

تفسیر

# فصل الخطاب

مصنف

سید العلماء الحاج علامہ السید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

# تفسیر فصل الخطاب

جلد سوم

مصنف

سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

# جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب-----تفسیر فصل الخطاب

جلد-----سوم

مصنف-----سیدالعلماء علامہ سید علی نقی نقوی<sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup> لکھنؤی

پروف ریڈنگ-----مولانا عابد عسکری

کمپوزنگ----- (قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی)

ترتیب نو-----مجاہد حسین حر

نیٹ سیٹنگ-----قلب علی سیال

سال اشاعت-----2011

ناشر-----مصباح القرآن ٹرسٹ

**ملنے کا پتہ**

**قرآن سینٹر**

۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

## ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَاِلَيْهِ الطَّاهِرِيْنَ.

قارئین کرام! تفسیر فصل الخطاب کی دوسری جلد پیش خدمت ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ سید العلماء علامہ سید علی نقی العقوی اب ہم میں نہیں رہے۔ میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ء کو تفسیر کے چند خصوصی نسخے لے کر سرکار مدوح کی خدمت میں حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ بہت دکھ ہوا اور تشویش بھی بہر حال میں نے اپنا وہ نام کہنا بھجوا یا جس نام سے آپ مجھے یاد فرمایا کرتے تھے۔ آدمی واپس آیا، اس نے بیٹھک کھول دی اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، تھوڑی دیر میں مولانا برآمد ہوئے، کافی دیر گفتگو ہوئی اور پھر خورد و نوش کا سلسلہ بھی چلا۔ میں نے تفسیر کے دو نسخے پیش کیے، تیسرے پر تبرک کے طور پر ان سے دستخط کروا لئے اور ساتھ لے آیا۔ مولانا نے تفسیر کو تھوڑی دیر دیکھا اور فرمایا: ”دیر آید درست آید“۔ کسے خبر تھی کہ یہ مولانا سے آخری ملاقات ہے اور پھر کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوگا۔

سید العلماء ۳۰، ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء رحلت فرما گئے اور عین عید الفطر کے دن مدفون ہوئے۔ خداوند عالم ان کو جو ار معصومین میں جگہ عطا فرمائے۔

آہ! وہ شبح جو ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء لکھنؤ میں روشن ہوئی تھی، گل ہو گئی۔

افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر وہ ہم میں روحانی طور پر موجود اور ہمارے دل و دماغ پر محیط ہیں۔ آج بھی ان کے علمی نکات ہم کو یاد آتے ہیں اور دین و دیانت اور اخلاق و شرافت سے ہماری محبت کو مستحکم کرتے ہیں۔ اب ایسی صلح کل ہستیاں کہاں ہیں جو علم و عمل کے میدان میں اسلامی تعلیمات و اقدار کی امین ہوں اور دنیا کی مشکلات میں ہمارے مژدہ فتح مبین ہوں۔

تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے تھوڑے دنوں بعد ہی ”مصباح القرآن ٹرسٹ“ لاہور نے جو تفسیر نمونہ کے ناشر ہیں خواہش ظاہر کی کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کی ان کو اجازت دے دی جائے۔ مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن نتیجہ خیز نہ ہو سکی۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کے آخری دنوں میں میری بیرون ملک سے واپسی پر پھر گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت مصباح القرآن ٹرسٹ کی طرف سے اور پیشکش ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کی طرف سے ہو۔ چنانچہ ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے دوسری جلد کا کتابت شدہ مسودہ مصباح القرآن ٹرسٹ کے حوالے کر دیا تاکہ اشاعت کا کام مصباح القرآن ٹرسٹ کے اہتمام و انصرام کے تحت انجام پاسکے اور تفسیر فصل الخطاب کی جلدیں بہ سرعت شائع ہوتی رہیں۔ الحمد للہ کہ مصباح القرآن ٹرسٹ نے اب نئے سرے سے مکمل تفسیر کی کمپوزنگ کروائی ہے اور قارئین کی سہولت کیلئے اشاعت ہذا میں تین جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب کو مکمل شائع کر دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تفسیر کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے، امید ہے کہ قارئین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور تعاون فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

سید علی اکبر رضوی

صدر ادارہ ترویج علوم اسلامیہ

کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عرض ناشر

سرکار سید العلماء علامہ علی نقوی نقوی اعلیٰ اللہ مقامہ کے خطیبانہ و مولفانہ فیوض و برکات کا سلسلہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ آپ کی تقریر و تحریر میں بیان و زبان کی سادگی اور مفاہیم و مطالب کی گہرائی یکساں طور پر موجود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو برصغیر پاک و ہند کے جمہور مسلمین میں عموماً اور شیعہ مومنین میں خصوصاً مقبولیت اور ادب و احترام نصیب ہوا کہ باید و شاید!

سید العلماء کے آثار علمی میں ”شہید انسانیت“ سمیت دسیوں با عظمت کتابیں، آپ کے کئی ایک مجموعہ ہائے تقاریر اور مختلف دینی موضوعات پر کم و بیش پانچ سو سالے موجود ہیں۔ تاہم آج سے ۲۵ برس قبل جب آپ کا مقدمہ تفسیر قرآن منظر عام پر آیا تو آپ کے تبحر علمی تحقیقی صلاحیت اور ذمہ دار قلم کی رعایت سے اپنے بیگانے ہر ایک کی نظریں آپ کی تفسیر قرآن کی طرف لگ گئیں۔

اس سلسلے میں خاص و عام کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی تفسیر آئندہ جلد کی تلاش میں پاکستان کے لوگ ہندوستان جاتے اور وہاں کے لوگ پاکستان آتے، نیز دیگر ممالک میں مقیم مسلمان اس کے لئے ہندو پاک کے کتب خانوں سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ آخر کار ان ہزاروں منتظر اور متلاشی نگاہوں کی تسکین کا سامان یوں ہوا کہ سید العلماء کے ایک نہایت ہی مخلص قدر شناس غلام محمد بٹ نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک کی مدت میں ٹمر بگ (مقبوضہ کشمیر) سے آپ کی تفسیر قرآن ”فصل الخطاب“ کی سات جلدیں شائع کر کے اس اہم فرض کی تکمیل کا اعزاز حاصل کر لیا۔

اس اثناء میں مذکورہ تفسیر کی پاکستان میں اشاعت کی ضرورت کا احساس فرماتے ہوئے سید العلماء نے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی کے صدر سید علی اکبر رضوی کو بھی اس کی اشاعت کے حقوق مرحمت فرمادیئے۔ چنانچہ اس ادارے نے تفسیر فصل الخطاب کی جلد اول شائع کر دی لیکن بوجہ یہ سلسلہ کچھ آگے نہ بڑھ سکا لہذا سید علی اکبر رضوی نے مصباح القرآن ٹرسٹ کی شاندار تفسیری و علمی خدمات کو دیکھتے ہوئے ایک معاہدے کے تحت اس تفسیر کی اشاعت کا عظیم کام اس ٹرسٹ کے حوالے کر دیا۔ بنا بریں مصباح القرآن ٹرسٹ نے تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جلد اول جو کہ کراچی کے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے شائع کی تھی، کے ختم ہونے پر مصباح القرآن ٹرسٹ نے اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کی اصلاح و تزئین میں مقدور بھر کوشش کی گئی، اس کے باوجود ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی تجاویز و آراء سے مستفید فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آخر میں دردمندانہ گزارش بھی کرتے ہیں کہ تفسیر ہذا کی ترویج میں ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون فرما کر قرآن و عترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدر دانی کا حق ادا کرنے میں کوشاں رہیں۔

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

ضرورت تفسیر

قرآن مجید جب خود نور، ہدایت، بصیرت، آسان، واضح اور احسن (وبہترین) تفسیر ہے تو پھر تفسیر کی کیا ضرورت ہے؟  
جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات قرآن میں ہے:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا. (فرقان--۳۳)

اور یہ لوگ کوئی بھی مثال نہ لائیں گے مگر یہ کہ ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین بیان (وتفسیر) لے آئیں گے

فَاتِمَّا يَسِّرُهُ لِبَلْسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ. (دخان--۵۸)

درحقیقت ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں۔

وَلَقَدْ يَسِّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّاكِرٍ. (قمر--۱۴)

”اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے۔“

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ. (زمر--۲۸)

”عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔“

قرآن مجید نے نہ فقط اس سوال کا جواب دیا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ مفسر قرآن کون ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ. (نحل--۴۴)

”اے رسول! ہم نے قرآن کو آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے ان تمام احکام وغیرہ کو بیان کریں (اور ان

کی توضیح و تشریح کریں) جو ان کی طرف بھیجے گئے ہیں شاید وہ غور و فکر سے کام لیں۔“

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا. (فاطر--۳۲)

”پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا انہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا۔“

مذکورہ آیات میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے لئے مفسر کی ضرورت ہے اور مفسر قرآن سب سے پہلے

خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے ان کے بعد وہ مفسر قرآن ہیں جو وارث قرآن، وارث علم قرآن اور وارث علم پیغمبر ہیں یعنی

اہل بیت و عترت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ جیسا کہ خود پیغمبر نے بھی فرمایا:

”إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ الثَّقَلَيْنِ ----- كِتَابِ اللّٰهِ وَعَٰئِرَتِي أَهْلَ بَيْتِي -----“

میں آپ لوگوں کے پاس دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن مجید) اور دوسری اپنی عترت (یعنی اہلبیت)۔

اہل بیت و عترت پیغمبرؐ کے بعد تفسیر قرآن کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے حقیقی وارث اور «الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ» کے مصداق ہیں۔

انہی علماء میں سے ایک حضرت آیتہ اللہ علامہ السید علی نقی النقی المعروف ”علامہ نقن“ ہیں۔ جنہوں نے تفسیر فصل الخطاب لکھ کر احسن طریقہ سے فریضہ الہی انجام دیا۔

تفسیر فصل الخطاب سے قرآن مجید کا ترجمہ و حاشیہ مرتب کرتے وقت جس حد تک میں نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے تو تفسیر کی مختلف اقسام (مثلاً تفسیر روائی، تفسیر عرفانی اور تفسیر اجتہادی) میں سے فصل الخطاب کو تفسیر اجتہادی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس تفسیر میں ان تمام علوم سے استفادہ کیا ہے جو ایک جامع اور اجتہادی تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔

یہ تفسیر اگرچہ سابقہ کتابت کے مطابق چند مرتبہ مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب خداوند عالم نے خادین ادارہ مصباح القرآن لاہور مخصوصاً جناب محترم شیخ محمد امین صاحب کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ وہ اسے کمپوز کروا کر خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ کمپوز اور اصلاح کا کام جناب محترم مجاہد حسین صاحب کے سپرد کیا گیا انہوں نے اپنی حد تک کوشش کی لیکن اتنے بڑے کام میں نواقص اور غلطیوں کا باقی رہنا فطری امر ہے۔ قارئین محترم سے گزارش ہے کہ نواقص کے سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں تاکہ بعد والے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم بانی ادارہ مصباح القرآن حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مرحوم علامہ سید صفدر حسین نقوی النجفی قدس سرہ کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے قائم کردہ تمام ادارات کو ترقی و کمال عطا کرے مصباح القرآن و دیگر ادارات کی تاسیس میں ان کے معاون خاص محترم جناب سیٹھ نواز ش صاحب دام عزہ کو صحت و سلامتی اور طول عمر عطا کرے۔

علامہ مرحوم کے قائم کردہ تمام اداروں کے سرپرست اعلیٰ اور ان کے روحانی جانشین حضرت آیتہ اللہ حافظ ریاض حسین نقوی النجفی دامت برکاتہ کو صحت و سلامتی اور طول عمر بابرکت عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم و دائم رکھے۔ تمام معاونین و خادین ادارہ مصباح القرآن مخصوصاً جناب محترم محمد امین صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

سید فیاض حسین نقوی

جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مارچ ۲۰۱۱ء

# تفسیر فصل الخطاب

چند تاثرات

ڈاکٹر محسن نقوی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِهِ الطَّيِّبِیْنَ  
الطَّاهِرِیْنَ الَّذِیْنَ اَذْهَبَ اللّٰهُ عَنْهُمْ الرَّجْسَ وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِیْرًا.

ہماری خوش نصیبی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی عظیم ترین علمی شخصیات میں سے فردِ وحید و عالمِ جلیل سید العلماء علامہ سید علی نقوی (۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء - ۲۹ رمضان ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۸۸ء) کی تفسیر فصل الخطاب کی طبع نو کے موقع پر اس کے بارے میں کچھ خیالات کے اظہار کا موقع ہمیں فراہم ہوا۔

ایک پوتے کے لئے اپنے جد (سید العلماء ہمارے والد کے چچا تھے) کی کسی کتاب پر لکھنا وہ بھی ”سید العلماء“ جیسی علمی شخصیت کی کتاب، اُس پر مستزاد ”تفسیر القرآن“ جیسا وسیع و دقیق موضوع اس بے بضاعت کے لئے بہت مشکل کام تھا لیکن توفیقِ الہی (عزوجل) اور ولی العصر، صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام اور اُن کے اجدادِ کرام، صلوٰۃ اللہ علیہم کی ہدایت کے توسط سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی ابتداء سید العلماء کے اجداد میں سید علی نقوی (۱۲۰۰ھ/۱۲۵۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء - ۱۸۲۳ھ) ابن سید دلدار علی غفرانہما کے حصے میں آئی۔ آپ کا ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے پہلے قرار پاتا ہے۔ اس ترجمے کی زبان قدیم لیکن سلیس اور با محاورہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی کی لائبریری، ناظم آباد میں موجود ہے۔



یوں تو علمائے شیعہ نے قرآن مجید کے بہت سے ترجمے اور حواشی قلم بند کئے جن میں مولانا فرمان علی (۱۸۵۳ء--۱۹۱۶ء) اور مولانا مقبول احمد علی اللہ مقامہما (۱۸۷۰ء--۱۸۸۶ء) کے تراجم و حواشی کو خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح اردو تفاسیر میں مولانا عمار علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۸ء--۱۹۷۵ء) کی تفسیر ”عمدة البیان“ (۳ جلدیں) ایک متوسط حجم کی تفسیر شمار کی جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا امداد حسین کاظمی (۱۹۰۱ء--۱۹۷۵ء) کا ترجمہ و حاشیہ تفسیر متقین ہماری نظر میں فرمان علیؒ اور مقبول احمدؒ کے تراجم و حواشی پر بوجہ فوقیت رکھتا ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کے بعد علامہ حسین بخش جاڑا صاحب کی تفسیر ”انوار الخف“ تفسیر کے شائقین کا مرکز رہی، اسی طرح علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ کا ترجمہ و حاشیہ بھی اس بناء پر بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے کہ ترجمہ انتہائی رواں اور حواشی عام قاری کے لئے سہل ہیں۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی (دام ظلہ الوارف) کی زیر نگرانی تیار ہونے والی ”تفسیر نمونہ“ کا ترجمہ انتہائی دیانت و عرق ریزی سے کیا گیا اور اس نے خاص حد تک ایک ایسی تفسیر کی کمی پوری کر دی جو طلباء، کالج و یونیورسٹی کے پروفیسروں اور علماء کے لئے ”حوالے“ کا کام دے اور وہ اس کے ذریعے اپنی ”قرآن فہمی“ میں اضافہ کر سکیں۔ جزاء ہم اللہ احسن الجزاء جس دوران تفسیر نمونہ کی جلدیں طبع ہو کر آ رہی تھیں اسی دوران سید العلماء کی تفسیر ”فصل الخطاب“ پہلے سات جلدوں میں کشمیر سے چھپی، پھر ایک جلد ادارہ ترویج علوم اسلامیہ سے اور بعد ازاں مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس کا پورا سیٹ اچھے انداز میں طبع کیا۔

قرآن مجید کے طالب علم کی حیثیت سے عالم اسلام میں مختلف مکاتب فکر و فقہ کی تفاسیر شائع ہونے کے ساتھ زیر مطالعہ رہتی ہیں تو اپنے مکتب فکر کی اردو تفاسیر و حواشی بھی ہمیشہ زیر نظر رہتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں کچھ کم نہیں جن میں سے بعض کا ذکر ماقبل ہم کر چکے۔

سید العلماء کی تفسیر کی خاص بات جس نے ہمیں متاثر کیا وہ اس کا ”تفسیری ترجمہ“ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سید العلماء کی ساری محنت و ژرف نگاہی آیات کے ترجمے میں مضمر ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سید العلماء کسی بھی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے صرف عربی زبان، نحو و بلاغت، معانی و بدائع کو مد نظر نہیں رکھتے بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث اور ان کو مد نظر رکھ کر لکھی جانے والی تفاسیر مثلاً شیخ طوسیؒ کی التبیان، محسن فیض الکاظمی کی الصافی، تفسیر قمی علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان وغیرہ میں پیش کئے گئے مطالب کو اردو ترجمے میں سمو دیتے ہیں اور تائیداً متعلقہ تفسیر کی متعلقہ عبارت کو مختصراً نقل کر دیتے ہیں۔ تفسیری مواد اس ترجمے ہی کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی لئے ترجمے میں لفظ پر لفظ نہیں رکھا ہے

بلکہ اُسے اُردو محاورے کے مطابق ادا کیا ہے۔ نمونے کے طور پر بعض مقامات پیش خدمت ہیں:

(۱) سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۹ کے ایک جزء:

وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَكَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ط

اس کا ترجمہ سید العلماء نے یہ کیا ہے: اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ و غضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں۔ اس کے بعد حاشیہ میں پہلے مولانا فرمان علی کا ترجمہ دیا ہے ”تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹتے ہیں“۔ پھر ان ہی کا حاشیہ نقل کیا ہے: اس ”الانامل“ کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اُردو محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے ہیں اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

بعد ازاں سید العلماء وضاحت کرتے ہیں: مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں تو انگلیاں کاٹنا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے، (فصل الخطاب، ج ۳، ص ۷۳)

علامہ جوادی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ تفسیر نمونہ کے اُردو ترجمے میں ہے: جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ و غضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ (ج ۳ ص ۶۴) سید العلماء کا ترجمہ عربی سے قریب اور اُردو محاورے کے مطابق ہے۔

(۲) سورہ آل عمران ہی کی آیت ۱۵۴ کے پہلے جزء میں فرمایا:

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنَةً نُّعَاسًا يَّغْشَى طَائِفَةً مِّنْكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ ...

علامہ جوادی نے ترجمہ یوں کیا ہے: ”اس کے بعد خدا نے ایک گروہ پر پرسکون نیند طاری کر دی اور ایک کو نیند بھی نہ آئی کہ اسے صرف اپنی جان کی فکر تھی“

اس ترجمے میں ایک تو ”غم“ کا ذکر نہیں ہے، دوسرے تا کہ ”أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ“ میں جو عمومیت ہے وہ مفقود ہے۔ تیسرے قرآن مجید کے الفاظ ”وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ ...“ کا ترجمہ مبہم ہے ”اور ایک کو۔۔۔۔۔“ یہاں مفرد کا گمان ہوتا ہے اگر ”گروہ“ کا اضافہ ہوتا اور ”ایک“ کی بجائے ”دوسرے“ ہوتا تو قرآنی الفاظ کی رعایت بھی ہوتی اور مطلب واضح ہوتا۔

سید العلماء نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: پھر اُس نے رنج و غم کے بعد تم پر سکون و اطمینان اتارا نیند کی صورت سے جو تم

میں سے ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔ (ج ۳ ص ۷۴)

اس کی تائید میں انہوں نے علامہ طبرسی کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

(۳) سورہ نساء کی آیت ۹۱ کا ایک جزء ہے:

كَلَّمَا رُدُّوْا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا.

علامہ جوادی نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: یہ جب بھی فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں اُلٹے اس میں اوندھے منہ گر

پڑتے ہیں۔

الفاظ قرآن میں ”بلائے جاتے ہیں“ کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے۔

شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اس کی طرف لوٹ

جاتے ہیں۔

”اُرْكِسُوْا فِيْهَا“ کے بنیادی معنی: ”یعنی وقعوا فیہا“ (التبیان للطوسی) یعنی ”پڑجانا“ واقع ہو جانا اس کو تائیداً

نقل کر کے سید العلماء نے ترجمہ یوں کیا ہے: اور جب فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جٹ جائیں

گے۔ (فصل الخطاب ج ۳ ص ۲۶۹) ”جٹ جانا“ اردو محاورہ ہے جس میں تن دہی سے کسی کام میں دلچسپی سے لگے رہنے کا

مفہوم ہے اور یہی ”اُرْكِسُوْا فِيْهَا“ کا درست ترجمہ ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

درج بالا سطور سے سید العلماء کی تفسیر فصل الخطاب کی چند خصوصیات مستفاد ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ الفاظ قرآنی کی بالالتزام رعایت

۲۔ لفظی ترجمے کی بجائے محاوراتی ترجمہ اور لکھنوی اردو محاورے کی مطابقت

۳۔ ترجمے میں عقلی و منطقی اظہار اور ربط کا لحاظ

۴۔ طوالت سے گریز

۵۔ مستند تفاسیر کے طویل اقتباسات سے گریز

۶۔ تفاسیر کے مختصر اقتباسات سے استشہاد

- ۷۔ احادیث کے طویل مندرجات کی بجائے محض متعلقہ حصے کا اقتباس و اشارہ
- ۸۔ تاریخی واقعات کی طرف اشارہ اور تفصیل سے اجتناب
- ۹۔ تفسیر میں نہ اتنی طوالت کہ قاری پر بار ہو جائے اور نہ ایسا طنب کہ وہ حاشے میں شمار ہو۔
- ۱۰۔ وہ مضامین جن کی ادائیگی عوام میں خلاف ادب سمجھی جاتی ہے اُس کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال جن سے وہ دائرہ ادب و ستر سے باہر بھی نہ نکلیں اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔ مثلاً سورہ نساء کی آیت ۶ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں: ”بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں ۱۵ برس اور لڑکی میں ۹ برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں۔“ (ج ۳، ص: ۱۴۴)
- ۱۱۔ فقہی آیات احکام کی وضاحت میں فقہی مسائل کو اپنی پوری فقہی مہارت سے بیان فرمایا ہے مگر اس کو بہت قابل فہم انداز میں تحریر فرمایا تاکہ مسائل سمجھ میں آسکیں۔ مثلاً سورہ نساء کی آیات ارث۔
- قابل مبارک باد ہیں مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسؤلیں و منتظمین جو قرآن مجید کی خدمت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علوم اہل بیت علیہم السلام کو بھی نشر کر رہے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ ان سے فرمان خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم: ”میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: قرآن و اہل بیت جب تک ان سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے“ پر عمل بھی کروا رہا ہے اور ثقلین کی خدمت بھی۔

این سعادت بہ زور بازو نیست

تانه بخشد خدائے بخشده

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں ”ثقلین“ کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

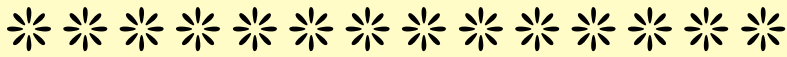
خادم الثقلین

ڈاکٹر محسن نقوی

۲۶ مارچ ۲۰۱۱ء کراچی

# بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے



## فہرست کتاب

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
47	رسول ﷺ کے آباؤ اجداد کا ایمان	21	سُورَةُ الشُّعَرَاءِ
49	حق پرستوں کے سوا عام طور پر شاعروں کی مذمت	21	سورہ شعرا کے خاص خاص مضامین
50	سُورَةُ التَّمَلُّ	23	آغاز تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
50	سورہ تمئل کے خاص خاص مضامین	24	جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون سے گفتگو
52	موسیٰ علیہ السلام کا آگ لینے کو جانا اور پیہری ملنا	27	ساحروں سے مقابلہ
52	جناب موسیٰ علیہ السلام کا خوف اور خالق کی تشبیہ		دریا میں شگاف، موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون کی معذرت
54	کافروں کا باوجود یقین انکار	30	انواع غرقابی
54	انبیاء کے لئے ورثہ کا ثبوت	31	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اور اپنی قوم سے گفتگو
55	چیونٹی کا واقعہ اور جناب سلیمان علیہ السلام سے گفتگو	32	خالق سے مناجات
57	ہڈ ہڈ کا واقعہ اور ملکہ سبا کی خبر لانا	34	حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ
57	جناب سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کے نام خط لکھنا	34	قوم کا جواب اور گفتگو
58	ملکہ سبا کا عائدین سلطنت سے مشورہ	35	انجام کار
59	ملکہ سبا کے تحائف پر جناب سلیمان علیہ السلام کا جواب	36	حضرت ہود علیہ السلام کا موعظہ و تبلیغ
60	تحفہ بقیس کا چشم زدن میں آنا	38	قوم کا جواب اور اس کا انجام
61	ملکہ کا حاضر ہونا اور متعلقہ واقعات	39	حضرت صالح علیہ السلام کا موعظہ و نصیحت کرنا
63	قبیلہ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال	39	ناقہ اور اس کا پے کیا جانا
64	جناب صالح علیہ السلام کے خلاف منصوبہ سازی اور اس کی ناکامی	40	حضرت لوط علیہ السلام کا قوم کو زبردستی بیچ کرنا
65	جناب لوط علیہ السلام کی نصیحت، قوم کی مخالفت اور اس کا انجام	41	قوم کا انکار اور اس کی پاداش
66	غیر اللہ کی عبادت کرنے والے کو مسلسل تازیانی	41	جناب شعیب علیہ السلام کا موعظہ و پند
68	علم غیب کا اللہ سے مخصوص ہونا اور اس کا مطلب	42	قوم کا انکار اور اس کی سزا
69	منکرین قیامت کے سوالات اور ان کے جواب	43	قرآن کا قلب پیغمبر پر اترنا
72	دائتہ الارض کا ذکر	44	عرب کے مقابلہ میں غیر عرب کی بے تعصبی اور حق پرستی
73	قیامت کے پہلے رجعت کا سوال	46	دعوتِ عشیرہ کا حکم

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
128	قبل رسالت کی زندگی بعد والے دعوے کی حقانیت	74	صور کے اثر سے کچھ افراد کا استثناء
133	حرم الہی کا مثالی امن قدرت خدا کی نشانی	76	زمین کی حرکت کا ثبوت
135	سُورَةُ الرَّؤْمِ	78	سُورَةُ الْقَصَصِ
136	دنیا کے معاملہ میں نکتہ رسی دین کے بارے میں بے خبری	78	سورہ قصص کے خاص خاص مضامین
138	اوقات نماز کی طرف اشارہ	79	مظالم فرعون
141	اسلام کا دین فطرت ہونا	80	مادرموسیٰ کی طرف وحی اور اس کی تفصیل
143	وہ ارشاد الہی جس کی بنا پر فدک ہبہ کیا گیا	82	زوجہ فرعون کی گفتگو اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی پرورش
143	سود میں خسارہ اور زکوٰۃ میں فائدہ	85	قبیلے کے قتل کا واقعہ
145	اللہ پر بتقا ضائع عدل واجب ہونا	87	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف و دہشت کے عالم میں مصر سے نکلنا
147	دور برزخ کا قیامت میں فراموش ہونا	88	دختران جناب شعیب علیہ السلام کا واقعہ
149	سُورَةُ الْقَمَنِ	91	جناب شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو
149	سورہ لقمان کے خاص خاص مضامین	92	وادئ ایمن
150	حرمت غناء	94	جناب ہارون کی بحیثیت گواہ ضرورت
151	آغاز و صیائے لقمان	96	فرعون کا ہامان کو فرمان اور آخری انجام
152	حقوق والدین میں ماں کے حق پر خصوصی زور	101	چشم پوشی اور رواداری کی مدح
152	حق ایمانی نہیں بلکہ انسانی	106	خالق کے فیصلے کے خلاف اپنے اختیار کو صرف کرنا ایک طرح کا شرک ہے
156	کلمات الہی کی کثرت و وسعت	108	قارون کا کردار اور اس کا انجام
158	وہ باتیں جن کا علم بس اللہ کو ہے	110	انجام بخیر ان کا جو دنیا میں قہر و غلبہ کے درپے نہ ہوں
159	سُورَةُ السَّجْدَةِ	112	پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مرکز کی طرف واپسی کی اطمینان دہانی
159	سورہ سجدہ خاص مضامین	113	سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ
162	ملک الموت کا ذکر	113	سورہ عنکبوت کے خاص خاص مضامین
164	سجدہ واجبہ	118	جناب نوح علیہ السلام کی عمر تبلیغ ساڑھے نو سو برس قبل از طوفان
164	مومن اور فاسق یکساں نہیں	118	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق
168	سُورَةُ الْاَحْزَابِ	120	قوم کا ظالمانہ رویہ
168	سورہ احزاب کے اہم مضامین	122	جناب ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کی نوازش
170	منہ بولا رشتہ اسلام میں حقیقت نہیں رکھتا	124	قوم لوط کی عذاب الہی سے تباہی
171	رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مومنین پر اختیار کئی	125	قوم شعیب اور مختلف اقوام پر عذاب الہی کا یکجائی تذکرہ
173	جنگ خندق کا ہولناک موقع اور مسلمانوں کی حالت	127	اہل کتاب سے بھی بحث میں رواداری

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
225	مساوات مطلق خلاف فطرت	175	منافقین کا کردار
226	منتخب افراد کا وارث کتاب ہونا	176	پیغمبر خدا ﷺ بہترین نمونہ عمل
230	گناہ کے بعد فوری سزا ہوتی تو کوئی باقی نہ رہتا	177	جنگ خندق کا سرانجام
231	سُورَةُ يُسُف	178	بنی قریظہ کا انجام
231	سورہ یسین کے خاص خاص مضامین	179	ازواج رسول ﷺ کا امتیاز خاص
234	ایک خاص داعی حق کے تذکرہ کا آغاز	184	خدا اور رسول ﷺ کے فیصلے کے بعد جمہور مسلمین کے اختیار کی نفی
234	دعوت حق دینے والے مومن کی گفتگو کا نتیجہ	186	ختم رسالت
235	اُس مومن کی حق گوئی کا نتیجہ	188	طلاق کے بعد عدہ نہ ہونے کی صورت
235	اس قوم کا انجام	189	ازواج بصورت بہر رسول ﷺ کی امتیازی خصوصیت
236	خالق کا افسوس اور اس کا مطلب	191	ازواج رسول ﷺ کے لئے پردے کی پابندی
237	ہر چیز میں جوڑے	192	وہ محرم افراد جن سے عورتوں کے لئے پردہ نہیں
238	آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کا ثبوت	192	پیغمبر خدا ﷺ پر درود کی تعلیم
239	غریبوں کی خبر گیری کے خلاف جواب میں دھاندلی	193	خدا اور رسول ﷺ کو ایذا پہنچانے پر لعنت
240	قیامت کے جسمانی ہونے پر تمام انبیاء کا اتفاق	194	خواتین کے چہرے کے پردے کا حکم
241	زبانوں کی بجائے ہاتھ پیروں کی گواہی کی نوعیت	195	قیامت کا علم اللہ سے مخصوص
242	پیرانہ رسالی کی کیفیت کو یاد دلانے کا مقصد	199	سُورَةُ سَبَا
245	مشرکین کے اعتراض کی نوعیت جو معاد جسمانی کا ثبوت ہے	199	سورہ سبہ کے خاص خاص مضامین
246	سُورَةُ الصَّفَاتِ	202	حضرت داؤد کے لئے وہیے کا نرم ہونا
246	سورہ صفات کے خاص خاص مضامین	203	دیمک سے سلیمان کی موت کا انکشاف
247	آفتابوں کی کثرت	204	ملک سبأ والوں کی ناشکری اور ان کا انجام
257	ذبح عظیم	206	انتہائی روادار انداعلان
260	آل یاسین پر سلام	207	مزید رواداری
267	سُورَةُ ص	207	رسالت خاتم الانبیاء کی ہمہ گیری
267	سورہ ص کے خاص خاص مضامین	210	اموال اور اولاد کے ساتھ حسن عمل کی قدر و قیمت میں اضافہ
272	حضرت داؤد کا فیصلہ اور اُس پر ان کو انتہا	214	اجر رسالت کا طلب ہونا مگر فائدہ افراد امت کا
274	قرآن کے بابرکت ہونے کے معنی	217	سُورَةُ فَاطِمَةَ
275	گھوڑوں کے معائنہ اور آفتاب کے پلٹنے کا بیان	217	سورہ فاطمہ کے خاص خاص مضامین
277	جناب ایوب علیہ السلام اور ان کے صبر کا تفصیلی تذکرہ	220	کلمہ طیب اور عمل صالح



صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
382	سُورَةُ الدَّخَانِ	283	سُورَةُ الزُّمَرِ
382	سورہ دخان کے خاص خاص مضامین	283	سورہ زمر کے خاص خاص مضامین
383	قرآن کا ایک خاص بابرکت رات میں نازل ہونا	284	تحقیق کا دامن چھوڑنا غلط
383	شب قدر میں خاص حکیمانہ فیصلوں کا صادر ہونا اور حقیقت زار کی قطعی دلیل	299	گناہ گاروں کو ناما مید نہ ہونا چاہئے رحمت خدا سے
389	سُورَةُ الْجَاثِيَةِ	307	سُورَةُ الْمُؤْمِنِ
389	سورہ جاثیہ کے خاص خاص مضامین	315	فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰ پر بے دینی اور فساد پھیلانے کا الزام
393	بد اعمال لوگ خوش اعمال لوگوں کے برابر نہیں	316	مومن آل فرعون کا تذکرہ
397	سُورَةُ الْاَحْقَافِ	319	ہامان کا بحکم فرعون اونچا گل بنانا تاکہ خدائے موسیٰ کا پیہ لگائے
397	سورہ احقاف کے خاص خاص مضامین	324	حضرت پیغمبر خدا کی مغفرت کی دعا تقاضاے عبودیت
401	ایمان پر برقرار رہنے کا اجر	325	اوقات نماز کی طرف اشارہ
402	والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ماں کے حق پر خصوصی توجہ دہانی	327	دُعَا سے انکار کرنے والوں کو شدید تہدید
407	الوا العزم پیغمبروں کی تعداد	333	عذاب آنے کے بعد ایمان لانا بے سود
408	سُورَةُ هُجُرَاتٍ	334	سُورَةُ لَحْمِ السَّجْدَةِ
408	سورہ ہجرات کے خاص خاص مضامین	334	سورہ حم سجدہ کے خاص خاص مضامین
410	دشمنوں سے جنگ کی صورت میں مسلمانوں کو ہدایتیں	340	قیامت میں اعضاء جسمانی گواہی دیں گے
411	خدا کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور ثابت قدمی عطا کرے گا	344	سجدہ واجب
415	پیغام جہاد سن کر بعض مسلمانوں کی حالت	347	خالق کے ثبوت عدل کی دلیل
417	رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں میں بعض حاضر ہونے والوں کی حالت	350	سُورَةُ الشُّورَى
417	قرآن میں غور فکر سے کام لینے کی دعوت	350	سورہ شوریٰ کے خاص خاص مضامین
419	مسلمانوں کا لب و لہجہ ان کی پردہ کشائی کے لیے کافی	357	ذوی القربیٰ کی محبت کا بطور اجر رسالت مطالبہ
422	سُورَةُ الْفَتْحِ	365	حضرت پیغمبر خدا کے حکم کا بقیض الہی ہونا
422	سورہ فتح کے خاص خاص مضامین	366	سُورَةُ الزُّخْرُفِ
423	رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے قتل اور بعد کے جرائم کی معافی کے معنی	366	سورہ زخرف کے خاص خاص مضامین
425	تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم	367	حضرت علی کا اسم با مستی ہونا
427	کچھ مسلمان باوجود اصرار جہاد میں ساتھ نہیں لیے گئے	369	اللہ کے لئے نئی اولاد کی دلیل
429	بیعت شجرہ کا ذکر اور خالق کا اعلان خوشنودی	369	ملائکہ کے صنف اناث میں ہونے کی رد
432	حدیبیہ میں جنگ نہ ہونے دینے کا سبب	371	کلمتہ باقیمنصب امامت
432	صلح حدیبیہ سے غیر مطمئن افراد کو مطمئن بنانے کی کوشش	373	اموال دنیا کی پستی و حقارت

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
468	یاد دہانی کا اہل ایمان کے لیے فائدہ	436	سُورَةُ الْحُجُرَاتِ
469	مقصد خلقت انسان اور جنات	436	سورہ حجرات کے خاص خاص مضامین
472	سُورَةُ الطُّورِ	437	پیغمبر خدا ﷺ کے سامنے پیش دستی کی سخت ممانعت
477	نعمت بہشت کے اوصاف	439	فاسق کے جبر دینے پر تحقیق کی ضرورت
479	پیغمبر خدا ﷺ کو تسلی	440	توئی اور تبرّہ کا حکم
480	قرآن کا مثل لانے کی دعوت	441	مسلمانوں کو باغی جماعت سے جنگ کرنے کا حکم
485	سُورَةُ النَّجْمِ	442	مؤمنین سے تمسخر اور بدگمانی کی ممانعت
485	سورہ نجم کے خاص خاص مضامین	442	تجسس، بدگمانی اور غیبیت سے ممانعت
486	پیغمبر خدا ﷺ کی عظمت عملی قولی	443	اسلامی مساوات کے ساتھ معیار امتیاز کا بیان
491	مشرکین کے اس مزعومہ باطل کی رد کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں	444	اسلام آسان ہے اور ایمان مشکل
499	نتائج کا انحصار سعی و کوشش پر	445	قبول ہدایت کے ساتھ راہ راست اختیار کرنا اللہ کا احسان
505	سُورَةُ الْقَمَرِ	446	سُورَةُ قَاتِحِ
505	سورہ قمر کے خاص خاص مضامین	446	سورہ ق کے خاص خاص مضامین
506	شق القمر ہونا	447	پیغام آنحضرت کے ماننے میں کفار کے ذہن کے لیے دور کاوٹیں
508	قوم نوح اور طوفان نوح کی نوعیت	448	دوبارہ کی زندگی کے کفار کا تعجب دور کرنے کے لیے مثالیں
509	قوم عاد پر دائمی طور پر منحوس دن کا عذاب ہونا	449	قوم نوح کے ساتھ اسباب رس اور اہل ایکہ کا ذکر
511	قوم ثمود و ناقہ صالح اور عذاب الہی کا آنا	450	آخرت میں کفر ختم مگر اس دن کا ایمان معتبر نہیں
513	قوم لوط پر عذاب اور اس کا مختصر پیش منظر	454	اوقات نماز کا بیان
514	زمانہ رسول کے مشرکین کو سخت ترین الفاظ میں انتہا	455	رسول ﷺ کا کام جبر کرنا نہیں ہے
517	سُورَةُ الرَّحْمٰنِ	456	سُورَةُ الدَّارِ اَيَاتِ
517	سورہ رحمن کے خاص خاص مضامین	456	سورہ ذاریات کے خاص خاص مضامین
518	تخلیق انسان و تعلیم کا بیان	457	جزا و سزا پر قسموں کے ساتھ زور
520	خالق کی طرف سے توازن کا قیام	458	مشرکین کا رسول ﷺ کے خلاف باتوں میں اضطراب
520	زمین اور اس کے نباتات خداوندی نعمتیں	458	پرہیزگاروں کا کردار
521	دو شرق اور دو مغرب	459	آسمانوں میں روزی بھی اور خدا کا عذاب بھی
522	دو دریاؤں کی آمیزش اور ان سے موتی اور مونگے برآمد	461	قوم لوط پر عذاب کا نزول
528	ہول قیامت	463	گزشتہ کئی قوموں پر عذاب کا مختصر مختصر تذکرہ
528	نعمت جنت کا ذکر	467	مومن اور کافر کے معنی

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
602	منزل تخلیق میں سب کی یکسانی	532	سُورَةُ الْوَاقِعَةِ
606	اہل و عیال جو صحیح راستے پر جانے سے روکیں درحقیقت دشمن ہیں	532	سورہ واقعتہ کے خاص خاص مضامین
607	اموال اور اولاد، ذریعہ آزمائش	539	قرآن کے مس حروف کے لیے طہارت کی شرط
608	سُورَةُ الطَّلَاقِ	540	تیبوں قسم کے لوگوں کے انجام کا خلاصہ
608	سورہ طلاق کے خاص خاص مضامین	541	سُورَةُ الْحَائِيَةِ
610	طلاق کے موقع پر دو عادلوں کی بحیثیت گواہ موجودگی ضروری	541	سورہ حدید کے خاص خاص مضامین
611	یانسہ وغیرہ اور حاملہ کا عدہ	546	منافقوں کی بے بسی اور محتاجی
612	احکام رضاعت	547	مسلمانوں کو انتہا کہ وہ امتداد زمانہ سے گھبر کر بد دل نہ ہو جائیں
615	سُورَةُ التَّحْرِيمِ	549	دنیاوی زندگی کی بے حقیقتی اور بے اعتباری کی مثال
615	سورہ تحریم کے خاص خاص مضامین	550	حال کی ہر بات پہلے سے لوح قلم قضاۃ قدر میں محفوظ ہوتی ہے
619	اپنے اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کے معنی	551	تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کتاب اور میزان کا اترنا
620	خالص توبہ	552	عیسائیوں کی نیک دلی مگر ان کی ایجاد کردہ رہبانیت کی مذمت
621	کفار اور منافقین کے مقابلے میں سختی کی ضرورت	555	سُورَةُ الْمُجَادَلَةِ
623	سُورَةُ الْمَلِكِ	555	سورہ مجادلہ کے خاص خاص مضامین
623	سورہ ملک کے خاص خاص مضامین	556	ظہار کے حکم شرعی کا بیان اور اس کے کفارے کا ذکر
624	موت و حیات ذریعہ آزمائش	566	سُورَةُ الْحَشْرِ
628	زمین کی صفت	575	سُورَةُ الْمُہْتَجِبَةِ
632	سُورَةُ الْقَلَمِ	585	سُورَةُ الصَّفِّ
632	سورہ قلم کے خاص خاص مضامین	585	سورہ صف کے خاص خاص مضامین
640	حضرت یونس کے ترک اولیٰ کا اظہار	587	حضرت موسیٰ کی اپنی قوم کو فہمائش
641	سُورَةُ الْحَاقَةِ	589	دین الہی کے مددگار ہونے کی دعوت اور حواریین حضرت عیسیٰ کی مثال
641	سورہ حاقہ کے خاص خاص مضامین	590	سُورَةُ الْجُمُعَةِ
647	سُورَةُ الْمَعَارِجِ	590	سورہ جمعہ کے خاص خاص مضامین
647	سورہ معارج کے خاص خاص مضامین	592	پیغمبر آخرا زمانہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت
648	پچاس ہزار برس کا ایک سال	594	جمعہ کی نماز کا حکم
655	سُورَةُ نُوحٍ	596	سُورَةُ الْمُنَافِقُونَ
655	سورہ نوح کے خاص خاص مضامین	601	سُورَةُ التَّغَابُنِ
659	حضرت نوحؑ کی بارگاہ الہی میں مناجات	601	سورہ تغابن کے خاص خاص مضامین

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
739	سُورَةُ الْبَيْلِ	660	سُورَةُ الْحَجِّ
741	سُورَةُ الضُّحَى	660	سورہ جن کے خاص خاص مضامین
744	سُورَةُ الْمَنَافِقِ	666	سُورَةُ الْمُزِمِّلِ
745	سُورَةُ التِّينِ	671	سُورَةُ الْمَدَّانِيِّ
747	سُورَةُ الْعَلَقِ	671	سورہ مدثر کے خاص خاص مضامین
750	سُورَةُ الْقَدْرِ	672	اللہ اکبر کے معنی
751	سُورَةُ الْبَيِّنَاتِ	674	ایک شخص خاص کا تذکرہ
754	سُورَةُ الزَّلْزَلِ	680	سُورَةُ الْقِيَامَةِ
755	سُورَةُ الْعَدِيَّتِ	683	دیدار خدا بصیرت سے نہ کر بصارت سے
757	سُورَةُ الْقَارِعَةِ	686	سُورَةُ الدَّهْرِ
758	سُورَةُ التَّكْوِيْنِ	688	اس واقعہ کا ذکر جس کی بنا پر یہ سورہ نازل ہو ہے
759	سُورَةُ الْعَصْرِ	689	نعمات بہشت کا مفصل ذکر، کردار کی جزا کے طور پر
760	سُورَةُ الْهُمَزَةِ	692	سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ
762	سُورَةُ الْفِيلِ	697	سُورَةُ النَّبَاِ
764	سُورَةُ قُرَيْشٍ	697	خاص بڑی خبر کا ذکر
765	سُورَةُ الْمَاعُونِ	701	سُورَةُ النَّازِعَاتِ
766	سُورَةُ الْكَوثرِ	705	سُورَةُ عَبَسَ
768	سُورَةُ الْكَافِرُونَ	709	سُورَةُ التَّكْوِيْنِ
769	سُورَةُ النَّصْرِ	713	سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ
770	سُورَةُ اللَّهَبِ	715	سُورَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ
771	سُورَةُ الْاِخْلَاصِ	718	سُورَةُ الْاِنشِقَاقِ
773	سُورَةُ الْفَلَقِ	721	سُورَةُ الْبُرُوجِ
774	سُورَةُ النَّاسِ	725	سُورَةُ الطَّارِقِ
	*****	727	سُورَةُ الْاَعْلَى
		729	سُورَةُ الْغَاشِيَةِ
		731	سُورَةُ الْفَجْرِ
		734	سُورَةُ الْبَلَدِ
		737	سُورَةُ الشَّمْسِ

عنوان

صفحہ نمبر

عنوان

صفحہ نمبر

# بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے

\* \* \* \* \*

# سُورَةُ الشُّعَرَاءِ

مکیہ ..... ۲۲۷ ..... آیات

اس سورہ کی اختتامی آیات میں شاعروں کی صنف کا ذکر ہے، اس لئے اس سورہ کا نام اس صنف کی نسبت سے ہوا۔

## سورہ شعرا کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی گفتگو جس کا تفصیلی بیان اس سورہ کے مختصات میں سے ہے۔
- ۲..... ساحروں سے مقابلہ، پھر دریا میں شگاف، نبی اسرائیل کا پار ہو جانا اور فرعون کا مع اپنی افواج کے غرق ہونا جو دوسرے مقامات پر بھی مذکور ہے۔
- ۳..... حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اور اپنی قوم سے گفتگو، پھر اپنے خالق سے مناجات۔
- ۴..... حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ، قوم کا جواب اور تفصیلی گفتگو۔
- ۵..... حضرت ہود علیہ السلام کا موعظ و تبلیغ، قوم کا جواب اور ان لوگوں کا انجام۔
- ۶..... حضرت صالح علیہ السلام موعظ و نصیحت، ناقہ اور اس کا پے کیا جانا اور نتیجہ۔
- ۷..... حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو زبردستی بیخ، قوم کا انکار اور اس کی پاداش۔
- ۸..... جناب شعیب علیہ السلام کا موعظ و پند، قوم کا انکار اور اس کی سزا۔
- ۹..... قرآن کا قلب پیغمبر پر اترنا۔
- ۱۰..... عرب کے مقابلہ میں غیر عرب کی بے تعصبی اور حق پرستی۔
- ۱۱..... دعوت عشرہ کا حکم
- ۱۲..... رسول کے آباؤ اجداد کا ایمان اور عبادت گزار ہونا..... وغیرہ وغیرہ۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

طسّم ۱ تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۲ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا  
مُؤْمِنِينَ ۳ إِنَّ نَسْأَ نُزِّلَ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا

## خُضِعِينَ ﴿٣﴾

”طا، سین، میم۔ یہ کھلی ہوئی کتاب کی آیات ہیں۔ شاید آپ جان دے دیں گے اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے، اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایک نشانی ایسی اتاریں کہ زبردستی ان کی گردنیں اُس کے سامنے جھک جائیں۔“  
یعنی جبری ایمان خالق کے نظامِ حکمت کے خلاف ہے، اس لئے دنیا میں کافر کا وجود ہے، پھر اُن کے ایمان نہ لانے سے آپ اتنا رنج کیوں کرتے ہیں؟

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَنِ مُحَدِّثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ﴿٥﴾ فَقَدْ

كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبَاءٌ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٦﴾

”اور نہیں آتی اُن کے پاس خدائے رحمن کی طرف سے کوئی تازہ ہدایت مگر یہ کہ وہ اُس سے بے اعتنائی اختیار کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے جھٹلایا تو عنقریب آئیں گی اُن کے سامنے خبریں اُس کی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔“

یعنی عذاب الہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے، پہلے وہ خبروں کی حیثیت رکھتا تھا اور اب وہ مجسم طور پر اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمَا أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴿٧﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ

لَايَةً ۗ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٨﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٩﴾

”کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ کتنے ہم نے ہر عمدہ قسم کے نباتات اُس میں پیدا کیے ہیں، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے، مگر اُن میں کے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بلاشبہ تمہارا پروردگار غالب ہے، بڑا مہربان۔“

غلبہ کے باوجود اُس کی مہربانی، دنیا میں یہ ہے کہ وہ باوجود قدرتِ کاملہ کے عذاب نازل نہیں کرتا، اس طرح یہ غلبہ اور رحم کی صفات دونوں کافروں ہی کے تعلق سے ہیں [۱] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عزیز ”غالب“ کہنا کفار کے مقابلہ میں ہو اور رحیم کہنا مؤمنین کے لحاظ سے ہو [۲] اور ایک صورت یہ ہے کہ دونوں صفات کو مستقل سمجھا جائے جو بجائے خود ذاتِ الہی کے اسمائے حسنیٰ میں ہیں اور تعلق ہر ایک کا کوئی خاص مانا ہی نہ جائے [۳]۔

وَإِذْ نَادَى رَبُّكَ مُوسَىٰ أَنْ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۗ أَلَا

[۱] یعنی نہ مانے پر جلد عذاب نہیں بھیجتا (موضح القرآن)

[۲] العزيز ذو القدرة ينتقم من الكافرين الرحيم يرحم المؤمنين (جلالین)

[۳] العزيز ای القادر الذی لا يعجزو الغالب الذی لا يغلب الرحيم ای المنعم علی عباده بانواع النعيم (مجمع البيان)

يَتَّقُونَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ۝ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ  
لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَرُونَ ۝ وَلَهُمْ عَلَىٰ ذَنْبٍ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ۝ قَالَ  
كَلَّا ؕ فَادْهَبَا بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُونَ ۝ فَأَتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ  
رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَنْ أَرْسِلَ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝

”اور جب پکارا آپ کے پروردگار نے موسیٰ کو کہ جاؤ اس ظالم فرعون کی قوم کی طرف کہ وہ پرہیزگاری کیوں اختیار نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا پروردگار! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے اور میرا دم الجھتا ہے اور میری زبان میں روانی نہیں ہے تو ہارون کو بھی تو بھیج اور ان کا میرے خلاف ایک الزام ہے، تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں، کہا ہرگز نہیں۔ اچھا تم دونوں ہمارے مجزوں کے ساتھ جاؤ۔ تمہارے ساتھ سننے والے ہیں، تو جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس اور کہو کہ ہم تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف کے پیغمبر ہیں کہ تو ہمارے ساتھ نبی اسرا نیل کو روانہ کر دے۔“

آغاز تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام:

”ان کا میرے خلاف ایک الزام ہے، یعنی اس قبضی کے قتل کرنے کا جو ایک اسرائیلی سے لڑ رہا تھا اور جناب موسیٰ علیہ السلام نے اس اسرائیلی کی مدد کیلئے اسے گھونسا مارا جس سے اتفاقاً وہ مر گیا۔ اس واقعہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔“

قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ۝ وَفَعَلْتَ  
فَعَلَتِكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ۝ قَالَ فَعَلْتَهَا إِذَا وَأَنَا مِنَ  
الضَّالِّينَ ۝ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ  
الْمُرْسَلِينَ ۝ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝

”اس نے کہا کیا ہم نے تمہیں پالا نہیں بچپن میں اور تم نے ہم میں اپنی عمر کے کئی سال گزارے اور پھر وہ کارنامہ کیا جو تمہیں کرنا تھا اور تم ناشکر گزاروں میں ثابت ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے وہ کیا تھا اس وقت جب میں کھویا ہوا تھا تو میں بھاگا تم سے جب میں تم سے ڈرا۔ اس کے بعد میرے پروردگار نے مجھے علم عطا کیا اور مجھے پیغمبروں میں سے قرار دیا اور تم یہ احسان مجھ پر جتا رہے ہو جب کہ تم نے تمام بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔“

[۱] ای لہم علی دعویٰ ذنب (جمع البیان) یعنی قتل القبضی (تبیان)



## جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون سے گفتگو:

یہ کارنامہ جس کا اس گفتگو میں حوالہ ہے، وہی قبطی قتل کا ذکر خود جناب موسیٰ کی زبانی پہلے آچکا ہے اور اس کا تفصیلی تذکرہ سورہ قصص میں اس کے بعد آئے گا۔

اور یہ جو حضرت موسیٰ کے قول میں ہے اس وقت تک ”کھویا ہوا تھا“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک ربانی ہدایت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ جو بعثت کے بعد ہوتا ہے۔ [۱]

اور حقیقت امر یہ ہے کہ عصمت انبیاء تو ابتدائے عمر سے ہوتی ہے مگر احاطہ علمی میں بقیض ربانی ارتقاء ہوتا رہتا ہے اور ہر درجہ بالا کے لحاظ سے قبل کے درجہ کو یہ حضرات اپنے لئے ”گم شدگی“ کی لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط  
 إِنَّ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ  
 آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۶﴾ قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمْ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ  
 رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط إِنَّ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲۸﴾

”فرعون نے کہا یہ تمام جہانوں کا پروردگار کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا پروردگار اگر تم یقین کرو۔ اس نے اپنے اردگرد والوں سے کہا کہ تم سن نہیں رہے ہو؟ انہوں نے کہا سب کا پروردگار اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا بھی پروردگار۔ وہ کہنے لگا یہ تم لوگوں کا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضروری دیوانہ ہے انہوں نے کہا مشرق اور مغرب اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا پروردگار اگر تم عقل سے کام لو۔“

بہت دفعہ اس پر روشنی ڈالی جاتی رہی ہے کہ قرآن مجید نے واقعات کی وہ کڑیاں جنہیں انسان کا ذہن خود سمجھ سکتا ہے، چھوڑ دی ہیں۔ یہاں یہی صورت ہے۔

خالق کے ارشاد میں پہلے آچکا ہے کہ فرعون کے پاس جا کر کہو: انا رسول رب العالمین، ہم تمام جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر ہیں..... اب اس سے سننے والوں کو خود ہی سمجھ لینا چاہئے کہ وہ گئے اور انہوں نے فرعون سے یہی الفاظ کہے کہ انا رسول رب العالمین ”ہم رب العالمین کی طرف کے رسول ہیں“ اب فرعون کی جو گفتگو یہاں بیان ہوئی ہے، وہ اسی کے تعلق سے شروع ہوتی ہے کہ اس نے کہا: وما رب العالمین ”یہ رب العالمین، یعنی چہ؟“ اور اب اسی رب العالمین کی تشریح ہے جسے جناب موسیٰ علیہ السلام نے رب السموات والارض وما بینہما اور پھر ربکم اور رب ابائکم الاولین اور پھر رب المشرق والمغرب وما بینہما کے تعبیرات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

[۱] من الضالین عما آتانی اللہ بعد ما من العلم والزسالة (جلالین) اعلم یوح الی تحریم قتلہ (مجمع البیان)

پھر یہ انداز دیکھنے کا ہے کہ فرعون اُن کے حق آگئیں جملوں پر طرح طرح کی باتیں کر رہا ہے اور دل آزادی کے طریقے اختیار کر رہا ہے اور ہر بات پر آپ اُس کی کبی اور اپنی سنی ہوئی بات کو جیسے ان کبی اور اُن سنی قرار دے کر اپنی ہی پہلی بات کو تعبیر بدل کر پیش کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے مجمع سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ”سن رہے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔“؟ اور آپ جیسے اب پورے مجمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں، ”ہاں سنو! کیا کہہ رہا ہوں؟ یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ سب کا پروردگار ہے اور تمہارے باپ داداؤں کا بھی۔“ وہ ان کے قول اُنکا رسول رب العالمین کی بنا پر طنز یہ طور پر مجمع سے کہتا ہے کہ ”یہ تمہارا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ضرور دیوانہ ہے“ اور آپ فرمادیتے ہیں۔ ”ارے، وہ مشرق اور مغرب سب کا پروردگار ہے اگر تم عقل سے کام لو۔“

مجبوراً کا لفظ سننے کے ساتھ ان کنتہم تعقلون کی بلاغت دیکھیے، یہ گویا اشارہ ہے اس کی طرف کہ میں خیر، تم سب کو دیوانہ تو نہیں کہتا، اس لئے کہ واقعی دیوانے ہوتے تو مستوجب سزا ہی کب ہوتے مگر افسوس تم عاقل ہوتے ہوئے عقل سے کام نہیں لیتے یعنی تمہارے افعال و اعمال ضرور عاقلانہ ہیں جس پر تم کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ ہے انبیاء کا طریقہ دعوت حق میں کہ مخالفین کے طعن و تشنیع، بہتان و افتراء، سب کو سنو اور بات اپنی کہتے رہو اور اُس پر زور دیتے رہو، آخر میں جب تعصب و عناد کا جوش ختم ہوگا تو وہ تمہاری باتوں کو سننے اور اُن پر غور کرنے لگیں گے اور پھر بہت سی سعید روحمیں اُس پیغام کو قبول بھی کر لیں گی۔

ایک دوسرا تصور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون دونوں کی زبان پر جاری شدہ فقرات کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر ایک مسلسل حیثیت رکھتی تھی۔ جب فرعون نے کہا: وما رب العالمین تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پر زور انداز میں تابڑ توڑ یہ جملے کہے: رب السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مَا بَيْنَهُمَا ان كُنْتُمْ موقنین۔ ربکم ورب ابائکم الاولین، رب المشرق والمغرب وما بینہما ان کنتہم تعقلون۔ وہ آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار ہے اگر تم یقین کرو، وہ تمہارا پروردگار اور تمہارے آباؤ اجداد کا پروردگار ہے۔ وہ مشرق اور مغرب اور اُن کے درمیان کی تمام چیزوں کا پروردگار ہے اگر تم عقل سے کام لو۔ یہ زور دار تقریر ایک مسلسل باران حقیقت کی حیثیت رکھتی تھی اور فرعون یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں اس کا اثر اُس کے گرد و پیش کے لوگوں پر نہ ہو جائے۔ اس لئے وہ بیچ بیچ میں اپنی جماعت کو مخاطب کر کے برابر اُس کے اثر کو دور کرنے کی کوشش کے لئے وہ جملے بول رہا تھا۔<sup>[۱]</sup>

اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسے کسی تقریر کی ریکارڈنگ ہوتی ہے تو بیچ بیچ میں جو آوازیں ادھر ادھر کی آرہی ہوں، وہ بھی پردہ گوش سے ٹکراتی رہتی ہیں بس اُسی انداز میں قرآن مجید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کے دوران جہاں جہاں فرعون نے کوئی فقرہ کہا تھا، اسے بھی ہمارے سامعہ تک پہنچا دیا ہے۔

میرے نزدیک یہ تصور بھی قرآن مجید کے اُس معجزانہ معیار فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے، جس نے دنیا کو نئے پیرایوں سے روشناس کرایا ہے، بعید نہیں ہے۔

[۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک بات کہے جاتے تھے اللہ کی قدرتوں کا پتہ بتانے کی اور فرعون بیچ میں اپنے سرداروں کو ابھارتا تھا کہ ان کو یقین نہ آجائے (موضح القرآن)

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ﴿٢٩﴾ قَالَ أَوْلَوْ  
 جِئْتِكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ ﴿٣٠﴾ قَالَ فَأْتِ بِهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ﴿٣١﴾ فَأَلْفَىٰ عَصَاهُ  
 فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿٣٢﴾ وَنَزَعَ يَدَهُ فَادَاهَا بَيْضًا لِّلنّٰظِرِينَ ﴿٣٣﴾

”اس نے کہا اگر تم نے میرے سوا کوئی خدا بنایا تو میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا، انہوں نے کہا چاہے میں تمہارے  
 سامنے کھلی ہوئی چیز پیش کر دوں۔ کہا لاؤ اُسے اگر تم سچے ہو اس پر پھینک دیا انہوں نے اپنا عصا تو ایک دم وہ کھلا  
 ہوا اڑ رہا ہو گیا اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لئے چمکتا ہوا ظاہر ہوا۔“

جب فرعون جناب موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا کوئی توڑ نہ کر سکا تو یہ عاجزی کا مظاہرہ تھا کہ وہ اپنے سطوت و اقتدار شاہی سے انہیں ڈرانے  
 لگا [۱] مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے بالکل ڈرے نہیں بلکہ اس کی اُس دھمکی کو نامعقول ثابت کرنے کے لئے کہا کہ میں اگر کوئی معجزہ تمہارے  
 سامنے پیش کر دوں تب بھی مجھے قید خانے میں ڈال دو گے؟ اس کے جواب میں وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ ہاں اگر معجزہ بھی تم نے پیش کر دیا تو بھی ایسا  
 کروں گا اس کا طنز شاہی اس سوال سے دھیما ہو گیا، اور اب وہ بحسب اذعائے خود جو خدائے وقت تھا، تذبذب کا شکار ہو گیا، جو اُس کی ان  
 الفاظ سے ظاہر ہے کہ اگر تم سچے ہو تو جو کہتے ہو، وہ پیش کرو، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم سچے ثابت ہوئے تو مجھے ماننا ہی پڑے گا، اب اگر معجزہ  
 دکھانے کے بعد وہ نہ مانے جیسا کہ اس نے نہیں مانا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے ضمیر کی عدالت کے فیصلہ کے مطابق مجرم ہے۔

قَالَ لِلْمَلَآئِكَةِ إِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِّنْ أَرْضِكُمْ  
 بِسِحْرِهِ ۗ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ﴿٣٥﴾ قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأَبْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حٰشِرِينَ ﴿٣٦﴾  
 يَا تٰوَكُّ بِكُلِّ سِحْرٍ عَلِيمٍ ﴿٣٧﴾

”اُس نے اُن عمائد سے جو اس کے ارد گرد تھے کہا کہ بلاشبہ یہ ایک بڑا ماہر جادوگر ہے جو چاہتا ہے کہ اپنے جادو  
 سے تمہاری اس سرزمین سے تمہیں باہر نکالے تو تم مجھے کیا رائے دیتے ہو؟ انہوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو  
 روک رکھیے اور تمام شہروں میں آدمی بھیجے جمع کرنے والے جو ہر ماہر بڑے جادوگر کو آپ کے پاس حاضر کریں۔“

”تمہیں اس زمین سے باہر نکالے“ اس کے مخاطب بنی اسرائیل بھی ہو سکتے ہیں کہ اُس ازارہ سیاست اُن کا ہمدرد بن کر یہاں تم اپنے  
 گھر بار میں چین سے بیٹھے ہو، یہ شخص چاہتا ہے کہ تمہیں اس دیس سے نکال کر بے گھر اور بے در بنادے اور یہ بھی امکان ہے کہ اس کے مخاطب اُسی  
 کی قوم کے افراد ہوں اور مطلب یہ ہو کہ وہ تم پر غلبہ حاصل کر کے بحیرہ و قہر تمہیں اس بستی سے نکال باہر کرے گا۔ [۲]

[۱] الْمَلَآئِكَةُ عَلَىٰ فِرْعَوْنَ الْاِجْتِمَاعِ مِنْ مُوسَىٰ تَهْدِدهُ (تبیان)

[۲] یجتمل ان یکون اراد یخْرِجْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ وَیَتَعَلَّبَ عَلَیْکُمْ (تبیان)

علامہ طبری نے اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

فَجَمَعَ السَّحَرَةَ لِيَقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ<sup>(۳۸)</sup> وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنْتُمْ مُجْتَبِعُونَ<sup>(۳۹)</sup>  
لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِنْ كَانُوا هُمْ الْغَالِبِينَ<sup>(۴۰)</sup> فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا  
لِفِرْعَوْنَ أَيْنَ لَنَا أَجْرٌ إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ<sup>(۴۱)</sup> قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذَا لَبِئْتُمُ  
الْمُقَرَّبِينَ<sup>(۴۲)</sup>

”چنانچہ وہ تمام جادوگر جمع کیے گئے ایک مقرر شدہ دن کو اور عوام الناس سے کہا گیا ہے کہ چاہو تو تم سب بھی جمع ہو جاؤ، اُمید ہے کہ ہم سب جادوگروں کی پیروی کریں اگر وہ غلبہ حاصل کریں تو جب وہ جادوگر آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا کہ اگر ہم غالب آئے تو کیا ہمارے لئے کوئی خاص صلہ ہوگا؟ اس نے کہا ہاں ضرور، اس وقت میں تم مقربین بارگاہ میں شامل کیے جاؤ گے۔“

ساحروں سے مقابلہ:

ان آیات سے جناب موسیٰ عليه السلام کا ساحروں سے مقابلہ کا آغاز ہوتا ہے۔

قَالَ لَهُمْ مُوسَى الْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ<sup>(۴۳)</sup> فَالْقُوا جِبَالَهُمْ وَعَصِيَّهُمْ وَقَالُوا  
بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ<sup>(۴۴)</sup> فَأَلْفَى مُوسَى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا  
يَأْفِكُونَ<sup>(۴۵)</sup> فَالْقَى السَّحَرَةَ لَسْجِدِينَ<sup>(۴۶)</sup> قَالُوا أَمَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ<sup>(۴۷)</sup> رَبِّ مُوسَى  
وَهَارُونَ<sup>(۴۸)</sup>

”موسیٰ نے ان سے کہا کہ پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو، چنانچہ انہوں نے اپنی رسیاں اور اپنی لکڑیاں پھینکیں اور کہا فرعون کے اقبال کی قسم یقیناً ہم غالب آنے والے ہیں، اس پر موسیٰ نے اپنا عصا پھینک دیا تو وہ ایک دم نکلنے لگا اُسے جو وہ جھوٹ بنا رہے تھے تو تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم اس رب عالمین پر جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے ایمان لائے۔“

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر جو الفاظ ہیں، وہ پتہ دیتے ہیں کہ ساحران فرعون کے جادو کی نوعیت اُس سحر کی نہ تھی جس سے کسی شے کی واقعی صورت تبدیل ہو جاتی ہے بلکہ اس کی نوعیت اُس جادو کی تھی جس سے دیکھنے والوں کا حاسہ متاثر ہوتا ہے جس کو ”شعبدہ بازی“ اور ہماری

[۱] من ارضكم ودياركم ويتغلب عليها بسحره (مجمع البيان)

زبان میں ”ڈھٹ بندی“ کہتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى ﴿٥٦﴾ اُن کے جادو سے تصور ایسا ہوتا تھا جیسے وہ رسیاں دوڑ رہی ہیں (سورہ طہ)

یہاں یہ ہے کہ:

تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ

عصائے موسیٰ لگنے لگا اُسے جو انہوں نے جھوٹ بنا یا تھا۔ یہ الفاظ بھی کچھ ایسا ہی پتہ دیتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

علامہ کنٹوری جناب سید غلام حسین اعلیٰ اللہ مقامہ نے اپنی سوانح عمری میں ایک جگہ مسمریزم کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے استاد جناب ممتاز العلماء سید نفی صاحب قبلہ اس کے حرام ہونے پر مصر تھے اور فرماتے تھے کہ یہ جادو ہے، علامہ کنٹوری لکھتے ہیں کہ میں اس وقت تو گفتگو میں قائل نہیں ہوا مگر بعد میں ایک حدیث میری نظر سے گزری ایسی جس سے میری سمجھ میں آیا کہ ساحرانِ فرعون کا جادو اسی مسمریزم کی جنس سے تھا۔

قَالَ آمَنْتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۗ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۗ

فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۗ لَا قَطْعَانَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَا وَصْلَبَتَّكُمْ

أَجْمَعِينَ ﴿٥٩﴾ قَالُوا لَا ضَيْرَ ۗ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ﴿٦٠﴾ إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا

خَطِيئَتَنَا أَنْ كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦١﴾

”فرعون نے کہا تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں، یقیناً وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو جادو سکھا یا ہے، اب بہت جلد تمہیں معلوم ہوگا میں ضرور ضرور تمہارے ہاتھ اور پیر مختلف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور تم کو سولی دلوادوں گا۔ انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں، یقیناً ہم پلٹ کر اپنے پروردگار کے پاس جائیں گے ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار غلطیوں کو معاف کر دے گا اس لئے کہ ہم سب سے پہلے ایمان لارہے ہیں۔“

”وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھا یا ہے“ بظاہر تو یہ ضمیر خود حضرت موسیٰ کی طرف راجع ہے، یعنی تم نے موسیٰ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اتنی جلدی ہار مان لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جادوگری کے فن میں تمہارا استاد یہی ہے<sup>[۲]</sup> مگر شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”تمہارا بڑا کہا رب کو یعنی موسیٰ اور تم ایک استاد کے شاگرد ہو“ (موضح القرآن)

اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔

اُن کا کہنا کہ ”ہم سب سے پہلے ایمان لارہے ہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کو تسلیم کرنے والے اس وقت سب سے پہلے ہم ہیں۔“<sup>[۳]</sup> اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کچھ لوگ اسی وقت ایمان لاکچکے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی سرزمین مصر سے مدین کی

[۱] ای ان العصا تناول جمعی ماموہواہ (مجمع البیان)

[۲] ای استاذ کم وعالمکم (مجمع البیان)

[۳] اول المؤمنین فی زماننا (جلالین)

طرف گئے نہیں تھے اور مومن آل فرعون کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، اس لئے ساحر لوگ اب ایمان لائے تو وہ سب سے پہلے ایمان لانے والے تو نہیں ہوں گے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ساحر سب تو باہر دور دور سے آئے ہوئے تھے۔ انہیں تو پہلے کے حالات اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے واقعات معلوم نہ تھے، وہ یہی سمجھے کہ اب ہم جو ایمان لا رہے ہیں تو ہم سب سے پہلے جناب موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت پر ایمان لانے والے ہیں۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي إِلَيْكُمْ مُتَّبِعُونَ ﴿٥٢﴾ فَأَرْسَلْنَا فِرْعَوْنَ فِي  
الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ﴿٥٣﴾ إِنَّ هَؤُلَاءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ ﴿٥٤﴾ وَإِنَّهُمْ لَنَا لَغَائِظُونَ ﴿٥٥﴾  
وَإِنَّا لَجَمِيعٌ حٰذِرُونَ ﴿٥٦﴾

”اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو لے کر رات کے وقت چل کھڑے ہو یقیناً تمہارا پیچھا کیا جائیگا، تو فرعون نے تمام شہروں میں جمع کرنے والے بھیجے کہ یہ ایک چھوٹی سی ٹکڑی ہے اور بے شک ان لوگوں نے ہمیں غصہ دلا یا اور بے شک ہم پوری طرح چوکنا ہیں۔“

تمہارا پیچھا کیا جائے گا“ یہ پس منظر بتانا ہے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے غرق ہونے کا کہ وہ تمہارا تعاقب کریں گے اور اس طرح دریا تک پہنچ کے غرق ہوں گے۔<sup>[۱]</sup>

”جمع کرنے والے بھیجے“ یعنی فوج و لشکر فراہم کرنے والے، حاذرون جس کا ترجمہ ہم نے ”چوکنا“ کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پوری طرح ان لوگوں کے تدارک کیلئے آمادہ اور تیار ہیں۔<sup>[۲]</sup>

فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِّنْ جَنَّتٍ وَعَيْوُنٍ ﴿٥٧﴾ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ﴿٥٨﴾ كَذٰلِكَ ۙ  
وَآوَرَّثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿٥٩﴾

”تو ہم نے ان کو نکالا باغوں اور چشموں اور خزانوں اور اچھے اچھے مکانوں سے اور ان سب چیزوں کا ورثہ دار بنی اسرائیل کو بنایا۔“

یعنی بنی اسرائیل کے تعاقب کے لئے وہ اپنے باغوں اور چشموں وغیرہ کو چھوڑ کر روانہ ہوئے تو پھر واپس آنا نصیب نہ ہوا اور بنی اسرائیل ان چیزوں کے وارث ہوئے یعنی ان کے فنا ہونے کے بعد یہ باقی رہے اور پھر انہیں ویسا ہی جاہ و اقتدار و مال نعمت حاصل ہوا۔ نہ یہ کہ وہی مصر کے باغات وغیرہ انہیں مل گئے، اس لئے کہ یہ فلسطین کی سرزمین کی طرف روانہ ہوئے مگر چونکہ ظاہر الفاظ قرآن یہی ہے کہ وہی تمام چیزیں، جو فرعون کی قوم والے چھوڑ گئے تھے، بنی اسرائیل کو مل گئیں، اس لئے بعض مفسرین نے یہ کہا کہ یہ چیزیں انہیں حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے دور میں

[۱] يَتَّبِعُكُمْ فِرْعَوْنُ، وَجُنُودُهُ فَيَلْحِقُونَ دَرَاءَ كَمِ الْبَحْرِ فَاَنْجَاكُمْ وَاغْرَقَهُمْ (جلالین)

[۲] اِيْ ذُوْا اِدَاةٍ مُّسْتَعِدُوْنَ (مجمع البيان)

میں اور بعض نے کہا ہے کہ فرعون وغیرہ کے غرق ہونے کے بعد پھر بنی اسرائیل مصر کی طرف واپس ہوئے علامہ طبری نے تہم و جزم کے انداز میں اسی کو لکھا ہے [۱] مگر قرآن مجید میں تہ و غیرہ کا تذکرہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں کی اسی صحرا انوردی کے عالم میں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ اس لئے یہ قول درست معلوم نہیں ہوتا۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جو عام اصول فطرت و عادت کے مطابق ہے کہ جماعت بنی اسرائیل کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلنے کے ساتھ پس افتادہ یا معذور یا ایسے افراد جو ہم خیال نہ ہوں، ہجرت نہ کر سکے ہوں یا ارادۂ انہوں نے ہجرت نہ کی ہو، مصر میں رہ گئے ہوں۔ اب فرعون اور اس کی قوم کے غرق ہونے کے بعد وہ ان کی جائدادوں پر قابض ہو گئے ہوں یا یہ کہ جب بنی اسرائیل نے جو جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تھے، یہ دیکھا کہ فرعون والے لوگ غرق ہو گئے تو ان میں سے ایک گروہ مصر واپس ہو گیا ہو اور ایک گروہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فلسطین کی طرف روانہ ہوا ہو جس کے واقعات قرآن مجید میں دوسری جگہوں پر مذکور ہیں۔

فَاتَّبَعُوهُمْ مُشْرِقِينَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَاءَ الْجَمْعُ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمَدْرَكُونَ ﴿٦١﴾  
 قَالَ كَلَّا ۗ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾ فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ  
 الْبَحْرَ ۖ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾ وَأَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخِرِينَ ﴿٦٤﴾  
 وَأَنْجَيْنَا مُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ أَجْمَعِينَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخِرِينَ ﴿٦٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ  
 لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٦٨﴾

”تو ان لوگوں نے صبح ہوتے ہی ان کا پیچھا کیا تو جب دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو دکھائی دینے لگیں تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا کہ یقیناً ہم پکڑ لئے جائیں گے (موسیٰ نے کہا) کہ یقیناً میرے ساتھ پروردگار ہے جو مجھے صحیح راستہ بتائے گا تو ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو چنانچہ وہ شگافہ ہو گیا تو ہر حصہ مثل پہاڑ کے کھڑا ہو گیا اور نزدیک لائے ہم وہاں دوسری جماعت کو اور موسیٰ اور ان کے ساتھ والی پوری جماعت کو ہم نے نجات دے دی، پھر ہم نے غرق کر دیا دوسروں کو، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے اور ان میں سے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بلاشبہ تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی“۔

**دریا میں شگاف، موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون کی معہ افواج غرقابی:**

اب قرآن مجید کے اتنے تفصیلی بیان بلکہ الفاظ میں مکمل تصویر کشی کے بعد کہ عصا کے مارنے سے دریا یا ایسا شگافہ ہوا کہ ہر حصہ مثل بڑے پہاڑ کے کھڑا ہو گیا اور اسے بڑی نشانی یعنی معجزہ کہنے کے بعد بھی ماضی قریب یا حال کا بخیاں خود روشن خیال طبقہ یہ کہے کہ یہ کوئی غیر فطری بات نہ تھی

[۱] ان الله سبحانه رذبني اسرا ئيل الى مصر بعد ما اغرق فرعون وقومه واعطاهم جميع ما كان لفرعون وقومه من الاموال القفار المساكين والديار (مجمع البيان)

بلکہ مدوجز کا طبعی کرشمہ تھا جو ہوا کرتا ہے تو کیا یہ طبقہ بھی انہی میں سے نہیں جن کے لئے قرآن مجید نے کہہ دیا تھا کہ ”ان میں سے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں“؟

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ۖ قَالُوا نَعْبُدُ  
 أَصْنَامًا فَنَنْظِلُّ لَهَا عُكْفِينَ ۖ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۖ أَوْ  
 يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۖ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَلِكَ يَفْعَلُونَ ۖ قَالَ  
 أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۖ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ الْأَقْدَمُونَ ۖ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي  
 إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ ۖ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ۖ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي  
 وَيَسْقِينِ ۖ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۖ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۖ وَالَّذِي  
 أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ۖ

”اور پیش کیجئے ان کے سامنے ابراہیم کا واقعہ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کس کی تم پوجا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم پوجتے ہیں مورتیوں کو اور اسی پر استقلال کے ساتھ قائم ہیں، کہا کہ یہ تم لوگوں کی سنتے ہیں جب تم پکارتے ہو فائدہ بخشتے ہیں یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انہوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایسا ہی کرتے پایا ہے کہا تو کیا تم نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ تم اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی جسے پوجتے ہیں، وہ ہے کیا؟ بہر حال یہ سب میرے دشمن ہی کی حیثیت رکھتے ہیں سوا تمام عالمین کے اس پروردگار کے جس نے مجھے پیدا کیا، اس کے بعد وہی مجھے راستہ بتاتا ہے اور وہ مجھے غذا دیتا ہے اور پینے کے لئے پانی دیتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے صحت دیتا ہے اور جو مجھے بے جان کرے گا اور پھر جان عطا کرے گا اور جس سے مجھے امید ہے کہ وہ جزاؤں سزا کے دن جو میری غلطی ہو، اسے معاف کرے گا۔“

**حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اور اپنی قوم سے گفتگو:**

اس سے نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ انبیاء و مرسلین سے غلطیاں ہوتی ہیں بلکہ یہ احساس عظمت الہی ہے کہ معصوم ہونے کے باوجود اس کی بارگاہ میں اپنے کو غلطیوں سے بالاتر نہیں سمجھتے۔

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۖ وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي  
 الْآخِرِينَ ۖ وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۖ وَاعْفُرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ



الضَّالِّينَ ﴿٣٧﴾ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿٣٨﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا مَنْ

آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٤٠﴾

”اے میرے پروردگار! مجھے علم و حکمت عطا فرما اور مجھے نیوکاروں میں شامل فرما اور میرے لئے سچائی کی زبان آئندہ نسلوں میں قرار دے اور مجھے بہشت کے حقداروں میں محسوب فرما اور میرے باپ کو بخشش دے، بلاشبہ وہ گمراہوں میں تھا اور مجھے رسوا نہ کر اس دن جب سب اٹھائیں جائیں گے، جس دن نہ مال فائدہ دے گا اور نہ اولاد سو اس کے جو اللہ کی بارگاہ میں سالم دل کے ساتھ حاضر ہو“۔

### خالق سے مناجات:

یہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی مناجات میں اپنے پروردگار میں اپنے چچا کیلئے جسے وہ باپ کہتے تھے جو دعا ہے، اس کا پس منظر اور اس پر تبصرہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے، ایک جگہ ان کا اپنے اس بزرگ سے اثنائے گفتگو میں یہ کہنا ہے کہ سوف استغفر لک ربی مطلب یہ ہے کہ تم میرا کہنا چاہے نہ مانو مگر میں اپنے پروردگار سے تمہاری بخشش کیلئے دعا کروں گا، وہ پس منظر ہے اور اس کی بنا پر مناجات کے ذیل میں یہ دعائے مغفرت ہے اور تیسری جگہ مشرکین و مشرکات کے لئے دعائے مغفرت کی ممانعت کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت کی توجیہ ہے کہ:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاٰبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدٰهَا اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ اَنَّهُ عَدُوٌّ لِلّٰهِ تَبَيَّرَ

مِنْهُ ۗ (توبہ - ۱۱۳)

ابراہیم علیہ السلام کا دعائے مغفرت کرنا اپنے باپ کے لئے صرف ایک وعدہ کی وجہ سے تھا جو انھوں نے اس سے کیا تھا تو جب یہ بالکل صاف معلوم ہوا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اُس سے بے تعلقی اختیار کر لی۔

”سچائی کی زبان میرے لئے قرار دے آئندہ نسلوں میں“ اس کے یہ معنی بھی سمجھے گئے ہیں کہ میرے لئے سچی نیک نامی قرار دے یعنی حق بجانب طور پر میرا ذکر خیر باقی رہے چنانچہ دنیا کے تین بڑے مذاہب جو تقریباً تمام عالم پر چھائے ہوئے ہیں یعنی یہود، عیسائی اور مسلمان سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جلالت قدر پر متفق ہیں۔<sup>[۱]</sup>

اور یہ بھی کہ میری نسل میں ایک سچا دعوت حق دینے والا پیدا کر<sup>[۲]</sup> اب چونکہ اس دعا کی قبولیت کا اعلان دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے کہ وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۱۰﴾ (سورہ مریم) جس میں ہم کی ضمیر جو جمع مذکر کو ظاہر کرتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کی اولاد اسحاق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کی طرف پھیر دی گئی ہے اور اس میں ”لسان صدق“ کے ساتھ ”علیاً“ کا لفظ ہے جس کے وصفی معنی تو بلند کے ہیں مگر

[۱] ثناء حسنا (جلالین) پدید آوری برای من ذکر نیک در پسیناں (شاہ ولی اللہ) لان اليهود یقرّون ببوتہ و كذلك النصارى وسائر الامم۔ (تبیان)

[۲] وقيل ان معناه: واجعل لي ولد صدق في الآخر الامم يدعوا الى الله ويقوم بالحق وهو محمد ﷺ (مجمع البيان)

نام کی حیثیت سے وہ ایک شخصیت کی طرف ذہن کو موڑتی ہے لہذا کوئی قابل انکار بات نہیں ہے کہ اس لسان صدق کا مصداق آخری رسول کے اُس سب سے پہلے تصدیق کرنے والے کو سمجھا جائے جس نے آخری رسول کی تصدیق کے ضمن میں پورے سلسلہ انبیاء کی جو اس سے پہلے تھا مکمل ترین عملی تصدیق کردی اور وہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ذات گرامی ہے جسے خالق نے پیغمبر کے ساتھ ”شاہد“ ہونے کے لئے پیدا ہی کیا تھا اَمَّا جَنَّ كَانَ عَلَى بَيْتِنَا مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُو مَا شَهِدْنَا مِنْهُ (سورہ ہود ۱۷۱)۔ ممکن ہے یہی شاہد رسالت وہ لسان صدق ہو جو علی علیہ السلام ہے اور جس کے آنے سے دعائے ابراہیمی کی استجابت پایہ تکمیل کو پہنچی۔

وَأَزَلَّتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٩٤﴾ وَبُورَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ ﴿٩٥﴾ وَقِيلَ لَهُمْ آيِنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٩٦﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ هَلْ يَنْصُرُونَكُمْ أَوْ يَنْتَصِرُونَ ﴿٩٧﴾ فَكَبَّكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ ﴿٩٨﴾ وَجُنُودُ ابْلِيسَ أَجْمَعُونَ ﴿٩٩﴾ قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَخْتَصِمُونَ ﴿١٠٠﴾ تَاللَّهِ إِنْ كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿١٠١﴾ إِذْ نَسَوْنَكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٢﴾ وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمَجْرُمُونَ ﴿١٠٣﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ﴿١٠٥﴾ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٦﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ط وَمَا كَانَ أَكْثَرَهُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٠٧﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٨﴾

”اور بہشت قریب لایا جائے گا پر ہیزگاروں کے اور دوزخ سامنے لایا جائے گا گمراہوں کے اور ان سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے تھے۔ کہا وہ تمہاری مدد کرتے ہیں یا خود مدد حاصل کرتے ہیں تو اوندھے منہ ڈال دیے گئے اس (دوزخ) میں وہ اور تمام گمراہ لوگ اور شیطان کی انواع سب کے سب۔ کہا انہوں نے جب کہ اُن میں آپس میں جھگڑا ہو رہا تھا کہ خدا کی قسم ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جب تمہیں پروردگار عالمیوں کے برابر قرار دیتے تھے اور ہمیں نہیں گمراہ کیا مگر نابکاروں نے تو اب نہیں ہیں ہمارے لئے کوئی سفارشی اور نہ کوئی مہربان دوست تو کاش ہم دوبارہ بھیجے جاتے تو ایمان لانے والوں میں ہوتے، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے اور اُن میں کے زیادہ لوگ مومن نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے بڑا مہربان بھی۔“

كَذَّابَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٩﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١١٠﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١١١﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرَهُ ﴿١١٢﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ ۖ إِنِ اجْرِي إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١١٣﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرَهُ ﴿١١٤﴾

”نوحؑ کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب ان سے اُن کے بھائی نوحؑ نے کہا کیوں تم پر ہیزگاری اختیار نہیں کرتے؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ نہیں ہے کسی پر سوا پروردگار عالمیان کے تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا سنو۔“

### حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

”نوح علیہ السلام کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔“ اس طرح کی آیات جناب نوح علیہ السلام اور جناب ہود علیہ السلام وغیرہ کی قوموں کے لئے کئی جگہ قرآن مجید میں ہیں اور جیسا کہ وہاں بھی لکھا گیا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس قوم کے پاس جناب نوح علیہ السلام کے علاوہ اور بھی انبیاء آئے ہوں، اسی طرح قوم ہود علیہ السلام کے پاس جناب ہود علیہ السلام کے علاوہ بھی دوسرے پیغمبر آئے ہوں جن کے نام ہمیں معلوم نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جناب نوح علیہ السلام یا ہود علیہ السلام وغیرہ ہی کی تکذیب کو تمام پیغمبروں کی تکذیب قرار دیا ہو اس لئے کہ پیغام تمام پیغمبروں کا ایک ہے تو جس نے اس کی تکذیب کی اس نے سب کی تکذیب کی [۱] حدیث معصومہ اس پہلے تصور کی موید ہے۔ [۲]

قَالُوا أَنْتُمْ مِنْ لَدُنِّكَ وَأَتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ۗ قَالَ وَمَا عَلِمْتُمْ مِمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۗ  
 إِنَّ حِسَابَهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ۗ وَمَا أَنَا بِظَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۗ إِنْ أَنَا إِلَّا  
 نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۗ

”انہوں نے کہا کیا ہم تم پر ایمان لائیں اس صورت حال میں کہ تمہاری پیروی کی ہے نہایت پست طبقہ کے لوگوں نے، کہا تو جو کردار انہوں نے اختیار کیا، اسے میں کیا جانوں؟ ان کا حساب کتاب سوا اللہ کے کسی پر نہیں، اگر تم شعور سے کام لو اور میں ایمان لانے والوں کو پاس سے بھگا دینے والا تو نہیں ہوں سوا صاف صاف عذاب الہی سے ڈرا دینے والے کے۔“

### قوم کا جواب اور گفتگو:

ایک نبی یا رسول کا کام پیغام حق کا پہنچانا ہے، قبول کرنا یا نہ کرنا دوسروں کا کام ہے، اب کون لوگ قبول کرتے ہیں اور کون قبول نہیں کرتے ہیں، اسکی ذمہ داری اُس رسول پر کیا ہو سکتی ہے؟ اگر امراء ایمان نہیں لائے اور غرباء ایمان لے آئے تو اسے وہ رہنما کیا کرے؟ وہ کیا ان غریبوں کو جو ایمان لائے ہیں یہ کہہ کر بھگا دے کہ جاؤ تم تو پست طبقہ کے اشخاص ہو، تمہارا ایمان لانا میرے مشن کو نقصان پہنچائے گا۔ ایک مصلح ربانی اور حجت الہی کی یہ شان نہیں ہو سکتی۔

جناب نوح علیہ السلام کا جواب: وما علمي مما كانوا يعملون. اس کا ایک ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے کیا خبر وہ کیا کام کرتے رہے ہیں: اس

[۱] اَتَمَّا كَذَّبُوهُمْ جَمِيعًا لَا يَتَّبِعُهُمْ كَذَّبُوا اَكْلًا مِنْ دَعَا اِلَىٰ تَوْحِيدِ اللّٰهِ (تبیان)

[۲] قَالَ اَبُو جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَعْنِي بِالْمُرْسَلِيْنَ نُوْحًا وَّالْاَنْبِيَاءَ الَّذِيْنَ كَانُوْا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَدَمَ (مجمع البيان)

سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ اُن لوگوں نے جو کہا تھا **وَاتَّبَعَكَ الْإِرْدَلُونَ**، ”تمہاری پیروی کی ہے پست طبقہ کے لوگوں نے“ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ بہت رذیل پیشے کرتے رہے ہیں، کپڑا بنانا، کوڑا صاف کرنا، جوتیاں ٹانگنا وغیرہ۔ یہ وہی ذہنیت ہے کہ پیشے کی پستی سے آدمی نچ ذات کا ہو جاتا ہے جو ہمارے ہندوستان میں اونچی اور نیچی جاتیوں کی صورت میں اب تک قائم ہے۔ جناب نوح علیہ السلام نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ مجھے اس سے کیا مطلب کہ وہ کیا پیشہ پہلے کرتے رہے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

مجھے تو دعوت حق دینے سے مطلب ہے جو پہلے اسے قبول کرے گا وہ مومنین کی جماعت میں شامل ہو جائے گا، میں اُنہیں اپنے پاس سے ان کے پیشوں کی وجہ سے بھگانہ نہیں سکتا۔

**قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنْتَهَ يَنُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ۝۱۳۷ قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ۝۱۳۸ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَنْ مَعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝۱۳۹ فَانجَيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلِكِ الْمَشْحُونِ ۝۱۴۰ ثُمَّ اغْرَقْنَا الْبَاقِينَ ۝۱۴۱ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۝۱۴۲ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝۱۴۳ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝۱۴۴**

”ان لوگوں نے کہا اگر تم اے نوح! باز نہ آئے تو تمہیں سگسار کر دیا جائے گا، انہوں نے کہا اے میرے پروردگار! میری قوم والوں نے مجھے جھٹلایا ہے، اب تو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے اور مجھے اور انہیں جو میرے ساتھ ایمان لائے ہیں، نجات عطا فرما چنانچہ ہم نے انہیں اور جو اُس بھری ہوئی کشتی میں ان کے ساتھ تھے نجات دے دی، پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے، پھر بھی اُن میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔“

### انجام کار:

ان آیات میں قوم نوح کی نافرمانی اور ہٹ دھرمی کے نتیجے میں ان کے انجام کار کو بیان کیا گیا ہے۔

**كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِينَ ۝۱۴۵ إِذْ قَالَ لَهُمُ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝۱۴۶ إِنْ لَكُمْ رِسُولٌ أَمِينٌ ۝۱۴۷ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۱۴۸ أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيحٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝۱۴۹ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۝۱۵۰ وَإِذَا بَطِشْتُمْ بَطِشْتُمْ جَبَّارِينَ ۝۱۵۱ فَاتَّقُوا اللَّهَ**

[۱] ای ما اعلم اعمالهم وصنایعهم ولم اكلف ذلك (تبیان)

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالَّذِي آمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ ﴿١٣٢﴾ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ﴿١٣٣﴾

وَجَنَّتِ وَعُيُونٌ ﴿١٣٤﴾ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٣٥﴾

”قبیلہ عادی نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب اُن سے اُن کے بھائی ہود نے کہا کہ کیوں تم پر ہیزگاری اختیار نہیں کرتے؟ میں تمہارے لئے پیغمبر ہوں امانت دار تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ کسی پر نہیں ہے سوا پروردگار عالمیان کے یا تم بے کار ہر بلندی پر کوئی نہ کوئی یادگار تعمیر کرتے ہو اور بڑے بڑے محل تعمیر کرتے ہو، شاید کہ تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور جب حملہ آور ہوتے ہو تو ظالمانہ طور پر حملہ کرتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور ڈرو اُس سے جس نے تمہیں نوازا اُن چیزوں کے ساتھ جنہیں تم جانتے ہو، تمہیں موشیوں اور اولاد اور باغوں اور چشموں کے ساتھ نوازا، اب مجھے تمہارے لئے بہت بڑے (ہولناک) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔“

حضرت ہود علیہ السلام کا موعظہ و تبلیغ:

اس پورے انبیاء کے تذکرہ میں جو ایک مسلسل حیثیت رکھتا ہے اور جس کی ساخت پتہ دے رہی ہے کہ وہ مقام تنزیل میں ایک ساتھ ایسے ہی تسلسل کے ساتھ اُترا ہے، خاص طور پر دیکھنے کی بات بنیادی حیثیت سے تمام انبیاء کے پیغام کی وحدت ہے، جن الفاظ سے تبلیغ کا آغاز نوح علیہ السلام کرتے ہیں، انہی الفاظ سے ہود علیہ السلام کرتے ہیں، انہی الفاظ سے صالح علیہ السلام کرتے ہیں اور وہی پیغام ہے جو اب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں۔

اُس بنیادی پیغام کے بعد جو توحید اور نئی شرک کا ہے، پھر ہر نبی کی قوم خصوصی طور پر جن عملی جرائم میں مبتلا ہے، اس کے خلاف ہدایت و تلقین ہوتی ہے، اس میں ہر ایک کی دعوت میں کبھی ہوئی باتیں حسب ضرورت جدا جدا ہیں لیکن جو دعوت رسالت کا سنگ بنیاد اور اصل اصول ہے، وہ سب میں ایک ہی ہے، اس میں ذرہ بھر اختلاف نہیں ہے۔

”بے کار ہر بلندی پر کوئی نہ کوئی یادگار تعمیر کرتے ہو“ جیسے آج کل بھی اونچے اونچے مینار رائج ہیں جو سکونت وغیرہ کے کسی کام میں نہیں آتے، بس صرف نام کے لئے ہوتے ہیں، ایسے ہی شاید وہ لوگ کثرت سے بناتے تھے جیسا کہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”اُن لوگوں کو بڑا شوق تھا اونچے مضبوط منارے بنانے کا جن سے کچھ کام نہ نکلے“ (موضح القرآن)

علامہ طبری فرماتے ہیں:

ای بناء لا نحتاجون اليه لسكننا كمر واثما تريدون والبعث بذلك واللعب واللهو (مجمع البيان)  
یعنی ایسی عمارت جس کی تمہیں اپنی سکونت کے لئے کوئی ضرورت نہیں ہے بس تمہارے پیش نظر صرف بے کار کا خرچ اور دل چسپی و تفریح ہے۔

اس کے ساتھ اس ذیل میں اُنہوں نے ایک حدیث درج کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے مکان مسکونہ میں بھی صرف شان و شوکت

یا حسن وجمال کی خاطر ایسے اجزاء بنوانا جن کا ضروریات سکونت میں کوئی دخل نہیں ہے، یہ بھی خالق کے منشا کے خلاف ہے۔ یہ انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ گھر سے برآمد ہوئے تو ایک اونچا گنبد دیکھا، آپ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ اصحاب میں سے کسی نے کہا یہ فلاں انصاری کا مکان ہے، آپ خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر میں وہ انصاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجمع کو سلام کیا، اوروں نے جواب دیا مگر حضرت نے بے رنجی اختیار فرمائی۔ انہوں نے آپ کے چہرہ سے ناگواری کے آثار محسوس کیے اور انہیں فکر ہوئی، دوسرے اصحاب سے اس کا ذکر کیا، انہوں نے بتایا کہ حضرت نے تمہارا یہ اونچا گنبد دیکھا تھا اور پوچھا تھا کہ کس کا ہے؟ تو ہم نے تمہارا نام لیا، یہ سن کر وہ انصاری صحابی گئے اور انہوں نے گنبد اپنا منہدم کر دیا، جب حضرت پھر ادھر سے گزرے تو وہ گنبد نظر نہ آیا تو فرمایا وہ گنبد کیا ہوا جو یہاں تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ سرکار کی ناگواری محسوس کر کے انہوں نے اُسے منہدم کر دیا۔

حضرت نے فرمایا: ان لکل بناء یبني وبالاعلیٰ صاحبہ یوم القیة الا مالا بدمنہ  
ہر عمارت جو تعمیر کی جائے اپنے بنوانے والے کے لئے وبال جان ہوگی سو اتنے کے جو ضروریات زندگی میں ہو۔  
اس حدیث سے صرف ضعف سند کی بنا پر مقرر تلاش کر کے اس طرح کی عمارتوں کا جواز حاصل کیا گیا ہے مگر اسلام کے اصل معیاری تصور کے خلاف تو اسے ماننا ہی پڑتا ہے۔

بے شک تفسیری حیثیت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ قرآن مجید میں سکونی مکانات کا ”بڑے بڑے محل“ کہہ کر بعد کا ذکر ہے، اس لئے قبل میں جو ہے کہ ”اونچے مقامات پر بے کار یا دگار بناتے ہو“ یہ پہلی ہی قسم کی تعمیریں ہیں جن سے سکونت کے مفاد کا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ انصاری والا گنبد جس کا روایت میں ذکر ہے، اُسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ صرف یادگار کے طور پر بنوایا گیا تھا، اس لئے اُسے اس آیت کے تحت میں داخل نہیں ہونا چاہیے، ہاں دوسرے جملہ کے ماتحت مورد مذمت اور باعث ناگواری پیغمبر خدا ﷺ ہو سکتا ہے کہ: وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ”بڑے بڑے محل بنواتے ہو شاید تم دنیا میں ہمیشہ رہو گے“ لیکن یہ ایک فنی بحث ہے، عملی نتیجہ بہر حال یہ ہے کہ اپنے ذاتی مکان میں بھی صرف تزک و احتشام اور عمارت کے شان دار ہونے کے لئے ایسے اجزاء کا بنوانا خالق کو پسند نہیں ہے۔

قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَضْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَعِظِينَ ﴿١٣٨﴾ إِنَّ هَذَا إِلَّا خُلُقُ  
الْأَوَّلِينَ ﴿١٣٩﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ ﴿١٤٠﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكَ لَهُمْ ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ط  
وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٤١﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٤٢﴾

”انہوں نے کہا ہمارے لئے برابر ہے تم نصیحت کرو یا نصیحت کرنے والوں میں نہ ہو، یہ نہیں ہے کچھ بھی سو اگلے زمانے والوں کی باتوں کے اور ہم بھی گرفتار عذاب ہونے والے نہیں ہیں اس طرح ان لوگوں نے ان کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔“

## قوم کا جواب اور اس کا انجام:

امتوں کا یہ کہنا کہ یہ نہیں ہیں کچھ بھی سو اگلے زمانہ والوں کی باتوں کے، یہ بھی اسی حقیقت کی بناء پر ہے کہ انبیاء کا بنیادی پیغام ہمیشہ سے ایک ہی رہا اور گویا ایک ہی بات ہے جسے ہر داعی حق دہراتا رہا۔

جیسا کہ پہلے اجمالاً انتباہ کیا گیا ہے، بہت سے سوروں کی طرح اس سورہ کی ایک خاص ساخت ہے وہ یہ کہ ہر نبی کے پیغام اور اس کے نتیجہ کے تذکرہ کے بعد یہ الفاظ آئے ہیں کہ: **إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۗ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝۳۱** **وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ:** ”یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے مگر ان میں زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی ہے۔“ اس آخری فقرہ میں جو دو لفظ ہیں: **الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ** تو عزیز کے مفہوم میں قہر و غلبہ ہے، اور یہ ہر جگہ نمایاں ہے اس عذاب سے جو تکذیب پیغمبر کرنے والوں پر نازل ہوا مگر اس کے ساتھ جو **الرَّحِيمُ** کا لفظ ہے، وہ بعض جگہ تو آسانی سے سمجھ میں آتا ہے جیسے قوم نوح **ﷺ** پر عذاب نازل ہونے کے ساتھ جناب نوح **ﷺ** کے ہمراہیوں کا جو کشتی میں ان کے ساتھ تھے، اس طوفان عذاب سے نجات پانا جیسا کہ یہاں علامہ طبری نے لکھا ہے۔

العزیز فی اہلک قوم نوح بالغرق الرحیم فی انجاتہ نوحا ومن معہ فی الفلک

قہر و غلبہ والا ہے ہلاک کرنے میں قوم نوح کے غرق کی صورت میں، مہربان ہے نجات دینے میں نوح اور ان کے ساتھ والوں کو غرق سے۔ مگر چونکہ ہر نبی کے پیغام اور اس کی قوم کے معذب ہونے کے ذکر کے بعد ایک ہی الفاظ ہیں لہذا مفہوم ایسا ہونا چاہیے جو ہر جگہ یکساں طور پر منطبق ہو لہذا ہم سمجھتے ہیں کہ عزیز تو ہر مقام پر اس قوم کی ہلاکت ہی کے لحاظ سے کہا گیا ہے مگر رحیم یعنی مہربان، یہ ان فی ذلك لآیة کے مفہوم سے متعلق ہے، ”یقیناً اس میں نشانی ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عبرت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ عبرت یعنی سبق انہیں نہیں ہے جو ہلاک ہو گئے بلکہ دوسرے کے لئے ہے جو بعد میں رہ جائیں اور ان کے انجام پر مطلع ہوں، یہ عبرت چونکہ آنکھ کھولنے کا ذریعہ اور راہ ہدایت پر آنے کا وسیلہ ہے، اس لئے وہ یقیناً خالق کے لطف و کرم کا نتیجہ ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝۱۳۱ اِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ اَلَا تَتَّقُونَ ۝۱۳۲ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝۱۳۳ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝۱۳۴ وَمَا اَسْأَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنِّ اَجْرِیْ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱۳۵ اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هُمْ بِاٰمِنِیْنَ ۝۱۳۶ فِیْ جَنَّتٍ وَعٰیوُنٍ ۝۱۳۷ وَزُرُوْعٍ وَّاَنْخَلٍ طَلَعَهَا هٰضِیْمٌ ۝۱۳۸ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فُرِهٰیْنَ ۝۱۳۹ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنَ ۝۱۴۰ وَلَا تُطِیْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ۝۱۴۱ الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ ۝۱۴۲

”قبیلہ ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا کیوں تم پر ہیزگاری اختیار نہیں

کرتے؟ میں تمہارے لئے پیغمبر ہوں امانت دار تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ نہیں ہے کسی پر سوا پروردگار عالمیان کے۔ کیا تم اس سب میں جو یہاں ہے، اطمینان کے ساتھ چھوڑ دیے جاؤ گے، باغوں، چشموں اور کھیتوں میں اور ان کھجور کے درختوں کے ساتھ جن کے نازک نازک شگوفے ہیں اور تم پہاڑوں کو تراش کر بڑے چین کے ساتھ مکانات بناتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور حد سے تجاوز کرنے والوں کے کہنے پر نہ چلو، جو زمین میں خرابیاں پھیلاتے ہیں اور درستی نہیں کرتے۔“

### حضرت صالح علیہ السلام کا وعظ و نصیحت کرنا:

”قبیلہ بنمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا، اس کے متعلق قوم نوح علیہم السلام اور عاد علیہم السلام کے ذکر میں جہاں یہی الفاظ آئے ہیں تشریح آچکی ہے۔“

”کیا تم اس سب میں جو یہاں ہے، اطمینان کے ساتھ چھوڑ دیے جاؤ گے؟“

یہاں سب کیا کیا ہے؟ انہی اللہ کی نعمتوں کی تفصیل بعد میں ہے: باغوں، چشموں، کھیتوں اور کھجور کے درختوں میں۔“ [۱]

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿۱۵۳﴾ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۗ فَأْتِ بَآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هَذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمْسُوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوهَا فَاصْبَحُوا نَادِمِينَ ﴿۱۵۷﴾ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرَهُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۵۸﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۱۵۹﴾

”لوگوں نے کہا کہ تم تو بس ایسوں میں سے ہو جو بار بار آسب میں مبتلا ہوئے ہیں، نہیں ہو تم مگر ہماری طرح کے ایک آدمی تو کوئی معجزہ لاؤ اگر تم سچے ہو۔ کہا یہ ایک اونٹنی ہے، ایک دن پینے کا پانی اس کے لئے ہوگا اور ایک مقررہ دن تمہیں پانی لینے کا حق ہوگا اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا، نہیں تو تم پر بڑے دن والا عذاب آجائے گا تو انہوں نے اسے پے کر ڈالا، جس پر وہ بعد میں پچتائے تو ان پر عذاب آگیا، یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے اور ان میں کے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔“

### ناقہ اور اس کا پے کیا جانا:

المسحّرين کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ”بار بار آسب میں مبتلا ہونے والے“ یہ ایک تفسیر کے موافق ہے [۲] جس کے کلام عرب میں

[۱] عدد نعمة التي كانوا فيها (تبيان و مجمع البيان)

[۲] المسحّر هو الذي قد سحر مرة بعد اخرى حتى يحتل عقله ويضطرب رايه (تبيان)





تھی، پھر دوسروں کو ہم نے تنہس نہس کر دیا اور ان پر ایک بڑی ہولناک بارش کی تو کتنی بری بارش تھی اُس جماعت پر جن کو ڈرایا جا چکا تھا، یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے اور اُن میں کے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔“

### قوم کا انکار اور اس کی پاداش:

”بڑھیا“ سے مراد ان کی بیوی ہے [۱] جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات سے ثابت ہے اور ”بڑی ہولناک بارش“ سے مراد خاص طرح کے پتھروں کی بارش ہے [۲] جس کی قرآن مجید میں دوسرے مقام پر صراحت ہے۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ لَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٥١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمُ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿٥٢﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿٥٣﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا مَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۗ  
 إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ﴿٥٥﴾  
 وَزِنُوا بِالْقِسْطِ أَيْسَ الْمُسْتَقِيمِ ﴿٥٦﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا  
 فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٥٧﴾ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبَلَةَ الْأُولِيْنَ ﴿٥٨﴾

”ایک کے رہنے والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب کہ اُن سے شعیب نے کہا تم پر ہیزگاری اختیار کیوں نہیں کرتے؟ یقیناً میں تمہاری طرف بھیجا ہوا امانت دار پیغمبر ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، نہیں ہے میرا معاوضہ کسی پر سوا پروردگار عالمیان کے، ناپ پوری کرو اور گھانا کرانے والوں میں نہ ہو اور ٹھیک ترازو سے تولو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں خرابی پھیلاتے نہ پھرو اور اُس سے ڈرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور پہلے والی مخلوق کو۔“

### جناب شعیب علیہ السلام کا وعظ و پند:

قرآن مجید میں دوسرے مقام پر شعیب علیہ السلام کی سکونت کا مقام مدین بتایا گیا۔ یہ ایک اس کے قریب ہی کی کوئی بستی ہو سکتی ہے [۱] اس کا ذکر پہلے بھی سورہ حجر میں آچکا ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جا چکی ہے اور چونکہ جناب شعیب علیہ السلام خاص وہاں کے باشندوں میں نہیں تھے، اس

[۱] امرأتہ (جلالین)

[۲] الحجارة من السماء وهو قوله: وامطرننا عليهم مطرا (مجمع البيان)

[۳] هي غيضة شجر قرب مدین (جلالین)

لئے جناب ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام کے لئے جو لفظ اخوہم ان کے بھائی کا صرف کیا گیا تھا، وہ یہاں شعیب علیہ السلام کے لئے صرف نہیں کیا گیا [۱] جس طرح جناب موسیٰ علیہ السلام کے لئے اخوہم نہیں کہا گیا، اس لئے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور فرعون جس کی طرف پیغام پہنچانے پر مامور ہوئے تھے، قبطی قوم کا تھا۔ [۲]

قَالُوا اِمَّا اَنْتَ مِنَ الْمُسْحَرِّينَ ﴿۱۸۷﴾ وَمَا اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۹﴾  
 قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَ مِنْهُمُ الْعَذَابَ يَوْمَ الظُّلَّةِ ۗ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۹۱﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيٰةً ۗ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۲﴾  
 وَاِنَّ رَبَّكَ لَهٗوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۳﴾

”ان لوگوں نے کہا تم بس ایسوں میں ہو جن پر بار بار جادو کا اثر ہوا اور تم نہیں ہو ہر مگر ہماری طرح ایک آدمی اور ہم تمہیں جھوٹوں میں سے خیال کرتے ہیں تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دو اگر تم سچے ہو، انہوں نے کہا میرا پروردگار تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے اس طرح ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو انہیں سائبان کے دن والے عذاب نے اپنی گرفت میں لے لیا، یقیناً وہ ایک بڑے سخت دن کا عذاب تھا، بلاشبہ اس میں بڑی نشانی ہے اور ان میں سے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔“

### قوم کا انکار اور اس کی سزا:

”سائبان کے دن والے عذاب نے“، یہ انداز تعبیر بتاتا ہے کہ تاریخ دور جہالت میں کوئی خاص موقع یوم الظلّة کے نام سے مشہور تھا۔ ”سائبان“ کا لفظ کی تشریح یہ ہوئی ہے کہ ابر نمودار ہوا جو مثل سائبان کے تھا، لوگ جو دھوپ کی شدت سے بے قرار تھے، وہ تیزی کے ساتھ اُدھر دوڑے کہ اس کی چھاؤں میں سکون حاصل کریں جب وہ سب اس کے نیچے پہنچ گئے تو اس میں سے بجائے پانی کے آگ برسنے لگی جس نے ان کو جلا کر خاک کر دیا۔ [۳]

ایک قدیم مفسر کا قول ہے کہ یہ لوگ مدین کے علاوہ تھے جن پر عذاب آیا اور جناب شعیب علیہ السلام دو گروہوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن پر دو مختلف طرح کے عذاب نازل ہوئے۔ [۴]

[۱] لم يقل اخوهم لانه لم يكن منهم (جلالین)

[۲] كان من بني اسرائيل وكانوهم قبطا فلم يسبه الله باثمة اخوهم (تبیان)

[۳] هي سهاية الظلّتهم بعد حرّ شديدا اصابهم فامطرت عليهم نار افاحترقوا (جلالین)

[۴] اصحاب الايكة وهم غير اهل مدین فی قول قتادة قال ارسل شعیب الی امتین (تبیان)

اور یہ ”ساتبان کے دن والا عذاب“ اُمتوں کے عذاب کی پوری تاریخ میں ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ ”وہ ایک بڑے سخت دن والا عذاب تھا“<sup>[۱]</sup>

وَأَنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٩٤﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٥﴾ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ  
مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٦﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾ وَأَنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٩٦﴾ أَوْلَمَ يَكُنْ  
لَهُمْ آيَةٌ أَن يَّعْلَمَهُ عَلِيُّ ابْنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٩٤﴾

”اور بلاشبہ یہ اُسی پروردگار عالمیان کی طرف سے اتاری ہوئی چیز ہے جسے روح امین نے آپ کے دل پر اتارا تا کہ آپ عذاب الہی سے ڈرانے والوں میں ہوں، کھلی ہوئی عربی زبان میں اور بلاشبہ وہ اگلے والوں کی کتابوں میں درج ہے اور کیا ان کے لئے یہ ثبوت کافی نہیں ہے کہ اُسے بنی اسرائیل کے باخبر لوگ جانتے ہیں۔“

### قرآن کا قلب پیغمبر پر اترا نا:

”روح امین“ کا لفظ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے لقب کی حیثیت رکھتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

ہر پیغمبر کی زبانی جو پیغام اس سورہ میں ہے، اس میں خالق کا تعارف رب العالمین کے نام سے ہوتا رہا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے ساتھ گفتگو میں بھی جو باہمی رد و بدل ہوتا ہے اس میں بھی رب العالمین کے دائرہ کی وسعت نمایاں کی گئی ہے۔ اور اب اس پورے پس منظر میں ”آدم برسر مطلب کے طور پر اس سے قرآن کی حقانیت پر روشنی ڈالی جا رہی ہے اور اسی لئے ہم نے ترجمہ میں ”اسی پروردگار عالمیان“ کے الفاظ درج کیے ہیں کیوں کہ جیسے مفرد الفاظ میں الف و لام عہد کا ہوتا ہے جس سے اشارہ کے معنی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح اضافت کی صورت میں بھی بعض مقامات پر عہد کے معنی پیدا ہوتے ہیں جس سے اشارہ ”فرد خاص“ کی طرف ہوتا ہے جس کا قرینہ یہاں شروع سے آخر تک اسی سورہ میں موجود ہے۔

قرآن مجید کا محل تنزیل ”قلب“ کو بتانا اس حقیقت کا قرآنی ثبوت ہے کہ قرآن مکتوبی شکل میں نازل نہیں ہوا تھا، ورنہ وہ ہاتھ پر اترا ہوا کہا ہے جاتا، دل پر نہیں بلکہ اکثر اوقات ملک کی زبان کا بصورت تلفظ ذریعہ ہونا بھی ضروری نہ تھا، ورنہ اس کا تعلق سمع سے قرار پاتا، قلب سے نہیں، اس لئے اکثر اوقات مجمع کے اندر قرآن اترتا تھا مگر کوئی صدا نہ تھی کہ لوگ سنتے۔

بے شک اس آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ دل پر جو القاء ہوتا تھا وہ بھی فقط معانی کا نہیں بلکہ الفاظ ہوتے تھے، اور اس کا ثبوت بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ کے الفاظ ہیں، اس لئے کہ معانی کی کوئی زبان نہیں ہوتی، زبان کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہے لہذا قرآن دل پر اترا تھا مگر معانی کی شکل میں نہیں جنہیں رسول اپنی زبان میں بیان فرماتے یہ حیثیت احادیث کی ہوتی ہے بلکہ وہ الفاظ ہی کی شکل میں رسول کے دل پر اترا ہے اور

[۱] کان من اعظم الايام في الدنيا عذابا و ذلك قوله: انه كان عذاب يوم عظيم (مجمع البيان)

[۲] الروح الامين جبرئيل (مجمع البيان)

اسی بناء پر کلام رسول نہیں بلکہ کلام خدا ہے۔

”وہ اگلے والوں کی کتابوں میں درج ہے، اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آپ کا مبعوث ہونا اگلی کتابوں میں درج ہے یعنی ان میں اس کی خبر دی گئی ہے۔“<sup>[۱]</sup>

اور یہ بھی کہ یہ قرآن اپنے مطالب و مضامین کے لحاظ سے سابق کی کتابوں میں موجود ہے<sup>[۲]</sup> میری نظر میں پہلی تشریح زیادہ قوت رکھتی ہے۔

**وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ۙ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِمْ مَا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ۝۱۹۹**  
 ”اور اگر ہم اسے اتارتے غیر عرب کسی شخص پر اور وہ اسے ان کے سامنے پڑھتا تو یہ اس پر ایمان نہ لاتے۔“

**عرب کے مقابلہ میں غیر عرب کی بے تعصبی اور حق پرستی:**

اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ اس کا کوئی خاص پیش منظر ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”کافر کہتے تھے کہ قرآن آیا ہے عربی زبان میں اس نبی کی زبان بھی عربی ہے۔ شاید آپ ہی کہتا ہے۔ اگر غیر زبان والے پر عربی آتا تو یقین کرتے۔ فرمایا کہ دھوکے والے کا جی کبھی نہیں ٹھہرتا، تب وہ شبہ نکالتے کہ کوئی سکھا جاتا ہے۔“ (موضح القرآن)

دوسرا پہلو یہ ہے کہ عربوں کی تنگ نظری کا اظہار ہے کہ ان میں قومی تعصب اتنا ہے کہ اگر کوئی غیر عرب نبی بنا کر بھیجا جاتا تو کبھی تسلیم نہ کرتے<sup>[۳]</sup> مگر دنیا کی اور قومیں فراخ حوصلہ ہیں کہ رسول کے عرب ہونے کے ساتھ انہوں نے سر جھکانے میں عذر نہیں کیا، حدیث معصوم عليه السلام اس پہلو کو ثابت کرتی ہے۔<sup>[۴]</sup>

**كَذَلِكَ سَلَكْنَاهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۙ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ**

**الْأَلِيمَ ۙ فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۙ فَيَقُولُوا أَهْلٌ مِّنْكُمْ مَّنْظُرُونَ ۙ ۝۲۰۰**

”یونہی ہم اسے پہنچاتے ہیں ان بد اعمالوں کے دلوں میں۔ یہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک آنکھوں سے نہ دیکھیں دردناک عذاب کو چنانچہ وہ ان پر ایک دم آجائے گا اس حالت میں کہ انہیں احساس بھی نہ ہوگا، تب وہ کہیں گے کہ کیا ہمیں مہلت ملے گی؟“

[۱] ای ذکر القرآن لتنزل على آل محمد عليهم السلام (جلالین)

[۲] یہ قرآن مذکور ہے بیچ کتابوں کے پیغمبروں کی (شاہ رفیع الدین)

[۳] ما كانوا مؤمنين انفة من اتباعه (جلالین)

[۴] قال الصادق عليه السلام: لو انزل القرآن على العجم ما أمنت به العرب وهو نزل على العرب فأمنت به العجم فهذه فضيلة العجم (علی

بن ابراہیم)

جبر کا پہلو پیدا ہونے سے دلچسپی رکھنے والے سلکناہ کی ضمیر کو بلا تکلف شک، انکار اور تکذیب کی طرف موڑ دیتے ہیں [۱] مگر پرستار ان حق کا ضمیر کا مرجع قرآن کو قرار دیتے ہیں اور یہ خود سلسلہ آیات سے قرین قیاس یوں ہے کہ اس کے بعد دوسری ضمیر یہ ہے کہ لا یؤمنون بہ ”وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے“؟ کس پر؟ شک اور انکار اور تکذیب پر؟ اس ضمیر کیلئے دنیا مجبور ہے کہ قرآن یا ذات نبوی کی طرف راجع کرے تو پھر پہلی ضمیر کو ادھر عائد کرنے سے کیا مجبوری ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں کو تو اس قرآن کی حقانیت کا احساس ہے جو ہمارے ودیعت کیے ہوئے ضمیر کا فطری تقاضا ہے تاکہ ان پر حجت تمام ہو مگر اس کے جاننے اور سمجھنے کے باوجود اسے مانتے نہیں ہیں۔ [۲]

**أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿۳۴﴾ أَفَرَأَيْتَ إِنْ مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿۳۵﴾ ثُمَّ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۳۶﴾ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يُمْتَعُونَ ﴿۳۷﴾**

”تو کیا یہ ہمارے عذاب میں جلدی کرتے ہیں؟ کیا تم دیکھتے ہو، اگر ہم نے برسوں انہیں فائدہ اٹھانے کا موقع دیا اور پھر ان پر آگیا وہ جس سے انہیں ڈرایا جاتا رہا تھا تو یہ تمام ساز و سامان دنیا جس سے فائدہ اٹھاتے رہے تھے، اس دن انہیں کیا فائدہ پہنچائے گا؟“ [۳]

**وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ﴿۳۸﴾ ذِكْرَىٰ ﴿۳۹﴾ وَمَا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۴۰﴾**

”اور ہم کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتے سوا اس صورت کے کہ اسے کچھ عذاب الہی سے ڈرانے والے آچکے ہوں، یاد دہانی کی غرض سے اور ہم کبھی ظالم نہیں رہے۔“

یعنی بغیر ہدایت اور اتمام حجت کے ہلاک کرنا ظلم ہوتا اور ظلم سے ذات باری بری ہے۔ ”یاد دہانی کی غرض سے“ یعنی سابق امتوں کے ہلاک ہونے کا جو بیان ہے وہ تمہاری یاد دہانی کے لئے ہے اور اس اصول کا ثابت کرنا ہے کہ ہماری طرف سے ظلم نہیں ہوتا بلکہ جو جس پاداش کا مستحق ہے وہ اسے دی جاتی ہے [۴] بکثرت آیات کے علاوہ یہ ایک ہی آیت ہمارے دو اصولوں کی حقانیت کیلئے کافی ہے، ایک عدل اور دوسرے افعال الہی کا معدل باغراض ہونا جو حقیقت میں بحث عدل ہی کا ایک مسئلہ ہے۔ [۵]

**وَمَا تَنْزَلَتْ بِهِ الشَّيْطَانِ ﴿۴۱﴾ وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿۴۲﴾ إِنَّهُمْ عَنْ السَّبْعِ لَمَعَزُؤُونَ ﴿۴۳﴾**

[۱] ادخلنا التكذيب به (جلالین) در آوریم انکار را (شاه ولی اللہ)

[۲] فالهآء كناية من القرآن ومعناه امرناه في قلوبهم باخطاره ببالهم لتقوم الحجة عليهم (تبیان) اوقعنا في قلوب الكافرين — مع ذلك لا يؤمنون به (مجمع البيان)

[۳] ما استفهامية بمعنى ای شئی (جلالین)

[۴] معناه ما ذلك الذي قصصناه من انزال الالام بالامم الخالية الاذكري لكم تتعظون بها ثم بيّن ان ذلك كان عدلا (تبیان)

[۵] ففی سبحانه عن نفسه الظلم وفي هذا التكذيب لمن زعم ان كل ظلم وكفر في الدنيا فهو من خلقه وارانده (مجمع البيان)

”اور اُسے شیطانوں نے نہیں اتارا ہے اور نہ اُن پر یہ کھپ سکتا ہے اور نہ وہ اس پر قدرت رکھتے ہیں، یقیناً وہ تو سننے سے روک ہی دیئے گئے ہیں۔“

یعنی عالم بالالہی باتوں کا سننا ان کے امکان میں ہے ہی نہیں۔<sup>[۱]</sup>

اکثر آیات کی تزیل کے پس منظر میں کچھ مشرکین اور دوسرے مخالفین اسلام کی گفتگوئیں ہیں، خواہ انہوں نے وہ بات رسول اللہ ﷺ یا دوسرے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر ان کے منہ پر کبھی ہو اور خواہ آپس میں انہوں نے اس قسم کی بات چیت کی ہو۔<sup>[۲]</sup> یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ شان نزول میں اُس کہنے والے کا نام راویوں نے بتا دیا ہے اور بعض میں نہیں بتایا ہے لیکن قرآن مجید کا انداز بیان اس کا پتہ دے رہا ہے، یہاں ایسا ہی ہے۔

### فَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَكُونَ مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ﴿۳۳﴾

”تو اللہ کے ساتھ کسی کو خدا کے نام سے نہ پکارو، نہیں تو سزا کے مستوجب ہو گے۔“

ہم نے دوسرے مقامات پر جیسا کہ لکھا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واحد حاضر کا صیغہ قرآن میں ہو اس کا مخاطب رسول ہی کو مانا جائے بلکہ اکثر مخاطب غیر معین سے خطاب ہوتا ہے، کسی کو خدا کے نام سے نہ پکار، یعنی کوئی شخص ایسا نہ کرے، ورنہ سزا کا مستوجب ہوگا مگر بعض لوگ ہر ایسے موقع پر مخاطب رسول ہی کو قرار دے لیتے ہیں، اس صورت میں بھی مقصود دوسروں ہی کا متنبہ کرنا ہوگا<sup>[۳]</sup> اس کی بھی نظیریں قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

علامہ طبرسی نے یہاں خصوصیت کے ساتھ حضرت ﷺ کے مخاطب ہونے کو خاص اہمیت دی ہے اس رخ سے کہ جب اتنی بڑی شخصیت کو اس بارے میں ایسی سخت تہدید کی جا رہی ہے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے<sup>[۴]</sup> نتیجہ اس کا بھی بہر حال وہی ہے کہ مقصود اس سے دوسروں کی تنبیہ ہے۔

### وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿۳۴﴾ وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ

### الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۵﴾

”اور اپنے قریبی خاندان والوں کو اندیشہ عذاب سے باخبر کیجئے اور اپنا بازو جھکائیے مؤمنین سے اُس کے لئے جو آپ کا پورا پورا پیرو ہے۔“

### دعوتِ عشیرہ کا حکم:

[۱] انہم عن السمع لكامل الملكة محجويون بالشهب (جلالین)

[۲] ما نزلت به ای بالقرآن الشیاطین کا یزعمہ بعض المشرکین (مجمع البیان)

[۳] نہی نبیۃ وارادہ المکلفین (تبیان) یہ فرمایا رسول کو اور سنا یا دوسروں کو (موضح القرآن)

[۴] ائما افرده بالخطاب ليعلم ان العظيم الشأن اذا وعد فمن دونه كيف حاله واذا حذر هو فغيره اولى بالتجذر (مجمع البیان)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ”دعوتِ عشرہ“ ہوئی، اُس کی روایت کتبِ شیعہ اور کتبِ اہل سنت دونوں میں متفقہ طور پر موجود ہے [۱] جس کی تفصیلی روئداد ہماری کتاب ”تاریخ اسلام“ حصہ اول میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

”بازو جھکانا“ بطور محاورہ عربی میں تو واضح و اخلاق سے پیش آنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے [۲] مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثل کو اصل اور مجاز کو حقیقت بنا دیا جب اپنے تیجِ کامل حضرت علی ابن طالب علیہ السلام کے لئے کعبہ میں بت شکنی کے موقع پر اپنے بازو جھکا دیئے اور دوش مبارک پر بلند کر کے تطہیر کعبہ کا کام انجام دیا۔

**فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۳۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿۳۸﴾  
الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ﴿۳۹﴾ وَتَقَلِّبُكَ فِي السُّجُودِ ﴿۴۰﴾ إِنَّهُ هُوَ السَّبِيعُ  
الْعَلِيمُ ﴿۴۱﴾**

”تو اگر وہ آپ کا کہنا نہ مانیں تو کہہ دیجئے کہ میں بے تعلق ہوں اُس سے جو تم کرتے ہو اور بھروسہ کیجئے اُس پر جو زبردست ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا مہربان بھی ہے، جو دیکھتا ہے آپ کو جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور آپ کی گردش کو سجدہ کرنے والوں میں، یقیناً وہ سننے والا ہے بڑا جاننے والا۔“

**رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد کا ایمان:**

تَقَلِّبُكَ فِي السُّجُودِ ”آپ کی گردش سجدہ کرنے والوں میں“ محل وقوع کے لحاظ سے اس کا مطلب جو سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ کہ نماز گزار کی حالت میں جو بارگاہِ الہی میں قیام، رکوع اور سجود کی مختلف حالتوں میں آپ کی گردش ہے، اسے اللہ دیکھتا ہے۔ [۳] دوسرا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ دوسرے نمازیوں کے اندر نگرانی حال کے لئے آپ کی گردش [۴] لیکن بجائے خود محل وقوع تربیتی سے قطع نظر کر کے جس کا تمام قرآن میں کلیۃً موافق تنزیل نہ ہونا قطعی حیثیت رکھتا ہے لہذا سو کچھ سوروں اور آیات کے جن کی ترکیبی ساخت اُن کے موافق تنزیل ہونے کی گواہی دے رہی ہے، باقی کسی جگہ بھی وثوق نہیں ہو سکتا کہ یہ آیت یا یہ آیات محل وقوع کے لحاظ سے اصل تنزیل کے موافق ہیں تو ان آیات میں نفس مضمون جس جس مفہوم کا حامل ہو سکتا ہے، کسی کو محل وقوع کو سند بنا کر رد نہیں کیا جاسکتا چنانچہ یہاں یراک حین تقوم ”دیکھتا ہے آپ کو جب آپ کھڑے ہوتے ہیں“ اس کا یہ مفہوم بھی دل نشین ہے کہ آپ دعوتِ حق کے لئے جس پامردی کے ساتھ کھڑے ہیں، وہ ہمارے زیر نظر ہے جو ایک تفسیر ہے۔ [۵]

[۱] اشتهرت القصة بذلك عند الخاص والعام (مجمع البيان)

[۲] ای الر جانبک و تواضع و حسن اخلاقک معہم (مجمع البيان)

[۳] تقليبک فی ارکان الصلوة (جلالین) یعنی از قیام بر کوع بسجود (فتح الرحمن)

[۴] یعنی جب تو سجدہ کو اٹھتا ہے اور یاروں کی خبر لیتا ہے یا میں ہیں یا غافل (موضح القرآن)

[۵] قیل حین تقوم للانذار و اداء الرسالة (مجمع البيان)



اور تَقَلَّبِكَ فِي السَّاجِدِينَ ”آپ کا گردش کرنا سجدہ گزاروں میں“ اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ آپ کا پشت در پشت عبادت گزاروں کے صلب سے گزرتے رہنا، جس کا نتیجہ قطعی طور پر یہ ہے کہ حضرت کے آباؤ اجداد سب موحد اور نماز گزار تھے جو اہل حق کا متفق علیہ تصور ہے۔ [۱]

جناب ابن عباسؓ کی تفسیر بھی اس سے ملتی جلتی ہے [۲] اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی حدیث بھی اس کے موافقت میں ہے۔ [۳]

هَلْ أَنْبَأَكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنْزَلُ الشَّيْطَانُ ۗ تَنْزَلُ عَلَىٰ كُلِّ آفَاكٍ أَثِيمٍ ۗ

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثُرُهُمْ كَاذِبُونَ ۗ

”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے؟ وہ اترتے ہیں ہر جھوٹی تہمت لگانے والے گناہ گار پر۔ وہ غور سے سنتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر جھوٹے ہوتے ہیں۔“

مشرکین کی اس بات کا کہ وہ قرآن مجید کی نسبت کہتے تھے کہ ”یہ شیطان کی طرف کی باتیں ہیں“ پہلے قرآن مجید کی عظمت کو نمایاں کرتے ہوئے یہ جواب دیا گیا تھا کہ قرآن میں الوہی زبان ہے اور اس کی طرف کے نبی مضامین ہیں، بھلا شیطانوں کے بس میں ان پر اطلاع حاصل کرنا کہاں ہے؟ اور اب اس ذیل میں خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ایک پہلو جو تھا کہ معاذ اللہ ان پر شیطان اترتے ہیں اُس جواب میں کہا جا رہا ہے کہ شیطان ایسے پاکیزہ نفوس پر نہیں اتر کرے وہ اترتے ہیں تو جھوٹے اور گناہ گار اشخاص پر اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا باطن و ظاہر اتنا پاک ہے کہ شیطانوں کا ان سے کوئی واسطہ ہو ہی نہیں سکتا۔

وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۗ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۗ وَأَنَّهُمْ

يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۗ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ

كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ

يَنْقَلِبُونَ ۗ

”اور شعراء ان کی پیروی کرتے ہیں گمراہ لوگ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر جنگل میں سرگرداں پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیں سوا ان کے جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے اور اللہ کو بہت یاد کرتے رہے اور مظالم جھیلنے کے بعد انہوں نے بد لیا اور عنقریب معلوم ہوگا انہیں جنہوں نے ظلم ڈھائے ہیں کہ

[۱] قال قوم من اصحابنا انہ اراد تقلبه من ادم الى ابیہ عبد اللہ فی ظہر الموحدين لم یکن فیہم من یسجد لغير اللہ (تبیان)

[۲] عن ابن عباسؓ ان معناه اخر جک من نبی الى نبی حتی اخر (تبیان)

[۳] هو المروئی عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ صلوات اللہ علیہما قال فی اصلاب التبیان نبی بعد نبی حتی اخر جہ من صلب ابیہ من نکاح غیر سفاح من لدن ادم (مجمع البیان)

پلٹا کھا کے وہ کس انجام کی طرف جاتے ہیں۔“

## حق پرستوں کے سوا عام طور پر شاعروں کی مذمت:

مشرکین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ”کاہن“ کہتے تھے اور کبھی ”شاعر“ گزشتہ آیات میں کاہنوں کی مذمت تھی کہ ان کی باتیں شیطان کے القاء سے ہوتی ہیں اور وہ اکثر غلط ہوتی ہیں اور اس آیت میں شاعروں کی مذمت ہے۔

اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے ان شاعروں کو جو حق کی حمایت میں اشعار نظم کرتے ہیں، چونکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مشرکین کی طرف سے ایک جماعت شاعروں کی بھی تھی جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اشعار سے گستاخیاں کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کی جو عین نظم کرتے تھے [۱] ادھر سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں جناب حسان بن ثابت وغیرہ نے ان کے جواب دینا شروع کیے، ان آیات میں پہلی جماعت کے مقابلہ میں جو اکثریت رکھتی تھی بطور استثناء اسی دوسری جماعت کی مدح ہے۔

اس مدح کا آخری جملہ ہے: **وَإِنْ تَصْرُؤًا صَبَّحْتُمْ مِمَّا ظَلَمْتُمْ** ”اور مظالم جھیلنے کے بعد انہوں نے بدلا لیا“۔ یعنی بہت دن خاموش رہے اور ضبط و صبر کے ساتھ سنتے رہے اور اس کے بعد مجبوراً جواب دینے پر تیار ہوئے اور اب اس سے چسپاں ہے یہ تہدید نفیہ کہ: **وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ** اور جو ظلم ڈھاتے رہے، انہیں بہت جلد معلوم ہوگا کہ ان کا انجام کیا ہوگا؟ اب یہاں تو جن ظالموں کا ذکر تھا، وہ وہی شعراء ہیں مگر اس اعلان کی عمومیت ہر ظالم و ستم گار کو لے لیتی ہے کہ وہ اس ظلم و ستم کے انجام کو پیش نظر رکھے۔

[۱] قال ابن عباس رضی اللہ عنہما یرید شعر آء المشرکین و ذکر مقاتل اسماء ہم (مجمع البیان)

# سُورَةُ النَّهْلِ

مکیہ --- ۹۳ --- آیات

نمل عربی میں چونٹیوں کو کہتے ہیں، چونکہ اس سورہ میں جناب سلیمان علیہ السلام اور چونٹیوں کے لشکر اور پھران کی سردار جو چونٹی تھی، اس کی اپنی بولی میں جو گفتگو تھی اس کا ذکر ہے اس لئے اس سورہ کا نام یہ ہوا۔

سورہ نمل کے خاص خاص مضامین:

۱--- جناب موسیٰ کا آگ لینے جانا اور پیسیری کا ملنا اور اس وقت عصا کے اڑد ہانبنے سے ان پر خوف و دہشت کا طاری ہونا خداوند عالم کی جانب سے اس پر تنبیہ۔

۲--- کافروں کا یقین کے باوجود جان بوجھ کر انکار کرنا۔

۳--- انبیاء کے لئے ورثہ کا ثبوت۔

۴--- ہد ہد کا غائب ہونا، ملک سبا کی خبر لانا، جناب سلیمان علیہ السلام کا خط لکھنا، اس خط کا پورا مضمون اور اس کا آغاز، بسم اللہ الرحمن الرحیم سے جس کے بعد سورہ ہائے قرآن کی تعداد کے مقابلہ میں سورہ برات میں بسم اللہ کے نہ ہونے سے جو ایک کی کمی ہوگئی تھی، وہ پوری ہوگئی یعنی اب جتنے سورے قرآن مجید کے ہیں، گنتی کے لحاظ سے اتنی دفعہ قرآن میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کی آیت ہے۔

۵--- ملکہ سبا کا عمائد سلطنت سے مشورہ، پھر جناب سلیمان علیہ السلام کے پاس تحفے بھیجنا، جناب سلیمان علیہ السلام کا تحفے واپس کرنا اور تہدیدی خط لکھنا۔

۶--- تخت بلقیس کا چشم زدن میں جناب سلیمان علیہ السلام کے پاس آنا پھر بلقیس کا حاضر خدمت ہونا اور متعلقہ حالات۔

۷--- دابة الارض کا ذکر۔

۸--- قیامت کے پہلے رجعت کا ثبوت۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

طس ۱۰۰ تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ ۱ هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ ۲

الَّذِينَ يَقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿٣﴾

”طاہرین، یہ ہیں آیات قرآن اور ایک روشنی کتاب کی رہ نمائی اور خوش خبری ان ایمان لانے والوں کے لئے جو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور دوزخ آخرت کا یقین رکھتے ہیں“

”بڑی روشن کتاب“ اور ”قرآن“ دوا لگ الگ چیزیں نہیں بلکہ یہ دو عنوان ہیں جن کا معنی ایک ہے جو باعتبار پڑھے جانے کے قرآن ہے اور باعتبار لکھے جانے کے کتاب ہے، پھر اس میں روشنی کی صفت کے اضافہ نے مزید افادیت پیدا کر دی ہے۔<sup>[۱]</sup>

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ ﴿٤﴾ أُولَٰئِكَ

الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْآخَسِرُونَ ﴿٥﴾

”بلاشبہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے“ ہم نے ان کے کاموں کو ان کے لئے آراستہ کر رکھا ہے تو وہ اندھے پن میں مبتلا ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے اور وہ آخرت میں بڑا گھانا اٹھانے والے ہیں“۔

یہ کہنے کے بعد کہ ”ہم نے آراستہ کر رکھا ہے“ فوراً ہی عذاب کی خبر دینا اس کا ثبوت ہے کہ پہلے جملہ میں آراستہ کرنا بطور جبر نہیں ہے، ورنہ وہ مستحق سزا کیوں ہوتے؟ بلکہ جیسا کہ دوسرے مقامات پر تشریح کی گئی ہے، بد اعمالیوں کے نتیجے میں قدرتی طور پر احساس جرم کا ختم ہو جانا مراد ہے جس کی تعبیر یوں کی گئی ہے۔

وَأَنَّكَ لَتَلَقِيَ الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ﴿٦﴾

”اور بلاشبہ یہ قرآن آپ کو سکھایا جاتا ہے ایک بڑے حکمت والے صاحب علم کی طرف سے“۔

اس حقیقت کا اظہار دو غلط تصوروں کے مقابلہ میں ہے:

ایک یہ کہ یہ قرآن خود آپ کے ذہن کی پیداوار ہے جو منکرین مذہب کے ایک گروہ کا تصور ہے اور شاید بعض ترقی پسند ذہن کے نام نہاد مسلمان بھی آج کل ایسا سمجھنے لگے ہیں۔

دوسرے یہ کہ کوئی اور آدمی ہے جو آپ کو یہ معلومات بہم پہنچاتا ہے یا اس کلام کو تصنیف کر کے آپ کو دے دیتا ہے جیسا کہ بعض مشرکین اس وقت کے جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا تو ایسا کہہ دیتے تھے کہ جس کا ذکر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ہے۔

قرآن دونوں کی رد کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ وہ ان کا طبع زاد بالکل نہیں ہے بلکہ ایک دوسری ہستی کا سکھایا ہوا ہے مگر وہ ہستی کوئی از قسم مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ خالق کائنات ہے جو انہیں اس قرآن کی تعلیم دیتا ہے۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا ۖ سَاتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُمْ بِسَهَابٍ

[۱] القرآن والكتاب معناهما واحد وصفه بالصفتين (مجمع البيان)

## قَبَسٍ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿٤﴾

”جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گھروں والوں سے کہا کہ میں نے ایک آگ محسوس کی ہے تو ابھی میں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے لئے آگ کا ایک لوکا لاتا ہوں کہ تم تاپ سکو۔“

## موسیٰ علیہ السلام کا آگ لینے کو جانا اور پیمبری ملنا

چونکہ سردی کی شدت تھی، اس لیے تاپنے کے لئے آگ کی تلاش تھی اور شاید جنگل میں راستہ بھی بھول گئے تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ

ایسا ملے جو راستہ بتاوے۔ [۱]

فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَنْ بُورِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨﴾ يُمُوسَى إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ وَأَلْقَى عَصَاكَ ۖ فَلَمَّا رَأَاهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا ۖ وَلَمْ يُعَقِّبْ ۖ يُمُوسَى لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيْ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠﴾ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلْ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١﴾ وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخَرُّجَ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۗ إِنِّي تُسِّعُ إِلَيَّ الْفِرْعَوْنَ وَقَوْمَهُ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ ﴿١٢﴾

”تو جب وہ اُس کے پاس آئے تو آواز دی گئی کہ برکت والا (قائم و دائم) ہے وہ جس کا جلوہ آگ میں ہے اور جس کا جلوہ اس کے ارد گرد ہے اور پاک ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اے موسیٰ علیہ السلام! یقیناً میں اللہ ہوں جو عزت والا، بڑی سمجھ بوجھ والا ہے اور اپنے عصا کو بھیجے گا تو جب اسے دیکھا کہ وہ حرکت کر رہا ہے جیسے کہ وہ سا نپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر مڑے اور پھر نہیں پلٹے۔ اے موسیٰ علیہ السلام! ڈرو نہیں، میں وہ ہوں کہ میرے پاس پیغمبروں کو ڈرو نہیں ہوتا، سوا اُس کے جو کوئی تجاوز کرے۔ پھر برائی کو اچھائی سے تبدیل کرے تو بلاشبہ میں بخشنے والا مہربان ہوں اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالتا تو وہ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی برائی کے تو معجزوں میں، انہیں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ، یقیناً وہ بد اعمال لوگ رہے ہیں۔“

## جناب موسیٰ علیہ السلام کا خوف اور خالق کی تشبیہ:

بُورِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا : جس کا ترجمہ میں نے یوں کیا ہے کہ ”برکت والا (قائم و دائم) ہے وہ جس کا جلوہ آگ میں

[۱] بخیر الطریق ..... لائے کان اضلل الطریق (مجمع البیان)

ہے اور جس کا جلوہ اس کے ارد گرد ہے، اس کی تشریح میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آگ میں جو جلوہ تھے، وہ فرشتے تھے اور اُس کے آس پاس خود موسیٰ علیہ السلام تھے یا اس کے برعکس۔<sup>[۱]</sup>

بعض نے کہا ہے کہ آگ میں جن کا جلوہ تھا، وہ بلند مرتبہ فرشتے تھے اور ارد گرد ان سے کم درجہ کے یا ویسے ہی فرشتے تھے۔<sup>[۲]</sup> بعض نے کہا کہ آس پاس فرشتے اور موسیٰ علیہ السلام دونوں تھے۔

میرا ترجمہ اس لحاظ سے ہے کہ من اسم موصول جس کا ترجمہ ہے ”وہ“ اس سے خود اُس ذات کا اُس محل میں ہونا کیوں سمجھا جائے جس کی بناء پر خداوند عالم کے علاوہ دوسری شخصیتوں کے تصور کی ضرورت ہو۔ بلکہ اُس کی جلوہ نمائی قدرت کے مظاہروں کی صورت میں، جو تمام کائنات پر حاوی ہے، اُس کی ایک شکل یہاں کیوں نہ مانی جائے؟ جب ہی اُس سے متصل بلافاصلہ آیا: سبحان اللہ رب العالمین کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ آگ میں بذات خود وہ حلول کیے ہوئے تھا اور اگر من فی النار ومن حولها سے مراد فرشتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوتے تو اس کے ساتھ اس جملہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟

آخر میں جو ہے ”ڈرو نہیں، میں وہ ہوں کہ میرے پاس پیغمبروں کو ڈرو نہیں ہوتا۔“ اس میں ظاہری نگاہ کلیم اللہ کے لئے کچھ نقص کا پہلو محسوس کر سکتی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ تم کیسے پیغمبر ہو کہ میرے پاس ڈر رہے ہو، یعنی یہ ڈرنا نشان رسالت کے خلاف ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعتاً تو جناب موسیٰ علیہ السلام میں پیغمبر اور پیغمبر معمولی نہیں، اولوالعزم پیغمبر تو اگر ڈرنا پیغمبروں کی شان نہیں ہے تو وہ ڈر کیوں رہے ہیں؟ یعنی یہ امر وقوع میں آ ہی کیوں رہا ہے؟

اور تم تو معصوم ہو اس لئے کہ مرسلین میں سے ہو، مرسلین کے لئے میرے پاس ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

علامہ طبرسی نے بھی تقریباً انہی کے الفاظ درج کر دیئے ہیں، اب اس کے بعد پھر استثناء کیسا؟ اسے وہ فرماتے ہیں کہ استثناء منقطع ہے یعنی معصومین علیہم السلام کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں جو گناہ گار ہوں انہیں ڈرنا چاہیے مگر وہ گناہ گار جو خوگر گناہ ہو گئے ہیں ایسے کہ احساس گناہ ہی نہیں رہا، وہ نہیں ڈرتے، ڈرتے وہ ہیں جنہوں نے گناہ کئے ہوں مگر ان کا ضمیر مردہ نہیں ہوا، اس لئے اپنے مجرم ہونے کا احساس ہوتا ہے تو اُس پر پشیمان ہوتے ہیں اور پھر تلافی کی فکر ہوتی ہے، ایسے لوگوں کو خود ہوتا ہے اور وہ خوف نتیجہ خیز بھی ہے کہ اللہ کی نظر کرم ان پر متوجہ ہوتی ہے اور وہ اس خوش خبری کے مستحق ہوتے ہیں کہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون یعنی نتیجہ میں نہ ان کے لئے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن و ملال میں مبتلا ہوں گے۔<sup>[۳]</sup>

فَلَبَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۱۳﴾ وَجَحَدُوا بِهَا

[۱] من فی النار ای موسیٰ ومن حولها ای الملائکة او العکس (جلالین)

[۲] کسی کہ در آتش است ملائکہ کہ دران نور مصور بصورت آتش بودند و کسیکہ گرد آتش بودند ملائکہ فرو تراز ایشان بودند (فتح الرحمن)

[۳] لا یخاف لئی المرسلون لا یفعلون قبیہا ولا یخلون بواجب بل ہم منزہون عن جمیع ذلک (تبیان)

## وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٣﴾

”تو جب ہماری روشن نشانیاں اُن کے پاس آئیں تو انہوں نے کہا یہ کھلا ہوا جادو ہے اور انہوں نے جان بوجھ کر صاف ظلم و ستم اور گھمنڈ سے اُن کا انکار کیا حالانکہ اُن کے نفوس کو اُن کا یقین تھا تو دیکھو کیا ہوا انجام ان فساد یوں کا۔“

### کافروں کا باوجود یقین کے انکار کرنا:

یہ ”فساد“ ضروری نہیں کہ کوئی مزید اُن کی کارستانی ہو بلکہ اُن کا حق سے جان بوجھ کر انحراف ہی جو دوسروں کے گمراہ کرنے لئے ہی ہوا کرتا ہے بہت بڑا فساد ہے جس کی مرتکب جماعت مفسدین والے انجام کی مستحق ہو جاتی ہے۔

## وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عِلْمُنَا

مَنْطِقِ الطَّيْرِ وَأَوْتَيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ط إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾

”اور ہم نے داؤد اور سلیمان علیہ السلام کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہم کو بہت سے اپنے با ایمان بندوں سے زیادہ دیا ہے اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور کہا ”اے لوگو! ہمیں چڑیوں کی بولی کا علم عطا ہوا ہے اور ہر چیز میں حصہ ملا ہے۔ یقیناً یہ کھلا ہوا لطف و کرم ہے۔“

### انبیاء کے لئے ورثہ کا ثبوت:

داؤد علیہ السلام بھی اور اُن کے وارث سلیمان علیہ السلام بھی نبی۔ اس طرح اُس مزعومہ حدیث: نحن معاشر الانبياء لانرث ولا نورث کے دونوں جزؤں کی مخالفت قرآن سے ثابت ہوتی ہے، اسی نشیب کو محسوس کرتے ہوئے مترجمین و مفسرین جمہور یہاں ترجمہ سے الگ کچھ نہ کچھ ذیل دینے کی کوشش کرتے ہیں جیسے شاہ فریح الدین ترجمہ میں لکھتے ہیں:

”وارث یعنی قائم مقام ہوا سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کا۔“

اب معلوم نہیں ”وارث“ کے معنی قائم مقام کس لغت سے لئے گئے ہیں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”وارث ہوا یعنی نبی ہوا اور بادشاہ ہوا باپ کی جگہ اور بیٹے تھے، جو اس مقام پر نہ ہوئے۔“ (موضح القرآن)

جلالین صاحبان نے ورث سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام میں اضافہ فرمایا: النبوة والعلم۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ورثہ اور میراث اور وارث، ان سب سے متبادر متروکہ جائیداد اور اموال کا اپنے پیش رو کے بعد مالک ہونا ہے۔ علم یا نبوت وغیرہ قابل انتقال چیزیں نہیں جو میراث بن سکیں۔ اسی بناء پر علامہ طبرسی نے تحریر فرمایا:

فی هذا دلالة على ان الانبياء يورثون المال كتوريث غيرهم  
اس آیت میں دلالت ہے اس پر کہ پیغمبر لوگوں کا ورثہ مال کا ان کے وارث تک پہنچاتا ہے جیسے دوسروں کا۔  
پھر وہ دوسرے اقوال کہ علم یا نبوت مراد ہے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:  
هذا خلاف الظاهر والصحيح عند اهل البيت عليهم السلام هو الاول (مجمع البيان)

وَحِشْرَ لِسُلَيْمِنَ جُنُودَهُ مِنَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٦﴾ حَتَّىٰ إِذَا  
آتَوْا عَلَىٰ وَادِ النَّمْلِ ۖ قَالَتْ مَمْلَأَةٌ يُكَيِّبُهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسْكِنَكُمْ ۖ لَا  
يُحْطَبُكُمْ سُلَيْمِنُ وَجُنُودُهُ ۖ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٧﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ  
قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتِكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ  
وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ ﴿١٩﴾

”اور جمع کیے گئے سلیمان عليه السلام کے سامنے ان کے افواج جنات اور آدمیوں اور پرندوں میں سے تو ان کی قواعد ہو رہی تھی یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، کہیں سلیمان عليه السلام اور ان کی افواج بے خیالی میں تمہیں پامال نہ کر دیں تو وہ مسکرائے اُس کی بات پر ہنستے ہوئے اور کہا، اے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھے عطا کی ہے اور میرے ماں باپ کو شکر گزار ہوں اور میں ایسا اچھا کردار رکھوں جو تجھے پسند ہو اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔“

### چیونٹی کا واقعہ اور جناب سلیمان عليه السلام سے گفتگو:

معجزات و کرامات یعنی قدرت الہی کے غیر معمولی نظام کے جو منکر ہیں، انہیں چیونٹی کا گفتگو کرنا اور جناب سلیمان عليه السلام کا اُسے سننا اور سمجھنا سمجھ میں نہیں آتا، چنانچہ جناب نیاز فتحپوری نے واد النمل کا مطلب لیا ہے ایک ایسا مقام جہاں قبیلہ بنی نمل کے مکانات تھے اور نملۃ کے معنی لئے ہیں اس قبیلہ کی ایک عورت جس نے اپنے قبیلہ والوں کو متنبہ کیا مگر کاش انہیں عربی زبان کی اس معمولی سی بات کی طرف توجہ ہوتی کہ قبیلہ ہاشم کی عورت ”ہاشمیہ“ کہلاتی ہے، ”ہاشمہ“ نہیں اور قبیلہ بنی اسد کی ”اسدیہ“ ہوگی ”اسدہ“ نہیں۔ اسی طرح بنی نمل کی عورت ”نملیۃ“ ہوگی ”نملۃ“ نہیں۔

اس کے علاوہ آدمیوں کے لئے یہ کہنا کہ ”وہ فوج تمہیں بے خیالی میں روند نہ ڈالے، اس لئے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ“ بے معنی سی



بات ہے۔

اگر کسی قبیلہ پر حملہ کرنا ہے جسے مجازاً ”پامال کرنا“ کہہ سکتے ہیں تو وہ گھروں کے اندر بھی ہوں گے تو بھی پامال ہوں گے اور اگر حملہ نہیں کرنا ہے تو آدمیوں کو بے خیالی کے عالم میں کیوں روندنا جائے گا؟ یہ تو بے چاری چیونٹیاں ہی ہیں جو کتنی ہمارے پیروں کے نیچے آتی رہتی ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہوتی۔

پھر یہ کسی آدمی کی بات ہوتی تو وہ کون ایسی خاص چیز تھی کہ اُس پر جناب سلیمان علیہ السلام خوش ہوتے، مسکراتے اور خالق سے اُس کا شکر ادا کرنے پر مناجات کرنے لگتے، یہ تو چیونٹی ہی کے لبوں سے نکلی ہوئی بات ہو سکتی ہے جس کا یہ جزء کہ تمہیں کہیں بے خیالی میں روند نہ ڈالیں، جناب سلیمان علیہ السلام کی پوری فوج کے متعلق اس حسن کردار کی گواہی تھی کہ وہ ارادہ کسی مخلوق کو ضرر نہیں پہنچاتے۔ اس پر جناب سلیمان علیہ السلام کو مسرت حاصل ہوئی اور انہوں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس سے حسن کردار کو مکمل طور پر قائم رکھنے کے لئے توفیق کی درخواست کی۔

علامہ طبرسی نے اس پہلو کی طرف ٹھیک ہی توجہ کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس سفر میں جناب سلیمان علیہ السلام اپنی فوج کے ساتھ دوش ہوا پر نہ تھے بلکہ خشکی میں مرکبوں پر سوار جا رہے تھے، اس لئے چیونٹیوں کے پامال ہو جانے کا اندیشہ تھا۔<sup>[1]</sup>

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدًى ۖ أَمْ كَانِ مِنَ الْغَائِبِينَ ۖ ﴿١٠﴾ لَا عَذِيبَةَ عَذَابًا  
شَدِيدًا أَوْ لَا أذْبَحْتَهُ أَوْ لِيَأْتِيَنَّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿١١﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا  
لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَأٍ يَقِينٍ ﴿١٢﴾ إِنِّي وَجَدْتُ أُمَّرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ  
كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿١٣﴾ وَجَدْتُهُمَا وَقَوْمَهُمَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ  
وَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿١٤﴾ أَلَّا يَسْجُدُوا  
لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السُّهُوتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿١٥﴾ اللَّهُ لَا  
إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٦﴾

”اور پرندوں کی جانچ کی تو کہا کیا بات ہے ہد ہد مجھے نظر نہیں آ رہا ہے یا وہ واقعی غیر حاضر ہے؟ بلاشبہ میں اُسے سخت سزا دوں گا یا اُسے ذبح کر دوں گا اور نہیں تو وہ میرے سامنے (اپنی صفائی میں) کھلا ہوا کوئی ثبوت پیش کرے تو کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس نے آکر کہا میں نے وہ ایک بات معلوم کی ہے جو آپ کو نہیں معلوم اور میں سب سے ایک یقینی اطلاع آپ کے لئے لایا ہوں، میں نے ایک عورت کو پایا ہے جو ان پر بادشاہت کرتی ہے اور اُسے ہر چیز کا ذخیرہ عطا ہوا ہے اور اُس کا ایک بڑا تخت سلطنت ہے۔ میں نے اُسے اور اُس کی قوم کو پایا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر

[1] ہذا یدل علی ان سلیمان و جنودہ کانوا ركبنا علی الارض (مجمع البیان)

سورج کی پوجا کرتے ہیں اور شیطان نے اُن کے اعمال کو اُن کی نظروں میں سنوار دیا ہے تو اصل راستے سے ان کو روک دیا ہے جس سے وہ ایسے گمراہ ہو گئے ہیں کہ سجدہ نہیں کرتے اللہ کو جو آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو باہر لاتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم چھپاؤ اور جو ظاہر کرو، اللہ کہ جس کے سوا کوئی خدا نہیں جو بڑے عرش کا مالک ہے۔“

### ہد ہد کا واقعہ اور ملکہ سبا کی خبر لانا:

خوارق عادات کو بلاوجہ تاویلات کا نشانہ بنانا، آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ چنانچہ شیخ الصوفیہ جناب ابن عربی نے طیر ایک بڑی تیز رفتار پلٹن کا نام اور ہد ہد انہی میں سے کسی آدمی کا نام قرار دے دیا ہے مگر قرآن مجید کا انداز بیان ایسے موقعوں پر ایسے دوراز کار تاویلات کے قبول کرنے سے انکاری ہے۔

قَالَ سَنَنْظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِينَ ﴿٤٥﴾ اِذْ هَبْ بِكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهٖ

اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَاَنْظُرْ مَا ذٰلِكَ يَجْعُوْنَ ﴿٤٨﴾

”انہوں نے کہا ہم ابھی دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے؟ میرا یہ خط لے کر اُسے اُن کے یہاں ڈال دے، پھر اُن کے پاس سے ہٹ آ تو پھر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔“

### جناب سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کے نام خط لکھنا:

یہ حقیقت ہے کہ انبیاء و مرسلین ذاتی طور پر غیب کے مالک نہیں ہوتے، خالق خصوصی طور پر بطور اعجاز جتنا علم عطا فرمائے، وہ اور بات ہے چنانچہ اسی لئے جناب سلیمان علیہ السلام کو ہد ہد کے اُس بیان پر پورا اعتماد نہیں ہوا اور انہوں نے کہا ہم دیکھیں گے تو سچ کہتا ہے یا جھوٹ؟  
تَوَلَّ عَنْهُمْ کا ترجمہ ”ہٹ آ“ بعد والے جملہ کی رعایت سے ہے کیوں کہ اگر خط دے کر مقصود یہ ہوتا ہے کہ بس وہ پلٹ آئے جیسا کہ بعض تراجم سے سمجھ میں آتا ہے [۱] تو وہ دیکھتا کیوں کر کہ وہاں کیا ہوتا ہے؟ وہ آپس میں کیا چرچا کرتے ہیں اور اُس کا کیا جواب تجویز کرتے ہیں؟

”ہٹ آ“ کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ کر قریب ہی رہنا کہ تجھے معلوم ہو سکے کہ وہاں کیا باتیں ہوتی ہیں جو اکثر مفسرین کی تشریح ہے۔ [۲]

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ الْإِنِّي الْغَيْبِ الْإِلَى كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿٤٥﴾ اِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٰنٍ وَاِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٤٦﴾ اَلَّا تَعْلَمُوْا عَلٰی وَاَتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٤٧﴾ قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ

[۱] روبگردان ازیشان (شاہ ولی اللہ) پھر اُن کے پاس سے (رفیع الدین)

[۲] انصرف عنهم وقف قریباً منهم (جلالین) ای استتر منهم قریباً منهم (مجمع البیان)

### أَفْتُونِي فِي أَمْرِي ۖ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتَّى تَشْهَدُونِ ﴿٣٢﴾

”اُس (ملکہ) نے کہا کہ اے سردارو! میرے اوپر ایک معزز خط ڈالا گیا ہے، وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کا مضمون یہ ہے کہ سہارے سے اللہ کے نام کے جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے (یہ مطالبہ کیا جاتا ہے) کہ تم لوگ میرے خلاف گھمنڈ سے کام نہ لو اور (چپکے) میرے پاس مسلمان ہو کر آ جاؤ، اس نے کہا کہ اے سردارو! تم مجھے میرے معاملہ میں رائے دو میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم لوگ مجھے آ کر رائے مشورہ نہ دو۔“

### ملکہ سبا کا عمائدین سلطنت سے مشورہ:

حسب دستور قرآن مجید نے درمیانی کڑیاں سننے والے کی عقل پر چھوڑ دی ہیں <sup>[۱]</sup> جناب سلیمان علیہ السلام نے ہد ہد سے کہا کہ میرا خط لے جا۔ بس اب خود سمجھ لیجئے کہ وہ کیا تو اب اس نے کیا کیا؟ آدمی ہوتا تو لے جا کر دربانوں کو دیتا یا درمیانی منزلوں سے گزرتا ہوا، اطلاع دے کر ہی نہیں، بلکہ اجازت لے کر بلقیس تک پہنچتا مگر یہ تو پرندہ تھا، اُس نے لے کر جا کر خط کو جہاں پر بلقیس تھی، وہیں پر ڈال دیا، بہر حال ایک اُسے خط نظر آیا، اٹھا کر پڑھا تو مضمون خط سے وہ متاثر ہوئی۔ اور جیسے کچھ دہشت زدہ بھی ہوئی اور اُس کی اہمیت محسوس کی، اس لئے ارکان دولت کو جمع کر کے اُس خط کو اُن کے سامنے پڑھا اور یہ گفتگو کی۔

### قَالُوا نَحْنُ أَوْلُوا قُوَّةٍ وَأَوْلُوا بِأَسْ شَدِيدٍ ۖ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ فَانظُرِي مَاذَا

### تَأْمُرِينَ ﴿٣٣﴾

”ان لوگوں نے کہا کہ ہم طاقت ور ہیں اور سخت جنگ کرنے والے اور اختیار پورا آپ کو ہے تو آپ غور کیجئے کہ کیا فرمان دیتی ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ ہم نے نہ جسمانی طاقت کی کمی ہی اور نہ دل کے حوصلہ اور ہمت کی، اس لئے ہماری کمزوری کے خیال سے سر جھکانے کا تصور نہ کیجئے۔ ہاں ہم آپ کے تابع فرمان ہیں، اس لئے کسی مصلحت سے آپ ملائم طرز عمل اختیار کریں تو ہم اس میں آپ کی اطاعت کریں گے۔

### قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ

### وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿٣٤﴾ وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ

### الْمُرْسَلُونَ ﴿٣٥﴾

”اس (خاتون) نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور اُس کے عزت

[۱] فی الکلام حذف لان تقدیرہ فمضی الیہد بالکتاب فالقاء الیہا فلما راتہ قالت (تبیان)

دار باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ایسا ہی واقعاً وہ کرتے ہیں اور میں اُن کے پاس ایک تحفہ بھیجتی ہوں اور پھر دیکھتی ہوں کہ میرے فرستادے کیا خبر لاتے ہیں۔“

نظاہر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ خط لکھنے والا دنیا طلب ہے تو تحفوں کو دیکھ کر خوش ہوگا اور قبول کرے گا اور اگر اُسے صرف دینی اصلاح مد نظر ہے جیسا کہ اُس کے خط کا مضمون ہے تو وہ ان تحفوں کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھے گا [۱] چنانچہ جب جناب سلیمان علیہ السلام نے تحفے واپس کیے تو بس اسی سے بلقیس کو اُن کی حقانیت کا یقین ہو گیا اور وہ مع ارکان دولت کے مسلمان ہونے کے لئے تیار ہو گئی جیسا کہ بعد سے ظاہر ہے۔

بادشاہوں کے کردار کو بیان کرنے کے بعد کہ جب وہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور اُس کے عزت دار باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، آخر میں یہ جملہ: وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ، اُسے عام مفسرین نے بلقیس کے قول کا تتمہ قرار دیا ہے [۲] مگر ہماری قدیم تفسیر یہ بتاتی ہے کہ بلقیس کا کلام اس کے پہلے تک تھا اور پھر اس کے بعد آئے گا، بیچ میں جملہ معترضہ کے طور پر خالق نے بادشاہوں کے کردار کے متعلق اُس کے قول کی تصدیق فرمائی ہے کہ جیسا اس نے کہا تھا، واقعی وہ ایسا کرتے ہیں۔ [۳]

بعد والے ہمارے مفسرین نے بھی یہ معنی درج کیے ہیں۔ [۴]

**فَلَمَّا جَاءَ سُلَيْمِينَ قَالَ اَتُمِدُّونَنِي بِمَالٍ فَمَا اَتَيْنِ اللّٰهُ خَيْرًا مِّمَّا اَتَيْتُمْ ۗ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدْيِكُمْ تَفْرَحُونَ ﴿۳۱﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِمِجَنُّودٍ لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِنْهَا اَذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿۳۲﴾**

”اور جب وہ (فرستادہ) سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کیا تم مال سے مجھے کچھ مدد پہنچاؤ گے تو مجھے اللہ نے جو عطا کیا ہے وہ اُس سے جو تمہیں عطا کیا ہے بہتر ہے بلکہ اپنے تحفہ کے ساتھ تم ہی لوگ خوش ہو سکتے ہو، پلٹ جاؤ اُن کے پاس۔ اب ہم ایسی فوجیں لے کر اُن کی طرف آئیں گے جن کے مقابلہ کی اُن میں تاب نہ ہوگی اور ہم اُن کو ذلیل حالت میں وہاں سے نکال باہر کریں گے۔“

**ملکہ سبا کے تحائف پر جناب سلیمان علیہ السلام کا جواب:**

”اپنے تحفہ کے ساتھ تم ہی لوگ خوش ہو سکتے ہو، یعنی تم میں سے ایک دوسرے کو تحفہ بھیجے تو وہ خوش ہوگا، اس لئے کہ اُسے مال دُنیا کے

[۱] ہمہ یرجع المرسلون من قبول الهدية اور دھا ان کان ملکا قبلها او بنیالما یقبلها (جلالین)

[۲] یعنی یہ بادشاہ بھی ایسا ہی کریں گے (موضح القرآن)

[۳] فقال الله عز وجل: كَذَلِكَ يَفْعَلُونَ (علی بن ابراہیم)

[۴] قال الله تعالى تصدیقها لقولها (تبیان) صدقها الله فيما قالت فقال: وَكَذَلِكَ اى كما قالت هي (مجمع البيان)

اضافہ کی فکر ہے مگر مجھے خدا نے اس سے بے نیاز کیا ہے لہذا میں تمہارے اس تحفہ سے خوش نہیں ہو سکتا۔<sup>[۱]</sup>

قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُوا أَيُّكُمْ يَا تَيْبِي بَعَرَشَهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُوَنِي مُسْلِمِينَ ﴿٣٨﴾ قَالَ عَفْرِيَّتٌ مِنَ الْحِجْرِ أَنَا أَتَيْتِكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ ۖ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ ﴿٣٩﴾ قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتَيْتِكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي ۗ أَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۚ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ﴿٤٠﴾

”انہوں نے کہا معزز حاضرین! کون ہے تم میں جو اُس کا تخت یہاں لے آئے قبل اس کے کہ وہ لوگ مسلمان ہو کر میرے پاس آئیں؟ جنات میں سے ایک دیونے کہا، ”میں اُسے آپ کے پاس لے آؤں گا اس سے پہلے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوں اور میں اس پر طاقت رکھنے والا امانت دار ہوں“۔ اُس شخص نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا کہا ”میں اُسے آپ کے پاس لے آؤں گا اس سے پہلے کہ آپ کی نظر ادھر سے ادھر ہو“۔ تو جب انہوں نے اُسے اپنے پاس رکھا دیکھا تو کہا کہ یہ میرے رب کے لطف و کرم سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکرگزار ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں اور جو شکرگزار ہوگا، وہ اپنے فائدہ کے لئے شکرگزار ہوگا اور جو کفرانِ نعمت کرے گا تو بلاشبہ میرا پروردگار عزت والا ہے، بے نیاز۔“

### تختِ بلقیس کا چشم زدن میں آنا:

جیسا کہ بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآن مجید کا یہ عام طریقہ ہے کہ وہ واقعات کی درمیانی کڑیوں کو مخاطب کے ذہن پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، چنانچہ یہاں درمیان کے واقعات جو سلسلہ کلام سے ظاہر ہیں، یہ ہیں کہ بلقیس کے قاصد گئے۔ انہوں نے جناب سلیمان علیہ السلام کے یہاں کا پورا ماجرا سنایا جس کا بلقیس پر یہ اثر ہوا کہ وہ سلیمان علیہ السلام کی تجویز کے مطابق مع اپنے عمائد دولت کے اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی اور جناب سلیمان علیہ السلام کی طرف روانہ ہو گئی جس کی خبر جناب سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچ گئی اور وہ وقت بھی آ گیا جب کہ وہ سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچ جائے گی، اب اس وقت کی بات یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ کون تم میں ایسا ہے جو اُن کے آنے کے پہلے بلقیس کا تختِ سلطنت میرے پاس حاضر کر دے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] الفخر کم من زخارف الدنيا (جلالین) تفرحون اذا اهدى بعضكم الى بعض داما انا قلا افرح بها اشار الى قلة اكنراثة باموال الدنيا (مجمع البيان)

[۲] فلما رجع اليها الرسول عرفت انها لا تقاومة فتجهزت للمير اليه واخبر جبرئيل سليمان انها خرجت من اليمن مقبلة اليهم فقال سليمان (مجمع البيان)

قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٣١﴾  
 ”(سلیمان علیہ السلام نے) کہا اُس کے لئے اُس کے تخت کی ذرا صورت بدل دو، دیکھیں وہ صحیح صورت حال سمجھ لیتی ہے یا اُن آدمیوں میں سے ہوتی ہے جو سمجھ نہیں پاتے۔“

ملکہ کا حاضر ہونا اور متعلقہ واقعات:

جناب سلمان علیہ السلام کا اپنے کارندوں کو یہ حکم دینے کا مقصد بلقیس کی ذہانت کا امتحان منظور تھا۔<sup>[۱]</sup>

فَلَمَّا جَاءَتْ قِيلَ أَهَكَذَا عَرْشُكَ ط قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ ؕ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ﴿٣٢﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ ط إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿٣٣﴾

”تو جب وہ آئی تو کہا گیا کہ کیا ایسا ہی ہے تمہارا تخت؟ اس نے کہا یہ تو جیسے وہی ہے اور ہمیں تو اس کے پہلے حقیقت معلوم ہو چکی اور ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور انہوں نے روکا اُسے غیر اللہ کی عبادت سے جو کرتی تھی، بلاشبہ وہ کافروں میں سے تھی۔“

قرآن مجید کے سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ یہ فقرہ کہ ”ہمیں تو اس کے پہلے حقیقت معلوم ہو چکی اور ہم مسلمان ہو گئے ہیں“، بلقیس کے قول کا تتمہ ہے۔ مطلب یہ کہ معجزہ تو ہم نے اب دیکھا مگر ہم تو ہدیوں کو پہنچ کر ہی جس کردار کا مشاہدہ کر چکے تھے، اُسی سے آپ کی حقانیت سمجھ چکے اور اُسی وقت اسلام لاپکے ہیں<sup>[۲]</sup> مگر بعض مفسرین نے نہ معلوم کیوں ”یہ تو جیسے وہی ہے“ پر ختم کر کے اس کے بعد کے جملہ کو جناب سلیمان علیہ السلام کا قول قرار دے دیا ہے<sup>[۳]</sup> جس مجھے لفظی اور معنوی کسی طرح بھی مناسبت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے بعد کا جملہ: وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ ط، اس میں بھی اختلاف ہو گیا ہے۔ صد فعل ماضی ہے جس کی بصورت متعدی استعمال ہونے پر معنی ہوتے ہیں ”روکا“، یہاں اُس کے ساتھ مفعول اس کا نمایاں ہے جو ضمیر مؤنث ہے اور اس لئے اُس کا مرجع بلا شبہ بلقیس ہے۔ اب معنی ہوئے ”روکا اسے“، یعنی بلقیس کو لیکن اس فعل کا فاعل یعنی روکنے والا کون ہے؟ ہم نے جو ترجمہ کیا ہے وہ اس پر مبنی ہے کہ فاعل ضمیر ہے جو سلیمان علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ اب یہ ترجمہ ہوا کہ ”انہوں نے

[۱] اراد بذلك اختبار عقلها (تبیان) بلقیس کی عقل آزمانا بھی اور اپنا معجزہ دکھانا (موضح القرآن)

[۲] دادہ، شد ما راد انش بحقیقت سلیمان (شاه ولی اللہ) یعنی اس معجزہ کی حاجت نہ تھی (موضح القرآن)

[۳] قال مجاهد هو من قول سلیمان (تبیان)

روکا اُسے، [۱]

اور بعد میں جو ما کانت من دون اللہ ہے، وہ دوسرا مفعول ہے جس کے ساتھ عموماً عن کا لفظ آتا ہے لیکن یہ عن کا لفظ کبھی حذف بھی ہو جاتا ہے جس کی نظیریں خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔

اس کے خلاف دوسرا قول یہ ہے کہ صد کا فاعل یہی ہے: ما کانت تعبد من دون اللہ اور دوسرا مفعول کہ کا ہے سے روکا؟ مخدوف ہے۔ اب ترجمہ یہ ہوگا کہ اللہ کے سوا جس کی وہ عبادت کرتی تھی، اس نے روکا، کا ہے سے؟ اسے عقل سے سمجھے یعنی اللہ کی عبادت سے [۲] مگر یہ ”وندان تو جملہ درد ہا نند چشمان تو زیر ابروند“ کی سی بات معلوم ہوتی ہے اور پھر اس جملے کے پہلے ہی یہ آچکا ہے کہ اُس نے کہا ہم پہلے ہی آپ کی حقانیت سمجھ گئے اور مسلمان ہو چکے تو اب اس کہنے کا کیا محل ہے کہ اُس کے معبودانِ باطل نے اسے روکا معبود حقیقی کی عبادت سے؟ اس لئے میرے نزدیک پہلی ہی تشریح زیادہ قابل قبول ہے۔

قِيلَ لَهَا ادْخِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً ۚ وَ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ط  
 قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ اِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاَسْلَمْتُ مَعَ  
 سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۳﴾

”کہا گیا اُس سے کہ داخل ہو ایوان میں تو جب اس نے اسے دیکھا تو پانی کی لہریں سمجھی اور پانچ پنڈلیوں سے اونچے کر لئے، انہوں نے کہا ارے یہ محل کی زمین ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس کے اوپر ظلم کیا تھا اور اب میں ایمان لائی ہوں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اللہ پر جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے“۔

اس نے اس واقعہ پر کیوں کہا کہ اب میں ایمان لائی ہوں؟

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”اس کو اپنی عقل کا قصور اور ان کی عقل کا کمال معلوم ہوا۔ سمجھی کہ دین میں بھی جو یہ سمجھے ہیں، صحیح ہے“ (موضح القرآن)

ایک خیال یہ ہے کہ یہاں درمیان کی ایک کڑی مخدوف ہے یعنی جب وہ بیٹھی تو جناب سلیمان علیہ السلام نے اسے دعوت اسلام دی۔ اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے چونکہ وہ متعدد معجزات دیکھ چکی تھی۔ اس نے یہ کہا [۳] مگر مجھے اس میں تاثر ہے۔ کیوں کہ وہ تو اپنے تخت ہی کو دیکھ کر کہہ

[۱] صدھا سلیمان عمنّا کانت تعبد من دون اللہ (تبیان) بازداشت سلیمان آن زن راد (شاہ ولی اللہ) بند کیا اُس کو اُس چیز سے کہ تھی عبادت کرتی (شاہ رفیع الدین)

[۲] صدھا عن عبادۃ اللہ ما کانت تعبد (جلالین) ای منعها عبادۃ الشمس عن الایمان باللہ تعالیٰ بعد رویۃ تلك المعجزۃ عن مجاهد (مجمع البیان)

[۳] قیل انہا لما جلست دعاها سلیمان الی الاسلام و کانت قدرات الایات والمعجزات فاجابت واسلمت (مجمع البیان)

چکی تھی کہ میں اس کے پہلے اسلام لایا ہی ہوں، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور یہ حضرات بھی اس کی تشریح اسی طرح کر چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت جو قائلت یعنی ”کہا“ ہے اور زبان سے کہنا نہیں بلکہ حقانیت کے مزید احساس کے ساتھ اس نے اپنے دل میں کہا کہ میں کتنے عرصے تک اپنے نفس پر ظلم کرتی رہی اور خدا یا اب سلیمان علیہ السلام کے ساتھ میں اس پروردگار پر ایمان لائی جو تمام کائنات کا مالک ہے۔

**وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ فَإِذَا هُمْ فَرِيقَانِ**

**يَخْتَصِمُونَ ﴿٣٥﴾**

”اور ہم نے ثمود کی طرف بھیجا ان کے بھائی صالح کو کہ عبادت کرو اللہ کی تو وہ دو فریق ہو گئے جو آپس میں بحث کرنے لگے۔“

یعنی کچھ کافر ہو گئے اور اس کے بعد آپس میں بحث شروع ہو گئی۔<sup>[1]</sup>

**قبیلہ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال:**

یاد رہے کہ بعض لوگ ہر تعمیری یا اصلاحی صدا کو بھی یہ کہہ کر دبانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے قوم میں افتراق پیدا ہوگا مگر واقعہ یہ ہے کہ ہر نبی اور رسول آنے کے بعد افتراق ہی پیدا ہوا ہے، اتحاد قائم نہیں رہا ہے تو اگر یہ خطرہ کوئی وزن رکھتا ہوتا تو اللہ کسی پیغمبر کو بھیجتا ہی نہ اور کوئی پیغمبر اپنا پیغام پہنچاتا ہی نہ۔

**قَالَ يَقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۗ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُونَ اللَّهَ**

**لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ ﴿٣٦﴾**

”انہوں نے کہا اے قوم والوں کیوں تم بھلائی کے پہلے برائی کے لئے جلدی کرتے ہو، کیوں نہیں بخشش کے طلب گار ہوتے اللہ سے شاید تم پر رحم کیا جائے۔“

معلوم ہوتا ہے جیسے دوسرے مقامات پر مشرکین کا قول نقل ہوا ہے انہوں نے ہٹ دھرمی اور تمسخر کے طور پر یہ کہا تھا کہ خدا سے کہیے کہ وہ عذاب کیوں نہیں نازل کرتا، اس پر جناب صالح علیہ السلام بطور ایک مخلص ہمدرد کے یہ ہمائش کر رہے ہیں کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ تم اپنے منہ سے اپنے لئے عذاب مانگتے ہو۔ تمہیں تو اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی کے لئے التجا کرنا چاہیے۔ یہ کیا جہالت ہے جو تم کر رہے ہو۔ شیعہ سنی دونوں مفسرین یہی کہتے ہیں<sup>[2]</sup> مگر میری سمجھ میں اس کا ایک دوسرا پہلو یہ آتا ہے کہ برائی کے لئے جلدی کرنے سے مراد ان کا عملی منصوبہ ہے۔ اس پر جناب صالح علیہ السلام نے یہ ہمائش کی کہ اگر تم نے ایسا کیا تو پھر عذاب کے آنے میں دیر نہ ہوگی لہذا ایسا نہ کرو بلکہ بجائے ایسا کردار اختیار کرنے کے

[1] یعنی منہم مومن صالح و منہم کافر (تبیان)

[2] كان هؤلاء الجهال اذا خوفوا بالعقاب قالوا على وجه الانكار لصحة متي هو (تبیان) حيث قلت ان كان ما اتيتنا به فاتنا بالقباب (جلالین)



جو جلد عذاب کو لے آئے اپنی سابقہ غلطیوں کی معافی مانگ لو کہ خدا کی طرف کی بخشش تمہارے شامل حال ہو اور تم نجات کے مستوجب بن جاؤ۔

**قَالُوا أَظْيَرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَعَكَ ط قَالَ ظَيِّرْكُمْ عِنْدَ اللَّهِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ**

**تَفْتَنُونَ ﴿٣٤﴾**

”انہوں نے کہا تم تو تم سے اور تمہارے ساتھ والوں سے بڑی نحوست دیکھ رہے ہیں۔

انہوں نے کہا تمہاری اصل نحوست تو اللہ کے یہاں ہے، ہاں تم وہ لوگ ہو جو امتحان میں ڈالے گئے ہو۔“

مطلب یہ ہے کہ دنیوی راحت و تکلیف کے تو بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک ابتلاؤ آزمائش ہے مگر اصل سعادت و شقاوت انسان کی تو انجام میں ظاہر ہوگی جو اللہ کے یہاں ہے۔

**وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿٣٥﴾ قَالُوا**

**تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا**

**لَصَادِقُونَ ﴿٣٦﴾ وَمَكْرُؤًا مَكْرًا وَمَكْرُؤًا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٣٧﴾ فَانظُرْ كَيْفَ**

**كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۚ أَتَاكَ دَمْرُنُهُمْ وَقَوْمُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٣٨﴾ فِتْلِكَ بِيَوْمِهِمْ**

**خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ وَأَنْجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا**

**وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٤٠﴾**

”اور اس شہر میں نو (9) شخص تھے جو ہمیشہ مفسدہ پردازی کرتے تھے اور کبھی ٹھیک کام نہیں کرتے تھے، انہوں نے

کہا کہ آپس میں اللہ کی قسم کھا کر عہد و پیمان کرو کہ ہم انہیں اور ان کے گھر والوں کو سب کو راتی راتا ختم کر دیں گے،

پھر ان کے وارث سے کہیں گے کہ ہم اس گھر والوں کی ہلاکت میں شریک نہ تھے اور یقین مانو کہ ہم سچے ہیں اور

(اس طرح) انہوں نے ایک منصوبہ بنایا اور ہم نے بھی ایک منصوبہ بنایا اور انہیں اُس کی خبر نہ تھی تو دیکھو اُن کے

منصوبہ کا انجام کیا ہوا؟ یہ کہ ہم نے انہیں اور ان کی تمام قوم کو تہس نہس کر دیا تو یہ ہیں اُن کے گھر ویران و سنسان

اُن کے ظلم کی وجہ سے، بلاشبہ اس میں نشانی ہے اُن کے لئے جو جانیں ہم نے نجات دے دی انہیں جو ایمان لائے

تھے اور پرہیزگاری سے کام لیتے تھے۔“

**جناب صالح علیہ السلام کے خلاف منصوبہ سازی اور اس کی ناکامی:**

میں نے جو ترجمہ کیا ہے کہ ”انہوں نے ایک منصوبہ بنایا اور ہم نے بھی ایک منصوبہ بنایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے منصوبے کا توڑ کا ہم نے انتظام کیا۔ اب یہاں یہ توڑ کیا تھا؟ اس کی تفصیل قرآن مجید میں نہیں ہے۔ روایات مختلف ہیں اور اُن میں سے کوئی معصوم کی طرف مستند نہیں

ہے [۱] لہذا وثوق کے ساتھ کیا کہا جاسکتا ہے؟

فَتِلْكَ بَيِّنَةٌ لَهُمْ خَاوِيَةٌ بِمَا ظَلَمُوا ط ”یہ ہیں ان کے گھر ویران اور سنسان ان کے ظلم کی وجہ سے“ اس کے بعد جو ارشاد ہوا: إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ”بلاشبہ اس میں نشانی ہے اُن کیلئے جو جانیں۔“ اس میں قیامت تک کے انسانوں کو نتیجہ نکالنے کی دعوت ہے کہ دیکھو! ظلم کا انجام کیا ہوتا ہے؟ [۲]

وَلَوْ طَا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ﴿۵۳﴾ أَيْنَكُمْ لَتَأْتُونَ  
الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ ط بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿۵۴﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ  
قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ؕ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ ﴿۵۶﴾  
فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ نَقَدَرْنَا مِنْهَا مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۵۵﴾ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا  
فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِينَ ﴿۵۷﴾

”اور (بھیجا ہم نے) لوط کو جب اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم ایسی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہو اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو؟ ارے تم نفسانی خواہش عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے پوری کرتے ہو بلکہ تم انتہائی جہالت سے کام لینے والے لوگ ہو تو اُن کی قوم کا کوئی جواب نہ تھا سو اس کے کہ اُنہوں نے کہا نکال دو لوط کے گھرانے والوں کو اس بستی سے، یہ لوگ بڑے پاکباز بنے ہوئے ہیں تو ہم نے اُن کے گھر والوں کو نجات دی سو ان کی بیوی کے جس کی قسمت میں ہم نے لکھ دیا تھا کہ وہ یونہی رہ جانے والوں میں ہوگی اور ان پر ہم نے ایک خاص بارش کی تو کتنی بری بارش تھی ان لوگوں کی جنہیں ڈرایا جا چکا تھا۔“

### جناب لوط علیہ السلام کی نصیحت، قوم کی مخالفت اور اس کا انجام:

”ایسی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہو اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو“ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور پھر یہاں بھی بعد میں صراحت ہے کہ وہ بجائے عورتوں کے صنفِ مذکور سے نفسانی جذبے کی تسکین کرتے تھے جو قوم لوط کا عام کردار تھا اور اسی لئے عرف عام میں اس گناہ کے مرتکب کو ”لوٹی“ کہتے ہیں اور ”اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو“ اس کا مطلب بعض نے کہا کہ اس فعل کی بُرائی تم کو معلوم ہے [۳] اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کا

[۱] دخلوا على صالح ليقتلوه فانزل الله سبحانه الملائكة فرموا كل واحد منهم بجرج حتى قتلوه وسئل صالح من مكرهم، ابن عباس وقيل ان الله امر صالحا ان يخرج من بينهم ثم استأصلهم بالعداب وقيل نزلوا في سطح جبل ينتظر بعضهم بعضا ليأتوا صالحا فهم عليهم الجبل (مجمع البيان)

[۲] روى عن ابن عباس انه قال: اجد في كتاب الله ان الظلم يجزب البيوت وتلا هذه الآية (مجمع)

[۳] اي تعلمون انها فاحشة (مجمع البيان)

مطلب یہ ہے کہ تمہاری برائی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے ایسا فعل شنیع کرتے ہو۔<sup>[۱]</sup> جناب لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کے متعلق یہ کہنا کہ ”یہ لوگ بڑے پاک باز بنے ہوتے ہیں“ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بُرے ہیں، اس لئے کہ ہماری اس فعل شنیع میں ہمارے ساتھ نہیں ہوتے<sup>[۲]</sup> یہی ہر دور کے گنہگاروں کی ذہنیت ہوتی ہے کہ وہ نیکیوں کو اپنے لئے ناقابل برداشت سمجھتے ہیں اور یہی معصومین علیہم السلام سے اہل دنیا کی مخالفت کا راز ہے۔

زوجہ لوط علیہ السلام کے لئے یہ لفظ کہ وہ رہ جانے والوں میں ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عذاب سے اسے چھکارا نہ ہوگا..... آخر میں جو بارش کا ذکر ہے، وہ پتھروں کی بارش ہے جس کی صراحت قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر موجود ہے۔

**قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ ۗ اللَّهُ خَيْرٌ مَّا يُشْرِكُونَ ۝۵۹**

”کہیے کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے اور سلام اُس کے اُن بندوں پر جنہیں اُس نے منتخب کیا، کیا اللہ بہتر ہے یا جنہیں وہ شریک کرتے ہیں؟“

اس آیت میں اجمال کے ساتھ اس خطبہ کا مکمل خاکہ دے دیا گیا ہے جو کسی تقریر یا تحریر کے شروع میں اسلامی جماعت کے خطباء یا مصنفین کو سکھانا منظور ہے<sup>[۳]</sup> اور اس میں عَبَدَہ کے بجائے عِبَادَہ کہہ کر رسول کے ساتھ آل کو شریک کرنے کا اشارہ مضمحل ہے۔

**أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَنْبَتْنَا بِهِ**

**حَدَائِقَ ذَاتِ بَهْجَةٍ ۖ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوا شَجَرَهَا ۗ ؕ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ هُمْ**

**قَوْمٌ يَعْبَدُونَ ۝۶۰**

”یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا تو ہم نے اس سے خوش نما باغ اُگائے۔ تمہارے لئے ممکن نہیں تھا کہ تم ان کے درختوں کو اُگاؤ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (حق سے) منحرف ہیں۔“

**غیر اللہ کی عبادت کرنے والے کو مسلسل تازیانے**

اس کا تعلق انیسویں پارے کی آخری آیت سے ہے جس کا آخر میں سوال تھا کہ اللہ بہتر ہے یا جنہیں وہ شریک کرتے ہیں؟ اسی کے تسلسل سے یہ کہا جا رہا ہے اور جس کی قدرت کی نشانیاں ہیں جو تمہارے سامنے ہیں۔

آخری لفظ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ یہ لفظ عدول سے ہے جس کے معنی انحراف کے ہیں اور یہ ہماری قدیم تفسیر کے

[۱] ينظر بعضكم بعضاً (جلالین)

[۲] الباقين في العذاب (جلالین) يتطهرون من ايتان الرجال في ادبارهم (مجمع البيان)

[۳] اللہ کی تعریف اور پیغمبر پر سلام بھیج کر اگلی بات شروع کرنی لوگوں کو سکھادی (موضح القرآن)

مطابق ہے اور بعض مترجمین اہل سنت بھی اس کے موافق ہیں [۱] مگر کچھ لوگوں نے اُسے اُس ”عَدَل“ سے لیا ہے جس کے معنی عدیل یعنی ہمسر قرار دینے کے ہیں اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ ایسے ہیں جو (خدا کا) مد مقابل تجویز کرتے ہیں۔ [۲]

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَلَهَا أَنْهَرًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِي وَجَعَلَ بَيْنَ

الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۝ عَالَهُ مَعَ اللَّهِ ۝ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ [۳]

”یا وہ جس نے زمین کو رہنے کی جگہ بنایا اور اُس کے بیچ بیچ میں ندیاں بنا لیں اور اُس کے لیے پہاڑ پیدا کیے اور دو دریاؤں کے بیچ میں پردہ رکھا۔ کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی خدا ہے بلکہ اُن میں سے زیادہ علم نہیں رکھتے۔“  
دو دریاؤں کے بیچ ”یعنی کھاری اور بیٹھے میں جو پہلو بہ پہلو رواں ہوتے ہیں، اس نے اپنی قدرت کا ایسا پردہ حائل کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے میں مخلوط نہیں ہوتے۔ [۳]

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۝

إِلَهُ مَعَ اللَّهِ ۝ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ [۴]

”یا وہ کہ جو دعا قبول کرتا ہے بے بس، بے قرار کی جب وہ اُسے پکارتا ہے اور دور کرتا ہے مصیبت کو اور تمہیں زمین میں ایک دوسرے کی جگہ پر لاتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی خدا ہے؟ بہت کم تم سمجھانے کا اثر لیتے ہو۔“  
يَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ کا ترجمہ ہم نے کیا ہے، یہ خود قرآن میں اس لفظ کا دوسری جگہ جہاں استعمال ہوا ہے، اس کے مطابق ہے اور بعض مفسرین اس بات میں ہم سے متفق ہیں [۴] مگر بعض لوگوں نے اس کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ ”تمہیں زمین میں اقتدار عطا کیا ہے“ یعنی کافروں کو بے دخل کر کے تمہیں ان مقامات کے بندوبست کا ذمہ دار بنایا ہے۔ [۵]  
میں اس سے متفق نہیں ہوں، اس لئے کہ اس صورت میں خطاب خاص مسلمانوں سے ماننا پڑیگا جو خلاف ظاہر ہے۔

أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ

رَحْمَتِهِ ۝ عَالَهُ مَعَ اللَّهِ ۝ تَعَلَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ

وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۝ عَالَهُ مَعَ اللَّهِ ۝ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ

[۱] يعدلون عن الحق (علی بن ابراہیم) کم می روند (شاہ ولی اللہ)

[۲] يعدلون باللہ غیرہ لجهلهم (تبیان) یشر کون باللہ غیرہ (مجمع البیان)

[۳] لا یختلط احدہما بالآخر (جلالین)

[۴] بسازو شمارا جائے نشین نخستیاں در زمین (شاہ ولی اللہ)

[۵] یجعلکم خلفاء من الکفار بلادہم (مجمع البیان)

### كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٧﴾

”یا وہ جو تمہیں راستہ دکھاتا ہے خشکی اور تری کے اندھیروں میں اور جو ہواؤں کو بھیجتا ہے خوش خبری دیتے ہوئے اپنی رحمت کے آگے؟ کیا اور خدا ہے اللہ کے ساتھ؟ بالآخر ہے اللہ اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں، یا وہ جو پہلی دفعہ مخلوق کو پیدا کرتا ہے، پھر اُس کو دوبارہ اٹھائے گا اور جو تمہیں آسمان وزمین سے روزی عطا کرتا ہے؟ کیا کوئی خدا ہے اللہ کے ساتھ؟ کیسے کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔“

”آسمان وزمین سے روزی عطا کرتا ہے“ یعنی آسمان سے پانی برستا ہے اُسے زمین جذب کرتی ہے اور زمین سے نباتات روئیدہ ہوتے ہیں لہذا جو روزی انسان تک پہنچتی ہے اُس میں آسمان اور زمین دونوں کی شرکت ہے۔<sup>[۱]</sup>

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اٰيٰنَ يُّبْعَثُوْنَ ﴿٣٨﴾ بَلِ ادْرٰكِ عِلْمِهِمْ فِي الْاٰخِرَةِ تَبَلُّبٌ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۗ بَلْ هُمْ مِّنْهَا

### عَمُوْنَ ﴿٣٩﴾

”کیسے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے وہ کوئی غیب کو نہیں جانتا سوا اللہ کے اور انہیں خبر نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے؟ بلکہ رفتہ رفتہ آخرت کی منزل میں جا کر انہیں پورا علم ہوگا ہاں (ابھی) وہ اس کے متعلق شک میں مبتلا ہیں بلکہ وہ اُس کی طرف سے اندھے ہیں۔“

### علم غیب کا اللہ سے مخصوص ہونا اور اس کا مطلب:

جن جن باتوں کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہیں سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور یہاں مطلق غیب کو کہا گیا ہے کہ اُسے کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے، اُس سب میں یہ مطلب ہے کہ عام انسانی ذرائع اُن کے ادراک سے قاصر ہیں، ذاتاً علم اُن کا صرف اللہ کو ہے لیکن وہ جتنا مناسب سمجھے، اتنا علم جسے چاہتا ہے اور اس کا اہل جانتا ہے، اُسے عطا فرماتا ہے، اُس کی نفی ان آیات سے نہیں ہوتی۔<sup>[۲]</sup>

ادراک علمہم کی تشریح میں بہت الفاظ نظر کے سامنے ہیں<sup>[۳]</sup> لیکن میرے نزدیک سب سے واضح تشریح علاء طبری نے کی ہے<sup>[۴]</sup> جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے۔

[۱] من السماء بالغیب والمطر ومن الارض بالنبات والزرع (تبیان)

[۲] الا اللہ وحده او من اعلمہ اللہ تعالیٰ (مجمع البیان)

[۳] ای بلغ الحق او تتابع وتلاحق (جلالین) پی در پی متوجہ شد علم ایشان (شاہ ولی اللہ) مختلف ہوا ہے علم ان کا، (شاہ رفیع الدین) یعنی عقل دوڑا کر تھک گئے، آخرت کی حقیقت نہ پائی، کبھی شک کرتے ہیں کبھی منکر ہوتے ہیں (موضح القرآن)

[۴] ای تتابع علمہم وتلاحق حتی کمل علمہم فی الاخرۃ بما اخبروا بہ فی الدنیا (مجمع البیان)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِذَا كُنَّا تُرَابًا وَّآبَاءُ وَّآبَائِنَا لَمُخْرَجُونَ ﴿٤٤﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هَذَا  
 نَحْنُ وَّآبَاؤُنَا مِن قَبْلُ ۗ إِن هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٤٥﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ  
 فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٦﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ  
 مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿٤٧﴾

”اور کافر لوگوں نے کہا کہ کیا جب ہم خاک ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا، تب ہم برآمد کیے جائیں گے؟ یہ ہم سے پہلے بھی وعدہ وعید کیا گیا اور ہمارے باپ داداؤں سے بھی اس کے پہلے، یہ نہیں ہیں سوا اگلے زمانے والوں کی کہانیوں کے، کہیں کہ چلو پھر زمین میں دیکھو کہ کیا ہوا انجام گنہگاروں کا اور آپ ان پر رنج نہ کیجئے اور دل تنگ نہ ہو جیے اس سے جو وہ ترکیبیں کرتے ہیں۔“

### منکرین قیامت کے سوالات اور ان کے جواب:

یہ معجزانہ قول کافروں کا قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کی اُن کی بات نہ تھی بلکہ وہ برابر یہ کہا کرتے تھے۔  
 ”کیا ہم برآمد کیے جائیں گے“ یعنی قبروں سے زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے؟<sup>[۱]</sup> اسی کا نام ”بعث“ ہے اور اسی کو ”قیامت“ کہتے ہیں۔ اسی لئے دوسرے بعض مواقع پر کفار کے اس مقولہ میں مخرجون کے بجائے مبعوثون آیا ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ انبیائے الہی نے ہر دور میں قیامت بعد الموت اور قیامت کا یہی تصور پیش کیا ہے جو اسلام میں ہے۔  
 جواب کافروں کے اس قول کا قرآن میں بحسب موقع گونا گوں انداز میں دیا گیا ہے یہاں جو جواب دیا گیا ہے، اُس میں ذہن کے اندر ایک خلش یہ محسوس ہوتی ہے کہ انبیاء جو اطلاع دیتے رہے اور جس پر وہ استعجاب کر رہے ہیں، وہ تو دوسری زندگی یعنی حیات بعد الموت ہے اور اس دنیا میں چل پھر کے جو انہیں نظر آئے گا، وہ اس دنیا کی تباہی اور بربادی ہے تو اس سے اُن کے سوال کا کیا جواب ملے گا؟ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ اُن کے سوال کا جواب نہیں ہے بلکہ ان کے مقابلہ میں ایک طرح کا استدلال ہے کہ دیکھو انہی انبیاء نے اُن پر عذاب نازل ہونے کی بھی تو خبریں دی تھیں، وہ کس طرح صحیح ثابت ہوئیں، اُسے تم چل پھر کر آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو، تو اس سے سمجھ لو کہ وہ سچے نبی تھے لہذا اُن کی دی ہوئی خبریں جو آخرت کے متعلق ہیں، وہ بھی درست ہیں۔

دوسرا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ تمہارے قبل والوں کو بھی یہ خبر دی گئی تھی اور انہوں نے بھی تمہاری ہی طرح اس کا انکار کیا تو دیکھو کہ اس انکار کا انجام کیا ہوا؟ یہ کہ وہ عذاب الہی میں گرفتار ہوئے جس کا تم چل پھر کر مشاہدہ کر سکتے ہو تو اب تم جو انکار کر رہے ہو تو تمہیں بھی اس انجام سے ڈرنا چاہیے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] مخرجون من القبور (مجمع البیان)

[۲] کیف کان عاقبة المجرمین بانکارہم وہی ہلا کہم بالعذاب (جلالین)

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدَانِ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٤﴾ قُلْ عَسَى أَنْ يَكُونَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٤٥﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٤٦﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ وعید کب پورا ہوگا اگر تم لوگ سچے ہو؟ کہیے کہ بہت ممکن ہے نزدیک ہو گیا ہو کچھ حصہ اس کا جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو اور بلاشبہ آپ کا پروردگار بڑے فضل و کرم والا ہے تمام لوگوں پر مگر ان میں سے زیادہ شکر گزار نہیں ہیں۔“

جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو، وہ ان کے لئے عذاب ہی تو ہے۔ عذاب اصل تو وہ ہوگا جو آخرت میں ہوگا لیکن اس کا پیش خیمہ عذاب دنیا ہے، وہ ان کافروں پر جلد ہی اس کے بعد آنے والا تھا اسی کو کہا گیا ہے کہ ”بہت ممکن ہے“ [۱]

خالق کے کلام میں چونکہ حقیقی طور پر اظہار شک نہیں ہو سکتا، اس لئے جب وہ کہے کہ ”بہت ممکن ہے“ تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ یقیناً یہ بات ہونے والی ہے۔ [۲]

آخر میں اللہ کے فضل کا جو حوالہ ہے اور پھر الناس کے لفظ کے ساتھ جس میں مومن اور کافر سب داخل ہیں، وہ اُس کی بناء پر ہے جو وہ کافروں پر عذاب کے نازل کرنے میں تاخیر فرماتا ہے کہ جتنا ہو سکے ان کو موقع دے دیا جائے کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٤٧﴾ وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٤٨﴾

”اور بلاشبہ آپ کا پروردگار جانتا ہے اُسے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور اُسے جو ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز آسمان اور زمین میں پوشیدہ نہیں مگر یہ کہ وہ ایک کھلے ہوئے نوشتے میں ہے۔“

یہ ”کتاب مبین“ جس کا ترجمہ ہم نے ”کھلے ہوئے“ یعنی واضح نوشتے کے ساتھ کیا ہے قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے اور عموماً اس سے مراد لوح محفوظ ہوتی ہے۔ [۳]

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَفُضُّ عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٤٩﴾ وَإِنَّهُ لَهْدَىٰ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٠﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ

[۱] فصل لہم القتل بیدرو باقی العذاب یأتیہم بعد الموت (جلالین)

[۲] عسی من اللہ واجبة (تبیان)

[۳] هو اللوح المحفوظ ومکنون علمہ تعالیٰ (جلالین)

## الْعَلِيمُ ﴿٨٩﴾

”بلاشبہ یہ قرآن بیان کرتا ہے، بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ باتیں جن میں وہ باہم اختلاف رکھتے ہیں اور بلاشبہ وہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے، بلاشبہ آپ کا پروردگار اُن کے درمیان فیصلہ کرتا ہے اپنے حکم سے اور وہ عزت والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

یہ گویا جواب ہے اُس کا جو عیسائی علماء کہتے ہیں کہ قرآنی مندرجات مانوخذ ہیں بائبل وغیرہ قدیم کتابوں سے جس کے لئے زمانہ سابق میں ”ینایج الاسلام“ عیسائی مشنریوں کی طرف سے نکلی تھی اور پھر ڈاکٹر ٹسڈل نے نوشتہ جات کو اپنے انداز میں نیاز صاحب فتح پوری نے ”ماخذ القرآن“ کے نام سے ”نگار“ لکھنؤ کے ایک خاص شمارہ کی صورت میں شائع کیا۔ حالانکہ قرآن مجید کے مندرجہ واقعات کا بائبل سے موازنہ کیا جائے تو خود اس سے اس خیال کا غلط ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے اُن واقعات کو بائبل سے اخذ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی غلطیوں کی تصحیح کی ہے جیسا کہ قصہ آدم علیہ السلام اور قصہ داؤد علیہ السلام کا بائبل اور قرآن دونوں میں مطالعہ کرنے سے ظاہر ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اہل کتاب کو جن باتوں میں خود شک تھا، اُن کی حقیقتوں کو قرآن نے نمایاں کیا ہے اور اس کا اس آیت میں اعلان بھی کر دیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ بائبل وغیرہ کے مندرجہ بیانات سے قرآنی مندرجات میں جو فرق ہے وہ معاذ اللہ غیر شعوری طور پر نہیں ہے جیسا کہ نقل در نقل میں فطری طور پر ہو جاتا ہے بلکہ وہ شعوری طور پر اس مقصد سے ہے کہ اہل کتاب کے سامنے جو اصل حقیقت ہے، اسے ظاہر کیا جائے، اس صورت میں جو واقعات دونوں میں مشترک مل جائیں، انہیں ”اخذ“ کہنے کا کسی کو حق نہیں، بلکہ اس حد تک جو دونوں میں مشترک ہے، اسے تصدیق و توثیق کہا جاسکتا ہے۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۗ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴿٨٩﴾ إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تَسْمِعُ  
الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٩٠﴾ وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمَىٰ عَنْ ضَلَّاتِهِمْ ۗ إِنَّ  
تَسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٩١﴾

”تو اللہ پر بھروسہ کیجئے بلاشبہ آپ کھلے ہوئے حق پر ہیں، یقیناً آپ مُردوں کو آواز نہیں سن سکتے اور نہ بہروں کو صدا پہنچا سکتے ہیں جب وہ پیٹھ پھرا کر گردانی کریں اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر راستہ دکھا سکتے ہیں۔ آپ نہیں سن سکتے سوائے اُن کے جو ہماری نشانیوں کے ماننے کے لئے تیار ہوں تو یہی اسلام قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔“

بہر آدمی بھی اگر قریب ہو اور ادھر رخ کیے ہوئے ہو تو امید ہو سکتی ہے کہ وہ بات سن لے یا لبوں کی حرکت اور اشاروں سے سمجھ لے لیکن اگر وہ بہرا بھی ہے پیٹھ پھرائے ہوئے بھاگ بھی رہا ہے تو اب کہاں امید کی جاسکتی ہے کہ اس تک ہماری آواز پہنچے اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو۔<sup>[۱]</sup>

[۱] اذا اعرض وادبر وتباعد انقطع الطمع في السماعه (مجمع البيان)



آخر میں من یؤمن بآیتنا کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے کہ ”جو ہماری نشانیوں کے ماننے کے لئے تیار ہوں“ وہ اس بناء پر ہے کہ ایمان لانے کی منزل تو آواز حق سنانے کے بعد ہوگی اور جنہیں آواز سنائی جا رہی ہے، اُن کی جو صفت بیان ہو رہی ہے، وہ آواز سنانے کے قبل ہونا چاہیے اور وہ ماننے کے لئے تیار ہونا ہی ہے۔

اس تیاری میں وہ عقل و شعور بھی داخل ہے جو صلاحیت فہم پیدا کرے اور وہ قبول حق کا جذبہ بھی جو جان بوجھ کر انکار پر آمادہ نہ ہونے دے۔

سنانے کے بعد کا نتیجہ وہ ہوگا جو بعد میں ہے: فہم مسلمون تو یہی اسلام قبول کرنے والے ہوتے ہیں یعنی وہ ایمان کا اقرار کر کے مسلمان ہو جاتے ہیں۔

جناب شیخ الطائف نے پہلے تو اسی کے مطابق تشریح کی ہے مگر اس کے بعد انہوں نے یؤمن بآیتنا کے معنی لے لئے ہیں ”ایمان لے آئے ہیں“ اور یہ مطلب لیا ہے کہ آپ کا سنانا کارآمد انہی میں ثابت ہوتا ہے جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے اور دوسروں کے لئے آپ کا سنانا، نہ سنانے کے برابر ہے اس لئے کہ وہ فائدہ نہیں اٹھاتے اور اس کے لئے انہوں نے ہدی للمتقین کی مثال دی ہے کہ قرآن حقیقت میں تو ہدایت سب کے لئے ہے جیسا کہ دوسری جگہ کہا گیا ہے: ہدی للناس ”تمام آدمیوں کے لئے ہدایت“ مگر چونکہ فائدہ اس سے متقین ہی اٹھاتے ہیں اس لئے وہاں کہا گیا ہے: ہدی للمتقین مگر ہمارے نزدیک یہاں وہی مفہوم زیادہ چسپاں ہے جو اُن کے پہلے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے [۱] اور جو ہمارے ترجمہ کا مطلب ہے۔

نظر غائر بتاتی ہے کہ ہمارے اس مفہوم کی صورت میں بھی ہدی للمتقین کی مثال درست ہے، اس لئے کہ رسول خدا ﷺ اپنے عمل کے لحاظ سے تو سنا تے سب ہی کو تھے مگر فائدہ اُس سے وہی اٹھاتے تھے جو اپنے حسن فطرت سے حق کو قبول کرنے پر تیار تھے، باقی لوگوں پر آپ کا سنانا اثر انداز نہیں ہوتا تھا، اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ بس اُنہی کو سنا تے ہیں جو ایمان لانے کے لئے تیار ہوں اور اس کی مثال وہی ہے کہ قرآن کے لئے کہا گیا ہے: ہدی للمتقین حالانکہ اس کی ہدایت سب کے لئے عام ہے۔

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۗ إِنَّ

النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿۷۴﴾

”اور جب اُن پر حکم آجائے گا تو ان کے لئے ہم زمین سے ایک چلنے پھرنے والا برآمد کریں گے جو اُن سے بات کرے گا اس بناء پر کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔“

دَابَّةُ الْأَرْضِ كَذَاكَر:

لغوی حیثیت سے دَابَّةُ ہر زمین پر چلنے والے کو کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

[۱] لا تسمع الا من يطلب الحق بالنظر الى آياتنا فلا يلبث ان يسلم (تبیان)

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رُزُقُهَا.

کوئی زمین پر چلنے والا نہیں ہے سوا اس کے کہ اللہ پر اس کی روزی کی ذمہ داری ہے۔ (ہود-۶)  
یہ قرآن مجید میں کئی جگہ ہے۔

یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ دابّۃ کے ساتھ ارض یعنی زمین کا ذکر تقریباً ہر جگہ آتا ہے، گویا محاورہ میں یہ لفظ بغیر ارض کے ذکر کے مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں بھی دابّۃ من الارض کہنے سے یہ سمجھنا کوئی ضروری نہیں کہ یہ کوئی جانور ہوگا جو زمین کو شگافتہ کر کے اس کے اندر سے برآمد کیا جائے گا مگر عرف عام میں دابّۃ کا لفظ چوپایہ کے لئے آتا ہے اور فقہ میں یہ لفظ گھوڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس لئے مترجمین و مفسرین اہل سنت اس دابّۃ کے لفظ کی تشریح جانور کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”قیامت سے پہلے صفار پہاڑ مکہ کا پھٹے گا، اس میں سے ایک جانور نکلے گا، لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور پکے ایمان والوں کو اور چھپے منکروں کو جدا کر دے گا نشان دے کر“ (موضح القرآن)

مگر لغوی معنی کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی جانور ہو بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ کنایہ کسی انسان کامل سے ہو جیسا کہ ہماری بعض کتابوں میں روایت ہے جو اُسے زمانہ رجعت سے متعلق قرار دیتی ہے<sup>[۲]</sup> جب کہ اس کے بعد کی آیت زیادہ واضح طور پر رجعت سے متعلق ہے لیکن رجعت کے تفصیلات خود غیر واضح ہیں اور دابّۃ کی پوری حقیقت تقریباً متشابہات میں سے ہے بہر حال قرآن مجید کا انداز بتاتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی مظاہرہ قدرت الہی ہوگا جو دنیا کو متنبہ کرنے کے لئے کہ وہ عذاب الہی کے مستحق ہیں، سامنے آئے گا۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿۸۳﴾ حَتَّىٰ إِذَا  
جَاءُوكَ وَقَالَ أَكْذَبْتُمْ بآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۸۴﴾  
وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ ﴿۸۵﴾

”اور جس دن ہم اٹھائیں گے ہر قوم میں سے ایک دستے کو ان میں سے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں تو انہیں تنبیہ کی جائے گی، یہاں تک کہ جب وہ آئیں گے تو ارشاد ہوگا کہ کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا اس حالت میں کہ تمہارا علم اُس پر حاوی نہ تھا یا کیا تمہارا جو تم کرتے تھے؟ اور حکم چل گیا ہوگا ان پر اس لئے کہ وہ ظلم کے مرتکب ہوئے تھے تو وہ اب بات نہیں کرتے ہوں گے۔“

قیامت کے پہلے رجعت کا سوال:

[۱] برآورد ای ایشاں جانوری از زمین (شاہ ولی اللہ) نکالیں گے واسطے ان کے ایک جانور زمین سے (شاہ فریح الدین)

[۲] عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ (علی بن ابراہیم)

یہ موقع کونسا ہوگا جس میں ہر قوم میں سے ایک دستے کو لایا جائے گا؟ مفسرین جمہور جواب دیں گے کہ قیامت مگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام فرماتے ہیں کہ قیامت تو وہ موقع ہے جب سب اٹھائے جائیں گے جیسا کہ قرآن میں ہے:

فَلَكُمْ نُعَادٍ مِنْهُمْ أَحَدًا - اُنْ مِنْ سِوَاكُمْ كَمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (کہف - ۴۷)

لہذا یہ موقع کوئی اور ہے اور وہ رجعت کا ہے جو قیامت کے پہلے ہوگی اور اس میں بس کامل الایمان افراد اور بڑے سخت کافر و منافق ہی اٹھائے جائیں گے، درمیانی قسم کے لوگ نہیں۔

جلالین نے فوجاً کی تشریح میں لکھا ہے:

وهم رؤسأوهم المتبعون: یہ اُن کے وہ سرعینڈر ہوں گے جن کی پیروی کی جاتی تھی۔

اس صورت میں بعید نہیں ہے کہ بعد میں جو یہ ہے کہ ”تم نے میری آیات کو جھٹلایا“ ان آیات سے مراد وہی احکام ہوں جن کا تعلق انہی ہستیوں سے تھا جنہیں خالق نے مرکز ہدایت و اطاعت قرار دیا تھا مگر یہ دوسرا ان آیات سے انحراف کر کے خود ان منصبوں پر قابض ہو گئے۔ [۱]

**أَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا الْبَيْتَ لِبِسْكَانِ فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ**

**لِقَوْمٍ يَتَّقُونَ ﴿۸۶﴾**

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات بنائی اس لئے کہ وہ اُس میں سکون حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا، بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو ایمان لانے پر آمادہ ہوں۔“

**وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ**

**اللَّهُ ۗ وَكُلُّ أَتَوْهُ ذَخِيرِينَ ﴿۸۷﴾**

”اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو گھبرا جائیں گے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سوا اُس کے جسے اللہ چاہے اور سب اُس کی طرف آئیں گے سر جھکائے ہوئے۔“

**صور کے اثر سے کچھ افراد کا استثناء:**

یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں صور پھونکنے کا دو جگہ ذکر ہے، ایک جگہ کہا گیا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ (زمر - ۶۸)

صور پھونکا گیا ہوگا تو آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں سب بے حس و حرکت ہو کر گر جائیں گے

وہاں بھی یہ استثناء موجود ہے کہ ”اللہ“ سوا اُس کے جسے اللہ چاہے، اور یہاں جو یہ اثر بتایا گیا ہے کہ آسمان و زمین والے سب گھبرا جائیں گے، یہاں بھی یہ استثناء ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کچھ نفوس ایسے ہیں جن پر نہ اُس صور کا اثر ہوگا اور نہ اس صور کا۔ یہ نفوس وہی ہو

[۱] من قال بالاول قال المراد بالآيات الائمة الطاهرة (مجمع البيان)

سکتے ہیں جو تمام نوع بشر میں افضل اور مقصود کل کائنات ہوں، جن کے لئے پیدا ہونے کے بعد پھر فنا و زوال نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر نے صورت پھونکنے جانے کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”ایک بار صورت پھونکنے کا جس سے خلق مرجائے گی۔ دوسرا پھونکنے کا توجی اٹھیں گے، اس کے بعد صورت پھونکنے کا تو گھبرائیں گے اور پھر پھونکنے کا تو بے ہوش ہو جائیں گے اور پھونکنے کا تو ہشیار ہوں گے۔ صورت پھونکنا بہت بار ہے۔“ (موضح القرآن)

لیکن جب قرآن مجید نے جن دو صورتوں کا ذکر کیا ہے، اُن کی تاثیر میں استثناء موجود ہے تو وہ جتنی بار بھی پھونکنے کا، اس کے اثر سے اُن نفوس کو ہم مستثنیٰ سمجھ سکتے ہیں جو الا من شاء اللہ کا مصداق ہیں۔

شاہ صاحب نے گھبراہٹ والے صورت کو تیسرے (۳) نمبر پر رکھا ہے اور موت والے کو پہلا (۱)، اس کے برخلاف بعض قدیم مفسرین ترتیب اس طرح بتاتے ہیں کہ پہلا (۱) وہ جس سے گھبرا جائیں گے، دوسرا (۲) وہ جس سے بے جان ہو کر گر جائیں گے، یہ وہ ہے جسے قرآن میں کہا گیا ہے صعق من فی السموات الارض اس کے علاوہ بے ہوشی والے کسی صورت کا پتہ نہیں ہے، تیسرا (۳) وہ جس سے زندہ ہو جائیں گے۔ [۱]

دوسری طرف جلالین کا نقطہ نظریہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں دو جگہ درج ہونے والے صورت بھی ایک ہی ہیں چنانچہ فزع من فی السموات ومن فی الارض کے تحت میں لکھا ہے:

ای خافو الخوف المفضی الی الموت کما فی آیة اخزی: فصعق۔

یعنی وہ خوف زدہ ہو جائیں گے ایسا خوف جو باعث موت ہوگا جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: فصعق

علامہ طبریؒ کا بھی پہلا تصور یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ فزع کی تفسیر کی ہے:

ای ماتو الشدة الخوف والفزع یعنی خوف اور گھبراہٹ کی شدت سے وہ مرجائیں گے

اور پھر دوسرا قول نقل کیا ہے کہ صورتین (۳) مرتبہ پھونکا جائے گا لیکن اگر اُس صورت کا اثر آخر میں موت کی شکل میں ظاہر ہونے والا ہے تو آخر قرآن کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اس نتیجہ کو جو شدید ہے چھوڑ کر اُس خفیف اثر کو نمایاں کرے جو شروع میں ہونے والا ہے؟ پھر جب کہ دوسری جگہ جو صعق کا لفظ ہے وہ بھی صراحةً موت کا اظہار نہیں کرتا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے قرآن مجید میں یہی لفظ آیا ہے: ”خزّ موسیٰ صعقاً“ حالانکہ برق طور سے ان کو غش آیا تھا، موت طاری نہیں ہوئی تھی۔

اب یہ من شاء اللہ کون ہیں جن پر کسی بھی صورت کا اثر نہیں ہوگا؟ اس کے لئے جلالین نے پہلے تورہم بالغیب کے طور پر جبرئیل و میکائیل و اسرافیل کے نام لکھ دیے ہیں مگر اس کی دلیل کیا ہے؟ کچھ نہیں پھر جناب ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ: هم الشهداء اذ هم احياء عند ربهم يرزقون یہ شہدائے ہیں اس لئے کہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے یہاں رزق پاتے ہیں۔

ہمیں جناب ابن عباسؓ کے اس قول سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن اگر شہداء ہیں تو وہ ہستیاں جو عام شہداء سے بلاشبہ افضلیت و برتری رکھتی ہوں بدرجہ اولیٰ اس کی مصداق ہوں گی۔

[۱] قبیل النفخة الاولى نفخة الفزع والثانية نفخة الفزع والثالثة نفخة القيام (تبیان)

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ط صُنَعَ اللَّهُ الَّذِي اتَّقَنَ

كُلَّ شَيْءٍ ط إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ ﴿٨٩﴾

”اور تم دیکھتے ہو پہاڑوں کو، سمجھتے ہو انہیں قائم و برقرار، حالانکہ وہ بادلوں کی طرح رواں دواں ہیں، یہ اللہ کی صناعی ہے جس نے ہر شے کو پائدار بنایا ہے بلاشبہ وہ خوب جانتا ہے اُسے جو تم کرتے ہو۔“

### زمین کی حرکت کا ثبوت:

موجودہ سائنس کے تصورات سے پہلے اس آیت کو قیامت کے بیان کے سلسلے میں داخل کیا جاتا تھا کہ پہاڑ حرکت میں آجائیں گے [۱] مگر آیت کا دوسرا ٹکڑا کہ یہ اللہ کی صناعی ہے، اس تصور کو غلط قرار دیتا ہے۔

اب جدید سائنس کے اس انکشاف پر کہ زمین متحرک ہے، نمایاں طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن مجید نے اس آیت میں حرکت زمین کی حقیقت کا انکشاف کیا ہے جسے قدیم علماء اس لئے نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اُس وقت کے مسلمات کے خلاف تھا اور قیامت کے لئے تو ارشاد ہوا ہے: (سورہ ط آیت ۱۰۵ میں)

يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ (انہیں پہاڑوں کو) میرا پروردگار پوری طرح سرمہ بنا دے گا، تو پھر انہیں دیکھ کر قائم و برقرار کون سمجھے گا اور وہ بادلوں کی طرح رواں دواں کہاں ہوں گے جب کہ اُن کا بصورت جسمانی وجود ہی نہ ہوگا۔

جناب ابن عباسؓ کی تفسیر موجودہ نظریہ کی تائید کرتی ہے، اس لئے کہ انہوں نے اسے حال ہی سے متعلق قرار دیا ہے، نہ کہ مستقبل قیامت سے۔ [۲]

یہ اور بات ہے کہ بعد والوں نے اس میں بھی اپنی طرف سے گویا نوٹ دے کر قیامت ہی سے متعلق قرار دے دیا ہے [۳] جو اُن کے اپنے وقت کی فلکی سائنس (عالم بیت) سے تاثر کا نتیجہ تھا۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا ۖ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ ﴿٩٠﴾ وَمَنْ جَاءَ

بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ ط هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٠﴾

”جو نیک کام کرتا ہے، اُسے اس سے بہتر ملے گا اور وہ اُس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے اور جنہوں نے برائی کی وہ اوندھے منہ آگ میں گرائیں جائیں گے۔ کیا تمہیں جو کچھ تم کرتے تھے، اُس سے الگ کوئی سزا مل رہی ہے؟“

”برائی“ کے لفظ کے اطلاق کی صورت میں چون کہ مشکل یہ پڑتی ہے کہ پھر گناہ کی سزا آتش جہنم قرار پاتی ہے حالانکہ ہمیں معلوم ہے

[۱] تبصرہ وقت النفخة (جلالین) یہ ہو گا قیامت میں (موضح القرآن)

[۲] قال ابن عباس: تحسبها قائمة وهي تسير بر احيثا سر يعا (تبيان)

[۳] ذلك اذا ازيلت الجبال عن اما كنها قبل التلاشي كما في قوله: وتكون الجبال كالعين المنفوش (مجمع البيان)

قرآن مجید کی دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور بعض میں کچھ معیادی سزا ہوتی ہے، اس لئے مفسرین مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں سیئہ سے مراد سب سے بڑا گناہ یعنی کفرہ شرک مراد لیں اور اس میں وسعت بھی دی جائے تو ایسی چیزوں کے انکار تک جو ایمان میں ذخیل ہوں اور جن سے آخرت وابستہ ہو، اس لئے علامہ طبرسی نے پہلے بالسعیۃ کے تحت میں لکھا ہے:

ای بالمعصیۃ الکبیرۃ الّتی ہی الکفر والشرک۔ یعنی بڑی نافرمانی کا ارتکاب کیا جو کفر و شرک ہے

اور پھر آگے وہ احادیث درج کی ہیں جو اہل بیت رسول سے عدوات کے متعلق ہیں کہ اس کا نتیجہ بھی بلاشبہ آتش دوزخ ہے مگر قرآن مجید میں اس آیت کے آخر میں جو هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ نقرہ ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سزا کا تعلق اعمال سے ہے جو وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں نہ کہ عقیدہ کے کسی لازمی جزء سے جو ایک استمراری حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں وہ تہجد و تسلسل نہیں ہے جو مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ کے الفاظ سے نمایاں ہے، اس لئے ہم کیوں نہ یہ سمجھیں کہ یہ سزا خالق کی نافرمانی کی ہے، اگر ملے، لیکن کسی وجہ سے خواہ عنف و کرم کی بناء پر اور خواہ تو بہ و انابت سے اور خواہ شفاعت سے سزا نہ ملے تو اور بات ہے۔ پھر یہ کہ فی التّار میں کیت و کیفیت کے اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے۔ اس لفظ کی وحدت سے اس سزا کی نوعیت میں وحدت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَذِهِ الْبَلَدَةِ الّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۚ وَأُمِرْتُ  
أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٩١﴾ وَأَنْ أَتْلُوا الْقُرْآنَ ۚ فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي  
لِنَفْسِهِ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿٩٢﴾

”مجھے تو بس یہ حکم ہوا ہے کہ اس شہر کے پروردگار کی عبادت کروں جس نے اسے محترم قرار دیا ہے اور اسی کی ہر چیز اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اسلام اختیار کرنے والوں میں ہوں اور یہ کہ میں قرآن پڑھ کر سنادوں، اب جو ہدایت پائے گا وہ اپنے لئے ہدایت پائے گا اور جو گمراہی پر برقرار رہے تو کہیے کہ میں تو بس خوف دلانے والوں میں سے ہوں۔“ [۱] بظاہر سلسلہ تزیل میں یہ آیت کسی ایسے سیاق کلام میں تھی جہاں رسول سے مخاطب کے ذیل میں قل آتا ہے یعنی یوں کہیے مگر وہ یہاں پہنچ گئی، اس لئے اب اس میں قل کا جز نہیں رہا لیکن یقیناً مراد اس سے یہی ہے [۲] اور اس لئے خواہ جناب شیخ الطائفی یاد کی غلطی سے اور خواہ کاتب کی کارستانی سے اثنائے تفسیر میں متن آیت میں قُل کا لفظ اس طرح درج ہو گیا ہے جیسے کہ وہ آیت میں موجود ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾

”اور کہیے کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے وہ بہت جلد تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم انہیں پہچان لو گے اور نہیں ہے تمہارا پروردگار غافل اس سے جو تم لوگ کرتے ہو۔“

[۱] قل سبحانہ لنبیہ ﷺ قل لہم (مجمع البیان)

[۲] قال سبحانہ لنبیہ ﷺ قل لہم (مجمع البیان)

# سُورَةُ الْقَصَصِ

مکیہ --- ۸۸ --- آیات

چونکہ اس سورہ میں زیادہ تر انبیاءِ اہم سابقہ کے واقعات ہی کا بیان ہے اس لئے اس کا نام ”قصص“ ہوا۔

سورہ قصص کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... مظالم فرعون۔
- ۲..... مادرِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی اور اس کی تفصیل۔
- ۳..... زوجہ فرعون کی گفتگو اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی پرورش۔
- ۴..... قبطی کے قتل کا واقعہ۔
- ۵..... حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف و دہشت کے عالم میں مصر سے نکلنا۔
- ۶..... دختران جناب شعیب علیہ السلام کا واقعہ۔
- ۷..... جناب شعیب علیہ السلام کے پاس جانا اور ان سے گفتگو۔
- ۸..... وادی ایمن۔
- ۹..... عہدہ پیغمبر میں حضرت ہارون علیہ السلام کی شرکت کے لئے دعا اور اس کی قبولیت۔
- ۱۰..... دربار فرعون میں جانا اور اس موقع کی گفتگو۔
- ۱۱..... فرعون کا ہامان کو اونچے قصر کی تعمیر کے لئے کہنا اور پھر ان کا انجام۔
- ۱۲..... چشم پوشی اور رواداری کی مدح۔
- ۱۳..... یہ کہ خالق کے فیصلہ کے خلاف اپنے اختیار کو صرف کرنا ایک قسم کا شرک ہے۔
- ۱۴..... قارون کا کردار اور اس کا انجام۔
- ۱۵..... انجام خیر ان کے لئے جو دنیا میں تہر و غلبہ کے درپے نہ ہوں۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

طَسَمَ ① تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ② نَتْلُوا عَلَيْكَ مِنْ نَبَأِ مَوْسَىٰ وَفِرْعَوْنَ

بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ③

”طا۔ سین۔ میم۔ یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔ ہم آپ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کچھ خبریں سچائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اُن کے لئے جو ایمان لائیں۔“

یہ ویسا ہی ہے جیسے آغاز سورہ بقرہ میں پورے قرآن کے لئے کہا گیا: هَدَىٰ لِلْمُتَّقِينَ ”یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے“ حالانکہ مقصود اُس سے سب ہی کی ہدایت ہے مگر چونکہ فائدہ اٹھانے والے اس سے پرہیزگار ہی ہیں، اس لئے یہ کہا گیا ہے۔ اُسی طرح یہ خبریں سب کے لئے ہیں مگر فائدہ اٹھانے والے اُن سے وہی ہیں جو ایمان لائیں تو یوں کہا جا رہا ہے کہ ”اُن کے لئے جو ایمان لائیں“ ①

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضِعُّ طَائِفَةً مِنْهُمْ

يُدْعِي أبنَاءَهُمْ وَيَسْتَحِي نِسَاءَهُمْ ④ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ⑤

”بلاشبہ فرعون نے دنیا میں گھمنڈ کیا اور اُس کے رہنے والوں کو متفرق جماعتوں میں تقسیم کر دیا کہ ایک گروہ کو اُن میں سے وہ کمزور بناتا تھا، اُن کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھ لیتا تھا، یقیناً وہ خرابی پھیلانے والوں میں سے تھا۔“

### مظالم فرعون:

یہ ”کمیاولی“ سیاست ”لڑاؤ اور حکومت کرو“ وہ ہے جسے قرآن نے فرعون کے نمبر ایک جرم کے طور پر پیش کیا ہے لیکن دنیائے مغرب اور مشرق میں حکمرانوں اور خصوصاً بڑی طاقتوں کی وہی سیاست آج تک برقرار ہے۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعُّوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ

الْوَرَثِينَ ⑥ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِي فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ

مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ⑦

”اور ہمارا مقصود یہ ہے کہ احسان کریں اُن پر جنہیں دنیا میں دبا یا پیسا گیا تھا اور انہی کو پیشوا قرار دیں، اُنہی کو آخر میں قابض و متصرف بنائیں، اُنہیں زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون اور ہامان اور اُن کے تمام لاؤ لشکر کو اُن کی جانب سے وہ شے دکھلائیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔“

قبل کی آیت کے لحاظ سے محل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ”ارادہ بھی ماضی سے متعلق ہو، اس لئے بعض مترجمین نے ترجمہ اسی طرح کیا ہے

① لا تهم منتفعون به (تبیان)



[۱] مگر قرآن کے الفاظ میں مضارع کا صیغہ ہے جو حال و مستقبل کو بتاتا ہے اس لئے دوسرے مترجمین کو اسی کے مطابق ترجمہ کرنا پڑا ہے۔ [۲] ہم سمجھتے ہیں کہ ذکر ماضی کے ذیل میں خالق نے اپنے مستقبل اصول کا اعلان فرمایا ہے کہ ہمیشہ ہماری سنت یہی ہے اور اس صورت میں بعد میں جو فرعون اور ہامان کا نام ہے وہ بھی بمناسبت سیاق ہے اور مراد اُس سے ہر دور کے فرعون صفت اور ہامان منشا افراد ہیں جس کے لئے معصوم رہنمایان دین کے ارشادات بھی موجود ہیں جنہیں علامہ طبری نے مجمع البیان میں درج فرمایا ہے۔

اب یہاں اس عام اصول کے ذیل میں جو حسب ذیل فقرے ہیں: ”انہیں امام بنائیں گے“، انہیں آخر میں قابض و متصرف بنائیں گے“، انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں گے۔“ ان الفاظ کو سامنے رکھیے اور پھر اس اہمیت کے لئے جو خصوصی اعلان ہوا ہے کہ:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۗ (نور- ۵۵)

اللہ کا وعدہ ہے اُن سے جو تم میں سے ہے ایمان رکھتے ہوں اور نیک اعمال کے پابند رہیں کہ وہ انہیں روئے زمین میں خلیفہ بنائے گا اُس طرح جیسے خلیفہ بنایا انہیں جو اُن سے پہلے تھے اور ضرور وہ اُن کے لئے اُس دین کو باقتدار بنائے گا جسے اُس نے ان کے لئے منتخب کیا اور انہیں خوف و دہشت کے بدلے امن و سکون عطا فرمائے۔

یہ وعدہ انہی افراد امت کے لئے ہوگا جنہیں دنیا میں دبا یا گیا اور پیسا گیا اور انہی کے واسطے آخر میں یہ وعدہ الہی پورا ہوگا۔ وہی امام خلق ہوں گے اور وہی وارث زمین ہوں گے نہ کہ وہ جو قہر و غلبہ کے مالک ہو کر دوسروں پر مظالم ڈھائیں اور اپنے اقتدار کی خاطر حق پرستوں کو سولیوں پر چڑھائیں، قید خانوں میں بند رکھیں یا تلواروں کے گھاٹ اتاریں۔ یہ تو کردار کے لحاظ سے جنود فرعون و ہامان میں داخل ہیں، جنہیں آخر میں اپنے منصوبوں کے خلاف مظلوموں کا اقتدار دیکھنا نصیب ہوگا، وہی مظلومین کے لئے قرآن کی روشنی میں ہماری دعا ہے: سَجَّلَ اللَّهُ فَرْجَهُمْ۔

**وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا**

**تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۗ إِنَّا رَأَوُوهُ إِلَيْكَ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝۴**

”اور ہم نے مادر موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ تم اُسے دودھ پلاؤ، اسکے بعد جب اس کے لئے تمہیں خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور ڈرو نہیں اور نہ رنج کرو۔ ہم بلاشبہ اسے واپس پلٹائیں گے تمہاری طرف اور اُسے پیغمبروں میں سے قرار دیں گے۔“

**مادر موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی اور اُس کی تفصیل:**

عام خیال یہی ہے کہ یہاں اس قلبی القاء کو جو خالق کی جانب سے نیک بندوں کے لئے ہوتا ہے وحی کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس

[۱] اور ارادہ کرتے تھے ہم یہ (شاہ رفیع الدین)

[۲] می خواہیم (شاہ ولی اللہ)

لئے بعض مترجمین نے وحی کا ترجمہ یہاں الہام کے ساتھ کیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:

”اُن کی ماں کے دل میں پڑ گیا یا خواب میں دیکھا“ (موضح القرآن)

یہ تڑدو تڑدو دیکھنا انداز انہوں نے جلالین سے اخذ کیا ہے جنہوں نے لکھا ہے:

او حیٰنا وحی الہام او منامہ: ہم نے وحی بھیجی الہام والی وحی یا خواب والی۔

ہماری قدیم تفسیر میں ہے کہ ندائے آسمانی آئی جس میں انہیں یہ باتیں بتائی گئی اور یہ صندوق بھی قدرتی طور پر آسمان سے اُتر آتا تھا۔<sup>[۲]</sup>

قرآن مجید نے مادرِ موسیٰ ﷺ کو پہنچائے ہوئے پیغام میں جتنے تفصیلات بتائے ہیں کہ:

۱۔۔۔۔۔ پہلے تو دودھ پلاتی رہنا۔

۲۔۔۔۔۔ جب خطرہ قریب آجائے تو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا

۳۔۔۔۔۔ ڈرنا نہیں

۴۔۔۔۔۔ غم نہ کرنا

۵۔۔۔۔۔ ہم پھر اُسے تم تک واپس لائیں گے

۶۔۔۔۔۔ ہم اسے پیغمبروں میں قرار دیں گے۔

یہ تفصیلات نہ خطور قلبی کی حیثیت کے ہیں، نہ خواب کے۔ اتنی باتوں کے خواب میں بھی کہنے کے لئے کوئی شخص ہونا چاہیے۔ اس لئے

ہمارے نزدیک تو یہ خالق کی طرف کی ویسی ہی وحی ہے جو صاحبان منصب کے لئے ہوتی ہے اور یہ اُس تصور کے شواہد میں سے ہے جو ہماری مستقبل

نظر یہی کی حیثیت رکھتا ہے کہ طبقہ خواتین میں بھی وقتاً فوقتاً کچھ صاحب منصب شخصیتیں ہوتی رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس منصب کا نام تعینی طور پر

ہمیں معلوم نہ ہو، کوئی بعید نہیں ہے کہ اس دور میں وہ صاحب منصب ذات اُنہی مادرِ موسیٰ ﷺ کی ہو۔

جناب شیخ الطائف نے خواب اور نبوت دونوں کی صراحت نفی کی ہے لیکن اس کی نوعیت کو پھر معین نہیں کیا ہے۔<sup>[۳]</sup> لیکن قدماء کے یہاں

بھی یہ قول موجود ہے کہ جبرائیل ﷺ نے آکر باقاعدہ یہ حکم الہی پہنچایا۔<sup>[۴]</sup>

**فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ**

**وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِبِينَ ﴿۸﴾**

”تو اُسے اٹھالیا فرعون کے گھر والوں نے تاکہ وہ اُن کے لئے دشمن اور سرمایہ رنج و غم ہو۔ یقیناً فرعون اور ہامان اور

[۱] الہام فرستادیم (شاہ ولی اللہ)

[۲] انزل اللہ علی موسی التابوت ونودیت ائمہ ضعیبہ فی التابوت (علی ابراہیم)

[۳] لیس وحی نومر ولا نبوہ فی قول قتادہ وغیرہ (تبیان)

[۴] قیل اتاہا جبرئیل بذلک (مجمع البیان)

اُن کے لاؤ لشکر والے (سب) خطا کا رتھے۔“

قرآن کا عام انداز بیان جو ہے کہ وہ واقعات کی کڑیوں کو فہم خلاق کے سپرد کر کے آگے بڑھ جاتا ہے، وہی یہاں بھی ہے، اس کے قبل کہا گیا تھا کہ مادر موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی گئی کہ تم اُسے دودھ پلاؤ یہاں تک کہ جب تمہیں خطرہ محسوس ہو تو اُسے دریا میں ڈال دینا۔ اب خود سمجھ لیجئے کہ یہ سب کچھ ہوا، کچھ روز جناب موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے پاس رہے اور وہ انہیں دودھ پلاتی رہیں [۱] اس کے بعد انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ بس اب فرعون کے آدمی آتے ہیں اور وہ بچہ کو لے جا کر قتل کر دیں گے تو انہوں نے فرمان ربانی کے مطابق انہیں صندوق میں رکھ کر دریا میں بہا دیا اور وہ صندوق بہتے بہتے عین فرعون کے محل کے نیچے پہنچا، بس اب اس کے بعد قرآن بتا رہا ہے کہ کیا ہوا؟ [۲]

اُس صندوق کو فرعون کے آدمیوں نے دریا سے نکال لیا، یہاں ارشاد ہوا ہے: لیکون لہم عدوا و حزنا تا کہ وہ اُن کے لئے دشمن جان اور باعث رنج و غم ثابت ہوں۔“ اسے علمائے معانی و بیان نیز مفسرین دوسرے مقامات پر جہاں ضرورت ہوتی ہے، اس کی مثال میں پیش کرتے ہیں کہ کبھی قہری طور پر مترتب شدہ نتیجہ عرض و غایت کے طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ اُن کا بچہ کو اٹھانا اس مقصد سے نہ تھا کہ یہ اُن کے دشمن ثابت ہوں بلکہ انہوں نے تو اس لئے اٹھایا تھا کہ وہ مثل اولاد کے اُن کے یہاں پلپیں، بڑھیں اور اُن کے خاندان کے ایک فرد کے طور پر زندگی گزاریں مگر چونکہ ہوا یہ کہ وہ بڑے ہو کر اُس انقلاب کے بانی ہوئے جس کے خطرات سے اب تک فرعون نے بے شمار، بے تصور بچوں کی جانیں لی تھیں، اس لئے یہ کہا گیا کہ انہوں نے اس لئے انہیں پالا کہ دشمن ثابت ہوں۔ [۳]

پھر بعد میں بتایا گیا کہ یہ قدرت کا انتظام اُن کے مظالم کا انتقام لینے کے لئے تھا، اس لئے کہ وہ بڑے خطاوار تھے۔ وہ اپنی تباہی و بربادی میں کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتْ عَيْنِي لِي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ اَنْ يَنْفَعَنَا اَوْ

نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ④

”اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ ارے، میرے اور تمہارے لئے آنکھ کی ٹھنڈک ہے، تم لوگ اسے قتل نہ کرو بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنائیں اور انہیں حقیقت کی خبر نہ تھی۔“

زوجہ فرعون کی گفتگو اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی پرورش:

اس کے پہلے کہا گیا ہے کہ آل فرعون نے اسے اٹھالیا اور اب بیوی کا ذکر اس سے الگ کر کے امرأة فرعون کے الفاظ سے کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ بیوی آل فرعون میں داخل نہیں تھی اور بعض مترجمین نے جو وہاں کسی خاص مقصد سے آل فرعون کا ترجمہ ”اہل خانہ“ سے کر دیا

[۱] لہا ارضعت ثلاثة اشهر... وخافت عليه نوضعتہ في تابوت واغلقته والقته في بحر النيل (جلالین)

[۲] في الكلام حذف لان تقديره ان امر موسى طرحتہ في البحر ومضى في البحر الى ان بلغ قصر فرعون (تبیان)

[۳] ای لیکون لہم فی عاقبة امره كذلك لا تمہم اخذوه لهذا كما يقال لمن كسب مالا فاذا ذالك الى المحتف والهالك اتما كسب فلان محتفه وهو لم يطلب المال للمحتف (مجمع البيان)

ہے [۱] وہ درست نہیں ہے۔

سلسلہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دریا سے نکالنے کے بعد فرعون اور اس کے ارکانِ دولت یا فوجیوں نے چاہا کہ بچہ قتل کر دیں اس وقت زین فرعون آگے بڑھی [۲] اور اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا: قَرَّةَ عَيْنٍ لِي وَلِكُ لِيَعْنِي 'اے، یہ پیارا پیارا بچہ تو میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتا ہے'۔ اس پر شوہر چپ ہو گیا تو اب اُس کے سکوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر منع کر دیا کہ اسے نہ مارو۔ یہ ہمارے لئے نفع بخش ہوگا، یا ہم اسے بیٹا بنالیں گے'۔ یہاں 'ہم' کی لفظ میں اُس نے شوہر کو اپنے ساتھ شریک کر لیا کہ یہ بھی اس فیصلہ میں مجھ سے متفق ہیں، اب کس کی مجال تھی جو قتل کرتا۔

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَرِحًا ۖ إِنَّ كَادَتْ لِتَبْدِي بِيهِ لَوْلَا أَنَّ رَبَّنَا عَلَيَّ قَلْبَهَا  
لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ ۖ فَبَصُرَتْ بِهِ عَنْ جُنُبٍ وَهُمْ  
لَا يَشْعُرُونَ ۝ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ  
بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَصْحُونَ ۝ فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا  
تَحْزَنَ ۖ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

’اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل بے تاب ہو گیا، قریب تھا کہ وہ اُس راز کو نمایاں کر دیں اگر ہم اُن کے دل کو مضبوط نہ کرتے تاکہ وہ ایمان والوں میں ثابت ہوں اور انہوں نے اُس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے جاؤ تو اُس نے اُسے دور سے دیکھا در حالیکہ اُن لوگوں کو خبر نہ تھی اور ہم نے اس پر اناؤں کو پہلے سے حرام کر دیا تھا تو اس (بہن) نے کہا کہ کیا میں تم لوگوں کو ایک گھر انا بتاؤں، جو پال دے اس کو تمہارے لئے اور وہ اُس کے خیر خواہ ہوں گے تو پلٹا یا ہم نے اُس کی ماں کی طرف تاکہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور تاکہ وہ جانیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اُن میں سے زیادہ لوگ جانتے نہیں‘۔

فارغا کی لفظ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ’بے تاب‘ یہ ایک تشریح کے مطابق ہے [۳] دوسری تشریح ایک ہے [۴] جس کے لحاظ سے یہ معنی ہوں گے کہ اُن کا دل (موسىٰ علیہ السلام کے تصور میں) محو تھا، تیسری تشریح [۵] کے مطابق فارغ کے معنی ’بے فکر‘ کے ہوتے ہیں کیوں کہ وحی ربانی سے انہیں بچہ کی سلامتی اور پھر واپسی کا یقین ہو گیا تھا مگر بعد کے جملہ سے کہ اللہ اُن کا دل مضبوط نہ کرتا تو وہ اُسے نمایاں کر دیتیں، پہلے مفہوم کو زیادہ

[۱] برگرفتند آن راہل خانہ فرعون (شاہ ولی اللہ)

[۲] قال ابن عباس: ان اصحاب فرعون لما علموا بموسى جاءوا اليه فقتلوه فمنعتهم وقالت لفرعون: قرت عين لي ولك (مجمع البيان)

[۳] خالی از صبر (شاہ ولی اللہ) خالی صبر سے (شاہ رفیع الدین)

[۴] ای خالیاً من کل شیء الا من ذکر موسی ای صار فارغاً عن ابن عباس وقتادة والضحاك (مجمع البيان)

[۵] قيل فارغا من الحزن لعلمها بان ابنها ناج (مجمع)

قوت حاصل ہے۔

یہ انتظام قدرت تھا انہیں اُن کی والدہ تک دوبارہ پہنچانے کا کہ القائے ربانی سے وہ کسی اٹا کی طرف رُخ نہ کرتے تھے، اس باطنی ہدایت کو جس کی بنا پر وہ کسی دودھ پلانے والی کی طرف رُخ نہ کرتے تھے، خالق نے یوں تعبیر کیا ہے کہ ”ہم نے اُن پر اناؤں کو پہلے سے حرام کر دیا تھا۔ یہ ایک طرح کا حکم تکوینی تھا، نہ کہ حکم تکلیفی جو سن و سال سے تعلق رکھتا ہو۔“<sup>[1]</sup>

ہمارے نزدیک یہ جملہ صریحی ثبوت ہے اس کا کہ وہ پہلے کی سب باتیں کہ تم ان کو دودھ پلاتی رہو اور جب خطرہ قریب ہو تو دریا میں ڈال دینا اور ڈرنا نہیں اور رنجیدہ نہ ہو۔ ہم اُسے پھر تم تک پہنچا دیں گے اور اُسے آگے چل کر رسول بنا لیں گے..... یہ سب ذہنی تصورات قلبی خطورات نہ تھے جیسا کہ بعض کا تصور ہے بلکہ وہ سب خداوندی پیغام تھے جو اُن تک کسی ذریعہ خاص سے پہنچائے گئے تھے۔

**وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۗ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣﴾**

”اور جب وہ شباب کی منزل تک پہنچے اور پورے قد و قامت پر آگئے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور اسی طرح ہم صلہ دیتے ہیں نیک اعمال افراد کو۔“

حکمت اور علم کا عطا کرنا قرآن مجید میں نبوت عطا کرنے کی ایک تعبیر ہے جس کی صراحت بعض قدیم مفسرین کے کلام میں موجود ہے مگر یہاں پر جلالین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ:

قبل ان يجعله نبيًا: قبل اس کے کہ وہ نبی بنائے جائیں۔

یہ شاید اس بنا پر ہے کہ نبوت تو اُس وقت ملی ہے جب وہ آگ لینے گئے تھے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

خدا کے دین کا موسیٰ ﷺ سے پوچھیے احوال

کہ جائیں آگ کو لینے بیمبری مل جائے

مگر یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ حکمت اور علم کا عطا کرنا نبوت کے منصب ہی کی تعبیر ہے اور وہ مصر سے نکلنے کے پہلے نبی ہو چکے تھے اور واپسی میں جب آگ لینے گئے تو وہ رسالت کے منصب پر فائز کئے گئے جیسا کہ ہمارے یہاں کی بعض دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت کا منصب رسالت کی منزل سے فروتر ہے، پھر بھی آیت کے آخری فقرہ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ سے یہ ثابت ہے کہ اُس کے پہلے بھی حسن عمل اُن کی زندگی کا وصف تھا اور جلالین کی بھی وہ تشریح اس حیثیت سے پیش قیمت ہے کہ خالق کے اس ارشاد کے بعد کہ اُن کو ہم نے علم و حکمت عطا کر دیا، اُن کے اُس عمل کو جو اس کے بعد ہی مذکور ہے کہ اُنہوں نے ایک مومن کی حمایت کرتے ہوئے قبطی کو مارا جس سے وہ مر گیا، کوئی ایسا عمل نہیں سمجھا جاسکتا جو شانِ نبوت کے خلاف ہو اور پھر آخری جملہ: كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں حسن عمل منصب الہی کا نتیجہ نہیں ہوتا کہ چونکہ وہ نبی ہو گئے اس لئے معصوم ہیں بلکہ اُن کا منصب حسن عمل مرتب ہے کہ چونکہ وہ معصوم ہیں، اس لئے اللہ نے نبی بنایا ہے اور جزء کا مفہوم یہاں ان کی صلاحیت ذاتی کے تقاضا کو پورا کرتا ہے۔

[1] فلهذا تحريم منع لان هناك نهيا عن الفعل (مجمع البيان)

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَى حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هٰذَا مِنْ شَيْعَتِهِ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنَ شَيْعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ ۗ فَوَكَرَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۗ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَاغْفِرْ لَهُ ۗ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٦﴾ قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ﴿١٧﴾

”اور وہ شہر کے اندر گئے ایسے وقت جب وہاں کے لوگوں کو خبر نہ تھی تو وہاں دیکھا دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے ہوئے، یہ اُن کے دوستوں میں سے تھا اور یہ اُن کے دشمنوں میں سے تو اس نے جو اُن کے دوستوں میں سے تھا فریاد کی اُن سے اُس کے خلاف جو اُن کے دشمنوں میں سے تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے اُسے گھونسا مار دیا تو اس نے اس کا فیصلہ کر دیا، کہا یہ شیطان کی کارستانی کا نتیجہ ہے، بلاشبہ وہ کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے، کہا اے میرے پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا اب تو مجھے بخش دے تو اُس نے اُنہیں بخش دیا، بلاشبہ وہ بڑے بخشنے والا ہے، بڑا مہربان، کہا اے میرے پروردگار! اس بنا پر کہ تو نے مجھے اپنی نعمت سے نوازا ہے میں کبھی گنہگاروں کا پشت پناہ نہیں ہوں گا۔“

### قبلی کے قتل کا واقعہ:

فَوَكَرَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ”موسیٰ علیہ السلام نے اُسے گھونسا مار دیا تو۔۔۔ اس نے اس کا فیصلہ کر دیا“ اس سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصد اس قبلی کی جان لینے کا نہ تھا بلکہ اُس گھونسا ہی مارا تھا، اب وہ گھونسا ہی رہتا تو اس میں زیادہ اہمیت پیدا نہ ہوتی، ایک وقتی بات تھی جس سے اُس اسرائیلی کو تقویت ہو جاتی اور وہ قبلی گھبرا کہ بھاگ جاتا مگر ایک گھونسے ہی میں وہ آدمی جو ایک دم ختم ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معاملہ کی نزاکت کا احساس ہوا کہ اب یہ بات فرعون تک ضرور پہنچے گی اور اس کے نتیجہ میں دیکھنے کیا ہوتا ہے؟ اُس کے مرجانے پر جو فوراً اضطراری کیفیت جناب موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی، وہ خود اس کا ثبوت ہے کہ یہ اُن کا مقصود نہ تھا، ورنہ اُن کو اپنی کامیابی پر خوش ہونا چاہیے تھا۔ اب عمل شیطان جو کہہ رہے ہیں وہ اس غیر ارادی نتیجہ کو یعنی گھونسا مارنا تو میرا کام تھا، مگر اُس کا اتنا مہلک ہونا، یہ غیر ارادی بات ہے، جو شیطان کی کارستانی ہی کہی جاسکتی ہے۔

اسی اضطراب میں انہوں نے خالق سے یہ مناجات کی۔ یہ اندیشہ کسی عذاب اخروی یا غضب الہی کا نہ تھا بلکہ فرعون کے عتاب کا اندیشہ تھا جسے سمجھنا چاہیے کہ حکم تقیہ کی مخالفت تھی جو قہری طور پر اُن سے سرزد ہو گئی تھی جس کے لئے اللہ سے بخشش کے طلب گار تھے۔ غور کیا جائے تو یہاں

بخشش کا مطلب خالق کی طرف سے اُس کے نتائج بد سے بچانے کا انتظام تھا اور چونکہ قانون الہی کی خلاف ورزی کا سنگین جرم نہ تھا اس لئے فوراً ہی اللہ نے اپنی بخشش کا اعلان فرما کر فرعون کے ساتھ سے جو اندیشے جناب موسیٰ علیہ السلام کو ہو سکتے تھے اُن سے حفاظت کو اپنے ذمے لے لیا۔

اب ایک ضمنی بات اس مقام پر قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ انبیاء اور اہل ولایت کے دوست کی تعبیر قرآن مجید نے لفظ ”شیعہ“ کے ساتھ کی ہے جس میں مخالفین اکثر کچھ ذم کے پہلو نکالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے وہ قابل فخر لقب ہے اور اس لئے آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس پر اپنے شیعوں کو مبارک باد دی ہے۔<sup>[۱]</sup>

اس سے یہ تلخ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ جسے رسول و آل رسول علیہم السلام کے شیعہ ہونے سے انکار ہو، اسے پھر ان کے ”عدو“ ہونے کا تمغہ قبول کرنا ہوگا کیوں کہ قرآن نے من شیعۃ کے مقابل کی صفت من عدوہ قرار دی ہے اور کوئی نہیں۔

**فَاصْبَحْ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اَسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ  
يَسْتَصْرِحُهُ ۗ قَالَ لَهُ مُوسَى إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَنْ يَبْطِشَ  
بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۗ قَالَ يُمُوسَى أَتُرِيدُ أَنْ تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا  
بِالْأَمْسِ ۗ إِنْ تُرِيدُ إِلَّا أَنْ تَكُونَ جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَنْ تَكُونَ مِنَ  
الْمُصْلِحِينَ ﴿۱۹﴾**

دوسرے دن صبح کو نکلے وہ اُس شہر میں خوف زدہ، نتیجہ کے منتظر، ایک دفعہ دیکھا کہ جس نے کل اُن سے مدد طلب کی تھی، وہی پھر اُن کو چیخ چیخ کر مدد کے لئے پکار رہا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا تو بلاشبہ کھلا ہوا گمراہ ہے۔ اب جو انہوں نے چاہا کہ حملہ کریں اُس پر جو اُن دونوں کا دشمن تھا تو اُس نے کہا کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے قتل کر دو جس طرح کل ایک آدمی کو قتل کیا؟ تم نہیں چاہتے سوا اس کے کہ سرکش ہو کر رہو دنیا میں اور تم اصلاح کرنے والے نہیں ہونا چاہتے“

یہ کس نے کہا؟ بظاہر جس پر حملہ کرنا چاہا تھا، اُسی نے کہا جس سے پتہ چلا کہ کل کے اُس شخص کے قتل ہو جانے کا راز کھل چکا ہے لیکن شاہ ولی اللہ نے ترجمہ میں لکھا ہے ”گفت فریاد کنندہ۔“

اور حاشیہ پر لکھا ہے: یعنی چوں موسیٰ اور اغوی، مبین گفت دانست کہ غضب کردہ بر سر من می آید۔  
یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ”کھلا ہوا گمراہ“ کہا تو اس نے جانا کہ وہ غصہ کرتے ہوئے میرے سر پر آرہے ہیں۔  
اور ان کے پہلے جلالین نے لکھا ہے:

[۱] روی ابو بصیر عن ابی عبد اللہ ﷺ اِنَّهُ قَالَ لِيَهْتَكُمُ الْاِسْمُ قَالَ قُلْتُ وَمَا لِسْمِ؟ قَالَ ”الشَّيْعَةُ“ اَمَّا سَمِعْتَ اللّٰهَ سَبَّحَانَهُ يَقُولُ : فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنَ شَيْعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنَ عَدُوِّهِ (مجمع البيان)

قال المستغيث ظاناً انه يبسط به لما قال له۔

جس نے فریاد کی تھی، اس نے یہ کہا اُس گمان پر کہ یہ اُس پر حملہ کر رہے ہیں چونکہ انہوں نے کہا ”تو بلاشبہ گمراہ ہے۔“

جناب الطائف نے انکشاف کیا ہے کہ یہ اصل میں جناب ابن عباسؓ وغیرہ کا قول ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی مدد کے لئے چلے تھے، اس نے اس غلط فہمی پر کہ یہ اُس پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، یہ جملہ کہہ کر راز فاش کر

دیا۔

بہر حال جس طرح ان آیات کا مفہوم اس مقام پر سمجھا جاتا ہے، اُس میں ایک بات ناقابل فہم معلوم ہوتی ہے یا یوں کہا جائے کہ ان کڑیوں کا باہمی تسلسل دشوار محسوس ہوتا ہے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر کہ وہی اسرائیلی جو کل ایک شخص سے لڑ چکا ہے اور جس کی حمایت میں اب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پریشانی میں مبتلا ہوئے ہیں، آج پھر دوسرے آدمی سے جو فرعون کے قبیلے والا ہے، لڑ رہا ہے، یہ سمجھ گئے کہ فساد ہی اسرائیلی ہے اور اس لئے اس سے کہا: إِنَّكَ لَعَوِيٌّ مُّبِينٌ ”تو کھلا ہوا گمراہ ہے“ یعنی لڑا کا ہے کہ ایک ایک سے لڑتا ہے۔ اب پھر انہوں نے ارادہ کیا کہ جو ان دونوں کا دشمن ہے اور بلاشبہ اس سے مراد وہی قبطی ہے جس سے وہ اسرائیلی آج لڑ رہا ہے، اس پر حملہ آور ہوں، کہوں؟ جب کہ ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا کہ یہی اسرائیلی فساد ہی ہے اور اُسی کی روزگزشہ حمایت کرنے سے وہ پریشانی میں مبتلا ہیں تو وہ اب اس قبطی پر حملہ آور ہونے کے لئے کیوں آگے بڑھے؟ اس لئے یہاں علامہ طبرسیؒ کی تشریح درست معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی باہمی آویزش کو دیکھ کر اس اظہار کے بعد کہ وہی اسرائیلی مفسدہ پرداز ہے، اب وہ آگے اس لئے بڑھے تھے کہ اُس قبطی کو اُس اسرائیلی سے الگ کر کے بچاؤ کر دیں مگر چونکہ انہوں نے اسرائیلی کو زور سے ڈانٹا تھا، اس لئے وہ یہ سمجھا کہ یہ مجھ پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور اس نے وہ جملہ کہہ کر کل کے قتل کا راز فاش کر دیا اور بات فرعون تک پہنچ گئی جس پر انہوں نے اُن کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

علامہ طبرسیؒ نے اس قول کی نسبت کہ یہ جملہ کہنے والا اسرائیلی تھا۔ جناب ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین کی طرف دی ہے اور دوسرے قول کو کہ جملہ قبطی نے کہا تھا بطور قول شاذ کے نقل کیا ہے۔ [۱]

وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ

لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنَّ لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ ﴿۲۵﴾

”اور آیا شہر کے آخری حصے سے ایک شخص دوڑتا ہوا، اس نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تمام بڑے آدمی تمہارے

خلاف سازش کر رہے ہیں کہ تمہیں قتل کر دیں تو تم باہر نکل جاؤ، یقیناً میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف و دہشت کے عالم میں مصر سے نکلنا:

بعض کا خیال ہے کہ یہ وہی ”مومن آل فرعون“ تھا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ ہے بلکہ سورہ اسی کے عنوان پر معنون

[۱] عن ابن عباس واکثر المفسرین وقال الحسن هو من قول القبطی (مجمع البیان)



ہے ”سورة المؤمن“ حالانکہ اس کے اصل نام میں اختلاف ہے [۱] مگر نام کی کیا اہمیت ہے۔ اصل تو کام ہے جو اس نے انجام دیا اور وہ اس کے مکمل ایمان نہیں تو بڑی حد تک خدا ترسی کی دلیل تو ہے ہی۔

### فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ ۚ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۲۱﴾

”اور جب نکلے وہ وہاں خوف زدہ، نتیجے کے منتظر کہا اے میرے پروردگار مجھے چھٹکارا دے اس ظالم جماعت سے۔“  
الفاظ آیت سے جناب ابن عباسؓ کی یہ تشریح بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ مصر سے نکلنے وقت جناب موسیٰؑ کو راہ معلوم نہ تھی کہ کدھر جائیں تو منزل تک پہنچیں گے [۲] بلکہ میں الفاظ آیت سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے پیش نظر کوئی منزل تھی ہی نہیں، جدھر نہیں جانا ہے، وہ بس اللہ کے بھروسے پر نکل کھڑے ہوئے تھے اور نصب العین صرف اس وقت فرعون کے شکنجے سے نکلنا تھا اور یہی وہ مناسبت ہے جس کے لحاظ سے امام حسینؑ طلب بیعت کے بعد جب مدینہ سے نکلے ہیں تو آپ اس آیت کے تلاوت فرما رہے تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مدینہ سے یہ منصوبہ بنا کر نہیں نکلے تھے کہ آپ کو کوفہ جانا ہے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّيٰٓ اَنْ يَّهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿۲۲﴾ ۚ وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ

مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْكُوْنَ ۚ وَوَجَدَ مِنْ دُونِهِمْ اُمَّرَاتَيْنِ تَدُوْدٰنِ ۗ

قَالَ مَا خَطْبُكُمْ آ قَالَتَا لَا نَسْقٰٓى حَتّٰى يُّصَدَرَ الرَّعَاءُ ۗ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰٓى

لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّى لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَىٰٓى مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾

”اور جب وہ مَدْيَنَ کی طرف روانہ ہوئے تو کہا امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے سیدھے راستے کی طرف لے جائے گا اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو پایا اس پر ایک جماعت کو آدمیوں کی کہ وہ مویشیوں کو پانی پلا رہی ہے اور ان سب سے الگ دو (۲) عورتوں کو پایا کہ وہ الگ کھڑی ہیں۔ انہوں نے کہا تم دونوں کی کیا صورت حال ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم اس وقت نہیں پلائے جائیں گے جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پلا کر لے نہ جائیں اور ہمارے باپ بہت سن رسیدہ بوڑھے ہیں تو انہوں نے ان دونوں کے جانوروں کو پانی پلا دیا، پھر سایہ میں چلے گئے اور کہا اے میرے پروردگار! میں اس کا جو تو مجھ پر نعمت اتارے، محتاج ہوں۔“

### دختر ان جناب شعیبؑ کا واقعہ:

ان آیات کے ابتدائی جملہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ روانہ تو ہوئے تھے مصر سے بغیر کسی منزل مقصود کے مگر پھر راستے میں انکے ذہن میں مدین کی طرف جانے کا خیال پیدا ہو گیا اور اس القائے ربانی سے وہ خوش ہوئے کہ ادھر جانے کا نتیجہ میرے لئے اچھا ہوگا۔

[۱] كان الرجل حز قیل مؤمن ال فرعون وهر ابن عمه فرعون وقیل رجل اسمہ شمعون وقیل سمعان (مجمع البيان)

[۲] قال ابن عباس خرج موسى متوجها نحو مدین ولبس له علم بالطريق الا حسن ظنه بربه (مجمع البيان)

”مدین کا پانی“ یعنی وہ کنواں جس سے لوگ پانی بھر کے بستی کے اندر لے جاتے تھے اور اپنے مویشیوں کو بھی سیراب کرتے تھے۔  
 ”وہ دو عورتیں الگ کھڑی ہیں“ اس کا کیا مطلب؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے جانوروں کو پانی پینے کے لئے آگے بڑھنے سے روکتی ہیں تاکہ دوسرے لوگ پلا لیں، تب وہ پانی پلانے کے لئے جائیں جو بحیثیت واقعہ بعد کے خود قرآنی بیان سے جو ان لڑکیوں کی زبانی ہے، ظاہر ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنی بکریوں کو دوسروں کی بکریوں سے لگ بھاتی تھیں کہ کہیں وہ ان میں مل نہ جائیں، بحیثیت واقعہ یہ سب باتیں ٹھیک ہو سکتی ہیں اور ہر ایک موافق میں مفسر کا قول بھی ہے [۱] مگر خود الفاظ قرآنی کی مطابقت کے لحاظ سے قریب تر پہلا ہی مفہوم ہے۔

ما خطبکما جس کا ترجمہ میں نے کیا ہے ”تم دونوں کی کیا صورت حال ہے؟“ اس سوال میں دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ تم اپنے مویشیوں کو لئے الگ کیوں کھڑی ہو؟ دوسرے یہ کہ تم عورت ذات ہو کر آخر مردوں کی اس بھیڑ میں مویشیوں کو پانی پلانے کیوں آئی ہو؟ اس کے لئے کسی مرد کو آنا چاہیے تھا، ان صاحبزادیوں کے جواب میں ان دونوں باتوں کے متعلق وضاحت ہے۔

الگ کھڑے ہونے کا سبب تقاضائے نسوانیت کے ساتھ احساس شرافت ہے کہ اس بھیڑ بھاڑ اور دھکم پیل میں جانا ہماری شان کے خلاف ہے جب یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر لے جائیں، اور بھیڑ ختم ہو، تب ہم پانی پلائیں، چاہے اس میں کتنی ہی دیر کھڑا رہنا پڑے اور مضارع منفی میں جو تجدد و استمرار کا حامل ہے، یہ مفہوم مضمر ہے کہ ہم روز ایسا ہی کرتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور یہ کہ ہم کیوں آئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے گھر میں مردوں میں بس ہمارے والد ہیں اور وہ بہت بوڑھے ہیں، وہ خود آ نہیں سکتے تو پھر کون آئے؟ مجبوراً یہ خدمت ہم کو انجام دینا پڑتی ہے، ضمناً اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ وہ دونوں ناکتخرا ہیں، ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔

**فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمَشِيًّا عَلَى اسْتِحْيَاءٍ ۖ قَالَتْ إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۖ قَالَ لَا تَخَفْ ۗ نَجَّوْتِ مِنَ**

**الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۳۵﴾**

”تو آئی ان دونوں میں کی ایک راستہ چلتی ہوئی شرم کے ساتھ، کہا کہ میرے والد تمہیں بلا رہے ہیں تاکہ تمہیں معاوضہ دیں اُس کا جو تم نے ہمارے لئے پانی پلا دیا تو جب وہ ان کے پاس آئے اور تمام واقعات ان سے بیان کئے تو انہوں نے کہا کہ نہ ڈرو، تم نجات پا گئے اس ظالم جماعت سے“۔

حسب دستور قرآن مجید نے درمیان کی کڑیاں فہم مخاطبین و سامعین پر چھوڑتے ہوئے آگے کی بات بیان کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب جناب موسیٰ علیہ السلام نے ان لڑکیوں کے لئے پانی بھر دیا تو وہ اپنے والد بزرگوار کے پاس خلاف امید اس وقت سے پہلے پہنچ گئیں جس وقت وہ روزانہ پہنچا کرتی تھیں تو انہوں نے پوچھا کہ آج تم جلدی کیوں کر آ گئیں؟ انہوں نے واقعہ بیان کیا، انہوں نے کہا ارے، اس آدمی کو بلا کر لاؤ کہ اس نے ہمارے لئے اتنی زحمت اٹھائی ہے۔ اب ہمیں اس کا کچھ معاوضہ ادا کرنا چاہئے لہذا اب ان میں سے ایک جناب موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی جس کا اس

[۱] تمنعان غنمہما من الورود علی الماء عن السدی وقیل تذود ان الناس عن مواشیہما عن قتادة وقیل تکفان غنمہما من ان تحتلط باغنام الناس عن الحسن (مجمع البیان)

آیت میں تذکرہ ہے۔

اب معانی بیان میں جیسے ایک صنعت ہوتی ہے، رد العجز علی الصدر، اس طرح بیان قرآنی میں ہمیں اول باختر نسبتے وارد کی کیفیت نظر آتی ہے کہ جب جناب موسیٰ مصر سے نکلے تھے تو ان کی کیفیت قرآن میں یہ بیان ہوئی تھی کہ ”خائفاً یترقب“ (خوف زدہ نتیجہ کے منتظر) اور بارگاہ الہی میں مناجات تھی رب نجفی من القوم الظالمین پروردگار مجھے اس ظالم جماعت سے نجات دے، اب ان بزرگوار پیر مرد نے واقعات سن کر جو اطمینان بخش الفاظ کہے وہ اسی ترتیب سے یوں ہیں کہ ”لا تخف“ (خوف نہ کرو) ”نجوت من القوم الظالمین“ (تم اس ظالم جماعت سے نجات پا گئے)۔

اب مشہور روایت جسے عام طور پر ”مسلمات“ کی حیثیت حاصل ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ بزرگوار جناب شعیب علیہ السلام تھے اور چونکہ سرزمین مدین کے نبی کی حیثیت سے قرآن مجید میں بھی جناب شعیب علیہ السلام کا نام آیا ہے، اس سے اس مسئلے کو تقویت بھی ہوتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس واقعہ میں شعیب علیہ السلام کا نام نہیں لیا ہے اور اقوال تفسیر میں ان پیر مرد کے بارے میں متعدد ہیں۔ <sup>[۱]</sup> لہذا کسی ایک بات کو مسلمات میں سے سمجھنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

قَالَتْ اِحْدَهُمَا يَا بَتِ اسْتَا جِرْهُ لَانَّ خَيْرَ مَن اسْتَا جَرَتْ الْقَوْمِ الْاَمِيْنُ ﴿۳۶﴾  
 قَالَ اِنِّي اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتِي هَتَيْنِ عَلٰى اَنْ تَاَجِرْنِيْ ثَمِيْنِيْ حَجَجٌ ؕ فَاِنْ  
 اَتَمَمْتِ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ؕ وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ  
 مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيِّنِيْ وَبَيِّنْكَ ؕ اَيُّمَا الْاَجْلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ  
 عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۳۸﴾

”اُن میں کی ایک نے کہا ”اباجان! ان کو مزدوری میں رکھ لیجئے بہترین شخص جسے آپ مزدوری کے لئے رکھیں، وہی ہے جو طاقت ور بھی ہو اور امانت دار بھی۔ انہوں نے کہا کہ میں تم سے اپنی دونوں بیٹیوں میں سے اس ایک کا عقد کرنا چاہتا ہوں اس شرط پر کہ تم آٹھ برس تک میری خدمت انجام دو گے، اس کے بعد اگر دس پورے کر دو تو وہ تمہارا احسان ہوگا اور میں تمہیں کوئی ناگوار زحمت نہیں دینا چاہتا، اللہ نے چاہا تو تم مجھے خوش کردار لوگوں میں سے پاؤ گے۔ انہوں نے کہا اچھا یہ میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ دونوں میں سے جو بھی مدت میں پوری کر دوں مجھ پر کوئی الزام نہ ہوگا اور اللہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس کا گواہ ہے۔“

[۱] قبیل کان الشیخ ابو ہما شعیباً وقال الحسن بل کان رجلاً مسلماً علی دین شعیب اخذ الذین عنہ وشعیب مات قبل ذلک وقال قوم انہ کان ابن اخی شعیب (تبیان)

## جناب شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو:

یہاں دو باتیں بقرینہ واقعات ذہن میں آتی ہیں: ایک یہ کہ گھر کے اندر یہ چرچا تھا اور ان لڑکیوں کے والد نے لڑکیوں کے علم میں یہ کہا تھا کہ میں ایسا آدمی چاہتا ہوں جو اس پیرانہ سالی میں میری مدد کرے اور اس سے میں ان لڑکیوں میں سے ایک کی شادی کر دوں گا، جب ہی اس صاحبزادی کے یہ کہنے پر کہ بس ان کو آپ مزدوری پر رکھ لیجئے، وہ بزرگوار یہ سمجھے کہ یہ ان سے شادی پر تیار ہے اور انہوں نے جناب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اجیر کرنے کی پیش کش کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کی پیش کش کر دی۔

دوسرا (۲) امر یہ ہے کہ چونکہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے پاس بلانے کے لئے ایک صاحبزادی گئی تھیں اور وہاں تعبیر ان سے احدہما (ان دونوں میں کی ایک) کی لفظ کے ساتھ ہوئی تھی تو یہ احدہما کا لفظ جیسے اس ایک صاحبزادی کی طرف اشارہ کے لئے ایک اصطلاح بن گئی یعنی اسی صاحبزادی نے پھر ان کو اس طرف توجہ دلائی کہ انہی کو اجیر بنا لیجئے جس سے والد نے محسوس کیا کہ یہ ان کی شریک حیات بننے پر رضامند ہے لہذا اسی سے جناب شعیب علیہ السلام نے (یا جوان بزرگوار کا نام ہو) عقد کرنے کے لئے جناب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ”ایجاب“ کیا اور انہی کے لئے جناب موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قبول ہوا۔ جس کی طرف ہماری قدیم تفسیر اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے ارشاد سے بھی صحیح رہنمائی ملتی ہے۔ [۱]

اس طرح یہ احدہما کا لفظ یہاں پر واحد غیر معین کے لئے نہ تھی جو تعین منکوحہ کے منافی ہو بلکہ وہ بسباق واقعات اس وقت متعین تھی جس کی تعین کے لئے بعد میں کسی تحقیق و دریافت کی ضرورت نہ تھی۔

تعب ہے کہ ہمارے اکابر علماء نے اپنی تفاسیر میں ان دونوں پہلوؤں پر توجہ نہیں فرمائی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ ان صاحبزادی کے جناب موسیٰ علیہ السلام کے پاس جانے میں قرآن نے علی استحیاء (شرم کے ساتھ) کی لفظ سے جس کیفیت کا اظہار کیا ہے، وہ اسی تصور سے ہو جو ان کے ذہن میں موجود تھا کہ انہی کے ساتھ میری شادی ہوگی۔

بہر صورت متعدد مقامات کی طرح قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ ہر دور میں شرافت کا معیار لڑکیوں میں شرم و حیا ہی رہا ہے نہ کہ اس دور کی طرح کوشش کر کے لڑکیوں کو بے شرم و بے حیا بنانا موجودہ دور کے ترقی پسندانہ نظام کی امتیازی خصوصیت ہے۔

قدیم مفسرین میں حسن کی زبانی جس سے غالباً حسن بصری مراد ہیں، اس علی استحیاء کے مفہوم کا بہت اچھا تجزیہ وارد ہوا ہے۔

[۲]

## فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَىٰ الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ نَارًا ۗ قَالَ

[۱] قلت له جعلت فداك ايتهما زوجة شعيب من بناته قال التي ذهبت اليه فدعته وقالت لا بيها يا ايت استاجر وان خير من استاجرت القوي الامين (علي بن ابراهيم) عن صفوان بن يحيى عن ابي عبد الله عليه السلام قال سئل ايتهما التي قالت ان ابي يدعوك قال التي تزوج بها (مجمع البيان)

[۲] فوالله ما كانت ولا جة ولا خراجة ولكنها كانت من الخفرات اللواتي لا يحسن المشي بين ايدي الرجال والكلام معهم (مجمع البيان)

لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ صَلَاةَكَ لِذِكْرِي وَلَا تُكْفِرْ بِمَا كُنْتَ تَكْفُرُ ۚ ﴿٢٩﴾ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يُمُوسَىٰ إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٠﴾ وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَآهَا تُهْتَزُّ كَانَتْهَا حَآئِنًا وَّكَلِيًّا مُدْبِرًا ۖ وَلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يُمُوسَىٰ أَقْبَلَ وَلَا تَخَفْ ۚ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ ﴿٣١﴾ أَسْلُكَ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخَرُّجَ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۚ وَوَاصِمًا إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ۚ فَذُنُوبِكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٣٢﴾

”تو جب موسیٰ علیہ السلام اُس مدت کو پورا کر چکے اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر چلے تو طور کی جانب سے ایک آگ محسوس کی، کہا اپنے گھر والوں سے کہ ٹھہرو میں نے ایک آگ محسوس کی ہے، شاید میں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر لاؤں یا کوئی چنگاری آگ کی کہ تم لوگ تا پتو جو وہاں گئے تو آواز آئی اُس وادی کی داہنی جانب سے اس مبارک سرزمین میں درخت سے کہ، اے موسیٰ علیہ السلام! میں اللہ ہوں تمام جہانوں کا پروردگار اور یہ کہ تم اپنا عصا پھینک دو تو جب انہوں نے اُسے دیکھا کہ وہ حرکت کر رہا ہے جیسے ایک سانپ ہے تو پیٹھ پھرا کر مڑے اور پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اے موسیٰ! آگے بڑھو اور ڈرو نہیں، تم محفوظ ہو، اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو۔ وہ نکلے گا سفید چمکتا ہوا بغیر کسی برائی کے اور پھر سمیٹ لو اپنے بازوؤں کو خوف سے تو یہ دونوں دلیلیں ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اُس کے ارکان سلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے، بلاشبہ وہ بد اعمال لوگ رہا کیے ہیں۔“

### وادیِ ایمن:

جناب موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ میں کوئی خبر لاؤں، اس کا مطلب یہ ہے کہ شاید وہاں آگ کے پاس کوئی شخص ایسا ملے جس سے راستہ معلوم ہو جائے اس لئے کہ رات کا اندھیرا بھی تھا، سردی بھی تھی اور وہ راستہ بھی بھول گئے تھے، سمجھ میں نہ آتا تھا کدھر جائیں۔<sup>[۱]</sup> اُن بزرگوار نے جن کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ جناب شعیب علیہ السلام تھے، آٹھ برس کی لازمی شرط کی تھی اور پھر کہا تھا کہ اگر دس برس پورے کر دو تو یہ تمہاری خوشی سے وابستہ ہے، جناب موسیٰ علیہ السلام نے اُس وقت یہ اقرار کیا تھا کہ بہر حال ان میں سے جو بھی مدت پوری کر دوں، مجھ پر کوئی الزام نہ ہوگا۔ اب قرآن کے یہ الفاظ ہیں کہ ”انہوں نے جب وہ مدت پوری کر دی۔“ اب یہ کونسی مدت ہے؟ اس کی تعیین قرآن مجید کے الفاظ سے نہیں ہوتی، صحابہ کرام کی دو روایتیں ہیں جو جناب موسیٰ علیہ السلام کی شان کے مطابق ہیں کہ انہوں نے وہی آخری مدت دس برس والی پوری

[۱] روی ائہ کان قد ضل عن الطريق (تبیان)

کی۔ [۱]

اس آواز کے متعلق جو درخت سے آئی تھی، ہم نے ”مقدمہ تفسیر“ میں کلام الہی کی بحث میں تشریح کی ہے کہ وہ جناب باری تعالیٰ کی خلق کی ہوئی آواز تھی۔ بحیثیت اپنے کلام کے جس کا محل وہ درخت تھا، کلام کا محل، نہ کہ اس کے متکلم کا جو کسی محل میں حلول سے اپنے کمال ذات کی بنا پر بری ہے۔ [۲]

عصا کے سانپ کی شکل اختیار کرنے پر جناب موسیٰ علیہ السلام کی جو کیفیت ہوئی، اس کے متعلق عرض ہے کہ انبیاء عام بشری تاثرات سے بری نہیں ہوتے جیسے بھوک، پیاس، درد۔ یہ کیفیات عام طور سے طبعی اسباب کے ماتحت انسان پر طاری ہوتی ہیں، ویسے ہی ڈر، وحشت، گھبراہٹ کیفیات ہیں، ان کا طاری ہونا بھی بشریت کا تقاضا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے کوئی غیر معمولی تقریب ہونے والی ہوتی ہے تو اُس محکمے کی طرف سے اُس کے لئے متعلقہ افراد کو مشق کرائی جاتی ہے جسے ”ریہرسل“ کہتے ہیں۔ اسی طرح چونکہ علم الہی میں ان کے لئے ساحروں کی مہم درپیش ہوگی تو اُن کے لئے پہلے پیغام نبوت کے ساتھ اُس موقع کے لئے تیار کیا گیا چنانچہ اس وقت خود اپنے پھینکے ہوئے عصا کے اڑدھابن جانے سے جو دہشت طاری ہوئی تھی وہ اڑدھابنا، ہاں وہاں جیسا کہ الفاظ قرآن نے ظاہر کیا ہے، اُس وقت ذرا سا خوف پیدا ہوا تھا جب ساحروں کی رسیاں سانپوں کی طرح حرکت کرنے لگی تھیں مگر اس کے لئے حضرت علی علیہ السلام نے اپنے کلام میں جو نوح البلاغہ میں ہے، فرمایا ہے۔

مَا اشْفَقَ مُوسَىٰ خَيْفَةَ عَلِيٍّ نَفْسِهِ وَائِمَّا اشْفَقَ مِنْ غَلْبَةِ الْجَهَّالِ وَدَوْلَةِ الضَّلَالِ:

موسیٰ علیہ السلام نے جو خوف محسوس کیا تھا اپنے لئے نہ تھا بلکہ اس لئے تھا کہ کہیں ساحروں کا کرتب خلق خدا کی گمراہی میں شدت کا باعث نہ ہو جائے۔

اس کی تائید خالق کی اس اطمینان دہانی سے ہوتی ہے کہ:

اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی نَتِیْجَہٗ مِیْنِ غَالِبِ تَمَّ ہِی رَہو گے

یعنی اس طرح گمراہی کے استیصال کا سامان ہو جائے گا۔

خالق کا یہ ارشاد کہ ”یہ دونوں دلائل ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے“ اس میں مضمحل ہے یہ حکم کہ تم یہاں سے سیدھے فرعون کی طرف جاؤ جسے صراحتاً دوسری جگہوں پر اذہب الی فرعون کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں نقل واقعات میں ایسا تنوع اور گونا گوں انداز بیان ”نقل بالمعنی“ کے جواز کی بہت بڑی دلیل ہیں جس کے نظائر قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں۔

[۱] روى الواحدی باسنادہ عن ابن عباس قال سألت اى الاجلین قضی موسى قال اوفاهما وابطاهما وبلا سناد عن ابی ذر قال قال

رسول الله ﷺ اذا سئلت اى الاجلین قضی موسى فقل خيرهما وابتاهما (مجمع البيان)

[۲] فعل الكلام فيهما ان الله تعالى كان في الشجرة لانه لا يمويه مكان ولا يحل في جسمه (تبيان)

قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ﴿٣٣﴾ وَأَخِي هَارُونُ  
هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسَلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ﴿٣٤﴾  
قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۗ  
بِأَيِّنَّا ۗ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُونَ ﴿٣٥﴾

”کہا پروردگار! میں نے اُن میں سے ایک کو مار ڈالا تھا تو ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں اور میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان کے فصیح ہیں تو انہیں میرے ساتھ بھیج مددگار بنا کر کہ وہ میری تصدیق کریں۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔ ارشاد ہوا کہ ہاں ہم تمہارے بازو کو مضبوط کریں گے تمہارے بھائی کے ساتھ اور ہم تم دونوں کو غلبہ عطا کریں گے تو ہماری طرف کی نشانیوں کی وجہ سے اُن کی دسترس تم پر نہ ہوگی، تم دونوں اور جو تمہاری پیروی کریں گے، غالب آنے والے ہیں۔“

### جناب ہارون علیہ السلام کی بحیثیت گواہ ضرورت:

جناب موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا ویسی ہی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا جو پہلے پارے میں آچکی ہے کہ ان کی طرف ایسا رسول بھیج جس کے یہ اوصاف ہیں، یعنی یہ نہیں ہے کہ رسول کا انتخاب و تقرر اُن کی دعا سے ہوا ہے بلکہ جو منظور قدرت تھا اس کو بالقاتلے ربانی پیغمبر نے اپنی دعا بنا کر پیش کر دیا۔ [۱]

جناب موسیٰ علیہ السلام کی اس خواہش سے جو از روئے قرآن ثابت ہو رہی ہے، یہ پتہ چلتا ہے کہ جب جھٹلانے والوں کی کثرت ہو تو کوئی ایک ایسا ضرور ہونا چاہیے جو اُن کے مقابلہ میں رسول کی تصدیق کرے، اس کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ میرے ساتھ ہارون کو بھیج جو اس مہم کی تکمیل کرے اسی طرح آخری رسول کو بھی جنہیں قرآن مجید نے مثل موسیٰ علیہ السلام کہا ہے (کہا ارسلنا الی فرعون رسولا) آغاز رسالت سے پہلے ہی لمحہ میں اُس کی تصدیق کے لئے موجود ہو جسے قرآن مجید نے یوں ظاہر کیا ہے کہ:

أَفْمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيْتَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ. (ہود - ۱۷)

وہ جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلا ہوا ثبوت حقائقیت رکھتا تھا اور اُس کے پیچھے پیچھے تھا ایک گواہ جو اس کا جز تھا۔

اب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مثل موسیٰ علیہ السلام تھے تو لازماً گواہ مثل ہارون ہوگا جس پر منطبق ہوتی ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ متفقہ حدیث بھی کہ انت مئی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ (یعنی) تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔

خالق نے دعا قبول فرمائی یعنی جو اُس کا فیصلہ پہلے ہی سے تھا، جس کے مطابق وہ دعا تھی اُس کا اعلان فرمادیا تو مقام حقیقت میں دعا اُس فیصلے پر مبنی تھی اور مقام ظاہر میں خالق کا فیصلہ دعا پر مرتب ہوا لہذا وہ اس کی قبولیت قرار پایا، بالکل یونہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا آخری رسول کے

[۱] قیل ان موسیٰ ما سأل ذلك الا باذن الله لانه لا يجوز ان يسأل بني ان يرسل معه انسانا اخر نبيا (تبيين)

لئے اور عطاءے امامت پر! ومن ذریتہی کہہ کے اپنی اولاد کے لئے، ان سب کی نوعیت متحد ہے یعنی دعا مشیت خالق پر مبنی تھی اور نتیجہ کا ظہور دعا پر مترتب ہوا، اس لئے کہنے والے نے ہمارے رسول کے لئے کہا تو غلط نہیں کہا کہ ”دعا نے خلیل و نوید مسیحا۔“

بالکل اسی طرح رسول کا حضرت علیؑ کے لئے دعا کرنا اور آیہ تطہیر کے نزول سے پہلے جیسا کہ فریقین کی احادیث میں ہے، اہل بیت معصومینؑ کو زیر چادر لے کر بارگاہ الہی میں عرض کرنا کہ: اللّٰهُمَّ هُوَ اَهْلِي ”پروردگارا! یہ میرے اہل ہیں“۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد کہا:

اذْهَبْ عَنْهُمْ الرَّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيراً۔

ان سے نجاست کو دور رکھ اور انہیں پاک رکھ جیسا پاک رکھنے کا حق ہے۔

اور اس کے بعد آیہ تطہیر کا نازل ہونا جیسا کہ حدیث کساء کی اس باسند شکل میں ہے جسے ہمارے دوست اور اس وقت ایران کے ایک بزرگ مرجع تقلید آیۃ اللہ سید شہاب الدین مرعشی معروف بہ آقا نجفیؒ نے شائع فرمایا ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن ترجمہ کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں چھپ چکے ہیں۔

”ہماری طرف کی نشانیوں کی وجہ سے ان کی دسترس تم تک نہ ہوگی، یعنی معجزات جو تمہیں عطا ہوئے ہیں، ان سے ان پر ہیبت طاری ہو جائے گی، اس کی وجہ سے وہ تمہارے خلاف کوئی اقدام نہ کر سکیں گے۔“ [۱]

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا

بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِ

وَمَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۳۷﴾

تو جب ان کے پاس آئے موسیٰؑ ہماری کھلی نشانیوں کے ساتھ تو انہوں نے کہا یہ نہیں ہے مگر گھڑا ہوا جادو اور ہم نے اپنے اگلے باپ داداؤں کے دور میں نہیں سنا اور موسیٰ نے کہا میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور کس کے لئے آخرت کی کامیابی ہوگی، بلاشبہ ظالم لوگ دین اور دنیا کی بہتری نہیں پا سکیں گے۔“

حسب دستور درمیان کی کڑی واقعہ کی قرآن نے عقل کے حوالے کر دی کہ جب خالق کا فرمان ہو گیا تو موسیٰؑ نے تعمیل کی اور اب سنو [۲] جب وہ ان کے پاس گئے تو یہ ہوا۔

چونکہ اس کے پہلے فرعون کے ساتھ ملائکہ یعنی اس کے عمائد سلطنت کا ذکر ہو چکا ہے، اس لئے یہاں بھی صیغہ جمع ہی کر کے صرف ہوئے ہیں کہ وہ ان کے پاس گئے۔

[۱] ما یجری علی ایدیکم امن المعجزات فیخافکم فرعون و قومہ لاجلہا (مجمع البیان)

[۲] التقدير فمضى موسى الى فرعون و قومہ (مجمع البیان)



اب جناب موسیٰ علیہ السلام نے کہا، مطلب تو اس کا صاف یہ ہے کہ میرا پروردگار جانتا ہے کہ میں ہدایت پر ہوں اور تم گمراہ، اور حقیقت کے انکار کی بناء پر ظالم ہو، اس لئے نجات نہیں پاسکتے، مگر اس کے بجائے جو حقیقت ہے، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا پروردگار خوب جانتا کہ کون راہ ہدایت پر ہیں اور کون ظالم ہے اور جو ظالم ہوں، وہ نجات نہیں پاسکتے۔ یہ روادانہ گفتگو اس پیغمبر کی ہے جسے دنیا نے غیظ و غضب کا پتلا سمجھ رکھا ہے اور اس رواداری کے نمونے قرآن مجید میں بکثرت نظر آتے ہیں جو ہمارے رسالہ ”قرآن کا معیار تہذیب اور روادارانہ گفتگو“ میں درج ہیں۔ وہی انداز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس کلام میں نظر آ رہا ہے۔<sup>[۱]</sup>

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرِي ۖ فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامُنُّ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَى إِلَهِ مُوسَى ۖ وَإِنِّي لأظنُّهُ مِنَ الْكٰذِبِينَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُم إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ﴿۳۹﴾ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يُدْعَوْنَ إِلَى النَّارِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنصَرُونَ ﴿۴۱﴾ وَاتَّبَعْنَاهُمْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوحِينَ ﴿۴۲﴾

”اور کہا فرعون نے اے عمائدورؤسا! مجھے تمہارے لئے اپنے سوا کسی خدا کا علم نہیں ہے۔ تو اے ہامان! میرے لئے اینٹوں کا بھٹا لگو اور ایک اونچا قصر بناؤ، شاید میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کا پتلا لگا سکوں اور میں تو انہیں جھوٹوں ہی میں سے سمجھتا ہوں اور اس نے اور اس کی افواج نے دنیا میں ناحق گھمنڈ سے سے کام لیا اور انہوں نے سمجھا کہ وہ ہماری طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے تو ہم نے اس کو اور اس کی افواج کو گرفت میں لے کر دریا میں ڈال دیا تو دیکھو کیسا انجام تھا ظالموں کا اور انہیں ہم نے قرار دیا ایسا پیشوا جو آگ کی طرف بلا تے تھے اور قیامت میں ان کی مدد نہ ہوگی اور ان کے پیچھے لگا دی ہم نے اس دنیا میں لعنت اور روز قیامت وہ بد حال لوگوں میں ہوں گے۔“

### فرعون کا ہامان کو فرمان اور آخری انجام:

یوں تو غور کرنے پر سب ہی کو معلوم ہوگا کہ انکار خدا کا سرما یہ لا اد ریت اور لاعلمی کے سوا کچھ نہیں ہے مگر خود اذعائے الوہیت رکھنے والا یہ کہے کہ مجھے اپنے سوا کسی کو خدا کا علم نہیں ہے۔ اس میں اصل خدا کے متعلق تو خیر بس جہل ہی ثابت ہوتا ہے جو نئی بات نہیں ہے مگر ہمنما خود اپنی خدائی کی تو قطعی نئی ہو جاتی ہے کیوں کہ جو واقعی خدا ہوا سے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر خدا کی تلاش کے لئے یہ کوشش و کاوش

[۱] لہذا كما يقال على سبيل المظاهر ؓ الله اعلم بالمحقق مئا و المبطل (مجمع)

کہ ایک اونچا محل تعمیر کیا جائے، یہ وہی مادہ پرستانہ ذہنیت ہے جس کا مظاہرہ تہذیب و تمدن کی ہزاروں برس کی ترقی کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ ماضی قریب میں روس کے وزیر اعظم خروٹچوف نے کیا کہ ہم نے اپنے ہوا بازوں کو خلا میں بھیج کر خوب تلاش کر لیا، خدا ہمیں کہیں نہیں ملا، حقیقت کے لحاظ سے فرق ہی کیا ہوا؟ پرانے زمانے کا خروٹچوف محل کی چھت پر چڑھ کر ڈھونڈتا تھا اور اپنے ذوق انکار کو تسلی دے لیتا تھا اور نئے زمانے کے فرعون خلائی جہازوں پر آدمی بھیج کر ڈھونڈتے ہیں اور اپنے انکار کی بھوک کو تسلی دیتے ہیں لیکن حقیقی خدا جو ہوتا ہے، وہ مکان میں محدود ہی نہیں لہذا وہ جسے ملتا ہے رگ گردن سے زیادہ قریب مل جاتا ہے اور جسے نہیں ملتا وہ محلوں پر چڑھ کے اور آسمانی خلاؤں کو طے کرنے کے بعد بھی اسے نہیں ملتا، بس تلاش کرنے والوں کی ذہنیت کا پیہ چل جاتا ہے کہ منکرین کی انسانیت ہے ابھی اُس نقطے پر جہاں پرانے زمانے کے فرعون کی تھی۔

”انہیں ہم نے قرار دیا ایسا پیشوا جو آگ کی طرف لے جانے والے ہیں“۔ یہاں قرار دینے کے معنی حکم لگانے اور ایسا جاننے کے ہوتے ہیں جیسے کہا جائے فلاں عالم نے اسے کافر قرار دیا۔

یہاں جناب شیخ طوسی نے کافی بسط تبصرہ کیا ہے۔ فرمایا ہے کہ قرار دینے کی چار قسمیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) مقام تخلیق میں ایسا بنانا جیسے ارشاد ہوا:

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَاتَيْنِ ۚ هُمْ فِيهَا مُخْتَلِفُونَ ۗ (بنی اسرائیل - ۱۲)

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۚ هُمْ فِيهَا كَوَالِدٍ إِذَا حُمِلْتُمْ ۚ (انبیاء - ۳۲)

(۲) ایک صورت سے دوسری صورت پر کر دینا جیسا کہ ارشاد ہوا:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا ۚ (مؤمنون)

(۳) حکم لگانا کہ یہ ایسا ہے، اس کی مثال یہی آیت ہے۔

(۴) کسی کے بارے میں اعتقاد کرنا کہ وہ ایسا ہے جیسے اس نے اسے جاہل قرار دیا یعنی جاہل سمجھا۔ اس کی انہوں نے قرآنی مثال کوئی

نہیں دی۔

تعب علامہ طبرسی سے ہے کہ انہوں نے تقریباً ہر جگہ تفسیر تمبیان کا تتبع کرنے کے باوجود اتنے سیر حاصل تبصرہ کو جو تمبیان میں ہے یہاں بطور خلاصہ بھی درج ذیل نہیں کیا ہے بلکہ اپنی طرف سے ایسا مختصر سرسری تبصرہ کر دیا ہے جیسے کہ اس مقام پر جناب شیخ الطائفہ کے افادات بالکل ان کے سامنے نہ تھے۔

ہاں ایک بڑا تعجب جناب شیخ سے بھی ہے کہ ایک نمایاں قسم قرار دینے کی انہوں نے چھوڑ دی اور وہ ”عطاء منصب“ ہے جیسے:

(۱) اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ (بقرہ - ۳۰) میں زمین میں ایک جانشین قرار دینے والا ہوں۔

(۲) اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (بقرہ - ۱۲۴) میں تمہیں تمام انسانوں کا امام قرار دیتا ہوں۔

(۳) اِنَّا جَاعِلُنَاکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ۔ (ص - ۲۶) ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ قرار دیا ہے۔

(۴) اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا (بقرہ - ۲۴۷) اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔

ان تمام مقامات پر قرار دینے کے معنی اس منصب پر مقرر کرنے کے ہیں لیکن زیر تبصرہ آیت میں جو فرعون وغیرہ کے بارے میں ہے،

بہر حال قرار دینے کے معنی وہی حکم لگانے کے ہیں۔ اس کے سوا کوئی دوسرے معنی اس محل پر منطبق نہیں ہیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ  
لِلنَّاسِ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٣٣﴾

”اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی بعد اس کے کہ پہلی نسلوں کو فنا کیا بصارتوں کا مجموعہ لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت بنا کر شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں۔“

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْعَرَبِ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ  
الشَّاهِدِينَ ﴿٣٤﴾ وَلَكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۖ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي  
أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۖ وَلَكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴿٣٥﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ  
الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَكِنْ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَهُمْ مِّن نَّذِيرٍ مِّن  
قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٣٦﴾

”اور آپ تو موجود نہ تھے مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ سے اس معاملہ کو طے کیا اور آپ اُس موقع پر موجود نہ تھے بلکہ ہم نے کتنی نسلیں پیدا کیں اور انہیں طولانی عمریں ملیں اور آپ مدین والوں میں بھی سکونت پذیر نہ تھے کہ ہماری آیات کی آپ تلاوت کرتے ہوں مگر ہم نے رسول بھیجے تھے اور آپ طور کے پہلو میں بھی نہ تھے جب ہم نے آواز دی تھی مگر یہ آپ کے پروردگار کی طرف کی رحمت ہے تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے پاس آپ کے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں۔“

”آپ وہاں نہیں تھے“ اور ”آپ اُس موقع پر حاضر نہ تھے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ کو اطلاعات ملتی ہیں، ورنہ

آپ کے پاس ان کے علم کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔<sup>[۱]</sup>

”ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے“ اس سے مراد پوری عرب قوم نہیں ہے کیونکہ ان کے اسلاف تک حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذریعہ سے ابراہیمی تعلیمات پہنچے جن کے بقایا آثار اب تک مناسک حج وغیرہ کے ذیل میں موجود تھے بلکہ اب اُن کی اس وقت کی نسل میں جو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھی عرصہ دراز سے کوئی خداوندی ہدایت پہنچانے والا نمایاں طور پر نہ آیا تھا۔ اسی لئے اس دور کو ”دور فترت“ کہتے ہیں۔ اب ان میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جو اپنی عالم گیر رسالت کی فیض رسانی کا آغاز ان سے کر رہے تھے۔

وَلَوْلَا أَن تَصِيبَهُمُ مُّصِيبَةٌ مِّمَّا قَدَّمَتْ آيَاتِهِمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ

[۱] لولا ما علمناك به لعمرت تبتد (تبیان) اخبرناك به لیکون لك معجزة (مجمع البیان)

إِلَيْنَا رَسُولًا فَتَتَّبِعِ آيَاتِكَ وَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٦﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ  
عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ ۖ أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ مِنْ  
قَبْلُ ۚ قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا ۗ وَقَالُوا إِنَّا بِكُلِّ كَيْفَرٍ وَن ﴿٣٧﴾ قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ  
عِنْدِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعُهُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا  
لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى  
مِّنَ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ  
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٤٠﴾

”اور ایسا نہ ہو کہ انہیں کوئی مصیبت آئے اس کی سزا میں جو وہ اپنے ہاتھوں سے کرتے رہے ہیں تو وہ کہیں کہ کیوں نہ تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر بھیجا تو ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور ایمان لانے والوں میں سے ہوتے تو جب ان کے پاس حق ہماری طرف سے آیا تو وہ کہنے لگے کہ کیوں نہ انہیں ویسا ہی ملا جیسا موسیٰ کو ملا تھا، کیا انہوں نے انکار نہیں کیا اس کا جو اس کے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا یہ دونوں جادو ہیں جو آپس میں متفق ہو گئے ہیں اور کہا ہم ہر ایک کے منکر ہیں۔ کہیے کہ پھر تم لاؤ اللہ کی طرف کی کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ صحیح راستہ بتانے والی ہو تو میں اس کی پیروی کروں اگر تم سچے ہو۔ اب اگر وہ آپ کی بات نہ مانیں تو جان لیجیے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں اور کون گمراہ ہو گا زیادہ اس سے کہ جو اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرے اللہ کی طرف کی ہدایت کو چھوڑ کر؟ بلاشبہ اللہ منزل مقصد تک نہیں پہنچاتا ظالم لوگوں کو اور ہم نے ان سے کہنے کا سلسلہ جاری رکھا شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں۔“

”ایسا نہ ہو کہ انہیں کوئی مصیبت آئے اس کی سزا میں جو وہ اپنے ہاتھوں سے کرتے رہے ہیں تو وہ کہتے، یعنی جب ان کے اعمال کی انہیں دنیا میں کوئی سزا ملتی تو وہ اس دنیا میں یوں کہتے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روز قیامت جب انہیں سزا ملتی تو وہ یوں عذر پیش کرتے۔۔۔۔۔ بہر صورت مطلب یہ ہے کہ بغیر خالق کی طرف رہنما کے بھیجے ہوئے خلق خدا پر حجت تمام نہ ہوتی اور انہیں یہ عذر پیش کرنے کا حق ہوتا جیسا کہ چھٹے پارے میں آچکا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِيَعْلَمَ الْكَافِرُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء ۱۶۵)

پیغمبر بھیجے ہیں بشارت و انذار کرنے والے تاکہ لوگوں کے پاس پیغمبروں کے بھیجنے کے بعد اللہ کے سامنے کوئی دلیل نہ رہے۔  
”یہ دونوں جادو ہیں جو آپس میں متفق ہیں، یعنی وہ پہلی نازل ہونے والی کتاب اور بعد کی آنے والی۔ ان کی تعیین میں اقوال مفسرین

مختلف ہیں۔<sup>[۱]</sup>

جیسے قرآن مجید کیلئے دس (۱۰) سوروں کے مثل لانے کی دعوت کے بعد کہا گیا تھا:

فَالَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۰﴾ (ہود)

اگر وہ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں (کہ ایسے دس سورے پیش کریں) تو (پھر ان سے کچھ کہنا بے کار ہے) تم لوگ (یعنی جو حق طلبی کی راہ میں ہو) یہ سمجھ لو کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔

ویسے ہی یہاں کہا گیا ہے کہ وہ تو ریت اور قرآنی دونوں کے منکرین ہیں تو اب ہم ان سے کہتے ہیں کہ اچھا ان سے بہتر کی کسی کتاب کا پتہ تم دو جو سرمایہ ہدایت ہو (اور ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے پھر بھی مائیں گے نہیں) تو اب سمجھ لو کہ ان کا انکار کسی وجہ معقول پر مبنی نہیں ہے۔ وہ صرف ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے اھو آء اصطلاح قرآنی میں ایسے ہی خیالات کو کہا جاتا ہے جو بے بنیاد ہوں اور جو دھاندلی، تعصب اور ہٹ دھرمی سے انکار کرے تو پھر اللہ اُس کی ہدایت نہیں کرتا ہے یعنی اس کے بعد وہ ہدایت ربانی سے کوئی فیض اپنے سوا اختیار سے حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے یوں سمجھنا چاہیے کہ ہدایت ربانی اس کے لئے ہے ہی نہیں جس بنا پر قرآن مجید کے لئے شروع سورہ بقرہ میں کہہ دیا گیا ہے ”ہدی للمتقین“ وہ ہدایت ہے مگر نجات رکھنے والوں کے لئے ”حالانکہ وہ ہدایت تمام انسانوں کے لئے ہے مگر جو اثر پذیر نہیں ہوتے، اُن کے لئے وہ ہدایت نہیں ہے متقین اُس سے اثر لیتے ہیں لہذا نتیجتاً وہ اُنہی کے لئے ہدایت بنتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

الَّذِينَ اتَّبَعَتْهُمْ إِلَىٰ قَبْلِهِمْ مِنَ الْقِبْلَةِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۲﴾ وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا  
 أَمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ﴿۵۳﴾ أُولَٰئِكَ يُؤْتُونَ  
 أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ  
 يُنْفِقُونَ ﴿۵۴﴾ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ  
 أَعْمَالُكُمْ نَسَلَّمْ عَلَيْكُمْ ۖ لَا تَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ﴿۵۵﴾

”جنہیں ہم نے کتاب اس کے پہلے عطا کی ہے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، بلاشبہ یہ حق ہے ہمارے پروردگار کی طرف سے ہم تو اس کے پہلے ہی اسلام قبول کیے ہوئے ہیں یہ وہ ہیں جنہیں اُن کا صلہ دُہرا عطا ہوگا اس لئے کہ انہوں نے صبر سے کام لیا اور وہ برائی کا بھلائی سے دفعیہ کرتے ہیں اور جب وہ فضول باتیں سنتے ہیں تو ان سے بے اعتنائی اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ تمہیں سلام، جاہلوں سے ہمیں

[۱] قال ابن عباس اراد التوراة والقرآن وقال الضحاك اراد الانجيل والقرآن وقال عكرمة اراد التوراة والانجيل (تبیان)

[۲] قيل اثمهم اذ لم يهتدوا و ايهدي الله فكاثه لم يهدهم (مجمع البيان)

مطلب نہیں ہے۔“

## چشم پوشی اور رواداری کی مدح:

یہ ان حقیقت پسند یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے جو قرآن مجید کی حقانیت سے متاثر ہوتے اور بلا توقف اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کے لئے دہری جزاء کا اعلان شاید اس لئے ہے کہ وہ صحیح معنی میں سابق کی کتاب پر بھی ایمان لائے اور اب اسی کے نتیجے میں اس کتاب پر بھی انہوں نے ایمان اختیار کیا اور چونکہ معرفت حق اور اعلان حق کے تقاضوں پر عمل میں ہمیشہ مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اس لئے ان کے ثواب کے ساتھ ان کے کردار میں صبر کے پہلو کو نمایاں کیا گیا اور بعض مفسرین نے دہری جزاء کی تشریح یہی کی ہے کہ انہوں نے پیغمبر خدا ﷺ کی اطاعت کی اور صبر سے کام لیا تو دہری جزاء ان کے کردار کے دونوں پہلوؤں سے متعلق ہے۔<sup>[۱]</sup>

”ہم تو پہلے ہی اسلام قبول کیے ہوئے ہیں، یعنی جب گزشتہ کتاب سماوی پر ایمان لائے جس میں اس رسول کا صاف صاف ذکر موجود ہے تو اس کتاب پر ایمان کے ساتھ اس رسول کی رسالت کو تسلیم کر لیا جو اب معیار اسلام ہے۔“<sup>[۲]</sup>

آخر کی آیت جو بظاہر سلسلہ تزییل میں قبل سے متصل ہی ہے، اسی برائی کو بھلائی سے دفع، کرنے کی تشریح ہو سکتی ہے یعنی فریق مخالف بیہودہ گوئی اور سخت کلامی کر رہا ہے مگر یہ اس سے چشم پوشی کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ ارے بھئی بحث بے کار ہے، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان کو اسلامی سلام کر کے رخصت کرتے ہیں<sup>[۳]</sup> اور یہ خدا حافظی سلام بالکل شیعہ طرز پر سلام، سلام علیکم ہی ہے جو باوازاں طرح کہا گیا کہ وہ سن سکتے تھے اور اب جیسے الگ ہٹ کر دل ہی دل میں یا آہستہ یہ کہا کہ لا نبتغی الجاہلین یعنی ہم جاہلوں کو منہ نہیں لگاتے۔ ان سے ہمیں کیا مطلب!

اس سے بڑھ کر رواداری کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟

”بھلائی سے برائی کا دفعیہ کرتے ہیں“----- یہ کردار بھی اپنے صحیح محل پر قرآن ہی کی تعلیم ہے<sup>[۴]</sup> جسے دنیائے ”مقاومت مجہول“ یا ”عدم تشدد“ وغیرہ کے ماتحت اختیار کیا لیکن اس کے محل کو پہچانا ضروری ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ

بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

”آپ جسے چاہیں، اسے سیدھے راستے پر نہیں لگا سکتے، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگاتا ہے اور وہی جاننا ہے کہ کون ہدایت قبول کرنے والوں ہیں۔“

[۱] مڑتین احداہما لقبہم الطاعة والثانية الصبر علیہا (تبیان)

[۲] ذلک ان ذکر النبى والقرآن کان مکتوباً عندہم فی التورہة والانجیل (مجمع البیان)

[۳] سلام متارکة لا تحیة ای سلمتم متاً من الشتم وغیرہ (جلالین)

[۴] ای یدفعون سیئة من اساء الیہم بحسنا یمہم (علی بن ابراہیم)

آخری جملہ نے بتا دیا کہ اللہ کی ہدایت کوئی جبری حیثیت نہیں رکھتی بلکہ یہ جو تعصب و عناد سے خالی ہیں اور طلب حقیقت کی تڑپ رکھتے ہیں، انہی کو وہ اپنی توفیق شامل حال فرماتا ہے اور راہِ حق تک پہنچانے کے اسباب فراہم کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم خود انہیں اپنے راستے دکھاتے ہیں۔ (عنکبوت - ۶۹)

اہل سنت کے اکثر مفسرین نے اسے خواہ مخواہ جناب ابوطالب عليه السلام سے متعلق قرار دیا ہے کہ رسول خدا کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ایمان لائیں، اس پر خالق نے یہ ارشاد کیا مگر مذہبِ حق کے لحاظ سے یہ روایت درست نہیں، اس لئے کہ جناب ابوطالب عليه السلام شروع دن سے مومن تھے <sup>[۱]</sup> چنانچہ یہاں پر علامہ طبرسی نے کافی طاقت کے ساتھ اس روایتِ شانِ نزول کی رد کی ہے۔

وَقَالُوا إِن تَتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نَتَّخِظُكَ مِنَ الْغِيظِ ۖ أَوَلَمْ نُكَلِّمْ لَهُمُ حَرَمًا

أَمِنًا يُجِيبِي إِلَيْهِ ثَمَرَاتٌ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۶۷﴾

”اور انہوں نے کہا کہ اگر آپ کے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں تو ہماری سرزمین سے جھپٹا مار کر ہم کو نکال دیا جائے گا اور کیا ہم ہی نے ان کے لئے مہیا کیا ہے ایسا امن والا محترم مقام جہاں ہر قسم کے پھل لائے جاتے ہیں ہماری طرف کے رزق کی حیثیت سے مگر ان میں کے زیادہ علم نہیں رکھتے۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”مکے کے لوگ کہنے لگے کہ ہم مسلمان ہوں تو سارے عرب ہم سے دشمنی کریں۔ اللہ نے فرمایا اب ان کی دشمنی سے کس کی پناہ میں ہو، یہی حرم کا ادب ہے، اللہ تب بھی پناہ دینے والا ہے۔“ (موضح القرآن)

ہماری تفسیر بھی اسی کے مطابق ہے۔ <sup>[۲]</sup>

جناب شیخ طوسی نے اس میں یہ اضافہ فرمایا ہے کہ باوجودیکہ تم کافر ہو، پھر بھی ہم نے حرم کی برکت سے تم پر نعمتیں ارزانی فرمائی ہیں تو اگر ایمان لے آؤ تو ہم کس طرح تمہیں اپنی رحمت سے محروم کریں گے۔ <sup>[۳]</sup>

علامہ طبرسی نے اُسے ذرا لفظ بدل کر تشریح کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

ای اولم نجعل لهم مکتة فی امن وامان قبل لهذا ودفعنا ضرر الناس عنهم حتی كانوا فیہ فلما ذا یخافون زوال الان افلا نقدر علی دفع ضرر الناس عنهم لو امنوا وان الایمان والطاعة اولی بالامن والسلامة

<sup>[۱]</sup> عن ابی عبد اللہ عليه السلام و ابی جعفر عليه السلام ان ابا طالب کان مسلماً علیہ اجماع الا ما میة لا یختلفون فیہ ولهم علی ذلك ادلة قاطعة مر حبة للعلم (تبیان)

<sup>[۲]</sup> نزلت فی قریش حین دعاهم رسول اللہ ﷺ الی الاسلام والهجرة قالوا ان نتبع الهدی معك نتخطف من ارضنا (علی ابراہیم)

<sup>[۳]</sup> انا جعلنا الحرم اماناً حرمة البيت مع انهم كفار یعبدون الا صنما حتی امنوا علی انفسهم و اموالهم فلو امنوا لکان اخری بان یومنهم الله و اولی بان یمکن هم من مرادهم (تبیان)

عن حالة الكفر (مجمع البيان)

یعنی کیا ہم نے اُن کے لئے مکہ کو اس کے پہلے امن وامان میں نہیں رکھا اور اُن سے لوگوں کی ضرر رسانی کی دفعیہ نہیں کیا جس سے وہ اب تک وہاں رہے تو اب وہ کیوں یہاں سے ہٹائے جانے سے ڈرتے ہیں؟ کیا ہم اُن سے لوگوں کی ضرر رسانی کو دفع کرنے پر اگر یہ ایمان لے آئیں قادر نہیں ہیں حالانکہ ایمان اور فرماں برداری سے استحقاق امن و سلامتی کا زیادہ پیدا ہوتا ہے بہ نسبت کفر کی حالت کے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرْتِ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسْكِتُهُمْ لَمَّا تَسْكُنُ مِنْ

بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۗ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ﴿۵۸﴾

اور کتنی ہی بستیاں ایسی جو اپنے عیش و عشرت سے اترائی ہوئی تھیں ہم نے تہس نہس کر دیں تو یہ اُن کے مکانات ہیں جو ان کے بعد بھی آباد نہیں ہوئے سوا کم کے اور ہم تھے آخر میں اُس متروکے پر تصرف رکھنے والے۔“  
بَطَرْتِ کا با محاورہ ترجمہ اترانا ہی ہے جو ہم سے پہلے کیا جا چکا ہے [۱] مگر اس اترانے سے منع حقیقی کو بھول جانا کفرانِ نعمت ہوتا ہے جو ہماری قدیم تفسیر میں اس کے معنی بتائے گئے ہیں۔ [۲]

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْهِمْ

أٰتِنَا ۖ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلَهَا ظٰلِمُونَ ﴿۵۹﴾

”اور نہیں ہے تمہارا پروردگار بستیوں کو ہلاک کرنے والا جب تک کہ اُن کی مرکزی آبادی [۳] میں کوئی پیغمبر بھیج دے جو اُن پر ہماری آیات کی تلاوت کرے اور ہم نہیں ہیں بستیوں کو ہلاک کرنے والے سوا اس کے کہ اُن کے باشندے مظالم و جرائم کے مرتکب ہوں۔“  
یعنی جب تک جہتِ الٰہی تمام نہیں ہوتی، بندوں کو استحقاق سزا نہیں ہوتا اور عذاب جب آتا ہے تو وہ اُن کی ارادی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہوتا ہے، بلا وجہ نہیں ہوتا۔

یہ اسی اصولِ عدل کا بیان ہے جس پر کثیر التعداد آیات قرآن میں زور دیا گیا ہے۔

وَمَا أُوْتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ

وَأَبْقٰى ۗ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اٰمَنُ وَعَدْنٰهُ وَعَدًّا حَسَنًا فَهٗوَا لَاقِيَهٗ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ

[۱] اتراتی تھیں بیچ معیشت اپنی کے (شاہ رفیع الدین)

[۲] بطرت معیشتہا ای کفرت (علی بن ابراہیم)

[۳] اُمّہا ای اعظہا (جلالین) بیچ بڑے شہر اُن کے (شاہ رفیع الدین)



### مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٦١﴾

”اور جو چیز تمہیں ملے، وہ زندگانی دنیا ہی کا سرمایہ اور یہیں کی آرائش تو ہے اور جو اللہ کے یہاں ہے وہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے، پھر تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے؟ تو کیا وہ جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے تو وہ اُسے پا کر رہے گا، مثل اُس کے ہے جسے ہم نے اس دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے، تو پھر قیامت کے دن اُسے (خدا کے سامنے) حاضر کیا جائے گا۔“

یہ گزشتہ اُن کے جواب کا بظاہر تکرار ہی ہے یعنی وہ جو کہتے تھے کہ اگر ہم ایمان لے آئیں تو دوسرے عرب قبائل ہم پر یورش کر دیں گے اور مکہ سے ہم کو نکال دیں گے، اس کا جواب پہلے تو یہ دیا گیا کہ یہ تمہارا خوف بے بنیاد ہے۔ اللہ ہی اس وقت بھی تمہاری حفاظت کرے گا اور اب ان آیات میں کہا جا رہا ہے کہ اگر بالفرض ایمان لانے سے تمہیں دنیوی نقصان یا تباہی بھی درپیش ہوتی ہے تو آخرت کی نجات کی خاطر وہ کوئی چیز نہیں ہے اُسے گوارا کرنا چاہیے، اور نجات آخرت کے مفاد کو مقدم سمجھا چاہئے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا ۖ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا آيَاتِنَا يَعْبُدُونَ ﴿٦٣﴾ وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمُ

فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ ۖ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿٦٤﴾

”اور جس دن وہ انہیں پکارے گا اور فرمائے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے متعلق تم گمانِ باطل رکھتے تھے؟ کہیں گے وہ جن پر عذاب کا حکم نافذ ہو چکا کہ اے ہمارے مالک! یہ ہیں جنہیں ہم نے گمراہ کیا تھا جیسے ہم گمراہ تھے، ویسے ہی ہم نے انہیں گمراہ کیا۔ اب ہم تیری طرف برأت کرتے ہیں۔ یہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے اور کہا کہ پکارو اپنے بنائے ہوئے شریکوں کو تو وہ پکاریں گے تو وہ اُن کو جواب دیں گے اور عذاب کو آنکھوں سے دیکھیں گے، کاش وہ ہدایت پاتے۔“

اکثر آیات ہیں جن کے آخر میں لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ، لَوْ كَانُوا يَعْمَلُونَ اور لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ وغیرہ ہے، ان میں یہ اختلاف برابر رہتا ہے کہ میں اس لَوْ کے معنی ”کاش“ کے سمجھتا ہوں جس کی نظیریں کلام عرب میں موجود ہیں لہذا جملہ اس پر پورا ہو جاتا ہے اور کچھ اس کے جواب میں محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی اور اس میں، میں تنہا نہیں ہوں بلکہ میرے موافق اور پہلے کے افراد ہیں [۱] لیکن دوسرے مفسرین اکثر اُسے ”اگر“ کے معنی میں لے کر اُس کے جواب کو محذوف سمجھتے ہیں اور اُس کے لئے اپنے ذہن سے کچھ الفاظ تجویز کر کے انہیں مقدر

[۱] کاش ایشیاں راہ باب می بودند (شاہ ولی اللہ کاشکے وہ ہوتے راہ پانے والے (رفیع الدین)

ماننے ہیں جس میں اُن کی سمجھ کے اختلاف سے اختلاف بھی ہوتا ہے چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔<sup>[۱]</sup>

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٥﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ  
يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿٦٦﴾ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ  
يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿٦٧﴾

”اور جب وہ انہیں پکار کر کہے گا کہ کیا جواب دیا تھا تم نے پیغمبروں کو؟ تو اب اس دن خبریں اُن پر تارک ہو گئی ہوں گی تو وہ آپس میں پوچھ گچھ بھی نہ کر سکیں گے مگر جو اللہ کی طرف لوگائے تھا اور ایمان لایا تھا اور نیک اعمال کرتا رہا تھا تو امید ہے کہ وہ فلاح پانے والوں میں ہوگا۔“

مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا لیک کہی تھی تم نے پیغمبروں کے سوال پر یعنی انہوں نے جو تمہیں دعوت و ایمان عمل دی تھی، اُسے تم نے کس حد تک قبول کیا؟ جناب شیخ الطائفہ نے یہی مفہوم تحریر فرمایا ہے<sup>[۲]</sup>

دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ پیغمبروں سے سوال ہوگا: مَاذَا أَجَبْتُمُ ”تمہاری آواز پر کیا لیک کہی گئی؟“

ظاہر ہے کہ خداوند عالم کو اپنے علم کے لئے نہ اُن سے دریافت کرنا ہے، نہ ان سے، ہم تو دونوں جگہ کی آیات کو سامنے رکھ کر ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے پیغمبروں کا زبان مقال سے نہیں تو ”زبان حال“ سے ایک استغاثہ خالق کریم کی عدالت میں دائر ہے اور اب جیسے یہ مقتدرے کی کاروائی ہے جس میں مستغیث کا بیان بھی لیا جا رہا ہے (مَاذَا أَجَبْتُمُ) اور اب مستغاث علیہم کا بیان لیا جا رہا ہے (مَاذَا أَجَبْتُمُ) اور ظاہر ہے کہ دنیا میں یہ سوال ہوتا تو کسی کسی صفائیاں پیش کرنے کی کوشش ہوتی اور بحث کی جاتی جسے مگر یہ تو قیامت کا ہنگام ہے، اب تو سوا عاجزانه خاموشی یا مجبورانه اقرار کے کوئی چارہ کار نہیں ہے جسے یوں کہا گیا ہے کہ فعمیت علیہم النبأ یعنی اب اُن کے لئے کسی سوال و جواب کا موقع ہی نہیں رہا جس کے بعد اُن کے بارے میں عدالت کو فیصلہ سنانا ہوگا جو ظاہر ہے، اس لئے اُس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿١٩﴾

”اور آپ کا پروردگار پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور منتخب کرتا ہے۔ انہیں کوئی اختیار نہیں۔ پاک ہے اللہ اور بلند ہے اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں، اور آپ کا پروردگار جانتا ہے جو اُن کے سینوں میں چھپا ہے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔“

[۱] لو ائہم كانوا يہتدون فی الدنیا مارا وۃ فی الاخرۃ (جلالین) جواب لو محذوف تقدیرہ لو ائہم كانوا يہتدون... لا اعتقدوا ان العذاب حق (مجمع البیان)

[۲] مَاذَا اجبتہم المرسلین فیما دعوکم الیہ من توحید اللہ سبحانہ و عدلہ و اخلاص العبادتہ لہ (تبیان)

## خالق کے فیصلے کے خلاف اپنے اختیار کو صرف کرنا ایک طرح کا شرک ہے:

اللہ کے اختیار و اقتدار کے مقابلہ میں انسانوں کی جو بے بسی کا اعلان ہے، اُس میں مؤمن و کافر کی تفریق کے کوئی معنی نہیں۔ اللہ کے اختیار و اقتدار کے مقابلہ میں انسان کے حق خود ارادی اور تصور جمہوریت کی مطلق طور پر نفی ہے مگر سواد اعظم کے بعض مفسرین اپنی طرف نشیب محسوس کرتے ہوئے اختیار کی نفی میں مشرکین کی قید لگا دیتے ہیں [۱] جس کے یہاں پر کوئی معنی ہی نہیں۔ ہمارے یہاں کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے انتخاب امام میں اللہ کے اختیار کا اظہار مقصود ہے۔ [۲] اور اب ایک آخری جملہ بہت ہولناک ہے یعنی اللہ کے مقابلہ میں اپنا کسی کا اختیار ماننا یا جتنا یا اس سے کام لینا ایک طرح کا شرک ہے (پناہ بخدا) اس کے بعد جو اللہ کے ظاہر و باطن پر حاوی ہونے کا ذکر ہے، وہ اللہ کے اختیار خصوصی کے سبب کا اظہار ہے کہ مخلوق تو ظاہر کو دیکھتی ہے، اس لئے اُس کا انتخاب جو ہوگا، اس میں غلطی کا امکان نہیں ہے۔ [۳]

وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَى وَالْآخِرَةِ ذُو الْعَرْشِ وَالْحُكْمُ وَالْيَقِينُ

تُرْجَعُونَ ﴿۵﴾

”اور وہ اللہ ہے اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اُس کے لئے سب تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اس کی حکومت ہے اور اُس کی طرف تم پلٹ کر جاؤ گے۔“ جب حکومت اس کی ہے [۴] تو نائب حکومت مقرر کرنا کس کا کام ہونا چاہیے؟ حاکم کا یا رعایا جس پر حکومت ہے؟ گزشتہ اور موجودہ، یہ تینوں آیات نظام حکومت دینی کا پورا اصول مقررہ کر دیتی ہیں، جو حکومت اس کے مطابق ہو وہ صحیح معنی میں ”اسلامی حکومت“ ہوگی۔ خواہ اس کا نام شخصی حکومت رکھا جائے یا جمہوری۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ ۗ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ﴿۴﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِاللَّيْلِ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۗ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿۵﴾ وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ

[۱] ماکان لہم للمشکرین (جلالین)

[۲] یختار اللہ الامام ولیس لہم ان یختاروا (علی بن ابراہیم)

[۳] اقام سبحانہ البرہان علی صحۃ اختیار (مجمع البیان)

[۴] اور است فرمان روائی (شاہ ولی اللہ)

### وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٤٣﴾

”کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر اللہ رات کو روز قیامت تک کے لئے ہمیشہ قرار دیدے تو کون خدا اللہ کے سوا ہے جو تمہاری طرف روشنی کو لائے؟ تو کیوں سماعت نہیں کرتے ہو؟ کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے وہ دن ہی کو قیامت تک کے لئے ہمیشہ قرار دے دے تو کون خدا ہے سوا اللہ کے جو تمہاری طرف رات کو لائے جس میں تم آرام کرو تو کیوں دیکھتے نہیں ہو؟ اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن قرار دیئے ہیں تاکہ تم اس میں آرام کرو اور (کسب معاش کر کے) اُس کے فوائد کے خواہاں ہو اور شاید کہ تم شکر گزار ہو۔“

یعنی نظام حیات کے لئے اس تنوع کی ضرورت ہے جو رات اور دن کی شکل میں نمودار ہے اس نظام میں جتنی دن کی اہمیت ہے، اتنی ہی رات کی۔ رات اور دن، دونوں کا ایک ساتھ نام لے کر پھر لفت و نشر مرتب کے طور پر اُن دونوں کے فوائد بیان کیے ہیں، رات تاکہ اُس میں آرام کرو اور دن جس میں کسب معاش کر کے اس کے فوائد کے خواہاں ہو۔<sup>[۱]</sup>

### وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٤٤﴾ وَتَزَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٤٥﴾

”اور جس دن وہ انہیں پکارے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے متعلق تم گمان باطل رکھتے تھے اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے تو ہم کہیں گے کہ لاؤ اپنی دلیل تب انہیں معلوم ہوگا کہ حق اللہ کا ہے اور جو کچھ غلط باتیں وہ گھڑتے تھے، سب اُن سے غائب ہو جائیں گی۔“

”ہر امت“ یعنی ہر دور کے لوگ اُن میں سے ایک گواہ لایا جائے گا جو خدا کے دیئے ہوئے علم سے اُن سب جو خدا کو دیئے ہوئے علم سے اُن سب کے حال پر حاضر و ناظر ہوگا، جس کے علم اور اُس کے اظہار میں غلطی نہیں ہو سکتی قرآن مجید کی اس آیت سے ایسے کسی گواہ کا ہر دور میں موجود ہونا لازمی ثابت ہوتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

### إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَى فَبَغَى عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ ۚ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٤٦﴾ وَابْتَغَ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ

[۱] لأن الليل للسكون والنهار للتصرف والحركة (تبيان) لتسكنوا فيه اي في الليل ولتبتغوا من فضله اي في النهار (مجمع البيان)

[۲] هم عدول الآخرة الذين لا يخلو زمان منهم (تبيان)

الدُّنْيَا وَأَحْسِنُ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا

يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٤٤﴾

”قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا، اس نے ان لوگوں پر بلاوجہ چھا جانے کی کوشش کی اور ہم نے اُسے اتنے خزانے عطا کئے تھے کہ اس کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت سے بھی مشکل سے اٹھتی تھیں جب اُس سے اُس کی قوم والوں نے کہا کہ خوش نہ ہو، یقیناً اللہ خوش ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو اللہ نے تمہیں دیا ہے، اس سے آخرت کا سامان کرو اور اپنا حصہ دنیا سے بھی نہ بھولو اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ نیک سلوک کیا ہے اور زمین میں خرابیاں پھیلا نا نہ چاہو۔ یقیناً اللہ خرابیاں پھیلانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

قارون کا کردار اور اس کا انجام:

بغی علیہم کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے ”ان لوگوں پر بلاوجہ چھا جانے کی کوشش کی“ یہ جناب شیخ طوسیٰ کی تشریح کے مطابق ہے جسے علامہ طبرسی نے بعینہ ”اللغته“ کے زیر عنوان درج کر دیا ہے۔<sup>[۱]</sup> بعض لوگوں نے اس کا مفہوم ظلم و تعدی کا قرار دیا ہے<sup>[۲]</sup> اور ظاہر ہے کہ بلاوجہ چھا جانے کی کوشش بھی ایک ظلم و تعدی کی حیثیت رکھتی ہے۔

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيْتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۗ أَوَلَمْ يَعْلَم أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ

مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَآكَثَرُ جَمْعًا ۗ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمْ

الْمُجْرِمُونَ ﴿٤٥﴾

”اس نے کہا یہ تو مجھے ملا ہے بس ایک علم کی وجہ سے جو میرے پاس ہے اور کیا اُسے یہ علم نہیں کہ اللہ نے اس کے قبل ایسی نسلوں کو ہلاک کر دیا جو اُس سے زیادہ طاقت ور اور زیادہ سرماہ دار تھیں اور گنہ گاروں سے ان کے گناہوں کے متعلق کچھ پوچھنا نہیں ہے۔“

”یہ مال و دولت مجھے ایک علم کی وجہ سے ملا ہے“ اس کی تشریح میں یہ بہت قرین قیاس ہے جو ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہے کہ وہ فن کیسیا سے واقف تھا اور اسی سے اس نے اپنی دولت بڑھائی تھی<sup>[۳]</sup> اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ علوم دینیہ کا بہت بڑا عالم تھا۔<sup>[۴]</sup> علامہ طبرسی نے اس کے علاوہ بھی اقوال اس کی تشریح میں درج کیے ہیں، مثلاً علم سے مراد فن تجارت سے واقفیت اور اکتساب مال اور

[۱] ان البغی طلب العلو بغیر حق ولذا قیل لولاة الجور بغاة (تبیان و جمع البیان)

[۲] تعدی کردبرایشان (شاہ ولی اللہ)

[۳] کان یعمل الکیمیاء (علی بن ابراہیم)

[۴] کان اعلم بنی اسرائیل بالتوراة بعد موسیٰ وھرون (جلالین)

فراوانی دولت کے گروں سے واقفیت ہے، اس صورت میں بھی علم خود قارون کی صفت ہوگی جسے اس نے اپنی دولت مندی کا سبب قرار دیا ہے۔ اس کے برخلاف بعض لوگوں نے علم سے مراد اللہ کا علم لیا ہے کہ اس نے میرے اوصاف سے واقفیت کی بناء پر مجھے اس دولت کا حق دار جانا ہے تو کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کا کیا حق ہے، مگر اس صورت میں اوتیتہ کے بجائے جو صیغہ مجہول ہے اور معنی یہ ہیں کہ ”مجھے دیا گیا ہے“ صیغہ معروف مثلاً اتانی ربی ”مجھے میرے پروردگار نے دیا ہے“ زیادہ موزوں ہوتا اور پھر علم نبی یا علم عتیٰ ہوتا جس کے معنی یہ ہوتے کہ اس نے مجھے اس علم کی بناء پر جو میرے متعلق ہے، دولت عطا کی، مگر الفاظ قرآن میں: علی علم عندی: اس کے معنی وہی ہوتے ہیں کہ مجھے ہدایت ملی ہے اس ہنر کے سبب سے جو میرے پاس ہے۔

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا  
مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ ۗ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٤٩﴾ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ  
وَيَلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَن آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۖ وَلَا يُلْقَاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ﴿٥٠﴾

”تو وہ نکلا اپنی قوم والوں کے سامنے ساز و سامان کے ساتھ، کہا اُن لوگوں نے جو زندگانی دنیا کے طلب گار تھے کہ کاش ہمارے لئے ہوتا ویسا ہی جیسا قارون کو ملا، یقیناً وہ بڑا نصیب والا ہے اور کہا اُن لوگوں نے جنہیں علم عطا ہوا تھا کہ وائے ہوتم پر۔ اللہ کے یہاں کا صلہ بہتر ہے اُس کے لئے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے اور نہیں اس کو پاتے مگر صبر و برداشت کرنے والے۔“

ہے تو یہ شخصی واقعہ مگر وہ ایک عام کردار ہے دو (۲) قسم کے پست و بلند ذہنیت رکھنے والے افراد کا ہر اُس موقع پر جب وہ کسی انسان کے دنیوی تزک و احتشام پر نظر ڈالیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اس قسم کا رشک اور ایسی تمنا بے صبری کی دلیل ہے اور نا سمجھی بھی ہے، جو سمجھدار ہیں، وہ اللہ کی عطا پر جو انہیں اس دنیا میں ہے شاکر رہتے ہیں اور دوسروں کے جاہ و حشم کو دیکھ کر مرعوب نہیں ہوتے۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ ۗ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُوهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ وَمَا  
كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِينَ ﴿٥١﴾ وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيُكَانِّ  
اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَيَقْدِرُ ۗ لَوْلَا أَن مَّنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا  
لَخَسَفَ بِنَا ۗ وَيُكَانَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ﴿٥٢﴾

”تو ہم نے غرق کر دیا اُسے اور اُس کے گھر والوں کو زمین میں تو اب اللہ کو چھوڑنے کے بعد کوئی جماعت نہ تھی جو اُس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنے لئے کچھ کر سکتا تھا اور وہ جو کل اُس کے درجے پر ہونے کی آرزو کر رہے تھے، اب کہنے لگے ارے اللہ جس کے لئے چاہتا ہے روزی میں کشادگی کرتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی کرتا

ہے۔ اگر اللہ ہم پر احسان نہ فرماتا تو ہمیں بھی زمین میں غرق کر دیتا۔ ارے اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کافر لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے۔“

یعنی دولت مندی فلاح و نجات کی ضامن نہیں اور جسے اُس نے تنگی میں ڈالا ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ تنگ دستی اُس کے لئے نعمت ہو اور وہ انجام کے لحاظ سے اُن بڑے دولت مندوں سے ہزار درجے بہتر ہو۔

کاٹھ جس کا ترجمہ عموماً ”گویا“ کی لفظ سے ہوتا ہے اور یہاں بھی لفظی ترجمہ ”گویا“ کیا جاسکتا ہے مگر ہم نے اس کا مطلب خیز ترجمہ کیا ہے کہ ”اب ایسا معلوم ہو رہا ہے“۔ حالانکہ حقیقت میں یہ ایک یقینی واقعیت ہے کہ کافر لوگ فلاح نہیں پاتے مگر چونکہ یہ جاہل لوگ وہ ہیں جو اس کے پہلے یہ تمنا کرتے تھے کہ وہ قارون ایسے ہوتے تو وہ پہلے اس حقیقت سے کہ اصل معیار فلاح ایمان ہے بالکل ہی غافل تھے بلکہ جیسے یقین رکھتے تھے کہ دولت مندی ہی اصل معیار فلاح و نجات ہے، اب قارون کے انجام کو دیکھ کر انہیں کچھ کچھ اپنے پہلے تصور کی کمزوری کا حساس ہوا ہے تو اب وہ شک و تذبذب کی منزل میں آگئے ہیں اور یوں کہنے لگے ہیں کہ ارے اس مشاہدہ کے بعد تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دولت معیار نجات نہیں ہے بلکہ معیار نجات ایمان ہے جس سے کافر لوگ، چاہے وہ دولت مند ہوں، محروم ہیں۔

یہ آخری جملہ کہ ”لَا يَفْلَحُ الْكَافِرُونَ“ ان آیات کے ابتداء میں جو بہت سے الفاظ آئے ہیں، اُن کے ساتھ مل کر اس تصور کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے کہ قارون کا جو انجام ہوا، وہ صرف اس کی دولت کی وجہ سے ہوا جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اسلام مطلق دولت مندی کے خلاف ہے، حقیقت یہ ہے کہ دولت مندی اگر اداے فرائض اور قوی و عملی طور پر شکر نعم الہی کے ساتھ ہو تو وہ کوئی مستوجب سزا امر نہیں ہے جب کہ اسی آخری آیت میں صراحتاً موجود ہے کہ کشائش عطا کرنے والا بھی اللہ ہی ہے تو وہ اس پر سزا کیوں دے گا؟! مگر دولت مندی کے ساتھ جب نبی، آخرت فراموشی اور فساد فی الارض اور کفرانِ نعمت کے جرائم جمع ہوں جن کا مذکورہ آیات میں قارون کے سلسلے میں تذکرہ موجود ہے تو وہ اُس انجام کی مستوجب ہو سکتی ہے جو قارون کا دنیا کی آنکھوں کے سامنے آیا۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلَهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فِسَادًا ط

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۸۳﴾

”وہ آخرت کا گھر، اُسے ہم قرار دیتے ہیں، اُن کے لئے جو زمین میں دوسروں پر چھانے کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ فساد اور انجام کی بہتری پر ہیز گاروں کے لئے ہے۔“

انجام بخیر اُن کا جو دنیا میں قہر و غلبہ کے درپے نہ ہوں:

اس آیت کو معصومین علیہم السلام نے بڑے اثر انگیز انداز میں اور خود اپنے قلبی تاثرات کے ساتھ وعظ و نصیحت کے موقع پر پیش فرمایا ہے چنانچہ امیر المؤمنین علیہ السلام کی زبان سے نہج البلاغہ کے ایک کلام کے ذیل میں یہ آیت آئی ہے اور تفسیر علی بن ابراہیم میں اپنی سند متصل کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد حفص بن غیاث سے مخاطب میں درج کیا گیا ہے کہ:

يَا حَفْصُ مَا مَنزِلَةُ الدُّنْيَا مِنْ نَفْسِي الْإِمْنَةُ إِذَا اضْطَرَّتْ إِلَيْهَا أَكَلَتْ مِنْهَا.

اے حفص: دنیا کی حیثیت میرے نزدیک نہیں ہے سو امر دار کے کہ جب اضطراری شکل ہو تو اس میں سے ذرا سا کھا لو۔  
 يَا حَفْصُ إِنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى عِلْمَ مَا لِعِبَادٍ يَاتُونَ وَالِى مَا هُمْ صَائِرُونَ فَعَلِمَ مِنْهُمْ عِنْدَ أَعْمَالِهِمُ  
 السَّيِّئَةَ بَعْلَمَهُ السَّابِقُ فِيهِمْ فَلَا يَغْرَثُكَ تَرَكَ الطَّلَبَ مِمَّنْ لَا يَخَافُ الْفُوتَ ثُمَّ تَلَا قَوْلَهُ: تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ وَجَعَلُوا  
 يَسْئِرًا وَيَقُولُ: ذَهَبَتْ وَاللَّهِ الْإِمَانِي عِنْدَ هَذَا الْآيَةِ.

اے حفص! اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم تھا کہ بندے کیا کریں گے اور ان کا انجام کیا ہوگا اس طرح ان کے برے اعمال اُس کے علم میں  
 تھے تو تمہیں دھوکا نہ ہونا چاہیے، اس کے چھوڑے رہنے سے جسے ہاتھ سے نکلنے کا ڈر نہیں ہے، پھر حضرت نے یہ آیت پڑھی اور گریہ فرمانے لگے اور  
 کہنے لگے بخدا تمام آرزوئیں ختم ہو گئیں اس آیت کے ہوتے ہوئے۔

ایک روایت میں ہے کہ جسے علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں نقل فرمایا ہے کہ جناب امیر علیؑ اپنے دور خلافت میں بازاروں میں ایک  
 ایک دوکاندار کو قرآن مجید کی یہ آیت دکھلاتے تھے اور فرماتے تھے، یہ آیت ہر قسم کے اقتدار کے مالک افراد کے لئے خواہ حکام ہوں یا جن کو بھی کسی  
 حلقہ میں کچھ افراد انسانی پر بالادستی حاصل ہو، خالق کی طرف کا انتباہ ہے۔ (مجمع البیان)

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّمَّهَا ۖ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا

السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٨٣﴾

”جو نیک کام کرے، اُسے اُس سے بہتر صلہ ملے گا اور جو بُرا کام کرے تو انہیں جو بُرے کام انجام دیتے ہیں،  
 پاداش نہیں ملے گی سوا اُس کے جو وہ کرتے تھے۔“

چونکہ جزاء میں اضافہ کر دینا ظلم نہیں ہے بلکہ کرم و تفضل ہے جو امر مستحسن ہے اور سزا میں اضافہ ظلم ہے جو قبیح ہے اور خالق کے لئے روا  
 نہیں [۱] لہذا ایسی کا بدلہ اس سے بہتر ملے گا اور بدی کا بدلہ بس اتنا ہی۔

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَأْدُكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۖ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ مَنْ جَاءَ

بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨٤﴾ وَمَا كُنْتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ

إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِلْكَافِرِينَ ﴿٨٥﴾ وَلَا يَصُدُّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ

بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٨٦﴾ وَلَا تَدْعُ

مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ

تُرْجَعُونَ ﴿٨٧﴾

[۱] لایزاد فی عقابہم علی قدر استحقاقہم بخلاف الزیادۃ فی الفضل علی الثواب المستحق فأنہ یكون تفضلاً (مجمع البیان)



”بلاشبہ وہ جس نے قرآن پہنچانے کا فریضہ آپ کے ذمے عائد کیا، وہی آپ کو واپسی کی منزل پر دوبارہ لائے گا، کیسے کہ میرا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے اور آپ اس کے امیدوار نہیں تھے کہ آپ پر کتاب اتاری جائے۔ یہ تو بس آپ کے پروردگار کی رحمت ہے تو آپ کبھی کافروں کے پشت پناہ نہ بننے گا اور وہ آپ کو روکیں نہ اللہ کی آیات سے بعد اس کے کہ وہ آپ پر نازل ہو چکی ہیں اور دعوت دیجئے اپنے پروردگار کی طرف اور مشرکوں میں شامل نہ ہو جیے اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے خدا کو نہ پکاریئے۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوا اُس کے چہرے کے۔ اُسی کی حکومت ہے اور اُسی کی طرف تم لوگوں کو پلٹ کر جانا ہے۔“

### پیغمبر خدا ﷺ کو اپنے مرکز کی طرف واپسی کی اطمینان دہانی:

معاد واپسی کی منزل سے مراد بظاہر مکہ معظمہ ہے جس سے جدائی کا حضرت کو صدمہ تھا<sup>[۱]</sup> مگر ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد آخرت ہے۔<sup>[۲]</sup> آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد اسی دار دنیا میں ان حضرات کا دوبارہ پلٹنا ہے جسے رجعت کہتے ہیں<sup>[۳]</sup> لیکن جناب شیخ الطائفہ نیز علامہ طبری نے متعدد اقوال درج کرنے کے باوجود اسے نہیں لکھا ہے۔<sup>[۴]</sup> شروع کی آیت کے بعد جو آیات ہیں، جن کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مقام تنزیل میں یونہی متصل تھیں، ان میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مخاطب رسول ہوں اور مقصود دوسروں کی تشبیہ ہو اور ہم نے اتصال کی وجہ سے اسی لحاظ سے ترجمہ میں ”آپ“ کی لفظ کے ساتھ مخاطب کیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطاب مخاطب غیر معین سے ہو جیسا کہ اکثر آیات میں ہمارے نزدیک قطعاً ایسا ہی ہے۔ اس صورت میں میرے عام دستور کے مطابق ان آیات میں ضمیر خطاب کا ترجمہ آپ کے بجائے ”تم“ کے ساتھ ہوگا۔ بہر حال آخر میں جمع کا صیغہ نُرجعون تم کو پلٹ کر جانا ہے، اس کی دلیل ہے کہ مقصود عام مسلمانوں ہی کو متنبہ کرتا ہے، ذات رسول مقصود نہیں ہے۔<sup>[۵]</sup>

[۱] الی مکة وکان قد اشتاقها (جلالین) یہ آیت اتری ہجرت کے وقت، یہ تسلی فرمائی کہ پھر کئے آؤ گے (موضح القرآن)

[۲] یعنی آخرت (فتح الرحمن)

[۳] عن علی بن الحسین علیہ السلام یرجع الیکم بنیکم و امیر المؤمنین والائمة علیہم السلام (علی بن ابراہیم)

[۴] قال الحسن معناه الی المرحوم الیوم القیمة وقال مجاهد الی الجنة وقال ابن عباس الی الموت وفي رواية اخرى عن ابن عباس الی مكة والاطهر من الاقوال لو اذک الی معاذ فی النشأة الغانیة الی الجنة (تبیان)

[۵] وان کان الخطاب للنبی ﷺ فالمراد غیره (مجمع البیان)

# سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ

مکیہ --- ۶۹ --- آیات

چونکہ اس سورہ میں ایک آیت اس مضمون کی ہے کہ کافروں کے بنائے ہوئے منصوبے کبیت العنکبوت ”مکڑی کے جالے کی طرح ہیں“ وان اوهن البيوت لبیت العنکبوت ”اور تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہوتا ہے“۔ اس کی مناسبت سے اس سورہ کا نام عنکبوت یعنی مکڑی کی طرف نسبت دے کر ہو گیا۔

## سورہ عنکبوت کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کا حکم لیکن اگر وہ توحید و اطاعت الہی کے تقاضوں میں سدّ رہ ہوں تو پھر ان کی اطاعت حرام۔
- ۲..... جناب نوح علیہ السلام کا ساڑھے نو برس تبلیغ کرنا، پھر طوفان کا آنا۔
- ۳..... جناب ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اور قوم کا ظالمانہ رویہ۔
- ۴..... متعدد اقوام پر مختلف قسم کے عذابوں کا یکجا تذکرہ۔
- ۵..... قبل بعثت پیغمبر خدا کی زندگی میں بعد بعثت آپ کی حقانیت کا پس منظر۔
- ۶..... اصل آیات قرآنی صفحہ کاغذ پر نہیں بلکہ خاص اہل علم کے سینوں میں ہوتی ہیں۔
- ۷..... حرم الہی کا مثالی امن خدا کی قدرت کی نشانی۔
- ۸..... جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں اللہ خود انہیں اپنے راستے دکھاتا ہے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

الْمَلَأَ ۱ أَحْسِبَ النَّاسَ أَنْ يُّتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ

فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلْيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلْيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِينَ ۝

”الف۔ لام۔ میم۔ کیا لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے بس اتنا کہنے پر کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہیں ہوگی؟ حالانکہ ہم نے آزمائش میں ڈالا انہیں جو ان کے پہلے تھے تو اب بھی اللہ ضرور معلوم کرے گا انہیں جو سچے ہیں اور معلوم کرے گا جھوٹوں کو۔“

”معلوم کرے گا“ کئی طرح کے الفاظ پہلے کئی جگہ آچکے ہیں اور ان کی تشریح کی جا چکی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ امتیاز عملی حیثیت سے وقوع میں آجائے اور چونکہ علم بر بنائے واقعہ ہوتا ہے۔ لہذا علم الہی کا اس کے مطابق ثبوت سامنے آجائے لیکن اگر یہ امتیاز وقوع میں آیا ہی نہیں تو وہ علم الہی میں بھی کیوں ہوگا اس لئے کہ علم خلاف واقعہ تو ہو نہیں سکتا۔

شاہ ولی اللہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس طرح کہ فلیعلمن اللہ الذین صدقوا و الیعلمن الکذبین کا ترجمہ کیا ہے: ”البتہ متمیز نکند خدا آنان را کہ راست گفتند و البتہ متمیز نکند دروغ گویان را۔“

شاہ رفیع الدین نے ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ”البتہ ظاہر کر دے گا اللہ ان لوگوں کو جو سچ بولے اور اللہ ظاہر کرے گا جھوٹوں کو۔“ جلالین نے فلیعلمن اللہ کے تحت میں تشریحی ضمیمہ لگا یا ہے علم مشاہدہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقوع کے قبل بھی اللہ کو علم ہے مگر وہ علم غیب ہے اور جب وقوع میں آجائے گا تو وہ علم شہود ہو جائیگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت سب کے ذہن میں ایک ہے، تعبیریں مختلف ہیں اور اس لئے میرا نظریہ یہ ہے کہ فلیعلمن اللہ کا ترجمہ تو وہی ہونا چاہیے جو اس کے لفظی معنی ہیں یعنی اللہ معلوم کرے یا اللہ جانے اور ان باتوں کو تشریحی حیثیت سے کہنا چاہیے کہ اس معلوم کرنے اور جاننے کا مطلب کیا ہے؟

### أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥﴾

”کیا سمجھے ہوئے ہیں وہ جو بُرے کام کرتے ہیں کہ وہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؟! کتنا بُرا ہے وہ حکم جو وہ لگاتے ہیں۔“

”ہمارے قابو سے نکل جائیں گے۔“ اس کے لئے جو الفاظ قرآن کے ہیں، وہ تمثیلی و تشبیہی ہیں، یعنی کوئی آگے آگے بھاگ رہا ہو اور دوسرا اُس کا پیچھا کرے مگر یہ اُس تک نہ پہنچ سکے، وہ آگے بڑھ جائے اور یہ اس کے پکڑنے میں عاجز ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ منظر جو جسمانی حیثیت رکھتا ہے، یہاں نہیں ہے لیکن جو اُس کا نتیجہ ہے کہ وہ شخص قبضے میں نہ آئے، وہ نتیجہ یہاں مقصود کلام ہے [۱] اس لئے ہم نے ترجمہ یہی کیا کہ کیا وہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؟

بعض مقامات پر قرآن مجید نے اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ لیسوا، معجزین ”جو ہمیں بے بس نہیں بنا سکتے۔“

### مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٥﴾ وَمَنْ

### جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿٦﴾

”جو اُمید رکھتا ہے اللہ سے ملنے کی تو بلاشبہ اللہ کی مقرر کردہ میعاد آنے ہی والی ہے اور وہ سننے والا ہے، بڑا ماننے والا، اور جدوجہد [۲] میں مقابلہ کرتا ہے، وہ مقابلہ کرتا ہے اپنے لیے، بلاشبہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔“

[۱] ان یفرقون اذات السابغ لغیرہ و یعجزون اذات نقدر علی اخذہم (مجمع البیان)

[۲] جاهد الشیطان بدفع و سوسۃ و اغواءہ و جاهد اعداء الدین الا حیائہ و جاهد نفسه الّتی ہی اعدی اعدائہ (مجمع البیان)

”جہاد“ کے لفظی معنی جدوجہد میں مقابلہ ہی کے ہیں، اب وہ اپنی نفسانی خواہشوں کا مقابلہ ہو جو ”جہاد اکبر“ ہے یا دشمنان دین کا اسلحہ جنگ سے مقابلہ ہو جو فقہ کی اصطلاح میں جہاد کہلاتا ہے اور حقیقت میں یہ میدان جنگ کا جہاد بھی جہاد نفس کے عام مفہوم کا ایک جزئیہ ہے۔

**وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ**

**أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٤٠﴾**

”اور جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے تو ہم یقیناً ان کی غلطیوں کو نظر انداز کریں گے اور انہیں بدلہ دیں گے بہترین اس معیار پر جو ان کے اعمال کا تھا۔“

میں اس کا مطلب یوں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ایک امتحان کے بہت سے پرچے ہوتے ہیں، ان میں کسی ایک پرچے میں اگر آدمی فیل ہے، تب تو وہ امتحان میں ناکامیاب قرار پاتا ہے، چاہے بعض پرچوں میں اس کے فرسٹ کے نمبر ہوں لیکن اگر فیل کسی ایک پرچے میں بھی نہیں ہے فی صدی ۳۳ نمبر تو ہر ایک ہی میں لایا ہے تو پھر اب اس کی کامیابی کا معیار اُس کے تمام پرچوں کو سامنے رکھ کر مقرر ہوگا لہذا اگر اُس کے ایک پرچے میں کمزوری بھی ہے تو مجموعی نمبروں میں آگے وہ کمزوری نظر انداز ہو جاتی ہے اور مجموعی نتیجہ کے لحاظ سے وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوتا ہے، بس یونہی سمجھیے کہ کچھ واجبات کا ترک یا محرمات کا ارتکاب اور سب سے بڑھ کر ایمان سے محرومی، یہ تو وہ ہے جو انسان کے آخرت میں ناکام ہونے کا باعث ہے جس کے بعد وہ نجات سے محروم ہو جاتا ہے اور ایسے لوگ وہ ہیں جو اللذین آمنوا و عملوا الصالحات کے عنوان ہی سے خارج ہیں لیکن ایک صورت یہ ہے کہ انسان ان باتوں کا مرتکب نہیں ہے اور جو ہر ایمان سے عاری نہیں ہے، اس طرح کسی درجہ پر اللذین آمنوا و عملوا الصالحات کے تحت میں داخل ہے لیکن اس کے بعد شعبے اعمال کے تو بہت ہیں کچھ حقوق اللہ ہیں، ان میں بھی کچھ عبادات جسمانی ہیں، کچھ عبادات مالی ہیں اور اس کے علاوہ حقوق الناس ہیں، ان میں بھی مختلف انواع و اقسام ہیں، ان سب کے لحاظ سے کچھ شعبوں میں ایسی کمزوری ہے کہ اگر انہی کے معیار پر اُسے نتیجہ دیا جائے تو وہ بہت پست درجے میں ہوگا لیکن ایسی صورت میں خالق اُس کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے اُس کے عملی شعبوں کو سامنے رکھ کر جن میں اُس کے عمل کا معیار اونچا ہے، ان کے لحاظ سے آخرت میں مرتبہ عطا کرنا ہے، اس طرح وہ کمزوریاں نمایاں نہیں ہوتیں جو اُس کے عمل کے بعض شعبوں میں ہیں، یہ ہے جو کہا گیا کہ ”ہم ان کی غلطیوں کو نظر انداز کریں گے اور انہیں بدلہ دیں گے بہترین اُس معیار پر جو ان کے اعمال کا تھا۔“

بعض مفسرین اس مفہوم کو نہیں سمجھتے ہیں اور ژولیدہ بیانی میں مبتلا ہوئے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:

”یعنی ایمان کی برکت سے نیکیاں ملیں گی اور برائیاں معاف ہوں گی۔“

گویا: احسن الذی کانوا یعملون کے معنی ہیں ایمان مگر قرآن تو ایمان کے پہلو میں حرف عطف کے ساتھ عمل صالح کا ذکر پہلے کر چکا ہے۔ پھر اب عمل سے خود ایمان مراد لینے کا کیا عمل ہے؟

جلالین کی سمجھ میں احسن (افعل تفضیل) کی تشریح کچھ آئی ہی نہیں تو لکھ دیا:

احسن، معنی حسن و نصبہ بنزع الخافض الباء۔

احسن کے معنی حسن کے ہیں اور اسے نصب یوں ہے کہ حرف جرب محذوف ہے  
دوسرے مفسرین کے بیانات بھی مجھے اچھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ  
عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾ وَالَّذِينَ  
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ﴿٩﴾

”اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے اور اگر وہ دونوں تم سے اس بات پر  
لڑائی جھگڑا کریں کہ تم میرے ساتھ اسے شریک کرو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے تو پھر ان کا کہنا نہ  
مانو۔ میری ہی طرف تم سب کو پلٹنا ہے تو میں تمہیں بتاؤں گا جو کچھ تم کرتے تھے اور ایمان لائے اور نیک اعمال  
کرتے رہے، ضرور ہم انہیں نیکوکاروں میں داخل کریں گے۔“

کَلِيَّةٌ ”نیکوکار“ معصومین علیہم السلام ہیں۔ انکے علاوہ جو جس حد تک ایمان اور حسن عمل کے درجے پر ہو، وہ ان کے ساتھ محشور ہوگا ﴿٨﴾ جو اس  
کی فلاح و نجات کی نشانی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ  
كَعَذَابِ اللَّهِ ۖ وَلَئِن جَاءَ نَصْرٌ مِّنَ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۖ أَوَلَيْسَ اللَّهُ  
بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ  
الْمُنَافِقِينَ ﴿١١﴾

”اور انسانوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اس کے بعد جب اللہ کی راہ میں اسے ایذا  
پہنچائی جاتی ہے تو وہ آدمیوں کی آزمائش کو اللہ کے عذاب کے مثل سمجھ لیتا ہے اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف  
سے مدد آئے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا اللہ خوب واقف نہیں ہے اس سے جو تمام دنیا والوں  
کے دلوں میں ہو اور ضرور اللہ جانے گا انہیں کہ جو ایمان رکھتے ہیں اور ضرور جانے گا منافقوں کو۔“

آغاز کلام سے خیال ہو سکتا ہے کہ یہ کمزور دل والے دین داروں ہی کا ذکر ہے جو مومن تو ہیں مگر ثبات قدم اور سکون دل سے پورے طور پر  
بہرہ یاب نہیں ہیں مگر اختتام آیت اور پھر بعد کی آیت نے صاف کر دیا ہے کہ یہ منافق لوگوں کا ذکر ہے ﴿١٠﴾ جو حقیقت میں ایمان لائے ہی نہیں ہیں

﴿١﴾ فی الصالحین الانبیاء والا ولیاء بان یحشر ہم معہم (جلالین)

﴿٢﴾ لهذا الذی ذکرہ صفة المنافقین (تبیان)

بلکہ مصلحت جماعت میں شامل ہیں اور اس لئے ذرا سی سختی پڑتی ہے تو وہ گھبرا کر راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ اب ہو سکتا ہے کہ آپ یہ قاعدہ لازم و ملزوم ایسے کرداروں کا مشاہدہ کر کے ہی فیصلہ کریں کہ یہ حقیقی مومنین نہیں ہو سکتے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطِيئَتَكُمْ وَمَا  
هُمْ بِمُحْمِلِينَ مِنْ خَطِيئَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ط إِنَّهُمْ لَكَذِبُونَ ﴿١٤﴾ وَلِيَحْمِلَنَّ أَثْقَالَهُمْ  
وَأَثْقَالًا مَعَ أَثْقَالِهِمْ ذَوَلْيَسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿١٥﴾

”اور کہا انہوں نے جو کافر ہیں ان سے کہ جو ایمان لائے ہیں کہ ہمارے مسلک کی پیروی کرو اور ہم تمہارے گناہوں کو اپنے اوپر اٹھالیں۔ حالانکہ وہ ان کے گناہوں کو کچھ بھی اٹھانے والے نہیں، یقیناً وہ جھوٹے ہیں اور بلاشبہ وہ اٹھائیں گے اپنے بوجھوں کو اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کچھ اور بوجھ اور ان سے باز پرس ہوگی قیامت کے دن اُس کی جو وہ غلط باتیں گھڑتے تھے۔“

کافر حقیقتاً آخرت کے قائل تھے ہی نہیں، بطور تمسخر مسلمانوں سے کہتے تھے کہ بے کار تم پیغمبر کی پیروی کر کے عذاب آخرت کے دھڑکے میں رہتے ہو، ہمارا ساتھ دو اور ہم ذمہ دار ہیں کہ تمہاری طرف سے وہاں کے بوجھ ہم اٹھائیں گے ﴿١٤﴾ اس کی اس آیت میں رد کی گئی ہے۔ یہ گناہوں کا اٹھانا جس کی نفی کی گئی ہے، باختیار خود ان کے گناہوں کی ذمہ داری لے کر انہیں گناہوں کی پاداش سے بچا دینا ہے اور پھر جو کہا گیا ہے کہ ”یہ بوجھ بھی اٹھائیں گے اور دوسروں کے بوجھ بھی“ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں دوسروں کے ورغلانے کی سزا ملے گی اور اس طرح خود اپنے گناہوں کی سزا بھی پائیں گے اور دوسروں کے گناہوں کی بھی جو ان کے ورغلانے سے مرتکب جرم ہوئے مگر اس کے نتیجے میں وہ مرتکبین بری نہیں ہوں گے۔ ﴿١٥﴾

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا ط  
فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١٦﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً  
لِّلْعَالَمِينَ ﴿١٧﴾

”اور ہم نے نوح کو بھیجا اُنکی قوم کی طرف تو وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار برس رہے پھر اس قوم کو طوفان نے اپنی گرفت میں لے لیا درنحالیکہ وہ ظالم و گنہگار تھے تو ہم نے انہیں اور کشتی والوں کو نجات دی اور اُسے نشانی قرار دیا تمام جہانوں کے لیے۔“

﴿١٤﴾ كان الكفار يقولون للمؤمنين كو نو امعنا فان الذي تخافون انتم ليس بشئ فان كان حقاً ففتحمل نحن ذنوبكم (علی بن ابراہیم)

﴿١٥﴾ یعنی بارگمراہ شدن و گمراہ کردن بردارند و بار تابعان از سر ایشان دفع نہ کند (فتح الرحمن)

## جناب نوح علیہ السلام کی عمر تبلیغ ساڑھے نو سو برس قبل از طوفان:

وہ کشتی اپنی اس کارکردگی کے لحاظ سے تو نشانی تھی ہی کہ اتنا ہمہ گیر طوفان اور اُس سے اُس کشتی نے اپنے ساکنوں کو ساحل نجات تک پہنچا دیا اس کے علاوہ خود اس کشتی کا تمام جہانوں کے لئے (جس میں آج تک کی عمر زمانہ کے حدود داخل ہیں) نشانی ہونا اس کے بقا و استحکام کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ اخباروں میں ہزاروں برس گزرنے کے بعد آج تک یہ خبریں گردش کرتی رہی ہیں کہ وہ آرات پر اس کشتی کا مشاہدہ کیا گیا ہے اور وہ اب تک وہاں موجود ہے۔

اس اُمت محمدی کے لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل بیت کو کشتی نوح کے مثل بتایا ہے تو یہ اہل بیت بھی یہی صفت رکھتے ہیں کہ ان کے کارنامے بھی عالمین کے لئے آیت الہی تھے اور آخر عمر زمانہ تک ان کے سلسلہ کی ایک فرد کا باقی رہنا بھی اللہ کی ایک بڑی نشانی کی حیثیت رکھتا ہے جس سے انکار وہی کریں گے جو آیات الہی سے انکار کے پہلے عادی رہے ہیں۔

وَابْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ ۖ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۶﴾ إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ ۗ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۱۷﴾ وَإِنْ تَكْذِبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۗ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴿۱۸﴾

”اور (ہم نے بھیجا) ابراہیمؑ کو جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے غضب سے بچو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو، تم اُسے چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو، وہ کچھ بہت ہی توہین اور جھوٹ بناتے ہو، یقیناً یہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، تمہاری روزی پر قدرت نہیں رکھتے تو اللہ سے رزق کے طلبگار ہو اور اس کی عبادت کرو اور اُس کے شکر گزار رہو، اُسی کی طرف تو تمہیں پلٹ کر جانا ہے اور اگر تم جھٹلاؤ تو تمہارے پہلے بہت سی قوموں نے جھٹلایا اور نہیں ہے پیغمبر کے ذمہ مگر کھلی ہوئی تبلیغ۔“

## حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق:

آخری آیت ممکن ہے کہ سلسلہ واقعہ ابراہیم علیہ السلام سے الگ ہو، ہمارے رسولؐ کے زمانے کے مشرکین سے مخاطب ہو جیسا کہ ہمارے یہاں کی تفاسیر میں بتایا گیا ہے۔ [۱]

[۱] انقطع خبر ابراہیم وخطب الله امة محمد ﷺ وقال وان تكذبوا (على بن ابراهيم) وان تكذبوا اي وان تكذبوا امحمد ﷺ (مجمع البيان)

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۗ إِنَّ ذَلِكِ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿١٩﴾ قُلْ  
سَيُرَوُّوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۗ  
إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ پہلی دفعہ مخلوق کو پیدا کرتا ہے، پھر اُسے دوبارہ پلٹاتا ہے، بلاشبہ یہ اللہ پر آسان ہے، کہیے کہ چلو پھر دنیا میں تو دیکھو کہ کس طرح اللہ نے مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا، پھر اللہ آخرت کی زندگی دیتا ہے، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اس میں مشاہدے کا تعلق پہلے جز سے ہے یعنی اللہ کا پہلی دفعہ پیدا کرنا اور پھر اُسے دلیل قرار دیا ہے غیب یعنی آئندہ کے دوبارہ زندہ کرنے کی [۱] جیسا کہ دوسری جگہوں پر صاف یہ دلیل و مدلول کا عنوان نمایاں ہے جیسا کہ جب پوچھا گیا من یحیی العظام وہی رمیمہ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گی“ ارشاد ہوا قبیل یحییہا الذی انشأہا اول مرۃ ”کہیے وہی زندہ کریگا جس نے پہلی دفعہ انہیں پیدا کیا۔“ (یسین - ۷۹)

يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ﴿٢١﴾ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي  
الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٢٢﴾ وَالَّذِينَ  
كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَبِيسُوٓا۟ مِنْ رَّحْمَتِي وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ  
أَلِيمٌ ﴿٢٣﴾

”وہ جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے اور تم زمین میں اور نہ آسمان میں اس کے قابو سے باہر نہیں ہو سکتے اور اللہ کو چھوڑ کر تمہارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار اور جنہوں نے اللہ کی نشانیوں اور اُس کی بارگاہ میں حاضری کا انکار کیا، یہ وہ ہیں جو میری رحمت سے ناامید ہو گئے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

”ناامید ہو گئے“ یعنی وہ اس لائق ہیں کہ ناامید ہو جائیں [۲] اور ہو سکتا ہے کہ یہ ”ناامید ہو گئے“ اُن کے ضمیر کی گواہی ہو اس بات پر کہ وہ مستحق رحمت الہی نہیں ہیں۔ [۳]

[۱] لان من قدر على الانشاء والابتداء فهو على الاعادة اقدر (مجمع البيان)

[۲] اخبراته سبحانه يسهم من رحمته وجنته اويكون معناه يجب ان يعيسوا من رحمته (مجمع البيان)

[۳] اخبار عن ويسهم من رحمته (تبيان)



فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ط

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾

”تو نہیں تھا اُن کی قوم کی طرف سے کوئی جواب سوا اس کے کہ انہوں نے کہا انہیں قتل کر دو یا انہیں آگ میں جلا دو تو اللہ نے انہیں آگ سے نجات دی، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو ایمان لائیں۔“

قوم کا ظالمانہ رویہ:

اگر اس مقام پر ترتیب کو مطابق تنزیل سمجھا جائے تو اس کے قبل سب حضرات ابراہیم علیہ السلام کی تقریر تھی جو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے بیک وقت مختلف اوقات میں کی تھی اور اب کہا جا رہا ہے کہ ان باتوں کا جواب ان کے پاس کوئی نہیں تھا سوا اس کے کہ وہ ان کو آگ میں جلا دینے پر تیار ہو گئے جس کی فی الجملہ تفصیل قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ہے مگر چونکہ ترتیب کے مطابق تنزیل ہونا ثابت نہیں، اس لئے گزشتہ آیات میں نفس مضمون کے لحاظ سے ہم تفریق محسوس کرتے ہیں:

وَإِذْ هَبْنَا دَاوُدَ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ. سَلِّمُوا كَذَّبَ امَمًا مِّنْ قَبْلِكُمْ ط وَمَا عَلَيَّ الرَّسُولُ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿١٥﴾ تک جناب ابراہیم علیہ السلام کی تقریر ہے اس کے بعد

(١) أَوْلَٰئِكَ يَبْدِئُ اللَّهُ..... الْآخِر

(٢) قُلْ سَبِّحُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا..... الْآخِر

(٣) يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ..... الْآخِر

(٤) وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ..... الْآخِر

(٥) وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ..... الْآخِر

یہ پانچ آیات علیحدہ سے نازل شدہ ہیں جو بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر کا جزء نہیں ہیں اور اب فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ..... الْآخِر جناب ابراہیم علیہ السلام کی اس تقریر سے بلا فصل متصل ہے جو ان پانچ آیات کے قبل تھی ﴿١٥﴾ اور اس کے بعد جو آیت آئے گی، اس میں پھر جناب ابراہیم علیہ السلام کی تقریر کی کچھ کڑیاں درج ہیں۔

ترتیب آیات میں یہ پاشانی و پریشانی یہاں کچھ نئی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں نمایاں طور پر مختلف مقامات پر موجود ہے اور اس لئے ایک دفعہ پچارے خواجہ حسن نظامی صاحب نے یہ لکھ دیا تھا کہ حضرت عثمان ایڈیٹر اچھے نہ تھے تو اس جمہور اہل سنت میں ان کے خلاف بڑا شور مچا مگر کیا کیا جائے کہ محسوس اس کو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والا کرتا ہے، چاہے اسے محسوس کرے مگر زبان سے کہنے کی ہمت نہ کرے۔ اس لئے کہ جرات اظہار کی نعمت قدرت کی طرف سے ہر ایک کو یکساں طور پر ارزانی نہیں ہوتی ہے۔

﴿١٥﴾ اوپر سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلام چلا آ رہا تھا۔ اسی کے موافق اللہ تعالیٰ نے بیچ میں کتنی باتیں فرمائیں، پھر اس قوم کا جواب ذکر کیا (موضح القرآن)۔

جناب خلیل علیہ السلام کے ذکر میں یہاں صرف ان لوگوں کے اس کہنے کا بیان ہے کہ ”انہیں قتل کر دیا آگ میں جلا دو“۔ اس کا نتیجہ کہ پھر کیا ہوا کہ؟ وہ یہاں ایک لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ نے انہیں آگ سے نجات دی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صورت اختیار کی گئی۔<sup>[۱]</sup> جیسا کہ دوسرے مقامات پر جہاں آگ میں جلانے کا ذکر ہے، میں نے انتباہ کیا ہے، عام طور سے آگ میں جلانے کے حکم کی نسبت نمرود کی طرف دی جاتی ہے، یہ قرآن مجید سے کہیں ثابت نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پینچاتی فیصلہ تھا جو اجتماعی طور پر کیا گیا تھا۔

**وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا ۖ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ ۖ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا ۚ وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿۳۵﴾**

”اور انہوں نے کہا کہ تم نے اللہ کو چھوڑ کر اختیار کیا ہے بس کچھ بتوں کو آپس کی محبت کی وجہ سے اس دنیوی زندگی میں پھر قیامت کے دن تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانا آگ میں ہوگا اور تمہارے کوئی مددگار نہ ہوں گے۔“

مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ جزء جناب ابراہیم علیہ السلام کی تقریر کا آگ میں پھینکے جانے کے قبل ہی کا ہے۔ اس کے بعد تو جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے، چونکہ حجت تمام کی جا چکی تھی لہذا جناب ابراہیم علیہ السلام نے اس قوم سے علیحدگی اختیار کی اور وہاں سے ہجرت کر کے سرزمین شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں بعد کے اس جزء سے کہ ”آپس میں محبت کی وجہ سے اس دنیوی زندگی میں“ ہم سمجھتے ہیں کہ شروع میں جو ہے کہ تم نے اللہ کو چھوڑ کر بس کچھ بتوں کو اختیار کیا ہے، ان بتوں سے مراد سچ مچ کے بت یعنی بے جان مورتیاں نہیں ہیں بلکہ وہ لیڈر ہیں جن کے پیچھے وہ چل رہے تھے اور انہیں کہا گیا ہے کہ یہ بس کچھ بت ہی ہیں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر معبود بنائے ہوئے ہو۔

روز قیامت کا یہ حوالہ کہ وہاں تم میں سے ایک دوسرے سے انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا<sup>[۲]</sup> جیسا کہ اس کے پہلے ابتدائی پاروں میں ایک دوسرے سے تبرّے کا ذکر آیا ہے صاف اس بات کی دعوت ہے کہ اسی دنیا میں پیشواؤں کے کردار کا خوب جائزہ لے لو اور آخرت کے پہلے یہیں پیشویاں باطل کا انکار، ان سے تبرّ اور ان پر لعنت کرو۔

قرآن مجید میں بار بار لعنت اور دعوت لعنت کے بعد قرآن پر کسی ایمان رکھنے والے کو تبرّ اور لعنت کو دشنام یا گالی سے تعبیر کرنا کسی طرح روا نہیں ہو سکتا۔

**فَأَمِّنْ لَهُ لَوْطٌ ۖ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۳۶﴾**

”اور ان کی بات کو مانا لوٹ نے اور انہوں نے کہا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے کے لئے تیار ہوں، یقیناً

[۱] فی الکلام خذف و تقدیرہ اثمہم او قد و نار او طر حوہ فیہا (تبیان)

[۲] ای یتبرّأ القادة من الاتّباع..... ویلعن الاتّباع القادة (جمع البیان)

وہ عزت والا ہے، حکمت والا۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”حضرت لوطؑ بھتیجے تھے حضرت ابراہیمؑ کے۔ اُس قوم میں کسی نے نہ مانا اُن کے سوا۔“ (موضح القرآن) اور حضرت ابراہیمؑ پر کیا موقوف ہے، جناب نوحؑ، ہودؑ اور صالحؑ کسی بھی پیغمبر کا ذکر قرآن میں دیکھ لیجئے۔ اُس پر ایمان لانے والی اتنی چھوٹی اقلیت ہے جو انگلیوں پر شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

تمام انبیاء میں بلاشبہ ہمارے پیغمبر اُس بارے میں بھی سب پر فوقیت رکھتے ہیں کہ آپ کے پیغام پر آپ کی زندگی میں جتنوں نے لبیک کہی، اتنی تعداد میں لبیک کہنے والے کسی پیغمبر کو نصیب نہیں ہوئے اب ان لبیک کہنے والوں میں بھی اگر ہم کہیں کہ خالص اور مخلص اور اعلیٰ مرتبہ کے آخر تک ثابت قدم رہنے والے صرف چند ہی افراد تھے تو اسے سنت انبیاء و ائم پر نظر رکھنے کے بعد کوئی عجبہ اور قابل انکار چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔

**وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ**

**فِي الدُّنْيَا ۗ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۲۷﴾**

”اور ہم نے اُنہیں عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب قرار دی اور ہم نے اُن کا صلہ دنیا میں بھی عطا کیا اور بلاشبہ وہ آخرت میں نیکو کاروں میں تھے۔“

**جناب ابراہیمؑ پر اللہ کی نوازش**

آخرت کا صلہ تو اجر و ثواب ہے۔ دنیا کا صلہ اس جملہ سے ظاہر ہوا کہ اُن کی نسل میں نبوت اور کتاب عطا کی، اس میں بقائے نسل کی بھی ضمانت ہے اور پھر اُس منصب الہی کے برقرار رہنے کی خواہ نام نبوت ہو یا کسی دور میں بنام ”امامت“ ہو۔ اس کے ساتھ ”نیک نامی“ بھی شامل ہوتی ہے کوئی حرج نہیں یعنی حضرت ابراہیمؑ کی عظمت پر دنیا کے تین بڑے یہود، نصاریٰ اور مسلمان سب متفق ہیں یہ بات کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ [۱]

**وَلَوْ طَا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَأْتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ ۖ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ**

**الْعَالَمِينَ ﴿۲۸﴾ أَيْنَكُمْ لَأْتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۗ وَتَأْتُونَ فِي**

**نَادِيكُمْ الْمُنْكَرَ ۗ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِنْ**

**كُنْتُمْ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۲۹﴾ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ﴿۳۰﴾**

”اور لو طوؑ کو جب انھوں نے کہا اپنی قوم سے کہ تم لوگ ایک ایسی سیاہ کاری میں مبتلا ہو جس میں تم سے پہلے دنیا کی

[۱] اجرہ فی الدنیا وهو الذکر الحسن والولد الصالح عن ابن عباس (مجمع البیان)

کوئی قوم مبتلا نہیں ہوئی۔ ارے تم مردوں سے نفسانی خواہش پوری کرتے ہو اور راہزنی کرتے ہو اور اپنے مجمع میں بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو تو ان کی قوم والوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا سو اس کے کہ انہوں نے کہا لاؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو۔ انہوں نے کہا پروردگار! میری مدد کر اس تباہ کار جماعت کے مقابلے میں۔“

”ابراہیم علیہ السلام کو“ اور ”لوط علیہ السلام“ کو یہ سب پہلے والے ارسلنا کے ماتحت ہے یعنی ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو ان کی طرف۔ پھر کہا گیا ”اور ابراہیم علیہ السلام کو“ اب اسی پر عطف کے ساتھ کہا جا رہا ہے ”اور لوط علیہ السلام کو“۔ [۱]

”راہ زنی“ ایک مستقل جرم بھی ہو سکتا ہے مگر چونکہ وہ تشریح کے طور پر وارد ہوا ہے، اس فاحشہ ”سیاہ کاری“ کی جس کے لئے کہا گیا ہے کہ تم سے پہلے کوئی قوم اس کی مرتکب نہیں ہوئی اور وہ راہ زنی عام حیثیت کا ایسا جرم ہے یقیناً پہلے بھی ہوتا رہا ہوگا، اس لئے بعض مفسرین کی یہ تشریح قابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ یہ راہ زنی بھی اس جنسی شہوت کی تسکین کے ماتحت تھی کہ وہ حسین لڑکوں کو اس راستے پر گزرنے والے قافلوں سے انخوا کر کے لے آتے تھے اور اس لئے قافلوں نے اس راہ سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ [۲]

ایک بہت ہی لطیف تفسیر اس کی یہ کی گئی ہے کہ وہ عورتوں سے قطع تعلق کی بناء پر انسانی مردم شماری میں اضافہ نہ کرتے ہوئے میدان حیات میں آنے والی نسلوں کے قافلے کو روکتے تھے۔ [۳]

”مجمع میں بدکاری کا ارتکاب“ بھی بظاہر گذشتہ جرم ہی کی اور زیادہ شرمناک صورت کا اظہار ہے کہ تمہاری بے حیائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ جانوروں کی طرح آپس میں اس جرم کا ارتکاب مجمع عام میں کرتے ہو اور ممکن ہے کسی دوسری قسم کی بے حیائی مراد ہو۔ [۴]

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُوا أَهْلَ هَذِهِ الْقَرْيَةِ ۗ  
 إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿۳۱﴾ قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا قَالُوا مَنْ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيهَا ۗ  
 لَنَنْجِيَنَّهٗ وَأَهْلَهُ إِلَّا أَمْرًا تَهُ ۗ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۳۲﴾

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس آئے خوش خبری لے کر تو انہوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہم اس بستی والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، بلاشبہ اس کے باشندے ظالم و گنہگار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس میں تو لوط بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس میں کون کون ہے؟ ہم انہیں اور ان کے گھرانے کو نجات دیں گے مگر ان کی زوجہ، وہ رہ جانے والوں میں ہوگی۔“

[۱] فرستادیم لوط علیہ السلام را (شاہ ولی اللہ)

[۲] تفتعون السبیل طریق المارة لفعلكم الفاحش لمن یمز بكم فترك الناس المیز بكم (جلالین)

[۳] قیل یقطعون سبیل الولد بایتان الذکر ان فی الادبار (تبیان)

[۴] شاید یہی بدکاری لوگوں میں کرتے ہوں گے اس بات کی شرم بھی نہ رہی تھی یا کچھ اور ٹھٹھے اور چھیر کرتے ہوں گے (موضح القرآن)

یعنی وہ ہلاک ہونے والوں میں سے نہیں نکل سکے گی، انہی میں رہ جائے گی۔<sup>[۱]</sup>  
جناب ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے کا مقصد تو انہیں ولادت فرزند کی خوش خبری دینا تھا<sup>[۲]</sup> مگر اثنائے گفتگو میں خود جناب ابراہیم علیہ السلام کے دریافت کرنے پر کہ تمہاری اصل مہم کیا ہے؟ انہوں نے اس کا ذکر کر دیا کہ ہم قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لئے آئے ہیں۔

وَلَمَّا أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئِئًا بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۗ إِنَّا مُنْجُونَكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا أَمْرًا تَكَّ كَانَتْ مِنَ الْغَيْرِينَ ۗ ﴿۳۳﴾ إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۗ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ تَرَكُنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۗ ﴿۳۵﴾

”اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے تو انہیں ان کی وجہ سے رنج ہوا اور وہ الجھن میں مبتلا ہو گئے اور ان لوگوں (فرستادگان الہی) نے کہا ڈرو نہیں اور رنجیدہ نہ ہو۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھرانے کو نجات دینے والے ہیں مگر تمہاری بیوی رہ جانے والوں میں ہے۔ ہم اس بستی کے رہنے والوں پر آسمان سے عذاب اتاریں گے، اس لئے کہ وہ بدکاری کرتے رہے ہیں، اور ہم نے اس کی ایک کھلی ہوئی نشانی چھوڑی ان کے لئے جو عقل سے کام لیں۔“

### قوم لوط کی عذاب الہی سے تباہی:

یہ آیات بتاتی ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اپنی کارستانیوں سے باز نہ آئی بالآخر تباہ ہو کر رہی۔

وَالِی مَدَیْنٍ آخَاهُمْ شُعَیْبًا ۗ فَقَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْآخِرَ وَلَا تَعْتُوا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۗ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوهُ فَآخَذْتَهُمُ الرَّجْفَةُ فَاصْبَحُوا فِی دَارِهِمْ جُثَثِیْنَ ۗ ﴿۳۷﴾ وَعَادًا وَثَمُودًا وَقَدْ تَبَّیْنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسْكِئِهِمْ ۗ وَزَیِّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمٰلَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِیْنَ ۗ ﴿۳۸﴾ وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ ۗ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُّوسٰی بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سَابِقِیْنَ ۗ ﴿۳۹﴾ فَكَلَّا اَخَذْنَا بِذُنُبِهِمْ ۗ فَمِمْهُمْ مِّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حٰصِبًا ۗ

[۱] الباقین فی العذاب (جلالین)

[۲] یبشر و نه بأسحق ومن وراء اسحق یعقوب (مجمع البیان)

وَمِنْهُمْ مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۖ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ ۖ وَمِنْهُمْ مَّنْ

أَعْرَفْنَا ۖ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٣٥﴾

”اور مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو تو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی اور روز آخرت کی امید رکھو اور دنیا میں خرابیاں پھیلاتے نہ پھرو تو ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو انہیں زلزلے نے اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ اپنے گھروں میں مردہ ہو کر گر گئے اور اسی طرح ہلاک کیا ہم نے (عاد اور ثمود کو اور یہ تمہارے لئے ان کی سکونت کے مقامات سے نمایاں ہے اور شیطان نے ان کاموں کو بنا سنوار کے ان کے سامنے پیش کیا تھا تو انہیں سیدھے راستے سے روک دیا حالانکہ وہ آنکھیں رکھتے تھے اور قارون، فرعون اور ہامان کو اور ان کے پاس آئے موسیٰ کھلی ہوئی دلائل لے کر تو انہوں نے تکبر سے کام لیا اور وہ بچ کے جانے والوں میں نہ تھے تو ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا تو ان میں کوئی وہ ہے جس پر ہم نے تیز آدھی بھیجی اور ان میں کوئی وہ ہے جس کا ایک مہیب آواز نے کام تمام کیا اور ان میں کسی کو ہم نے زمین میں غرق کر دیا اور کسی کو ہم نے پانی میں ڈبوایا اور اللہ ایسا نہیں کہ ان پر ظلم کرے مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔“

قوم شعیب علیہ السلام اور مختلف اقوام پر عذاب الہی کا سیکھائی تذکرہ:

یہاں سے خالق کائنات قوم لوط کا تباہ ہونا ایک مثال بنا کر بتا رہا ہے کہ صرف قوم لوط علیہ السلام ہی نہیں بلکہ جس قوم نے بھی خدا کے نمائندوں کی نافرمانی کی اور خدائی قوانین کی خلاف ورزی کی تو وہ عذاب الہی کا شکار ہو کر رہی۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ ۖ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ط

وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾

”مثال ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر حوالی موالی مقرر کیے ہیں، مکڑی کی سی ہے جس نے ایک مکان تیار کیا اور یقیناً تمام مکانوں میں سب سے زیادہ کمزور مکڑی کا بنا یا ہو مکان ہوتا ہے۔ کاش وہ جانیں،“

”کاش وہ جانیں،“ یعنی انہیں معلوم ہو کہ ان کے معبودانِ باطل کا سہارا اتنا بے حقیقت ہے، نہ یہ کہ وہ جانیں کہ مکڑی کا جالا اتنا مضبوط ہوتا ہے، کیوں کہ یہ کون نہیں جانتا، وہ تو ہر ایک کو معلوم ہے۔ [۱]

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ط وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٣٧﴾ وَتِلْكَ

الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴿٣٨﴾ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ

[۱] لا يجوز ان يكون متعلقاً بقوله: وان اوهن البيوت لبیت العنكبوت لانهم كانوا يعملون ان بيت العنكبوت وراة ضعيف (مجمع البيان)

## وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٣﴾

”بلاشبہ اللہ جانتا ہے اسے جو اسے چھوڑ کر کسی کو بھی معبود بناتے ہیں اور وہ عزت والا ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا۔ یہ باتیں ہیں جنہیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور سوا صاحبان علم کے انہیں کوئی سمجھتا نہیں، اللہ نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ یقیناً اس میں نشانی ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔“

## أَتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ

## الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَذِكْرِ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ﴿٣٤﴾

”پڑھ کے سنائیے یہ کتاب جو آپ پر وحی کے ذریعہ بھیجی گئی ہے بلاشبہ نماز بدکاری اور برائی سے روکتی ہے اور بلاشبہ اللہ کو یاد رکھنا بڑی سے بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے اُسے جو تم لوگ کرتے ہو۔“

نماز کی خاصیت جب کہ اُس نسخہ شفا کے اتارنے والے نے یہ بتادی ہے کہ وہ بدکاری اور برائی سے روکتی ہے تو اگر ایسا مشاہدہ ہو کہ نماز کی پابندی ہے مگر منکرات کا ارتکاب بھی ہے تو قرآن کا تقاضا عقلی طور پر یہ ہے کہ وہ نماز صورتاً نماز ہے لیکن حقیقت کے لحاظ سے وہ نماز ہے ہی نہیں۔ اس کے لئے معصومین کے بھی متعدد ارشادات ہیں جنہیں علامہ طبرسی نے درج فرمایا ہے مثلاً رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے:

من لم ينهه صلوة عن الفحشاء و المنكر لم يزد من الله الا بعدا.

جس کی نماز اُسے بدکاری اور برائی سے نہ روکے تو اللہ سے اس کی دوری بڑھتی ہی جائے گی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من احب ان يعلم قبلت صلواته ام لم تقبل فلينظر هل منعته صلواته عن الفحشاء و المنكر فيقدر

ما منعته قبلت منه. (مجمع البيان)

جو معلوم کرنا چاہے کہ اُس کی نماز قبول ہوئی یا نہیں تو وہ دیکھے کہ اُس نے اُسے بدکاری اور برائی سے روکنا نہیں تو جس حد تک اس نے

برائی سے روکا ہو اسی حد تک وہ قبول ہوئی۔

## وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۗ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ

## وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَالْهَذَا وَآيَاتُ الْكِتَابِ

## لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٣٥﴾ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ ۖ فَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ

## يُؤْمِنُونَ بِهِ ۗ وَمِنْ هَؤُلَاءِ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ ۗ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ ﴿٣٦﴾

”اور بحث نہ کرو اہل کتاب سے مگر ایسے طریقے پر جو بہتر سے بہتر ہو سوا اُن کے جو اُن میں سے ظالم ہوں اور کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور تمہاری طرف نازل کیا گیا اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا

ایک ہی ہے اور ہم اُس کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں اور اسی لئے ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری اور جنہیں ہم نے کتاب دی تھی، وہ اُس پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں بھی ایسے ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ہماری آیتوں کا جان بوجھ کر انکار نہیں کرتے مگر کافر لوگ،

### اہل کتاب سے بھی بحث میں رواداری:

بعض ”جہاد پسند“ مفسرین کے رویہ پر ہم اکثر احتجاج کرتے رہے ہیں اور یہاں بھی اس کا محل ہے کہ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ جہاد کا حکم آنے سے یہ حکم منسوخ ہو گیا مگر یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔<sup>[۱]</sup> بعد میں جو استثناء ہے کہ ”سوا اُن کے جو اُن میں ظالم ہیں“ تو یہ امر ظاہر ہے کہ ہر کافر اور منکر حق ایک معنی سے تو ظالم ہے ہی مگر یہاں مطلب یہ ہے کہ بحث میں وہ ظالمانہ رویہ اختیار نہ کرے، جسے ہٹ دھرمی کہتے ہیں تو پھر اب اُس سے بحث ہی بے کار ہے اور اب بحث کو ختم کرنے کے لئے کوئی سخت جملہ زبان سے نکل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کیوں کہ اُس کی ہٹ دھرمی نے اب یہ امید باقی ہی نہیں رکھی ہے کہ وہ راہ حق اختیار کرے گا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ بعد میں جو کہا گیا ہے کہ یوں کہو، یہ اُس روادارانہ انداز گفتگو کو بطور مثال پیش کرنا ہے۔ نہ یہ کہ ہر بات کے جواب میں یہی الفاظ کہے جائیں۔

آخر کی آیت میں اُس روادارانہ گفتگو کا نتیجہ ہے کہ پھر بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو کر ایمان اختیار کر لیتے ہیں جن کی مثالیں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں بھی ہیں اور اُن کے غیر یعنی کھلے ہوئے مشرکین میں بھی اُن افراد کی صورت میں جو پہلے والے راستے کو چھوڑ کر حق پر آگئے ہیں۔

”آیتوں کا انکار جان بوجھ کر نہیں کرتے مگر کافر لوگ“ اس کافر سے مراد وہ ہیں جو دانستہ کفر کو کفر سمجھتے ہوئے اختیار کیے ہوئے ہیں یعنی حق کے منکشف ہونے کے بعد پھر بھی اُس کو قبول نہیں کرتے۔

وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكُمْ إِذَا لَأَرْتَابَ  
الْمُبْطِلُونَ ﴿۳۸﴾ بَلْ هُوَ آيَةٌ بَيِّنَةٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۗ وَمَا يَجْحَدُ  
بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ﴿۳۹﴾

”اور آپ اس کے پہلے کوئی نوشتہ نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اُسے لکھتے تھے اس صورت میں باطل پرستوں کو شک کا موقع ہوتا بلکہ یہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں اُن لوگوں کے سینوں میں جنہیں علم عطا ہوا ہے اور ہماری آیتوں کا جان بوجھ کر انکار نہیں کرتے مگر ظالم لوگ“

[۱] (دلیل علی ما قال و کیف وقد امر بالعدل الذی هو احسن و المواجب الذی لا یجوز غیرہ) (تبیان)



## قبل رسالت کی زندگی بعد والے دعوے کی حقانیت

قرآن مجید میں شروع سے آخر تک دیکھا جائے کسی نبی کے بارے میں اس پر زور نہیں دیا گیا ہے کہ اُس نے پڑھا لکھا نہ تھا لیکن ہمارے پیغمبرؐ کی زندگی کے اس پہلو پر بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ اور انبیاء کے معجزات از قبیل خوارق عادات جسمانی حیثیت رکھتے تھے مثلاً عصا کو اثر دہا بنانا۔ مادرزاد اندھے کو شفا دینا اور اس طرح کی باتیں لیکن ہمارے رسولؐ کو علمی معجزہ کتاب کا عطا ہوا تھا۔ دوسرے انبیاء کے معجزات جن فنون سے متعلق تھے، اگر وہ انبیاء ان فنون کو کبھی حاصل کر چکے ہوتے مثلاً حضرت موسیٰؑ کبھی جادو کا فن سیکھ چکے ہوتے۔ حضرت عیسیٰؑ طب یونان کے مدرسوں میں پڑھ چکے ہوتے تو اس سے اُن کی سچائی کا وزن کم ہو جاتا، اسی طرح ہمارے رسولؐ اس کے پہلے کتابت و تحریر کا مشغلہ رکھتے ہوئے تو ان کے معجزے کی قوت ختم ہو جاتی، اسی لئے ان کے واسطے اس پہلو پر زور دینے کی ضرورت ہوئی اور یہاں اس آیت میں اُس کا فلسفہ یہی بتایا جا رہا ہے کہ اگر آپ لکھتے پڑھتے ہوتے تو باطل پرستوں کے لئے شک کرنے کا ایک مشغلہ ہاتھ آجاتا لیکن جب آپ کی زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح اُن کے سامنے ہے کہ آپ کبھی لکھتے پڑھتے نہیں دیکھے گئے تو اب اُنہیں ماننا چاہئے کہ آپ کا علم منجانب اللہ ہے اور یہ کتاب خالق کی نازل کردہ ہے۔ صنعت بشری کا کوئی دخل نہیں ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن اس بارے میں قبل بعثت کی آپ کی زندگی کا حوالہ دے رہا ہے اور اسی کی اثباتِ حقانیت کے لئے ضرورت ہے لیکن اب بعد بعثت اور جب قرآن کے لفظوں میں عَلِمْتَ مَا لَمْ تُكُنْ تَعْلَمُ کا مرحلہ انجام پا گیا تو اب یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ آپ قرأت و کتابت سے قاصر تھے یعنی ضرورت ہو کہ کچھ لکھا ہو آپ خود پڑھیں تو خود پڑھ نہیں سکتے تھے یا ضرورت پڑے کہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھیں تو لکھ نہیں سکتے تھے، جی نہیں۔ اب اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جس طرح اب تک آپ کوئی کتاب دنیا کو نہیں سناتے تھے، مگر اب سنار ہے ہیں تو یہ اس کا ثبوت ہے یہ وحی الہی ہے، اُس طرح اب تک کچھ پڑھ نہیں سکتے تھے اور اب پڑھ رہے ہیں، کچھ لکھ نہ سکتے تھے اور اب لکھ رہے ہیں تو اب اسے یا تعلیم ربانی سمجھنا پڑے گا اور یہ عمل بھی معجزہ ہوگا اور متفق علیہ حدیث کی بنا پر جو بخاری اور مسلم میں بھی موجود ہے، یہ معجزہ وقوع میں آتا جب رسولؐ نے وَاذِ قُرْطَاسٍ يَطْلُبُ مَا يَآتِيهِمْ بِرِجَالٍ يَخَابِئُكَ مِنَ الْقُرْآنِ ذِكْرٍ كَرِيمٍ اور سیاسی مصالِح اس نوشتے کے وجود میں آنے کے مزامم ہوئے جس سے گمراہی کا ایک بڑا دروازہ کھلا رہ گیا ہے جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بند کرنا چاہتے تھے اور وہی آج تک مسلمانوں کی تباہی کا واحد سبب ہے۔

اس نکتے پر کہ یہ آیت ما قبل بعثت سے متعلق ہے، بعد بعثت نفی قرأت و کتابت کا کوئی ثبوت نہیں، ہمارے پہلے کے بعض اکابر علماء متوجہ ہو چکے ہیں چنانچہ علامہ طبری لکھتے ہیں:

قال الشريف الاجل المرتضى علم الهدى رحمته الله هذه الآية تدل على ان النبي صلى الله عليه وسلم ما كان يحسن الكتابة قبل النبوة فاما بعد النبوة فلا تعلق له بالريبة و التهمة فيجوز ان يكون قد تعلمها من جبرئيل بعد النبوة (مجمع البيان)

جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ طاب ثراہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے فن تحریر سے واقف نہیں تھے مگر نبوت کے بعد شک و شبہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تو ہو سکتا ہے آپ نے جبرئیلؑ سے نبوت کے بعد یہ علم حاصل کر لیا ہو۔

بس آخری جملہ میں ہمارا ذوق دینی اور حقیقت پروری متقاضی ہے کہ من جبرئیل کے بجائے من اللہ سبحانہ کہا جاتا یعنی معلم رسول کا اللہ کو

سمجھنا چاہئے، نہ کہ جبرئیل امین کو۔

آخر میں یہ فقرہ بڑی خاص توجہ کا مستحق ہے: بل هو ایت بیئنت فی صدور الذین اوتوا العلم۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے:-

بلکہ قرآن آیات روشن است محفوظ در سینہ ہائے آنانیکہ دادہ شدہ است ایشان را علم۔

بلکہ قرآن روشن آیتیں ہیں محفوظ اُن کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تک قرآن ہے، اُس وقت تک یقیناً کوئی سینہ بھی ہے جس میں اُس کا علم محفوظ ہو اور ان افراد کو چھوڑ کر صرف کاغذ پر لکھے ہوئے نقوش سے اصل قرآن نہیں ملے گا اور اب جو قرآن مجید میں دوسری جگہ آیا ہے۔

ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں تو اس حفاظت کا تقاضا یہ ہوگا کہ وہ ایسے کسی سینے کو باقی رکھے گا جس میں قرآن محفوظ ہو مگر چونکہ شاہ صاحب کے پیش نظر اپنے مسلمات و عقائد کے ماتحت رسول کے بعد کوئی ایسے سینہ نہیں ہیں، اس لئے جیسے وہ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے پریشان سے ہوئے ہیں اور اس بنا پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں۔

مترجم گوید بعض مفسران گفتہ اندکہ مراد از ”الذین اوتوا العلم“ تنہا ذات پیامبر است صلی اللہ علیہ۔

میں کہتا ہوں کہ بعض مفسروں نے کہا ہے کہ جنہیں علم ملا ہے، اس سے مراد اکیلے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں واللہ اعلم۔

اس انداز سے نقل قول خود پتہ دیتا ہے کہ شاہ صاحب کو اُس کے ضعف کا احساس ہے، پھر معلوم نہیں اس تنکے کا سہارا لینے کی ضرورت

کیوں ہے؟

پھر خود رسول بھی مراد ہوں تو حضرت کی رہنمائی کے مقابلہ میں حسدنا کتاب اللہ کا نعرہ تو غلط ہی ہوگا اور اگر بالفرض منطوق آیت یہ نہ بھی بتاتا ہو کہ رسول کے بعد کچھ سینے ایسے ہیں تو جب قرآن سے رہنمائی رسول پر موقوف تھی، اس لئے کہ اُس کی حقیقت اُنہی کے سینے میں تھی تو جب وہ دنیا سے تشریف لے جائیں تو آپ کا فرض رسالت ہے کہ آپ اُس ذخیرے کو دوسرے سینے میں منتقل کرتے جائیں جو خدا و رسول کے علم میں اس لائق ہو اور وہی پھر مرکز قرآن ہونے میں پیغمبر کا جانشین ہوگا۔

اب جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے متفق علیہ حدیث میں یہ اعلان فرماتے ہیں کہ:- انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اہل بیتی ما ان تمسکتہم بہما لن تضلوا بعدی تو اس کے سمجھنے میں کیا تامل ہے کہ رسول اس طرح اُن سینوں کی نشان دہی فرما رہے ہیں جو آپ کے بعد حامل قرآن ہیں اور اسی لئے تفسیر اہل بیت علیہم السلام میں ہے الذین اوتوا العلم سے مراد ائمہ طاہرین علیہم السلام ہیں [۱]۔

وَقَالُوا لَوْلَا اُنزِلَ عَلَيْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَبِّهِ ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاِنَّمَا اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵﴾ اَوْلَمْ یَكْفِیْهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ط اِنَّ فِی

[۱] ہم الائمۃ علیہم السلام (علی بن ابراہیم) عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ علیہما السلام (مجمع البیان)

## ذٰلِكَ لَرَحْمَةٌ وَّذِكْرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾

”اور انہوں نے کہا کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کچھ خاص نشانیاں کیوں نہیں اترتیں، کہتے کہ نشانیاں بس اللہ کے پاس ہیں اور میں تو بس کھلا ہوا عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری جو ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے، بلاشبہ اس میں رحمت اور یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔“

یعنی ان کو فراموشی معجزے دکھانے کی کیا ضرورت ہے جب کہ تمام حجت کے لئے ایک معجزہ جو ہر دور میں رسالت پیغمبر کا زندہ ثبوت ہے موجود ہے۔<sup>[۱]</sup>

قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ شَهِيدًا ۗ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبٰطِلِ وَاٰمَنُوْا بِاللّٰهِ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٥٢﴾

”کہتے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہونے کے لئے کافی ہے، وہ جانتا ہے اُسے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جو باطل پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کے ساتھ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، یہ لوگ گھانا ٹھانے والے ہیں۔“

ایمان اور کفر جب مطلق طور پر بولے جائیں تو وہ دونوں متضاد ہیں، ایمان کے معنی ہیں حق کو ماننا اور کفر حق کا انکار کرنا لیکن اضافت کی صورت میں جب استعمال ہو تو ہر کفر کو ایمان اور ہر ایمان کو کفر کہا جاسکتا ہے جیسے یہاں حقیقتاً کفر ہے جسے ایمان بالباطل کہا گیا ہے اور آیۃ الکرسی میں ایمان کو کفر بالطاغوت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ استعمال بطور اضافت ہی صحیح ہوتا ہے ورنہ جیسا کہ شروع میں کہا گیا مطلق طور پر ایمان کو کفر اور کفر کو ایمان نہیں کہا جاسکتا۔<sup>[۲]</sup>

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ط وَّلَوْلَا اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ ط

وَلَيَأْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٣﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ط وَاِنَّ جَهَنَّمَ

لَمَحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ ﴿٥٤﴾ يَوْمَ يَغْشَاهُمْ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ

اَرْضِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٥﴾

”اور وہ آپ سے عذاب میں جلدی کرتے ہیں اور اگر نہ ہوتی ایک مقررہ مدت تو آجاتا ان پر عذاب اور وہ آئے گا ان پر اچانک درآں حالیکہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ وہ آپ سے عذاب میں جلدی کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ

[۱] فی هذا دلالة على ان القرآن كافى في المعجزات انه في اعلى درجات الاعجاز (مجمع البيان)

[۲] انما وصفهم بالايمن مقيد بالباطل كما يقال فلان كافر بالطاغوت مقيد وانما الاطلاق لا يجوز فيهما (تبيان)

دوزخ گھیرنے والا ہے کافروں کو جس دن چھا جائے گا اُن پر عذاب اُن کے اوپر سے اور اُن کے پیروں کے نیچے سے اور وہ ارشاد فرمائے گا کہ چکھو اُسے جو تم اعمال کرتے تھے۔

جب پہلے کہہ دیا گیا ہے کہ ایک مقررہ مدت ہے اور بعد میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسا دن آنے والا ہے تو بیچ میں جو یہ فقرہ آ گیا ہے کہ: - إِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ، اس کا یہ ترجمہ درست نہ ہوگا کہ ”دوزخ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو“ جس سے منکرینِ آخرت یہ نتیجہ نکالیں کہ کافروں کی بد اعمالیاں جن میں وہ ہیں بس یہی دوزخ ہیں جب کہ عربی زبان میں اسمِ فاعل کبھی بمعنی حال ہوتا ہے اور کبھی بمعنی استقبال تو اس قبل اور بعد کے لفظی قرآن کی بنا پر کیوں نہ مستقبل ہی کے معنی میں لیا جائے جو حقیقت ہے، اور پھر جب کہ با کافرین پر وقف نہیں بلکہ (لا) کی علامت بنی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ٹھہرنا نہیں چاہئے یعنی بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے اور اس کے بعد بلا فاصلہ یہ ہے کہ ”جس دن گھیرے گا اُن کو عذاب اُن کے اوپر سے اور اُن کے پیروں کے نیچے سے“ تو اس کے بعد لُحْيَةُ: \* کا صیغہ اسمِ فاعل حال کے لئے بھی ہو تو وہ حال اس وقت کا نہیں ہے جو دار دنیا میں ہے بلکہ حال اسی مستقبل کے دن کا ہے جو آخرت میں آنے والا ہے یعنی جس دن عذاب ان کے اوپر سے آئے گا اور نیچے سے اور یہ کہا جائے گا کہ چکھو اُسے جو تم اعمال کرتے رہے تھے تو اُس دن کا حال یہ ہوگا کہ دوزخ انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ اس کو جناب شیخ طوسی نے دوسرے توجیہات کے ذیل میں درج فرمایا ہے۔ [۱] مگر میرے نزدیک وہ کوئی زبردستی کی توجیہ نہیں بلکہ بالکل الفاظ کا ظاہری مفہوم ہے اور اس کے بعد اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اس حال کو دار دنیا سے متعلق کر کے اس کے آگے آخرت کا انکار کیا جائے۔

يُعْبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإَيَّامِي فَاْعْبُدُونِ ﴿٥١﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ  
 الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿٥٢﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ  
 مِنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿٥٣﴾  
 الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٥٤﴾

”اے میرے ایمان لانے والے بندو! میری زمین بہت وسیع ہے تو میری ہی عبادت کرو ہر تنفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے، پھر میری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے اور جو ایمان لائیں اور اچھے اعمال انجام دیں، انہیں ہم بہشت کے اونچے درجوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے سے نہریں رواں ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور کتنا اچھا صلہ ہے اُن عمل کرنے والوں کا جنہوں نے صبر و برداشت سے کام لیا اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔“  
 توحید الہی اور عبادتِ معبودِ حقیقی میں اگر ایک جگہ رکاوٹیں ہیں تو ہجرت کے لئے تیار ہو اور وطن کی زندگی کو قربان کر دو [۲] اور اگر اس راہ میں جان دینے کی ضرورت ہو تو مرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ اس لئے ایک دن تو موت آنا ہی ہے، پھر وہ اس کی راہ میں کیوں نہ ہو جس کے بعد آخرت میں بہترین مراتب حاصل ہوں گے۔

[۱] وجہ ثالثا اٹھا تحیط بہم یوم یغشاہم العذاب.... الخ (تبیان)

[۲] قال ابو عبد اللہ ﷺ اذا عصی اللہ فی الارض انت فیہا فاخرج منها الی غیرہا (مجمع البیان)

وَكَايِنٍ مِّنْ ذَاتِبَةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۗ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ۗ وَهُوَ السَّيِّعُ

الْعَلِيمُ ﴿٦٠﴾

”اور کتنی ہی چلنے پھرنے والی مخلوق ہے جو اپنی روزی خود اٹھا کر نہیں لاسکتی، اللہ ہی روزی دیتا ہے اُسے بھی اور تمہیں بھی اور وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا“۔

اگر یہ آیت مقام تنزیل میں اسی طرح گذشتہ آیت سے متصل ہے تو اس آیت کے تعلق سے اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے آخر میں اگر راہ حق پر برقرار رہنے اور عبودیت الہی کے فرائض کو انجام دینے میں معاشی مشکلات کا اندیشہ ہے کہ کھائیں گے کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سب کا روزی رسان اللہ ہے، اُس پر بھروسہ کرے۔ شان نزول کی ایک روایت اس کے موافق ہے۔<sup>[۱]</sup>

وَلِئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ

اللَّهُ ۗ فَاَنۢىۡ يُّؤْفَكُوۡنَ ﴿٦١﴾ ۗ اَللّٰهُ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۢ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَيَقۡدِرُ لَهُ ۗ اِنَّ

اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿٦٢﴾ ۗ وَلِئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡيَا بِهٖ

الْاَرْضَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۗ قُلِ الْحَمۡدُ لِلّٰهِ ۗ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا

يَعۡقِلُوۡنَ ﴿٦٣﴾

”اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو تابع حکم بنایا، وہ کہیں گے اللہ نے، تو پھر وہ کس وجہ سے منحرف ہوتے ہیں؟ اللہ وسعت دیتا ہے روزی میں اپنے بندوں میں جس کے لئے چاہتا ہے اور اُس کے لئے (جب چاہتا ہے) تنگی کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور اگر ان سے پوچھو کہ کس نے اتارا آسمان سے پانی تو زندہ کیا اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد، تو کہیں گے اللہ نے کہنے اللہ کا شکر بلکہ ان میں زیادہ سمجھتے نہیں“۔

قرآن مجید میں یہاں اور متعدد مقامات پر اس کا اظہار ہے کہ مشرکین اللہ کو جانتے اور مانتے ہیں اور کائنات عالم کے نظام کو اُس سے وابستہ سمجھتے ہیں، بس جو چیز نہیں سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جب ایسا ہے تو معبود بھی بس اُسی کو ہونا چاہئے اور کسی کو نہیں قرآن نے برابر بس یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اسی کو کہا جا رہا ہے کہ وہ سمجھتے نہیں۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۗ اِلَّا لَهٗوٌ وَّلَعِبٌ ۗ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيٰوةُ ۗ مَلُوۡ

[۱] قبیل الایۃ نزلت فی اهل مکة المؤمنین منهم فانهم قالو الرسول الله لیس لنا بالمدينة اموال ولا منازل فمن این المعاش فانزل الله الایۃ۔ (تبیان)

## كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٧﴾

”اور یہ دینی زندگی نہیں ہے مگر تماشا اور کھیل اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے کاش وہ جانیں۔“  
 ”تماشا اور کھیل، یعنی بے ثبات اور ناپائیدار [۱] نہ کہ بے حقیقت یا بے مقصد جس کے لحاظ سے دوسرے مقامات پر اس کا گاہ ہستی کے لہو و لعب (کھیل اور تفریح) ہونے کی نفی کی گئی ہے کہ اس معنی سے لہو و لعب ہونے کا تصور آفریدگار کی شانِ حکمت کے خلاف ہے۔

## فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلِكِ دَعَوْا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا

## هُم يُشْرِكُونَ ﴿٦٨﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۖ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٦٩﴾

”تو جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ سے دعا کرتے ہیں خالص اُس کی عبادت کرتے ہوئے، اس کے بعد جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی میں پہنچا دیتا ہے تو ایک دم وہ شرک کرنے لگتے ہیں، اچھا تو وہ کفرانِ نعمت کر لیں اُس کا جو ہم نے اُنہیں دیا ہے، اور فائدہ اٹھالیں اس کے بعد اُنہیں معلوم ہوگا۔“

ہم نے جو ترجمہ کیا ”کفرانِ نعمت کر لیں“ اور ”فائدہ اٹھالیں“ اس پر مبنی ہے کہ لِيَكْفُرُوا اور وَلِيَتَمَتَّعُوا میں لام، لام امر ہے جسے علامہ طبرسی نے بھی مقام تشریح میں مقدم رکھا ہے اور ہمارے بھی دل کو وہ زیادہ لگتا ہے اور یہ امر حکم کے مقصد سے نہیں ہے بلکہ تہدیدِ طور پر ہے [۲] جس کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ لام غایت ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ”تا کہ“ اُس کی بناء پر ترجمہ یہ ہوگا ”تا کہ وہ کفرانِ نعمت کر لیں“ اور ”فائدہ اٹھالیں“ جیسا کہ دوسرے مترجمین کا رجحان معلوم ہوتا ہے۔ [۳]

## أَوْلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيَتَخَفَتِ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ط

## أَفِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک امن والا محترم شہر قرار دیا حالانکہ اُس کے ارد گرد سے لوگوں پر چھٹے مارے جاتے رہتے ہیں تو کیا وہ غلط باتوں کو مانیں گے اور اللہ کی نعمت کا انکار کریں گے۔“

## حرم الہی کا مثالی امن قدرت خدا کی نشانی

یعنی ”مکے کے لوگ اللہ کے گھر کے طفیل دشمنوں سے پناہ میں تھے اور سارے ملک عرب میں فساد تھا، بتوں کے جھوٹے احسان مانتے ہیں اور یہ سچا احسان نہیں مانتے۔“

[۱] لا بقاء لہھا ولا دوام کما یزول اللہ واللعب. (تبیان)

[۲] ان جعلت اللام لامر فمعناها التہدید (مجمع البیان)

[۳] تاہرہ مندشوند (شاہ ولی اللہ)

اب اسے خواہ قدرت کی کار فرمائی سمجھا جائے اور خواہ حکم الہی کا نفوذ و اثر کہ جب ادھر ادھر بدامنی کے شعلے بھڑک رہے ہوں تو بیچوں بیچ اُس کے ایک مختصر قطعہ زمین اُن شعلوں کی لپٹ سے اس طرح محفوظ رہے جیسے چاروں طرف پانی کا طوفان اور اُس کے درمیان ایک جزیرہ اور در صورتیکہ کہ حکم الہی کا اثر و نفوذ مانا جائے تو اس میں ایک یہ لمحہ فکر یہ ہے کہ ایک شعبے میں انسان اُس کے قانون کو مان لیتا ہے تو کس طرح عافیت نصیب ہو جاتی ہے تو اگر تمام حیات کے شعبوں میں اُس کے قانون کی پیروی ہو تو کیا پوری دنیا جنت نہ بن جائے؟

**وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ ۗ أَلَيْسَ فِي**

**جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾**

”اور کون زیادہ ظالم ہے اُس سے کہ جو اللہ پر غلط باتیں منڈھے یا حق کو جھٹلائے، جب وہ اس کے پاس آیا، کیا دوزخ میں ٹھکانا نہیں ہے کافروں کا۔“

یہ قرآن کا وہ انداز بحث ہے جس سے وہ مخاطب جماعت پر بغیر صریحی طور پر کوئی ضرب لگائے ہوئے اُسے غور کرنے پر آمادہ کرتا ہے جیسے دوسری جگہ ہے:

**وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًىٰ أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٢٠﴾ (سورہ سبأ)**

ہم میں اور تم میں بہر حال کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں۔ ویسے ہی یہاں جو دو (۲) فقرے ہیں، ان میں اپنے کو اور مخاطب جماعت کو بالکل ایک سطح پر رکھ کر بات کہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میں اللہ کی طرف سے رسالت کا غلط دعویٰ کرتا ہوں تو مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اور اگر میرا دعویٰ سچا ہے اور تم اُسے جھٹلاتے ہو تو تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں، اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ ہم میں اور تم میں اتنا بڑا ظالم کون ہے؟ بعض مفسرین دونوں چیزوں کو مشرکین سے متعلق قرار دیتے ہیں [۱] ”کون زیادہ ظالم ہے اُس سے کہ جو اللہ پر افتراء کرے“، یعنی شرک کرے اور ”حق کو جھٹلائے یعنی پیغمبر کی بات نہ مانے اور رسالت کا انکار کرے مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تشریح اُس وقت کچھ زیادہ چسپاں ہوتی جب ”اُو“ کے بجائے ”و“ ہوتا۔ اس لئے کہ وہ افتراء اور یہ تکذیب مشرک میں تو دونوں باتیں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے یہ نہ کہا جاتا کہ افتراء کرے یا جھٹلائے لیکن قرآن میں ”اُو“ ہے جس کے معنی ہیں دونوں میں سے ایک بات یہ ہماری بیان کردہ تشریح کے زیادہ مطابق ہے۔

**وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٩﴾**

”اور جنہوں نے ہماری راہ میں جدوجہد کی، انہیں ہم اپنی راہوں پر لگاتے ہیں یقیناً اللہ اچھے کردار والوں کے ساتھ ہے۔“

یاد رکھنا چاہئے کہ تلوار وغیرہ کی جنگ جسے عام طور پر ”جہاد“ کہتے ہیں اور علم فقہ کی بھی اصطلاح ہے، وہ ”جہاد“ کے لفظ سے جس کے اصلی معنی جدوجہد ہی کے ہیں جو ہم نے ترجمہ کیا ہے، کوئی لازمی تعلق نہیں رکھتا، ہاں وہ اُس کے عمومی مفہوم کی ایک قسم ہے جب کہ وہ ناگزیر ہو جائے اور اس کے شرائط حاصل ہوں۔

[۱] جن افتراء علی اللہ کذباً ای۔۔۔ محمد بایات اللہ۔۔۔ او کذب بالحق لما جاءه من نبوة محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم (تبیان)

# سُورَةُ الرَّوْمِ

مکیہ --- ۶۰ --- آیات

چونکہ اس سورے میں شروع ہی میں رومیوں کی وقتی شکست کا حال اور پھر مستقبل قریب میں اُن کی فتح کی پیشین گوئی درج ہوئی ہے، اس لئے اس کا ”سورہ روم“ نام ہوا، اس کے علاوہ قدرت کی نشانیوں پر ایک ایک کا نام لے کر مختصر مرقع کشی کے ساتھ نگاہوں کو متوجہ کرنے اور گذشتہ امتوں کے انجام پر متنبہ کر کے جو قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی طرح طرح کے انداز میں مذکور ہے، خاص چیز جس کی صاف صراحت کی گئی ہے، وہ اسلام کا دین فطرت ہونا اور اس کے تقاضوں کا ناقابل تبدیل ہونا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

اللّٰهُ ۱ غَلَبَتِ الرَّوْمُ ۲ فِيْ اَدْنٰى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۳  
فِيْۤ بَضْعِ سِنِيْنَ ۴ اللّٰهُ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۵ وَيَوْمَئِذٍۭ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۶  
بِنَصْرِ اللّٰهِ ۷ يَنْصُرُ مَنۢ يَّشَآءُ ۸ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِیْمُ ۹ وَعَدَّ اللّٰهُ ۱۰ لَا يُجْلِفُ اللّٰهُ  
وَعَدَةً ۱۱ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۱۲

”الف۔ لام۔ میم۔ روم والے قریبی سرزمین میں مغلوب ہو گئے اور وہ اپنے اس مغلوب ہونے کے بعد بہت جلد پھر غالب آجائیں گے چند ہی برس کے اندر، اللہ ہی کے ہاتھ میں معاملہ ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اُس دن مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ عزت والا ہے، بڑا مہربان۔ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا مگر زیادہ تر لوگ جانتے نہیں۔“

روم والے عیسائی تھے جو اپنے اصول مذہب کے لحاظ سے مسلمانوں کے ساتھ زیادہ قرب رکھتے تھے اور فارس والے مشرک آتش پرست تھے، اس لئے ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کو رنج ہوا۔ اُس وقت تسلی کے لئے یہ سورہ اور اُس کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں قرآن نے ایک غیب یعنی آئندہ کے متعلق اور وقت کی قید کے ساتھ کہ چند ہی سال میں ایسا ہوگا، یہ پیشین گوئی کی تھی جس پر اہل ایمان نے اُسی وقت یقین کر لیا ہوگا مگر منافقین اور مخالفین اسلام کے لئے فطری طور پر وہ ایک بڑا ہی حقانیت اسلام کی آزمائش یا



(نعوذ باللہ) اُسے غلط ثابت کرنے کا ایک سرمایہ لگیا جس کی وجہ سے انہوں نے وہ آٹھ دس برس کی مدت دن گن گن کر گزارا ہوگی مگر دنیا کی تاریخ موجود ہے اور ہر ایک اب اس وقت بھی حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ اس سورے کے نازل ہونے سے اتنی ہی مدت کے بعد یہ واقعہ جس کی خبر قرآن نے دی تھی وقوع میں آگیا اور اس طرح یہ آیت باعتبار اپنے اخبار بالغیب جس طرح اُس زمانے کے لوگوں کے لئے ایک برہان حقانیت تھی اُسی طرح آج بھی ہر محقق کے لئے وہ ایک برہان کی حیثیت رکھتی ہے۔

**يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ ﴿٥﴾**

”وہ جانتے ہیں بس دنیوی زندگی کے سطحی پہلو کو اور وہ آخرت سے بے خبر ہیں۔“

**دنیا کے معاملہ میں نکتہ رسی دین کے بارے میں بے خبری**

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”یعنی ظاہر دنیا میں جس کا غلبہ دیکھیں، کہیں اللہ اُس سے خوش ہے“ (موضح القرآن)

مگر افسوس ہے کہ یہی ذہنیت مسلم اکثریت کی رہی اور یہ کہ قہر و غلبہ کو دلیل حقانیت سمجھ لیا۔

پھر اس ارشاد قرآنی کو ذرا وسیع دائرہ میں لے جائیے تو قرآن مجید جیسے ایک بڑی حیرت ناک ہی نہیں، عبرت ناک واقعیت پیش کر رہا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ذہین مفکر، فلسفی جو کتنی فلسفہ کی گھتیاں سلجھا دیں اور دنیوی معاملات میں بڑے نکتہ رس کاروباری دنیا کے ماہرین، وہ خدا اور روز آخرت کے بارے میں ایسی سطح پر آجائیں کہ معمولی باتوں کو جنہیں عام عقل والے سمجھ سکتے ہیں، وہ کسی طرح سمجھانے سے بھی نہ سمجھیں اور آخرت سے بالکل بے خبر رہیں۔ اس مفہوم کو ہمارے پہلے کے بہت قدیم مفسرین نے بہت روزمرہ کی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ [۱]

**اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَائِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴿٥﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوْا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَا اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۗ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٦﴾ ثُمَّ كَانَ عٰقِبَةُ الَّذِيْنَ اَسَءُوْا السُّوْاىَ اَنْ كَذَّبُوْا بِآيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا**

[۱] ای یعلمون من منافع الدنيا ومضارها ومتى يزرعون ومتى يحصدون وكيف يجمعون وكيف يبنون وهم جهال بالأخوة فعبروا دنياهم وخرّبوا آخرتهم عن ابن عباس (مجمع البيان)

## يَسْتَهْزِءُونَ ﴿١٥﴾

”کیا انہوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو پیدا نہیں کیا مگر صحیح طور پر اور ایک مقررہ مدت کے لئے اور یقیناً زیادہ تر لوگ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری سے منکر ہیں۔ کیا وہ اطراف زمین میں پھرے نہیں کہ دیکھیں کیا انجام ہوا اُن کا جو ان کے پہلے تھے۔ وہ ان سے زیادہ طاقت ور تھے اور انہوں نے زمین کو تہ و بالا کر دیا تھا اور اُس میں عمارتیں بنائی تھیں اُس سے زیادہ جتنی انہوں نے بنائی ہیں اور اُن کے پیغمبر اُن کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرے مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے، پھر جنہوں نے برائی کی تھی، اُن کا انجام بہت برا ہوا اس لئے کہ انہوں نے آیات الہی کو جھٹلایا اور وہ اُس کا مذاق اڑاتے تھے۔“

اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿١١﴾ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ  
 الْمُجْرِمُونَ ﴿١٢﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِّنْ شَرِّ كَافِهِمْ شَفْعُوا وَكَانُوا بِشَرِّ كَافِهِمْ كَفِرِينَ ﴿١٣﴾  
 وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُؤْمِدُ يُتَفَرَّقُونَ ﴿١٤﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
 فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ﴿١٥﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ  
 فَأُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُخَضَّرُونَ ﴿١٦﴾

”اللہ پہلے پہل پیدا کرتا ہے خلاق کو، پھر دوبارہ انہیں پلٹا کر لاتا ہے، پھر اُس کی طرف تمہاری حاضری ہوگی اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو گناہ گار لوگ دم بخود ہو جائیں گے اور نہ ہوں گے ان کے ”خیال کیے ہوئے“ شریکوں میں سے اُن کے کوئی سفارشی اور وہ اپنے شریکوں سے منکر ہوں گے اور جس دن قیامت برپا ہوگی اُس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے تو جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے، وہ ایک خاص بہشت میں خوش خوش ہوں گے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آخرت کی حاضری کو تو وہ عذاب میں حاضر کیے جانے والے ہوں گے۔“

”پہلے پہل پیدا کرتا ہے“ یہ تو پہلی زندگی اسی دارد دنیا کی ہوگی اور پھر ”انہیں پلٹا کر لاتا ہے“ یہ حیات بعد الموت ہے اور پھر اُس کی طرف تمہاری حاضری ہوگی یہ میدانِ محشر میں حساب و کتاب کے لئے لایا جاتا ہے۔

اب چونکہ درمیان والی حیات بعد الموت کے بعد ثمر ”پھر“ کے لفظ کے ساتھ جو ذرا فاصلے کا پتہ دیتا ہے بارگاہ الہی میں حاضری کا ذکر ہے، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ درمیان والی زندگی کا ذکر قبر میں سوال و جواب کے لئے زندہ کیے جانے سے متعلق ہے [۱] اور ممکن ہے کہ وہ وہی

[۱] يجوز ان المراد به احياءهم في القبر للمسئلة (تبيين)

زندگی ہو جو حشر و نشر کے ہنگام میں قبروں سے برآمد ہونے کی صورت میں ہوگی اور ”پھر“ اس کی طرف تمہاری حاضری ہوگی، یہ موقف حساب و کتاب میں کھڑا ہونا ہے جس کے بعد جزا و سزا کی منزل ہے ﴿﴾ اور ان دونوں میں فاصلہ زمانہ کے لحاظ سے چاہے نہ ہو لیکن نوعیت کے فرق کی وجہ سے بیچ میں ٹھہرا گیا ہے جو بعض مقامات پر صرف ذکر میں ترتیب کے لئے بھی آتا ہے جس کی نظیریں بہت ہیں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سن چکے۔ اب اس کے بعد یہ سنو۔

**فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ ﴿١٦﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ**

**وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ ﴿١٧﴾**

”تو تسبیح ہے اللہ کی جب تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو اور اسی کی حمد ہے آسمانوں اور زمیں میں اور رات گئے اور جب تمہیں دوپہر کا وقت ہوتا ہے“

### اوقات نماز کی طرف اشارہ

اس آیت میں نماز بیچ گانہ کے اوقات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:-

مراد آنست کہ در ہر وقتی از این اوقات دلائل تنزیہ او از رذائل و اتصاف او بحمائد متجدد می گردد پس مامور شدند بصلوة.

مقصود یہ ہے کہ ان اوقات میں سے ہر ایک میں تمام برائیوں سے اُس کے بری ہونے اور تمام خوبیوں سے اس کے متصف ہونے کے ثبوت تازہ ہوتے رہتے ہیں لہذا اُن میں نماز کا حکم ہوا۔

اس صورت میں یہ بات قابل لحاظ ہے اس میں حِينَ تُمْسُونَ نماز صبح اور عشیئاً نماز عشاء چونکہ وقت فضیلت اُس کا بلاشبہ تاخیر کے ساتھ ہے، بس اُس کے بعد ایک لفظ ہے حِينَ تُظْهِرُونَ جس میں فقہ اہل بیت کے مطابق ظہر و عصر دونوں کا وقت آجاتا ہے لیکن اگر اسے نہ مانا جائے اور عصر کے وقت کو ظہر سے جدا قرار دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آیت صرف چار نمازوں کو بتا رہی ہے۔ پانچویں کا ذکر ہی نہیں ہے۔

اس کے لئے بعض مفسرین نے یہ عجیب ستم ظریفی کی ہے کہ عشیئاً سے مراد عصر لے لی ہے اور تُمْسُونَ میں مغرب اور عشاء دونوں کو درج کیا ہے [۲] مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عشاء کا وقت دن ختم ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ دن کے آخری حصے میں نہیں ہے پھر یہ کہ خواہ تُمْسُونَ سے ظہر و عصر دونوں مراد ہوں اور خواہ تُمْسُونَ سے مغرب و عشاء دونوں مراد لی جائیں دونوں باتیں فقہ اہل بیت ہی کے لحاظ سے درست ہوتی ہیں کہ اصل وقت ظہر و عصر کا بھی ایک ساتھ شروع ہوتا ہے، صرف ترتیب لازم ہے اور اصل وقت مغرب اور عشاء کا بھی اسی طرح ایک ساتھ ہوتا ہے۔ فقہ اہل سنت کے لحاظ سے نہ ظہر کے ساتھ عصر کا وقت آتا ہے، نہ مغرب کے ساتھ عشاء کا بلکہ درمیان درمیان فاصلہ ہے تو وہاں ظہر و عصر کو ایک لفظ کے

[۱] یعیدهم بعد الموت احباً كما كانوا اثم اليه يرجعون بجاز يهمل باعمالهم (مجمع البيان)

[۲] حِينَ تُمْسُونَ فِيهِ صَلَوَاتُ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَالْعِشَاءِ فِيهِ صَلَوَاتُ الْعَصْرِ (جلالین)

ساتھ بیان ہونا چاہئے نہ مغرب اور عشاء کو بلکہ سب کا بیان الگ الگ ہونا چاہئے حالانکہ قرآن مجید میں کہیں ایسا نہیں ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿١٩﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ ﴿٢٠﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافَ الْأَلْسِنَتِكُمْ وَالْوَالِدَاتِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْغَالِبِينَ ﴿٢٢﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُسْمِعُونَ ﴿٢٣﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ۗ ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْأَرْضِ ۗ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرَجُونَ ﴿٢٥﴾ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ ۗ كُلُّ لَّهُ قَانُونٌ ﴿٢٦﴾ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۗ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٧﴾

”وہ نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے اور وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد اور اسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے، اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک دم تم چلتے پھرتے ہوئے انسان ہو گئے اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہارے نفوس سے جوڑے قرار دیئے تاکہ سکون حاصل کرو تم اُن سے اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی قرار دی یقیناً اُس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو غور و فکر کریں اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کا اور مختلف ہونا ہے تمہاری زبانوں اور رنگوں کا یقیناً اُس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے اور اُس کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا ہے رات اور دن میں اور تمہارا روزی طلب کرنا ہے اس میں، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو سٹیں اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ دکھاتا ہے تمہیں بجلی ڈرا اور آسمرے کے لئے اور آسمان سے پانی برساتا ہے تو اُس سے زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد، یقیناً اس میں

نشانیوں میں اُن کے لئے جو عقل سے کام لیں اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اُس کے حکم سے برقرار ہیں اور پھر جب تمہیں ایک دفعہ زمین کے اندر سے وہ بلائے گا تو ایک دم تم نکل کھڑے ہو گے اور اُس کے ہیں سب لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب اُس کی اطاعت کرنے والے ہیں اور وہ ہی وہ ہے جو پہلی دفعہ خلائق کو پیدا کرتا ہے۔ پھر دوبارہ زندہ کرے گا اور وہ اُس کے لئے بہت آسان ہے اور اُس کے لئے بلند ترین وصف ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہ عزت والا ہے، حکمت والا۔

قدرت الہی کی نشانیوں میں زبانوں کے اختلاف کے بیان سے ایک تصور ذہن میں یہ آتا ہے کہ سوائے ان زبانوں کے جو باہمی میل جول سے بنی ہیں جیسے اردو، باقی جو اصل زبانیں مختلف ملکوں کی ہیں وہ شروع شروع قدرتی طور پر من جانب اللہ پیدا ہوئی ہیں، پھر ان میں رفتہ رفتہ ترقی انسانوں کی کارگزاری سے ہوئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قدرت کی طرف سے مختلف ملکوں کے زبان و وہن کی ساخت اُن زبانوں میں دخل رکھتی ہو۔ [۱]

”سونا ہے رات اور دن میں اور تمہارا روزی طلب کرنا اُس میں، بظاہر یہ آخر والی ضمیر نہار یعنی دن کی طرف راجع ہے، چونکہ کاروبار تجارت اور زراعت کا فطری موقع دن ہوتا ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ جیسے سونے کا عمومی وقت رات کا ہوتا ہے لیکن دن کو بھی آدمی سو رہتا ہے، اُسی طرح تحصیل معاشی کا عام وقت دن ہے لیکن رات کے کچھ حصے میں بھی یہ کام ہوتا ہے۔ [۲]

**صَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ ۖ هَلْ لَّكُمْ مِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنْتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۗ كَذَلِكَ نَفْصِلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۳۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ فَمَنْ يَهْدِي مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ۗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّصِيرِينَ ﴿۳۹﴾**

”اُس نے تمہارے لئے مثال پیش کی ہے خود تمہاری، کیا تمہارے جو ملکیت میں غلام ہیں اُن میں سے کچھ اُس دولت میں جو ہم نے تم کو دی ہے تمہارے ساتھ حصہ دار ہیں کہ تم سب اس میں برابر کا حق رکھتے ہو اور تم اُن سے اس طرح ڈرو جس طرح اپنے آپس کے آدمیوں سے ڈرتے ہو؟ اس طرح ہم باتیں تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں بلکہ جو ظالم ہیں، انہوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے بغیر واقفیت کے تو کون ہدایت کر سکتا ہے اس کی جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے اور اُن لوگوں کے لئے کوئی مددگار نہ ہوں گے۔“

پیش کردہ مثال کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے غلام تمہارے اموال میں برابر کے حصہ دار نہیں ہیں تو اللہ کے بندوں کو تم اس کے

[۱] ان كانت اللغات توقيضية فهو الذي فعلها وان كانت مواضعه من قبل العباد فهو الذي يسرها (مجمع البيان)

[۲] قبل ان الليل والنهار معا وقت التوم ووقت ابتغاء الفضل (مجمع)

قلم رو رو بوبیت میں اُس کے شریک کیوں مانتے ہو اور خدائی کا درجہ کس لئے دیتے ہو؟ [۱]

فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۖ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۗ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾  
 مُبَيِّنِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۳۱﴾ مِنَ  
 الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۗ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿۳۲﴾

”تو اپنا رخ سیدھا رکھو دین حق کے لئے سب راستوں سے ہٹ کر، اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔ اُس سے لو لگائے رہو اور اُس سے ڈرو اور نماز پڑھتے رہو اور مشرکوں میں سے نہ ہو، اُن میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر جماعت اُس سے جو اُن کے پاس ہے خوش ہے۔“

### اسلام کا دین فطرت ہونا

”خوش ہے، یعنی اُس کیش کو جسے وہ بطور ”دین“ اختیار کئے ہوئے، سچا سمجھتے ہیں۔ [۲]

یہ سمجھنا اگر فطری طور پر تصور ذہن کا نتیجہ ہوتا تو قابل معافی تھا جیسا کہ مجنون مرفوع القلم ہوتا ہے لیکن چونکہ اس میں ذہنی تساہلی اور فرض تحقیق کے انجام دینے میں کوتاہی کا فرما ہے لہذا وہ باعث معذوری نہیں ہے۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسُ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا آذَاهُمْ مِنْهُ رَحْمَةٌ  
 إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۗ فَتَمَتَّعُوا أَهْلَهُ  
 فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۳۴﴾ أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهَوَيْتَكُمْ بِمَا كَانُوا بِهِ  
 يُشْرِكُونَ ﴿۳۵﴾

”اور جب لوگوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے پروردگار سے لو لگاتے ہوئے اُس سے دعا کرتے ہیں، پھر جب وہ اپنی طرف سے انہیں کچھ مہربانی کا مزہ چکھاتا ہے تو اُن میں سے ایک فریق ایک دم شرک کرنے لگتا ہے تاکہ جو

[۱] المعنى انكم اذلم ترضو العبيد كم ان يكونوا اشركاء لكم في اموالكم واملواكم فكم فكيف ترضون لربكم ان يكون له شركاء في العبادة (مجمع البيان)

حاصل مثل این است کہ مملوک یا مالک برابرین می شود پس مملوک خدا را شریک او نتوان گفت (فتح الرحمن)

[۲] كل فريق بدینهم معجبون مسرودون یظنون انهم علی حق (مجمع البيان)

ہم نے انہیں عطا کیا ہے، اُس کا کفر ان نعمت کریں تو اچھا فائدہ اٹھا لو، اس کے بعد تمہیں معلوم ہوگا۔ کیا ہم نے اُن پر کوئی ثبوت اُتار ہے کہ وہ اُن کے سامنے بولتا ہو، اُس کے ساتھ جو وہ شرک کرتے ہیں۔“

”شرک اعتقادی“ نہ ہی تو ایک طرح کا شرک عملی اُس کی اطاعت کو چھوڑ کر شیطان کی اطاعت کرنا یا نفسانی خواہش کی پیروی کرنا بھی ہے جسے دوسری جگہ قرآن مجید میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ: **مَنْ اتَّخَذَ إِلَهًا هُوَا** ”جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنایا“ اس معیار پر جانچنے تو جو کردار قرآن نے ان آیتوں میں اور متعدد جگہ قرآن میں اور بھی، مشرکین کا پیش کیا ہے، وہ مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ ”مومنین کرام“ میں بھی نظر آتا ہے یا نہیں؟

جب تک لڑکی کی شادی نہیں ہو رہی تھی، خدا یاد تھا، دعائیں اُس سے مانگی جا رہی تھیں اور جب ماشاء اللہ وہ دن آیا اور فضلِ خدا سے شادی کا ہنگام آیا تو اب خدا سے مطلب نہیں۔ وہ باتیں اب کی جا رہی ہیں جو اُسے ناراض کرنے والی اور شیطان کو خوش کرنے والی ہیں۔ گانا بجانا اور ناچ رنگ اور وہ بھی رات بھر اب شیطان ہی شیطان ہے، خدا کا نام نہیں۔ یہ کیا اسلام اور ایمان کا تقاضا ہے؟

اس ناشکرے پن پر اُس نے تہدید کی انداز میں کہا ہے کہ ”اس کے بعد تمہیں معلوم ہوگا“۔ [۱]

اب ہو سکتا ہے اسی دنیا میں معلوم ہو جائے کہ کفر ان نعمت کے نتیجے میں سلب نعمت ہو جائے اور شادی ”ناشادی“ سے بدل جائے اور خواہ آخرت میں معلوم ہو، جب وہاں کا عذاب سامنے آئے۔

اب خدا کی نعمتوں کے مقابلہ میں یہ کردار اگر اجتماعی طور پر پوری قوم مسلم نے اختیار کیا ہے تو اُس کے نتائج بھی سلب نعمت کی صورت میں پوری قوم کے سامنے آئیں گے، چاہے اُس پر اب کتنے ہی دردمندانہ انداز میں ”شکوہ“ کیا جائے مگر پھر ”جواب شکوہ“ بھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود ہی دینا پڑے گا۔

**وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا ۗ وَإِنْ تُصِيبُهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ ﴿٣٦﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يَقْدِرُ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٣٧﴾**

”اور جب ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو مہربانی کا ذائقہ تو وہ اُس سے خوش ہو جاتے ہیں اور جو کچھ وہ اپنے ہاتھوں کر چکے ہے، اُس کی پاداش میں اُن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ایک دم وہ نا اُمید ہو جاتے ہیں، اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ وسعت دیتا ہے روزی میں جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگی کرتا ہے (جس کے لئے چاہتا ہے) یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو ایمان لائیں۔“

**فَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۗ ذَلِكَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ**

[۱] ای فانتفعوا بهذه النعم الدنیویة کیف شئتم فسوف تعلمون ما فیہ من کفر کم و معصیتکم (مجمع البیان)

## وَجَهَ اللَّهُ زَوَاوَلِيكَ هُمُ الْمَفْلِحُونَ ﴿٣٨﴾

”تو قرابت دار کو اُس کا حق دیجئے اور مسکین اور مسافر کو، یہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لئے جو رضائے الہی کے طلب گار ہوں اور یہی لوگ ہر طرح کی بہتری پانے والے ہیں۔“

## وہ ارشاد الہی جس کی بنا پر فدک ہبہ کیا گیا

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت مستقل طور پر حضرت پیغمبر خدا ﷺ کو مخاطب کر کے اتری ہے اور اُس کے اترنے کے بعد حضرت نے فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو بلا کر فدک ہبہ فرمایا تھا، یہ روایت فریقین کے یہاں متفقہ حیثیت سے موجود ہے۔ بے شک بعد کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ قرابت داروں، محتاجوں اور مسافروں کو یہ عطا کرنے کا حکم ہے سب ہی کے لئے اور رسول خدا ﷺ کا اس پر عمل کرنا اپنی جانب سے اُس کی عملی مثال قائم کرنے کے لئے تھا۔ اس طرح اُس کی دوسری تفسیر بھی جو عموم کا پتہ دیتی ہے [۱] اس متفق علیہ روایت کے خلاف نہیں ہے۔

## وَمَا آتَيْتُمْ مِّن رَّبِّ لِيَزْبُؤَ فِيْ أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَزْبُؤَ عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَمَا آتَيْتُمْ

## مِّنْ زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجَهَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ﴿٣٩﴾

”اور جو تم لوگ سودی روپیہ دو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں مل کر اضافہ پائے تو وہ اللہ کے یہاں اضافہ کا باعث نہیں ہوگا اور جو تم زکوٰۃ دو جس سے اللہ کی خوشنودی چاہتے ہو تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو دو نادون پائیں گے۔“

## سود میں خسارہ اور زکوٰۃ میں فائدہ

انسان سود کھاتا ہے اس لئے کہ مال و دولت میں اضافہ ہو اور اللہ کی طرف کے حقوق مایہ زکوٰۃ و خمس دینے سے اس لئے گریز کرتا ہے کہ اس سے مال میں کمی ہوگی مگر خالق ارشاد فرماتا ہے کہ اس سود سے چاہے اس دنیا میں کچھ دولت بڑھ بھی جائے مگر اللہ کے یہاں اُس میں خسارہ ہی خسارہ ہے اور اس زکوٰۃ و خمس سے مال میں وقتی طور پر کمی ہو جاتی ہے مگر نتیجہ میں اس سے دو نادون اضافہ ہی ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بھی مال میں برکت ہوتی ہے اور خدا کے یہاں ثواب تو اتنا گنا ملتا ہے کہ انسان اُس کی حد ہی مقرر نہیں کر سکتا اس لئے حدیث میں ہے: ما نقص مال من صدقة (مجمع البیان) کسی مال میں خیرات سے کمی نہیں ہوتی۔

## اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۗ هَلْ مِنْ

## شُرَكَائِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِّنْ ذَلِكَ مِّنْ شَيْءٍ ۗ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٠﴾

”اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں روزی دی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا

[۱] قبیل انہ خطاب لہ ﷺ ولغیرہ والمراد بالقربی قرنی الرّجل وهو امر بصلۃ الرحمٰن بالمال والنفس عن الحسن (مجمع البیان)



تمہارے (مانے ہوئے) شریکوں میں کوئی ہے جو اس میں سے کچھ بھی کام انجام دے؟ پاک ہے اس کی ذات اور بلند ہے اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں؟

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ  
الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٣١﴾

”خرابی نمایاں ہو گئی ہے خشکی اور تری میں اُن کاموں سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کیے تاکہ وہ چکھائے انہیں کچھ اُن کے اعمال کا مزہ شاید کہ وہ پلٹیں، یعنی توبہ کریں۔ [۱]

لوگوں کے اعمال سے دو (۲) طرح خشکی اور تری میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اُن کی بد اعمالیوں کے نتیجے میں تنبیہی طور پر زلزلے اور طوفان وغیرہ آئیں یا زراعتوں کی تباہی اور قحط سالی کا دور دورہ ہو۔ [۲]

دوسرے اُس طرح جس کا تجربہ آج دنیا کو ہو رہا ہے کہ لوگوں کی نفع اندوزی کی ہوس سے اجناس کی کمی ہو جائے۔ ریلوں کے ڈرائیور اور جہازوں کے کپتان وغیرہ ادائے فرائض میں کوتاہی سے اکثر لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۗ كَانَتْ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ﴿٣٢﴾ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يُصَدِّعُونَ ﴿٣٣﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۗ وَمَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلَا نَفْسِهِمْ يُمَّهَدُونَ ﴿٣٤﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ﴿٣٥﴾

”کہنے کہ چلو پھر زمین میں، پھر دیکھو کہ کیا انجام ہوا اُن کا جو اس کے پہلے تھے؟ وہ زیادہ تر مشرک تھے، تو تم اپنا رُخ سیدھا رکھو صحیح دین کے لئے قبل اس کے کہ وہ دن آئے اللہ کی طرف سے جسے پلٹنا نہیں ہے، اُس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے، جو کفر اختیار کرے، اُس کفر سے نقصان اُسی کو ہوگا اور جو اچھے اعمال کرے تو وہ لوگ خود اپنے لئے سامان کر رہے ہیں تاکہ وہ انہیں جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے اپنے فضل و کرم سے صلہ دے اور یقیناً وہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔“

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيَّاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَلِتَجْرِيَ

[۱] یتوبون (جلالین)

[۲] قبل بالعدل ینبت الله الزرع ویدر الضرع وبالظلم ینبت القحط وضحی الرزق (تبیان)

## الْفَلَكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٣٦﴾

”اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو خوش خبری دینے والی بنا کر اور اس لئے کہ چکھائے تمہیں مزہ اپنی رحمت کا اور اس لئے کہ چلیں کشتیاں اُس کے حکم سے اور اس لئے کہ تم اس کے فضل و کرم سے روزی حاصل کر سکو اور شاید تم شکر گزار ثابت ہو۔“

اس میں ہواؤں کے جتنی قسم کے نمایاں فائدے ہیں، اُن کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہواؤں کا خوش خبری دینا زبان سے نہیں ہوتا بلکہ چونکہ اُن کی رفتار سے بارش کی اُمید پیدا ہوتی ہے، اس لئے اُن کی طرف خوش خبری کی نسبت دی گئی ہے، جس طرح اپنے ارادہ خاص سے اُن کے چلانے کو بھیجنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ [۱]

## وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَاذْتَقَمْنَا

### مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا ۗ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٧﴾

”اور ہم نے بھیجے آپ کے قبل بہت سے پیغمبر اُن کی قوم کی طرف تو وہ اُن کے پاس معجزے لائے تو جو گناہ گار ثابت ہوئے، اُن سے ہم نے بد لایا اور ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمے ایک لازم الادا حق تھا۔“

## اللہ پر تقاضائے عدل واجب ہونا

جن کا تصور یہ ہے کہ اللہ پر کسی امر کو واجب کہنے کا مطلب اُس کی قدرت کو محدود کرنا ہے، وہ خود اللہ سبحانہ کے اس ارشاد پر توجہ کریں کہ کان حقاً علینا نصر المؤمنین جس کا بالکل تحت اللفظی مگر مطلب خیر ترجمہ یہی ہوتا ہے جو میں نے کیا ہے کہ ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمے ایک لازم الادا حق تھا، [۱] اب اس مطلب کو چاہے کوئی کسی زبان میں ادا کرے مگر عربی میں علی کا لفظ لازمی ذمہ داری ہی کا پتہ دیتا ہے تو کسی بھی نقطہ نظر والے کو اس وجوب و لزوم کے پہلو کا چھوڑنا ممکن ہی نہیں ہے۔ [۲] مگر یہ وجوب و لزوم کسی دوسری بالادست طاقت کی طرف سے نہیں ہے تاکہ اس کی قدرت قاہرہ اور ربوبیت مطلقہ کے خلاف ہو بلکہ یہ اس کے تقاضائے عدل و حکمت کی بنا پر اور کمال ذات و افعال کا نتیجہ ہے۔ یہی مطلب یہ کہنے کا ہے کہ اللہ پر عدل واجب ہے، تکلیف بلا بیان یا تکلیف مالا یطاق ناممکن ہے۔ اس کے معنی قدرت کی نفی کے نہیں ہیں بلکہ تقاضائے کمال ذاتی کے اظہار کے ہیں۔

## اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ

[۱] فَكُنَّا نَهَا نَاطِقَاتٍ بِاللِّسَانِ لِمَا فِيهَا مِنَ الدَّلَالَةِ عَلَيْهِ وَارْسَالِ الرِّيحِ تَحْرِيكُهَا وَاجْرَاؤُهَا فِي الْمَجَاهَاتِ الْمَخْتَلِفَةِ (مجمع البيان)

[۲] اِى اَوْجِبْنَا عَلٰى اَنْفُسِنَا اَنْ نَنْصُرَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ عِبَادِنَا (تبیان)

[۳] كَانَ وَاجِبًا عَلَيْنَا نَصْرَهُمْ بِاعْلَاءِ الْحُجَّةِ وَدَفْعِ الْاِعْدَاءِ عَنْهُمْ (مجمع البيان) بُوَد نَصْرَتُ مَسْلَمَانٍ لَازِمٌ بَدْمَا (شاه ولی اللہ) تَهَا لَازِمٌ اَوْ پَر ہمارے (شاه رفیع الدین)

كِسْفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خَلِيلِهِ ۚ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادَةٍ  
 إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٣٨﴾ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْهِمْ مِنَ قَبْلِهِ  
 لَمُبْلِسِينَ ﴿٣٩﴾ فَاَنْظُرْ إِلَىٰ آثَرِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ إِنَّ  
 ذَٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتَىٰ ۗ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤٠﴾ وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِجْمًا فَرَاوُهُ  
 مُصَفَّرًا لَّا ظُلُمًا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ﴿٤١﴾

’اور وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو لاتی ہیں، اس کے بعد اُسے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور اسے مختلف ٹکڑوں کی شکل میں لاتا ہے تو بڑی بڑی بوندوں کے میٹھ کو دیکھو گے کہ وہ اس کے اندر سے نکلتا ہے تو جب وہ اُسے پہنچاتا ہے جس حد تک اپنے بندوں میں سے وہ چاہتا ہے تو وہ ایک دم خوش ہو جاتے ہیں، اگرچہ وہ اس سے پہلے کہ یہ اُس کی طرف سے اُن پر اترے، نا امید تھے تو دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کو کس طرح وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد، یقیناً وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور اگر ہم ایسی ہوا بھیج دیں کہ وہ اُس (کھیتی) کو زرد دیکھیں تو اس کے بعد وہ کفر اختیار کریں گے۔‘

حیات بعد الموت کے لئے قرآن مجید جو مثالیں پیش کرتا ہے، وہ بھی اُن غیر اسلامی جزاؤں کے تصورات کو ختم کرنے کے لئے کافی ہیں جو آج کل کے بعض مادیت یا بخیاں خود ’عقلیت‘ کے پرستار و عویداران اسلام حشر و نشر کے بارے میں قرآن مجید کے سرمنڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فَإِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تَسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٥٠﴾ وَمَا أَنْتَ  
 بِهَادِي الْعُمَىٰ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۗ إِنَّ تَسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْمِعُونَ ﴿٥١﴾  
 ’تو یقیناً آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں جب وہ پیٹھ پھیر کر منحرف ہوں اور نہ آپ  
 اندھوں کو اُن کی گمراہی سے ہٹا کر راستے پر لگا سکتے ہیں، آپ تو نہیں سنا سکتے مگر انہیں جو ہماری آیتوں کا اعتبار کریں  
 تو وہی اسلام قبول کرتے ہیں۔‘

ظاہر ہے کہ حضرت گوئی قبرستانوں میں جا کر واقعی مردوں کو تو آواز دیتے نہیں تھے، آپ تو جیتے جاگتے لوگوں ہی کو دعوت حق دیتے تھے مگر چونکہ کفار و مشرکین آپ کے کلام کو توجہ سے نہیں سنتے اس لئے بطور استعارہ اُن کی تعبیر مردوں سے کی گئی جس کی نظیر قرآن مجید میں دوسری جگہوں پر بھی موجود ہے اور اسی لحاظ سے انہیں بہرا اور اندھا بھی کہا گیا ہے۔ [۱]

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ

[۱] شبہ الکفار لترك تأثرهم فيما يدعوهم اليه النبي ﷺ، تارة بالاموات وتارة بالضعف (مجمع البيان)

بَعْدَ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً ۖ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ ﴿٥٣﴾

”اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا کمزور، پھر کمزوری کے بعد طاقت دی، پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپے کا دور قرار دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ بڑا جاننے والا ہے، قدرت والا۔“

یہاں بقرینہ سیاق ”جو چاہتا ہے“ سے انواع مخلوقات مراد نہیں بلکہ گونا گوں کیفیات مراد ہیں۔ [۱]

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ ۗ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ ۗ كَذَلِكَ

كَانُوا يُؤْفَكُونَ ﴿٥٤﴾ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ

اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ ۖ فَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلَكِنَّكُمْ كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٥٦﴾

فِيَوْمٍ مِّنْ دُونِهَا يَنْفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَمْعَادَرْتَهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٥٥﴾

”اور جس دن قیامت پھا ہوگی، گنہگار لوگ قسمیں کھائیں گے کہ وہ تھوڑی دیر سے زیادہ نہیں رہے، ایسے ہی وہ تو (پہلے بھی) بے راہ روی میں مبتلا تھے اور کہیں گے وہ جنہیں علم اور ایمان عطا ہوا تھا کہ تم اللہ کے نوشتے کے مطابق دوبارہ کی زندگی تک اس عالم میں رہے چنانچہ یہ وہ دوبارہ کی زندگی کا دن ہے مگر تم جانتے نہیں تھے تو اُس دن ظالموں کو اُن کی عذرخواہی کچھ فائدہ نہ دے گی اور نہ اُنہیں تلافی کا موقع دیا جائے گا۔“

### دور برزخ کا قیامت میں فراموش ہونا

دور برزخی میں ایک طرح کی زندگی ثابت ہے اور یہ برزخ والا دور وہی ہے جو موت کے بعد سے قیامت کی دوبارہ زندگی تک ہے مگر قرآن مجید کی اس آیت اور اس مضمون کی دوسری آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی زندگی کا آئندہ کے دور حیات سے جو قیامت میں ہوگا کوئی ربط نہیں ہے یعنی جو کچھ اس درمیانی دور میں ہوا، وہ اُس وقت یاد نہیں ہوگا کہ جب قیامت میں اُٹھیں گے، اُنہیں بالکل احساس نہیں ہوگا کہ اس سے پہلے کس عالم میں تھے۔ [۲]

بے شک جو دار دنیا کی پہلی زندگی ہی میں جانتے اور مانتے تھے کہ موت آئے گی اور پھر برزخ ہوگا اور پھر قیامت میں حیات ثانیہ ہوگی، وہ اپنے اُنہیں معتقدات کی روشنی میں حقیقت کا انکشاف کر سکیں گے کہ ہمیں تو پہلے سے قدرت کا پروگرام معلوم تھا کہ مرنے کے بعد قیامت تک عالم برزخ میں رہنا پڑے گا اور پھر تمام اہل دنیا کی عمر ختم ہونے کے بعد قیامت کا دن ہے جس دن تازہ زندگی ہوگی تو یہ وہی قیامت کا دن ہے جس کی ہمیں پہلے سے خبر تھی مگر تم نے پہلے ہی اس علم کو حاصل نہ کیا تھا، اس لئے آج تم یہ جہالت کی باتیں کر رہے ہو۔

بعض مفسرین نے اس کو دور برزخی سے متعلق قرار ہی نہیں دیا ہے بلکہ یہ مطلب قرار دیا ہے کہ آخرت کی سختیاں دیکھ کر وہ دنیا کی زندگی کو

[۱] ما یشاء من ضعف وقوة (مجمع البیان)

[۲] ما لبثوا فی القبور (جلالین) یعنی قبر کار ہنا تھوڑا معلوم ہوگا (موضع القرآن)

یاد کریں گے کہ افسوس وہ کتنی مختصر تھی۔ [۱] مگر میرے خیال میں بظاہر قرآن کے خلاف ہے اور اہل علم و ایمان کا جو جواب درج کیا گیا ہے، وہ بھی اس کے ساتھ چسپاں نہیں ہے۔

بے شک اس قسم کی آیات سے عالم برزخ والے عذاب کا سمجھنا مشکل ہے، اس لئے کہ یہ آیات اُس دور میں بالکل بے خبری کا پتہ دیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ عذاب میں بغیر شعور و احساس کے کوئی معقولیت نہیں ہے، اس لئے بعض اہل فکر نے ان آیات سے عذاب برزخ کی نئی پر استدلال کیا ہے مگر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عذاب قبر تو میعاد کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اُس میعاد کے ختم ہونے کے بعد اُن پر بے حسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور یہ سوال و جواب اُس بے حسی کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کے موقع کا ہے لہذا اس میں اور عذاب قبر میں کوئی منافات نہیں ہے۔ [۲]

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۖ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ  
لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ﴿۵۸﴾ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ  
الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفُّكَ الَّذِينَ لَا  
يُوقِنُونَ ﴿۶۰﴾

”اور ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال پیش کی ہے اور اگر آپ اُن کے پاس کوئی بھی معجزہ لایئے تو کافر لوگ ضرور یہی کہیں گے کہ تم لوگ نہیں ہو مگر غلط راستے پر، اسی طرح اللہ مہر کرتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو جانتے بوجھتے نہیں تو آپ صبر و تحمل سے کام لیجیے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور آپ کو جوش میں نہ لائیں وہ جو یقین نہیں کرتے۔“

[۱] من استدلال بهذا الآية على نفي عذاب القبر فقد ابدى الماتيين ان الله يجوز ان يرى دواهم لهم يلبثوا بعد عذاب الله الاساعته (مجمع البيان)

[۲] من استدلال بهذا الآية على نفي عذاب القبر فقد ابدى الماتيين ان الله يجوز ان (مجمع البيان)

# سُورَةُ الْقَمِينِ

مکیہ --- ۳۴ --- آیات

چونکہ جناب لقمان علیہ السلام کا ذکر خاص اسی سورے میں ہے، اس لئے اس کا نام اُن کے نام پر ہوا۔

## سورۃ لقمان کے خاص خاص مضامین:

۱۔ ”ابوالحدیث“ کی حرمت جس کی تفسیر غنائی گانے کے ساتھ ہوئی ہے۔

۲۔ جناب لقمان کے مواعد و نصائح۔

۳۔ ادائے شکر کے حکم میں اللہ کے ساتھ والدین کا ذکر۔

۴۔ مخالفت پروردگار میں والدین کی اطاعت حرام، پھر بھی حسن سلوک کی ہدایت۔

۵۔ کلمات الہی کی کثرت و وسعت۔

۶۔ غیب کی اُن باتوں کا ذکر جن کا علم بس اللہ کو ہے۔ وغیرہ وغیرہ

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

الَّذِينَ هَدَىٰ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۙ وَالَّذِينَ هَدَىٰ وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَ ۙ ۝۱

یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُوْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ یُوقِنُوْنَ ۙ ۝۲

هُدٰی مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَآوَلِیِّكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۙ ۝۳

”الف۔ لام۔ میم۔ یہ آیتیں ہیں حکمت بھری کتاب کی۔ ہدایت اور رحمت اچھے اعمال والوں کے لئے جو نماز

پڑھتے، زکوٰۃ دیتے اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، یہ لوگ سیدھے راستے پر ہیں اپنے پروردگار کی طرف سے اور یہ

لوگ ہر طرح کی بہتری پانے والے ہیں۔“

ان ابتدائی آیات کا مضمون سورۃ بقرہ کے ابتدائی آیات میں آچکا ہے اور اس کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن یَشْتَرِیْ لَهٗوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَن سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۙ ۝۴

وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٦﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا ۗ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٧﴾

”اور انسانوں میں ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو تفریحی باتوں کا خریدار ہے تاکہ اللہ کے راستے سے بغیر واقفیت کے بھٹکائے اور اُس کا مذاق اڑائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے اور جب اُس کے سامنے ہماری آیتیں پیش ہوتی ہیں تو وہ منہ موڑتا ہے تکبر سے کام لیتا ہوا جیسے کہ اُس نے سنا ہی نہیں، جیسے کہ اس کے کانوں میں گرانی ہے تو اسے خوشخبری دونا دون عذاب کی“۔

### حرمتِ غناء

لہو الحدیث جس کا ترجمہ ہم نے ”تفریحی باتوں“ کے ساتھ کیا ہے، اُس کی تفسیر گانے بجانے اور شراب خواری وغیرہ کے ساتھ ہوتی ہے زیادہ قوت اسی کو ہے کہ اُس سے مراد غناء یعنی گانا ہے۔ [۱]

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴿٨﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَالْأَرْضَ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۗ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴿١٠﴾ هَذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ ۗ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿١١﴾

”یقیناً وہ جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے، اُن کے لئے آرام والے بہشت ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے اور وہ عزت والا ہے، حکمت والا، اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر کسی ستون کے جسے تم دیکھو اور زمین میں اس نے پہاڑوں کو رکھا کہ وہ تمہیں لئے ہوئے ڈانوا ڈول نہ ہو اور اس میں ہر طرح کے چلنے پھرنے والے پھیلا دیے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا تو اس سے ہم نے ہر قسم کی چیزیں اگائیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق۔ اب تم مجھے دکھاؤ جو اس کے علاوہ دوسروں نے پیدا کیا ہو بلکہ ظالم لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔“

”بغیر کسی ستون کے جسے تم دیکھو“ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اتنے بڑے آسمانوں کے لئے کوئی ستون ہوتا تو وہ تمہیں دکھائی دیتا، جب تمہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے تو یقین جانو کہ اس نے بغیر کسی ستون کے صرف اپنی قدرت سے اسے بلند کیا ہے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ

[۱] اکثر المفسرین علیٰ ان المراد بلہو الحدیث الغناء وهو قول ابن عباس وابن مسعود وغيرہما وهو المروی عن ابی جعفر وابی عبد اللہ رضی اللہ عنہما (مجمع البیان)

اس میں ایسے ستون نہیں ہیں جو تمہیں دکھائی دیں۔ اس میں ستون ویسے ہیں جو تمہیں دکھائی نہیں دیتے۔ علامہ طبرسی نے پہلے مفہوم کو ترجیح دی ہے مگر وجہ ترجیح کچھ درج نہیں فرمائی۔ [۱]

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اشْكُرْ لِلَّهِ ۖ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿۱۳﴾

”اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شکر ادا کرے گا وہ اپنے لئے اور جو کفرانِ نعمت کرے گا تو بلاشبہ اللہ بے نیاز ہے قابلِ تعریف“۔

جناب لقمان کے بارے میں اختلاف ہے، بعض اُن کو نبی کہتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ وہ نبی نہ تھے اللہ کے بس ایک نیک بندے تھے جنہیں اللہ نے خاص دانش مندی کا جوہر عطا کیا تھا۔ [۲]

قرآن مجید کا انداز بیان کہ ”ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی“ اور پھر ان کے ساتھ ایک طرح کا مخاطب جو وحی کا انداز رکھتا ہے، ذہن میں نبوت کے تصور کو تقویت دیتا ہے۔ علامہ طبرسی نے اور بھی اقوال درج کیے ہیں اور ایک حدیث نبوی بھی کہ وہ نبی نہیں تھے مگر یہ حدیث کسی معتبر سند کے ساتھ نہیں ہے۔

وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿۱۴﴾

”اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے نصیحت کرتے ہوئے کہا اے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے“۔

### آغاز وصایاے لقمانؑ

یہاں سے حضرت لقمان کی وصیتیں شروع ہو رہی ہیں اور یہ وہی پیغام توحید ہے جو تمام انبیاء کا پیغام رہا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصْلُهُ فِي عَامَيْنِ أَنْ

اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿۱۴﴾ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مِمَّا لَيْسَ

لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۚ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ

آتَاكَ إِلَٰهُ ۚ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾

”اور ہم نے انسان کو اُس کے ماں باپ کے بارے میں ہدایت کی جس کو اس کی ماں نے بزمانہ حمل اٹھایا دہری

[۱] الصّٰحِيحُ الْاَوَّلُ (مجمع البيان)

[۲] قال ابن عباس ومجاهد وقتادة لم يكن لقمان نبياً وقال عكرمة كان نبياً (تبيان)



دُہری تکلیفوں کے ساتھ اور دوبرس میں اس کی دودھ بڑھائی ہوئی کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا شکر گزار رہنا، میری ہی طرف تو آخر میں پلٹنا ہے اور اگر وہ تجھ سے کوشش کے ساتھ یہ چاہیں کہ میرے ساتھ شریک کر اُسے جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں اُن کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہنا اور پیروی اُن کے راستے کی کرنا جنہوں نے مجھ سے لو لگائی، پھر میری طرف تم لوگوں کو پلٹنا ہے تو میں تمہیں بتلاؤں گا جو تم کرتے تھے۔“

### حقوق والدین میں ماں کے حق پر خصوصی زور

یہ آیات اگر تنزیل میں بھی اس طرح وارد ہوئیں تھیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جناب لقمان عليه السلام کی گفتگو کا تذکرہ چھیڑ کر خالق نے بیچ میں بطور جملہ ’معتزضہ کے حقوق والدین کی طرف متوجہ فرمایا ہے جس کی مناسبت شاہ عبدالقادر صاحب اس طرح بتاتے ہیں کہ:-

”باپ نے اللہ کا حق بتایا، اللہ نے باپ کا“ (موضح القرآن)

مگر یہ تناسب اس آیت کے پورے مضمون سے کچھ دل کو لگتا نہیں اس لئے زیادہ تصور یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت مقام تنزیل میں اس گفتگو کے درمیان نہ تھی۔

### حق ایمانی نہیں بلکہ انسانی

آخر میں یہ کہنے کے بعد کہ ”اگر وہ دونوں (ماں باپ) تمہیں مشرک بنانے کی کوشش کریں تو اُن کا کہنا نہ ماننا، پھر یہ کہ ”دنیا میں اُن کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا“ یہ بتاتا ہے کہ یہ حسن سلوک کا حکم انہی مشرک ماں باپ کے ساتھ ہے جو اُسے بھی شرک کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ [۱] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک حق ایمانی نہیں، حق انسانی ہے۔

يُبْتَغَىٰ إِلَيْهَا إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَوَاتِ أَوْ فِي

الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿١٦﴾

”اے بیٹے! یقیناً اگر رائی کے ایک دانے بھر بھی کچھ ہو اور وہ کسی پتھر کے نیچے ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں تو اسے بھی اللہ لائے گا اور وہ باریک نگاہ والا ہے، خوب واقف۔“

اب پھر سلسلہ جناب لقمان عليه السلام کے مواعظ کا شروع ہو گیا۔

یہ رائی کے دانے بھر..... کسی پتھر کے نیچے ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں..... کیا چیز؟ اس کے لئے ہماری قدیم تفسیر میں یہ

ہے کہ ”روزی“ مراد ہے۔ [۲] دوسری تشریح یہ ہے کہ انسان کا عمل نیک یا بد، کتنے ہی پردوں میں ہو مگر خدا سے چھپ نہیں سکتا۔ [۳]

[۱] ای احسن الیہا و ارفق بہما فی الامور الدنیویة وان وجبت مخالفتہما فی ابواب الدین لمکان کفرہما (مجمع البیان)

[۲] قال من الرزق (علی بن ابراہیم)

[۳] من خیر او شر یات بہا اللہ ویجاسب علیہا و یجازی (تبیان)

بعض لوگوں نے شاید انداز بیان میں کچھ تہدیدیں انداز محسوس کرتے ہوئے اس میں ”برے عمل“ کی خصوصیت سمجھی ہے۔ [۱] علامہ طبرسی نے تفسیر عیاشی کے حوالہ سے امام جعفر صادق کی حدیث اس کی تائید میں پیش کی ہے۔ اس صورت میں زمین کے ساتھ ”آسمان“ کا ذکر صرف بطور مجاورہ ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ سات (۷) پردوں میں بھی ہو تو چھپے گا نہیں۔

يُبْنِيْ اَقِيْمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ ط  
 اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ  
 مَرْحًا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾ وَاَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ  
 صَوْتِكَ ط اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾

”اے بیٹے! نماز قائم رکھو اور اچھے کاموں پر آمادہ کرو اور برائی سے روکو اور جو تمہیں مصیبت درپیش ہو، اس پر صبر کرو۔ یقیناً یہ اہم باتوں میں سے ہے اور لوگوں کے لئے اپنا رخسارہ نہ جھکاؤ اور زمین میں اترتے نہ پھرو، یقیناً اللہ شیخی رکھنے والے، اکڑنے والے کو دوست نہیں رکھتا اور اپنی رفتار میں اعتدال قائم رکھو اور اپنی آواز دھیمی رکھو، یقیناً بدترین آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے۔“

”صلوٰۃ“ جس کا ترجمہ ہماری زبان میں ”نماز“ ہوتا ہے جناب یحییٰ اور جناب عیسیٰ اور حضرت مریم کے اذکار سے بھی گذشتہ شریعتوں میں اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ارکان و اجزاء میں اس کے مختلف شریعتوں کے لحاظ سے کچھ تبدیلی ہوتی رہی ہو جس سے اس کی اصل حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ کا ترجمہ ”اہم باتوں میں سے ہے“ ایک تشریح کے مطابق ہے۔ [۲] دوسری تشریح کے مطابق یہ ترجمہ درست ہوگا ”مضبوط ہمت کے کاموں میں سے ہے“۔ [۳]

”لوگوں کے لئے اپنا رخسارہ نہ جھکاؤ، یہ ترجمہ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ کا ہماری قدیم تفسیر کے مطابق ہے خاص کر کلمات معصومین سے ماخوذ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مالداروں کے سامنے طمع مال میں تدلل اختیار نہ کرو۔ [۴] مگر اس کی دوسری تشریح یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے اپنا منہ نہ موڑو۔ [۵] یعنی غرور و تکبر سے کام نہ لو۔ ہماری رائے میں اس مفہوم کے لئے عن الناس ہوتا تا کہ اعراض کے معنی پیدا ہوں لیکن وہاں ہے للناس یہ لفظ پہلے ہی مفہوم سے مناسبت رکھتا ہے۔

[۱] الخصلة السیئة (جلالین) خطبة (شاه ولی اللہ)

[۲] ای معز و ما تبھا الّتی علیہا لوجوہا (جلالین) ایں مقدمہ از کارہائے مقصود است (شاه ولی اللہ) یہ بڑے کاموں میں سے ہے (فنیج الدین)

[۳] العزم العقد علی الامر بتوطين النفس علی فعله (تبیان)

[۴] ای لا تذلل للناس طمعاً فیما عندهم (علی بن ابراہیم)

[۵] معناه لا تعرض بوجهک عن الناس تکبراً ذکرہ ابن عباس (تبیان)

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ  
نِعْمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً ۗ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى  
وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا  
وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۖ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَى السَّعِيرِ ﴿٢١﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہیں فائدہ پہنچانے پر مجبور کیا ہے تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو فراواں کیا ہے اور آدمیوں میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر علم اور بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس کی جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم پیروی کریں گے اُس کی جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے، کیا چاہے انہیں شیطان بلایا کرتا ہو آتش دوزخ کی طرف“

”اللہ نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو فراواں کیا ہے“ اس کی تشریح یحییٰ بہت ہوئی ہیں۔

۱۔ ظاہری وہ نعمتیں ہیں جو سب ہی کی آنکھوں کے سامنے ہیں جیسے خلق کرنا، زندہ رکھنا اور قدرت و اختیار عطا کرنا وغیرہ اور باطنی جو بغیر غور و فکر کے معلوم نہیں ہو سکتیں۔

۲۔ ابن عباسؓ کا قول: ظاہری جو انسانوں کو معلوم ہیں اور باطنی جو بندگان خدا کے علم سے باہر ہیں۔

۳۔ جناب ابن عباسؓ ہی کی روایت بطور حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری نعمت اسلام اور انسان کا خلقتاً درست ہونا اور رزق عطا ہونا اور باطنی ہمارے غلط کردار کی پردہ پوشی۔

۴۔ ظاہری دنیا کی نعمتیں اور باطنی آخرت کی نعمتیں۔

۵۔ ظاہری اعضاء و جوارح اور باطنی قلب و دماغ کا کام کرنا۔

۶۔ ظاہری قد و قامت کی درستی اور باطنی نعمت الہی۔

۷۔ ظاہری قرآن کی تنزیل اور باطنی اس کی تاویل۔

۸۔ حضرت امام محمد باقرؑ کا ارشاد: ظاہری نعمت حضرت پیغمبر خداؐ کہ آپ نے معرفت الہی اور توحید میں رہنمائی فرمائی اور باطنی نعمت

ولایت اہل بیتؑ۔

علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں:- ان اقوال میں باہم کوئی منافات نہیں ہے اور یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں اور آیت کو ان سب پر محمول کرنا صحیح ہے۔ مشرکین کی جانب سے اباؤ اجداد کے راستے پر چلنے کی دلیل بہت جگہ قرآن مجید میں آئی ہے اور اس کا جواب انداز بدل بدل کر دیا گیا ہے مگر مطلب سب کا یہ ہے کہ انسان کو خود اپنی عقل و ضمیر کے فیصلے پر چلنا چاہئے۔ باپ دادا اگر غلط راستے پر تھے یا انہوں نے عقل سے کام نہ لیا ہو تو اُس

کے وہ ذمہ دار ہونگے تم اُن کے راستے پر آنکھ بند کر کے کیوں چلو؟

وَمَنْ يُسَلِّمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿٣٢﴾ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنكَ كُفْرُهُ ۗ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٣٣﴾ نَمَتَّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٣٤﴾

”اور جو سراسر توجہ رکھے اللہ کی طرف اُس حالت میں کہ اچھے اعمال رکھنے والا ہو تو اُس نے مضبوط سہارا پکڑا اور اللہ کی طرف تمام چیزوں کی آخر میں رجوع ہے اور جو کفر اختیار کرے تو آپ کو اُس کے کفر سے صدمہ نہ ہو۔ ہماری ہی طرف اُنہیں پلٹنا ہے تو ہم اُنہیں بتائیں گے جو وہ کفر کرتے تھے کہ یقیناً اللہ سینوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ ہم اُنہیں تھوڑے دن فائدہ اٹھانے کا موقع دیتے ہیں، پھر اُنہیں زبردستی سخت عذاب کی طرف لے جائیں گے“

چونکہ وجہ کے معنی چہرے کے ہیں، اس لئے اکثر نے يُسَلِّمُ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ کے ترجمے میں مُنہ کا ذکر ضروری سمجھا ہے۔ (۱) مگر چونکہ توجہ کے لفظ میں خود وجہ داخل ہے اور پھر اُس کے ساتھ الی اللہ ہے جس سے اللہ کی طرف کے معنی پیدا ہوتے ہیں، اس لئے جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، وہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کا ذہن جیسے لَوْجِہِ اللَّهِ کے محاورے کی طرف گیا ہے، انہوں نے اس کی تشریح میں خلوصِ عبادت اور رضائے قلبی ملحوظ رکھنے کا ذکر کیا ہے مگر یہاں وَجْهٌ کی نسبت اللہ کی طرف ہے ہی نہیں بلکہ بندہ کی طرف ہے لہذا اُس کا لَوْجِہِ اللَّهِ والے محاورے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَلَيْنَ سَاءَ لَتْهُمْ مِّنْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۗ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٥﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٣٦﴾

”اور اگر اُن سے پوچھئے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور وہ کہیں گے اللہ نے۔ کہئے کہ شکر خدا اگر اُن میں سے بیشتر علم نہیں رکھتے۔ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ بلاشبہ اللہ بے نیاز ہے، قابل تعریف۔“

اُن کے اس اقرار پر کہ آسمان اور زمین کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے، اُن بتوں نے نہیں جن کی عبادت کرتے ہیں، یہ جملہ کہ الحمد لله اس کا مفہوم میری سمجھ میں جو آتا ہے، وہ یہی کہ خدا کا شکر کہ اتنا تو تمہاری سمجھ میں بھی آیا اور تم نے بھی تسلیم کر لیا جس کے بعد اُن کی بت پرستی کی پوری

عمارت خود اُن کے اس اقرار سے زمین بوس ہو گئی۔ [۱] ایک تصور یہ ہے کہ اُن کے اس جواب کو سن کر اب اُن سے کچھ نہیں کہا جاتا بلکہ حق پرست آدمی اب اپنی جگہ آہستہ کہتا ہے: الحمد للہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا شکر کہ ہم صحیح راستے پر قائم ہیں اور پھر جیسے دل ہی دل میں اُن کی حماقت پر اظہارِ افسوس کرتا ہے کہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت کا یہ لوگ علم نہیں رکھتے یا یہ کہ یہ لوگ ہمارے متعلق اس کا علم نہیں رکھتے کہ ہم اصل ہدایت کے راستے پر ہیں۔ [۲] نتیجہ دونوں باتوں کا ایک ہے۔ اس کے بعد پھر اپنی ہی جگہ یہ کہا ہے کہ ”اچھا“ یہ نہیں مانتے تو اللہ کا کیا بگڑتا ہے؟ تمام کائنات زمین و آسمان اُس کے تابع فرمان ہیں۔ اُسے ان کے ماننے کی کوئی ضرورت تو ہے نہیں۔ وہ بے نیاز مطلق ہے۔ [۳]

**وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةَ آبْحُرٍ مَّا**

**نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۷﴾**

”اور اگر وہ جو زمین میں درخت ہیں، سب قلم ہو جائیں اور سمندر سب روشنائی بن جائے جس میں سات سمندر اور شامل ہوں، تب بھی اللہ کے کلمے ختم نہیں ہوں گے، یقیناً اللہ عزت و غلبہ والا ہے، حکمت والا“۔

### کلماتِ الہی کی کثرت و وسعت:

”زمین کے درخت قلم ہو جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں، اب اس کے بعد کی کڑی لفظوں میں مذکور نہیں ہے [۱] سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ ان سے اللہ کے کلمے لکھے جائیں تو (اب اس کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ) اس کے بعد بھی وہ کلمے ختم نہیں ہوں گے۔“ کلماتِ الہی کی ایک تفسیر ”معلوماتِ الہی“ کے ساتھ ہوئی ہے [۲] اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ اُس سے دو باتیں مراد ہیں جو اللہ کے احاطہ قدرت میں ہیں۔ صدر اول کے ایک مفسر کی زبانی جو تشریح ہوئی ہے، اُس میں یہ دونوں باتیں کچھ اضافہ کے ساتھ سموی ہوئی ہیں۔ [۳]

**مَا خَلَقَكُمْ وَلَا بَعَثَكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿۲۸﴾**

”تم سب کا پیدا کرنا اور تمہارا دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا نہیں ہے مگر مثل ایک متفلس کے، یقیناً اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا“۔

مطلب یہ ہے کہ حشر و نشر کے بارے میں کوئی اس بنا پر استعجاب کرے کہ بھلا اتنی بے شمار مخلوق ایک دم کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے؟ تو یہ استبعاد بالکل غلط ہے، اس لئے کہ قدرت کے سامنے ایک اور ایک لاکھ اور ایک ارب اور اس سے زیادہ اُن میں کوئی فرق نہیں ہے۔

[۱] الحمد للہ علی ظهور الحجۃ علیہم بالتوحید (جلالین)

[۲] الحمد للہ علی ہدایتہ و توفیقہ لنا بالمعرفة بل اکثرہم لایعلمون انکم وفقکم اللہ لمعرفتہ (تبیان)

[۳] هو الغنی عن حمد الحامدین وعن کل شیء (مجمع البیان)

[۴] فیہ حذف لان المعنی یکتب بہا کلام اللہ (تبیان)

[۵] المعبر بہا عن معلوماتہ (جلالین) یعنی معلومات (فتح الرحمن)

[۶] قال قتادة لقدماء البحر قبل ان تنفد عجائب اللہ و حکمتہ و خلقہ علمہ (تبیان)

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے یہ کہا تھا کہ پہلے اللہ نے جو پیدا کیا تھا، وہ تو رفتہ رفتہ نطفہ، علقہ، مضغہ اور پھر لحم کی صورت میں منزل بہ منزل لیکن قیامت کے لئے کہا جا رہا ہے کہ ہم ایک دم زندہ ہو جائیں گے، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔<sup>[۱]</sup> مگر میری سمجھ میں الفاظ آیت سے وہی پہلو آتا ہے جو پہلے عرض کیا گیا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۹﴾  
ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ ۗ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيمُ الْكَبِيرُ ﴿۳۰﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے قابو رکھا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک چل رہا ہے ایک مقررہ مدت تک اور یہ کہ اللہ تمہارے اعمال کا جاننے والا ہے۔ اللہ ہی بس حق ہے اور جو کچھ وہ اُس کے سوا پکارتے ہیں، وہ بے حقیقت ہے اور یہ کہ اللہ اونچا ہے، بڑا“۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۳۱﴾  
وَإِذَا غَشِيَهِمْ مَوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوْا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۗ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ ﴿۳۲﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے کے لئے جو شکر گزار ہو اور جب اُن پر دریا کی لہریں مثل سائبانوں کے چھاتی ہیں تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اس کا اعتقاد رکھتے ہوئے مگر جب وہ اُن کو خشکی کی طرف نجات دے کر پہنچا دیتا ہے تو اُن میں سے کچھ ہی ہیں جو اعتدال کے راستے پر قائم رہتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار نہیں کرتا ہماری نشانیوں کا مگر ہر غدار ناشکر“۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَأَخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَاوَالِدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَارٌ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا ۗ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۗ وَلَا

[۱] قال مقاتل ان كفار قريش قالوا ان الله خلقنا اطرا ا نطفة علقة مضفة لحم فكيف يبعثنا خلقا جدا في ساعة واحدة فانزلت

الاية (مجمع البيان)

## يَغُرَّتْكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ﴿٣٣﴾

”اے انسانو! اپنے پروردگار (کے غضب) سے بچو اور ڈرو اس دن سے جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو کوئی فائدہ پہنچا سکے گا اور نہ بیٹا باپ کو کچھ فائدہ پہنچانے والا ہوگا، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو تمہیں دنیاوی زندگی فریب میں مبتلا نہ کرے اور نہ تمہیں دھوکا دینے والا اللہ کے بارے میں دھوکا دے۔“

یجزمی کے لفظ سے ذہن میں جزا کے معنی آتے ہیں مگر محاورہ عرب میں اس کے معنی فائدہ پہنچانے کے ہوتے ہیں۔ غرور یعنی دھوکا دینے والا اور وہ بھی الف لام کے ساتھ جو کسی خاص شخصیت کی طرف اشارہ کو بتلاتا ہے، وہ دراصل تو از روئے قرآن شیطان ہے لیکن ہر شخص یا ہر چیز جو امیدوں کے سبز باغ دکھا کر طاعت الہی میں سرگرم ہونے سے روکے، وہ اس لفظ کا مصداق ہے جیسا کہ بعض قدیم مفسرین نے اس کی تشریح کی ہے۔ [۳۱]

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۖ وَيُنزِّلُ الْغَيْثَ ۖ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۗ وَمَا

تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۗ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۗ إِنَّ اللَّهَ

عَلِيمٌ حَبِيرٌ ﴿٣٣﴾

”بلاشبہ اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہ مینہ برساتا ہے اور وہ اُسے جو ماؤں کے پیٹ میں ہے جانتا ہے اور کوئی تنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا حاصل کرے گا؟ اور کوئی تنفس نہیں جانتا کہ کس سرزمین پر اُسے موت آئے گی، یقیناً اللہ جاننے والا ہے، بڑا باخبر۔“

وہ باتیں جن کا علم بس اللہ کو ہے:

مذکورہ بالا پانچ چیزیں وہ ہیں جو خصوصیت سے اس علم غیب کی حیثیت رکھتی ہیں جسے اللہ کے ساتھ خصوصیت خاص حاصل ہے۔ [۳۲] بے شک انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو حسب مصلحت خالق ان چیزوں کا کلا۔۔۔ یا جزء جس طرح چاہتا ہے اظہار معجزہ وغیرہ کے لئے علم عطا فرماتا ہے اور اس اعتبار سے ائمہ طاہرین علیہم السلام کے لئے کثیر التعداد احادیث میں ”ماکان“ (ماضی) کے علاوہ مایکون (مستقبل) کے علم کا ثبوت موجود ہے جس کا کثرت روایات و واقعات کی بنا پر انکار ممکن نہیں ہے۔

[۱] یعنی لا یغنی فیہ احد عن احد۔ یقال جزیت عنک اذا اغنیت عنہ (تبیان)

[۲] اقبل هو تمنیک المغفرة فی عمل المعصية عن سعید بن جبیر (جمع البیان)

[۳] هذه الخمسة الاشياء لم یطلع علیها ملك مقرب ولا نبي مرسل وهي من صفات الله عزوجل (علی بن ابراہیم)

# سُورَةُ السَّجْدَةِ

مکیہ --- ۳۰ --- آیات

قرآن مجید میں چار سورے ہیں جن میں ایک ایک ایسی آیت ہے جس کے پڑھنے پر سجدہ واجب ہوتا ہے پڑھنے والے پر بھی اور سننے والے پر بھی۔ ان سوروں کو عزائم کہتے ہیں، باقی اور کچھ سوروں میں جو سجدے ہیں، وہ مستحب ہیں۔ عزائم یعنی واجب سجدے والے سوروں میں سب سے پہلا سورہ یہ ہے۔ اس کا نام ”سورہ سجدہ“ ہوا۔

## سورہ سجدہ کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ ہزار برس کے برابر ایک دن۔
- ۲۔ ملک الموت کا ذکر۔
- ۳۔ مومن اور فاسق یکساں نہیں۔
- ۴۔ عذاب آخرت کے پہلے ایک اور عذاب کا اعلان۔
- ۵۔ آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی شان
- ۶۔ وہ موقع جس کے بعد توبہ قبول نہیں..... وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

الَّذِي تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱﴾ اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۗ  
بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنذِرَ رَ قَوْمًا مَّا اَتَتْهُمْ مِنْ نَّذِيرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ  
يَهْتَدُونَ ﴿۲﴾

”الف۔ لام۔ میم۔ اس کتاب کا اتارا جانا، اس میں کوئی شک نہیں، تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اُس نے اسے گڑھ لیا ہے۔ بلکہ وہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے تاکہ آپ متنبہ کریں اس قوم کو جس کے پاس آپ کے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید وہ ہدایت حاصل کریں۔“

”اُس قوم کو“ یہاں ”قوم“ سے مراد عام محاورہ والی قوم یعنی عرب مراد نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی ہیں ”لوگ“ اور مراد وہ تمام افراد انسانی



ہیں جن کو دعوت اسلام دینے کے لئے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مامور ہوئے تھے۔

اس صورت میں اس ارشاد سے کہ آپ کے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، یہ مراد نہیں ہے کہ کبھی بھی اُن کے بعید ترین اسلاف کی رہنمائی بھی نہیں ہوئی جب کہ مشرکین عرب جو اہل مکہ تھے، اُن کے اسلاف کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور اُن کے فرزند حضرت اسماعیل کی رہنمائی حاصل ہو چکی تھی جس کے مٹے ہوئے نقوش اُن میں ارکان حج وغیرہ کی صورت میں موجود تھے اور اُن کے دوسرے ہم جد نبی اسرائیل کی رہنمائی حضرت ابراہیم کے بہت بعد بھی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور ان دونوں بزرگواروں کے درمیان کے کثیر التعداد انبیاء سے ہو چکی تھی اور قرآن مجید کے اس اعلان کی بنا پر کہ اِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ”کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی متنبہ کرنے والا نہ گزرا ہو“ دنیا کی دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں میں بھی دور قدیم میں ضرور خداوند عالم کی طرف کے رہنما ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے تقریباً متواتر احادیث کی بنا پر یہ مسلم ہے کہ زمین حجت خدا سے خالی نہیں رہتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ نمایاں نہ ہو اور عامہ خلائق اُس سے واقف نہ ہوں لہذا حضرت ابراہیم اور اسماعیل کے بعد سے غیر بنی اسرائیل میں بھی اوصیائے حضرت ابراہیم موجود تھے جو دین حنیف ابراہیمی کے محافظ تھے اور بنی اسرائیل میں بھی اوصیائے حضرت عیسیٰ کا سلسلہ قائم تھا جن کے ہاتھوں دونوں طرف کی وراثت رہنمائی اور اُس سے متعلقہ امانتیں جنہیں ”مواریث انبیاء“ کہنا چاہیے ہمارے رسول خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچیں لہذا اُن دوسرے آیات قرآن اور پھر اُن احادیث معصومین کی روشنی مَّا اَنْذَهُمْ مِنْ نَّذِيرٍ مِّنْ قَبْلِكَ ”آپ سے پہلے اُن کے پاس کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا“ اس کے معنی یہ ہیں کہ مدت مدید سے جو قبل کے اکثر تعلیمات کو فراموش کر دینے کے لئے کافی ہے، کوئی اُدھر کا معصوم رہ نما نمایاں طور پر اُن کے سامنے نہیں آیا، اب اُن تمام نقوش محوشہ کو تازہ کرنے کے لئے حضرت مجموعہ ہوئے ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ  
عَلَى الْعَرْشِ ط مَا لَكُمْ مِّنْ دُونِهِ مَن وَّلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ط أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٠﴾ يَذَّبُ  
الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ  
سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿٥١﴾

”اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو چھ (۶) دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر برقرار ہوا اور اُسے چھوڑ کر تمہارا نہ کوئی مالک ہے اور نہ سفارشی تو کیا تم نصیحت قبول نہ کرو گے؟ وہ تمام معاملات کا انتظام کرتا ہے آسمان سے لیکے زمین تک۔ پھر وہ معاملات اُس کے سامنے پیش ہونگے اُس دن جس کی مقدار تمہاری گنتی کے ایک ہزار برس کے برابر ہوگی۔“

”ہم نے جو ترجمہ کیا ہے کہ ”وہ معاملات اُس کے سامنے پیش ہوں گے“ ظاہر الفاظ قرآن کے لحاظ سے صاف ہیں، چونکہ پہلے یذَّبُ الامر آپکا ہے تو بعد میں يعرج کے لفظ کے اندر ضمیر مضمحل ہے، وہ اسی الامر کی طرف راجع ہوگی جس کا مفہوم ”معاملات“ کے لفظ سے ظاہر ہوتا

ہے ہماری قدیم تفسیر اس کے مطابق ہے اور بعض قدیم ترجمے بھی [۱] مگر علامہ طبریؒ نے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ فرشتہ آسمان سے اُس کے فیصلوں کو لے کر اترتا ہے اور پھر وہ (فرشتہ) اُن امور کو وہاں پہنچا کر اوپر چڑھ جاتا ہے [۲] مگر جب پہلے ملک کا کوئی ذکر آیت میں نہیں ہے تو یہ مفہوم کیوں کر سمجھا جاسکتا ہے۔

ذٰلِكَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝۱ الَّذِي اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ  
خَلَقَهُ وَبَدَا خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ۝۲ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ  
مَّهِينٍ ۝۳ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ  
وَالْاَفْئِدَةَ ۝۴ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۵

”یہ ہے اُن دیکھی اور دیکھی سب چیزوں کا جاننے والا، عزت والا، مہربان جس نے ہر چیز کی بہترین تخلیق کی ہے اور شروع میں انسان کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اُس کی نسل قرار دی ایک ذلیل قسم کے پانی کے نچوڑ سے پھر اُس کے جسم کو تیار کیا اور اس میں اپنی روح کا ایک جزء پھونکا اور تمہارے لئے سننے کی طاقت اور نگاہیں اور دل قرار دیئے۔ بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو۔“

یہ جو دوسرا ٹھہر یعنی ”پھر“ کا لفظ ہے، یہ بظاہر ترتیب واقعہ کے لئے نہیں بلکہ ترتیب ذکر کے طور پر ہے کہ اس کے بعد یہ بات سنو، ترتیب واقعہ کی بنا پر اس لئے نہیں ہے کہ اس کے پہلے نسل آدم کی تخلیق کا ذکر تھا اور یہ الفاظ کہ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ پہلی نظر میں یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ پتلا تیار کیا اور اس میں روح پھونکی جو ابوالبشر حضرت آدمؑ کی تخلیق سے متعلق ہے جیسا کہ دوسری جگہ خلقت آدم کے قبل والے اعلان میں یہی الفاظ ہیں کہ فَاِذَا سَوَّيْنَاهُ وَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنَا لَكُمُ الْعَيْنَ وَالْاَبْصَارَ وَجَعَلْنَا لَكُمْ السَّمْعَ وَجَعَلْنَا لَكُمْ الْاَفْئِدَةَ وَجَعَلْنَا لَكُمْ الْاَبْصَارَ وَجَعَلْنَا لَكُمْ السَّمْعَ وَجَعَلْنَا لَكُمْ الْاَفْئِدَةَ۔

ثُمَّ سَوَّاهُ اِي خَلَقَ اَدَمَ: پھر اس کے جسم کو تیار کیا یعنی آدمؑ کو پیدا کیا۔

مگر ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں جسم تیار کیا اور روح پھونکی۔ اس طرح وہ نسل آدم سے متعلق قرار پاسکتا ہے اور اب ٹھہر کا ترتیب واقعہ کے لئے بھی سمجھنا درست ہوگا۔

وَقَالُوْا اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ اِنَّآ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۶ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ  
كٰفِرُوْنَ ۝۷ قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلَىٰ رَبِّكُمْ

[۱] يعرج اليه يعنى الامور التي يدبرها (على بن ابراهيم) بالامى رود آن كار بسوئے خدا (شاه ولی الله)

[۲] ثم يعرج اليه ذلك الملك اى يصعد الى المكان الذى امره الله تعالى ان يصعد اليه (مجمع البيان)

## تُرْجَعُونَ ﴿١١﴾

”اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھوجائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا ہوں گے؟ بلکہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری کے منکر ہیں، کہتے کہ تمہاری مدت زندگی کو پورا کرتا ہے، موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔“

## ملک الموت کا ذکر

یاد رکھنا چاہئے کہ اصل وفات دینے والا یعنی مدت زندگی کو پورا کرنے والا اللہ ہے جیسا کہ سورہ زمر آیت ۴۲ میں صاف ارشاد ہے:-  
 اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا: اللَّهُ تَمَامَ نَفْسِ كِي مَدَّتْ كُو پُوْرَا كِرْتَا هِي اُنْ كِي مَوْتِ كِي وَتْ -  
 مگر چونکہ اس کام پر اُس نے مَلَكُ الْمَوْتِ کو مقرر کیا ہے، اس لئے زیر تحریر آیت میں اُس فعل کی نسبت بصورت جمع ملائکہ کی طرف دی گئی ہے (تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ) اس لئے کہ مَلَكُ الْمَوْتِ اس پورے کارخانے کے سربراہ ہیں اور انکی ماتحتی میں بہت سے فرشتے ہیں جو اُن کے حکم سے قبض روح کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ ذرائع و وسائل کی طرف فعل کی نسبت سے یہ مانتے ہوئے کہ اللہ اصل فاعل ہے، شرک لازم نہیں آتا، اسی طرح اگر کوئی اصل مددگار اللہ کو مانتے ہوئے پیغمبر خدا ﷺ یا ائمہ طاہرین علیہم السلام کو بحیثیت وسیلہ مددگار کہے یا اُن سے مدد کا طالب ہو تو اس سے شرک لازم نہیں آتا اور وہ سورہ حمد کے جملہ ایاتِ نستعین کے بھی خلاف نہیں ہوگا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُرْمُونَ تَأْكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا

فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ﴿١٢﴾

”اور کاش تم دیکھتے جب گنہگار لوگ اپنے سر جھکائے ہوں گے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پروردگار ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا، اب تو ہمیں دوبارہ پلٹا تو ہم اچھے اعمال کریں گے۔ ہم اب یقین حاصل کیے ہوئے ہیں۔“  
 اصول یہ ہے کہ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ کے آثار جو اخروی عذاب کا پتہ دیتے ہیں، اُن کے مشاہدہ کے بعد جو ایمان کا اقرار ہو، وہ قابل قبول نہیں ہے اور یہاں تو قیامت کا ہنگام ہے جب کہ ہر غیب عالم شہود میں آگیا ہے تو اب کتنا ہی دیکھ لیا اور سن لیا اور یقین حاصل کر لیا ہو، اس کا کوئی حاصل نہیں۔ نواب دور آخرت کے بعد دو تکلیف جو دنیا میں گزرا پلٹ کر آسکتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًىٰ وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٣﴾ فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۗ إِنَّا

نَسِينُكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

”اور اگر ہم چاہتے تو ہر تنفس کو منزلِ ہدایت عطا کر دیتے مگر یہ میری طرف کی حتمی بات ہے کہ میں دوزخ کو جنات

اور انسانوں سب سے بھر دوں گا تو چکھو اس کی سزا جو تم بھولے ہوئے تھے ہمارے اس دن کی حاضری کو بے شک اب ہم بھی بھول گئے تم کو اور چکھو ہمیشہ کی زندگی کا عذاب اُس کی وجہ سے جو تم اعمال کرتے تھے۔  
 ”ہر نفس کو منزل ہدایت عطا کر دیتے“ یعنی جبری طور پر اُسے صحیح راستے پر لگا دیتے، خواہ اس طرح کہ وہ پیدا ہوتے ہی ایسے کہ گناہ کا ارتکاب نہ کرتے۔ [۱] یا بعد میں کوئی معجزہ ایسا دکھا دیا جاتا کہ وہ سب زبردستی ایمان اختیار کر لیں۔ [۲]  
 ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اگر چاہتے تو اُن کی خواہش کے مطابق دوبارہ انہیں دنیا میں بھیج دیتے کہ وہ اعمال خیر کر کے نجات کے مستحق بن جائیں مگر حشر و نشر کے بعد جب کہ دور عمل ختم ہو چکا ایسا کرنا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ [۳] ورنہ یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔  
 ایک اور معنی یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ اس کا ربط سابق کی آیتوں سے ہے کہ ہم چاہتے تو اس قیامت کے یقین کو معتبر مان لیتے اور ہر ایک کو ہدایت یافتہ تسلیم کر لیتے اور سب کو بہشت میں جگہ دے دیتے مگر یہ اُس دور تکلیف اور پھر اُس کے نتیجہ میں جزا و سزا کے حتمی اعلان کے خلاف ہوتا جو پہلے ہو چکا ہے اور جس کے لئے دوزخ کی تخلیق کی گئی ہے اور اس صورت میں دوزخ کی تخلیق ہی عبث ہوتی۔  
 مجھے بعد کے فقرے اس مفہوم کے ساتھ زیادہ چسپاں معلوم ہوتے ہیں خصوصاً بالکل آخر کا جملہ ”اب چکھو اس عذاب کو اُس کی وجہ سے جو تم اعمال کرتے تھے“۔ یہ بالکل اس قبل والے گروہ سے خطاب معلوم ہوتا ہے جو کہہ رہا تھا کہ اب ہم یقین لے آئے اور ہمیں دار دنیا میں بھیج تو ہم نیک اعمال کریں تو کہا جا رہا ہے کہ جو دور عمل تھا، اس میں تم نے عمل نہ کیا تو اب کیا ہوتا ہے جب کے دور مجازا ہے، اب تو اُنہی سابق اعمال کی سزا بھگتنا ہے۔ اس کے سوا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿١٥﴾ تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۗ جَزَاءً مِّمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾

”ہماری آیتوں پر بس وہ ایمان لاتے ہیں کہ جب اُنہیں ان (آیتوں) کے ساتھ نصیحت کی جائے تو وہ سجدے میں گر جاتے اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ غرور سے کام نہیں لیتے اور ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں کہ پکارتے رہتے ہیں اپنے پروردگار کو ڈر اور امید میں اور جو ہم نے اُنہیں دیا ہے، اُس سے وہ خیرات کرتے ہیں تو کوئی آدمی نہیں جانتا جو اُن کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے صلے میں

[۱] لَوْ شِئْنَا لَنَجْعَلَهُمْ كَلِمَةً مَّعْصُومِينَ لِقَدَرْنَا (علی بن ابراہیم)

[۲] بَانَ نَفْعَلُ أَمْرًا مِّنَ الْأُمُورِ يَلْجَأُهُمُ إِلَى الْأَقْرَارِ بِالتَّوْحِيدِ وَلَكِنْ ذَلِكَ يَبْطُلُ بِالْغُرُضِ بِالتَّكْلِيفِ (مجمع البيان)

[۳] قَالَ الْجَبَائِيُّ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ الْمَرَادُ لَوْ شِئْنَا لَجَبِينَا هُمْ إِلَى مَا سَأَلُوا أَوْلَادَنَا إِلَى دَارِ التَّكْلِيفِ لِيَعْمَلُوا بِالتَّطَاعَاتِ وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي أَنْ أَجَازَ بِهِمُ بِالْعِقَابِ فَلَا أَرَدُهُمْ (تبيان)

اُس کے جو وہ اعمال کرتے تھے۔“

### سجدہ واجبہ:

یہ اس سورہ سجدہ کے وہ آیات ہیں جن میں سے پہلی (نمبر ۱۵) کے آخری لفظ لَا يَسْتَكْبِرُونَ کی تلاوت سے پڑھنے والے پر بھی سجدہ واجب ہے اور سننے والے پر بھی۔ اگر ان تمام آیات کو ایک سلسلہ کا مانا جائے جو بعید نہیں ہے تو مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن تو ہر آدمی مومن بن جائے گا مگر اُس وقت کا ایمان بے کار ہے، وہ سب کافروں میں محشور ہوں گے۔ مومن تو اصل وہ ہیں جو اس دنیا میں آیات الہی سے متاثر ہوں اور اس تاثر کے عملی تقاضے یہ ہیں جو بعد میں بیان ہوئے ہیں۔ حکم سجدہ جو یہاں ہے وہ بندہ خدا کی طرف سے اُس کا ایک مظاہرہ ہے کہ ہم اسی دنیا میں ایمان اختیار کیے ہوئے ہیں اور تیری آیتوں سے متاثر ہو کر تیری بارگاہ میں سر بسجود ہیں۔ یہ کہ ”اُن کے پہلو اُن کے بستروں سے الگ رہتے ہیں“ یعنی راتوں کو اُس ہنگام میں کہ جب یاد الہی سے غافل افراد اپنے بستروں پر دراز مخو خواب رہتے ہیں، اُن کے پہلو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بستر آشنا نہیں ہوتے۔

علامہ مطہریؒ نے متعدد احادیث درج کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیات نماز شب کی فضیلت سے متعلق ہیں۔

**أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۗ لَا يَسْتَوُونَ ﴿۱۸﴾**  
”تو کیا جو مومن ہے، وہ مثل اس کے ہے کہ جو بد اعمال ہو؟ وہ برابر نہیں ہیں۔“

### مومن اور فاسق یکساں نہیں

اس آیت کی شان نزول حدیث معصومہ میں یہ وارد ہوئی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور ولید بن عقبہ میں بحث ہو گئی۔ اُس نے جاہلیت کے معیار کے مطابق کچھ باتوں پر فخر کیا، حضرت علیؓ نے اُس کے جواب میں جو اسلامی معیار ہے، وہ پیش کیا کہ قابل فخر یہ باتیں نہیں ہیں۔ اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہے اُس پر حضرت علیؓ کے قول کی تصدیق میں یہ آیت اُتری جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس محل پر مومن سے مراد حضرت علی بن ابی طالبؓ ہیں اور فاسق سے مراد ولید بن عقبہ ہے۔ [۱] جس کے فاسق ہونے کا اظہار قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں موجود ہے: إِنَّ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا ”اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اُس کی تحقیق کر لیا کرو“ اس میں مفسرین اہل سنت نے بھی فاسق کا مصداق ولید کو بتایا ہے۔

**وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۗ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿۲۰﴾**  
**وَلَنذِيقَهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَلْوَنِ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۲۱﴾**

[۱] فی روایۃ ابن ابی الجار ودعن ابی جعفرؑ (علی بن ابراہیم)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۗ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ

مُنْتَقِبُونَ ﴿٢٢﴾

”اب وہ جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے، اُن کے لئے آرام والے بہشت ہیں بطور ضیافت ان اعمال کے سبب سے جو وہ کرتے تھے، رہے وہ جو بد اعمال ہیں، اُن کا ٹھکانا آتش دوزخ میں ہوگا۔ جب بھی اس میں سے نکلنا چاہیں گے، دوبارہ اس میں پلٹا دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائیگا کہ چکھو اس آگ کا مزہ جسے تم جھٹلاتے تھے اور ہم انہیں اس بڑے عذاب کے پہلے قریبی دور میں عذاب چکھائیں گے شاید کہ وہ اپنے عمل میں تبدیلی کریں اور کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جسے اُس کے پروردگار کی آیتوں کے ذریعے نصیحت کی جائے، پھر وہ اُن سے روگردانی کرے۔ بلاشبہ ہم گنہگاروں سے بدل لینے والے ہیں۔“

”قریبی دور“ کے عذاب سے عام تفسیروں میں وارد دنیا کا عذاب مراد لیا گیا ہے اور یہ بعد کے فقرے سے مناسبت بھی رکھتا ہے کہ ”شاید وہ اپنے عمل میں تبدیلی پیدا کریں“۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تنبیہی عذاب ہے، نہ کہ وہ عذاب جس کے بعد اصلاح عمل کی گنجائش ہی نہیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مَرْيَةِ مِمَّنْ لَقَّاهُ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي

إِسْرَائِيلَ ﴿٢٣﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۗ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا

يُوقِنُونَ ﴿٢٤﴾

”اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی تو تم شک میں نہ ہو اس کا سامنا ہونے میں اور ہم نے اُسے ہدایت قرار دیا بنی اسرائیل کے لئے اور اُن میں سے ہم نے کچھ پیشوا قرار دیئے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں جب کہ انہوں نے صبر سے کام لیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین کرتے تھے۔“

”ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی“ اس کے ساتھ یہ جملہ کہ ”فَلَا تَكُنْ فِي مَرْيَةِ مِمَّنْ لَقَّاهُ“ تم شک میں نہ ہو اس کا سامنا ہونے میں۔“ اس میں یہ ضمیر ”اُس“ کدھر راجع ہے؟ یہ تفسیر کا مشکل مسئلہ بن گیا ہے۔

جناب ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق یہ ضمیر جناب موسیٰ کی طرف راجع ہے اور ہمارے پیغمبرؐ سے مخاطب ہو کر کہا جا رہا ہے کہ آپ کو اس میں بالکل شک نہ ہونا چاہیے کہ جن سے آپ ملے تھے، وہ موسیٰ ہی تھے اور یہ ملاقات شبِ معراج ہوئی تھی۔ [۱] یا بعد میں غیر معین طور پر مخاطب ہو جس کا مطلب یہ ہو کہ کسی کو اس ملاقات میں جو مابین موسیٰ و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوئی، شک نہ ہونا چاہئے۔ بہر صورت ضمیر کے جناب موسیٰ کی طرف راجع ہونے کی صورت میں اس کا تعلق کتاب کے عطا کیے جانے کے ساتھ جو اس فقرے کے پہلے ہے اور بنی اسرائیل کے لئے ذریعہ ہدایت ہونے کے ساتھ جو اس فقرے کے بعد ہے اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

[۱] یعنی لقاء موسیٰ لیلۃ الاسراء بک الی السماء فی ما ذکرہ ابن عباس (تبیان) وقد التقی الیلۃ اسراء (جلالین)

دوسرا قول یہ ملتا ہے کہ یہ ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے۔<sup>[۱]</sup> لیکن یہ مفہوم اُس وقت واضح ہوتا ہے جب فی مریۃ منہ ہوتا، مطلب یہ ہوتا کہ اس میں تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہیے کتاب کے ساتھ لِقَاء کا لفظ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید اس کا مفہوم یوں بنایا جاسکے کہ توریت اور موسیٰ کی باہمی ملاقات میں تمہیں شک نہ ہونا چاہئے۔ جناب شاہ ولی اللہ نے بالکل بے جوڑ طور سے ضمیر کو قرآن کی طرف راجع کر دیا ہے<sup>[۲]</sup> اور حسن بصری نے بالکل نئی کہی ہے کہ یہ ضمیر اذیت کی طرف راجع ہے یعنی موسیٰ کو کتاب پا کر بڑی اذیتیں اٹھانا پڑیں مگر جب اس کے پہلے اذیت کا ذکر کہیں نہیں ہے تو یہ ضمیر کیوں کر پھیری جائے۔ ہاں اس مفہوم کے قبل اور بعد کے مضمون سے مرتبط ہونے کی وجہ سے اُسے یوں قبول کیا جاسکتا ہے کہ ضمیر تو جناب موسیٰ ہی کی طرف راجع ہو مگر لِقَاء کے معنی درپیش ہونے کے لئے جائیں کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا اذیتیں اٹھائیں، اُن میں تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہئے۔

بہر حال تفسیر معصوم کی تشنگی یہاں بہت محسوس ہو رہی ہے جو ہمارے دسترس سے باہر ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۵﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمَا آهَلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسْكِنِهِمْ ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ ط أَفَلَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۶﴾

”یقیناً تمہارا پروردگار فیصلہ کرے گا اُن کے درمیان قیامت کے دن اُس میں کہ جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور کیا انہیں نہیں معلوم کہ ہم نے اُن کے پہلے کتنی نسلیں ہلاک کیں جن کے رہنے کے مکانات میں یہ چلتے پھرتے ہیں، یقیناً اس میں بڑی نشانیاں ہیں تو کیا وہ سنتے نہیں ہیں؟“!

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ ط أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۷﴾

”اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو لے جاتے ہیں بنجر زمین تک تو اس سے نکالتے ہیں ایسی کھیتی جس سے اُن کے چوپائے غذا حاصل کرتے ہیں اور وہ خود تو کیا وہ دیکھتے نہیں؟“ یعنی یہ اللہ کی نعمتیں اُن کی آنکھوں کے سامنے تو وہ اُن پر حقیقت میں آنکھوں سے نظر کیوں نہیں ڈالتے۔<sup>[۳]</sup>

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْفَتْحُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۸﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ

[۱] دھوکا نہ کرو اُس کے ملنے میں یعنی کتاب کے یا موسیٰ (موضح القرآن)۔

[۲] ایسے مباحث درشبہہ از ملاقات قدآن (شاہ ولی اللہ)

[۳] افلا یبصرون نعم اللہ تعالیٰ علیہم (مجمع البیان)

## الَّذِينَ كَفَرُوا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٩﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاَنْتَظِرُ اِنَّهُمْ مُنْتَظَرُونَ ﴿٢٠﴾

”اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ فتح کب ہوگی اگر تم سچے ہو؟ کہنے کہ فتح کے دن کافروں کو اُن کا ایمان فائدہ نہ دے گا اور نہ انہیں مہلت ملے گی تو ان سے بے اعتنائی کیجئے اور منتظر رہئے وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں۔“

ہمارے یہاں کی روایت یہ ہے کہ یہ آیت رجعت سے متعلق ہے اور یہ سوال و جواب اسی سلسلہ کے ذیل میں ہے (علی بن ابراہیم)۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”فتح“ سے مراد فیصلہ ہے جیسے ارشاد ہوا ہے: رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ پُروردگارا! فیصلہ کر دے ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ (اعراف: ۸۹)

اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ”اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا تو آخر یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اور ایک تصور جو بالکل سطحی نگاہ سے سمجھ میں آسکتا ہے، یہ ہے کہ یہ فتح مکہ سے متعلق ہے۔ [۱] مگر فتح مکہ کے دن تو یہ عمل نہیں ہوا کہ ایمان کو بے کار قرار دیا گیا ہو اور توبہ قبول نہ کی گئی ہو۔ فیصلہ مراد ہونے کی صورت میں بعض لوگوں نے فیصلہ تقدیر مراد لیا ہے جس کا ظہور جنگ بدر میں ہوا کہ بہت سے ان میں سے قتل ہوئے اور بہت سے ذلت کے ساتھ قید ہوئے مگر روز بدر بھی حکم تو یہ نہ تھا کہ جواب ایمان لائے اس کا ایمان فائدہ نہ دے اور توبہ اُس دن کی قبول نہ ہو۔

بعض نے جزا و سزا والا فیصلہ مراد لیا ہے جو قیامت میں ہوگا [۲] اور بعض نے اُسے مجملاً نزول عذاب کے معنی میں لیا ہے۔ [۳] بہر حال ہم جو رجعت کے قائل ہیں، پہلی تفسیر کو بلا تکلف قبول کر سکتے ہیں اور جو رجعت کے قائل نہیں ہیں، انہیں ان آخر کے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہی مضمون آیت کے لحاظ سے صحیح ہو سکتا ہے۔ ”یہ کہ وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں“ اس میں ظاہر ہے کہ اُن کا انتظار اپنے مفید مطلب کسی نتیجے کے لئے ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ پیغمبر خدا دنیا سے اٹھ جائیں یا اور کسی طرح اپنے مقصد میں ناکام ہوں اور شکست کھا جائیں [۴] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بطور طنز اس نتیجے کے لئے جو بعد میں اُن کے واسطے قہراً یہ فیصلہ قدرت ہوگا اُن کی طرف انتظار کی نسبت دی گئی ہے جس کی نظریں قرآن مجید میں موجود ہے۔

[۱] الفتح القضاء دون الحكم وقيل انه اداد به فتح مكه (تبيان)

[۲] قال السدي الفتح هو القضاء بعد اذ اهداهم في الدنيا وقال مجاهد هو الحكم بالشواب والعقاب لكم القيامة (مجمع البيان)

[۳] بانزال العذاب (جلالين)



# سُورَةُ الْأَحْزَابِ

## مکیہ --- ۷۳ --- آیات

”احزاب“ ”حزب“ کی جمع ہے اور حزب کے معنی پارٹی کے ہیں تو احزاب کے معنی پارٹیاں اور اس پر الف لام استغراق کا ہے، اس طرح آج کل کے محاورے کے مطابق بالکل لفظی ترجمہ اس کا ہوا ”آل پارٹینر“۔ چونکہ جنگ اُحد کی شکست کے بعد مشرکین قریش نے جو اہل مکہ تھے محسوس کیا کہ ہم تنہا رسول اسلام ﷺ کے مقابلہ میں سربر نہیں ہو سکتے تو دوسرے قبائل عرب کو جو مخالف رسول ہونے میں اُن کے ساتھ متحد ہو سکتے تھے، انہوں نے اپنے ساتھ لے کر متفقہ طور سے مدینہ پر چڑھائی کی، اس موقع پر رسول خدا ﷺ نے مدینہ سے باہر نکل کر جناب سلمان فارسی رضوان اللہ علیہ کے مشورے کے مطابق سامنے ایک خندق کھدوائی تاکہ وہ لوگ چاروں طرف سے گھیر نہ سکیں اور مقابلہ ایک طرف سے ہو، اس لئے اس جنگ کو عام طور سے ہمارے محاورے میں ”جنگ خندق“ کہا جاتا ہے اور تاریخ کی اصطلاح میں ”غزوہ احزاب“ ہے۔ اس سورہ میں اس غزوہ کے موقع پر عام مسلمانوں پر کیا خوف و دہشت کا عالم طاری تھا، اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور اس ذکر میں کئی دفعہ احزاب کے لفظ کا استعمال ہوا ہے، اس لئے اس سورے کا نام ”احزاب“ ہوا۔

### سورۃ احزاب کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ یہ کہ اپنی زبان سے کوئی رشتہ لگانے سے حقیقی رشتہ دار کے احکام جاری نہیں ہوتے۔ اس ذیل میں ظہار کی طرف اشارہ ہے جس میں آدمی بیوی کو ماں کہہ دیتا ہے جو فقہ کا مستقل باب ہے اور جس پر اس کے بعد اٹھائیسویں پارے کے شروع میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔
- ۲۔ متنبی کے حکم کا بیان اور یہ کہ اُسے ”بیٹا“ کہنا غلط ہے اور اس پر بیٹے کے احکام جیسے وراثت اور محرمیت مرتب نہیں ہوتے۔
- ۳۔ ازواج رسول کے ”امہات المؤمنین“ ہونے کا اعلان اور اُن سے بعد وفات رسول نکاح کرنے کی دائمی ممانعت۔
- ۴۔ جنگ خندق کے خاتمے کے بعد بنی قریظہ کا انجام۔
- ۵۔ ازواج رسول کو سخت تنبیہیں اور یہ کہ اُن میں کی کوئی مرتکب گناہ ہوگی تو اُسے دونی سزا دی جائیگی۔
- ۶۔ پردے کا عام حکم اور خاص طور پر ازواج رسول کے لئے اپنے گھروں کے اندر رہنے کا حکم۔
- ۷۔ آیۃ تطہیر۔
- ۸۔ عورت اور مرد کی معیار عمل اور اجر و ثواب میں یکسانی۔
- ۹۔ خدا اور رسول کے فیصلے کے بعد جمہور مسلمین کے اختیار کی نفی۔
- ۱۰۔ واقعہ زینب بنت جحش۔

- ۱۱۔ ہمارے رسولؐ کا خاتم الانبیاء ہونا۔  
 ۱۲۔ پردے کے عام حکم سے مستثنیٰ محرم افراد کا بیان۔  
 ۱۳۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کی تعلیم۔  
 ۱۴۔ خدا اور رسولؐ کو ایذا پہنچانے والوں پر لعنت۔  
 ۱۵۔ بارامانت اور انسان پر قرعہ فال۔ وغیرہ وغیرہ۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّبِعِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا  
 حَكِيمًا ۝۱۱ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝۱۲  
 وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝۱۳

”اے پیغمبر! اللہ کی ناراضگی سے بچتے رہیے اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانئے یقیناً اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا اور پیروی کیجئے اُس کی جو آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے یقیناً اللہ اس سے جو تم لوگ کرتے ہو باخبر ہے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے اور اللہ کافی ہے کارساز ہونے کے لیے“۔

بیچ کے اس جملے کے روئے خطاب سے کہ ”اللہ اُس سے جو تم لوگ کرتے ہو باخبر ہے“ ظاہر ہے کہ آغاز آیت میں جو رسولؐ کو مخاطب کیا گیا ہے، اُس سے تشبیہ خود رسولؐ کو مقصود نہیں ہے بلکہ اور لوگوں کو۔<sup>[۱]</sup>  
 جناب شیخ الطائفی نے شان نزول یہ درج کی ہے کہ ابوسفیان اور کچھ افراد رسالت مآبؐ کے پاس کچھ گفتگو کے لئے آئے تو بعض پر جوش صحابہ نے جو بظاہر وہی ہو سکتے ہیں جو پہلے ہی صلح حدیبیہ کے خلاف تھے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پر زور طریقے پر یہ چاہا کہ آپ ان لوگوں کو قتل کرادیں اس پر یہ آیت اتری۔

اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہاں منافقین انہی افراد کو کہا گیا ہے جنہوں نے ایسا مشورہ دیا تھا۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ ۗ وَمَا جَعَلَ أَرْوَاجَكُمْ إِلَيْ تَظْهِرُونَ  
 مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ ۗ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ۗ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ

[۱] لہذا هو الذي قال الصادق عليه السلام ان الله بعث نبيه باياتك اعنى واسمعي باجارة فالمخاطبة للنبي صلى الله عليه وآله والمعنى للناس (علی بن ابراہیم)

## يَا قَوْمِ اهْكُمُوا ۖ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ﴿٣٠﴾

”اللہ نے کسی آدمی کے لئے دو (۲) دل اس کے سینے میں نہیں رکھے ہیں اور تمہاری اُن بیویوں کو جنہیں تم ظہار کے عنوان سے ماں کہہ دو، تمہاری ماں نہیں بنایا ہے اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا قرار دیا ہے، یہ سب تمہاری اپنے منہ سے باتیں ہیں اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہ صحیح راستے کی ہدایت کرتا ہے۔“

منہ بولا رشتہ اسلام میں حقیقت نہیں رکھتا:

”کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں ہیں، ان لفظوں کا مفہوم تو بالکل ظاہر ہے اور بحیثیت واقعہ یہ حقیقت بھی سب کو معلوم ہے کہ کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے مگر اس آیت میں یہ بات کیوں کہی گئی ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس میں اتنا اختلاف ہے کہ انسان کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ سات آٹھ پہلو علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں درج کیے ہیں جن میں بس ایک معصوم کی طرف نسبت رکھتا ہے اور بجائے خود بہت دل نشین ہے کہ ایک سینے میں دو دل نہیں ہیں لہذا یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان ایک آدمی کے ساتھ محبت کرے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کے دشمن سے بھی محبت کرے۔ [۱]

پھر بھی یہ بات تشنہء بیان ہے کہ اس کا اس آیت کے دوسرے اجزاء سے کیا تعلق ہے؟ سب کو ملا کر ذہن میں جو مطلب آتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ باتیں خلاف فطرت ہونے کی بناء پر غلط ہیں۔ محبت کا کسی ایک سے ہونا اور پھر اس کے دشمن سے بھی محبت رکھنا۔ دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد قرار دینا اور بیوی کو ماں بنانا تو جو یہ باتیں کرتا ہے وہ خلاف فطرت باتوں کا ادا کرتا ہے۔

أَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي

الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ ۖ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ ۚ وَلَكِنْ مَّا

تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٣١﴾

”انہیں اُن کے باپ کی طرف نسبت دے کر پکارو، یہ زیادہ درست ہے اللہ کے نزدیک اب اگر ان کے باپ تمہیں معلوم نہ ہوں تو تمہارے دینی بھائی اور حوالی موالی ہیں اور تم پر کوئی گناہ نہیں اس میں جو تم نے غلطی سے کیا ہو مگر جو تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہو اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

”منہ بولا بیٹا“ کوئی غیر بھی ہو سکتا ہے مثلاً کسی دوست یا عزیز کا بچہ اور خود اپنا غلام یا غلام زادہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کی عزت افزائی کے لیے یا بر بنائے محبت ”بیٹا“ کہنے لگے۔ ان کے اکثر اصلی باپ کا نام اور پتہ معلوم نہیں ہوتا تھا، اس لئے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اگر باپ اُن کے معلوم نہیں ہیں تو پہلی صورت میں جب کہ تم سے اُن کا کوئی رشتہ واقعہ نہیں ہے تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوسری صورت میں تمہارے موالی ہیں جو آزاد کردہ غلام یا غلام زادہ کے معنی میں ہوتا ہے اور چچا زاد بھائی کا رشتہ بھی ہو سکتا ہے، جو موالی کے دوسرے معنی ہیں اور اس صورت میں کہ

[۱] قال ابو عبد الله ﷺ ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه يحب بهنذا قوماً ويحِبُّ بهنذا اعداءهم (مجمع البيان)

جب نباوہ چچا زاد بھائی ہوں تو قریب تر وارث نہ ہونے کی صورت میں انہیں میراث بھی مل سکتی ہے مگر جو واقعی اُن کا نسبی رشتہ ہے، اس کے حساب سے، نہ کہ بیٹا کہنے کی بناء پر۔ بہر حال یہ سب صورتیں اس میں داخل ہیں۔ ﴿۱۱﴾

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ۗ وَأُولُو الْأَرْحَامِ  
بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا  
إِلَىٰ أَوْلِيَّيَكُم مَّعْرُوفًا ۗ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ﴿۱۱﴾

”پیغمبر مومنین پر خود اُن سے زیادہ اختیار رکھتے ہیں اور اُن کی بیویاں اُن (مومنین) کی مائیں ہیں اور قرابت دار آپس میں قانون الہی کے دائرے میں ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حق دار ہیں مومنین اور مہاجرین سے یہ اور بات ہے کہ اپنے دوستوں کے ساتھ کچھ حسن سلوک کرو۔ یہ قانون الہی میں درج شدہ چیز ہے۔“

### رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مومنین پر اختیار کلی

پہلا جزء ”پیغمبر مومنین پر خود اُن سے زیادہ اختیار رکھتے ہیں“ یہ اعلان جس کا مترجمین و مفسرین اہل سنت بھی یہی مفہوم قرار دینے پر مجبور ہوئے۔ (۱)۔ اسلامی سیاست کی اصل بنیاد ہے جس میں خداوندی اختیار کے مقابلہ میں عوام کے اقتدار و اختیار کی کلیدی نئی ہوتی ہے، چاہے وہ شخصی طور پر ہو یا چند نفوس کے مشورے کے طور پر ہو یا تمام افراد کے متفقہ فیصلے کی صورت میں ہو، اس لئے کہ شریک شوری یا شریک اجماع جو افراد ہوں گے، وہ مومنین ہی تو ہوں گے، جب اُن میں سے ہر ایک کے اختیار کی نفی ہوگئی تو ظاہر ہے کہ نفی کا اظہار زیرو (-) سے ہوتا ہے۔ یہ زیرو چار پانچ ہوں یا بے شمار ہوں، بہر حال ان سے کبھی کسی عدد کی تشکیل نہیں ہو سکتی یعنی بے شمار افراد کا مجموعہ بھی بے اختیار ہوگا۔ اُس کو حق اختیار حاصل نہیں ہو سکتا۔

”اُن کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں“ عزت و احترام میں جس کا خاص جزیہ ہے کہ نکاح اُن کے ساتھ پیغمبر کے بعد کبھی روا نہیں مگر پردے کے حکم سے مستثنیٰ نہیں ہیں جو اسی سورے کی بعد کی آیتوں سے ظاہر ہوگا۔

اس کے بعد مختصر طور پر قرابت داروں کی میراث کا بیان ہے جس کا ربط قبل کے مضمون سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس غلطی کے دفعیہ کے لئے ہے کہ جب ازواج رسول مومنین کی مائیں ہیں تو میراث بھی ماں کی حیثیت سے انہیں ملنا چاہئے تو اُن کی نفی کی جا رہی ہے کہ جس طرح ماں ہونے کے باوجود پردے سے مستثنیٰ نہیں ہیں، اسی طرح ایسا نہیں ہے کہ اصل قرابت داروں کو چھوڑ کر انہیں میراث مل جائے یا اُن کی میراث اُن کے قرابت داروں کو چھوڑ کر دوسرے مسلمانوں کو بحیثیت اولاد کے مل جائے۔

بعد میں جو استثناء ہے:۔ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَّيَكُم مَّعْرُوفًا ”یہ اور بات ہے کہ اپنے دوستوں کے ساتھ کچھ حسن سلوک کرو“ اس کا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت میراث تو قرابت داروں کے جو نزدیک و دور کے طبقے ہیں، اسی لحاظ سے ملے گا لیکن اگر انسان اپنی زندگی میں اپنے ذاتی تعلقات کی وجہ سے کسی کے ساتھ حسن سلوک کرے یا اپنے بعد کے لئے وصیت کر جائے تو اصول میراث اُس میں سدراہ نہیں ہوتے، یہ اور

بات ہے کہ وصیت میں حد مقرر رہے کہ بلا اجازت ورثہ ثلث میں نافذ ہوگی۔ اس سے زیادہ میں نہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمَنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى  
وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۗ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ۝ لِيَسْأَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَن  
صِدْقِهِمْ ۗ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

’اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد و پیمانہ لیا اور آپ سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ فرزند مریم سے اور ان سب ہی سے مضبوط عہد لیا تاکہ وہ پوچھے سچوں سے اُن کی سچائی کے متعلق اور اس نے تیار رکھا ہے کافروں کے لئے دردناک عذاب‘۔

سیاق کلام کے لحاظ سے سچوں سے مراد انبیاء معلوم ہوتے ہیں جو صحیح صحیح اپنی دعوت و کارگزاری اور اپنی اپنی قوم کے رویہ کا اظہار کریں گے مگر اس کے عموم میں اصولی طور پر اللہ کا ہر بندہ داخل ہے کہ سب سے جواب دہی اُن کی سچائی کے بارے میں ہوگی اور اُس کے لحاظ سے اُنہیں جزا ملے گی۔ اب اسی میں ضمناً جھوٹوں کے لئے تنبیہ بھی ہے کہ اُنہیں اُن کے جھوٹ کی پاداش ملے گی۔ علامہ طبرسی نے بطور حدیث امام جعفر صادق: نقل کیا ہے جو میرے خیال میں بہت بڑا مسامحہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جناب شیخ طوسی نے یہ عبارت تحریر فرمائی ہے کہ:-

يكون فيه تهديد الكاذب فان الصادق اذا سئل عن صدقه فيجأزي بحسبه فكيف يكون صورة الكاذب (تبیان)

اس میں جھوٹے آدمی کے لئے تنبیہ بھی ہوتی ہے اس لئے کہ سچے سے جب اُس کی سچائی کے متعلق دریافت کی جائے گا تو اسی کے اعتبار سے اُسے جزا ملے گی تو پھر جھوٹے کے لئے صورت حال کیا ہوگی؟ ہمارے جناب طبرسی نے جو شیخ کی عبارتوں کا بغیر حوالہ بحسنہ درج کرنے کے عادی ہیں فان الصادق کو قال الصادق پڑھ کر یوں درج فرمایا کہ:-

يكون فيه تهديد الكاذب قال الصادق عليه السلام اذا سئل عن صدقة على اى وجه قاله فيجأزي بحبه فكيف يكون حال الكاذب. (مجمع البيان)

اس میں جھوٹے آدمی کے لئے تنبیہ بھی ہوتی ہے امام جعفر صادق نے فرمایا جب سوال کیا جائے گا اس کی سچائی کے متعلق کہ اُس نے کس طرح سے کہا تھا تو اسی لحاظ سے اُسے جزا ملے گی تو کیا حالت ہوگی جھوٹے کی۔

اب اس عبارت میں الصادق کو جو صدق کا اسم فاعل تھا اس کی وصفی حیثیت سے ہٹا کر الصادق عليه السلام قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں سئل عن صدقه کا نائب فاعل لفظی طور پر غائب ہو گیا۔ انہی ملکوں سے بچنے کے لئے میں پابند ہوں کہ کسی کی کتاب سے کوئی بھی چیز لوں تو اُس کا پورا حوالہ درج کر دوں جس میں شخصیت کا بھی کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس پر بعض لوگوں کو مجھ سے شکایت ہے کہ اس سے بعض اشخاص کو

اہمیت حاصل ہو جاتی ہے مگر میرے نزدیک میرے اظہار حقیقت سے یہ نتیجہ اگر برآمد ہوتا ہے تو وہ بہتر ہے اس سے کہ انسان ایسے خطروں میں مبتلا ہو جن کا دوسری صورت میں امکان ہوتا ہے جس کی افسوسناک مثالیں میری نظر میں کئی ہیں اور سردست تفسیر مجمع البیان کی یہ مثال جس کے لئے بہت کافی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۝٩ إِذْ جَاءَ وَكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونًا ۝١٠ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝١١ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۝١٢

”اے ایمان لانے والو! یاد کرو اللہ کے فضل و احسان کو جو تم پر ہوا، جب تمہاری طرف آئیں فوجیں تو ہم نے ان کے مقابلے پر بھیجا ایک ہوا کو اور ان فوجوں کو جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اُس کو دیکھنے والا ہے، جس وقت آئے وہ تمہاری طرف اوپر سے اور نیچے سے اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور دل کھینچ کر گلوں تک آگئے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے اس وقت آزمائش ہوئی ایمان لانے والوں کی اور وہ بڑے سخت زلزلے میں مبتلا کیے گئے اور جب منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے کہ ہم سے اللہ اور اس کے پیغمبر نے وعدہ نہیں کیا تھا مگر دھوکا دینے کے لئے۔“

### جنگ خندق کا ہولناک موقع اور مسلمانوں کی حالت

یہ جنگ خندق اور مسلمانوں کے گفتار و پندار اور کردار کی تصویر ہے [۱] اور اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتے بدر کے بعد پھر خندق میں بھی اترے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس دن انہوں نے جنگ نہ کی ہو۔ صرف مسلمانوں کی ہمت افزائی کے لئے آئے ہوں۔ [۲]

وَإِذْ قَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۗ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ ۗ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۗ إِنَّ يُرِيدُونَ

[۱] یعنی یوم الاحزاب وهو یوم الخندق (تبیان)

[۲] اَقِيلَ اِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَمَ يَقَاتِلُوْا يَوْمَئِذٍ وَلٰكِنْ كَانُوْا اِيْشَجَعُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَيَجْبِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ (مجمع البيان)

إِلَّا فِرَارًا ۝۱۳ وَلَوْ دَخَلْتَ عَلَيْهِمْ مِنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سَبَلُوا الْفِتْنَةَ لَا تَوَهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ۝۱۴ وَلَقَدْ كَانُوا عَاهِدُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلِ لَا يُؤَلُّونَ الْأَدْبَارَ ط  
وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ۝۱۵ قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذَا لَا تُمْتَعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝۱۶ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ط وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝۱۷

”اور جب ایک گروہ نے اُن میں سے کہا کہ اے مدینہ کے رہنے والو! تمہارے ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے تو واپس چلو اور کچھ لوگ اُن میں پیغمبر سے اجازت مانگ رہے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں ہیں۔ نہیں چاہ رہے ہیں وہ مگر بھاگنا اور اگر اُسے (مدینے) میں اُن پر حملہ کر کے داخل ہو جایا جاتا اس کے اطراف و جوانب سے پھر، اُن سے چاہا جاتا ہنگامہ برپا کرنا تو یہ ایسا بھی کر گزرتے اور اس میں زیادہ توقف نہ کرتے حالانکہ انہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا اس کے پہلے کہ وہ بیٹھ نہیں پھرائیں گے اور اللہ سے جو عہد ہو، اُسے پوچھا جائے گا، کہنے کہ تمہیں بھاگنا کبھی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ اگر تم بھی مرنے سے یا مارے جانے سے اور اس وقت میں بھی تمہیں (زندگی دنیا سے) بہرہ مند ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا مگر بہت کم۔ کہنے کہ کون تمہیں بچائے گا اللہ سے اگر چاہے وہ تمہارے لئے کوئی مصیبت یا چاہے تمہارے ساتھ مہربانی (بہر حال تم اس کے رحم و کرم ہی پر ہو اور وہ نہیں پائیں گے اپنے لئے اللہ کو چھوڑ کر دوست اور نہ مددگار۔“

ایک باخبر بزرگوار کی زبان سے جن کے یہاں کی مسلم شخصیتیں اکثر تاریخ کے بے لوث بیانات سے مجروح ہوتی ہیں، یہ سننے میں آیا کہ تاریخ بڑی بے درد ہوتی ہے۔ کسی شخصیت کا لحاظ نہیں کرتی مگر اسے کیا کیا جائے کہ بیان واقعات میں قرآن مجید بھی ممدوح کی زبان میں ایسا ہی بے درد نظر آتا ہے کہ اُس خیر القرآن کے ”مہر و ماہ“ قسم کے افراد کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتتا اور کس کس طرح ایسا کردار سامنے لاتا رہتا ہے کہ قرآن پر ایمان لانے کی صورت میں اُن کے ساتھ انسان کو حسن ظن قائم رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمَعْوِفِينَ مِنْكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۚ وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ۝۱۸ أَشْحَتٌ عَلَيْكُمْ ۚ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ

سَلَقُواكُمْ بِالْسِنَةِ حِدَادٍ أَشْحَتًا عَلَى الْحَيْرِ ط أُولَئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ  
أَعْمَالَهُمْ ط وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝۱۹ يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۗ  
وَإِنْ يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوا لَوْ أَنَّهُمْ بَادُونَ فِي الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ  
أَنْبَاءِكُمْ ط وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قُتِلُوا إِلَّا قَلِيلًا ۝۲۰

”اللہ جانتا ہے تم میں سے روکنے والوں کو اور اپنے بھائی بندوں سے یہ کہنے والوں کو کہ ہماری طرف آؤ اور وہ جنگ کے موقع پر نہیں آتے مگر بہت کم، بخل کرتے ہوئے تمہارے اوپر تو جب خوف کا موقع آئے تو تم انہیں دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، دیدے گھاگھا کے جیسے وہ آدمی جسے موت کی سختی سے غش آجائے۔ اس کے بعد جب خوف چلا جائے تو تیز زبانوں سے تم لوگوں کو باتیں سنائیں گے۔ دولت کو ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ یہ لوگ ایمان لائے ہی نہیں تو اللہ نے ان کے اعمال اکارت کر دیئے۔ اور یہ اللہ پر آسان ہے ان فوجوں کو وہ سمجھتے ہیں کہ گئی نہیں ہیں اور اگر وہ فوجیں آجائیں تو وہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ صحرائی عربوں کے ساتھ رہ کر جنگوں میں تمہاری خبریں دریافت کرتے ہوتے اور اگر وہ تم میں ہوتے تب بھی جنگ نہ کرتے مگر بہت کم“۔

### منافقین کا کردار

”بخل کرتے ہوئے تمہارے اوپر“ یعنی تمہاری مدد میں بخل کرتے ہوئے جان سے بھی اور مال سے بھی۔ (۱) پھر أَشْحَتًا عَلَى الْحَيْرِ میں جو خیر ہے اس کے معنی مال کے ہوتے ہیں اس لئے ہم نے ترجمہ کیا ”دولت کو ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں“۔ دوسروں نے بھی ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے۔ (۲) مطلب یہ ہے کہ ان کی کوشش رہتی ہے کہ مال غنیمت میں انہیں زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ (۳) مگر ایک خیال میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ بخل کے ساتھ جس چیز کو روکا جائے، اُس کے لئے ”ب“ آتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ، علی نہیں جب کہ شُحُّ بخل ہی کے معنی میں ہے تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اس لفظ میں بھی یہی ہونا چاہئے چنانچہ پہلی جگہ جو اشحۃ علیکم آیا ہے، اُس کے معنی یہ نہیں ہوئے کہ تمہارے ساتھ بخل کرتے ہیں بلکہ اُس کی تشریح میں ہر ایک نے یہ لکھا ہے کہ تمہاری مدد میں جان و مال کے ساتھ بخل کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ب اُس چیز کے لئے آئے گا جس کے ساتھ بخل کیا جائے اور علی اُس کے لئے جس سے بخل کیا جائے اب جو خیر کے ساتھ علی آیا ہے کہ اشحۃ علی الخیر تو اس خیر کے معنی مال و دولت کے کیوں قرار دیئے جائیں جس کے ساتھ وہ بخل کرتے ہیں بلکہ خیر کے معنی نیک کاموں کے کیوں نہ لئے جائیں جس میں صرف کرنے سے وہ بخل کرتے ہیں مگر یہ پہلو ان مفسرین کے جیسے پیش نظر نہیں ہے۔

[۱] او بخلاء بالقتال معهم وقيل بخلاء بالنفقة في سبيل الله والنصرة (مجمع البيان)

[۲] بخل كنان بدمال (شاه ولی اللہ)

[۳] ای الغنیمۃ یطلبونها (جلالین)



لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ  
وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝۳۱

”تمہارے لئے پیغمبر خدا کی ذات میں اچھا نمونہ پیروی کے لئے موجود ہے اُس کے لئے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو خوب یاد رکھے۔“

پیغمبر خدا ﷺ بہترین نمونہ عمل

یعنی جس طرح قول رسولِ وحی الہی کا ترجمان ہے، اُسی طرح فعل رسول۔ آپ کے تمام افعال کو مرضی الہی کے مطابق ماننا لازم ہے اور ہم اُن کی پیروی کریں تو بہر حال یہ پیروی ہماری اللہ کو پسند ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ فعل واجب نہ ہو، مستحب یا کم از کم مباح ہوگا کیوں کہ ظاہر ہے کہ رسول صرف واجبات ہی کو عمل میں نہیں لاتے تھے بلکہ مستحبات کو بھی اکثر ترک نہیں فرماتے تھے اور جو جائز امور از قبیل مباحات ہوں، وہ بھی جب اُن کا عمل ہو عمل میں لاتے تھے لہذا اُس کے تعین کہ کون واجب ہے اور کون مستحب اور کون امر مباح۔ یہ صرف عمل رسولؐ کو دیکھ کر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے بیان رسولؐ یا دوسرے دلائل شرعیہ کو دیکھنے کی ضرورت ہوگی۔ [۱] اگر مقام تنزیل میں آیت اسی محل پر ہے تو گزشتہ اور آئندہ کے ربط سے مقصود اس پر متنبہ کرنا ہے کہ تم آخر شدائد اور مصائب کے وقت اتنے بے تاب کیوں ہو جاتے ہو؟ رسولؐ کو دیکھو! یہ کس طرح ان حالات میں صبر و تحمل کا نمونہ رہتے ہیں اور سکون و اطمینان کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ [۲]

وَلَبَّارًا الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ ۝۳۲ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ  
وَرَسُولُهُ ۝ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝۳۳

”اور جب خاص ایمان والوں نے اُن فوجوں کو دیکھا تو انہوں نے کہا یہ وہ وعدہ ہے جو ہم سے اللہ اور اس کے پیغمبر نے کیا تھا اور اللہ اور اُس کے پیغمبر نے سچ کہا تھا اور اس نے اُن کے ایمان اور سر تسلیم خم کرنے میں اور اضافہ کر دیا۔“ عام مسلمانوں کا تو وہ حال تھا جو پہلے آپکا ہے لیکن اُس وقت بھی ایک سچی صاحب ایمان جماعت ایسی تھی جس نے سکون و اطمینان کا دامن نہیں چھوڑا اور ان کے ذہن میں کوئی شک و تذبذب کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ ہیں وہ خاص الخالص مومنین جن کا حال اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ  
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ ۝ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝۳۴ لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ

[۱] ای اقتداءً حسنً فی جمیع ما یقولہ ویفعلہ متی فعلتم مثله کان ذلک حسناً ولا یدل علی وجوب الاقتداء بہ فی افعاله وانما یعلم ذلک یدلیل آخر (تبیان)

[۲] اقتداء بہ فی القتال والثبات فی مرآطنه (جلالین) کہا فعل ہر یوم احد \_\_\_\_\_ فہلاً فعلتم مثل ما فعل ہو (جمع البیان)

**وَيُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ إِن شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ٢٣**

”ایمان والوں میں کچھ اشخاص ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اُسے جو انہوں نے اللہ سے عہد پیمان کیا تھا تو اُن میں کچھ وہ ہیں جنہوں نے اپنا وقت پورا کر لیا اور ان میں سے کچھ انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے بات میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی تا کہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا صلہ دے اور منافقین کو چاہے سزا دے یا اُن کی توبہ قبول کرے، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان“۔

”جنہوں نے اپنا وقت پورا کر لیا“، یعنی شہید ہو گئے۔ [۱] اور کچھ وہ ہیں جو انتظار کر رہے ہیں یعنی شوق شہادت میں وہ ان افراد سے کم نہ تھے مگر وہ اس موقع پر درجہ شہادت پر فائز نہیں ہوئے آئندہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

فریقین کی روایت میں ہے کہ قُصْنِ قُصْبَةٍ کے جملے کا جناب حمزہ و جعفرؓ سے تعلق ہے کہ اوّل الذکر جنگ احد میں اور دوسرے بزرگ جنگ موتہ میں شہید ہو گئے اور کچھ انتظار کر رہے ہیں، اس فقرے کا تعلق حضرت علیؓ سے ہے جو پیش آمدہ غزوات رسولؐ میں باوجود کارہائے نمایاں انجام دینے کے شہید نہیں ہوئے۔ [۲]

**وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا ۗ وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ**

**الْقِتَالِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ٢٤**

”اور پلٹا یا اللہ نے کافروں کو اُن کے عم و غصہ کے ساتھ کہ اُن کا کوئی بھی بھلا نہ ہوا اور بچایا اللہ نے مومنین کی جماعت کو جنگ کی زحمت سے اور اللہ طاقت ور ہے، عزت والا“۔

### جنگ خندق کا سرانجام

جنگ خندق میں بس ایک پہلوان عمرو بن عبدود کے قتل ہونے سے جسے حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے قتل کیا تھا تمام مشرکین مرعوب ہو گئے اور ان کی فوجیں واپس چلی گئیں، اس لئے بعض تفاسیر میں وارد ہوا ہے کہ اس آیت کی تزییل یعنی معنی تزیلی یہ ہے کہ کفی اللہ القتال بعلی علیؓ کے ذریعہ سے تمام مسلمانوں کو اللہ نے جنگ کی زحمت سے بچایا [۳] اور اہل تفسیر اہل بیت عصمت علیہم السلام بھی اسی مفہوم کے مطابق ہے۔ [۴]

**وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي**

[۱] بانجام رسانید قراود خود را (شاہ ولی اللہ) پورا کر چکا کام اپنا (رفیع الدین) یعنی شہید شدند (فتح الرحمن) ذمہ پورا کر چکا یعنی جہاد ہی میں جان دے چکا (موضح القرآن)

[۲] روى ان الآية نزلت في حمزة بن عبدالمطلب وجعفر بن ابى طالب (تبيين) من على (عليه السلام) قال فينا نزلت: رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فانا والله المنتظر وما بدلت تبديلا (مجمع البيان)۔

[۳] هبى قراءة ابن مسعودو كذلك هو في مصحفه (تبيان)

[۴] هو المروى عن ابى عبدالله (عليه السلام) (مجمع البيان)

قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿٣٦﴾ وَأَوْرَثَكُمُ أَرْضَهُمْ

وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَمْ تَطَّوُّهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٣٧﴾

”اور اُس نے اتار دیا اہل کتاب میں سے اُن کو جنہوں نے اُن کی مدد کی تھی، اُن کے قلعوں سے اور اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ ان میں سے کچھ کو تم قتل کر رہے تھے اور کچھ کو قید کر رہے تھے اور تمہیں قابض بنایا اُن کی زمین اور اُن کے مکانات اور اُن کے اموال اور اس زمین پر جسے تم اپنے زیر قدم لائے نہ تھے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

### بنی قریظہ کا انجام

یہ یہود میں بنی قریظہ کا تذکرہ ہے۔ [۱] جنہوں نے رسولؐ سے اس کے قبل عہد و فاداری کرنے کے بعد اب اس جنگ احزاب میں مشرکین کا ساتھ دیا، اس لئے اب اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی۔ ایک قدیم مفسر نے بنی نصیر کا نام لے دیا ہے مگر یہ غلط ہے اس لئے کہ وہ پہلے ہی مدینہ سے نکالے جا چکے تھے۔ [۲]

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِن كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنْتَهَا فَتَعَالَيْنَ

أَمْ تَتَّعِكُنَّ وَأُتْسِرُ حُكْمًا سَرًّا حَاجِمِيلاً ﴿٣٨﴾ وَإِن كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالذَّارِ

الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٣٩﴾

”اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیاوی زندگی اور اُس کی سجاوٹ کی طلبگار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دوں اور تمہیں اچھے عنوان سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے پیغمبر اور منزلِ آخرت کی طلبگار ہو تو جو تم میں سے اچھے اعمال کرتی رہیں گی، اُن کے لئے اللہ نے بڑا ثواب تیار رکھا ہے۔“

حمید الدین فراہی صاحب جو تفسیر میں نظم قرآن پر بڑا زور دیتے ہیں، معلوم نہیں جنگ خندق اور ازواجِ رسولؐ کو اس انتہاء میں کیا رشتہ قرار دیتے ہیں، ہم کلیدیہ اس نظم یعنی ترتیب کو قابل لحاظ نہیں سمجھتے۔ اس لئے بھی کہ موجودہ ترتیب تنزیل کے مطابق ہے ہی نہیں اور اس لئے بھی کہ اکثر آیات متفرق طور پر کچھ حالات کے تحت نازل ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اُن کا قبل کے آیات سے کوئی جوڑ ہو چنانچہ اب یہ سلسلہ آیات کا جو شروع ہو رہا ہے، گذشتہ سلسلہ آیات سے قطعاً غیر متعلق ہے لہذا خود ان آیات کی شان نزول تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ ازواجِ رسولؐ میں کیا چمی گویاں ہوئی تھیں، یا انہوں نے پیغمبر خداؐ سے کیا فرمائشیں کی تھیں جن کی بنا پر یہ آیات نازل ہوئی ہیں جو شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔ ”حضرتؑ کے ازواج نے دیکھا کہ لوگ آسودہ ہوئے، چاہا کہ ہم بھی آسودہ ہوں بعضوں نے بول چال کی حضرتؑ نے قسم کھائی کہ ایک

[۱] انزل فی بنی قریظہ (علی بن ابراہیم) ہم بنو قریظہ من الیہود (تبیان)

[۲] کانوا اقداء لولوا قبل ذلک (مجمع البیان)

مہینے گھر میں نہ جائیں۔ پھر مہینے کے بعد یہ آیت اتری۔“  
تفسیر جلالین میں ہے:

ظَلِيلَيْنِ مِنْهُ زَيْنَةَ الدُّنْيَا مَا لَيْسَ عِنْدَهَا۔ انہوں نے حضرتؐ سے دنیوی آرائش کے ایسے سامان کا مطالبہ کیا جو حضرتؐ کے پاس نہ تھا۔ اس کے بعد ہمارے یہاں یہ روایت ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے اپنے ازواج کے سامنے جب یہ آیت پڑھ کر سنائی تو سب سے پہلے ام المومنین جناب ام سلمہ رضوان اللہ علیہا نے کہا کہ میں تو خدا اور رسولؐ کو چاہتی ہوں۔ دوسری تمام ازواج رسولؐ ان کی پیش قدمی کی قدر کرتی ہوئی ان سے گلے لیں اور پھر سب نے یہی بات کہی۔ [۱]

**يُنْسَاءُ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ يُضَعَفُ لَهَا الْعَذَابُ  
ضِعْفَيْنِ ۗ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿۳۱﴾**  
”اے زنان پیغمبر! جو تم میں سے کسی نمایاں جرم کا ارتکاب کرے گی، اُسے دہری سزا دی جائیگی اور یہ بات اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔“

### ازواج رسول ﷺ کا امتیاز خاص

یعنی دنیا کے لئے اس کا فلسفہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کیوں کہ زوجیت رسولؐ جب ایک بہت بڑا شرف ہے تو پھر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری بھی شدید ہونا چاہئے۔ اگر ان تقاضوں پر عمل نہ ہو اور کسی گناہ کا ارتکاب ہو تو دوسروں کی بہ نسبت ان کے گناہ کی سزا دینی ہے، اس لئے کہ جب وہ گناہ ہے تو خود اس عمل کی سزا تو ہے ہی اور پھر رسولؐ کے ساتھ رشتہ ازدواج کی توہین بھی ہے۔ اب اس سے سادات، اولاد رسولؐ کی آنکھیں کھلنا چاہئیں کہ ان کا پیغمبر خدا ﷺ سے سلسلی رشتہ ہے تو پھر ان کی ذمہ داری بھی زیادہ ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اب ہمیں اس رشتے کی بنا پر کچھ چھوٹ ملے گی بلکہ ان کے اعمال کا احتساب زیادہ شدت کے ساتھ ہونا چاہئے کیونکہ اصول بہر حال اصول ہے۔ جب سہمی رشتے سے گناہ کی سزا میں اضافہ ہو جاتا ہے تو نسبی رشتے سے کیوں نہ ہوگا؟

**وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِيهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۗ**

**وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا ﴿۳۲﴾**

”اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے پیغمبر کے اطاعت کرے اور نیک اعمال کرتے رہے اُسے ہم اُس کا ثواب بھی دو ناعطا کریں گے اور اس کے لئے ہم نے عمدہ روزی تیار رکھی ہے۔“  
قبل والے پارے کے آخر میں یہ آیا ہے کہ ازواج رسولؐ میں سے کوئی اگر گناہ کی مرتکب ہوگی تو اُسے سزا دینی دی جائے گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ گناہ بھی ہے اور رسولؐ کے رشتے کی توہین بھی۔

[۱] فكانت امر سلمة اول من قامت وقالت قد اخترت الله ورسوله وقرن كلهن فعاتقته وقلن مثل ذلك (علی بن ابراہیم)۔

اب اس آیت میں اس کے بالمقابل حسن عمل کے لئے بھی وعدہ دونے ثواب کا ہوا ہے۔

یہاں جناب شیخ الطائف نے ایک سوال جیسے اٹھایا ہے مگر جواب اس کا لکھنے سے رہ گیا یا نقل در نقل سے کتابت میں ساقط ہو گیا۔ وہ سوال یہ ہے کہ وہ سزا بالاستحقاق تھی تو یہ جزاء دونی کیا صرف اس لئے لازم ہے کہ اللہ نے وعدہ کر لیا ہے؟ سیاق کا تقاضا یہ ہے کہ جیسے وہ سزا بالاستحقاق تھی، ویسے ہی یہ جزا بھی بالاستحقاق ہو۔ [۱]

ہم غور کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سزا دونی کیوں تھی؟ اس لئے کہ گناہ بھی ہے اور رشتہ رسول کی توہین بھی ہے تو اس کے بالمقابل اگر زندگی بھر یہ پیش نظر رہا کہ ہمیں رسول سے کیا تعلق ہے؟ اس لئے ہمیں اپنی پوری زندگی اس معیار تقویٰ پر گزارنا ہے جو اس رشتے کا تقاضا ہے تو اس پوری زندگی میں جو اطاعت کا اجر ملتا ہے، وہ بھی ملنا چاہیے اور پھر رسول کے ساتھ عمر بھر کا لحاظ رکھنے سے حفظ کرامت و احترام رسول کا اجر بھی خاص طور پر ملنا چاہیے اس کے علاوہ پیغمبر خدا سے رشتہ خاص ہونے کی بنا پر ان کے افعال کی دوسرے تقلید کرتے ہیں اور یہ اصول کہ جو ٹھیک طریقہ شروع کرے جس پر دوسرے چلیں۔ اس کے ثواب میں وہ شریک ہوگا اور جو برا طریقہ اختیار کرے اس پر جتنے چلیں ان کے عذاب میں وہ شریک ہوگا (من سن سنة حسنة كان له اجر من عمل بها الى يوم القيامة ومن سن سنة سيئة كان عليه وزر من عمل بها الى يوم القيامة) اور یہ وجہ ایسی ہے جو قبل والی سزا کے دونے ہونے کا بھی ایک مستقل سبب ہو سکتی ہے اور اس سے معلوم ہوگا کہ ثواب اور عذاب دونوں میں دونا کہنا بھی اقل درجہ کے لحاظ سے ہے، ورنہ بہت ممکن ہے کہ وہ عذاب اور ثواب دونے سے بہت زیادہ ہو جس کا پورا اندازہ اس وقت نہیں کیا جاسکتا۔

اب وہ بدی پر عذاب کا دونا ہونا اور اطاعت گزاری پر ثواب کا دونا ہونا جب اس اصول پر ہے تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جن کا رشتہ اس سے بھی زیادہ نمایاں ہو یعنی اولاد کا رشتہ جو سادات کا ہے تو جیسا کہ قبل میں بھی مجملاً عرض کیا گیا، ان کے لئے بھی یہی بات سمجھنا ناگزیر ہے کہ یہ نسبت دوسروں کے ان کے کردار کی برائی اور اچھائی دونوں کا وزن زیادہ ہوگا۔ یہ کوئی ہمار طبع زاد نکتہ نہیں ہے بلکہ خود بزرگان سادات نے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس کے ذیل میں حدیث معصومہ بھی ہے۔ [۲]

اور عقل سلیم کی مدد سے اس میں وسعت دی جائے تو ہر ایسا شخص جس کے کردار کو لوگ مثال بنائیں خواہ دینی سبب سے جیسے صاحبان اقتدار یا دینی حیثیت سے جیسے علماء و اعظمتین، ان پر بھی یہی حکم جاری ہوگا کہ ان کی ذمہ داری زیادہ ہوگی اور ان کے کردار کی جزا یا سزا بھی دوسروں سے بڑھ کر ہوگی۔

## يُنْسَاءُ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ

[۱] الاجر مژتین لیس یجب بالوعد بل انہا ہو مستحق (تبیان)

[۲] عن ابی حمزۃ التّعالی عن زید بن علیؑ انه قال: انی لا وجو للمحسن منّا ان یضاعف له التّواب ضعفین وعلی المسیئ منّا ان یضاعف العذاب ضعفین کما اوعد ازواج النّبیینؑ۔ عن علی بن الحسینؑ انه قال له رجل: انکم اهل بیت مغفور لکم قال فغضب وقال نحن احدی ان یجری فینا ما اجری الله فی ازواج النّبیینؑ دون ان نکون کما تقول، انّا المحسننا ضعفین من الاجر و المسیئنا ضعفین من العذاب ثم قرأ الآية (مجمع البیان)

فَيَطْمَعُ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٣٣﴾ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ؕ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿٣٤﴾

”اے پیغمبر کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم پر ہی زنگار رہتی ہو تو نرمی کے ساتھ بات نہ کرو تا کہ اسے جس کے دل میں بیماری ہے کچھ توقع پیدا ہو، اور نیک بات کہا کرو اور استقلال کے ساتھ اپنے گھروں کے اندر رہا کرو اور زمانہ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کے جلوہ دکھاتی نہ پھرو اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ ادا کرتی رہو اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی فرماں بردار رہو۔ اللہ کا بس یہ ارادہ ہے کہ تم لوگوں سے ہر گناہ کو دور رکھے اے اس گھر والو! اللہ تمہیں پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے۔“

قَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کے معنی ہم نے لکھے ہیں کہ ”استقلال کے ساتھ اپنے گھروں کے اندر رہو“۔ یہ اکثر مفسرین و مترجمین کی تشریح کے مطابق ہیں۔ [۱] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام عورتوں کے لئے تو گھر کی چار دیواری کا پردہ واجب نہیں ہے بلکہ برقع و چادر میں نہاں ہو کر وہ جائز ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہیں لیکن ازواج رسول کے لئے کہا جا رہا ہے کہ تم اور عورتوں کی سطح پر نہیں ہو لہذا تم پر پردے کی پابندی زیادہ ہے۔ تم کو اپنے گھروں میں بیٹھے رہنا چاہیے۔

آخری حصہ جو اِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ سے ہے، اگرچہ موجودہ ترتیبی صورت میں گذشتہ آیت کا ایک جز ہے مگر مسلماً وہ مقام تنزیل میں تھا اترتا ہے جس کی شان نزول متفقہ طور پر مستقلاً درج ہے: اِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔ اس میں جو تفسیری حیثیت سے مرکزی لفظ ہے، وہ اَهْلَ الْبَيْتِ ہے جس کا ترجمہ اکثریت والے مفسرین صرف اَهْلَ اٰلِ الْبَيْتِ کے الفاظ کو دیکھ کر ”اہل خانہ“ یا خالص ہندوستانی زبان میں ”گھر والی“ سے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس میں درمیان میں ایک الف لام ہے جو بیعت پر داخل ہے (البیت) اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

یہ الف لام جو یہاں فرد خاص کی طرف اشارہ کے لئے آیا ہے۔ [۲] سامنے رکھا جائے تو اُس کے معنی ہو جائیں گے ”اس گھر والے“ جیسے الیوم کے معنی ”آج“ یعنی یہ سادہ۔ اب دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ رسول کا اشارہ کس گھر کی طرف تھا۔ چار دیواری والا گھر یا کوئی اور؟ سنی اور شیعہ تمام محدثین کے روایات جو اس آیت کے شان نزول میں وارد ہوئے ہیں، متفق ہے کہ حضرت نے ایک چادر کے نیچے علی و فاطمہ، حسن و حسین علیہم السلام کو لیا اور اُس وقت یہ آیت اتری۔ رسول نے یہ چادر کا حصار کیوں کھینچا؟ اس لئے کہ اَهْلَ الْبَيْتِ ”اس گھر والے“ کے

[۱] امرھن بالاستقرار فی بیوتہن والمعنی ابقین فی منازلکن والزمنہما (مجمع البیان) بمانید (شاہ ولی اللہ) ٹکی رھو (شاہ رفیع

الدین) اصلہ اقرن من قرات بفتح الزاء (جلالین)

[۲] التعریف فیہ للعھد والمراد بہ بیت النبوة (مجمع البیان)

الفاظ میں ”اس گھر“ کا اشارہ چادر یواری میں منتشر نہ ہو۔ یہ چادر کا حصار قرآن کی آیت کے آغاز والے کلمہ حصر انما کی جو انحصار کا پتہ دیتا ہے، مجسم شکل میں تفسیر تھی۔ اس کے بعد صرف اَہْلُ اور بَيْتِ کے لغوی معنی کی بنا پر چادر یواری والے گھر کے افراد کو مصداق قرار دینا کہاں درست ہو سکتا ہے؟

رہے سبے مفروضہ ابہام کو جناب ام سلمہ رضوان اللہ علیہا نے جو اُس معنی میں گھر والیوں کی ایک نمایاں فرد تھیں اپنے عمل سے دور کر دیا جب وہ چادر کے قریب آئیں اور چاہا کہ اُس میں داخل ہوں اور اُس مجسم خلق عظیم نے کہ جس نے مسجد میں بالکل اپنے پہلو میں کسی کو بٹھانے میں عذر نہیں کیا، مقصد الہی کے تحفظ کے لئے ایسی ممتاز بیوی کے ہاتھ سے گوشہ چادر کو جھٹکا دے کر کھینچ لیا اور فرمایا کہ تم جہاں ہو اچھی ہو مگر اس چادر میں تمہاری جگہ نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی اس صنف کی فرد کو اس لفظ اہل البیت کا مصداق سمجھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اسی لئے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے معزز صحابی رسول جناب زید بن ارقم سے جب دریافت کیا گیا کہ ازواج رسول اہل البیت میں داخل ہیں یا نہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ زوجہ اپنے شوہر کا جز عارضی طور پر ہوتی ہے لیکن جب کسی وجہ سے رشتہ زوجیت قطع ہو جائے تو وہ دوسرے گھر کا جز ہو جاتی ہے۔ یہ اہل البیت تو وہ ہیں جو مستقل طور پر بیت رسالت والے ہیں۔ اس سے الگ کبھی نہیں ہو سکتے یہ ان کا فیصلہ جو منطقہ استدلال کے ساتھ ہے اس بحث کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔

وَأَذْكُرَنَّ مَا يُثَلَّى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا

خَبِيرًا ﴿٣٣﴾

”اور یاد رکھنا اسے جو تمہارے گھروں میں آیات الہی اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی رہتی ہیں یقیناً اللہ لطف و کرم والا ہے، بڑا باخبر“

یہ پھر ازواج رسول سے خطاب ہے ﴿٣٣﴾ اور مطلب یہ ہے کہ یہ اصلاح خلق کے تعلیمات دنیا بھول جائے تو بھول جائے مگر تمہیں تو جو ہر وقت انہیں سننی رہتی ہو، ہمیشہ ہمیشہ انہیں یاد رکھنا چاہئے اور کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنَاتِ وَالْقَنَاتِ  
وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ  
وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّالِبِينَ وَالصَّالِبَاتِ وَالْحَفِظِينَ فُرُوجَهُمْ  
وَالْحَفِظَاتِ وَالذَّكِرِينَ اللَّهُ كَثِيرًا وَالذَّكِرَاتِ ۗ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا  
عَظِيمًا ﴿٣٥﴾

”اپنے معاملات کو سپرد خدا کرنے والے مرد اور ایسی ہی عورتیں اور ایمان کا جوہر رکھنے والے مرد اور یہ جوہر رکھنے والی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور اطاعت گزار مرد اور اطاعت گزار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور اثر پذیر دل رکھنے والے مرد اور اثر پذیر دل رکھنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنے اندام نہانی کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، اُن کے لئے اللہ نے مہیا رکھی ہے بخشش اور بڑا اجر و ثواب۔“

اسلام اور ایمان کا ایک اصطلاحی مفہوم ہے جس میں اسلام آسان اور ایمان مشکل ہے۔ اسلام ظاہر سے وابستہ ہے اور ایمان دل سے متعلق چیز ہے جس کے لحاظ سے قرآن مجید میں ایک جگہ ہے:-

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَكُمْ تُوْمُنُوْا وَلٰكِنْ قَوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

صحرائی عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں کہنے کہ تم ایمان نہیں رکھتے ہو۔ ہاں یہ کہو کہ ہم اسلام لائے اور بھی ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ (حجرات - ۱۴) اس کے لحاظ سے تو اجر آخرت ایمان کے ساتھ وابستہ ہے، نہ کہ صرف اسلام کے ساتھ جس کے اثرات قانونی طور پر دنیا میں حاصل ہوتے ہیں مگر حقیقت معنی کے لحاظ سے جو مفہوم لغوی کی حیثیت رکھتی ہے معاملات کو سپرد خدا وہی کرے گا جو تہہ دل سے ایمان اختیار کیے ہوئے ہو۔ اس لئے بس مفہوم لفظی کے لحاظ سے یہ دونوں الگ الگ وصف ہیں مگر عالم مصداق میں دونوں متحد ہیں اسی طرح صحیح ایمان و اسلام رکھنے والوں میں وہ سب ہی اوصاف ہوں گے جن کا ذکر بعد کو ہے۔ لہذا یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ بہت سی جماعتوں کا ذکر ہے جن میں ایک مومنین ہیں، ایک مسلمین ہیں، ایک قانتین ہیں، ایک صادقین ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ وہ ایک ہی جماعت ہے جس کے مرد بھی ان اوصاف کے حامل ہیں اور عورتیں بھی۔

قرآن مجید میں اکثر جگہ اختصار پسندی کے باوجود یہاں اتنی تفصیل کے ساتھ ہر وصف میں الگ سے اُس وصف رکھنے والی عورتوں کا ذکر اس ”گرانی مجمل“ کا رد عمل ہے جس میں اس دنیا کی ذہنیت اُس وقت کیا، کسی حد تک اب بھی بتلا ہے کہ عورتوں کی کوئی ذمہ دار انفرادی حیثیت نہیں بلکہ وہ بے چاری تو بس مردوں کی تابع مہمل ہیں۔ قرآن مجید صراحتاً اس آیت میں ہر جگہ اُن کا تذکرہ کر کے یہ احساس پیدا کرنا چاہتا ہے کہ احساس فرائض کی منزل مرد اور عورت ہر ایک کی مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اس لئے جواب دہی بھی ہر ایک کی اور باز پرس مستقل طور پر ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض صورتوں میں فرد اقویٰ ہونے کی بنا پر مرد کی ذمہ داری ڈہری ہو جائے اور اس کی جواب دہی بھی زیادہ سخت ہو۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ

مِنْ اَمْرِهٖمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ صُلٰٓلًا مُّبِيْنًا ۝۳۶

”اور کسی با ایمان مرد کو یہ حق نہیں اور نہ با ایمان عورت کو کہ جب اللہ اور اُس کے پیغمبر نے کوئی بات طے کر دی تو انہیں اپنے معاملہ میں کوئی اختیار ہو اور جو اللہ اور اُس کے پیغمبر کی نافرمانی کرے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوا۔“



## خدا و رسول ﷺ کے فیصلے کے بعد جمہور مسلمین کے اختیار کی نفی

یہ آیت تمام امور میں خدا و رسول کے فیصلے کے بعد مسلمانوں کے حق خود ارادی کی خواہ انفرادی طور پر ہو یا مل جل کر اجماع یا شوری کی صورت میں ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نفی کا اعلان ہے۔ اس کے بعد ایک جگہ مسلمانوں کی تعریف جو ہوئی ہے کہ:۔ امر ہمہ شورئى بینہم۔ وہ اپنے امور باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں تو یہ انہی امور سے متعلق ہو سکتا ہے جس میں خدا و رسول کی طرف سے کوئی فیصلہ نہ ہوا ہو۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۗ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ۗ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۗ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٣٤﴾

”اور وہ موقع جب آپ کہہ رہے تھے اُس سے جس کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا اور آپ نے بھی اُسے نعمت سے نوازا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو اور اللہ سے ڈرو اور آپ اپنے دل میں چھپا رہے تھے اُسے جسے اللہ نمایاں کرنے والا تھا اور آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے اور اللہ اُس کا زیادہ سزاوار ہے کہ آپ اُس سے ڈریں تو جب زید اُس (خاتون) سے ضرورت پوری کر چکے تو ہم نے آپ سے اُس کی شادی کر دی تاکہ ایمان لانے والوں پر کوئی تنگی نہ رہے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ اُن سے مطلب پورا کر چکے ہوں اور اللہ کی بات انجام تک پہنچ کر رہتی ہے۔“

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ جناب زینب بنت جحش حضرت پیغمبر خدا ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جناب زید بن حارثہ بطور غلام آپ کے پاس آئے تھے مگر اُن کے ضمیر کی طہارت اور حق پسندی ایسی تھی کہ اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں میں صف اول میں وہ ہیں، حضرت نے انہیں نہ صرف آزاد کیا بلکہ مقام نسبت میں اپنی فرزندگی کا شرف عطا فرمایا، یہاں تک کہ وہ رسول کے بیٹے کہے جانے لگے اور پھر اسلامی مساوات کو عملی شکل میں پیش کرنے کے لئے آپ نے انہی اپنی پھوپھی زاد بہن کو رضامند کر کے اُن کی شادی اُن کے ساتھ کر دی، اُس طرح وہ ایک حیثیت سے خاندان بنی ہاشم کا جز بن گئے مگر بعد میں اُن دونوں کے باہمی تعلقات ناخوشگوار رہنے لگے اور جناب زید نے حضرت زینب کو طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ خالق غیبی طور پر حضرت کو مطلع فرما چکا تھا کہ یہ خاتون ایک وقت میں آپ کے حلقہ زوجیت میں داخل ہوگی۔ اب جو اُن کی باہمی نزاع کا معاملہ رسول کی خدمت میں پیش ہوا تو حضرت نے دل میں تصور فرمایا کہ یہی موقع ہے جس کے لئے مجھے بتایا گیا تھا تو جب یہ طلاق دیں گے تو میں اُن کے ساتھ عقد کر لوں گا مگر آئین کے مطابق کہ ایک حاکم شرع کا فرض ہے کہ حتی الامکان باہمی تعلقات کے سدھارنے کی کوشش کرے اور طلاق سے مانع ہو چونکہ طلاق ایسی چیز ہے جسے عموماً اللہ پسند نہیں فرماتا لہذا حضرت نے زید سے فرمایا کہ اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں برقرار رکھو اور اللہ سے ڈرو یعنی طلاق کا جسے اللہ ناپسند فرماتا ہے اقدام نہ کرو۔ اسی کو خالق نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”آپ دل میں چھپاتے تھے اُسے

جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔“ اس کے علاوہ حضرت کو یہ بھی تصور تھا اگر میں طلاق کے بعد زینبؓ سے شادی کروں گا تو دنیا کہے گی کہ یہ کیسے ہیں کہ ایسی عورت کو جو پہلے ان کی بہو تھی، انہوں نے اپنی بیوی بنا لیا۔ یہ خوف ایک طرح کے حجاب کی حیثیت رکھتا تھا جو کوئی بری صفت نہیں مگر چونکہ یہاں خالق کو اپنے رسولؐ کو اس محل امتحان میں لا کر ایک غلط ذہنیت کو ختم کرنا تھا، اس لئے اس شرم و حجاب کے کام میں لانے سے روک دیا گیا اور کہا کہ مقصد الہی کو جو ایک غلط ذہنیت کی اصلاح ہے، مقدم سمجھنا چاہیے، اس کو یوں کہا گیا ہے کہ ”اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اُس سے ڈریئے“۔ [۱]

”جب زیدؓ نے اپنا مطلب پورا کر لیا، یعنی ازدواجی زندگی بسر کر چکے اور اس میں یہ مضمر ہے کہ اُن کا دل اُن سے بھر گیا کہ اب انہیں رغبت انہیں باقی رکھنے کی اپنے حلقہ زوجیت میں نہیں رہی تو ”ہم نے آپ کے ساتھ اُن کی شادی کر دی“۔ اب اُس خاتون کو جو کبیدہ خاطر پیدا ہوئی تھی، اُس کی تلافی ہوئی ایسی کہ وہ عمر بھر فخر کرتی رہیں کہ کسی کی شادی اُس کے والدین یا دوسرے عزیز کرتے ہوں گے اور میری شادی رسول اللہؐ سے اللہ سبحانہ نے کی ہے۔ [۲]

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ ۖ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ  
قَبْلُ ۗ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ۗ (۳۸) الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ  
وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ۗ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا (۳۹)

”پیغمبر پر کوئی سختی نہیں اُس چیز میں جو اللہ نے اُس کے لئے قرار دی ہے، جیسا اللہ کا طریقہ ہے اُن میں جو اس کے پہلے گزر چکے ہیں اور خدا کی بات ایک فیصلہ تقدیر ہے جو معین کر دیا گیا ہے۔ وہ جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں اور کسی سے سوا اللہ کے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب کرنے کے لئے کافی ہے۔“

زمانہ جاہلیت میں جو اب بھی غیر مسلم حلقوں میں باقی ہے، متبہش بالکل اپنا بیٹا سمجھا جاتا تھا، اس کے لحاظ سے متبہش کی مطلقہ بیوی سے اُس شخص کو جس نے متبہش بنایا ہے، نکاح ناروا تھا۔ اسلام نے چونکہ متبہش بنانے کو بے معنی قرار دیا، اس لئے اپنے رسولؐ کو مومرا فرمایا کہ وہ زید بن حارثہ کی مطلقہ بیوی سے عقد فرمائیں۔ اس پر مشرکانہ رسم و رواج کے خوگر افراد نے شور مچا دیا کہ انہوں نے اپنی سابقہ بہو سے نکاح کر لیا اُن کے اس اعتراض کو بے معنی قرار دیتے ہوئے یہ کہا جا رہا ہے کہ جو اللہ نے قانون قرار دیا ہے، رسولؐ اُس پر عمل کریں تو اس پر اعتراض کے کوئی معنی نہیں ہیں جیسا کہ اللہ کا طریقہ ہے اُن میں جو اس کے پہلے گزر گئے ہیں یعنی شریعت اسلام کا یہ حکم کوئی نیا نہیں ہے بلکہ انبیاء ماسلف کی شریعتوں میں بھی ایسا ہی تھا۔ [۳] یہ مشرکین دور جاہلیت کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے متبہش پر اصل بیٹے کے احکام جاری کر دیئے تھے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ

[۱] اراد خشية الاستحياء لان الحياء كان غالباً على شمه الكريمة كما قال سبحانه ان ذلكم كان يوذا النبي فيستحي منكم (مجمع البيان)

[۲] في الحديث ان زينب كانت تفتخر على سائر نساء النبي ﷺ وتقول زوجني الله من النبي ﷺ وانتن ائماز وجكن اولياء كن (مجمع)

[۳] يعني ما امر نابه محمد امن هذه النبي والعادات مثل سنة من تقدم من الانبياء (تبيان)۔

## اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾

”محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے پیغمبر اور انبیاء کے لئے مہر اختتام ہیں اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے“

### ختم رسالت

”تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں یعنی اپنی واقعی اولاد کے سوا تم میں سے کسی کو بیٹا کہہ دیں تو ان کے وہ واقعی باپ نہیں ہو جاتے۔ نہ یہ کہ جو واقعی ان کی اولاد ہو، اس کے بھی باپ نہیں ہیں۔ [۱] ختمہ کے معنی تمام کرنے کے ہیں مہر لگانے کو عربی میں ختمہ اور مہر کو خاتمہ جو کہا جاتا ہے، وہ اسی لئے کہ مہر اختتام پر لگتی ہے اور اس لئے بلاشبہ یہ آیت حضرت محمد ﷺ کے آخری رسول ہونے کی دلیل ہے۔ [۲] مگر قادیانی جماعت کے لوگ جو مرزا غلام احمد صاحب کو نبی بنانے کے درپے ہیں، وہ اس آیت میں خاتمہ کے ایسے معنی قرار دینا چاہتے ہیں جس سے ہمارے رسول کے بعد بھی نبی کے آنے کی گنجائش باقی رہے جو تمام امت اسلامیہ کے نزدیک باطل اور خلاف ضرورت دین ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٣١﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٣٢﴾  
هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ط وَكَانَ

بِالْمُؤْمِنِينَ رَحيماً ﴿٣٣﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ ۗ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيماً ﴿٣٤﴾

”اے ایمان لانے والو! اللہ کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو، وہ وہ ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اُس کے فرشتے تاکہ تمہیں نکالیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور وہ ایمان لانے والوں پر مہربان ہے۔ اُن کا آپس کے میل جول میں ادب قاعدہ جب وہ اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے سلام ہوگا اور اُس نے اُن کے لئے عمدہ صلہ تیار کر رکھا ہے۔“

”صبح و شام اُس کی تسبیح کرو۔“ اس تسبیح سے مراد شب و روز کی نمازیں ہو سکتی ہیں جیسا کہ متعدد مفسرین کا خیال ہے، چونکہ احادیث معصومین میں بھی نماز کی تعبیر سبحة سے ہوئی ہے اور بعض دوسرے آیات میں بھی تسبیح کے معنی نماز کے سمجھے جاتے ہیں۔ [۳] مسلمانوں میں سے افراد شیعہ عموماً ائمہ معصومین کے لئے صلوات اللہ علیہ اور علیہ السلا م وغیرہ کہنے کا دستور رکھتے ہیں بلکہ علیہ السلا م کا لفظ تو کبھی دوسرے شہداء اور مقربین کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اہل سنت عموماً اُس پر معترض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

[۱] اذکروا لله اولاد ذکور ابراہیم علیہ السلام والقاسم علیہ والطیب علیہ والمظہر علیہ فكان اباہم وقد صحح ائہ قال فی الحسن علیہ ان ابنی لهذا سیکہ وقال ایضاً الحسن علیہ والحسین علیہ ابناء هذا ان اما مان قاما او قعدا (مجمع البیان)

[۲] یعنی لانی بعد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ (علی بن ابراہیم) یعنی بعد انہی ہیج پیغمبر نباشد (فتح الرحمن)

[۳] اسمی الصلوة تسبیحاً لہا فیہا من التسمیح والتغزیہ (مجمع البیان)

یہ چیز انبیاء مرسلین کے لئے مخصوص ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت سے خالق کا صلوة و سلام ممتاز درجہ کے مومنین کے لئے ثابت ہو رہا ہے۔ [۱] اس لئے انبیاء سے اسے مخصوص سمجھنا بے بنیاد ہے۔

تَحِيَّتُهُمْ کے معنی ہم نے آپس کے ”ادب قاعدہ“ کے کہے ہیں مگر بعض علمائے اہل سنت نے اسے بھی اللہ سے متعلق کیا ہے۔ [۲] ہمارے نزدیک پہلا مفہوم الفاظ آیت سے زیادہ قریب ہے اور اکابر مفسرین اس بارے میں ہم سے متفق ہیں۔ [۳] علامہ طبرسی نے پہلے تو یہی تشریح کی ہے پھر ایک صحابی کی طرف نسبت کے ساتھ یہ نقل کیا ہے کہ مومن کو اُس کی موت کے وقت ملک الموت سلام کرتے ہیں۔ [۴] مگر اس کا اسناد صحابی نے رسول کی طرف نہیں کیا ہے چنانچہ علامہ طبرسی نے بھی اُسے بطور نقل قول درج کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٣٥﴾ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ  
وَسِرًا جَانِبِيًّا ﴿٣٦﴾ وَبَشِيرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ﴿٣٧﴾ وَلَا تُطِيعِ

الْكُفْرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذُنَهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٣٨﴾

”اے پیغمبر! یقیناً ہم نے آپ کو بھیجنا ہے گواہ بنا کر، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا، دعوت دینے والا اللہ کی طرف اُس کے حکم سے اور ایک روشنی دینے والا چراغ اور خوش خبری دینے والا ایمان والوں کو کہ اُن کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل و کرم ہے اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانگیے اور اُن کی ایذا رسانی کا خیال نہ کیجئے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے۔ اور اللہ کافی ہے کار سازی کے لیے“۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے کہ ہر وقت کا نبی اُس امت کے کردار کے لئے بطور گواہ قیامت میں پیش ہوگا اور ہمارے رسول اُس امت کے بھی گواہ ہیں جو اُن کے رویہ کو جو آپ کے ساتھ اور آپ کے بعد رہا اللہ کی بارگاہ میں پیش کریں گے [۵] اور آپ تمام دوسرے انبیاء پر بھی گواہ ہیں کہ اُن کی کارگزاریوں کی تصدیق فرمائیں گے اور جیسا کہ دوسرے محل پر یہ لفظ آیا ہے اس کے معنی میں نمونہ عمل بننا بھی مضر ہے، آخر میں جو ہے: دَعْ أَذُنَهُمْ جس کے معنی یہ ہوئے کہ ”اُن کی اذیت کو چھوڑیے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی طرف اعتناء کیجئے۔ [۶] جس کو ہم نے ترجمہ میں یوں ادا کیا ہے کہ ”اُن کی ایذا رسانی کا خیال نہ کیجئے“۔ پھر آخر کے جملے کی مناسبت سے اُس میں یہ پہلو بھی مضر ہے کہ اُس سے اپنے لئے یا

[۱] یعنی اللہ ان پر سلام بھیجے گا (موضع القرآن)

[۲] تحییتہم منہ تعالیٰ یوم یلقونہ سلام بلسان الملائکة (جلالین)

[۳] ای ما یجیبی بعضهم بعضاً یوم یلقون اللہ سلام (تبیان) آپس میں بھی یہی دعا اُن کی ہے اور ہوگی (موضع القرآن)

[۴] عن البراء بن عازب انہ قال یوم یلقون ملک الموت لایقبض روح مومن الا سلم علیہ (مجمع البیان)

[۵] ای شاهد اعلیٰ ائمتک فیما یفعلونہ من طاعة اللہ او معصیة لوائمان بہ او کفر بہ لیشہد لہم یوم القیامة او علیہم فاجازہم

بجسبہ (تبیان)

[۶] انظرا اعتبار بگنار ررنجانیدن ایشان را (شاہ ولی اللہ) لاجازہم علیہ (جلالین)۔

اپنے مقصد کے لئے کسی گزند کا اندیشہ نہ کیجئے۔ اللہ پر بھروسہ کیجئے اللہ کافی ہے کار سازی کے لیے۔ [۱]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ  
تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا ۖ فَمَتَّعُوهُنَّ وَسِرَّ حُوهُنَّ سِرًّا حَآ  
جَمِيلاً ﴿٢٩﴾

”اے ایمان لانے والو! جب تم باایمان خواتین سے نکاح کرو، پھر انہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ لگاؤ تو اس طرح تمہاری طرف سے ان پر کوئی عہد نہیں ہے جس کے دنوں کو تم گنو تو انہیں کچھ دے دلا دو اور انہیں مناسب طور پر رخصت کرو۔“

### طلاق کے بعد عہدہ نہ ہونے کی صورت

جب طلاق قبل دخول ہو تو وہ عورت بائنا ہوتی ہے۔ اس صورت میں نہ اس پر عہدہ کی پابندی ہے، نہ شوہر کو حق رجوع حاصل ہے لہذا اب رخصت کر دینے کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ کہ ”کچھ دے دو“ اس صورت میں ہے جب کوئی مہر مقرر نہ ہوا ہو لیکن اگر مہر مقرر ہو گیا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا جس کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ موجود ہے (وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ). (بقرہ- ۲۳۷)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي آتَيْتَ أَجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ  
مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَتِكَ  
الَّتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ ۖ وَامْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ  
أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا ۖ خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۗ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا  
عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۗ وَكَانَ  
اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٥٠﴾

”اے پیغمبر! ہم نے آپ کے لئے حلال کی ہیں آپ کی وہ بیویاں جن کے مہر آپ نے ادا کر دیے ہیں اور جو آپ کی ملکیت میں ہیں اس میں سے جو اللہ نے کفار سے حاصل شدہ اموال میں آپ کا خاص حق قرار دیا ہے اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھی کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالوں کی بیٹیاں جنہوں

نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور کوئی بھی باایمان عورت اگر وہ اپنا نفس پیغمبر کو بہہ کر دے اگر پیغمبر چاہیں کہ اُسے تعلقات ازدواجی قائم کریں، یہ بات تمام دوسرے مسلمانوں سے الگ آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہم جانتے ہیں جو ہم نے اُن پر احکام مقرر کیے ہیں اُن کی بیویوں اور مملوکہ کنیزوں کے بارے میں تاکہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

### ازدواج بصورت ہبہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی خصوصیت

اس میں تمام احکام عمومی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں مخاطب اگرچہ رسول ہیں مگر وہ حکم تمام مسلمانوں کے لئے ہے، بس ایک چیز ہے جسے کہہ دیا ہے کہ وہ صرف رسول کے لئے ہے اور لوگوں کے لئے نہیں اور اُسے آپ کا ایک اعزاز سمجھنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ دوسروں کے لئے نکاح میں جو ایجاب و قبول کے صیغے ہیں، اُن میں ہبہ کے لفظ کا استعمال درست نہیں ہے یعنی عورت یا اُس کا وکیل اگر انکحت یا زوجت کے بجائے وہبیت کا لفظ کہے کہ میں اپنے کو تمہیں ہبہ کرتی ہوں یا وکیل ہبہ کا لفظ استعمال کرے تو یہ درست نہیں ہے، اس کے علاوہ کچھ نہ کچھ مہر ہونا ضروری ہے لیکن رسول کے لئے جن کو دین و دنیا کے آقا اور مولا ہونے کی حیثیت من جانب اللہ حاصل ہے، اس کی بنا پر بنظر اعزاز عورت اگر یہ الفاظ کہے میں اپنے کو آپ کو ہبہ کرتی ہوں اور رسول اُسے منظور فرمائیں تو یہ صحت ازدواج کے لئے کافی ہے۔ دوسروں کے یہاں استحقاق کے ہوتے ہوئے عورت معاف کر دے تو کوئی حرج نہیں مگر رسول کے یہاں ازوال ہی بغیر مہر اپنے نفس کی پیش کش کر دے تو درست ہے۔ [۱] یہ پیغمبر کے خصوصیات میں سے ہے جس کی قرآن مجید میں صراحت ہے۔ [۲]

اور جناب ابن عباس نے صاف اُس کی وضاحت کی ہے۔ [۳]

اب یہ امر کہ ایسی کوئی خاتون آپ کے ازدواج میں تھیں یا حضرت گو صرف حق اس کا خالق نے دیا تھا لیکن حضرت نے اس حق کا استعمال کبھی نہیں فرمایا اور اگر کوئی خاتون اس طرح کی تھیں تو وہ کون تھیں؟ یہ تاریخی بحث ہے جس میں شدید اختلاف ہے۔ اس کا تفسیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤَيِّ إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ط وَمَنْ ابْتَغَيْتِ مِنْهُنَّ عَزَلَتْ فَلَا  
جُنَاحَ عَلَيْكَ ط ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَجْزَنَ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ  
كُلَّهُنَّ ط وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ط وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا ⑤

”آپ جسے چاہیں اُن میں سے چھوڑ دیں اور اپنے پاس رکھیں، اُسے اُن میں سے جس کو چاہیں اور جن کو الگ کر دیا ہے اُن میں سے پھر کسی کی آپ کو خواہش ہو تو آپ پر کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ صورت ہے اُس

[۱] النكاح بلفظ الهبة من غير صداق (جلالین) یعنی بغیر مہر در نکاح آید (فتح الرحمن) بخش دیوے یعنی بغیر مہر کے (شاہ رفیع الدین)

[۲] فلا تحل الهبة إلا رسول الله (علی بن ابراہیم)

[۳] روى عن ابن عباس انه لا تحل امرأة بغیر مهر وان وهبت نفسها إلا لنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاصة (تبیان).

کی کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور وہ سب اُس پر جو آپ انہیں عطا کریں رضا مند رہیں اور اللہ جانتا ہے اُسے جو تم لوگوں کے دلوں میں ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بڑا برداشت کرنے والا۔  
شان نزول جس کی الفاظ آیت سے تصدیق ہوتی ہے اور جسے علامہ طبرسی نے بھی درج کیا ہے، یہ ہے کہ بعض ازواج حضرت پیغمبر خدا ﷺ اُس آذوقہ کو جو انہیں ملتا تھا ناکافی سمجھتی تھیں اور خرچے کے لئے مزید پیسے کی طلب گار تھیں اور ان میں سے بعض نے شاید اتنی شدت اختیار کی کہ حضرت نے اُن کے یہاں جانا چھوڑ دیا اور ایک ماہ تک تعلقات ترک رکھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا يَجِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَاقِبًا ۙ

”اب اس کے بعد اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ کہ آپ اُن کے بدلے میں دوسری بیویاں اختیار کریں، چاہے اُن کا حسن و جمال کتنا ہی آپ کو پسند ہو، سو اُن کے جو آپ کی ملکیت میں ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔“

”اس کے بعد اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں“ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور اسی بنا پر دو قول ہیں ایک یہ کہ جو اقسام بیان ہو چکی ہیں، ان کے علاوہ دوسری عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں ہیں، نہ اس طرح کہ آپ مزید اضافہ کریں اور نہ اس طرح کہ انہی میں سے کسی سے علیحدگی اختیار کر کے دوسری کو حوالہ زوجیت میں لائیں۔ دوسری بس جو خواتین اس وقت آپ کی زوجیت میں ہیں انہی کو رہنا ہے نہ ان میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے، نہ تبدیلی۔ ہمارے نزدیک پہلے مفہوم کا بھی لازمی نتیجہ یہ دوسرا امر ہے اس لئے الگ الگ دو قول بیکار ہیں۔ بہر حال ایسی آیتیں جن میں پیغمبر خدا پر سختی کے ساتھ کوئی پابندی عائد کی گئی ہے یا آپ کو کسی اقدام پر روکا ٹوکا گیا ہو، انہیں ٹھنڈے دل سے غیر مسلم بھی دیکھیں تو انہیں محسوس ہوگا کہ یہ معاذ اللہ خود رسول کا کلام نہیں بلکہ اُس بالادست طاقت کی طرف سے ہے جو اُن پر حکمراں کی حیثیت رکھتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرٍ  
نَظَرٍ إِنَّهُ ۖ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا  
مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ ۖ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذَى النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا  
يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ۖ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَائِهِ حِجَابٍ ۖ  
ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۖ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ

ای من بعد النساء اللواتي احللناهن لك في قوله: ائنا احلنا لك وقيل معناه لا يجلي لك النساء من بعد نساتك اللاتي خيرتهن  
فاخترن الله ورسوله (مجمع البيان)

تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُمْ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا ۖ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ﴿٥٣﴾ إِنَّ تَبَدُّوا

شَيْئًا أَوْ تَخْفَوْهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٥٤﴾

”اے ایمان لانے والو! پیغمبر کے گھروں کے اندر نہ جاؤ جب تک کہ تمہیں بلا یا نہ جائے کھانے کی طرف، نہ یہ کہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کے پکنے کا مگر جب بلا یا جائے تو اندر جاؤ، اس کے بعد جب کھا لو تو ادھر ادھر چلے جاؤ اور نہ باتوں میں لگے ہوئے رہو، یقیناً یہ بات پیغمبر کی اذیت کا باعث ہوتی ہے مگر وہ تم سے کہتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں اور اللہ کو حق کے کہنے سے شرم نہیں آتی اور جب ان خواتین سے کوئی چیز مانگو تو ان سے پردے کے پیچھے سے مانگو یہ تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کے پاک رکھنے کا زیادہ باعث ہے اور تمہیں یہ جائز نہیں ہے کہ پیغمبر کو ایذا پہنچاؤ اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے ان کے بعد بھی کبھی شادی کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر تم نے کسی چیز کو ظاہر کر دیا تو اسے چھپاؤ بہر حال اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

ازدواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پردے کی پابندی

ان آیات پر اور ایسی متعدد دوسری آیتوں پر جو دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں موجود ہیں نظر کی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسی قوم سے سابقہ پڑا تھا جس کے افراد معمولی معمولی تہذیب و تمدن کے تقاضوں سے بھی واقف اور ان پر عامل نہ تھے۔ اب چاہے ایسے تمام افراد کو بھی ایک بڑا معزز لقب دے کر کلی طور سے ”عدول“ کی سند دے دی جائے اور انہیں رفعت کے بام بلند پر پہنچا دیا جائے مگر قرآن مجید تو ان کی پستی کردار کے نمونوں سے بھرا ہوا ہے۔

پہلی آیت کے ٹکڑے کے بعد یہ آیت کہ ”تم چاہے اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اس سے خوب واقف ہے“ بتلا رہی ہے کہ کچھ صحابہ نیت رکھتے تھے اور شاید آپس میں بصیغہ راز یہ خیال ظاہر کرتے تھے کہ بعض ازدواج رسول کو رسول کی آنکھ بند ہونے پر اپنے حوالہ عقد میں لائیں گے، اسی پر خالق نے اتنے سخت الفاظ میں تمبیہ کی ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمْ فِي آبَائِهِمْ وَلَا أَبْنَائِهِمْ وَلَا إِخْوَانِهِمْ وَلَا

أَبْنَاءَ إِخْوَتِهِمْ وَلَا نِسَائِهِمْ وَلَا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ ۗ وَاتَّقِينَ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ

كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٥٥﴾

”ان (خواتین) پر کوئی پابندی نہیں ہے ان کے باپ داداؤں کے بارے میں اور نہ ان کے بیٹوں پوتوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھائیوں اور نہ ان بھتیجیوں اور نہ ان کے بھانجوں اور نہ اپنی (قوم کی) عورتوں اور نہ اپنی مملوکہ کنیزوں کے بارے میں اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔“



## وہ محرم افراد جن سے عورتوں کے لئے پردہ نہیں

ان کے بارے میں ”کوئی پابندی نہیں“ یعنی ان سے پردے کا حکم نہیں ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر نہیں ہے حالانکہ مسلمان وہ محرم افراد میں داخل ہیں۔ تو یا یہ کہا جائے کہ چونکہ بھتیجیوں اور بھانجیوں کا ذکر ہے اور درجہ قرابت میں اوپر کی طرف چچا اور ماموں ان کے بالکل برابر ہیں، اس لئے قرآن سے بضمیمہ عقل یہ صنفیں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ [۱] مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا اس لئے کہ اگر دلیل شرعی ان کے محرم ہونے پر نہ ہو تو بھتیجے اور بھانجے کے حکم میں انہیں ملحق کرنا قیاس ہوگا جو ہمارے یہاں باطل ہے اور یا یہ کہا جائے کہ ان صنفوں کا پردے سے مشتمل ہونا قرآن سے نہیں بلکہ سنت سے ثابت ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ ماخذ احکام صرف قرآن مجید نہیں ہے۔ بہت سے احکام شرعیہ سنت سے ثابت ہیں۔ اس کے بعد مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ یعنی مملوک، اسے غلام و کنیز دونوں کو شامل کیا جائے تو یہ ثابت ہوگا کہ اپنے غلاموں سے بھی پردہ واجب نہیں ہے۔ مفسرین اہل سنت کے یہاں یہ تعیم ہے ہی۔ [۲]

مگر تعجب ہے کہ ان کے تنوع میں ہمارے علامہ طبرسی نے بھی یہ تعیم کر دی۔ [۳] لیکن چونکہ اس کے قبل عورتوں کا ذکر ہے کہ ”اپنی ہم قوم خواتین“ جس کے معنی یہ ہیں کہ غیر اقوام کی خواتین سے بھی پردہ کرنا چاہئے اور اس کے بعد بلافاصلہ وَلَا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ ہے تو بعید نہیں کہ مملوک سے مراد کنیزیں ہوں یعنی عورتوں کی جنس میں ان سے پردہ نہیں ہے۔ اگرچہ غیر مسلم ہوں چنانچہ اکابر علمائے شیعہ کے نزدیک ترجیح اسی قول کو ہے کہ اگر مملوک عورتوں کی صنف سے ہے تو پردہ نہیں ہے لیکن مرد یعنی غلام ہو تو پردہ اس سے لازم ہے۔ [۴]

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا

تَسْلِيمًا ﴿۵۶﴾

”یقیناً اللہ اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں پیغمبر پر، اے ایمان لانے والو! تم بھی اُن پر درود بھیجو اور سلام جو حق ہے سلام بھیجئے گا۔“

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کی تعلیم

صلوٰۃ جس کا ترجمہ ہم ”درود“ کرتے ہیں ایک ہی ہے مگر اللہ اور ملائکہ اور انسانوں کی طرف انتساب سے حقیقت اُس کی مختلف ہو جاتی ہے۔ اللہ اور ملائکہ کی طرف سے اُس کے معنی ہیں رحمتوں کا نازل کرنا جس میں بس یہ فرق ہے کہ اصل مرکز رحمت اللہ ہے اور فرشتے اُس کی رحمتوں کے پہنچانے والے ہیں جیسے توفیق کی نسبت قرآن مجید میں اللہ کی طرف بھی ہے اور فرشتوں کی طرف بھی مگر اصل فاعل اُس کا اللہ ہے اور

[۱] المرید کر العم و الخال لانه مفهوم من الكلام لان قرابهم واحدة (تبیان)

[۲] من الاماء والعبید ان یروھن ویعلموھن من غیر حجاب (جلالین)

[۳] من السید والاماء (مجمع البیان)۔

[۴] قال قوم من النساء والرجال وقال آخرون من النساء خاصة وهو الاصح (تبیان)

واسطہ وقوع اُس کا فرشتے ہیں، اُسی طرح یہاں بھی ہو سکتا ہے مگر ہم؟ ہمارے اختیار میں بس دعائے رحمت ہے جس کا اظہار ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ اللہم صل علی محمد وال محمد یا اس کے ساتھ اور مزید الفاظ شامل کر کے جو شیعہ اور سنی دونوں فریقوں کے یہاں وارد ہیں۔ ایک تصویر یہ ہے کہ ملائکہ کی طرف بھی صلوة کا انتساب دعائے رحمت ہی کے لحاظ سے ہے۔ [۱] جو بعید نہیں ہے۔

آخری جز: **وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا** کے معنی صلوة کی مناسبت سے ذہن میں سلام کے آتے ہیں جیسا کہ ہم نے بھی ترجمہ کیا ہے مگر ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ **وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا** کا مطلب یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرو اور صدق دل سے انہیں قبول کر کے اُس کے تقاضوں پر عمل کرو۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں یہ جملہ بلاشبہ اسی معنی میں آیا ہے:-

لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا  
وہ مومن قرار نہیں پائیں گے جب تک کہ اپنے درمیان کی تمام نزاعوں میں آپ کا فیصلہ کرنے والا قرار نہ دیں اور پھر جو آپ فیصلہ کریں اُس سے یہ اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور جو حق ہے سر تسلیم خم کرنے کا اُس طرح تسلیم کریں۔ (نساء۔ ۶۵)

**إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ  
عَذَابًا مُّهِينًا ﴿۵۸﴾ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا  
فَقَدْ احْتَمَلُوا جَهَنَّمَ أَجْرًا ۗ وَاللَّهُ مُبِينٌ ﴿۵۹﴾**

”یقیناً وہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر کو اذیت پہنچاتے ہیں، اُن پر اللہ نے دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور اُن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار رکھا ہے اور وہ جو با ایمان مردوں اور با ایمان عورتوں کو اذیت دیتے ہیں بغیر کسی جرم و خطا کے جو انہوں نے کیا ہو، وہ بے شک ایک بڑے بہتان اور کھلے ہوئے گناہ کا بار اٹھاتے ہیں“۔

**خدا اور رسول ﷺ کو ایذا پہنچانے پر لعنت**

ایذا اگر بدگوئی اور الزامات بے جا کی صورت سے ہو تو وہ داخل بہتان ہوگی اور عملی ایذا ہے تو بہر حال گناہ عظیم ہوگی۔ غور کیا جائے تو لعن بالکل صلوة کے مقابل کی ہی چیز ہے جس کی نسبت اللہ ملائکہ اور انسانوں کی طرف انہی حیثیتوں سے ہوگی جن کا بیان صلوة کے ذیل ہو چکا ہے۔ وہاں جیسے رحمت کا نزول کرنا ہے، یہاں رحمت سے دور کرنا ہے اور وہاں جیسے دعائے رحمت ہے، یہاں اُس کے مقابل کی بددعا ہے۔ [۲]

**يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ  
جَلَابِئِهِنَّ ۖ قُلْ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذِينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۵۹﴾**

[۱] صلوة الملائكة عليه مسئلتهم الله تعالى (تبیان)

[۲] معنی لعنہم اللہ ای حل بہم وبال اللعن بالا بعدا من رحمة اللہ وقول القائل لعن اللہ فلانا معناہ الدعاء علیہ بالا بعدا من رحمة (تبیان)

”اے پیغمبر! کہہ دیجئے اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہ اپنے سر پر سے گھونگھٹ لٹکالیا کریں اپنی چادروں کا۔ یہ زیادہ مناسب ذریعہ ہے اس کا کہ اُن کی پہچان ہو جائے تو انہیں ایذا نہ دی جائے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان“۔

### خواتین کے چہرے کے پردے کا حکم

یہ حکم کہ سر پر سے گھونگھٹ نکال کر چادروں کو لٹکالیا کریں، پردے میں چہرے کے چھپانے کا حکم ہے جس کے بعد پردے سے چہرے کو منٹنی کرنا غلط معلوم ہوتا ہے چنانچہ علمائے تفسیر نے بھی عموماً اس کی تشریح میں چہرے کے چھپانے کا ذکر صراحتاً کیا ہے۔ [۱] ”یہ ان کے پہچاننے کا ذریعہ ہے“ یعنی یہ اُن میں اور بازاری عورتوں میں امتیاز کا باعث ہے جس کی وجہ سے بد معاش لوگ انہیں چھیڑنے کی ہمت نہ کریں۔ ”بخشنے والا ہے، بڑا مہربان“ یعنی اب تک جو ہوا وہ ہوا، اس کی سزا دی نہ جائے گی۔ [۲] مگر اب سے اس کی پابندی لازم ہے۔

لَيْسَ لَكُمْ يَنْتَه الْمُنْفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ  
لَنْغَرِيْبَكْ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيْلًا ۝ مَلْعُوْنِيْنَ ۝ اَيْنَمَا تُقِفُوْا  
اُخِذُوْا وَقْتِيْلًا ۝ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الدِّيْنِ خَلَوْا مِنْ قَبْلِ ۝ وَلَنْ تُجَدَّ لِسُنَّةِ  
اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

”اگر باز نہ آئے منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینے میں غلط افواہیں پھیلانے والے تو ہم آپ کو اُن کے خلاف حرکت میں لے آئیں گے، پھر وہ اس (مدینے) میں آپ کے پاس نہ رہ سکیں گے مگر بہت کم۔ وہ مور و لعنت ہیں جہاں بھی وہ پائے جائیں پکڑے جائیں اور پوری طرح قتل کیے جائیں جیسا ہوا اُن کے بارے میں جو ان سے پہلے تھے اور اللہ کے طریقہ کار میں بھی تبدیلی نہ پاؤ گے“۔

منافقین کے ساتھ ”اور“ ”اور“ کہہ کے جن کا ذکر ہے، بظاہر یہ الگ الگ جماعتیں نہیں ہیں بلکہ منافقین ہی ہیں جن کا متعدد اوصاف کے لحاظ سے تعارف کرایا گیا ہے کہ اُن کے دلوں میں بیماری ہے اور وہ بہت بڑی بیماری یہی نفاق ہے اور اب اس بیماری کے نتیجے میں اُن کا یہ کردار ہے کہ وہ مدینے میں غلط افواہیں پھیلاتے ہیں، انہی کو کہا جا رہا ہے کہ یہ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو کھلے ہوئے کفار و مشرکین کے ساتھ ہو چکا ہے [۳] اور اسی کو اللہ کا وہ طریقہ کار کہا گیا ہے جو تبدیل نہیں ہوتا۔ [۴]

[۱] قال الحسن الجلابيب اللاحف ستدليها المرأة على وجهها (تبيان) الجلابيب خمار المرأة الذي يعطى راسها ووجهها اذا خرجت لحاجة (مجمع البيان) اي يوضين على الوجوه اذا خرجن (جلالين) بدوگنزارند خود چادر پائے خود (شاه ولی اللہ)

[۲] غفور الماسلف منهم من ترك التستر حياءً بهن اذسترهن (جلالين)

[۳] هم المنافقون الذين كانوا اير جفون في المدينة بالاخبار الكاذبة المضعفة لقلوب المسلمين (مجمع البيان)۔

[۴] الطريقة التي اجرها بامر الله تعالى فاضيف اليه لانه فعلها بامر الله (تبيان)

يَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ

السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ﴿٣٣﴾

”آپ سے لوگ قیامت کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہیں کہ اس کا علم بس اللہ کے پاس ہے اور آپ کو کیا خبر؟ ممکن ہے قیامت نزدیک ہی ہو۔“

### قیامت کا علم اللہ سے مخصوص

اس سے اور نیز بعض دوسرے آیات سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن کا علم تعین کے ساتھ اللہ نے اپنی کسی مخلوق کو نہیں دیا ہے اور اس سے ایک وسیع بحث میں نقطہ حقیقت کا پتہ چلتا ہے اور وہ انبیاء و مرسلین کے لئے علم غیب کی بحث ہے۔ نقطہ حقیقت یہ ہے کہ بعطائے الہی علم غیب انبیاء و ائمہ کے یقیناً حاصل ہوتا ہے جس کا شاہد ایک تو خود لفظ نبی ہے جس کے معنی ہی خبر دینے والے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ انبیاء کے ذمے جو خبر دینا تھا، وہ مشاہدات کی خبر نہ تھی۔ یہ غیب ہی کی خبریں ہوتی تھیں جو انبیاء کی زبانی خلق تک پہنچتی تھیں اور اسی بناء پر ہمارے رسول کے القاب میں بشیر و نذیر ہے جس کے دونوں جز صراحتاً قرآن مجید میں موجود ہیں۔ یہ بشارت اور انداز دونوں اخبار بالغیب کے دو شعبے ہیں اور یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ انبیاء دوسروں کو کیوں کر خبر دے سکتے تھے اگر اللہ کی طرف سے انہیں ان باتوں کا علم عطا نہ ہوتا لہذا سب کچھ کے طور پر انبیاء سے علم غیب کی نفی تو انکار نبوت کی مراد ہے لیکن یہ اطلاع ان کو بعطائے الہی ہوتی تھی، لہذا اللہ کی مصلحت جس غیب کو پردے میں رکھنے کی ہو، اُس پر انہیں دسترس نہیں ہو سکتا۔ اس کے بھی بہت سے شواہد قرآن وحدیث میں موجود ہیں، جس کے بعد بعض افراد کا یہ جملہ تو بالکل بے معنی قرار پاتا ہے کہ حضرات معصومین کو تمام باتوں کا ”علم حضوری“ ہوتا ہے یہ افراد درحقیقت علم حضوری کے معنی سے واقف نہیں ہیں۔

ان امور میں جو خدا نے کلیتہً پردہ غیب میں رکھے ہیں، قیامت کے دن کا تعین کے ساتھ علم ہے جو اس آیت سے صراحتاً ثابت ہے اور جب حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کو جن کے علم کی وسعت یقیناً: بلا استثناء تمام حلقہ معصومین میں سب سے زیادہ تھی، یہ علم اُس نے عطا نہیں فرمایا تو اور کون ہو سکتا ہے جسے یہ علم حاصل ہو۔ اسی لئے کہہ دیا گیا ہے: کذب الوقانون یعنی ”جھوٹے ہیں وقت مقرر کرنے والے“ اس طرح جو پیش گوئیاں قیامت کے متعلق وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں، وہ بلاشبہ جھوٹ ہی ہوا کرتی ہیں، اُن کی سچائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكُفْرِينَ وَاعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ﴿٣٤﴾ خُلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا

وَلَا نَصِيرًا ﴿٣٥﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَلَيِّنَّا أَطَعْنَا اللَّهَ

وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ ﴿٣٦﴾ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا

السَّبِيلَ ﴿٣٧﴾ رَبَّنَا أَرْبَابَهُمْ ضَعَّفْنَا مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَاهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ﴿٣٨﴾

”بلاشبہ اللہ نے مورد لعنت قرار دیا ہے کافروں کو اور اُن کے لئے ایک بھڑکتی آگ تیار رکھی ہے جس میں وہ ہمیشہ

ہمیشہ رہیں گے۔ نہیں پائیں گے کوئی دوست اور نہ مددگار، جس دن اُن کے چہرے آگ میں اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے، وہ کہیں گے کاش ہم اللہ کی اطاعت کرتے اور پیغمبر کی اطاعت کرتے اور انہوں نے کہا پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انہوں نے ہم کو صحیح راستے سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار! انہیں دہری سزا دے اور انہیں بڑی لعنت میں گرفتار فرما۔“

”اُن کے چہرے آگ میں اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے“ اس کا ایک مفہوم یہ نکالا گیا ہے کہ شدت تکلیف اور درد و الم سے چہروں کے رنگ میں بار بار تبدیلی ہو رہی ہوگی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جیسے کباب کی سیخ آگ پر اٹھی پٹی جاتی ہے تاکہ حرارت آتش اپنا پورا اثر کرے، وہی کیفیت اُن کی سمجھنا چاہئے۔ [۱] آخری الفاظ سے ظاہر ہے کہ دنیا میں جن کے ساتھ بڑی عقیدتیں تھیں، آخرت کی منزل میں اُن کے پیر و اُن پر لعنت کر رہے ہوں گے۔ کاش دنیا ہی میں سوچ سمجھ کر اُن کے پیچھے چلے ہوتے اور اللہ نے جن کو شروع ہی سے اُن کے اوصاف و کردار کی وجہ سے مورد لعنت قرار دیا تھا، اُن کو دنیا ہی میں مستحق لعنت سمجھ لیتے۔

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَى فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ط وَكَانَ**

**عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا ﴿١٩﴾**

”اے ایمان والو! اُن لوگوں کی طرح نہ ہو تو جنہوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی تو اللہ نے انہیں بری ثابت کیا اُس سے جو انہوں نے کہا تھا اور وہ اللہ کے یہاں آبرور کھنے والے تھے۔“

حضرت موسیٰ پر کیا اتہام لگا تھا جس سے اللہ نے انہیں بری ثابت کیا؟ اس کے لئے ایک روایت اہل سنت کے صحاح میں بھی ہے اور شیعہ طریق روایت سے بھی وارد ہوئی ہے۔ [۲] یہ اور بات ہے کہ ہمارے دور کی عقل اُسے خلاف فطرت کہہ کے قبول نہ کرے اور سچ پوچھتے تو ہماری عقل کو بھی جلالتِ شانِ رسول کے کچھ خلاف محسوس ہونے کی بنا پر اُس کے قبول کرنے میں تاہل ہے وہ یہ ہے کہ خود حضرت موسیٰ کا دستور تو یہ تھا جو اُن کے شانیاں شان یہ ہے کہ وہ نظرِ خلّاق سے الگ جا کر غسل فرماتے تھے مگر چونکہ بنی اسرائیل عموماً ملاء عام میں برہنہ غسل کرنے کے عادی تھے تو انہوں نے جناب موسیٰ کے تنہائی میں غسل کرنے سے یہ ہوا اڑادی کہ ان میں جسمانی نقص ہے، اس لئے وہ سب کے سامنے برہنہ نہیں ہوئے۔ اس کی صفائی کے لئے قادرِ مطلق نے یہ انتظام کیا کہ ایک دن نہاتے وقت حضرت موسیٰ نے اپنے کپڑے اتار کر جس پتھر پر رکھے تھے، وہ پتھر ان کے نہانے کی حالت میں وہاں سے ہٹ کر ایسی جگہ پہنچ گیا جو عام نگاہوں کے سامنے تھی۔

حضرت موسیٰ مجبوری اپنے کپڑے لینے کے لئے اُس پتھر کی طرف گئے تو بنی اسرائیل کو پتہ چل گیا کہ اُن کا تصور بے بنیاد تھا جس کے بعد اُن کی زبان بندی ہوگئی اور حضرت موسیٰ جس طرح تنہائی میں غسل فرمایا کرتے تھے، اُسی طرح پھر غسل فرمانے لگے۔ جناب شیخ الطائفہ کے

[۱] معناه تقلّب وجوہ ہؤلاء۔ فتسودّوا تصفّروا تصیر کالحیة۔ وقیل معناه تنفّل وجوہہم من جهة الی جهة فی النار فیكون ابلغ فیما یصل الیہا من العذاب (تبیان)

[۲] حدیثی ابی عن النضر بن سوید عن صفوان عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ رضی اللہ عنہ (علی بن ابراہیم)

کلام سے بھی اس کی قبولیت اور عدم قبولیت میں تامل ظاہر ہوتا ہے۔ [۱]

انہوں نے اس کے علاوہ آیت کے پس منظر میں ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جناب موسیٰ کو متہم کیا کہ ہارون کو معاذ اللہ انہوں نے قتل کیا۔ خداوند عالم نے اُن کی طرف سے صفائی کا ثبوت دینے کے لئے حضرت ہارون کو دوبارہ زندہ کیا اور انہوں نے بتایا کہ وہ بحکم خدا اپنی طبیعتی موت کے ساتھ دنیا سے اٹھے۔ جناب موسیٰ پر اس کی ذمہ داری کوئی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ بھی قول ہیں جنہیں علامہ طبرسی نے نقل کیا ہے لہذا وثوق کے ساتھ اصل واقعہ کی تعیین نہیں ہو سکتی اور عملی طور پر ہماری لئے نتیجہ خیز یہ ہے کہ تم اُن کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰ کو اذیت دی تھی اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی ہر ہر فرد کو یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس کا کوئی قول یا فعل اپنے پیغمبر کی ایذاء کا باعث نہ ہو۔ یہ ہماری زندگی سے متعلق چیز ہے۔ موسیٰ کی قوم والوں نے موسیٰ کو خاص اذیت کیا دی تھی؟ یہ ہماری تاریخی معلومات میں اضافہ کا سبب ہو سکتا ہے۔ اُس کے پورے طور پر سمجھنے سے ہماری عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۗ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ**

**وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝۴۱**

”اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کہا کرو، وہ تمہارے لئے تمہارے کاموں کو درست کرے گا اور تمہارے لئے تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے، اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔“

عام حکم یہی ہے کہ ”ٹھیک بات کہا کرو“ اس سے خارج کچھ صورتیں بطور مستثنیات ہو سکتی ہیں جن میں نمایاں محل تقیہ کا ہے مگر ہماری قوم کے بعض افراد نے جو اندھا دھند محل تقیہ کا قرار دے لیا ہے کہ کچھ لوگ خفا ہو جائیں گے جن سے ان کے کچھ منافع وابستہ ہیں، عوام ناراض ہو جائیں گے، کسی عزیز یا دوست کی دل شکنی ہوگی اگر صحیح بات کہہ دی جائے تو اس غلط استعمال نے مخالفین تقیہ کو تقیہ کے بدنام کرنے کا موقع دے دیا ہے۔ یہ اصول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقیہ دفع ضرر کے لئے ہو سکتا ہے جب منفعت کے لئے نہیں، ضرر میں بھی موازنہ کرنے کی ضرورت ہے کہ کتنا حق کی مضرت زیادہ ہے یا وہ ضرر جو اظہار کی صورت میں ہوگا۔ بغیر اس کا موازنہ کیے ہوئے آنکھ بند کر کے اس کا استعمال تقیہ نہیں بلکہ حکم تقیہ کا مذاق اڑانا ہے۔

**إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا**

**وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۗ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝۴۲ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ**

**الْمُنْفِقِينَ وَالْمُنْفِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ**

**وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۴۳**

[۱] اجاز البلخی حدیث الصخرۃ۔ وقال قوم ذلك لا يجوز لائن فيه اشتهاز النبي سوء ته على رءوس الاشهاد (تبیان)

”ہم نے اس امانت کو پیش کیا آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے تو انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا اور اُس سے خوف زدہ ہو گئے اور انسان نے اسے برداشت کر لیا، بلاشبہ وہ بڑا ظالم ہے، بڑا نادان تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے اور با ایمان مردوں اور با ایمان عورتوں پر نظر توجہ مبذول فرمائے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان“۔

”امانت“ بظاہر تکالیف شرعیہ کی ذمہ داری ہے۔ [۱] جسے فطرت انسانی نے صلاحیتوں کے اعتبار سے قبول کیا اور ظالم و جاہل اس اکثریت کے اعتبار سے کہا گیا ہے جو باوجود صلاحیت کے مقام عمل میں اُس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا [۲] اور ایک تصور یہ ہے کہ ظلو م و جھول کا لفظ مقام مذمت میں نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے کہ اس نے اس ذمہ داری کے بار کو برداشت کر کے کتنا اپنے کو زحمت میں ڈال دیا۔ [۳]

سوال و جواب کی نوعیت کے متعلق جناب شیخ الطائف نے شعرائے عرب کی نظیریں پیش کر کے اس کی وضاحت کی ہے کہ آسمان اور زمین وغیرہ جو بے جان ہیں، انہیں امانت کے پیش کرنے میں مخاطب کیوں کر بنایا جاسکتا ہے۔ اُن نظیروں سے ظاہر ہے کہ وہاں کوئی زبانی سوال و جواب نہیں ہوتا بلکہ یہ خطاب کسی حقیقت کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی کسی وقوع میں آنے والی مقام خارج میں روند کا بیان نہیں ہے کہ ہم نے آسمان اور زمین کے سامنے کسی خاص وقت لفظی طور پر اس ذمہ داری کو پیش کیا، انہوں نے انکار کیا اور انسان نے اُسے قبول کر لیا، اسکے بعد جملہا کے معنی میں جس کا ترجمہ عموماً ہوتا ہے، برداشت کیا یا اٹھالیا، ایک قول اُنہوں نے یہ درج فرمایا ہے کہ حمل امانت کے معنی اُس امانت میں خیانت کرنے کے ہوتے ہیں۔ [۴] جس میں ضمنی طور پر جنات کو بھی نصوص قرآنی کی بناء پر داخل کرنا پڑے گا باقی کائنات میں کافر و نافرمان کا وجود نہیں ہے کیوں کہ اُن سب کی اطاعت احکام تکوینیہ کے ماتحت فطری طور پر ہے۔ انسان ہی بس ایسا ہے کہ اسے اختیاری اطاعت کرنا تھی، اس لئے اس میں اکثریت اس دین فطرت سے منحرف ہے اور بس ایک اقلیت ہے جو اُس پر قائم و برقرار رہتی ہے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اکثریت جو منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کی ہے، مبتلائے عذاب ہوتی ہے وہ اقلیت جو مؤمنین و مومنات کی ہے نجات یافتہ ہوتی ہے۔

[۱] یعنی استعداد تکلیف باو امر و نواہی (فتح الرحمن)

[۲] یعنی بالفعل عدالت و علم نادر و قابلیت آنہارا دارد (شیخ الرحمن) الانبیاء والاولیاء والمؤمنون عن عموم هذه الآية خارجون (مجمع البیان)

[۳] ظلوم امان نفسه بما حمله (جلالین) یعنی اپنی جان پر ترس نہکھایا (موضح القرآن)

[۴] اقلیل معنی حملہا الانسان ای خانہا (تبیان)

# سُورَةُ سَبَا

مکیہ --- ۵۴ --- آیات

چونکہ ملک سبا کے باشندوں پر انعامات خداوندی اور اُن لوگوں کے کفرانِ نعمت کا ذکر اس سورے میں ذرا تفصیل کے ساتھ ہے جو کسی دوسرے سورے میں نہیں ہے، اس لئے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

**سورہ سبا کے خاص خاص مضامین:**

- ۱۔ حضرت داؤد کے لئے لوہے کا نرم ہونا۔
- ۲۔ تخت سلیمان کی آمدورفت کا پیمانہ اور جنات کی اُن کے لئے مختلف اشیاء کی صنایع۔
- ۳۔ شکر گزاروں کی قلت۔
- ۴۔ عصائے حضرت سلیمان کا دیمک کی نذر ہونا اور اُس سے اُن کی وفات کا حال معلوم ہونا۔
- ۵۔ یہ کہ اہلیس کی دوسرہ انگیزی انسان کے لئے بحد جبر نہیں اور اُس سے متاثر ہونے نہ ہونے کا یقین آخرت پر انحصار۔
- ۶۔ قرآن مجید کا انتہائی روادارانہ اعلان ”یا ہم گمراہ یاتم“ ”یا ہم ہدایت یافتہ یاتم“۔
- ۷۔ مزید رواداری کا مظاہرہ کہ ہمارے جرائم کے تم ذمہ دار نہیں اور جو تم کرو اُس کے ذمہ دار ہم نہیں۔
- ۸۔ رسالت پیغمبر اسلام کی ہمہ گیری کے اعلان کے ساتھ تم رسالت کا ثبوت۔
- ۹۔ اموال اور اولاد کے ساتھ حسن عمل کی قدر و قیمت میں اضافہ۔
- ۱۰۔ اجر رسالت کی طلب مگر فائدہ اُس کا افراد امت ہی کے لئے۔

**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ**

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ط  
وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ① یَعْلَمُ مَا یَلْجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ

مِنَ السَّمٰوٰتِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ط وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ②

”سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اُسی کی تعریف



ہوگی آخرت میں اور وہی حکمت والا ہے، بڑا باخبر جانتا ہے اُسے کہ جو زمین کے اندر جاتا ہے اور جو اس سے باہر نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور وہ مہربان ہے، بڑا سختی والا۔  
 ”جو زمین کے اندر جاتا ہے“ جیسے آب باران اور ”جو اس سے باہر نکلتا ہے“ از قسم نباتات پھر ”جو آسمان سے اترتا ہے“ وہ بھی آب باران ہے اور ”جو اُس میں چڑھتا ہے“ وہ بندوں کے اعمال ہیں۔<sup>[۱]</sup> بعض نے کہا ہے کہ آسمان پر چڑھنے والے جو ہیں، وہ فرشتے ہیں<sup>[۲]</sup> اور کوئی حرج نہیں کہ اس کے عموم میں دونوں کو داخل سمجھا جائے جیسا کہ بعض کا رجحان ہے۔<sup>[۳]</sup>

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۗ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ ۗ عِلْمِ  
 الْغَيْبِ ۗ لَا يُعْزِبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ  
 مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝۳ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا  
 الصَّالِحَاتِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ ۖ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝۴ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا  
 مُعْجِزِينَ ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رَّجْزِ الْيَوْمِ ۝۵

”اور کافر لوگوں کا قول ہے کہ قیامت ہمیں کبھی درپیش نہیں ہوگی، کہنے کہ کیوں؟! وہ ضرور تمہارے سامنے آئے گی قسم میرے پروردگار کی جو غیب کا جاننے والا ہے اس کی نظر سے اوجھل نہیں ایک ذرہ بھر بھی آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ کوئی اُس سے چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی مگر یہ کہ وہ ایک روشن نوشتے میں محفوظ ہے تاکہ وہ بدلادے انہیں جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے رہے، یہ ہیں وہ جن کے لئے بخشش ہے اور باعزت روزی اور جو ہماری آیتوں کے مقابلہ کی کوشش کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لئے سخت قسم کی دردناک سزا ہے۔“

قیامت کے ذکر کے ساتھ علم الہی کا بیان کہ وہ ایک ایک ذرہ سے واقف ہے، جیسے ہر دور والے بعض فلسفیوں کے اس اعتراض کا جواب ہے جو انداز بدل بدل کے پیش کیا گیا ہے اور اُس کی اُن کے خیال میں بڑی ”عقدہ مالاً ینحل“ ہونے والی تقریر وہ ہے جو ”ہبہ آکل وما کول“ کے نام سے مشہور ہے اور اُسی کو اُن پڑھ جاہل قسم کے عرب محسوس شکل میں پیش کرتے تھے کہ کہیں سے بہت بوسیدہ ہڈیاں لاکرا نہیں ریزہ ریزہ کر دیتے تھے اور کہتے تھے جب ہم اس طرح سڑگل گئے اور ریزہ ریزہ ہو گئے تو بھلا کون وہ ہو سکتا ہے جو انہیں از سر نو پہلی ہی ترتیب کے مطابق عالم ظہور میں لے آئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں میں یہ امتیاز کہ کون کس جسم کا جز تھا؟ ہمارے لئے ناممکن ہے کہ ہمارا علم محیط نہیں ہے مگر عالم الغیب کے لئے جو ہر ذرے سے واقف ہے ملے جلے ہوئے مختلف اجسام کے ذرات میں یہ مشخص کرنا کہ کون کس کا اصل جز ہے؟ عقلی طور پر بالکل دشوار نہیں ہے۔

[۱] ما یدخل فیہا وما ینزل من السماء یعنی المطر وما ینخرج منها قال الثبات وما یرجع فیہا یعنی اعمال العباد (علی بن ابراہیم)

[۲] ما یرجع فیہا من ملک (تبیان)

[۳] ما یرجع ای یصعد فیہا من الملائکة واعمال العباد (مجمع البیان)

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِينَ أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ ۖ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿٦﴾

”اور جنہیں علم عطا ہوا ہے، وہ سمجھتے ہیں اُسے جو آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے کہ وہ حق ہے اور وہ رہنمائی کرتا ہے صاحب عزت تعریفوں کی مستحق ذات کے راستے کی طرف“۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَى رَجُلٍ يُتَّبِعُكُمْ إِذَا مَرَّكُمْ كُلٌّ مِمَّزَّقٍ ۖ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿٧﴾ أَفَتَزَيَّ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ ﴿٨﴾

”اور کافر لوگ ”آپس میں“ کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہیں بتائیں ایسا آدمی جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ اُس وقت جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے کہ تم از سر نو پیدا ہو گے۔ کیا یہ اللہ پر جھوٹ تہمت لگاتا ہے یا اس میں دیوانہ پن ہے بلکہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے عذاب اور سخت گمراہی میں ہیں“۔

أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ نَشْأَ تَخْسِفُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نَسْقِطُ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ ﴿٩﴾

”تو کیا انہوں نے نہیں دیکھا اُسے جو اُن کے سامنے اور اُن کے پیچھے ہے آسمان اور زمین؟ اگر ہم چاہیں تو اُن کے ساتھ ایسا کریں کہ زمین ایک دم دھنس جائے یا اُن پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں، یقیناً اُس میں نشانی ہے، اُس بندے کے لئے جو اُس کی طرف لو لگانے والا ہو“۔

یعنی ہماری قدرت کی طرف نظر کریں تو اُن کو ہماری باتوں کے جھٹلانے کے انجام سے ڈرنا چاہئے۔ [۱] علامہ طبرسی نے اس میں گذشتہ آیات کے ساتھ ربط پیدا کرنے کے لئے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ اس پر نظر کرتے تو سمجھتے کہ ہم مردوں کے زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں، اس کا انکار نہ کرتے۔ [۲]

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا ۗ يُجِبَالُ أَوْبِي مَعَهُ وَالطَّيْرِ ۗ وَالنَّعَالُ الْحَدِيدِ ﴿١٠﴾  
 أَنْ اِعْمَلْ سَبِغَةً وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ۖ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۗ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١﴾

[۱] افلا یحذرون هذا ویر تدعون من التکذیب بآیات اللہ (تبیان)

[۲] افلا یر تدع هؤلاء من التکذیب بآیات اللہ والانکار لقد رتہ علی البعث (مجمع البیان).

”اور بلاشبہ عطا کی ہم نے داؤد علیہ السلام کو فضیلت، اے پہاڑو! تسبیح کرو ان کے ساتھ اور پرندو اور نرم کیا ہم نے اُن کے لئے لوہا کہ بناؤ وسیع زرہیں اور کڑیوں کے جوڑنے میں تناسب کا خیال رکھو اور تم لوگ نیک کام کرتے رہو۔ میں تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہوں۔“

### حضرت داؤد کے لئے لوہے کا نرم ہونا

یہاں جناب داؤد علیہ السلام کے تین معجزوں کا ذکر ہے:-

ایک یہ کہ اُن کی صدائے تسبیح کے ساتھ پہاڑوں سے بھی صدائے تسبیح بفرمان الہی جو حکم کن کی طرح ہوتا تھا بلند ہوتی تھی۔ یہ تسبیح نہ وہ تسبیح شانی ہے جو کائنات کی ہر چیز میں مخلوق الہی ہونے کے تقاضا سے موجود ہے، ورنہ خاص داؤد کے لئے اُس کو اللہ کے حکم خاص کا نتیجہ قرار دینے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اور نہ یہ طبعی طور پر صدائے بازگشت کی قسم کی چیز ہے جو پہاڑوں کے اندر کوئی آواز بلند ہونے پر پیدا ہوتی تھی، ورنہ پھر بھی بطور خاص اللہ کے حکم تکوینی کے ذکر کا محل نہ تھا بلکہ یہ ویسی صدائے تسبیح ہے جیسی روایتوں میں ہے کہ ہمارے رسول کے ہاتھ میں آکر سنگریزے تسبیح کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ پرندے اُن کے قبضے میں تھے اور پہاڑوں پر اس کا عطف معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ ”الجبال“ کا لفظ بصورت نصب اس کے پہلے نہیں ہے۔ [۱] لہذا یہاں پر فعل کو مقدم ماننا پڑے گا جو ”مسخرنا“ ہے جو فطری طور پر یہاں سمجھ میں آتا ہے۔ [۲] لیکن بعض لوگ اسے جبال پر بلحاظ محل عطف قرار دے کر یہ معنی قرار دیتے ہیں کہ پرند بھی اُن کے ساتھ تسبیح میں مصروف ہوتے تھے۔ [۳] تیسرے یہ کہ اُن کے ہاتھ میں آ کے لوہا نرم ہو جاتا تھا۔ [۴] اور وہ بتعلیم ربانی اُس سے زرہیں بناتے تھے اور تعلیم کا اللہ کی طرف سے ہونا ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ قدرتی السرد ”زرہ کی کڑیوں میں تناسب کا خیال رکھنا۔ [۵]

وَلَسَلِّمِنَ الرِّيحِ عُدُوَّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاسَلَّمْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ط وَمِنَ الْجِبِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ط وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نَذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿١٥﴾ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَّحَارِبٍ وَتَمَاثِيلٍ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رُسِيَّتٍ ط اِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا ط وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ

[۱] ان الحمل علی لفظ المنادی شکل (تبیان)

[۲] مسخرش ساخیتہ مرغان را (شاه ولی اللہ)

[۳] عطفاً علی محل الجبال ای ودعوناها تسبیح معہ (جلالین)

[۴] افسار فی یدہ کالشمع یعمل بہ ماشاء من غیر ان یدخل النار (مجمع البیان)

[۵] اندازہ نگہدار دریافتن حلقہ ہا (شاه ولی اللہ) اندازہ رکھ ایک دوسرے کے پرونے میں (رنج الدین)

## الشُّكُورُ ﴿١٣﴾

”اور سلیمان کے قبضے میں ہم نے دیا ہوا کوجس کا صبح کا سفر ایک مہینے کی راہ کا تھا اور شام کا سفر اُس کا ایک مہینے کی راہ کا اور اُن کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ جاری کیا اور جنات میں سے کچھ ایسے تھے جو اُن کے پروردگار کے حکم سے اُن کے کارندے بنے ہوئے تھے اور جو اُن میں سے ہمارے حکم سے منحرف ہوا، ہم چکھائیں گے اُسے آگ کے عذاب کا مزہ۔ وہ اُن کے لئے بناتے تھے جو وہ چاہتے تھے محرابیں اور مجسمے اور پیالے حوضوں کے ایسے اور گڑی ہوئی دنگیں اے داؤد کے گھرانے والو! شکر ادا کرو اور میرے بندوں میں کم ہیں جو شکر گزار ہوں۔“

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ  
مِنْ سَاتِهِ ۖ فَلَمَّا خَرَ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْعَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي  
الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿١٣﴾

”تو جب ہم نے اُن پر موت کا حکم جاری کیا تو انہیں پتہ نہیں دیا اُن کے مرنے کا مگر دیمک نے جو کھا رہی تھی اُن کی لاشی کو تو جب وہ گرے تو جنات سمجھے کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت آمیز سزا میں اتنے عرصے تک نہ رہتے۔“

## دیمک سے سلیمان کی موت کا انکشاف

اس کی تفصیل مفسرین کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ وہ اپنے عصا پر تکیہ کر کے کھڑے ہوئے اور انہوں نے جنات سے کہا کہ جب تک میں کھڑا رہوں تم اس کام میں مصروف رہنا۔ جنات اُس کام میں لگ گئے اور یہاں کھڑے ہی کھڑے اُن کی روح قبض ہو گئی اور وہ اسی طرح کھڑے رہے اور جنات سرگرمی سے مصروف عمل رہے، یہاں تک کہ اتنی مدت گزر گئی کہ اُس عصا میں دیمک لگی اور اُس دیمک نے اُس عصا کو کھالیا جس سے وہ ٹیک لگائے ہوئے تھے، اور عصا ٹوٹا تو اُن کا جسم زمین پر گرا اور اب جنات کو احساس ہوا کہ یہ تو مدت ہوئی دنیا سے اُٹھ گئے اور ہم بے خبری سے بلا وجہ اس کام میں لگے رہے۔ الفاظ قرآنی اس تفصیل پر بلا تکلف منطبق ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَا فِي مَسْكِنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّاتٍ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۚ كُلُّوا مِنْ رِزْقِ  
رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ ۗ بَلَدَةٌ طَيِّبَةٌ ۚ وَرَبُّ غَفُورٌ ﴿١٥﴾ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ  
سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِ الْأَكْلِ خُمُطٍ وَأَثَلٍ ۚ وَشَيْءٍ مِّنْ  
سِدْرٍ قَلِيلٍ ﴿١٦﴾ ذَلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا ۗ وَهَلْ نُجِزِي إِلَّا الْكَفُورَ ﴿١٦﴾

”قبیلہ سبا کے لئے اُن کے بود و باش والے مقام پر ایک قدرت کی نشانی تھی، دو ۲ باغ دائیں اور بائیں کے کھاؤ

اپنے پروردگار کی طرف کے رزق سے اور اس کا شکر ادا کرو، پاک و صاف شہر ہے اور پروردگار ہے جو بخشنے والا ہے تو انہوں نے روگردانی کی تو ہم نے اُن پر زور و شور کا سیلاب بھیجا اور اُن کے اُن دونوں باغوں کے بجائے دو باغ کر دیئے، بد مزہ پھلوں اور جھاؤ کے کچھ درختوں اور بہت تھوڑی سی بیروں والے۔ یہ ہم نے اُنہیں سزا دی اس کی کہ اُنہوں نے ناشکر اپن کیا اور کیا ہم سزا دیتے ہیں ناشکرے کے سوا کسی کو۔

### ملک سبأ والوں کی ناشکری اور ان کا انجام

”کھا و پیا اپنے پروردگار کے رزق سے اور اس کا شکر ادا کرو“ ایک تصور یہ ہے کہ یہ لفظی پیغام تھا جو انبیاء کی زبانی اُن تک برابر پہنچتا رہا۔ [۱] اور دوسرا تصور ذہن میں یہ آتا ہے کہ یہ ان نعم الہی کا بزبان حال پیغام تھا جس کے لئے چشم بینا کے ساتھ گوش شنوا کی ضرورت تھی۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا قُرَى ظَاهِرَةً وَقَدَرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۗ سَيَّرُوا فِيهَا لِيَالِي وَايَّامًا اِمْنِيْنَ ﴿۱۸﴾ فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنِ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

”اور ہم نے قرار دیں اُن کے درمیان اور اُن بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت عطا کی مسلسل آبادیاں اور اُن میں آمد و رفت کا سلسلہ قائم کیا، چلو پھروان میں رات دن امن و عافیت سے تو اُنہوں نے کہا پروردگار! ہمارے سفروں میں فاصلے قرار دے اور اُنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو اُنہیں ہم نے افسانہ بنا دیا اور اُن کے پورے طور پر پر نچے اڑ دیئے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیے۔“  
یہ کفرانِ نعمت اور ظلم جس کے نتیجے میں اتنی سخت سزا دی گئی، ویسا ہی تھا جیسے بنی اسرائیل نے من و سلوٰی کے بجائے پیاز لہن وغیرہ کی فرمائش کی اور اُس پر اُن کو سخت سزا دی گئی۔ [۲]

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۗ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾

”اور سچا ثابت کر دیا اُن کی نسبت شیطان نے اپنا خیال تو انہوں نے اُس کی پیروی کی سوا ایمان والوں کی ایک

[۱] فی کلّ قرية نبی یدعوهم الی اللہ سبحانہ یقولون لهم: کلو امن رزق ربکم واشکرو له (مجمع البیان)

[۲] کہا قالت بنو اسرائیل: فادع لنا ربک ینزع لنا حما تنبت الارض الخ (تبیان)

جماعت کے اور اُسے اُن پر قابو نہیں ہو اگر اس لئے کہ ہم جائیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں ہے اور تمہارا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے۔“  
یعنی شیطان کی دسترس اللہ نے صرف اس لئے اُن پر ہونے دی کہ اُن کا امتحان ہو جائے اور مومن اور غیر مومن میں امتیاز سامنے آجائے، اُس کو یوں کہا ہے کہ ہم جائیں کون مومن ہے اور کون غیر مومن۔ [۱]

**قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ ۚ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ**

**وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهَا مِنْ شَرْكٍ ۚ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِّنْ ظٰهِيٍّ ۝۳۳**

”کہنے کہ پکارو انہیں جن کو تم سمجھتے ہو اللہ کے علاوہ، وہ نہیں قدرت رکھتے ایک ذرے بھر پر بھی آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہیں ہے ان کے لئے اُن دونوں میں کچھ شرکت اور نہیں ہے اُن کا اُن میں سے کوئی مددگار۔“

**وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ اِلَّا لِمَنْ اٰذِنَ لَهُ ۗ حَتّٰى اِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا**

**مَاذَا ۗ قَالَ رَبُّكُمْ ۗ قَالُوْا الْحَقّٰى ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝۳۴**

”اور اُس کے یہاں سفارش فائدہ نہیں دیتی مگر اُس کی جسے وہ اجازت دے، یہاں تک کہ جب اُن کے دلوں سے اضطراب دور کر دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ کیا کہا تمہارے پروردگار نے؟ وہ کہیں گے کہ اُس نے حق کہا تھا اور وہ اونچا ہے، بہت بڑا۔“

جیسا کہ متعدد مقامات پر ہم نے متنبہ کیا ہے، جب نفی شفاعت کے ساتھ بہت سی جگہ قرآن میں استثناء موجود ہے ”مگر جسے وہ اجازت دے“ جسے وہ پسند کرے“ جس سے وہ راضی ہو اور اسی طرح کے الفاظ تو اس کے بعد مطلق شفاعت کا انکار کرنا قطعاً غلط ہے۔  
یہاں جو استثناء ہے: اِلَّا لِمَنْ اٰذِنَ لَهُ، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک وہی جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے:-  
”جسے وہ اجازت دے“ اس صورت میں اذن کا تعلق شفاعت کرنے والے کے ساتھ قرار پاتا ہے دوسرے یہ کہ ”جس کے لئے وہ اجازت دے“ یعنی بد اعمالی کا درجہ ایسا نہ ہو کہ اُس کی شفاعت اللہ کو نا پسند ہو۔ اس صورت میں اذن کا تعلق اُس شخص سے ہوگا جس کی شفاعت کی جائے۔

فزع عن قلوبہم کے معنی اضطراب دور کرنے کے یوں ہیں کہ فزع (بغیر تشدید) کے معنی اضطراب کے ہیں، باب تفعیل میں لے جانے سے اُس میں دور کرنے کے معنی پیدا ہو گئے۔ [۲]

مطلب یہ ہے کہ جب احوال قیامت کے ہنگامی اثر پر کچھ وقت گزرنے سے تھوڑا دل ٹھہرے گا تو یہ سوال و جواب ہوگا۔

[۱] لنعلم علم ظہور (جلالین) فعیّر عن تمییزہ بین الفریقین بالعلم (تبیان)

[۲] فزع عن قلوبہم کشف عن قلوبہم (علی بن ابراہیم) ای کشف الفزع عن قلوبہم (جمع البیان)

اب ”وہ کہیں گے“ کون؟ ایک تشریح یہ ہے کہ فرشتے کہیں گے۔ [۱] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپس میں یہ سوال و جواب ہو۔

**قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط قُلِ اللَّهُ ۖ وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى**

**أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۲﴾**

”کہئے کہ کون تمہیں روزی عطا کرتا ہے آسمانوں اور زمین سے؟ کہئے کہ اللہ اور بلاشبہ یا ہم اور یا تم، ہدایت پر ہیں یا کھلی ہوئی گمراہی میں۔“

### انتہائی روادارانہ اعلان

یہ حقیقت حال کے بارے میں شک کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک حکیمانہ انداز ہے مخاطب کے لئے حقیقت حال پر غور کرنے کی دعوت کا جو اُسے ناگوار بھی نہ ہو۔ [۲] اور اس میں یہ ایک اصول مضمّن ہے کہ اختلاف و تصادم رائے کی شکل میں حق دونوں سمتوں میں نہیں ہو سکتا۔ ایک ہی سمت میں ہوگا۔

شاہ عبدالقادرؒ نے لکھا ہے:

”یعنی دونوں فرقے تو سچ نہیں کہتے، ایک مقرر سچا ہے، ایک مقرر جھوٹا ہے تو لازم ہے کہ سوچو اور سچی بات پکڑو، اس میں اُن کا جواب ہے جو اس زمانہ میں بعض لوگ کہتے ہیں، دونوں فرقے ہمیشہ سے چلے آ رہے ہیں، کیا ضرور ہے جھگڑنا“ (موضح القرآن)

خیر جہاں تک جھگڑنے کا تعلق ہے، اس سے تو قرآن مجید نے بھی روکا ہے لَا مَحْجَةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ط اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (سورہ شوریٰ - ۱۵) اور یہاں بھی بعد والی آیتوں کا مطلب یہی ہے مگر دونوں کا بیک وقت سچا نہ ہونا اور اس لئے بحث و نظر کی ضرورت لازمًا ثابت ہے۔

یہ بعض لوگ اب اس زمانے میں بہت بڑھ گئے ہیں جو کہنے لگے ہیں کہ مذاہب سب ایک ہی منزل تک پہنچانے والے راستے ہیں اور سب ہی ٹھیک ہیں مگر یہ خیال نہ عقلاً درست ہے اور نہ قرآن اُسے درست قرار دیتا ہے۔

**قُلْ لَا تَسْأَلُونَ عَمَّا أَجْرَمْنَا وَلَا نَسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۳۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا**

**ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ط وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿۳۶﴾**

”کہئے کہ تم سے جواب دہی نہیں ہوگی اُس کی جو ہم جرم کریں اور نہ ہم سے جواب دہی ہوگی اُس کی جو تم کرتے ہو، کہئے کہ ہم سب کو ہمارا پروردگار یکجا کریگا، پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور بڑا فیصلہ کرنے والا

[۱] قالت الملائكة (تبیان)

[۲] اتمّٰ قال \_\_\_ علی وجه الانصاف فی الحجاج دون الشک (تبیان) وقیل اتمّٰ قال علی وجه الاستعفاف والمداراة لیسع الکلام ولهذا من احسن ما ینسب به المحق نفسه الی الهدی وخصمه فی الضلال لانه کلام من لا یکشف خصمه بالتضلیل بل ینسبه الیه علی احسن وجه وبحثه علی النظر ولا یجب النظر الا بعد التردد (مجمع البیان)

ہے، جاننے والا۔“

### مزید رواداری

یہ رواداری کا انداز بھی قابل ملاحظہ ہے کہ خود اپنی طرف بطور مفروضہ بے محابا جرم کا انتساب کر دیا جاتا ہے اور فریق مخالف کے بارے میں کہنا یہی ہے کہ جو تم جرم کرو، اُس کی جواب دہی ہم سے نہ ہوگی مگر اس لئے کہ اُسے ناگوار نہ ہو اُس کی طرف جرم کی نسبت نہیں دی جاتی بلکہ ”عمل“ کا لفظ کہا جاتا ہے کہ جو تم کر رہے ہو، اُس کی جواب دہی ہم سے نہ ہوگی۔

”سب کو یکجا کرے گا“ موقف حساب میں اور پھر فیصلہ کے بعد تفریق ہو جائے گی (فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ)

**قُلْ أَرُونِي الَّذِينَ أَحَقُّتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ كَلَّا بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٤﴾**

”کہئے کہ مجھے دکھاؤ وہ جنہیں تم نے اس کے ساتھ شریک بنا کر ملایا ہے۔ حاشا کلا، وہی اللہ ہے جو عزت والا ہے،

حکمت والا۔“

”دکھاؤ“ کا یہ مطلب بھی بالکل درست ہے کہ اُن کی قدرت و طاقت کے کچھ آثار ہماری نظروں کے سامنے لاؤ اور یہ اعلان نفی کا پرزور انداز ہے یعنی اگر کہیں اُس کے شریک معبودوں کا وجود ہے تو ہمیں بھی دکھاؤ کہ اُن کے کیا کارنامے ہیں؟ پھر چونکہ وہ معبود از قبیل اجسام قرار دے رہے تھے تو خود اُن کے دکھانے کا مطالبہ بھی درست ہے۔ پھر بھی ان کی صورتوں کا دکھانا مراد تھوڑی ہو سکتا ہے یہ کونسا مشکل ہے وہ اُنکی سے اشارہ سے دکھا دیتے کہ یہ ہیں۔ اس صورت میں یہ جزء اس کے ساتھ لازمی ہے کہ اُن میں صفات الوہیت دکھاؤ کیا ہیں؟ رہ گیا خدائے حقیقی تو واقعہ یہ ہے کہ اُس کے وجود کے وہ بھی قائل تھے اور اُس کے غیب الغیوب ہونے سے بھی واقف تھے کہ وہ دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اُس کے جواب میں وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ جس خدا کو تم کہتے ہو، اگر وہ ہے تو ہمیں دکھاؤ اور آج کوئی منکر خدا بھی ہم سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ اگر وہ ہے تو ہمیں آنکھوں سے دکھاؤ، اس لئے کہ ہم جسے ”خدا“ کہتے ہیں، اس کے تصور کا جزء لازمی یہ ہے کہ وہ دکھائی نہیں دے سکتا۔

**وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا**

**يَعْلَمُونَ ﴿٢٥﴾**

”اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام نوع انسانی کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں۔“

### رسالت خاتم الانبیاء کی ہمہ گیری

یہ آیت ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے عام ہونے کی دلیل ہے کہ وہ صرف کسی ملک مثلاً حجاز اور کسی قوم مثلاً عرب کے لئے نہ تھی بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے تھی۔ اس کے ساتھ جب اس میں سے قید زمان و مکان نکال دی جائے تو اسی سے ختم نبوت کا ثبوت بھی ہو جائے گا اور حقیقت یہ ہے کہ کافۃ کے معنی میں غیر کی ضرورت نہ ہونے کا پہلو مضمر ہے کیوں کہ کف کے معنی روکنے اور باز رکھنے کے ہیں چنانچہ قدر



کفاف کے معنی ہیں ”ضرورت بھرا“ اور ٹھوس مائے کافہ وہ ہوتی ہے جو عمل سے روک دیتی ہے۔ کافہ للناس کے معنی درحقیقت یہی ہیں کہ آپ کی ذات سے نبوت و رسالت کے مقصد کی تکمیل ہوگئی۔ اب نہ اسی دور میں کسی اور نقطہ ارض پر کوئی اور نبی یا رسول ہے اور نہ آئندہ کسی دور زمانہ میں کوئی نبی یا رسول آنے والا ہے۔

**وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٩﴾ قُلْ لَكُمْ مِيعَادُ يَوْمٍ لَا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٠﴾**

”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ وعید آخر کب پورا ہوگا اگر تم لوگ سچے ہو، کہنے کہ تمہارے لئے وعدہ وعید ہے ایک ایسے دن کا جس سے نہ تم ایک گھڑی پیچھے جا سکتے ہو، نہ آگے بڑھ سکتے ہو۔“

اگر یہ آیت مقام تنزیل میں اسی جگہ کی ہے تو چونکہ بشارت کے نتیجہ میں وعدہ ثواب اور انداز میں وعدہ عذاب مضمر ہے جسے کہا گیا ہے کہ زیادہ تر لوگ جاننے نہیں یعنی اُس آخرت کے دن کا تصور نہیں رکھتے۔ [۱] تو وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ وعید جو تمہارا ہے آخر کس دن وقوع میں آئے گا؟ اس کے جواب میں جو کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وقت تو راز الہی ہے مگر ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ ٹلنے کا نہیں ہے اور وہ علم الہی میں ایسا مقرر و معین ہے کہ ایک ساعت ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ عربی کے لحاظ سے ميعاد مصدر میمی ہے جس کے معنی وعدے کے ہیں اور وہ دن قیامت کا ہے۔ [۲]

بعض جماعتوں نے ميعاد کا لفظ کے اردو معنی لے کر آیت کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ قیامت تک ایک دن کی ميعاد ہے اور پھر دن کے لئے کچھ اور آیات کے ضمیمے سے یہ کہا ہے کہ وہ ایک ہزار برس کا ہے، اس لئے دین اسلام اور امت محمدی کی عمر ایک ہزار برس ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسرا ہر آئے گا اور یہ شریعت منسوخ ہو جائے گی، یہی نہیں بلکہ اُس رہبر کا آنا ہی قیامت کا قائم ہونا ہوگا اور اسی کو قرآن میں لقاء اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہائی لٹریچر میں اس پر بڑی عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں جو قطعی بے بنیاد ہیں اس لئے کہ عربی میں ميعاد کے وہ معنی ہیں ہی نہیں جو کہ اردو میں ہیں۔

ميعاد کے معنی جیسا کہ پہلے آیا، وعدے کے ہیں اور اس طرح دن کا لفظ اس درمیانی دور کی پیمائش کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ وعدہ جس دن کا ہے اُس کی تعیین کے لئے جسے سورہ فاتحہ الکتب یعنی سورہ حمد ہی میں یوم الدین کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور دوسرے مقامات پر یوم البعث، یوم التناد، یوم الحشر، یوم الجمع بلکہ یوم الميعاد سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور وہ یوم القیامۃ ہے۔

**وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ط وَلَوْ تَرَى**

[۱] قبیل لا یعلمون ما لہم فی الآخرۃ فی اتباعتک من الثواب والنعمیم وما علیہم فی مخالفتک من العذاب الالیم (مجمع البیان)

[۲] وهو یوم القیامۃ (جلالین)

إِذِ الظُّلُمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ ۗ يَقُولُ  
الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ  
الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذٍ  
جَاءَكُمْ ۗ بَلْ كُنْتُمْ هُجْرَمِينَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا  
بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَنْ نَكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۗ  
وَأَسْرُوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۗ وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ الَّذِينَ  
كَفَرُوا ۗ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٣﴾

”اور کافروں نے کہا کہ ہم ہرگز اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اُس پر جو اس کے آگے ہے اور کاش تم دیکھتے اُس موقع کو جب ظالم کھڑے کیے جائیں گے اُن کے پروردگار کے سامنے اُن میں کا ایک دوسرے سے سوال و جواب کر رہا ہوگا، کہیں گے وہ لوگ جو دبے ہوئے تھے اُن سے کہ جو بڑے بنے ہوئے تھے۔ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ایمان لے آئے ہوتے، بڑے لوگ کہیں گے ان دبے ہوئے آدمیوں سے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت پانے سے روکا تھا جب کہ وہ تمہارے پاس آگئی بلکہ تم خود جرم کے ذمہ دار تھے اور کہیں گے جو دبے ہوئے تھے اُن سے جو بڑے تھے کہ کچھ نہیں بلکہ یہ زمانہ کانیرنگ ہے جو تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اُس کے لئے برابر دار قرار دیں اور دل میں چھپائے ہوں گے اور وہ سب پچھتاوے کو جب عذاب کو انہوں نے دیکھا ہوگا اور ہم نے زنجیریں ڈال دیں اُن کی گردنوں میں جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا۔ کیا انہیں سزا مل رہی ہے سوا اس کے جو وہ اعمال کرتے تھے۔“

یہ انسان کی عام کمزوری ہے کہ جب کچھ بن نہیں پڑتا تو وہ پوری ذمہ داری تقدیر و زمانے کی گردش پر ڈال دیتا ہے۔ یہاں بھی آخر میں یہی ہوا کہ ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہراتے ٹھہراتے آخر میں رخ مڑ گیا ہے ”زمانہ کے نیرنگ“ کی طرف مگر زمانہ کانیرنگ آدمی کو افعال کی ذمہ داری سے بری تھوڑی کر دیتا ہے اور انسان کے ضمیر کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے، اس لئے وہ لیڈر جو کہہ رہے تھے کہ ہم سے کیا مطلب؟ تم خود گمراہ ہوئے اور یہ پیر و جواب اس سب کو تقدیر کے حوالے کر رہے ہیں، اپنی جگہ سب ہی دل میں ندامت محسوس کر رہے ہیں کہ ہم یقیناً مجرم ہیں اور جو سزا مل رہی ہے، اُس کے حق دار ہیں یہ اُس وقت ہے جب اسروا کے معنی چھپانے کے ہوں اور دوسرا قول یہ ہے کہ اسروا کے معنی ہیں اظہار کرنا جس کی نظیریں بھی کلام عرب میں ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ سب ہی اب پچھتاوا ظاہر کر رہے ہیں خواہ ان باتوں کے ذریعہ سے

جو ان کی زبان پر ہیں جو خود ان کے احساس جرم کی غماز ہیں اور خواہ ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر لعنت و ملامت کے طور پر۔<sup>[۱]</sup>

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ  
كُفِرُونَ<sup>[۲]</sup> وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا ۗ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ<sup>[۳]</sup> قُلْ إِنَّ  
رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ<sup>[۴]</sup> وَمَا  
أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرَّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ  
صَالِحًا ۖ فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءٌ الضَّعْفُ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ<sup>[۵]</sup>  
وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ<sup>[۶]</sup>

”اور ہم نے نہیں بھیجا کسی بستی میں کوئی پیغمبر مگر یہ کہ وہاں کے دولت مندوں نے کہا کہ ہم اس پیغام کو جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔ نہیں مانتے اور انہوں نے کہا کہ ہم مال اور اولاد میں بڑھے ہوئے ہیں اور ہمیں کوئی سزا نہیں مل رہی ہے۔ کہنے کہ میرا پروردگار جس کے لئے چاہے رزق میں وسعت دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے مگر زیادہ تر لوگ علم نہیں رکھتے اور تمہارے مال اور اولاد تمہیں ہماری بارگاہ میں نزدیک کرنے والے نہیں ہیں مگر وہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے تو ان کے لئے بیش از بیش جزا ہے ان کے اعمال کے عوض میں اور وہ بہشت کے اونچے درجوں میں اطمینان کے عالم میں ہوں گے اور جو ہماری آیتوں کے مقابلہ کی کوشش کرتے ہیں تو یہ لوگ عذاب میں حاضر کیے جائیں گے۔“

### اموال اور اولاد کے ساتھ حسن عمل کی قدر و قیمت میں اضافہ

دولت مند لوگ اپنے مال اور دولت کو گویا اپنی حقانیت اور بے جرمی کا ثبوت قرار دیتے ہیں یعنی اگر ہم ایسے مجرم ہوتے تو جیسا کہ پیغمبر لوگ بتاتے ہیں تو ہمارے پاس یہ مال اور اولاد کی فراوانی کیوں ہوتی؟ ان آیات میں اس تصور کی رد کی جا رہی ہے یعنی مشیت الہی سے کسی کو دولت ملنا یا محروم رہنا اکثر بطور امتحان عمل ہوتا ہے جسے جاہل لوگ اللہ کی رضا اور ناراضگی کا ثبوت قرار دیتے ہیں اور یہی وہ جہالت ہے جسے کہا جا رہا ہے کہ ”زیادہ تر لوگ علم نہیں رکھتے“۔<sup>[۲]</sup> پھر اسی کو زیادہ صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ مال اور اولاد کی کثرت سبب قرب الہی نہیں ہے۔ اصل چیز انسان میں ایمان و عمل صالح ہے۔ یہ ذخیرہ جس کے پاس زیادہ ہو وہ تقرب الہی کے درجہ پر فائز ہے۔ اب اس کے ساتھ مال اور اولاد بھی ہوتو کیا

[۱] فیہ وجہان معنای اظہرو الندامة والأخران المعنی اخفوا فمن قال بالأول قال معنای اظہر المترفون الندامة علی الاضلال و اظہر الاتباع الندامة علی الضلال وقیل معنای اقبل بعضهم علی بعض یلومہ ویظہر ندمہ (مجمع البیان)

[۲] ان الاموال والاولاد عطاء من الله سبحانه یتحقق به الشکر علیہ ولیس ذلك الا کرام والتفضیل (مجمع البیان)

کہتا اور یہ انہیں بھی عمل صالح کے ذخیرہ میں اضافہ کا باعث بنا لے تو وہ مال اور اولاد بھی بالواسطہ قرب الہی کا ذریعہ بن جائیں گے۔  
اس عمل صالح کی بنا پر جو اُس نے اُن کے ذریعہ سے انجام دیا اور اس لئے اموال اور اولاد کے باعث تقرب ہونے کی نفی میں اس کا بطور استثناء اظہار کیا (لَا مَنَ اَمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا)

اب ان افراد کے لئے جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کا جوہر رکھتے ہیں، ارشاد ہے کہ ان کی کارگزاری کے صلے میں جَزَاءُ الضَّعْفِ ہے جس کا ترجمہ ہم نے دونی جزاء نہیں کیا باوجودیکہ ضَعْف کے ظاہری معنی دو نے کے ہیں۔ اس لئے دونی کہنے سے جزا کی زیادتی محدود ہو جاتی حالانکہ اعمال خیر کی جزاء تو بنص قرآن کم از کم دس گنی ہوتی ہے اور مال کے ذریعہ سے جو نیک عمل ہوتا ہے یعنی راہ خدا میں انفاق، اس کے لئے بھی تو سات سو گنے کا اعلان کیا گیا اور اس کے بعد کہا گیا: (وَ اللّٰهُ يَضْعَفُ لِمَنِ يَشَاءُ) اللہ جسے چاہتا ہے اور زیادہ عطا کرتا ہے۔ (۲۶۱)  
ہمارا ترجمہ ”بیش از بیش“ ان تمام صورتوں کو سمیٹ لیتا ہے۔

**قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۗ وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ**

**شَيْءٍ فَهٗوَ يَخْلِفُهٗ ۗ وَهُوَ خَيْرُ الرَّزٰقِيْنَ ﴿۳۹﴾**

”کہئے کہ میرا پروردگار روزی میں وسعت دیتا ہے جس کے لئے اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے اور جو تم لوگ خیرات کرو، وہ اس کی جگہ پر عطا کرے گا اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔  
یعنی راہ خدا میں خرچ کرتے وقت نفروفاقہ کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ اس کی کمی کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ [۱]  
اس میں یہ تو سہ بالکل درست ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کمی دنیا ہی میں پوری ہو جائے بلکہ اخروی اجر و ثواب بھی اس مال دنیا کا بہترین جانشین ہے اس کے لئے جو آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ [۲] تو اللہ اس کی کمی کو پورا ضرور کر دے گا خواہ دنیا ہی میں اور خواہ آخرت میں۔ [۳]

**وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِهٰٓؤْ لَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾**

**قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيْنٰنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۗ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۗ اَكْثَرُهُمْ**

**بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَاَلْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَلَا ضَرًّا ۗ وَنَقُوْلُ**

**لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكْذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾**

”اور جس دن وہ اُن سب کو حشر میں لائے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ وہ

[۱] خدای عوز آن دھد (شاہ ولی اللہ) وہ بلا دیتا ہے اس کا (فتح الدین)

[۲] الیس المراد ان یخلف فی دار الدنیا علی کلّ حال لانّ اللہ تعالیٰ یفعل ذلک بحسب المصلحة واما ارادته یعوض علیہ اما فی الدنیا بان یخلف بدله او یتیب علیہ (تبیان).

[۳] اما فی الدنیا بزيادة النعمة واما فی الآخرة بثواب الجنة. (مجمع البیان)

کہیں گے پاک ہے تیری ذات ہمیں جو تعلق ہے، وہ تجھ ہی سے ہے نہ کہ ان سے بلکہ وہ جنات کی پرستش کرتے تھے ان میں کے زیادہ لوگ انہیں مانتے تھے تو آج کے دن تم میں کا ایک دوسرے کے لئے کسی نفع یا نقصان پر قدرت نہ رکھے گا اور ہم کہیں گے ظالموں سے کہ چکھو اُس آگ کا مزہ جسے تم جھٹلاتے رہے تھے۔

اس آیت سے بالکل یہ تفریق نمایاں ہے کہ ملائکہ اور جن دوسرے ہیں اور اس لئے شیطان کو جو قرآن میں کہا گیا ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ ”وہ جنات میں سے تھا“ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ملائکہ میں سے نہیں تھا بلکہ بعض مفسرین نے زیر تحریر آیت میں جن سے مراد شیطان ہی لیا ہے کہ اس کی وسوسہ انگیزی سے انہوں نے غیر اللہ کو معبود بنا لیا ہے۔ [۱]

اس طرح یہ آیت خود براہ راست شیطان کو فرشتوں سے خارج اور اُن کا مد مقابل بنا رہی ہے۔

اب چونکہ خالق نے سوال یہ کیا تھا کہ کیا یہ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ اس کے جواب میں اُن کا یہ کہنا کہ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ”نہیں بلکہ وہ جنات کی عبادت کرتے تھے“ اس سے بظاہر تو ذہن میں بھی معنی پیدا ہوتے ہیں کہ وہ ملائکہ کی عبادت کرتے ہی نہ تھے مگر کچھ مفسرین نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ وہ ملائکہ کی عبادت شیطان کی تحریک سے کرتے تھے اس لئے فرشتوں نے کہا ہے کہ وہ دراصل جنات کی عبادت کرتے تھے ہماری نہیں۔ [۲]

بعض نے کہا ہے کہ شیاطین نے جنات ہی کی شکل کی کچھ صورتیاں بنائی تھیں اور اُن سے کہا تھا کہ یہ فرشتوں کے مجسمے ہیں تو انہوں نے فرشتوں کے تصور میں جنات کی عبادت کی۔ [۳]

وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانُوا يَعْبُدُ آبَاءَكُمْ ؕ وَقَالُوا مَا هَذَا إِلَّا إِفْكٌ مُّفْتَرًى ۖ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَلْحَقِّ لَبَأٌ جَاءَهُمْ ۗ إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۳۳﴾

”اور جب اُن کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص نہیں ہے مگر ایسا آدمی جو چاہتا ہے تمہیں منحرف کرے اُس سے جس کی تمہارے باپ دادا عبادت کرتے آئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے مگر گڑھا ہوا جھوٹ اور کافر لوگ حق کو کہتے ہیں جب وہ اُن کے پاس آیا کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو“۔

وَمَا آتَيْنَهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ ﴿۳۴﴾

[۱] قبیل المراد بالجن ابلیس وذریتہوا و عوانہ (مجمع البیان)

[۲] ای یطیعونہم فی عبادتہم ایانا (جلالین) یعنی عبادت ملائکہ بجمہت و وسوسۃ شیاطین بود پس گویا عبادت شیطان کردند (فتح الرحمن)

[۳] قبیل ائہم صورۃ قوم من الجن وقالو اھذہ صورۃ الملائکۃ فاعبدوھا (تبیان)

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٣٥﴾

”اور ہم نے انہیں کچھ کتابیں نہیں دی ہیں جنہیں وہ پڑھتے ہوں اور آپ کے پہلے ہم نے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں بھیجا اور ان کے پہلے والوں نے جھٹلایا اور جو کچھ انہیں ہم نے دیا تھا، اُس کے دسویں حصے تک بھی یہ نہیں پہنچے ہیں تو انہوں نے میرے پیغمبروں کو جھٹلایا تو کیسی تھی میری طرف کی سزا“۔

”آپ کے پہلے“ یعنی ماضی قریب میں کافی طولانی مدت سے نہ یہ کہ اس قوم میں پہلے کبھی بھی کوئی رسول نہیں آیا جو اس اعلان قرآنی کے خلاف ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی رسول نہ آیا ہو اور پھر اگر کبھی کوئی رسول نہ آیا ہو تو ہمیں دوسری آیت میں ان کے سابق اسلاف کے تکذیب رسل کا حال کیوں بیان ہوتا؟

چوں کہ کفرانِ نعمت سلبِ نعمت کا سبب ہوتا ہے تو اس قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا، انہیں ایذا میں دیں اور انہیں قتل کیا، اس لئے ایک عرصے تک کے لئے وہ ہدایتِ ربانی سے محروم کر دیئے گئے۔

اس امت نے بھی جب اپنے پیغمبر کے معصوم جانشینوں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا تو پردہ غیبت ڈال کر آخری رہنما کے فیوض سے بہت حد تک انہیں محروم کر دیا گیا۔

ایک خیال یہ ہے کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی کتابیں ان کے پاس نہیں آئیں اور کوئی پیغمبر پہلے بھی نہیں آیا جسے انہوں نے مان لیا ہو اور ایسی ہی باتیں نہ کہی ہوں جو آپ کے لئے کہہ رہے ہیں۔ [۱] مگر قرآن مجید کے الفاظ سے یہ مطلب کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

علامہ طبرسی نے یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ ہم نے انہیں کوئی ایسی کتابیں نہیں دی ہیں جنہیں وہ آپ کے خلاف بطور سند پیش کر سکیں اور آپ کے پہلے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس کی تعلیم کا تقاضا یہ ہو کہ وہ آپ کا انکار کریں۔

قُلْ اِمَّا اَعْظَمَكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوا لِلّٰهِ مَثْنٰی وَفَرَادٰی ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْنَ ۗ

بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جَنَّةٍ ۗ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿٣٦﴾

”کہئے کہ میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کے لئے دو دو مل کر اور اکیلے اٹھو اور پھر غور کرو کہ اس تمہارے رفیق (رسول) میں کوئی دیوانگی نہیں ہے مگر تمہیں ہوشیار کرنے والا اس عذاب کے پہلے جو بہت سخت ہوگا“۔

کتنا ملائم اور کتنا روادارانہ انداز ہے؟ حاکمانہ فرمان نہیں بلکہ مشفقانہ نصیحت بس ایک بات کی اور وہ یہ ہے کہ برائے خدا ایک ایک یعنی بطور خود تنہائی میں فرصت کے لمحات میں خود سوچو اور اجتماعی طور پر باہم تبادلہ خیالات میں بھی اس پہلو پر غور کرو۔ اگر ذرا بھی کوئی عناد اور دھاندلی

[۱] يجوز ان يكون المراد وما ارسلنا اليهم قبلك يا محمد من نذير الا وفعلو اياه وقالوا له مثل ما قالوا لك (تبيان)

سے کام نہ لے تو یہ اندازاً سے غور کرنے کی تحریک پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ دو، دو یا ایک یعنی اجتماعی طور پر یا انفرادی حیثیت سے قوموں اُس کا ترجمہ ہم نے ”کھڑے ہو، نہیں کیا بلکہ ”اٹھو“ یعنی اس کا مطلب وہ کھڑا ہونا نہیں ہے جو بیٹھے اور لیٹنے کے مقابل میں ہوتا ہے بلکہ اُس سے مقصود اس غور و خوض پر آمادہ ہونا اور ذہنی کاہلی سے کام لے کر اپنی موجودہ حالت یا دیرینہ کیش پر قانع ہو کر پڑے نہ رہنا ہے۔ [۱]

**قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۗ إِنَّ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۗ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ**

**شَهِيدٌ ﴿۳۷﴾**

”کہنے کے میں نے تم سے جو اجر طلب کیا ہے، وہ تو تمہارے ہی لئے ہے۔ میرا اصل معاوضہ تو نہیں ہے مگر اللہ پر اور وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔“

### اجر رسالت کا طلب ہونا مگر فائدہ افراد امت کا

چونکہ تمام انبیاء نے جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے ہمیشہ کہا کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور اس میں کوئی استثناء نہیں کیا مگر ہمارے پیغمبرؐ کی زبانی بحکم الہی یہ اعلان ہوا کہ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ یعنی آپ نے ایک استثناء کر دیا کہ مودت ذوی القربیٰ کا بطور اجر میں طلب گار ہوں تو اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ آپ کا عمل ویسا بے لوث اور خالص نہیں رہا جیسا دوسرے انبیاء تھے۔ اس شبہ کو اس آیت میں دور کیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ وہ اجر جو خلوص عبادت کے خلاف ہو سکتا ہے، وہ ہے جس کا نفع اُس عمل کرنے والے کی ذات کو پہنچے لیکن میں نے جو اجر مانگا ہے، وہ اپنی ذات کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ اجر ایسا ہے جو خود تمہارے لئے فائدہ رسان ہے یعنی وہ ذوی القربیٰ وہ ہیں جن کی محبت تمہارے لئے ذریعہ نجات بنے گی جس کی تشریح پیغمبر خدا ﷺ کی اس حدیث سے ہو جاتی ہے کہ مثل اہل بیتمیٰ کمثل سفینة نوح من رکبها نجا و من تخلف عنها غرق و هوئی اور دوسری حدیث کہ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اہل بیتمیٰ ما ان تمسکتہم بہما لن تضلوا بعدی: اب اگر نجات کی اور ضلالت و گمراہی سے علیحدگی کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے تو ان ذوی القربیٰ کی محبت بھی ہر مسلمان کی اپنی ضرورت ہے جس کی تکمیل اجر رسالت طلب کر کے کی گئی ہے۔ یہ بھی درحقیقت خود مسلمانوں کی ایک خدمت اور ان کے ساتھ ایک بڑا لطف و کرم ہے۔ اس لئے بعد میں کہا گیا کہ میرا اعمال کا جن میں خود یہ اجر رسالت کی طلب بھی ہے، اللہ کے ذمے ہے، وہ مجھے اسی سے ملے گا۔

**قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۗ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿۳۸﴾ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِي**  
**الْبَاطِلَ وَمَا يُعِيدُ ﴿۳۹﴾ قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۗ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ**

[۱] ایس معنی القیام هنا القیام علی الارجل واما المراد به القعد للاصلاح والاقبال علیہ (مجمع البیان)

## فَيَا يُوْحٰى اِلٰى رَبِّىْ ط اِنَّهُ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ﴿٥﴾

”کہئے کہ بلاشبہ میرا پروردگار حق کو اتارتا ہے، وہ بڑا غیبوں کا جاننے والا ہے، کہئے کہ حق آگیا اور جو خود غلط ہے، وہ نہ پہلے پہل پیدا کر سکتا ہے اور نہ دوسری دفعہ پلٹا سکتا ہے، کہئے کہ اگر میں گمراہ ہوں تو میری گمراہی کی ذمہ داری خود مجھ پر ہے اور اگر میں ہدایت پاؤں تو وہ ثمرہ ہے اس کا جو میرا پروردگار میری طرف وحی بھیجتا ہے بلاشبہ وہ سننے والا ہے، بالکل نزدیک“۔

يَقْذِفُ بِالْحَقِّیِّ كَاتِرْجَمِہٖم نَی كَیَا ہٖ ”حَق كُواتارتا ہٖ“ یہ اِیك طرْح كِی مَجْبُورِی كَانْتِیجَہ ہٖ كَہ كُوی مَناسِب لَفْظ جُوقْذِف كَہ خُصُوصِیَا ت كَا حَامِل ہُوء اَرْدُو مِی دَسْتِیَاب نَیہِی ہُوء۔ دَر حَقِیْقَت كَقْذِف كَہ مَعْنِی مِی اُس طرْح كَا قُوت كَہ سَا تَہ پَھِنِكُنَا یَا اِنَا مَضْمُر ہٖ جِیسَہ كُولا پَھِنِكَا جَا تَا ہٖ جِیسا كَہ دُوسرِی جگَہ اَس كَہ سَا تَہ عَلِی الْبَا طِل كَا لَفْظ ہٖ كَہ وَه حَق كُو بَا طِل كِی طَرَف پَھِنِكُنَا ہٖ۔ [۱] اُور قُوت كَہ سَا تَہ اِنَا جِیسَہ كِی نَد وَغِیْرَہ مِی ہُوءا بَھری جَاتِی ہٖ جِیسا كَہ حَدِیْث مِی ہٖ:

العلم نور یقذفه الله فی قلب من یشاء.

عِلْم اِیك نُور ہٖ جِس كَہ دَل مِی چَا ہْتَا ہٖ اللہ اُسَہ اُتَا تَا ہٖ۔ اَب یہَا چُونكَہ اُس كَہ سَا تَہ عَلِی الْبَا طِل وَغِیْرَہ كَا لَفْظ نَیہِی ہٖ اَس لَئَہ اَگَر تَرْجَمِہ مِی پَھِنِكُنَا یَا اِنَا كَہِی تُو مَفْہُوم كَچَہ ذَہَن مِی نَیہِی اُتَا لَہْذَا اِس اُس كَہ اِیك جَز مَفْہُوم كُولَہ ”اُتَا تَا ہٖ“ تَرْجَمَہ كِیَا كِیَا اُور اِی سَی لَئَہ بَعْض نَی اَس كَہ مَحَل نَزُول كَہ لَئَہ اَنْبِیَاء كَا نَام لَیَا كَہ وَه اُسَہ اِپنَہ پَیغَمْبَر پَر اُتَا تَا ہٖ۔ [۲] اَمَّا یُبْدِئُ الْبَا طِلَّ وَ مَا یُعِیْنُ كَا تَرْجَمِہ جُوهَم نَی لَكْہَا ہٖ كَہ ”جُوهُود غَلَط ہٖ وَہ نَہ پَہْلِی دَفْعَہ پَیْدَا كَر سَكُنَا ہٖ اُور نَہ دُوسرِی دَفْعَہ پَٹَا سَكُنَا ہٖ“ یہ اِس پَر مَبْنِی ہٖ كَہ بَا طِل سَہ مَرادُوہ ہِی جُواللہ كَہ عِلَاوہ مَعْبُود بَنَانُے كَہ ہِی اُور بَعْض دُوسرَے مَتْرَجِیْمِن نَی ہِی تَرْجَمِہ اَس كَہ مَطَابِق كِیَا ہٖ۔ [۳] مَگَر بَعْض نَی اِس طَرَح تَشْرِیْح كَر دِی ہٖ جُویْدَا اُور یَعْدَا سَہ مَتَعَلِّق ہُوسَكْتِی ہٖ نَہ كَہ یَبْدِی وَ یَعِیْد كَہ لَفْظُوں سَہ جُوكَہ قُرْآن مِی ہِی۔ [۴]

اِس سَہ بَہْتَرُوہ ہٖ جُوعِلَامَہ طَہْرِی كَا رَجْحَان مَعْلُوم ہُوتَا ہٖ كَہ بَا طِل سَہ مَرادُ كُفْر ہِی وَغِیْرَہ ہٖ اُور مَا یُبْدِئُ وَ مَا یُعِیْنُ كَا مَطْلَب یہ ہٖ كَہ اَب اِس مِی كَسی كَا رَگْزَا رِی كِی سَكْت بَا قِی نَیہِی رَہِی۔ نَہ وَہ كَسی چِیز كُوشْرُوع كَر سَكُنَا ہٖ۔ نَہ دُوبَا رَہ اَنْجَام دَے سَكُنَا ہٖ۔ [۵] مَگَر چُونكَہ دُوسرَے مَقَامَات پَر یَبْدِئُ وَ یَعِیْد خَالِق كَا وَصْف قَرَار دِیَا كِیَا ہٖ جِس سَہ اُس كِی قَدْرَت كَا اَظْہَار ہُوتَا ہٖ، اِس لَئَہ اِس كِی نَفْی سَہ بَھِی ذَہَن مِی ہِی مَعْنِی آتَے ہِی لَہْذَا جِیسَہ خَدَاے حَقِیْقِی كَہ لَئَہ الْحَق كَا لَفْظ عَام طُور پَر اِسْتِعْمَال ہُوتَا ہٖ چِنَا نچَہ ہمارَے مَحَاوِرَے كَا جَز ہٖ ”حَق سَجَانُہ“ جُوقُرْآن كَہ مَطَابِق ہٖ تُو كِیوں نَہ بَا طِل سَہ مَرادُ اِس كَہ مَقَابِل وَ اَلْغَلَط مَعْبُود ہُوں، اِس لَئَہ مِیرَے نَزْدِیك اُسی مَفْہُوم كُوقُوت ہٖ جِس كَہ لِحَاظ سَہ تَرْجَمَہ ہُوا ہٖ۔

[۱] ای یلقیہ علی الباطل كما قال تعالیٰ: بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه (تبیان)۔

[۲] یلقیہ علی انبیاءہ عن قنادة و مقاتل (مجمع البیان)

[۳] آفرینش نمی کند معبود باطل و نہ دیگر بار آفریند (شاه ولی اللہ) نہ پہلی بار پیدا کرتا ہے معبود باطل نہ دوبارہ کرتا ہے (رنج الدین)

[۴] ما یبدئ الباطل الکفر و ما یعید ای لم یبق له اثر (جلالین)

[۵] ای ذهب الباطل ذهاباً لم یبقی منه ابداء و الاعادة و الاقبال و الادبار (مجمع البیان)



اس کے بعد رسولؐ جو جس اعلان کا حکم دیا گیا ہے، وہ درحقیقت ایک عام اصول کا اعلان ہے کہ جو غلط کام کرے اُس کا ذمہ دار بالکل اپنے کو سمجھنا چاہئے اور جو صحیح کام کرے اس کا انجام دینے والا اپنے ارادہ سے تو یہی شخص ہے، اس لئے اُسے اس کا اجر ملتا ہے مگر اس میں توفیق و ہدایت ربانی کا دخل ہوتا ہے، اب چونکہ یہ اعلان پیغمبرؐ خدا کی زبانی کرایا گیا ہے اور آپ کے لئے ہدایت ربانی کا خصوصی ذریعہ وحی کی صورت میں ہے اس لئے اس کا نام لیا گیا۔ دوسروں پر وحی تو نہیں ہوتی، پھر بھی توفیق الہی اسباب کی فراہمی میں آسانی نیز القائے ذہنی کی شکل میں ہوا کرتی ہے نیز پیغمبرؐ خدا پر نازل شدہ وحی سے حضرتؐ کی زبانی جو ارشادات خلق خدا تک پہنچے، اُن سے بھی رہ نمائی ہوتی ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس کا ایک بہت عمدہ مفہوم بتایا ہے جو بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین پیغمبرؐ خدا کو اپنے خیال ناقص کے مطابق گمراہ کہتے تھے تو اُن کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ اُن سے کہہ دیجئے کہ میں گمراہ ہوں تو یہ خود میرے لئے ہلاکت کا سبب ہے۔ تمہیں اُس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اگر میں راہ ہدایت پر ہوں تو یہ اللہ کی وحی کا نتیجہ ہے جس سے مجھے بھی فائدہ پہنچے گا اور تمہیں بھی، اس صورت میں یہ اسی طرح کار و ادارانہ مخاطب ہے جس کی نظیریں اور جگہ ہیں کہ اگر میں مجرم ہوں تو اُس کی ذمہ داری مجھ پر ہے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اور جو تم کر رہے ہو اس کی جواب دہی تم سے ہوگی، تم کو اس کی فکر کرنا چاہئے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فِرْعَوْنُ فَلَا فُوتَ وَأَخَذَٰ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿٥١﴾ وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ  
وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَاطُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٥٢﴾ وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۖ وَيَقْدِفُونَ  
بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٥٣﴾ وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ  
بِأَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مَُّرِيبٍ ﴿٥٤﴾

”اور کاش تم دیکھو وہ موقع جب وہ گھبرائے ہوئے ہوں گے مگر نکلنے کا موقع نہ ہوگا اور وہ قریبی جگہ سے پکڑ لئے جائیں گے اور وہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لائے اور اب کہاں انہیں دسترس ہو سکتی ہے اس مقام پر سے جو دور ہے اور وہ پہلے تو اس کا انکار کرتے رہے اور اندھا دھند تیر مارتے رہے دور دور از مسافت سے اور رکاوٹ ڈال دی گئی ان کے درمیان اور اُس کے درمیان جس کے یہ خواہش مند ہیں جیسا کہ کیا گیا اُن کے ایسوں کے ساتھ اس کے پہلے، وہ بھی سخت قسم کے شک و شبہ میں مبتلا رہے تھے۔“ ”قریبی جگہ سے پکڑ لئے جائیں گے، یعنی اللہ کو انہیں گرفت میں لانے کے لئے کسی جستجو کی زحمت اٹھانا نہیں ہے۔ وہ ہر وقت اُس کے قبضے میں ہیں اور بعد میں جو ہے کہ اب کہاں انہیں دسترس ہو سکتی ہے، اس مقام پر سے جو دور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے کا محل تو دنیا میں تھا اور دینیوی زندگی کا دور اب اُن سے دور ہو چکا ہے۔

# سُورَةُ فَاطِرٍ

مکیہ --- ۴۵ --- آیات

اس سورے کا دوسرا نام ”سورۃ الملائکہ“ ہے جو تفسیر علی بن ابراہیم اور مجمع البیان وغیرہ میں درج ہے چونکہ بسم اللہ کے بعد پہلی آیت کی ابتداء میں ہے: الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تو اس فقرے کی بنا پر ”سورۃ فاطر“ نام ہوا اور پھر دوسرا فقرہ ہے: جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اَلْحِ اس کی بناء پر سورۃ الملائکہ نام ہوا، حالانکہ فرشتوں کا تذکرہ ظاہر ہے کہ دوسرے سوروں میں بھی ہے مگر سورۃ ہود وغیرہ میں اس پر انتباہ ہو چکا ہے کہ نام کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ذکر صرف اسی سورہ میں ہو۔ ہاں فرشتوں کے بال و پر اور ان کے پروں کی تعداد کہ وہ دودو اور تین تین ہیں اور چار چار بھی اور بعض میں اس سے زیادہ یہ ذکر صرف اسی سورے میں ہے۔

## سورۃ فاطر کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ کلم طیب (اچھی بات چیت) کا خالق کی طرف بلند ہونا اور اعمال نیک کا اس میں بلندی پیدا کرنا۔
- ۲۔ کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا یعنی ہر ایک پر اس کے اعمال کی ذمہ داری ہے۔
- ۳۔ اللہ سے ڈرنا صرف واقعی صاحبان علم کا کام ہے۔
- ۴۔ منتخب افراد کا وارث کتاب ہونا۔
- ۵۔ اگر اللہ جرائم کی سزا عام طور پر دنیا میں دینے لگے تو روئے زمین پر چلنے پھرنے والا کوئی نہ رہے مگر اس نے پاداش عمل کا اصل دن بعد کو رکھا ہے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولٰٓئِیْ اَجْبَعٰتٍ مَّمْنٰی

وَتَلٰتٍ وَّرُبْعٍ ط یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ①

”سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا جن کے دودو، تین تین اور چار چار شہپر ہیں، اللہ اپنی خلقت میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“

فرشتوں کو قرآن میں رُسُل کہا گیا ہے جو رسول کی جمع ہے مگر یہ ”رسول“ اُن اصطلاحی معنوں میں نہیں ہے جو پیغمبروں کو رسول کہنے میں ہیں۔ اُس میں تعلیم و تربیت اور رہنمائی وغیرہ کے پہلو ہیں اور یہ رسول بس لغوی معنی میں ہیں جن کی قاصد کے طور پر پیغام رساں کی حیثیت ہے۔ [۱]

مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۖ وَمَا يُمْسِكُ ۙ فَلَا مُمْسِلَ لَهُ  
مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۵

”اللہ لوگوں کے لئے جو رحمت ارزانی فرمائے، اُسے روکنے والا کوئی نہیں اور جسے وہ روکے تو اُس کے بعد اُسے بھیجنے والا کوئی نہیں اور وہ غالب ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا۔“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۗ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ  
مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۗ فَآئِنِّي تُؤْفَكُونَ ۝۶

”اے انسانو! یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی عطا کرے؟ اس کے سوا کوئی خدا نہیں تو تم کہاں حیران سرگردان پھرتے ہو۔“

وَإِنْ يَكْذِبُواكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝۷

”اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو جھٹلائے گئے بہت سے پیغمبر آپ سے پہلے اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہونا ہے تمام معاملات کی۔“  
یہ بھی اپنے پیغمبر کی تسلی کا ایک انداز ہے کہ آپ کو ان لوگوں کے انکار سے اتنا صدمہ و ملال نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو ہوتی آئی ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ [۲]

”اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہونا ہے تمام معاملات کی،“ یعنی آپ کو جھٹلا کر وہ اللہ کی گرفت سے تو نکل نہیں سکتے، آخرت میں تو انہیں اس جھٹلانے کی سزا ملنا یقینی ہے اور وہ چاہے تو دنیا میں بھی اپنی نصرت و مدد اپنے پیغمبر کے شامل حال فرمائے گا۔ [۳]

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۗ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ  
الْغُرُورُ ۝۸ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوا عَدُوًّا ۗ وَإِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا  
مِنَ أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝۹

”اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو یہ زندگانی دنیا تمہیں فریب میں مبتلا نہ کرے اور اللہ کے بارے میں تمہیں

[۱] رسلا بعضهم الى بعض وبعجهم الى البشر (تبیان)

[۲] افلك اسواقهم (تبیان)

[۳] افیجازى من كذب رسله وينصر من كذب من رسله (مجمع البيان)

دھوکا دینے والا دھوکا نہ دے، یہ حقیقت ہے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے تو اُسے دشمن سمجھو، وہ اپنی جماعت کو اس کی دعوت دیتا ہے کہ وہ دوزخ والے ہو جائیں۔

”اللہ کا وعدہ“ یعنی جو اُس نے جزا و سزا کے ایک دور کا اعلان کیا ہے، وہ بہر حال پورا ہو کر رہے گا۔ [۱]

**الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝**

”جنہوں نے کفر اختیار کیا، اُن کے لئے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اُن کے لئے بخشش ہے اور بڑا اجر و ثواب۔“

**أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا ۚ فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ**

**يَشَاءُ ۚ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝**

”تو کیا وہ شخص جس کے لئے اُس کی بد اعمالی دلا ویز بنی ہوئی ہو تو وہ اُسے اچھا سمجھتا ہو؟ تو بے شک اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے، ہدایت فرماتا ہے تو آپ کی جان نہ جائے اُن پر افسوس میں، یقیناً اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔“

”کیا وہ شخص“؟ اس کے بارے میں سوال کس بات کا ہے؟ اُسے ہر ایک آدمی اپنی عقل سے سمجھ لے اور جو وہ تجویز کرے اس کے بارے میں شاید وہ درست ہی ہوگا مثلاً یہ کہ کیا وہ خوش اعمال شخص کی طرح ہو سکتا ہے؟ [۲] یا یہ کہ کیا وہ کسی ہمدردی کا مستحق ہے اور اُس کے انجام بد پر افسوس کرنا چاہئے؟ [۳] علامہ طبرسی نے پہلی نوعیت کے مفہوم کو اختیار کیا ہے۔ [۴]

اب جو شخص اپنی بد اعمالی کو اچھی بات سمجھ رہا ہے، اُس کی اس کج نگاہی کا نتیجہ یہ ہے اُس پر مصلح کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تو یہی باعث ہے اس کا کہ اللہ اپنی توفیقات کو اُس سے سلب کر لے اور اُسے گمراہی میں چھوڑ دے جیسے کہا گیا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے، عادل ہونے کی بناء پر اس کا یہ چھوڑ دینا بلا وجہ نہیں ہو سکتا اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے یعنی اپنی توفیقات شامل حال کرتا ہے۔ یہ بھی بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک بات اُس طریق کے ذاتی حسن اختیار اور سوء اختیار کا نتیجہ ہوا کرتی ہے اور اسی بنا پر اس جماعت کی تباہی پر جو اپنے ہاتھوں ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بر بنائے ہمدردی رنج و غم سے روکا گیا ہے۔

[۱] ان وعد اللہ من البعث والنشر والجنة والنار والجزاء والحساب صدق كائن لا محالة (مجمع البيان)

[۲] من مبتدأ خبره كمن هدا الله (جلالين) آیا مثل مو من صالح باشد (شاه ولی اللہ)

[۳] خبر من محذوف وتقديره يتحشر عليه (تبیان)

[۴] ای ہو کمن علم الحسن والقبيح وعمل بما عمل ولم يزين له سوء عمله (مجمع البيان)



العمل الصالح مبتدا ہے اور یرفع کی ضمیر پوشیدہ اُسی کی طرف راجع ہے اور کاً جو ضمیر مفعول اُس سے ملی ہوئی ہے، یہ سابق کے الکلم الطیب کی طرف راجع ہے اب معنی یہ ہوں گے کہ نیک عمل اس پاکیزہ کلمے کو بلندی عطا کرتا ہے، یوں کہنا چاہیے کہ پاکیزہ کلمے کو جو ایمان کا ترجمان ہے عمل صالح پر پرواز عطا کرتا ہے۔

علی بن ابراہیم کی اس قدیم تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں جو حدیث درج ہے، وہ حسب ذیل ہے:-

عن ابی جعفر عليه السلام قال قال رسول الله ﷺ ان لكل عمل مصداقا من عمل يصدقه ويكذبها فاذا قال ابن آدم وصدق قوله بعبله رفع قوله بعبله الى الله و اذا قال و خالف قوله عمله رد قوله على عمله الخبيث وهو به في النار.

امام محمد باقر عليه السلام کی روایت ہے کہ حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ ہر عمل کی سچائی ثابت ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے کوئی عمل جو اُسے سچ ثابت کرے یا جھوٹ قرار دے تو جب آدمی کہے اور اپنے قول کو عمل سے سچ ثابت کرے تو اس کا قول اُس کے عمل کے سبب سے اللہ کی طرف جاتا ہے اور جب کہے اور اُس کا عمل اس کے فعل کے مخالف ہو تو اس کا قول اس کے ناپاک عمل کی طرف پلٹا جاتا ہے اور وہ اسے دوزخ میں گرا دیتا ہے۔ مگر ہمارے اکابر مفسرین نے اپنے دستور کے مطابق تفسیر قمری سے استفادہ نہیں کیا۔ ہاں علامہ طبرسی نے ایک تیسرے معنی لکھے ہیں جو بعید نہیں ہیں۔ اس میں العمل الصالح تو مبتدا ہوتا ہی ہے لیکن یرفع کی ضمیر پوشیدہ پہلے والے کلمہ طیب کی طرف راجع ہے اور جو مفعول ہے اور جو مفعول کی ضمیر ”کاً“ ہے، وہ عمل صالح کی طرف راجع ہے۔ اب معنی یہ ہوں گے کہ عمل صالح میں بلندی پیدا کرتا ہے وہ کلمہ طیب یعنی کلمہ توحید جو اس حقیقت کے بالکل مطابق ہے کہ ایمان شرط قبول عمل صالح ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِّنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۗ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۗ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمْرِهٖ اِلَّا فِي

كِتٰبٍ ۗ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾

”اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر تمہیں مرد اور عورت کے جوڑے کی شکل میں بنایا اور کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ اُس کے یہاں وضع حمل ہوتا ہے مگر اُس کے علم سے اور نہ کوئی عمر پانے والا عمر پاتا ہے اور نہ اُس کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ کہ وہ ایک نوشتے میں موجود ہے، یقیناً یہ اللہ پر آسان ہے۔“

”مٹی سے پیدا کیا“، یعنی پہلے فرد کو [۱]۔ پھر ”نطفے سے“، یعنی اُن کی اولاد میں یہ طریق تخلیق جاری ہوا۔ [۲] مَا يُعَمَّرُ مِنْ عُمْرِهٖ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمْرِهٖ کی تفسیر مفسرین نے یہ کی ہے کہ جسے طولانی عمر ملتی ہے وہ بھی ایک ایک نوشتے میں ہے اور جسے کم عمر ملتی ہے، وہ بھی ایک ایک نوشتے

[۱] بخلق ایبکم آدم منہ (جلالین)

[۲] بخلق ذریتہ منہا (جلالین)

میں ہے حالانکہ قبل کے جملے میں ”طول“ کے اظہار کے لئے قرآن میں کوئی لفظ نہیں ہے مگر بعد میں جو نقص یعنی کمی کا ذکر ہے، اس سے مناسبت کی بنا پر قبل میں طولانی کا اضافہ کر دیا گیا۔ [۱] ہماری قدیم تفسیر پھر ہماری رہنمائی ایک دوسرے پہلو کی طرف کرتی ہے اور وہ یہ کہ جسے پوری عمر ملتی ہے یعنی جتنی از اول مقرر تھی، اُس میں کمی نہیں ہوتی، اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جس کی عمر میں کسی سبب سے کمی ہو جاتی ہے، وہ بھی اُس کے یہاں درج ہے۔ یہ مفہوم مسئلہ ہمارے مطابق ہے کہ تقدیر کے بعض فیصلے بعض اسباب سے بدل جاتے ہیں جیسے صدقہ جو عمر میں زیادتی کا باعث ہے۔ [۲] یہاں پر علامہ طبرسی نے بھی بغیر حوالہ ایک ایسا قول درج کر دیا ہے جو نتیجتاً اس کے موافق ہے۔ [۳] اس صورت میں پہلے جو مَا يُعْمَّرُ مِنْهُمْ مُعَمَّرٌ ہے، اس کا مطلب اس کی مناسبت سے یہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے ملی ہوئی عمر کے علاوہ جسے مزید عمر ملتی ہے، اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جس کی عمر میں کمی ہوتی ہے، اُسے بھی۔ میں نے جو ترجمہ کیا ہے وہ ایسا ہے کہ اس مطلب پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَيْنِ ۚ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۗ  
وَمَنْ كُلِّ تَاكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَعْرِجُونَ جَلِيَّةً تَلْبَسُونَهَا ۗ وَتَرَى الْفُلْكَ  
فِيهِ مَوَآخِرَ لَتَبْتَعُوا مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۴﴾

”اور نہیں یکساں ہیں دونوں دریا کہ یہ خوش گوار بیٹھے پانی کا ہے خوش مزہ اور یہ کھاری بد مزہ ہے اور ہر ایک میں سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو اور زبور برآمد کرتے ہو جسے پہنتے ہو اور اُس میں کشتیوں کو تم دیکھو گے پانی کو چیرتی ہوئی تاکہ تم اُس کے فضل و کرم سے کسب معاش کرو، اور شاید کہ تم شکر گزار ہو۔“  
”دونوں دریا یکساں نہیں ہیں“ اور پھر ”ہر ایک میں فائدے ہیں“ اسے شاہ عبدالقادر استعارہ قرار دیتے ہیں اس طرح کہ:-  
”یعنی کفر اور اسلام برابر نہیں، خدا کفر کو مغلوب ہی کرے گا اگرچہ تم کو دونوں سے فائدہ ملے گا، مسلمانوں سے قوت دین اور کافروں سے جزیہ“ (موضح القرآن)

مگر سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں صرف اللہ کی نعمتوں اور اُس کی قدرت کی کار فرمائوں کی طرف نظروں کو متوجہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تمثیل وغیرہ اس میں مد نظر نہیں ہے۔

يُوجِجُ اللَّيْلُ فِي النَّهَارِ وَيُوجِجُ النَّهَارُ فِي اللَّيْلِ ۗ وَسَخَّرَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرَ ۗ كُلٌّ  
يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ ذَٰلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۗ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ  
مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ﴿۱۵﴾ إِنَّ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ ۗ وَلَوْ سَمِعُوا مَا

[۱] ای ما یزاد فی عمر طویل العمر (جلالین) زندگانی دادہ نسی شود ہیچ درازعدی (شاہ ولی اللہ)

[۲] هورڈ علی من ینکر البداء (علی بن ابراہیم)

[۳] قبل هو ما یعلمہ اللہ ان فلانا واطاع لبقی الی وقت کذا واذ اعصی نقص عمرہ (مجمع البیان)

اَسْتَجَابُوا لَكُمْ ط وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ط وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ

خَبِيرٍ ﴿١٣﴾

”وہ رات کو دن کے اندر لے جاتا ہے اور دن کو رات کے اندر لے جاتا ہے اور اُس نے قابو میں رکھا ہے سورج اور چاند کو ہر ایک ایک مقررہ میعاد تک چل رہا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا مددگار۔ اُس کی سلطنت ہے اور جنہیں وہ اُسے چھوڑ کر پکارتے ہیں، ذرا سی چیز پر بھی قدرت نہیں رکھتے، اگر انہیں پکارو تو تمہاری پکار کو وہ سنیں گے نہیں اور اگر سنیں بھی تو تمہاری التجا کو قبول نہیں کریں گے اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور ایسے شخص کی سی جو پورے طور پر باخبر ہو، کوئی دوسرا تمہیں صحیح اطلاع نہیں دے سکتا۔“

یعنی خداوند عالم کے برابر جو ہر بات سے واقف ہے، کون تمہیں صحیح اطلاع دے سکتا ہے۔ ﴿١٣﴾ اور اس آیت میں مِثْلُ خَبِيرٍ کے فقرے کا استعمال اکثر کسی اہم بات کہنے کے بعد بطور ضرب الامثال ہوتا ہے، مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سے پوچھو، ہم سے زیادہ تر تم کو صحیح اطلاع اس کی کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ ﴿١٤﴾ مگر یہ بات محتاج تحقیق ہے کہ یہ مثل پہلے سے موجود تھی اور قرآن مجید نے اسے بطور مثل ہی استعمال کیا ہے یا یہ جملہ پہلے پہل قرآن میں آیا اور پھر بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿١٥﴾ إِنَّ يَسَّأَ

يُدْهِبُكُمْ وَيَأْتِي بَخْلِقٍ جَدِيدٍ ﴿١٦﴾ وَمَا ذَلِكُ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿١٦﴾

”اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز ہے جو قابل تعریف ہے، اگر وہ چاہے تو تم کو ختم کر دے اور نئی مخلوق کو پیدا کرے اور یہ اللہ پر کوئی دشوار امر نہیں ہے۔“

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى ط وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ جَمَلِهَا لَا يُحْمَلُ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ

كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ط إِنَّ مَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ط

وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ط وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾

”اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور اگر کوئی گراں بار اُس کے اٹھانے کے لئے پکارے تو اُس میں سے کچھ بھی دوسرے کے ہاتھوں، اٹھایا نہ جائے گا چاہے رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ آپ خوفِ آخرت سے ہوشیار بس انہی کو کرتے ہیں ﴿١٣﴾۔ جو اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہوں اور نماز کے پابند ہوں اور جو پاک

﴿١٥﴾ ای لا یخبرک بما فیہ الصلاح والفساد والمنافع والمضار مثل اللہ سبحانہ (مجمع البیان)

﴿١٦﴾ بمنزلہ مثل است، چون سخن بلیغ گویند و تحقیق بنہایت رسانند، این کلمہ گویند (فتح الرحمن)

﴿١٧﴾ معنا لیس ینتفع یتخویفک یا محمد الا الذین یخافون ربہم (تبیان)



باز رہے، وہ بس خود اپنے فائدے کے لئے پاک باز رہے گا بالآخر اللہ ہی کی طرف جانا ہے۔  
 ”آپ بس انہی کو ہوشیار کرتے ہیں“ یہ ویسا ہی ہے جیسے قرآن مجید کو ہدٰی لِلْمُتَّقِينَ کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہوا:  
 اِنَّمَا اَنْتَ مُنذِرٌ مِّنْ يُحْشَاہَا۔  
 ”آپ بس انہی کو ہوشیار کرتے ہیں جو آخرت کا دھڑکا محسوس کریں۔“  
 چونکہ فائدہ پیغمبر کے انداز و تبلیغ سے وہی اٹھاتے ہیں، اس لئے انہی لوگوں سے اُس کا تعلق بتلایا گیا ہے ورنہ جیسے قرآن ہدایت سب کے لئے ہے، ویسے ہی رسول اپنے امکان بھر سب ہی کو ہوشیار کرتے ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظُّلُّ وَلَا  
 الْحُرُوْرُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَن يَّشَاءُ ؕ وَمَا  
 اَنْتَ بِمَسْمُوعٍ مِّنْ فِى الْقُبُوْرِ ﴿٢٢﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿٢٣﴾

”اور نہیں یکساں ہے اندھا اور آنکھوں والا اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا اور نہ سایہ اور دھوپ اور نہیں یکساں ہیں  
 زندے اور مردے، یقیناً اللہ سنائے گا جسے چاہے اور آپ نہیں سنا سکتے انہیں جو قبروں میں ہیں۔ آپ نہیں ہیں مگر  
 ڈرانے والے۔“

یعنی آپ کا کام جبر کرنا نہیں ہے، جبر پر قدرت رکھنے والا اللہ ہے مگر وہ بھی جبر سے کام نہیں لیتا اس لئے کہ وہ اُس کے تقاضائے حکمت  
 کے خلاف ہے۔

ہاں نتیجہ میں بر بنائے عدل تفریق لازم ہے جیسے اندھا اور آنکھوں والا، اندھیرا اور اجالا وغیرہ یکساں نہیں ہیں، ویسے ہی مومن و کافر،  
 مطیع و عاصی سب کو یکساں نہیں رکھا جاسکتا۔ ﴿﴾ لہذا نتیجہ میں یہ سیکولر تصور کہ انجام سب کا بخیر ہے، درست نہیں ہے۔

اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ؕ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿٢٤﴾ وَاِنْ  
 يُكٰذِبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ  
 وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاَكْفَيْفَ كٰنَ نَكِيْرًا ﴿٢٦﴾

”ہم نے بھیجا ہے آپ کو حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور کوئی قوم نہیں مگر یہ کہ اُس میں  
 کوئی ڈرانے والا گزرا ہے اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو اُن کے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تھا۔ آئے اُن کی طرف  
 اُن کے پیغمبر معجزے اور کتابیں اور روشن دستور حیات لے کر پھر میں نے گرفت میں لیا انہیں جو کافر تھے تو کیسا تھا  
 میرا عذاب۔“

﴿﴾ لا يستوى المؤمن الكافر والحق والباطل والعالم والجاهل (مجمع البيان).

”کوئی قوم نہیں مگر یہ کہ اُس میں کوئی ڈرانے والا گزرا ہے“۔ قرآن کا یہ عمومی اعلان اس کا ثبوت ہے کہ شرق و غرب میں جہاں جہاں انسان بستے ہیں، اُن کے پاس کبھی نہ کبھی شروع میں کوئی رہنما ضرور آیا جس کے تعلیمات کو بھلا کر وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ [۱]

الْمَ تَرَى أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۗ  
وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ ۖ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا ۖ وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴿۴۷﴾ وَمِنَ  
النَّاسِ وَالِدٌ وَآبٌ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ  
عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿۴۸﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا تو ہم نے اُس سے نکالے مختلف رنگ کے پھل اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ ٹکڑے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں اور انسانوں اور چلنے پھرنے والے جانوروں اور چوپایوں میں بھی اسی طرح مختلف رنگ ہیں، اللہ سے اس کے بندوں میں سے بس عالم لوگ ڈرتے ہیں، بلاشبہ اللہ عزت والا ہے، بخشنے والا“۔

### مساوات مطلق خلاف فطرت

یہ خلاق کا اختلاف عقلاً خالق کے فاعل مختار ہونے کی تو دلیل ہے ہی، اُس کے ساتھ ضمناً یہ نوع انسانی میں ”مساوات مطلق“ کے خلاف فطرت ہونے کی دلیل بھی ہے۔ جب تمام کائنات میں ہر شے کے اندر خاصیتیں اور صلاحیتیں مختلف ہیں تو انسان سب یکساں کیوں کر سمجھ جاسکتے ہیں بلکہ لازماً ان میں صلاحیتوں کے لحاظ سے اختلاف ہوگا تو سب کو ایک لکڑی سے ہانکنا کیوں کر صحیح ہوگا؟۔  
قرآنی اصول کے مطابق یوت کل ذی فضل فضله یعنی ہر صاحب فضیلت کو اُس کی فضیلت کے لحاظ سے امتیاز ہونا چاہئے چنانچہ ایک بڑا اہم معیار فضیلت کا علم ہے، اُس کا یہاں خصوصیات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا  
وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورًا ﴿۴۹﴾ لِيُؤَفِّيَهُمْ أَجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّنْ  
فَضْلِهِ ۗ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿۵۰﴾

”یقیناً وہ جو کتاب الہی کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اُس سے پوشیدہ طور پر اور ظاہر بظاہر خیرات کرتے ہیں، وہ امید وابستہ کیے ہوئے ہیں ایسی تجارت سے جو کبھی برباد نہیں ہوگی تاکہ

[۱] قال الجبائی: فی ذلك دلالة علی انه لا احد من المكلفین الا وقد بعث الله اليهم رسولا وقد اقام الحجّة علی جميع الاهم (تبیان و مجمع البیان)

وہ انہیں پورے اُن کے ثواب عطا کرے اور اپنے فضل و کرم سے انہیں اور زیادہ دے، بلاشبہ بخشنے والا ہے، عمل کی قدر کرنے والا۔

وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ

بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿٣١﴾

”اور ہم نے آپ کی طرف بذریعہ وحی جو کتاب بھیجی ہے، وہ حق ہے تصدیق کرنے والی اُس کی جو اُس کے پہلے ہے، یقیناً اللہ اپنے بندوں سے باخبر ہے، دیکھنے والا۔“

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۗ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۗ

وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۗ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ ۗ يُأْذِنُ اللَّهُ ۗ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ

الْكَبِيرُ ﴿٣٢﴾

”پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا انہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا، اس لئے کہ ان میں کچھ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ معتدل قسم کے ہیں اور اُن میں سے بعض بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اللہ کے حکم سے یہی تو بہت بڑی فضیلت ہے۔“

### منتخب افراد کا وارث کتاب ہونا

یعنی انتخاب کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بندگانِ خدا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں لہذا سب وارث کتاب ہونے کے لائق نہیں ہو سکتے۔ صحیح مفہوم یہی ہے۔

اس کے برخلاف علمائے اہل سنت چونکہ امت میں کسی ایسے برگزیدہ افراد کے وجود کا تصور نہیں رکھتے لہذا وہ پوری امت والوں کو وارث کتاب قرار دے کر انہی میں ظالم اور معتدل اور سابق الی الخیرات کے اقسام نکالتے ہیں۔ [۱] جس کے بعد انتخاب الہی کا کوئی منشاء ہی باقی نہیں رہتا۔

ہمارے اور علمائے اہل سنت کے نقطہ نظر میں الفاظ قرآنی کے مفہوم کے اعتبار سے بنیادی فرق یہ ہے کہ ہم منہم کی ضمیر ہم کا مرجع اس کے پہلے والی لفظ ”عبادنا“ کو قرار دیتے ہیں، اب وہ مطلب ہوگا جو ہم نے وارث کتاب ہونے کے لئے اپنے بندوں میں سے کچھ کو منتخب کیا ہے، کیوں کہ ان بندوں میں سے ایسے بھی ہیں جو ظالم ہیں اور کچھ درمیانی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو خیرات کی طرف سابق ہیں اس لئے انتخاب کی ضرورت ہوئی اور ظاہر ہے کہ منتخب گروہ وہی تیسرا ہے جو اعلیٰ طبقہ ہے۔ ان میں نہ ظالم ہیں، نہ درمیانی قسم کے لوگ۔ اب ظاہر ہے کہ درمیانی وہ قرار

[۱] ہم امتک فمتہم ظالم لِنَفْسِهِ بِالتَّقْصِيرِ فِي الْعَمَلِ بِهِ وَمَتَّهْمٌ مُّقْتَصِدٌ يَعْمَلُ بِهِ فِي أَغْلِبِ الْأَوْقَاتِ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِصَمِّ الْإِلٰهِ الْعَمَلِ بِهِ التَّعْلِيمِ وَالْإِرْشَادِ فِي الْعَمَلِ (جلالین) یعنی یہ امت، ان میں تین درجے بنائے، ایک گنہگار، ایک میاں، ایک اعلیٰ (موضح القرآن)

پائیں گے جن میں کچھ ظلم ہے اور کچھ نیکو کاری۔ ان کے مقابل میں وارث کتاب جو آخری قسم ہے وہ قرار پائے گی جن میں ظلم کا شائبہ نہ ہو اور وہی اصطلاحی طور پر معصوم کہلاتے ہیں۔

دوسرے لوگ اس منہم کی ضمیر کا مرجح الذین اصطفینا کو قرار دیتے ہیں، اس صورت میں انہی منتخب شدہ وارث کتاب افراد میں ظالمین وغیرہ ہوں گے۔ پھر معلوم نہیں انتخاب الہی کا حاصل کیا ہوا؟

ظاہر ہے کہ ہمارا نقطہ نظر زیادہ اور واضح اور مطابق عمل ہے اور قدیم مفسرین میں جناب ابن عباسؓ کا قول جو کرمہ نے نقل کیا ہے، اس کے موافق ہے۔ [۱]

جَنَّتْ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا يُجَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ  
وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝۳۳ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ ۖ إِنَّ رَبَّنَا  
لَغَفُورٌ شَكُورٌ ۝۳۴ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِن فَضْلِهِ ۗ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ  
وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ۝۳۵

”ہمیشہ کے قیام والے بہشتوں میں داخل ہوں گے، انہیں پہنٹائے جائیں گے ان میں سونے کے ننگن اور موتی اور ان کے کپڑے ریشم کے ہوں گے اور وہ کہیں گے شکر اُس اللہ کا جس نے ہم سے رنج و غم دور کیا، بلاشبہ ہمارا پروردگار بخشنے والا ہے، اچھے اعمال کی قدر کرنے والا، جس نے ہم کو اتارا اپنے فضل و کرم سے دائمی قیام والی جگہ پر جس میں ہمیں نہ کوئی زحمت ہوتی ہے اور نہ ہمیں کوئی ذرا سی بھی تھکن ہوتی ہے۔“

گذشتہ آیت میں متعدد قسمیں تھیں، اس آیت سے متصل قریبی ذکر تیسری قسم کا ہے جو سابق بالخیرات ہے، ہمارے نزدیک تو یہ بشارت الہی انہی سے متعلق ہے لیکن جنہوں نے ایک دم سب امت کا ظالمین کی ایک قسم سمیت منتخب و برگزیدہ خدا بنا دیا ہے، وہ اس بشارت کو بھی تمام امت سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ [۲]

مگر جناب ابن عباسؓ وغیرہ اس سے متفق نہیں ہیں [۳]۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۖ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ  
عَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۗ كَذَلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ ۝۳۶ وَهُمْ يَصْطَرِحُونَ فِيهَا ۗ رَبَّنَا

[۱] قال عكرمة عن ابن عباس ان لمصطفين هم الانبياء والظالم لنفسه هو المنافق (تبيان)

[۲] يدخلونها اي الثلاثة (جلالين) آخر میں سب بہشتی ہیں (موضح القرآن)

[۳] عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنه المقتصد والسابق بالخيرات في الجنة والمنافق في النار وقال الحسن و مجاهد . الظالم لنفسه اصحاب المشيمة . (تبيان)

أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۖ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ

مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ﴿٣٤﴾

”اور جنہوں نے کفر کیا، اُن کے لئے دوزخ کی آگ ہے، اُن کو قضا بھی نہیں آئے گی کہ مرجائیں اور نہ اُن سے اُن کے عذاب میں کمی ہوگی۔ اسی طرح ہم سزا دیں گے ہر ناشکرے کو اور وہ اس میں چیختے ہوں گے، اے ہمارے پروردگار! اب ہم نیک اعمال کریں گے اُس کے علاوہ جو کرتے رہے تھے۔ کیا ہم نے تم کو عمر دی نہیں اتنی جس میں کسی کو نصیحت قبول کرنا ہو تو وہ قبول کر لے اور تمہارے پاس ڈرانے والا رسول بھی آیا، اب مزہ چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔“

میں تو سیاق قرآنی سے محسوس کر رہا ہوں کہ سابقین بالخیرات کو مژدہ جنت دینے کے بعد یہ دوزخ کا وعید انہی تین قسموں میں سے اُس گروہ کے لئے ہے جس کا پہلے ظالم لِنَفْسِهِ کہہ کر تعارف کرایا گیا تھا اور اس لئے یہ الذین کفرو اکھلے ہوئے کافر نہیں بلکہ اسی امت کی بھیڑ میں چھپے ہوئے کافر ہیں اور اس لئے آخر میں کفر کا لفظ چھوڑ کر ان کی تعبیر ظالموں ہی سے کی گئی ہے کہ فما للظالمین من نصیر مگر وہ جو انتخاب الہی اور اس پہلی خوشخبری کو تمام امت سے متعلق قرار دیتے ہیں، وہ اس پر مجبور ہیں کہ اس وعید جہنم کو اس پوری امت سے ہٹا کر ویسے ہی کفار سے متعلق کریں جو کسی رخ سے بھی اس امت میں سمجھے نہ جاسکے اور وہ غیر مسلمین ہی ہو سکتے ہیں، مسلمان نہیں۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٣٥﴾

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلِيفَ فِي الْأَرْضِ ۖ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَلَا يَزِيدُ

الْكُفْرِينَ كُفْرَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكُفْرِينَ كُفْرَهُمْ إِلَّا

خَسَارًا ﴿٣٦﴾

”بلاشبہ اللہ آسمان اور زمین کی ان دیکھی چیزوں کا جاننے والا ہے، یقیناً وہ دلوں کی باتوں سے خوب واقف ہے، اس نے تم لوگوں کو زمین پر اگلے والوں کی جگہ پیدا کیا، اب جو کفر اختیار کرے گا، اُس کے کفر سے اُسی کو نقصان پہنچے گا اور نہیں اضافہ کرتا کافروں کو اُن کا کفر اُن کے پروردگار کے یہاں ناراضگی کے سوا اور نہیں اضافہ کرتا کافروں کے لئے اُن کا کفر سوا خسارے کے۔“

قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَ كُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ

الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ ۖ أَمْ آتَيْنَهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْهُ ۗ

بَلْ إِنَّ يَعْدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿٣٧﴾

”کہئے کہ کیا تم نے غور کیا ہے اپنے (بنائے ہوئے) شریکوں پر جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو مجھے دکھا دو، انہوں نے زمین میں کیا چیزیں پیدا کی ہیں یا ان کی آسمانوں میں کوئی شرکت ہے؟ یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے تو وہ ایک دلیل رکھتے ہیں اس کی؟ بلکہ ظالم لوگ ایک دوسرے کو توقعات نہیں دلاتے سوادھو کے اور فریب کے۔“

توقعات اس کے کہ یہ معبودان باطل آخرت میں ان کے کام آئیں گے۔<sup>[۱]</sup>

إِنَّ اللَّهَ يُمَسِّكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۗ وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ  
أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿۳۱﴾

”یقیناً اللہ تھامے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور اگر وہ ہٹیں تو کوئی اُس کے بعد اُن کی روک تھام نہیں کر سکتا، یقیناً وہ برداشت کرنے والا ہے، بڑا بخشنے والا۔“

آخری یہ الفاظ یہ تصور پیدا کرتے ہیں کہ تمہاری بد اعمالیوں کا تقاضا تو یہی تھا کہ آسمان وزمین اپنی جگہ سے ہٹ کر تباہ و برباد ہو جائیں مگر خالق کا عفو و تحمل وہ ہے جو تمہارے کرتوت کو نظر انداز کرتا ہے اور عذاب نازل نہیں کرتا۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ إِحْدَى  
الْأُمَمِ ۗ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا ﴿۳۲﴾ اسْتَكْبَارًا فِي الْأَرْضِ  
وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۗ وَلَا يَحِيقُ الْبُكْرُ السَّيِّئِ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۗ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ  
الْأُولَٰئِينَ ۗ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۗ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ﴿۳۳﴾

”اور انہوں نے اپنی کوشش بھر سخت سے سخت قسمیں اللہ کی کھائیں کہ اگر اُن کے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) آئے تو وہ کسی بھی قوم سے زیادہ ہدایت یافتہ ثابت ہوں گے، اس کے بعد جب اُن کے پاس ڈرانے والا آیا تو اُس نے اُن میں اضافہ نہیں کیا سوا وحشت کے، دنیا میں گھمنڈ اور بُری طرح کی سازشوں کی صورت میں اور بُری قسم کی سازش ضرر نہیں پہنچاتی مگر اپنے کرنے والے کو تو انہیں کیا انتظار ہو سکتا ہے سوا اگلے والوں کو پیش آنے والے دستور کے، اس لئے کہ تم ہرگز اللہ کے دستور میں تبدیلی نہیں پاؤ گے اور نہ کبھی اللہ کے دستور میں تغیر پاؤ گے۔“

وہ دستور کبھی ہا ہے؟ یہ کہ بد اعمالیوں پر عذاب میں گرفتار ہوں تو انہیں بھی اپنی بد اعمالیوں پر اس کا منتظر رہنا چاہیے۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ  
وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي

[۱] بقولہم الاصل نام تشفع لہم (جلالین)۔

### الْأَرْضُ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ﴿٣٣﴾

”کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ دیکھتے کیا انجام ہوا ان کا جو ان کے پہلے تھے وہ ان سے زیادہ طاقت ور تھے اور اللہ کو کوئی چیز بے بس نہیں بنا سکتی آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ بڑا جاننے والا ہے، قدرت رکھنے والا“۔

وَلَوْ يُوْاْخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ وَّلٰكِنْ

يُوْخِزُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهِۦ بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾

”اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے گرفت میں (فوراً) لے لیا کرتا تو اس روئے زمین پر کسی نقل و حرکت کرنے والے کو چھوڑتا ہی نہ مگر وہ تو انہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دیتا ہے تو جب ان کی مدت پوری ہوگی تو اللہ اپنے بندوں کا دیکھنے والا تو ہے ہی“۔

### گناہ کے بعد فوری سزا ہوتی تو کوئی باقی نہ رہتا

”گرفت میں (فوراً) لے لیا کرتا“ یعنی بس ادھر معصیت سرزد ہوئی اور ادھر عذاب خداوندی آجایا کرتا۔ [۱] تو پھر کوئی تنفس روئے زمین پر باقی ہی نہ رہتا۔

”اللہ اپنے بندوں کا دیکھنے والا تو ہے ہی“ یعنی کہیں جا کر وہ اُس سے چھپ تو سکتے نہیں، جہاں وہ ہوں گے، وہی جس طرح چاہے گا عذاب میں گرفتار کر دے گا اور ان کے اعمال اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ کتنی ہی وہ چھپانے کی کوشش کریں، وہ خوب واقف ہے کہ وہ کیسے عذاب کے مستحق ہیں۔ [۲]

[۱] ای جزاء علی معیاصیہم عاجلاً (تبیان)

[۲] ہو بصیر بماکذبہم فیؤاخذہم حیث کانوا وقیل بصیر باعمالہم فیجازیہم علیہا (مجمع البیان)

# سُورَةُ كَايَس

مکیہ ---- ۸۳ ---- آیات

عام طور پر سورہ یسین کا تعلق ہے حالت احتضار و موت سے سمجھا جاتا ہے، اس لئے عوام کسی اچھے بھلے آدمی کے پاس سورہ یسین پڑھنے سے وہم مانیں گے اور اسے ایک طرح کی بدشگونی سمجھیں گے مگر تفسیر مجمع البیان میں میں نے جو منقولہ احادیث کا مطالعہ کیا جو روایتیں خصوصیات کے ساتھ عالم سکرات یا موت کے وقت پڑھنے سے متعلق ہیں، اُن میں سے کوئی ائمہ معصومین کے ذریعہ سے نہیں ہیں بلکہ ایک روایت جناب ابی بن کعب پر ختم ہو جاتی ہے اور یہ کے راوی خلیفہ اول جناب ابو بکر ہیں اور جو حدیث معصوم کی ہے، اُس میں اس سورے کو صحیح و سالم آدمی کے لئے ذریعہ سلامتی و طول عمر بتاتا ہے۔ ہاں اُس بیمار کے لئے جس کی قضا آئی ہو، باعث مغفرت قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے بجائے خود بھی اس سورے کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ ابوبصیر کی روایت ہے امام جعفر صادق سے جس کے ابتدائی جملے جو مقصود پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں، حسب ذیل ہیں:-

ان لکل شیء قلبا و قلب القرآن یس فمن قرأ یس فی نہارہ قبل ان یمسی کان فی نہارہ من محفوظین و المرزوقین حتی یمسی و من قرأ فی لیلۃ قبل ان ینام و کل بہ الف ملک یحفظونہ من کل شیطان رجیم و من کل آفة (مجمع البیان)

ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یسین ہے تو جو دن کو شام ہونے سے پہلے یسین پڑھے، وہ اُس دن محفوظ اور رزق سے بہرہ یاب ہوگا اور جو رات کو سونے سے پہلے پڑھے تو ایک ہزار فرشتے اس پر مقرر ہوں گے جو اُس کی ہر شیطان سے اور ہر آفت سے حفاظت کریں گے۔

## سورہ یسین کے خاص خاص مضامین:

- ۱- ہمارے پیغمبر کے پہلے زمانہ فترت تھا یعنی مدت سے خدا کی طرف سے کوئی رہنما نہ آیا تھا۔
- ۲- ہر شے کا امام مبین میں سما یا ہونا۔
- ۳- حضرت عیسیٰ کے دور کے کچھ مبلغین حق کا تذکرہ۔
- ۴- ایک داعی حق کا تذکرہ اور اُس کا انجام۔
- ۵- خلق خدا کا داعیان حق کے ساتھ افسوس ناک رویہ۔
- ۶- ہر چیز میں نرا اور مادہ کی طرف اشارہ۔
- ۷- اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ اجرام سماوی کسی ٹھوس جسم میں جڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ایک خلا میں گردش کرتے ہیں۔
- ۸- مناظر قیامت۔



۹۔ دہنوں کا خاموش ہونا اور اعضائے جسم کا کلام کرنا۔

۱۰۔ عمر طولانی ہونے کے اعلیٰ تقاضے۔

۱۱۔ پیغمبر خدا کا شاعری سے بے تعلق ہونا۔

۱۲۔ حیات بعد الموت کے منکروں کی طرح طرح فہمائش۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرْ نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اَلَمْ يَرْزُقْكُمْ مِنْ قَبْلِ هٰذَا وَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ فِتْنَةٌ اَلَمْ يَكُنْ اَوْلٰى بِكُمْ مِنْ ذٰلِكُمْ اَلَمْ يَخْلُقْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ رَدَّكُمْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ سَمٰوٰتٍ مَّوْجًا مَّوْجًا فَاصْبِرْ لِحُكْمِ اللّٰهِ هٰذَا نِعْمَتُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱﴾

”تَنْزِيْلُ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا اَنْذِرَ اَبَاؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۳﴾“  
”یسین۔ قسم اس باحکمت قرآن کی، بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں سیدھے راستے پر یہ اتارا ہوا ہے اُس عزت والے کا جو بڑا مہربان ہے تاکہ آپ ڈرائیے اُس قوم کو جس کے باپ دادا کو ڈرایا نہیں گیا تھا تو وہ بے خبری کے عالم میں ہیں۔“

”باپ دادا کو نہیں ڈرایا گیا تھا“ یعنی قریبی باپ دادا کو جن کے سامنے نمایاں طور پر کوئی ہادی دین نہ تھا۔ ﴿۱﴾  
چونکہ ان کے قبل والے آباؤ اجداد نے ہادیان دین کو جھٹلایا اور اُن کے ساتھ بدسلوکی سے کام لیا، اس لئے یہ نعمت سلب ہوگئی اور ہادیان دین پوشیدہ کر دیئے گئے۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۵﴾ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَعْمٰىهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۶﴾ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾ اِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ الْغَيْبَ ۗ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿۸﴾

”اُن میں سے زیادہ افراد کو عذاب کا استحقاق ہو چکا ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں تو انہوں نے اُن کی ٹھڈیوں تک کو کس لیا ہے تو وہ مجبوراً سر اٹھائے ہوئے ہیں اور ہم نے اُن کے آگے دیوار کھڑی کر دی ہے اور اُن کے پیچھے دیوار کھڑی کر دی ہے تو ہم نے اُن کو ڈھانپ دیا ہے تو انہیں

دکھائی نہیں دیتا اور اُن پر برابر ہے، خواہ آپ اُنہیں ڈرائیں یا آپ اُنہیں نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے، آپ تو اُسے ڈرا سکتے ہیں جو یاد دہانی سے اثر لے اور بے دیکھے خدائے رحمن کا تصور رکھے تو اُسے خوش خبری دیجئے۔ بخشش اور باعزت ثواب کی۔

آخر کے جملے سے بات صاف ہوگئی کہ پہلے کی سب باتیں اُن کی اختیاری بے اعتنائی اور حق سے روگردانی کی بنا پر ہیں، نہ یہ کہ وہ باتیں باعث ہوئی ہیں اُن کے اثر قبول نہ کرنے کی۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۗ وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي ۙ  
 إِمَامٍ مُّبِينٍ ۝۱۴

”بلاشبہ ہم مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں اُسے جو وہ کر چکے اور جو اُن کے اثرات ہیں اور ہر چیز کا احاطہ کیا ہے ہم نے روشن مرتبے والے امام ہیں۔“

”امام مبین“ کی تشریح عام طور پر مفسرین ”لوح محفوظ“ کے ساتھ کرتے ہیں جس میں ہمارے مفسرین بھی داخل ہے۔ [۱] اور لوح محفوظ کو امام کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ مرکزی محل ہے جہاں خالق نے اپنے علم و مشیت کو محفوظ کیا ہے۔ یوں ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ اس سے مراد امیر المومنین ہیں۔ [۲] اور پھر لازماً ہر دور کا امام معصوم۔ غور کیا جائے تو پہلا مفہوم اصل لفظ سے دور مگر سیاق کلام کے مطابق ہے اور دوسرا اصل لفظ سے قریب مگر سیاق کلام سے دور ہے۔

وَاصْرَبْ لَهُمْ مَثَلًا ۖ اصْحَابَ الْقَرْيَةِ ۗ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ۝۱۳ إِذْ أَرْسَلْنَا  
 إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُمْ مُّرْسَلُونَ ۝۱۴ قَالُوا  
 مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖ وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَنُ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا  
 تَكْذِبُونَ ۝۱۵ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ۝۱۶ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلْغُ  
 الْمُبِينِ ۝۱۷ قَالُوا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۖ لَئِن لَّمْ تَنْتَهُوا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ  
 مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۸ قَالُوا طَائِرُكُمْ مَعَكُمْ ۗ إِنَّكُمْ لَبَلَّاتٌ تَوْمٌ  
 مُّسِرٌّ ۖ فُؤَادٌ ۝۱۹

”اور اُن کے سامنے بطور مثال حال بیان کیجئے ایک خاص بستی والوں کا، جب اُن کے پاس بھیجے ہوئے پیغام رساں

[۱] معناه احصیناہ فی کتاب ظاہر و هو اللوح المحفوظ۔ (تبیان)

[۲] ذکر ابن عباس عن امیر المؤمنین علیہ السلام اِنَّہ قال انا والله الامام المبین (علی بن ابراہیم)

آئے، جب ہم نے ان کی جانب دو بھیجے تو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا تو تقویت کی ہم نے تیسرے کے ساتھ تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ تم نہیں ہو مگر ہمارے ایسے انسان اور خدائے رحمن نے کوئی چیز اتاری و تاری نہیں ہے، تم نہیں ہو مگر جھوٹ بولتے، انہوں نے کہا ہمارے ذمہ نہیں ہے مگر صاف صاف تبلیغ کر دینا، انہوں نے کہا ہم نے تو نحوست محسوس کی ہے تمہارے سبب سے۔ اگر تم باز نہ آؤ گے تو ہم تمہیں سنگ سار کریں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی، انہوں نے کہا تمہاری نحوست تمہارے ساتھ۔ کیا اگر تمہیں نصیحت کی جائے (تو تمہیں یہی کرنا چاہیے) بلکہ تم ظلم و تعدی سے کام لینے والے لوگ ہو۔

**وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدْيَنَةِ رَجُلٌ يَسْعَى قَالَ يَاقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٠﴾ اتَّبِعُوا  
مَنْ لَا يَسْأَلْكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿٢١﴾**

’اور آیا شہر کے دور ترین حصے سے ایک شخص دوڑتا ہوا، کہا اے میری قوم والو! ان پیغمبروں کی بات مانو! پیروی کرو ایسے شخص کی جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اور وہ ہدایت کے راستے پر ہیں۔‘

### ایک خاص داعی حق کے تذکرہ کا آغاز

اس آنے والے کا نام اہل تفسیر نے حبیب نجار بتایا ہے۔ [۱] اور یہ حضرت عیسیٰ کے دور کا ذکر ہے۔

**وَمَا لِي لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٢﴾ أَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ إِلَهًا إِنْ يُرِيدُنِي  
الرَّحْمَنُ بِضُرٍّ لَا تُغْنِي عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنْقِذُونِ ﴿٢٣﴾ إِنْ أَرَادْتُ إِذَا لَفِي ضَلَالٍ  
مُّبِينٍ ﴿٢٤﴾ إِنْ أَمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُونَ ﴿٢٥﴾**

’اور مجھے کیا ہے کہ میں عبادت نہ کروں اُس کی جس نے مجھے پیدا کیا اور اُسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے کیا میں اُسے چھوڑ کر ایسے خداؤں کو اختیار کروں کہ اگر خدائے رحمن مجھے کوئی ضرر پہنچانا چاہے تو اُن کی سفارش مجھے کچھ بھی فائدہ نہ پہنچائے میں ایمان لایا ہوں تمہارے پروردگار پر تو میری بات کان لگا کر سنو۔‘

### دعوت حق دینے والے مومن کی گفتگو کا تہ

جو شخص اس پارے کو (جب کہ وہ علیحدہ ہو) اٹھا کر اس کے شروع کی ان آیتوں کو پڑھے یا ان کو ترجمہ دیکھے، اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آئے گا کہ یہ کون کہہ رہا ہے؟ مگر یہ قرآن کو پارہ پارہ کرنے والے تیس حصوں میں تقسیم کرنے والوں کی بد سلیقگی کا نتیجہ ہے جنہوں نے اس سلسلے کی پہلی آیت کو بائیسویں پارے کا جزء بنا دیا۔ اُسے ملا کر دیکھیے تو سمجھ میں آئے گا کہ یہ اس شخص کے قول کا جز ہے جو بیرون شہر سے آیا تھا اور کہا تھا کہ ”حق

[۱] عن ابن عباس وجماعت من المفسرين (مجمع البيان)

کا پیغام لانے والوں کو قتل نہ کرو بلکہ اُن کی پیروی کرو۔“

قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ط قَالَ يَلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ

الْمُكْرَمِينَ ﴿٣٧﴾

”کہا گیا کہ بہشت میں داخل ہو جا، اس نے کہا کاش میری قوم والے جانتے کہ کاہے سے میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے معزز لوگوں میں قرار دیا۔“

اُس مومن کی حق گوئی کا نتیجہ

مومن مذکور کی گفتگو کے بعد بلافاصلہ یہ ارشاد کہ بہشت میں داخل ہو جا مفسرین کے اس خیال سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کہ اُس گفتگو کے نتیجہ میں اُن بے دینوں نے اُس مومن کو شہید کر ڈالا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُسے یہ نوید مل رہی ہے کہ بہشت میں داخل ہو جا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شہادت کا صلہ یہ ہے کہ اُس انسان سے پھر حساب کتاب کچھ نہ ہو بلکہ عالم برزخ کے منقضي ہونے کے انتظار کی ضرورت بھی نہ ہو اور وہ اُسی وقت بہشت میں داخل کر دیا جائے۔

اس موقع پر سورہ الفجر کی وہ آخری آیت بھی یاد کر لیجئے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٣٨﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٣٩﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٤٠﴾ وَادْخُلِي جَنَّاتِي ﴿٤١﴾

اور اُس کی یہ تفسیر کہ یہ امام حسین علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ بات فوراً ہونا ضروری نہیں بلکہ اس کے بعد جب بھی وہ دنیا سے اٹھا تو اُس کی موت کے ساتھ یہ حکم ہوا۔ تیسرا یہ کہ درمیان میں شہادت کا ہونا بھی حدفاصل نہیں بلکہ اُس کی اس دعوت حق کے ساتھ ہی دنیا سے اٹھایا گیا اور اُسے زندگی ہی میں بہشت میں داخل کر دیا گیا۔

افسوس ہے کہ حدیث معصوم موجود نہیں، اس لئے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ ﴿٤٢﴾ إِنَّ

كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خُمُودٌ ﴿٤٣﴾

”اور نہیں اتارا ہم نے اُس کی قوم پر اُس کے بعد کوئی لشکر آسمان اور نہ ہم اتارنے والے ہیں۔ نہ تھی مگر ایک مہیب آواز جس سے وہ ایک دم بجھ کر رہ گئے۔“

اس قوم کا انجام

ترتیب آیات کے مطابق تنزیل ہونے کی صورت میں جو یہاں پر باعتبار مضمون بعید نہیں ہے، اُسی مومن کی قوم کا ذکر ہے جس نے

دعوت حق دی تھی اور پھر شہید ہو کر فوراً یا زندگی ہی میں اُس کے بعد داخل بہشت کر دیا گیا اور اب یہ اُس کی قوم کا انجام ہے کہ وہ عذاب الہی میں گرفتار ہوئی جس کے لئے ارشاد ہو رہا ہے کہ یہاں فرشتے عذاب نازل کرنے کے لئے نہیں اتارے گئے بلکہ بس قدرت نے ایک مہیب صدا پیدا کر کے انہیں ہلاک کر دیا۔ ظاہر ہے کہ خدا عذاب نازل کرنے کے لئے لاؤ لٹکر کا محتاج نہیں ہے ”نہ ہم اتارنے والے ہیں“ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے، ہماری قدرت ان اسباب کی محتاج نہیں نہ یہ کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا، یا اس کا کوئی عہد و پیمانہ ہے کہ وہ ایسا کبھی نہ کرے بلکہ جو اُس کی مصلحت متقاضی ہوئی تو اس نے ایسا کر بھی دیا جیسا کہ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لئے فرشتے بھیجے گئے تھے۔

يَحْسِرَةٌ عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٣٠﴾ أَلَمْ يَرَوْا  
كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٣١﴾ وَإِنْ كُلُّ لُتَّى  
بِجَمِيعِ لَدِينَا مُحْضَرُونَ ﴿٣٢﴾

”ہائے افسوس ان بندوں کے حال پر، کوئی پیغمبران کے پاس نہیں آتا مگر یہ کہ وہ اُس کا مذاق اڑاتے رہے ہیں، کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان کے پہلے کتنی نسلیں ہم نے ختم کر دیں وہ اب اُن کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے، کوئی اُن میں نہیں ہے مگر یہ کہ سب ہمارے پاس حاضر کیے جائیں گے۔“

### خالق کا افسوس اور اس کا مطلب

بعض مفسرین نے افسوس والی آیت کو تترہ قرار دیا ہے اسی مومن کے قول کا جس کا ذکر قبل والے پارے کے آخر سے شروع ہوا تھا اور اس پارے کے شروع والی آیت کے تترہ کی تھی۔ [۱] مگر ہمیں اس کے قبول کرنے میں موجود ترتیب قرآن کے لحاظ سے اگر وہ موافق تزیل ہو جو اس مقام پر مضمون آیات کے لحاظ سے بعید نہیں ہے، یوں تاہل ہے کہ اُس مومن کی تقریر اس پارے کے شروع والی آیتوں پر جو ہم نے یکجا کی درج کی ہیں، ختم ہو گئی اور اس کے بعد کی آیتوں میں خالق کا ارشاد ہے تو کیوں نہ اسے بھی خالق ہی کی زبانی مانا جائے اور یہ تصور کہ یہ خداوند عالم کو افسوس کیوں کر ہوتا ہے۔ یہ تو ایک تاثر کا نام ہے جس سے خالق کی ذات کو بری ماننا چاہیے، بے بنیاد ہے اس بنا پر کہ رحمت اور غضب وغیرہ سب ہی کیفیات از قبیل تاثرات ہوتے ہیں اور انفعالات نفسانی کی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح ان سب کی نسبت خداوند عالم کی طرف تصرف عقلی کے ساتھ ہوتی ہے، ویسے ہی افسوس جو خالق کے وصف کے طور پر بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ اُن کے حال کے بجائے خود قابل افسوس ہونے کا اظہار ہے۔ [۲]

وَآيَةٌ لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ﴿٣٣﴾  
وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن مَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ﴿٣٤﴾ لِيَأْكُلُوا

[۱] قبیل ہو قول الذی جاء من اقصی المدینة (تبیان)

[۲] لهذا من قول الله سبحانه والمعنى اللهم حلوا محل من يتحسر عليه (مجمع البيان)

مِنْ ثَمَرِهِ ۖ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ ۗ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٥﴾

”اور ایک بڑی نشانی ہے اُن کے لئے وہ مردہ زمین جسے ہم نے زندہ کر دیا اور اس سے برآمد کیا اُن کے لئے اناج تو اس سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور ہم نے اُس میں قرار دیئے ہیں باغ کھجور اور انگوروں کے اور اُس میں سے ہم نے چشمے جاری کیے ہیں تاکہ وہ اس کے پھلوں سے کھائیں اور اسے ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا ہے تو وہ پھر بھی شکر گزار نہیں ہوتے۔“

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا

يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾

”پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے پیدا کیے زمین کے نباتات میں اور خود اُن میں اور اُن چیزوں میں سے جو وہ نہیں جانتے۔“

ہر چیز میں جوڑے

چونکہ سابق زمانہ میں سوا کھجور کے عام نباتات میں نر اور مادہ کا تصور نہ تھا اس لئے ازواج کے معنی اقسام و انواع کے قرار دے لئے گئے۔ [۱] مگر اب علم جدید نے بہت حد تک اُس مفہوم کی پردہ کشائی کر دی ہے جسے قرآن مجید نے آج سے چودہ سو برس قبل اپنی معجز زبان میں پیش کر دیا تھا۔

وَآيَةٌ لَهُمُ اللَّيْلُ ۚ نَسَلَخْنَا مِنْهُ النَّهَارَ فَاذَا هُمْ مُظْلِمُونَ ﴿٣٧﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِي

لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ۗ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَا مِنْ أَنْزَالٍ حَتَّىٰ

عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ﴿٣٩﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ

سَابِقُ النَّهَارِ ۗ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٤٠﴾

”اور ان کے لئے ایک خاص نشانی رات ہے جس سے دن کی کھال کھینچ کر ہم الگ کر دیتے ہیں تو ایک دم اُن پر تاریکی چھا جاتی ہے اور سورج چل رہا ہے اپنی قراگاہ پر۔ یہ فیصلہ ہے اُس صاحب عزت کا جو باخبر ہے اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ پلٹتا ہے ایسی صورت میں جیسے پرانی ٹہنی، نہ سورج کے لئے یہ صحیح ہے کہ وہ چاند کو پا جائے اور نہ یہ کہ رات دن سے آگے نکل جائے اور سب ایک خاص حلقے میں تیر رہے ہیں۔“

[۱] خلق الاصناف والاشكال من الاشياء (مجمع البيان) الاصناف كلها (جلالین) اجناس راتام ان (شاہ ولی اللہ)

## آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کا ثبوت

آخری فقرے پر تیرہویں صدی کے شروع کے علماء میں شاہ عبدالقادر کا تبصرہ قابل قدر ہے:-  
 ”ہر ستارہ ایک ایک گھیرا کھتا ہے، اسی راہ پر تیرتا ہے معلوم ہوا کہ ستارے آپ چلتے ہیں، یہ نہیں کہ آسمان میں گڑے ہوں اور آسمان چلتا ہے۔ نہیں تو تیرنا نہ فرماتے“ (موخ القرآن) یہ تبصرہ اس لئے بہت قابل قدر ہے کہ اُس دور میں ہر فرقہ کے علماء جس علم ہیئت کو پڑھتے تھے، اُس میں یہی پڑھایا جاتا تھا کہ ستارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں اور آسمان گردش کرتے ہیں۔ اُس اپنی نصابی تعلیم کے بندھن سے آزاد ہو کر الفاظ قرآنی سے یہ استفادہ کرنا یقیناً آزاد ذہن سے سوچنے کی بہت بڑی علامت ہے۔

وَايَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفَلَكِ الْمَشْحُونِ ﴿٣١﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ﴿٣٢﴾ وَإِنْ نَشَأْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيحَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُونَ ﴿٣٣﴾ إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٤﴾

”اور اُن کے لئے ایک نشانی قدرت کی یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو سوار ہونے کا موقع دیا بھری ہوئی کشتی میں اور اُن کے لئے اسی طرح کی اور چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوں اور اگر ہم چاہیں تو انہیں ڈبو دیں تو نہ کوئی اُن کی فریاد کو سُننے والا ہو اور نہ وہ چھڑائے جا سکیں سوا ہماری رحمت اور ایک مدت تک مہلت دینے کے“  
 بعض مفسرین نے بھری ہوئی کشتی سے مراد کشتی نوخ لی ہے اور ”اس طرح کی اور چیزیں“ اس سے مراد دوسری کشتیاں اور جہاز وغیرہ ہیں جو اسی صورت پر بنائے جاتے ہیں۔ [۱] یہ قول شروع والی صدیوں کے بعض مفسرین کی طرف بھی منسوب ہے۔ [۲] لیکن زیادہ واضح تفسیر یہ ہے کہ کشتی سے مراد بطور اسم جنس عام کشتیاں ہی ہیں۔ [۳] اور ”اس طرح کی چیزیں“ اس سے مراد دوسری سواریاں ہیں خواہ وہ زمین پر چلنے والی ہوں۔ [۴]

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٣٥﴾ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٣٦﴾

”اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اُس سے جو تمہارے آگے ہے اور اُس سے جو تمہارے پیچھے ہے۔ شاید کہ رحمت الہی تمہارے شامل حال ہو اور ان کے پاس کوئی آیت اُن کے پروردگار کی آیتوں میں سے نہیں آتی مگر یہ

[۱] ای سفینة نوح — مثله ای مثل فلك نوح وما عملوا على شكله (جلالین)

[۲] قال قتادة والضحاك المعنى بقوله سفينة نوح (تبیان)

[۳] هي السفن الجارية في البحار (جمع البيان)

[۴] هي الدواب والانعام (علی بن ابراہیم)

کہ وہ اس سے روگرانی کرتے ہیں۔“

”جو تمہارے آگے ہے“ اور ”جو تمہارے پیچھے ہے“ اس میں قدیم مفسرین کے دو قول ہیں جنہیں جناب شیخ الطائفہ نے بلا تسمیہ نقل کر دیا ہے۔ ایک یہ کہ ”جو تمہارے آگے ہے“ اس سے مراد وہ عذاب ہیں جو قبل کی اُمتوں پر آچکے ہیں اور اس سے ڈرنا یہ ہے کہ تم ویسے اعمال نہ کرو اور ”جو تمہارے پیچھے ہے“ یعنی آخرت۔ دوسرے ”جو تمہارے آگے ہے“ یعنی جو گناہ آئندہ تمہارے تصور میں ہوں، اُن سے پرہیز کرو اور ”جو پیچھے ہے“ یعنی جو گناہ پہلے کر چکے ہو، اُن سے ڈر کر بارگاہ الہی میں توبہ کرو۔ علامہ طبرسی نے امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث نقل کی ہے وہ پہلے جزیں اس سے متفق ہے یعنی ”جو آگے بنے“ اس سے مراد وہ گناہ ہیں جن کا کرنا پیش نظر ہے اور جو تمہارے پس پشت ہے، اس کے لئے معصوم نے فرمایا خَلَقَكُمْ مِنَ الْعُقُوبَةِ اس سے مراد وہ سزا ہے جو اس پر مرتب ہوگی۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا

أَنْطِعُمْ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطَعْتَهُ ۗ إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٥٤﴾

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خیرات کرو اُس سے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے تو وہ کافر ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم کھلائیں اسے جسے اللہ چاہتا تو کھلا ہی دیتا تم نہیں ہو مگر کھلی ہوئی گمراہی میں۔“

### غریبوں کی خبر گیری کے خلاف جواب میں دھاندلی

یعنی قدرت کی طرف سے جب ان کی تقدیر میں محتاجی لکھی ہے تو ہم پر ان کے پیٹ بھرنے کی ذمہ داری کیوں کر عائد ہو سکتی ہے۔ اس منطق کو دوسرے لفظوں میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر اللہ کو ان کی شکم پری منظور ہوتی تو وہ خود انہیں رزق عطا کرتا جب اس نے انہیں محروم رکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے ان کا بھوکا رکھنا منظور تھا تو پھر ہم انہیں دے کر ان کے پیٹ بھرنے کا سامان کیوں کریں؟ ﴿۵۴﴾ مگر یہ غلط ہے اس لئے کہ اُس نے ان کے اموال میں ان محروموں کا حق قرار دیا ہے تو انہیں اُس کے روکنے کا کیا حق ہے؟

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٥٥﴾ مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً

وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿٥٦﴾ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ

يَرْجِعُونَ ﴿٥٧﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ ﴿٥٨﴾

قَالُوا يَا بُولَاقَ مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا ۗ هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ

الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٩﴾ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٦٠﴾

﴿۵۴﴾ اِذَا لَمْ يَطْعَمَهُ دَلَّ عَلَىٰ اِنَّهُ لَمْ يَشَا اِطْعَامَهُ فَنَحْنُ اِذَا احْتَقَّ بِذَلِكَ (تبیان)



## فَالْيَوْمَ لَا تُظَلِّمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٣﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ وعید کب سامنے آئے گا اگر تم لوگ سچے ہو، وہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر ایک مہیب آواز کا جو انہیں اپنی گرفت میں لے لے اسی عالم میں کہ وہ یونہی جھگڑا کرنے میں مصروف ہوں تو وہ نہ وصیت کر سکیں اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف واپس جاسکیں اور صور پھونکا جائے گا تو ایک دم وہ اپنی قبروں سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑتے ہوں گے اور کہیں گے وائے ہو ہمارے حال پر، کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھایا؟ یہ وہ ہے جو خدائے رحمن نے وعدہ وعید کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ سچ بتایا تھا۔ نہ تھی سو ایک مہیب آواز کے جس کے بعد ایک دم وہ ہماری بارگاہ میں حاضر تھے تو آج کسی تنفس کے حق میں کچھ کمی نہ ہوگی اور نہ تمہیں سزا ملے گی سو اس کے جو تم اعمال کرتے تھے۔“

## قیامت کے جسمانی ہونے پر تمام انبیاء کا اتفاق

حشر میں اٹھائے جانے کے بعد ان کا یہ قول کہ یہ وہ ہے جو خدائے رحمن نے وعدہ وعید کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ سچ بتایا تھا، یا ایک تفسیر کے مطابق فرشتوں کا یہ کہنا۔ [۱] اس کی دلیل ہے کہ تمام پیغمبروں نے ہمیشہ حشر و نشر کی یہی صورت بتائی ہے جسے تمام مسلمان مانتے ہیں اور ترقی یافتہ آزاد ذہن والے مفکرین جو اس سے الگ کوئی تصور جزا و سزا کا پیش کرتے ہیں، وہ انبیاء مرسلین کی بتائی ہوئی کیفیت کے بہر حال خلاف ہے لہذا اسلام میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فُكِهُونَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلِّ عَلَى  
الْأَرَائِكِ مُتَّكِنُونَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَّا يَدْعُونَ ﴿٥٧﴾ سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ

رَبِّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾ وَامْتَأَزُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمَجْرُمُونَ ﴿٥٩﴾

”بلاشبہ بہشت والے اس دن اپنے اپنے مشغلے میں خوش ہوں گے، وہ اور ان کی بیویاں سائبانوں میں تختوں کے چوکوں پر لگے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے لئے اس میں پھل ہوں گے اور ان کے لئے جو وہ فرمائش کریں مہیا ہوگی۔ مہربان پروردگار کی زبانی ان پر سلام ہوگا اور تم الگ ہو جاؤ اے گنہگارو!“

یدعون کا ترجمہ ”آرزو کریں گے“ کے ساتھ محاورہ عرب کے مطابق کیا تو جاسکتا ہے مگر اس محاورہ ہی کی بنا پر اس آرزو کے ساتھ دوسرے پر اس کے اظہار کا جز مضمحل ہوتا ہے۔ [۲] لہذا میں نے ترجمہ میں ”فرمائش“ کے لفظ کو زیادہ مناسب سمجھا ہے۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يٰبَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾

[۱] قالت الملائكة (علی بن ابراہیم)

[۲] قال ابو عبیدة تقول العرب: ادع علی ماشئت ان تمنّ ماشئت (تبیان)

وَأَنْ اَعْبُدُونِي ۚ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۗ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾

”کیا میں نے تم سے پہلے سے نہیں کہہ دیا تھا اے اولاد آدم کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور یہ کہ میری عبادت کرنا یہ سیدھا راستہ ہے اور اس نے (پھر بھی) گمراہ کر دیا تم میں سے بہت سی مخلوق کو تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے“۔

یعنی پہلے سے جانتے تھے کہ یہ تمہارا دشمن ہے جسے خلقت آدم و حوا کے بعد ہی خالق نے بنا دیا تھا اور شیطان کی دشمنی سے ڈرا یا تھا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے پھر تم جانتے بوجھتے ہوئے اس کے کہنے میں آکر گمراہ کیوں ہوئے؟

هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٦٣﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٦٤﴾

”یہ ہے وہ دوزخ جس سے تم کو ڈرایا جاتا تھا۔ آج اس کی گرمی کو اٹھاؤ سزا میں اس کی جو تم انکار کرتے تھے“۔ ماضی اور حال کے صیغوں کے اختلاف سے صاف نمایاں ہے کہ وہ دور اور تھا جس میں آج کی خبر دے کر ڈرایا جاتا تھا اور وہ بھی ”جاتا تھا“ ماضی استمراری کے عنوان سے جس کا مطلب یہ ہے کہ برابر ایسا ہوتا رہتا تھا جس میں ایک لاکھ چوبیس ہزار اور قیامت تک کے ان کے جانشینوں کا دور ہے۔ [۱] اور یہ اس کے بعد کا دوسرا دور ہے جو ”آج“ ہے اور جس کے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ افْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾

”آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے دہنوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پیر ان اعمال کی جو وہ کرتے تھے“۔

### زبانوں کی بجائے ہاتھ پیروں کی گواہی کی نوعیت

یعنی ان کی زبانیں خاموش ہو جائیں گی تو ہاتھ پیروں کا کام دنیا میں بات کرنا نہ تھا، ان کے خلاف ان کی بد اعمالیوں کی گواہی دے رہے ہوں گے۔ [۲] اب یہ گواہی کیوں کر دے رہے ہوں گے؟ خالق ان میں قوت گویائی پیدا کر دے گا؟ یا ان میں آواز خلق فرما دے گا؟ یہ زبان مقال سے نہیں ہوگا بلکہ کچھ ایسے علامات ان میں ظاہر ہوں گے جو ان بد اعمالیوں کا ثبوت ہوں؟ جناب شیخ الطائف نے کہا ہے کہ ان میں سے ہر بات ممکن ہے۔ [۳] اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کیفیت کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

[۱] کنتم تو عدون بہا فی دار التکلیف (تبیان و مجمع البیان)

[۲] ای نستنطق الاعضاء الَّتِي لَا تَنْطِقُ فِي الدُّنْيَا تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ عَلَىٰ افْوَاهِهِمُ الَّتِي عَاهَدْنَا مِنْهَا النَّطْقَ (مجمع البیان)

[۳] کلُّ ذَلِكْ جَائِزٌ (تبیان)

وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّى يُبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ

نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ وَلَا يَسْتَبِقُونَ ﴿٦٧﴾

”اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھوں کو ناپید کر دیتے پھر وہ دوڑ کر راستہ چلنا چاہتے تو انہیں دکھائی کہاں سے دیتا اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ پر انہیں مسخ کر دیتے تو وہ نہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے پلٹ سکتے۔“

مطلب یہ ہے کہ رحمت الہی اس کی متقاضی ہے کہ محتم عذاب میں ہو ورنہ سزا دینے کی بہت صورتیں تھیں جن میں سے بعض کا یہاں

تذکرہ ہے۔ [۱]

وَمَنْ نُّعَبِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۗ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

”اور جسے ہم زیادہ عمر دیتے ہیں، اُسے خلقت میں الٹ دیتے ہیں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے؟“

پیرانہ سالی کی کیفیت کو یاد دلانے کا مقصد

اُس کی مناسبت گذشتہ آیت کے مضمون سے جو ذکر آخرت کے سلسلہ میں ہے یوں بیان کیا گیا ہے کہ دیکھو جوانی کے بعد بڑھا پا آتا

ہے اور طاقتیں کمال کی منزل پر پہنچ کر رو بہ زوال ہو جاتی ہیں جو خدا اس پر قادر ہے، وہ موت کے بعد زندگی دینے پر بھی قادر ہے۔ [۲]

مجھے یہ مناسبت کچھ زیادہ ذہن نشیں محسوس نہیں ہوتی۔ ہماری قدیم تفسیر سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق سابق کے سلسلہ کلام سے نہیں

ہے بلکہ وہ رد ہے دہریوں کی جو منکر خدا ہے۔ [۳] ادہریوں کا تصور یہ ہے کہ مادے کے اجزاء ہی ہیں جن کے اجتماع سے کائنات کی تشکیل ہوتی ہے

۔ اس کا ایک انداز تھا جو بعد میں ڈارون کے ”فلسفہ نشو و ارتقا“ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ردیوں ہے کہ اگر مادہ کی طبیعت میں ترقی ہے تو انسان شباب

کے بعد نشیب کی منزل میں کیوں آتا ہے اور پھر کبھی تو یہ عالم ہو جاتا ہے کہ اُس کی تمام فکر و نظر کی طاقتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہ مشاہدہ اس کا

ثبوت ہے کہ ارتقاء مادہ کا کوئی طبعی فعل نہیں ہے بلکہ خالق کے فیض و عطا کا نتیجہ ہے اور اس لئے جب چاہتا ہے۔ اس نعمت کو سلب کر لیتا ہے۔

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ﴿٦٩﴾ لِيُنذِرَ مَنِ

كَانَ حَيًّا وَيَجِئَ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٠﴾

”اور ہم نے انہیں شاعری نہیں سکھائی ہے اور نہ وہ ان کے لئے زیبا ہے، وہ نہیں ہے سوا یاد دہانی اور صاف روشن

قرآن کے تاکہ اُسے خوف دلائیں جس میں زندگی ہو اور رحمت تمام ہو جائے کافروں پر۔“

[۱] المعطی ولو نشاء لعذبناهم بنوع آخر من العذاب (مجمع البيان)

[۲] افلا تعذبون في ان الله تعالى قادر على اعادة كما قدر على ذلك (مجمع البيان) افلا يعقلون ان القادر على ذلك المعلوم عندهم

قادر على البعث فيؤمنون (جلالين)

[۳] ارد على الزنادقة الذين يبطلون التوحيد (علي بن ابراهيم)

عرب جاہلیت کے یہاں معیار فصاحت و بلاغت شعر تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اسالیب بیان پر قدرت کا سرچشمہ شاعری ہے لہذا حکمت الہی کا پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے تقاضا یہ تھا کہ آپ کے خداداد کمالات میں شاعری کی جگہ نہ ہو۔ تاکہ آپ جو قرآن پیش فرما رہے ہیں اور وہ فصاحت کے بلند ترین نقطہ پر ہے اُس میں یہ شبہ نہ ہو کہ یہ آپ کے ملکہ شاعری کا نتیجہ ہے جس طرح آپ کا معجزہ چونکہ کتاب کی نوعیت کا تھا لہذا آپ کو کتابت کے فن سے الگ رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے فن کتابت کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی، اسی طرح اس سے کہ ”ہم نے ان کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کے لئے زیبا ہے“ اس فن کی کوئی تنقیص مد نظر نہیں جب کہ رسول کے علاوہ دیگر ہمارے معصومین ﷺ کی شعر گوئی مسلم ہے اور خود پیغمبر نے اکثر اشعار کی مدح فرمائی اور کچھ شعراء کی ہمت افزائی فرمائی۔

جناب شیخ الطائف فرماتے ہیں:-

مَا عَلَّمَنَهُ الشَّعْرَ لَا تَه لَوْ عَلَّمَنَا ذَلِكَ لَدَخَلْتَ بِهِ الشَّبَهَةَ عَلَى قَوْمٍ فِي مَا آتَى بِهِ مِنَ الْقُرْآنِ وَ إِنَّهُ قَدَّرَ عَلَى ذَلِكَ لَهَا فِي طَبَعِهِ مِنَ الْفِطْنَةِ لِلشَّعْرِ (تبیان)

ہم نے انہیں شاعری نہیں سکھائی ہے اس لئے کہ اگر ہم انہیں یہ ملکہ عطا کرتے تو اس سے ایک طبقہ کوشبہ ہوتا اس قرآن میں جسے وہ لائے ہیں اور وہ یہ سمجھتے کہ آپ اس پر قادر ہوئے اس شاعری کے سلیقہ کی وجہ سے جو آپ کی طبیعت میں ہے۔ علامہ طبرسی نے تحریر فرمایا ہے:

قد صحَّ أنَّه كان يسمع الشعر ويحث عليه وقال لحسان بن ثابت لا تزال يا حسان مؤيدا بروح القدس ما نصرتنا بلسانك (مجمع البيان)

یہ بات پایہ صحت تک پہنچی ہے کہ آنحضرت اشعار سنتے تھے اور شعر کہنے کی ترغیب دیتے تھے اور آپ نے حسان بن ثابت سے فرمایا اے حسان برابر روح القدس تمہیں مدد دیتے رہیں گے جب تک تم اپنی زبان سے ہماری مدد کرتے رہو گے۔

**أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِنَّا جَمِيعًا قَدَرًا مِّمَّا كَفَرُوا لَقَدْ جَاءَهُمْ بَيِّنَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ قَدْ كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤١﴾**

**وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ﴿٤٢﴾ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبٌ ۖ**

**أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٤٣﴾**

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے پیدا کیا ان چیزوں میں سے جنہیں ہمارے ہاتھوں نے بنایا چوپایوں کو تو وہ انہیں اپنی ملکیت میں رکھتے ہیں اور ہم نے انہیں ان کے قابو میں دیا تو ان میں سے ان کی سواری میں کام آنے والے بھی ہیں اور ان میں بعض میں سے ان کی غذا بھی ہے اور ان کے لئے ان میں مختلف فائدے کی چیزیں اور پینے کے دودھ بھی ملتے ہیں تو وہ کیوں شکر گزار نہیں ہوتے؟“

چونکہ کھانے اور پینے کا جو گوشت اور دودھ سے متعلق چیزیں ہیں، ذکر صراحتاً پہلے اور بعد ہوا ہے اور سوار ہونے کا بھی تو اب جو اُس کے علاوہ مختلف فائدہ والی چیزیں کہا گیا تو یہ پہننے، اوڑھنے اور بچھانے کے کام کی چیزیں ہوں گی جیسے کھال، اون اور بال۔ [۱]

[۱] من منافعها لبس اصرافها واشعارها و اوبارها (مجمع البيان)

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهَةً لَعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٦﴾ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ ۖ  
وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحَضَّرُونَ ﴿٤٧﴾ فَلَا يَجْزِيكَ قَوْلُهُمْ مَرَاتًا نَعَلِمُ مَا يُبْسِرُونَ وَمَا  
يُعْلِنُونَ ﴿٤٨﴾

”اور انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت خدا بنا لئے کہ شاید انہیں مدد مل سکے، وہ ان کی مدد پر قدرت نہیں رکھتے اور ان کی پوری فوج ان کے لئے موجود ہے تو ان کی باتیں آپ کے لئے رنج کا باعث نہ ہوں، بلاشبہ ہم جانتے ہیں اُسے جو وہ چھپاتے ہیں اور اُسے جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔“

”اُن کی پوری فوج اُن کے لئے موجود ہے“ کس کی فوج کس کے لیے؟ بعض نے پہلی ضمیر بتوں کی طرف پلٹائی ہے اور دوسری بت پرستوں کی طرف جس سے اُن بتوں کی کثرت کا اظہار ہے۔ [١] اور مُحَضَّرُونَ ”ان کے لئے موجود ہے“ اس کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ وہ بھی اُن کے ساتھ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ [٢] دوسری تفسیر یہ ہے کہ پہلی ضمیر بت پرستوں کی طرف راجع ہے اور دوسری بتوں کی طرف مطلب یہ ہے کہ وہ بت تو اُن کی پوری فوج اُن بتوں کی مدد کے لئے کمر بستہ رہتی ہے۔ [٣] حقیقت یہ ہے کہ باتیں بحیثیت واقعہ یہ سب درست ہیں، وہ بت ان کے واقعی اتنی کثرت کے ساتھ ہیں کہ ایک اچھی خاصی فوج کی حیثیت رکھتے ہیں مگر باوجود اس کثرت کے انہیں فائدہ نہیں دے سکتے۔ یہ بھی قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے ثابت ہے کہ وہ بت بھی اُن کے ساتھ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے اور ان کے سامنے وہاں حاضر و موجود ہوں گے۔ یہ بھی کہ یہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ہر وقت اُن بتوں کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں مگر یہ بھی انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ سب باتیں ٹھیک ہیں۔ [٤] اور ہر ایک پر الفاظ قرآنی بلا تکلف منطبق ہیں مگر الفاظ قرآن سے بوقت واحد دونوں رخ مراد نہیں ہو سکتے لہذا یہ کہ مراد الہی ان الفاظ سے کیا ہے؟ اس کے لئے ہم العلم عند اللہ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿٤٩﴾ وَصَرَبَ لَنَا  
مَثَلًا ۖ وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۗ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٥٠﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي  
أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٥١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ  
الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِّنْهُ تُوقَدُونَ ﴿٥٢﴾ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ

[١] ایں بتاں بدای ایشاں لشکدی حاضد کہ وہ شدہ اند (شاہ ولی اللہ)

[٢] محضرون فی النار معہم (جلالین)

[٣] ہم لهم ای للالهة جند محضرون (علی بن ابراہیم) قال قتادة یعنی ہم یغضبون للاوثان فی الدنیا (تبیان)

[٤] فلا الجند یدفعون عنها الاحراق ولا ہی تدفع عنهم العذاب (مجمع البیان)

وَالْأَرْضُ بِقَدْرِ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۖ بَلَىٰ ۖ وَهُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ ﴿٨١﴾

”کیا آدمی نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے نطفے سے پیدا کیا جس کے بعد اب وہ زیادہ بحث کرنے والا ہے اور اس نے ہمارے لئے ایک مثال پیش کی اور خود اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا کہ کون زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو جب کہ وہ بالکل بوسیدہ ریزہ ریزہ ہیں؟ کہیں کہ انہیں زندہ کرے گا وہی جو انہیں پہلی دفعہ وجود میں لایا تھا اور وہ ہر مخلوق سے خوب واقف ہے وہ جس نے تمہارے لئے سرسبز و شاداب درخت سے آگ پیدا کی تو ایک دم تم اُسے سلگا کر بھڑکاتے ہو، کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کے ایسے اور پیدا کر دے؟ کیوں نہیں جب کہ وہ بڑا پیدا کرنے والا بڑا جاننے والا ہے۔“

مشرکین کے اعتراض کی نوعیت جو معاد جسمانی کا ثبوت ہے

مشرکین کے اعتراضات و استبعادات جو باجاً قرآن مجید میں موجود ہیں اور جس طرح قرآن نے ان کا جواب دیا ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے، سب اُسی معاد کی قطعی دلیل ہیں جسے عام مسلمان مانتے ہیں۔ نہ جو ترقی پسند فلسفی قسم کے بحیال خود ”ذی علم مسلمان“ اُس کا تصور پیش کرتے ہیں۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِي بِيَدِهِ

مَلَكَوٰتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٣﴾

”اس کی بات تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو چاہتا ہے، کہہ دیتا ہے ”ہو جا“ اور فوراً ہی وہ ہو جاتی ہے تو پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے اور اُسی کی طرف تم پلٹ کر جاؤ گے۔“

یوں الگ سے بھی ان آیات کا مفہوم مکمل ہے جس کے تمام اجزاء دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن گذشتہ سلسلہ کلام کے ربط سے یہ اُس کا تہہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو ہر بات پر قادر اس طرح کہ اُس کے ارادہ کے ساتھ ہی جو اُس کا مقصد ہو، وہ بلا فاصلہ وجود میں آجائے تو دوبارہ اس خلق کا وجود میں لانا اُس کے دائرہ قدرت سے باہر کیوں کر سمجھا جاسکتا ہے۔ [۱]

[۱] من قدر علی کلّ شئی قدر علی احياء العظام الرّميم وعلی خلق کلّ شئی وافنائہ واعادته (مجمع البيان)

# سُورَةُ الصَّفَاتِ

مکیہ --- ۱۸۲ --- آیات

اس سورہ میں بسم اللہ کے بعد پہلا ہی لفظ 'والصافات' ہے اسی پر اس کا نام ہو گیا۔

## سورہ صافات کے خاص خاص مضامین:

۱۔ خدا مشرقوں کا پروردگار ہے جس سے مشرقوں کی کثرت اور ضمناً سورجوں کی کثرت ظاہر ہوتی ہے جس سے تھوڑے ہی عرصے پہلے تک دنیا بے خبر تھی۔

۲۔ سیاروں کے ذریعے شیطانوں کے لئے عالم بالا پر جانے سے رکاوٹ کا سامان اور 'شہاب ثاقب' کا تیر باران۔

۳۔ پیشواؤں اور پیروؤں کی ایک دوسرے کو لعنت ملامت جس کا ذکر طرح طرح سے قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ہے۔

۴۔ اہل بہشت کی بہشت میں جانے پر بالیدگی اور آپس کی گفتگو۔

۵۔ بہشت سے دوزخ کا منظر دیکھنے کا امکان اور منکر آخرت کے انجام کا مشاہدہ۔

۶۔ درخت زقوم کا ذکر جو اس کے بعد سورہ واقعہ میں بھی ہے۔

۷۔ حضرت نوحؑ کی فریاد اور اس کی بنا پر خالق کا انہیں اور ان کے ساتھ والوں کو نجات دینا۔

۸۔ حضرت ابراہیمؑ کی اپنی قوم سے گفتگو، پھر بت شکنی اور نتیجتاً آگ میں پھینکا جانا۔

۹۔ قربانی جناب اسماعیلؑ کا مفصل تذکرہ اور فریہ کا آنا۔

۱۰۔ ذبح عظیم۔

۱۱۔ جناب الیاسؑ کا ذکر۔

۱۲۔ جناب یونسؑ کا ذکر اور آپ کی قوم کی کثرت تعداد، عذاب آنے کے بعد اس کا رد ہونا اور ان کا ایمان لانا۔

۱۳۔ متعدد انبیاء پر باری باری سلام۔

۱۴۔ نتیجہ میں پیغمبروں کے مشن کی مختتم کامیابی کا اعلان جس کا پورا نتیجہ سامنے آنا باقی ہے اور اسی کا اہل ایمان کو انتظار ہے۔

۱۵۔ ختم سورہ پر وہ آیات جو بطور آداب تلاوت قرآن کے بعد پڑھے جاتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

وَالصَّفَاتِ صَفًّا ۝۱۱۱ فَالزُّجْرَاتِ زَجْرًا ۝۱۱۲ فَالثَّلَاثِ ذِكْرًا ۝۱۱۳ إِنَّ إِلَهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۱۱۴

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝۱۱۵

”قسم ہے پورے طور پر صف باندھنے والی ہستیوں کی، پھر بڑی شدت کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کرنے والیوں کی، پھر ذرا الہی کی تلاوت کرنے والیوں کی کہ یقیناً تمہارا خدا ایک ہے جو آسمانوں اور زمینوں اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا مالک اور تمام مشرقوں کا پروردگار ہے۔“

## آفتابوں کی کثرت

یہ اوصاف جنہیں سرنامہ قرار دے کر قسم کھائی گئی ہے، بظاہر فرشتوں سے متعلق ہیں جو مختلف فرائض اور انتظامات پر مامور ہیں۔

ان کے وصف ”صف بستہ“ میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عبادت الہی میں صف بستہ رہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اپنے پر وبال کو ملا کر ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ [۱] اور ڈانٹ ڈپٹ سے مراد یہ لی گئی ہے کہ وہ بادلوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر اُن کے راستوں پر لگاتے ہیں۔ (۱) مگر ہماری قدیم تفسیر جو اکثر و بیشتر روایات معصومین پر مبنی ہے، یہ بتلاتی ہے کہ اس میں انبیاء و مرسلین اور تمام عبادات گزار فرض شناس بھی داخل ہیں کہ وہ عبادت الہی میں صف بستہ ہوتے ہیں اور ہر ایک کو معاصی الہیہ پر نہی عن المنکر کے طور پر حسب ضرورت ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتے ہیں۔ [۲]

آیات مذکورہ کے آخر میں جو ہے: ”وَرَبُّ الْمَشَارِقِ“ تمام مشرقوں کا پروردگار“ تو جب تک دنیا کا یہ تصور تھا کہ سورج بس ایک ہے اور اس لئے منطق میں اس کئی کے لئے جو فرد واحد میں منحصر ہو، مثال میں آفتاب ہی کا نام لیا جاتا تھا، اس وقت تک علمائے تفسیر مجبوراً ”تمام مشرقوں“ سے مراد اسی آفتاب کے موسموں کے اختلاف کے ساتھ مختلف نقاط سے طلوع ہونے کے مقامات لیتے تھے۔ [۳] مگر اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ جتنے تارے ثابت کہلاتے ہیں، وہ سب درحقیقت اپنے اپنے نظام سیارات کے لئے آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں تو اب مشرقوں کی کثرت کا تصور بالکل آسان ہو گیا ہے اور تیرہ سو برس پہلے ہمارے رہنمایان دین نے بھی آفتابوں کی کثرت کا پتہ دے دیا تھا۔ [۴]

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ ۝۱۱۶ وَحِفْظًا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۝۱۱۷

لَا يَسْبَعُونَ إِلَى الْمَلَأِ الْأَعْلَى وَيُقَذَّفُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝۱۱۸ دُحُورًا وَلَهُمْ

[۱] اختلاف فی معنی الصافات علی وجوہ اchiedا انہا الملائكة تصف انفسها صفوا فی السماء کصفوف المؤمنین فی الصلوة وثانیہا تصف اجنحتہا فی الهواء (مجمع البیان)

[۲] الملائكة نرجو السحاب (جلالین)

[۳] الملائكة والانبیاء ومن یصف لله وعبده فالزجرات زجر الذین یزجرون الناس والتالیات ذکر الذین یقرءون الكتاب (علی بن ابراہیم)

[۴] لها کل یوم مشرق و مغرب (جلالین)



### عَذَابٌ وَأَصِيبٌ ۙ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝۱۰

”بلاشبہ ہم نے نیچے والے آسمان کو آراستہ کیا خاص آرائشی ستاروں سے اور حفاظت کے واسطے ہر سرکش شیطان سے، وہ کان نہیں لگا سکتے عالم بالا کی باتوں کی طرف اور انہیں تیر پڑتے ہیں ہر طرف سے دفع کرنے کے لئے اور اُن کے لئے لازمی سزا ہے سوا اُس کے جو ایک دم اچک لے جائے تو اس کا پیچھا کرتا ہے ایک ٹوٹنے والا تارا۔“

دوسرے آیات قرآنی کی بنا پر عام طور سے ذہن میں یہی رہا ہے کہ ”شہاب ثاقب“ جو ٹوٹنے والے تارے ہیں، انہی کو شیطانوں کے لئے آسمانوں پر جانے سے رکاوٹ کا ذریعہ بنایا گیا ہے اور وہی وہ تیر ہیں جو شیطانوں پر پڑتے ہیں مگر یہاں کے مذکورہ آیات میں ستاروں کو جو آسمانوں کی آرائش کا ذریعہ ہیں۔ شیطان سے حفاظت اور عالم بالا کی باتوں کے سننے سے رکاوٹ کا ذریعہ بتانے کے بعد ”شہاب ثاقب“ یعنی ٹوٹنے والے تارے کا ذکر الگ سے کیا گیا ہے کہ وہ آسمانی راز کو اچک لے جانے کے بعد شیطان کا پیچھا کرتا ہے۔ یہ اجمالی طور پر قرآن کا مفہوم یقینی ہے لیکن اُس کی تفصیلی کیفیت سمجھنا ہمارے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهْمَ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَنِ خَلَقْنَا ۖ إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّن طِينٍ لَّازِبٍ ۝۱۱  
 بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۝۱۲ وَإِذَا دُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ ۝۱۳ وَإِذَا رَأَوْا آيَةً  
 يَسْتَسْخِرُونَ ۝۱۴ وَقَالُوا إِن هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝۱۵ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا  
 وَعِظَامًا ۖ إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۝۱۶ أَوْ أَبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۝۱۷ قُلْ نَعَمْ وَأَنْتُمْ دَاخِرُونَ ۝۱۸  
 فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ ۝۱۹ وَقَالُوا يَوْمَئِذٍ هَذَا بَدِيعُ  
 هَذَا يَوْمِ الْفَصْلِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝۲۰

”تو اُن سے خود پوچھو کیا وہ خلقت میں زیادہ طاقت ور ہیں یا اور جو ہم نے پیدا کیے؟ ان کو ہم نے لیسدا رٹی سے پیدا کیا مگر آپ حیرت میں ہیں اور وہ مذاق اڑاتے ہیں اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اثر نہیں لیتے اور جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ہنسی اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے کچھ سوا کھلے ہوئے جادو کے، کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیوں کی شکل میں ہوں گے تو ہم زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے پہلے کے باپ دادا بھی؟ کہتے ہیں ہاں اور تم ذلیل و خوار ہو گے بس وہ ایک نعرہ ہوگا جس کے بعد وہ ایک دم دیکھ رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ارے وائے ہو ہم پر یہ جزا سزا کا دن ہے؟ (ہاں) یہ وہ فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔“

”آپ حیرت میں ہیں اور وہ مذاق اڑاتے تھے“ یعنی اتنے کھلے ہوئے دلائل حقانیت کے ہوتے ہوئے اُن کا انکار ایسی خلاف توقع

بات ہے کہ آپ حق بجانب طور پر اُس سے حیرت میں ہیں کہ یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقتوں کو تسلیم نہیں کرتے اور اُن کی بوالعجبی یہ ہے کہ وہ آپ کی اس حیرت پر آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ [۱]

اُن کا یہ کہنا کہ جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیوں کی شکل میں ہوں گے تو کیا ہم زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، جو یہ نہیں بلکہ ذرا ذرا سے اختلاف الفاظ کے ساتھ متعدد جگہ ہے اور ہر جگہ ہم نے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے، یہ اس کی دلیل ہے کہ انبیاء و مرسلین قیامت کا جو تصور پیش کرتے تھے، وہ یہی تھا جسے عام مسلمان متفقہ طور پر مانتے ہیں اور فلسفی حضرات یا اس زمانے کے بخیاں خود روشن خیال جس طرح اُس کا تصور پیدا کرتے ہیں، وہ تعلیم انبیاء کے خلاف ہے، ورنہ قرآن کا اُن کے استنبادات کے جواب میں یہ کہہ دینا کافی تھا کہ ہم کب کہہ رہے ہیں کہ یہ جسم بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائیگا؟ بس جھگڑا ختم ہو جاتا مگر قرآن طرح طرح سے یہی سمجھا رہا ہے کہ ہاں ایسا ہی ہوگا اور وہ قدرت الہی سے بعید نہیں ہے۔

أَحْشَرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿۳۲﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ  
فَاهْدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴿۳۳﴾ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ ﴿۳۴﴾ مَا لَكُمْ لَا  
تَنصَرُونَ ﴿۳۵﴾ بَلْ هُمْ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ﴿۳۶﴾

”اٹھ کر کے لے جاؤ ان کو جو ظلم کرتے رہے، اُن کے تمام ہم جنسوں اور انہیں جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے تو انہیں راستہ دکھاؤ دوزخ کا اور ٹھہراؤ انہیں۔ یقیناً اُن سے پوچھ گچھ ہوگی کہ کیا بات ہے اب تم ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کرتے بلکہ وہ تو اب سر جھکائے ہوئے ہیں۔“

یہ تفصیلات دیکھیے اور اپنے ضمیر سے فیصلہ لیجئے کہ کیا ان میں کسی تاویل، مجاز اور استعارہ کے تصور کی گنجائش ہے؟  
الَّذِينَ ظَلَمُوا کے ساتھ جو ہے: وَأَزْوَاجَهُمْ، اُس کے کھلے ہوئے معنی تو ہیں ”اور اُن کی بیویوں کو“ جو ایک قول ہے مگر اہل تحقیق کی اکثریت نظائر قرآنی کی مدد سے اُس کا مفہوم یہ لیتی ہے کہ یہ ہر گنہگار کو اُس کے قبیل کے دوسرے مجرموں کے جتنے میں محشر میں لائے جانے کا حکم ہے۔ [۲] اور اسی لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

وَأَقْبَلْ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿۳۷﴾ قَالُوا إِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَأْتُونَنَا عَنِ  
الْيَمِينِ ﴿۳۸﴾ قَالُوا بَلْ لَمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۳۹﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِنْ  
سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِينَ ﴿۴۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا ۗ إِنَّآ لَذٰبِقُونَ ﴿۴۱﴾

[۱] عجبیت یا محمد ﷺ من تکذیبہم ایاک وہم یسخرن من تعجبک (مجمع البیان)

[۲] فیکون معنی ان صاحب الزنا یحشر مع اصحاب الزنا و صاحب الخمر مع اصحاب الخمر انی غیر ہم (مجمع البیان)



إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۖ يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٣٥﴾ وَيَقُولُونَ آيِنَّا  
لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ﴿٣٦﴾ بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّكُمْ  
لَذَائِقُوا الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَ  
اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ ﴿٤٠﴾

”وہ ایسے لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا تھا سو اللہ کے کوئی خدا نہیں تو وہ گھمنڈ سے کام لیتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم اپنے خداؤں کو ایک دیوانے شاعر کی خاطر سے چھوڑ دیں؟ بلکہ وہ حق کے ساتھ آیا ہے اور اس نے پیغمبروں کی سچائی ثابت کی ہے۔ یقیناً تم لوگ دردناک عذاب کا مزہ چکھنے والے ہو اور تمہیں سزا نہیں ملے گی سوا اُس کے جو تمہارے اعمال تھے مگر اللہ کے نکھارے ہوئے بندے۔“

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهَ ۖ وَهُمْ مُكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾  
عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَدَّةٍ  
لِّلشَّرِبِ بَيْنَ ۖ لَا فِيهَا غَوْلٌ ۖ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْفَوْنَ ﴿٤٦﴾ وَعِنْدَهُمْ قَصْرٌ مِّنَ الظَّرْفِ  
عَيْنٍ ﴿٤٧﴾ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ﴿٤٨﴾

”یہ وہ ہیں جن کے واسطے معینہ روزی ہے طرح طرح کے پھل اور وہ نوازے ہوئے ہیں باغبانے بہشت میں تختوں پر ایک دوسرے کے مقابل، اُن پر لطیف شراب کے جام گردش کر رہے ہوں گے سفید سفید پینے والوں کے لئے سراسر لذت، نہ اُس میں بدحواسی ہے اور نہ اُس سے اُن میں بکنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُن کے پاس نگاہوں کو مقید رکھنے والی بڑی آنکھوں والیاں ہوں گی جو پردوں میں چھپے ہوئے شتر مرغ کے انڈوں کی سی ہوں گی۔“

ہمارے ہندوستانی مذاق میں حسین چہرے کے رنگ کی تعریف سرخ و سفید ہوتا ہے، عرب میں زرد و سفید رنگ بہت اچھا سمجھا جاتا تھا اور شتر مرغ کے انڈوں کا رنگ ایسا ہی ہوتا ہے۔

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٥٠﴾ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي  
قَرِينٌ ﴿٥١﴾ يَقُولُ آيِنِكَ لَبِنَ الْمُصَدِّقِينَ ﴿٥٢﴾ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَآتَانَا  
لَمَدِينُونَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُّطَّلِعُونَ ﴿٥٤﴾ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي سَوَاءٍ الْجَحِيمِ ﴿٥٥﴾ قَالَ  
تَاللَّهِ إِنْ كِدَتْ لَتُرْدِينَ ﴿٥٦﴾ وَلَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٥٧﴾ أَمْ أَمَّا نَحْنُ

### بِمَيْتَيْنِ ﴿٥٨﴾ إِلَّا مَوْتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَدَّبِينَ ﴿٥٩﴾

”تو اُن میں کا ایک دوسرے کی طرف مڑے گا آپس میں سوال و جواب کرتے ہوئے، اُن میں سے ایک نے کہا کہ میرا ایک رفیق تھا، وہ کہتا تھا کہ کیا تم سچ مانتے ہو کہ جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیوں کی صورت میں ہوں گے تو کیا ہمیں جزا و سزا ملے گی؟ کہے گا کہ کیا تم جھانک کر دیکھو گے؟ اب اُس نے جھانک کر دیکھا تو اُس سے بیچوں بیچ دوزخ میں پایا، کہا خدا کی قسم تو مجھے ہلاک کیا ہی چاہتا تھا اور اگر میرے پروردگار کا فضل و کرم نہ ہوتا تو میں بھی اسی گروہ میں موجود ہوتا تو (اب بتا) کیا ہم نہیں مرنے والے ہیں مگر بس پہلی دفعہ والی موت اور کیا ہم سزا پانے والوں میں نہیں ہیں؟“

صاف یہ آیت جزا و سزا کے اسی تصور کی تصدیق کرتی ہے جو عموماً مسلمانوں کے مذہبی طبقے میں عوام اور تقریباً تمام خواص میں مسلم ہے اور ضروریات دین اسلام میں سے ہے اور اب ہر فلسفی قسم کا تصور کتنے ہی ترقی یافتہ غلافوں میں لپیٹ کر اس کے علاوہ پیش کیا جائے، قرآن مجید کے انہی تازیانوں کی زد میں ہوگا، جن کا اس مکالمے کی شکل میں اُس جزا و سزا کی تکذیب کرنے والوں یا مشکوک بنانے والوں کی تنبیہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

إِنَّ هَذَا هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٠﴾ لِيَسْئَلِ هَذَا فَلَیَعْمَلِ الْعَمَلُونَ ﴿٦١﴾ أَذَلِكْ خَيْرٌ نُّزُلًا  
 أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ﴿٦٢﴾ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِلظَّالِمِينَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ  
 الْجَحِيمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيْطَانِ ﴿٦٥﴾ فَإِنَّهُمْ لَا يَكُونُ مِنْهَا فَمَالِئُونَ  
 مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ  
 لَإِلَى الْجَحِيمِ ﴿٦٨﴾

”بلاشبہ یہ ہے بڑی کامیابی، یہ ایسی چیز ہے جس کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے کیا یہ مہمانی کے طور پر بہتر ہے یا زقوم کا درخت؟ یقیناً ہم نے اُسے مصیبت بنایا ہے ظالموں کے لئے۔ وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی تہ سے برآمد ہوتا ہے، اُس کی پھنگی ایسی ہے جیسے شیطانوں کے سر۔ وہ اُس میں سے کھائیں گے تو اُس سے پیٹ بھریں گے، پھر اُن کے لئے اُس پر سے گرم پانی کی آمیزش ہوگی پھر اُن کی دوزخ کی طرف بازگشت ہوگی۔“

”یہ“ یعنی آخرت کی جزا و سزا کا تصور اس دنیا میں قائم رکھنا جو منکر معاد سے مخاطب میں سابق کے آیات سے نمایاں ہوتا ہے اور اُس کے نتیجے میں وہ جزا و سزا کا بطور سامان ضیافت اُس سے قبل کے آیات میں ذکر آیا ہے، بہت بڑی کامیابی ہے اور پھر ایک تازیانہ تنبیہ کے طور پر یہ سوال ہے کہ یہ سامان ضیافت اچھا ہے یا وہ سامان جس کا بطور سزا بعد میں ذکر ہو رہا ہے؟

إِنَّهُمْ أَفْوَا أَبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلَىٰ آثَرِهِمْ يُهْرَعُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ

أَكْثَرُ الْأُولَئِينَ ﴿٤٤﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُنْذِرِينَ ﴿٤٥﴾ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ  
الْمُنْذِرِينَ ﴿٤٦﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٧﴾

”انہوں نے اپنے باپ داداؤں کو گمراہ پایا تو وہ بھی بے تحاشا انہی کے نقش قدم پر دوڑتے رہے حالانکہ ان کے پہلے والے زیادہ تر لوگ گمراہ ہی تھے اور بے شک ہم نے ان میں خوف دلانے والے (پیغمبر) بھیجے تھے تو دیکھو کیا انجام ہوا ان کا جنہیں خوف دلایا گیا تھا سو اللہ کے ان بندوں کے جو نکھارے ہوئے ہیں۔“

”باپ دادا گمراہ تھے“ تو ظاہر ہے کہ وہ بھی ان کے پیچھے دوڑنے سے گمراہ ہی قرار پائیں گے اور اس پر ان کا سرمایہ استدلال فقط باپ دادا کی اندھا دھند تقلید تھی جیسا کہ ان کا قول قرآن مجید میں کئی جگہ یہی نقل ہوا ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو یہی کرتے دیکھا اور دیکھا جائے تو ہر دور میں باطل پرست عوام اپنے عمل کی صحت کے لئے یہی دلیل پیش کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ نَادَيْنَا نُوْحًا فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ ﴿٤٨﴾ وَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ  
الْعَظِيمِ ﴿٤٩﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ﴿٥٠﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿٥١﴾ سَلَامٌ  
عَلَى نُوْحٍ فِي الْعَالَمِينَ ﴿٥٢﴾ إِنَّكَ كَذَلِكَ نَجِزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٣﴾ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا  
الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٤﴾ ثُمَّ آغْرَقْنَا الْآخِرِينَ ﴿٥٥﴾

”اور ہمیں صدادی نوح نے تو کتنے اچھے ہم لبیک کہنے والے تھے اور ہم نے انہیں اور ان کے گھر والوں کو سخت تکلیف سے نجات دی اور ان کی نسل ہی وہ تھی جنہیں ہم نے قائم و برقرار رکھا اور ان کا ذکر خیر بعد والوں میں باقی رکھا۔ سلام ہو نوح پر تمام جہانوں میں۔ اسی طرح ہم اچھے کردار والوں کو جزا دیتے ہیں بلاشبہ وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھے، پھر دوسروں کو ہم نے غرق کر دیا۔“

تَرَكَنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ جو اس سورے میں برابر ہر تذکرہ کے بعد آیا ہے، اس کا یہ ترجمہ کہ ”ان کا ذکر خیر ہم نے بعد والوں میں باقی رکھا“۔ یہ ایک تفسیر کے مطابق ہے جو مجھے ذہن سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ [۱]

دوسرا مفہوم یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے ان کے لئے آخری زمانہ والوں میں یہ شرف رکھا کہ ان پر سلام ہوگا یعنی یہ جملہ ہر رسول کے تذکرہ کے بعد اس کی تمہید ہے جس پر یہ ذکر ختم ہوا ہے۔

وَأَنَّ مِنْ شَيْعَتِهِ لَابْرَهِيمَ ﴿٥٦﴾ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٥٧﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ  
وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ﴿٥٨﴾ أَيْفَاكُمُ إِلَهَةٌ دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ ﴿٥٩﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ

[۱] ای تر کنا علیہ ذکر اجمیلا واثنینا علیہ فی امة محمد ﷺ عن ابن عباس و مجاہد وقتادة (مجمع البيان)

## الْعَلِيَّيْنَ ﴿٨٧﴾

”اور انہی کے پیروں میں ابراہیم تھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے آئے صحیح و سالم دل لئے ہوئے جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم والوں سے کہا کہ تم کا ہے کی عبادت کرتے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کے دوسرے خداؤں کو تم نے مقصود بنا لیا ہے تو کیا خیال ہے تمہارا تمام جہانوں کے پروردگار کے بارے میں؟“

ترتیب لفظی کے لحاظ سے تَوْرَانَ مِنْ شَيْعَتَيْهِ کی ضمیر حضرت نوحؑ کی طرف راجع ہے کہ جو ہر مقصد کے لحاظ سے انہی کے راستے کے سالک حضرت ابراہیمؑ بھی تھے اور اس سے حضرت نوحؑ کی فضیلت حضرت ابراہیمؑ سے ضروری طور پر ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ حقیقت میں سب پیرو، اس حق کے ہیں جو ازل سے ایک ہی ہے اور اسی کے پیرو تمام انبیاء و مرسلین ہیں لہذا ترتیب زمانی کے لحاظ سے ہر بعد والے کو قبل والے کا پیرو کہنا درست ہے۔ نوحؑ کو کہہ دیجئے کہ آدمؑ کے پیرو تھے تو اس سے حضرت آدمؑ کی باعتبار فضیلت اوصاف کمال بلندی کا اظہار مقصود نہ ہوگا۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کا پیرو حضرت ابراہیمؑ کو کہہ دیا ہے تو اس سے باعتبار فضیلت حضرت نوحؑ کی برتری ثابت نہیں ہوتی اور اسی صورت سے ہمارے رسولؐ کو مخاطب کر کے قرآن مجید میں جو ارشاد ہوا ہے:-

وَآتَّبَعُ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا: پیروی کیجئے ابراہیم کی ملت کی جو غلط راستوں سے ہٹے ہوئے تھے۔

اس سے جناب ابراہیمؑ کی فضیلت کا اظہار مقصود نہیں ہے جب کہ حقیقت ثابت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے قبل کے پیغمبروں سے افضل و برتر ہیں اور ہمارے پیغمبرؐ بلا استثناء افضل الانبیاء و المرسلین ہیں۔

ایک قدیم مفسر نے غالباً ترتیب آیات کو لازمی طور پر موافق تزیل نہ سمجھتے ہوئے جو ایک حقیقت ثابت ہے من شیعته کی ضمیر حضرت محمد ﷺ ہی کی طرف راجع کی ہے اور ہمارے یہاں کے بعض روایات میں ضمیر حضرت امیر علی بن ابی طالبؑ کی طرف راجع بتائی گئی ہے۔ [۱] بہر حال نتیجہ سب کا ایک ہے جب کہ اصل راستہ سب ہی کا متحد ہے۔ آخر میں جو ہے ”تو کیا خیال ہے تمہارا تمام جہانوں کے پروردگار کے بارے میں“ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم جو اُس کے ساتھ شریک کر رہے ہو تو کبھی یہ سوچو کہ وہ جو خالق کائنات اور اصل پروردگار ہے، اس کی تمہیں کیا سزا دے گا؟

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا تم نے اُسے ایسا ہی عاجز و قاصر سمجھ رکھا ہے جیسے تم نے بت بنا رکھے ہیں یہ دونوں مفہوم اس جملے کے بیان کیے

گئے ہیں۔ [۲]

## فَنظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ﴿٨٧﴾ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ﴿٨٨﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ﴿٨٩﴾ فَرَاعَ

[۱] قال الفراء معناد وان من شيعته محمد صلى الله عليه وآله وسلم لابراهيم وقدورى عن اهل البيت عليهم السلام ان من شيعته علي لابراهيم (تبيان)

[۲] اي ليصنع بكم مع عبادتكم غيره \_\_\_ وقيل ماتظنون بربكم انه على ائى صفة \_\_\_ حين شجهتم بدهذه الاصنام (مجمع البيان)

إِلَى إِلَهَتِهِمْ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ﴿٩١﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ﴿٩٢﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا  
بِالْيَمِينِ ﴿٩٣﴾ فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزْفُونَ ﴿٩٤﴾ قَالَ اتَّعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ﴿٩٥﴾ وَاللَّهُ  
خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ ﴿٩٦﴾

”اس کے بعد انہوں نے ستاروں پر ایک نگاہ ڈال کر کہا کہ میں بیمار پڑنے والا ہوں، اس پر وہ لوگ پیٹھ پھرا کر اُن کے پاس سے چلے گئے، تب انہوں نے اُن کے خداؤں کی طرف پوشیدہ طور پر رخ کیا، کہا کیوں تم کھاتے نہیں تمہیں کیا ہے کہ تم بولتے نہیں؟ اس کے بعد اُن کی طرف متوجہ ہوئے مارتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ سے تو وہ لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم لوگ عبادت کرتے ہو اُس کی جو تم خود تراشتے ہو حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے تمہیں بھی اور انہیں بھی جو تم بناتے ہو۔“

ستاروں کی طرف نگاہ ڈالنے کے پس منظر کے لئے جلالین نے لکھا ہے:-

وكانوا انجاصمين: وہ لوگ نجومی تھے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”وہ لوگ نجومی تھے، اُن کے دکھانے کو تاروں کی طرف دیکھ کر کہا یا نجوم کی کتاب میں دیکھ کر کہا میں بیمار ہوں یا ہوا چاہتا ہوں (موضح

القرآن)

اب کون کہہ سکتا ہے کہ جناب ابراہیم کو اس کے بعد کسی طرح کی علامت پیدا نہیں ہوئی مگر صحیح بخاری میں حضرت ابراہیمؑ کے لئے یہ آگیا ہے کہ کذب ثلاث کذبات ”انہوں نے (معاذ اللہ) تین جھوٹ بولے اُن میں سے ایک موقع یہ ہے۔ بہر حال صحیح بخاری پر ایمان رکھنے والے اپنے ایمان کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین معصوم ہوتے ہیں اور دروغ بیانی معیار عصمت کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اس روایت کو قبول کرنے سے قاصر ہیں۔ [۱]

جناب شاہ صاحب رقم طراز ہیں کہ:-

”یہ ایک جھوٹ ہے اللہ کی راہ میں، عذاب نہیں ثواب ہے“ (موضح القرآن)

ہم تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اسے جھوٹ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں اور ایسی حدیث کو جو خلیل حق کی طرف جھوٹ کی نسبت دے جھوٹا سمجھتے ہیں۔ مگر سچائی کے بلند بانگ دعویداروں کو جو تفتیہ کو جھوٹ کہہ کر جماعت شیعہ پر اعتراض کیا کرتے ہیں، شاہ صاحب کے اس افادہ عالیہ کو یاد تو رکھنا ہی چاہیے کہ جھوٹ بھی کبھی اللہ کی راہ میں ہوتا ہے اور وہ عذاب نہیں ثواب ہوتا ہے۔ جناب ابراہیمؑ کا بتوں سے بطور طنز و استہزاء یہ کہنا کہ ”کیوں! تم کھاتے نہیں ہو“ اس کا پس منظر یہ بتایا گیا ہے کہ اُس دن ان کا کوئی تہوار تھا جس میں وہ عید گاہ گئے ہوئے تھے اور کھانا بتوں کے سامنے رکھ گئے تھے بطور تبرک کہ جب وہ واپس آئیں گے تو اس کھانے کو سب کھائیں گے۔

[۱] لا يجوز ذلك على الانبياء لانه يرفع الثقة بقولهم جل امناء الله تعالى واصفياءه عن ذلك (مجمع البيان)



قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿٩٤﴾ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ  
الْأَسْفَلِينَ ﴿٩٥﴾ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٩٦﴾ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ

### الصَّالِحِينَ ﴿١٠٠﴾

”اُن لوگوں نے کہا ہے کہ اس شخص کے لئے ایک عمارت بناؤ تو اس کو آگ میں ڈال دو، اس طرح انہوں نے ان کے لئے ایک منصوبہ بنایا جس کے نتیجے میں ہم نے اُنہی لوگوں کو پست کیا اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں، وہ مجھے منزل تک پہنچائے گا۔  
پروردگار! مجھے نیک قسم کی اولاد عنایت فرما۔“

عمارت بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ایک خاص احاطہ تیار کرو جس میں لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کرو۔ [۱]  
شہرت عامہ میں اُس آگ کو ”آتش نمرود“ کہا جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر اقبال نے بھی کہہ دیا ہے:-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق  
عقل ہے محو تماشا پ بام ابھی

مگر قرآن مجید نے نمرود کے تعلق سے بس حضرت ابراہیمؑ کا مکالمہ درج کیا ہے جب انہوں نے کہا میرا پروردگار جلاتا ہے اور مارتا ہے، اُس نے کہا میں بھی ایسا کر سکتا ہوں، اُنہوں نے کہا اللہ آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال دے، اس پر وہ لاجواب ہو گیا لیکن آگ میں جلانے کی نسبت قرآن نے ہر جگہ قوم کی طرف دی ہے، یہاں بادشاہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔  
اُس کے بعد کیا نتیجہ ہوا؟ یہاں صرف اُن کے منصوبہ کی ناکامی کا ذکر ہے لیکن وہ کیوں کر ناکام ہوا؟ اُس کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔  
دوسری جگہ آگ کے سرد ہونے کا ذکر ہے۔

یہاں بے شک سلسلہ کلام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بس اس کے بعد اُنہوں نے وہاں سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا مگر اس ہجرت کے ساتھ ہی انہوں نے اولاد کی دعا کیوں کی؟ اس کے متعلق مجھے ابھی تک تفاسیر میں کچھ نہیں ملا۔ ممکن ہے اس وقت اپنی تنہائی کا احساس ہوا ہو لیکن ظاہر ہے کہ اولاد ہوتی بھی تو وہ پوری قوم کا مقابلہ کر کے اُن کی حفاظت کہاں کر سکتی تھی۔ ہاں ممکن ہے یہ تصور ہوا ہو کہ اگر عنایت الہی خصوصی انتظام حفاظت کے ساتھ شامل حال نہ ہوتی تو میں بے نام و نشان دنیا سے گزر جاتا اور میرے اس مشن کو باقی رکھنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ اس لئے دل میں تمنا پیدا ہوئی ہو کہ کاش میرے اولاد ہو جائے تو اگر مجھے ختم بھی کر دیا جائے تو میری اولاد میرے بعد اس مشن کو برقرار رکھے اور اسی لئے اولاد میں جس کی بارگاہ الہی میں تمنا کی من الصالحین کی قید لگائی کہ اگر اولاد ایسی ہوئی جو میرے مقصد کو پورا نہ کر سکے تو بے کار ہے۔

فَبَشِّرْهُ بِعَلْمٍ حَلِيمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنَئِي إِنِّي فِي الْمَنَامِ

[۱] ابنو الہ بنیانا فاملاؤہ خطباً واضر موہ بالثار (جلالین) یعنی آنجا آتش بیسار جمع ثنائید (فتح الرحمن)

أَيُّ أَدْبُجِكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَى ۖ قَالَ يَا بَتِ اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ  
 اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝۱۴۲ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝۱۴۳ وَتَادَيْنَاهُ أَن يَأْبُرْهُيْمَ ۝۱۴۴ قَدْ  
 صَدَّقَتِ الرُّعْيَاءُ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۱۴۵ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۝۱۴۶  
 وَتَدَيْنَاهُ بِذِيحِ عَظِيمٍ ۝۱۴۷ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝۱۴۸ سَلَّمَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝۱۴۹  
 كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۱۵۰ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝۱۵۱ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ  
 نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝۱۵۲ وَبَرَكَاتٍ عَلَيْه وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۝۱۵۳ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ  
 وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ ۝۱۵۴

”تو ہم نے انہیں بشارت دی ایک بڑے قوت برداشت رکھنے والے بیٹے کی۔ اس کے بعد جب وہ ذرا دوڑ  
 دھوپ کے سن تک پہنچا تو انہوں نے کہا اے بیٹا! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ اب تم غور  
 کرو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا اے بابا! کیجئے جو آپ کو حکم ہو رہا ہے، اللہ نے چاہا تو مجھے آپ صبر  
 کرنے والوں میں پائے گا۔ تو جب وہ ہم تن اطاعت پر تیار ہو کر آئے اور انہوں نے ان کو پیشانی کے بھل لٹایا  
 اور ہم نے انہیں صدادی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا، بلاشبہ ہم یونہی جزا دیتے ہیں نیکو کاروں کو یقیناً  
 یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی اور ہم نے ان کا فدیہ بھیج دیا ایک عظیم قربانی کے سبب سے اور ہم نے اُس کی یاد قائم رکھی  
 بعد والوں میں۔ سلام ہو ابراہیم پر ہم یونہی جزا دیتے ہیں نیکو کاروں کو، یقیناً وہ باایمان بندوں میں سے تھے اور ہم  
 نے انہیں خوشخبری دی اسحاق کی جو نبی ہوگا اچھے آدمیوں میں سے اور برکت عطا کی انہیں اور اسحاق کو اور ان کی  
 اولاد میں نیکو کار بھی ہونگے اور کھلے ہوئے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے بھی۔“

## ذبح عظیم

ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی اُس قربانی کا تذکرہ ہے جو انہوں نے اپنے فرزند کے ذبح پر تیار ہو کر پیش کی تھی۔  
 یہود اور نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ یہ فرزند جناب اسحاقؑ تھے لیکن اسلامی روایات اس بارے میں مختلف ہیں جو ہمارے علماء کے یہاں بھی  
 وارد ہیں مگر زیادہ قوت اسی کو ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے مورث اعلیٰ ہیں۔  
 بعض اہل نظر و تلاش کو بائبل میں بھی اس کی تائید ملی ہے اس بنا پر کہ اس فرزند کی قربانی کے وقت جناب ابراہیمؑ کی جو مناجات مذکور ہے،  
 اس کے الفاظ یہ بیان کیے جاتے ہیں کہ ”میں اپنا اکلوتا بیٹا تیری بارگاہ میں پیش کرتا ہوں“ اور یہ متفقہ حقیقت ہے کہ جناب اسماعیلؑ پہلے پیدا ہوئے  
 تھے۔ بالکل ظاہر ہے کہ چھوٹا بیٹا کبھی ”اکلوتا“ قرار نہیں پاتا۔ ہاں جب تک چھوٹے کی ولادت نہ ہو، بڑا اکلوتا فرزند ہوا کرتا ہے اور جناب ابراہیمؑ

اس فرزند کو جسے قربانی کے لئے لارہے ہیں ”اکھوتا“ کہہ رہے ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ جناب اسماعیلؑ ہیں، جناب اسحاقؑ نہیں ہیں۔ پھر جیسا کہ میں نے ”تاریخ اسلام“ حصہ اول میں لکھا ہے ”اگر یہ قربانی“، جناب اسحاق سے متعلق ہوئی تو اُس کی یادگاریں بنی اسرائیل کے مذہبی رسوم میں ہوتیں اور اُس کے آثار شام و فلسطین کی سرزمین پر پائے جاتے مگر ایسا نہیں ہے۔ اُس قربانی کی یادگار ”عید قربان“ کی صورت میں مسلمانوں ہی میں قائم ہوئی اور اُس کے آثار عرفات اور منیٰ وغیرہ میں سرزمین مکہ پر پائے جاتے ہیں جہاں جناب اسماعیلؑ کی بود و باش تھی۔ اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ یہ قربانی جناب اسماعیلؑ سے متعلق تھی مگر قرآن مجید میں چونکہ واقعہ قربانی کے پہلے بشارت فرزند کا ذکر ہے اور دوسرے مقام پر بشارت کا ذکر جناب اسحاق کے متعلق کیا گیا ہے، اس لئے بعض لوگ تو ہم کرتے ہیں کہ قربانی کا تعلق جناب اسحاق سے ظاہر ہوتا ہے مگر یہ اس سلسلہ کے تمام مذکورہ آیات کو جو ہم نے اسی لئے ایک ساتھ درج کیے ہیں، پیش نظر نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ان آیات میں بشارت کا ذکر دو دفعہ ہے۔ ایک دفعہ غلامہ حلیمہ ”قوت برداشت رکھنے والے فرزند“ کی بشارت ہے جس کے سلسلہ میں قربانی کا واقعہ درج ہے اور دوسری دفعہ اس قربانی کے بعد بشارت کا ذکر ہے جو صراحتاً اسحاق سے متعلق ہے۔ اس لئے قرآن کے اس بیان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ پہلی بشارت اور قربانی کا تذکرہ اسحاق سے پہلے پیدا ہونے والے جناب اسماعیلؑ سے متعلق ہے اور بعد میں پھر جو بشارت ہوئی ہے، وہ جناب اسحاق سے متعلق ہے۔

علامہ طبریؒ نے اس کے علاوہ مزید دو دلیلیں پیش کی ہیں:- ایک یہ کہ قرآن میں ایک جگہ جناب اسحاق کی بشارت کے ساتھ ارشاد ہوا ہے:- **وَمِنْ ذُرِّيَّتِكَ يَحْقُوبُ** یعنی اُسی بشارت میں جناب اسحاق کے فرزند یعقوبؑ کی بشارت ہو گئی تھی، اس کے معنی یہ ہیں کہ اُسی وقت اس فیصلے کا اظہار ہو گیا تھا کہ جناب اسحاق زندہ سلامت باقی رہیں گے، یہاں تک کہ اُن کی شادی ہوگی اور فرزند متولد ہوگا، پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بچپن ہی کے دور میں اُن کے ذبح کا حکم ہو؟!

دوسرے حضرت پیغمبر خدا ﷺ کا یہ ارشاد پایہ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے کہ انا ابن الذبیحین یعنی میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں۔ اس میں ایک ذبح جناب اسماعیلؑ ہیں اور دوسرے آپ کے والد جناب عبد اللہ، وہ بھی ذبح سے فدیہ کے ذریعہ سے بچ گئے تھے۔ اگر پہلے ذبح کا واقعہ جناب اسحاق سے متعلق ہو تو حضرت کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا؟

بڑا اہم فقرہ اس سلسلہ آیات میں فدینا کا بذبح عظیم کا ہے۔ اس کی تفسیر میں عموماً مفسرین اہل سنت ”ذبح عظیم“ سے مراد وہ دنبہ لیتے ہیں جو بطور فدیہ آیا تھا مگر کہاں ”ذبح عظیم“ کا پر عظمت لفظ اور کہاں ایک دنبہ، وہ چاہے جنت کا کیوں نہ ہو، عظیم کے لفظ سے ذہن میں تو مرتبہ ہی کی عظمت آتی ہے اس لئے دنبہ کے ساتھ یہ عظیم کا لفظ بظاہر کھپتا نہیں، اس کے کھپانے کے لئے ان حضرات کو کیا کیا پڑ پیلنے پڑے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ اس ”ذبح عظیم“ ایسا دو لفظی لفظ کا ترجمہ اتنا طویل الذیل فرماتے ہیں:-

”گوسفندی مہیا برائے ذبح، بزرگ جثہ“ اے سبحان اللہ خود اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کو ”یہ بزرگ جثہ“ ترجمہ دل کو نہیں لگا تو انہوں نے لکھا ”یعنی بڑے درجہ کا بہشت سے آیا“ (موضح القرآن) مگر کیا بہشت سے آنے کی وجہ سے دنبہ کا ایسا درجہ ہو گیا کہ وہ نبی زادے کے مقابلہ میں عظیم بن جائے؟

اس کے مقابلہ میں شیعہ عام تصور یہ ہے کہ ”ذبح عظیم“ سے حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام مراد ہیں جس کے لحاظ سے ڈاکٹر اقبال

نے کہا ہے:-

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پر  
معنی ”ذبح عظیم“ آمد پر

اب ”عظیم“ کے لفظ کا اطلاق تو بالکل بر محل معلوم ہوتا ہے مگر حضرت امام حسینؑ کا فدیہ اسماعیل ہونا ذہن کے لئے قابل قبول معلوم نہیں ہوتا لیکن میرے خیال میں دشواری بذبح عظیم کی ”ب“ کو صلہ کا لینے سے ہو رہی ہے جو فدیہ کا مفہوم پیدا کرتا ہے، کیوں نہ اسے سیدیہ لیا جائے جس کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے ”ایک عظیم قربانی کے سبب سے“ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اسماعیل ہی کی نسل ہیں وہ عظیم تر قربانی ہونے والی تھی جو خالق کی طرف سے مکمل مثال قربانی بن سکے اور ابھی وہ نسل عالم وجود میں آنا باقی تھی لہذا اس قربانی کو محل عزم تک لا کر فدیہ بھیج دیا گیا۔ اب کوئی دشواری نہیں ہے۔

وَلَقَدْ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١٣٧﴾ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكُرْبِ الْعَظِيمِ ﴿١٣٨﴾  
وَ نَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ﴿١٣٩﴾ وَ اتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ﴿١٤٠﴾ وَ  
هَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿١٤١﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْأَخْرَبِ ﴿١٤٢﴾ سَلَّمَ عَلَىٰ  
مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١٤٣﴾ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٤٤﴾ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا  
الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٤٥﴾

”اور بلاشبہ ہم نے اپنا فضل و کرم مبذول کیا موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر اور انہیں اور ان کی قوم کو سخت اذیت و تکلیف سے چھٹکارا دیا اور ہم نے ان کی مدد کی توفیق پانے والے وہی ثابت ہوئے اور ان دونوں کو ہم نے واضح کتاب عطا کی اور ان کو سیدھے راستے پر لگایا اور ان کا ذکر خیر ہم نے بعد والوں میں باقی رکھا۔ سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر، یقیناً ہم یونہی جزا دیتے ہیں نیکوکاروں کو بلاشبہ وہ دونوں ہمارے باایمان بندوں میں سے تھے۔“

ہر پیغمبر کے حال کے بعد ایسا جملہ ہے جس کا ترجمہ ایک تفسیر کے لحاظ سے جسے ہم نے ترجیح دی یہ ہے کہ ”ہم نے ان کا ذکر خیر باقی رکھا بعد والوں میں۔ دوسری تفسیر کی بنا پر ترجمہ یہاں یہ ہوگا کہ ہم نے ان کا ذکر بعد والوں میں اس طرح رکھا کہ سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر۔“

وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٤٦﴾ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ آلَا تَتَّقُونَ ﴿١٤٧﴾ أَتَدْعُونَ بَعْلًا  
وَ تَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴿١٤٨﴾ اللَّهُ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٤٩﴾ فَكَذَّبُوا فَاتَاهُمْ  
لَمُحْضَرُونَ ﴿١٥٠﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ ﴿١٥١﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْأَخْرَبِ ﴿١٥٢﴾ سَلَّمَ عَلَىٰ  
إِلْيَاسَ ﴿١٥٣﴾ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٥٤﴾ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥٥﴾

”اور یقیناً الیاس بھی پیغمبروں میں سے تھے، جب انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ کیوں تم پر ہیزگاری اختیار نہیں کرتے؟ کیا تم بعل (بت) کی پرستش کرتے ہو اور اُس بہترین خالق اللہ کو چھوڑے ہوئے ہو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے والے آباؤ اجداد کا بھی پروردگار ہے تو اُن لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو بلاشبہ وہ لوگ عذاب میں لائیں جائیں گے سو اللہ کے اُن بندوں کے جو نکھارے ہوئے ہوں اور ہم نے اُن (الیاس) کا ذکر خیر بعد والوں میں باقی رکھا۔ سلام ہو آلِ یاسین پر۔ یقیناً ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں نیکو کاروں کو بلاشبہ وہ ہمارے باایمان بندوں میں تھے۔“

## آلِ یاسین پر سلام

اس میں جو الِ یاسین ہے، اس کے اندر ایک عجیب ذہنی کش مکش پیدا ہوتی ہے، چونکہ یہ الیاس (پیغمبر) کے ذکر میں ہے اور بالکل اُس محل پر ہے جہاں اُس کے قبل برابر اُس پیغمبر کا نام لے کر سلام ہوتا تھا تو بلاشبہ ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ جناب الیاس پر سلام ہے مگر یہ خود لفظ اپنے حروف اور منفقہ رسم الخط کے اعتبار سے قواعد کتابت کے لحاظ سے بالکل الیاس سے الگ ہے۔ ایک تو اس میں آخر میں ی اور ن زائد ہے جو الیاس میں نہیں ہے۔ دوسرے الیاس الف لام داخل لفظ ہے اس لئے ملا کر لکھا جاتا ہے لیکن الِ یاسین میں ”ال“ پڑھے گا اور یس وہ لفظ ہے جس کے نام کا ایک سورہ قرآن میں موجود ہے اور اُس کے آغاز میں یہی لفظ ہے اس طرح کہ یس والقرآن الحکیم انک لمن المرسلین اور چونکہ یس اور قسم کے بعد بلافاصلہ مخاطب ہمارے رسول سے ہے، اس لئے عام طور پر مسلمانوں میں یہ رسول اللہ ﷺ کے القاب میں درج ہوتا ہے۔

اب علمائے اہل سنت سابق و سیاق کلام میں قبل و بعد الیاس کا ذکر ہونے اور اس سے اس جملہ کے چسپان ہونے کی وجہ سے اس کا ترجمہ ”الیاس پر سلام ہو“ کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ [۱] اور آخر میں ی اور ن جو زائد ہے، اُس کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ الیاس ہی کا دوسرا تلفظ ہے۔ [۲] اور کوئی کہتا ہے کہ الیاس اور اُن کے تابعین مل کر بہت سے الیاس ہو گئے تو انہیں الیاسین کہہ دیا گیا۔ [۳] لیکن آخر یہیں ایسا کیوں ہوا؟ نوخ اور اُن کے تابعین مل کر نصیبن اور ابراہیم اور اُن کے تابعین مل کر ابراہیم کیوں نہیں ہوئے؟ ہماری احادیث دوسرے پہلو کو ترجیح دیتی ہیں اور جو قرآنی رسم الخط سے یہ لفظ سمجھ میں آتا ہے الِ یاسین اسی کو درست بتاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں الِ یس سے مراد آل محمد ﷺ قرار پاتے ہیں اور صدر اسلام کے قاریان قرآن کی ایک جماعت اس لفظ کو اسی طرح پڑھتی تھی۔ [۴] اور ترجمان القرآن جناب ابن عباس رضوان اللہ علیہ کی رائے اس کے مطابق ہے۔ [۵]

[۱] سلام باوہد الیاس (شاہ ولی اللہ) سلام ہو جو پورا پر الیاس کے (رفیع الدین)

[۲] الیاس کو الیاسین بھی کہتے ہیں جیسے طور سینا اور طور سینین (موضح القرآن)

[۳] اقبیل ہو ومن امن معہ فجمعا معہ تغلیباً (جلالین)

[۴] اقر انا فاع و ابن عامر و یعقوب سلام علی الِ یاسین (تبیان)

[۵] قال ابن عباس الِ یاسین ال محمد ﷺ یاسین من اسمائہ ﷺ (مجمع البیان)

بعض اہل سنت نے اس قرأت کی صورت میں بھی اُسے جناب الیاس علیہ السلام سے متعلق کرنا چاہا ہے، اس طرح کہ یاسین اُن کے باپ کا نام تھا <sup>[۱]</sup> مگر الیاس کے باپ کا نام یاسین ہونا کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔

وَأَنَّ لَوْطًا لِّبَنِ الْمُرْسَلِينَ <sup>[۱۳۱]</sup> إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ <sup>[۱۳۲]</sup> إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ <sup>[۱۳۳]</sup> ثُمَّ دَمَرْنَا الْأَخْرِينَ <sup>[۱۳۴]</sup> وَإِنَّا لَنَكْمُرُنَّ لَهُمْ مَصْبِحِينَ <sup>[۱۳۵]</sup> وَبِالْبَيْلِ <sup>[۱۳۶]</sup> أَفَلَا تَعْقِلُونَ <sup>[۱۳۷]</sup>

”اور بلاشبہ لوط علیہ السلام بھی پیغمبروں میں سے تھے جب کہ ہم نے انہیں اور اُن کے گھر والوں کو چھٹکارا دیا سو ایک بڑھیا (ان کی بیوی) کے جو رہ جانے والوں میں سے تھی، پھر دوسروں کو ہم نے تہس نہس کر دی اور تم لوگ خود اُن کی طرف سے گزرتے ہو، صبح کو بھی اور رات کو بھی تو کیا پھر بھی نہیں سمجھتے۔“

چونکہ قوم لوط کی بستیاں مشرکین کی تجارتی شاہ راہ میں پڑتی تھیں، جب وہ شام کے ملک کی طرف جاتے تھے، اس لئے انہیں مخاطب کر کے توجہ دلائی گئی کہ تم اُن تباہ شدہ بستیوں کے نشان بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، پھر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ <sup>[۱]</sup>

وَأَنَّ يُونسَ لَبَنِ الْمُرْسَلِينَ <sup>[۱۳۸]</sup> إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلِّ الْمَشْحُونِ <sup>[۱۳۹]</sup> فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ <sup>[۱۴۰]</sup> فَالتَّقَبُّهُ الْحُوتِ وَهُوَ مُلِيمٌ <sup>[۱۴۱]</sup> فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ <sup>[۱۴۲]</sup> لَلَّيْتُ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ <sup>[۱۴۳]</sup> فَنبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ <sup>[۱۴۴]</sup> وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَقْطِينٍ <sup>[۱۴۵]</sup> وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ <sup>[۱۴۶]</sup> فَأَمَّنُوا فَمَرَّعْنَاهُمْ إِلَى حِينٍ <sup>[۱۴۷]</sup>

”اور یونس علیہ السلام بھی پیغمبروں میں سے تھے جب کہ وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف مضطربانہ گئے، اس کے بعد قمر پڑا تو وہ پھینک دیئے گئے تو انہیں مچھلی نے نگل لیا اس عالم میں کہ وہ اپنے کو ملامت کر رہے تھے تو اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو اُس کے پیٹ میں رہتے اُس دن تک کہ جب سب دوبارہ زندہ کئے جائیں گے تو ہم نے اُن کو (نکال کر) خشک زمین پر ڈالا اس حال میں کہ وہ نڈھال تھے اور اُن پر ہم نے اگایا کدو کا ایک درخت

<sup>[۱]</sup> ال یاسین بھی پڑھا ہے کسی نے تو یاسین اُن کے باپ کا نام ہے (موضح القرآن) علی قراءۃ ال یاسین بالمدای اهل والمراد به الیاس ایضاً (جلالین)

<sup>[۲]</sup> خطاب لمشرک کی العرب ای تمہارے فی ذہابکم ومحشکم الی الشام علی منازلہم۔ (جمع البیان) قوم لوط کی بستیاں اٹھی ہوئی نظر آتی تھیں شام کی راہ میں (موضح القرآن)

اور انہیں ہم نے بھیجا ایک لاکھ یا اس سے زیادہ کی طرف چنانچہ وہ ایمان لائے تو ہم نے ان کو ایک مدت تک پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔“

یہ جناب یونس کا واقعہ ہے جس کی شروع اور درمیان کی بہت سی کڑیاں بنظر اختصار قرآن مجید نے یہاں پر چھوڑ دی ہیں اور بعض کو خود دوسرے مقامات پر بیان کیا ہے اور بعض کا حدیثوں میں بیان ہوا ہے۔

قرعہ کیوں ڈالا گیا؟ اس کا پتہ قرآن مجید سے نہیں چلتا۔ مفسرین نے دو وجہیں لکھیں ہیں:- ایک یہ کہ کشتی طوفانی ہوئی، اس پر ان لوگوں کے ذہن میں یہ آیا کہ کوئی آدمی اس پر ایسا سوار ہے جس کے سبب سے یہ کشتی طوفانی ہوئی ہے، اُسے دریا میں پھینک دیا جائے تو سب لوگ محفوظ ہو جائیں گے۔

دوسرے یہ کہ مچھلی سامنے آئی منہ کھولے ہوئے اس طرح جیسے کسی کی طلبگار ہے اور اس طرح قرعہ ڈالا گیا اور وہ جناب یونس کے نام پر نکلا۔ یہ دونوں قول جناب شیخ الطائف نے تیان میں نقل کیے ہیں علامہ طبری نے بھی دو قول کیے ہیں:-

پہلا یہ کہ کشتی ڈوبنے کے قریب ہوئی، اُس وقت یہ ہوا۔

دوسرے یہ کہ کشتی رک گئی، چلتی نہ تھی، کسی بڑے بوڑھے نے کہا کہ کوئی اس میں اپنے مالک سے بھاگا ہوا ہے، اس بنا پر قرعہ ڈالا گیا اور تین دفعہ قرعہ پڑنے پر ہر دفعہ جناب یونس کے نام پر نکلا۔

”ایک لاکھ یا اس سے زیادہ“..... چونکہ کلام الہی میں کوئی لفظ اظہار تردد کے لئے نہیں ہو سکتا اور کلام عرب میں اوبل یعنی ”بلکہ“ کے معنی میں آتا ہے لہذا یہاں بھی یہی معنی ہیں، نتیجہ کلام یہی ہے کہ وہ ایک لاکھ سے زیادہ تھے۔ اب اس سے کتنے زیادہ؟ اس کو بیان نہیں کیا گیا اس لئے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمُ الرَّبُّ بِكَ الْبَنَاتِ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ

شَاهِدُونَ ﴿١٤٠﴾ أَلَا إِنَّهُمْ مِّنْ أَفْكَهْمَ لَيَقُولُونَ ﴿١٤١﴾ وَلَدَ اللَّهِ ۗ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١٤٢﴾

أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ﴿١٤٣﴾ مَا لَكُمْ ۖ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿١٤٤﴾ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿١٤٥﴾

أَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ ﴿١٤٦﴾ فَأَتُوا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٤٧﴾

”تو ذرا ان سے پوچھیے کہ کیا آپ کے پروردگار کے لئے بیٹیاں ہیں اور ان کے لئے بیٹے ہیں؟ یا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا درحالیکہ وہ لوگ دیکھ رہے تھے، معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اپنی دروغ بانی سے کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے اور وہ بلاشبہ ضرور جھوٹے ہیں، کیا اُس نے بیٹیوں کو بیٹوں کے مقابلہ میں پسند کیا ہے؟ تم لوگوں کو کیا ہے؟ کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ سمجھانے سے سمجھتے کیوں نہیں؟ یا کیا تمہارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل ہے تو وہ اپنی دستاویز پیش کرو اگر تم سچے ہو۔“

یعنی اصل اولاد کا تصور ہی اللہ کے لئے غلط ہے خواہ وہ بیٹا ہو یا بیٹی مگر مزید ستم ظریفی اُن کی یہ ہے کہ یہ خود بیٹیوں سے نفرت کرتے ہیں اور اللہ کے لئے جس اولاد کے قائل ہیں یعنی فرشتے، انہیں بیٹیوں کی صنف سے سمجھتے ہیں جو اُن کی حماقت بالائے حماقت یا دروغ اندر دروغ ہے۔ آخر کہاں سے ان کو پتہ چلا کہ ملائکہ صنف اناث سے ہیں، یہ ایسی واہی تو اہی باتیں بغیر ثبوت آخر کیوں کرتے ہیں!؟

**وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نَسْبًا ۗ وَلَقَدْ عَلِمْتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ﴿۱۵۸﴾**  
**سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلِصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾**

”اور قرار دیا انہوں نے اس کے درمیان اور جنات کے درمیان رشتہ ناسب، حالانکہ خود جنات خوب جانتے ہیں کہ وہ (جزا و سزا کے لیے) حاضر کیے جائیں گے، پاک ہے اللہ اُس سے جو وہ بیان کرتے ہیں سو اللہ کے نکھارے ہوؤں کے“

یعنی یہ اللہ کے نکھارے ہوئے بندے جو اوصاف اللہ کے بیان کرتے ہیں، وہ اس کی شان کے لائق ہیں۔ [۱]  
 جنات کے ظاہری معنی تو یہی قوم جن کے ہیں جیسا کہ اکثر مترجمین ترجمہ کرتے ہیں۔ [۲] مگر بعض مفسرین کا خیال ہے کہ جنات سے مراد یہاں فرشتے ہیں چونکہ جن کے لغوی معنی پوشیدہ ہونے کے ہیں اور فرشتے بھی نظر سے پوشیدہ ہیں، اس لئے انہیں بھی جن کہا جاتا ہے، اس طرح اس آیت میں گزشتہ آیات والے مضمون کی تکرار ہے اور کچھ نہیں۔

یہ سمجھنے کی شاید ان مفسرین کو اس لئے ضرورت پڑی کہ مشرکین قریش کے عقائد میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ جنوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے مگر چونکہ مشرکین کے عقائد کا کوئی ذخیرہ خود ان کا لکھا ہوا ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے تو قرآن کے اس بیان کو ہم اس تاریخی واقعیت کی دلیل کیوں نہ سمجھیں کہ مشرکین کا کوئی گروہ شیاطین و جنات کے متعلق بھی اس طرح کا تصور رکھتا تھا کہ اُن میں اور خدا میں کوئی رشتہ ہے چنانچہ بعض مفسرین نے ایک لاندہب گروہ کا ایسا تصور بیان کیا ہے۔ [۳]

جب کہ ملائکہ کے بنات الہی ہونے کے متعلق اُن کے غلط عقیدہ کا ابھی تفصیل کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے تو پھر حرف عطف کے ساتھ جو مغایرت کا پتہ دیتا ہے ان الفاظ سے کہ ”اور انہوں نے جنات اور اللہ کے درمیان رشتہ قرار دیا ہے“ یہ کیوں سمجھا جائے کہ یہ پہلی ہی والی بات ہے جسے دوبارہ کہا جا رہا ہے، پھر بعد کا جملہ کہ جنات خوب جانتے ہیں کہ وہ حاضر کیے جائیں گے اور دوسرے مقامات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض ون کا لفظ زیادہ تر عذاب کے محل پر صرف ہوتا ہے یعنی سزا دینے کے لئے لائے جائیں گے، یہ جملہ ملائکہ پر جو اطاعت کے سوا محصیت سے واقف نہیں ہیں اور ان کے یہاں ثواب و عذاب بلکہ حساب و کتاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کسی طرح چسپاں معلوم نہیں ہوتا، غالباً اسی وجہ

[۱] یعنی بیان ایشاش موافق واقع است (فتح الرحمن)

[۲] میان خدائی تعالیٰ و میان جنات (شاہ ولی اللہ) در میان خدا کے اور در میان جنوں کے (شاکر فیع الدین)

[۳] قول الزنادقة ان الله تعالى و ابليس اخوان وان الله خلق التور و الخيرو و الحيوان النافع و ابليس خلق الظلمة و الشر و الحيوان الضار عن كلبى و عطية (جمع البيان)



سے اس قول کے قائل نے اِنْتُمْ لَمْ حَضَرُوْنَ کی ضمیر کو کہ ”وہ حاضر کیے جائیں گے“ جنات سے ہٹا کر اُن کہنے والوں کی طرف عائد کیا ہے جس کی بنا پر معنی یہ ہوں گے وہ جنات جانتے ہیں کہ اس بات کے کہنے والے عذاب میں گرفتار کیے جائیں گے۔ [۱] مگر مجھے یہ تمام تکلفات بلا ضرورت اور خلاف حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔

کچھ مفسرین نے جنات کے ساتھ رشتے کو ملائکہ کے دختران الہی ہونے کے تصور سے الگ مگر اُسی کے ضمیمہ کے طور پر مانا ہے اس طرح کہ اُن کا مزعومہ یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جنیہ عورتوں کے بطن سے یعنی اللہ اور جنات کی شرکت سے فرشتے پیدا ہوئے ہیں۔ [۲] مگر اُن کے اس مبینہ خیال کی رد مقصود ہوتی تو یہ سبلی رشتہ ویسا ہوتا جسے عربی میں ”مہر“ کہتے ہیں، نسبی رشتہ نہ ہو اور قرآن کہہ رہا ہے کہ اُنہوں نے اللہ اور جنات کے درمیان ”نسب“ قرار دیا ہے۔

نسب اور مہر الگ الگ چیزیں ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے :-

خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا (فرقان - ۵۴)

لہذا یہ بیان بھی قابل قبول نہیں ہے۔

**فَاتَّكُمُ وَمَا تَعْبُدُونَ ﴿۳۱﴾ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَتِينِينَ ﴿۳۲﴾ إِلَّا مَنْ هُوَ صَالٍ**

**الْجَحِيمِ ﴿۳۳﴾**

”یقیناً تم اور جس چیز کی تم عبادت کرتے ہو، تم سب اُس پر گمراہ نہیں کر سکتے سو ایسے کے کہ جو دوزخ کی گرمی کا اٹھانے والا ہو“۔

یعنی گمراہ کرنے والے ہمیشہ جسے گمراہ کرتے ہیں، وہ وہی ہوتا ہے جو اپنی بد باطنی سے گمراہ ہونے کے لئے تیار ہوتا ہے، اس لئے کسی کے گمراہ کرنے سے جو شخص گمراہ ہوا ہے گمراہ ہونے کی ذمہ داری سے یہ کہہ کر بچ نہیں سکتا کہ میں کیا کروں؟ فلاں شخص نے مجھے گمراہ کیا۔ [۳] ارے وہ لاکھ گمراہ کر رہا تھا! یہ کیوں گمراہ ہوا؟ لہذا گمراہ ہونا خود اُس کا فعل ہے جس پر یہ مستحق سزا ہے اور وہ گمراہ کرنے والا بھی سزا کا مستوجب ہے کہ اُس نے کیوں گمراہ کیا؟

بعض مفسرین جو انسانی افعال کی ذمہ داری خدا پر عائد کرنا چاہتے ہیں، اُنہوں نے یہ مطلب قرار دیا ہے کہ تم گمراہ نہیں کر سکتے مگر اُسے جو اللہ کے علم میں گمراہ ہونے والا ہے۔ [۴] گویا اس کا گمراہ ہونا علم الہی کی وجہ سے ہے۔ تمہارے گمراہ کرنے سے نہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ اس گمراہ کرنے والے کو سزا ملنا چاہیے اور نہ گمراہ ہونے والے کو، اس لئے کہ یہ عدل الہی کے خلاف ہوگا۔ [۵]

[۱] اِنْتُمْ اِی قَائِلِیْ ذٰلِکَ (جلالین)

[۲] کافر کہتے ہیں فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جنوں کی عورتوں سے پیدا ہوئیں۔ (موضح القرآن)

[۳] المعنی ان من یقبل هذا القاتن وینقاد لہ فهو یصلی الحجیم (تبیان)

[۴] من هو صال الجحیم فی علم اللہ تعالیٰ (جلالین)

[۵] یعنی تم انسان اور تمہارے تین شیطان کے مرضی اللہ کے گمراہ نہیں کر سکتے گمراہ وہی ہوگا جسکو اُس نے دوزخی لکھ دیا ہے۔ (موضح القرآن)

تجربہ ہے کہ علامہ طبرسی نے دونوں مفہوم بغیر کس محاکمہ کے درج کر دیئے ہیں جسے ”ترک اولیٰ“ تو ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔

**وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ﴿١٦٣﴾ وَإِنَّا لَنَعْنُ الصَّافُونَ ﴿١٦٥﴾ وَإِنَّا لَنَعْنُ**

### الْمُسَبِّحُونَ ﴿١٦٦﴾

”اور ہم میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ اُس کا ایک خاص مقام ہے اور بلاشبہ ہم پرے جمائے ہوئے ہیں اور بلاشبہ ہم تسبیح کرنے والے ہیں۔“

چونکہ ترتیب قرآن مطابق تزیل نہیں ہے، اس لئے نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہ آیتیں کس موقع کی ہیں اور اُن کے پہلے کون سی آیات تھیں جن سے ان کا ربط ہے؟ بہر حال یہ خود ان آیات کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ فرشتوں کی زبانی کلام ہے اور مترجمین مفسرین سب ہی کو یہ محسوس ہوا ہے کہ ان آیتوں کا تعلق یہاں قبل کی آیتوں سے کوئی نہیں اس لئے انہیں یہ اضافہ کرنا پڑا ہے کہ فرشتوں نے یہ کہا؟ مگر انہوں نے کب اور کیوں کہا؟ اس کہنے کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں، شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”یہاں سے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زبان سے فرمایا جیسے دعائیں فرمائی ہیں آدمیوں کی زبان سے“

پھر گذشتہ آیات سے ربط قائم کرنے کی یوں کوشش کی ہے کہ ”کافر کہتے ہیں فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جو جنوں کی عورتوں سے پیدا ہوئیں، سو جنوں کو اپنا حال معلوم ہے اور فرشتے یوں کہتے ہیں“۔ [۱] (موضح القرآن) مگر کافروں کا یہ مزعومہ ہونا خود ثابت نہیں اور قرآن مجید کے الفاظ کے خلاف ہے جس پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے پھر جیسے پہلے الجذبة نام لے کر اُن کے علم کا اظہار ہوا ہے، ویسے ہی اس کے بعد فرشتوں کا نام لے کر اس قول کا ذکر ہونا چاہیے تھا، پہلے بیان ہو جنات کا اور پھر فرشتوں کا ذکر ہوئے بغیر قول نقل ہو فرشتوں کا یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

**وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُونَ ﴿١٦٤﴾ لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِنَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٦٨﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ**

### الْمُخْلِصِينَ ﴿١٦٩﴾ فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿١٧٠﴾

”اور یقیناً وہ کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی یادداشت ہوتی پہلے والوں کی طرف سے تو ضرور ہم اللہ کے نکھارے ہوئے بندے ہوتے، اب انہوں نے اس کا انکار کیا تو انہیں (اس کا انجام) معلوم ہوگا۔“

پھر اب یہ اُس فرشتوں کے ذکر سے غیر متعلق تذکرہ شروع ہو گیا مشرکین کا [۲] یعنی یہ جب بنی اسرائیل وغیرہ کے انبیاء کا ذکر سنتے تھے تو کہتے تھے کہ ہمارے پاس بھی ایسی ہدایتیں آئی ہوتیں تو ہم میں ایمان اور عمل کی کمی نہ ہوتی مگر اب جب اُن میں نبی مبعوث ہوا تو انہوں نے اُسے نہ مانا اور کفر اختیار کیا۔ المخلصین لام کے فتح کے ساتھ ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ کیا ”نکھارے ہوئے“ مگر تجربہ ہے کہ جلالین نے اس کو لام کے کسرہ کے ساتھ قرار دے کر اُس کی شرح یوں کی ہے کہ: المخلصین العبادة له عبادت کو خالص کرنے والے اُس کے لئے اور اس سے

[۱] افشتگان گفتند (شاہ ولی اللہ)

[۲] یعنی اہل مکہ کا نوا یقولون (مجمع البیان) ہدایتینہ کافدان عبد مسی گفتند (شاہ ولی اللہ)

زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جناب شیخ طوسیؒ نے بھی یوں تشریح کی ہے کہ:- الذین اخلصوا العبادۃ لہ (تبیان) جنہوں نے عبادت کو اس کے لئے خاص رکھا اور علامہ طبرسیؒ نے بھی بس اخلصوا کو مخلصون کر کے اسی کو ہرادیہ، بہر حال اصل قرآن میں جب تک المخلصین کو المخلصین سے نہ بدلا جائے، اس وقت تک ہم اس کے موافق ترجمہ کرنے سے قاصر ہیں۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿١٤٦﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ﴿١٤٧﴾ وَإِنَّ  
 جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿١٤٨﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿١٤٩﴾ وَأَبْصِرْ هُمْ فَسَوْفَ  
 يُبْصِرُونَ ﴿١٥٠﴾ أَفَبِعَدَابِنَا يُسْتَعْجِلُونَ ﴿١٥١﴾ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ  
 الْمُنذَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿١٥٣﴾ وَأَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ﴿١٥٤﴾ سُبْحٰنَ  
 رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿١٥٥﴾ وَسَلَّمٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ﴿١٥٦﴾ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ  
 الْعَالَمِينَ ﴿١٥٧﴾

”اور ہمارا قول پہلے ہو چکا ہے اپنے بندوں کے لئے جو پیغمبر بنائے گئے ہیں کہ فتح و ظفر انہی کی ہوگی اور بلاشبہ ہماری ہی فوج وہ ہے جو غالب آئے گی تو ان سے ایک مدت تک بے اعتنائی کیجئے اور انہیں دیکھتے رہیے عنقریب وہ خود دیکھیں گے تو کیا وہ ہمارے عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں تو جب وہ ان پر نازل ہو جائے گا تو بڑی بری صبح ہوگی ان کی جو ڈرائے جاتے ہیں اور (ہاں) ایک مدت تک ان سے بے اعتنائی کیجئے اور دیکھیے کہ عنقریب وہ خود دیکھیں گے، پاک ہے آپ کا پروردگار جو غلبہ کا مالک ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں اور سلام ہو پیغمبروں پر اور شکر ہے اللہ کا جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔“

یہ قول الہی جو پیغمبروں کے لئے اگر شخصی طور پر ہر فرد کے لئے مانا جائے تو اکثر وہ مشاہدہ کے خلاف نظر آئے گا لہذا ماننا پڑتا ہے کہ یہ قول مجموعی طور پر سلسلہ مرسلین کے لئے ہے کہ ان کا مشن یعنی دین حق غالب آکر رہے گا جس کے ظہور کی دنیا منتظر ہو یا نہ ہو، ہم یقینی طور پر منتظر ہیں۔  
 آخری فقرات:

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿١٥٥﴾ وَسَلَّمٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ﴿١٥٦﴾ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٥٧﴾ یوں تو تلاوت قرآن کے اختتام پر کہے جاتے ہیں مگر حدیث یہ ہے کہ انسان ہر محل و مجلس میں گفتگو ختم کر کے یہ جملہ کہے تو ثواب عظیم حاصل ہوگا۔ [۱]

[۱] روای الاصبغ بن نباتة عن علیؑ وقد روی ایضاً من فوعاعن النبیؐ قال من اراد ان یکتال بالمکیال الاوفی من الاجریوم القیمة فلیکن آخر کلامه فی مجلسه: سبحان رب العزّة عمّا یصفون وسلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین (مجمع البیان)

# سُورَةُ ص

## مکیہ --- ۸۸ --- آیات

ص ایک حرف ہے مقطعات قرآنیہ میں سے جس سے اس سورہ کی ابتدا ہوئی ہے اس لئے اس سورہ کا نام یہی ہو گیا ہے۔

### سورہ ص کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ مشرکین کو اللہ کے ماننے سے انکار نہ تھا اُسے ایک ”ماننا اُن سے نزدیک عجب بات تھی۔
- ۲۔ مشرکین کی دلیل کہ یہ ہم نے پہلے کسی سے نہیں سنا۔
- ۳۔ مشرکین کی حیرت کہ آخر یہ ایک آدمی (یعنی رسول) کیا خصوصیات رکھتا ہے کہ اللہ نے اس پر اپنا کلام اتارا ہے؟
- ۴۔ حضرت داؤد کے پاس دو فریقوں کا آ کر مقدمہ پیش کرنا حضرت داؤد کا فیصلہ اور اُس پر اُن کو انتہا۔
- ۵۔ بائبل کے بیان کردہ واقعہ اور یائے حتیٰ کی تصحیح اور جناب داؤد کی عصمت کردار کا تحفظ۔
- ۶۔ مساوات کلی خلاف عدل۔
- ۷۔ جناب سلیمان کا تفصیلی تذکرہ۔
- ۸۔ گھوڑوں کے معائنہ اور آفتاب کے پلٹنے کا بیان۔
- ۹۔ عطائے ملک کے لئے دعا اور اُس کی قبولت۔
- ۱۰۔ جناب ایوب اور اُن کے صبر کا تفصیلی تذکرہ جو اس سورے کے مختصات میں سے ہے۔
- ۱۱۔ بعض غیر معروف انبیاء جیسے یسوع اور ذوالکفل کا اجمالی ذکر۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ ۝۱ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ ۝۲ كَمْ أَهْلَكْنَا

مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ فَنَادَوا وَاوَلَاتِ حَيْنٍ مِّنَاصٍ ۝۳

”صاد قسم قرآن کی جو نصیحت کا حامل ہے بلکہ وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا سرکشی اور پھوٹ ڈالنے میں مصروف ہیں کتنی ہی نسلیں ان کے پہلے ہم نے ہلاک کیں تو انہوں نے پکارا اور اب چھکارے کا وقت نہ تھا“۔

ض تو حروف مقطعات سے ہے جو قدرت کے سر بستہ راز ہوتے ہیں، اس کے بعد قسم کھائی ہے، اگر اس قسم پر وقف مطلق نہ ہوتا تو سمجھ میں یہ آتا کہ اس کے بعد درمیان میں ایک جملہ معترضہ ہے کہ باوجودیکہ یہ قرآن نصیحتوں کا حامل ہے، پھر بھی کافر سرکشی سے کام لیتے ہیں اور اختلاف کا ذوق رکھتے ہیں اس لئے تسلیم نہیں کرتے۔

”نصیحت کا حامل“ یہ ترجمہ ایک تفسیر کے مطابق ہے لیکن قرآن مجید میں بعض جگہ ذکر کا عز و شرف کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے انہ لذن کر لک و لقومک (یعنی) ”یہ آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے عز و شرف ہے“ اور اس لئے ذی الذکر کر کے ایک معنی کہے گئے ہیں ”عز و شرف والا“۔ [۱]

اب اس کے بعد جو شے قسم کھا کے کہی جا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے پہلے اپنی بد اعمالیوں سے بہت قومیں ہلاک ہوئیں اور جب ہلاکت کے آثار آنکھوں کے سامنے بالکل آگئے تب انہوں نے فریادی کی مگر اب تلافی مافات کا وقت گزر چکا تھا، اس لئے چیخ پکار سے کچھ نہ ہوا۔ اسی طرح تمہاری بھی ابھی آنکھیں نہیں کھلتیں، جب عذاب آجائے گا، اس وقت چیخو چلاؤ گے جس کا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

یہ مفہوم اس پورے کلام کا اُس وقت درست ہوگا، جب والقرآن ذی الذکر پر وقف نہ ہو مگر یہاں تمام قرآنوں میں وقف مطلق کی علامت بنی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا کلام یہاں پر ختم ہو گیا ہے اس کے بعد مستقل جملہ ہے لہذا بعض لوگوں نے قسم کھا کر جو بات کہی جا رہی ہے، اُسے محذوف مانا ہے مگر اُس میں اختلاف ہے، کوئی یہ مانتا ہے کہ قسم ہے اس قرآن کی کہ جو آپ کا پیغام ہے وہ بالکل حق ہے۔ [۲] اور کوئی یہ کہ قسم اس قرآن کی کفار مکہ جو بہت سے خدا مانتے ہیں، وہ غلط ہے۔ [۳]

ہمارے نزدیک اگر درمیان کے اُس وقف کو نظر انداز کر دیا جائے اس بنیاد پر کہ ان علامات و اوقاف کو تعبیر قبول کرنے کا لزوم ثابت نہیں ہے تو وہی پہلی تشریح درست ہے کہ اصل مورد قسم یہ جملہ ہے کہ ”اپنی بد اعمالیوں سے اس کے پہلی کئی قومیں ہلاک ہوئیں یہ مفہوم قدیم مفسرین میں سے بعض کی زبانی ایک قول کی صورت میں نقل ہوا ہے۔

اس پر قواعد نحوی کے لحاظ سے یہ اعتراض دور از کار ہے کہ جو اب قسم میں لانا ہونا چاہیے یہاں ہے کہ اهلکننا من قبلہم من قرن یوں نہیں ہے لکہ اهلکننا الخ اور کہہ کا لفظ چونکہ کے مفعول ہے، اس پر لام تاکید آ نہیں سکتا کیوں کہ اہل نحو ہر چیز کو جس طرح چاہتے ہیں کچھ نہ کچھ پوشیدہ مان کر اپنے قواعد کے مطابق کر لیتے ہیں یہاں وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے، اس لئے کہ وہ کہہ کو مبتدا مان لیں اور اهلکننا میں ضمیر مفعول کو پوشیدہ مان لیں، اس طرح تقدیر کلام یہ ہوگی کہ لکہ اهلکننا من قبلہم احزاب ان کی مبینہ نحوی دشواری دور ہو جائے گی لیکن جب کہ حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھا جائے:

(۱) ض پر کوئی وقف علامت نہیں ہے جب کہ بعض مقامات پر مقطعات قرآنیہ کے جو حروف ہیں، اُن پر قرآن مجید میں وقف ہے یہاں اس کے بعد والقرآن ذی الذکر پر وقف مطلق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ض سے لے کر یہاں تک ایک بات کہی گئی ہے جو یہاں

[۱] ای ذی الشرف عن ابن عباس رضی اللہ عنہما (مجمع البیان)

[۲] قسم القدان \_\_\_\_\_ کہ آنچہ بآن دعوت می کنی راست است (شاہ ولی اللہ)

[۳] جواب لهذا القسم محذوف ایہا الامر کہا قال اهل مکة من تعدد الالهة (جلالین)

پر پوری ہوئی ہے۔

(۲) بعید نہیں ہے کہ فرمان معصوم اقرأو کما یقرأ الناس اوقاف کو بھی شامل ہو جس پر عام طور سے افراد ملت حقہ اثنا عشریہ کا عمل ہے۔  
(۳) مقطعات قرآنیہ کے متعلق قول معصوم یہی ہے کہ وہ اسرار ربانی ہیں، ص بھی انہی مقطعات قرآنیہ میں سے ہے۔ اور اس کے بعد بس قسم پر بات ختم ہو گئی ہے اور کوئی دوسرا جملہ نہیں ہے۔ ان تمام امور کی بنا پر میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ یہاں اصل جملہ جو قسم کے ساتھ کہا گیا ہے، وہ یہی ہے جو حرف ص کے اندر مضمحل ہے اور جو بصورت راز پیغمبر خدا ﷺ تک پہنچایا گیا ہے اور جس کے سمجھنے کی عام لوگوں کو ضرورت نہیں ہے لہذا ان کو اس کے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہیے۔

وَعَجَبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ ۚ وَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا سِحْرٌ كَذٰبٌ ۙ اَجْعَلِ  
الْاِلٰهَةَ الْهٰٓءَا وَاحِدًا ۙ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ مُّجْتَابٌ ۙ وَاَنْطَلَقَ الْمَلَآئِمُ مِنْهُمْ اَنْ اَمْشُوا  
وَاَصْبِرُوْا عَلٰٓى اِلْهٰتِكُمْ ۙ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُرٰدُ ۙ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِى الْاٰلَمِ  
الْاٰخِرَةِ ۙ اِنَّ هٰذَا اِلَّا اِخْتِلَاقٌ ۙ اَنْزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ۙ بَلْ هُمْ فِى  
شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۙ بَلْ لَمَّا يَنْزِقُوْا عَذَابًا ۙ

”اور انہوں نے تعجب کیا اس سے کہ ان کے پاس ایک ڈرانے والا (پیغمبر) انہی میں سے آیا اور کافروں نے کہا یہ بڑا جھوٹا جادو گر ہے، کیا اس نے بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا، یقیناً یہ ضرور ایک عجیب چیز ہے اور ان میں سے بڑے لوگ آئے کہ چلو اور اپنے خداؤں پر صبر و برداشت کے ساتھ قائم رہو، یقیناً یہی چیز ہے جسے نصب العین ہونا چاہیے۔ ہم نے یہ بات نہیں سنی اس بعد والی نسل میں یہ نہیں مگر گڑھی ہوئی ایک چیز۔ کیا ہم میں سے اس پر کتاب اتاری گئی ہے؟ بلکہ وہ میری کتاب سے شک میں ہیں بلکہ انہوں نے ابھی میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا ہے۔“

اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُرٰدُ کا ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ”یقیناً یہی ایک چیز ہے جسے نصب العین ہونا چاہیے“ یہ اس پر مبنی ہے کہ ہذا کا اشارہ اس بات کی طرف ہو جو انہوں نے کہی تھی کہ ”اپنے خداؤں پر صبر و برداشت کے ساتھ قائم رہو“ اور چونکہ یہی اس کے پہلے بلافاصلہ مذکور ہے لہذا اس کا مشارا لہ ہونا ذہن سے زیادہ قریب ہے مگر دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہذا کا اشارہ اس بات کی طرف موجود رسولؐ اپنے پیام کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کا اس میں کوئی منصوبہ ہے مثلاً غلبہ و اقتدار کا حاصل ہونا اور قوم کو اس پیغام کے ذریعہ سے اپنا تابع بنانا۔ [۱]

علامہ طبرسی نے اس کے علاوہ بھی کئی مطلب درج کیے ہیں، مگر میرے نزدیک سب بعید ہیں، جو صاف سیدھا مطلب ہے، وہ وہی

ہے۔

[۱] معنای ہذا الذی یدعیہ محمد ﷺ ویدعوہم الیہ لشیء یراد بہ امر ما من الاستعلاء علینا والریاستہ فینا والقہر لنا (تبیان)

أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ ۙ أَمْ لَهُمْ مُلْكُ السَّمَوَاتِ  
وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ ۙ جُنْدًا مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ  
مِّنَ الْأَحْزَابِ ۙ

’کیا ان کے پاس تمہارے باعزت، عطا بخش پروردگار کی رحمت کے خزانے ہیں؟ یا کیا ان کے لئے سلطنت ہے  
آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں تو پھر چڑھیں رسیوں کو پکڑ کے یہاں تو بس شکست خوردہ گروہوں  
کی قسم سے ایک لشکر سامنے نظر آ رہا ہے۔‘

مفسرین کا غالباً اس بنا پر کہ یہ سورہ مکہ کا نازل شدہ ہے، یہ بیان ہے کہ مشرکین کو بطور پیشین گوئی خبر دی گئی ہے کہ یہ لاؤ لشکر جو نظر آ رہا  
ہے، نتیجہ میں شکست کھائے گا جس کا وقوع بعد میں بدر کی جنگ میں ہو گیا اور ہنالک جس سے اشارہ ایسے منظر کی طرف ہوتا ہے، جو سننے والے کی  
آنکھوں کی سامنے ہو، اس سے اشارہ اسی آئندہ کے منظر کی طرف ہے جب ان کے بڑے بڑے سوراخوں کے لاشے زمین پر پڑے ہوں گے۔ [۱]

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ ۙ وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ  
وَأَصْحَابُ لَيْكَةِ ۖ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ ۙ إِنَّ كُلًّا كَذَّبَ الرَّسُلَ فَحَقَّ  
عِقَابُ ۙ وَمَا يَنْظُرُ هُوَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ۙ وَقَالُوا رَبَّنَا  
عَجَّلْ لَنَا قِطْعًا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ۙ

’ان کے پہلے جھٹلایا نوح کی قوم نے اور قبیلہ عاد نے اور فرعون نے جو میخوں والا تھا اور قبیلہ ثمود اور لوط کی قوم اور  
ایک والوں نے، یہی سب گروہ تھے، کوئی نہیں مگر یہ کہ اُس نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو وہ میری سزا کا مستوجب ہوا اور  
(اب) یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں، سوا ایک سخت نعرے کے جس کے بعد کچھ دیر نہ ہوگی اور انہوں نے کہا کہ  
پروردگار! جو ہماری تقدیر ہو وہ حساب کتاب سے پہلے ہی ہمارے سامنے لے آ۔‘

فرعون کے ساتھ ’میخوں والا‘ کا لفظ جس انداز میں ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ نزول آیت کے وقت فرعون کے ساتھ میخوں کا تصور  
شہرت عام کی حیثیت رکھتا تھا مگر بعد میں امتداد زمانہ سے وہ چرچے کم ہو گئے تو مفسرین کے لئے یہ میخیں ناقابل فہم ہو گئیں، اس لئے کثرت اقوال  
سے جن میں کوئی بھی قول مستند نہیں ہے، ان کی نوعیت کے متعلق کچھ بھی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اب تو اسے فرعون کا بس ایک لقب سمجھا جاسکتا ہے جس  
کی وجہ تسمیہ ہمیں معلوم نہیں۔

قرآنی رسم الحظ میں بعض جگہ بڑا عجبہ معلوم ہوتا ہے مگر عجبہ سمجھتے ہوئے بھی اُس کی پابندی کرنا پڑتی ہے چنانچہ یہ لفظ جس کا ترجمہ ہوا

[۱] اخبر الله سبحانه وهو يمكة انه سيهزم جند المشركين ف جاء تاويلها يوم بدر وهناك اشارة الى بدر ومصارعهم بهار (مجمع البيان)

”ایکے والوں“ اسے فطری طور پر کوئی بھی عربی داں لکھے تو اصحاب الایکۃ لکھے گا جو بالکل درست ہوگا مگر معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں کاتب یہاں اصحاب کے بعد الف لکھنا بھول گیا اس لئے یہاں پر یہ لفظ اصحاب لیئکۃ بغیر درمیانی الف کے ہی لکھی جائے گی۔

یہ تذکرہ بہت جگہ قرآن مجید میں ہے کہ کافر لوگ عذاب آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اس کی نوعیت کا سمجھنا دلچسپ ہے جو ظاہر ہے کہ صفحہ کاغذ پر نہیں آتا، اس میں ایک جھنجھلاہٹ کی کیفیت سمجھ میں آتی ہے جیسے انبیاء سے بار بار عذاب کی خبروں کو سن کر وہ غصے سے کہیں کہ کان پک گئے سنتے سنتے کہ عذاب آئے گا اور وہ ایسا ہوگا اور ویسا ہوگا، آخر وہ عذاب آئی کیوں نہیں جاتا۔

اور دہمی آواز میں یہ ایک تمسخر کا پیرایہ ہو سکتا ہے کہ عذاب، عذاب، یہ عذاب آئی جائے کہ دیکھ لیں اور وہ کیسا ہوتا ہے۔

إِصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ ۗ إِنَّهُ آوَابٌ ۙ إِنَّا سَخَّرْنَا  
الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحُنَا بِالْعَشِيِّ وَالْإشْرَاقِ ۙ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً ۗ كُلٌّ لَّهِ آوَابٌ ۙ  
وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَضَّلْنَا الْخِطَابَ ۙ

”جو یہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجئے اور ہمارے طاقت والے بندے داؤد کو یاد کیجئے، بلاشبہ وہ بڑا لوگ لگانے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اُس کے قبضے میں کیا تھا کہ وہ تسبیح کرتے تھے شام اور صبح کے اوقات میں اور پرند تمام اکٹھا ہو جاتے تھے، سب اُس کی آواز میں آواز ملاتے تھے اور ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا تھا اور اُسے حکمت اور فیصلہ کن گفتگو عطا کی تھی“۔

وَهَلْ أَتَاكَ نَبِيُّ الْخَصْمِ ۖ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۗ إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُدَ فَفَزِعَ  
مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ ۗ خَصَمِينَ بَغْيٍ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ  
وَلَا تَشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ ۗ ۙ إِنَّ هَذَا أَخِي ۖ لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً  
وَلِي نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ ۖ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ۗ ۙ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ  
بِسْوَإِ نَعَجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ  
بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ ۗ وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا  
فَتَنَتْهُ فَاستَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ۗ ۙ فَغَفَرْنَا لَهُ ذَلِكَ ۗ وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا  
لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَّآبٍ ۙ

”اور کیا آپ تک پہنچی ان مخالفین کی خبر جب وہ دیوار پھانڈ کر محراب عبادت میں پہنچے جب وہ داؤد کے پاس اندر



پہنچ گئے تو وہ اُن سے ڈر گئے، انہوں نے کہا ڈریئے نہیں، ہم متخاصمین ہیں جن میں ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے تو آپ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے اور کسی کی رورعایت نہ کیجئے اور ہمیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کیجئے۔ یہ میرے بھائی ہیں، ان کے پاس ننانوے گوسفند ہیں اور میرے پاس ایک ہی گوسفند ہے، اس پر بھی انہوں نے کہا کہ یہ مجھے دے دو اور گفتگو میں میرے اوپر چھا گئے (داؤد) نے کہا کہ یہ ان کی تم پر زیادتی ہے جو اپنے (اتنے) گوسفندوں کے ہوتے ہوئے تمہارا گوسفند طلب کیا اور یقیناً بہت سے میل جول رکھنے والے ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں سو اُن کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور بہت کم ہیں اور اب خیال کیا داؤد نے کہ ہم نے ان کا امتحان لیا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے بخشش کے طلب گار ہوئے اور سجدے میں گر گئے اور توبہ و انابت کرنے لگے تو ہم نے اُن کے لئے اسے معاف کر دیا اور یقیناً اُن کے لئے ہمارے یہاں تقرب ہے اور انجام کی بہتری۔

### حضرت داؤد کا فیصلہ اور اُس پر ان کو انتباہ

یہ وہی اور یائے حتیٰ کی بیوی کا واقعہ ہے جسے مروجہ تورات میں ایسے عنوان سے پیش کیا گیا ہے کہ نبی خدا کی عصمت اُس سے ختم ہو جاتی ہے یعنی معاذ اللہ انہوں نے ناجائز طور پر اُس کی بیوی پر قبضہ کر لیا اور پھر حکمت عملی سے اُس شخص کو قتل کر دیا اور عدہ گزرنے سے پہلے اس کے ساتھ عقد کر لیا۔ اسرائیلیات کے اثر سے مسلمانوں کے کتب میں بھی یہ تذکرہ آ گیا ہے مگر روایت کا قرآن کے مقابلہ میں کیا اعتبار؟ اور قرآن مجید میں اُس کی جتنی اصلیت ہے وہ پیش کر دی گئی ہے اور وہ ایسی ہے جس سے کسی ایسے فعل کا صدور جو خلاف قانون اور خلاف شرع ہو جناب داؤد سے ظاہر نہیں ہوتا۔ [۱]

صرف ایسی خواہش ظاہر ہوتی ہے جس کا نہ ہونا بہتر تھا لہذا اس کا بس ”ترک اولیٰ“ کہہ سکتے ہیں۔ گناہ کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور اسی لئے قرآن مجید نے اُس کے تذکرہ کے ختم کرتے ہی اعلان فرما دیا کہ یہ ایک ایسا امر تھا جس سے اُن کے تقرب میں کوئی کمی آئی اور نہ حسن انجام میں کسی طرح کا نقص واقع ہوا بلکہ اگر ترتیب تزیل مانی جائے تو فوراً اُس کے بعد اُن کے لئے ایک منصب کا اعلان ہو گیا کہ یا داؤد انا جعلنا خلیفۃ فی الارض جس کی تفسیر ابھی آتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل قضیہ میں جناب داؤد سے کوئی ترک اولیٰ بھی قرآن سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ صرف مستغیث کا بیان سن کر بغیر دوسرے فریق کا بیان سنے ہوئے، آپ نے جو حکم جاری کر دیا، یہ وہ ترک اولیٰ تھا جس پر وہ متنبہ ہو کر استغفار کرنے لگے، جناب شیخ الطائف نے اپنے مختار کی حیثیت سے اس کو ترجیح دی ہے۔ [۲]

میرے خیال میں اگر اور یائے حتیٰ کا واقعہ تورات میں موجود نہ ہوتا اور اُس کا اہل کتاب میں عموماً چرچا نہ ہوتا جس کے اثر سے علمائے

[۱] اس میں کسی کا خون نہیں کیا، بے ناموسی نہیں کی (موضح القرآن)

[۲] اولیٰ الوجوه ما قد مناه ترک النذب فی ما یتعلق یأدب القضاء (تبیان)

اسلام نے بھی ایسی روایات درج کر دی ہیں یعنی اس واقعہ سے بالکل خالی الذہن ہوتے تو واقعی الفاظ قرآنی سے ہماری سمجھ میں کسی ایسے عمل کا وقوع ثابت نہ ہوتا جو قابل بحث ہو اور پھر ہم ترک اولیٰ اُسی کو سمجھتے جو جناب شیخ الطائف نے اختیار کیا ہے مگر جب کہ یہ واقعہ ہے کہ وہ حکایت اُس وقت موجود تھی اور ذہن کا اُس سے خالی ہونا ممکن نہیں ہے تو اب ذہن میں اس سے زیادہ قریب تصور یہی ہے کہ قرآن مجید کو اُس واقعہ کی اصل شکل کا پیش کرنا منظور تھا اور متخامین کے بیان کردہ مقدمہ کی روئداد سے وہ صورت واقعہ سمجھ میں آتا ہے جسے جناب داؤد کا ترک اولیٰ سمجھا جاسکتا ہے۔

جناب داؤد کی نسبت اُس غلط حکایت کا خود مسلمانوں میں کتنی شدت سے چرچا مدت تک رہا، اُس کا ثبوت خود جناب شیخ طوسی کی درج کردہ حدیث سے ہوتا ہے جس میں جناب امیر گوشدت کے ساتھ اس روایت کے بیان کرنے والوں کو تہدید فرمانا پڑی ہے اس طرح کہ آپ نے فرمایا کہ جو ایسا کہے گا، اُس پر میں دو طرح کی حد شرعی جاری کروں گا، ایک وہ جو کسی پر زنا کاری کی تہمت لگانے سے جاری ہوتی ہے اور ایک جو کسی پیغمبر کی توہین پر جاری ہونا چاہیے۔ [۱]

علامہ طبرسی نے بھی اس حکایت کی سختی کے ساتھ رد فرمائی ہے اور کہا ہے کہ اس میں حضرت داؤد کا جو کردار بتایا گیا ہے وہ ایک شخص عادل کی عدالت کے منافی ہے، چچا نیکہ شان نبوت جس میں عصمت جز لازم ہے۔ [۲]

يٰۤاٰدُۡ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاٰحِكْمْۢ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ  
الْهٰوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ  
عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا اَيَّوْمَ الْحِسَابِ ﴿۳۱﴾

”اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے بلاشبہ جو لوگ بھٹکتے ہیں اللہ کے راستے سے اُن کے لئے سخت عذاب ہے اس سے کہ اُنہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔“

خلیفہ کا ترجمہ جناب شاہ ولی اللہ نے ”بادشاہ“ کے لفظ سے کر دیا جس سے خود اُن کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین مطمئن نہیں ہوئے اور اُنہوں نے ”نائب“ کے لفظ کے ساتھ ترجمہ کیا جو زیادہ حقیقت سے قریب ہے مگر اس کے ساتھ اقتدار سلطنت کا مفہوم بھی ملحوظ رکھنا ہو گا ورنہ بحیثیت رہ نمائے خلق سرسلسلہ انبیاء جو حضرت آدمؑ ہیں، اُنہی کے لئے اعلان ہو گیا تھا اِنِّيْ جَاعِلٌۢ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ”میں زمین میں ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں“ تو پھر جناب داؤد کی خصوصیت کیا ہے؟ اس لئے یہاں بقرینہ مقام و بقرینہ تخصیص خلیفہ کے مفہوم میں بہ نیاہت الہی اقتدار سلطنت کو مضمرا ماننا پڑے گا۔

[۱] روى عن علي عليه السلام انه قال لا اولى برجل يقول ان داؤد ارتكب فاحشة الاضريتته حدّين احدهما القذف والاخر لا جل النبوة (تبيان)

[۲] اجل انبياء الله عن ذلك (مجمع البيان)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۖ ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ  
فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ ﴿٢٧﴾ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾

”اور ہم نے پیدا کیا آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو غلط طور پر یہ گمان ہے ان لوگوں کا جو کافر ہیں،  
وائے ہو ان کے لئے جو کافر ہیں آتش جہنم سے۔ کیا ہم انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے مثل  
زمین میں فساد پھیلانے والوں کے قرار دیں یا پرہیزگاروں کو مثل فاسق و فاجر لوگوں کے قرار دیں؟“  
اس میں قرآن مجید نے دو حیثیتوں سے خالق کے لئے وجوب عدالت کا اظہار کیا ہے اور کافروں سے مخاطب کر کے یہ کہا کہ کیا ہم ایسا  
کریں گے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل عدالت کو خالق کے لئے لازم قرار دیتی ہے اور خالق عقل کے اس فیصلے کو مستند قرار دیتا ہے۔ یہ بھی اس سے  
ظاہر ہے کہ خالق کی عدالت کا انکار، اُس کے لئے فعلِ عبث کی تجویز اور ظلم کی نسبت کفار کا شیوہ ہے۔ اہل ایمان کی شان یہ نہیں ہے۔

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبْرَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٩﴾  
”یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر اتارا ہے، بابرکت تاکہ وہ اُس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ عقل والے  
نصیحت حاصل کریں۔“

### قرآن کے بابرکت ہونے کے معنی

”برکت“ کے معنی عربی میں ”دیر پا“ ہونے کے ہیں، اس لئے کتاب کے بابرکت ہونے میں یہ پہلو بھی مضمحل ہے کہ وہ تا عمر زمانہ باقی  
رہنے والی ہے، کبھی منسوخ ہونے والی نہیں اور یہ بھی کہ وہ فنا ہونے والی نہیں بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں کہ انالہ  
لحافظون (حجر- ۹)۔ (یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) سے ظاہر کیا گیا اور یہ بھی کہ جتنا غور کیا جاتا رہے اس کے حقائق و نکات کا  
انکشاف ہوتا رہے گا، وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں جسے کلام معصوم میں ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ:-

لا تنقضی عجائبہ ولا تغنی عنہ: اُس کے عجیب عجیب مطالب ختم ہونے والے نہیں، اس کے نادر مضامین فنا پذیر نہیں ہیں۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ۗ نِعَمَ الْعَبْدِ ۗ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿٣٠﴾ اِذْ عَرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ  
الصَّفِيفَةُ الْجِيَادُ ﴿٣١﴾ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي ۗ حَتَّى تَوَارَتْ  
بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾ رَدُّوْهَا عَلَيْكَ ۗ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ﴿٣٣﴾

”اور ہم نے داؤد کو سلیمان (کا ایسا بیٹا) عطا کیا، وہ بہت اچھا بندہ تھا، جب اُسے شام کے وقت تیز رفتار گھوڑوں کا  
معائنہ کرایا جا رہا تھا تو اُس نے کہا کہ میں نے ان گھوڑوں کی محبت کو اختیار کیا اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو کر

یہاں تک کہ وہ (سورج) پردے میں چھپ گیا۔ واپس لاؤ انہیں میری طرف تو وہ اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں کو قطع کرنے لگا۔“

## گھوڑوں کے معائنہ اور آفتاب کے پلٹنے کا بیان

خیبر کا لفظ بعض جگہ قرآن مجید میں مال و دولت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی ترجمہ مال و دولت کے ساتھ ہو سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ [۱]

مگر جناب شیخ الطائف نے اکابر مفسرین کا قول کلام عرب کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ خیبر کا لفظ عربی محاورے میں خیل یعنی گھوڑوں کے معنی میں آتا ہے۔ [۲] اور علامہ طبرسی نے اس کے لئے کلام عرب سے کئی شہاد درج کیے ہیں، بہر حال صورت واقعہ یہ بتائی گئی ہے۔ جو الفاظ قرآن سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جناب سلیمان گھوڑوں کے معائنے میں ایسے محور ہے کہ نماز عصر کا وقت گزر گیا اور سورج غروب ہو گیا۔ اس پر وہ پشیمان ہوئے اور اب اس غفلت کے کفارے کے طور پر انہوں نے ان سب کی قربانی کر کے گوشت راہ خدا میں تقسیم کر دیا۔ اکثر مفسرین کا خیال یہی ہے [۳] اور یہی مفہوم ذہن سے زیادہ قریب ہے۔ بعض لوگوں نے معنی یہی کہے ہیں کہ ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگے [۴] مگر قبل کی صورت حال سے اس کا تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

ہاں ایک تفسیر آیت کی جس کی موافقت میں امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی زبانی روایت آئی ہے۔ اگر مان لی جائے تو مسعبا بالسوق والاعناق کا یہ مفہوم بھی ذہن سے قریب ہو سکتا ہے وہ تفسیر یہ ہے کہ جیسے توارت کی ضمیر آفتاب کی طرف راجع ہے، ویسے ہی ردوہا کی ضمیر بھی آفتاب کی طرف عائد ہے مطلب یہ ہے کہ جب انہیں احساس ہوا کہ سورج ڈوب گیا اور نماز عصر ان کی قضا ہو گئی تو انہوں نے خدا سے دعا کی کہ آفتاب ان کے لئے پلٹا دیا جائے چنانچہ آفتاب پلٹا اور انہوں نے نماز عصر ادا کی۔ [۵]

مجھے جناب امیر کی طرف اس روایت کی نسبت میں تاہل یوں ہے کہ اس صورت میں ردوہا علی ہونا چاہیے تھا (یعنی)، اے اللہ! پلٹا دے اسے مجھ پر، نہ کہ ردوہا علی جو جمع حاضر کو صیغہ ہے کہ ”پلٹا دو اُسے مجھ پر“۔ یہ کون ہیں جن سے وہ آفتاب پلٹانے کے لئے کہیں؟

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَالْقَيْنَانَ عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ﴿٣٣﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٣٤﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ

[۱] دوست داشتتم ایس اسپان را از قبیل رغبت مال (شاہ ولی اللہ) دوست رکھا صحبت مال کو (رفیع الدین)

[۲] العرب تستمی الخیل الخیر (تبیان) حب الخیر ای الخیل (جلالین)

[۳] ای ذبحها و قطع ار جلیها (جلالین)

[۴] ہاتھ پھیرنا بالوں پر اور گردنوں کو (شاہ رفیع الدین)

[۵] اذ قیل معناه اِنَّهٗ سال الله تعالیٰ ان یرد الشمس علیہ فردها علیہ حتی صلی العصر فالها ۛ فی ردوہا یتة عن الشمس عن علی بن ابی

طالب ﷺ (جمع البیان)

الرَّيْحِ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝۳۷ وَالشَّيْطَانُ كُلُّ بَنَاءٍ وَغَوَا۟صٍ ۝۳۸  
وَأَخْرَيْنَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝۳۹ هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ

حِسَابٍ ۝۴۰ وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفَىٰ وَحَسَنَ مَّآبٍ ۝۴۱

”اور ہم نے سلیمانؑ کی آزمائش کی اور ڈال دیا اُن کے تخت پر ایک جسم، پھر انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کی، کہا پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا کر دے جو میرے بعد کسی کی شان کے لائق نہ ہو، یقیناً تو بڑا عطا کرنے والا ہے تو ہم نے ہوا کو اُن کے قبضے میں دے دیا کہ وہ اُن کے حکم پر جہاں وہ چاہیں باہستگی رواں ہوتی تھی اور شیطانوں کو جن میں ہر عمارت بنانے والا اور غوطہ لگانے والا تھا اور دوسرے جوز نیجروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ ہماری عطا ہے تو خوب احسان کرو یا بے اندازہ روک رکھو، بلاشبہ اُن کے لئے ہمارے یہاں تقرب کا درجہ تھا اور انجام کی بہتری“۔

ان تمام آیتوں کی تشریح کے لئے واقعہ کے مستند تفصیلات کی ضرورت ہے جو افسوس ہے کہ ہمارے دسترس میں نہیں ہے۔ تفسیری روایات جو ان امور میں وارد ہوئی ہیں، وہ اتنی غیر مستند ہیں کہ اُن سے کوئی وثوق حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک جو کسی حد تک قابل قبول ہے، یہ ہے کہ اُنہوں نے ایک دفعہ یہ کہہ دیا کہ میری ستر بیویاں ہیں، ہر ایک کے پاس جاؤں گا تو میرے ستر بیٹے ہوں گے مگر اس کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا۔ یہی بات قدرت کو ناپسند ہوئی اور اُن تمام بیویوں کے پاس جانے پر ان میں سے کسی کے یہاں اولاد نہیں ہوئی اور ایک کے یہاں ہوا تو مردہ بچہ جسے اُن کے تخت پر لا کر ڈال دیا گیا۔ اب اُنہیں توجہ ہوئی کہ میں نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا اور اس پر انہوں نے توبہ و انابت کی، اس کے علاوہ بعض قصے بیان ہوئے ہیں جو زیادہ مہمل و دل حزن ہیں۔

بہر حال جو چیز قطعی دلائل سے ثابت ہے یعنی عصمت انبیاء اُس کے خلاف افواہی باتیں جن کا کوئی معتبر ماخذ نہیں، وزن ہی کیا رکھتی ہیں؟ جناب شیخ الطائف نے بھی ان افواہی باتوں کو بیان کر کے بس اس مسلمہ دینی حقیقت یعنی عصمت انبیاء کو یاد دلایا ہے اور پھر اُن بیانات پر کوئی محاکمہ نہیں کیا ہے۔

ایک بات آدمؑ سے لے کر سلیمانؑ تک برابر دیکھنے کی ہے کہ جو ترک اولی اُن سے ایسا ہوا اور اُنہوں نے توبہ و انابت کی، اُس کے بعد بجائے سزا کے وہ اُن کے منصب پر بھیج دیئے گئے جسے حضرت آدمؑ یا اُس کے بعد اُن کے لئے کسی منصب خاص کا اعلان ہو گیا جیسے جناب داؤدؑ اور یہاں جناب سلیمانؑ باوجود یکہ باپ والی حکومت کے مالک تھے، اب اُنہوں نے وہ سلطنت طلب کی جو اُن کے خصوصیات میں سے ہو اور خداوند عالم نے نہ صرف اُن کی درخواست کو قبول فرمایا بلکہ اس کے ساتھ اُن کے لئے تقرب خاص اور حسن انجام کا اعلان بھی فرمادیا۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ۝۴۲  
أَرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۖ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ۝۴۳ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمُ

## مَعَهُمْ رَحْمَةٌ مِنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولَى الْأَلْبَابِ ﴿٣٣﴾

”اور یاد کرو ہمارے بندے ایوبؑ کو جب انہوں نے پکارا اپنے پروردگار کو کہ مجھے گرفتار کیا ہے شیطان نے سختی اور تکلیف میں۔ اپنا پیر مارو، یہ نہانے کے لئے پانی ہے ٹھنڈا اور پینے کا اور ہم نے انہیں عطا کی ان کی آل اولاد اور ان ہی کے ایسے ان کے ساتھ اپنی رحمت سے اور یادگار صاحبانِ عقل کے لئے“۔

### جناب ایوب علیہ السلام اور ان کے صبر کا تفصیلی تذکرہ

”مجھے گرفتار کیا ہے شیطان نے“ اس کا کیا مطلب؟ چونکہ ہمیں جو ان کی تکلیف معلوم ہے عوارض جسمانی اور آفات ارضی و سماوی کے قبیل سے ہے تو اس شیطان کا کیا دخل؟ اس لئے بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں یہ عوارض اور مصائب و آلام مراد نہیں ہیں بلکہ ذہنی کشاکش جو سابق اللہ کی نعمتوں کے زوال اور مصائب کی فراوانی کے تصور سے ہوتی ہے جس میں انسان کو اپنے ایمان میں تزلزل محسوس ہوتا ہے، وہ مراد ہے۔ اسے وہ شیطان کی وسوسہ انگیزی کہہ رہے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ وہ ان تصورات کو بے جا اور اس فکر کو غلط سمجھتے ہیں۔ مگر اس صورت میں ان کی مناجات کے جواب میں صرف ان تکلیفوں کے زوال کا بیان جیسے کافی معلوم نہیں ہوتا بلکہ مزید کچھ ان کے استحکام ایمان کے سلسلہ میں اطمینان دہانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ شیطان کی وسوسہ انگیزی کو انہوں نے اپنے متعلق نہیں کہا ہے بلکہ شیطان کی وسوسہ انگیزی نے عام لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ ان کی بیماری کی وجہ سے ان کو اچھوت سمجھ لیں اور ان کے قریب جانے سے پرہیز کریں۔ اس قول کے باوجود یکہ نسبت امام جعفر صادق کی طرف بھی ہے مگر ہمارے علماء نے اُسے قبول نہیں کیا ہے اس تصور کی بنا پر کہ انبیاء کو کسی ایسے مرض میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے جس سے لوگ نفرت کریں۔ [۲] لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اگر مرض واقعی قابل نفرت نہ ہو مگر لوگ پروپیگنڈے کی بنا پر اور عداوت و عناد سے بے جا طور پر الگ رہنے لگے ہوں اور دوسرے لوگوں کو الگ رہنے کو کہتے ہوں جیسا کہ شیطان کی طرف اُس کے اسناد سے ظاہر ہے تو اس میں شانِ رسالت پر کیا اثر پڑتا ہے جب کہ اُس میں شانِ عصمت کا تحفظ ہو رہا ہے۔

وَحُذِّبِيكَ ضِعْفًا فَاصْبِرْ بِبِهِ وَلَا تَحْنُطْ ۗ اِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۗ نِعْمَ الْعَبْدُ ۗ

اِنَّهُ اَوَّابٌ ﴿٣٤﴾

”اور اپنے ہاتھ میں ایک گھچالے کر اُسے مارو اور اپنی قسم کی مخالفت نہ کرو، بے شک ہم نے اُسے صبر کرنے والا پایا بڑا اچھا بندہ، یقیناً وہ لو لگانے والا تھا“۔

ان واقعات کے بیان میں قرآن مجید کے انداز تذکرہ سے ظاہر ہے کہ یہ واقعات بوقت نزول قرآن مجید عام طور پر معلوم و مشہور تھے۔

[۱] مَسْنَى الشَّيْطَانِ اِي وَسْوَسَتِي وَذِكْرِي مَا كُنْتُ فِيهِ مِنْ نِعْمِ اللّٰهِ فِي الْاَهْلِ وَالْوَالِدِ وَالْمَالِ وَكَيْفَ زَالَ ذٰلِكَ كُلُّهُ (تبیان)

[۲] اَقَالَ اَهْلُ التَّحْقِيقِ اِنَّهُ لَا يَجُوزُ اَنْ يَكُوْنَ بِصِفَةِ يَسْتَقْدِرُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ اِلَّا فِي ذٰلِكَ تَنْفِيْرًا (مجمع البيان)

اس لئے قرآن صرف اجمالاً بلکہ اشارۃً اُن کا ذکر کر کے آگے بڑھ جاتا ہے جس سے وہ لوگ جو اُس پر مطلع نہیں ہیں، پورے واقعہ کو سمجھ نہیں سکتے۔ ہم ایسے دور افتادہ افراد تفصیلات کے لئے اب روایات کے دست نگر ہو گئے ہیں چنانچہ اس واقعہ کے سلسلے میں جو معلوم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی بات پر حضرت ایوبؑ نے اپنی زوجہ کے لئے قسم کھائی تھی کہ وہ سوچھڑیاں یا تازیانے لگائیں گے لیکن وہ بیوی بظاہر مقربانِ الہی میں سے تھیں لہذا خالق نے ایسی صورت بتائی ہے کہ اُن کی قسم بھی پوری ہو جائے اور اُس خاتون کو کوئی خاص تکلیف بھی نہ ہو۔ [۱]

وَأَذْكُرُ عَبْدًا نًّا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولَى الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ﴿۳۵﴾ إِنَّا  
أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۳۶﴾ وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنِ  
الْأَخْيَارِ ﴿۳۷﴾ وَأَذْكُرُ اسْمُعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ط وَكُلُّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴿۳۸﴾

”اور یاد کرو ہمارے بندگانِ خاص ابراہیمؑ و اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو جو خاص دسترسوں اور نگاہوں والے تھے۔ ہم نے انہیں عالمِ آخرت کی یاد دہانی کی پر خلوص صفت کے ساتھ مخصوص کیا اور بلاشبہ وہ ہمارے نزدیک نیک آدمیوں میں تھے اور یاد کرو اسماعیلؑ، یسع اور ذوالکفل کو اور ہر ایک نیک آدمیوں میں سے تھا۔“

بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ کی ترکیب نحوی اور اُس کے مضمرات میں بہت سے پہلو ہیں جنہیں علامہ طبرسیؒ نے درج فرمایا ہے لیکن واضح مفہوم یہی ہے کہ الدار سے مراد عالمِ آخرت ہے اور اُس کی یاد دہانی اُن کا امتیازی وصف ہے جسے خالصۃ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اس طرح ذِکْرَى الدَّارِ خالصۃ کے ابہام کی تشریح ہے۔ اس کے موافق نے ترجمہ کیا ہے۔ [۲]

هَذَا ذِكْرٌ ط وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لِحُسْنِ مَّآبٍ ﴿۳۹﴾ جَنَّتٍ عَدْنٍ مَّفْتَحَةٌ لَهُمْ  
الْأَبْوَابُ ﴿۴۰﴾ مُتَّكِبِينَ فِيهَا يُدْعَوْنَ فِيهَا بِأَفْئَاتٍ كَثِيرَةٍ وَّشَرَّابٍ ﴿۴۱﴾ وَعِنْدَهُمْ  
قُصْرَاتٌ الطَّرْفِ أَرْبَابٌ ﴿۴۲﴾ هَذَا مَا تُوْعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۴۳﴾ إِنَّ هَذَا لَرِزْقُنَا  
مَالَهُ مِنْ نِعْمَاتِنَا ﴿۴۴﴾

”یہ بڑا اہم تذکرہ ہے اور بلاشبہ پرہیزگاروں کے لئے انجام کی بہتری ہے۔ وہ جاودانی بہشت جس کے دروازے اُن کے لئے کھلے ہوں گے۔ وہ تکیوں سے لگے ہوئے بیٹھے ہوں گے، منگوار ہے ہوں گے اُن میں بکثرت فواکہ اور پینے کے شرابت اور اُن کے پاس نگاہوں کو محدود رکھنے والی ہم عمر حوریں ہوں گی۔ یہ وہ ہے جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے حساب کے دن کے واسطے۔ یقیناً یہ ہماری طرف کا مخصوص رزق ہے جس کے لئے ختم ہونا نہیں ہے۔“

[۱] قبیل اٹھ کان خلف علی امر اٹھ لامر انکو لائن عوفی لیضرب بنہا مائة (تبیان)

[۲] الخالصۃ بمعنی الخلوص والدِّکْرَى بمعنی التذکیر ای خلص لہم تذکیر الدار وهو ائہم کانوا ایذ کرو نہا بالتأہب لہا ولیزہدون فی الدنیا کما هو عادۃ الانبیاء (مجمع البیان)

”یہ ایک بڑا اہم تذکرہ ہے۔“ یہ ترجمہ ایک تفسیر کے مطابق ہے۔ [۱] اس کے علاوہ بعض مقامات پر ذکر کے معنی شرف اور درجہ امتیازی کے بھی آئے ہیں۔ اس طرح انبیاء کے تذکرہ کے بعد اس لفظ کا یہ مطلب ہوگا یہ جو ان بزرگوں کو خصوصیات حاصل تھے، یہ ان کے لئے ایک خاص عزت و امتیاز کی حیثیت رکھتے تھے۔ [۲] اور یوں اس کے علاوہ انجام کی بہتری کلینتہ حسن عمل سے وابستہ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ بعد کو ہوا ہے۔ حوروں کے لئے متعدد جگہ اس طرح کے وصف سے جس کے لئے یہاں قاصرات الطرف کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے کیا ”نگاہوں کو محدود رکھنے والی“۔ [۳]

اور سورہ رحمن میں اس کے علاوہ مقصورات فی الخیام ”خیموں کے اندر محدود رہنے والیاں“ اس طبقہ (صنف نازک) کے لئے خالق کی نظر میں جو پسندیدہ معیار ہے، اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس صنف کے لئے خالق کی نگاہ میں وہ کوئی خوبی نہیں ہے جسے آج کل ”ایڈوانس“ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ”سوشل“ کہہ کے تعریف کی جاتی ہے جو موجودہ دور ارتقاء کی ذہنیت کی ترجمان ہے۔

هَذَا ط وَإِنَّ لِلطَّغْيِينِ لَشَرَّ مَا بٍ ۝۵۵ جَهَنَّمَ ۖ يَصْلَوْنَهَا ۖ فَبِئْسَ الْبِهَادُ ۝  
هَذَا ۖ فَلْيَدُّ وَقُوَّهُ حَمِيمٌ ۝۵۶ وَغَسَّاقٌ ۝۵۷ وَأَخْرَجْنَا مِنْ شَكْلَةٍ أَرْوَاحٌ ۝۵۸ هَذَا فَوْجٌ  
مُقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۖ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ط إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ۝۵۹

”یہ تو ہے (ایک طرف) اور یقیناً سرکشوں کے لئے انجام کی برائی ہے، دوزخ جس کی گرمی وہ اٹھائیں گے تو کیا برا وہ ٹھکانا ہے۔ اب یہ ہے تو اُسے انہیں چکھنا ہے، گرم پانی اور پیپ اور اسی صورت کی ملتی جلتی ہوئی چیزیں۔ یہ ایک بڑا انبوہ ہے جو تمہارے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔ کوئی ”خوش آمدید“ ان کے لئے نہیں ہے انہیں تو اس آگ کی گرمی برداشت کرنا ہے۔“

”یہ ایک بڑا انبوہ ہے جو تمہارے ساتھ داخل ہو رہا ہے“ اس سے ظاہر ہے کہ پہلا عذاب جو بیان ہوا ہے، وہ لیڈروں اور غلط پیشواؤں کا ہے اور وہ جو ان کے ساتھ داخل ہونے والے ہیں بے چارے ان کے پیرو ہیں۔ بعد کی آیت سے کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ لا مرحباً بہم ”کوئی خوش آمدید ان کے لئے نہیں ہے“ یہ ان لیڈروں کا قول ہے جن سے خطاب ہوا تھا کہ ”یہ ایک بڑا انبوہ ہے جو تمہارے ساتھ داخل ہو رہا ہے“ اسے سن کر جیسے وہ کہتے ہیں۔ [۴] کہ ہمیں اس انبوہ سے کوئی غرض نہیں ہے، کوئی ”خوش آمدید“ ان کے لئے نہیں ہے۔ یہ کم بخت تو دوزخ کے مستحق ہے، اس پر وہ ان سے کہیں گے جو بعد کو ہے۔

قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ ۖ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ط أَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوهُ لَنَا ۖ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝۶۰

[۱] لہذا ذکر لہم بالثناء الجمیل ہنا (جلالین)

[۲] ای شرف لہم و ذکر جمیل و ثناء حسن ین کروں بہ فی الدنیا ابدا (مجمع البیان)

[۳] ما بسات العین علی ازواجہن (جلالین)

[۴] ان القادة والرؤساء يقولون لا تتابع لا مرحباً بهؤلاء انهم يدخلون النار (مجمع البیان)



### قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هَذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضَعْفًا فِي النَّارِ ﴿١١﴾

”انہوں نے کہا بلکہ تم، تمہارے لیے ”خوش آمدید“ نہ ہو، تم ہی یہ دن ہمارے سامنے لائے تو کیا برا ٹھکانا ہے (پھر کہا) اے ہمارے پروردگار! جو ہمارے سامنے اُسے لایا اسے دردناک عذاب کر اس آگ میں۔“

چونکہ لیڈروں نے اصل دوزخی ان اپنے پیروؤں کو قرار دیا تھا، اس لئے اب یہ اُن کی جانب سے اُس کا جواب ہے۔ [۱۱] جو بل سے شروع ہو رہا ہے، یعنی ہم اصل دوزخی کیوں ہونے لگے، بلکہ تم نے ہمیں گمراہ کیا اور تمہاری اطاعت سے یہ روز بد ہمارے سامنے آیا ہے۔ [۱۲] اور اس لئے وہ پروردگار عالم سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں دوزخی سزا دے۔ خود ان کی گمراہی کی بھی اور ہمارے گمراہ کرنے کی بھی۔

### وَقَالُوا مَا لَنَا لَنْزِي رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ ﴿١٢﴾ أَتَأْتِنَاهُمْ سِحْرِيًّا أَمْ

### زَاغَتْ عَنْهُمْ الْأَبْصَارُ ﴿١٣﴾ إِنَّ ذَلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿١٤﴾

”اور انہوں نے کہا کہ کیا بات ہے ہم اُن اشخاص کو نہیں دیکھتے جنہیں ہم بہت برے آدمیوں میں شمار کرتے تھے۔ ہم نے اُن کا (بلاوجہ) مذاق اڑایا تھا یا نظریں اُن کے دیکھنے سے چوک رہی ہیں؟ یقیناً ایسا ہی واقعی ہونا ہے دوزخ والوں کا آپس کا جھگڑا۔“

### قُلْ إِنَّمَا آتَا مُنذِرٌ ﴿١٥﴾ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾ رَبُّ السَّمَوَاتِ

### وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ﴿١٧﴾

”کہہ دیجیے کہ میں تو بس ڈرانے والا ہوں، اور کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے جو یکتا، زبردست، آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار، عزت کا مالک، بخشنے والا ہے۔“

### قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ ﴿١٨﴾ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ﴿١٩﴾ مَا كَانَ لِي مِنْ

### عِلْمٍ بِالْمَلَائِكَةِ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٢٠﴾ إِنَّ يُوْحَىٰ إِلَىٰ آلِ الْأَنْبِيَاءِ أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢١﴾

”کہئے یہ بہت بڑی خبر ہے جس سے تم بے اعتنائی اختیار کرتے ہو مجھے تو کوئی علم نہیں تھا عالم بالا کے رہنے والوں کا جب وہ سوال و جواب کر رہے تھے، میری طرف وحی نہیں ہوتی سوا اس کے کہ میں صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔“

اس کو اگر قبل کے تذکرہ سے متعلق کیا جائے تو وہ سوال و جواب اہل دوزخ کے تابعین و متوہمین کا ہوگا مگر ملا اعلیٰ کا لفظ اُس پر زیادہ

[۱] تابعان گویند (شاہ ولی اللہ) پہلے وہ تھے جو دنیا میں سردار تھے، پچھلے وہ جو ادنیٰ تھے (موضح القرآن)

[۲] ای حملتمونا علی الکفر الذی اوجب لنا هذا العذاب (مجمع البيان)

منطبق نہیں اور اگر بعد کے تذکرے سے متعلق سمجھا جائے تو ملا اعلیٰ سے مراد فرشتے ہوں گے جن میں اور ابلیس میں سجدہ آدم کے باب میں اختلاف عمل نمودار ہوا اور پھر خالق اور ابلیس کے درمیان سوال و جواب ہوا۔ بعض لوگوں نے اُسے اُس سوال سے متعلق کیا ہے جو فرشتوں کی طرف سے اعلانِ خلافتِ آدم کے متعلق ہوا۔ [۱] مگر ملائکہ کی عصمت کو دیکھتے ہوئے اس سوال و جواب کو اختصام یعنی آپس کے جھگڑے کے لفظ سے تعبیر کیا جانا دل کو لگتی ہوئی بات نہیں ہے، پھر جب کہ خلافتِ آدم والے اعلان کا یہاں قبل اور بعد میں کہیں ذکر نہیں ہے لیکن اس کے بعد بلا فاصلہ سجدہ آدم کے حکم اور ابلیس کے انکار کا ذکر موجود ہے، تو بلا وجہ سے کسی دوسرے واقعہ سے متعلق کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ﴿۴۱﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُهُ وَنَفَخْتُ فِیْهِ  
 مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدٰتٍ ﴿۴۲﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰئِكَةُ كُلُّهُمْ اٰجْمَعُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا  
 اِبْلِیْسَ ۗ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۴۴﴾ قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ  
 لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیْیْ ۗ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعٰلِیْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۗ  
 خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِیْنٍ ﴿۴۶﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رٰجِیْمٌ ﴿۴۷﴾ وَاِنَّ  
 عَلَیْكَ لَعْنَتِیْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۴۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَالَ  
 فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۵۰﴾ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۵۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ  
 لَا اُغْوِیَنَّهُمْ اٰجْمَعِیْنَ ﴿۵۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلِصِیْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ  
 اَقُوْلُ ﴿۵۴﴾ لَا مَلَكَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَهَمَّسَنَّ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اٰجْمَعِیْنَ ﴿۵۵﴾

”جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک انسان مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اسے تیار کر لوں اور اُس میں اپنی خاص روح میں کا ایک جزء پھونک دوں تو اُس کے سجدے میں گر جانا تو جتنے فرشتے تھے سب نے سجدہ کیا سو ابلیس کے اُس نے گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے تو تھا ہی۔ ارشاد ہوا اے ابلیس! کون امر تجھے مانع ہوا اس سے کہ تو سجدہ کرے اُسے جسے میں نے خود اپنی قدرت خاص سے پیدا کیا ہے؟ تو کیا تو نے گھمنڈ سے کام لیا ہے یا تو واقعی اونچے طبقے والے افراد میں سے تھا؟ اُس نے کہا میں اُس سے بہتر تو ہوں ہی، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا تھا اور اُسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اس پر ارشاد ہوا تو نکل جا اُس میں سے کہ تو (ہمیشہ کے لیے) راندا ہوا ہے اور یقیناً تجھ پر میری لعنت ہے روز قیامت تک۔ اُس نے کہا پروردگار! مجھے مہلت

[۱] یعنی بالملا الاعلیٰ الملائکة اختصموا فی ادم حین قیل لہم: ائی جاعل فی الارض خلیفة فی قول ابن عباس وقتادة والسدي (تبیان) یختصمون فی شان ادم حین قال اللہ: ائی جاعل فی الارض خلیفة (جلالین)

دے اُس دن تک کہ جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے۔ کہا تجھے موقع دیا جاتا ہے مقررہ وقت والے دن تک۔ اُس نے کہا تو قسم ہے تیرے عزت و جلال کی کہ میں اُن سب کو گمراہ کروں گا سوا تیرے خاص نکھارے ہوئے بندوں کے۔ ارشاد ہوا کہ پھر یہ حقیقت ہے اور جو حقیقت ہو وہی میں کہتا ہوں کہ میں لازماً بھردوں گا دوزخ کو تجھ سے اور اُن سے جو اُن میں سے تیری پیروی کریں گے۔

اَسْتَكْبَرْتُمْ اَمَّ كُنْتُمْ مِنَ الْعَالَمِينَ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ تو نے گھمنڈ سے کام لیا ہے یا واقعی تو اونچے طبقے والے افراد سے تھا، اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ کوئی اونچا طبقہ ایسا تھا جو سجدہ آدم پر مامور نہ تھا مگر بعض حضرات نے اس عالین کے لفظ کو اس مفہوم میں لیا ہے جیسے فرعون کیلئے قرآن میں آیا ہے: علافی الارض ”اُس نے روئے زمین پر بڑا بننے کی کوشش کی“ اسی طرح ایک جگہ ہے: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ ”وہ آخرت کا گھر اُن کے لئے ہے جو روئے زمین پر بڑا بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ [۱] مگر اس صورت میں اُس کا مفہوم استکبرت ”کیا تو نے تکبر کیا“ سے ملتا جلتا ہوگا تو اُسے حرف عطف کے ساتھ یوں ہونا چاہیے تھا کہ استکبرت و کنت من العالین مگر وہاں ام کے لفظ کے ساتھ آیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ استکبار کے مقابل کی کوئی چیز ہے اور بعض مستند مفسرین کی تشریح ہمارے موافق ہے۔ [۲]

قُلْ مَا اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَا اَنَا مِنَ الْمَتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۷﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ

لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَتَعْلَمَنَّ نَبَاہُ بَعْدَ حَبِيْنٍ ﴿۸۹﴾

”کہتے ہیں تم سے کوئی معاوضہ اس پر نہیں مانگتا اور نہ میں زبردستی کی باتیں کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ نہیں ہے سوا نصیحت و ہدایت کے تمام دنیا جہان کے لئے اور کچھ مدت کے بعد تمہیں اس کا حال معلوم ہوگا“

”نہ میں زبردستی کی باتیں کرنے والوں میں سے ہوں“، یعنی بغیر مستحکم دلائل کے خواہ مخواہ ادعائے رسالت کروں، ایسا نہیں ہے۔ [۳] اور ایک مفہوم یہ کہا گیا ہے کہ میں خالق کی طرف سے مامور ہوا ہوں ورنہ میں بلا وجہ از خود یہ زحمت کیوں اٹھاتا۔ [۴]

[۱] استکبرت یا ابلیس ای طلبت المتکبر با متناعک من السجود له ام کنت من العالمین الذین یعلون علی الحق تجبراً و تکبراً (تبیان)

[۲] ام کنت من الذین تعلوا اقدارهم عن السجود فتعالیت عنہ (مجمع البیان)

[۳] ای ولست من یتعسف فی طلب الامر الذی لا یقتضیہ العقل (تبیان) المتقولین القرآن من تلقاء نفسی (جلالین)

[۴] من المتکلفین لهذا القرآن من تلقاء نفسی وقیل معناه ائی ما اتیتکم رسولاً من قبل نفسی ولم اتکلف لهذا الا بامر بہ (مجمع البیان)

# سُورَةُ الزُّمَرِ

مکیہ --- ۵ --- آیات

”زُمر“ زُمرہ کی جمع ہے جس کے معنی گروہ کے ہیں، چونکہ اس سورہ کے دوران میں اہل جنت اور اہل جہنم دونوں کے لئے کہا گیا ہے کہ بصورتِ زُمر یعنی گروہ درگروہ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف جائیں گے، اس لئے اس سورے کا نام زُمر ہوا۔

## سورہ زُمر کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ مشرکین کی اپنی بت پرستی کے لئے توجیہ کہ ہم ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ سے قریب کریں جیسا اپنے الفاظ میں اس وقت کے تعلیم یافتہ بت پرست بھی اکثر اپنی بت پرستی کی توجیہ میں کہا کرتے ہیں۔
- ۲۔ انسانوں کی تین تاریکیوں کے اندر درجہ بدرجہ تخلیق۔
- ۳۔ کوئی دوسرے کا بار نہیں اٹھائے گا۔
- ۴۔ عالم اور جاہل برابر نہیں۔
- ۵۔ صبر کرنے والوں کے لئے اجر بے حساب۔
- ۶۔ سب کی سنا چاہیے اور اُس میں جو بہتر ہو اُسے قبول کرنا چاہیے۔
- ۷۔ رسول سے خطاب کہ آپ کو بھی سب کی طرح موت سے دوچار ہونا ہے۔
- ۸۔ وفات بصورتِ موت اور بصورتِ خواب۔
- ۹۔ گناہ گاروں کو نانا میدانہ ہونا چاہیے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ① اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ بِالْحَقِّ  
فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ② اَلَا لِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ③ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ  
دُونِهِ اَوْلِيَاءَ ④ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُونَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفَى ⑤ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ

### فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفّٰرٌ ﴿٣٠﴾

”کتاب کا اتارا جانا ہے اللہ کی طرف سے جو عزت والا، صحیح کام کرنے والا ہے یقیناً ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہے سچائی کے ساتھ تو اللہ کی عبادت کیجئے خالص رکھتے ہوئے دین کو اُس کے لئے۔ معلوم رہے کہ خالص دین کا مرکز صرف اللہ ہے اور جنہوں نے اُس کے علاوہ سرپرست بنا لئے ہیں (کہتے ہیں کہ) ہم اُن کی عبادت نہیں کرتے ہیں مگر اس لئے کہ ہم کو اللہ کی بارگاہ میں قریب کریں، بلاشبہ اللہ فیصلہ کرے گا اُن کے درمیان اُس میں کہ جس کے بارے میں وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ یقیناً اللہ منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا ایسے کو جو جھوٹا بڑا ناشکرا ہو۔“

### تحقیق کا دامن چھوڑنا غلط

اہل حق کی جزا اور اہل باطل کی سزا ہی وہ مختتم فیصلہ ہے جس کے لئے قیامت کی پوری کارگاہ ہے۔ اس فیصلے کے لئے قیامت کا حوالہ بہت سے مقامات پر قرآن میں ہے جس میں رواداری بھی ہے اور حقانیت کے ایک خاص پہلو کا اظہار بھی۔ رواداری تو یہ ہے کہ یہ معاملہ جب قیامت میں طے ہونا ہے تو دنیا میں اس سوال پر جنگ و جدال سے کیا فائدہ ہے؟ ”موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود“ پر عمل کرو اور آپس میں مل جل کر رہو۔ مذہب کی بنا پر لڑائی جھگڑا بالکل بے کار کی بات ہے۔ اس کے ساتھ حقانیت کے جس پہلو کا اظہار ہے، وہ یہ ہے کہ آج کل کے بعض ترقی یافتہ افراد کا یہ کہنا کہ مذاہب سب درست ہیں۔ اعمال بس درست ہونا چاہئیں، یہ بالکل غلط ہے۔ حق ان میں سے ایک ہی ہے جس کا فیصلہ جزا و سزا کی شکل میں روز قیامت سامنے آئے گا لہذا اس دنیا میں تحقیق کا دامن چھوڑنا غلط ہے اور جسے اُن کا ضمیر مستحکم دلیل کے ساتھ حق بتائے، اُس حق سے دوسروں کو متعارف بنانا بھی خلق خدا کے ساتھ خیر خواہی ہے لہذا اہل حق کو مذہب حق کی تبلیغ کرنا بھی درست ہے مگر اُنہی حدود میں جو قرآن مجید کے انداز بیان سے جا بجا سامنے آتے ہیں۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۗ سُبْحٰنَهُ ۗ هُوَ اللّٰهُ  
الْوٰحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣١﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۗ يَكُوِّرُ اَلَيْلَ عَلٰى النَّهَارِ  
وَيَكُوِّرُ النَّهَارَ عَلٰى اَلَيْلٍ ۗ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۗ كُلٌّ لِّمَجْرٰى لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ  
اَلَا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ﴿٣٢﴾

”اگر اللہ چاہتا کہ کوئی اولاد اختیار کرے تو اپنی مخلوقات میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا۔ پاک ہے اُس کی ذات وہ تو بس ایک بڑا غالب و قاهر اللہ ہے۔ اُس نے آسمانوں اور زمین کو سچائی کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ لپینٹا ہے رات کو دن پر اور لپینٹا ہے دن کو رات پر اور وہ قابو میں رکھے ہوئے ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک چل رہا ہے ایک مقررہ مدت تک معلوم رہے کہ وہ عزت والا بڑا بخشنے والا ہے۔“

آغاز آیت مثل بعض دیگر آیات کے یہ بتاتا ہے کہ وہ بطور متبہٹی بیٹا بنانے کی نفی میں ہے مگر اُس کے ساتھ سُبْحٰنَهُ کا لفظ اور پھر اُس

کے خدائے واحد ہونے کا تذکرہ بتاتا ہے کہ وہ حقیقی اولاد کی نئی ہے جو شان الوہیت کے خلاف ہے بہر حال نتیجتاً دونوں تصورات کی رد ہو جاتی ہے خواہ کوئی کہتا ہو کہ واقعی عیسیٰ اُس کے بیٹے ہیں یا یہ کہتا ہو کہ اُس نے انہیں بیٹا بنایا ہے۔ ہیں دونوں ہی باتیں غلط۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلْ مِنْهَا زَوْجَهَا وَانزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ  
ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ ۖ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمٍ  
ثَلَاثٍ ۖ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَآلِي تَصَرُّفُونَ ﴿٦﴾

”اُس نے تم سب کو پیدا کیا ایک تنفس سے، پھر اُس سے اُس کے شریک زندگی کو پیدا کیا اور تمہارے لئے اُتارا چوپایوں میں سے آٹھوں قسموں کو، وہ تمہیں پیدا کرتا ہے تمہاری ماؤں کی شکموں میں ایک طرح کی تخلیق، پھر دوسری طرح کی تخلیق کے ساتھ تین اندھیرے پردوں میں۔ یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار۔ اُس کے لئے سلطنت ہے، کوئی خدا نہیں سوا اُس کے، تو کدھر مخرف ہوتے ہو۔“

چوپایوں کی آٹھ قسمیں: گائے، بھینس، اونٹ، بکری اور بھیڑ، ہر ایک میں زراور مادہ جن کا ذکر سورۃ انعام میں ہو چکا ہے۔ [۱]

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَإِنْ تَشْكُرُوا  
يَرِضْهُ لَكُمْ ۖ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۖ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ  
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٧﴾

”اگر تم ناشکر اپن اختیار کرو تو یقین جانو اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکرے پن کو پسند نہیں کرتا اگر تم شکر گزاری کرو تو وہ تمہارے لئے اُسے پسند کرتا ہے اور کوئی ایک بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تمہارے پروردگار کی طرف تم سب کی رجوع ہوگی اور وہ تمہیں بتائے گا جو کرتے تھے، یقیناً وہ دلوں کی باتوں کا جاننے والا ہے۔“

”اللہ تم سے بے نیاز ہے“ یعنی تمہاری شکر گزاری سے اُس کا کوئی فائدہ نہیں اور ناشکرے پن سے، اس کا کوئی نقصان نہیں ہے ”وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکرے پن کو پسند نہیں کرتا“، یعنی بحیثیت مربی کے وہ اُس کے درپے ہے کہ اس کے بندے خصائلِ حسنہ سے آراستہ ہوں اور یہ بُری خصلتوں سے دور ہوں اور ناشکر اپن بری چیز ہے اور وہ ان کے لئے اسے ناپسند کرتا ہے، بے شمار آیات قرآن کی طرح انسان کے فاعل مختار ہونے کی دلیل ہے، اس لئے کہ جب وہ کفرانِ نعمت سے راضی نہیں اور شکر گزاری سے راضی ہے تو اگر افعالِ انسانی اُس کے جبر سے ہوتے تو کفرانِ نعمت کا وجود ہی ناممکن ہے۔

[۱] ہی التی فشرناہا فی سورۃ الانعام (علی بن ابراہیم)

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا  
كَانَ يَدْعُوًا إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ط قُلْ تَمَتَّعْ  
بِكُفْرِكَ قَلِيلًا ۖ إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۝۹

”اور جب آدمی پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے پروردگار کو پکارتا ہے اُس سے لو لگاتے ہوئے، پھر جب وہ اپنی  
طرف سے اُسے کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ بھول جاتا ہے اُسے جس کے واسطے وہ پہلے پکار رہا تھا اور اللہ کے لئے  
شریک قرار دیتا ہے کہ اُس کے راستے سے گمراہ کرے۔ کہو کہ فائدہ اٹھا لو اپنے ناشکرے پن سے تھوڑے دن یقیناً  
تو دوزخ والوں میں سے ہے۔“

”کہو“ یہ کسی شخص خاص سے خطاب نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ بات اس سے کہی جائے تو بالکل درست ہے لیکن عام طور پر مفسرین  
ایسے خطاب کا مخاطب رسول کو قرار دیا کرتے ہیں چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے۔ [۱] جو میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ پھر ”فائدہ اٹھالے“ یہ  
کہنا حکم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ تجھ کو اس دنیا میں تھوڑے دن فائدہ اٹھالینے دیا جائے گا پھر اُس کے بعد دوزخ میں جلنا ہے۔ [۲]

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهِ ط  
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو  
الْأَلْبَابِ ۝۱۰

”آیا وہ شخص جو عبادت کرنے والا ہے، رات کے لمحات میں سجدے کی حالت میں اور قیام میں کہ آخرت سے ڈرتا  
ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار رہتا ہے؟ کہئے کہ کیا برابر ہیں وہ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے؟  
بس نصیحت تو صاحبان عقل ہی قبول کرتے ہیں۔“

اکثر آیتوں میں اس طرح کے سوال سے آغاز ہوا ہے جس کا انداز بتاتا ہے کہ اس کے قبل بھی ایسا ہی کچھ سوال تھا مگر موجودہ ترتیب میں  
وہ نظر نہیں آتا، اس لئے اُس سوال کے مقابل کا رُخ الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرا رخ سننے والے کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہو  
بہر حال اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اور وہ جو ایسا نہیں ہے، برابر نہیں ہیں۔ [۳]

قُلْ يُعْبَادُ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ط لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا

[۱] قال الله تعالى لنبيه قل له يا محمد ﷺ على سبيل التهديد (تبيان)

[۲] هذا امر معناه الخبر كقوله اذالم تستحي فاصنع ما شئت (مجمع البيان)

[۳] آری آن ناسپاس مشدک بہتداسست یا کسی کہ (شاہ ولی اللہ) فاترہمالا یستایان ابدال (تبیان)





اول المسلمین کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ”اول نمبر کا مسلمان“ اس میں کسی تبصرہ و توجیہ کی ضرورت نہیں ہے اور اس کی نظریں قرآن مجید میں بکثرت ہیں مگر جنہوں نے اس کا ترجمہ ”پہلے مسلمان“ کے ساتھ کیا ہے یعنی اس انہیں کو باعتبار زمانہ قرار دیا ہے اس اولیت میں توجیہ سے کام لینے کی ضرورت پڑی ہے جیسا کہ جناب شیخ الطائفہ نے لکھا ہے:-

أَمَّا أَمْرَانِ يَكُونُ أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ كَانَ مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمُونَ كَثِيرُونَ لِأَنَّ الْمُرَادَ بِهِ أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ (تبیان)

آپ کو حکم ہوا کہ آپ مسلمانوں میں سب سے پہلے ہوں، حالانکہ آپ کے پہلے بہت مسلمان تھے مگر مقصود یہ ہے کہ اس امت میں سب سے پہلے اسلام کا نمونہ آپ ہوں۔

حالانکہ ممدوح اس کے قبل کے جملے: امرت ان عبد الله مخلصا له الدين کے تحت میں لکھ چکے ہیں کہ:-

الْأئِمَّةُ وَأَنْ تُوَجَّهَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ إِلَّا أَنْ الْمُرَادَ بِهَا جَمِيعَ الْمُكَلَّفِينَ

آیت کا روئے خطاب اگرچہ رسول کی طرف ہے مگر مراد اس سے تمام افراد مکلفین ہیں۔

اس صورت میں دوسرے جملے میں: اول المسلمین ہونے کا حکم، اُسے بھی پھر تمام مکلفین سے متعلق ہونا چاہیے مگر ظاہر ہے کہ مکلفین میں سے ہر فرد اس امت میں بھی سب سے پہلا مسلمان ہونے والا فرد نہیں ہو سکتا، پھر اس حکم کے کیا معنی؟ ہم نے جو معنی قرار دیئے ہیں اُن میں کوئی دشواری نہیں ہے، اس لئے کہ مطلوب اول خالق کی طرف سے ہر بندے کے لئے یہی ہے کہ وہ اول نمبر کا مسلمان ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اس مقصد کو بدرجہ اتم اکل پورا کرنے والی وہی ذات ہوگی جو اس خطاب کی مخاطب اول ہے۔

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَى ۗ

فَبَشِّرْ عِبَادِ ۚ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ

هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝۱۸

”اور جنہوں نے باطل معبودوں سے پرہیز کیا کہ وہ اُن کی عبادت کریں اور اللہ سے لو لگائی اُن کے لئے خوش خبری ہے تو دے دو خوش خبری میرے اُن بندوں کو جو بات غور سے سنتے ہیں تو جو اُس کا بہترین جزء ہے، اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کی اللہ نے خاص طور پر رہنمائی کی ہے اور یہ ہیں صاحبانِ عقل“۔

یہ رجحان کہ انسان اپنے کانوں پر پھرے بٹھائے کہ جو اُس کی دل پسند باتیں ہوں، اُنہی کو سنے اور جن باتوں کو وہ ناپسند کرتا ہے یا سمجھتا ہے کہ وہ میرے نقطہ نظر کے خلاف ہے وہ نہ سنے۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ سنو سب کی، پھر اپنی عقل اور قوت نظر و استدلال سے فیصلہ کرو کہ کیا ماننے کے قابل ہے تو اسے قبول کرو اور کیا مسترد کرنے کے لائق ہے تو اُسے مسترد کر دو۔

أَمَّنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۙ ﴿١٩﴾

”کیا جس پر عذاب کا فیصلہ قلم بند ہو گیا ہے تو کیا آپ اُسے چھڑادیں گے جو آگ میں ہے۔“

یہ بھی ایک انداز کلام ہے، پہلے جملے کا بس مبتدا کہہ کر کہ جیسے کلام کو نام چھوڑ دیا گیا ہو، پھر دوبارہ ایک نئے جملے سے اُس کی خبر کا اظہار کیا گیا۔

پہلے جیسے یہ کہا جا رہا تھا کہ کیا جس پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا، وہ بھلائی بھی سکتا ہے؟ مگر یہ فیصلہ تو اس شخص کے عناد اور اُس کی بد اعمالی کی بنا پر ہوتا ہے جس میں وہ مستقل طور پر مبتلا ہے تو کہا جا رہا ہے کہ وہ تو اپنے ہاتھوں خود جیسے جہنم میں اسی وقت پڑا ہوا ہے۔ آپ کا اس میں اختیار ہی کیا ہے؟ [۱] آپ کے بس میں اُس کا بچانا تھوڑی ہے جو آپ اس غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ یہ لوگ ہدایت قبول کیوں نہیں کرتے۔ [۲]

لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِي مِنْ

تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۗ وَعَدَّ اللَّهُ ۙ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْبِعَادَ ۙ ﴿٢٠﴾

”مگر وہ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے اُن کے لئے بالائی منزل پر کے محل ہیں جن پر اور محل بنے ہوئے ہیں جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، یہ اللہ کا وعدہ ہے اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔“

چونکہ اس کے پہلے بد اعمال جماعت کے عذاب میں یہ آیا تھا ”اُن کے اوپر سے سائبان ہیں آگ کے اور اُن کے نیچے سے بھی ویسے ہی تختے ہیں آگ کے“ تو اس آیت میں جیسے اُس کے بالمقابل خوف الہی رکھنے والوں کے منازل کی یہ مرتع کشی کی گئی ہے کہ ”اُن کے لئے بالائی منزل پر کے محل ہیں جن پر اور محل ہیں“۔ وہاں اس کے بعد تھا ”یہ وہ ہے جس سے ڈراتا ہے اللہ اپنے بندوں کو“ یہاں اس کے بعد ہے ”یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا“۔ [۳]

یہاں ان دونوں آیتوں کے مضمون کا باہمی تناسب اس کی گواہی دیتا ہے کہ آیات کا یہ سلسلہ اسی ترتیب سے نازل ہوا تھا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ

زُرْعًا فَخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهْبِجُ فَتَرْبُهُ مُصَفَّرًا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ

لَذِكْرٍ لِّلْأُولَىٰ ۚ ﴿٢١﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا تو اُسے روانہ کر دیا چشموں کی صورت سے زیر

[۱] اقيم فيه الظاهر مقام المظمو— والمعنى لا تقدر على هدايته فتقذاه من النار (جلالين)۔

[۲] انما قال ذلك للنبي ﷺ محصرة على اسلام المشركين والمعنى انك لا تقدر على ادخال الاسلام في قلوبهم نساء وامر ابو افلا عليك اذلم يؤمنوا فأتما اتوا ذلك من قبل نفوسهم (مجمع البيان)

[۳] لهم غرف من فوقها غرف في مقابلة ما قال للكافرين: لهم من فوقهم ظلل من الحار ومن تحتهم ظلل (تبيان)

زمین، پھر اُس سے کھیتی برآمد کرتا ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو اُسے زرد دیکھو گے، پھر وہ اُسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، یقیناً اس میں یاد دہانی ہے صاحبانِ عقل کے لئے۔  
اس میں یاد دہانی کا ہے؟ فاعل مختار۔ باقتدار خالق کے وجود کی بھی اور انسان کے اس داردنیا میں بچپن، جوانی اور پیری کے انقلابات سے گزر کر آخری انجام کی بھی۔ □

**أَمَّنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ ۗ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ**

**قُلُوبِهِمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۗ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٣٢﴾**

”تو کیا پوچھنا اُس کا جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک اُجالے کے اوپر ہے۔ اب وائے ہے اُن پر جن کے دل یاد الہی کی طرف سے سخت رہیں۔ یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔“

”سینے کو اللہ نے کھول دیا ہے“ یعنی اپنی توفیق شامل حال کر کے اُسے ایسا حوصلہ عنایت کیا کہ وہ شبہات و وساوس، تقلید آباء، ماحول کے دباؤ، ہمہنگی جماعت ان تمام جذبات اور اُن کے دباؤ سے آزاد ہو کر حق کو قبول کر لے۔ □

قرآن مجید کے ان الفاظ اور اُن کے مفہوم کو سامنے رکھا جائے جو متعدد مقامات پر قرآن میں موجود ہیں تو پھر سورۃ الحد نشرح میں رسول گو مخاطب کر کے جو یہی الفاظ صرف کیے گئے ہیں، اُن کی وہ تفسیر غلط ثابت ہوگی جو صحیح بخاری وغیرہ کے احادیث سے ثابت ہوتی ہے کہ ملک نے اگر رسول کے سینے کو چاک کیا اور دل کو نکال کر اُسے (معاذ اللہ) آلائشوں سے پاک کیا جو شان رسول کے خلاف بھی ہے اور محاورات عرب اور استعمالات قرآنی کے مخالف بھی ہے۔

**اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِي ۖ تَتَشَعَّرُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ**

**يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۗ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ هُدَىٰ اللَّهِ**

**يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَمَن يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن هَادٍ ﴿٣٣﴾**

”اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، وہ کتاب ایک جو پوری ایک ہی طرح کی ہے، برابر دہرائی جانے والی جس سے روٹگئے کھڑے ہو جاتے ہیں جسم پر اُن کے جو اپنے پروردگار کا خوف رکھتے ہیں، پھر اللہ کی طرف سے اُن کی

□ إذا تفكروا في ذلك عرفوا الصانع المحدث وعلمو اصحة الابتداء والبعث والاعادة (مجمع البيان)

□ ای من لطف الله عليه حتى امن و عرف الله ووحداه و سندق نبیہ (تبیان) شرح الصدر يكون بثلاثة اشياء احدها بقوة الادلة التي نصبها الله تعالى وهذا يختص بالعلماء والثاني بالطاق التي تجدد له حالا بعد حال كما قال: والذين اهتدوا زادهم هدى والثالث بتوكيد الادلة وحل الشبهة والقائه الخواطر (مجمع البيان)

کھالیں اور اُن کے دل نرم ہو جاتے ہیں، اللہ کی یاد کی طرف۔ یہ اللہ کی طرف کی رہ نمائی ہے جس سے وہ منزل مقصد تک پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے گمراہی میں چھوڑ دے، اس کا کوئی رہ نمائیں ہے۔  
 ”مقدمہ تفسیر“ اور نیز ”تفسیر قرآن“ میں محکم اور متشابہات کی بحث میں ہم نے اس آیت کو پیش کیا ہے کہ پوری کتاب کو یہاں ”تشابہ“ کہا گیا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کے سب اجزاء ایک دوسرے کے مانند ہیں۔ اُن میں کوئی فرق نہیں ہے۔<sup>[۱]</sup>  
 اس مفہوم کو ترجمہ میں ہم نے یہاں مد نظر رکھا ہے مثالی کی تشریح بھی پہلے ہو چکی ہے۔

**أَفَمَنْ يَتَّبِعِي بَوَّجْهَهُ سُوَاءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ وَقِيلَ لِلظَّالِمِينَ ذُوقُوا مَا**

**كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿۳۳﴾**

”تو کیا پوچھنا اُس کا جو اپنے کو بچائے عذاب کی برائی سے قیامت کے دن، اور کہا جائے گا ظالموں سے کہ چکھو اُسے جو تم کرتوت کرتے تھے۔“

آیت کے ابتدائی الفاظ سے جو ہماری اور بعض دوسرے مترجمین و مفسرین کی سمجھ میں آیا ہے وہ تو یہی ہے کہ پرہیزگاروں کا ذکر ہے۔<sup>[۲]</sup> مگر بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ جو اپنے چہرے کو سپر بنائے عذاب کی برائی کا روز قیامت یعنی منہ کے بھل اُس میں گرا دیا جائے۔<sup>[۳]</sup> جناب شیخ طوسی کی تفسیر بھی یہی ظاہر کرتی ہے۔<sup>[۴]</sup> اور علامہ طبرسی کی تشریح بھی اس کے مطابق ہے۔<sup>[۵]</sup> مگر ابھی تک میری سمجھ میں آیت سے یہ مفہوم نہیں آتا ہے۔

اس دوسری تفسیر کے لحاظ سے قِيلَ لِلظَّالِمِينَ میں الف لام عہد کا لینا چاہیے یعنی اُنہی ظالموں سے یہ کہا جائے گا کہ چکھو اسے اور ہمارے ترجمے کے لحاظ سے پہلی جماعت نیکوکاروں کی ہے جو جنابت یافتہ ہے اور یہ اُس کے مقابل والی جماعت ہے جس سے یہ کہا جائے گا۔

**كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَآتَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۴﴾**

**فَإِذَا قَهَّمُ اللَّهُ الْحَزِيءَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ أَكْبَرُ ۖ لَوْ كَانُوا**

**يَعْلَمُونَ ﴿۳۵﴾**

”جھٹلایا اُنہوں نے جو اُن کے پہلے تھے تو آگیا اُن پر عذاب ایسی صورت سے جس کا اُنہیں کوئی تصور بھی نہ تھا تو اللہ نے چکھایا اُنہیں رسوائی کا مزہ اس دنیاوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب ضرور اور بھی بڑا ہے کاش وہ

[۱] ای یشبہ بعضہ بعضاً (جلالین)۔

[۲] احتراز منی کندروئے خود (شاہ ولی اللہ) جو کوئی بچاتا ہے منہ اپنے کو (رفیع الدین)

[۳] یتقی یلغی۔ بان یلغی فی النار مغلولۃ یدہ الی عنقہ (جلالین)

[۴] فی التفسیر ان الکافر یلغی فی النار مغلولاً لا یمکنہ ان یتقی النار الا بوجہہ (تبیان)

[۵] تقدیرہ افعال من یدفع عذاب اللہ بوجہہ یوم القیامہ کحال من یاتی اماناً لا تمسہ النار (مجمع البیان)

جائیں۔“

وَلَقَدْ صَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٤٧﴾ قُرْآنًا  
عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٤٨﴾

”اور ہم نے پیش کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں، عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔“

صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَكِّسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِرَجُلٍ هَلْ  
يَسْتَوِينَ مَثَلًا ط الْحَمْدُ لِلَّهِ ط بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٩﴾

”بیان کی ہے اللہ نے ایک مثال کہ ایک آدمی ہے جس کے مالک کئی پست اخلاق اشخاص ہیں آپس میں جھگڑا کرنے والے اور ایک آدمی ہے جو بس ایک شخص کا ہے کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟ شکر خدا کا بلکہ اُن میں کے زیادہ لوگ جانتے نہیں۔“

یہ ایک انداز بیان قرآن کا ہے۔ ایک سوال کیا اور پھر جیسے اُس کا جواب اُدھر والوں نے حسب ذیل خواہ دیا یا زبان سے چپ رہے مگر اُن کے ضمیر نے اُس کا اقرار کیا جو فطرت کا تقاضا ہے اور اس کے بعد ارشاد ہوا: الحمد لله جو ہم چاہتے تھے تم نے مان لیا۔ اب تم نتیجہ خود سمجھ لو۔ یہاں جو سوال ہے وہ یہ ہے کہ جسے ایک مالک کے سامنے سر جھکانا ہے، وہ بہتر ہے یا وہ جو بہت سے افراد کی ملکیت کے شکنجے میں ہے اور کش مکش میں گرفتار ہے؟ جواب اس کا صرف ایک ہے کہ وہ پہلا بہتر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک خدا کے بندے بہتر ہیں اُن سے جو بہت سے معبودوں کے سامنے سر جھکاتے ہوں۔ یہی اس سوال کا مقصد ہے۔ [۱] اقبال نے اسے یوں کہا ہے:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ﴿٥٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ  
تَخْتَصِمُونَ ﴿٥١﴾

”آپ کو بھی دنیا سے اٹھنا ہے اور وہ بھی یقیناً مرنے والے ہیں، پھر تم لوگ قیامت کے دن اپنے پروردگار کے یہاں تصفیہ کر لو گے۔“

اس کے پہلے جز کے ذیل میں جو ایک تو ہم ”حیات النبی کے مسئلے سے متعلق پیدا ہوتا ہے یا کچھ لوگ غلط فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اُس پر امامیہ مشن لکھنؤ سے رسالے کی صورت میں میری ایک تقریر شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے ”مسئلہ حیات النبی ﷺ“ اور واقعہ وفات رسول“

[۱] شبہ الکافر بشر کاء متنازعین مختلفین والمؤمن عبد الہا واحد (تبیان)

اُس میں اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔

آخری فقرے سے صدر اوّل کے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بعد رسول خود امت رسول کے درمیان جو تفرقے پیدا ہونے والے تھے، اُن کے متعلق کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن اُن کا تصفیہ ہوگا اب یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ ان جھگڑوں سے اگر نجاتِ آخرت کا کوئی تعلق نہ ہو تو پھر روز قیامت اُن کے تصفیے کے کیا معنی رہتے ہیں؟

**فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ إِذْ جَاءَهُ ۗ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ**

**مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ﴿٣١﴾**

”تو اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ لگائے اور سچائی کو جب وہ اُس کے پاس آئے جھٹلائے۔ کیا دوزخ میں ٹھکانا کافروں کا نہیں ہے؟“

دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں اس مضمون کے ادا کرنے میں او کا لفظ ہے یعنی کون ظالم ہوگا اُس سے زیادہ جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا سچائی کا انکار کرے جب وہ اُس کے پاس آئے؟ اس صورت میں یہ جملہ قرآن کی اُس ”تہذیب گفتگو اور معیار رواداری“ کے تحت میں ہوگا۔ جس پر ہمارا ایک مستقل رسالہ ”امامیہ مشن لکھنؤ“ سے شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح قرآن مجید خود فریق مخالف کے لئے لمحہ فکریہ پیدا کرتا ہے کہ خود اُن کے ضمیر کی خلش اُن کو حق اور باطل پر غور کرنے کی تحریک کرے یہ رواداری اس لئے ہے کہ حقیقت یہی تھی کہ وہ لوگ سچائی کو جھٹلاتے تھے مگر کھل کر یہ نہیں کہا جاتا بلکہ رسول گواہوں کے برابر کی سطح پر رکھ کر کہا جاتا ہے کہ اگر (معاذ اللہ) انہوں نے غلط طور پر رسالت کا دعویٰ کیا ہے تو ان سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں اور اگر تم سچائی آنے کے بعد اس کا انکار کرتے ہو تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں اور جو ظالم ہو وہی کافر بھی ہے اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اب تم غور کرو کہ دوزخ میں جانے کا مستحق کون ہے؟ مگر یہاں والی آیت میں چونکہ اُو نہیں ہے وہ ہے، اس لئے مفسرین نے دونوں فقروں کو اسی فریق مخالف سے متعلق قرار دیا ہے کہ وہی خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور وہی سچائی کو جھٹلاتے ہیں۔

**وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿٣٢﴾ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ**

**عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٣﴾ لِيُكَفِّرَ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا**

**وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٥﴾**

”اور جو سچائی کو لے کر آئے اور اُس کی تصدیق کرے تو یہ لوگ اصل پرہیزگار ہیں اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے یہاں وہ ہے جو وہ چاہیں، یہ صلہ ہے اچھے اعمال والوں کا تا کہ اللہ اُن کے بُرے سے بُرے کاموں کو جو انہوں نے کیے تھے نظر انداز کر دے اور انہیں اُن کا اجر دے اُن بہترین اعمال کے معیار پر جواب وہ کرتے رہے۔“

”سچائی کو لے کر آئے اور اُس کی تصدیق کرے“ یہاں بعض مفسرین نے ان دونوں صفتوں کا موصوف الگ الگ قرار دیا ہے۔ کسی نے کہا ”جو سچائی کو لے کر آئے“ یعنی پیغمبر اور ”جو اُس کی تصدیق کرے“ یعنی مومنین، کسی نے کہا ”جو سچائی کو لائے“ وہ جبرئیل ہیں اور ”جنہوں نے

تصدیق کی، وہ رسول ہیں لیکن جناب شیخ طوسیؒ کو اس سے اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ الذی جو اسم موصول ہے اگر دہرایا گیا ہوتا تو دو موصوف تلاش کیے جاتے، یہاں ایک الذی ہے جس کی دو صفتیں ہیں لہذا سچائی کو لانے والا اور اُس کی تصدیق کرنے والا ایک ہی شخص ہے اور وہ رسول ہیں۔ [۱]

علامہ طبرسیؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ [۲]

مگر مجھے اس مبتداء کی خبر: **أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۳۱﴾ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۲﴾ لِيُكْفِرَ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾** جو ایک جیسا کلام معلوم ہوتا ہے اور جس میں ترتیب موافق تزیل نہ ہونے کی بحث پیدا کرنا زبردستی کا کام ہے، جس کا ترجمہ ہو چکا ہے کہ ”یہی پرہیزگار لوگ ہے، اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے یہاں وہ ہے جو اچھے اعمال والوں کا صلہ ہے“۔ اور پھر یہ کہ ”اللہ اُن کے بُرے سے بُرے کاموں کو جو انہوں نے کیے تھے نظر انداز کر دے گا اور انہیں اجر دے گا اُن کے بہترین اعمال کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے“۔

اس سب پر نظر کرتے ہوئے وہی قول درست معلوم ہوتا ہے کہ **الَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ** ”جو سچائی کو لائے“ رسول ہیں اور لصدق بہ ”جو اُس کی تصدیق کرے“ وہ سچے قسم کے مومنین ہیں جب ہی یہ بعد والے فقرات چسپاں ہوں گے لیکن اگر **الَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ** پورے سے رسول کی ذات مراد لے لی جائے تو بعد کی خبر کو آپ ہی کی ذات سے وابستہ کرنا پڑے گا جس میں اول تو واحد کوجمع سے تبدیل کرنے کے لئے کوئی نکتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے یہ اوصاف مجھے شان رسول کے مطابق نظر نہیں آتے لہذا میں الذی کے دوبارہ دہرائے جانے کو ایسی اہم بات نہیں سمجھتا جتنی اُن آخری فقرات کی نوعیت کو ہم سمجھتا ہوں۔

لطف یہ ہے کہ علامہ طبرسیؒ ان فقرات کی شرح میں جیسے یہ بھول گئے کہ وہ اس پورے کلام کے سرنامہ کو رسول سے متعلق کر چکے ہیں لہذا **يُكْفِرُ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا** کی تشریح میں لکھتے ہیں:

أَي اسقط الله عنهم عقاب الشرك والمعاصي التي فعلوها قبل ذلك بايما نهم واحسانهم ورجو عنهم الى الله تعالى

یعنی اللہ نے اُن سے شرکت اور اُن گناہوں کی سزا کو جو وہ پہلے کر چکے تھے معاف کر دیا، اس ایمان اور حسن عمل اور اللہ کی طرف پلٹ کر آجانے سے جواب انہوں نے اختیار کیا۔

اس کے بعد ہر ذی جس مسلمان یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کا تعلق معاذ اللہ رسول کی ذات کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔

**أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ ۖ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالذِّينِ مِنْ دُونِهِ ۖ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿۳۴﴾ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ ۖ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِي**

[۱] لو كان غير العقال: والذی جاء بالصدق والذی صدق به. (تبیان)

[۲] لهذا اقوى الاقوال (مجمع البيان)

## اِنْتِقَامٍ ﴿٣٤﴾

”کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟ اور آپ کو وہ اُس کے سوا دوسروں سے ڈراتے ہیں اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے، اُسے کوئی منزل تک پہنچانے والا نہیں اور جسے اللہ منزل تک پہنچائے، اُسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا اللہ سب سے زبردست سخت بدلائینے والا نہیں ہے؟“

چونکہ جیسا اس کے بعد کی آیت میں آئے گا اور قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بکثرت آیات سے ثابت ہے، وہ اللہ کے وجود کے قائل تھے تو پہلے جملے میں کہ کیا اللہ اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں ہے؟ توحید پر ایک عقلی استدلال ہے کہ جب خدا کا وجود دلائل عقلی کی بنا پر ماننا ضروری ہے تو وہ ضرورت ایک خدا کے ماننے سے پوری ہو جاتی ہے جس کے تم بھی قائل ہو تو پھر دوسرے خداؤں کے ماننے کی ضرورت کیا ہے؟ اس کے علاوہ مشرکین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈراتے رہتے تھے کہ ہمارے معبودوں کی جو تم مخالفت کرتے ہو، اچھا نہ ہوگا۔ [۱] یا جیسا کہ سورہ ہود میں ہے جناب ہوڈ سے کہا:

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے بعض خداؤں نے تم کو کچھ نقصان پہنچا دیا ہے۔

یعنی تم جذبہ انتقام میں ہمارے معبودوں کی مخالفت کرتے ہو، تو اُن کے ذہن کو اُس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ جب میرا پروردگار وہ اللہ ہے جسے تم بھی مانتے ہو تو تمہارے طبع زاد معبود کیا بنا سکتے ہیں؟

اس صورت میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے کے بجائے عبدہ کہنے میں وہ خصوصیت مضمر ہے جو آیہ معراج سبحان الذی اسری بعبدہ میں نظر آتی ہے۔ [۲]

وَلَيْنَ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط قُلْ اَفَرَا يَتَّبِعُوْنَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادْنِي اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفٰتُ ضُرِّيْهِ اَوْ اَرَادْنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَتُ رَحْمَتِهٖ ط قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ط عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٣٨﴾

”اور اگر ان سے پوچھیے کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے، کہنے تو پھر کیا تم نے دیکھا ہے انہیں جن کی تم دہائی دیتے ہو، اگر اللہ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا، یہ اُس کی طرف کے نقصان کو دور کر دیں گے یا وہ میرے ساتھ رحمت شامل حال کرنا چاہے تو کیا یہ اُس کی رحمت کو دور کر دیں گے؟ کہنے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے، اُسی پر بھروسہ کرتے ہیں کرنے والے“

[۱] يخوفونك بالذين من دونه خطاب للثبي بان الكفار يخوفه بالاوثان التي كانوا يعبدونها (تبيان)

[۲] يعني به محمد ﷺ كفيته عداوة من يعاديه ويناويه (مجمع البيان)



قُلْ يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ مَنْ يَأْتِيهِ

عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٤٠﴾

”کہئے اے میری قوم والو، تم اپنی جگہ کام کرتے رہو، میں اپنا کام کرتا ہوں اس کے بعد معلوم ہوگا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اُسے رسوا کرے اور کس پر آتا ہے وہ عذاب جو برقرار رہنے والا ہے۔“

”اپنی جگہ اپنے کام کرتے رہو“ یعنی جس طرح میری مخالفت اور مزاحمت کر رہے ہو کرتے رہو جس میں اُن کا ظلم و تشدد جو وہ رسولؐ اور آپ کے متبعین کے ساتھ کرتے تھے، سب داخل ہے۔ [۱] اور میں اپنا کام کرتا رہوں گا“ اس کے بعد انجام دیکھو کیا ہوتا ہے؟ اس چیلنج میں دلیل حقانیت میں مضر ہے اور ایک لرزہ برانداز کر دینے والی تہدید و تحویف بھی ہے ”رسوا کرنے والا عذاب“ دنیا کا اور ”برقرار رہنے والا“ آخرت کا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ

فَأَمَّا يَظِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿٤١﴾

”یقیناً ہم نے آپ پر کتاب تمام انسانوں کے لئے حق کے ساتھ اتاری تو جو ہدایت حاصل کرے گا وہ اپنے لئے اور جو گمراہی اختیار کرے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا اور آپ کوئی ان کے ٹھیکیدار نہیں ہیں۔“

یعنی زبردستی انہیں مومن بنانا آپ کا کام نہیں ہے۔ آپ کا کام ہدایت کرنا ہے۔ اُن کے ایمان لانے سے آپ کا ذاتی کوئی فائدہ نہیں ہے اور اُن کے کفر اختیار کرنے سے آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ آپ کا کہنا ماننے سے اُنہی کا فائدہ ہے اور نہ ماننے سے اُنہی کا نقصان ہے۔

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ فَيُمْسِكُ الَّتِي

قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ

لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾

”اللہ لیتا ہے جانوں کو اُن کے مرنے کے وقت اور جنہیں موت نہیں آئی، اُن کے سونے کے عالم میں تو روک لیتا ہے اُسے جس پر موت کا فیصلہ کر دیا اور چھوڑ دیتا ہے دوسری کو ایک مقررہ مدت تک، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں۔“

اس آیت سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ توفی کے معنی موت کے نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ اس عالم حواس ظاہری سے نفس کو بے تعلق بنانے کے لئے آتی ہے، اس لئے سونے میں بھی کہا گیا ہے کہ اللہ توفی کرتا ہے یعنی جاگنے میں جیسا تعلق اس دنیا سے تھا وہ ایک حد تک قطع ہو جاتا ہے، جب

[۱] علی قدر جہد کم وطاقتکم فی ہلاکی وتضعیف امری (مجمع البیان)

اس قطع تعلق کو اس سرزمین کے عالم سے قرآن توفی سے تعبیر کر رہا ہے تو اگر عیسیٰ کے لئے دنیا سے آسمان پر اٹھائے جانے کے لئے توفی کا لفظ استعمال ہو تو یہ ان کے لئے موت کی دلیل ہوگی۔

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۗ قُلْ أَوْلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٣٣﴾ قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۗ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٣٤﴾

”کیا انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور سفارشی بنائے ہیں، کہنے کہ کیا چاہے وہ ایسے ہوں کہ جو نہ کسی چیز پر قدرت رکھتے ہوں؟ اور نہ عقل و شعور رکھتے ہوں کہ سفارش پوری کی پوری اللہ کے قبضے میں ہے اسی کے لئے مخصوص ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔“

یہ فقرہ کہ ”سفارش پوری اللہ کے قبضے میں ہے“ غور طلب ہے، ظاہر ہے کہ اللہ سے اوپر کوئی طاقت نہیں ہے جس سے اللہ سفارش کرے ماننا پڑے گا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں سفارش کرنے والے وہی ہیں جنہیں اُس نے مقرر کیا ہے اور وہ بھی اُس کی اجازت سے سفارش کرتے ہیں۔ [۱] جیسا کہ دوسری جگہ ہے: لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ وَارْتَضَىٰ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ، اس طرح یہ آیت بھی کلی طور پر نفی شفاعت کے بجائے ثبوت شفاعت کی دلیل ہے۔

وَإِذَا دُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا دُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٥٥﴾ قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ عَلِمْتَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٥٦﴾

”اور جب اللہ کا وحدت کے ساتھ ذکر ہوتا ہے تو جزبہ ہوتے ہیں اُن کے دل جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب اُن کا ذکر ہوتا ہے جو اُس کے علاوہ ہیں تو وہ ایک دم خوش ہو جاتے ہیں کہو کہ اے خدا! اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے دکھائی دینے والی اور نہ دکھائی دینے والی چیزوں کے جاننے والے! تو اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا اُس میں کہ جس میں وہ باہم اختلاف رکھتے تھے۔“

قبل کا مخاطب ضروری نہیں کہ رسول سے ہو، اس لئے اُس کا ترجمہ ہم نے ”کہو“ کے ساتھ کیا، جو لوگ رسول کو مخاطب قرار دیتے ہیں، وہ بھی کہتے ہیں کہ مقصود اُس سے سب ہی لوگ ہیں۔ [۲]

[۱] ای لایشفع احد الا باذنه (مجمع البیان)

[۲] هذا امر من الله تعالى لنبيه محمد ﷺ والمراد به جميع المكلفين (تبیان)

وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ

الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَآلَمٌ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ ﴿٣٨﴾ وَبَدَا

لَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٣٩﴾

”اور اگر ان کے پاس جنہوں نے ظلم سے کام لیا سب کچھ ہو جو روئے زمین پر ہے، پھر ایسا ہی اُس کے ساتھ مزید ہو اور ہو تو وہ اُس عذاب سے بچنے کے لئے جو قیامت کے دن ہوگا، اُسے تاوان میں دے دیں اور ان کے سامنے آئے گا اللہ کی طرف سے وہ دن جس کا انہیں خیال بھی نہیں تھا اور ظاہر ہوں گی ان کے سامنے برائیاں اُس کی جو انہوں نے کیا تھیں اور ان کے سر پر آیا ہوگا وہی (عذاب) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔“

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِمَّا ؕ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ

عَلَىٰ عِلْمٍ ۖ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّا أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ

قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٤٠﴾ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَا كَسَبُوا ۗ

وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَٰؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتٌ مَا كَسَبُوا ۗ وَمَا هُمْ

بِمُعْجِزِينَ ﴿٤١﴾

”تو جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اُسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ مجھے بس ایک خاص ہنر کی وجہ سے ملی ہے بلکہ وہ ایک آزمائش ہے مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ نہیں جانتے۔ ایسا ہی کہا ان لوگوں نے جو ان کے پہلے تھے تو انہیں کچھ فائدہ نہیں دیا اُس نے جو وہ کرتے تھے تو انہیں پہنچیں گی برائیاں اُس کی جو انہوں نے کیا ہو اور یہ بے بس کرنے والے نہیں ہیں۔“

”مجھے تو ایک خاص ہنر کی وجہ سے ملی ہے“ یہ اس کا ایک ترجمہ ہے جو پہلی دفعہ اس فقرے کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے اور صدر اول کے بعض

مفسرین کے قول کے مطابق ہے۔ [۱]

لیکن اس کے ایک معنی یہ بھی کہے گئے ہیں اور ہو سکتے ہیں کہ مجھے یہ نعمت جو ملی ہے، وہ خاص بات نہیں ہے۔ وہ تو قرآن بھی بتا رہے تھے اور میں جانتا تھا کہ یہ مجھے ملے گی اور ایک تیسرے معنی یہ کہے گئے ہیں اور وہ میرے نزدیک بعید ہیں کہ اللہ جانتا تھا کہ میں اس کا مستحق ہوں۔ اسی طرح یہ مفہوم کہ یہ نعمت مجھے ملی ہے اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ خدا مجھ سے راضی و خوشنود ہے، جب ہی مجھے نعمتوں سے نوازتا ہے۔ [۲]

[۱] قال الحسن معناه اُنّی او تینتہ بحیلتی و عملی (تبیان)

[۲] علی علی برضاہ عنی فلذلک اتانی ما اتانی من النعم (مجمع البیان)

أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ  
لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾

”اور کیا انھیں نہیں خبر کہ اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں وسعت دیتا ہے اور (وہی جب چاہتا ہے) تنگی دیتا ہے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائیں“  
اگر یہ آیت مقام تنزیل میں پہلے سے متصل ہے تو یہ مطلب ہے کہ ہنر سے کچھ نہیں ہوتا۔ خوش حالی اور تنگ دستی مشیت الہی سے وابستہ ہے اور بعد والے دونوں معنوں کے ساتھ جو گزشتہ آیات میں درج ہیں اس آیت کا مضمون یوں چسپاں ہے کہ خوش حالی اور تنگ دستی رضائے الہی کی دلیل نہیں ہے وہ تو اور وجوہ سے مثلاً آزمائش کے طور پر بھی ہو سکتی ہے۔ اسے نہ حق دار سمجھنے کی دلیل سمجھا جاتا ہے، نہ رضامندی خدا کی۔

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ  
يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۗ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٥٣﴾

”کہہ دیجئے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ سب ہی گناہوں کو بخش دیا کرتا ہے یقیناً وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔“

گناہ گاروں کو ناامید نہ ہونا چاہئے رحمت خدا سے

اس طرح کی ایک آیت جو گزشتہ پارے میں آچکی ہے: قُلْ يُعْبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّ كُمْ ”کہہ دیجئے کہ اے وہ میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے پروردگار سے ڈرو“ وہاں یہ لکھا جا چکا ہے کہ قل یعنی کہئے، یا ”کہہ دیجئے“ کے بعد جو قرآن میں آتا ہے، وہ کبھی تو پینچمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ہوتا ہے جیسے: قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني ”کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو“ اور قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ”کہئے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ خدمات کا نہیں مانگتا سوا صاحبان قرابت کی محبت کے“ یہاں کہیے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ رسول مخاطب افراد سے اپنی جانب سے یہ کہیں اور کبھی قل کے بعد کلام اللہ کی زبانی ہوتا ہے مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ رسول مخاطب افراد تک خدا کی جانب سے یہ پیغام پہنچادیں۔ یہاں ایسا ہی ہے یعنی رسول اطلاع دیتے ہیں کہ خالق یہ ارشاد فرما رہا ہے کہ اے میرے ایسے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے یعنی گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

اس آیت کو قرآن مجید کی تمام آیتوں میں سب سے زیادہ سرمایہ امید بتایا گیا ہے۔ [۱] جو اس کے مضمون سے ظاہر ہے مگر یہ اس وقت ہے جب بعد کی آیتوں کا تعلق اس سے نہ مانا جائے جو لب و لہجہ کے اختلاف سے بعید نہیں ہے۔

[۱] قال عبد الله بن عمر وبن العاص - ارجى آية في كتاب الله وهو المروي عن علي أيضاً (تبيان) عن امير المؤمنين علي عليه السلام انه قال ما في القرآن آية اوسع من يا عبادي الذين اسرفوا الاية (مجمع البيان)

وَأَنبِئُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿٥٣﴾ وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٥٤﴾ أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ لِيحْسُرْنِي عَلَىٰ مَا فَرَطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّخِرِينَ ﴿٥٥﴾ أَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿٥٦﴾ أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً فَأَكُونَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٧﴾ بَلَىٰ قَدْ جَاءَتْكَ آيَاتِي فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ﴿٥٩﴾

”اور اپنے پروردگار کی طرف توبہ و انابت کرو اور اُس کے سامنے سر جھکاؤ اس سے پہلے تم پر عذاب آئے اور پھر تمہاری مدد نہ ہوگی اور پیروی کرو اُس بہترین پیغام کی جو تمہاری طرف اتارا گیا ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تمہیں احساس بھی نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ کوئی تنفس کہے ہائے افسوس اُس پر جو میں نے اللہ کے معاملہ میں کمی کی اور یہ کہ میں تو مذاق اڑاتا تھا یا کہے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت کرتا تو میں پرہیزگاروں میں سے ہوتا یا کہے اس وقت جب عذاب کو دیکھے کہ کاش میرے لئے واپسی ہو تو میں اب اچھے اعمال والوں میں سے ہوں ہاں کیوں نہیں! تیرے پاس میری آیتیں آئیں تو تو نے انہیں جھٹلایا اور گھمنڈ سے کام لیا اور تو کافروں میں سے تھا۔“

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ اللَّهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٦٠﴾ وَيُنَجِّي اللَّهُ الَّذِينَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦١﴾

”اور قیامت کے دن اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے، دیکھو گے کہ اُن کے منہ کالے ہوں گے، کیا گھمنڈ رکھنے والے کے رہنے کا ٹھکانا دوزخ نہیں ہے؟ اور اللہ انہیں جو پرہیزگار رہے، اللہ کامیابی کے ساتھ نجات دے گا، انہیں کوئی برائی چھو بھی نہیں جائے گی اور نہ انہیں کوئی صدمہ و ملال ہوگا۔“

اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿٦٢﴾ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٦٣﴾

”اللہ ہر چیز کو وجود میں لانے والا ہے اور وہ ہر چیز پر صاحب اختیار ہے، اس کے لئے کنجیاں ہیں آسمان اور زمین کی اور جنہوں نے اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر اختیار کیا، یہی وہ ہیں جو گھانا اٹھانے والے ہیں۔“

”مفاتیح“ اور ”مقالید“ دونوں لفظوں کے معنی کنجیوں کے ہیں یوں تو عام طور پر دونوں لفظوں میں یہ فرق بتایا گیا ہے کہ مفتاح کھولنے والی کنجی کو کہتے ہیں اور مقلاد جس کی جمع مقالید ہے بند کرنے والی کنجی کو مگر اکثر بغیر اس خصوصیت کو مد نظر رکھے ہوئے دونوں لفظوں کا ایک ہی عام یعنی کنجی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہاں ایسا ہی ہے۔ [۱] ”اُس کے ہاتھ میں کنجیاں ہیں“ یعنی روزی اور رحمت کے دروازے اُسی کے ارادے سے کھلتے ہیں۔ [۲]

**قُلْ أَفَغَيَّرُ اللَّهَ تَأْمُرُونَِّيْٓ أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ﴿٦٥﴾ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ**  
**مِنْ قَبْلِكَ ۗ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٦٥﴾ بَلِ اللَّهَ**  
**فَاعْبُدْ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٦٦﴾**

”کہتے تو کیا تمہارا مطالبہ مجھ سے یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت کروں اے جاہلو!؟ اور بے شک وحی بھیجی گئی ہے آپ کی طرف اور اُن کی طرف بھی جو آپ سے پہلے تھے کہ اگر تم شرک کرو تو تمہارے سب اعمال اکارت جائیں گے اور تم گھانا اٹھانے والوں میں سے ہو گے بلکہ بس اللہ ہی کی عبادت کیجیے اور شکر گزاروں میں سے ہو جائیے۔“

کسی بھی نبی کی طرف جو یہ وحی ہوئی اور پھر ہمارے نبی کی طرف اس میں حکیمانہ انداز سے نبی کو مخاطب کر کے دوسروں کے لئے سرمایہ امتیاز فراہم کیا جاتا تھا یعنی بظاہر نبی مخاطب ہوتا تھا اور مقصود اس سے دوسرے ہوتے تھے جیسا کہ ہمارے قدیم مفسرین نے صراحتاً تشریح کی ہے اور صرف طبع زاد طور پر نہیں بلکہ حدیث معصومہ کی سند کے ساتھ جو بالکل فیصلہ عقل کے مطابق ہے۔ [۱] اور اسی کے موافق جناب ابن عباسؓ کی تشریح بھی ہے۔ [۲]

**وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمَاوَاتُ**  
**مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ ۗ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾**

”اور انہوں نے اللہ کی شان کا ویسا اندازہ نہیں کیا جیسا کرنا چاہیے اور (واقعہ یہ ہے کہ) زمین پوری اُس کی مٹھی

[۱] یعنی مفاتیح السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (علی بن ابراہیم) المقالید المفتاح (تبیان)

[۲] یرید مفاتیح السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِالرِّزْقِ وَالرَّحْمَةُ عَلَن ابْنِ عَبَّاسٍ (مجمع البیان)

[۳] قَالَ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى بَعَثَ نَبِيَّهُ بِأَيِّكَ اَعْنَى وَاسْمَعَى يَا جَارَةَ (علی بن ابراہیم)

[۴] قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ هَذَا اَدَبُ مَرِئِئَةِ لَنَبِيِّهِ وَتَهْدِيْدٌ لِّغَيْرِهِ اِنَّ اللَّهَ تَعَالَى مِنَ الشَّرِكِ وَمَدَاهِنَةُ الْكُفَّارِ (مجمع البیان)

میں ہوگی قیامت کے دن اور آسمان سب بھی لپیٹے ہوئے ہوں گے اُس کے ہاتھ میں پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔“

عربی میں بھی اور ہماری اُردو میں بھی مٹھی میں ہونا اور ہاتھ میں ہونا کتنا یہ ہوتا ہے قبضہ و قدرت و ملکیت سے۔ مثلاً ہم یہ کہتے ہیں پورا شہر میری مٹھی میں ہے یا وہ آدمی بالکل میرے قبضے میں ہے تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہوتا ہے کہ جسمانی طور پر وہ آپ کے ہاتھ یا مٹھی میں ہو، بس ایسا ہی یہاں سمجھنا چاہیے۔ [۱]

اس سے ہرگز اُس کی ذات کے لئے جسمیت کا تصور درست نہیں ہے جیسا کہ نجدی جماعت کے مورث اعلیٰ ابن عبدالوہاب نے اپنے پیشوا ابن تیمیہ کی پیروی میں اپنے یہاں کے مزعومہ صحاح کے بعض احادیث کی بنا پر کیا ہے۔

**وَنَفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ط**

**ثُمَّ نَفِخَ فِيْهِ اٰخَرٰى فَاِذَا هُمْ قِيٰٰمٌ يَنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾**

”اور صور پھونکا گیا ہوگا تو وہ جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں سب ہی بے حس و حرکت ہو کر گر گئے سوا اُن کے جنہیں اللہ چاہے، پھر وہ دوبارہ پھونکا گیا تو وہ ایک دم کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔“

مشہور یہ ہے کہ صور پھونکا جائے گا تو سب بلا استثناء فنا ہو جائیں گے، قرآن سے کسی ایسے صور کا یہ نہیں چلتا، آخری صور کے پہلے جو زندہ کر کے کھڑا کرنے والا ہے، قرآن مجید میں دو صورتوں کا ذکر ہے ایک کا ذکر یوں ہے کہ وہ پھونکا گیا ہوگا فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (سورہ نمل - ۸۷) آسمان اور زمین میں جتنے تھے وہ سب پریشان اور مضطرب ہو گئے وہاں بھی استثناء ہوا ہے کہ الا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ”سوا اُن کے جنہیں اللہ چاہے“ پھر دوسرا صور یہ ہے جس کا اثر بتایا گیا ہے۔ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ۔ (سورہ زمر - ۶۸) جس کا ترجمہ ہم نے یہ کیا کہ ”بے حس و حرکت ہو کر گر جائیں گے“ جو یہاں موت کی نوعیت سے ہے۔ [۲] اور اس کا استعمال بے ہوشی کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ہے: خرموسئ صعقا ”موسیٰ بے ہوش ہو کر گر گئے“ یہاں بھی استثناء موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نفوس مطمئنہ ایسے ہیں جن پر اُس مضطرب کرنے والے صور کا اثر نہیں، اور کچھ نفوس باقیہ ایسے ہیں جن پر اس دوسرے بے جان کرنے والے صور کا اثر نہیں پھر وہ کون سا صور ہے جس میں بلا استثناء سب فنا ہو جائیں گے؟

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”ایک بار نوح صور ہے عالم کے فنا ہونے کا، دوسرا ہے زندہ ہونے کا، تیسرا ہے بے ہوشی کا، بعد حشر کے چوتھا خبردار ہونے کا، اس کے بعد اللہ کے سامنے جائیں گے“ (موضح القرآن)

[۱] معنی الآية ان الارض باجمعها مقدورة كما يقبض عليه القابض فيكون في قبضته و كذلك قوله والسَّمٰوٰتِ مطوياتٌ بيمينه اي في مقدوره طيبها (تبيان)

[۲] اي مرت من شدّة تلك الصيحة \_\_\_\_\_ يقال صعق فلان اذا مات بحال هائلة شبيهة بالصيحة العظيمة (جميع البيان)

مگر قرآن مجید سے اس کا پتہ کہیں نہیں چلتا۔

نُفِخَ، فَرِغَ اور صَبَقَ وغیرہ کی صورت کے الفاظ میں جو ہر جگہ ماضی کا صیغہ ہے، اس کی نظیریں واقعات قیامت کے بیان میں قرآن مجید کے اندر بکثرت ہیں، ان سب میں مستقبل کے واقعات کو یقینی ہونے کی بنا پر بصورت ماضی بیان کیا گیا ہے لیکن مقصود اُس سے مستقبل ہی ہوتا ہے، اس لئے بعض مترجمین نے ترجمہ میں ماضی کا ترجمہ مضارع یا مستقبل کے الفاظ سے کیا ہے۔ [۱]

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِئَتْ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ  
وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۹﴾ وَوَفَّيْتُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا عَمَلَتْ  
وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿۲۰﴾

’اور چمک اٹھی زمین اپنے پروردگار کے نور سے اور رکھ دیے گئے نامہ ہائے اعمال اور پیغمبر اور تمام گواہ حاضر کیے گئے اور فیصلہ کر دیا گیا اُن کے درمیان حق کے ساتھ اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا اور ہر تنفس کو پورا پورا دیا گیا اُس کے اعمال کا بدلا اور وہ خوب واقف ہے اُس سے جو وہ کیا کیے ہیں‘۔

یہاں شروع میں عدالت الہی کی تصویر کشی میں بالکل ایک کچھری کا منظر پیش کیا گیا ہے اور آخر میں جو ہے ’وہ خوب واقف ہے اس سے جو وہ کیا کیے ہیں‘۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب مظاہرہ دنیا کو عدل الہی کا مشاہدہ کرانے کے لئے ہے ورنہ اللہ خود ہر ایک کے کردار اور جزا و سزا کے معیار سے واقف ہے۔

پہلا جملہ ایسا تصور پیش کرتا ہے کہ جیسے عدالت کی کرسی پر جج آ کر بیٹھ گیا، اس موقع کشی میں بھی مستقبل کا ذکر بصیغہ ماضی کیا گیا ہے۔ گواہ ہونا امت پر اُن روحانی پیشواؤں ہی کا کام ہے جو خود گناہوں سے بری ہوں چنانچہ انبیاء اپنی اُمتوں کے شاہد تھے جیسا کہ ارشاد

ہوا:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿۱۵﴾ (مزمّل)  
یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر بھیجا تھا جو تم پر گواہ ہے اُسی طرح جیسے فرعون کی طرف پیغمبر بھیجا تھا۔  
اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ہے:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۚ

اور میں اُن پر اُس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں اُن میں موجود تھا۔

اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ارشاد ہوا:

إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدٌ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿۲۰﴾ (نساء)

جس وقت ہم ہر امت کے گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو اُن کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

[۱] آدمیہہ شود صور (شاہ ولی اللہ) پھونکا جاوے گا صور (شاہ رفیع الدین)



اب اگر شہداء کا انحصار انبیاء ہیں ہوتا تو زیر تحریر آیات میں بالنسبین کہہ دینا کافی تھا لیکن یہاں النسبیین کے ساتھ حرف عطف کے ساتھ الشہداء کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کے علاوہ بھی اس معیار پر کچھ افراد ہیں جنہیں یہ گواہی کا منصب عطا کیا گیا ہے۔ جمہور امت ”شہداء“ یعنی گواہوں کے تصور سے محروم ہے مگر ہم ان ”شہداء“ کو جانتے ہیں جو اصطلاحی طور پر نبی نہیں ہیں مگر معیار کمال عصمت پر فائز ہیں، یہ ہیں خاتم الانبیاء کے حقیقی جانشین ائمہ طاہرین علیہم السلام یہی وہ شہداء ہیں جو علاوہ انبیاء کے گواہی کے لئے لائے جائیں اور وہی قرآن میں دوسری جگہ اس خطاب کے مخاطب صحیح ہیں کہ:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ ط (بقرہ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی گروہ قرار دیا تاکہ تم تمام لوگوں پر گواہ ہو اور پیغمبر تمہارے اوپر گواہ ہوں۔

جس کی تفسیر پہلے آچکی ہے۔ [۱]

دوسرے لوگ جو ایسے معصومین کے وجود کا تصور نہیں رکھتے، وہ اسے عام نیک آدمیوں کے معنی میں لیتے ہیں مگر غیر معصوم کیسا ہی نیک آدمی ہو، خود اس کے اعمال میں صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کی آمیزش ہوگی تو اسے خود گواہی کی زد میں آنا ہے، پھر وہ گواہ ہونے کے قابل کیوں کر ہو سکتا ہے؟

ان میں سے بعض مفسرین نے اس سے مراد امت محمدیہ کو لیا ہے مگر عام امت کے کردار کو دیکھ کر حافظ شیرازی کی ہم نوائی کرتے ہوئے کہنا پڑتا ہے ”وائے گرد پس امر وز بود فردائی“۔

امت محمدیہ ہے بھی تو گواہی کے لائق ان میں کے وہی افراد ہو سکتے ہیں جو خالق کی نظر میں مثالی کردار کے حامل ہوں۔

بعض نے پوری امت کو گواہ بنانے کی خاطر گواہی کی نوعیت کو بدل دیا ہے کہ امت محمدیہ بحیثیت گواہ خود انبیاء کی خدمات کی تصدیق کے

لئے آئے گی۔ [۲]

سبحان اللہ! اس صورت میں بعد کے فقرے کو کیا کہا جائے گا کہ قضی بینہم بالحق ”فیصلہ کر دیا جائے گا ان کے درمیان حق کے ساتھ“۔ کیا پیغمبروں اور اس امت کے درمیان کوئی جھگڑا ہو رہا تھا جس کے فیصلے کا اعلان کیا جا رہا ہے؟

حقیقت میں یہ سب باتیں حق ناشناسی پر مبنی ہیں۔

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۗ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فَتَبَحَثُوا آبْوَابَهَا  
وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ  
وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۗ قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَىٰ

[۱] الشہداء الأئمة علیہم السلام (علی بن ابراہیم)

[۲] ای ائمة محمد ﷺ یشہدون الرسول بالابلاغ (جلالین)

الْكُفْرَيْنِ ④ قِيلَ ادْخُلُوا ابْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ فَبئسَ مَثْوًى  
الْمُتَكَبِّرِينَ ⑤

”اور لے جائے گئے وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا دوزخ کی طرف گروہ درگروہ، یہاں تک کہ جب وہ وہاں آئے تو اُس کے دروازے کھل گئے اور اُن سے اُس کے محافظوں نے کہا کہ کیا نہیں آئے تمہارے پاس کچھ پیغمبر تم میں کے جو تمہیں پڑھ کر سنائیں تمہارے پروردگار کی آیتیں اور تمہیں ڈرائیں تمہارے اس دن کے سامنے آنے سے؟ اُنہوں نے کہا کیوں نہیں مگر کافروں پر قدرت کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہا گیا کہ داخل ہو دوزخ کے دروازوں میں وہاں ہمیشہ رہتے ہوئے، کتنا برا ٹھکانا ہے گھنڈ کرنے والوں کا۔“

وَسَيُقَالُ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۗ حَتَّىٰ اِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا  
وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلِّمْ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ⑥ وَقَالُوا الْحَمْدُ  
لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقْنَا وَعَدَّا ۗ وَاَوْرَثْنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۗ  
فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِينَ ⑦

”اور لے جائے گئے وہ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے تھے بہشت کی طرف گروہ درگروہ یہاں تک کہ جب وہ وہاں آئے اور اُس کے دروازے کھولے جا چکے تھے اور اُن سے اُس کے محافظوں نے کہا سلام ہو تم پر تم پاک رہے، اب تم داخل ہو یہاں ہمیشہ کے لئے اور انہوں نے کہا شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہمیں حق دار بنایا اس سرزمین کا کہ ہم بہشت میں جہاں چاہیں ٹھہریں تو کتنا اچھا ہے صلہ عمل کرنے والوں کا۔“

یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں سلام ہے کہ الفاظ ہیں جو شیعوں کے یہاں رائج ہیں معلوم نہیں مسلم اکثریت نے اسے ترک کر کے السلام علیکم ہی کو اپنا شعار کیوں بنا لیا ہے؟

”ہمیں حق دار بنایا ہے اس سرزمین کا“، یعنی سرزمین بہشت کا اس لئے کہ زمین وہی تو نہیں ہے، جس پر ہم ہیں بلکہ ہر شے جس پر کسی کے قدم ہوں، وہ اُس کے لئے زمین ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ زمین ہے اور جو ہمارا آسمان ہے، اہل آسمان کے لئے وہ زمین ہے تو جو اہل بہشت ہوں گے، اُن کے لئے بہشت کی وہی سطح جس پر اُن کے قدم ہوں گے زمین کی حیثیت رکھتی ہوگی۔

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۗ وَقُضِيَ  
بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ⑧

”اور دیکھو گے فرشتوں کو عرش کے ارد گرد گھیرا کیے ہوئے کہ وہ تسبیح کرتے ہیں اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ

اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا اور کہا گیا شکر ہے اللہ کا جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔  
ہم تو سمجھتے ہیں یہ آیت بھی قیامت کے متعلق ہے اور ”اُن کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا“ یہ ”اُن“ کی ضمیر فرشتوں کی طرف راجع نہیں ہے بلکہ سابق میں جو اہل جنت اور اہل ناردونوں فریقوں کا ذکر ہوا تھا اُن سے متعلق ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔ [۱] اور بعض نے اُسے مجمل طور پر خلائق سے متعلق کیا ہے۔ [۲]

علامہ طبرسی نے کئی احتمال بطور تردید و تردید نقل کر دیئے ہیں مگر کسی میں اسے فرشتوں سے متعلق قرار نہیں دیا ہے۔ [۳] لیکن شاہ ولی اللہ نے ضمیر کو فرشتوں کی طرف راجع کر دیا ہے، اور حاشیہ پر لکھ دیا ہے ”یعنی دراختصاص ملا علی“ (فتح الرحمن)  
مطلب یہ ہے کہ اور جگہ یہاں سے کافی دور پر ایک سورے میں جو قرآن میں ”ملا علی“ کے جھگڑے کا ذکر ہے، اُس سے متعلق ہے حالانکہ ”اختصاص“ یعنی جھگڑا جس کا حوالہ دیا ہے، اُس کا یہاں اس سے پہلے کہیں ذکر نہیں ہے۔

اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر بھی مرجع ضمیر میں ان سے متفق ہیں مگر اس کی تشریح وہ عجیب و غریب انداز میں یوں کرتے ہیں کہ:-  
”فرشتوں میں فیصلہ یہ کہ ہر ایک اپنے قاعدے پر ایک تدبیر بولتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ایک کی بات جاری کرتا ہے، وہی ہوتی ہے حکمت کے موافق یہ فیصلہ اب بھی ہے اور قیامت میں بھی“ (موضح القرآن)  
مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک فرشتے اللہ کو طرح طرح کی رائیں دیتے ہیں، وہ کسی کو منظور کر لیتا ہے اور کسی کو رد کر کے قرآن مجید نے تمام فرشتوں کو یہ سند عطا کی ہے کہ:-

لَا يَسْئَلُونَكَ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ﴿۵۰﴾ (انبیاء)

وہ اللہ پر کچھ کہنے میں سبقت نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر کار بند ہوتے ہیں۔  
پھر یہ تصور کہ وہ غلط رائے بھی دے جاتے ہیں جنہیں خداوند عالم رد کر دیتا ہے، کہاں درست ہو سکتا ہے؟ خدا اور فرشتوں میں فرمان روائی اور فرمان برداری کا رشتہ ہے، نہ کہ وہ اُس کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں جو اُسے طرح طرح کی رائیں دیتے ہیں۔

[۱] ای قضی بین الخلائق بالحق ای العدل فیدخل المؤمنون الجنة والكافرون النار (جلالین)

[۲] ای فصل بین الخلائق بالعدل لا ظلم فیہ علی احد (تبیان)

[۳] ای فصل بین الخلائق بالحق وقیل بین الانبیاء والامم وقیل بین اهل الجنة والنار (مجمع البیان)

# سُورَةُ الْمُؤْمِنِينَ

مکیہ --- ۸۵ --- آیات

چونکہ اس سورے میں ”مومن آل فرعون“ کا تفصیلی تذکرہ ہے اس لئے اس سورے کا نام یہ ہوا۔ اس کے علاوہ اس سورے میں حسب ذیل مضامین ہیں خواہ مستقل طور پر اور خواہ اسی مومن کی زبانی۔

- ۱۔ حاملانِ عرش کا ذکر اور ان کا اہل ایمان کے لئے استغفار۔
- ۲۔ دودفعہ کی موت اور دودفعہ کی زندگی۔
- ۳۔ قدرت کی طرف سے حق بجانب لمن الملک کی صدا اور کائنات کے سناٹے کا بزبان خاموشی معترفانہ جواب۔
- ۴۔ فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰ پر بے دینی اور فساد پھیلانے کا الزام۔
- ۵۔ جناب یوسفؑ کے بعد لوگوں کا غلط تصور کرنا ان کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔
- ۶۔ فرعون کا ہامان کو ایک اونچے محل کے بنانے کا حکم تاکہ خدائے موسیٰ کا پتہ لگایا جائے۔
- ۷۔ اہل دوزخ کی وہاں کے محافظوں سے التجاء اور ان کا جواب۔
- ۸۔ خدا کی طرف سے اپنے پیغمبروں کی امداد کا قطعی وعدہ۔
- ۹۔ دعا کا حکم اور اس سے انکار کرنے والوں کی شدید تہدید۔
- ۱۰۔ کوئی پیغمبر کوئی معجزہ بغیر حکم الہی نہیں دکھا سکتا۔
- ۱۱۔ خالق کی سنت قدیم کہ عذاب آنے کے بعد ایمان لانا بے سود ہوتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

حَمْدٌ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۲ غَافِرِ الذُّنُوبِ وَقَابِلِ

التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ۳ ذِي السُّلُولِ ۴ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۵ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۶

”حامیم۔ اس کتاب کا اتارا جانا ہے اللہ کی طرف سے جو عزت والا، علم والا ہے، جو گناہ معاف کرنے والا اور توبہ

قبول کرنے والا، سخت سزا والا، بخشش و عطا والا ہے، سو اُس کے کوئی خدا نہیں، اسی کی طرف آخر کار جانا ہے۔“  
قابل التوب کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ”توبہ قبول کرنے والا“ یہ اس تصور پر مبنی ہے کہ توبہ کا لفظ تَابَ يَتُوبُ کے مصدر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ توبہ کی جمع ہے جیسے کَلِمَةٌ کی جمع كَلِمَةٌ اس کی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ”توباؤں کا قبول کرنے والا ہے۔“ [۱]

مجھے پہلا ترجمہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ علامہ طبرسیؒ بھی بظاہر اسی سے متفق ہیں۔ [۲]

مَا يُجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا يَغْرُرُكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ⑤  
كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ ۖ وَهَمَّتْ كُلُّ  
أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَدَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتَهُمْ ۗ  
فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ⑥ وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ  
أَصْحَابُ النَّارِ ⑦

”بلاوجہ بحث و تکرار نہیں کرتے آیات الہی کے بارے میں مگر وہی جو کافر ہوں تو تمہیں دھوکا نہ دے اُن کا مختلف شہروں میں دندناتے پھرنا۔ اُن کے پہلے نوح کی قوم اور اُن لوگوں کے بعد بہت سی جماعتوں نے جھٹلایا اور پھر قوم نے اپنے پیغمبر کے بارے میں ارادہ کیا کہ وہ اُسے گرفت میں لے لے اور باطل کے سہارے پر بحث تکرار کی تاکہ شکست دیں اُس سے حق کو تو میں نے اُنہیں گرفت میں لے لیا تو کیسا تھا میرا عذاب اور یونہی تمہارے پروردگار کی بات پوری ہونا ہے ان کے بارے میں اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ سب دوزخی لوگ ہیں۔“  
”تمہیں دھوکا نہ دے اُن کا مختلف شہروں میں دندناتے پھرنا“ یہ جملہ دوسری جگہ بھی آیا ہے جس کا مفاد ہر مقام پر یہ ہے کہ دنیوی قہر و غلبہ کو دلیل حقانیت نہ سمجھنا چاہیے، اس کے لئے عادی و غمخوار وغیرہ مثالیں دی گئی ہیں کہ اُنہیں بھی توفیق حاصل تھا، پھر کس طرح وہ سب تباہ و برباد ہو گئے۔

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ  
وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا ۗ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ  
لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ④ رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ

[۱] التوب: يحنبل وجهين (تبيان)

[۲] يقبل توبة من تاب اليه من المعاصي (مجمع البيان)

جَنَّتِ عَدْنُ الَّتِي وَعَدْتَهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ ط  
 إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۸ وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ ط وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ  
 فَقَدْ رَجِمْتَهُ ط وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝۹

”وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اُس کے ارد گرد ہیں، تسبیح کرتے ہیں اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اور اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور بخشش کی دعا کرتے ہیں اُن کے لئے جو ایمان لائے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! تو حاوی ہے ہر چیز پر رحمت اور علم کے ساتھ تو بخش دے اُنہیں جو تجھ سے لو لگائے ہیں اور جنہوں نے پیردی کی ہے تیرے راستے کی اور بچا اُن کو دوزخ کے عذاب سے اور اے ہمارے پروردگار! اُنہیں داخل کر ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے بہشتوں میں جن کا تو نے وعدہ کیا ہے اور جو اُن کے آباؤ اجداد اور بیوی بچوں میں سے اس لائق ہوں، یقیناً تو عزت والا ہے، حکمت والا اور اُنہیں غلطیوں سے بچا اور اُس دن جسے تو نے غلطیوں سے بچایا، اُس پر تو مہربان ہو اور یہی بڑی کامیابی ہے۔“

ملائکہ کی دعاؤں میں یہ فقرہ کہ قہم السیئات اُس کے لفظی معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ اُنہیں غلطیوں سے بچا اور اس مناسبت سے یہ مؤمن کا ترجمہ ہونا چاہیے ”آج“ یعنی اس دار دنیا میں لیکن دوسرا تصور یہ ہے کہ قہم السیئات کے معنی یہ ہیں کہ برائیوں کی سزا سے بچا۔ اس صورت میں یہ مؤمن کے معنی ہوں گے اُس دن یعنی آخرت میں۔ اس صورت میں حذف کے ماننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ﴿﴾ جس کی بادی النظر میں کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہوتی لیکن اس مفہوم کو تقویت پہنچتی ہے اس فقرے کے محل وقوع سے کیوں کہ اس کے پہلے سب دعائیں آخرت سے متعلق ہیں۔ ”بخش دے“ اور ”اُنہیں عذاب جہنم سے بچا اور اُن کے باپ داداؤں اور اولاد میں سے جو اس لائق ہوں، اُنہیں بہشت میں داخل کر، یہ سب چیزیں بعد والی منزل سے متعلق ہیں جو انجام کار ہے۔ اس کے بعد یہ کہ اُنہیں گناہوں سے بچا“ یہ دار دنیا کی اس زندگی سے متعلق ہے تو جیسے یہ رفتار کلام میں آگے بڑھ کر پیچھے کی طرف پلٹتا ہے مگر اس صورت میں جب کہ اس سے گناہوں کی سزا مراد ہو، ایک طرح کی تکرار محسوس ہوتی ہے کہ پہلے آچکا ہے قہم عذاب الجحیم ”اُنہیں بچا دوزخ کی سزا سے“ تو اب پھر یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ گناہوں کی سزا سے بچا کیوں کہ وہ سزا عذاب دوزخ ہی تو ہے۔

ہاں اس صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوزخ تو بڑے بڑے گناہوں کی سزا ہے لیکن سیئات جیسا کہ بعض جگہ الفاظ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے، وہ معمولی گناہ ہیں جن کی سزا دوزخ میں مستقل طور پر داخل نہیں ہے بلکہ اس سے کم تر سزا مثلاً دنیا میں کسی مصیبت کی صورت میں سزا دے دی جائے، یا عذاب قبر کی صورت میں تو دوزخ کی سزا سے بچانے کی دعا کے بعد قدم آگے بڑھا کر جیسے غلطیوں کی نتائج بد سے بچانے کی دعا کی گئی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُنہیں برے کاموں کے برے انجام سے بچا اور اس کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ بڑی کامیابی ہے۔

﴿﴾ وقہم السیئات معناه وقہم عذاب السیئات (تبیان).

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادُونَ لِمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ

إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ﴿١٥﴾

”بلاشبہ وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، انہیں پکار کر کہا جائے گا کہ اللہ کی ناراضگی زیادہ بڑی چیز ہے خود اپنے سے تمہاری ناراضگی سے جب کہ تمہیں بلایا جاتا تھا ایمان کی طرف تو تم کفر اختیار کرتے تھے۔“  
اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی مرضی کے خلاف کرتے، بہتر تھا اس سے کہ تم نے خدا کی مرضی کے خلاف عمل کیا جس کے نتیجے میں آج مستوجب عذاب ہوئے۔ اس کے علاوہ دوسرے مفہوم قرار دیئے گئے ہیں جو الفاظ قرآنی سے کچھ بعید نہیں ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:-

یعنی درود و زخ بد خود دعائے بد می کنند وی گویند کاشکے معدوم شدند  
یعنی وہ اپنے کو خود زخ میں کوستے ہوں گے کہ کاش وہ نیست و نابود ہو جائیں۔  
پھر کہا ہے کہ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ:-

یعنی قبول نہ کردن ایمان عداوت با خود است اگرچہ این را نہ نمی دانستند پس جزائے این عداوت نفس خود عداوت خدا شد ایشان را (فتح الرحمن)  
یعنی ایمان کا قبول نہ کرنا خود اپنے سے ایک دشمنی ہے اگرچہ وہ اس کو جانتے نہ تھے اب اسی اپنے ساتھ دشمنی کی سزا خدا کی عداوت کی صورت میں ملی ہے۔

زیادہ تر مفسرین کا ذہن اسی طرف گیا ہے کہ یہ ان کی اپنے نفس سے ناراضگی آخرت میں ہے جب کہ انہوں نے اپنی دنیا کی بد اعمالیوں کی سزا اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ ﴿۱۵﴾

شاہ صاحب نے جو پہلا مطلب لکھا ہے اس کا ما حاصل بھی یہ ہے۔

دوسرا مطلب جو انہوں نے لکھا ہے، اُس کے موافق جناب شیخ الطائف نے ایک قدیم مفسر کا قول یوں نقل کیا ہے کہ:-

قال البلخي لَمَّا تَرَ كَوَالِ الْإِيمَانِ وَصَارَ إِلَى الْكُفْرِ فَقَدْ مَقَّتُوا أَنْفُسَهُمْ.

بلخی نے کہا ہے کہ جب انہوں نے ایمان ترک کیا اور کفر کی طرف گئے تو انہوں نے اپنے ساتھ دشمنی کی۔

ہمیں اس مفہوم کے قبول کرنے میں اس لئے تامل ہے کہ پھر اللہ کا اُن سے ناراض ہونا تو نتیجہ ہوا اُن کی اس اپنے نفس کے ساتھ عداوت کا۔ اُسے اُس کے بالمقابل قرار دے کہ مقۃ اللہ اکبر اللہ کا ناراض ہونا تم سے اُس سے بڑھ کر ہے جتنا تم اس سے ناراض ہو، کہنا بے محل ہو گا۔ ہم نے پہلے جو مفہوم لکھا ہے، اُس کا ما حاصل یہ ہے کہ دورد دنیا میں تم اپنے افعال سے خود دشمنی اختیار کر لیتے، وہ آسان تھا اس سے کہ تمہارے اعمال کے نتیجے میں اللہ تم سے ناراض ہو جس کا نتیجہ اب تمہیں آنکھوں سے نظر آ رہا ہے۔

شیخ الطائف نے کچھ لوگوں کی زبانی ایک قول اس سب سے الگ یوں نقل کیا ہے:-

﴿۱۵﴾ قال مجاهد وقتادة والسدي وابن زيد مقتوا أنفسهم وهين عانيو العذاب (تبيان)

قال قوم لمقت الله اكبر من مقت بعضكم لبعض (تبيان)  
ایک جماعت نے کہا ہے کہ اللہ کی دشمنی اُس سے بڑی ہے جتنا آپس میں تم ایک دوسرے کو دشمن رکھتے۔  
ہمارے نزدیک یہ مفہوم بہت بعید ہے جس پر الفاظ آیت کو محمول نہیں کیا جاسکتا۔

قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِنتَئِنَّا وَاَحْيَيْتَنَا اِنتَئِنَّا فَاَعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ اِلَى  
خُرُوجٍ مِّنْ سَبِيلٍ ۝۱۱ ذَلِكُمْ بِاَنَّهُ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ ؕ وَاِنْ يُشْرِكْ بِهٖ  
تُؤْمِنُوۡا ۗ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝۱۲

”انہوں نے کہا اے ہمارے مالک! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندہ کیا تو ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، اب کیا نکلنے کی کوئی صورت ہے؟ یہ اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ جب اللہ کو اُس کی وحدت کے اظہار کے ساتھ پکارا جاتا تھا تو ہم انکار کرتے تھے اور اگر اُس کے ساتھ شرک کیا جائے تو تم مان لیتے تھے تو اب فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے جو بلند ہے، بزرگ۔“

دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی، اس کی تشریح شاہ عبدالقادر یوں کرتے ہیں: ”پہلے خاک تھے یا نطفہ تو مردے ہی تھے، پھر جان پڑی تو جی گئے، پھر مرے پھر جیے، یہ ہوئیں دو موتیں اور دو حیاتیں“ (موضح القرآن)

لیکن رجعت کی بنا پر جو احادیث اہل بیت بتواتر ثابت ہے، یہ دو موتیں اور دو زندگیاں بالکل ظاہر ہیں۔ پہلی موت قبل رجعت اور دوسری بعد رجعت پہلا زندہ ہونا اُس موت سے رجعت میں اور دوسرا دوسری موت سے قیامت میں، چنانچہ ہمارے یہاں کی ایک حدیث اس آیت کو متعلق بہ رجعت قرار دیتی ہے مگر جناب شیخ طوسیؒ اُس حدیث کو بظاہر ناقابل لحاظ قرار دیتے ہیں اور انہوں نے بطور ایک قول کے نقل کرتے ہوئے اُس سے اختلاف کا رجحان ظاہر کیا ہے اور بعد بحث و تمحیص اسے بطور احتمال قبول کیا ہے مگر دوسرا برابر کا احتمال یہ ہے کہ پہلی موت اس دار دنیا کی زندگی کے بعد والی موت ہے اور اس کے بعد کی زندگی جو سوال منکر و نکیر کے لئے قبر میں ہوں گے جس کے بعد پھر موت طاری ہوگی اور اُس کے بعد قیامت میں جزا و سزا کے لئے نختم زندگی ہوگی، اس احتمال کے موجود ہونے کے بعد کم از کم اس آیت سے استدلال رجعت پر نہیں ہو سکتا اور علامہ طبرسی نے اس مفہوم کو جو رجعت سے متعلق ہے بطور احتمال یا نقل قول بھی درج نہیں کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلْ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ۗ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَن  
يُنۡدِبُ ۝۱۳ فَاَدْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوۡنَ ۝۱۴

”وہ وہ ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمہارے لئے آسمان سے روزی اتارتا ہے اور نہیں نصیحت حاصل کرتا مگر وہ جو اللہ سے لوگائے تو پکارو اللہ کو اُس کی خالص عبادت کرتے ہوئے چاہے کافر لوگ ناپسند کریں۔“



”آسمان سے روزی اُتارتا ہے“ یعنی بارش جس سے روزی پیدا ہوئی ہے۔ [۱]

رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ  
لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝۱۵ يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ ۚ لَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِمَنِ  
الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۚ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۱۶ الْيَوْمَ تُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَا  
ظُلْمَ الْيَوْمَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝۱۷

”اوپنے درجوں والا، عرش کا مالک، اُتارتا ہے خاص روح کو اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے تاکہ وہ ڈرائے بارگاہ الہی میں حاضری والے دن سے، جس دن وہ باہر نکلیں گے، اللہ پر ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی، آج سلطنت کس کی ہے؟ ایک اکیلے غالب، زبردست اللہ کی۔ آج ہر تنفس کو معاوضہ ملے گا اُس کا جو اُس نے کیا ہے، آج کوئی ظلم نہیں ہے، یقیناً اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔“

رفیع الدرجت جس کے معنی ہوئے ”اوپنے درجوں والا“ اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ خود اُس کے درجے بہت بلند ہیں کیوں کہ وہ لامحدود ذات ہے جہاں درجوں کا تصور ہی نہیں ہو سکتا بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص کو جو عطا فرماتا ہے، وہ بڑے اونچے درجے ہیں۔ [۲] اس لئے بعض نے اُس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ وہ درجوں کا بلند کرنے والا ہے۔ [۳]

یہ لفظی طور پر تو ارفع الدرجات کے معنی ہوتے ہیں مگر اُس عقلی قرینے کی بنا پر تصرف ذہنی کے ساتھ لازم معنی یہ ہوتے ہیں جنہیں بطور ترجمہ قرار دے دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ سیدھی بات یہ ہے کہ درجوں کے لفظ میں چونکہ صریحی ارتقاء محسوس ہوتا ہے بس اُسے نظر انداز کر کے اُس کا مطلب یہ لیا جائے کہ اُس کے اوصاف کمال انتہائی بلند و برتر ہیں جسے علامہ طبرسی نے ایک قول کے طور پر درج کیا ہے۔ [۴] اُتارتا ہے خاص روح کو اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، ان بندوں سے مراد انبیاء ہیں، خواہ روح سے مراد وحی ہو اور خواہ خاص فرشتہ جو وحی لاتا ہے اور خواہ نبوت، نتیجہ سب کا ایک ہے۔

وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْأَزْفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كُذِّبَتْ ۚ مَا لِلظَّالِمِينَ  
مِنْ حَاجِمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ۝۱۸

[۱] من الغيث والمطر الذي يبيت ما هو رزق للخلق (تبيان و مجمع البيان)

[۲] اقبل معناه رفيع طبقات الثواب التي يعطيها الانبياء والمؤمنين في الجنة (تبيان)

[۳] ابلند کنندہ مراتب (شاه ولی اللہ)

[۴] اقبل معناه انه على الصفات (مجمع البيان)

”اور انہیں ڈرائیے قیامت کے دن سے [۱] جب کہ دل کھینچ کر گلوں میں آگئے ہوں گے غم و غصہ سے بھرے ہوئے، ان ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا جس کا حکم مانا جائے۔“

قیامت کو از فتنۃ کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اُسے دور نہ سمجھنا چاہیے، وہ قریب ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے: از فتنۃ یعنی قیامت نزدیک ہو چکی ہے، اس لئے کہ عمر عالم کے لحاظ سے ہزاروں برس کا فاصلہ بھی کوئی چیز نہیں ہے، اس لئے آج سے ایک ہزار برس پہلے بھی وہ قریب تھی اور آج بھی قریب ہے پھر بھی ہم اُسے کسی اپنے حساب والی مدت میں محدود نہیں کر سکتے۔

جیسا کہ دوسرے مقامات پر نفی شفاعت کے ساتھ الا نے آ کر ثبوت شفاعت کا تصور قائم رکھا ہے اُسی طرح یہاں نفی شفاعت کے ساتھ یطاع کے لفظ نے یہ معنی پیدا کیے ہیں کہ خالق کی نگاہ میں اُس سے بالاتر ذات کوئی نہیں ہے جو بطور حکم سفارش کرے اور خدا اُس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو بلکہ جو شفیع ہوں گے وہ اُس کے بندے ہوں گے جو اُس کی مرضی کے حدود کے اندر شفاعت کریں گے۔ [۲]

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۝۱۹ وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ۝ وَالَّذِينَ

يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ۝ إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝۲۰

”وہ جانتا ہے آنکھوں کی مجرمانہ جنبش اور جو سینوں میں باتیں چھپی ہوں اور اللہ فیصلہ کرتا ہے حق کے ساتھ اور جنہیں وہ پکارتے ہیں، اُس کے سوا وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے یقیناً اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا۔“

خائنة الاعین جس کا ترجمہ ہم نے ”مجرمانہ جنبش“ کیا ہے، اُس کی تشریح میں مفسرین نے یہ پہلو بھی لکھا ہے کہ جنبش پوشیدہ طور پر ہے جس میں کسی کو دھڑکا ہو کہ کوئی دوسرا دیکھ نہ لے۔ [۳] حالانکہ لفظ خائنة الاعین میں ”پوشیدہ“ کا مفہوم ہمیں محسوس نہیں ہوتا کیوں کہ اصطلاح قرآنی میں ہر گناہ ایک خیانت کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ قرآن میں ارتکاب گناہ کرنے کی ایک جگہ تعبیر تختانون انفسکم کے لفظوں سے کی گئی ہے اسی لئے ہم نے ترجمہ میں صرف ”مجرمانہ کا لفظ لکھا ہے۔“

ہاں ممکن ہے کہ اللہ کے لئے خصوصی علم کے اظہار سے یہ مطلب نکل آئے کہ وہ جنبش نظر اس طرح تھی کہ عام افراد اُسے اکثر محسوس نہیں کر سکتے۔

أَوْلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ

قَبْلِهِمْ ۝ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ

بِذُنُوبِهِمْ ۝ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ۝۲۱ ذَلِك بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ

[۱] یوم الأزیة یعنی یوم القیامة (علی بن ابراہیم)

[۲] انما اراد نفی شفیع یطاع ولیس فی ذلک نفی شفیع یجاب (مجمع البیان)

[۳] ای یعلم ما یختار به الاعین من النظر الی غیر ما یجوز النظر الیه علی وجه السرقة (مجمع البیان)

رُسُلَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ ۖ إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٣﴾

”کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کیا انجام ہوا اُن کا جو ان سے پہلے تھے؟ وہ ان سے زیادہ تھے قوت میں اور دنیا میں اپنی نشانیوں کے لحاظ سے تو اللہ نے اُن لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اُن کے گناہوں کی سزا میں اور انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ اس لئے کہ اُن کے پاس اُن کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تھے جس پر انہوں نے کفر اختیار کیا تو اللہ نے انہیں گرفت میں لے لیا، یقیناً وہ طاقت ور ہے، سخت سزا دینے والا۔“

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٢٤﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهٰمٰنَ وَقَارُونَ

فَقَالُوا سِحْرٌ كَذٰبٌ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا اَبْنَاءَ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ وَاَسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ ۗ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٢٦﴾

”اور بلاشبہ ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ فرعون، ہامان، اور قارون کی طرف تو انہوں نے کہا یہ بڑا جادوگر ہے جھوٹا تو جب وہ آئے اُن کے پاس ہماری طرف سے حق کو لے کر تو انہوں نے کہا کہ جنہوں نے ان کے ساتھ ایمان اختیار کیا، ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھ لو اور نہیں ہے کافروں کی منصوبہ بندی مگر گمراہی میں۔“

فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنا، ایک تو جناب موسیٰ کی ولادت سے پہلے تھا اس پیش گوئی کے پیش نظر کہ ان میں ایک وہ بچہ پیدا ہونے والا ہے جس سے فرعون کی سلطنت کا زوال ہوگا اور اسی لئے جناب موسیٰ کی حفاظت کے لئے خالق کی طرف سے یہ انتظام ہوا کہ انہیں دریا میں بہا دیا جائے اور اس طرح فرعون کے منصوبے کو شکست ہوگئی، دوسری دفعہ جس کا اس مقام پر تذکرہ ہے، جناب موسیٰ کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کے لئے بطور سزا یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کے بیٹوں کو قتل کیا جائے اور ان کی عورتوں کو کنیز بنا کر رکھ لیا جائے۔ [۱]

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذُرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوسٰى وَلِيْدُ غُرَبٰٓئِهٖ ۗ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُبَدِّلَ دِيْنَكُمْ

اَوْ اَنْ يُظْهِرَ فِى الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿٢٦﴾ وَقَالَ مُوسٰى اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِرَبِّىْٓ وَرَبِّكُمْ مِّنْ

كُلِّ مَتَكَبِّرٍ اَلَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٢٧﴾

”اور فرعون نے کہا کہ مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور وہ اپنے پروردگار کو مدد کے لئے پکاریں، مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل نہ دیں یا یہ کہ اس سرزمین پر فساد رونما کریں اور موسیٰ نے کہا کہ میں مانگتا ہوں اپنے پروردگار

[۱] اقتلوا ابناء الذين امنوا اموسى ومن معه: قال قتادة كان هذا الامر بقتل الابناء والاستحياء للنساء امر امن فرعون بعد الامر الاول (تبيان) هذا القتل غير القتل الاول لئلا ينشأ منهم من يزول ملكه على يده ثم ترك ذلك فلما ظهر موسى عليه السلام عاد على تلك العادة (جمع البيان)

اور تمہارے پروردگار سے پناہ ہر اُس گھمنڈ والے سے جو روز حساب پر ایمان نہ رکھتا ہو۔

## فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰ پر بے دینی اور فساد پھیلانے کا الزام

یوں تو جیسا اس کے پہلے سورہ اعراف میں آیا ہے فرعون کے یہاں کے عمائد نے جیسے فرعون سے خود تقاضا کیا تھا کہ موسیٰ کے خلاف تدارکی کاروائی کی جائے ان الفاظ میں کہ:-

کیا موسیٰ اور اُن کی قوم والوں کو چھوڑ دیجیے گا کہ وہ لوگ اس سرزمین میں فساد پھیلانیں اور وہ آپ کو اور آپ کے خداؤں کو چھوڑ دیں۔  
اُن کے جواب میں فرعون نے یہی ارادہ ظاہر کیا تھا کہ:

ہم اُن کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھ لیں گے اور ہم اُن پر پورا قابو رکھتے ہیں۔

مگر یہاں یہ الفاظ کہ ”مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو“ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ سب یا اُن میں سے کچھ خود موسیٰ کے قتل کرنے سے اختلاف رکھتے تھے۔ [۱]

بلکہ یہ بھی کچھ پتہ چلتا ہے کہ جیسے وہ یہ تصور بھی رکھتے تھے کہ شاید جناب موسیٰ جس خدا کی طرف دعوت دے رہے ہیں، وہ حقیقتاً درست ہو اور وہ اُس سے بددعا کر کے فرعون کا تختہ نہ الٹ دیں، جب ہی اس نے اُن کے جواب میں کہا کہ ”مجھے اُنہیں قتل کرنے دو اور وہ کریں اپنے خدا سے دعا“، یعنی اطمینان رکھو کہ وہ بددعا کر کے میرا کچھ نہیں بنا سکتے۔ [۲] اور اسی بنا پر اُسے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اُس کے گرد و پیش والوں پر اثر انداز نہ ہو رہے ہوں، اس لئے اُس نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل نہ دیں، دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ کچھ لوگ اُن سے متاثر ہو کر گرویدہ ہو جائیں اور کچھ فرعون کے طرف دار ہو جائیں اسی طرح اُس قوم میں انتشار اور باہمی تصادم ہو، اس خطرے کے احساس سے اُس نے دوسرا فقرہ کہا کہ ”یا وہ اس سرزمین پر فساد رونما کریں۔“

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ  
رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَإِنَّ يَكُ ذَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۗ وَإِنَّ  
يَكُ صَادِقًا يُصِيبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُّكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ  
كَذَّابٌ ۝ ۲۸

”کہا ایک با ایمان شخص نے فرعون کے خاندان والوں میں سے جو اپنے ایمان کو چھپائے رکھتا تھا کہ کیا ایک شخص کو اس بات پر قتل کر دے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے معجزے بھی لے کر آیا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اُس کے جھوٹ سے اُس کو نقصان پہنچے گا اور اگر وہ سچا ہو تو تم کو پہنچے

[۱] الاہمہم کانوا یکفونہ عن قتلہ (جلالین)

[۲] ایدل علی ان فی خاصۃ فرعون کان قومہم منحونہ من قتل موسیٰ علیہ السلام ومن معہ و یخوفونہ ان یدعور بہ فیہلک (تبیان)





وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلِ الْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكِّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ط  
 حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا ط كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ  
 هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ ۝۳۳ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ط كَبُرَ  
 مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا ط كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ

### جَبَّارٌ ۝۳۵

”اور اس کے قبل یوسف تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ آئے تو برابر تم شک و شبہ میں مبتلا رہے اُس سے جس کے ساتھ وہ آئے تھے یہاں تک کہ جب وہ دنیا سے اُٹھے تو تم نے کہا کہ ہرگز اللہ ان کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ گمراہی میں چھوڑتا ہے اُسے جو حد سے آگے بڑھنے والا، شک و شبہ میں گرفتار ہو، جو آیات الہی کے بارے میں تکرار کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو، یہ بڑی ناپسند چیز ہے اللہ کے نزدیک اور اُن کے نزدیک جو ایمان لائے اسی طرح اللہ مہر لگا دیتا ہے ہر سرکش، گھمنڈ والے کے دل پر۔“

گذشتہ آیات کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ مومن آل فرعون ہی کے کلام کا جز ہے مگر معلوم نہیں کیوں مفسرین اسے حضرت موسیٰ کا کلام قرار دیتے ہیں۔ [۱]

بے شک علامہ طبرسی کا خیال یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومن آل فرعون کے کلام کا جز ہے اس لئے کہ من قبل کی تشریح میں اُنہوں نے لکھا ہے: ای من قبل موسیٰ ان سے پہلے یعنی موسیٰ سے پہلے، اگر جناب موسیٰ کا کلام سمجھتے تو تشریح میں لکھتے: ای من قبلی ”یعنی میرے پہلے“۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ اللہ مہر لگا دیتا ہے ”توسیات کلام سے ظاہر ہے کہ سرکشی اور گھمنڈ جس کا نتیجہ ہے احکام الہی میں تکرار اور ان سے سرتابی کرنا، یہ جرم ان لوگوں سے سرزد ہو چکا تو اب یہ مہر لگانا جس کے معنی سلب توفیقات کے ہیں اُس کی سزا میں ہے۔ [۲] انہ کہ یہ مہر اُس سرکشی اور گھمنڈ میں مبتلا ہونے کا سبب ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَهْمُنُ ابْنُ بِنِي صَرَخًا لَعَلِّيٰ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝۳۶ اَسْبَابِ  
 السَّلْوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰى اِلٰهِ مُوسٰى وَاِنِّى لَاطْنُہٗ كَاذِبًا ط وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِفِرْعَوْنَ  
 سُوءَ عَمَلِهٖ وَصَدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ط وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِي تَبَابٍ ۝۳۷

[۱] ثم قال حا کیا ما قال لہم موسیٰ (تبیان)

[۲] يفعل ذلك عقوبة على كفره (جمع البيان)

”اور فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لئے ایک اونچا محل تعمیر کر دو جس سے ممکن ہو کہ میں ان راستوں، آسمان کے راستوں تک پہنچ کر موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ لوں اور بلاشبہ یقینی طور پر میں اُسے جھوٹا سمجھتا ہوں اور اس طرح فرعون کی نگاہ میں اُس کی بد اعمالی سچ گئی تھی اور وہ صحیح راستے سے ہٹ گیا تھا اور فرعون کا منصوبہ نہ تھا مگر تباہی کی راہ میں۔“

### ہامان کا محکم فرعون اونچا محل بنانا تاکہ خدائے موسیٰؑ کا پتہ لگائے

یہ ہامان کون تھا؟ ایک قدیم تصور یہ ہے کہ وہ فرعون کا وزیر تھا۔<sup>[۱]</sup> دوسرا تصور یہ ہے کہ وہ محکمہ تعمیر کا افسر تھا، یہاں جو اُس سے فرعون کی فرمائش ہے، وہ اس تصور کے موافق ہے اور تعمیر کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ معمار ہو جو خود تعمیر کرے بلکہ وہ افسر جو اپنے عملے سے اس کام کو انجام دلوادے، اُس کا مخاطب ہو سکتا ہے لیکن دوسرے مقامات پر قرآن نے جس اہمیت کی صورت سے فرعون کے ساتھ اُس کا نام لیا ہے اور ایک جگہ افواج کی نسبت ان دونوں کی طرف دی گئی ہے (وَنُورِي فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْتَدِرُونَ) [۲]۔ اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فرعون کے مظالم میں برابر کا شریک اور تقریباً اُس کے برابر اقتدار کا مالک ہے۔ یہ پہلے ہی تصور کی صحت کا پتہ دیتا ہے کہ وہ اُس کا وزیر تھا اور بحیثیت وزیر کے بھی اس تعمیر کا حکم اُسے درست ہے کہ وہ متعلقہ محکمہ کے ذریعے سے اس کام کو انجام دلوادے۔

اب وہ اُس ماضی بعید کے فرعون کا تصور تھا کہ خدائے موسیٰؑ کو وہ کسی اونچے محل کی چھت پر سے تلاش کرنا چاہتا تھا اور اُس کی صدائے بازگشت ہمیں ماضی قریب میں روس کے خرد شچوف کے اس اعلان کے ساتھ سنائی دی کہ ہماری ہوا بازوں نے خلا میں جا کر خوب تلاش کیا، خدا کہیں نہیں ملا۔

ان دونوں میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا کو جسم سمجھ کر آسمانوں میں ساکن سمجھتے ہیں لیکن پہلے والے فرعون کی مزید براں یہ حماقت تھی کہ وہ اپنے خدا ہونے کے ادعا کے ساتھ اُس خدا کو بلند عمارت پر سے دیکھنا چاہتا تھا اور اپنا یہ گمان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ غلط ہے لیکن اس تلاش سے خود اُس کی خدائی تو یقینی طور پر ختم ہو جاتی ہے اور اُس کے اس گمان سے بھی خود اُس کی خدائی کا غلط ہونا یقینی ہو جاتا ہے کیوں کہ اگر وہ خدا ہوتا تو اُسے دوسرے خدا کے وجود کا تصور نہ تھا تو ہم بھی کیوں ہوتا۔

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَوْمَ يَقَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِيكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ﴿٣٨﴾ يَقَوْمِ أُمَّمًا هَذِهِ  
الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿٣٩﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا  
يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ  
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٤٠﴾ وَيَقَوْمِ مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى  
النُّجُودِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ﴿٤١﴾ تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي

[۱] قبیل اٹھ کان وزیر (تبیان) ہو وزیرہ و صاحب امرہ (مجمع البیان)

[۲] سورۃ قصص - ۶



بِهِ عِلْمٌ ۚ وَآتَاكَ دَعْوُكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ ﴿٣٢﴾ لَا جَرَمَ لَكُمْ أَنْ تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ  
لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنْ مَرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ  
أَصْحَابُ النَّارِ ﴿٣٣﴾ فَسْتَدْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ ۗ وَأَفْوِضْ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ  
بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٣٤﴾

”اور وہ جو ایمان لایا تھا کہنے لگا کہ اے میری قوم والو! تم میری پیروی کرو تو میں تمہیں سیدھی راہ کی طرف لے جاؤں گا اے میری قوم والو! یہ دنیوی زندگی بس کچھ وقتی فائدہ ہے اور بلاشبہ آخرت ہی مستقل قیام کا گھر ہے، جو کوئی برائی کرے گا اُسے سزا بس اتنی ہی ملے گی اور جو نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت درحالیکہ باایمان ہوتو یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے، وہاں بے اندازہ انہیں رزق عطا ہوگا اور اے میری قوم والو! کیا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف دعوت دیتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو، تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور شریک کروں اُسے جس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے اور میں تمہیں بلاتا ہوں اُس عزت والے کی طرف جو بخشنے والا ہے، یقیناً جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، اُس کی طرف دعوت نہ کا آمد ہے، دنیا میں نہ آخرت میں اور یقیناً تم سب کو پلٹنا ہے اللہ کی طرف اور بلاشبہ جو حد سے بڑھے ہوئے ہیں آگ والے ہیں تو جلد ہی تم یاد کرو گے اُسے جو میں کہتا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، یقیناً اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔“

مذکورہ بالا تقریر پر نظر کرتے ہوئے جو بالکل مبلغانہ حیثیت رکھتی ہے پتہ چلتا ہے کہ وہ ماضی کا ایک دور تھا جسے قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے کہ: کان یکتہر ایمانہ ”وہ ایمان کو اپنے چھپائے رکھتا تھا“، مگر اس کے بعد ہدایت خلق کو امکانی حد تک اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے رفتہ رفتہ اُس نے تقیہ کے پردے کو چاک کیا اور بہر حال تقیہ میں ان حدود کی مراعات لازم ہے کہ کب تک تقیہ کا محل رہتا ہے اور کب فریضہ دینی اُس کے ترک کا متقاضی ہو جاتا ہے؟

ظاہر ہے کہ داعیان اگر ہمیشہ تقیہ کرتے رہتے تو پیام حق ہم تک پہنچتا ہی کیوں کر؟ اور اس سے ہمارے رہنمایان دین کی سیرت کے سلسلہ میں یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے ۶۰ھ میں تقیہ سے کام کیوں نہیں لیا؟ انہی فرائض کی باعتبار محل تبدیلیوں ہی کی وجہ سے تو کتاب کافی نہیں ہے بلکہ بصیرت دینی والی سوجھ بوجھ رکھنے والے رہنما اشخاص کی قولی و عملی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید نے بھی اس مومن کی تقریروں کو الگ الگ حصوں میں درج کیا ہے اور اُن کے مضامین سے ظاہر ہے کہ وہ سب ایک ہی وقت کی تقریر کے ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع کی تقریروں کے مضمون ہیں چنانچہ یہ آخری تقریر جس میں آخر میں یہ جملہ ہے کہ ”جلد ہی تم یاد کرو گے اُسے جو میں کہتا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں“ یقیناً اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے، بالکل اُس وقت کی معلوم ہوتی ہے، جب

اُس مومن کی جان لینے کا منصوبہ بن گیا ہے جس کا ذکر اس کے بعد کی آیت میں ہے۔

**فَوَقَّهٗ اللّٰهُ سَيِّئَاتٍ مَّا مَكَرُوا وَحَاقَ بِالِ الْفِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۝۵۰  
يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۖ اَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ  
اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۵۱**

”تو اللہ نے بچایا اُس کو برائیوں سے اُس کی جو انہوں نے منصوبہ بنایا تھا اور فرعون والوں کو گھیر لیا برائی نے عذاب کی۔ آگ جس کے سامنے وہ لائے جاتے ہیں صبح اور شام اور جب قیامت برپا ہوگی، داخل کرو فرعون والوں کو سخت ترین عذاب میں۔“

”بچایا اُس کو“ یعنی مومن آل فرعون کو۔ مضمون آیت سے ظاہر ہے کہ اُس مومن کی جان لینے کا منصوبہ بنایا گیا مگر اللہ نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

ہمارے وہ اکابر مفسرین جیسے جناب شیخ طوسی اور علامہ طبرسی جنہوں نے قدیم ترین علی بن ابراہیم قمی کی تفسیروں کو جو زیادہ تر احادیث معصومین پر مبنی ہیں اپنا ماخذ نہیں بنایا ہے، انہوں نے ایک قدیم سنی مفسر قتادہ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مومن آل فرعون جناب موسیٰ اور اُن کے ساتھ والے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل کر دریا پار کر کے نجات پا گیا جب کہ فرعون اور اُس کے ساتھ والے غرق ہو گئے۔ [۱] دوسری روایت علامہ طبرسی نے کسی گنہگار شخص کی نقل کی ہے کہ وہ مومن بھاگ کر ایک پہاڑ پر چلا گیا اور فرعون نے اُس کے گرفتار کرنے کے لئے آدمی بھیجے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ نماز میں مصروف ہے اور جنگل کے جانور اُس کے گرد پہرہ بانداھے ہوئے حفاظت کر رہے ہیں، اس سے وہ آدمی خوف زدہ ہو کر واپس گئے۔ [۲]

بلاشبہ ان دونوں روایتوں میں سے ہر ایک کا مضمون الفاظ قرآن کے ظاہری مفہوم کے مطابق ہے لیکن تفسیر علی بن ابراہیم میں امام جعفر صادق سے یہ روایت وارد ہوئی ہے کہ اُن ظالموں نے اُس مومن کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا مگر اس کے باوجود اسے دین حق سے منحرف نہیں کر سکے۔ [۳]

اس حدیث کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ اصل منصوبہ اُس کی جان لینے کا نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ بجز و قہر اُسے دین حق سے منحرف کریں لیکن اس میں وہ ناکام ہوئے تو بالآخر اُسے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ قتل کر دینا اُس ظالم کے منصوبے کا کامیاب ہونا نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ عملی طور پر شکست کا اقرار ہوتا ہے جیسا کہ حضرت امام حسینؑ کو شہید کر دینے کو یزید کی کامیابی سمجھنا درست نہیں ہے بلکہ وہ حصول بیعت میں اُس کی

[۱] قال قتادہ صرف اللہ عنہم سوء مکرہم وکان قیطان قوم فرعون قنجامع موسیٰ (تبیان)

[۲] قبیل ائہم ہوا بقتلہ فہرب الی جبل فبعث فرعون لجلین فی طلیہ فوجداہ فائما یصلی و حولد الرحوش صفوفاً فخافا ورجعا ہار من (مجمع البیان)۔

[۳] قال ابو عبد اللہؑ واللہ لقد قتلواہ اربا بار بالکن و قاة اللہ ان نفنواہ فی دیند (علی بن ابراہیم)۔

ناکامی کا ثبوت ہے۔

آخر میں جو ہے کہ ”فرعون اور اس کے ساتھ والے آگ کے سامنے صبح و شام لائے جاتے ہیں“ اس کے لئے ترتیب کلام سے ظاہر ہے کہ یہ صورت قیامت کے پہلے ہے اُس دور میں جسے عالم برزخ کہتے ہیں۔ [۱]

وَاذْ يَتَحَايِبُونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعْفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ  
تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۳۷﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا  
كُلٌّ فِيهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۳۸﴾

”اور جب وہ آتش دوزخ میں آپس میں بحث کرتے ہوں گے تو کمزور لوگ اُن سے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے کہ یقیناً ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلنے والے تھے تو کیا تم آگ کے عذاب سے کچھ بچاؤ گے کہ ہم تو سب ہی اُس میں ہیں یقیناً اللہ نے اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ سنایا ہے۔“

یہ چھوٹے اور بڑے آدمیوں کی آپس کی گفتگو میں قرآن مجید میں ہر جگہ خاص انداز میں ہیں اور سب کا نتیجہ یہ ہے کہ آخرت میں یہ لیڈر لوگ جو عوام کو گمراہ کرتے ہیں، اُن بچارے عوام کے کسی طرح بھی کام نہ آئیں گے۔ اس لئے سادہ لوح عوام کو چاہیے کہ ہر لیڈر کے جوش دلانے پر جوش میں نہ آجایا کریں بلکہ خوب سوچ سمجھ لیں کہ کیا یہ شخص اپنے اوصاف کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حق و باطل اور صحیح و غلط میں امتیاز کرنے کی کوشش کریں۔

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخِزْنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ  
الْعَذَابِ ﴿۳۹﴾ قَالُوا أَوْلَمْ نَأْتِكُمْ رُسُلَكُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا بَلَىٰ قَالُوا  
فَادْعُوا ۗ وَمَا دَعَا الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ ﴿۴۰﴾

”اور کہا اُن لوگوں نے جو آگ میں ہیں دوزخ کے نگہبانوں سے کہ اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن ہم سے عذاب میں کچھ تخفیف کرے، اُنہوں نے کہا کہ کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر کھلی ہوئی دلیلین لے کر آتے نہیں رہے تھے؟ اُنہوں نے کہا کیوں نہیں! کہا پھر خود ہی دعا مانگو اور کافروں کی دعا نہیں ہے مگر گم شدہ۔“

یعنی یہ دعا کسی منزل مقصود تک پہنچنے والی نہیں۔ سفارش کے جواب میں فرشتوں کی طرف سے رسولوں کا تذکرہ کس مناسبت سے ہے؟ اس کے لئے شاہ عبدالقادر کی یہ نکتہ رسی بعید نہیں ہے کہ:-

”دوزخ کے فرشتے کہیں گے سفارش کرنا ہمارا کام نہیں۔ ہم تو عذاب پر مقرر ہیں، سفارش کام ہے رسولوں کا۔ رسولوں سے تو برخلاف

ہی تھے۔ (مصحح القرآن)

بعض لوگوں کا خیال ہے فرشتوں کا بس یہ مطلب تھا کہ جب تم نے پیغمبروں کی تکذیب کی تو کافر قرار پائے اور کافر کی شفاعت نہیں کی جاسکتی۔ [۱]

**إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴿۵۱﴾**

**يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعَذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾**

”بلاشبہ ہم اپنے پیغمبروں کی مدد کریں گے اور ان کی جو ایمان لائے اس دنیا والی زندگی میں بھی اور اُس دن جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے، جس دن ظالموں کو ان کی عذر خواہی فائدہ نہ پہنچائے گی اور ان کے لئے لعنت ہے اور اُس آخری منزل کی برائی ہے۔“

دنیا والی زندگی میں نصرت کا حتمی وعدہ ہو رہا ہے مگر اکثر مشاہدات اس بارے میں ذہن کو غیر مطمئن کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں کی ایک حدیث ہے کہ یہ وعدہ رجعت میں پورا ہوگا۔ [۲] اور یہ مشاہدہ اس کی دلیل ہے کہ یہ دار دنیا کے اس پہلے دور حیات سے متعلق نہیں ہے۔

دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ نصرت کے لئے ظاہری غلبہ و فتح کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حقانیت کا نمایاں کرنا بھی بڑی نصرت ہے جو بہر حال دنیا اور آخرت دونوں میں خدا پرستوں کے شامل حال رہتی ہے۔

علامہ طبری تحریر فرماتے ہیں:

يعني نصرهم بوجوه النصر قد يكون بالحجة و قد يكون ايضا بالغلبة في المحاربة و ذلك يحسب ما تقتضيه الحكمة و يعلمه سبحانه من المصلحة و يكون ايضا بالالطاف و التأييد و تقوية القلب و يكون باهلاك العدو و كل هذا قد كان الانبياء و المؤمنون من قبل الله تعالى فهم منصورون بالحجة على من قالفهم وقد نصر و باهلاك عدوهم و انجاءهم مع من امن معهم و قد يكون بالنصر بالانتقام كما نصر يحيى بن زكريا لما قتل به من قتل سبعون الفافهم لا محالة منصورون في الدنيا باحد هذا الوجوه. (مجمع البيان)

یعنی ہم ان کی مختلف طرح مدد کریں گے کبھی دلائل کے ذریعہ سے اور کبھی جنگ میں غالب آنے کی صورت سے، جیسا جس وقت حکمت الہی کا تقاضا ہو اور خداوند عالم مصلحت جانے اور کبھی خاص مہربانیوں اور تائید اور دل کو تقویت پہنچانے کی شکل میں اور کبھی دشمن کو ہلاک کرنے کے طور پر اور یہ سب صورتیں پیغمبروں اور صاحبان ایمان کے لئے اللہ کی جانب سے وقوع میں آتی ہیں کہ دلائل کے ذریعہ سے تو وہ ہمیشہ ہی دشمنوں پر غالب

[۱] فاننا لا تشفع الكافر (جلالین)

[۲] عن ابي عبد الله عليه السلام ذلك والله في الرجعة اما علمت ان انبياء كثيرة لم ينصروا في الدنيا وقتلوا والايممة بعدهم قتلوا ولم ينصروا وذلك في الرجعة (علی بن ابراہیم)۔

رہے اور مخالفین کے مقابلہ میں فتح بھی پائی اور ان کے دشمنوں کو ہلاک بھی کیا گیا اور اہل ایمان کی معیت میں ان کو نجات دی گئی اور کبھی مدد ہوئی ہے اس طرح کہ انتقام لیا گیا جیسے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کی مدد ہوئی کہ ان کے عوض میں ستر ہزار آدمی قتل ہوئے بہر حال دنیا میں ایک نہ ایک طریقے پر ان کی مدد ہوتی رہی۔

جناب شیخ طوسی نے اسے مختصر طور پر اس طرح فرمایا ہے جس میں بس دو صورتوں کا ذکر ہے:

النصر ای المعونة علی العدو هو علی ضربین نصر بالحجة و نصر بالغلبة فی المحاربة بحسب ما یعلمہ اللہ تعالیٰ من المصلحة و تقتضیہ الحکمة. (تبیان)

نصرت یعنی دشمن کے مقابلہ میں مدد، اس کی دو قسمیں ہیں، دلائل کے ذریعہ سے مدد اور جنگ میں غالب آنے کی صورت سے مدد جیسا اللہ مصلحت جانے اور جو اس کی حکمت کا تقاضا ہو۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ ۗ هُدًى وَذِكْرًا

لِأُولَى الْأَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

”اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو ہدایت کا سامان عطا کیا اور ہم نے بنی اسرائیل کو اس کتاب کا ورثہ دار بنایا ہدایت اور نصیحت کا سرمایہ بنا کر صاحبانِ عقل کے لیے“۔

عام طور پر الہدی ”ہدایت کا سرمایہ“ بھی توریت کو بتایا گیا ہے اور الكتاب بھی وہی توریت ہے۔ [۱] مگر جب کہ بعد میں الكتاب یعنی توریت کے لئے پھر الہدی موجود ہے تو پہلا لفظ الہدی سے بھی توریت کا سرمایہ ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ پہلے الہدی سے مراد وہ صلاحیت جو ہر ہے جو باعثِ عطاءِ نبوت و رسالت ہے جسے دوسری جگہ کہا گیا ہے: اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ۔ [۲] ”اللہ خوب جانتا ہے اپنی رسالت کا منصب کہاں رکھے“ اور پھر الكتاب سے بے شک توریت مراد ہے جو عملی طور پر خلق کے لئے سرمایہ ہدایت تھی۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ

وَإِلْبَاغِ ۗ ﴿۵۵﴾

”تو صبر سے کام لے جیسے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت کے لئے دعا کیجیے اور اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ شام و سحر تسبیح کیجیے“۔

حضرت پیغمبر خدا کی مغفرت کی دعا تقاضائے عبودیت

[۱] الہدی التوزیة والمعجزات (جلالین)

[۲] انعام - ۱۲۴

گناہ ہو یا نہ ہو بارگاہ الہی میں مغفرت گناہ کی دعا خود ایک تقاضائے عبودیت ہے جس کی پیغمبر خدا ﷺ کو تعلیم دی گئی ہے۔ اس سے عقیدہ عصمت پر کوئی ضرب نہیں لگتی۔

بعض مفسرین اہل سنت نے بھی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ گناہ سے استغفار کی ہدایت حضرت گواہ غرض سے ہے کہ دوسرے آپ کی پیروی کریں۔ [۱] یعنی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ معاذ اللہ آپ سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔ ہمارے علماء نے ظاہر ہے کہ اس کو زیادہ پُر زور واضح انداز میں لکھا ہے۔ [۲]

”شام و سحر“ تفسیر کے لئے مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد نماز ہائے پنجگانہ ہیں اور شام سے مراد زوال سے لے کر اس کے بعد رات تک کا وقت ہے چنانچہ تفسیر جلالین میں ہے:-

بالعشی هو من بعد الزوال والابکار الصلوة الخمس  
شام کو یعنی زوال کے بعد سے اور صبح کو یہ سب پنجگانہ نمازیں ہیں۔

### اوقات نماز کی طرف اشارہ

اس صورت میں قابل غور امر یہ ہے کہ چار نمازوں کو ایک ساتھ العشی کے ساتھ ادا کیا ہے اور ابکار کے ساتھ ایک تھا۔ یعنی صبح کو۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ صرف فقہ اہل بیت علیہم السلام کی رو سے سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ چار نمازوں کا وقت یعنی ظہرین و مغربین کا اس طرح مسلسل ہے کہ درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہے جو وقت نماز ہونے سے خارج ہو، اس طرح کہ زوال کے بعد سے مغرب تک ظہرین کا وقت اور مغرب سے نصف شب تک مغربین کا وقت۔ چونکہ یہ پورا وقت کسی نہ کسی نماز کا ہے، اس لئے اس سب کو ایک لفظ بالعشی سے ادا کر دیا ہے اور ایک نماز یعنی صبح جو کہ جدا ہے، نہ اُس کے قبل کوئی اور نماز ہے نہ اُس کے بعد۔ اس لئے اُس کا علیحدہ ذکر کیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ زیادہ واضح لفظوں میں ایسا ہی کیا گیا ہے۔ (أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنِ الْفَجْرِ)۔ [۳] لیکن اہل سنت کے مکاتب فقہی کے لحاظ سے ظہر اور عصر کے وقت کے بیچ میں بھی فاصلہ ہے اور مغرب اور عشاء کے بیچ میں بھی فاصلہ ہے۔ اب اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صبح کی نماز کا علیحدہ ذکر کیا جائے اور ان چاروں نمازوں کو بالعشی کے لفظ میں سمو دیا جائے اس صورت میں بالعشی کے معنی صرف وقت عشاء کے ہوں گے ظہر اور عصر اور مغرب کو اس کے تحت میں داخل کرنے کی کوئی وجہ معقول نہیں ہے اور اس صورت میں اس آیت سے صرف دو نمازوں کا حکم ثابت ہوگا۔ نماز پنجگانہ کا استفادہ اُس سے درست نہیں ہو سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَنٍ أَتَهُمْ ۖ إِنَّ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا  
كِبْرًا مَّا هُمْ بِبَالِغِيهِ ۖ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿۵۶﴾

[۱] واستغفر لذنوبك ليستن بك (جلالین)

[۲] هذا تعبد من الله سبحانه لنبيه بالدعاء والاستغفار لكي يزيد في الدرجات والتصير سنة لمن بعده (مجمع البيان)

[۳] ابنی اسرائیل - ۸۰

”یقیناً وہ لوگ جو آپ سے اللہ کی آیتوں کے بارے میں بغیر کسی ثبوت کے جو ان کے پاس آیا ہو، تکرار کرتے ہیں، ان کے سینوں میں کچھ نہیں سوا ایک گھمنڈ کے جس میں وہ کامیاب ہونے والے نہیں ہیں تو اللہ سے پناہ مانگیے، یقیناً وہ سننے والا ہے، دیکھنے والا“۔

”اللہ سے پناہ مانگئے“ یعنی ان کے گھمنڈ کے مقابلہ میں آپ بھی ویسا ہی طرز عمل اختیار نہ کیجیے بلکہ ان کے منصوبوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ سے پناہ طلب کیجیے۔ [۱] اور خود ہدایت ربانی کے مطابق حکمت اور موعظہ حسنہ وغیرہ کے طریقے کے پابند رہیے، آپ کی اور ان کی باتیں خدا سنتا اور آپ کے اور ان کے طرز عمل کو وہ دیکھتا ہے۔

**لَخَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا**

**يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾**

”بلاشبہ آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑی چیز ہے لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں“۔

یعنی قیامت میں دوبارہ پیدا کرنا انسانوں کو اُس کے لئے کونسا مشکل ہے جس نے پوری کارگاہ عالم علوی و سفلی اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کی ہے مگر ”زیادہ تر لوگ جانتے نہیں“ یعنی اپنی جہالت سے معاد کا انکار کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ استدلال اُنہی کے مقابلہ میں ہے جو کہ کائنات کا خالق اللہ کو مانتے ہیں لیکن پھر حیات بعد الموت کے جیسے ”معاد“ کہتے ہیں، منکر تھے جیسا کہ مشرکین عرب تھے۔ [۲]

آج کل کے لامذہبوں کے مقابلے میں یہ استدلال نہیں ہے جو تخلیق کائنات کے لئے اُس باشعور ذات کا تصور ہی نہیں رکھتے جسے خدا کہا جاسکے۔

**وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا**

**الْمُسِيْءِ ۗ ط قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾**

”اور یکساں نہیں اندھا اور آنکھوں والا اور جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور وہ جو بد اعمال ہوں بہت کم تم لوگ نصیحت قبول کرتے ہو“۔

نصیحت قبول کرنے کا مطلب خود اس حقیقت کو اپنی اصلاح نفس کے لئے سمجھنا بھی ہے کہ بد اعمالیاں ترک کر کے اچھے اعمال سے آراستہ ہوں تاکہ اچھے انسان بنیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں ظہور نتیجہ کے دن یعنی روز جزاء کی طرف ذہن کو منتقل کرنا ہو جیسا کہ شاہ

[۱] امر نبیّہ بان یتعیذ باللہ من شرّ هؤلاء المخاصمین (تبیان)

[۲] اثمہم اذا اقروا بان الله تعالى خلق السموات والارض فكيف انكروا قدرته على احياء الموتى (مجمع البيان)

عبدالقادرنے لکھا ہے:-

”یعنی ایک دن چاہیے کہ ان کا فرق کھلے“ (موضح القرآن)

اس کے بعد کی آیت مقام تنزیل میں اس سے متصل ہو تو وہ اس پہلو کو تقویت پہنچاتی ہے۔

**إِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٩﴾**  
”یقیناً قیامت آنے والی ہے، اُس میں کوئی شک نہیں مگر زیادہ تر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔“

لَا رَيْبَ فِيهَا ”اس میں کوئی شک نہیں“ یہ ویسا ہی ہے جیسے سورہ بقرہ کے آغاز میں قرآن کے لئے ہے۔ لَا رَيْبَ فِيهِ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں ہے۔ شک کرنے والے تو ہیں مگر مطلب یہ ہے کہ حقیقت ایسی ہے کہ اس میں شک کسی کو ہونا نہیں چاہیے۔

**وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۗ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دُخْرِينَ ﴿٦٠﴾**

”اور تمہارے پروردگار نے کہا کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بلاشبہ جو میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں، وہ ذلت و حقارت کے ساتھ دوزخ میں داخل ہوں گے۔“

**دُعا سے انکار کرنے والوں کو شدید تہدید**

سیاق آیت سے صاف ظاہر ہے کہ دعا کرنا تقاضائے عبودیت ہونے کی بنا پر خود ایک بڑی عبادت ہے اور خدا سے دعا کو گویا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر بے نیازی اختیار کرنے والوں کو دوزخ کا حق دار بنایا جا رہا ہے۔

دعا کی قبولیت کا وعدہ تو حتمی طور پر ہے لیکن دعا کرنے والا اگر حکمت و عدل الہی پر ایمان رکھتا ہے تو بوقت دعا خواہ وہ لفظوں میں کہے یا اُس کے ذہن میں ہو جو اُس کے اس ایمان کا تقاضا ہے کہ میرا مطلب اگر تیرے نظامِ عالمی کے مصالح کے خلاف نہیں ہے تو اُس کو پورا کر دے۔ اگر دعا اس تقاضائے ایمانی کے تحفظ کے ساتھ ہے تو پھر مقصد حاصل نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ وہ حکمت الہی کے تقاضا کے خلاف ہے لہذا اُس کا پورا نہ ہونا اس کی دعا کو قبول کرنے کے کسی وقت بھی منافی نہیں ہے کیونکہ دعایں اس شرط کے ساتھ تھی کہ خالق کے تقاضائے حکمت کے خلاف نہ ہو۔<sup>[۱]</sup>

بعض لوگوں نے عبادت کو اُس کے اصل معنی میں رکھ کر قبل کے لفظ دعائیں تصرف کیا ہے کہ اُس کے معنی عبادت کے ہیں اور ”قبول کروں گا“ کے معنی اُس پر ثواب عطا کرنے کے ہیں۔<sup>[۲]</sup> اس طرح اُس سے دعا کرنے کا لزوم ثابت نہیں ہوگا مگر ہمارے خیال میں یہ ظاہر کے

[۱] من يدعوا لله ويسأله فلا بد له ان يشترط المصلحة اما لفظا او اضمادا (مجمع البيان)

[۲] ادعوني استجب لكم اي اعبدوني اتبيكم بقرينة ما بعدة (جلالين)



خلاف ہے، زیادہ ذہن سے قریب وہی پہلا مفہوم ہے اور احادیث معصومین علیہم السلام اُس کی موافقت میں ہیں۔ اس ذیل میں علامہ طبرسی نے حسب ذیل احادیث درج کی ہیں:

معوية بن عمار قال قلت لابي عبد الله عليه السلام جعلني الله فداك ما تقول في رجلين دخل المسجد جميعاً كان احدهما اكثر صلوة و الاخر اكثر دعاء اييهما افضل قال كل حسن قلت قد علمت و لكن اييهما افضل قال اكثرهما دعاء لا تسمع قول الله ادعوني استجب لكم الى آخر الآية قال وهي العبادة الكبرى.

معاویہ بن عمار کی روایت ہے میں نے امام جعفر صادق سے عرض کیا: آپ پر قربان! کیا ارشاد ہے؟ آپ کا اُن دو اشخاص کے بارے میں جو ایک ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ ایک نے نمازیں زیادہ پڑھیں اور دوسرے نے دعا زیادہ مانگی۔ ان میں کون زیادہ بہتر ہے؟ فرمایا دونوں ہی باتیں ٹھیک ہیں میں نے کہا یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن ان میں بہتر کون ہے؟ فرمایا جس نے دعا زیادہ مانگی کیس نہیں رہے ہو ارشاد خداوندی کہ مجھ سے دعا مانگو میں قبول کرونگا تا آخر آیت پھر فرمایا کہ یہ سب سے بڑی عبادت ہے۔

روى زرارة عن ابي جعفر عليه السلام في هذه الآية قال هو الدعاء فافضل العبادة الدعاء.

زرارہ کی روایت ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں فرمایا یہ دعا ہے تو بہترین عبادت دعا ہے۔

روى حنان بن سلمان عن ابيه قال قلت لابي جعفر امي المعبادة افضل قال ما من شئ احب الى الله من ان يسأل ويطلب ما عنده ولا يحب الله عز و جل من يستكبر عن عبادته ولا يسأل ما عنده.

حنان بن سلیمان کی روایت ہے اپنے والد کی زبانی انہوں نے کہا میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے کہا کونسی عبادت سب سے بہتر ہے فرمایا اللہ کو اس سے زیادہ کوئی بات پسند نہیں کہ اُس سے سوال کیا جائے اور اُس کی نعمت کو طلب کیا جائے اور اللہ اُسے دوست نہیں رکھتا جو اُس کی عبادت کے مقابلے میں گھمنڈ کرے اور اُس کی نعمت کا سوال نہ کرے۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَذُو

فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦١﴾

”اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی ہے تاکہ تم اُس میں سکون حاصل کرو اور دن کو دیکھنے والا بنایا ہے یقیناً اللہ انسانوں پر بڑے فضل و کرم والا ہے مگر زیادہ تر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔“  
”دن کو دیکھنے والا بنایا“ یعنی روشن جس میں چیزیں دکھائی دیے لگتی ہیں۔

ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۗ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۗ فَآتَىٰ تُوْفِكُونَ ﴿٦٢﴾ كَذٰلِكَ

يُؤْفِكُ الَّذِينَ كَانُوا بِاللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٦٣﴾

”یہ ہے تمہارا پروردگار جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، کوئی خدا نہیں سوا اُس کے تو کہاں منحرف ہوتے ہو؟ اس طرح تو وہ منحرف ہوتے ہیں جو آیات خداوندی کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔“

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ ۗ ذَٰلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمُ ۗ فَتَبَرَّكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٥﴾

”اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو محل قیام اور آسمان کو بطور عمارت قرار دیا اور تمہاری صورت گری کی تو اچھی اچھی صورتیں تمہاری بنائیں اور تمہیں طرح طرح کی پاک صاف غذائیں عطا کیں۔ یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار تو قائم و برقرار ہے وہ اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، وہ زندہ، سوا اُس کے کوئی خدا نہیں تو اُس کو پکارو عبادت کو اُس سے مخصوص رکھتے ہوئے۔ تعریف ہے اُس اللہ کی جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔“

قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِي الْبَيِّنَاتُ مِنْ رَبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ أُسَلِّمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٦﴾

”کہہ دیجیے کہ مجھے ممانعت ہوئی ہے اس سے کہ میں عبادت کروں اُن کی جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو، جب کہ میرے پاس میرے پروردگار کے پاس سے کھلی ہوئی دلیلیں آچکیں اور مجھے حکم ہے کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی بارگاہ میں اسلام اختیار کروں۔“

”اسلام اختیار کرو“ یعنی کلی اطاعت اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اس ممانعت اور حکم کو بطور تکلیف شرعی اس دور کی پیداوار سمجھا جائے بلکہ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے پہلے آچکا ہے:-

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨٠﴾ (سورۃ بقرہ) جب اُن سے اُن کے پروردگار نے کہا اسلام اختیار کرو انہوں نے کہا میں نے اسلام اختیار کیا تمام جہانوں کے پروردگار کے لئے اس کی تشریح ہم نے اس آیت کے ذیل میں کی ہے کہ وہ قول لفظی نہیں ہے جو کسی خاص وقت پر ہوا ہو بلکہ وہ حکم کُن کی طرح کا اشارہ قدرت ہے جس کے بعد یہ سوچنے کا سوال نہیں کہ اُس کی تعمیل کب سے ہوئی ویسا ہی یہاں امر اور اُسی کے تناسب سے اُس کے قبل کی نبی کو سمجھنا چاہیے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا ۖ وَمِنْكُمْ مَن يَتَوَفَّىٰ مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى ۖ وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾ هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَإِذَا قُضِيَ

## أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿١٨﴾

”وہ وہ ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر جسے ہوئے خون سے، پھر تمہیں بچے کی صورت میں باہر لاتا ہے، پھر (رکھتا ہے) یہاں تک کہ تم سن بلوغ تک پہنچو، پھر یہاں تک کہ تم بوڑھے ہو اور تم میں کوئی پہلے ہی اٹھالیا جاتا ہے اور اُس وقت تک کہ تم مقررہ عمر تک پہنچو اور شاید تم عقل سے کام لو۔ وہ وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو جب کسی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے تو بس اُس سے کہتا ہے ہو جا، وہ ہو جاتی ہے۔“

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”یعنی اتنے احوال تم پر گزرے، شاید ایک حال اور بھی گزرے اور وہ مر کر جینا“ (موضح القرآن) اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مختلف مراتب تخلیق پر توجہ دہانی اعتقاد کی منزل میں ایمان بالآخرۃ کی دعوت کے مقصد سے ہے۔ علامہ طبرسی نے تمام فقروں کی تشریح کے بعد لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ کے تحت میں لکھا ہے:

فتتعقلوا ما انعم الله به عليكم من انواع التعمير و اراد منكم اخلاص العبادۃ.

تم عقل سے کام لے کر سمجھو اللہ کی ان گونا گوں نعمتوں کو اور جو اللہ تم سے چاہتا ہے کہ تم خالص عبادت اُس کی کرو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصلاح عمل کی دعوت ہے اور عبادت میں شرک سے روکنا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے لہذا نتیجتاً آیت کو ان دونوں پہلوؤں پر حادی سمجھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ ۖ أَنَّىٰ يُصْرَفُونَ ﴿١٩﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا  
بِالْكِتَابِ وَمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٢٠﴾ إِذْ الْأَغْلُلُ فِي أَعْنَاقِهِمْ  
وَالسَّلْسِلُ ۖ يُسْحَبُونَ ﴿٢١﴾ فِي الْحَبِيمِ ۖ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ  
أَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُونَ ﴿٢٣﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا بَلْ لَمْ نَكُنْ نَدْعُوا  
مِنْ قَبْلُ شَيْئًا ۖ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ فِي  
الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۖ وَمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُونَ ﴿٢٥﴾ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ  
فِيهَا ۖ فَبئسَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٢٦﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جو آیات خداوندی کے بارے میں بے جا تکرار کرتے ہیں، کیسے منحرف ہو رہے ہیں جنہوں نے کتاب کو جھٹلایا اور اُس پیغام کو جس کے ساتھ ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا تو اُنہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا، جب طوق اُن کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں وہ کھینچتے جاتے ہوں گے۔ گرم پانی میں پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔ پھر اُن سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر شریک مانتے تھے، اُنہوں نے کہا

وہ تو ہم سے غائب ہو گئے بلکہ ہم اس کے پہلے کسی چیز کو (خدا کہہ کر) پکارتے ہی نہ تھے۔ اس طرح اللہ گمراہی کا نتیجہ دکھائے گا کافروں کو۔ یہ اس لئے کہ تم دنیا میں ناحق خوش ہوتے تھے اور اتراتے پھرتے تھے، داخل ہو دو زخ کے دروازوں میں ہمیشہ وہاں رہتے ہوئے تو کتنا بُرا ٹھکانا ہے گھمنڈ کر نیوالونکا۔“

یہ سلسلہ تفصیلی حالات آخرت کا مثل دوسرے مقامات کے بہت سے سلسلہ وار آیات کے جو تفصیلات پر مشتمل ہیں ان خیالات کا قلع قمع کرانے کے لئے کافی ہے جو قدیم و جدید فلسفیوں کی بلند پروازی ذہن نے اختراع کیے ہیں وہ اس لئے کہ قرآن کا صریحی انکار لازم نہ آئے اور عذاب اخروی کی اُس شکل کو جو ان کے مزعومہ عقلی تصورات کے خلاف ہے، ماننا بھی نہ پڑے، قرآن مجید کے ان تذکروں کو جو اخروی نعمت یا عذاب سے متعلق ہیں، مختلف طرح مجاز یا تمثیل پر محمول کر کے بظاہر اپنے اسلام کو سنبھالتے ہیں لیکن قرآن کے درج کردہ تفصیلات کو دیکھنے کے بعد کوئی معقول ذہن ان کے اس تصور کو قبول نہیں کر سکتا بلکہ آزاد عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ یا تو ان حضرات کے ان تاویلات و تصورات کو لغو و لائل سمجھا جائے یا قرآن مجید کے بیانات کو معاذ اللہ مہمل سمجھا جائے۔ اب ہر نام نہاد مسلمان فیصلہ کرے کہ اُس کا اسلام ان میں سے کس کو گوارا کرتا ہے؟

**فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ**

**فَالْيَنَاءِ يَرْجِعُونَ ﴿٤٥﴾**

”تو صبر و برداشت سے کام لیجیے، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو خواہ وہ انجام جس کی ہم انہیں اطلاع دیتے رہے ہیں، ہم آپ کو آنکھوں سے دکھلا دیں اور خواہ آپ کو (اس سے پہلے) دنیا سے اٹھالیں۔ بہر صورت انہیں ہماری طرف پلٹنا ہے۔“

یعنی عذاب آخرت تو کہیں گیا نہیں ہے۔ ﴿٤٥﴾ بالفرض اس دنیا میں ان پر عذاب نہ آئے، وہاں کے عذاب میں تو انہیں مبتلا ہونا ہی ہے۔

**وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِّنْهُمْ مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّن لَّمْ**

**نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ**

**اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٤٦﴾**

”اور ہم نے آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیجے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا ذکر ہم نے آپ سے کیا ہے اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا ذکر آپ سے نہیں کیا اور کسی پیغمبر کو یہ مقدور نہیں تھا کہ وہ کوئی معجزہ پیش کرے مگر اللہ کے حکم سے تو جب اللہ کی طرف کا حکم آجاتا ہے تو سچائی کے ساتھ فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس موقع پر وہ جو باطل پر ہیں گھٹا اٹھاتے ہیں۔“

**اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾ وَلَكُمْ فِيهَا**

مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿٨٥﴾

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ ۖ فَآتَىٰ آيَاتِ اللَّهِ تُنَكِّرُونَ ﴿٨٦﴾

”اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے چوپائے بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کچھ پر تم سوار ہو اور کچھ سے تم غذا حاصل کرو اور تمہارے لئے اُس میں فائدے ہیں اور یہ مقصد ہے کہ تم ان پر جو تمہارے دلوں میں ارادہ ہو، اُس تک پہنچ سکو اور ان پر اور کشتیوں پر تم سوار ہوتے ہو اور وہ تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تو کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے؟“

”اُن پر جو تمہارے دلوں میں ارادہ ہو، اُس تک پہنچ سکو“ خواہ بار برادری مقصود ہو تو دوسری چیزیں اُن پر لا کر پہنچا سکو۔ [۱] اور خواہ خود جانا ہو تو سوار ہو کر وہاں پہنچ سکو جس منزل مقصد تک پہنچنے کی تمہاری نیت ہو۔ [۲]

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ط

كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا آغْنَىٰ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا

يَكْسِبُونَ ﴿٨٧﴾ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُم مِّنَ الْعِلْمِ

وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٨٨﴾ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحَدَّاهُ

وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ﴿٨٩﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ط

سُنَّتِ اللَّهُ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۗ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿٩٠﴾

”تو کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھیں کیا ہوا انجام اُن کا جو ان کے پہلے تھے، جو تعداد میں ان سے زیادہ اور طاقت میں اور دنیا میں چھوڑے ہوئے نشانوں کے لحاظ سے ان سے بڑھے ہوئے تھے تو کوئی فائدہ انہیں پہنچایا اُس نے جو وہ دولت کماتے رہے تھے تو جب اُن کے پاس اُن کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تو وہ اپنے پاس جو علم تھا اُس میں مگن رہے اور بتلا ہو گئے اُس (عذاب) میں جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے تو جب ہمارے عذاب کے آثار آنکھوں سے دیکھے تو کہنے لگے کہ ہم اللہ پر جو ایک ہے ایمان لاتے ہیں اور جسے اُس کے ساتھ شریک کرتے تھے، اُس کا انکار کرتے ہیں تو انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچاتا تھا یہ ایمان اُن کا جب کہ انہوں نے عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیا یہی طریقہ ہے اللہ کا جو جاری رہا ہے اُس کے بندوں میں اور اُس موقع پر کافر لوگ

[۱] ہی حمل الاثقال الى البلاد (جلالین)

[۲] ای تر کیوہا وتبلغوا المواضع التي تفصدونها لحوایجکم (تبیان)

گھاٹا اٹھاتے ہیں۔“

### عذاب آنے کے بعد ایمان لانا بے سود

”اپنے پاس جو علم تھا“ اُس میں مگن رہے، یعنی حصول دنیا کے طریقوں میں جو انہیں مہارت تھی اُسے وہ اپنا بہترین جوہر سمجھ کر خوش رہے۔ اس صورت میں عنہم کی ضمیر خود اُن قبل والے لوگوں کی طرف راجع ہے اور بعض مفسرین کا یہی خیال ہے۔ [۱]

ضمیروں میں اس قول سے اتفاق رائے کے ساتھ ”اُن کے پاس جو علم تھا“ اُس کی تشریح میں دو قول اور نقل ہوئے ہیں:۔ ایک یہ کہ وہ اُس میں مگن رہے جو اُن کا مزعومہ تھا کہ حشر و نشر کچھ بھی نہیں اور یہی دنیا سب کچھ ہے دوسرے یہ کہ جو اُن کا زعم تھا شرک اور انکار توحید کا۔ دونوں صورتوں میں اُن کے اس مزعومہ کا اطلاق اُن کے ”جہل مرکب“ کی بنا پر ہے کہ وہ اُسے علم سمجھ رہے ہیں۔ [۲] مگر دوسری تفسیر اس کی یہ کی گئی ہے کہ عندهم کی ضمیر رسل کی طرف راجع ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا کہ ”وہ تفریح کرنے لگے اُس سے جو اُن پیغمبروں کے پاس علم تھا یعنی مذاق اُڑانے لگے۔ [۳]

تیسری تفسیر یہ ہے کہ فرحو اکی ضمیر پیغمبروں کی طرف راجع ہے یعنی جب پیغمبر معجزات لے کر آئے اور پھر انہوں نے تکذیب کی اور خالق نے اُس پر اپنے انبیاء کو اُس عذاب کی اطلاع دی جو اُن جھٹلانے والوں پر نازل ہوگا تو وہ پیغمبر اس اللہ کے دیے ہوئے علم سے خوش ہوئے۔ [۴]

ہمیں یہ تشریح بہت بعید معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کے درمیان کی کڑیاں الفاظ قرآنی سے بالکل ذہن میں نہیں آتیں۔

[۱] یعنی علم معاش (فتح الرحمن)

[۲] فاطلق عليه لفظ العلم على اعتقادهم (مجمع البيان)

[۳] فرحو اى الكفار بما عندهم اى الرسل من العلم فرح استهزاء (جلالين)

[۴] فى الكلام حذف و تقدیرة لہا جاء بہم رسلہم بالیئونات فجدوها وانکروا دلالتہا عد اللہ تعلى الرسل باہلاک القوم و نجات الرسل فرح الرسل بما عندهم من العلم بذلک (تبیان)

# سُورَةُ حَمِّ السَّجْدَةِ

مکیہ۔۔۔۔۔ ۵۴۔۔۔۔۔ آیات

قرآن مجید میں چار سوروں میں ایک ایک آیت ایسی ہے جس کے پڑھنے سننے کے بعد فوراً سجدہ واجب ہوتا ہے، ان سوروں میں پہلی کی ابتداء اللہ سے ہے، اس لئے وہ اللہ سجدہ کہلاتا ہے اور اس کی پیشانی پر صرف السجدہ نام لکھتے ہیں جو اکیسویں پارے میں ہے اور اس دوسرے سورے کی ابتداء حم سے ہے، اس لئے اسے حم السجدہ کہتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس سورے کا نام نہیں ہے۔

سورہ حم سجدہ کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ رسول کی بشریت کا اعلان انہی لفظوں میں جو اس کے پہلے سولہویں پارے میں سورہ کہف کے آخر میں آچکی ہیں۔
- ۲۔ آسمان مبداء تخلیق میں دھوس کی صورت میں تھا۔
- ۳۔ قبیلہ ثمود کی اللہ نے ہدایت کی تو انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی جس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی ہدایت جبری طور پر نہیں ہوتی۔
- ۴۔ آنکھوں، کانوں اور کھالوں کا مجرموں کے خلاف گواہی دینا۔
- ۵۔ صبر و ضبط اور رواداری کی تعلیم اور یہ کہ صفت بڑے ہی خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے۔
- ۶۔ آیات الہی کے ذیل میں ایک پلہ میں تمام آفاق اور ایک پلہ میں نفس انسانی۔
- باقی دوسرے مضامین ہیں ایسے جو بہت سے سوروں میں آتے رہتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

حَمْدٌ ۱ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۲ كِتٰبٌ فَصَّلَتْ اٰیٰتُهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ  
یَعْلَمُوْنَ ۳ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۴ فَاَعْرَضْ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۵ وَقَالُوْا  
قُلُوْبُنَا فِیْ اَكِنَّةٍ ۶ هِمَّا تَدْعُوْنَا اِلَیْهِ وَفِیْ اٰذَانِنَا وَقْرٌ ۷ وَمِنْ بَیْنِنَا وَبَیْنِكَ حِجَابٌ  
فَاَعْمَلْ اِنَّا عَمِلُوْنَ ۸

”ح۔ میم۔ یہ نازل شدہ ہے اسی سب کو فیض پہنچانے والے بڑے مہربان کی طرف سے، ایسی کتاب جس کی

آیتیں کھلی ہوئی صاف صاف قرار دی گئی ہیں عربی زبان کے قرآن کی شکل میں اُن لوگوں کے لئے جو واقف ہیں، خوش خبری دینے والا اور (عذاب) ڈرانے والا تو اُن میں سے اکثر نے روگردانی کی اور وہ سنتے ہی نہیں اور اُنہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اُس سے جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے آپ کے درمیان پردہ حائل ہے تو آپ اپنی سی کیجیے۔ ہم اپنی سی کیے جائیں گے۔“

آخر کے جملے میں جو مضمون اُن کی زبانی ہے، وہ بعض جگہ خالق نے خود اُن کے لئے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جان بوجھ کر انکار، ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے سمجھنا چاہیے کہ اُن کے دلوں پر مہر ہے، اُن کے کانوں پر پردے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی صلاحیت اُن میں باقی نہیں ہے۔ اگر یہ خالق کے ارشادات اُن کے گوش زد ہوئے ہیں تو اُن کا یہ سب کچھ کہنا رسولؐ سے بطور طنز بھی ہو سکتا ہے کہ جب آپ ہمارے لئے یہ سب کچھ کہہ چکے تو اب ہمیں کیوں سمجھاتے ہیں؟ ہم سمجھنے والے ہیں ہی نہیں اور ہو سکتا ہے، اُنہوں نے خود ہی اپنے انکار کو عزم بالجزم کے طور پر قائم رکھنے کے اظہار کے لئے بطور استعارہ یہ سب الفاظ کہے ہوں۔

**قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ اِلَىٰ اُمَّةٍ اِلَهَكُمْ اِلَهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِمْ صِدْقًا اِلَيْهِ  
وَاسْتَغْفِرْ لَهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۗ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ  
هُمۡ كٰفِرُوْنَ ﴿٤﴾**

”کہئے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں (مگر) ایسا کہ میری جانب پیغام بھیجا جاتا ہے کہ تم سب کا خدا بس ایک ہی خدا ہے تو اُس کی طرف سیدھا رخ رکھو اور اُس سے بخشش کے طلب گار ہو اور وائے ہو اُن مشرکوں کے لئے جو خیرات نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔“

چونکہ خیرات نہ دینے کا ذکر مشرکین کے ساتھ متعلق ہونا سمجھ میں نہیں آتا اس لئے بقول شاہ عبدالقادر:-

”بعض کہتے ہیں یہاں زکوٰۃ سے کلمہ کہنا مراد ہے، زکوٰۃ کے معنی سترائی، (موضح القرآن)

مگر یہ کون یا یا تنز کون ہوتا تو اس مفہوم کی گنجائش نکل بھی سکتی تھی، یہ تو تون کے ساتھ جس کے معنی ہیں ”دیتے ہیں“ الزکوٰۃ کا لفظ صاف اس حق مالی کے دینے کا اظہار کرتا ہے جس کا نام ”زکوٰۃ“ ہے اس صورت میں مفسرین کے اندر کافی پریشان خیالی محسوس ہوتی ہے۔

بعض نے یہاں اُس علم کلام کے مسئلہ سے کام لیا ہے کہ کفار فروع کے ساتھ بھی مکلف ہیں، پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے نہ دینے کا ذکر خاص طور پر کیوں ہو رہا ہے؟ وہ نماز کب پڑھتے ہیں جو زکوٰۃ دیا کریں۔

بعض نے کہا ہے کہ قریش والے حجاج پر کافی خیرات کرتے تھے مگر مسلمانوں کو محروم رکھتے تھے ۱۱ اس کا شکوہ کیا جا رہا ہے۔



اور بھی بعض اقوال علامہ طبرسی نے درج کیے ہیں۔ [۱]

سیاق الفاظ اجازت نہیں دے رہے ہیں، ورنہ اس زحمت سے رہائی مل جائے اگر ہم یہ مان لیں کہ اس سے خاص الخاص مشرکین جو غیر مسلم ہوں مراد نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کا ایک ایسا طبقہ جو کسی نہ کسی طرح شرک و کفر کا مرکب ہے جسے ابان بن تغلب کی ایک روایت بتا رہی ہے جو امام جعفر صادق کی طرف نسبت رکھتی ہے۔

**إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝۸**

”بلاشبہ وہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اُن کے لئے اُن کا صلہ ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے۔“

”جو ختم ہونے والا نہیں“ یہ لفظ غیر ممنون کا ترجمہ اس بنا پر ہے کہ ممنون کے معنی لئے جائیں ”قطع ہو جانے والا“۔ [۲]

دوسری تفسیر یہ ہوئی ہے کہ اللہ اُن کی جزاء بطور استحقاق عطا کرے گا۔ کسی احسان کے طور پر نہیں جو اُن پر جتایا جائے۔ [۳] کیوں کہ

احسان کا جتایا جانا احسان کی خوش گواری کو ختم کر دیتا ہے۔ [۴]

**قُلْ أَنْتُمْ لَكُمْ تُكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا ۝**

**ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝۹** وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِي مِّنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا

أَقْوَامًا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۝ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۝۱۰ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ

دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا ۝ قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ۝۱۱

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۝ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ

الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۝ وَحِفْظًا ۝ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝۱۲

”کہئے کہ کیا تم لوگ انکار کرتے ہو اُس ذات کا جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور اُس کے لئے برابر دار مقرر کرتے ہو؟ وہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور اُس نے اُس (زمین) میں اُس کے اوپر سے پہاڑ بنائے اور اُس میں برکت عطا کی اور اُس میں اُس کی روزی کے سامان چار دن کی مدت میں مقرر کیے۔ یہ تمام دریافت کرنے والوں کے لئے یکساں طور پر جواب ہے۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف رخ کیا، اس حالت میں کہ اُدھر دھواں ہی دھواں تھا تو کہا اُس سے اور زمین سے کہ آؤ خواستہ یا نخواستہ تو دونوں نے کہا ہم آتے ہیں خوشی خوشی تو اُس نے اُن

[۱] الذین اشرکو ابلا امام الاول و هم بالائمة الاخرین کافرون (علی بن ابراہیم)

[۲] ای لم جزاء علی ذلک غیر مقطوع بل هو متصل دائم (جمع البیان)

[۳] ای یلامن من اللہ علیہم بما یا جرہم بہ (علی بن ابراہیم)

[۴] يجوز ان يكون معناها انه لا اذى فيه من النهن الذي يكيد الصنعية (تبیان)

کے سات آسمانوں پر تقسیم ہونے کا انتظام کیا دودن میں ہر ہر آسمان میں وحی بھیجی اُس کے معاملات کی اور ہم نے نیچے والے آسمان کو چراغوں اور حفاظت کے سامان سے زینت بخشی، یہ بندوبست ہے اُس غلبہ و اقتدار والے کا جو بڑا علم والا ہے۔

چھ دن میں آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کا ذکر بائبل میں بھی ہے مگر اُس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ اس لگاتار محنت سے تھک گیا تو ساتویں دن اُس نے کمر سیدھی کی اور آرام کیا۔ قرآن نے بس اس آخری جز کو جو جلال و کمال الہی کے خلاف تھا رد کر دیا اور ارشاد کیا: مَا مَسَّنَا مِنَ لُغُوبٍ ﴿۳۵﴾ (سورہ ق) ہمیں تھکن چھو بھی نہیں گئی۔

بے شک چھ دن میں پیدا ہونے کا تذکرہ متعدد مقامات پر قرآن نے بھی کیا ہے جو بظاہر ان تمام امور کے تدریجی طور پر وقوع میں آنے کا اظہار ہے لیکن دنوں کی پوری حقیقت و کیفیت جب کہ شمس و قمر اُس وقت موجود نہ تھے جن سے ہمارے دن اور رات بنتے ہیں، اسے ”مشابہات“ میں داخل سمجھا جائے تو بعید نہیں اور جب اس چھ دن کے اصل معنی ہم نہیں سمجھتے تو اس تفریق کو کیوں کر سمجھ یا سمجھا جاسکتے ہیں کہ زمین کے لئے چار دن اور آسمان کے لئے دو دن ہمارے معتبر مفسرین بھی خاموش نظر آتے ہیں۔

”کہا اُن دونوں آسمان اور زمین سے کہ آؤ خواستہ یا ناخواستہ۔ اُنہوں نے کہا کہ آتے ہیں ہم خوشی خوشی“ یہ کہنا اور اُن کا جواب دینا لفظی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ کہنا وہی حکم گن ہے اور یہ جواب بلا توقف اُس کے وقوع میں آنے کی تعبیر ہے۔ [۱] جیسے امانت کا آسمان زمین پر پیش کرنا اور اُن کا انکار۔ یہ کسی خاص وقت پر ہونے والے سوال و جواب کا اظہار نہیں بلکہ انسان کے علاوہ اس بار امانت کے اٹھانے سے دوسرے مخلوقات کی عدم صلاحیت فطرت کی تعبیر ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَبْعَةً مِّثْلَ صَبْعَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴿۱۳﴾ إِذْ جَاءَتْهُمْ  
الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ط قَالُوا لَوْ شَاءَ  
رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً فَأِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿۱۴﴾

”تو اگر وہ رد گردانی کریں تو کہہ دیجیے کہ میں نے ڈرا دیا تمہیں اُس کے آسمانی عذاب سے جو قبیلہ عاد و ثمود والے آسمانی عذاب کا سا ہو، جب اُن کے پاس پیغمبر آئے اُن کے سامنے سے اور اُن کے پیچھے سے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار چاہتا تو فرشتے اتارتا تو ہم اُس کے جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو منکر ہیں۔“

”اُن کے سامنے سے اور اُن کے پیچھے سے“۔ اس کے ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ یہ لوگ اُن کی طرف متوجہ ہو کر منہ در منہ اُن کی بات

[۱] ایس ہناک امر بالقول علی الحقیقۃ ولا جواب لذلك بالقول بل اخبر الله سبحانه بخلقه السهوات والارض وانشائه لها من غير تعذرو ولا كلفة ولا مشقة (مجمع البيان)

سین یا اُن کی طرف سے منہ موڑے رہیں کہ وہ ان کے پس پشت سے پکار رہے ہوں۔ [۱] وہ بہر صورت پیغام الہی ان تک پہنچائے جاتے تھے مگر یہ مفہوم قرآن کے الفاظ سے سمجھ میں آنا مشکل ہے اس سے زیادہ ذہن سے نزدیک یہ مفہوم ہے کہ پیغمبر اُن کے آگے بھی آئے یعنی اُن کے گزرے ہوئے آباؤ اجداد کے پاس اور اُن کے پیچھے یعنی بعد میں بھی آئے۔ [۲]

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۗ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۗ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۱۵﴾  
فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحْسَاتٍ لِنَنْذِرَهُمْ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۗ وَكَانُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ أَخْزَىٰ وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ ﴿۱۶﴾

”توفیلہ عاد، انہوں نے دنیا میں ناحق گھمنڈ سے کام لیا اور کہا کون ہم سے زیادہ ہے طاقت میں؟ کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا، وہ اُن سے طاقت میں زیادہ ہے اور وہ ہماری آیتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے تھے تو ہم نے اُن پر تیز و تند ہوا بھیجی کچھ خاص منحوس دنوں میں تاکہ انہیں رسوائی کی سزا کا مزہ چکھائیں اس زندگی میں اور بلاشبہ آخرت کا عذاب زیادہ سوال کرنے والا ہے اور اُن کی کوئی مدد نہ ہوگی۔“

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ فَأَخَذَتْهُمُ صِيعَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ ۖ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۱۸﴾  
”اور قوم ثمود، اُن کی ہم نے رہنمائی کی تو انہوں نے اندھے پن کو راہ راست پانے پر ترجیح دی تو انہیں ذلت و حقارت کے سخت عذاب نے گرفتار کر لیا اُن کے کرتوتوں کے نتیجے میں اور جو ایمان لائے تھے اور پرہیزگار رہے تھے، انہیں ہم نے نجات دی۔“

”ہم نے رہنمائی کی تو انہوں نے اندھے پن کو ترجیح دی“ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کا ہدایت کرنا بصورت جبر نہیں ہے، ورنہ اُس سے تکلف ممکن ہی نہ ہوتا۔ [۳] اور جہاں کافروں سے ہدایت ربانی کی نفی کی گئی ہے کہ اگر ہم ہدایت کرتے تو سب ہی ایمان لے آتے، وہاں وہ ہدایت ہے جو زبردستی منزل تک پہنچا دینے کے معنی میں ہے مگر اس طرح کا مجبور کرنا اللہ کی شان حکمت اور انسان کی مطلوبہ منزل شرافت کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ایک درجہ درمیانی ہے جو توفیقات خاصہ کا شامل حال کرنا ہے جس کی رسولؐ سے نفی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۹﴾

[۱] ای مقبلین علیہم و مدبرین عنہم (جلالین)

[۲] فمنہم من تقدّم زمانہ ومنہم من تأخر عنہ (تبیان)

[۳] فی الآیة دلالة علی بطلان قول المجبرة (تبیان)

آپ جس کی چاہیں اُس کی ہدایت نہیں کر سکتے، وہ تو اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔  
مگر یہ ”چاہنا“ بلاوجہ نہیں ہوتا بلکہ خود اُس بندے کا ذوق طلب اُسے اس کا حقدار بناتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو ہمارے بارے میں جدوجہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنے خاص راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ غرض قرآن مجید کے مطالعے سے عقلی تدبیر کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت کے متعدد معنی یا مختلف مدارج ہیں، کوئی عمومی طور پر ثابت ہے خدا کے لئے بھی اور رسول کے لئے بھی، کوئی خدا کے ساتھ مخصوص ہے، رسول کے بس میں نہیں مگر جس کی مطلق طور پر نفی ہوئی ہے اور وہ جبری ہدایت ہے۔ کوئی خدا کی طرف سے ہے مگر اُس میں عمومیت نہیں بلکہ صلاحیت ظرف اور مصالح کے ساتھ مشروط ہے۔ اس اختلاف معانی یا مراتب کے نظر انداز کرنے سے بہت لوگ پریشان خیالی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ محل اور موقع کے لحاظ ہر جگہ اس لفظ کے وہ معنی سمجھنا چاہئیں جو اُس موقع پر موزوں و مناسب ہوں۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوا لَوْلَا دِينُنَا لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْتَقَىٰ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢٢﴾ وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدَكُمْ فَاصْبَحْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٢٣﴾ فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالنَّارُ مَثْوًىٰ لَهُمْ ۗ وَإِنْ يَسْتَعْتِبُوا فَمَا لَهُمْ مِنَ الْمُعْتَبِينَ ﴿٢٤﴾

”اور جس دن دشمنانِ خدا قیامت میں آگ کی طرف لے جائے جائیں گے تو انہیں ہر طرف سے لایا جائے گا، یہاں تک کہ جب وہ وہاں آئیں گے تو اُن کے خلاف اُن کے کان اور اُن کی آنکھیں اور اُن کی کھالیں گواہی دیں گے اُس کی جو وہ کرتے تھے اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی تو وہ کہیں گے کہ ہمیں گویائی عطا کی اللہ نے جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے اور اُس نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اُس کی طرف تمہارا پلٹنا ہے اور تم چھپنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اس سے کہ تمہارے خلاف کہیں تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں گواہی نہ دیں مگر تمہارا خیال تھا کہ اللہ بہت سی باتوں سے جو تم کرتے ہو، آگاہ نہیں ہے اور یہی تمہارا خیال جو تم نے اپنے پروردگار کی نسبت کیا تمہارے لئے تباہ کن، بنا تو تم گھانا اٹھانے والوں میں

ہوئے۔ اب اگر وہ برداشت کریں تو بھی آگ اُن کا ٹھکانا ہے اور اگر وہ راضی کرنے کی کوشش کریں تو بھی اُن سے راضی ہوا نہیں جاسکتا۔“

## قیامت میں اعضاء جسمانی گواہی دیں گے

آنکھوں، کانوں اور جسم کی کھالوں کا گواہی دینا اُس حجت کا سدباب ہے جسے دنیا میں ایک شاعر نے پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پے ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

حدیث معصوم بتاتی ہے کہ یہ حجت روز قیامت پیش کی جائے گی اور اُس وقت خالق کی طرف سے اُن کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور اعضاء جسمانی اُن کی بد اعمالیوں کی گواہی دینے لگیں گے، وہ حدیث یہ ہے:-

قال صادق عليه السلام فيقولون يا رب هؤلاء ملائكتك يشهدون لك ثم يحلفون بالله ما فعلوا من ذلك شيئاً وهو قول الله: يوم يبعثهم الله جميعاً فيحلفون له كما يحلفون لكم فعدت ذلك يختم الله على السنتهم وينطق جوارحهم... (علی ابن ابراہیم)

امام جعفر صادق کا ارشاد ہے کہ اُس وقت وہ کہیں گے پروردگار! یہ تیرے ہی تو فرشتے ہیں، وہ تیری سی گواہی دے رہے ہیں، پھر وہ خدا کی قسم کھائیں گے کہ انہوں نے یہ کچھ نہیں کیا، چنانچہ قرآن میں ہے: جس دن وہ انہیں اٹھائے گا تو وہ اُس کے سامنے اسی طرح قسمیں کھائیں گے جیسے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تو اُس وقت اللہ اُن کی زبانوں پر مہر لگا دے گا اور اُن کے اعضاء گواہی دیں گے۔

وَقَيْضَنَا لَهُمْ قَرْنَاءَ فَرِيئُوا لَهُمْ مَّا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ  
الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ  
كَانُوا خَسِرِينَ ﴿٢٥﴾

”اور ہم نے اُن کے لئے مقرر کیے کچھ ساتھی تو انہوں نے ان کے لئے بنا سنوار کر پیش کیا اُسے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور اُن پر بات پوری ہوگئی اُن بہت سی قوموں کے ذیل میں جو جنات اور آدمیوں میں سے ان کے پہلے گزر گئیں، بلاشبہ وہ گھانا اٹھانے والے تھے۔“

”ہم نے ان کے واسطے مقرر کیے کچھ ساتھی“۔ یہ ساتھی حقیقت میں اس مقصد سے تو مقرر نہیں کیے گئے تھے مگر چونکہ اُن ساتھیوں نے کام بھی کیا، اس لئے اس نتیجہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس کی یہ مثال ایسے موقع پر علماء کے درمیان زبان زد ہے اور اس تفسیر میں بھی بار بار آئی ہے کہ حضرت موسیٰ کے واقعہ میں کہا گیا: فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا (قصص- ۸) ”فرعون کے گھرانے والوں نے اُنہیں دریا سے نکال لیا تاکہ وہ اُن کے لئے دشمن جان اور سبب رنج و ملال ہوں“ حالانکہ فرعون والوں کا مقصد حضرت موسیٰ کی پرورش سے یہ نہ

تھا کہ وہ اُن کے لئے دشمن جان ثابت ہوں، اسی طرح یہاں یہ ساتھی اس لئے اُنہیں نہیں دیے گئے تھے مگر چونکہ نتیجہ یہی سامنے آیا لہذا اُسے اس طرح کہا گیا۔

”بات پوری ہوگئی“ وہی جو آغاز آفرینش میں شیطان سے خالق نے کہہ دیا تھا کہ: **لَا مَلَكَنَ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَبِمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ** **أَجْمَعِينَ** (سورۃ ص)

میں دوزخ کو تم سے اور تیرے پیرووں سے بھر دوں گا۔

”سامنے اور پیچھے“ یعنی دنیا و آخرت کے بارے میں جو ان کے تصورات تھے کہ دنیا سب کچھ ہے اور آخرت کچھ نہیں، اس میں اُن ساتھیوں نے جو اُنہیں تقدیر سے مل گئے تھے، ہاں میں ہاں ملائی بلکہ کبھی انہی لوگوں نے اُنہیں گمراہ کر کے ایسے خیالات پیدا کر دیے۔ [۱] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ برے ساتھیوں کا ملنا خود ان کی بد اعمالی کے نتیجے میں سلب توفیق کی بناء پر ہوا۔ [۲] اس کے مقابلہ میں اچھے ماحول اور اچھے ساتھیوں کا ملنا ایک توفیق الہی ہوتا ہے اُن کے لئے جن میں اللہ آثار خیر و سعادت پاتا ہے۔

**وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ** (۳۶)  
**فَلَنْدِ يُقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا ۗ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا**  
**يَعْمَلُونَ** (۳۷) **ذَلِكَ جَزَاءُ أَعْدَاءِ اللَّهِ النَّارِ ۗ لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ ۗ جَزَاءُ مِمَّا كَانُوا**  
**بِأَيْتِنَا يَجْحَدُونَ** (۳۸)

”اور کہا اُن لوگوں نے جو کافر ہیں کہ اس قرآن کی نہ سنو اور اس کے پڑھے جانے میں ادھر ادھر کی فضول باتیں کیا کرو، شاید تم فتح پاؤ، تو ضرور ضرور ہم چکھائیں گے ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ اور اُنہیں سزا دیں گے ان بدترین اعمال کے لحاظ سے جو وہ کرتے تھے، یہ سزا ہے دشمنانِ خدا کی آگ، جس میں اُن کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر ہے، سزا میں اس کی کہ وہ ہماری آیتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے تھے“۔

**وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرْنَا الَّذِينَ أَضَلْنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ نَجْعَلُهُم تَحْتِ**  
**أَقْدَامِنَا لِيَكُونُوا مِنَ الْأَسْفَلِينَ** (۳۹)

”اور کہا اُن لوگوں نے جو کافر تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دکھلا اُن دونوں قسم کے اشخاص کہ جنات اور آدمیوں میں سے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہم اُنہیں پیروں کے نیچے روندیں تاکہ وہ پستی میں مبتلا ہوں“۔

[۱] ما بین ایدیہم من امر الدنیا وایتان الشهوات وما خلفهم من اموال الاخرة بقولهم لابعث ولا حساب (جلالین)

[۲] اثمًا فعل ذلك عقوبة لهم على مخالفتهم ونظره ومن يعش عن ذكر الرحمن نقيض لدشيطانا فهو له قرين (مجمع البيان)

بعض مفسرین نے ”دونوں قسم کے اشخاص“ کے بجائے سوچ کر دو شخصیتیں نکالی ہیں کہ اہل دوزخ انہی کو آنکھ سے دیکھنے کا مطالبہ کر رہے تھے، جنات میں سے ابلیس اور آدمیوں میں سے قابیل جس نے سب سے پہلے خوزیری کی بنیاد قائم کی۔ [۱]

اس کے لئے کوئی حدیث ثبوت میں مل جائے تو ٹھیک ہے جیسا کہ ایک روایت میں اُس کی نسبت جناب امیر علیہ السلام کی طرف آئی ہے۔ [۲] مگر حضرت کی طرف اس ارشاد کا استناد پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا ہے، بہر صورت مقصود اُس سے سب ہی ایسے اشخاص ہیں جو دوسروں کی گمراہی کا سبب ہوں۔ [۳]

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا  
وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۳۳﴾ مَن أَوْلِيَاكُمْ فِي الْحَيَاةِ  
الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهَى أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا  
تَدْعُونَ ﴿۳۴﴾ نَزَّلًا مِّنْ غُفُورٍ رَّحِيمٍ ﴿۳۵﴾

”وہ جنہوں نے کہا کہ ہمارا مالک اللہ ہے اور پھر مضبوطی کے ساتھ جے رہے، اُن پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ افسوس کرو اور خوش ہو اس بہشت سے جس کا وعدہ تم سے ہوتا رہا تھا۔ ہم تمہارے مددگار ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور تمہارے لئے اُس میں وہ ہے جو تمہارے نفوس خواہش رکھتے ہوں اور تمہارے لئے وہاں وہ ہے جو طلب کرو سامان ضیافت کے طور پر بڑے بخشنے والے مہربان کی جانب سے۔“

”اُن پر فرشتے اترتے ہیں“ یعنی موت کے وقت اُن کو فرشتے آ کر یہ بشارت دیتے ہیں۔ [۴]

دوسرا تصور یہ ہے کہ حشر کے موقع پر قبور سے اٹھائے جاتے وقت یہ بشارت اُنہیں مل جاتی ہے۔ [۵]

تیسرا قول یہ ہے کہ تین دفعہ ایسا ہوگا، موت کے وقت اور قبروں میں اور پھر قبروں سے اٹھائے جانے کے وقت۔ [۶]

علامہ طبرسی نے پہلے قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:-

روى ذلك عن ابى عبد الله عليه السلام (يعنى) اس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آئی ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۶﴾

[۱] ای ابلیس قابیل الذین من الکفر والقتل (جلالین)

[۲] روى ذلك عن على عليه السلام (تبیان)

[۳] اراد بذلك كل من ابدع الكفر والضلالة من الجن والانس (مجمع)

[۴] عند الموت (جلالین)

[۵] قال الحسن تستقبلهم اذا خرجوا من قبورهم في الموقف بالبشارة (تبیان)

[۶] قيل ان البشرى تكون في ثلاثة مواطن: عند الموت وفي القبر وعند البعث (مجمع البيان)

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۗ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ  
وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٢﴾ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۗ وَمَا يُلْقِيهَا  
إِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ ﴿٣٥﴾

”اور کون ہوگا بات میں بہتر اُس سے کہ جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک اعمال بجلائے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں اور بھلائی اور بُرائی یکساں نہیں ہے، تم برائی کا دفعیہ زیادہ سے زیادہ بھلائی سے کرو تو ایک دم یہ نتیجہ ہوگا کہ تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی ہے، وہ ایسا ہو جائے جیسے وہ بڑا جگری دوست ہے اور یہ طریقہ کار سکھایا نہیں جاتا مگر اُن کو جو برداشت سے کام لیں اور اسے نہیں سکھایا جاتا مگر اُسے جو بڑے نصیب والا ہو۔“

اس قرآن کی آیت میں عدم تشدد والے مقابلے کا پورا فلسفہ موجود ہے مگر عوام کو لازمی طور پر اس کا پابند نہیں بنایا جاسکتا، اس لئے شریعت اسلام نے قصاص اور مقابلہ بمثل کا حق دیا ہے، یہی اسلام کی وہ جامعیت اور اعتدال کی خصوصیت ہے جو اس کی ہمہ گیر اور دائمی ہونے کی ذمہ دار ہے۔ معصوم رہنمایان دین نے یہ توضیح فرمائی ہے کہ ہر شخص کے مقابلہ میں یہ طریقہ کار کامیاب اور مستحسن نہیں ہوتا بلکہ اس عدم تشدد کے مقابلے کے لئے فریق مخالف میں کچھ شرافت کا جو ہر ہو، تب نتیجہ حسب دل خواہ مرتب ہوتا ہے، ورنہ ممکن ہے کہ ظلم کی ہمت افزائی ہو اور ایسی صورت میں یہ طریقہ کار اختیار کرنا صحیح نہ ہوگا۔

ایک تشریح یہ ہے کہ ”برائی“ سے مراد سخت کلامی اور بدزبانی ہے اور ”بھلائی“ سے مراد ”رواداری“ تہذیب اور شائستگی ہے۔ [۱] یعنی تمہارا مخالف تم سے بحث میں کیسی ہی سخت کلامی کرے، تم رواداری کا دامن نہ چھوڑو تو بہت ممکن ہے کہ اُس کی سختی و درشتی بھی پھر نرمی اور رفتہ رفتہ محبت و الفت سے تبدیل ہو جائے۔ اس صورت میں اس حکم کو عام بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ عموماً اپنا کردار ایسا ہی رکھنا چاہیے۔

وَأَمَّا يُنْزَعَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۗ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٣﴾

”اور اگر شیطان کا ورغلا نا تمہیں منحرف کرنا چاہے تو اللہ سے پناہ مانگو، بلاشبہ وہ سننے والا ہے، جاننے والا۔“

سابقہ آیت کے سیاق کی مناسبت سے اگر ترتیب نزول میں بھی یہ آیت اُس سے متصل ہو تو یہاں شیطان کے ورغلانے سے مراد جوش انتقام اور غصے کا غلبہ قرار پاتا ہے۔ [۲] اور اگر سیاق سے قطع نظر کیا جائے تو یہ ایک عام بات ہے کہ جب طبیعت کسی بے راہ روی کی طرف مائل ہو تو اللہ سے پناہ مانگو۔

یہ پناہ حقیقتاً تو تصور صادق کے ساتھ اللہ کو یاد کر لینا ہے اور لفظی مظہر اُس کا یہ الفاظ ہیں کہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم جو تلاوت قرآن میں خاص طور پر وارد ہوئے ہیں اور یوں بھی انسان کو انہیں زبان پر جاری کرنا چاہیے۔

[۱] قبیل معنی الحسنۃ لہذا المدارۃ والسنۃ المراد بہا الغلظة فأدب اللہ تعالیٰ عبادة بهذا الادب (تبیان)

[۲] یعنی کبھی بے اختیار غصہ چڑھ آوے تو یہ شیطان کا دخل ہے (موضح القرآن)



وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ  
وَأَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿٣٤﴾ فَإِنِ اسْتَكْبَرُوا  
فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٣٥﴾<sup>الصحيفة</sup>

”اور اُس کی نشانیوں میں سے رات ہے اور دن اور سورج اور چاند، تم سجدہ نہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو اور سجدہ کرو  
اُس اللہ کو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر تم بس اُسی کو مستحق عبادت سمجھتے ہو تو اگر وہ گھمنڈ سے کام لیں تو بلاشبہ جو  
تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات اور دن اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ تھکتے نہیں ہیں۔“

### سجدہ واجب

یعنی وہ تمہاری عبادت سے بے نیاز ہے، اُسے سجدہ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔  
یہ دو آیتیں وہ ہیں جن میں سجدہ واجب ہے، ہمارے علماء کے نزدیک ان میں سے پہلی آیت کی آخری لفظ تعبدون پر سجدہ واجب  
ہے۔ [۱] اور یہ اس لئے قرین قیاس ہے کہ اصل سجدہ کا حکم و اسجدوا یعنی سجدہ کرو اسی میں ہے، بعد والی آیت تو اس کا ایک طرح کا تتمہ ہے اور  
جمہور کے علماء زیادہ تر دوسری آیت کے آخری لفظ لا یسمعون پر سجدہ واجب جانتے ہیں کہ پورا مضمون مع تتمہ ختم یہاں پر ہوتا ہے۔  
ہمارے علماء کے قول کی موافقت میں ہمارے ائمہ معصومین کے ارشادات ہیں اور بعض صحابہ کا قول بھی ہے اور قراء سبعہ میں سے ایک  
قاری کا وہ مسلک بھی ہے۔ [۲] فقہی حیثیت سے احتیاط یہ ہے کہ دونوں جگہ سجدہ کر لے، پہلا بقصد وجوب اور دوسرا بطور احتیاط اور اگر دونوں میں  
تصدقہ قربت پر اکتفاء کرے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ  
وَرَبَّتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٦﴾

”اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تم زمین کو دیکھو گے بالکل افسردگی کے عالم میں تو جب ہم اُس پر پانی  
برساتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور اُس میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ جس نے اُسے زندگی دی، وہی  
مردوں کا زندہ کرنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

ابتداء یہ سب آیتیں تصور مبداء یعنی خالق کی طرف ذہن کو موڑنے کے مقصد سے تعلق رکھتی تھیں لیکن اس آیت کے آخر میں ذہن کو تصور  
معاد کی طرف موڑ دیا گیا ہے اور ایسے تمثیلات قرآن کی ایک مستحکم دلیل ہیں کہ قرآن اُسی جسمانی تصور قیامت کی طرف رہ نمائی کرتا ہے جو عام  
مسلمانوں کا عقیدہ ہے نہ کہ جسے فلاسفہ یا آج کل کے ترقی پسند ذہنیت والے بتاتے ہیں۔

[۱] السجود عند اصحابنا عند قوله: ان كنتم اياها تعبدون (تبیان)

[۲] عن ابن مسعود والحسن عند قوله: ان كنتم اياها تعبدون وهو اختيار عمر بن العلاء وهو المروئي عن ائمتنا (مجمع البيان)

إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۗ أَفَمَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ خَيْرًا مِمَّنْ

يَأْتِيهِمْ آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ ۗ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣٠﴾

”یقیناً وہ لوگ جو ہماری آیتوں کے بارے میں کج روی سے کام لیتے ہیں ہم پر چھپے ہوئے نہیں ہیں تو کیا جو آگ میں ڈال دیا جائے، وہ بہتر ہے یا جو قیامت کے دن امن و اطمینان کے ساتھ آئے جو تمہیں منظور ہو، وہ کرو، یقیناً وہ جو تم کرو، اُس کو دیکھنے والا ہے۔“

آیتوں کے بارے میں کج روی یہی ہے کہ اُن پر غور نہیں کرتے اور ایمان اختیار نہیں کرتے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۗ وَإِنَّ لَهُمْ لَكِتَابًا عَزِيزًا ﴿٣١﴾ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۗ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٣٢﴾

”یقیناً جن لوگوں نے اس قرآن کا انکار کیا جب کہ وہ اُن کے پاس آیا حالانکہ وہ یقیناً ایک باعزت کتاب ہے، باطل کا اُس کے پاس گزر نہیں، نہ اُس کے سامنے سے اور نہ اُس کے پس پشت سے، اُتارا ہوا ہے اُس ذات کی طرف سے جو حکمت والی ہے، ہر تعریف کی حق دار۔“

”جن لوگوں نے انکار کیا“ اس مبتداء کی خبر محذوف ہے بعض لوگوں نے قرینہ کلام سے اُسے معین کیا ہے کہ ”وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔“ [۱]

اُس کے قبل کی آیت میں کہا گیا تھا، بعض نے کہا ہے کہ ”ہم انہیں سزا دیں گے“ [۲] اور بھی جملے تجویز کیے گئے ہیں جو مقدر مانے جائیں۔ [۳] ممکن ہے کہ ایسے مقامات پر حذف میں حکمت یہی ہو کہ ایسوں کے لئے جو بھی ایسی سزا تجویز کرے گا، وہ درست ہی ہوگی۔

”باطل کا اُس کے پاس گزر نہیں، نہ سامنے سے اور نہ پس پشت سے“ ہمارے نزدیک تو آخر کا فقرہ بس اُسی ”گزر نہیں“ کے مفہوم میں

قوت پیدا کرنے کے لئے ہے یعنی کسی رخ سے اُس میں غلطی کا امکان نہیں۔ بعض لوگوں نے یہ معنی کہے ہیں کہ نہ اُس کے پہلے کوئی کتاب الہی ایسی ہے جو اسے غلط کہے اور نہ اس کے بعد اس کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت آیا ہے۔ [۴] میرے نزدیک یہ مفہوم ذہن نشین نہیں ہے۔

جناب شیخ الطائف نے اس سلسلہ میں پانچ قول درج کیے ہیں جنہیں علامہ طبرسی نے بھی مجمع البیان میں نقل کر دیا ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو

عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٣﴾

[۱] پوشیدہ نیستند (شاہ ولی اللہ)

[۲] انجاماز یہم (جلالین)

[۳] اهلکوا به وفسقوا به ونحوه (تبیان)

[۴] ای لیس قبلہ کتاب یکذبہ ولا بعد (جلالین)

”نہیں کہا جاتا آپ سے گروہی جو کہا جاتا رہا ان پیغمبروں سے جو آپ سے پہلے تھے، بلاشبہ آپ کا پروردگار بخشنے والا بھی ہے اور دردناک سزا والا بھی۔“

یعنی جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور یہ چاہنا بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ معیار استحقاق کے مطابق ہوتا ہے۔ [۱]  
یہ بھی پیغمبر خدا ﷺ کو تسلی دہانی ہے کہ جو دل شکن باتیں آپ سے کہی جاتی ہیں، یہ قبل والے انبیاء سے برابر کہی جاتی رہی ہیں۔ [۲]

**وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَبِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ؕ أَعْجَبِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ۗ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءً ۗ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۗ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۳۷﴾**

”اور اگر ہم اُسے عربی کے علاوہ کسی زبان کا قرآن بنا کر اتار دیتے تو وہ کہتے کہ اُس کی آیتیں صاف صاف کیوں نہیں رکھی گئیں، یہ غیر عربی زبان کا کلام اور عرب انسان! کیسے کہ وہ اُن کے لئے جو ایمان لائیں ہدایت ہے اور علاج اور جو ایمان نہیں رکھتے، اُن کے کانوں میں گرانی ہے اور وہ اُن کے لئے اندھا پن ہے یہ وہ ہیں جنہیں پکارا جا رہا ہے بہت دور کی جگہ سے۔“

”بہت دور کی جگہ سے پکارا جا رہا ہے“ کہ کچھ سنائی دیتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ [۳] یہی عالم اُن کا ہے کہ صدا تو کان میں جا رہی ہے مگر بے توجہی کے سبب سے اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جا رہا ہے؟

**وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقَضَىٰ بَيْنَهُمْ ۗ وَاتَّخَذُوا لِفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَرِيْبٌ ﴿۳۸﴾**

”اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تو اُس میں اختلاف کیا گیا اور اگر نہ ہوتی اللہ کی طرف کی بات جو پہلے کہی جا چکی تھی تو اُن کے درمیان مختتم فیصلہ ہو گیا ہوتا اور بلاشبہ وہ اُس میں شدید قسم کے شک و شبہ میں گرفتار ہیں۔“

”اگر نہ ہوتی اللہ کی طرف کی بات جو کہی جا چکی ہے“ یہ جملہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہے اور ہر جگہ اُس میں دو تصور ہیں: ایک یہ کہ طے شدہ بات یہ ہے کہ فیصلہ قیامت میں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ طے ہو چکا ہے کہ رسول کی بدولت اس امت پر نختم عذاب نہیں آئے گا یہاں بھی کوئی وہ کہتا ہے۔ [۴] اور کوئی یہ [۵] یہاں موقع کے لحاظ سے ہم یہ محاکمہ کر سکتے ہیں کہ اگر اس جملے کو موسیٰ ہی کی قوم سے متعلق رکھا جائے تو پہلے تصور

[۱] الذومغفرة للمؤمنين وذوعقاب اليمللكافرين (جلالین)

[۲] عزى سبحانه نبيه ﷺ على تكذيبهم (مجمع البيان)

[۳] يسمع الصرت ولا يفهم المعنى (تبيان)

[۴] لا يعاجلهم بالعقوبة وانه يؤخرهم الى يوم القيمة (تبيان)

[۵] فى تاخير العذاب عن قومك وانه لا يعذبهم وانت فيهم (مجمع البيان)

کو معین سمجھنا چاہیے اور اگر بعد کا جملہ اس امت سے متعلق قرار دیا جائے تو دوسرے تصور کو قوت حاصل ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ﴿٣٧﴾

”جو نیک کام کرے، وہ اپنے لئے کرے گا اور جو برائی کرے، وہ اپنے ہی نقصان کا باعث ہوگا اور تمہارا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔“

## خالق کے ثبوت عدل کی دلیل

بکثرت آیات و احادیث کی طرح یہ بھی ثبوت عدل کی دلیل ہے۔

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۖ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٍ مِنْ أَكْثَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ

أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۖ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِيَ ۖ قَالُوا أَدْنَبُكَ ۗ مَا

مِنَّا مِنْ شَهِيدٍ ﴿٣٨﴾ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ وَظَنَّوْا مَا لَهُمْ مِنْ

فَحْيٍ ﴿٣٨﴾

”اُسی کی طرف ہر پھر کے پہنچنا ہے قیامت کا علم، اور کوئی پھل اپنے غلافوں سے نمایاں نہیں ہوتے اور کسی ماں کے پیٹ میں کوئی بچہ نہیں ہے اور نہ وہ اُس کے یہاں پیدا ہوتا ہے مگر اُسی (اللہ کے) علم کے ساتھ اور جس دن وہ اُنہیں آواز دے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟ وہ کہیں گے ہم تجھے بتا چکے کہ ہم میں سے اس کی گواہی دینے والا کوئی نہیں اور غائب ہو گئے اُن سے وہ جنہیں وہ پہلے پکارا کرتے تھے اور وہ سمجھے کہ اُن کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔“

”میرے شریک“ یعنی وہ جنہیں تم میرا شریک قرار دیتے تھے اور یہ قرآنی نظیر بڑی قوی سند ہے، اس کی اکثر غیر کے مزعومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ لفظ صرف کر دیا جاتا ہے جو دوسروں کے معتقدات کے مطابق ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان مثلاً غلام محمد قادیانی کو اپنے انداز تحریر کی بنا پر ”نبی قادیان“ یا کسی جمہوری نظام والے خلیفہ مسلمین کو ”خلیفہ وقت“ کہہ دے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا نہیں جاسکتا کہ وہ خود ان الفاظ کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے۔

”وہ آواز دے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟“ اب خواہ وہ قضا میں صدا پیدا کر کے ندادے جس کے یہی الفاظ ہوں یا جیسا کہ جناب شیخ الطائفہ کا تصور ہے، اس کی طرف کا کوئی منادی صدا دے اور وہ کہے کہاں ہیں اللہ کے شریک؟ [۱] لیکن چونکہ وہ صدا اُس کے حکم سے تھی تو نقل بالمعنی کے طور پر اب اُس نے قرآن میں اُسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ”میرے شریک کہاں ہیں؟“

[۱] ای ویوم ینادیہم مناد ابن شرکاء اللہ الذین کنتم تعبدونہم من دون اللہ وتوجہون العبادۃ الیہم (تبیان)

لَا يَسْمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَوْسُقَنْوُظٌ ۖ وَلَئِنْ  
 آذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرْبٍ آءٍ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هَذَا لِي ۖ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ  
 قَائِمَةً ۖ وَلَئِنْ رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ لَلْحُسْنَىٰ ۖ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا  
 بِمَا عَمِلُوا ۖ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝۵۰ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَىٰ الْإِنْسَانِ  
 أَعْرَضَ وَتَأْبَىٰ جَانِبَهُ ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ۝۵۱

”آدمی بھلائی کی دعا کرنے سے تھکتا نہیں اور اگر برائی پہنچ جاتی ہے تو ایک دم نراسا، بے امید ہو جاتا ہے اور اگر ہم  
 اُسے اپنی طرف سے کسی مہربانی کا مزہ چکھاتے ہیں، اُس سختی کے بعد جو اُسے درپیش ہوئی تھی تو وہ کہے گا کہ یہ میرا  
 حق ہے اور میں نہیں سمجھتا قیامت کو کہ وہ برپا ہونے والی ہے اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف پلٹا یا گیا تو یقیناً  
 میرے لئے اُس کے یہاں بھی بھلائی ہی ہوگی تو ہم بتائیں گے اُنہیں جو کافر رہے کہ اُنہوں نے کیا کیا تھا اور  
 اُنہیں چکھائیں گے سخت سزا کا کچھ مزہ اور جب ہم آدمی کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور پہلو تہی  
 سے کام لیتا ہے اور جب اُسے برائی درپیش ہوتی ہے تو لمبی چوڑی دعا کرتا ہے۔“

یہ سب باتیں اُسی وقت کے آدمیوں کا تذکرہ ماضی نہیں ہیں بلکہ یہ اوصاف کے چوکھے ہر دور کے لئے قرآن نے پیش کر دیے ہیں کہ ہر  
 زمانے میں اپنے کردار کے محاسبہ کی جنہیں توفیق ہو وہ اپنے کردار کی تصویر اس چوکھے میں لگا کر دیکھ لیں کہ وہ اُس کے ٹھیک مطابق نہیں ہوتی اور  
 ایسے موقعوں کے پیش کرنے کے موقع پر قرآن نے کوئی جماعتی لقب سرنامہ اوصاف نہیں بنایا ہے بلکہ انسان کا لفظ کہہ کر بین الاقوامیت پیدا کی  
 ہے کہ اس کے حکیمانہ انتباہ سے ہر مذہب و ملت کا آدمی فائدہ اٹھا سکے۔

آخری جملے میں الفاظ قرآنی ذودعاء عریض کا لفظی ترجمہ تو ”چوڑی دعا والا“ ہے مگر اردو محاورے کے لحاظ سے ہماری زبان میں  
 دو الفاظ ساتھ ”لمبی چوڑی“ بولے جاتے ہیں تو وہ مفہوم ادا ہوتا ہے اور یہ علمی حقیقت کے بھی مطابق ہے یعنی لمبان کے لئے چوڑان ضروری نہیں ہے  
 مگر چوڑان کے لئے عقلی طور پر لمبان لازمی وصف ہے۔ [۱]

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ مَنْ أَضَلُّ مِنْهُنَّ هُوَ فِي

شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝۵۲

”کہئے کہ کیا تم نے غور کیا ہے اگر یہ اللہ کی طرف سے ہوا، پھر تم نے اس کا انکار کیا تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو  
 ایسی شدید مخالفت میں مبتلا ہو۔“

[۱] لان العرض يدل على الطول ولا يدل الطول على الارض اذ قد يصح طومل ولا عرض له ولا يصح وعريض لا طول له (تبيان)

صاف یہ کہنے کے بجائے کہ اس صورت میں تم سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا، جو واقعہ ہے اور حقیقت میں یہی کہنا مقصود ہے۔ [۱] یوں بات کو پھرا کر کہنا کہ اُس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو ایسی شدید مخالفت میں مبتلا ہو، ایک انداز رواداری نہیں ہے تو کیا ہے؟

**سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۵۳﴾**

”ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں جو تمام کائنات میں ہیں اور خود اُن میں ہیں یہاں تک کہ اُن کے لئے ثابت ہو جائے کہ وہ بالکل حقیقت ہے، کیا تمہارے پروردگار کے لئے یہ امر کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔“  
خدا کی قدرت کی نشانیوں میں ایک پلے میں ہیں آفاق یعنی تمام کائنات اور دوسرے پلے میں خود نفس انسان۔

بات یہ ہے کہ کائنات کا ادراک کچھ حواس کا محتاج ہے لہذا جس کے حواس معطل ہیں یا انہیں کارفرمائی کا موقع نہ ملا ہو، اُس کے لئے کائنات والا ذریعہ کارآمد نہیں ہوتا لیکن نفس انسان اُس سے کسی بھی ہنگام اور کسی محل پر جدا نہیں اور اُس کے ادراک کے لئے کسی حالت کی ضرورت نہیں اس لئے کوئی شخص ایسا تصور میں نہیں لایا جاسکتا جس کے احاطہ ادراک میں یہ آیت الہی نہ ہو۔

پھر یہ کہ دوسری کائنات خدا کی مخلوق ہونے کی بنا پر اُس کے وجود کا پتہ دیتی ہے اُس طرح جیسے تصویر مصور کا پتہ دیتی ہے اور عمارت معمار کا یعنی مقام علم میں ذہن کو اُس کی طرف منتقل کرتی ہے مگر نفس انسانی کو اس کے ساتھ ساتھ خالق نے عالم امکان میں کچھ اپنے اوصاف کا آئینہ بنا دیا ہے لہذا یہ اللہ کی جانب ذہن کو اُس طرح منتقل کرنا ہے جیسے تصویر اس شخص کے پہچاننے کا ذریعہ ہوتی ہے جس کی تصویر ہے۔ اب جتنا نفس کامل ہو، اتنا اُس کی معرفت کا زیادہ ذریعہ ہے، اس لئے ایسے نفوس میں سے ہر ایک ”وجہ اللہ“ کا مصداق ہو جاتا ہے کہ جس طرح چہرہ کسی شخص کی معرفت کا ذریعہ ہوتا ہے، اُسی طرح اس شخص کے اوصاف کو دیکھ کر معرفت الہی حاصل ہوتی ہے۔

**آلَا إِنَّهُمْ فِي مَرِيَّةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ آ لَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ﴿۵۴﴾**

”معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لوگ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری کے بارے میں شک و شبہ میں گرفتار ہیں، معلوم ہونا چاہیے کہ یقیناً وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔“

تمام اشیاء کو گھیرے ہونا علم و قدرت دونوں لحاظ سے ہے لہذا محیط کا لفظ اسمائے حسنیٰ جن کی تعبیر ”صفات ثبوتیہ“ سے کی جاتی ہے، اُن میں سے دو صفوں پر حاوی ہے اور چونکہ اللہ کی بارگاہ میں حاضری یعنی قیامت کے بارے میں جتنے استبعادات و اعتراضات ہیں، اُن میں سے کچھ اُس کے احاطہ علمی کے پیش نظر رکھنے سے دور ہوتے ہیں اور کچھ احاطہ اختیار یعنی قدرت کو یاد رکھنے سے ختم ہوتے ہیں، اگر اس کے علم کلی اور قدرت عمومی دونوں کو سامنے رکھا جائے تو کسی قسم کا اعتراض و استبعاد درست معلوم نہ ہو لہذا اس ایک لفظ ”قرانی محیط“ میں اُن تمام کی رد مضمحل ہے۔

# سُورَةُ الشُّورَى

مکیہ --- ۵۳ --- آیات

چونکہ اس سورے میں یہ فقرہ ہے ”وَآمُرُهُمْ سُورَىٰ بَيِّنَاتٍ“ جس پر وہاں تبصرہ ہوگا، اس لئے اس سورہ کا یہ نام ہوا۔

سورہ شوریٰ کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ اصول دین میں تمام انبیاء کا متحد ہونا۔
- ۲۔ رسول گوانتہائی روادارانہ اعلان کی ہدایت کہ اللہ ہمارا بھی پروردگار ہے، تمہارا بھی، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں، تمہارے لئے تمہارے اعمال۔
- ۳۔ آیہ موذت جس کا مفہوم ہے ذوی القربیٰ کی محبت کا بطور اجر رسالت مطالبہ۔
- ۴۔ انتقام لینے کے حق کے ساتھ معافی کی تعریف۔
- ۵۔ اقسام کلام الہی۔
- ۶۔ پیغمبر کے علم کا فیض الہی ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

حَمْدٌ ۱ عَسَقَى ۲ كَذَلِكَ يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ ۳ اللّٰهُ الْعَزِيزُ

الْحَكِيمُ ۴ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۵ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۶

”حائیم، عین، سین، قاف۔ اسی طرح وحی بھیجتا ہے آپ کی طرف اور ان کی طرف جو آپ کے پہلے تھے وہ اللہ جو عزت والا ہے، صحیح کام کرنے والا، اُس کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور بلند ہے، بڑا بزرگ مرتبہ۔“

”اسی طرح“ یعنی جیسے اب تک وحی آپ پر آتی رہی ہے، ویسے ہی یہ سورہ آپ پر بذریعہ وحی اتارا جا رہا ہے، اسی طرح باعتبار رفعت بھی

وصف ہو سکتا ہے یعنی جیسی حقائق و معارف سے بھری ہوئی وحی اب تک ہوتی رہی ہے، ویسی ہی یہ سورہی ہے۔ [۱]

[۱] معنی التشبیہ فی کذلک ان بعضہ کبعض فی ائہ حکمة و صواب (تبیان)

تَكَادُ السَّمَوْتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْبَلَيْكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ  
وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ إِلَّا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٥﴾ وَالَّذِينَ  
اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ ۗ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿٦﴾

”نزدیک ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے شکافتہ ہو جائیں اور فرشتے اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ان کے لئے جو دنیا میں ہیں طلب مغفرت کرتے ہیں معلوم ہونا چاہیے۔ کہ یقیناً اللہ وہی بڑا بخشنے والا، مہربان اور جنہوں نے اُس کے سوا سرپرست بنائے ہیں، اللہ ان سب پر نگران ہے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔“

کیوں؟ ایک تصور یہ ہے کہ ”آسمان اور زمین شکافتہ ہو جائیں“ کیوں؟ ایک تصور یہ ہے کہ اس سے عظمت الہی کا اظہار منظور ہے اور دوسرے یہ کفار و مشرکین کی گستاخیوں اور بد اعمالیوں کی شدت کا اظہار ہے کہ یہ ایسی ہیں کہ ان سے آسمان شکافتہ ہو جائیں۔ [۱]

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ  
يَوْمَ الْجُمُعِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ﴿٧﴾

”اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بذریعہ وحی بھیجا ہے عربی زبان کا قرآن تاکہ آپ متنبہ کریں مکہ اور اُس کے ارد گرد والوں کو اور ڈرائیں سب کو اکٹھا کیے جانے کے دن سے جس میں کوئی شک نہیں ایک گروہ بہشت میں جائے گا اور ایک گروہ دوزخ میں۔“

آپ کی ہدایت کا تعلق صرف مکہ والوں سے نہیں بتایا گیا ہے بلکہ ”اردگرد“ کہہ کے وسعت پیدا کر دی گئی ہے، چونکہ جیسا کہ مذہبی روایات بتاتی ہیں اور اُمّ القوی کہہ کے یہاں قرآن نے ارشاد کیا ہے مکہ وسط میں ہے، اس لئے اُس کے اردگرد کا احاطہ تمام معمورہ ارض پر حاوی ہے بلا تفریق سمت و جہت اور بلا اختلاف ملک و اقلیم۔ [۲]

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يَدْخُلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ  
وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَرِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٨﴾

”اور اگر اللہ چاہتا تو وہ سب کو ایک مذہب پر قرار دے دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی سرپرست ہے اور نہ کوئی مددگار۔“

[۱] فی معنای قولان احدہما \_\_\_\_\_ من عظمة الله جلّ جلاله و لثانی \_\_\_\_\_ استعظا ما للکفر بالله والعصیان له (تبیان)

[۲] من سائر الناس وقوی الارض کلها (مجمع البیان) ای هل مکة وسائر الناس (جلالین) آس پاس اُس کے اول عرب، بعد اُس کے ساری دنیا (موضح القرآن)



”اگر اللہ چاہتا“ یعنی جبری طاقت سے مگر ایسا کرنا اُس کے نظام حکمت اور انسانی شرافت کے خلاف ہے۔ [۱] جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے۔

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٩﴾ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۗ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۗ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿١٠﴾ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا ۗ وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا ۗ يَذُرُّكُمْ فِيهِ ۗ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿١١﴾ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٢﴾

”کیا انہوں نے اس کو چھوڑ کر سرپرست اختیار کیے ہیں تو اصل سرپرست اللہ ہی ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور کوئی چیز بھی جس کے بارے میں تم میں اختلاف ہو تو اُس میں فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔ یہ ہے اللہ میرا پروردگار، اُس پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اُس سے لو لگاتا ہوں، آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا، اُس نے تمہارے لئے تمہارے نفوس میں سے بیویاں قرار دیں اور چوپایوں میں بھی جوڑے بنائے ہیں اور وہ سننے والا ہے، دیکھنے والا، اُس کی ملکیت میں کجیاں ہیں آسمانوں اور زمین کی۔ وسعت دیتا ہے رزق میں جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگی بھی کرتا ہے یقیناً وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۗ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۗ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ﴿١٣﴾

”اُس نے مقرر کیا ہے تم لوگوں کے لئے وہی دین جس کی اُس نے ہدایت کی تھی نوحؑ کو اور جو بذریعہ وحی ہم نے بھیجا آپ کی طرف اور جس کی ہم نے ہدایت کی ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کہ دین قائم رکھنا اُس کے متعلق تفرقہ میں

[۱] معناه الاخبار عن قدرته بأنه لو شاء ان يلجئهم الى الايمان ودين الاسلام لكان قادر اعلى ذلك وفعل لكن ذلك يبطل الغرض بالتكليف (تبيان)

نہ پڑنا، مشرکین کو بہت شاق ہے جس کی طرف آپ انہیں دعوت دیتے ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے اپنی بارگاہ میں منتخب کرتا ہے اور جو اُس سے لو لگاتا ہے اُسے وہ اپنی طرف رہبری کرتا ہے۔  
اس سے ظاہر ہے کہ اصول دین میں تمام انبیاء متحد ہیں اور اُن کے پیغام میں اختلاف قطعاً نہیں ہے۔  
”اُس کے متعلق تفرقہ میں نہ پڑنا“ یہ فرقہ بندی کی پیش بندی کے طور پر ممانعت تھی۔ [۱] جس کے روکنے کا خدا اور رسول نے انتظام کیا تھا مگر مسلمانوں نے اُس انتظام کو قبول نہ کیا اور بد نصیبی سے اُس تفرقے میں پڑ گئے جس سے روکے گئے تھے۔

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَيْنَهُمْ ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ  
سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ط وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ  
مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ﴿۱۳﴾

”اور وہ لوگ تفرقہ میں نہیں پڑے مگر صرف اُس کی ضد سے بعد اس کے کہ اُن کے پاس علم آ گیا اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف کی پہلے سے طے شدہ بات مقررہ مدت تک کے لئے نہ ہوتی تو اُن کے درمیان فیصلہ ہو گیا ہوتا اور یقیناً وہ جنہیں اُن کے بعد کتاب عطا ہوئی تھی اس کے بارے میں شک و شبہ میں گرفتار ہیں۔“  
”پہلے سے مقررہ بات“ یعنی یہ کہ اصل سزا کے لئے قیامت کا دن مقرر ہے یا منظور قدرت یہ ہے کہ انہیں کچھ عرصے تک کی مہلت دی جائے۔ [۲]

فَلِذَلِكَ فَادُعْ ؕ وَاسْتَقِمُّ كَمَا أُمِرْتَ ؕ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ط وَقُلْ آمَنْتُ  
بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ ؕ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ط اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ط لَنَأْ  
أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ط لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ط اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ؕ وَالِإِلَهِ  
الْمُصِيرُ ﴿۱۵﴾

”تو بس اسی کے لئے آپ دعوت دیتے رہیے اور مضبوطی سے جمے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم ہے اور اُن کے خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے اور کہئے کہ جو کوئی بھی کتاب، اللہ نے اتاری ہے، میں اُس پر ایمان رکھتا ہوں اور میں مامور ہوں کہ تمہارے درمیان عدالت سے کام لوں۔ اللہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں، کوئی بحث درکار نہیں ہے ہمارے تمہارے

[۱] لا تختلفوا فیہ (مجمع البیان)

[۲] ای لولا وعد الله تعالى واخباره بتبقيتهم الى وقت معلوم (مجمع البیان)

درمیان۔ اللہ ہم سب کو اکٹھا کرے گا اور اُس کی طرف بالآخر جانا ہے۔“  
بعض لوگوں نے خواہ مخواہ اس قرآنی اعلان کے ساتھ یہ نوٹ دیا ہے کہ یہ حکم جہاد کے قبل کی بات تھی۔ [۱] حالانکہ اسلامی حکم جہاد کی جو نوعیت قرآن سے ثابت ہوتی ہے، اُس کے لحاظ سے ان آیات میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ بدلی نہیں ہیں۔

**وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتَجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ  
وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿۱۶﴾**

”اور وہ جو اللہ کے بارے میں بلاوجہ بحث کرتے ہیں بعد اس کے کہ اُسے قبول کیا جا چکا، ان کی دلیل اُن کے پروردگار کے نزدیک غلط ہے اور اُن پر غضب ہے اور اُن پر سخت عذاب ہے۔“  
مِنْ بَعْدِ مَا اسْتَجِيبَ لَهُ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ”بعد اس کے کہ اُسے قبول کیا جا چکا اُس کے دو مطلب کہے گئے ہیں اور دونوں ہو سکتے ہیں۔ پہلے یہ کہ بہت سے حقیقت پسند افراد اس دعوت حق کو قبول کر چکے ہیں۔ [۲] دوسرے یہ کہ اللہ بیخبرگی دعا کو کہ وہ اُن کی نصرت کرے، قبول کر چکا ہے اور اُس کی بنا پر بدروغیرہ میں کامیابی عطا فرمائی ہے۔ [۳]  
علامہ طبری نے تعیناً پہلے ہی معنی کو اختیار کیا ہے۔ [۴] اور بظاہر وہ ذہن سے زیادہ قریب ہیں۔

**اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ ۖ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ  
قَرِيبٌ ﴿۱۷﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ  
مِنْهَا ۗ وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۗ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي  
ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿۱۸﴾ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿۱۹﴾**

”اللہ وہ ہے جس نے اُنار اہے کتاب کو حق کے ساتھ اور ترازو کو اور تمہیں کیا خبر شاید قیامت نزدیک ہی ہو، جلدی کرتے ہیں اُس کے لئے وہ جو اُس پر یقین نہیں رکھتے اور وہ جو ایمان لائے ہیں، ڈرتے ہیں اُس سے اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے، بلاشبہ وہ جو قیامت کے بارے میں تکرار کرتے ہیں، کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں، اللہ اپنے بندوں پر لطف و کرم والا ہے جسے چاہتا ہے روزی عطا کرتا ہے اور وہ طاقتور ہے، زبردست۔“  
اس آیت میں کتاب اور میزان یعنی ترازو کے الفاظ تشریح طلب ہیں کتاب کے جو ظاہری معنی ہیں اور ترازو کا جو ظاہری مفہوم ہے،

[۱] قبل ان ذلك كان قبل الامر بالقتال (تبیان)

[۲] یعنی جمعی در دائرہ اسلام داخل شدند (فتح الرحمن)

[۳] الثانی معناه من بعد ما استجیب للنبی دعاؤہ (تبیان)

[۴] ای من بعد ما دخل الناس فی الاسلام (مجمع البیان)

اُس میں کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی، اس لئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”تراز و فرمایا دین حق کو جس میں بات پوری ہے، نہ کم، نہ زیادہ“ (موخ القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے: المیزان العدل۔ میزان سے مراد عدالت ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں ایسی ہیں جن میں کتاب کے ساتھ حرف عطف ہے اور کسی چیز کو اُس کے ساتھ بتایا گیا ہے جیسے:-

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُبِينٌ ﴿٥﴾ (مائدہ)

تمہارے پاس نور آیا اور کتاب روشن۔

اور یہاں اُس کے ساتھ میزان کو کہا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تشریح و تکمیل دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ اب پیغمبر خدا ﷺ کے دور میں تو کتاب خدا کے ساتھ خود حضرت کی سنت ہے جس میں قول و عمل وغیرہ حضرت کا ہے لیکن آپ کے بعد پیغمبر خدا ﷺ کی متفق علیہ حدیث نے صاف کتاب کے ساتھ اپنے عترت و اہل بیت کو بتا دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم الفاظ قرآنی کی تشریح اس کے مطابق نہ کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ کتاب، دین کی وہ تشریح ہے جو بذریعہ الفاظ ہے اور میزان وہ نمونہ عمل ہے جس کا اتباع دین کے کمال کا معیار ہے۔ ہماری قدیم تفسیر جس کے ساتھ بظاہر حدیث معصومہ کا حوالہ ہے اس تشریح کے مطابق ہے۔ [۱]

**مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۗ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا**

**نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَّصِيبٍ ﴿۲۰﴾**

”جو آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اُس کی کھیتی میں اضافہ کرتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے ہم اس میں سے عطا کرتے ہیں اور آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا“۔

”جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے“ بمقابلہ آخرت یعنی آخرت کا سامان نہ کرنا چاہتا ہے، نہ کرتا ہے، اُس کی دنیا چاہے بن جائے مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا لیکن اگر آخرت کے ساتھ دنیا کا بھی طلب گار ہے تو اُس میں کوئی مضائقہ نہیں اور بہت ممکن ہے کہ اُس کی دنیا بھی قابل رشک طور پر آراستہ ہو اور آخرت بھی قابل غبطہ ہو جیسا کہ امام جعفر صادق فرماتے ہیں:-

المال والبنون حرث الدنيا والعمل الصالح حرث الآخرة وقد يجمعها الله لا قوام (علی بن ابراہیم)

مال اور اولاد دُنیا کی کھیتی ہے اور نیک اعمال آخرت کی کھیتی ہیں اور کچھ لوگوں کے لئے اللہ کبھی دونوں کو یکجا کر دیتا ہے۔

اور خود قرآن نے اہل ایمان کی مثالی تمنا بارگاہ الہی میں دعا کے طور پر یہی بتائی ہے کہ:-

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (سورۃ بقرہ ۲۰۱)

پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی۔

لہذا آخرت کے ساتھ دنیا کی طلب باعث محرومی آخرت کہاں ہو سکتی ہے؟

أَمْ لَهُمْ شُرَكُؤَا شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ

الْفُضْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ط وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣١﴾

”کیا ان کے کچھ (بنائے ہوئے) شریک ایسے ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کا کوئی ایسا طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی ہے اور اگر فیصلے کے متعلق طے شدہ بات نہ ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا گیا ہوتا اور ظالم لوگ، یقیناً ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

”اگر طے شدہ بات نہ ہوتی، علماء مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ فیصلہ ہے کہ جزا و سزا قیامت میں ہوگی۔ [۱] لیکن اگر یہ ہمیشہ طے شدہ بات ہوتی تو امت سابقہ پر عذاب کیوں آیا کرتا بلکہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ وجود پیغمبر مانع عذاب ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ (الانفال - ۳۳)

اللہ ایسا نہیں کہ ان پر عذاب نازل کرے در انحالیکہ آپ ان میں موجود ہیں۔ یہی وہ طے شدہ بات ہے۔ [۲] اور اس کے بعد ہر دور میں کسی ایسے جانشین رسول کا وجود جو جز رسول ہے مانع عذاب ہے اس لئے ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ کلمۃ الفصل سے مراد ہر زمانے کا امام ہے۔ [۳] اور اب ظالم لوگوں سے مراد وہ ہوں گے جو اس کلمے یعنی امام کا انکار کریں۔ [۴]

تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ ط وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ ؕ لَهُمْ مِمَّا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط ذَلِكَ

هُوَ الْفُضْلُ الْكَبِيرُ ﴿٣٢﴾ ذَلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ ط قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى ط وَمَنْ يَقْتَرِفْ

حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حَسَنًا ط إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٣٣﴾

”تم دیکھو گے ظالموں کو خوف زدہ اُس سے جو انہوں نے کیا اور اُس کا خمیازہ انہیں اٹھانا ہے اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، باغبانے بہشت میں ہوں گے ان کے لئے وہ ہوگا جو وہ چاہیں ان کے پروردگار کے یہاں، یہی بڑا فضل و کرم ہے۔ یہ وہ ہے جس کی خوشخبری دیتا ہے اللہ اپنے ان بندوں کو جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کرتے رہیں کہہئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا سوا صاحبان قربت کی محبت کے اور جو کوئی نیک

[۱] ای القضاء السابق بأن الجزاء يوم القيامة (جلالین)

[۲] ای لولا ان الله حکم بتأخیر العذاب لهذه الامه الى الآخرة (مجمع البيان)

[۳] الکلمة الامام والدلیل علی ذلك قوله: وجعلها کلمة بافیة فی عقبه لعلهم یرجعون (علی بن ابراہیم)

[۴] یعنی الذین ظلموا هذه الکلمة (علی بن ابراہیم)

کام کرے گا ہم اسے اُس میں بھلائی اور زیادہ عطا کریں گے، یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا ہے، قدر دان۔“

یہ موجودہ نظم قرآنی میں بالکل نمایاں بات ہے کہ جتنی آیتیں اہل بیت کرامؑ سے خصوصیت رکھنے والی تفسیر اور حدیث کے لحاظ سے متفق علیہ طور پر بطور مستقل آیت کے شہرت رکھتی ہیں جیسے آیہ اکمال دین اور تمام نعمت اور آیہ تطہیر، وہ سب بحالت موجودہ دوسری طویل آیتوں کا جزء بنی ہوئی ہیں اور ان کا مستقل آیت ہونا محسوس نہیں ہوتا چنانچہ آیہ مودت (قُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى) مذکورہ بالا دوسری آیت کے اندر اس طرح گھلا ملا کر درج ہوئی ہے کہ اُس کی منفرد حیثیت کوئی محسوس نہیں ہوتی، بہر حال شان نزول وغیرہ کی روایات کے لحاظ سے یہ امر شک و شبہ ہے بالاتر ہے کہ وہ ایک مستقل آیت ہے جو بالانفراد نازل ہوئی ہے اور اپنی ایک خاص شان نزول رکھتی ہے۔

اس کے بعد مرحلہ اُس کے معنی کا ہے۔ مفسرین جمہور اُس کا ترجمہ ایسا کرتے ہیں جس سے اُس کا کوئی تعلق اہل بیت رسولؐ سے نہ رہ جائے چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:- باید کہ پیش گیرید دوستی در میان خویشاوندان۔ چاہے کہ مقدم رکھو دوستی عزیزوں کے در میان۔ حاشیہ میں لکھا ہے ”یعنی با من صلہ رحم کنید“ (فتح الرحمن) مطلب یہ ہے کہ مجھ سے جو تمہاری قرابت ہے اُس کا لحاظ کرو اور اُس کے تقاضے کو پورا کرو۔ پہلے ترجمے میں گنجائش تھی کہ مخاطب مسلمان ہوں اور عزیزوں سے مراد خود مسلمانوں کے رشتہ دار ہوں مگر حاشیہ سے پتہ چلا کہ رسولؐ کفار و مشرکین کو اپنی رشتہ داری کا واسطہ دے کر طالب رحم ہیں۔ اُن کے صاحبزادے ترجمہ کرتے ہیں ”مگر دوستی بیچ قرابت کے“ اُس سے تو کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا مگر دوسرے صاحبزادے صاف کر دیتے ہیں کہ ”یعنی میں تمہارا بھائی ہوں ذات کا، مجھ سے بدی نہ کرو۔ (موضح القرآن) جلالین کا پیچیدہ لفظوں میں مطلب کچھ اور معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

اسألکم ان تؤدوا اقربتی ہی قرابتکم ایضاً فان له فی کل بطن من قریش قرابتہ.

میرا سوال تم سے یہ ہے کہ میرے قرابت داروں سے محبت کرو جو تمہارے بھی قرابت دار ہیں اس لئے کہ قریش کے ہر قبیلے میں حضرتؐ کے کچھ عزیز تھے۔ یعنی انہیں یہ محسوس ہوا ہے کہ اس سے رسولؐ کے عزیز مراد ہیں مگر انہوں نے مشرکین کو مخاطب بناتے ہوئے اسے حضرتؐ کے ان عزیزوں سے متعلق قرار دیا ہے جو مشرکین کے حلقے میں رہ گئے تھے۔

### ذوی القربیٰ کی محبت کا بطور اجر رسالت مطالبہ

یاد رکھنا چاہیے کہ نظریہ، مسلک اور اصول کے اختلاف میں قرابت کا واسطہ دینے کے کوئی معنی نہیں، اگر رسول خدا ﷺ کفار و مشرکین کو اپنی قرابت کا واسطہ دے کر یہ خواہش کریں کہ میری مخالفت نہ کرو تو اصولاً انہیں بھی اپنی قرابتوں کا واسطہ دے کر حق ہوگا کہ وہ آپ سے کہیں کہ آپ ہمارے بتوں کی مذمت نہ کیجئے اور جو ہمارے طور طریقے ہیں، اُن کی مخالفت نہ کیجئے اور اگر اُن کے لئے اس طرح کا واسطہ دینا صحیح نہیں ہے تو پیغمبر خدا کی شان کے بالکل خلاف ہوگا کہ آپ انہیں اپنی قرابت کا واسطہ دے کر مخالفت سے روکیں اور (معاذ اللہ) اُن سے رحم کی التجا کریں۔ آپ بطور خود بھی ایسا نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ اللہ آپ کو اس پر مامور فرمائے۔

بہر حال ہمارے یہاں متفق علیہ ہے اور کچھ فرار حوصلہ علمائے اہل سنت بھی اس میں ہم سے متفق ہیں کہ یہاں فی القربیٰ سے مراد

رسول خدا کے وہ ذوی القربیٰ مراد ہیں جنہیں ہم ”آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم“ اور ”اہل بیت رسول“ کہتے ہیں۔ [۱] ایک تصور یہ ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اجر رسالت کچھ مانگا نہیں گیا ہے بلکہ الگ سے جیسے کہا جا رہا ہے کہ ہاں بس قرابت داروں سے محبت رکھو مگر یہ تصور دوسرے آیات قرآن کی روشنی میں درست معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ایک جگہ کہا گیا ہے کہ:

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ: میں نے جو اجر مانگا ہے، وہ تمہارے فائدے کے لئے ہے۔ (سبا۔ ۷۴)

اس سے ظاہر ہے کہ آپ نے کچھ اجر مانگا ہے اور یہ اسی صورت میں درست ہے کہ جب استثناء کو متصل مابین یعنی آیت کا یہ مطلب لیں کہ میں کوئی دوسرا اجر نہیں مانگتا، بس یہ اجر تم سے طلب کرتا ہوں اور اس دوسری آیت میں شان رسول کا تحفظ کیا گیا ہے کہ کسی معاوضے کا طلب کرنا رسول کے خلوص عمل کے خلاف اُس وقت ہوتا ہے جب آپ ایسا اجر مانگتے جس کا فائدہ خود آپ کو حاصل ہو اور جب اجر رسالت ایسا طلب ہوا ہے جو خلق خدا ہی کے فائدے کے لئے ہے تو اس کا طلب کرنا شان رسول کے خلاف نہیں ہے۔ ایک تیسری آیت میں اُس فائدے کی تشریح ہے اجر کی نفی کے ساتھ کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، استثناء کیا گیا ہے یہ کہ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (فرقان۔ ۷۵) یعنی وہ فائدہ خلق خدا کا یہ ہے کہ اُن کے لئے تقرب الہی اور اُس کی مغفرت کا اس طرح ایک ذریعہ ہاتھ آتا ہے یعنی یہ ذوی القربیٰ وہ ہیں جو دنیا کو رسول کے بعد اللہ کی رضا حاصل کرنے کی راہیں بتانے والے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دینی رہنمائی کرنے والے ہیں۔

جب کہ جمہور کے نزدیک یہ پوری آیت ایک ڈال ہے اور بیچ کے جملے یعنی قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ كَوَافِرٍ سے متعلق قرار دیتے ہیں تو آخر کے فقرات کو وہ کیا کریں گے کہ ”جو کوئی نیک کام کرے گا ہم اُس میں بھلائی اور زیادہ عطا کریں گے یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا ہے، قدر دان؟“ جب کہ قرآن مجید نے دوسرے مقامات پر صاف بتلایا ہے کہ مشرکین و کفار کے اعمال جو کارہائے نیک کے قیل سے ہیں، سب رائیگاں ہیں اور اُن کا کوئی اجر نہیں تو پھر یہ فقرات کفار و مشرکین کے ساتھ مخاطب کے ذیل میں کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ لیکن یہ تفسیر جس کی تائید میں خود بیان رسول موجود ہے اور یاد رکھنا چاہیے کہ دوسری تفسیر کوئی ایسی نہیں جس کی موافقت میں خود پیغمبر خدا کی کوئی حدیث وارد ہوئی ہو تو مطلب صاف ہے کہ یہی ذوی القربیٰ کی محبت وہ نیک کام ہے جس کی مناسبت سے کہا جا رہا ہے کہ جو کوئی نیک کام کرے گا ہم اُسے اور زیادہ عطا کریں گے یعنی اُس شخص کے اعمال خیر میں برکت ہوگی اور ثواب میں اضافہ ہوگا جو مومنین سے اللہ کا دوسرے مقامات پر بھی وعدہ ہے اور ہمارے یہاں معصوم کی حدیث اس کی تائید میں موجود ہے۔ [۲]

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۗ فَإِنْ يَشِئِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۗ وَيَمْحِ اللَّهُ

الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۴۳﴾

”کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اللہ پر تہمت لگائی ہے تو اگر اللہ چاہے تو آپ کے دل پر مہر لگا دے اور اللہ باطل کو

[۱] قال علی بن الحسینؑ وسعد بن جبیر وعمر بن شعيب معناه الا ان تردوا قرابتی وهو المروئی عن ابی جعفر وابی عبد الله علیہما السلام وهو الاختیار عندنا وعلیه اصحابنا (تبیان)

[۲] صحیح عن الحسن بن علیؑ انه خطب الناس فقال فی خطبته انا اهل البيت الذین افترض الله مردتهم علی کل مسلم فقال: قل لا اسئلكم علیه اجر الا المودة فی القربی ومن یقترب حسنة نزله فیها حسنا فاقتراف الحسنة مردتنا اهل البيت (مجمع البیان)

مثالتا ہے اور حق کو اپنی باتوں سے حق ثابت کرتا ہے یقیناً وہ دلوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے۔“  
اس آیت میں اتنے مختصر الفاظ میں وہ پوری دلیل اعجاز درج ہے جسے متکلمین طول طول تقریروں سے پیش کیا کرتے ہیں۔  
مطلب یہ ہے کہ خالق کریم کی طرف غلط طور پر منسوب کر کے اگر معجزانہ نشان کی کوئی چیز پیش کی جائے تو وہ قادر مطلق اس کو باطل ثابت کرنے کا سامان ضرور کرے گا اور جب ایسا نہیں ہوا اور اُس کی طرف سے اس کے حق ہونے ہی کے ثبوت پیش ہوتے رہے تو ماننا پڑے گا کہ حقیقاً وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

اس صورت میں کہ جب اسے سابق آیہ مودت سے غیر متعلق قرار دے کر الگ سے دیکھا جائے تو ہمارے نزدیک قوت اس مفہوم کو ہے اگرچہ شیخ الطائف نے مفہوم آیت کے متعلق دوسرے اقوال کے ساتھ اسے بطور ایک قول کے درج کیا ہے۔<sup>[۱]</sup> لیکن الفاظ قرآن سے زیادہ موافقت اور دلیل عقلی کی مطابقت اسی مفہوم کو حاصل ہے لیکن اگر اس محل پر ترتیب کے مطابق تنزیل سمجھیں تو بعید نہیں ہے تو اس کا ربط آیہ مودت سے ہو سکتا ہے اُس کے اس مفہوم کے لحاظ سے جو ہمارے نزدیک قطعی حیثیت رکھتا ہے اور جس کو مناسب تشریح کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے اور جس کی بنا پر آیہ مودت کے مخاطب مشرکین نہیں بلکہ اہل اسلام ہیں تو اب یہ کہنے والے غیر قوم کے افراد نہیں بلکہ مسلمانوں ہی میں کے وہ اشخاص ہوں گے جنہیں ان ذوی القربیٰ سے پرُخاش تھی اور وہ اُن کی محبت کے اجر رسالت ہونے کو قبول نہیں کرتے تھے تو انہوں نے آپس میں یہ بات کہی ہو یا اپنے دلوں میں کہا ہو کہ اے بیچے! انہوں نے اپنے قرابت داروں کو ہمیشہ کے لئے مسلمانوں پر مسلط کر دیا۔ ہمارے اس تصور کو تقویت آیت کے آخری کلمے سے ہوتی ہے کیوں کہ اگر کھلے ہوئے مشرکین ہوتے تو وہ یہ بات اعلانیہ کہتے، اُن سے اس تہ کا تعلق نہیں ہو سکتا کہ ”وہ اُن کے دلوں کے اندر گھلے ملے ہوئے ہیں۔ اب اس سلسلہ میں بعد کی آیتیں بھی کھپ جائیں گی جو ابھی آپ کے سامنے آئیں گے۔

**وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿۵۵﴾ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿۵۶﴾**

”اور وہ ہے جو اپنے بندوں سے توبہ کو قبول کرتا ہے اور معمولی برائیوں سے درگزر کرتا ہے اور جانتا ہے اُسے جو تم کرتے ہو اور قبول کرتا ہے دعا کو اُن کی جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور انہیں اور زیادہ عطا کرتا ہے اپنے فضل و کرم سے اور کافر لوگ، اُن کے لئے سخت عذاب ہے۔“

اگر ہمارے تصور کو جو اس سے پہلے کی آیت میں ہم نے پیش کیا ہے قبول کر لیا جائے تو آیہ مودت سے یہاں تک پورا سلسلہ ایک ڈال ہو جائے گا اور اب یہاں کے ختم سلسلہ پر جو ”کافر لوگ“ کا لفظ ہے تو یہ وہ کھلے ہوئے کافر نہیں بلکہ یہی دلوں کے اندر والے کافر ہوں گے جن کے لئے اس سے پہلے کہا گیا تھا کہ اللہ دلوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے اور اب کہا جا رہا ہے کہ ”جانتا ہے اُسے جو تم کرتے ہو۔“

[۱] قبل المعنی انه قال لنبييه ﷺ لو حدثت نفسك بان تفتري على الله كذبا بالطبع على قلبك و اذهبت الوحي الذي ايتك لاني احو الباطل و حق الحق (تبيان)





دوسری آیت میں ”اے مشرک“۔

وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿٣٦﴾ إِنَّ يَسْأَلُ يُسْكَرِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿٣٧﴾ أَوْ يُوقِنُ يَقْنُنُ بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ ﴿٣٨﴾ وَيَعْلَمَ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِنَا ۗ مَا لَهُمْ مِنْ فَحْيٍ ﴿٣٩﴾

”اور اُس کی نشانیوں میں سے دریاؤں میں وہ بڑی بڑی کشتیاں ہیں جو مثل پہاڑوں کے دریا میں نظر آتی ہیں۔ اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے تو وہ اُس کی سطح پر رکی رہ جائیں، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر برداشت کرنے والے کے لئے جو شکر گزار ہو یا چاہے تو وہ اُنہیں تباہ ہی کر دے اُن کے اعمال کے نتیجے میں اور بہت سی باتوں کو معاف کر دے اور اس لئے کہ وہ جو ہماری نشانیوں کے بارے میں تکرار کرتے ہیں، جانیں کہ اُن کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔“

ان آیات کے دوران میں پھر معافی کا بیان ہے مگر یہاں معافی کو خاص مومنین سے متعلق نہیں کیا جاتا بلکہ اُس کا مطلب یہی لیا جاتا ہے کہ ہنگامی سزا کہ بد اعمالی کے نتیجے میں غرق کر دے، کبھی دے دی جاتی ہے مگر اکثر یہ وقتی سزا نہیں دی جاتی۔<sup>[۱]</sup> یہ مزید شاہد ہے اس کا کہ قبل کی آیتوں میں بھی خطاب خاص مومنین سے نہیں ہے اور معافی سے مراد یہی ہے کہ دنیا میں اُس کی سزا نہیں دی جاتی۔

فَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٣٩﴾ وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿٤٠﴾ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۗ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ۗ وَهَمًّا رِزْقَهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿٤١﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ ﴿٤٢﴾ وَجَزَاؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۗ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٤٣﴾

”اور جو چیز تمہیں ملتی ہے، وہ اس زندگی دنیا کا سرمایہ ہے اور جو کچھ اللہ کے یہاں ہے، وہ اچھا اور زیادہ پائیدار ہے اُن کے لئے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، اور وہ جو بڑے گناہوں اور شرمناک

[۱] يعفوا عن كثير اخبار منه تعالى انه يعفو عن معاصيهم لا يعاجلهم الله بعقوبتها (تبيان)

کاموں سے پرہیز رکھتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جنہوں نے اپنے پروردگار کے فرمان کو مانا ہے اور نماز کے پابند رہے ہیں اور ان کے معاملات ان کے درمیان باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں اور جو اُس میں سے ہم نے انہیں دیا ہے، خیرات کرتے ہیں اور وہ جو بدلا لیتے ہیں جب ان پر ناحق کوئی زیادتی کرے اور برائی کا بدلا تو ویسی ہی برائی ہے مگر جو معاف کر دے اور تعلقات اچھے رکھے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے بلاشبہ وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔“

علمائے جمہور نظام حکومت میں شوریٰ کی بنیاد اس آیت پر قائم کرتے ہیں حالانکہ اس کے پہلے فرمان الہی کو تسلیم کرنے کا ذکر موجود ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ شوریٰ ایسے ہی دینی امور میں ہے جہاں فرمان الہی کوئی موجود نہیں ہے جیسا کہ دوسری جگہ اس کے پہلے یہ ارشاد الہی آچکا ہے کہ:-

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

کسی مسلمان مرد اور مسلمان عورت کے لئے یہ نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو انہیں اپنے معاملے میں اختیار ہو۔ (احزاب - ۳۶) جب فیصلہ خالق کے سامنے اختیار کی مطلق نئی ہوگئی تو نہ ایک ایک فرد کو اختیار ہے نہ مجموع امت کو لہذا نص کے مقابلے میں نہ اجماع درست ہے اور نہ شوریٰ۔ اس جملے کے بعد کہ ”بدلا لیتے ہیں جب ان پر ناحق کوئی ظلم و تعدی کرے“ فوراً بلافاصلہ یہ کہنا کہ ”برائی کا بدلا تو ویسی ہی برائی ہے مگر جو معاف کر دے اور تعلقات خوشگوار بنا لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے، صاف بتا رہا ہے کہ پہلے جو بدلا لینے کا ذکر ہے، وہ بطور پابندی نہیں ہے بلکہ اجازت کے طور پر ہے کہ اگر چاہے تو بدلا لے۔“ مگر معاف کر دے تو بہت اچھا ہے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ ﴿٣١﴾ اِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى  
الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ  
أَلِيمٌ ﴿٣٢﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٣٣﴾

”اور جو اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلا لے تو یہ لوگ وہ ہیں جن پر کوئی الزام نہیں ہے، الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں ستم ڈھاتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے، بے شک وہ جو صبر سے کام لے اور بخش دے تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔“

ان آیات میں مجموعی طور پر اسلامی دستور کے اسی نقطہ اعتدال کا بتا دیا گیا ہے کہ قصاص کا قانون ضرور ہے مگر اس قانون میں قصاص کا حق دیا گیا ہے۔ اُسے فرض قرار نہیں دیا گیا ہے، قصاص نہ لیتے ہوئے معاف کر دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ اللہ کے نزدیک خاص فضیلت کا درجہ رکھتا ہے جس کی مدح یہاں یوں کی گئی ہے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے تو جو اس طرح کرے وہ جیسے اللہ کی طرف سے ”شاباشی“ کا مستحق ہے جس کا لازمی

﴿٣١﴾ ہی الرخصة التي صاحبها فيها بالخيار ان شاء فعل وان شاء ترك (علي بن ابراهيم)

نتیجہ یہ ہے کہ اُسے اس معاف کرنے کا بڑا اجر ملے گا۔ [۱] مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ کے دوسرے معنی جنہیں علامہ طبرسیؒ نے اختیار کیا ہے، یہ ہیں کہ یہ دائمی اللہ کا حکم ہے جو قابل منسوخی نہیں۔ [۲] میرے نزدیک پہلے مفہوم کو زیادہ قوت ہے، اس لئے میں نے اُس کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَبِيٍّ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَتَرَى الظَّالِمِينَ لَبَّارًا أَوَّالِ الْعَذَابِ  
يَقُولُونَ هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ مِنْ سَبِيلِ ۗ وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَشِيعِينَ مِنَ  
الدُّلِّ يَنْظُرُونَ مِنْ طَرْفِ خَفِيٍّ ۗ وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْخٰسِرِينَ الَّذِينَ  
خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ أَلَا إِنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُّقِيمٍ ۝۳۵  
وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ أَوْلِيَاءَ يَنْصُرُوهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ  
مِنْ سَبِيلٍ ۝۳۶

”اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے تو اُس کا اُس کے بعد کوئی مددگار نہیں اور ظالموں کو دیکھو گے جب انہوں نے عذاب کو دیکھا ہوگا تو وہ کہیں گے کہ کیا واپسی کا بھی کوئی راستہ ہے؟ اور تم انہیں دیکھو گے کہ وہ دوزخ کی طرف لائے جائیں گے سر جھکائے ہوئے، ذلت کے عالم میں سنبھلیوں سے دیکھتے ہوں گے اور کہیں گے وہ جو ایمان لائے کہ گھانا اٹھانے والے بڑے وہ ہیں جو خود اپنے کو اور اپنے عزیز واقارب کو قیامت میں گھانا پہنچائیں معلوم ہونا چاہیے کہ ظالم لوگ برقرار رہنے والے عذاب میں ہیں اور اُن کے کوئی دوست نہیں ہیں جو اُن کی مدد کریں اللہ کو چھوڑ کر اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے، اُس کے لئے کوئی راستہ نہیں۔“

اِسْتَجِيبُوا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللّٰهِ ۗ مَا لَكُمْ مِّنْ  
مَّلٰجِئٍ يَّوْمَئِذٍ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝۳۷

”اپنے پروردگار کے فرمان کو قبول کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جسے اللہ کی طرف سے پھر پلٹنا نہیں ہے، تمہارے لئے اُس دن کوئی گنجائش ہوگی اور نہ تمہارے لئے انکار کی کوئی گنجائش ہوگی۔“

نکیر کا ترجمہ ”انکار کی گنجائش“ ایک تشریح کے مطابق ہے۔ [۳] اس کے ساتھ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اس نوعیت عذاب سے انکار

[۱] عزم الامور هو الاخذ باعلاها في باب نيل الثواب والاجرو احتمال الشدائد على النفس وايفار رضا الله على ما هو مباح (تبيان)

[۲] ای من ثابت الامور التي امر الله تعالى بها فلم ينسخ (مجمع البيان)

[۳] انكار لذنوبكم (جلالين) نہیں واسطے تمہارے انکار (شاہ رفیع الدین)

کر کے اُس میں تبدیلی کرنا ممکن نہ ہوگا۔ [۱] دوسری تشریح یہ ہے کہ انکار کے معنی ”اعتراض“ کے ہیں، اس طرح مطلب یہ ہوگا کہ کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس پر اعتراض کر سکے۔ [۲]

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنَّ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلْغُ ۗ وَإِنَّا إِذَا  
أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۗ وَإِن تُصِيبْهُمْ سَيْئَةٌ سَيِّئَةٌ مِنَّا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ  
فَإِنَّ الْإِنْسَانَ كَفُورٌ ﴿۳۸﴾

”تو وہ اگر روگردانی کریں تو ہم نے آپ کو ان کا نگہبان مقرر کر کے نہیں بھیجا ہے، آپ کے ذمے نہیں ہے سوا تبلیغ کر دینے کے اور ہم جب آدمی کو اپنی طرف سے کچھ رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اُس پر خوش ہو جاتا ہے اور اگر انہیں کوئی برائی پہنچتی ہے اُن اعمال کی بدولت جو انہوں نے کیے ہیں تو بلاشبہ یہ آدمی ناشکرا ثابت ہوتا ہے۔“

لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۗ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِنَّا لَهُ  
لَمِنَ يَشَاءُ الدُّكُورِ ﴿۳۹﴾ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَا لَهُ  
لَمِنَ عَلَيْهِمُ قَدِيرٌ ﴿۴۰﴾

”اللہ کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے یا لڑکے اور لڑکیاں دونوں قسمیں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے یقیناً وہ بڑا جاننے والا ہے ہر طرح کی قدرت رکھنے والا۔“

”جاننے والا ہے“ مصالِح کا اور ”قدرت رکھنے والا ہے“ اُن کے تقاضوں کے مطابق عمل پر۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا  
فَيُوحِي بآذَنِهِ مَا يَشَاءُ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۴۱﴾

”اور کسی آدمی کے لئے یہ بات حاصل نہیں کہ اللہ اُس سے بات کرے مگر بطور وحی یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیجے تو وہ اُس کے حکم سے جو چاہے وحی پہنچائے، یقیناً وہ بلندی والا ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

آخر میں فرشتوں کو بھیج کر وحی کا تذکرہ کرنا اس کا ثبوت ہے کہ پہلے جو وحی کا تذکرہ آیا ہے، وہ وحی بغیر توسط ملک ہے جیسی وحی معراج میں ہمارے رسول پر ہوئی جس کا صرف اجمالی تذکرہ قرآن میں یوں ہے کہ:-

[۱] ای انکار و تغیر للعذاب (مجمع البیان)

[۲] اقبل معناه من نصير ينكر ما يجل بكم (تبيان)

فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۖ (سورۃ نجم)

اُس نے اپنے بندہ خاص پر وحی کر دی جو اُسے کرنا تھی۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر کرنا کہ ہر وحی خداوندی جو رسول پر ہوئی، وہ قرآن میں نہیں ہے، اس وحی کی ترجمانی اکثر بیان پیغمبر سے ہوئی ہے جو جز سنت ہے اور جہاں حالات خود رسول کے لئے اظہار کے متقاضی نہ تھے، وہ آپ نے اپنے ورثہ داران علم کے سپرد کر دیے جو ائمہ معصومین ہیں اور وہ آپ کے بعد وقتاً فوقتاً اُس کا اظہار فرماتے رہے اور اس طرح سنت رسول اور ان رہ نمایان دین کے اقوال کو احکام شرعیہ میں ماخذ بنائے بغیر صرف قرآن کو کافی سمجھ لینا کسی طرح درست نہیں ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۗ مَا كُنْتَ تَدْرِىۤىۡ مَا الْكِتٰبُ وَلَا  
الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا اَتْمٰهِدِىۡۤىۡۤ بِهٖۤ مِّنْ نَّشَاۤءٍ مِّنْ عِبَادِنَا ۗ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىۡۤىۡ  
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ط  
اَلَا اِلٰى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرِ ﴿۵۵﴾

”اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بھی بصورت وحی اپنے فرمان کی ایک روح، آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کس کا نام ہے مگر ہم نے اسے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم ہدایت کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے اور بلاشبہ آپ رہ نمائی کرتے ہیں سیدھے راستے کی طرف، اللہ کے راستے کی طرف جس کی مخصوص ملکیت ہے سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے تمام معاملات کو۔“

### حضرت پیغمبر خدا کے حکم کا بفیض الہی ہونا

ذات ممکن کا کوئی کمال اپنا نہیں ہے بلکہ عطیہ پروردگار ہے، اب صلاحیت ظرف کو دیکھتے ہوئے اس کی عطا ہے کہ کس کو کتنا دیتا ہے اور اُس کا زیادہ عطا کرنا خود وسعت ظرف کی دلیل ہے۔ پیغمبر خدا ﷺ کو اُس نے وہ علم عطا فرمایا جو اولین و آخرین میں کسی کو نہیں دیا، یہ اُس کا عطا فرمانا، اُن کے کمال صفائے جوہر کا ثبوت ہے جس کے لئے نور کے سوا لغت میں کوئی دوسرا لفظ موزوں نہیں ہے مگر اُس نور پر جو بارش کرم پروردگار ہو اُس کا مرکز بہر حال فیاض مطلق ہے ورنہ باعتبار ذات جب وجود اپنا نہیں تو کون کمال اپنا ہو سکتا ہے۔

بس یہی وہ ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ”آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کس کا نام ہے؟“ لیکن اس سے باعتبار ظرف زمان کسی دور حیات کو مقرر کر کے یہ سمجھنا کہ چالیس برس کی عمر کے پہلے معاذ اللہ آپ کتاب الہی اور ایمان سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے، ناروا جسارت ہی نہیں بلکہ حقیقت واقعہ کے خلاف ہے۔ جب کہ سابق دور کا ایک رسول گہوارے میں کہہ رہا ہے کہ اَتَدْرِىۡۤىۡ الْكِتٰبُ وَجَعَلٰنِیۡۤىۡ نَبِیًّا ۙ (سورۃ مریم) تو خاتم الانبیاء کے بارے میں یہ تصور کہاں صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ نزول قرآن سے پہلے کتاب الہی اور ایمان کسی بات سے واقف نہ تھے لیکن وہ کتاب لفظی نہیں ہے بلکہ وہ آئین حیات ہے جس کا علم نبی کو ثبوت کے ساتھ بدو فطرت سے ہوتا ہے۔

# سُورَةُ الزُّخْرُفِ

مکیہ --- ۸۹ --- آیات

اثنائے سورہ میں ایک جگہ زُخْرُف کا لفظ آیا ہے، اُس پر اس سورے کا نام ہو گیا۔

## سورہ زخرف کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ وہ لوح محفوظ میں علی حکیم ہے جو ایک خاص شخصیت کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔
- ۲۔ نعم الہیہ کے ذیل میں اُن حیوانات کے ذکر میں جو انسان کی سواری کے کام میں آتے ہیں، تعلیم کہ جب اُن کی پشت پر سوار ہو تو یوں کہو۔
- ۳۔ بیٹی کی پیدائش پر اہل جاہلیت کی کیفیت اور پھر خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کرنے کی حماقت۔
- ۴۔ ملائکہ کے صنف اناث میں ہونے کی رد۔
- ۵۔ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں اُن کے پیغام توحید کا ”کلمہ باقیہ“ کی صورت میں محفوظ ہونا اور برقرار رہنا۔
- ۶۔ مخالفین پیغمبر اسلام کا یہ کہنا کہ قرآن کسی بڑے آدمیوں پر کیوں نہیں اُترا اور اُس کا جواب۔
- ۷۔ اموال دنیا کی پستی و حقارت۔
- ۸۔ فرعون کا اپنی سلطنت اور دولت کو معیار حقانیت قرار دینا، اور اُس کی غلطی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

حَمْدٌ ۱۰ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۱۱ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۱۲ وَاِنَّهُۥ فِي

اُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيَّ حَكِيْمٌ ۱۳

”ح۔ میم۔ قسم اس روشن کتاب کی ہم نے اس کو عربی زبان والا قرآن بنایا ہے، شاید کہ تم عقل سے کام لو، بلاشبہ وہ اصل نوشتے میں ہمارے یہاں بلند مرتبہ ہے، حکمت والا“۔

## حضرت علیؑ کا اسمِ بامسمیٰ ہونا

سیاق کلام کی بنا پر ترتیب آیات کو دیکھتے ہوئے مفسرین جمہور ہی نہیں بلکہ ہمارے بھی کچھ مفسرین نے اس ضمیر کو کہ وہ علی حکیمہ ”بلند مرتبے والا ہے، حکمت والا“ قرآن ہی کی طرف راجع کیا ہے اور اُمّ الکتاب ”اصل نوشتے“ سے مراد لوح محفوظ قرار دی ہے۔ [۱] حالانکہ انہیں یہ اقرار ہے کہ یہ ایک مجازی تصرف کے ساتھ ہے کیوں کہ یہ دونوں وصف علی اور حکیمہ عموماً کسی ذی حیات ہستی کے ہوتے ہیں۔ [۲] ایک بات یہ ہے کہ قرآن کی توصیف میں خود قرآن کی قسم کے کیا معنی؟ مگر اس کی شاہ ولی اللہ نے ایک لطیف انداز میں یوں تو جیبہ کی ہے۔

قسم خوردن بچیزی برای اثبات ہماں چیزی یا لازم آن چیز کنائست بآنکہ آن چیز خود دلیل خود است چنانکہ گویند قسم بلب میگون و زلف شبگون تو کہ تو معشوق دل آرامی (فتح الرحمن)

کسی چیز کی قسم خود اس چیز یا اس کے کسی لازمے کے ثبوت کے لئے اشارہ ہوتا ہے اس طرح کہ وہ چیز خود اپنی دلیل ہے جیسے کہا جائے کہ تمہارے سرخ لبوں اور سیاہ زلفوں کی قسم کہ تم دلر با معشوق ہو۔

پھر بھی الفاظ آیت سے بلاشبہ ذہن مڑتا ہے ایک ایسی ذات کی طرف جو اسمِ بامسمیٰ علی ہے اور علم و حکمت کا خزانہ دار ہونے کی وجہ سے حکیم بھی ہے ہماری قدیم تفسیر اسی کے موافق ہے۔ [۳]

## أَفَنَضْرِبُ عَنْكُمْ الذِّكْرَ صَفْحًا أَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِينَ ۝

”تو کیا ہم تمہاری طرف سے بالکل چشم پوشی کر لیں اس سے کہ تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ رہے ہو“

یعنی تم جو چاہے کرو، ہم تمہاری ہدایت سے ہاتھ تو نہیں اٹھا سکتے، ہدایت کا سامان کرتے رہنا اور پیغمبروں کا بھیجنا تو ہمارے لئے ضروری ہے۔ [۴] اور یہ ایک تہدید خطاب بھی ہو سکتا ہے کہ کیا تمہاری زیادتیوں پر ہم چشم پوشی ہی کرتے رہیں اور تمہیں اس کی سزا نہ ملے؟ [۵]

## وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيِّ إِبْرَاهِيمَ إِلَىٰ قَوْمِهِ لِيُنذِرَهُمْ وَأْتِيَهُمْ بَشِيرًا وَمَا يُاتِيهِمْ مِنْ نَبِيِّ إِلَّا كَأَنَّهُمْ يُهَيَّؤْنَ لَهُ حِجَابًا يُبْصِرُونَ ۝

”اور کتنے ہی پیغمبر ہم نے بھیجے پہلے والے لوگوں میں اور نہیں آتا تھا کوئی پیغمبر ان لوگوں کے پاس مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے تو ہم نے ہلاک کر دیا انہیں جو طاقت میں اس سے زیادہ تھے اور پہلے لوگوں کی مثال سامنے گزر رہی چلی ہے۔“

[۱] اٹھ مثبت فی امر الکتاب — لعلی علی کتب قبلہ حکیمہ ذو حکمۃ بالغۃ (جلالین)

[۲] وصف اللہ تعالیٰ القرآن بہا تین الصفین علی سبیل التوسّع لانہما من صفات الحی (مجمع البیان)

[۳] یعنی امیر المؤمنین (علی بن ابراہیم)

[۴] افتتک عنکم الوحی صفحا فلا تامرکم ولا تنہا کم ولا نرسل الیکم رسولا (مجمع البیان)

[۵] المعنی افنضرب ذکر الانتقام منکم والعقوبۃ لکم (تبیان)



اس کا بظاہر گذشتہ آیات سے ربط ہے یعنی ہمیشہ پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا اور طرح طرح کی بدسلوکیاں کی گئیں مگر اس کی وجہ سے ہم نے پیغمبروں کا بھیجنا ترک تھوڑی کر دیا تو اب کیوں کر پیغمبر نہ بھیجتے؟ یا گذشتہ امتوں کو برابر مبتلائے عذاب کرتے رہے تو تم کہاں بچ سکتے ہو؟

وَلَيْنَ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۙ ④ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۙ ⑤ وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ ۖ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا ۗ كَذَلِكَ تُخْرَجُونَ ۙ ⑥ وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ۙ ⑦ لَتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ۙ ⑧ وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ ۙ ⑨

”اور اگر ان سے پوچھیے کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہیں گے کہ انہیں پیدا کیا اُس زبردست نے جو علم والا ہے، جس نے فرار دیا تمہارے لئے زمین کو گہوارہ استراحت اور قرار دیئے تمہارے لئے اُس میں راستے شاید کہ تم منزل تک پہنچ جاؤ اور جس نے اتارا آسمان سے پانی ایک خاص مقدار مقرر میں تو ہم نے اُس سے بے جان زمین میں زندگی پیدا کی اسی طرح تم لوگ بھی باہر نکلو گے اور جس نے تمام قسم کی چیزوں کو پیدا کیا اور تمہارے لئے کشتیوں اور چوپایوں میں سے وہ چیزیں پیدا کیں جن پر تم سوار ہوتے ہوتا کہ تم اُن کی پشت پر بیٹھ کر اپنے پروردگار کے احسان کو یاد کرو جب تم اُس پر بیٹھو اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے قبضے میں کیا اور ہمارے اپنے بس میں نہ تھا اور بلاشبہ ہمیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔“

یہ پوچھنے پر کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا اُن کا جواب تو مجملاً یہ ہوگا کہ اللہ نے..... اس کے بعد اللہ کے جو اوصاف ہیں، وہ سب خالق نے خود ارشاد فرمائے ہیں۔ اس لئے اس ذیل میں ہے کہ ”ہم نے اُس سے بے جان زمین میں زندگی عطا کی..... اسی طرح تم بھی باہر نکلو گے“ یعنی دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے برآمد ہو گے۔ یہ سب وہ تھوڑی کہیں گے، اگر یہ سب وہ کہہ دیں تو مبداء و معاد سب ہی کا اقرار نہ ہو جائے پھر اختلاف ہی کیا رہ جائے؟

وَجَعَلُوا آلَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ۙ ⑩  
 ”اور انہوں نے اُس کا ایک جز اُس کے بندوں میں سے قرار دیا، یقیناً انسان بڑا کھلا ہوا ناشکر ہے۔“

⑩ فلم نصر ب عنہم صفحاً لا استہزأہم برسلہم بل کثرنا الحجیح واعدنا الرسل (مجمع البیان)

”جز“ سے مراد یہاں اولاد ہے۔ [۱۱] اور اس لفظ کے اطلاق میں نفی ولد کی دلیل عقلی کی طرف اشارہ ہے کہ خدا ناطقاً بل تقسیم ہے لہذا اُس کے اولاد جو اُس کے ایک جز کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کر ہو سکتی ہے؟

أَمْ اتَّخَذَ هِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَكُمْ بِالْبَنِينَ ﴿١٦﴾ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ  
لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿١٧﴾ أَوْ مَنْ يَنْدَشُّوا فِي الْحَلِيَّةِ وَهُوَ فِي  
الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴿١٨﴾

”کیا اُس نے اُن چیزوں میں سے جنہیں اُس نے پیدا کیا ہے، اپنے لئے بیٹیاں قرار دی ہیں اور تمہیں بیٹیوں سے نوازا ہے؟ اور اُن میں سے جب کسی کو خوش خبری دی جاتی ہے اُس کی جسے وہ خدا کے لئے وصف قرار دیتا ہے تو اُس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور وہ رنج و غم سے سناٹے میں ہو جاتا ہے، یا وہ جسے گہنے پہنا کر پالا جاتا ہے اور وہ بحث میں قوت گویائی سے خالی ہے؟“

### اللہ کے لئے نفی اولاد کی دلیل

خداوند عالم تو ہر قسم کی اولاد سے بری ہے مگر اس میں مشرکین کی ذہنیت کے اس مضحکہ خیز پہلو کا اظہار ہے کہ وہ جسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، اُسے خاص طور پر اللہ کے لئے وصف قرار دیتے ہیں یعنی ان کے یہاں بیٹیاں ہوں تو بری مگر خدا کے لئے وہ اسے صحیح سمجھتے ہیں کہ فرشتے اُس کی بیٹیاں ہیں۔ دوسری جگہ اس ذہنیت کی دوسرے طریقے سے رد کی گئی ہے یہاں اُس کی رکاکت کے ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ آخری جملہ چونکہ اُن کی غلط ذہنیت کے بیان سے متصل ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اُس میں اُنہی کے تصور یا اُس وقت کے معاشرے کا اظہار ہو، اس لئے اُس کی کوئی لازوال حیثیت نہ مانی جائے۔

وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبْدُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا أَشْهَدُوا خَلْقَهُمْ ط  
سَتَكْتَبُ شَهَادَتَهُمْ وَيُسْأَلُونَ ﴿١٩﴾

”اور انہوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں، عورت قرار دے دیا ہے، کیا وہ اُن کی پیدائش کے وقت موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی قلم بند رہے گی اور اُن سے جواب طلبی ہوگی۔“

### ملائکہ کے صنف اناث میں ہونے کی رد

یہ اُن کی رد کا تیسرا رخ ہے پہلے تو دلیل عقلی کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ اولاد اپنے ماں باپ کا ایک جز ہوتی ہے تو ان کا اللہ کے لئے اولاد کو

[۱۱] اولاد (شاہ ولی اللہ) ایک جز یعنی اولاد (شاہ رفیع الدین) لان الولد جزء الوالد (جلالین) قالت قریش ان الملائكة هم بنات الله (علی بن

تجویز کرنا، اُس کے لئے اجزاء کو ثابت کرنا ہے جو ناممکن ہے یہ دلیل بیٹے اور بیٹی کی تفریق کے بغیر ہر قسم کی اولاد کی نفی کے لئے ہے۔  
دوسرا رخ یہ تھا کہ ان کی یہ عجیب بات ہے کہ اپنے لئے لڑکی کو برا سمجھتے ہیں مگر خدا کے لئے لڑکیاں تجویز کرتے ہیں۔  
اب تیسری بات یہ ہے کہ قطع نظر اللہ کی طرف انتساب کے خود اپنی جگہ فرشتوں کو انہوں نے صنف اناث میں کیوں کر سمجھ لیا ہے؟ یہ بھی ایک طرح کا بہتان اور اس لئے جرم ہے جس کی ان سے جواب طلبی ہوگی۔  
لطف یہ ہے کہ جس طرح کی طبع زاد بات اُن مشرکین کی تھی، اُس کی رد کرتے ہوئے بالکل ویسی ہی بات شاہ عبدالقادر نے لکھ دی ہے  
فرماتے ہیں: ”یہ جو فرمایا کہ بندے رحمان کے ہیں یعنی بیٹیاں نہیں، ورنہ معلوم ہے کہ فرشتے، اگرچہ نہ مرد نہ عورت، پر بولی مردانی بولتے ہیں۔“ (موضح القرآن)

اس پر وہی قرآنی سوال عائد ہوتا ہے کہ کیا وہ فرشتوں کی پیدائش کے وقت موجود تھے؟

**وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ ۗ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا**

**يَجْرُؤُونَ ﴿٥٠﴾**

”اور انہوں نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے، انہیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ بس اٹکل پجوبات کرتے ہیں۔“

ان کا استدلال نظام جبر کے تصور پر مبنی ہے خالق نے اُن کے اس قول کو جہالت کا نتیجہ قرار دیا ہے، یہ چیز کہ انسانی افعال جبر و اختیار کے درمیان کی ایک منزل میں ہیں، اُن کے مبلغ کے حدود سے باہر تھی لیکن یہ تو اس آیت سے ظاہر ہی ہے کہ اُن کے اس تصور کو کہ ہمارا فعل اللہ کی مشیت پر مبنی ہے، خدا نے جہالت قرار دیا ہے مگر علمائے جمہور جنہوں نے افعال انسانی کو مخلوق الہی قرار دیا اور اس طرح وہ واقعی مشیت الہی کو انسانی عمل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، یہاں مشکل میں ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

”یہ تو سچ ہے کہ بے چاہے خدا کے کوئی چیز نہیں، پر اُس کا بہتر ہونا نہیں نکلتا“ (موضح القرآن)

حالانکہ مشرکین کے قول میں بہتر ہونے نہ ہونے کا تو ذکر ہی نہیں تھا، انہوں نے بس یہی کہا کہ بے خدا کے چاہے ہمارا شرک وقوع میں نہیں آسکتا تھا، اسی کو آپ فرما رہے ہیں کہ یہ سچ ہے مگر قرآن نے اُسے بے علمی کا نتیجہ کہا اور اتنا نہیں بلکہ اللہ انہیں اٹکل پجوباتیں کہنے والے کہہ رہا ہے۔ اب کسی کا اُن کی بات کو سچ کہنا قرآن کو معاذ اللہ غلط کہنا نہیں تو کیا ہے؟

**اَمْ اتَيْنَاهُمْ كِتَابًا مِّنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ ﴿٥١﴾ بَلْ قَالُوا اِنَّا وَجَدْنَا**

**اٰبَاءَنَا عَلٰى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰى اٰثَرِهِمْ مُّهْتَدُونَ ﴿٥٢﴾ وَكَذٰلِكَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ**

**قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالُوْا مُتَرَفُوْهُمَّا ۗ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰى اٰثَرِهِمْ**

**مُّقْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ قُلْ اَوْلَوْ جُنَّتْكُمْ بِاٰهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ اٰبَاءَكُمْ ؕ قَالُوْا اِنَّا**

بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كُفِرُونَ ﴿٢٧﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ  
الْمُكذِّبِينَ ﴿٢٨﴾

”کیا ہم نے انہیں اس کے پہلے کوئی کتاب دی تھی کہ وہ اُس سے وابستہ ہوں؟ بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر دیکھا ہے اور ہم اُنہی کے نقش قدم پر چل کے منزل تک پہنچیں گے اور اسی طرح ہم نے آپ کے پہلے کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر دیکھا ہے اور ہم اُنہی کے نقش قدم کی پیروی کرتے رہیں گے، کہئے کہ چاہے میں لایا ہوں تمہارے پاس اُس سے جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے زیادہ صحیح چیز؟ انہوں نے کہا اُس پیغام کو جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو نہیں مانتے تو ہم نے اُن سے بدل لیا تو دیکھو کہ کیسا انجام ہوا اُن جھٹلانے والوں کا۔“  
ان آیات میں آباء و اجداد کی تقلید کو قابل مذمت گردانا گیا ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي  
فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ ﴿٣٠﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٣١﴾ بَلْ مَتَّعْتُ  
هُؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿٣٢﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا  
هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كُفِرُونَ ﴿٣٣﴾

”اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم والوں سے کہا کہ میں اُس سے جس کی تم عبادت کرتے ہو بے تعلق ہوں سوا اُس کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے کہ وہی مجھے منزل مقصد تک پہنچانے والا ہوگا اور اُس کو بنایا اُس نے ایسا کلمہ جو اس کی نسل میں باقی رہنے والا ہے شاید کہ وہ پھر واپس ہوں بلکہ میں نے عیش و آرام اٹھانے کا موقع دیا اُن کے باپ دادا کو یہاں تک کہ اُن کے پاس حق آیا، اور کھلی ہوئی ہدایت کرنے والا پیغمبر تو جب اُن کے پاس حق آیا، انہوں نے کہا یہ جادو ہے اور ہم اُسے نہیں مانتے۔“

### کلمۃ باقیہ منصب امامیت

عام طور پر مفسرین کَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ اُس نے اس کلمہ کو توحید کو اُن کی نسل میں باقی رکھا۔ [۱] لیکن ہمارے یہاں کی ایک حدیث میں کلمۃ باقیہ کے معنی منصب امامت بتائے گئے ہیں جو نسل ابراہیم میں قیامت تک باقی رہے گا۔ [۲]

[۱] ای کلمۃ التوحید (جلالین) ساخت خدا تعالیٰ کلمۃ توحید (شاہ ولی اللہ)

[۲] ہی الامامة الى يوم الدين عن ابي عبد الله (مجمع البيان)

اکابر اہل سنت میں سے بعض مفسرین نے ذریت ابراہیمی کے تحت میں آل محمد علیہم السلام کا نام لیا ہے اور بعض نے صراحت کی ہے ”قیامت تک“ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس سلسلہ کی ایک فرد خاص آخر دور زمانہ تک باقی رہے گی۔

ہماری قدیم تفسیر میں باقی رہنے والے کلمے کا مطلب بتایا گیا ہے سلسلہ معصومین اور ”پھر واپس ہوں“ یعنی اس دنیا سے اٹھنے کے بعد ان کی دوبارہ رجعت ہو۔ [۱] جس کا ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے متواتر احادیث نے پتہ دیا ہے، بے شک اُس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ آیت اس سیاق کلام کا جز نہیں ہے جس کے ماننے میں کوئی خرابی نہیں ہے جب کہ اُس کی متعدد نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

یوں عام مفسرین ”شاید کہ وہ پھر واپس ہوں“ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ کافر جو مکہ والے ہیں، اس توحید کے سبق کو جسے بھول گئے ہیں یاد کر کے دوبارہ اس راستے پر آجائیں۔ [۲]

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴿۳۱﴾ أَهْمُ  
يَقْسِبُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۗ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا  
وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمُ بَعْضًا سَخِرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ  
رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۳۲﴾

”اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا؟ کیا وہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کا بٹوارا کریں گے؟ ہم نے ان کے درمیان اس دنیوی زندگی میں ان کے اسباب معاش تقسیم کر دیئے ہیں اور ایک کو دوسرے سے کئی کئی درجے بلندی دی ہے تاکہ ایک دوسرے کو اپنے قبضے میں لاکر کام لے اور تمہارے پروردگار کی رحمت بہتر ہے اُس مال و دولت سے جو یہ جمع کرتے ہیں۔“

اُن کا کہنا کہ ”یہ قرآن ان دونوں بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اتارا گیا“ اس میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ ”دونوں بستیوں“ سے مراد مکہ اور طائف ہیں کہ یہاں کے لوگ دولت مند تھے۔ [۳] اور یہ محاورہ زمانہ جاہلیت سے چل رہا تھا جو آج تک جاری ہے کہ دولت مندوں کو بڑا آدمی کہا جاتا ہے۔

خالق نے اُن کی بات کا جواب دیا ہے، وہ یہ ہے کہ رسالت و نبوت کا تعلق نفس کی بلندی سے ہے، وہ ہر کس و ناکس کو نہیں مل سکتی اور یہ دنیوی مال و دولت اس دنیا میں ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ مل سکتی ہے، یہ پیش خدارفعت مرتبہ کا ثبوت نہیں ہے۔ نہ اس سے نبوت و رسالت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

[۱] قَالَ السَّيِّ فِي آلِ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَقَالَ الْحَسَنُ عَقِبَهُ وَوَلَدَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (تبيين)

[۲] يَعْنِي لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ إِلَى الْأُمَّةِ إِلَى الدُّنْيَا (علی بن ابراہیم)

[۳] لَعَلَّهُمْ أَهْلُ مَكَّةَ (جلالین) تَأْبُودُ كَمَا كَفَرُوا رَجُوعَ كُنُودِ (شاه ولی اللہ)

[۴] الْقَرِيَتَيْنِ مَكَّةَ وَالطَّائِفَ (علی بن ابراہیم) يَعْنِي يَكِي أَمْتَمُولَانَ مَكَّةَ وَطَائِفَ (فتح الرحمن)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”اللہ نے روزی دنیا کی تو ان کی تجویز پر نہیں بانٹی۔ پیغمبری کیوں کر دے ان کی تجویز پر“ (موضح القرآن) کاش اسی اصول کو یہ حضرات پیغمبر خدا کی جانشینی کے لئے بھی پیش نظر رکھیں۔

وَلَوْلَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لَبَنَ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لِبُيُوتِهِمْ  
سُقْفًا مِّنْ فَضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ﴿٣٣﴾ وَلِبُيُوتِهِمْ آبًا وَسُرُرًا عَلَيْهَا  
يَتَّكِنُونَ ﴿٣٤﴾ وَزُخْرَفًا وَإِنْ كُلُّ ذَلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِنْدَ  
رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٣٥﴾

”اور اگر یہ نتیجہ نہ ہوتا کہ سب ایک ہی طرح کے ہو جائیں تو جو جو اللہ کے منکر ہیں، ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی جن پر وہ چڑھتے اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر وہ گاؤ سے لگے بیٹھے ہوتے اور طرح طرح کی آرائشیں اور یہ سب ہوتا مگر اسی دنیا کا ساز و سامان اور آخرت تمہارے پروردگار کے یہاں پر ہیزگاروں کے لئے ہے۔“

### اموال دنیا کی پستی و حقارت:

یعنی دولت و اسباب دنیا کی بے وقعتی تو اللہ کے نزدیک ایسی ہے کہ وہ کافروں کو زیادہ سے زیادہ یہ چیزیں عطا کر دیتا اور کوئی کافر پریشان حال ہی نظر نہ آتا مگر اس میں ایک اجتماعی مضرت یہ تھی کہ پھر عامہ خلاق جو اتنے بلند نظر نہیں ہوتے کہ حق کو حق ہونے کی بنا پر اختیار کریں اندھا دھند کفر کو اس لئے اختیار کرتے کہ وہ آرام دنیا کا ضامن ہے، پھر تقریباً کوئی ایمان کے راستے پر نہ آتا اس لئے حکمت الہی اس کی متقاضی ہوئی کہ کبھی کبھی کفار بھی پریشان حال نظر آئیں اور اہل ایمان بھی کبھی دولت مند نظر آئیں تاکہ کفر یقینی طور پر دینیوی کامیابی کا ضامن نہ سمجھا جائے اور دنیا کو پھر بھی یہ احساس رہے کہ دولت عطا کرنے والا اصل میں خداوند عالم ہے لہذا یہ نہیں ہے کہ اگر ایمان لے آئیں تو لازماً دولت سے محروم ہو جائیں۔

ہماری قدیم تفسیر میں حدیث معصوم بھی اسی مفہوم کے مطابق ہے۔ [۱] اور صدر اول کے عام مفسرین کے اقوال بھی اسی محور پر گردش کرتے ہیں۔ [۲]

وَمَنْ يَّعِشْ عَنِ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نَقِيضٌ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ﴿٣٦﴾ وَإِنَّهُمْ

[۱] قَالَ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِرَفْعِ اللَّهِ ذَلِكَ لِمَا أَمِنَ أَحَدُ وَكَتَبَهُ جَعَلَ فِي الْمُؤْمِنِينَ اغْنِيَاءَ وَفِي الْكَافِرِينَ فَقَرَاءَ وَجَعَلَ فِي الْكَافِرِينَ اغْنِيَاءَ وَفِي الْمُؤْمِنِينَ فَقَرَاءَ ثُمَّ أَمْنَهُمْ بِالْأَمْرِ وَالنَّهْيِ وَالصَّبْرِ وَالرِّضَاءِ (علی بن ابراہیم)

[۲] ای لولا ان یجتمع الناس علی الکفر فیکونوا کلّهم کفار اعلیٰ دین واحد لیلهم الی الدنیا وحرصهم علیها عن ابن عباس والحسن وقتادة والسدی (مجمع البیان)

لَيَصُدُّوهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿٣٤﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ  
يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينُ ﴿٣٥﴾ وَلَنْ يَنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ  
إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿٣٦﴾

”اور جو خدا کی یاد سے اندھا رہتا ہے، اُس پر ہم ایک شیطان حاوی کر دیتے ہیں تو وہ اُس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور وہ اُنہیں راہِ راست سے ہٹاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح راستے پر ہیں یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آتا ہے تو کہتا ہے کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا کہ کتنا برا ساتھی ہے اور اب تم لوگوں کو آج ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس سے کہ تم سب عذاب میں شریک ہو۔“

آیت سے ظاہر ہے کہ شیطان کا سزاؤں ہونا جو کتنا یہ ہے سب توفیقات سے یہ یاد الہی سے اندھے رہنے کا نتیجہ ہے۔ [۱] اس لئے یہ اندھا رہنا اُس شیطان کے سبب سے نہیں ہے۔ پھر شیطان کے سزاؤں ہونے کے بعد بھی یہ شخص اُس کی فرمان برداری میں مجبور محض نہیں ہے بلکہ جب اپنی قوتِ ارادی سے کام لے تو اُس کی مخالفت کر سکتا ہے، اس لئے وہ سزا کا مستوجب ہے اور عذاب میں وہ شیطان اور یہ آدمی دونوں شریک ہیں۔ شیطان کا شریک عذاب ہونا اس کا ثبوت ہے کہ اُس شیطان کو اللہ نے اس پر مامور نہیں کیا تھا بلکہ سزاؤں کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اُس کی شیطنیت میں سدا رہا نہیں ہو اور اُسے گمراہ کرنے اور اسے گمراہ ہونے دیا۔

پھر اس شرکت سے کسی کا عذاب ہلکا نہیں ہوتا کہ اس کو ایک طرح کا فائدہ سمجھا جائے۔

أَفَأَنْتَ تُسَبِّحُ الضُّمَّةَ أَوْ تَهْدِي الْعُمْىٰ وَمَنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٣٧﴾ فَأَمَّا  
نَدَّهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ ﴿٣٨﴾ أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِمْ  
مُقْتَدِرُونَ ﴿٣٩﴾ فَاسْتَسْبِكْ بِالَّذِي أُوْحِيَ إِلَيْكَ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٤٠﴾  
وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۖ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ ﴿٤١﴾ وَسَأَلَ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ  
مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يُعْبَدُونَ ﴿٤٢﴾

”تو کیا آپ بہروں کو آواز سنائیے گا یا اندھوں کو راستہ دکھائیے گا اور انہیں جو کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں تو اگر آپ کو ہم لے بھی جائیں تو ہم اُن سے بدلا ضرور لیں گے یا آپ ہی کو ہم دکھا دیں گے جو ہم نے اُن کو اطلاع دی ہے اور ہم اُن کے مقابلے میں پوری قوت رکھتے ہیں تو آپ مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہئے اُس سے جو ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے، بلاشبہ آپ سیدھے راستے پر ہیں اور یقیناً یہ اعزاز ہے آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے اور

[۱] قال الحسن وهو خذلان عقوبة له على الاعراض حين علم انه لا يفلح (مجمع البيان)

تم سب سے اُس کے متعلق پوچھا جائے گا اور آپ پوچھیے اُن پیغمبروں سے جنہیں ہم نے آپ کے پہلے بھیجا تھا کیا ہم نے خدائے رحمن کے علاوہ کوئی خدا مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے،  
 «إِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ» کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک نصیحت ہے آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے [۱] اس عام فہم مفہوم کے مطابق ہے جو قرآن مجید میں تذکرہ اور ذکر کر مئی کے ایسے الفاظ کا ہوا کرتا ہے لیکن دوسری تشریح جو بعض مفسرین اہلسنت نے بھی کی ہے [۲] اور جسے جناب شیخ الطائف نے ترجیح دی ہے کہ علامہ طبرسی کا بھی وہ مختار ہے، یہ ہے کہ ذکر کے معنی شرف کے ہیں، مطلب یہ ہے جیسا ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ یہ آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے بڑا اعزاز ہے، آپ کے لئے اعزاز یہ کہ آپ کو ایسی کتاب عطا ہوئی ہے اور آپ کی قوم کے لئے کہ اُس کی ہدایت کا ایسا سامان کیا گیا ہے۔ [۳]

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ  
 الْعَالَمِينَ ﴿۳۱﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِمَّهَا يَضْحَكُونَ ﴿۳۲﴾ وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ  
 آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۳۸﴾ وَقَالُوا  
 يَا أَيُّهُ السَّحَرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۗ إِنَّا لَمُهْتَدُونَ ﴿۳۹﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا  
 عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿۴۰﴾

”اور ہم نے موسیٰ کو بھیجا اپنی طرف کے معجزوں کے ساتھ فرعون اور اس کے یہاں کے عمائدین کی طرف تو انہوں نے کہا کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف کا بھیجا ہوا ہوں تو جب وہ اُن کے پاس آئے ہمارے معجزوں کے ساتھ تو وہ ایک دم ان پر ہنسنے لگے، اور ہم انہیں کوئی معجزہ نہیں دکھاتے تھے مگر یہ کہ وہ اس کے ساتھ والے دوسرے معجزے سے بڑا ہوتا تھا اور ہم نے انہیں اپنے عذاب کی گرفت میں لیا، شاید کہ وہ اپنے راستے سے پلٹیں اور انہوں نے کہا اے جادوگر! اپنے پروردگار سے دعا کر اس ذریعہ سے جو اس نے تجھے دیا ہے۔ ہم اب ہدایت قبول کریں گے تو جب ہم نے اُن سے عذاب کو دور کیا تو ایک دم وہ لوگ اپنے عہد کو توڑ دیتے تھے“  
 ”موسیٰ کو فرعون اور اُس کے یہاں کے عمائدین کی طرف بھیجا“ حالانکہ وہ بھیجے گئے تھے بنی اسرائیل کو نجات دینے اور اُن کی ہدایت کے لئے مگر چونکہ وہ فرعون اور اس کے عمائدین کے زیر اقتدار تھے اور انہیں مغلوب کر کے ہی وہ نجات پاسکتے تھے اس لئے ان کا نام اس تذکرے میں

[۱] پسند است (شأولى الله)

[۲] الشرف لك ولقومك (جلالین)

[۳] الشرف لك بما اعطاك عزوجل من الحكمة ولقومك بما عوضهم له من ادراك الحق به (تبیان)



لیا گیا۔ [۱] ”اُس ذریعہ سے جو اُس نے تجھے دیا ہے، یعنی منتر وغیرہ جن سے تم یہ عجیب چیزیں دکھاتے ہو۔ اُنہی کو پڑھ کر دعا کرو۔ دوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اُس اقرار کے مطابق ہے جو اُس کا تم سے وعدہ ہے کہ اگر ہم ایمان لائیں گے تو وہ عذاب کو ہم سے دور کر دے گا۔ [۲]

وَنَادَى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَذِهِ الْأَمْهَلُ تَجْرِي  
مِنْ تَحْتِي ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿۵۱﴾ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ ۗ وَلَا يَكَادُ  
يُبِيدُنَّ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَا أَلْقَىٰ عَلَيْهِ آسُورَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلِكَةُ مُقْتَرِنِينَ ﴿۵۳﴾  
فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِقِينَ ﴿۵۴﴾ فَلَبَّآ اسْفُونَا  
اُنْتَقِمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِينَ ﴿۵۶﴾

”اور آواز بلند کی فرعون نے اپنی قوم میں، کہا اے میری قوم والو! کیا میرے قبضے میں مصر کی سلطنت نہیں ہے اور یہ نہریں میرے زیر قدم رواں ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ (خود غور کر کے سمجھو کہ) کیا میں اس سے بہتر ہوں جو بے قدر ہے اور تقریباً اپنا مافی الضمیر ظاہر نہیں کر سکتا تو کیوں ایسا نہیں ہوا کہ اس پر سونے کے زیور اترتے یا اس کے ساتھ فرشتے اترتے جو ساتھ ساتھ رہتے، تو اُس نے یوں درغلا یا اپنی قوم کو تو اُنہوں نے اس کا کہنا مانا یقیناً وہ سب بد اعمال لوگ تھے تو جب اُنہوں نے ہمیں صدمہ پہنچایا تو ہم نے اُن سے بدلہ لیا تو اُن سب کو ڈبو دیا اور اُنہیں گزری ہوئی نسل اور نمونہ عبرت بعد والوں کیلئے بنا دیا“

اُس نے جناب موسیٰ کیلئے جو یہ کہا کہ ”تقریباً اپنا مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کر سکتا“ اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ اُن کی زبان میں جو پہلے لکنت تھی، وہی اس کے علم میں تھی، ورنہ بعثت کے بعد اُن کی اس دعا سے کہ: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي ”میری زبان کی گرہ کو کھول دے“، یہ لکنت دور ہو گئی تھی۔ [۳]

وَلَبَّآ ضَرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ﴿۵۷﴾ وَقَالُوا ۗ يَا هَيْتَا خَيْرٌ  
أَمْ هُوَ ۗ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ﴿۵۸﴾ إِنَّ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ  
أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۵۹﴾

”اور جب مریمؑ کے فرزند کی مثال پیش کی گئی تو ایک دم یہ نظر آیا کہ آپ کی قوم والے اس سے روگردانی اختیار کر

[۱] اخَصَّ الْمَلَأُ بِالذِّكْرِ وَانْكَرَ انْكَارًا مِّنْ عَدَاوَةٍ تَبِعَ لِهَوْلَاءِ (تبیان)

[۲] هُوَ أَنَّهُ ضَمِنَ لَنَا إِذَا آمَنَّا بِكَ أَنْ يَكْشِفَ الْعَذَابَ عَنَّا (مجمع البيان)

[۳] أَلَّمَا عِبْرَةً لِّمَنْ كَانَ فِي لِسَانِهِ قَبْلَ (مجمع البيان)

تے ہیں اور انہوں نے کہا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟ انہوں نے یہ بات نہیں کہی ہے آپ سے مگر صرف بیٹھا بیٹھی کے طور پر بلکہ وہ بڑے جھگڑا لوگوں ہیں وہ تو نہیں ہیں سوا ایک بندے کے جسے اپنی نعمت سے ہم نے نوازا اور انہیں ایک مثالی شخصیت بنایا بنی اسرائیل کے لئے،

یہ آیت بھی ایسی ہے کہ پورا مطلب اس کا اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ معتبر طور پر شان نزول سے وہ پس منظر معلوم نہ ہو کہ پیغمبر خدا کی زبان سے حضرت عیسیٰ کی کیا توصیف ایسی ہوئی جس پر مشرکین نے یہ سوال کیا کہ ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟ کچھ لوگوں نے اس کا ربط اس آیت سے قرار دیا ہے جس میں خالق نے فرمایا ہے کہ ان کے معبودان باطل بھی دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے مگر اس کے ساتھ آپ نے جناب عیسیٰ کی مدح و ثناء فرمائی تو اس پر انہوں نے کہا کہ آخر ہمارے معبود کیوں ایسے برے ہو گئے کہ وہ دوزخ میں ڈالے جائیں اور عیسیٰ نہیں جن کی ایک جماعت پرستش کر رہی ہے اس پر یہ آیت اتری۔ بعض دوسرے حضرات نے اس کے علاوہ مختلف طرح نشانہ بازی کی ہے مگر ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جس پر وثوق کے ساتھ ذہن قائم ہو جائے۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُقُونَ ۝۶۰ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ  
فَلَا تَمْتَرْنَ بِهَا وَاتَّبِعُون ۝ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝۶۱ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ ۝  
إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝۶۲

”اور اگر ہم چاہتے تو بجائے تمہارے فرشتے بناتے جو زمین میں متمکن ہوتے اور یقیناً وہ قیامت کی بڑی نشانی ہے تو اس میں کوئی شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے اور تمہیں شیطان منحرف نہ کرے، یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے“

”وہ قیامت کی بڑی نشانی ہے“ موجودہ ترتیب قرآن کے سیاق کے لحاظ سے کچھ قبل حضرت عیسیٰ کا ذکر ہے تو مطلب یہ ہے کہ ان کا زمین پر اترنا آخر زمانہ میں ہوگا جس کے بعد بس قیامت ہوگی ۱۱ اور اس صورت میں ہمارے یہاں کی ایک روایت اس کے مطابق ہے کہ وہ آیت بھی حضرت مہدی امام آخر الزمان سے متعلق ہے۔ کیوں کہ حضرت عیسیٰ کا زمین پر اترنا حضرت کے ظہور کے بعد ہی ہوگا۔

وَلَمَّا جَاءَ عِيسَى بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلَا بَيِّنَ لَكُمْ بَعْضُ  
الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ ۝۶۳ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ  
فَاعْبُدُوهُ ۝ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝۶۴ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۝ فَوَيْلٌ

۱۱ ہو قول ابن عباس رضی اللہ عنہ و مجاهد قتادة والضحاك والسدی وابن درید (تبیان) ای ان نزول عیسی من اشرط الساعة يعلم بها قریبا (مجمع البیان)

## لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابٍ يَوْمِ إِلِيمٍ ﴿٤٥﴾

”اور جب عیسیٰؑ جزے لے کر آئے تو کہا کہ میں تمہاری طرف حکمت لے کر آیا ہوں اور یہ مقصد ہے کہ تمہارے لئے واضح کروں بعض وہ امور جن میں تم اختلاف رکھتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو یقیناً اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے تو اس کی عبادت کرو یہ سیدھا راستہ ہے تو مختلف جماعتوں میں آپس میں اختلاف ہو گیا تو وائے ہو ان کے لئے جو ظالم ہیں ایک بڑے دردناک دن کے عذاب سے“

حضرت عیسیٰؑ کا یہ کہنا کہ ”تمہارے لئے واضح کروں بعض وہ امور جن میں تم اختلاف رکھتے تھے“ یعنی جن کا دین میں دخل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ بعض یہاں کل کے معنی میں ہے [۱] یہ میری سمجھ میں نہیں آتا اور بعض زبان عرب کے علمائے اس کا انکار کیا ہے۔ [۲]

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٤٦﴾ الْآخِلَاءُ

## يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ﴿٤٧﴾

”کیا انتظار ہے ان کو سوا قیامت کہ وہ ان پر اچانک آجائے اس عالم میں کہ انہیں خبر نہ ہو، دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوا پرہیزگاروں کے“

یعنی ایمان و تقویٰ کے رشتے سے جو دوستی ہے، بس وہ برقرار رہے گی دنیا والے رشتے وہاں سب قطع ہو جائیں گے۔

يُعْبَادُ لَا خَوْفَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٤٨﴾ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا  
وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ﴿٤٩﴾ أَدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ﴿٥٠﴾ يُطَافُ  
عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ ۖ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ  
الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٥١﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ  
تَعْمَلُونَ ﴿٥٢﴾ لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٥٣﴾

”اے میرے بندو! تم پر آج کوئی ڈر نہیں اور نہ تم افسوس کرو گے، وہ جو ایمان لائے ہماری آیتوں پر اور سرطاعت جھکاتے رہے، جاؤ بہشت کے اندر تم اور تمہاری بیویاں خوش خوش اُن پر دوڑ چل رہے ہوں گے بڑے بڑے ساغروں اور پیالوں کے جو سونے کے ہوں گے اور وہاں انہیں وہ ملے گا جو اُن کے دل چاہیں اور جس سے آنکھیں

[۱] قال قوم البعض يراد به ههنا الكل كانه قال ولا بين لكم جميع ما تختلفون فيه وقيل المراد به من امر دينكم دون امر دنياكم (تبيان)

[۲] قال الزجاج: والصحيح ان البعض لا يكون في معنى الكل (مجمع البيان)

لذت حاصل کریں اور تم لوگ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے اور یہ ہے وہ بہشت جس کے تم حق دار بنے ہو اُن اعمال سے جو تم کرتے تھے، تمہارے لئے اُس میں بہت طرح کے فواکہ ہیں جن میں سے تم کھاؤ گے۔“

اگر یہ پورا سلسلہ آیات کا مقام تتریل میں سابق والی آیت سے متصل ہے تو اُس میں التَّفَاتُ مِنَ الْغَيْبَةِ إِلَى الْخِطَابِ والی صنعت ہے یعنی پہلے جو کہا گیا تھا ”جگری دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سو پرہیزگاروں کے“ اب اُنہی پرہیزگاروں کی طرف روئے خطاب ہو گیا اور اُن سے کہا جا رہا ہے ”اے میرے بندو! تا آخر مضمون آیات، اس دوران میں پھر ایک ”التفات“ ہے جس میں غیبت اور خطاب کی دو رنگی ہے کہ یطاف علیہم ”اُن پر دور چل رہے ہوں گے“ یہاں ضمیر جمع غائب کی ہے اور پھر آخر میں جمع حاضر انتم فیہا خالدون ”تم لوگ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے۔“

إِنَّ الْمَجْرِمِينَ فِي عَذَابٍ جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿٤٣﴾ لَا يُفْتَرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ

مُبْلِسُونَ ﴿٤٤﴾ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ ﴿٤٥﴾

”بلاشبہ گنہگار لوگ دوزخ کے عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہ اُن سے بلکانہ کیا جائے گا اور وہ اُس میں مایوسی کے عالم میں دم بخود ہوں گے اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا مگر وہ خود ظلم کرنے والے تھے۔“

وَنَادُوا لِمَلِكٍ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۗ قَالَ إِنَّكُمْ مُّكْثُونَ ﴿٤٦﴾

”اور انہوں نے آواز دی کہ اے مالک! تمہارا پروردگار ہمارا فیصلہ ہی کر دے، وہ کہنے لگے تم یوں رہو گے۔“

مالک یعنی وہ فرشتہ جو دوزخ کے انتظام پر مقرر ہے جیسے رضوان خازن جنت ہیں۔

”فیصلہ کر دے“ یعنی ہم کو ایسی موت دیدے جس سے شعور و احساس باطل ہو جاتا ہے۔ [۱]

لَقَدْ جِئْتَكُمْ بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كِرْهُونَ ﴿٤٧﴾ أَمْ أَبْرَمُوا أَمْراً فَاذَّابُوا

مُبرِّمُونَ ﴿٤٨﴾ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۗ بَلَىٰ ۗ وَرُسُلْنَا لَدَيْهِمْ

يَكْتُبُونَ ﴿٤٩﴾

”بلاشبہ ہم نے تمہارے سامنے حق کو پیش کر دیا ہے مگر تم میں سے زیادہ تر حق کو ناپسند کرتے ہیں کیا انہوں نے ایک

بات طے کر لی ہے تو بلاشبہ ہم بھی طے کیے ہوئے ہیں، یا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اُن کے پوشیدہ امور اور چپکے چپکے والی

باتیں نہیں سنتے کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے اُن کے پاس رہ کر لکھتے رہے ہیں۔“

”انہوں نے ایک بات طے کر لی ہے“ جو اُن کے کردار سے ظاہر ہے کہ وہ اس پیغام حق کو نہیں مانیں گے“ ”ہم بھی طے کیے ہوئے

ہیں“ کہ انہیں دوزخ کی سزا دیں گے اور اُس کا طے کرنا درحقیقت عدل و حکمت کے تقاضا کو پورا کرتا ہے مگر بہ مقتضائے بلاغت سزا کو اُن کے کردار

[۱] ای موت (علی بن ابراہیم) ای لیبتنا حتی نتخلص من العذاب (تبیان)

کی مناسبت سے اسی لفظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔ [۱] جس کی نظیریں قرآن میں مَكْرُؤًا وَمَكْرَ اللَّهُ اور يَكِيدُونَ كَيْدًا او كِيدًا (وغیرہ) کی شکل میں موجود ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ ۖ فَأَنَا أَوَّلُ الْعِبْدِينَ ﴿۸۱﴾ سُبْحَانَ رَبِّ السَّمَوَاتِ  
وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۸۲﴾ فَذَرَهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلْقُوا  
يَوْمَهُمُ الَّذِي يَوْمَعُدُونَ ﴿۸۳﴾

”کہئے کہ اگر خدا کا کوئی بیٹا ہو تو میں سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوں، بری ہے آسمان اور زمین کا پروردگار جو عرش کا مالک ہے اس سے جو وہ وصف قرار دیتے ہیں تو انہیں چھوڑو کہ بحث کرتے رہیں اور تفریح کرتے رہیں تاکہ ان کے سامنے آئے ان کا وہ روز بد جس کی انہیں خبر دی جا رہی ہے۔“

پہلے جملے کے بہت سے معنی کہے گئے ہیں لیکن بظاہر زیادہ سمجھ میں آنے والا مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک ناممکن مفروضے کی صورت میں اُس کے نتیجے کا اظہار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے کوئی ضد تھوڑی ہے کہ خدا کے کوئی واقعی اولاد ہو اور میں اُسے نہ مانوں۔ اگر اُس کے اولاد ہو تو مجھے بھی اُس کی عبادت میں کیا عذر ہے؟ میں اول نمبر کا عبادت گزار ہوں گا مگر حقیقت یہ ہے کہ اُس کے لئے کوئی اولاد ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ اُس کی شانِ توحید کے خلاف ہے۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌُ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌُ ۗ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿۸۴﴾ وَتَبَرَّكَ  
الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۗ وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۗ  
وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۸۵﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ  
بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۸۶﴾

”اور وہ ہے جو آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے اور وہ صحیح کام کرنے والا بڑا جاننے والا ہے اور بڑی برکت والا ہے وہ جس کے لئے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان والی کائنات کی سلطنت ہے اور اُس کے پاس قیامت کا علم ہے اور اُس کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور جنہیں وہ لوگ پکارتے ہیں اُسے چھوڑ کر وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے مگر وہ جو سچائی کے ساتھ گواہی دے اور وہ اُسے جانتے ہوں۔“

یہ استثناء منقطع ہے معنی یہ ہیں کہ وہاں۔ ایسے لوگ جن کا بعد میں ذکر ہے، جو خدا کی مرضی سے واقف ہوتے ہیں، وہ شفاعت کا حق رکھتے ہیں۔

وَلَيْنِ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَلَّى يُؤْفَكُونَ ﴿٨٥﴾ وَقِيلَ لَهُ يَرْبِّ إِنَّ

هُؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٦﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٨٧﴾

”اور اگر ان سے پوچھے کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ کہیں گے اللہ نے تو وہ ادھر ادھر کہاں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ اکثر آپ کا کہنا رہا ہے کہ اے میرے پروردگار! یہ لوگ کسی طرح ایمان نہیں لاتے تو ان سے چشم پوشی کیجیے اور کہئے بس خدا حافظ! کہ عنقریب انہیں خود معلوم ہوگا۔“

قبیلہ کے لفظ میں یہ بات مانی ہوئی کہ قبیل بھی قول کی طرح مصدر ہے جس کے معنی ہیں ”کہنا“ نیز یہ کہ ضمیر رسول کی طرف راجع ہے کہ آپ کا یہ کہنا ہے۔ اب اس کے بعد یہ واو کیسا ہے اور قبیل کو اعراب میں ”زیر“ کیوں کر ہو گیا ہے؟ اس کا سمجھنا بڑا دشوار ہو گیا ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ کچھ پہلے جو تھا: عِنْدَ مَا عَلِمُوا السَّاعَةَ ۖ ”اُس کے پاس قیامت کا علم ہے“ یہ تو عطف ہے اسی ساعہ کے لفظ پر مطلب یہ ہوا کہ اُس کے پاس قیامت کا علم ہے اور پیغمبر کے اس کہنے کا۔ [۱] یہ خیال اگرچہ بعض قدیم علمائے تفسیر کی زبانی نقل ہوا ہے مگر اسے میرے ذہن نے بالکل قبول نہیں کیا۔

دوسرے یہ کہ واو زُب کے معنی میں بسا اوقات، اس کے مطابق بعض مترجمین نے ترجمہ کیا ہے۔ [۲] اور معنوی طور پر اُس کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے، اس لئے میں نے ترجمہ اُس کے موافق کیا ہے مگر اس صورت میں اس کے قبل والی آیت پر لا کا نشان جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وقف نہ کیا جائے، ملا کر پڑھا جائے صحیح معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں بعد والی آیت کا کوئی ایسا لگاؤ قبل کی آیت سے نہیں ہے کہ یہ اُس کے مضمون کا جز ہو۔

تیسرے یہ کہ یہ واو قسم کا ہے۔ [۳] اس صورت میں ربط سابق کی آیت سے ہوگا اگرچہ مطلب بنانے میں پھر بھی کافی ذہنی کاوش صرف کرنا پڑتی ہے اس طرح کہ ”قسم ہے رسول کے اس قول کی۔۔۔۔۔ کیسی عجیب ہے ان لوگوں کی فریب خوردگی کہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور پھر خالق کو چھوڑ کر مخلوق ہی کی عبادت پر اصرار کرتے ہیں“ (تفہیم القرآن)

میرے خیال میں اس مفہوم کو اختیار کرنا اس صورت میں ناگزیر ہے جب کہ بیچ والے ”لا“ کے نشان کو تعبدی طور پر یقینی حیثیت سے قبول کرنا لازم سمجھا جائے۔

[۱] قال ابو علی عطف علی قوله: وعندہ علم الغیب و علم قبیلہ (مجمع البیان)

[۲] بسامی گوید پیغامبر (شاہ ولی اللہ) بہت کہا کرتا ہے پیغمبر (رفیع الدین)

[۳] اس کے قول کی قسم ہے (موضح القرآن)

# سُورَةُ الدُّخَانِ

مکیہ --- ۵۹ --- آیات

اس سورے میں ”دخان مبین“ کے لفظ کے ساتھ بطور عذاب الہی جو ایک دھوئیں یا قحط سالی کا ذکر ہے، اُس پر اس سورے کا نام ہوا۔

سورہ دخان کے خاص خاص مضامین:

- ۱۔ قرآن کا ایک خاص بابرکت رات میں نازل ہونا۔
- ۲۔ اس رات میں خاص حکیمانہ فیصلوں کا ہونا جس کی بنا پر اس کا نام ”شب قدر“ ہوا۔
- ۳۔ تنبیہ عذاب کے بعد صحیح راستے پر آنے کا وعدہ اور اُس کی مخالفت کے نتیجے میں مختتم عذاب۔
- ۴۔ فرعون اور اُس کی قوم کا رویہ اور اُن کا انجام۔
- ۵۔ فرعون والوں کی بد اعمالی کا اظہار اس طرح کہ اُن پر آسمان اور زمین نے گریہ نہیں کیا جو اس کی دلیل ہے کہ خدا کے مقرب بندے دنیا سے اٹھیں تو مستحق گریہ ہیں۔
- ۶۔ حیات بعد موت کے منکروں کا غلط مطالبہ اور اُس کا جواب۔
- ۷۔ آخری فیصلہ قیامت میں۔
- ۸۔ دوزخ کے آب و غذا کا ہولناک تذکرہ۔
- ۹۔ بہشت کی مختلف نعمتوں کا تذکرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

حَمْدٌ ۱ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۲ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْمُبْرَكَةِ ۳ اِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۴ فِيهَا  
يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ ۵ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۶ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۷ رَحْمَةً مِّنْ  
رَّبِّكَ ۸ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۹ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۱۰ اِنْ  
كُنْتُمْ مُّوقِنِينَ ۱۱ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۱۲ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَائِكُمْ

### الْأُولَئِينَ ۝ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ ۝

”ح۔ میم۔ قسم اس کھلی ہوئی کتاب کی۔ ہم نے اس کو اتارا ہے ایک مبارک رات میں یقیناً ہم عذاب سے ڈرانے والے رہے ہیں، اُس میں فیصلہ ہوتا ہے ہر حکیمانہ بات کا جو ہماری طرف کی بات ہوتی ہے، بلاشبہ ہم تھے بھیجنے والے تمہارے پروردگار کی رحمت کے طور پر، یقیناً وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا، پروردگار آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا اگر تم یقین کیے ہوئے ہو، کوئی خدا نہیں سوا اُس کے وہ زندہ کرتا ہے اور وہ مارتا ہے تمہارا پروردگار اور تمہارے پہلے والے باپ دادوں کا پروردگار مگر وہ ایک شک و شبہ میں مبتلا، تفریح اور مذاق میں لگے ہوئے ہیں۔“

### قرآن کا ایک خاص بابرکت رات میں نازل ہونا

”مبارک رات“ یعنی ”شب قدر“ جو ماہ رمضان میں ہوتی ہے، اُس میں قرآن کے اُتارے جانے کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقام پر ہے اور جیسا کہ ہم نے ”مقدمہ تفسیر“ میں لکھا ہے، یہ تزیل اول پورے قرآن کی بحیثیت مجموعی ہے جو لوح محفوظ سے بیت معمور کی طرف ہوئی ہے اور وہاں سے پھر تدریجی طور پر وقتاً فوقتاً پیغمبر خدا پر تین برس میں یعنی بعثت سے تا آخر عمر اترتا رہا ہے۔ [۱]

اس کے علاوہ بھی علامہ طبرسی نے اس سلسلے میں کئی قول نقل کیے ہیں جن میں سے کسی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ”اس میں فیصلہ ہوتا ہے ہر حکیمانہ بات کا“ اُس لئے اس کا نام ”شب قدر“ ہوا ہے اس علم کلام کے ایک مسئلے کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور وہ بداء ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تقدیرات الہیہ میں اکثر صورتوں میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ جیسے کسی کی عمر کم تھی اور صدقہ و خیرات سے اس کی عمر میں اضافہ ہو گیا کسی کی عمر میں ایسی ہی کسی وجہ سے کمی ہو گئی۔ اہل سنت اس کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ تقدیرات سب ازلی ہیں یعنی ازل میں ہر بات طے ہو گئی ہے۔ اب ان میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

### شب قدر میں خاص حکیمانہ فیصلوں کا صادر ہونا اور حقیقت زار کی قطعی دلیل

اس محل پر اصل مسئلہ بداء پر کوئی بحث مد نظر نہیں ہے مگر زیر نظر آیت کے مفہوم کی حد تک ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر تبدیلی نہیں ہوتی تو ہر شب قدر میں بعض قرآن جو فیصلے ہوتے ہیں، وہ کیا ہو سکتے ہیں؟ ان فیصلوں کا ہونا ثبوت بداء کی قطعی دلیل ہے۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۝ يَغْشى النَّاسُ ۝ هَذَا عَذَابٌ  
 أَلِيمٌ ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ۝ اَنَّى لَهُمُ الذِّكْرَى وَقَدْ  
 جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۝ اِنَّا كَاشِفُو

[۱] ہی لیلۃ القدر انزل اللہ القرآن فیہا الی البیت المعمور جملة واحدة ثم نزل من البیت المعمور علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ فی طول عشرین سنة (علی بن ابراہیم)



## الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿١٥﴾ يَوْمَ نَبِطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا

### مُنْتَقِبُونَ ﴿١٦﴾

”تو منتظر رہے اس دن کے جب آسمان سے نمایاں طور پر ایک دھواں آئے گا جو لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ ایک بڑی دردناک سزا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! اس عذاب کو ہم سے دور فرما، ہم یقیناً ایمان لائیں گے، انہیں نصیحت کہاں سے حاصل ہوگی، حالانکہ ان کے پاس صاف صاف ہدایت کرنے والا ایک پیغمبر آیا، پھر بھی انہوں نے اس سے روگردانی کی اور کہا سکھایا ہوا ایک دیوانہ ہے۔ یقیناً ہم خود اس عذاب کو بہا دیں گے، یقیناً پھر یہی کرو گے جس دن ہم سب سے بڑا ہلا بول دیں گے، بلاشبہ ہم پورا بدلا لے لیں گے۔“

یہ دھواں جس کا ان آیات میں ذکر ہے اور جس پر اس سورے کا نام ہوا ہے، بعض کے نزدیک قیامت میں ہوگا، [۱] مگر پھر یہ جملہ کیسا ہے کہ ”ہم ذرا اس عذاب کو بہا دیں گے یقیناً تم پھر یہی کرو گے“ اس لئے کہ قیامت کے عذاب سے نہ کسی آہ و زاری سے تحفیف کا امکان ہے، اور نہ اس کے بعد پھر کوئی دور ہے جس میں وہ پھر یہی کریں گے۔ خصوصاً جب کہ اس کے بعد البطشة الکبریٰ کا ذکر ہے جس کا ترجمہ ”بڑے گرفت“ کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ہم نے اس لفظ کی شدت کے اظہار کے لئے اس کو نا کافی سمجھتے ہوئے ترجمہ کیا ”سب سے بڑا ہلا“ قیامت کے بعد وہ ”گرفت“ یا ”ہلا“ کون ہو سکتا ہے؟۔ ایک تفسیری روایت جو صحابہ میں سے عبداللہ بن مسعود کی زبانی وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ مشرکین کی آنکھیں کھولنے کے لئے رسول خدا نے بارگاہ الہی میں دعا کی: اللھم سننہن کسننہن یوسف ”خداوند ایسی قحط سالی ہو جائے جیسی یوسف کے زمانے میں ہوئی تھی“ اس کی بنا پر خالق نے اس تنبیہی عذاب کی اطلاع دی جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ نظروں کے سامنے دھواں چھایا ہو اور ہتا تھا [۲] لیکن تاریخ میں ہمیں قبل بعثت کی قحط سالیوں کے کچھ حال تو ملتے ہیں، بعد بعثت کی اس قحط سالی کے حالات کچھ نظر نہیں آتے۔ ہماری قدیم تفسیر (علی بن ابراہیم قمی) اسے قیامت سے پہلے دور رجعت سے متعلق قرار دیتی ہے جس میں رجعت کے ماننے والوں کے لئے کوئی وجہ انکار نہیں ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ﴿١٢﴾ أَنْ أَذُوا إِلَىٰ آلِي عِبَادَ

اللَّهِ ۖ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٨﴾ وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ ۖ إِنِّي آتِيكُمْ بِسُلْطٰنٍ

مُبِينٍ ﴿١٩﴾ وَإِنِّي عٰذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ ﴿٢٠﴾ وَإِنْ لَمْ تُؤْمِنُوا بِي

### فَاعْتَرِلُونِ ﴿٢١﴾

”اور ہم نے آزمائش کی ان کے پہلے فرعون کی قوم کی اور ان کے پاس آیا ایک معزز پیغمبر کہ میرے سپرد کرو اللہ کے بندوں کو، میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں اور یہ کہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو، یقیناً میں تمہارے

[۱] قیامت میں یہ دھواں گھیرے گا (موضع القرآن)

[۲] قحط انداخت تا از شدت جوع یا از کثرت انجرہ چوں دودی محسوس می شود (فتح الرحمن)

سامنے لارہا ہوں ایک کھلی ہوئی دلیل اور میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار سے مانگتا ہوں پناہ اس سے کہ تم مجھے پتھروں کا نشانہ بناؤ اور اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرتے تو مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لو،  
یعنی تشدد نہ کرو اور جارحیت سے کام نہ لو۔ [۱]

فَدَعَا رَبَّهُ أَنَّهُ هُوَ لَأَيُّ قَوْمٍ هُجْرُمُونَ ﴿۳۲﴾ فَاسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ مُتَّبِعُونَ ﴿۳۳﴾  
وَأَنْتُرِكَ الْبَحْرَ رَهْوًا إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُونَ ﴿۳۴﴾ كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۳۵﴾  
وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ﴿۳۶﴾ وَنَعْمَةً كَانُوا فِيهَا فَكَيْهَيْنِ ﴿۳۷﴾ كَذَلِكَ تَفْ وَأَوْرَثْنَهَا  
قَوْمًا آخَرِينَ ﴿۳۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ ﴿۳۹﴾

”تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ ”یہ بڑے مجرم لوگ ہیں“ (اچھا) تو تم میرے بندوں کو لے کر رات کو نکلو، یقیناً تمہارا پیچھا کیا جائے گا اور تم دریا کو اس حالت میں کہ وہ خشک ہو گیا ہوگا چھوڑ دو، بے شک وہ لشکر غرق ہونے والا ہے، کتنے ہی انہوں نے چھوڑے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور بڑے عمدہ مقامات اور اسی طرح کے آرام و آرائش کے سامان جن میں وہ بڑے خوش خوش رہ رہے تھے اور ہم نے ان چیزوں کا مالک بنایا دوسری قوم کو تو نہ ان پر آسمان رو یا اور نہ زمین اور نہ انہیں مہلت مل سکی“

ان آیتوں میں جن واقعات کا ذکر ہے، ان کی تفصیل قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر موجود ہے۔ آخری جملہ فرعون کی بد اعمالی کے اظہار میں بطور کنایہ ارشاد ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص کردار کے لحاظ سے اللہ کے یہاں بلند مرتبہ رکھتا، ہو، وہ مستحق گریہ ہے اور اس پر آسمان بھی روئے گا اور زمین بھی چنانچہ جلالین نے بھی اس کے تحت میں لکھا ہے:

بخلاف المؤمنین بیکی علیہم بموتہم مصلاً ہم من الارض و مصعد عملہم من السماء.  
برخلاف مؤمنین کے کہ ان کے دنیا سے اٹھنے پر زمین کے وہ قطعات بھی روئے ہیں جن پر وہ نمازیں پڑھتے تھے اور آسمان کے وہ حصے بھی جہاں سے ان کے اعمال بلند ہوتے تھے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔ ”حدیث میں فرمایا کہ مسلمان کے مرنے پر روتا ہے دروازہ آسمان کا جس سے اس کی روزی اُترتی اور زمین جہاں وہ نماز پڑھتا ہے“ (موضح القرآن) خاص ظہور اس کا حدیث اور تاریخ کے لحاظ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے بارے میں ہوا کہ آپ پر آسمان اور زمین دونوں نے گریہ کیا جس کا اس آیت کے ذیل میں قدیم اہل تفسیر نے بھی ذکر کیا ہے۔ [۲] اور آپ کے ساتھ حدیث میں جناب یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا نام بھی ہے۔ [۳]

[۱] فاتر کونی لامعی ولا علی (مجمع البیان)

[۲] قال السدی لما قتل الحسين عليه السلام بكت السماء عليده (بتیان)

[۳] قال او ما بكت السماء والارض الا على يحيى بن زكريا والحسين بن علي عليه السلام (روى ذوارقة بن اعين عن ابى عبد الله قال بكت السماء يحيى بن زكريا والحسين بن علي اربعين صباحا) (مجمع البیان)

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿٣٥﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ط إِنَّهُ كَانَ  
عَالِيًا مِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ اخْتَرْنَا لَهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٧﴾ وَآتَيْنَاهُمْ  
مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُّبِينٌ ﴿٣٨﴾

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو نجات دی ذلت آمیز عذاب سے جو فرعون کی طرف سے تھا، یقیناً وہ سرکش تھا ظلم و تعدی کرنے والوں میں سے اور ہم نے پوری واقفیت کے ساتھ انہیں تمام دنیا کے مقابلے میں ترجیح دی اور ہم نے انہیں وہ قدرت کی نشانیاں دکھلائیں جن میں کھلی ہوئی آزمائش تھی“

یہ ترجیح جس کا بنی اسرائیل کے لئے اعلان ہوا ہے اسی دور زمانہ سے مخصوص تھی ﴿٣٥﴾ اس لئے کہ اُمت محمدیہ کو بلاشبہ ان پر خالق نے فوقیت دی، اس کے علاوہ یہ ترجیح کچھ باتوں کے لحاظ سے ہے جیسے خدا کے پیش نظر انبیاء کا قرب الہی ان کی کثرت کو دیکھتے ہوئے۔ ﴿٣٦﴾

إِنَّ هَؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ﴿٣٩﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِينَ ﴿٤٠﴾ فَأَتُوا  
بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤١﴾ أَهْمٌ خَيْرٌ أَمْ قَوْمٌ تُبَّعُ ۗ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط  
أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُجْرَمِينَ ﴿٤٢﴾

”بلاشبہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے مگر پہلی ہی دفعہ کا مرنا اور ہم دوبارہ جلائے جائیں گے (اچھا) تو لاؤ ہمارے باپ داداؤں کو اگر تم سچے ہو، کیا وہ (مادی طاقت کے اعتبار سے) بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے تھے؟ ہم نے ان کا ستیاناس کر دیا، یقیناً وہ گنہگار لوگ تھے“

حیات بعد الموت کا ذکر سن کر جو آخرت میں ہوگا ان کا یہ کہنا کہ اگر تم لوگ سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لاؤ، دھاندلی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے کہ وہ زندہ کرنا بطور سیر و تفریح نہیں ہے۔ وہ تو جزا و سزا کے لئے دور زمانہ کے اختتام پر ہے، اس وقت ان کی فرمائشوں کی بنا پر ان کے باپ داداؤں کو زندہ کیوں کیا جائے؟ چونکہ یہ ان کا سوال بالکل ہی جہالت پر مبنی تھا اور اتفاق سے ان کا کہنے والا ابو جہل ہی بتایا گیا ہے۔ ﴿٣٩﴾ اس لئے اس کے جواب میں پہلے گزشتہ سرکش قوموں کا انجام یاد دلا کر انہیں عذاب الہی سے ڈرایا گیا ہے کہ تم بھی ویسے ہی عذاب کے مستحق ہو جیسا ان قوموں پر عذاب آیا۔ ﴿٤٠﴾

﴿٣٥﴾ قال قتادة و مجاهد على عالمي زمانهم (بتیان)

﴿٣٦﴾ أفضلناهم بالتورته و كثرة الانبياء منهم (مجمع البيان)

﴿٣٧﴾ هذا القول جهل من ابى جهل (مجمع البيان)

﴿٣٨﴾ من تجاهل في الحجاج الذي يجرى مجرى الشعب... فآته ينبغى ان يعدل عن مقابلة... ولذلك عدل تعالى معهم الى هذا الوعد الشديد (بتیان)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعَيْنٍ ﴿٣٨﴾ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ  
 وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّ يَوْمَ الْفُصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٠﴾ يَوْمَ لَا  
 يُغْنِي مَوْلَى عَنْ مَوْلَى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤١﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ ۗ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ  
 الرَّحِيمُ ﴿٤٢﴾

”اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو بے کار، تفریحی طور پر ہم نے انہیں پیدا کیا مگر حق بجانب طور پر لیکن ان میں سے زیادہ لوگ علم نہیں رکھتے، یقیناً فیصلے کا دن ان سب کا مقرر شدہ وقت ہے، جس دن کوئی دوست کسی دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا اور نہ ان کی مدد ہوگی، مگر جس کے شامل حال اللہ کی رحمت ہو یقیناً اللہ زبردست ہے، بڑا رحم و کرم والا“

یہاں پر ترتیب آیات کو مطابق تزیل مانتے ہوئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ گزشتہ ابوجہل کے مطالبے کا اصل جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شروع سے آخر تک اللہ کا کوئی کام بطور کھیل اور تفریح کے نہیں ہوتا۔ نہ اس نے پہلے بلاوجہ بطور تفریح کے کائنات کو خلق کیا تھا، نہ دوبارہ مردوں کو زندہ کرنا بطور تفریح ہوگا۔ پہلی دفعہ خلق کرنا بھی بامقصد تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر لوگ اس مقصد سے بے خبر ہیں اور دوبارہ زندہ کرنا بھی بامقصد ہوگا جس میں اعمال کی پاداش کا فیصلہ سامنے لایا جائے گا۔ یوم الفصل کے لفظ سے ظاہر ہے۔ اس فیصلے کے دن میں کوئی دوست کسی دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا یعنی وہ جن کی دوستی دنیوی رشتے سے ہو لیکن جو محبت بحکم الہی ہو، اس سے کیوں فائدہ نہ پہنچے گا۔ [۱] یا جو شفاعت کے ذریعے سے باذن خدا تعالیٰ فائدہ پہنچائیں۔ [۲]

إِنَّ شَجَرَتَ الرَّقُومِ ﴿٣٣﴾ طَعَامُ الْإِثْمِ ﴿٣٤﴾ كَالْمُهْلِ ۗ يُغْطَىٰ فِي الْبُطُونِ ﴿٣٥﴾ كَغَلِيِّ  
 الْحَمِيمِ ﴿٣٦﴾ خُدُّوهُ فَاعْتَلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿٣٧﴾ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ  
 الْحَمِيمِ ﴿٣٨﴾ ذُقْ ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿٣٩﴾ إِنَّ هَذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ﴿٤٠﴾

”یقیناً رقوم کا درخت گنہگار کی غذا ہے، کھلے ہوئے تانبے کی طرح شکموں میں جوش کھائے گا کھولتے ہوئے پانی کے جوش کی طرح“ پکڑو اسے“ پھر لے چلو اس کو پیچوں بیچ دوزخ میں، پھر اس کے سر پر گرم پانی ڈالو، چکھو تو تو بڑا عزت والا ہے، بڑے مرتبے والا۔ یقیناً یہ وہ ہے جس میں تم لوگ شک و شبہ کرتے تھے“

آخری فقرہ جو کافر سے مخاطب میں ہے کہ تو تو بڑا عزت والا ہے، بڑے مرتبے والا، یہ طنز ہے اس کے غلط تصورات پر جو دنیا میں تھے،

[۱] من والی غیر اولیاء اللہ لا یغی بعضهم عن بعض (علی بن ابراہیم)

[۲] لا ینافی ما تذهب الیہ من اثبات الشفاعة للنبی ﷺ والائمة والمومنین لان الشفاعة لا تحصل الا بامد اللہ تعالیٰ (مجمع البیان)

ورنہ حقیقتاً عزت اور بزرگی اہل ایمان سے مخصوص ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿٥١﴾ فِي جَنَّةٍ وَعُيُونٍ ﴿٥٢﴾ يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ  
وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٥٣﴾ كَذَلِكَ تَفْ وَرَوْجُهُمْ يُحْوَرُ عَيْنِينَ ﴿٥٤﴾ يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ  
فَاكِهَةٍ أَمِينٍ ﴿٥٥﴾ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَى ۖ وَوَقَّهُمْ  
عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٦﴾ فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ ۗ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٥٧﴾

”بلاشبہ پرہیزگار لوگ امن و سکون کی جگہ پر ہوں گے، بہشتوں اور چشموں میں، پہنیں گے سندس اور استبرق کے کپڑے، آمنے سامنے بیٹھے ہوئے اسی صورت سے اور ان کی شادی کر دیں گے ہم بڑی آنکھوں والی حوروں کے ساتھ، وہ منگواتے وہاں طرح طرح کے پھل امن و اطمینان کے ساتھ۔ نہیں چکھیں گے ان میں ذائقہ موت کا سوا پہلے والی موت کے اور اس نے بچایا انہیں دوزخ کے عذاب سے فضل و کرم کی بنا پر جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔“

”پہلی موت کے سوا وہ وہاں موت کا مزہ نہ چکھیں گے“ یہ اس طرح کا استثناء نہیں ہے جس سے اس نفی کی عمومیت کو صدمہ پہنچے اور مطلب یہ ہو کہ بس ایک موت ہے جو ابھی آنا ہے بلکہ یہ اصطلاحی طور پر استثناء منقطع کہلاتا ہے جس کا مطلب یہاں یہ ہوتا ہے کہ جو موت آنا تھی وہ بس پہلے آچکی اب کسی موت سے انہیں دوچار ہونا نہیں ہے۔ [۱]

فَإِنَّمَا يَسْتَرْزِقُهُمْ لِسَانُكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ فَأَرْتَقِبْ إِيَّاهُمْ مُّرُّ تَقَبُّونَ ﴿٥٩﴾

”تو ہم نے اس کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں، اچھا تو انتظار کیجئے یقیناً وہ بھی انتظار میں ہیں۔“

یعنی انجام ان کے کفر کا آپ کے سامنے بھی آئے گا اور ان کے بھی سامنے آنا ہے۔ اگرچہ وہ اس کا تصور نہیں رکھتے تو انتظار کیا کریں گے مگر سامنے ان کے اسی طرح آنا ہے جس طرح کسی منتظر کے سامنے آئے جب کہ وہ اپنے کردار سے اس کا سامان کیے ہوئے ہیں۔ اس لئے مجازاً یوں کہا گیا ہے کہ وہ بھی منتظر ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ منتظر رہیں ان کی تباہی و بربادی کے جو ہو کر رہے گی اپنے خیال خام میں اس لگائے ہیں آپ کے لئے روز بد کی جو آنے والا نہیں ہے۔

[۱] تقدیرہ: ولكن الموتة الاولى قد اذقها (تبیان)

# سُورَةُ الْجَاثِيَةِ

مکیہ --- ۷ --- ۳ --- آیات

اس سورے کے درمیان میں ’جاثیہ‘ کا لفظ ہے (و تزی کل امة جاثیة) بس اُس پر اس سورے کا نام ہو گیا۔

**سورہ جاثیہ کے خاص خاص مضامین:**

۱۔ قدرت کی نشانیوں میں آسمان، زمین، زمین میں چلنے پھرنے والی مخلوق، شب و روز کی ادل بدل آسمان سے اترنے والی روزی یعنی بارانِ رحمت جس سے روزی پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ بے توجہی اختیار کرنے والوں، انکار کرنے والوں اور مذاق اڑانے والوں کی تنبیہ و تہدید۔

۳۔ مسلمانوں کو ہدایت کہ وہ منکروں کی طرف توجہ نہ کریں۔

۴۔ رسول ﷺ کو خدا کی طرف سے ایک قانون کا پابند بنایا گیا ہے یعنی شریعت من جانب اللہ ہے، رسول کا کام بھی اتباع ہے۔ ابتداء یعنی ایجاد نہیں۔

۵۔ کیا بد اعمال لوگ انجام میں خوش اعمال لوگوں کے برابر رکھے جائیں؟

۶۔ انکار آخرت کرنے والے دہریوں کی رد۔

۷۔ نامہ اعمال

**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ**

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

حَمْدٌ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۲ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

لَاٰتٍ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۳ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبْتُ مِنْ ذٰبْتِ اٰتٍ لِّقَوْمٍ يُوقِنُوْنَ ۴

وَاحْتِلَافِ الْيَلِّ وَالنَّهَارِ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ اٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ۵ تِلْكَ اٰتِ اللّٰهِ

نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۶ فَبَايَ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰتِئْتَهُ يَوْمَ مَنُوْنَ ۷

”حا، میم۔ اس کتاب کا اتاراجانا ہے اللہ کی طرف سے جو عزت والاحکمت والا ہے، یقیناً آسمان اور زمین میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لئے اور تمہاری تخلیق میں اور جو وہ پھیلاتا ہے چلنے پھرنے والی مخلوق، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین کریں اور رات دن کی آمدورفت اور اس میں جو اللہ نے آسمان سے روزی اتاری تو اس سے زمین کو زندہ کر دیا اس کے بے جان ہونے کے بعد اور ہواؤں کی گردش میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں، یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم آپ کے سامنے حق کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر وہ ایمان لائیں گے؟“

متعدد سوروں کے آغاز میں کتاب کے اتارے جانے کی نسبت عزت و حکمت والے اللہ کی طرف کتاب کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے کہ دیکھو یہ کتاب کس کی طرف سے ہے اور چونکہ یہ پہلو بہت اہم ہے، اس لئے اسے بار بار دہرایا گیا ہے اور یہ تکرار جان بلاغت ہوتی ہے۔ علامہ طبرسی نے اس تکرار کی مثال میں اسے پیش کیا ہے کہ بندہ دعائیں کرتا ہے تو ہر دعا کے شروع میں اللھم، اللھم کہتا ہے۔ اس کے اظہار کے لئے ہے کہ جس سے وہ کہہ رہا ہے، وہ کتنی عظیم ذات ہے۔ [۱]

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُثَلِّي عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَانُ  
لَمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا  
هُزُوًا ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ مِنْ وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ  
مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ  
عَظِيمٌ ۝ هَذَا هُدًى ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رَّجْزِ  
أَلِيمٍ ۝

”وائے ہو ہر گنہگار جھوٹے کے لئے جو سنتا ہے آیات الہی کو کہ وہ اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، پھر وہ تکبر سے کام لیتا ہوا ہٹ دھرمی کرتا ہے جیسے کہ انہیں اس نے سنا ہی نہیں تو اسے خوش خبری دیجیے دردناک عذاب کی اور جب ہماری نشانوں میں سے کسی کا اسے علم ہوتا ہے تو اسے مذاق کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ یہ وہ ہیں کہ ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔“

ان کے آگے دوزخ ہے اور جو کچھ انہوں نے کمایا ہے، وہ انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچائے گا اور نہ وہ جو انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر حوالی موالی بنائے ہیں اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ یہ ایک ہدایت ہے اور وہ جو اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں، ان کے لئے دردناک قسم کا عذاب ہے

[۱] يقول القائل اللهم اغفر لي اللهم ارحمني اللهم غافني اللهم واتبع لي في رزقي فيأتي بما يؤذن ان تعظي به لربّه ضعقد بكل ما يد عوبه (مجمع البيان)

۔ ”ہماری نشانیوں میں سے کسی کا علم ہوتا ہے“ یہ الفاظ عمومیت رکھتے ہیں، خواہ مشاہدہ کے ذریعے سے علم ہو کہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے وہ معجزہ آیا یا اس کا تذکرہ اس کے گوش زد ہوا، بہر حال وہ اسے مذاق کا ذریعہ بنالیتا ہے لیکن ایک تفسیر یہ ہے کہ علم کے معنی یہاں مشاہدے ہی کے ہیں۔ [۱]

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ لَتَجْرِي أَلْفُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ  
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۱﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ  
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ ﴿۱۲﴾

”اللہ وہ ہے جس نے تمہارے قبضے میں کیا ہے دریا کوتا کہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں رواں ہوں اور تاکہ تم اس کے فضل و کرم سے جو کچھ ملے حاصل کر لو اور شاید تم شکر گزار ہو اور تمہارے قبضے میں کیا اس نے وہ جو آسمانوں میں ہے اور وہ جو زمین میں ہے، یہ سب اس کی طرف سے ہے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں“

کشتیوں کے دریا میں چلنے کے ساتھ یہ کہ ”اس کے فضل و کرم سے جو ملے اسے حاصل کرو“ اس بنا پر ہے کہ اس زمانے میں دریاؤں کے سفر عموماً تجارت کے لئے ہوتے تھے۔ سخر لکم کا لفظ متعدد جگہ قرآن مجید میں ہے جس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس نے یہ چیزیں تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیں لیکن اس کا اصل مفہوم وہی ہے جو ہم نے ترجمہ کیا ہے ”تمہارے قبضے میں کیا ہے“ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ چیزیں ہمارے ارادے کی پابند ہوں۔ اب یہ ہمارے علم و اقتدار کی کوتاہی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا  
يَكْسِبُونَ ﴿۱۳﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ  
تُرْجَعُونَ ﴿۱۴﴾

”کہتے ان سے جو ایمان لائے ہیں کہ وہ بخشے رہیں انہیں جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تاکہ وہ بدلادے کسی بھی قوم کو ان اعمال کا جو وہ کرتے رہے تھے، جو نیک کام کرے گا وہ اپنے فائدے کے لئے اور جو برائی کرے گا تو وہ اپنا نقصان کرے گا، پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہوگا۔

”بخشنے“ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ انہیں معاف کر دیں، ورنہ آئندہ کے بدلے کا کیوں ہوتا؟ بلکہ انہیں نظر انداز کریں بایں معنی کہ ان کے بے ہودہ باتوں کا سختی کے ساتھ جواب نہ دیں اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ان کے لئے خالق سے بددعا بھی نہ کریں جیسا کہ ہماری قدیم تفسیر میں ہے۔ [۲] ”اللہ کے دن“ یعنی وہ دن جن میں اس کی طرف کے کچھ کارنامے انجام پائیں خواہ اس کے بندگان خاص کے ہاتھوں جیسے انبیاء اور

[۱] یعنی ازرائی فوضع العلم مکان للرؤية (علی بن ابراہیم)

[۲] یقول لا تدعوا علی ائمتہ اعدو حتی یکون اللہ الذی یعاقبہم (علی بن ابراہیم)



ائمردین جن کے واقعات اب ماضی بن چکے ہیں، اس لئے ان کی یاد تازہ کرنے کا حکم ہے (وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ) اور خواہ خالق کے ارادہ خاص سے بعد میں وقوع پذیر ہونے والے ہوں جیسے کارگاہ حساب و کتاب، حشر و نشر وغیرہ یہ مستقبل کی چیزیں ہیں، ان سے متعلق ہے امید اور اس کے موافق سامان فراہم کرنا اور ان ایامِ الہی کی امید نہ رکھنے والے وہ ہیں جو آئندہ کی زندگی کا تصور ہی نہیں رکھتے اور آخرت کے قائل ہی نہیں۔

غور کیا جائے تو امام منتظر کے ظہور کا عہد بھی ایامِ الہی کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس لئے ان امید نہ رکھنے والوں میں وہ بھی آتے ہیں جو اس کے منکر ہیں بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ”وہ بدلا دے کسی بھی قوم کو اس کا جوہ کرتے ہیں“ اس کے دونوں رخ ہیں، ان منکروں کو سزا بھی وہی دینے والا ہے اور ان صبر کرنے والوں کو اور چشم پوشی کرنے والوں کو جزا بھی۔ ﴿﴾ جیسا کہ بعد والی آیت میں دونوں پہلو نمایاں ہیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ  
وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٦﴾ وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ ۖ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِّنْ  
بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ ۚ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ  
فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٧﴾

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی اور انہیں پاک غذاؤں سے رزق عطا کیا اور انہیں تمام دنیا جہاں سے زیادہ عطا کیا اور انہیں کھلے ہوئے دلائل دین کے عطا کیے تو انہوں نے باہم اختلاف نہیں کیا مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آچکا آپس کے ظلم و تعدی کی وجہ سے یقیناً تمہارا پروردگار فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن اُس میں کہ جو وہ باہم اختلاف رکھتے تھے۔“

بنی اسرائیل کے لئے فضلنا کا لفظ قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور ہم نے ہر جگہ اُس کی تشریح کی ہے کہ اس کے معنی کثرت عطا یا بعض باتوں میں ترجیح کے ہیں، نہ کہ بحیثیت مرتبہ بلندی جو کہ اپنے معصوم رہنماؤں کی بدولت جو افضل خلائق تھے، بلاشبہ اُمت محمدیہ کے لئے حاصل ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا  
يَعْلَمُونَ ﴿١٨﴾ إِنَّهُمْ لَن يَغْنُؤُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ  
أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ﴿١٩﴾ هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ  
لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٢٠﴾

”پھر ہم نے آپ کو ایک واضح راستے پر دین کے قرار دیا ہے تو اس کی پیروی کیجئے اور ان کے غلط خیالات کی پیروی

﴿﴾ مجتہل معنیں... احد ہما یجاز یہم یعنی الکفار... الغانی... لیجز یہم اللہ یعنی المؤمنین و یعظم اجرہم علیٰ حتمًا لہم و صبرہم (تبیان)

نہ کیجئے جو علم نہیں رکھتے۔ وہ اللہ کے مقابلے میں آپ کو کچھ فائدہ ہرگز نہیں پہنچائیں گے اور یقیناً ظالم لوگ ایک دوسرے کے پشت پناہ ہو جاتے ہیں اور اللہ پشت پناہ ہوتا ہے پر ہیزگاروں کا۔ یہ بصیرتوں کا سرمایہ ہے لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت اُن کے لئے جو یقین کریں۔“

یہ راستہ جس پر پیغمبر خدا ﷺ قائم تھے اور اسی کے مبلغ تھے، کچھ اصول ہیں جن سے ماننے کا تعلق ہے، یہ ”اصول دین“ کہلاتے ہیں اور کچھ عملی احکام ہیں جن کا مجموعہ اسی قرآنی لفظ یعنی ”شریعت“ ہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس جگہ جو لفظ شریعت ہے، وہ ان دنوں پر حاوی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی پیغمبر خدا ﷺ کا وضع کردہ نہیں ہے بلکہ خالق کی طرف سے مقرر ہے جس کی تبلیغ اور تعلیم پر آپ مامور ہیں، اس لئے میں نے اُسے اُس عشرے کے بیانات کا سرنامہ قرار دیا تھا جس سے متعلق مجموعہ ”پرسٹل لانا قابل تبدیل“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۗ سَوَاءٌ مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٣١﴾ وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٣٢﴾

”کیا سمجھتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے جرائم کا ارتکاب کیا ہے کہ ہم انہیں قرار دیں مثل اُن کی جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور اچھے اعمال کرتے رہے، یکساں ہو اُن کی زندگی اور اُن کی موت؟ کتنا برا ہے یہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔ اور اللہ نے آسمان اور زمین کو حق بجانب طور پر پیدا کیا۔“

### بد اعمال لوگ خوش اعمال لوگوں کے برابر نہیں

سَوَاءٌ مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ، اُس کے معنی ایک یہ کہے گئے ہیں کہ ان کافروں کی زندگی اور موت یکساں ہے یعنی اُن کی زندگی بے سود ہونے میں مثل موت ہے۔ [۱] یہ بات بجائے خود تو درست ہے مگر اس کا قبل کے کلام سے بظاہر کوئی ربط نہیں ہے۔ پھر اس صورت میں سَوَاءٌ مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ہونا چاہیے کہ یہ خود مبتدا اور خبر پر مشتمل ایک مستقل جملہ ہو مگر یہاں سَوَاءٌ نصب یعنی دوزبر کے ساتھ ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ نفعیہ کے تحت میں بطور مفعول ہے اس طرح جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ قبل ہی کے فقرے کا تتمہ ہے یعنی کیا بد اعمال لوگوں کو ہم مثل صاحب ایمان اور نیک اعمال لوگوں کے قرار دیں کہ ان سب کی زندگی اور موت یکساں ہو؟ یہ مفہوم بالکل درست ہے اور اس سے عدولی کرنے کی کوئی وجہ نہیں چنانچہ علامہ طبریؒ کا بظاہر مختار یہی ہے۔ [۲]

فرماں بردار اور نافرمان کو برابر قرار دینا، فرماں بردار پر ایک طرح کا ظلم ہے اور خدا ہر طرح کے ظلم سے بری ہے۔

[۱] اخبر علی الکفار وقال سواء محياهم ومماتهم۔ لان الحی متی لم یفعل الطاعات فهو بمنزلة المیت (تبیان)

[۲] ای یستوی محیا القبلیتین ومماتہم یعنی احسبوا ان حیوتہم ومماتہم کحیوة المومنین وموتہم (مجمع البیان)

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمِهِ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ

وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣٣﴾

”تو کیا دیکھا آپ نے اُسے کہ جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنایا ہے اور اللہ نے علم کی بنا پر اُسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اُس کے کان اور اُس کے دل پر مہر لگا دی اور اُس کی نگاہ پر پردہ ڈال دیا ہے تو اللہ کے بعد کون اُس کی ہدایت کر سکتا ہے تو کیوں تم سمجھانے کا اثر نہیں لیتے“۔

خواہش نفس کو خدا بنانا اُس کا ارادی فعل ہے اور علم الہی بحیثیت ایک واقعہ کے اُس سے متعلق ہے۔ وہ اُس کا سبب نہیں ہے اور بعد کی باتیں سب اس علم پر مبنی ہیں لہذا اُن سے جبر کا ثبوت نہیں نکلتا۔

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۗ وَمَا

لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٣٤﴾

”اور انہوں نے کہا کہ نہیں ہے سو اس دنیوی زندگی کے، یہی مرنا ہے، یہی جینا ہے اور ہمیں ہلاک نہیں کرے گا مگر یہی دور زمانہ حالانکہ انہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے، نہیں رکھتے وہ مگر ایک وہم و گمان“۔

اس میں جن کافروں کے قول کا ذکر ہے، وہ اسلام کے دونوں بنیادی اصول مبداء اور معاد یعنی خالق اور آخرت دونوں کے منکر ہیں اور اُن کے انکار کا سرمایہ اُس وقت بھی اور ڈیڑھ ہزار برس گزرنے کے بعد آج بھی لاعلمی کے سوا کچھ نہیں ہے جسے وہ ایک علمی فیصلے کی صورت سے پیش کرتے ہیں۔

وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ مُجْتَهِمًا ۗ إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا بِلَابِنَا إِن

كُنْتُمْ صِدِّقِينَ ﴿٣٥﴾ قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ

الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

وَالْأَرْضِ ۗ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُحْسِرُ الْمُبْطِلُونَ ﴿٣٧﴾

”اور جب اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں کھلی ہوئی صاف تو ان کی دلیل کچھ نہیں ہوتی سو اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے باپ داداؤں کو لاؤ اگر تم سچے ہو، کہتے کہ اللہ تمہیں زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، پھر تمہیں یکجا کرے گا قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے اور اللہ کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور جس دن قیامت برپا ہوگی، اُس دن گھاٹا اٹھائیں گے باطل پرست لوگ“۔

اُن لوگوں کی یہ جہالت کہ ہمارے باپ داداؤں کو زندہ کر کے لاؤ، جس کی نسبت خاص طور پر ابو جہل کی طرف ملتی ہے، پہلے بیان ہو چکی

ہے اور وہاں بھی اُس کا جواب تقریباً یہی دیا گیا تھا کہ یہ زندہ کرنا اور مارنا تفریحی طور پر نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کی طرف کے نظام حکمت کا ایک عمل ہے جو جزا و سزا کی ضرورت کی بنا پر ہوتا ہے لہذا بلاوجہ تمہارے باپ دادا کیوں زندہ کیے جائیں؟ پھر رسولؐ کی زبانی اس قول میں یہاں یہ پہلو بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرا کام نہیں ہے، یہ زندہ کرنا اور مارنا اور پھر زندہ کرنا اللہ کا کام ہے جو تمہاری خواہشوں کا پابند نہیں ہے۔

وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَائِئِيَةً ۖ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا ۗ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ  
تَعْمَلُونَ ﴿٢٨﴾ هَذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۗ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنتُمْ  
تَعْمَلُونَ ﴿٢٩﴾

”اور ہر قوم کو دیکھو گے گھٹنوں کے بل گرے ہوئے۔ ہر قوم کو دعوت دی جائے گی اُس کے نامہ اعمال کی طرف، آج تمہیں بدل لال رہا ہے اُس کا جو تم کرتے تھے۔ یہ ہماری طرف کا نوشتہ ہے جو تمہارے خلاف سچائی کے ساتھ بول رہا ہے ہم لکھتے رہتے تھے اُسے جو تم کرتے تھے۔“

”کتاب“ کی زیادہ ذہن میں آنے والی واضح تشریح یہی ہے کہ اُس سے نامہ اعمال مراد ہے جس کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے ”نامہ اعمال کی طرف دعوت دی جائے گی“ یعنی اُس نامہ عمل کے مطابق جو اُس کی قسمت کا فیصلہ ہوگا، اُس کا اُسے پابند بنایا جائے گا۔ [۱] بعد والی آیت کا مضمون اسی تفسیر سے مطابقت رکھتا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد وہ کتاب سماوی ہے جو اُس کے لئے اتاری گئی تھی۔ [۲] اور کتاب تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد وہ فرائض ہیں جو اُن پر عائد تھے [۳] مگر یہاں قیامت کا ذکر ہو رہا ہے، کتاب سماوی یا فرائض کی طرف دعوت تو دار تکلیف سے متعلق تھی، نہ کہ قیامت کے دن سے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ۗ ذَٰلِكَ  
هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿٣٠﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ أَفَلَمْ تَكُنْ آيَتِي تُلَىٰ عَلَيْكُمْ  
فَأَسْتَكْبَرْتُمْ ۖ وَكُنتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَالسَّاعَةُ  
لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِي مَّا السَّاعَةُ ۗ إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ  
بِمُستَيْقِنِينَ ﴿٣٢﴾

”تو وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں اُن کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے

[۱] قبیل معناه الی کتابہا الذی کان یستغسخ لها ویثبت فیہا اعمالہا (تبیان)

[۲] قبیل الی کتابہا المنزل علی رسولہا (مجمع الالبیان)

[۳] الی ما یجب علیہم من اعمالہم (علی بن ابراہیم)

گا، یہی ہے کھلی ہوئی کامیابی اور رہ گئے وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا تو کیا میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی نہیں جاتی تھیں تو تم نے غرور سے کام لیا اور تم گنہ گار لوگ تھے اور جب کہا جاتا تھا کہ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے؟ ہم نہیں رکھتے مگر تھوڑا سا گمان اور ہمیں یقین نہیں ہے۔“

وَبَدَأَ لَهُمْ سَيِّئَاتِ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٣٣﴾ وَقِيلَ  
الْيَوْمَ نُنَسِّسُكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ  
مِّنْ نَّصِيرِينَ ﴿٣٤﴾ ذَلِكُمْ بِأَنَّكُمْ اتَّخَذْتُمْ آيَةَ اللَّهِ هُزُوعًا وَغَرَّتْكُمْ الْحَيَاةُ  
الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٣٥﴾ فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ  
السَّمَوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٦﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ  
وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٣٧﴾

”اور وہ اُن کے سامنے آئیں برائیاں اُس کی جو انہوں نے کیا تھا اور گھیر لیا انہیں اُس نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور کہا گیا کہ آج تم تمہیں بھلاوے میں ڈالتے ہیں جس طرح تم نے بھلایا تھا اپنے اس دن کے سامنے آنے کو اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہارے کوئی مددگار نہیں ہیں، اس لئے کہ تم نے آیات الہی کا مذاق اڑایا اور تمہیں دنیوی زندگی نے فریب میں مبتلا کیا تو اب آج وہ یہاں سے نکل نہیں سکتے اور نہ اُن سے رضا جوئی کا مطالبہ ہو سکتا ہے تو شکر ہے اللہ کا جو مالک ہے آسمانوں کا اور مالک ہے زمین کا، مالک تمام جہانوں کا اور اسی کے لئے بزرگی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی عزت والا ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا۔“

”اُن کے سامنے آئیں برائیاں“ یعنی وہ برائیاں معلوم تو دنیا میں بھی تھیں مگر اب آخرت میں اُن کے نتائج مشاہدے کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آگئے۔ ”یہ کہا گیا“ اس کے لئے ضروری نہیں کہ لفظ کہا جائے بلکہ عملاً یہی ثابت ہو رہا ہے تو وہ سب سے بڑا کہنا ہے۔ دنیا میں وہ بھلائے رہے غفلت سے اور آج اُس کی پاداش میں انہیں بھلایا جا رہا ہے یعنی اُن کی آہ و ویلا پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی اور نظر رحمت مبذول نہیں ہوتی بر بنائے عدل و حکمت لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ”نہ اُن سے رضا جوئی کا مطالبہ ہو سکتا ہے“ یعنی اب دور تکلیف گزر چکا ہے اور اب اس کا امکان نہیں کہ وہ توبہ و انابت کر کے اور اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کر کے اللہ کی رضا حاصل کر سکیں۔ [۱] یہ دامن انسانیت کے لئے اُن کے انتہائی بُرے داغ ہونے کا ثبوت ہے کہ اُن کے انجام کی تباہی و بربادی پر حمد و شکر الہی ادا ہو رہا ہے۔

[۱] ای لا یطلب منهم العتبی والاعتذار لان التکلیف قد زال (تبیان و مجمع البیان)

# سُورَةُ الْأَحْقَافِ

مکیہ --- ۳۵ --- آیات

قبیلہ عاد اور اس کے پیغمبر جناب ہود علیہ السلام کا ذکر تو قرآن مجید میں بکثرت سوروں میں ہے اور ایک سورہ بھی انکے نام پر ہے لیکن ان کے محل قیام کی نوعیت کے لحاظ سے اس سورے میں ان کا تعارف احقاف کی نسبت کے ساتھ کرایا گیا ہے جس کے معنی ریگ کے ٹیلوں کے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کے سوروں میں بنیادی مقصد تعلیم ہے، اس لیے مطلب کے ذہن نشین کرنے کے لیے ایک ہی تذکرہ لفظ بدل بدل کر بہت سوروں میں کیا گیا ہے چنانچہ اس سورے میں بھی حسب ذیل مضامین ہیں جو بلاشبہ دوسرے سوروں میں اکثر موجود ہیں جیسے:

## سورۃ احقاف کے خاص خاص مضامین

- ۱..... کائنات بے کار پیدا نہیں ہوئی ہے، نہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیدا کی گئی ہے۔
- ۲..... اللہ کے سوا کسی دوسرے کے آثار قدرت تم دکھانہیں سکتے۔
- ۳..... تمہارے معبود قیامت میں تمہارے کام نہیں آئیں گے۔
- ۴..... رسولؐ کوئی انوکھا پیغام لے کر نہیں آئے ہیں، نہ اپنی طرف سے کچھ کہتے ہیں۔
- ۵..... راہ حق میں ثابت قدم رہنے کی تعریف۔
- ۶..... والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اور ماں کے حق پر خصوصی توجہ دہانی۔
- ۷..... حمل اور دودھ بڑھائی کی مجموعی مدت جو ایک دوسری آیت قرآنی کے ساتھ مل کر ایک خاص حکم فقہی کی بنیاد ہے۔
- ۸..... جنات کے ایک گروہ کا آیات قرآنی سننے پر تاثر اور پھر اس کی تبلیغی کارگزاری۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

حَمْدٌ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۲ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ  
وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۳ وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا اُنذِرُوا  
مُعْرِضُونَ ۴

”حا، میم۔ اس کتاب کا اتارا جانا ہے اللہ کی طرف سے جو غالب ہے، صحیح کام کرنے والا۔ ہم نے نہیں پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو مگر حق بجانب طور پر اور ایک مقررہ مدت تک کے لیے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان تینہوں سے جو انہیں کی جاتی ہیں روگردانی کرنے والے ہیں۔“

”حق بجانب طور پر“ یعنی نہ تو بے کار و بے مقصد اور غلط طور پر [۱] اور، یعنی قیامت سے پہلے تک کے لیے۔ [۲]

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ ط اِيْتُونِي بِكِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هَذَا أَوْ آثَرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنْتُمْ

صِدِّقِينَ ﴿۴﴾

”کیسے کیا تم نے غور کیا ہے جنہیں تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ انہوں نے زمین کی چیزوں میں سے کیا پیدا کیا ہے یا ان آسمانوں میں کوئی شرکت ہے؟ یا کوئی علمی روایت اگر تم سچے ہو، یعنی پہلے کی کسی کتاب میں دکھا دو یا پہلے کے کسی صاحب علم کا بیان ہی پیش کر دو جس میں بتایا گیا ہو کہ اللہ کے سوا کسی نے کائنات کی کسی چیز کو پیدا کیا ہے۔ [۳]

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنِ دُعَائِهِمْ غَفْلُونَ ﴿۵﴾ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كُفْرِينَ ﴿۶﴾

”اور کون اس سے زیادہ گمراہ ہوگا کہ جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارے جو قیامت تک اس کی آواز پر لبیک نہیں کہے گا اور وہ ان کی عبادت سے بے خبر ہیں اور جب لوگ محشر میں جمع ہوں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پوجا پاٹ سے منکر ہوں گے۔“

پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا سمجھ کر اس کی ڈہائی دے [۴] جیسا کہ مشرکین معبودانِ باطل سے فریاد کرتے ہیں۔

وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَذَا

[۱]۔ لم نخلقها عبثا ولا لاسدى (تنبيان)

[۲]۔ اجل مسمى يعنى يوم القيامة (مجمع البيان)

[۳]۔ بقیة من علم یوثر عن الاولین (جلالین)

[۴]۔ یوجہ عبادتہ (تنبيان)

## سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٤﴾

”اور جب اُن کے سامنے ہماری کھلی ہوئی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کافر لوگ حق کے لیے کہتے ہیں، جب وہ ان کے پاس آیا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ کافروں کا جادو کہنا قرآن میں بہت جگہ آیا ہے جو ان کے اس احساس کا ترجمان ہے کہ وہ غیر معمولی چیز یعنی ”خارق عادت“ ضرور ہے۔“  
یہ درحقیقت اس کے معجزہ ہونے کا ایک طرح اقرار ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۗ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۗ هُوَ أَعْلَمُ

بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۗ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٨﴾  
”کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ گڑھ لیا ہے تو کہیے کہ اگر میں نے اسے جھوٹ گڑھا ہے تو تم اللہ کے مقابلے میں میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے، وہ خوب جانتا ہے جو تم چرچے کرتے ہو، وہ کافی ہے بحیثیت گواہ کے میرے اور تمہارے درمیان۔ وہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان۔“

یہاں ان کے جواب میں جو کہا گیا ہے، وہ درحقیقت ”معجزہ“ کی حقانیت پر اہم عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی طرف نسبت دے کر اگر غلط دعویٰ کیا جائے تو یقیناً اللہ کو اس کا علم ہوگا لہذا وہ اسے باطل کریگا، اب اگر وہ ایسا نہ کرے تو سمجھنا چاہئے کہ دعویٰ سچا ہے اور اس کے ثبوت میں جو پیش کیا گیا ہے، وہ حقیقت میں معجزہ ہے اس دلیل عقلی پر ہمارے ”مقدمہ تفسیر“ میں بسطاً تبصرہ موجود ہے۔ ”کافی ہے بحیثیت گواہ“، یعنی اس کی طرف سے ثابت ہو جائے گا کہ دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا [۱] رہ گیا یہ کہ وہ تمہیں پھر اس کو جھٹلانے کی سزا کیوں نہیں دیتا؟ تو یہ اس لیے ہے کہ وہ تمہیں موقع دیتا ہے کہ شاید اب تم اپنے انکار سے باز آ جاؤ تو وہ معاف کر دے کیونکہ وہ ”غفور الرحیم“ ہے۔ [۲]

قُلْ مَا كُنْتُ بِدَعَاؤِ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۗ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا

مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٩﴾

”کہیے کہ میں پیغمبروں میں کوئی انوکھا نہیں ہوں اور مجھے نہیں خبر کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ میں تو نہیں پیروی کرتا مگر اُس کی جو میری طرف وحی ہوتی ہے اور میں نہیں ہوں مگر صاف صاف ڈرانے والا“  
”انوکھا نہیں“، یعنی میری تعلیم اصولی طور پر کوئی نہیں بلکہ بنیادی طور پر وہی تعلیم ہے جو ہمیشہ انبیاء و مرسلین دیتے چلے آئے یا صرف یہ مقصود ہو کہ پہلے پہل مجھ ہی کو رسالت نہیں ملی ہے بلکہ پہلے بھی انبیاء و مرسلین آتے رہے ہیں۔ زیادہ تر مفسرین یہی مفہوم قرار دیتے ہیں۔ [۳]

[۱]۔ يشهد منا والمبطل (تبیان)

[۲]۔ لا يعجل بالعقوبة قال الزجاج هذا دعاء لهم الى التوبة (مجمع البيان)

[۳]۔ قال ابن عباس وجاهد وقتادة معناه ما كنت باول رسول بعث (تبیان) قد سبق مثل قبل كغير فكيف تكذبوني (جلالین)



”اور مجھے نہیں خبر“ یعنی ذاتی طور پر بغیر اللہ کی طرف سے علم ملے ہوئے ”میرے ساتھ کیا جائیگا اور تمہارے ساتھ“۔ اس میں بظاہر کہنا یہ ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا تم پر کیا عذاب نازل ہوگا؟ مگر ان کے ساتھ اپنے کو شریک کر دینا کہ ”میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ“ یہ ایک کھلا ہوا انداز رواداری ہی ہے۔

**قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَأَمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٥﴾**

”کیسے کہ کیا تم نے غور کیا ہے؟ اگر وہ اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کے ساتھ کفر اختیار کیا حالانکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے ایسے ہی پیغمبر کے آنے کی گواہی دی ہے تو وہ تو ایمان لایا اور تم نے سرکشی سے کام لیا ہے بلاشبہ اللہ ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچایا نہیں کرتا“

”کیا تم نے غور کیا ہے اگر ایسا ہوا“ اس کا مطلب بظاہر اس طرح کا استدلال ہے جو امام نے ایک منکر خدا سے کہا تھا کہ اگر خدا نہ ہوا تو ہم اور تم برابر یعنی اقرار خدا سے ہمیں کوئی نقصان تو پہنچے گا نہیں اور اگر خدا ہوا اور تم اس کا انکار کر رہے ہو، تو تم اپنے انجام پر غور کرو۔<sup>[۱]</sup>

بنی اسرائیل کے گواہ سے مراد سابق زمانے کے پیغمبر موسیٰ و عیسیٰ بھی ہو سکتے ہیں لیکن مفسرین اہل سنت اس سے مراد لیتے ہیں وہ یہودی مثلاً عبد اللہ بن سلام جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا اس کی رد میں کہا گیا ہے کہ یہ سورہ مکہ ہے اور ابن سلام نے مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے۔<sup>[۲]</sup> اس کے علاوہ میرے ذہن میں ایک یہ پہلو ہے کہ اب تو پیغمبر خدا ذاتاً موجود تھے تو جو ایمان لاتے تھے وہ آپ کی شخصیت پر لہذا گواہی کے ساتھ علیہ کا لفظ ہونا چاہئے علیٰ مثلاً سے ظاہر ہوتا ہے جو گواہی تھی وہ اوصاف کے ساتھ تھی جو آپ پر منطبق ہیں۔ یہ انبیاء ماسلف کی گواہیاں ہو سکتی ہیں۔ پھر یہ کہ مدینہ میں یہودیوں کے علاوہ جو تھے، وہ انصار تھے، یہ بیچارے پہلے ہی ایمان لائے تھے، اسی بنا پر تو آپ کی ہجرت ہوئی اور وہ انصار کہلائے تو پھر ان سے کس طرح کہا جاتا کہ وہ ایمان لائے اور تم نے سرکشی سے کام لیا۔ اس لیے قوت پہلے قول کو معلوم ہوتی ہے کہ اس سے انبیاء بنی اسرائیل مراد ہیں مگر اس سے ”کچھ ذہن میں خلش محسوس ہوتی ہے شہادہ کی تکمیل وحدت سے جس سے معنی ہوئے ”ایک گواہ بنی اسرائیل میں سے“ حالانکہ گواہی دینے والے انبیاء بنی اسرائیل تو بہت ہیں اور خصوصیت کے ساتھ موسیٰ اور عیسیٰ مراد ہوں تو وہ بھی دو (۲) ہیں نہ کہ ایک اور وہ بھی جیسے غیر معروف کوئی اسرائیلی۔ یہ الفاظ انبیاء کی گواہی پر کچھ کھپتے نہیں اس لیے کیوں یہ سمجھا جائے کہ عبد اللہ بن سلام نہیں جو مدینہ میں اسلام لایا، کوئی یہودی یا عیسائی جس کا نام ہمیں نہیں معلوم، اس نے مکہ میں اسلام اختیار کیا تھا اور قرآن اس کی گواہی اور ایمان اختیار کرنے کو مشرکین کے سامنے پیش کر کے ان کی قبائلی عصیت کی بنا پر جیسے غیرت دلارہا ہے کہ دیکھو ایک دوسری نسبی شاخ بنی اسرائیل کے آدمی نے تو گواہی دی اور ایمان اختیار کیا اور تم جو رسول خدا کے ہم جدی یعنی بنی اسماعیل میں سے ہو سرکشی سے کام لے رہے ہو!۔

[۱]۔ اخبرونی ماذا حالکم جواب الشرط بما عطف علیہ الستم الظالمین دل علیہ: ان الله لا يهدي القوم الظالمین (جلالین)

[۲]۔ قال مسروق الشاهد من بنی اسرائیل هو موسیٰ بنی قال لان السورۃ مکیة ابن سلام اسلم بالمدينة (تبیان)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ وَإِذْ لَمْ  
يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَذَا أَفْكٌ قَدِيمٌ ۝

”اور کہا انہوں نے جو کافر ہیں انکے لیے جو ایمان لائے ہیں کہ اگر یہ کوئی اچھی بات ہوتی تو یہ ہم پر اس میں سبقت نہ کرتے اور جب انہوں نے اس سے صحیح راستہ نہ پایا تو وہ یہ بھی کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے“ یہ ان کی عجیب و غریب منطق تھی کہ وہ اپنے کو معیار حق اور دوسروں کو معیار باطل قرار دے رہے تھے کہ اگر یہ صحیح راستہ ہوتا تو یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ دوسرے اس میں آگے بڑھ جائیں اور ہم اس میں پیچھے رہیں حالانکہ حق خود نا قابل تبدیل معیار ہے۔ دوسروں نے اگر اس کے اختیار کرنے میں سبقت کی تو یہ ان کے خوش نصیب ہونے کی دلیل ہے اور یہ اگر اس کے اختیار کرنے میں پیچھے رہے تو یہ ان کی بد نصیبی کی دلیل ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهِ كَتَبَ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۖ وَهَذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانِكَ عَرَبِيًّا  
لِيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ ۝

”اور اس کے پہلے موسیٰ کی کتاب پیش رو بن کر آئی تھی اور رحمت اور یہ ایک تصدیق کرنے والی کتاب ہے عربی زبان میں تاکہ متنبہ کرے انہیں جو ظالم ہیں اور خوش خبری نیک اعمال لوگوں کے لیے“۔

اس کے پہلے کی کتاب یعنی توریت کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین کا اس قرآن کو نہ ماننا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کے پہلے انہوں نے توریت کو کب مانا؟ اور توریت کو ”پیش رو“ اس لیے کہا گیا ہے کہ کتب سماوی میں جو چار ہیں، وہ سب سے مقدم ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ  
يَحْزَنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ جَزَاءً لِّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

”بلاشبہ وہ جنہوں نے کہا کہ ہمارا مالک اللہ ہے، پھر اس اقرار پر برقرار رہے، انہیں کوئی ڈر نہیں ہے اور نہ انہیں افسوس ہوگا۔ یہ بہشت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے، صلے میں اس کے جو وہ کرتے تھے“۔

### ایمان پر برقرار رہنے کا اجر

یہ تعریف ان کی جو حق پر قائم رہتے تھے اور باطل کے سامنے سر نہیں جھکاتے، دوسری لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے بیعت یزید سے انکار پر قائم رہتے ہیں۔ دنیا والے انہیں ”ضدی“ کہتے ہیں اور اپنی بات پر قائم رہنے کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ ”ضد سے کام لیا“، مگر قرآن اس کی تعریف کر رہا ہے اور ان کے کردار کو مثالی حیثیت سے پیش کر رہا ہے۔ ”خوف“ سے جس کی نفی ہوئی ہے دنیا کے مصائب کا ڈر مراد نہیں ہے یہ ڈر تو

[۱]۔ فی الکلام محذوف یتسم بہ المعنی تقدیر لافلم یتدوبہ (مجمع البیان)

خاصان خدا کے لیے انواع ابتلاء میں سے ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:-

وَلَمَّا بَلَغْتُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ.

اور ضرور ہم تمہاری آزمائش کریں گے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ: ڈر، بھوک اور مال، جان اور پھلوں کا نقصان۔ (البقرہ- ۱۵۵)

پھر جب اس آیت میں انواع ابتلاء میں سب سے پہلے خوف کا ذکر ہے تو اس کی نفی کیوں کر ہو سکتی ہے بلکہ ڈر سے مراد انجام کی ناکامی کا ڈر ہے اور آخرت کے مواخذے کا اور رنج و ہاں کے ہولناک مناظر کو دیکھ کر۔<sup>[۱]</sup> اس کے علاوہ یہ رنج جسکی اُن سے نفی ہوتی ہے، اپنے کئے ہوئے پر پچھتاوا بھی ہو سکتا ہے یعنی یہ افسوس کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟ نہ غم و رنج جو نقصان جان و مال اور عزیزوں کے داغ اٹھانے کا لازمی نتیجہ ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ط حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ط

وَحَمَلُهُ وَفِضْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ط حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۖ قَالَ

رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتِكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ

صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۗ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۵﴾

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي

أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ط وَعَدَّ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۱۶﴾

اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی۔ اس کی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا زحمت کے ساتھ اور اسے جنم بھی دیا زحمت کے ساتھ اور اس کے پیٹ میں رہنے اور دودھ سے چھوٹنے کی مدت تیس (۳۰) مہینے ہوئی، یہاں تک کہ جب وہ جوان ہوا اور چالیس (۴۰) برس تک پہنچا تو اس نے کہا اے میرے پروردگار! مجھے توفیق عطا کر کہ میں شکر ادا کروں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں نیک کام کروں اور میرے لیے میری اولاد میں نیکی قائم رکھ۔ میں تجھ سے لو لگائے ہوں اور میں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہوں، یہ وہ ہیں کہ ہم قبول کریں گے اُن سے بہترین اعمال جو انہوں نے کئے ہوں اور ان کی غلطیوں سے درگزر کریں گے، جنت والوں میں۔ یہ سچا وعدہ ہے جو برابر سے ہوتا رہا تھا۔“

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ماں کے حق پر خصوصی توجہ دہانی

حمل اور دودھ سے چھوٹنے کی مجموعی مدت چونکہ یہاں تیس (۳۰) مہینے بتائی گئی ہے اور دوسری جگہ قرآن میں رضاعت یعنی دودھ پلانے کی مدت: حولین کاملین ”دو سال پورے“ بتائی گئی ہے۔ (۳۰) مہینے سے دو (۲) سال نکالنے کے بعد چھ (۶) مہینے بچتے ہیں جس سے

[۱] لا خوف علیہم من العقاب فی الآخرة ولا یجزون من احوال القیامة (تبیان)

علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ کم از کم مدت حمل از روئے قرآن چھ مہینے ہے۔<sup>[۱]</sup> تو مفہوم آیت ہے جو عام ہے اور اس سے یہ حکم شرعی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی بچہ شادی ہونے کے بعد چھ (۶) مہینے گزرنے پر پیدا ہو تو اسے حلال سمجھا جائے گا اور وہ اسی باپ کی اولاد سمجھا جائے گا جس سے اس عورت کی شادی ہوئی۔ یہ ہے مفہوم کی وسعت کا نتیجہ مگر چونکہ واقعات کی دنیا میں مذہبی تاریخ میں یہ آیا ہے کہ یہ بات اولین حضرت یحییٰ کے لیے تھی کہ وہ ماں کے پیٹ میں بس چھ (۶) مہینے رہے اور اس امت میں یہ چیز حضرت امام حسینؑ کے لیے ہوئی کہ آپ بطن مادر میں چھ (۶) مہینے رہے، اس لیے بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ یہ آیت امام حسینؑ کی شان میں اتری ہے<sup>[۲]</sup> اور یہ بھی ایک روایت ہے اُن آیات میں سے جن سے ان کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو ائمہ معصومینؑ کے بحیثیت انسان تذکرہ پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ دیکھیں کہ قرآن ان حضرات کا تذکرہ انسان ہی کہہ کر کرتا ہے۔

وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَّكُمَا أَتَعِدُنِيَّ أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِنْ  
قَبْلِي ۗ وَهُمَا يَسْتَعْجِلِينَ اللَّهَ وَيَلْتَكِمَانِ ۚ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَيَقُولُ مَا هَذَا  
إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝۱۵ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ  
مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ۝۱۸ وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ عَمَلًا  
عَمَلُوهَا ۗ وَلِيُؤَفِّفَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۱۹

اور وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا ”افوہ! میں تم دونوں سے عاجز آ گیا، کیا تم مجھے امید دلاتے ہو کہ میں (پھر اٹھا قبر سے) نکالا جاؤں گا حالانکہ کتنی ہی نسلیں میرے پہلے گزر چکی ہیں اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے رہے، ارے وائے ہو تجھ پر ایمان لے آ۔ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے تو وہ یہی کہتا رہا کہ یہ نہیں ہے مگر پرانے قصے۔ یہ وہ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ نافذ ہو چکا ہے ان قوموں کے ضمن میں جو آدمیوں اور جنات میں سے اُس کے پہلے گزر چکی ہیں۔ بلاشبہ وہ لوگ گھاٹے میں تھے اور ہر ایک کو جو انہوں نے عمل کیے ہیں۔ اسی لحاظ سے درجے حاصل ہوتے ہیں اور یہ اس لیے کہ انہیں اُن کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔“

شان نزول جو مستند طریقے سے وارد نہیں ہوئی، صرف ایک نقل قول کی حیثیت کی رکھتی ہے، اس محل پر عبدالرحمان بن ابوبکر کا نام آیا ہے اور کتب تاریخ میں ملتا ہے کہ جب عبدالرحمان بن ابوبکر نے بیعت یزید سے انکار کیا تو امیر شام نے کہا کہ اس شخص کے بارے میں تو یہ آیت قرآن اتری ہے۔<sup>[۳]</sup> اس پر جناب عائشہ نے انکار کیا اور بتایا کہ نہیں، یہ آیت دوسرے شخص کے بارے میں آئی ہے، ان کے لیے نہیں رہے۔ بہر حال

[۱] اکثر مدّة الرضاع اربعة وعشرون شهرا و اقل مدّة الحمل سنته اشهر (تبیان)

[۲] كان الحسينؑ في بطن امه سنته اشهر وفضاله اربعة وعشرون شهرا او هو قول الله: وحمله وفضاله ثلاثون شهرا (علی ابن

ابراہیم)

[۳] قيل ان الآية نزلت في عبد الرحمن بن ابی بکر (مجمع البیان)

آیت کا مضمون کسی خاص نام سے وابستہ نہیں ہے۔ جو کوئی بھی ایسا ہو، اُس کے لیے یہ باتیں ہیں جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلْأَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ  
الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۖ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ  
تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۖ وَمِمَّا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿٢٥﴾

”اور جس دن کافر لوگ آگ کے سامنے لائے جائیں گے، تم نے اپنی سب دولتیں اپنی دنیاوی زندگی میں ختم کر دیں اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ اب آج تمہیں ذلت کے عذاب کی سزا ملے گی اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناپق سرکشی سے کام لیتے تھے اور اس لیے کہ تم بد اعمالی میں مبتلا تھے۔“

وَأذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَّتِ الْبُيُوتُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ  
وَمِنْ خَلْفِهِ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٢٦﴾

”اور یاد کرو عادی کی برادری والے کو جب انہوں نے اپنی قوم کو احقاف میں متنبہ کیا اور بہت سے متنبہ کرنے والے ان کے آگے اور پیچھے گزر چکے ہیں کہ عبادت نہ کرو کسی کی سوائے اللہ کے۔ میں تمہارے لیے ڈرتا ہوں ایک بڑے دن کے عذاب سے“

احقاف اُس نخلے کا نام تھا جو قبیلہ عاد کا مسکن تھا، چونکہ احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں اور وہاں بڑے بڑے ٹیلے تھے، اس لیے اس کا نام ”احقاف“ ہوا۔ اس کے محل وقوع کے بارے میں قدیم مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے ان اقوال کو شیخ الطائف نے تیان میں درج فرمایا ہے اور عاد کی برادری والے سے مراد جناب ہود ہیں جو اسی قوم سے تھے اور اس کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ”بہت سے پیغمبر ان کے آگے اور پیچھے گزر چکے ہیں“ اس سے جناب ہود کا دور بتانا ہے کہ وہ وسطی دور سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ ان کے قبل بھی بہت سارے انبیاء آچکے تھے اور ان کے بعد بھی بہت سے انبیاء آئے۔ نہ یہ کہ جب وہ آئے تو بہت سے انبیاء ان کے قبل اور بعد گزر چکے تھے کیوں کہ جب وہ انبیاء ان کے بعد تھے تو اس وقت ان کے لیے گزرنے کا اطلاق کہا صحیح ہو سکتا ہے؟

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَأْفِكَنَا عَنِ الْهَيْتِنَا ۖ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا ۖ إِنْ كُنْتُمْ مِنَ  
الصَّادِقِينَ ﴿٢٧﴾ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَكِنِّي  
أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿٢٨﴾

”ان لوگوں نے کہا کہ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے منحرف کر دو تو لے آؤ“ ہم پر اسے جس سے ہمیں دھمکاتے ہو اگر تم سچے ہو۔ کہا (اس کا) علم بس اللہ کو ہے اور میں تو تم تک اسے پہنچاتا ہوں جس پیغام کے

ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے مگر میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ جہالت سے کام لیتے ہو،  
”علم بس اللہ کو ہے، یعنی عذاب کا صحیح وقت کہ کب آئے گا؟ میرے حدود علم سے باہر ہے۔“

فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَّتِهِمْ ۖ قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۗ بَلْ  
هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ ۗ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣٧﴾ تَدْمِرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا  
فَأَصْبَحُوا آلا يَرَى إِلَّا مَسَكِنَتَهُمْ ۗ كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿٣٨﴾

”تو جب انہوں نے اسے ایک بادل کی صورت میں جو ان کی وادیوں کی طرف رخ کیے ہوئے تھا دیکھا تو کہنے لگے یہ بادل ہے جو ہم پر پانی برسائے گا بلکہ یہ وہ ہے جس کے لیے تم جلدی کر رہے تھے ایک ہوا جس میں دردناک عذاب ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے پروردگار کے حکم سے تباہ کر دے گی چنانچہ ان کا یہ عالم ہو گیا کہ سوائے ان کے مکانات کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس طرح ہم سزا دیتے ہیں گناہگار لوگوں کو“

وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ قِيَمَانَ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَآبْصَارًا وَأَفْئِدَةً ۗ فَمَا  
أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا

يَجْحَدُونَ ۗ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٣٩﴾

”اور ہم نے انہیں اقتدار دیا تھا اتنے حلقے میں کہ جس میں تمہیں اقتدار نہیں دیا ہے اور ان کے لیے ہم نے طاقت سماعت اور نگاہیں اور دل قرار دیئے تھے تو نہیں فائدہ پہنچایا انہیں انکی سماعت نے اور نہ نگاہوں نے اور نہ دلوں نے کچھ بھی جبکہ وہ آیات الہی کا جان بوجھ کر انکار کرتے تھے اور گرفتار کیا انہیں اسی نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے“

یعنی وہی عذاب جس کی خبروں کو سن کر وہ ہنسی میں اڑاتے تھے، اب انہیں گھیرے ہوئے تھا۔ ”کان، آنکھیں اور دل سب انہیں دیے گئے تھے یعنی تمام ذرائع ادراک جن سے وہ آیات الہی اور قدرت کی نشانیوں کو سن بھی سکتے تھے، دیکھ بھی سکتے تھے اور ان پر غور بھی کر سکتے تھے، یہ چیزیں اگر انہیں دی نہ گئی ہوتی تو وہ معذور تھے مگر یہ سب چیزیں انہیں دی گئی تھیں اور انہوں نے ان سب سے فائدہ نہیں اٹھایا [۱] اس لیے وہ عذاب الہی کے مستحق ہیں۔

وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرَىٰ وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤٠﴾  
فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً ۗ بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ ۗ  
وَذَلِكَ إِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٤١﴾

[۱]۔ لم یمنفعهم جمیع ذالک لا تمہم لم یعتبروہا ولا فکروا فیہا (تبیان)

”اور ہم نے ہلاک کیا ہے تمہارے گرد و پیش کی بستیوں کو اور بار بار (حق کی) نشانیاں پیش کی تھیں، شاید وہ پلٹیں تو کیوں نہ انکی مدد کی انہوں نے جنہیں انہوں نے تقرب کے طور پر اللہ کے سوا خدا بنا رکھا تھا بلکہ وہ ان سے غائب ہو گئے اور اب یہ ہے ان کا جھوٹ اور جو کچھ وہ من گھڑت باتیں بناتے تھے۔“  
یعنی یہ نتائج ان کی باطل پرستی اور غلط روی کے ہیں جو تمام دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ ۖ فَلَمَّا حَصَرُواْ وَقَالُواْ  
أَنْصِتُواْ ۖ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْاْ إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُّندِرِينَ ﴿٣٩﴾ قَالُوا يٰقَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا  
كِتَابًا أَنْزَلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقِ  
مُّسْتَقِيمٍ ﴿٤٠﴾ يٰقَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرَ لَكُمْ مِّن ذُنُوبِكُمْ  
وَيُجْزِكُمْ مِّن عَذَابِ آلِيمٍ ﴿٤١﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي  
الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءُ ۗ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٤٢﴾

”اور جب ہم نے موڑا آپ کی طرف جنات کے کچھ افراد کو جو غور سے قرآن سن رہے تھے تو جب وہ آپ کے پاس آئے، آپس میں کہنے لگے خاموش سنتے رہو تو جب آپ پڑھ چکے تو وہ اپنی قوم کی طرف پلٹے ہدایت کرتے ہوئے، کہنے لگے اے ہماری قوم والو! ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد اتاری گئی ہے تصدیق کرتی ہوئی اُس کی جو اس کے پہلے ہے، وہ ہدایت کرتی ہے حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف۔ اے ہماری قوم والو! البیک کہو اللہ کی طرف بلانے والے کی صدا پر اور اس پر ایمان اختیار کرو کہ وہ سچے کچھ تمہارے گناہ اور تمہیں پناہ دے دردناک عذاب سے اور جو البیک نہ کہے اللہ کی طرف بلانے والے کی صدا پر تو وہ دنیا میں قبضہ قدرت سے باہر نکلنے والا نہیں ہے اور نہ اس کے لیے اسے چھوڑ کر کوئی حوالی موالی ہوں گے۔ یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں“

قرآن مجید کے متعدد آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت پیغمبر خدا کے دائرہ رسالت میں جنات بھی تھے [۱] لیکن دوسرے آیات سے یہ بھی بلاشبہ ثابت ہے کہ پیغمبروں کو اور جو رہنمائے خلق ہوں اُس مخلوق کا ہم جنس ہونا چاہیے، جو عقلی طور پر بھی ضروری ہے۔ ان دونوں باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم نے ایک محل پر اسی تفسیر میں یہ رائے قائم کی ہے کہ کتابی رہنمائی اور اقوال سے ہدایت کے دائرہ میں تو دوسری جنس یا دوسری نوع کے افراد بھی داخل ہو سکتے ہیں مگر عملی رہنمائی انہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو جنس و نوع میں متحد ہوں، یعنی دعوت اطاعت میں اتحاد جنس و نوع کی شرط نہیں ہے لیکن دعوت اتباع میں شرط ہے اور نوع انسانی کو چونکہ دعوت اتباع بھی ہے لہذا رسول اور امام کو لازماً انسان اور بشر کی نوع میں داخل ہونا ضروری ہے۔

[۱]۔ کان مبعوثا الی الجن کما کان مبعوثا الی الانس (مجمع البیان)

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْزُبْ عَنْهُمُ قَدِيرٌ عَلَيْهِ  
أَنْ يُعَذِّبَهُمُ الْمَوْتُ بِبَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٤﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا  
عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا قَالُوا فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا  
كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٥﴾

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوا، وہ قادر ہے اس پر بھی کہ مردوں کو زندہ کرے، کیوں نہیں؟ یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس دن کافر لوگ آگ کے سامنے لائے جائیں گے، کیا یہ سچ نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں؟ قسم ہمارے پروردگار کی، اُس نے کہا کہ پھر چکھو اس عذاب کو اس وجہ سے کہ تم انکار کرتے تھے“

مشرکین عرب اللہ کو مانتے تھے اور اسے خالق آسمان و زمین بھی جانتے تھے لیکن حیات بعد الموت ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس لیے قرآن نے بار بار ابتدائی تخلیق کو جسے وہ مانتے تھے، ان کے سامنے پیش کر کے انہیں متنبہ کیا ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ ط كَأَنَّهُمْ يَوْمَ  
يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ ۗ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ط بَلَّغْ ۗ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا  
الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٣٥﴾

”تو صبر و برداشت سے کام لیجئے جس طرح صبر کیا اور اولو العزم رسولوں نے اور ان کے لیے جلدی نہ کیجئے، گویا وہ جب دیکھیں گے اُسے جس عذاب کی انہیں خبر دی جا رہی ہے تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ نہیں رہے تھے (دنیا میں) مگر دن کے ایک مختصر حصے میں یہ پیغام پہنچا دینا ہے تو ہلاکت میں کیا فاسق لوگوں کے علاوہ کوئی اور پڑیں گے؟“

### الو العزم پیغمبروں کی تعداد

بعض نے اولو العزم کے لغوی مفہوم کے لحاظ سے یعنی ”ہمت والے“ کہا ہے کہ سب ہی انبیا اور اولو العزم تھے اور من الرسل میں من بیان یہ ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ صاحب ہمت لوگ جو تمام پیغمبر تھے، مگر دینی اصطلاح یہ ہے کہ اولو العزم، رسولوں میں سے کچھ خاص پیغمبر تھے اور اس طرح من تعین کے لیے قرار پاتا ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ رسولوں میں سے وہ جو صاحب عزم تھے۔ اب یہ اولو العزم پیغمبر کون ہیں؟ ان میں اختلاف ہے لیکن جو ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام سے مروی ہے، وہ یہ کہ یہ وہ صاحب شریعت پیغمبر ہیں جن کے لائے ہوئے قانون سے سابق شریعت منسوخ ہوئی ہے وہ یہ پانچ ہیں: حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آخر میں ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ [۱]

[۱] - هو المروى عن ابى جعفر عليه السلام و ابى عبد الله عليه السلام (مجمع البيان)



# سُورَةُ مُحَمَّدٍ

مدنیہ۔۔۔۔۔ ۳۸۔۔۔۔۔ آیات

چونکہ اس سورے کے شروع کی دوسری ہی آیت میں ہمارے پیغمبر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی درج ہے، اس سورے کا نام حضرت کے نام پر ہوا۔

## سورہ محمد کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... دشمنوں سے جنگ کی صورت میں مسلمانوں کو ہدایتیں۔
- ۲..... شہدائے راہ حق کے لیے حسن انجام کی بشارتیں۔
- ۳..... خدا کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔
- ۴..... کافروں کی لذات دنیا سے متمتع ہونا مثل چوپایوں کے ہے لیکن انجام ان کا دوزخ ہے۔
- ۵..... رسول کے خطبوں میں بعض حاضر ہونے والوں کی حالات۔
- ۶..... پیغام جہاد سن کر بعض مسلمانوں کی حالت۔
- ۷..... کچھ ذمہ دار مسلمانوں کو انتہاء کہ اقتدار حاصل ہونے کے بعد ان کا کردار کیا ہوگا؟
- ۸..... قرآن میں غور و فکر سے کام لینے کی دعوت اور اس کے خلاف جانے کی مذمت۔
- ۹..... منافقین کا لب و لہجہ، ان کی پردہ کشائی کے لیے کافی ہے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ① وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ② كَفَرُوا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ③

”وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اُس نے ان کے اعمال کو اکارت کر دیا اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کئے اور اس پر جو محمدؐ پر اتارا گیا، ایمان لائے اور وہ سراسر حق ہے ان کے پروردگار

کی طرف سے تو اُس نے اُن کی غلطیوں سے درگزر کیا اور اُن کی حالت کو درست کیا“

اصل اعمالِ لہم جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ”ان کے اعمال کو اِکارت کر دیا“..... اس میں ظاہر ہے کہ اعمال سے مراد وہی اعمال ہیں جو ذاتاً خیر ہیں اور شرائطِ صحت کے وجود کی صورت میں باعثِ ثواب ہوتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

لیکن چونکہ ایمان بنیادی طور پر شرطِ نجات ہے جو ان میں مفقود ہے لہذا ان کے اعمال اِکارت ہو جاتے ہیں یعنی ان کا کوئی اجر انہیں حاصل نہ ہوگا۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے لیکن بعض حضرات نے اسے علمِ کلام کے مسئلہ ”احباط“ سے مرتبط کر کے ذرا پیچیدہ طور پر توجیہ کی ہے کہ وہ کفار ان کے اعمال کو غلط طور پر انجام دیتے ہیں مثلاً وہ خیرات کرتے ہیں تو کفار و مشرکین پر کرتے ہیں یا غلط مقاصد میں صرف کرتے ہیں اس لیے ان کا ثواب نہیں ملتا۔ ہمارے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ تشریحِ غلط ہے اس بنا پر کہ کتنے ہی بجائے خود اچھے کاموں میں وہ صرف کریں اور مومنین و صالحین ہی کو دیں، تو کیا انہیں باوجود کفر اس پر اجر و ثواب ملے گا؟

جناب شیخ طائفہ نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے کہ اللہ ان کے اعمال پر یہ حکم لگا تا ہے کہ یہ گم ہیں یعنی کالعدم ہیں بظاہر اس کا نتیجہ وہی ہے جو عرض کیا گیا۔ دوسری بات آیت میں قابلِ غور یہ ہے کہ سرنامہ کلام ہے: الذین آمنوا و عملوا الصالحات اس کا مطلب ہوا نیکو کار مسلمان۔ اب اس کے بعد مزید جو کہا گیا ہے: و آمنوا ایمان نزل علی محمد و هو الحق من الربہم اور ایمان لائے اس پر جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا اور وہ سراسر حق ہے ان کے پروردگار کی جانب سے، تو کیا اس سے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ یہ کوئی خاص نازل ہونے والی اہم بات ہے جسے نیکو کار مسلمانوں کے لیے حسن انجام کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ جب ہمیں مل جاتا ہے قرآن میں ایسی اہم بات کا پتہ جس کے لیے رسولؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:-

بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ. وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (البائتہ ۵-۶۷)

”پہنچا دیجیے اسے جو آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو کچھ اس کی رسالت پہنچائی ہی نہیں۔ تو دل یہ کہتا ہے کہ وہ ما نزل علی محمد جسے ایمان اور عمل صالح کے ساتھ خصوصیت سے کہا گیا ہے۔ وہ یہی ”ما نزل الیک من ربک“ والا اہم پیغام ہو سکتا ہے جس کے پہنچانے بغیر رسولؐ کی پوری تبلیغ کالعدم ہو رہی تھی تو ایک مسلمان کا اسلام بغیر اس کے مانے ہوئے کب نتیجہ خیز ہو سکتا ہے!-

ذٰلِكَ بِأَنَّ الدِّينَ كَفَرُوا وَاتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَأَنَّ الدِّينَ آمَنُوا وَاتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ

رَبِّهِمْ ط كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝۳

”یہ اس بنا پر ہے کہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، انہوں نے باطل کی پیروی کی اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا، انہوں نے اپنے پروردگار کی طرف کے حق کی پیروی کی۔ اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کے اوصاف بیان کرتا ہے۔“

[۱] - اعمالہا اللہ کان فی زعمہم اثمہا قربة و اثمہا تنفعہم کالعتق والصدقة و قری الضیف. (جمع البیان)

امثال کا ترجمہ و اوصاف کے ساتھ اس لفظ کے ان معنی کے مطابق ہے جو متعدد جگہ قرآن مجید میں موجود ہیں جیسے:

مِثْلُ الْجَنَّةِ النَّبِيِّ وَعِدَ الْمُتَّقُونَ ط تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (الرعد ۳۵)

(تا آخر آیت) ظاہر ہے کہ وہاں کوئی مثال نہیں دی گئی ہے بلکہ معنی یہی ہیں کہ اس جنت کا وصف یہ ہے یہی معنی یہاں بھی ہیں۔<sup>[۱]</sup> علامہ طبرسی نے امثال کو مثالوں ہی کی معنی میں لے کر کئی مفہوم درج کیے ہیں جن میں سے کوئی بھی دل کو لگنے والا نہیں ہے۔

فَإِذَا لَقِيْتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتَّىٰ إِذَا أَتَّخِذْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا  
الْوَتَاكَ ۖ فَمَا مَثًّا بَعْدُ وَإِنَّمَا فِدَاءٌ حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۗ ذَٰلِكَ ۖ وَلَوْ  
يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرْنَا مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ أَعْضَابَكُم بِبَعْضٍ ط وَالَّذِينَ قَتَلُوا فِي  
سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَيُدْخِلُهُمْ  
الْجَنَّةَ عَرَفَهَا آلَهُمْ ۖ

”تو جب تمہاری ٹڈ بھیر کا فروں سے ہو تو ایک دم گردنیں اڑاؤ یہاں تک کہ جب خوب مار لو تو پھر قیدی بناؤ، اس کے بعد یا احسان کرو یا فدیہ لے لو یہاں تک کہ جنگ موقوف ہو۔ یہ صورت حال اور اگر اللہ چاہتا تو خود ان سے انتقام لیتا۔ مگر اس کا مقصد تو یہ ہے کہ تم میں سے ایک کی دوسرے کے ذریعے سے آزمائش کرے اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے تو وہ ہرگز ان کے اعمال کو اکارت نہ کرے گا۔ وہ ان کو منزل مقصود تک جلد پہنچائے گا اور ان کی حالت درست کرے گا اور انہیں بہشت میں داخل کرے گا جس کا ان سے تعارف اُس نے کر دیا تھا۔“

### دشمنوں سے جنگ کی صورت میں مسلمانوں کو ہدایتیں

گردنیں اڑانے سے مراد بطور محاورہ قتل کرنا ہے۔ چونکہ زیادہ تر قتل کا عنوان اس دور میں گردن کا قطع کرنا ہوتا تھا اس لیے قتل کی تعبیر اس لفظ سے کی ہے۔<sup>[۲]</sup>

”جب خوب مار لو“ یعنی کثیر التعداد افراد کو قتل کر لو<sup>[۳]</sup> جس سے پوری جماعت چور چور ہو جائے۔<sup>[۴]</sup>

تو پھر باقی ماندہ افراد کو قیدی بناؤ۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ ”احسان کرو“ یعنی یوں ہی رہا کرو یا فدیہ لے لو۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں قیدی بنانے اور فدیہ لے کر چھوڑنے پر اظہار ناراضگی ہے۔ درحقیقت ایسے مقامات پر سمجھنے میں دشواری ترتیب کے مطابق

[۱]۔ یكون التقدير يضرب الله للناس صفات اعمالهم (تبيان)

[۲]۔ المعنى اقتلوهم (مجمع البيان) عبر بضرب الرقاب لان الغالب في القتل ان يكون بضرب الرقاب... (جلالين)

[۳]۔ اكثرتم فيهم القتل (جلالين)

[۴]۔ جب چور کر دو ان کو (شاعر فيح الدين)

تذلیل نہ ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مذمت کن حالات میں ہوئی تھی اور یہ صراحت کہ تمہیں اختیار ہے، چاہے چھوڑ دو یا نہ لے لو، کس موقع پر تھی؟

”اگر اللہ چاہتا تو خود ان سے انتقام لیتا“ یعنی دشمنوں پر وہ عذاب نازل کر دیتا تو تمہیں جہاد کی ضرورت نہ ہوتی مگر پھر تمہارے جوش ایمانی اور نصرت حق کا امتحان کیوں کر ہوتا؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ④ وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ⑤ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ⑥

”اے ایمان لانے والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عطا کرے گا اور جنہوں نے کفر اختیار کیا تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اس نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے ناپسند کیا اسے جو اللہ نے اتارا تو اُس نے اُن کے تمام اعمال کو اکارت کر دیا۔“

خدا کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور ثابت قدمی عطا کرے گا

چونکہ اللہ بے نیاز مطلق ہے ذاتا اس کی کوئی مدد نہیں کی جاسکتی لہذا اس کی مدد کے معنی ہیں تبلیغ دین میں جدوجہد اور جب موقع ہو تو میدان جنگ میں نصرت یعنی یہ دین یا اس کے پیغمبر کی مدد اللہ کی مدد ہے۔ اب اس نے اپنی مدد کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے، وہ یہ کہ تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔ اس کے بعد کسی فرد یا جماعت میں ثابت قدمی نظر نہ آئے تو ماننا پڑے گا کہ وہ درحقیقت اللہ کی مدد نہیں کر رہے ہیں اور کچھ مفادات کی خاطر میدان میں نظر آتے ہیں۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ⑦ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا ⑧ ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ ⑨

”تو کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کیسا انجام ہوا ان کا جو ان کے پہلے تھے۔ اللہ نے انہیں تہس نہس کر دیا اور ان کافروں کے بھی ویسے ہی انجام ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ سرپرست ہے ان کا جو ایمان لائے اور کافروں کا کوئی سرپرست نہیں ہے“

”چونکہ عذاب الہی کی شکلیں مختلف ہوا کی ہیں، سب پر ایک ہی طرح عذاب نہیں ہوا کیا، اس لیے ممکن ہے اس وقت کے کافران اقسام عذاب میں مبتلا نہ ہوں جو پہلی امتوں پر آتے رہے، یہاں ممکن ہے یہ انکا استیصال حکم تشریحی کے ذریعے سے یعنی مسلمانوں کو حکم جہاد

دے کر ہو جیسا کہ قبل کی آیتوں سے ظاہر ہے مگر نتیجہ اس کا بھی وہی تباہی و بربادی ہے، اس لیے کہا گیا امثالہا ”ویسے ہی انجام ہیں“

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا  
الأنهارُ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ  
مَثْوًى لَهُمْ ﴿١٢﴾

”اللہ داخل کرے گا انہیں کہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں اور دوزخ ان کی جگہ ہے۔“

آخر کا جملہ نتیجے میں انہیں چوپایوں سے بدتر قرار دیتا ہے، اس لیے کہ چوپائے دنیا میں جو کھاتے پیتے اور مزے کرتے ہیں، اس کے بعد کوئی سزا آخرت میں انہیں ملنے والی نہیں ہے اور یہ دنیا کی زندگی میں مثل چوپایوں کے ہیں اور آخرت میں ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجْتِكَ ۚ أَهْلَكَنَاهُمْ فَلَا  
نَاصِرَ لَهُمْ ﴿١٣﴾

”اور بہت سی بستیوں ہیں جو آپ کی اُس بستی سے جس نے آپ کو نکلنے پر مجبور کیا تھا؟ زیادہ طاقت ور تھیں۔ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا تو کوئی ان کا مددگار نہیں۔“

اس ”بستی“ سے مراد مکہ معظمہ ہے جہاں سے آپ حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔<sup>[۱]</sup> اور نکالنے کی نسبت ان کی طرف اسی اعتبار سے ہے کہ وہ اگر ایمان لاتے اور تبلیغ دین کے راستے میں جو آپ کی زندگی کا من جانب اللہ مشن تھا رکاوٹیں پیدا کرنے کی برابر کوشش نہ کرتے تو آپ اہل مدینہ کی دعوت کو کیوں قبول کرتے اور وہاں سے نکلنے پر آمادہ کیوں ہوتے؟!

أَمْ مَنْ كَانَ عَلَى بَيْتِنَا مِنْ رَبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ﴿١٤﴾

”تو کیا جو اپنے پروردگار کی طرف کے کھلے ہوئے راستے پر ہو، وہ اس کی طرح ہے جسے اس کی بد اعمالیوں آراستہ و پیراستہ محسوس ہوتی ہیں اور جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی ہے۔“

”کھلے ہوئے راستے پر ہو، یعنی اس کا ضمیر مطمئن ہو کہ جس راستے پر وہ قائم ہے، بالکل صحیح ہے۔ اب اُس کے مقابلے میں کون ہے؟ جسے اس کی بد اعمالیوں آراستہ و پیراستہ محسوس ہوتی ہیں“ کچھ لوگ اس سے مشرکین کو سمجھتے ہیں مگر معصوم کی حدیث یہ بتاتی ہے کہ اس سے منافق مراد ہیں۔<sup>[۲]</sup>

[۱]۔ یعنی اہل مکہ الذین اخر جوك منها (علی ابن ابراہیم)

[۲]۔ هو المروى عن ابى جعفر (مجمع البيان)

اور اب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بد اعمالیوں کے آراستہ پیراستہ محسوس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو سیاسی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ اس کو بڑی عقل مندی سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہیں۔ خالق کا ارشاد ہے کہ ”کیا یہ دونوں یکساں ہے؟“ اور اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ یکساں نہیں ہیں بلکہ پہلے والے نجات پائیں گے اور یہ ہلاکتِ ابدی میں گرفتار ہوں گے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ ۖ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ  
لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ ۖ وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ۖ وَأَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى ۖ  
وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ ۖ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ  
وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ۝۱۵

” (کیا) مثال اس بہشت کی جس کا وعدہ پر ہیزگاروں سے کیا گیا ہے جس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جس میں ذرا بھی رنگ میں تبدیلی نہیں اور نہریں ہیں ایسے دودھ کی جس کا مزہ نہیں بدلا اور نہریں ہیں ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے خوش ذائقہ ہے اور نہریں ہے صاف کیے ہوئے شہد کی اور ان کے لیے ان میں ہر طرح کے پھل ہیں اور بخشش ہے اُن کے پروردگار کی طرف سے، اُس کی سی ہے جو ہمیشہ آگ میں رہنے والا ہو اور جنہیں پینے کو گرم پانی ملے تو وہ ان کی آنتوں کے ٹکرے اڑا دے؟“  
اس میں دو باتیں عقل سے سمجھنے کی ہیں؛

ایک تو یہ کہ یہ جملہ خبریہ نہیں بلکہ سوالیہ ہے کیونکہ پہلے جنت اور اس کے اوصاف ہیں اور پھر کاف حرف تشبیہ کے ساتھ جس کے معنی مثل کے ہوتے ہیں دوزخ کا ذکر ہے اور اس کے کیفیات اور ظاہر ہے کہ بہشت مثل دوزخ کے نہیں ہے لہذا آیت کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ مثل اس کے ہے تو اسے ماننا لازم ہے کہ یہ استفہام انکاری ہے یعنی وہ سوال جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے شروع میں ترجمے کے اندر ہم نے بریکٹ میں ”کیا“ کا لفظ رکھی ہے اور حرف استفہام کا حذف کرنا انداز تلفظ کی مدد سے ہر زبان میں جاری و ساری ہے جیسے کوئی آپ کی توقع کے خلاف آجائے اور آپ کہیں ”آپ آگئے؟“ اسی طرح مثل الجنة سے لے کر آخر تک لکھنے کے بعد سوالیہ نشان بنا دیجئے؟ (؟) بنا دیجئے اور اس انداز سے تلفظ کیجئے تو استفہام کا مطلب نکل آئے گا۔ اس میں اصول تکلم کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پہلی جگہ مکان کے اوصاف ہیں جو بہشت ہے اور دوسری جگہ ”ک“ (حرف تشبیہ) کے بعد مکینوں یعنی اہل دوزخ کا ذکر ہے۔ یہاں بھی مطلب ظاہر ہے کہ ان بہشتوں کے رہنے والے ان دوزخ کے رہنے والوں کے مثل نہیں ہیں۔ اسے علماء یوں کہتے ہیں کہ یہاں پر جملے کا مبتدا مقدر یعنی پوشیدہ ہے۔ [۱]

حالانکہ ہمارے نزدیک لفظی طور پر نہ اس کے مذکور ہونے کی ضرورت ہے نہ مقدر جب کہ مطلب عقل کی مدد سے سمجھ میں آجاتا ہے، چاہے الفاظ ہوں یا نہ ہوں۔

[۱] - کمن هو خالد فی النار خبر مبتدا مقدر ایامن هو فی هذا النعیم (جلالین)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۗ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا  
الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ أِنْفَاثُ أَوْلِيكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا  
أَهْوَاءَهُمْ ﴿١٦﴾

”اور ان میں ایسے بھی ہیں جو (بظاہر) آپ کی باتوں کو سنتے ہیں، یہاں تک کہ جب آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان سے جنہیں علم ملا ہے، کہ یہ انھوں نے ابھی کیا کہا تھا؟ یہ وہ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی ہے“

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کسی غیر مسلم گروہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ مسجد میں رسول کے خطبوں میں شریک ہونے والوں اور زیر منبر بیٹھنے والے گروہ صحابہ ہی کا ذکر ہے کہ ان میں ایک جماعت ایسی ہے اور اس جماعت کے لیے قرآن کا اعلان ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آئندہ زندگی میں کبھی ایمان لانے والے نہیں ہیں تو اب قرآن کی روشنی میں بلا استثناء پوری جماعت کو عدالت کا تمغہ دینا کہاں درست ہو سکتا ہے؟

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًىٰ وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ﴿١٧﴾

”اور جنہوں نے ہدایت قبول کی، اس نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور انہیں ان کے شایان شان پرہیزگاری عطا کی“

برابر یہ بات دیکھنے کی ہے کہ جہاں جہاں دلوں پر مہر کرنے یا گمراہی میں اضافے کا ذکر ہے، وہاں بطور نفل اختیاری ان کے کفر، انحراف اور راہ حق سے روگردانی وغیرہ کا ذکر ہے اور جہاں ہدایت میں اضافے وغیرہ کا ذکر ہے، وہاں پہلے ان کے ہدایت قبول کرنے کا ذکر ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ ان کا قبل والا کفر، انحراف اور یہ ان کا شروع کا ہدایت قبول کرنا خود ان کا ارادی عمل ہے۔ نہ وہ جبر الہی کا نتیجہ ہے نہ یہ اور پھر بعد میں جو بیان ہوا ہے، جس کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے، وہاں ان کے خود اختیاری طور سے غلط راہ پر جانے کا اثر یا اس کی سزا ہے اور یہاں ان کے حسن اختیار کا نتیجہ یا اس صلہ ہے۔

فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۖ فَفَقْدًا جَاءَ أَشْرَاطَهَا ۗ فَأَنَّىٰ لَهُمْ

إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرُهُمْ ﴿١٨﴾

”تو کیا انتظار ہے ان کو سو اس کے کہ قیامت ان پر ایک دم آجائے تو اس کی علامتیں تو آ ہی گئی ہیں تو جب وہ آ ہی جائے گی تو انہیں نصیحت قبول کرنے کا موقع کہاں ہوگا؟

یعنی قیامت کے آنے کے بعد تو وہ دور تکلیف ختم ہو جائے گا اور اب جزا و سزا کی منزل ہوگی لہذا ایمان یا توبہ کوئی قابل قبول نہ ہوگا۔ [۱]

علامات قیامت احادیث میں متفرق طور پر بھی وارد ہوئے ہیں اور ایک طویل حدیث جناب سلمان فارسیؓ کی حضرت پیغمبر خداؐ کی زبانی ہے جو اہل سنت کی کتب میں سے محی الدین ابن عربی کی کتاب ”محاضرة الابرار ومسامرة الاخيار“ معروف بہ ”کتاب مسامرات“ میں میری نظر سے گزری ہے اور وہ ہماری قدیم تفسیر علی ابن ابراہیم قمی میں بھی اسی آیت کے تحت میں درج ہے مگر ان علامتوں میں زیادہ تر وہ ہیں جو صدیوں سے برابر سامنے آتی رہی ہیں لہذا انہیں دیکھ کر بھی قیامت کے قرب کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔

**فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثُوكُمْ ۝١٩**

”تو جانے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور اپنے گناہ کے لیے اور باایمان مردوں اور باایمان عورتوں کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہے اور اللہ جانتا ہے تم لوگوں کی گردش اور تمہارے جانے فرار کو“  
 درگاہ الہی میں اپنے کو گناہگار قرار دیتے ہوئے دعائے مغفرت تقاضائے عبودیت ہے۔ وقوع گناہ پر موقوف نہیں ہے، چنانچہ مفسرین اہل سنت نے بھی یہاں اس پہلو کو اختیار کیا ہے؛ تفسیر جلالین کے الفاظ یہ ہیں؛ (قِيلَ لَهُ ذَلِكَ مَعَ عَصْمِيَّةَ لَمَسْتَنِّي بِهِ أُمَّتِي) حضرت سے باوجود آپ کے معصوم ہونے کے یہ کہا گیا تا کہ آپ کی امت اس طریقے کی پیروی کرے۔ خداوند عالم عظمت و جلال کا جتنا شدت و قوت کے ساتھ احساس ہوگا، اتنا ہی بندہ اپنے کو اس کی بارگاہ میں تقصیر و استغفار اور توبہ و انابت کی نوعیت یہی ہے۔

**وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۚ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۖ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۗ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ۝٢٠ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝٢١**

”اور جو ایمان لائے کہتے ہیں کہ کوئی سورہ کیوں نہیں اتارا جاتا تو جب کوئی بالکل واضح سورہ اتارا جاتا ہے اور اس میں مرنے مارنے کا ذکر ہوتا ہے تو دیکھیے گا کہ انہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہوں گے جیسے موت سے بے ہوش ہو جانے والا دیکھتا ہے تو بہتر تھا ان کے لیے اطاعت کرنا اور اچھی گفتگو اور پھر جب لڑائی ٹھن جائے تو اگر اللہ سے سچی وفاداری کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا“۔

**پیغام جہاد سن کر بعض مسلمانوں کی حالت**

بعد والے مضمون سے ظاہر ہے کہ ”کوئی سورہ کیوں نہیں اتارا جاتا؟“ اس کے معنی یہ تھے کہ کوئی سورہ ایسا جس میں جہاد کا حکم ہو کیوں نازل نہیں ہوتا، چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:



”مسلمان سورت مانگتے تھے یعنی کافروں کی ایذا سے عاجز ہو کر آرزو کرتے تھے کہ اللہ حکم دے جہاد کا توجہ ہو سکے کر گزریں، جب حکم آیا جہاد کا تو کچھ لوگوں پر بھاری پڑا۔ مردے کی طرح بے رونق آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ہم کو کاش کہ اس حکم سے معاف رکھیں، بے حد خوف میں آنکھ کی رونق نہیں رہتی جیسے مرتے وقت“ (موضع القرآن)

بعض کا خیال ہے کہ جب وحی نازل ہونے میں دیر ہوتی تھی اور پیغمبر خدا ﷺ کی زبان سے کوئی نازل شدہ قرآن کا حصہ گوش زد نہیں ہوتا تھا تو صحابہ کا دل گھبراتا تھا لہذا اتفاقاً ہوتا تھا کہ کوئی سورہ آخر عرصے سے کیوں نہیں اترتا؟<sup>[۱]</sup> لیکن اگر کہیں ایسے آیات اتر آئے جن میں جہاد کا حکم ہوا تو یہ عالم ہو جاتا تھا جس کا ذکر بعد میں ہے۔

اولیٰ لہم طاعة و قول معروف کا ترجمہ میں نے کیا ”بہتر تھا ان کے لیے اطاعت کرنا اور اچھی گفتگو“ اس میں اولیٰ کے وہی معنی لیے گئے ہیں جو عام طور پر اس لفظ میں سمجھ آتے ہیں یہاں تک کہ اردو میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہیں۔ ہاں اس صورت میں یہ پورا ایک جملہ ہوتا ہے جیسا کہ تفسیر جلالین میں اولیٰ لہم کے بعد لکھا ہے:-

مبتدا خبر طاعة و قول المعروف (یہ مبتدا ہے جس کی خبر طاعة و قول معروف ہے)

لہذا اولیٰ لہم پر آیت کے پورے ہونے کا نشانہ نہیں ہونا چاہیے اور پھر جس کی علامت جس کے معنی یہ ہے کہ ٹھہرنا جائز ہے اور وہ وصل یعنی ملا کر پڑھنے سے بہتر ہے۔ غالباً ان علامتوں کی وجہ سے زیادہ مفسرین و مترجمین کا رجحان یہ ہے کہ اولیٰ کا لفظ ویل کی طرح عربی میں ملامت اور سرزنش کے محل پر استعمال ہوتی ہے جس کا ترجمہ اردو میں یوں ہوگا ”وائے ہوان پر“<sup>[۲]</sup>

اور پھر طاعة و قول معروف الگ ہے جس کے لیے کچھ محذوف مان کر جملہ پورا ہوتا ہے۔<sup>[۳]</sup>

ہم جہاں تک سمجھتے ہیں یہ علامتیں توفیقی و تعبدی حیثیت نہیں رکھتیں یہ قاریوں کے تفسیری رجحان کے مطابق علامتیں قرار دی گئی ہیں۔ اس لیے ہمیں دیکھ لیجئے کہ اگر واقفا اولیٰ وہی ”بہتر“ کے معنی میں ہے اور طاعة و قول معروف اس کی خبر ہے تو وصل معین ہونا چاہیے کہ وقف نہ کرو اور اگر ویل لہم کے معنی میں ہے ”وائے ہوان پر“ اور اس الگ جملہ ہے تو وقف معین ہونا چاہیے۔ یہ جائز اور بہتر ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامت قرار دینے والے کی نظر میں ترجیح تو اسی کو ہے کہ اس کے معنی ہیں ”وائے ہوان پر“ اس لیے اس پر آیت کا نشانہ بنایا ہے مگر ایک احتمال اسکے نزدیک دوسرا ہے جو اس کے خیال میں کمزور ہے، اس لیے ج کی علامت اس پر رکھی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تفسیری فیصلے آیتوں کی علامتوں کی بنیاد پر نہیں ہوئے ہیں بلکہ علامتی نشان تفسیری تصورات کی بنیاد پر لگائے گئے ہیں لہذا آج اور ہمیشہ ہر تفسیری صلاحیت رکھنے والے کو حق ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ان تفسیری علامات کی بندش کا اسیر نہ رکھے اور مفہوم آیت کو دیگر قرآنی دلائل، حدیث و لغت، عقلی قرآن اور روایت کے ذریعہ سے سمجھنے کی کوشش کرے۔

[۱] لانہم کانوا بالنسوان بنزول الوحی ویسترحشون من ابطائہ (تبیان)

[۲] ہذا تہدید و وعید (مجمع البیان)

[۳] وائے ایشان را حال ایشان بحسب ظاہر و فرمان برداریست (شاہ ولی اللہ) وائے ہوا سطلے ان کے۔ مطلب ان کی فرمان برداری ہے (رفیع الدین)

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتَقَطَّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٣﴾

أُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّى أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾

”تو کیا ایسا نہیں کہ بہت ممکن ہے جب تم صاحب اقتدار ہو تو زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے رشتوں کے تقاضے کے خلاف بدسلوکیوں سے کام لو۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے تو انہیں بہرا بنا دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔“

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں میں بعض حاضر ہونے والوں کی حالت

اس سے ملتے جلتے الفاظ میں ایک آیت دوسرے پارے میں آئی ہے:

وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (بقرہ ۵-۲۰۵)

وہاں بہت سے مفسرین نے تولى کے معنی روگردانی کرنے کے لکھ دیئے مگر ہم نے وہاں بھی اس کا ترجمہ صاحب اقتدار ہونے کے ساتھ کیا اور اب اس آیت میں تو دوسرے حضرات بھی ان تولیتہم کے معنی یہی قرار دے رہے ہیں کہ اگر تم صاحب اقتدار ہو۔<sup>[۱]</sup> اس کے بعد سیاق و سباق کو دیکھئے تو صاف پتہ چلے گا کہ جن کے آئندہ صاحب اقتدار ہونے کے امکان کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے، وہ وہی ہیں جو اس وقت صحبت رسول میں رہ کر بھی آپ کے فیوض سے محروم ہیں اور میدان رزم میں دشمنوں کے مقابلے میں کمزوری دکھاتے ہیں، یہی وہ ہیں جو بعد میں صاحب اقتدار ہو کر اہل حقوق کے حقوق کو برباد کریں گے۔

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾

”تو کیا وہ قرآن میں غور فکر سے کام نہیں لیتے یا کچھ دلوں پر ان کے قفل لگے ہوئے ہیں۔“

ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ یہ مسلم ہونے کے باوجود کہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے بعض سوروں کی شناخت ایسی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سورے یکجائی طور پر اسی شکل میں اترے تھے چنانچہ یہ سورہ بھی پورا ایک ہی طرز و اسلوب کا حامل ہونے کی بنا پر اسی طرح کا ہے۔

قرآن میں غور فکر سے کام لینے کی دعوت

اب اس آیت کو جس محل پر وہ ہے، قبل اور بعد سے ملا کر دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ قرآن پر غور نہ کرنے کی شکایت جو کی جا رہی ہے، یہ کفار و مشرکین سے نہیں ہے بلکہ انہی مسلمانوں سے ہے جن کا قبل اور بعد میں ذکر ہے اور پھر جیسے جھلایا ہوا جملہ کہ ”ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں، انہی کے قرآن کے اشاروں کو نہ سمجھنے کی اور یاد نہ رکھنے پر تازیا نہ ہے۔“ یاد رکھیے کہ قرآن الفاظ قرآن کو نہ سننے یا حفظ نہ کرنے کی شکایت نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے معنی و اشارات پر غور نہ کرنے کی شکایت کر رہا ہے، چاہے الفاظ کے حفظ کرنے میں کتنی ہی محنت کی جائے۔

[۱]۔ متولی امور مردمان شوید (شاہ ولی اللہ)۔ اگر والی ہو تو حکم کے (رفیع الدین)

جناب شیخ طوسیٰ اور ان کے تتبع میں علامہ طبرسی نے اس سے اپنے فرقے کی اخباری جماعت کے مد مقابل میں ظواہر قرآن کی حجیت پر استدلال کیا ہے کہ اگر قرآن مجید کے مطلب کا سمجھنا الفاظ قرآن سے بالکل ممکن نہ ہوتا تو قرآن پر غور نہ کرنے کی شکایت کیوں کی جاتی؟ [۱]

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ ۖ الشَّيْطَانُ  
سَوَّلَ لَهُمْ ۗ وَآمَلَىٰ لَهُمْ ۖ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ  
سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ ۖ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ  
الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ۖ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا آسَخَطَ اللَّهُ  
وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ۗ

”وہ جو اپنے پیچھے کی طرف پلٹ گئے بعد اس کے کہ ان کے لیے ہدایت کا راستہ ظاہر ہو گیا تھا، شیطان نے انہیں ورغلا یا اور انہیں ڈھیل دی۔ یہ اس بنا پر کہ انہوں نے کہا ان سے جنہوں نے ناپسند کیا اسے جو اللہ نے اتارا تھا، ہم کسی نہ کسی حد تک تمہارا ساتھ دیں گے اور اللہ ان کی اندرونی کارروائی کو جانتا تھا تو کیا ہو گا عالم اس وقت جب فرشتے ان کی قبض روح کریں گے۔ مارتے ہوں گے ان کے چہروں اور ان کی پشت پر۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے پیروی کی اس کی جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے اور اس کی پسند کو ناپسند کیا تو اس نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا۔“

ان آیات میں دیکھنے والے کے لیے بڑے لمحات فکر یہ ہیں:۔ شروع سے سورے کے مندرجہ مضامین کو دیکھیے تو اس میں غیر مسلمین کے مسائل سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ تمام تر کچھ مسلمانوں کے کردار کا ذکر ہے۔ اب اس کے بعد ان اجزاء کو غور سے دیکھیے۔ کچھ ہے جسے اللہ نے اس سورے کے شروع میں آیت نمبر ۲ میں پھر آیت نمبر ۹ میں اور اب آیت نمبر ۲۶ میں بمانزل علی محمد اور ما انزل اللہ اور ما نزل اللہ کہا ہے (یعنی) ”وہ جسے اللہ نے اتارا۔“ [۲]

پھر ایک جماعت سرغنہ افراد کی ہے جنہوں نے اپنے مفادات کے لحاظ سے ناپسند کیا اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اس منصوبے میں ان کے ساتھ شریک ہوئے اور کسی حد تک ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے کوئی خفیہ منصوبہ بنایا جسے کہا جا رہا کہ ”اللہ ان کی اندرونی کارروائی سے واقف ہے۔ انہوں نے پہلے کچھ نیک اعمال کیے تھے جنہیں کہا جا رہا ہے کہ اب وہ برباد ہو گئے اور اس پوری جماعت کے لیے مرتد ہونے کی سند تو اس پورے مضمون کے شروع ہی میں ارتدوا علی ادبارہم کی لفظوں میں موجود ہے۔“

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ أَنْ لَّنْ يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ ۖ وَلَوْ نَشَاءُ

[۱]۔ فی ذالک حجة علی بطلان قول من یقول لا یجوز تفسیر شیء من ظاہر القرآن الا بخبر او سمع (تبیان)

[۲]۔ المروی عن ابی عبد اللہؑ۔ کرہوا ما نزل اللہ ولایة علی ابن ابی طالب (مجمع البیان)

لَا رَيْنَكُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِينِهِمْ ط وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ط وَاللَّهُ يَعْلَمُ  
أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٠﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجْهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ ۗ وَنَبْلُوَ  
أَخْبَارَكُمْ ﴿٣١﴾

”کیا وہ سمجھتے ہیں وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ اللہ کبھی ان کے دلی کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا اور اگر ہم چاہیں تو ہم آپ کو انہیں دکھادیں تو آپ ان ناک نقشے سے انہیں پہچان لیجیے۔ اور بہر حال ان کے طرز گفتگو سے آپ انہیں ضرور پہچان لیں گے اور اللہ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے اور یقیناً ہم تم لوگوں کی آزمائش کریں گے یہاں تک کہ معلوم کریں تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر و برداشت رکھنے والوں کو اور آزما لیں تمہارے حالات“۔

### مسلمانوں کا لب و لہجہ ان کی پردہ کشائی کے لیے کافی

چاہے مفسرین جمہور کی پیروی میں ہمارے کچھ اکابر نے بھی گزشتہ آیات کو جماعت یہود وغیرہ سے متعلق کر دیا ہو لیکن آزاد چشم و گوش و ہوش سے ان آیات کوئی دیکھنے سے اور سمجھنے تو کسی رخ سے وہ غیر مسلم جماعتوں سے متعلق محسوس نہیں ہوں گی، صاف وہ اپنوں کی جماعت میں شامل افراد سے متعلق ہیں جو اپنے دلوں کے منصوبے دلوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور انہی کی آزمائش کی ضرورت ہے اور وہ سب سے بڑی آزمائش میدان جنگ میں ہوئی۔ چاہے وہ شروع کی جنگ احد ہو یا آخر میں ہونے والا معرکہ حنین، دونوں کی روئدادیں صفحات تاریخ ہی نہیں، صفحات قرآن پر بھی ثبت ہیں۔

”آپ ان کے ناک نقشے سے انہیں پہچان لیجیے گا اور ان کے طرز گفتگو سے معلوم ہو جائے گا“ یہ کیا یہود کے افراد ہو سکتے ہیں؟ یقیناً یہ وہی ہیں جو مؤمنین کی جماعت میں شامل ہیں اور رسول کی محفل میں بیٹھ کر بڑھ چڑھ کر گفتگوئیں کرتے ہیں مگر ان کے طرز گفتگو سے بہت موقعوں پر پتہ چل جاتا ہے کہ جسے خدا اور رسول بلند کرنا چاہتے ہیں، یہ اس کی بلندی کو پسند نہیں کرتے اور یہی ان کے نفاق کی بہت بڑی علامت ہے جس کے لیے بعض صحابہ کرام کے اقوال بھی ہیں۔<sup>[۱]</sup>

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ  
لَهُمُ الْهُدَىٰ ۗ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ط وَسَيَحْبُطُ أَعْمَالُهُمْ ﴿٣٢﴾

”جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور پیغمبر سے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان پر ہدایت کا راستہ واضح ہو گیا تھا، اور ہرگز اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور وہ ان کے اعمال کو کارت کر دے گا“۔  
پورے سورے کے گزشتہ مضامین کو سامنے رکھ کر کفر اللہ کی راہ سے روکنے اور پیغمبر سے اختلاف، ہر ایک کے معنی پر غور کرنا چاہیے

[۱] عن ابی سعد الخدری، قال: لحن القول بعضهم علی ابن ابیطالب رضی اللہ عنہ قال وکتنا نعرف المنافقین علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببعضهم علی ابن ابی طالب وروی ذالک عن جابر ابن عبد اللہ الانصاری وعن عبادۃ ابن صامت (مجمع البیان)

(الگ الگ الفاظ کو لغت اور عام اصطلاحات کی روشنی میں دیکھ کر نہیں) اور پھر نتیجہ نکالنا چاہیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ۖ إِنَّ  
الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ  
لَهُمْ ۖ

”اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور طاعت کرو پیغمبر کی اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو، بلاشبہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، پھر مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر ہیں، انہیں اللہ کبھی نہیں بخشے گا۔“  
درمیان میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے یہ کہنے کہ سے اپنے اعمال کو برباد نہ کرو، اس سے پہلے اور بعد جو کفر اختیار کرنے والوں کا ذکر ہے، کیا وہ غیر مسلم ہیں؟

اگر وہ اعمال کی بربادی اس کفر سے ہوتی جو غیر مسلم جماعت میں ہوتا ہے تو مسلمان سے درمیان میں کیوں کہا جاتا کہ اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔<sup>[۱]</sup>

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اعمال کی بربادی اور بعد میں بخشش کی محرومی کا جو اعلان ہے، وہ کسی ایسی وجہ سے ہے جو اس جماعت میں جو ظاہر کی بنا پر الذین آمنوا کی مصداق ہے، پائی جا رہی ہے۔

فَلَا تَمُوتُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ ۖ وَأَنْتُمْ الْأَعْلُونَ ۖ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتَرَكُمْ  
أَعْمَالَكُمْ ۖ

”تو کمزوری نہ دکھاؤ اور صلح کی اپنی طرف سے دعوت نہ دو در انحالیکہ تم برتر ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کو رانگاں نہیں کرے گا۔“

پہلے جملہ کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں آجاتا ہے کہ اپنی طرف سے صلح کی دعوت جس کی ممانعت ہوئی ہے، وہ وہ ہے جو ہمت ہارنے کی بنا پر ہو، نہ کہ کچھ بلند مقاصد کے تحفظ یا امن پسندی یا اتمام حجت کی خاطر اور آخری فقرے سے ظاہر ہے کہ یہ عاجزی نہ کرنے کی دعوت اس یقین دہانی کے ساتھ نہیں ہے کہ تمہیں مادی فتح ضرور حاصل ہوگی بلکہ صرف اس لیے کہ یہ ایک فریضہ ہے جسے تمہیں انجام دینا چاہیے اور اگر تم نے ظاہری شکست بھی کھائی یا اس راہ میں ختم بھی ہو گئے تو تمہارے اعمال کا اجر تو ضائع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے الاعلون کا ترجمہ ہم نے یہ نہیں کیا کہ تم ضرور غالب آؤ گے جو بعض لوگ سمجھے ہیں۔<sup>[۲]</sup> بلکہ اس کا ترجمہ واقعی یہی ہے تم برتر ہو یعنی اہل حق الاعلون کا مصداق بہر صورت ہیں چاہے فتح پائیں یا وقتی طور پر شکست سے دوچار ہوں۔

إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُوَ ۖ وَإِنْ تُوْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أَجْرَكُمْ وَلَا

[۱] - لا تبطلوا أعمالكم بالشك والنفاق عن عطا... مجمع البيان

[۲] - انتم القاهرون الغالبون في قول مجاهد (تبیان)

يَسْأَلُكُمْ أَمْوَالَكُمْ ۖ إِن يَسْأَلْكُمْ بِهَا فَيُحْفِكُمْ تَبَخَّلُوا وَبَخَّلُوا ۖ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا  
 هَآئِنْتُمْ هَآؤِلَاءِ ۖ تَدْعُونَ لِنُفْسِكُمْ ۖ فَسَبِّحُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَبْخُلُ ۖ وَمَنْ  
 يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلْ عَنِ نَفْسِهِ ۖ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ ۖ وَأَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ ۖ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا  
 يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۖ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۖ

”دینی زندگی تو بس کھیل اور تفریح ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور پرہیزگاری اختیار کرو تو تمہیں تمہارے اجر عطا کریں گا اور تم سے تمہارے اموال نہیں ماں گے گا۔ اگر وہ تم سے انہیں مانگتے ہوئے اصرار سے بھی کام لے تو تم بخل سے کام لو گے اور وہ تمہارے دلی کینوں کو نمایاں کر دے گا، دیکھ لو تمہارا تو یہ عالم ہے کہ تمہیں دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو تم میں ایسے ہیں جو بخل کرتا ہے تو وہ اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم خود محتاج ہو اور اگر تم روگردانی کرو تو وہ تمہارے بدلے دوسری قوم کو لے آئے گا، پھر وہ تمہارے ایسی نہیں ہوگی۔“

عرب مسلمانوں کو پہلی صدی کے آخر سے موالی و راعیام پر رشک آنے لگا کہ وہ مسلم سیاست ہی پر نہیں بلکہ علمی افتخار پر بھی چھائے جاتے ہیں۔ اس تعصب کے جذبے کو بنی امیہ نے عرب قومیت کا جذبہ نہیں ابھار کر بہت تقویت پہنچائی جس کے زیر اثر آج تک جمہوریت کے بہت سے مصنفین عجموں کو بہت کوستے ہیں اور ان پر اسلام کے مسخ کرنے کا الزام لگاتے ہیں لیکن قرآن اپنے معجزانہ انداز میں اس پر پہلے ہی انتباہ کر رہا تھا کہ اگر تم نے پوری وفاداری سے کام نہ لیا تو وہ تمہاری بدلے دوسری قوم کو لیے آئے گا۔ ہماری قدیم تفسیر میں جو اکثر کلمات معصومین پر مبنی ہے۔ اس دوسری قوم کی تفسیر موالی ہی کے ساتھ ہوئی ہے۔ [۱] جناب شیخ طوسی نے جو متعدد قول نقل کیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے اہل ایران مراد ہیں۔ [۲] علامہ طبری نے متعدد حدیثیں درج کی ہیں، ان میں طرق اہل سنت سے ایک حدیث نبوی ہے جس میں ایرانیوں کو دوسری قوم کا مصداق بتایا گیا ہے اور دو (۲) حدیثوں میں جو معصومین علیہم السلام سے ہیں موالی کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ [۳]

[۱] - علی ابنا اموالی المتقدمین (علی ابن ابراہیم)

[۲] - قبیل مثل سلمان و اشباہه من ابنا فارس (تبیان)

[۳] - روی ابو ہریرہ ان انا اصحاب رسول اللہ ﷺ قالو یا رسول اللہ ﷺ من هو لاء الذین ذکر اللہ فی کتابہ وکان سلمان الی جنب رسول اللہ فضرب یدہ علی فخذ سلمان فقال هذا وقومه... روی ابو بصیر عن ابی جعفر ﷺ قال ان تتولو یا مشعر العرب یستبدل قوماً غیرکم یعنی الموالی... عن ابی عبد اللہ ﷺ قال: قدر اللہ ایدل بہم خیر آمنہم الموالی (جمع البیان)

# سُورَةُ الْفَتْحِ

مدنیہ۔۔۔۔۔ ۲۹۔۔۔۔۔ آیات

اس سورے کا آغاز چونکہ ”فتح مبین“ عطا کرنے کے اعلان سے ہوا ہے، اس لیے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

## سورۃ فتح کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... رسول خدا ﷺ سے خطاب کر کے قبل اور بعد کے جرائم کی معافی جس کی بقدر ضرورت تشریح کی جائے گی۔
- ۲..... تعظیم رسول کا حکم۔
- ۳..... پیغمبر خدا سے بیعت اللہ سے بیعت اور آپ کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ۔
- ۴..... کچھ مسلمانوں کی رسول کے لئے بداندیشیاں کہ آپ اب زندہ واپس نہیں آئیں گے۔
- ۵..... کچھ مسلمانوں سے ان کے اصرار کے باوجود جہاد میں لے جانے سے انکار اور اس کی وجہ۔
- ۶..... معذورین کے لیے معافی کا اعلان۔
- ۷..... بیعت شجرہ کا ذکر اور خالق کا اعلان خوشنودی۔
- ۸..... آئندہ اموال غنیمت کے حصول کی اطلاع۔
- ۹..... حدیبیہ میں جنگ نہ ہونے دینے کا سبب۔
- ۱۰..... صلح حدیبیہ سے غیر مطمئن افراد کو مطمئن بنانے کی کوشش۔
- ۱۱..... حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی صریحی اعلان کے ساتھ آپ کے حقیقی ساتھیوں کی شان اور ان کا کردار۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝۱ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ  
وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝۲ وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا

عَزِيزًا ۝۳

یقیناً ہم نے آپ کو ایک بڑی نمایاں فتح عطا کی تاکہ اللہ نظر انداز کرادے جو کچھ جرائم آپ کے پہلے والے ہوں یا

بعد والے اور وہ اپنی نعمت کو آپ پر مکمل کر دے اور آپ کو منزل مقصود تک پہنچائے اور اللہ آپ کی مدد کرے  
زبردست۔

## رسول ﷺ کو خطاب کر کے قبل اور بعد کے جرائم کی معافی کے معنی

یہ بات متفق علیہ ہے کہ یہ سورہ صلح حدیبیہ کے بعد بلافاصلہ اتر ہے۔ اس صورت میں اس فتح سے مراد کیا ہے؟ مادی نقطہ نظر والے مفسرین جو فتوحات کے معنی ممالک کو زیر نگین کرنے اور طاقت سے طاقت کو شکست دینے کے سمجھتے ہیں، اس فتح سے مراد لیتے ہیں اس کے بعد والی فتح مکہ وغیرہ کو اور اس لیے شاہ ولی اللہ نے فتحنا کا ترجمہ کیا ہے ”حکم کر دیم برائی تو بفتح ظاہر“ مگر ظاہر ہے کہ فتح کے معنی تو فتح دینے ہی کے ہیں، حکم فتح جاری کرنے کے نہیں ہیں اور فتح کا اعلان بصدیقہ ماضی کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقوع میں آچکی، نہ کہ بطور وعدہ مستقبل، اگرچہ مستقبل کا بصورت ماضی اظہار حتم و جزم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر بلاشبہ وہ مجازی حیثیت رکھتا ہے جسے بلاوجہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس لیے درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صلح حدیبیہ ہی ہے جسے خالق نے ”فتح مبین“ سے تعبیر کیا ہے جس کی تائید میں صدر اول کے اقوال بھی موجود ہیں۔<sup>[1]</sup>

اس سے اس حقیقت تک رسائی ہوتی ہے کہ اسلام مادی فتوحات کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی روحانی فتح کو جو عزیمت و طمانیت اور اخلاق و کردار کے میدان میں ہو اور جس سے مخالفت ذہنیت کو شکست ہو اور اسی اعتبار سے ہم کر بلا میں امام حسین علیہ السلام کے لیے دائمی فتح مانتے ہیں ہر یزید کی دائمی شکست جو بالکل قرآنی رہنمائی کے مطابق ہے۔

دوسرا امر جو اس آیت میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، یہ جملہ ہے کہ لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبك وما تأخر جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ”نظر انداز کر دے خدا جو کچھ جرائم آپ کے پہلے والے ہوں یا اس کے بعد والے“۔ یہاں ان لوگوں کو کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی جن کی نظر میں عصمت انبیاء کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس لیے جناب شاہ ولی اللہ کو تو اس پر کوئی تشریحی نوٹ لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ شاہ عبدالقادر نے نوٹ دیا تو یہ کہ:

”یعنی تجھ کو اس تخیل سے درجے بڑھیں اور یہ بات اللہ نے کسی کو نہیں فرمائی کہ اگلے پچھلے گناہ بخشے اگرچہ بہت بندے ہیں۔ اس میں نڈر کر دینا ہے“ (موضع القرآن)

”یعنی ان کے نزدیک رسول بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ کے لیے یہ اعلان ہو گیا اور اللہ نے آپ کے نڈر ہونے کا اندیشہ محسوس نہیں فرمایا مگر آخر یہ سب گناہ آئے کہاں سے جن کے لیے معاف کرنے کا اعلان ہوا ہے؟  
بے شک جلالین کے ضمیر ایمانی میں اس سے خلش محسوس ہوئی، اس لیے لکھ دیا کہ:

وہو ماول العصمة الانبياء بالدليل العقلي القاطع من الذنوب.

اس میں تاویل کی ضرورت ہے گناہوں سے انبیاء کے معصوم ہونے کی وجہ سے جو قطعی دلیل عقلی سے ثابت ہے۔

[1] قال القراء الفتح قد يكون صلحاً... وقال الزهري لم يكن فتح اعظم من صلح الحدیبیہ (مجمع البيان)



مگر یہ تاویل کیا ہے؟ اس سے وہ کتر آ کر آگے بڑھ گئے۔

میری نظر میں یہاں جو مفہوم ہے، اس کے لیے تمہیداً ایک پہلو پر توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ گزشتہ اور آئندہ جرائم کی اس مغفرت کو قرآن نے نتیجہ اس فتح کا قرار دیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے بھی ترجمہ میں لکھا ہے:-

دعا قبت فتح آنت کہ بیمار زو ترا خدا آنچه کہ سابق گزشت از گناہ تو و آنچه پس ماند۔ اس فتح کا نتیجہ یہ ہے کہ بخش دے آپ کے لیے خدا جو پہلے ہو چکے آپ کے گناہ اور جو اس کے بعد ہوں۔

تفسیر جلالین میں ہے کہ

وَاللَّامُ لِلْعَلَّةِ الْغَائِبَةِ فَمَدَّ خَوْلَهَا مَسْبَبٌ لِّالسَّبَبِ۔

(لیغفر میں) لام نتیجہ و مقصد کو ظاہر کرتا ہے تو اس کے بعد جوشے ہے وہ اس فتح کے سبب سے ہے نہ یہ کہ وہ اس کا سبب ہے۔

اب ہر شخص سوچ سمجھ سکتا ہے کہ بارگاہ الہی میں انسان کے جو گناہ ہیں، ان کا اور دشمنوں کے مقابلے میں نمایاں فتح حاصل ہونے کا کیا ربط ہے؟ دشمنوں کے مقابلے میں فتح ہوئی اور اس کے نتیجے میں جو آپ کے گزشتہ گناہ ہوئے ہیں اور جو آئندہ ہوں گے سب معاف ہو گئے۔ ان دونوں میں باہم کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

اس بنا پر صحیح نقطہ نظر یہ معلوم ہوتا ہے جسے میں اپنے ضمیر ایمانی اور عقل انسانی کے سہارے پر یقینی سمجھتا ہوں کہ یہاں ذنب سے مراد وہ باتیں ہیں ہی نہیں جنہیں اللہ گناہ سمجھتا ہے بلکہ یہ اطلاق ان لوگوں کے مزعومہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہے جن کے مقابلے میں یہ فتح ہوئی اور وہ مشرکین ہیں کہ اس کے پہلے ان کی نگاہ میں آپ کے بڑے گناہ تھے جن کا وہ چرچا کیا کرتے تھے مگر آپ کی اس فتح کے بعد جو اس وقت اخلاقی حیثیت سے حاصل ہوئی ہے اور اس کے بعد فتح مکے میں ظاہری طور پر بھی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح ان کی زبانیں بند ہو گئی یہ رفتہ رفتہ اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے جائیں گے اور نتیجے میں جو کچھ آپ کر چکے، وہ بھی صحیح قرار پائے گا اور جو کچھ آئندہ کریں، اس پر بھی حرف گیری نہ ہو۔ اس طرح اللہ کے بخشنے کا مطلب اس کی طرف سے ایسا کرنا ہے کہ اب کوئی آپ کو مجرم کہنے والا نہ ہوگا۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ ط

وَاللَّهُ جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ لِيَدْخُلَ الْمُؤْمِنِينَ

وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرُ عَنْهُمْ

سَيِّئَاتِهِمْ ط وَكَانَ ذَلِكَ عِنْدَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ وَيُعَذِّبُ الْمُنْفِقِينَ وَالْمُنْفِقَاتِ

وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَالظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السُّوءِ ط عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السُّوءِ ؕ

وَعَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ط وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ وَاللَّهُ

جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝

وہ وہ ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں سکون و اطمینان اتارا تاکہ وہ اپنے موجودہ ایمان کے ساتھ ایمان میں مزید ترقی کریں اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، اور حکمت والا تاکہ وہ باایمان مردوں اور باایمان عورتوں کو داخل کرے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں اور ان کی طرف سے ان کی غلطیوں کا کفارہ کر دے اور یہ ہے اللہ کے نزدیک ایک بڑی کامیابی اور منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو سب اللہ کی نسبت برے خیالات رکھتے ہیں سزا دے انہی کے خلاف ہوگا اس برائی کا انجام اور اللہ ان پر غضبناک ہے اور ان پر لعنت کرتا ہے اور اس نے ان کے لیے مہیا رکھا ہے دوزخ کو اور وہ بہت برا انجام ہے اور اللہ کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کے لشکر اور اللہ زبردست ہے بڑی سوچ بوجھ والا۔“

حدیبیہ کی صلح کے بارے میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں چہ می گوئیاں ہوئیں اور بہت سے افراد کو شک کا دورہ پڑا۔ ان کے مقابل وہ افراد تھے جنہیں اس صلح کی حقانیت میں قطعی کوئی تردید نہ تھی۔ انہی کو کہا جا رہا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں سکون و اطمینان اتارا۔<sup>[1]</sup>

**إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝۸ لِيَتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ**

**وَيُوقِرُوهُ ۝۹ وَتَسْبِحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝۱۰**

”یقین جاننا چاہیے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا تاکہ تم لوگ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبر پر اور اس کی مدد کرو اور اس کی عزت کرو اور اس کی ذات (خدا) کی تسبیح کرو صبح اور شام۔“

علم معانی و بیان میں تو صنعت التفات کو صرف بعض انداز کلام کی تبدیلیوں میں محدود کیا گیا ہے مگر بلند پایہ فصیح پیرایہ ہائے کلام میں بہت قسم کے نمونے تبدیل کے ملتے ہیں چنانچہ یہاں خطاب سے خطاب ہی کی طرف منتقل ہونا ہے مگر پہلا واحد حاضر کا خطاب ہے رسول کی طرف روئے سخن کے ساتھ اور دوسرا عامہ خلایق سے جمع حاضر کے ساتھ ”آپ کو بھیجا ہے“ رسول سے خطاب اور اس سے ملا کرتا کہ تم لوگ ایمان لاؤ دوسروں سے خطاب۔ اس کا نام ان کے یہاں چاہے ”التفات“ نہ ہو مگر یہ ہے اس نوعیت کی چیز جس کی نظیریں قرآن مجید میں اور بھی موجود ہیں۔ شاہد کے معنی تو گواہ ہی کے ہیں، قرآن میں ہر رسول کے لیے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی امت پر شاہد ہوتا ہے اور ہمارے رسول اپنی تمام امت پر بھی شاہد ہیں اور اس کے علاوہ ایک سلسلہ شاہدوں کا جو انبیاء تھے، آپ کے پہلے تھا اور ایک سلسلہ آپ کے بعد قرآن مجید سے ظاہر ہوتا ہے اور آپ ان قبل والوں پر بھی شاہد ہیں اور بعد والوں پر بھی۔

**تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم**

اب یہ گواہی خواہ روز قیامت لفظی طور پر ہوان کی کارگزاری کے متعلق جیسے ایک افسر بالا اپنے پورے عملے کی رپوٹ پیش

[1] ہم الذین لم یخالفوا رسول اللہ ﷺ ولم ینکروا علیہ الصلح (علی ابن ابرہیم)

کرتا ہے اور خواہ جیسا کہ اس کی حقیقت کا ہم تصور کرتے ہیں؟ وہ نمونہ عمل اور کسوٹی کی حیثیت سے ہے جس کی مطابقت اور عدم مطابقت سے مقدار صحت و کمال عمل کا ثبوت ہوتا ہے۔

رسول خدا پر ایمان اور ان کی نصرت کے حکم کے ساتھ جو تیسرا حکم تو قروہ کے لفظ کے ساتھ ہے اس میں صاف تعظیم رسول کا حکم ہے جس کے بعد کسی مسلمان کو حق نہیں کہ وہ تعظیم رسول کے کسی طریقے کو شرک قرار دے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ۖ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۖ فَمَنْ نَكَثَ  
فِي مَائِمَةٍ يَنكُثْ عَلَى نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهُ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا  
عَظِيمًا ۝

”یہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے تو جو عہد کو توڑے گا وہ توڑ کے اپنا ہی نقصان کرے گا اور جو پورا کرے گا اسے جو اس نے اللہ سے عہد و پیمان کیا ہے تو اللہ اسے بہت بڑا صلہ عطا کریگا۔“

یہ پیغمبر کے نمائندہ خالق بلکہ نائب خالق ہونے کا وہ بلند پایہ اعلان ہے تو آپ کی ذمہ دارانہ حیثیت ہی نہیں بلکہ عصمت عملی کا عظیم الشان ثبوت بھی ہے۔ اس لیے کہ اللہ جس ہاتھ کو اپنا ہاتھ کہے، اور وہ وہ نہیں ہے جو ظلم و تعدی کرے، جو غلط کام کا انجام دے اور گناہ کا مرتکب ہو۔

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ  
لَنَا ۗ يَقُولُونَ بِالسَّتِيهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۖ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ  
شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۗ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ  
خَبِيرًا ۝ بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا  
وَزَيْنَٰ ذَلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ ۖ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۗ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ۝ وَمَنْ لَّمْ  
يُؤْمَرْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ۝ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ

وَالْأَرْضِ ۖ يَعْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

”عنقریب کہیں گے آپ سے وہ جو ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے صحرائی عربوں میں سے کہ ہمیں روکے رکھا ہمارے مال اور گھر والوں کے جھمیلوں نے تو ہمارے لیے بخشش کی دعا کر دیجئے، یہ اپنی زبانوں سے کہتے ہیں وہ جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، کہیے تو پھر کون تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز پر بھی قدرت رکھتا ہے اگر وہ

تمہارے نقصان چاہے یا تمہارا نفع چاہے بلکہ اللہ جو تم کرتے ہو، اس سے باخبر ہے بلکہ تم نے تو خیال کیا تھا کہ پیغمبرؐ اور ایمان والے لوگ اب کبھی بھی اپنے گھروں کی طرف واپس نہیں آئیں گے اور یہی سبز باغ لہلہا رہے تھے تمہارے دلوں میں اور تم نے برے خیال باندھ رکھے تھے اور تم لوگ ہلاک ہونے والی جماعت تھے اور جو ایمان نہ لایا ہو اللہ اور اسکے پیغمبرؐ پر، تو یقیناً ہم نے کافروں کے لیے دوزخ تیار رکھا ہے اور اللہ کے لیے تو آسمان اور زمین کی سلطنت ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے، مہربان۔“

پیچھے رہنے والوں سے مراد فریقین کی روایتوں کی رو سے وہ ہیں جنہوں نے حدیبیہ والے سفر میں جو مکہ معظمہ کی طرف تھا، پیغمبرؐ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے سے پہلو تہی کی تھی اور ان کی اس کوتاہی کی سزا یہ دی گئی کہ اب وہ خیبر کی مہم میں رسولؐ کے ساتھ جانے سے روک دیے گئے۔ [۱]

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَائِمٍ لِتَأْخُذُواهَا ذُرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۗ  
يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَ اللَّهِ ۗ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۗ  
فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۗ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝۱۵

”وہ پیچھے رہنے والے عنقریب کہیں گے اس وقت جب تم اموال غنیمت کی طرف جاؤ گے کہ ان پر قبضہ کرو، ارے ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے دو، وہ اللہ کی بات کو بدلوانا چاہتے ہیں، کہہ دیجئے کہ ہرگز تم ہمارے پیچھے نہیں آسکتے، اسی طرح اللہ نے پہلے کہہ دیا ہے۔ اس پر وہ کہیں گے بلکہ تم لوگ ہم سے جلتے ہو (نہیں) بلکہ وہ ہمیشہ سے ایسے (بد مغزے) رہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا مگر بہت کم۔“

کچھ مسلمان باوجود اصرار جہاد میں ساتھ نہیں لیے گئے

چونکہ خیبر میں کافی مال غنیمت کے ملنے کی امید تھی، اس لیے وہ عرب جو حدیبیہ میں نہیں گئے تھے اب اس جنگ میں ساتھ چلنے کے لیے بے تاب تھے، مگر گزشتہ مہم میں ان کے نہ جانے کی سزا یہ دی گئی اب انہیں اس جنگ میں ساتھ جانے سے روک دیا گیا۔ اب چاہتے تو یہ تھا کہ وہ اپنے گزشتہ کردار کو یاد کر کے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر پشیمان ہوتے مگر اس کے بجائے وہ الٹے یہ کہتے ہیں کہ دوسرے مسلمان ہم سے جلتے ہیں جو ہمیں ساتھ آنے نہیں دیتے۔ یہ بد مغز اپن نہیں تو اور کیا ہے؟

”وہ اللہ کی بات کو بدلوانا چاہتے ہیں“ یعنی اللہ نے پہلے سے یہ طے کر دیا تھا کہ خیبر کے مال غنیمت ان کے ہاتھ آئیں گے جو حدیبیہ

[۱]۔ لہذا رج رسول اللہ ﷺ الى المدينة من الحديبية خزاخير افاستاذنه المخلفون من الاعراب ان يخرجوا معه (علي ابن ابراهيم يعني) انانكه درسفر حديبية موافقت نه كردند (فتح الرحمن)

والے سفر میں ساتھ جائیں گے۔<sup>[۱]</sup>

علامہ طبرسی فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے ایسا تصور کیا ہے کہ کلام اللہ سے مراد خالق کا وہ اعلان ہے جو رسول کی زبانی کر یا گیا تھا:-  
**فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ  
 الْخُلَفَاءِ (توبہ ۸۳)**

کہہ دیجئے کہ تم اب کبھی میرے ساتھ کسی مہم پر نہیں نکلو گے اور میرے ساتھ مل کر کبھی بھی کسی دشمن سے جنگ نصیب نہیں ہوگی تم پہلی مرتبہ گھر میں بیٹھے رہنے کو پسند کر چکے تو اب بیٹھے رہو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔

مگر یہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اعلان ان لوگوں کے لیے ہوا تھا جو بتوک کی مہم میں نہیں گئے تھے اور وہ حدیبیہ اور جنگ خیبر کے بہت بعد فتح مکہ معظمہ اور جنگ حنین سب کے بعد ۹۰ھ کی بات ہے جس کے بعد پھر پیغمبر ﷺ کسی غزوے پر تشریف ہی نہیں لے گئے اس طرح اس اعلان کی عملی تصدیق ہوئی کہ تمہیں اب کبھی یہ سعادت نصیب نہیں ہوگی کہ میرے ساتھ کسی مہم میں چل سکو، اس صورت میں یہ اعلان اس کلام اللہ کے لفظ سے کہاں مراد ہو سکتا ہے جو اس سے کئی سال پہلے کی مہم سے متعلق ہے؟<sup>[۲]</sup>

**قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سُدْعُونَ إِلَىٰ قَوْمِ آبَائِهِمْ أَذِلَّةً وَيَسْلَبُونَ ۚ فَإِنْ تَطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ۗ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِمَّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝۱۶**

”کہیے ان پیچھے بیٹھے رہنے والے صحرائی عربوں سے کہ عنقریب تمہیں بلایا جائے گا ایسی جماعت کے مقابلے کے لیے جو سخت طاقت ور ہوگی ان سے تمہیں جنگ کرنا ہوگی یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کریں تو اب اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں اچھا صلہ عنایت کرے گا اور اگر تم نے روگردانی کی جیسے پہلے روگردانی کر چکے تو تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔“

یعنی اب اس وقت ان اموال غنیمت کی خاطر تو تمہیں نہیں لے جایا جاسکتا مگر تمہیں اصلاح عمل کا ایک موقع دیا جائے گا اور اس میں اگر تم نے وفاداری کا ثبوت دیا تو پھر یہ پہلے کی غلطی نظر انداز کر دی جائے گی اور اگر پھر تم نے ایسی کمزوری دکھائی تو اس کے بعد عذاب کے سوا کوئی صورت نہیں ہے

”اب یہ موقع کب تھا؟ یہاں مفسرین اہل سنت اجمال قرآن سے فائدہ اٹھا کر اسے جنگ فارس یا روم یا کسی اور مہم سے متعلق کرتے ہیں جو بعد رسول واقع ہوئی ہے۔<sup>[۳]</sup>

[۱] یعنی ما و عدیہ اهل الحدیبیۃ ان غنیمۃ خیبر لہم خاصۃ (تبیان)

[۲] کیف تکون ہذا الایۃ مرادۃ بقول ”کلام اللہ وقد نزلت بعد دیار ریح سنین (مجمع البیان)

[۳] قبیل ہم بنو حنیفۃ اصحاب الیمامۃ وقبیل فارس والروم (جلالین)

مگر یہ تو اس وقت صحیح ہوتا جب یہ اعلان بالکل حیات پیغمبرؐ کے آخری دور میں ہوا ہوتا جس کے بعد پھر رسولؐ نے کوئی لڑائی لڑی ہی نہیں مگر جب یہ فتح خیبر کے پہلے کا اعلان ہے کہ اس جنگ میں تم نہیں لے جائے جاؤ گے۔ اس کے بعد ایک سخت معرکہ سامنے آئے گا، اُس میں تمہارے کردار کے جوہر دیکھے جائیں گے۔ اور بالاتفاق اس کے بعد رسولؐ کو معرکہ حنین درپیش ہوا تو آخر اس اعلان کو درمیانی واقعات سے ایک دم چھلانگ لگا کر بعد رسولؐ کی لڑائیوں سے متعلق کرنے میں کیا معقولیت ہے؟ جب کہ صدر اول کے کچھ مفسرین اسے حنین سے متعلق قرار بھی دے رہے ہیں۔ [۱]

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرْجٌ ط  
وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ وَمَنْ يُتَوَلَّ  
يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا ۝۱۷

”اندھے پر کوئی سختی نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر سختی ہے اور نہ بیمار پر سختی ہے اور جو اللہ اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے تو وہ اسے داخل کرے گا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اور جو روگردانی کرے گا۔ اسے وہ دردناک عذاب کی سزا دے گا۔“

چونکہ سابق میں جہاد سے پہلو تہی کرنے والوں کی مذمت تھی، اس لیے معذور قسم کے افراد کے ذکر کی ضرورت ہوئی کہ ان لوگوں کے لیے معافی ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي  
قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝۱۸ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً  
يَأْخُذُونَ بِهَا ط وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝۱۹

”اللہ راضی ہوا ہے ایمان والوں سے جب کہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے تو اس نے جانا اسے جو ان کے دلوں میں ہے تو اتارا سکون و اطمینان ان پر اور انہیں عنایت کی ایک قریبی فتح اور بہت سے اموال غنیمت جن پر وہ قابض ہوں اور اللہ زبردست ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

### بیعت شجرہ کا ذکر اور خالق کا اعلان خوشنودی

یہ بیعت رسول خدا ﷺ نے مکہ معظمہ کے قریب پہنچ کر اسی سفر جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ہوئی ہے، ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر لی تھی، اس لیے اس کو ”بیعت شجرہ“ کہتے ہیں اور اسی کے متعلق یہ آیت اتری ہے جس کا آغاز لقد رضی اللہ سے ہے ”یعنی اللہ راضی ہوا ہے“ اس لیے

[۱] قال سعید بن جبیر وعكرمة وقتادة هم هو اذن بنين (تبيان) لا معنى لحمل ذلك على ما بعد وقانه (جمع البيان)

اس کو ”بیعت الرضوان“ بھی کہتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام افراد جنہوں نے اس وقت بیعت کی تھی، سب رضائے الہی کے مستحق ہو گئے مگر اس آیت میں یہ فقرہ کہ ”فعلم ما فی قلوبہم“ اس نے جانا اسے جو ان کے دلوں میں ہے، پوری طرح قابل توجہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ اس آیت میں کہا گیا ہے، وہ رسمی اسلام اور اس کے ساتھ اس رسمی بیعت سے وابستہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ایمان سے وابستہ ہے جسے بس اللہ جانتا ہے۔ ورنہ مسلماً جو ایک منافقین کی جماعت وجود رکھتی تھی، بیعت کرنے والوں میں تو وہ بھی شامل تھی۔ [۱]

معلوم ہونا چاہیے کہ مال غنیمت ظاہری اسلام سے مل جاتا ہے مگر رضائے الہی ظاہری اسلام یا رسمی بیعت سے قطعاً متعلق نہیں ہے۔ اس لیے تاریخ میں صرف درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں کی فہرست دیکھ کر سب کو رضائے الہی کا مستحق قرار دینا درست نہیں ہے۔

پھر یہ جو ارشاد ہو کہ ”اتاراسکون واطمینان ان پر“ اور اس سکون واطمینان اتارنے کا ذکر اس سورے میں پہلے بھی ہو چکا ہے اور وہاں بتایا جا چکا ہے کہ اس سکون واطمینان کی خاص علامت یہ تھی کہ اس صلح کے بارے میں ان کے دلوں میں شکوک و شبہات کا ہجوم نہ ہو۔ اب یہی اس آیت میں رضائے الہی کا معیار قرار دیا جا رہا ہے لہذا جن کے دلوں میں شکوک کا غلبہ نمایاں ہو جائے، وہ اس کا مصداق قرار نہیں پاسکتے۔

”انہیں عنایت کی ایک قسمی فتح“۔ معلوم ہونا چاہیے کہ حدیبیہ کے بعد جو بلا فاصلہ ہوئی ہے، وہ فتح خیبر ہے تو یہ وعدہ الہی اس کے ہاتھ سے پورا ہوا جس کے ہاتھوں یہ فتح ہوئی ہے جس کے لیے پیغمبر خدا ﷺ نے متفق علیہ حدیث خیبر: لا عطين الراية الخ کے آخر میں فرمایا تھا: یفتح الله علی یدیہ اللہ اس کے ہاتھوں یہ فتح عنایت کرے گا۔“

وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُ وَنَهَا فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ

عَنكُمْ ۗ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿۲۵﴾ وَأُخْرَى لَمْ

تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿۲۶﴾

”اللہ نے تم سے وعدہ کیا بہت سے اموال غنیمت کا جن پر تم قابض ہو گے تو سر دست تمہیں یہ عنایت کر دیے، اور ان لوگوں کے دست تعدی کو تم سے کوتاہ کر دیا اور اس لیے کہ وہ ایمان والوں کے لیے قدرت کی ایک نشانی ہو اور وہ تمہیں صحیح راستے کی ہدایت کرے اور دوسرے اموال بھی جن پر تمہیں دسترس نہیں ہو، وہ اللہ کے قبضے میں ہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے“

ان اموال غنیمت کے بعد پھر آخر میں جو دوسرے اموال کا ذکر ہے، اسے بھی خاص مقصد کے ماتحت جنگ روم و ایران کے اموال غنیمت سے متعلق کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کے بعد خود عہد رسولؐ میں اموال غنیمت حاصل ہونا تھے اور ہوئے، انہی کو کیوں مراد نہ سمجھا جائے؟

وَلَوْ قَتَلْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوْا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿۲۷﴾

سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۗ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ﴿۲۸﴾

[۱] قد بائع النبي ﷺ جماعة من المنافقين فلا بد من تخصيص الآية على كل حال (تبيان)

”اور اگر کافر لوگ تم سے جنگ کرتے تو وہ پیٹھ پھراتے، پھر نہ ملتا انہیں کوئی دوست اور نہ مددگار، یہی اللہ کا دستور تھا جو پہلے سے جاری ہے اور تم ہرگز اللہ کے دستور میں تبدیلی نہیں پاؤ گے۔“  
یعنی حدیبیہ میں حکمت الہی کا تقاضا یہ تھا کہ پیغمبرؐ بغیر جنگ کے واپس جائیں ورنہ جنگ ہوتی تو کفار مقابلے میں ٹھہرنے سکتے تھے۔ وہ اسی طرح شکست کھاتے جیسے پہلے شکست کھاتے رہے ہیں۔

**وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ  
أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٣٤﴾**

”اور وہ ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے مکے کے علاقے میں جب کہ تمہیں ان کے مقابلے میں پورا دسترس عطا کر دیا تھا اور اللہ اس کا جو تم کرتے ہو، دیکھنے والا ہے۔“

یوں تو اس سے مراد حدیبیہ کے موقع پر جنگ کا وقوع میں نہ آنا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ علامہ طبریؒ کا نظریہ معلوم ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

مگر عام طور پر اس کے تحت میں یہ واقعہ درج کیا گیا ہے کہ اسی حدیبیہ والی مہم میں بعض کا قول ہے کہ چالیں۔<sup>[۲]</sup>

اور بعض کا قول ہے ستر (۷۰)۔<sup>[۳]</sup>

یا اسی (۸۰)۔<sup>[۴]</sup>

آدمی ادھر کے بھیجے ہوئے آئے تھے کہ مسلمانوں پر حملہ کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کریں مگر ان کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ سب گرفتار کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے گئے تو آپ نے سب کو معاف کر دیا جس کا اخلاقی اثر مخالفین اسلام پر بہت پڑا۔

**هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيِ مَعْكُوفًا أَنْ  
يَبْلُغَ حِجْلَهُ ۗ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ  
تَطَّوُّوهُمْ فَتَضَيَّبَكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةً بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ لِيَدْخُلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ  
يَشَاءُ ۗ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٣٥﴾**

وہ وہی ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا اور تمہیں مسجد حرام سے روکا اور ان قربانی کے جانوروں کو جو کہ ساتھ تھے مانع ہوئے اس سے کہ وہ اپنے محل تک پہنچیں اور اگر نہ ہوتے کچھ باایمان مرد اور کچھ باایمان عورتیں کہ تم نادانستہ ان کی

[۱]۔ ذکر اللہ منہ علی المؤمنین بحجزہ بین الفریقین حتی لم تفتتلا وحتی انفق بینہم الصلح (مجمع البیان)

[۲]۔ قال ابن عباس کان المشركون بعثوا اربعين رجلا ليصيبيوا من المسلمين فأتى بهم رسول الله ﷺ فحلى سبيلهم (تبيان)

[۳]۔ بعد از انعقاد صلح ہفتاد تن از او یا ش قریش خواستند کہ بے خبر بر صحابہ تاخت آرد (فتح الرحمن)

[۴]۔ فان ثمانين منهم طافو بعسكركم... (جلالین)



پامالی کا سبب ہو جاتے تو تم پر ان کے سبب سے گناہ ہوتا علمی میں تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کرے۔ اگر وہ الگ ہو جاتے تو ہم سزا دیتے ان میں سے کفر اختیار کرنے والوں کو دردناک عذاب کے ساتھ۔

### حدیبیہ میں جنگ نہ ہونے دینے کا سبب

یہ اس جماعت کو صلح حدیبیہ سے غیر مطمئن تھی، ان کی سطح ذہن کے مطابق مصلحت اس صلح کی بتائی جا رہی ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”بعض مسلمان چھپے تھے مرد اور زن اور بعض ابھی مسلمان ہونے مقدر تھے اس روز کی فتح میں وہ پیسے جاتے۔ آخردو (۲) برس کی صلح میں جتنے مسلمان ہونے تھے سب ہو چکے اور نکلنے والے نکل آئے تب اللہ نے مکہ فتح کر دیا“ (موضع القرآن)

ہمارے یہاں کی ایک حدیث میں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اس آیت کی تشریح یہ ہوئی ہے کہ کافروں کے صلح میں جو با ایمان نسل علم الہی میں تھی، اس کا خیال خونریزی سے مانع تھا۔ اس صورت میں تَزَيَّلُوا ”اگر وہ الگ ہو جاتے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نسل عالم شہود میں آچکی ہوتی تو عذاب سے مانع کو نینہ ہوتا۔<sup>[۱]</sup>

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ الْحَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالزَّمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ

بِهَا وَأَهْلَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝۳۱

”جب ان لوگوں نے جو کافر ہیں اپنے دلوں میں حمیت کا جذبہ پیدا کیا، وہ جاہلیت والی حمیت تو اللہ نے اپنا سکون اتارا اپنے پیغمبر پر اور ایمان والوں پر اور انہیں پابند رکھا پرہیزگاری کی بات کا اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے لائق تھے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

### صلح حدیبیہ سے غیر مطمئن افراد کو مطمئن بنانے کی کوشش

بلاشبہ کفار قریش کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصوبے سے کہ آپ مکہ معظمہ میں داخل ہو کر مراسم عبادت انجام دیں ناگواری محسوس کرنا، اس حمیت جاہلیت ہی کا نتیجہ تھا کہ جنہیں ہم مکہ سے نکال چکے ہیں اور ان سے جنگ کرتے رہے ہیں، وہ اب ہماری آنکھوں کے سامنے بلا مزاحمت مکہ میں داخل ہوں لہذا وہ باوجود طاقت مقابلہ نہ ہو کے ”حرکت مذہبوجی کے طور پر مزاحمت کے لیے تیار ہوئے۔“

اس کے مقابلے میں اللہ نے اپنی طرف سے سکون اتارا اپنے پیغمبر پر ایمان والوں پر یعنی انہوں نے ان کی اس جہالت کے مقابلے میں ضبط و تحمل سے کام لیا، عام طور پر اہل تفسیر بس اتنے ہی پر نظر ڈالتے ہیں مگر اس حمیت جاہلیت کے مقابلے میں اسی نوعیت کی ایک حمیت مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ میں بھی تو کارفرما تھی، یعنی وہ ان کی اس جاہلیت کے مقابلے میں سکوت و سکون اور برداشت کو خود اپنی عزت

[۱] - كان الله ودائع مومنون في اصلاص قوم كافرين (علي بن ابراهيم)

قومی کے خلاف سمجھتے تھے، چنانچہ جو حمیت کے معنی ہیں کسی بات کو اپنی شان کے خلاف سمجھنا۔<sup>[۱]</sup>

ان کی ترجمانی صلح کی مخالفت میں ان الفاظ سے ہو رہی تھی کہ ”لَمْ تَعْطَى الدنیا فی دیننا“ ”ہم اپنے دین کے بارے میں اس ذلت کو کیوں برداشت کریں“ لہذا اللہ کی طرف کے سکون و اطمینان کی منزل وہی ثابت قدم اور مطمئن افراد مانے جاسکتے ہیں جو نہ کافروں کی حمیت جاہلیت کے مقابلے میں جوش سے کام لیں اور نہ اس اپنی جماعت کی اس حمیت سے جو بنا م ”حمیت دینی“ تھی متاثر ہو کر اپنے ہوش ایمانی کو ہاتھ سے دیں بلکہ رسول کے ساتھ ساتھ اس صلح پر مطمئن رہیں چنانچہ بعد میں بلا فاصلہ جو آیت ہے اس سے بھی صاف نظر آتا ہے کہ مقابل میں وہ جماعت پیش نظر ہے جو اس صلح سے غیر مطمئن تھی کیونکہ انہی کے دل میں یہ بھی تھا اور زبان پر آ رہا تھا کہ رسول نے تو خواب دیکھا تھا کہ آپ مکہ معظمہ میں داخل ہونگے تو اس صلح کے ساتھ بے نیل مرام واپسی کیوں ہو رہی ہے، ان کے اس وسوسا کا دفعیہ اس کے بعد کی آیت میں کیا گیا ہے بلکہ ہم تو محسوس کرتے ہیں کہ آخر سورہ تک بعد کی آیتیں بھی اس جماعت اور اس کے ترجمان کی گفتگو کے پس منظر میں اتری ہیں کیونکہ اس گفتگو کا یہ جز بھی تھا کہ کیا آپ خدا کے رسول نہیں ہے؟ کیا ہم حق پر نہیں ہے؟ اب بعد کی آیتوں کے الفاظ دیکھئے کہ اللہ نے اپنے رسول کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اور پھر یہ کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والوں کی یہ شان ہونا چاہیے یعنی جس سے پوری جماعت کی مدح میں بڑے زور کے ساتھ ایک قصیدے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے وہ اس پس منظر میں اس جماعت کے بہت افراد پر تازیا نے کی حیثیت رکھتا ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّسُولَ بِالْحَقِّ ۗ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ

أَمِينٍ ۗ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ ۗ لَا تَخَافُونَ ۗ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا

فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا ﴿۱۶﴾

”اللہ نے اپنے رسول کو حقیقتاً بالکل ہی سچا خواب دکھایا کہ تم لوگ انشاء اللہ ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے اطمینان کے ساتھ اپنے سروں کو منڈوائے اور اپنے کچھ بال یا ناخن کترے ہوئے تمہیں کچھ خوف نہ ہوگا، پھر بھی اس نے جانا وہ جو تم نہیں جانتے تھے تو اس کے پہلے اس نے ایک دوسری فتح عطا کر دی“

غیر مطمئن مسلمانوں کے دلوں میں بڑا وسوسہ یہ تھا اور وہ زبانوں پر بھی آ رہا تھا کہ رسول نے روانگی سے پہلے اپنا خواب بیان کیا تھا کہ ہم لوگ مکے میں داخل ہوئے ہیں مگر یہاں اس کے خلاف ہو رہا ہے تو اسے صاف کہا گیا ہے کہ وہ خواب بالکل سچا تھا۔ ایسا ضرور ہو کر رہے گا مگر یہ ضروری نہیں کہ اسی سال ایسا ہو۔ خدا کے وعدے پر اعتبار رکھو اور شک و تذبذب کو اپنے دل میں راہ نہ دو۔

الفاظ قرآن کے لحاظ سے اس کے پہلے جو فتح عطا کی، اس سے مراد یہی صلح حدیبیہ بھی ہو سکتی ہے جو اخلاقی اور اصولی فتح کی حیثیت رکھتی تھی، مطلب یہ ہے کہ اس وقت اس نوعیت کی فتح دے دی لیکن ایک تفسیر اس کی یہ ہے کہ اس پہلی فتح سے فتح خیبر مراد ہے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] - الحمیة الانفة من الشئ (جلالین)

[۲] - یعنی فتح خیبر (علی ابن ابراہیم)

جناب شیخ طوسی نے صدر اول کے مفسرین کے دونوں قول نقل کئے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

خالق کا خود اپنی مشیت کے فیصلے کے بعد میں ظاہر ہونے کے اعلان کے ساتھ جبکہ اس کے لیے اس کے وقوع میں شک و شبہ کا تو ہم بھی نہیں کیا جاسکتا انشاء اللہ کہنا اس سنت کو قائم کرنے کا عملی اہتمام ہے کہ بعد میں ہونے والی کسی بات کے کہنے میں چاہے کتنی ہی تمہارے لیے یقینی ہو انشاء اللہ ضرور کہہ لیا کرو، جب کہ انسان جسے یقینی سمجھتا ہے، وہ بھی اکثر بے حقیقت ثابت ہو جاتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ط وَكَفَىٰ

بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿۳۸﴾

”وہ وہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو صحیح رہنمائی اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے اس لیے کہ اُسے ہر دین پر غالب کرے اور اللہ سے بڑھ کر کون گواہ ہوگا“

ایسی ہی آیت سورہ برأت میں دسویں پارے میں آچکی ہے جس کا بنیادی مضمون یہی ہے اور پھر اس کے بعد اٹھاسویں پارے میں سورہ صف میں آے گی۔

یہاں محل وقوع کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ انکی رسالت کو سچے دل سے تسلیم کرتے ہو تو ان کی باتوں میں شک و شبہ کو راہ نہ دو اور ان کے عمل اور فیصلے پر چوں و چرا نہ کرو اور درمیان میں ناگوار صورت حال بھی پیش آئے تو مایوس نہ ہو اور سمجھو کہ نتیجے میں اللہ کی بات پوری ہو کر رہے گی۔

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ط وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ

رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا نَّسِيبًا هُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ

السُّجُودِ ط ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ ط وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ط كَزُرْعٍ أَخْرَجَ

شَطْطَهُ فَازْرَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيغِيظَ بِهِمُ

الْكُفَّارَ ط وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا

عَظِيمًا ﴿۳۹﴾

”محمد اللہ کے پیغمبر ہیں اور وہ جو ان کے ساتھی ہیں، کافروں کے مقابلے میں سخت، آپس میں بڑے ترس والے ہیں، تم انہیں دیکھو گے رکوع اور سجود میں مصروف، کہ وہ طلب گار ہیں اللہ کی طرف کے فضل و کرم اور خوشنودی

[۱] قال ابن زید یعنی بذالك فتح خيبر وقال الزهري هو فتح الحديبية (تبيان)

[۲] قال ابو العباس تغلب استنى الله فيما يعلم ليسنثني الناس فيما لا يعلمون (مجمع البيان)

کے۔ ان کی شان ان کے چہروں میں نمایاں ہے سجدے کے نشان سے۔ یہی ان کی توصیف ہے تو ریت میں اور اُن کی توصیف انجیل میں اس کھیتی کی طرح ہے جس کے ادھر ادھر کو پلٹیں پھوٹیں اس کے بعد وہ پھسکی اور اپنے قد و قامت پر کھڑی ہوئی، کہ کاشت کرنے والوں کے لیے خوش آئند ہے تاکہ غم و غصہ میں مبتلا نہ کرے اس سے کافروں کو، اللہ کا وعدہ ہے ان سے کہ جو ان میں با ایمان اور نیک اعمال رکھنے والے ہوں بخشش اور بڑے اجر و ثواب کا۔“

قرآن مجید کی آیت ہے، اس لیے اس کے مضمون کی حقانیت میں مسلمانوں کے اندر کوئی دو (۲) راسخ تو ہو ہی نہیں سکتیں مگر بس اتنا نظر کا پھیر ہے کہ کوئی بس جسمانی معیت کو اصل قرار دے اور پھر سمجھ لے کہ یہ سب توصیفات انہی کے ہیں، چاہے وہ اوصاف پائے جا رہے ہوں یا نہیں اور کوئی اصل ان توصیفات کو قرار دے اور جن میں یہ اوصاف از روئے مشاہدہ اور بر بنائے تو اتر اخبار نظر آئیں انہی کو سمجھیں کہ وہ حقیقتاً رسول خدا ﷺ کے ساتھی ہیں۔ نہ کہ وہ جنہیں تاریخ کے آئینے میں دیکھا جا رہا ہے وہ کفار کے مقابلے میں نرم ہیں اور اپنے آدمیوں کے مقابلے میں سخت ہیں، جن کا وقت بجائے رکوع سجد کے کبھی بازاروں کی گشت میں گزرتا ہوا اور کبھی سیاسی جوڑ توڑ میں یا جو رضائے الہی کے مقابلے میں مفادات دنیوی کو ترجیح دیتے رہے ہیں، ایسے لوگ ہر وقت رسول کی معیت میں نظر آئیں مگر پیغمبر کے واقعی ساتھی نہیں ہیں۔

آخر میں خالق نے جو اٰمَنُوا وَاَعْمَلُوا الصّٰلِحٰتِ جو ایمان پر قائم رہیں اور نیک اعمال کرتے رہیں کے ساتھ منہمہ کا لفظ ارشاد فرمایا ہے، اُن میں سے“ یہ عدالت صحابہ کی عمومیت کے قلعے کو چونکہ سہار کر دینے والی ہے، اس لیے تفسیر جلالین میں دفع دخل کیا گیا ہے اس طرح کہ: منہمہ ای الصحابہ لبيان الجنس لا للتبعيض لان كلهم بالصفات المذكورة۔

مطلب یہ ہے کہ یہ من بیانہ ہے جس کا ترجمہ ”یعنی“ سے ہوتا ہے اس طرح کہ اللہ کا وعدہ ہے ایمان اور عمل صالح رکھنے والوں سے یعنی انہی سے جو پہلے بیان ہوئے من تبعیضہ نہیں ہے کہ جس سے ثابت ہو کہ اس جماعت میں کچھ لوگ اس صفت سے متصف نہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ فرماتے ہیں:۔ اس لیے کہ وہ تو سب اس صفت سے متصف تھے، اسے کہتے ہیں ’مصادر علی المطلوب‘ یعنی دعوے کو دلیل میں پیش کر دینا جو منطقی طور پر غلط ہوتا ہے اور اسے یوں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قرآن کو اپنے عقیدہ کا تابع بنانا ہے حالانکہ عقیدے کو قرآن کا تابع ہونا چاہیے۔

شاہ عبدالقادر کے ذوق کو بھی من بیانیہ کی تاویل قابل قبول معلوم نہیں ہوئی۔ انہوں نے اسے من تبعیضہ ہی قرار دیا ہے مگر فرماتے ہیں:۔

”حضرت کے سب صحابہ ایسے ہی تھے مگر خامی آنے کا اندیشہ رکھا حق تعالیٰ بندوں کو ایسی خوشخبری نہیں دیتا کہ نڈر ہو جاویں۔ مالک سے اتنی شاباشی بھی عنیمت ہے، (موضع القرآن)

سمجھے آپ؟ کیا مطلب ہوا؟ تھے تو وہ سب ایسے مگر خالق نے اس واقعیت کا اظہار خلاف مصلحت سمجھا لہذا مصلحتاً فرما دیا کہ جو ان میں سے ان اوصاف کے ہوں، ان سے وعدہ ہے۔ اب معلوم نہیں خالق کے اس عمل کو تفسیر سمجھا جائے یا کیا؟ اور تفسیر بھی کن سے؟ وفادار بندوں یعنی خود صحابہ سے؟ سچ ہے انسان کو سخن پروری میں کیا پا پڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

# سُورَةُ الْحُجْرَاتِ

## مدنیہ۔۔۔۔۔۱۸۔۔۔۔۔ آیات

”حجرات“ یعنی چھوٹے چھوٹے رہنے کے ٹھکانے جنہیں آج کل کی زبان میں ”کوآرٹ“ کہہ سکتے ہیں ”کمرے“ اور ہمارے معیار زندگی کے لحاظ سے ”کوٹھریاں“ ایسے ہی مکانات میں ازواج رسول کا قیام تھا اور جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الشرف گیا ”محل“ یا ”حرم سرے“ میں ہوتے تھے تو ان میں سے کسی میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ چونکہ اس سورے کی ایک آیت میں ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے جو بدتمیزی سے ”حجرات“ کے پیچھے کی دیواروں کی طرف سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے تھے اس لیے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

### سورہ حجرات کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش دستی کرنے کی شدید ممانعت۔
- ۲..... رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کرنے کی ممانعت اور رسول کے سامنے آواز کو دھیمار کھنے کی ہدایت جس سے تعظیم رسول میں اہتمام ظاہر ہے۔
- ۳..... فاسق کے خردینے پر تحقیق کی ضرورت۔
- ۴..... اچھائی سے محبت اور برائی سے نفرت یعنی تولا و تبرأ کی تلقین۔
- ۵..... مسلمانوں کو اس جماعت سے جو باغی ہو جنگ کرنے کا حکم۔
- ۶..... آپس کی بچھتی کے لیے ہدایت، ایک دوسرے سے تمسخر نہ کرنے، پھبتیاں نہ کہے، بدگمانی سے کام نہ لے، دوسرے کے کاموں کا کھوج نہ کرے۔
- ۷..... غیبت کی ممانعت اور شدید مذمت۔
- ۸..... اسلامی مساوات کے ساتھ معیار امتیاز کا بیان۔
- ۹..... اسلام آسان ہے اور ایمان مشکل ہے۔
- ۱۰..... ایمان کا اصلی معیار۔
- ۱۱..... اپنے اسلام اور ایمان کا اللہ پر احسان جتنا غلط ہے بلکہ یہ اللہ کا احسان اپنے اوپر ماننا چاہیے کہ اس نے قبول ہدایت کے ساتھ راہ راست کو اختیار کرنے یا اس پر قائم رہنے کی توفیق کرامت فرمائی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ①

”اے ایمان لانے والو! اللہ اور رسول کے سامنے پیش دستی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

پیغمبر خدا ﷺ کے سامنے پیش دستی کی سخت ممانعت

اس آیت کی شان نزول میں عجیب لطیفہ نظر آتا ہے کہ شیعوں کی قدیم تفسیر میں تو اسے بنی تمیم کے وفد سے متعلق قرار دیا ہے جو رسول کی خدمت میں آئے تو آپ اندر تشریف رکھتے تھے، وہ باہر سے حضرت کا نام لے لے کر پکارنے لگے کہ باہر نکلیے اور پھر جب حضرت برآمد ہوئے تو ان کے آدمی آپ کے آگے آگے چلنے لگے اور بات کرنے لگے تو آپ کی صدا پر اپنی صدا بلند کر کے اور بات چیت میں بغیر کسی تعظیم و تکریم کے جیسے آپس میں گفتگو کرتے ہیں ویسے ہی آپ کا نام لے لے کر کرتاخاب کرنے لگے۔ اس پر یہ اور اس کے بعد کی آیتیں نازل ہوئیں۔ [1]

مگر اہل سنت کی مشہور تفسیر جلالین میں ہے:-

نزولت فی حادثة ابی بکر و عمر علی النبی ﷺ فی تأمیر الاقرع بن جابس والقعقاع بن معبد۔

یہ آیت نازل ہوئی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی باہمی زوردار بحث کے بارے میں جو پیغمبر خدا ﷺ کے فیصلے پر ہو رہی تھی کہ اقرع بن حابس سردار مانا جائے یا قعقاع بن معبد؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ موقع نزول تو وہی ہے جب بنی تمیم کا وفد آیا تھا مگر یہ شدید تشبیہ جو آیت میں کی گئی ہے، اس وقت کے ان نو مسلم افراد کے کسی عمل پر نہ تھی بلکہ جناب شبلی نعمانی کی زبان میں اسلام کے جو ”مہر و ماہ“ ہیں، ان کے کردار پر تھی۔

جناب شیخ طوسی نے شان نزول تو کچھ درج نہیں کی ہے۔ اصل مضمون آیت کی ہمہ گیری پر روشنی ڈالی ہے اور نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہر کام جو خدا و رسول کے خلاف کیا جائے، وہ ان کے مقابلے میں ایک طرح پیش دستی ہے۔ [2]

ہمارے نزدیک یہ بات از روئے حقیقت درست ہونے کے باوجود ان آیات کو دیکھتے ہوئے جو اسی سورے میں اس سے متصل نظر آتی ہیں اس محل پر مقصود معلوم نہیں ہوتی بلکہ پورا سلسلہ رسول خدا ﷺ کی بارگاہ میں بے ادبیوں کی روک اور آپ کی تعظیم و تکریم کی اہمیت ذہن نشین کرنے ہی کے مقصد کا حامل نظر آتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ

بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ② إِنَّ

[1] - نزولت فی وفد بنی تمیم (علی ابن ابراہیم)

[2] - الاولی حمل الآیة علی عمومہا فکل شیء اذا فعل خلاف اللہ ورسولہ فهو تقدم بین ایدیہما (تبیان)

الَّذِينَ يَعْضُونَ أَسْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۗ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٣﴾

”اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ ان سے زور زور سے باتیں کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ زور سے بات کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو، بے شک وہ جو اپنی آوازیں رسول خدا کے پاس دھیمی رکھتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پرہیزگاری کے لیے آزمایا ہے ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر و ثواب۔“

وہ جو رسول اور ائمہ اور مقربین بارگاہ الہی کی تعظیم کو شرک کا مرادف سمجھتے ہیں، آنکھ کھول کر دیکھیں کہ اس تعلیم قرآن اور سخت ترین انداز میں اس کی مخالفت پر زبرد تو شیخ اور تحویف و تہدید، یہ تعظیم رسول کی بحد لزوم دعوت ہے یا نہیں؟

تعظیم کو منع کرنے کا مطلب ہے برتاؤ میں کسی قسم کے بھی امتیاز کا نہ برتنا۔ اگر خالق کو یہ مد نظر ہوتا تو وہ رسول کے لیے خصوصی طور پر اس قسم کے امتیاز کا مطالبہ کیوں کرتا؟۔

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنَ الْحُجْرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥﴾

”بلاشبہ یہ لوگ جو آپ کو حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں، ان میں زیادہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اور اگر وہ اتنا صبر و ضبط سے کام لیتے کہ آپ خود ان کے پاس نکل کر آئیں تو ان کے لیے بہتر تھا اور اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔“

”سورہ حجرات“ نام اس سورے کا جو ہوا ہے، وہ اسی آیت سے جس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے کہ جب حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اندر ہوتے تھے تو جاہل عرب پیچھے کی دیوار کی طرف سے آکر بدتمیزی سے آپ کو آواز دیتے تھے اسی سلسلے میں یہ آیت اتری ہے:-

اس سے اور ایسی ہی دوسری آیتوں سے جو قرآن کریم میں، پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسی بدتمیز قوم سے ساتھ پڑا تھا مگر یہ آپ کا خلق عظیم تھا کہ آپ اسے برداشت کرتے تھے لیکن خالق کریم قرآن کریم کی آیتوں کے ذریعے سے انہیں متنبہ کرتا تھا تاکہ ان لوگوں کی اصلاح وہ مقصد بھی جس پر آپ مامور ہیں، پورا ہو جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصِيبُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نُدْمِينَ ﴿٦﴾

”اے ایمان لانے والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو کہ کہیں کسی جماعت کو تم ناواقفیت سے ضرر نہ پہنچا دو، پھر تمہیں اپنے کیے پر پشیمان ہونا پڑے“

## فاسق کے خبر دینے پر تحقیق کی ضرورت

چونکہ ”عادل“ اور ”فاسق“ دونوں شرع اسلامی کی اصطلاح لفظیں ہیں جن کے حدود شرائط پر مکمل بحثیں فقہ میں ہوئی ہیں، اس لیے ان کا ترجمہ کسی دوسری لفظ سے مناسب معلوم نہیں ہوتا، بلکہ ترجمے میں بھی بعینہ وہی لفظیں درج کر دی جانا چاہئیں، اب یہ فاسق جس کی خبر پر اس طرح عمل کرنے سے روکا گیا تھا، چاہے معلوم ہو کون ہے؟ اور وہ ولید بن عتبہ ہے مگر الفاظ آیت میں لفظ فاسق کئی خاص شخص کے نام کے طور پر تو آئی نہیں ہے بلکہ بطور وصف کلی طور پر آئی ہے لہذا وہ اور اس کی دلیل ہے کہ اس دور میں رسولؐ کے گرد و پیش رہنے والی جماعت میں فاسق کے لفظ کے مصداق کا وجود ہے اور اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ بس ایک ہی شخص تھا۔

چونکہ حکم بہر حال ایک قانون کلی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے لہذا اصول فقہ میں یہ منظر نظر آتا ہے کہ اسی آیت سے خبر واحد کی حجیت پر جب کہ راوی عادل ہو استدلال کیا جاتا ہے جسے جناب شیخ مرتضیٰ انصاری کی رسائل میں دیکھا جاسکتا ہے اور اسی سے جناب شیخ الطائفہ اور ان کے تتبع میں علامہ طبرسی نے عدم حجیت پر استدلال کیا ہے۔

پہلے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ فاسق کی خبر میں تحقیق کا حکم دیا گیا ہے یعنی اسے آنکھ بند کر کے باور نہ کرو۔ اب اگر عادل کی خبر میں بھی ایسا ہی ہے تو پھر فاسق اور عادل میں فرق ہی کیا ہوا؟

دوسرے استدلال کی بنیاد اس پر ہے کہ تحقیق کا حکم اس خطرے کی بنا پر ہوا ہے کہ تم بلاوجہ اس پر عمل کر کے کسی غلط کاری میں مبتلا نہ ہو اور یہ خطرہ خبر عادل میں بھی ہے لہذا اس کو بھی بغیر تحقیق قبول نہ کرنا چاہیے

اس کی اصل تحقیق و تنقیح تو اصول فقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ تفسیر میں اس پر کسی بسیط بحث کا محل نہیں ہے لیکن اس استدلال کے متعلق یہاں مختصراً عرض یہ ہے کہ عقلی طور پر یہ خطرہ ہے کہ کہیں نتیجتاً غلطی نہ ہو، یہ تو مسلمہ طور پر ”ظنون خاصہ“ جنہیں ”امارات“ کہتے ہیں جیسے بینہ یعنی دو عادلین کی گواہی وغیرہ ان میں بھی ہے، اس لیے کہ جب عادل کا معیار جو اصطلاح شرع میں ہے، معصوم ہونے کا مرادف نہیں ہے تو جیسے حد تو اترا تک نہ پہنچے ہو عادلوں کی خبر میں جسے ”خبر واحد“ کہتے ہیں، مخالفت واقع کا امکان ہے ویسے ہی دو (۲) عادلوں کی گواہی میں مگر چونکہ شریعت نے اسے معتبر قرار دیا ہے تو اس پر عمل میں ندامت کا سوال پیدا نہیں ہوتا جب کہ ضمیر مطمئن ہے کہ خدا نے جس چیز کو حجت یعنی قابل عمل قرار دیا ہے، ہم نے اس پر عمل کیا ہے۔ یہاں فاسق کی خبر میں عمل کو منع کرنے میں کہا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ناواقفیت سے غلط کام کرو تو اپنے کیے پر نادم ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے حجت قرار نہیں دیا ہے لیکن عادل کی خبر میں چاہے مخالفت واقع کا عقلاً امکان ہو، ندامت نہیں ہوگی کیونکہ عمل کی بنیاد ایک معتبر چیز پر ہے وہ خبر عادل ہے۔

وَأَعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ ۗ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ  
وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ  
وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّشِدُونَ ۖ فَضَلَّ مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۗ



## وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٨﴾

”اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر یہ بہت سی باتوں میں تمہارا کہنا مانے تو تم زحمت میں پڑھ جاؤ مگر اللہ نے محبوب بنایا ہے تمہارے لیے ایمان کو اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کیا ہے اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تمہیں ناگواری پیدا کی ہے، یہی لوگ وہ ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں اللہ کے فضل و کرم سے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، ٹھیک کام کرنے والا ہے۔“

## تولیٰ اور تبرّٰ کا حکم

اس آیت سے ظاہر ہے کہ اچھائی سے محبت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک برائی سے نفرت نہ ہو یہی قرآنی اصول تو لاوتیرا کاسنگ بنیاد ہے اور ان دونوں پہلوؤں کے یکجا رکھنے والوں کے لیے قرآن کا اعلان ہے کہ **أُولَئِكَ هُمُ الرَّاٰثِدُونَ** ”یہی لوگ راہ راست پر ہیں“ پھر سمجھ لیجیے ایمان سے محبت ہونا چاہیے اور کفر، فسق، اور معصیت سے نفرت اور ظاہر ہے کہ یہ غرض بغیر کسی محل کے قائم نہیں ہو سکتی، ان سے نفرت کے معنی ہوں گے ان افراد سے نفرت جو ان باتوں کے حامل ہوں صحیح راستہ یہی ہے باقی سب گمراہی۔ اس کے علاوہ آیت کے مرکزی مضمون کو بھی یاد رکھنا چاہیے یعنی پیغمبر مسلمانوں کے مشورے پر عمل کے پابند نہیں ہیں، شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:-

”یعنی تمہارا مشورہ قبول نہ ہو تو برا نہ مانو، رسول عمل کرتا ہے اللہ کے حکم پر، اسی میں تمہارا بھلا ہے، اگر تمہاری بات مانا کرے تو ہر کوئی اپنے بھلے کی کہے گا کس کس کی بات پر چلے“ (موضح القرآن)

ایک تلخ حقیقت جو آیت سے نمایاں ہے کہ ایمان کے مقابلے میں تین (۳) وصف ہیں کفر، فسق اور عصیان اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اعتقادی خامی جس کا نام کفر ہے ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے، اسی طرح عملی کمزوریاں جن کا نام باختلاف مدارج فسق اور عصیان ہے، یہ بھی ایمان کے خلاف ہیں۔ [۱]

لہذا گناہوں میں سرشار رہتے ہوئے اس تصور میں گن رہنا کہ مجھ ہم مؤمن تو ہیں، خیال خام کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

وَأَنْ طَآئِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِئَءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۖ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسَطُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٩﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَ أَخَوِيكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٠﴾

”اور اگر مسلمانوں میں سے دو (۲) گروہ آپس میں لڑنے لگیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ اب اگر ایک نے

[۱] فی الایة دلالة علی ان اضداد الایمان ثلثة کفر وفسوق وعصیان (تبیان)

دوسرے کے خلاف ظلم و تعدی کی ہے تو جس نے تعدی کی ہے، اُس سے جنگ کرو اس حد تک کہ وہ حکم الہی کی طرف واپس آئے تو اگر واپس آجائے تو پھر دونوں میں صلح کرو اور انصاف کے ساتھ اور انصاف سے کام لو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہی تو ہیں تو اپنے بھائیوں میں صلح کرو اور اللہ سے ڈرو، شاید اس کی رحمت تمہارے شامل حال ہو،

### مسلمانوں کو باغی جماعت سے جنگ کرنے کا حکم

یہ وہ آیت قرآنی ہے جو ”قتال بغاۃ“ یعنی مسلمانوں میں سے جو لوگ حکومت اسلامی کے خلاف باغی ہو جائیں، ان سے جنگ کے بارے میں ہے جس کے اجمال کی تفصیل اور اس کے تحتی قوانین شرعی کے لیے علمائے اہل سنت اقرار رکھتے ہیں کہ وہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب ؑ کی ان جنگوں سے جو جمل و صفین میں آپ نے لڑی تھیں معلوم ہوئے ہیں۔

جناب شیخ الطائف نے ایک بات پر متنبہ کرنا ضروری سمجھا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں کا شمار مؤمنین میں، اس جنگ کے قبل کے لحاظ سے ہے لیکن اس جنگ کے بعد بھی وہ دونوں مؤمنین کا مصداق رہیں گے، یہ اس سے ثابت نہیں ہوتا۔<sup>[1]</sup>

میرا تصور یہ ہے کہ حقیقی ایمان جو معیار نجات ہے، وہ تو طوائف ثقتان من المؤمنین کہنے سے پہلے بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ المؤمنین یہاں جماعتی لقب کے طور پر ہے جو اقرار ایمان سے حاصل ہو جاتا ہے، ورنہ اگر اس معیار کے سب مؤمن ہوتے تو وہ آپس میں خونریز جنگ کرتے ہی نہ لیکن جہاں تک ظاہری اسلام اور اس کے قانونی احترام کا سوال ہے، وہ آیت کے مضمون کے لحاظ سے جنگ کے بعد بھی برقرار معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ان بغاۃ کے احکام عام کفار سے مختلف کیوں ہوتے اور اگر بعد کی آیت کو قبل والی آیت کا تتمہ سمجھا جائے جیسا کہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برادری کا رشتہ بھی جو جنگ کے قبل تھا، وہ جنگ کے بعد بھی قائم ہے جس کے تقاضوں کے واپس لانے اور بحال کرنے کے لیے صلح کرانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا  
نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْبِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا  
تَنَابَزُوا بِاللِّقَابِ ۗ بئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۗ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ  
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿١١﴾

”اے ایمان والو! کوئی مردوں کی جماعت دوسری جماعت کے ساتھ تمسخر نہ کرے، بہت ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ کوئی عورتیں دوسری عورتوں کے ساتھ تمسخر کریں، بہت ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ اپنے آدمیوں پر چوٹیں کرو اور نہ برے خطابوں کے ساتھ یاد کرو وگناہ برانام ہے آدمی کا کہ ایمان لانے کے بعد فاسق

[1] لادلالة في هذا على انهما اذا اقتلا بقيا على الايمان (تبيان)

کہلائے اور جو توبہ نہ کرے گا وہی ظالم لوگ ہیں۔“

### مؤمنین سے تمسخر اور بدگمانی کی ممانعت

یہاں کی کئی آیتوں مسلمانوں کے درمیان بےجہتی قائم رکھنے اور باہم اسباب منافرت کے سدباب کے لیے تعلیمات ہیں جن کی مخالفت سے باہمی رنجش پیدا ہوتی ہے۔ رنجش آگے بڑھ کر کسی نوعیت کے تصادم کی صورت اختیار کرتی ہے ان میں سے پہلی بات ہے دوسرے کے ساتھ تمسخر یہ وہ مذاق ہوتا ہے جس کے ساتھ توہین کا پہلو شامل اور اس میں ہوتا ہے اپنے کو بالاتر سمجھنا اور دوسرے کی تحقیر اس لیے کہا گیا کہ تمہیں حق نہیں ہے کہ کسی کو اپنے سے کمتر سمجھو، بہت ممکن ہے کہ وہ تم سے اللہ کے نزدیک بہتر ہوں، دوسرے چوٹیں کرنا جس میں اکثر صورت یہ ہوتی کہ اس شخص کا نام نہیں لیا جاتا مگر انداز ایسا ہوتا ہے کہ سب سمجھتے ہیں کہ یہ اسی پر ہے اور وہ بھی یہی سمجھتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جواب نہ دے یا نہ دے سکتا ہو مگر اس کے دل کو تکلیف تو ہوتی ہے۔

تیسرے (۳) برے خطابوں کے ساتھ پھبتیاں کسنا یہ بسا اوقات بعد میں اتنی مشہور ہو جاتی ہیں کہ تقریباً نام کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں جس کی ذمہ داری اس پہلے شخص پر ہوتی ہے جس نے اس کی ابتدا کی ہے۔ بعض لوگ بسا اوقات ایسا وقتی تفریح کے طور پر کرتے ہیں مگر آیت کے آخری الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ سب گناہ ہیں ایسے جو اصطلاح شرع میں ”فاسق“ ہونے کا باعث ہوتے ہیں اور جن سے توبہ کرنے کی ضرورت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۖ أَيُّبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲﴾

”اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو، یقیناً بعض گمان بڑے گناہ ہوتے ہیں اور کھوج نہ کرو اور تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں کا کوئی دوست رکھتا ہے کہ اپنے بھائی کا جب وہ مردہ ہو جائے تو اس کو گوشت کھائے۔ اسے تم نے بھی برا سمجھا ہے اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔“

### تجسس، بدگمانی اور غیبت سے ممانعت

اسباب منافرت میں درجہ بدرجہ تین (۳) منزلوں پر ممانعت کے پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ اگر پہلی رکاوٹ کامیاب ہوگئی تو شاید دوسری منزل آئے ہی نہیں اور دوسری پر قدم رک جائیں تو شاید تیسری منزل تک جوشدیدتر گناہ کی ہے، آدمی کے قدم نہ پہنچیں۔ پہلی منزل ہے بدگمانی کرنا پہلی دیوار ممانعت کی یہاں کھڑی کی گئی ہے دوسری (۲) منزل ہے بدگمانی پیدا ہونے کے بعد جستجو کہ ہم اس کا پتہ لگائیں، اسے منع کیا گیا کہ تجسس نہ کرو۔ اب اگر اس کی اخلاف درزی ہوئی اور تجسس سے پتہ چل گیا یا بغیر تجسس ہی اتفاق سے پتہ لگ جائے تو اب جو بہت سخت گناہ ہے اس سے روکا جا رہا ہے کہ تمہیں برائی معلوم بھی ہوگی، تو خبردار اس کا چرچا نہ کرو، دوسروں سے اس کا ذکر نہ کرو۔ یہ غیبت

ہے جو اس طرح کی بری چیز ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا جسے یقین ہے کہ ہر ایک کا ضمیر ناپسند کرتا ہے تو جب اسے ناپسند کرتے ہو تو پھر غیبت سے پرہیز کرو کہ وہ بھی ایسی ہی چیز ہے۔

آخر میں بخشش اور مہربانی کا اعلان اس شخص سے متعلق معلوم ہوتا ہے جس کی غیبت کی جارہی ہے کہ تمہیں کیا خبر، اسکے جس گناہ کا تم چرچا کر رہے ہو، وہ بخشنا چاہو اور وہ اللہ کے یہاں اس داغ سے پاک و صاف ہو چکا ہو۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ

لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾

”اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں قرار دیا ہے اس لیے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو، یقیناً تم میں زیادہ عزت والا اللہ کے یہاں وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہو، بلاشبہ اللہ بڑا جاننے والا ہے، خبر رکھنے والا“۔

### اسلامی مساوات کے ساتھ معیار امتیاز کا بیان

یہی وہ غلط و جوہ امتیاز کے مقابلے میں مساوات اسلامی اور غلط تصور مساوات کے مقابلے میں معیار امتیاز کو ثابت کرنے والی آیت ہے جس نے تمام دنیا کی تہذیبوں کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کو بلند ترین درجہ بخشا ہے۔ اس کے تحت میں پیغمبر خدا ﷺ نے روز فتح مکہ بر ملا یہ اعلان فرمایا کہ:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ان الله قد اذهب عنكم بالاسلام نخوة الجاهلية وتفاحرهابآباءها ان عربيه ليس باب  
دوالة انما هولسان الناطق فمن تكلم به فهو عربي الا انكم من آدم و آدم من تراب و اكرمكم عندالله اتقاكم  
(علی ابن ابراہیم)

اے انسانو! اللہ نے اسلام کے ذریعے سے تمہارے جاہلیت والے گھمنڈ اور آباؤ اجداد کی طرف نسبت کی بنا پر جو فخر کی جاتا تھا، وہ ختم کر دیا۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ عرب ہونا باپ اور ماں کی لحاظ سے نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک وصف کی لحاظ سے ہوتا ہے جو گویائی ہے تو جس میں یہ وصف ہے، وہ عرب ہے! آگاہ ہو کہ تم سب آدم کی اولاد ہو آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ تم میں عزت اس کی زیادہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

درمیان میں جو فقرات ہیں، وہ عرب کی اس تصور فوقیت کے خلاف انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے تو اس کے خلاف روشنی ڈالی گئی ہے کہ گویائی کا وصف نسلی طور پر کسی قوم کی ملکیت سمجھنا غلط ہے۔ اصل و نسل کے لحاظ سے جسے تم عرب نہیں سمجھتے، وہ بھی اس وصف کا حامل ہو سکتا ہے لیکن آخر میں جو معیار امتیاز ہے، اس کو واضح کیا گیا ہے کہ اس میں عرب اور غیر عرب کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ کردار کا سانچہ ہے جسے ”تقویٰ“ کہتے ہیں، وہ خود کسی کام کا نام نہیں ہے بلکہ اس سانچے میں ڈھلے ہوئے جو کام ہوتے ہیں، وہ وہیں ہوتے ہیں جو مرضی خدا کے مطابق اور ہر حال میں جو انسان کا فرض ہے، اس کے موافق ہوتے ہیں۔

دنیا میں جو غلط اقدار امتیاز کے قائم تھے اور اب بھی ایک طبقہ میں ہیں جیسے رنگ کے لحاظ سے تفریق کہ گورے اونچے ہیں، کالے نیچے



اپنے مالوں جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں یہ ہیں بس سچے لوگ۔“  
 شکِ ضمیر کی خامی کی علامت ہے۔ اگر معرفتِ حق میں ضمیر مطمئن ہے اور پوری بصیرت کے ساتھ ایمان اختیار کیا ہے تو پھر شک کا گزردل و دماغ میں کیوں ہو؟  
 شروع کے ”اٹھا“ کلمہ حصر سے بھی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ صاحبِ ایمان بس یہ ہیں اور آخری فقرہ تو صاف بتاتا ہے کہ اگر شکوک و شبہات کا رفرما ہیں تو یہ نہیں کہ ایمان کے درجے کی کمی کے باعث ہوں بلکہ وہ دعویٰ ایمان کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوں گے۔

قُلْ أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ  
 وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٦﴾ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ  
 إِسْلَامَكُمْ ۗ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٧﴾  
 إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَاللَّهُ بَصِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾

”کہیے کہ کیا تم اپنے دین سے اللہ کو آگاہ کرتے ہو؟ حالانکہ اللہ آگاہ ہے اس سے کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ وہ آپ پر احسان جتاتے ہیں اس کا کہ وہ مسلمان ہوئے، کہیے کہ مجھ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان نہ جتاؤ بلکہ اللہ کا احسان ہے تم پر کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ بتایا اگر تم سچے ہو، یقیناً اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے غیب کو اور اللہ جو تم کرتے ہو، اس کا دیکھنے والا ہے۔“

### قبولِ ہدایت کے ساتھ راہِ راست اختیار کرنا اللہ کا احسان

کچھ لوگ بڑھ چڑھ کر گویا سینوں پر ہاتھ مار کر اپنے ایمان کا پر زور فخریہ انداز میں اذعا کرتے تھے جیسے کہ انہوں نے اتنا بڑا کارنمایاں انجام دیا کہ وہ ایمان لائیں اور پھر ان میں سے کچھ اُسے اس طرح پیش کرتے تھے کہ جیسے انھوں نے خدا اور رسول پر بڑا احسان کیا۔ ان میں سے اول تو اکثر اپنے دعوے میں سچے بھی نہ تھے اور ان کا ایمان بس نمائشی تھا اور اگر بالفرض وہ باایمان ہیں تو ان کا یہ تصور کہ ہم نے خدا اور رسول پر کوئی احسان کیا، غلط تھا اور خود یہ تصور ان کے ایمان کی خامی کی دلیل ہے۔ اگر وہ سچے مومن ہوتے تو یہ تصور ہرگز نہ کرتے بلکہ وہ سمجھتے کہ ایمان اختیار کر کے ہم نے حق پرستی کا وہ فریضہ ادا کیا جو عقل و ضمیر کے تقاضے سے ہمارے ذمے تھا اور اُس کے لیے خدا کی توفیق ہمارے شامل حال ہوئی۔ یہ اُس کا احسان ہم پر ہے جس کا ہمیں شکر لازم ہے۔

# سُورَةُ ق

مکیہ --- ۴۵ --- آیات

شروع میں مقطعات قرآنیہ کے قبیل سے جو حرف قاف ہے، اسی پر اس سورے کا نام ہوا۔

## سورۃ ق کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... پیغام رسولؐ کے ماننے میں کفار کے ذہن کے لیے دو (۲) رکاوٹیں۔
- ۲..... دوبارہ زندگی سے کفار کا تعجب دور کرنے کے لیے مثالیں۔
- ۳..... قوم نوحؑ کے ساتھ اصحاب رسؑ اور اہل ایکہ کا ذکر۔
- ۴..... اللہ کا رگ گردن سے زیادہ قریب ہونا۔
- ۵..... آخر میں کفر ختم مگر اُس دن کا ایمان معتبر نہیں۔
- ۶..... خلقت آسمان و زمین کے بعد خالق کا تھک جانا، جو بائبل میں ہے، اس کی رد،
- ۷..... آخرت کے مناظر۔
- ۸..... رسولؐ کا کام جبر کرنا نہیں ہے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ ۱۱ بَلْ عَجَبُوْا اَنْ جَاءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ

هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۱۲ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۱۳ ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِیْدٌ ۱۴

”قاف۔ قسم ہے بڑے مرتبے والے قرآن کی بلکہ انھیں تعجب ہے کہ انہی میں سے ایک ڈرانے والا (رسول) آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ ایک عجیب چیز ہے، کیا اس وقت جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے؟ یہ واپس آنا بعید از امکان ہے۔“

اس کے پہلے سورہ ص میں اس طرح کی صورت کلام ہے کہ حرف ص پھر قرآن کی قسم اور اُس کے بعد کافروں کا ذکر بَل کے لفظ کے ساتھ (ص وَالْقُرْآنِ ذِی الذِّکْرِ ۱۱ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ) اور یہاں وہی صورت ہے کہ حرف ق ہے۔ پھر قرآن کی قسم

ہے اور پھر ”بلکہ“ کے ساتھ کافروں کا ذکر ہے اب چونکہ قسم کے لیے جواب کی ضرورت ہوتی ہے جو کوئی جملہ ہوتا ہے اور بلکہ سے پہلے بھی کسی جملے کی ضرورت ہے، اس لیے یہاں ایسا جملہ مخدوف مانا جاتا ہے جس کو قرینہ مقام سے سمجھا جاسکتا ہے مثلاً یہ کہ آپ خدا کے رسول ہیں یا آپ جو دوسری زندگی کی اطلاع دے رہے ہیں وہ بالکل درست ہے کیونکہ یہی دونوں چیزیں وہ ہیں جن پر بعد میں ان کے تعجب کا اظہار کیا گیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

### پیغام آنحضرتؐ کے ماننے میں کفار کے ذہن کے لیے دو رکاوٹیں

اور یہ یہاں بھی ہو سکتا ہے جسے ہم نے سورہ ص میں ترجیح دی ہے کہ وہ جملہ حرف ص میں جو ایک رمز کی حیثیت رکھتا ہے مضمراً سمجھا جائے۔ ایسی صورت میں وہ ایک راز الہی ہوگا جس کے سمجھنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

رسول کے انہی میں سے آنے پر تعجب کے ساتھ بلافاصلہ مرنے کے بعد واپس آنے پر اظہار حیرت اس کا پتہ دیتا ہے کہ رسولوں کے بنیادی پیغام میں دوسری زندگی جس کا نام معاد ہے، اُس شکل میں جو مسلمانوں کا عام عقیدہ ہے، ایک رکن اساسی کی حیثیت رکھتی تھی جس پر کفار اظہار پریشانی کرتے تھے۔

اس کے علاوہ یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغام رسولؐ کے ماننے میں سب سے بڑی ان کے لیے دو (۲) رکاوٹیں تھیں، ایک یہ تصور کہ بشر کیوں کر رسول ہو سکتا ہے جو رسول ہوا سے تو بس ملک ہونا چاہیے۔<sup>[۲]</sup>

دوسرے معاد جسمانی جس پر وہ گھبرا کر کہتے تھے ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔

اب جس طرح وہ شخص جو اس طرح کی معاد جسمانی کا شکر ہو، وہ ذہنی حیثیت سے انہی کفار کے ساتھ شریک ہے، اسی طرح جو رسول اور ائمہ کو بشر کے علاوہ ملک یا کوئی دوسری نوع مانے، وہ بھی درحقیقت اسی ذہنیت کا حامل ہے جو ان کفار کی تھی۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ ۖ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ ﴿۳﴾ بَلْ كَذَّبُوا

بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ ﴿۵﴾

”ہمیں معلوم ہے جو زمین اُن میں کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس وہ نوشتہ ہے جو محفوظ رکھنے والا ہے بلکہ انہوں نے حق کو جب اُن کے پاس آیا جھٹلایا تو وہ پریشان خیالی کی کیفیت میں مبتلا ہیں“

یہ تتمہ ہے اُسی اُن کے اظہار تعجب کے مقابلے میں خالق کے جواب کا کہ ہمیں دوبارہ پلٹانے میں دشواری تو اس وقت ہوتی اگر منتشر اجزائے جسم پر ہمارا علم محیط نہ ہوتا لیکن جب ہم جانتے ہیں کہ کس جسم کے اجزا کہاں کہاں ہیں اور کس شکل میں ہیں تو ہمیں پھر اُن کو دوبارہ اصل صورت پر لانے میں کیا دشواری ہے؟<sup>[۳]</sup>

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَدَّيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ﴿۶﴾

[۱] جواب قسم مخدوف بدل علیہ ائذا امتنا و کنا ترابا تقدیرہ انکم منعوثون و قیل تقدیرہ ان محمد رسول اللہ (مجمع البیان)

[۲] عجیبو ان یکون المنذر منهم حسبوا انه لایوحی الالی ملک (مجمع البیان)

[۳] ای علمنا الذی تاکل الارض موحو مہم لا یخفی علینا شیء منہ (تبیان)



وَالْأَرْضَ مَدَدْنَا فِيهَا رَوَاسِي وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۙ  
تَبْصِرَةً وَذِكْرًا لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ ۙ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبْرَكًا فَأَنْبَتْنَا  
بِهِ جَنَّتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ ۙ وَالنَّخْلَ بَسَقَتِ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ۙ رِزْقًا لِلْعِبَادِ ۙ  
وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلَدَةً مَيِّتًا ۙ كَذَلِكَ الْخُرُوجُ ۙ

”کیا انھوں نے نہیں دیکھا آسمان کو جو ان کے اوپر ہے کہ کس طرح ہم نے بنایا ہے اُسے اور آراستہ کیا اس کو اور اُس میں کوئی شگاف نہیں ہے اور زمین کو ہم نے پھیلا یا اور اُس میں پہاڑ قائم کیے اور اُس پر ہر طرح کی خوشنما چیزیں اُگائیں۔ یہ آنکھ کھولنے کو ذریعہ اور یاد دہانی کا سامان ہے اللہ کی طرف توجہ رکھنے والے ہر بندے کے لیے اور ہم نے آسمان سے پانی اُتار کر برکت والا تو اُس سے اُگائے باغ اور کاٹی ہوئی زراعت کے دانے اور اونچے اونچے کھجور کے درخت جن میں تہہ بہ تہہ میوے پیدا ہوتے ہیں بندوں کی روزی کے لیے اور اس سے ہم نے مردہ، بے جان زمین کو زندہ کیا۔ یونہی (آدمیوں کا قبروں سے) نکلنا ہوگا۔“

### دوبارہ کی زندگی سے کفار کا تعجب دور کرنے کے لیے مثالیں

اُن کے اس اظہار تعجب کے جواب میں کہ کیا اُس وقت جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے یہ واپس آنا بہت بعید از امکان بات ہے، قرآن نے ان نگاہوں کو بارش اور اُس کے اثرات کی طرف موڑا ہے کہ دیکھو زمین کے ذرات کس طرح ملتے ہیں اور اُن سے مل کر نباتات برآمد ہوئے ہیں، اس پر تمہیں حیرت نہیں ہوتی تو ایسا ہی سمجھو کہ جب اللہ چاہے تو وہ انہی خاک کے ذرات کو اکٹھا کر کے اس ذی روح مخلوق کو پھر پیدا کر دے۔ [۱]

قرآن مجید کا منکرین معاد سے اس طرح بحث کرنا معاد جسمانی کی قطعی دلیل ہے اگر بعض مسلمان فلاسفہ قدیم وجدید کا تصور صحیح ہوتا کہ بس روحانی لذت والہ ہے۔ ثواب و عذاب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے تو قرآن کو مخالفین سے بحث میں ان مثالوں کے پیش کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ ۙ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ

لُوطٍ ۙ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۙ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ ۙ

”ان کے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور رس والوں نے اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کی قوم والوں اور ایک لوط اور تبع کی قوم، ان میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو میری طرف کے اعلان عذاب کے مستحق

[۱] جواباً لقولهم: ءاذا متنا و كنا ترابا ذالك رجح بعيد فقال الله كما ان الماء انزلناه من السماء فتخرج النبات من الارض

كذلك انتم تخرجون من الارض... على ابن ابراهيم

ہوئے۔“

## قوم نوح کے ساتھ اصحاب رس اور اہل ایکہ کا ذکر

رس کے لیے بتایا گیا ہے:

ہی بئر کانوا مقیمین علیہا، مو اشیہم یعبدون الا صنم ونبہم قبل حظلہ بن صفوان وقیل غیرہ۔  
یہ ایک کنواں تھا جس کے پاس اپنے مویشیوں کے ساتھ وہ لوگ قیام کیے ہوئے تھے اور بتوں کی پرستش کرتے تھے اور ان کے پیغمبر کہا گیا ہے کہ حظلہ بن صفوان تھے اور بعض نے کسی دوسرے کو کہا ہے۔

ہماری قدیم تفسیر میں ہے کہ:

ہم الذین ہلکو الاہم استغنوا الرجال بالرجال والنساء بالنساء (علی ابن ابراہیم)  
یہ وہ ہیں جو ہلاک ہوئے اس لئے کہ مردوں نے مردوں کے ساتھ اور عورتوں نے عورتوں کے ساتھ تعلقات ازدواجی پر انحصار کر لیا۔  
جناب شیخ طوسی نے رس کی تعیین میں کئی قول نقل کیے ہیں اور علامہ طبرسی نے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے کہ وہ لوگ تھے جن کی عورتوں میں تلذذ بالمثل (مساقت) کا رواج تھا۔<sup>[۱]</sup>  
یہ صراحتاً تفسیر علی بن ابراہیم کے ایک جز کے موافق ہے مگر بظاہر دوسرا جو اس کے ساتھ تلازم رکھتا ہے۔  
ایکہ کے معنی سینٹھوں کے جنگل کے ہیں، کہا جاتا کہ اس سے مراد اہل مدین ہیں جن میں جناب شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے۔ تبع کی قوم والوں سے اہل یمن مراد ہونا ظاہر ہے۔

## أَفَعَيَيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ط بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝۱۵

”تو کیا ہم پہلی دفعہ تخلیق میں عاجز آئے تھے؟ بلکہ وہ از سر نو پیدائش کے بارے میں شک و شبہ میں گرفتار ہیں۔“

یعنی جب پہلی مرتبہ کائنات کے پیدا کرنے پر قادر ثابت ہو چکے ہیں تو پھر از سر نو پیدائش میں بھی کوئی شک و شبہ ہونا نہیں چاہیے یہاں تک برابر سلسلہ چلتا رہا انہی کفار کی رد کا جو حیات بعد الموت اور معاد جسمانی پر جس کی انبیاء و مرسلین برابر اطلاع دیتے رہے ہیں حیرت و استعجاب کا اظہار کر رہے تھے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلْمَا تَوْسُوْسٍ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ

حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝۱۶ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝۱۷ مَا

يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝۱۸ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذٰلِكَ

[۱]۔ قیل کان سحق النسلء فی اصحاب الرس وروی ذالک عن ابی جعفر وابی عبد اللہ (مجمع البیان)

## مَا كُنْتُمْ مِنْهُ تَحِيْدٌ ۱۹

”اور ہم نے پیدا کیا ہے آدمی کو اور ہم جانتے ہیں جو اُس کے دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں اور ہم اُس سے رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں۔ جب کہ لے رہے ہوں گے دو لینے والے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے، کوئی بات اُس کی زبان سے نہیں نکلتی مگر یہ اُس کے پاس نگران تیار موجود ہیں اور آیا موت کے سکرات کا عالم حق کے ساتھ یہی وہ چیز تھی جس سے تو بہت بچتا تھا۔“

”رگ گردن سے زیادہ قریب“ ہونا جسمانی طور پر نہیں ہے بلکہ یہ علم و اطلاع کے احاطے کی ایک تعبیر ہے کہ ہمیں باخبر ہونے میں اُس کے حالات سے کوئی دیر نہیں لگ سکتی۔ [۱]

”دائیں اور بائیں“ بیٹھنے والوں سے مراد کا تباہ اعمال ہیں [۲] جو ہر وقت کے انسان کے کردار کو محفوظ کرتے ہیں۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْر ۲۰ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ  
وَشَهِيدٌ ۲۱ لَقَدْ كُنْتُمْ فِي عَفْوَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ  
الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۲۲

”اور صور پھونکا گیا ہوگا، یہ وہ عذاب کا دن جس سے تمہیں ڈرایا جاتا رہا ہے۔ ہر تنفس آیا اس طرح کہ اس کے ساتھ ایک پیچھے پیچھے ہکانے والا ہے اور ایک گواہ۔ تو بے خبری کے عالم میں رہا اس سے تواب ہم نے تیری آنکھ سے پردہ ہٹا دیا تو آج نگاہ تیز ہے۔“

## آخرت میں کفر ختم مگر اس دن کا ایمان معتبر نہیں

پہلے جو باتیں پردہ غیب میں تھیں، اس لیے دنیا میں یہ ان کا منکر تھا، آج وہ سب مشاہدے کی صورت میں آنکھ کے سامنے آچکی ہیں، اس لیے اُن کے ماننے میں آج مؤمن اور کافر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ [۳]  
لیکن اب آج کا ماننا نتیجہ خیز نہیں ہے اور ہلاکت ابدی سے بچا نہیں سکتا۔

اسی طرح ہر غیب پردہ غیب کے ہٹنے کے بعد جب عالم شہود میں آجائے تو آج کے منکر اس وقت سب ہی مان لیں گے مگر اس وقت کا ماننا

معتبر نہ ہوگا

## وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ۲۳ اَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ۲۴ مِّنَّا ع

[۱] اقرب اليه بالعلم (مجمع البيان)

[۲] يعنى الملكين الموكلين بالانسان عن يمينه وشماله (تبيان)

[۳] المراد به جميع المكلفين برهم وفاجرهم لان معارف الجميع ضرورية (تبيان)

## لِالْخَيْرِ مُعْتَدٍ مَّرِيْبٍ ﴿٥٥﴾ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَالْقَبِيْهُ فِي الْعَذَابِ

### الشَّدِيْدِ ﴿٥٦﴾

”اور اس کے ساتھ والا کہہ رہا ہوگا کہ یہ وہ ہے جو میرے پاس مدت سے تیار ہے تم دونوں ڈالو دوزخ میں ہر عنادر کھنے والے بڑے ہی کافر کو جو خیرات سے ہاتھ روکنے والا، حدود سے تجاوز کرنے والا اور شک و شبہ میں (دوسروں کو بھی) ڈالنے والا تھا، جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا خدا بنا یا تو تم ڈالو اس کو سخت عذاب میں۔“

ساتھ والا کہہ رہا ہوگا، زیادہ مفسرین اس کی تفسیر ”فرشتے“ کے ساتھ کرتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

اور ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں ہے کہ اس سے مراد شیطان ہے۔<sup>[۲]</sup>

اس صورت میں یہ وہ ہے جو میرے پاس مدت سے تیار ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ وہ ہے جو میں تجھے بہکا کر اور غلط راستوں پر تیرے لیے مدتوں سے سامان مہیا کیا ہے۔

بہر صورت بعد کا خطاب کہ ”تم دونوں ڈالو“ یہ خالق عظیم کا فرمان ہے۔

چونکہ القیامتینہ کا صیغہ ہے، اس لیے ہم نے ترجمہ کیا:۔

”تم دونوں ڈالو“..... اب یہ دونوں کون ہیں؟

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے:۔ گویم اے دو (۲) فرشتے۔

حالانکہ الفاظ قرآن میں ”اے دو فرشتو“ کی ہم معنی کوئی لفظ نہیں ہے۔ حاشیے میں وہ لکھتے ہیں:۔

عادت بادشاہانست کہ اسیر پیش ایساں دو کس گرفتہ می آرند ازاں جہت دو فرشتہ را خطاب..... (فتح الرحمن) بادشاہوں کا عام طریقہ یہ ہے کہ قیدی کو ان کے سامنے دو شخص لیے ہوئے آتے ہیں اس لیے دو فرشتوں سے خطاب ہوگا۔

یہ ایک طبع زاد بات ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

بعض مفسرین کی سمجھ میں کوئی دو (۲) ایسے نہیں آئے کہ جن سے یہ خطاب ہو لہذا انھوں نے گھبرا کر کہہ دیا کہ یہ تشبیہ باعتبار تکرار عمل ہے اور التی کی تکرار کے معنی میں ہے یعنی ”ڈالو، ڈالو“ مگر ظاہر ہے کہ تشبیہ کا صیغہ فاعل کے لحاظ سے ہوتا ہے نہ کہ فعل کے بار بار ہونے سے۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ تشبیہ کا صیغہ ہے ہی نہیں بلکہ نون تاکید خفیہ کے ساتھ مفر د کا صیغہ ہے اور کلام عرب میں کبھی نون خفیہ الف سے بدل جاتی ہے۔<sup>[۳]</sup>

بعض کا خیال ہے کہ عرب میں محاورہ ہے کہ اکثر ۲ کو مخاطب کرتے ہیں جس میں ۲ کی کوئی خصوصیت مقصود نہیں ہوتی جیسے متعلقہ امراء القیس کے آغاز میں فقہان بک ”ظہرو (تم دونوں) ہم روئیں“ اور دوسرے شعراء کے یہاں ”خَلِيْلِيْكَ“ ”اے میرے دونوں دوستو“ اور صَاحِبِيْ اے میرے دونوں ساتھیو..... اسی محاورے کے مطابق یہاں بھی خطاب دو (۲) سے ہے، چاہے مخاطب ایک ہی ہو یا دو (۲) سے زیادہ

[۱] فرشتہ ہم نشین او (شاہ ولی اللہ) ہم نشین اس کا یعنی فرشتوں میں سے (فتح الدین)

[۲] قرینہ ای شیطان (علی ابن ابراہیم)

[۳] ای الق الق او القین فابدلت النون الفاء (جلالین)

کی جماعت ہو۔

اور بھی پہلو ہیں جنہیں دوسرے مفسرین جمہور کے علاوہ ہمارے شیخ الطائفہ اور علامہ طبرسی نے بھی درج فرمایا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دو (۲) کا مصداق صاف طور پر سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو کیا حرج ہے کہ یہ سب لوگ ہمارے یہاں کی اس تشریح کو قبول کر لیں جو حدیث رسول: یا علی انت قسیم النار والجنة کی تائید اور معصوم کی طرف استناد کے ساتھ بسند متصل وارد ہوئی ہے کہ یہ خطاب محمد وعلی علیہ السلام سے ہوگا جو کارگاہ حشر و نشر کے از جانب خدا منتظم ہوں گے اور یہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے مسندات میں سے ہے یعنی آپ نے اپنے ابا و اجداد طاہرین علیہم السلام کے سلسلہ ذہبی سے اس کی روایت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمائی ہے۔<sup>[۱]</sup>

**قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْعَيْتُهُ وَلَكِنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿۱۵﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيْيَ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ ﴿۱۶﴾ مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلَ لَدَيْيَ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ نَقُولُ لِحَٰثَتِهِمْ هَلْ أَمْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ ﴿۱۸﴾**

”اس کے ساتھ والوں نے کہا کہ پرودگارا! میں نے اس کو سرکشی پر آمادہ نہیں کیا مگر یہ خود ہی گمراہی میں تھا۔ ارشاد قدرت ہو امیرے سامنے جھکڑا نہ کرو، میں نے تو پہلے ہی تم سب کو عذاب کی اطلاع دی تھی۔ میرے یہاں بات بدلتی نہیں اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں، جس دن ہم دوزخ سے کہیں گے کیا اب تو بھر گیا ہے؟ اور وہ کہے گا اور اضافہ ہو سکتا ہے؟“

یہاں قرینہ یعنی اس کے ساتھ والے کی تفسیر سب نے شیطان کے ساتھ کی ہے۔<sup>[۲]</sup>

یا اس کے علاوہ شیطان صفت آدمی بھی۔<sup>[۳]</sup>

اس سے تائید ہوتی ہے ہمارے یہاں کی اس تفسیر کی جو اس کے قبل والی آیت وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَيْيَ عَتِيدٌ میں ہوئی تھی۔ وہاں خواہ مخواہ ان لوگوں نے شیطان کو فرشتہ بنا دیا تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

هَلْ مِنْ مَزِيدٍ کو مفہوم عام طور پر طلب زیادتی کا لیا گیا ہے، اس لیے صحیح بخاری میں اس کے تحت میں شان الہی کے خلاف حدیث آگئی ہے کہ معاذ اللہ وہ اپنی ٹانگیں دوزخ میں ڈال دے گا جس کے بعد دوزخ کا پیٹ بھر جائے گا اور وہ کہے گا قط قط یعنی بس بس۔

ہمارے یہاں کی تفسیر کہتی ہے کہ یہ استفہام انکاری ہے یعنی اضافے کی اب کی گنجائش ہی کہاں ہے کیونکہ خالق کا پہلے سے اعلان تھا کہ

لَا مَلَانَ جَهَنَّمَ فِي دُوزَخٍ كُوبَهْرِدُونَ كَاتُوبِ خَطَابِ الْهَلِيِّ هُوْرَهَا هَيْ كَتُوْبَهْرُ كِيَا؟ اُوْرَا س كَا جَوَاب هَيْ كَه هَلْ مِنْ مَزِيدٍ اُوْر حَقِيْقَت اَمْرِي هَيْ كَه يَبِي بِنِيَادِي طُوْر پَر غَلَط هَيْ كَه اَس كُو لَفْظِي سُوَال وَجَوَاب مَانَا جَائِي بَلْ كَه وَه اَس حَقِيْقَت كَا اِيْك تَمْثِيْلِي بِيْرَا يَه فِي اَطْهَار

[۱] - عن محمد بن علي ابن الحسين عليه السلام عن ابيه عن جده عن علي ابن ابي طالب قال رسول الله (علي ابن ابراهيم)

[۲] - يعني شيطان (رفيع الدين) یہ ساتھی شیطان ہے..... موضع القرآن)

[۳] - يعني از شيطان الانس والجن (فتح الرحمن)

ہے کہ خالق نے جواز ہی میں اور کم سے کم سجدہ آدم سے انکار پر شیطان سے مخاطب ہو کر اپنے فیصلے کا اعلان فرما دیا تھا کہ میں دوزخ کو تیرے پیروں سے بھر دوں گا، وہ بالکل وقوع میں آ گیا۔<sup>[۱]</sup>

”اور بہشت آراستہ کیا جائے گا پرہیزگاروں کے لیے بغیر دوری کے۔ یہ وہ ہے جو کہ وعدہ کیا جاتا رہا ہے تم (میں) سے اللہ کی طرف توجہ رکھنے والے کے لیے جو محفوظ رکھنے والا ہو، جو بے دیکھے خدائے رحمن سے ڈرتا ہے اور اس دل کے ساتھ آئے جو لو لگانے والا ہے، داخل ہو تم لوگ اس میں سلامتی کے ساتھ۔ یہ ہمیشہ کے قیام کا دن ہے ان کے لیے اس میں وہ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اور زیادہ کی گنجائش ہے۔“  
بہشت پرہیزگاروں کے لیے آراستہ کیا جائے گا بغیر دوری، یعنی اس کی نعمتوں کے حصول میں کوئی دیر نہ ہوگی اور نہ اس تک پہنچنے میں کوئی زحمت درپیش ہوگی۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ  
مِنْ مَّحِيصٍ ۝۳۶ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ  
وَهُوَ شَهِيدٌ ۝۳۷

”اور کتنی ہلاک کیں ہم نے ان کے پہلے ایسی تو میں جو ان سے زیادہ طاقت میں تو انہوں نے تمام ملکوں کو چھان ڈالا تھا، کیا کوئی بھاگنے کا راستہ ہے؟ یقیناً اس میں یادداشت ہے۔ اس کے لیے جس کے پاس دل ہو یا کان لگائے ہو اس طرح کہ وہ حاضر الذہن ہو،“  
پہلے آچکا ہے کہ دل کے معنی محاورے میں عقل کے ہوتے ہیں۔<sup>[۲]</sup>  
نہ کہ ڈاکٹروں والا دل جو چلتے چلتے رک جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ۝۳۸ وَمَا مَسَّنَا مِنْ  
لُغُوبٍ ۝۳۹

”اور ہم نے آسمانوں اور زمینوں اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو چھ (۶) دن میں پیدا کیا اور ہمیں تھکن چھو بھی نہیں گئی۔“

یہ مضمون قرآن میں بہت جگہ آچکا ہے اور ہر جگہ اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ چھ (۶) دن وہ نہیں ہو سکتے جو طلوع و غروب آفتاب سے پیدا ہوتے ہیں کیوں کہ اس تخلیق سے پہلے سورج اور چاند وغیرہ کچھ تھا ہی نہیں۔  
اس کے علاوہ متعدد جگہ اس تذکرہ کے بعد یہ صراحت جو ہے کہ ہمیں اس میں تھکن نہیں ہوئی، یہ اس لیے ہے کہ جماعت یہود کا یہ تصور

[۱] الاظهر ان الكلام مخرج مخرج المثل (تبیان)

[۲] معنی القلب هنا العقل عن ابن عباس (مجمع البيان)

تھا جو بائبل میں ہے کہ اس نے چھ دن میں آسمان وزمین کو جو پیدا کیا وہ تھک کے چور ہو گیا اور ساتویں دن اس نے آرام کیا۔

**فَاَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ**

**الْغُرُوبِ ۗ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ۝۳۹**

”تو جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس پر صبر کیجیے اور اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے سورج نکلنے سے پہلے اور مغرب کے پہلے اور رات کے کچھ حصے میں بھی اس کی تسبیح کیجیے اور سجدہ کرنے کے بعد“۔

### اوقات نماز کا بیان

بظاہر مقام تنزیل میں اس کا تعلق قبل کی آیت سے کوئی نہیں ہے۔

اگر آخر کا فقرہ نہ ہوتا ”سجدہ کرنے کے بعد جس کے دوسرے معنی ہوئے نماز کے بعد۔“ [۱]

تو بلا تکلف سمجھا جاسکتا تھا کہ یہاں اوقات نماز کا بیان مقصود ہے مگر اس فقرے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ویسی ہی تسبیح ہے جیسی تعقیبات نماز پر پڑھی جاتی ہے مگر بعض علمائے اہل سنت بھی آخری جملہ کو نوافل سے متعلق کرنے کے بعد باقی اجزائے آیت سے اوقات نماز واجب مراد لیتے ہیں۔ اس صورت میں مثل دوسرے مقامات کے جہاں اوقات نماز کی طرف اشارہ ہوا ہے، یہاں بھی یہ دیکھنے کی بات ہے کہ قرآن نے الگ الگ تین ہی وقت بتائے ہیں جو شیعوں کی فقہ والے اوقات کے مطابق ہے، پانچ وقت الگ الگ نہیں چنانچہ جلالین نے بھی ان اوقات کی جو تشریح کی ہے وہ یوں ہے کہ:-

قبل طلوع الشمس ای الصلوة الصبح وقبل الغروب ای الظهر والعصر ومن الیل فسبحه ای صلِّ

العشائین)۔

سورج نکلنے سے پہلے یعنی نماز صبح اور غروب سے پہلے یعنی دونوں نماز ظہر اور عصر اور رات کے ایک حصے میں تسبیح کرو یعنی مغرب و عشاء یہ وہی صبح اور ظہرین اور مغربین کا فقہی تصور ہے جو اہل بیت کی تعلیم کے مطابق ہے، اس میں نماز صبح کا وقت الگ ہے۔ اس کے بعد زوال آفتاب سے غروب کے بعد سے دو (۲) نمازوں کا وقت ہے ظہر اور عصر جن میں بس تربیت معتبر ہے کہ ظہر پہلے ہو اور عصر بعد کو ہو اور غروب کے بعد سے دو (۲) نمازوں کا وقت ہے جنہیں ہم مغربین کہتے ہیں اور انہوں نے عشائین کہا ہے۔

بہر صورت وہ مغرب و عشاء ہیں۔ ان میں بس ترتیب کے لازم ہونے کی بنا پر شروع کا وقت بقدر نماز مغرب، مخصوص مغرب کے ساتھ ہے اور آخر کا بقدر نماز عشاء کے ساتھ ہے۔ باقی درمیان کا وقت جیسے وہاں ظہرین میں مشترک ہے، ویسے یہاں مغربین میں۔ قرآن مجید جہاں جہاں اوقات نماز کا اجمالی بیان ہے، وہ اجمال اسی تفصیل کے موافق ہے۔

**وَأَسْتَبِيعُ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۗ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ**

[۱] - عقب نماز نیز (شاہ ولی اللہ)

بِالْحَقِّ ط ذَلِكَ يَوْمَ الْخُرُوجِ ﴿٣٤﴾ إِنَّا مَحْنُ نُحْيِ وَنُمِيتُ وَالْيَنَّا الْمَصِيرُ ﴿٣٥﴾ يَوْمَ  
تَشَقُّقُ الْأَرْضِ عَنْهُمْ سِرَاعًا ط ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿٣٦﴾ مَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا  
يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكَرَ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ ﴿٣٧﴾

”اور غور سے سنو (اس دن کا حال) جب پکارنے والا صداد یگانہ قریبی جگہ سے جس میں ایک خاص زور دار آواز کو  
سنیں گے حق کے ساتھ وہ (قبروں) سے نکلنے کا دن ہوگا، یقیناً ہم ہی تو جلاتے اور مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف  
پلٹنا ہے جس دن زمین شگافتہ ہونے سے وہ تیزی کے ساتھ برآمد ہوں گے۔ یہ وہ حشر و نشر ہے جو ہم پر بالکل آسان  
ہے ہمیں معلوم ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں بنائے گئے تو بس یاد دہانی کرتے  
رہیے قرآن کے ساتھ اسے جو میرے اعلان عذاب سے ڈرتا ہو“

### رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام جبر کرنا نہیں ہے

یہاں بھی ذوق جنگ رکھنے والوں نے کہہ دیا ہے کہ یہ ارشاد حکم جہاد آنے سے قبل کے لیے تھا۔<sup>[۱]</sup>  
حالانکہ یہ اور ایسے ہی ملتے جلتے ہوئے الفاظ قرآن مجید میں شروع سے آخر تک کثرت سے ملتے ہیں۔ اس سب کو کیوں کر کہہ دیا  
جائے کہ یہ ہدایت وقتی پالیسی کے طور پر تھی۔ کوئی اصولی تعلیم نہیں تھی، حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم نے جو بلاشبہ جبر پر قادر ہے، جب خود جبر  
سے کام نہیں لیا بلکہ اختیاری ایمان کا مطالبہ کیا تو رسول پر جبر کا فریضہ کیوں کر عائد ہو سکتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] قال الزجاج انما قال الله النبي ﷺ اذالك قبل يامر بالقتال (تبيان)

[۲] مجبار مسلط قادر على قلوبهم فتجبرهم على الايمان (مجمع البيان)



# سُورَةُ الذَّارِيَاتِ

مکیہ ..... ۶۰ ..... آیات

چونکہ اس سورہ کی ابتدائی لفظ والذاریات ہے۔ اس لیے اس کا یہی نام ہو۔ مضامین اکثر وہی ہیں جو دوسرے سوروں میں آتے رہے ہیں اس لئے کہ کئی سوروں میں زیادہ تر کفار و مشرکین کو تعلیمی انداز سے حقیقتوں کو ذہن نشین کرانا تھا لہذا ان میں اکثر ایک ہی بات کو طرح طرح سے دہرایا گیا ہے۔

## سورہ ذاریات کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... جزا و سزا پر قسموں کے ساتھ زور دینا۔
- ۲..... رسول خدا کے خلاف مشرکین جو باتیں کہتے ہیں، ان کا اضطراب و اختلاف۔
- ۳..... پرہیزگاروں کو جو اہل بہشت ہیں کردار۔
- ۴..... آسمان میں روزی بھی اور خدا کا عذاب بھی۔
- ۵..... جناب اسحاق کی بشارت دینے والے فرشتوں کی آمد اور اس موقع کے کیفیات۔
- ۶..... قوم لوط پر عذاب کا نزول۔
- ۷..... گزشتہ کئی قوموں پر عذاب الہی کا مختصر مختصر تذکرہ
- ۸..... یاد ہانی کا اہل ایمان کے لیے فائدہ۔
- ۹..... مقصد خلقت انسان و جنات،

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان“

وَالذَّرِيَّتِ ذُرُوءًا ۱۱ فَالْحَمِلَتِ وَقْرًا ۱۲ فَالْجَرِيَّتِ يُسْرًا ۱۳ فَالْمُقْسَبَتِ أَمْرًا ۱۴

إِنَّمَا تَوْعَدُونَ لَصَادِقٌ ۱۵ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۱۶

”قسم ان غبار اڑانے والیوں کی بڑی شدت کے ساتھ جو سستی ہے، پھر بوجھ اٹھانے والیوں کی، پھر دھیمی رفتار سے چلنے والیوں کی، پھر احکام الہی کی تقسیم کرنے والی ہستیوں کی، یہ جو تمہیں آئندہ کے لیے وعدہ و وعید کیا

جاتا ہے۔ یہ لازماً سچا ہی ہے اور بلاشبہ جزا و سزا لازماً وقوع میں آنے والی ہے۔“  
مذکورہ قسموں کی ایک تشریح یہ ہوئی ہے کہ:-

”اول آندھی چلتی ہے کہ غبار اڑتا ہے اور بادل بنتے ہیں پھر اس میں پانی بنتا ہے، اس بوجھ کو لیے ہوئے پھرتیاں ہیں، پھر برسنے کے قریب نرم ہوا چلتی ہے، پھر ہانک کر ہر جگہ کا حصہ وہاں پہنچاتی ہے موافق حکم کے“ (موضح القرآن)  
اس کے معنی یہ کہ شروع سے لیکر آخر تک یہ سب ہواؤں ہی کا ذکر ہے مگر فریقین کے کتب تفسیر میں فالجربیت یسراً“ دھیمی رفتار سے چلنے والیوں“ کی تشریح کشتیوں کے ساتھ ہوئی ہے۔<sup>[۱]</sup>

اور المقسمات امر کی تشریح فرشتوں کے ساتھ بھی ہوئی ہے جو کاموں کو تقسیم کیے ہوئے ہیں۔<sup>[۲]</sup>

اور انہی کشتیوں کا وصف بھی قرار دیا گیا ہے کہ وہ پانی کو چیر کر ادھر ادھر بانٹ دیتی ہیں۔<sup>[۳]</sup>

علی ابن ابراہیم قمی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث درج کی ہے کہ ابن الکواکب (ایک منافق) نے امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب سے ان قرآنی جملوں کی تفسیر دریافت کی تھی تو حضرت نے، الذاریات ذروا، کی تشریح فرمائی: الریاح، یعنی ہوائیں اور الحاملات وقرأ،۔ بادل الجاریات یسراً، فرمایا ہی السفن، یہ کشتیاں ہیں اور المقسمات امر، فرمایا۔ الملائکة؛ اس حدیث کو جناب شیخ طوسی نے تبیان میں درج فرمایا ہے:

**وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُوبِ ۚ إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۙ يُؤْفِكُ عَنْهُ مَنَ أْفَاكٌ ۙ**  
”قسم ہے آسمان کی جو روشوں والا ہے، یقیناً تم لوگ مختلف باتیں کہنے میں لگے ہوئے ہو، جن سے منحرف ہوتا ہے وہ جو گم کردہ راہ ہو۔“

### جزا و سزا پر قسموں کے ساتھ زور

”مختلف باتیں“، یعنی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اعلان رسالت کے خلاف حضرت کی حقانیت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہوئے طرح طرح کی باتیں کہتے ہیں، کبھی شاعر، کبھی ساحر، کبھی مجنون، اس لیے کہ خود ان کا ضمیر ان میں سے کسی بات سے مطمئن نہیں ہے۔ قرآن کے بارے میں اُس کی قوت اعجاز سے متاثر ہونے پر سچی کتاب اور کلام الہیہ ماننے کی خاطر کیا کیا کہتے ہیں؛ کبھی جادو، اور شاعری، کبھی کہانت اور کبھی پرانے لوگوں سے ملی ہوئی تحریریں اور کبھی کسی کے سکھائے پڑھائے ہوئے سبق۔<sup>[۴]</sup>  
یہ سب اس لیے کہ دوسرے جو متاثر ہو کر راہ حق پر آنا چاہتے ہیں، نہ آئیں اور راہ راست سے منحرف رہیں۔

[۱]۔ السفن تجری علی وجه الماء (جلالین)

[۲]۔ بفرشتگان تقسیم کنندہ کار (شاہ ولی اللہ)

[۳]۔ پھر بانٹنے والیوں کی ایک چیز کی یعنی پانی کی (شاہ فہم الدین)

[۴]۔ فبعضکم یقول ہو شاعر وبعضکم یقول مجنون وفي القرآن یقولونہ انہ سحر و کہانتہ ورجز و ماسطرہ الاولون (مجمع البیان)

قَبْلَ الْخُرُصُونَ<sup>١٤</sup> الَّذِينَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ<sup>١٥</sup> يَسْأَلُونَ أَيَّانَ يَوْمِ الدِّينِ<sup>١٦</sup>  
يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ<sup>١٧</sup> ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ<sup>١٨</sup> هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ  
تَسْتَعْجِلُونَ<sup>١٩</sup>

”غارت ہوں اٹکل بچو باتیں کرنے والے جو ایک بڑی بے خبری کے عالم میں مدہوش ہیں، پوچھتے ہیں کہ  
جز اوسزا کا دن کب آئے گا؟ وہی سادن جب انہیں آگ میں سزا دی جائے گی، چکھو اس اپنی سزا کا مزہ یہی وہ  
ہے جس کی تم جلدی کرتے تھے“

مشترکین کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باتوں میں اضطراب

یہ ”کب“ کا سوال واقعی اگر حقیقت طلبی کے لیے ہوتا تو سمجھانے کے انداز میں جواب دیا جاتا مگر یہ ”کب، کب“ کی رٹ تو وہ بطور  
انکار یا تمسخر گائے رکھتے تھے۔ اس لیے جھلائے ہوئے انداز میں جواب دیا گیا۔<sup>[1]</sup>

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ<sup>٢٠</sup> اخذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ<sup>٢١</sup> إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ  
ذَلِكَ مُحْسِنِينَ<sup>٢٢</sup> كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ<sup>٢٣</sup> وَبِالْآسَافِ هُمْ  
يَسْتَغْفِرُونَ<sup>٢٤</sup> وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ<sup>٢٥</sup>

”پرہیزگار لوگ باغوں اور چشموں میں لیتے ہوئے جو انہیں ان کے پروردگار نے عطا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ  
اس سے پہلے (کے دور حیات میں) نیکو کار رہے تھے۔ اور وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور پچھلے پہروں کو وہ  
طلب مغفرت کرتے تھے اور ان کے اموال میں حق تھا مانگنے والے محتاج اور نہ مانگنے والے کے لیے۔“

پرہیزگاروں کا کردار

سائل کے ساتھ جو ”محروم“ کا لفظ ہے اس سے اردو داں طبقے کے ذہن میں تو محرومی کا تصور ہی آئے گا کہ جس کی مراد پوری نہ ہو مگر  
تفاسیر میں اس کی جو تشریح آئی ہے وہ یہی ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے کہ محروم وہ حاجتمند شخص ہے جو اپنی خودداری کی وجہ سے دست  
سوال دراز نہیں کرتا۔<sup>[2]</sup>

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ<sup>٢٦</sup> وَفِي أَنْفُسِكُمْ<sup>٢٧</sup> أَفَلَا تُبْصِرُونَ<sup>٢٨</sup> وَفِي السَّمَاءِ

[1]۔ يسأل هولاء الكفار على وجه الانكار لذلالك لاعلى وجه الاستفادة لمعرفة فاجيبوا بما يسؤهم (تبيان)

[2]۔ الذي لا يسأل لعفوه (جلالين)

رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ

تَنْطِقُونَ ﴿٢٣﴾

”اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تم میں تو کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟ اور آسمان میں تمہاری روزی بھی ہے جو تم سے وعدہ وعید کیا جاتا ہے تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ بلاشبہ وہ حق ہے جیسے کہ تم بات کرتے ہو۔“

### آسمانوں میں روزی بھی اور خدا کا عذاب بھی

آسمان میں روزی بھی ہے اور وہ بھی جو تم سے وعدہ وعید کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔  
(یعنی پیش از وجود خارجی در عالم ملکوت رزق و عقوبت و امثال آں متصور می شود..... فتح الرحمن) مطلب یہ ہے کہ وجود خارجی سے پہلے عالم بالا میں رزق اور سزا وغیرہ سب کی صورتیں وجود میں آجاتی ہیں،  
یہ افلاطون والا تصور ہے کہ آسمانوں میں مادے سے الگ ہر واقعہ کی صورت وجود رکھتی ہے جو اشراقین کی کے اثرات سے صوفیا میں مقبول ہوا شاہ عبدالقادر نے اس کا لباس ذرا بدلا ہے، وہ کہتے ہی:-

آنے والی جو بات ہے اس حکم کا آسمان سے اترتا ہے“ (موضح القرآن)

جلالین نے ان دونوں فقروں کا مفہوم الگ الگ کر دیا ہے فی السماء رزقکم“ آسمان میں تمہاری روزی ہے“ اس کو تعلق مشاہدے و احساس سے قرار دیا ہے اس طرح کہ: ای المطر المسبب عن النبات الذي هو رزق۔  
یعنی باران جو سبب ہوتا ہے نباتات کے روئیدہ ہونے کا جو رزق ہیں۔

اور ما توعدون“ جو تم سے وعدہ وعید کیا جاتا ہے“ اس کے تحت میں لکھا ہے:- ای مکتوب ذاك في السماء“ یعنی وہ آسمان میں تحریر ہے۔

ہمارے نزدیک سب سے زیادہ واضح یہ بات ہے کہ توعدون کا لفظ وعید سے ہے جس کے معنی خبر عذاب کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ آسمان ہی سے روزی بھی اترتی ہے جس سے تمہاری زندگی ہے اور آسمان ہی سے عذاب بھی آتا ہے جو تباہی و بربادی کا سبب ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup>  
”وہ حق ہے جیسے کہ تم بات کرتے ہو“ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو تم کہتے ہو، وہ باتیں لازماً حق ہیں، بلکہ خود یہ فعل کہ تم بات کر رہے ہو، اس میں تمہیں کوئی شک نہیں ہے ایسے ہی اللہ کی یہ بات حق ہے۔<sup>[۲]</sup>

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ﴿٢٤﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا

[۱] ما توعدون به من العذاب ينزله الله عليكم اذا استحققتهموه (تبيان)

[۲] ای مثل نطقكم الذي تنطقون به (مجمع البيان)

سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَّمَ ۗ قَوْمٌ مُّٰنِكِرُونَ ﴿٢٥﴾ فَرَاغَ اِلَىٰ اَهْلِهِ فِجَاءً بِعَجَلٍ سَمِيۡنٍ ﴿٢٦﴾  
فَقَرَّبَهُ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۗ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۗ  
وَبَشِّرُوْهُۤ اِبْغَلِمٍ عَلِيۡمٍ ﴿٢٨﴾

”کیا آپ کو معلوم ہوا ہے واقعہ ابراہیم کے معزز مہمانوں کا وہ جب ان کے پاس آئے تو سلام کیا انہوں نے جواب سلام دے کر کہا کہ کچھ لوگ اجنبی لوگ ہیں تو اپنے گھر والوں کے پاس گئے اور ایک موٹے تازے بچھڑے کے کباب لاکر ان کے پاس رکھے اور کہا کیوں آپ لوگ کھاتے نہیں؟ (جب انہوں نے اس کے بعد بھی کچھ نہ کھایا) تو ان سے انہوں نے ڈر محسوس کیا۔ انہوں نے کہا ڈریئے نہیں اور انہیں ایک صاحب علم بچے کی خوش خبری دی۔“

یہ جناب اسحاق علیہ السلام کے متولد ہونے کی بشارت کا ذکر ہے جو اس کے پہلے جو دھویں پارے میں بھی آچکا ہے۔

فَاَقْبَلَتْ اِمْرَاَتُهُ فِیۡ صَرَّۃٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيۡمٌ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا  
كَذٰلِكَ ۗ قَالَ رَبُّكَ ۗ اِنَّهُ هُوَ الْحَكِيۡمُ الْعَلِيۡمُ ﴿٣٠﴾

”تو ان کی بیوی نے آتے ہی ایک چیخ ماری جس کے بعد اپنا منہ پیٹ لیا اور کہا بڑھیا بانجھ؟! انہوں نے کہا ہاں یوں ہی تمہارے پروردگار نے کہا ہے یقیناً وہ صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔“

یقیناً وہ صورت حال سے واقف بھی ہے اور مصلحت و حکمت کے تقاضے کے مطابق ہی عمل کرنے والا، لہذا ہر بات کو جانتے ہوئے جو مناسب ہو، اس کام کو انجام دیتا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿٣١﴾ قَالُوْا اِنَّا اُرْسِلْنَا اِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِيۡنٍ ﴿٣٢﴾  
لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنۡ طِيۡنٍ ﴿٣٣﴾ مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ لِلْمُرْسِرِ فَيۡنٍ ﴿٣٤﴾

”انہوں نے کہا تو آخر تمہاری مہم کیا ہے اے بھیجے جانے والوں انہوں نے کہا ہم بھیجے گئے ہیں ایک خاص گناہگار قوم کی طرف کہ اس پر گرائیں ایسے سخت مٹی کے پتھر جن پر نشان پڑے ہوئے ہیں حد سے گزرے ہوؤں کے لیے“

چونکہ پاروں کی تقسیم میں جیسا کہ پہلے بھی ایسے موقع پر لکھا جا چکا ہے کہ معانی کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے لہذا ایک ہی سلسلہ مضمون کا ایک جز قبل والے پارے میں چلا گیا ہے اور اس سے تعلق رکھنے والا دوسرا جز بعد والے پارے میں ہے اس لیے اس آیت کا مضمون اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آئے گا جب تک کہ پہلے پارے کی آخری آیتوں کو نہ پڑھا جائے چنانچہ یہاں کلام کا سلسلہ جو پہلے آچکا ہے اس سے سمجھ یہ میں آتا ہے کہ جب فرشتے جو قوم لوط پر عذاب نازل کرنے جا رہے تھے اثنائے رہ گزریں جناب ابراہیم کے پاس ٹھہر گئے اور فرزند کی بشارت دی تو ان کے انداز سے جناب ابراہیم یہ سمجھ گئے کہ یہ خدا کی طرف کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جن کے بھیجے جانے کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ یہ بشارت

انہوں نے ضمناً دے دی ہے لہذا انہوں نے کہا آخر تمہاری مہم کیا ہے۔ اگر وہ اُس بشارت کو ہی اصل مہم سمجھ لیتے تو اس سوال کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اب جیسا کہ ہم اس تفسیر میں پہلے لکھ چکے ہیں قرآن مجید نے ایک ہی واقعہ کو متعدد جگہ جس جس طرح بیان کیا ہے، اس نے ناقلین واقعات کے لیے نقل بالمعنی کی بڑی وسیع گنجائش پیدا کر دی ہے چنانچہ ملائکہ نے اپنی مہم کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے قرآن میں قوم لوط کا نام موجود ہے کہ ہم ان پر عذاب لے کر آئے ہیں اور یہاں ان کا ذکر بس قوم مجرمین کی لفظوں میں ہے اور وہ وہی قوم لوط ہے۔<sup>[۱]</sup>

### قوم لوط پر عذاب کا نزول

قوم لوط کے لیے عام طور پر جس عذاب کی شہرت ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی بستیوں کا طبقہ الٹ دیا گیا یہاں ان پر جس عذاب کا ذکر ہے بس پتھروں کی بارش کا ہے لیکن چودھویں پارے میں ان الفاظ میں کہ: **فَأَخَذْتَهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ فَجَعَلْنَا عَلَيْهِمَ سَابِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ** (حجر..... ۷۴) تین مسلسل عذابوں کا ذکر ہے:-

(۱) صیحه ”صدائے مہیب۔“

(۲) طبقہ الٹ دیا جانا۔

(۳) پتھروں کی بارش۔

اس سلسلہ میں صیحه بظاہر ان کے لیے مستقل عذاب تھا جس سے وہ برباد ہو جائیں جیسا کہ بعض قوموں کے لیے یہ صیحه ہی مستقبل عذاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب اس کے بعد جو دو چیزیں ہیں، ان میں ذرا ذہن میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ جب طبقہ الٹ دیا گیا تو اب پتھروں کی بارش کا کیا حاصل ہے؟

اس کے لیے یہ تشریح قابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ جو شہر کے اندر موجود تھے، وہ بستی کا طبقہ الٹ جانے سے ہلاک ہو گئے اور جو کہیں دوری پر تھے، ان کا کام پتھروں نے جو برسائے گئے تمام کیا۔<sup>[۲]</sup>

پتھروں کا یہ وصف کہ ان پر نشان لگا ہوا ہے، اس کی تشریح جناب ابن عباس کی زبانی یہ آئی ہے کہ سفید پتھر ہے تو اس میں سیاہ نقطہ ہے اور سیاہ پتھر تو اس میں سفید نقطہ ہے۔<sup>[۳]</sup>

**فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ**

**الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۳۷﴾**

”تو ہم نے نکالا انہیں جو اس میں ایمان والوں میں سے تھے تو ہم نے انہیں پایا سوا ایک گھر کے مسلمانوں

[۱] قال الملئكة ارسلوا الى قوم لوط لاهلا كههم (تبيان)

[۲] قيل ارسلت الحجاره على الغائبين وقلبت القرية بالحاضرین (مجمع البيان)

[۳] يكون الحجر البيض فيه نقطة سوداء او يكون الحجر اسود فيه نقطة بيضاء (ابن جرير)

میں سے اور ہم نے اس میں ایک بڑی نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔‘

ظاہر ہے کہ اس کے پہلے اس پارے میں اور پھر اس پارے کی پہلی آیت میں جو گزری، یہ تو ان فرشتوں اور حضرت ابراہیمؑ کی باہمی گفتگو تھی۔ اس کے بعد کی صورت حال اور اس کے سلسلہ کے واقعات یہاں مذکور نہیں ہیں۔ دوسرے سوروں میں ہیں اور اب سننے والا سمجھ لے کہ وہی ہوا جو دوسرے مقامات پر بیان ہوا ہے کہ وہ قوم لوط کی بستی میں گئے اور جناب لوط کے مہمان ہوئے اور وہاں وہ واقعات پیش آئے کہ قوم لوط کے افراد اپنی ہوسناکی کا نشانہ ان فرشتوں کو بنانے کے لیے جو خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آئے تھے جناب لوط کے گھر پر آگئے اور وہ ان سے پریشان ہوئے اور انہیں سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ میرے مہمانوں کی آبروریزی کر کے مجھے رسوا نہ کرو مگر وہ ان کی نصیحت کے ماننے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے جس پر جناب لوط کو بہت اضطراب ہوا تو فرشتوں نے تسلی دی کہ گھبرائیے نہیں یہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ ہم آدمی زاد ہیں ہی نہیں۔ ہم تو آپ کے پروردگار کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، اس کے بعد کی روداد خالق نے خود ان فرشتوں کی زبانی بیان کیا ہے کہ ”ہم نے نکالا“ یعنی تلاش کیا کہ اس بستی میں کچھ اور مخلوق بھی رہتے ہیں یا نہیں تو سوا ایک گھر کے نہ پایا۔ یہ گھر وہی جناب لوط کا گھر تھا جس میں وہ فرشتے آئے تھے مگر دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کی بھی ایک فرد کا استثنا ہوا ہے اور وہ ان کی بیوی تھی جو عذاب سے بچ نہ سکی۔ اس کے علاوہ اور کون اس گھر کا آدمی عذاب سے بچا گیا؟ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے چونکہ ان کی دو بیٹیوں کا بائبل میں ذکر آیا ہے تو شاید اس لیے بعض قدیم تفاسیر میں جناب لوط کے ساتھ ان کی دو بیٹیوں کو بھی بتایا گیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

جو لوگ عذاب سے بچ گئے، ان کے لیے پہلے کہا ”كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ“ جو اس میں ایمان والوں میں سے تھا“ اور پھر بعد میں انہی کے لیے کہا ”غیر بیت من المسلمین“ سوائے ایک گھر کے مسلمانوں میں سے۔“ یہ اس کا ثبوت ہے کہ حقیقت میں جو سچا اسلام ہے، اسی کا نام ”ایمان“ ہے۔ واقفیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

چاہے اصطلاح میں فرق ہو گیا ہو جس کی بنا پر قرآن مجید میں دوسری جگہ اعراب سے کہا گیا ”لَهُ نُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قَوْلُوا اسْلَمْنَا“ ”تم ایمان نہیں لائے یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کی“ مگر اسی کے آخر میں ہے ”وَلَكِنَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ“ ”ابھی ایمان تمہارے دلوں میں پہنچا نہیں ہے“۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”مسلم“ کے لفظ کا اطلاق تو بنائے ظاہر ہو جاتا ہے مگر ایمان اس وقت ہوتا ہے جب یہی حقیقت دل کے اندر بھی پہنچ جائے۔

علامہ طبرسی نے دونوں کے فرق کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کہا ہے کہ چونکہ ان میں دونوں وصف جمع تھے یعنی دل سے تصدیق بھی جو کہ ایمان ہے اور عملاً اطاعت بھی جو کہ اسلام ہے۔

اس لیے ان کا یکے بعد دیگرے دونوں صفتوں سے وصف کیا گیا ہے اور جو مؤمن ہوگا، وہ مسلم بہر حال ہوگا۔<sup>[۲]</sup>

آخر میں جو ہے کہ ”ہم نے ایک بڑی نشانی چھوڑی“..... یہ نشانی اس نازل ہونے والے عذاب کے اثرات ہیں جو بعد میں دیکھنے والوں کے لیے سامان عبرت کے طور پر اس سرزمین اور اس کے اطراف میں مدتوں موجود رہے۔

[۱]۔ ہم لوط وابتغاه (ابن جریر)

[۲]۔ وصفهم الله بالایمان ولاسلام جميعا لانه لا مؤمن الا وهو مسلم (مجمع البيان)

وَفِي مُوسَى إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سِحْرٌ

أَوْ حُجْرٌ ﴿٣٩﴾ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿٤٠﴾

”اور موسیٰ میں جب ہم نے انہیں بھیجا فرعون کی طرف کھلے ہوئے ثبوت کے ساتھ تو اس نے اپنی طاقت کے برتے پر روگردانی کی اور کہا جادوگر ہے یاد یوانہ تو ہم نے اسے اور اس کی فوج کو گرفت میں لے کر ان سب کو دریا میں ڈال دیا اس عالم میں کہ اس پر پھٹکا رہتی رہے گی۔“

”اور موسیٰ“ یہ عطف ہے اس پر جو اس کے پہلے تھا: ”ترکنا فیہا ایہ“ اور ہم نے اس میں نشانی چھوڑی ہے یعنی عبرت کا نمونہ تو ویسا ہی عبرت کا نمونہ موسیٰ کے واقعے میں ہے۔<sup>[۱]</sup>

اس سورے میں ذکر واقعات میں صاف یہ پہلو نمایاں ہے کہ واقعات بیان کرنا نہیں بلکہ ان واقعات کی یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو اسے پہلے متعدد سوروں میں ان واقعات کی تفصیل پڑھ چکے ہیں، انہیں مختصر اشاروں سے وہ سب باتیں یاد آجائیں گی جو شاید وقتی طور پر ان کے حافظے سے محو ہو گئی ہوں، چنانچہ ”سلطان مبین“ کھلے ہوئے ثبوت“ کے لفظ میں عصابیں بیضا اور فرعون کے متنہ کرنے والے نوحے جن کا ذکر قرآن مجید نے پہلے کیا ہے، سب مندرج ہیں۔

### گزشتہ کئی قوموں پر عذاب کا مختصر مختصر تذکرہ

توٹی ہوئی برکنہ کا یہ ترجمہ کہ اس نے اپنی طاقت کے برتے پر روگردانی کی، ایک تشریح کے مطابق ہے۔<sup>[۲]</sup>

جیسا کہ عوامی محاورہ ہمارا یہاں ہے کہ ”اس کا کھونٹا مضبوط ہے۔“

بعض نے اس کا مفہوم ہی فوج و لشکر قرار کیا ہے مگر یہ بظاہر اس کا ضمنی جز ہے۔ اسی طرح ”قوم اور ساتھی“..... یہ سب ایک بادشاہ کی طاقت میں داخل چیزیں ہیں۔

ایک تصور یہ ہے کہ ”ب“ تعدیہ کا ہے جیسے جائے کے معنی آیا، اور جائے بہ کے معنی لایا..... اسی طرح تولی کے معنی ”روگردانی ہوا“ اور جب اس کے ساتھ ”ب“ آگئی تو معنی ہو گئے کہ اس نے اپنی فوجوں کو روگردان کیا۔“

اس کے بالکل بالمقابل یہ خیال ہے ”تولی برکنہ“ اس پورے کے بس یہ معنی ہیں کہ اس نے روگردانی کی جیسے ہمارے یہاں محاورہ ہے ”پہلو تہی“ کرنا۔ ویسے ہی یہ رکن جیسے ”پہلو“ کے معنی میں ہے۔ تفسیر صافی میں علامہ حسن فیض کا مختار یہی معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے تولی برکنہ کے تحت میں پہلے نہیں لکھا ہے:

فاعرَضُ عَنِ الْإِيْمَانِ بِهِ ”اس نے ان پر ایمان سے روگردانی کی“ اور اس کی مثال میں یہ قرآنی جملہ پیش کیا ہے: وَكَأَيُّ مَجَانِبِهِ ”اور اس نے پہلو کے ساتھ دوری اختیار کی“ جس کا مطلب وہی پہلو تہی کرنے کا ہے۔

[۱] ای و فی موسیٰ ایضاً آیة (مجمع البیان عطف علی قولہ: ترکنا فیہا آیة (تبیان)

[۲] صل الرکن الجانب والناحیة التي یعتمد علیہا ویقری بہا (ابن جریر)



اس نے کہا ”ساحر ہے یاد پوانہ“..... یہ بظاہر ایک وقت کی بات ہے ہی نہیں بلکہ جیسے قرآن مجید میں اہل کتاب کا مقولہ نقل کیا ہے کہ: لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوَ دَاخِلًا اَوْ نَضْرَى (بقرہ ۱۱۱)۔ ”جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوا اس کے جو یہودی یا نصرانی ہو“ تو حقیقت یہ ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ وہ جنت میں جائے گا جو یہودی ہو اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ وہ جنت میں جائے گا جو عیسائی ہو۔ ان میں سے کوئی اپنے ساتھ دوسرے کا نام نہیں لیتا مگر قرآن نے دونوں کے مقولوں کو سمو کر یہ کہا کہ ان کا اذعان تو یہ ہے کہ وہ جائے گا جو یہودی یا عیسائی ہو۔ ویسے ہی یہاں کہا گیا کہ فرعون نے ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ اِنَّ رَسُوْلَكَمُ الَّذِي اَرْسَلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ۔ ”یہ پیغمبر جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، دیوانہ ہے، (شعرا کی آیت ۲۷) اور دوسری دفعہ کہا: اِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ عَلِيمٌ۔ ”یہ بڑا ماہر جادوگر ہے جو اسی شعرا کی آیت ۳۴) میں اور دوسرے مقامات پر ہے قرآن میں ان دونوں وقتوں کی باتوں کو سمو کر یہاں کہا ہے کہ ”جادوگر ہے یاد پوانہ“۔

ڈوبے تو سب مگر پھٹکار میں اکیلے فرعون کی طرف ضمیر پھیری گئی اس لیے کہ ان سب کو ڈوبنے اور ہلاکت ابدی میں گرفتار کرنے کا باعث وہ تھا جیسا کہ سورہ ہود میں صراحتہ ارشاد ہوا ہے کہ: يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ (آیت ۹۸)۔ وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا کہ اسی نے ان سب کو دوزخ میں پہنچایا ہے۔“

وَفِي عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيْمَ ﴿۳۳﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا

جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۳۴﴾

”اور (قبیلہ) عاد میں جب کہ ان پر ہم نے بے نتیجہ قسم کی ہوا بھیجی، وہ کسی چیز کو جس پر سے گزرے چھوڑتی نہیں مگر یہ کہ اسے بنا دیتی ہے مثل سوکھی ہوئی گھاس کے چورے کے“

سلسلہ وہی ہے کہ قوم لوط والے عذاب میں نشانی ہے اور فرعون کے قصے میں اور قبیلہ عاد میں..... بے نتیجہ قسم کی ہوا۔ اسے عقیم کے لفظ سے تعبیر کیا جو بانجھ عورت کو کہتے ہیں۔ اب ہوا کو جب عقیم کہا تو مطلب یہ ہوگا کہ اس سے وہ نتائج جو ہوا کے ہوتے ہیں جیسے باران کا لانا، نباتات کا روئیدہ کرنا، یہ پیدا نہیں ہو سکتے۔ [۱]

حدیث میں ہے کہ ایسی ہوا سے پناہ مانگنا چاہیے۔ [۲]

رمیمہ کا لفظ قرآن مجید میں یوں تو ہڈیوں کے لیے آئی ہے ”حیات بعد الموت“ کے منکر کافروں کے قول می کہ: مَنْ يُضْحِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ“ (سین ۷۸) کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا ان کے بوسیدہ ہو کر چورا ہونے کی حالت میں۔

مگر مفسر طبری کے جامع البیان میں پتہ چلتا ہے کہ اصل میں یہ لفظ اس گھاس کے لیے آتی ہے جو خشک ہو کر بالکل چورا ہو جائے۔ [۳]

اس صورت میں مشرکین کے کلام میں جو اُس کا استعمال ہے، وہ بطور استعارہ ہے جس کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے:

[۱]۔ لا تلتقح المشجر ولا تثبات النبات... علی ابن ابراہیم

[۲]۔ فی فقیہ عن امیر المؤمنینؑ: الریاح خمسة فیها الریح لاعقیم فتعود بالله من نشرها (صافی)

[۳]۔ الیہم فی کلام العرب ما ییس من نبات الارض ودیس (ابن جریر)

وَفِي مُمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٣٣﴾ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ

الصُّعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ﴿٣٤﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُتَّصِرِينَ ﴿٣٥﴾

”اور قبیلہ شمود میں جب کہ ان سے کہا گیا (دنیا کی نعمتوں سے) بہرہ مند ہو، ایک خاص وقت تک تو انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی تو انہیں گرفت میں لے لیا بجلی نے جو گری درانحالیکہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، تو اس کے بعد اٹھ نہیں سکے۔ اور نہ انہیں مدد ملنا ممکن ہوئی۔

”اور قبیلہ شمود میں بسلسلہ سابق عطف ہے کہ ان میں بھی نشانی ہے..... کہا گیا..... جیسا کہ پہلے اس سورے کا اسلوب یہی ہے کہ واقعات بیان نہیں کیے جاتے۔ ان کی طرف مجمل اشارہ کر کے انہیں یاد دلایا جاتا ہے۔ اب پہلے جہاں جہاں اس واقعہ کا ذکر ہے، اس سب کو یاد کر لیجیے۔

جناب صالح علیہ السلام کا مبعوث ہونا، قوم کا معجزے کی درخواست کرنا، اس پر ایک ناقہ کا برآمد ہونا اس کے متعلق خاص ہدایتوں کا ہونا، اور قوم کا نافرمانی کرنا، یہاں تک کہ اس ناقے کو پے کر ڈالنا اس پر اعلان عذاب کے ساتھ تین دن کی مہلت کا ملنا اور اس پر بھی ان کی آنکھوں کا نہ کھلنا تو عذاب کا آجانا جس کا مذکورہ دو (۲) آیتوں میں ذکر ہے چونکہ بجلی کے گرنے سے شدید کڑک کی آواز ضرور ہوتی ہے لہذا دوسری جگہ اس کڑک کو ”صیحة“ کہا گیا ہے اور یہاں اس صیحة کے ساتھ بجلی گری اس کا نام لیا گیا ہے۔ ان دونوں میں باہم کوئی منافات نہیں ہے۔

وَقَوْمٍ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِقِينَ ﴿٣٦﴾

”اور نوحؑ کی قوم کو (ہم نے ہلاک کر دیا) یہ بد اعمال لوگ تھے“

پہلے سلسلہ تھا کہ قوم لوطؑ میں نشانی چھوڑی..... اور فرعون کے واقعہ میں اور عاد میں اور شمود میں اس سب کا خلاصہ سننے والے کے ذہن میں آ گیا کہ یہ سب ہلاک کیے گئے تو اب اس پر عطف کر کے کہا گیا اور قوم نوح کو..... اب یہ کیوں کر ہلاک کیے گئے۔ اسے دوسرے سوروں میں دیکھ لیجیے۔

جامع البیان طبری میں ”قوم نوح“ کے لفظ کے منصوب ہونے کی تین (۳) وجہیں لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ ”اخذتہم الصاعقہ میں جو ہم کی ضمیر ہے اور وہ مفعول ہے اس پر عطف ہو مگر یہ میرے نزدیک اس وقت درست ہوتا جب ان لوگوں کو بھی بجلی ہی نے ہلاک کیا ہوتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جسے میں نے اختیار کیا ہوتا۔

تیسری صورت یہ کہ یہاں ایک فعل حذف مانا جائے کہ نوح کو یاد کرو، فطری طور پر جو ذہن میں مفہوم آتا ہے، وہ درمیانی ہے۔

وَالسَّمَاءِ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ﴿٣٧﴾ وَالْأَرْضِ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ

الْمُهْدُونَ ﴿٣٨﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٣٩﴾

”اور آسمان ہم نے اس کو بنا یا بڑی طاقت کے ساتھ یقیناً اور ہم زیادہ وسعت دینے والے ہیں اور زمین اسے ہم نے بچھایا تو کتنے اچھے بچھانے والے ثابت ہوئے اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے، شاید کہ تم سبق حاصل کرو“

اب یہ ایک مستقل سلسلہ خالق کی صنعت کی طرف نگاہ کو متوجہ کرنے کے لیے ہے اور جس کا کوئی لفظی ربط سابق کے ساتھ بطور عطف کے قرار دینا ضروری نہیں ہے اور بعض لوگوں نے سابق پارے میں جو آیا تھا: *وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ*، زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے، اس پر عطف لیا ہے۔ یہ نہ صرف بلاوجہ ہے بلکہ درست بھی نہیں ہے اس لیے کہ اس سے اگر اس کا ربط ہوتا تو *السَّمَاءِ* کا لفظ مجرور ہوتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ آسمان میں بھی نشانیاں ہیں۔ دوسرے اس آسمان کے ذکر کے بعد پھر زمین کا ذکر نہ ہوتا۔

اس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مستقل جملے ہیں جن کا سابق سے کوئی لفظی ربط نہیں ہے، اید کا جو ہم نے ترجمہ کیا بڑی طاقت کے ساتھ یہ ایک معنی کے لحاظ سے ہے۔

دوسرے معنی اس کے نعت کے ہیں تو یہ ترجمہ ہوگا کہ آسمان کو ہم نے بڑے لطف و مہربانی کے ساتھ پیدا کیا مگر خلقت فلکی سے عام ذہن پر نعت کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا قدرت کا لہذا ہماری نظر میں اید کا مفہوم آیت میں قوت ہی کا ہے جس کے موافق ہم نے ترجمہ کیا اور حدیث معصومہ اس کے مطابق ہے۔ یہ صدوق کی روایت ہے تو حید میں محمد بن مسلم سے کہ امام محمد باقر نے فرمایا کہ اید کے کلام عرب میں دونوں معنی ہیں طاقت بھی اور نعت بھی مگر حسب ذیل دو آیتوں میں اس کے معنی قوت ہی کے ہیں: *وَإِذْ كَرَّعِبْدُ نَادَا دَاوُدَ ذَا لَآئِدٍ* ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو طاقت والے تھے اور *وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بَآئِدٍ*..... اید کے اسی معنی سے تائید کا لفظ ہے۔ ارشاد ہوا: *وَإِذْ هَمَّ بِرُوحٍ مِّنْهُ* ”اس نے انہیں قوت پہنچائی اپنی طرف کی روح سے“

آسمان کے ساتھ یہ کہنا: *إِنَّا لَمُوسِعُونَ*، یقیناً ہم اور زیادہ وسعت دینے والے ہیں۔ اس میں یہ مفہوم زیادہ ذہن میں آتا ہے کہ ہماری قدرت اتنی ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ عظیم مخلوق پیدا کرنے پر بھی ہم قادر ہیں۔<sup>[۱]</sup> بعض اشخاص نے اسے وسعت رزق کا معنی قرار دیا ہے مگر وہ سیاق کلام سے غیر مرتبط ہے ہاں وسعت دینے کے معنی ہوں تو یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ آسمان میں ہم وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔<sup>[۲]</sup>

اسے اگر انکشافات جدید کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ مفہوم باسانی نکل سکتا ہے کہ اجرام سماویہ میں ہماری قدرت سے اضافہ ہوتا رہتا ہے زمین کو بچھونا کہنے سے جیسا پہلے آچکا ہے ریاضی کے اس مسئلے کا کوئی تعلق نہیں کہ زمین کر دی شکل کی ہے کیوں کہ وہ پوری کر دی یا جو بھی ہو ہمارے لیے ایک فرش کی حیثیت رکھتی ہے،

ہر چیز کے ہم نے جوڑے قرار دیئے ہیں، اس سے واقعیت کا اظہار مراد ہو سکتا ہے جو جدید تحقیقات سے ثابت ہوئی ہے کہ ہر شے میں نر اور مادہ یا فاعل اور منفعل کی تفریق ہے مگر اصول کافی میں امام رضا علیہ السلام کا جو خطبہ وارد ہوا ہے، اس میں ہے کہ مختلف چیزوں کے درمیان اس

[۱] ای قادرون علی خلق ماہوا اعظم منها عن ابن عباس رضی اللہ عنہما (مجمع البیان)

[۲] لموسعون السماء (صافی)

نے تضاد قرار دیا ہے اور ایک کے مقابلے میں: دوسرا نور کے مقابلے میں ظلمت اور خشکی کے مقابلے میں تری اور سخت کے مقابلے میں نرم اور سرد کے مقابلے میں گرم..... یہ جو ہر چیز کے مقابلے میں کوئی دوسری چیز ہے جو اسی نے قرار دی ہے،

اس کے بعد فرمایا: وَذَلِكَ قَوْلُهُ وَمَنْ كَلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَا كَازُوجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ..... (صافی)

یہ ہے ارشاد خداوندی کہ ہم نے ہر چیز جوڑے قرار دیئے ہیں، شاید کہ تم سبق حاصل کرو۔

یہ سبق کیا ہے عقیدت سے متعلق یہی کہ ہر چیز میں اس نے جوڑے بنائے ہیں تو اس سے سمجھ لو کہ اس کا کوئی جوڑا نہیں ہے۔ اور اس مفہوم کی بنا پر جو زومادہ والا تھا، یہ عملی سبق ملتا ہے کہ جب اسی تفریق کے پیش نظر دو صنفیں مرد اور عورت کی قرار دی گئی ہیں تو اس سے سمجھنا چاہیے کہ تلذذ بالمثل جو قوم لوطؑ میں عام تھی فطرت کائنات کی مخالفت اور دو صنفوں کی پیدائش کی غرض کو نقصان پہنچانا ہے۔

**فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ اِنَّى لَكُمْ مِّنْهُ نَدِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٥﴾ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِنَّى**

**لَكُمْ مِّنْهُ نَدِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٥﴾**

”تو بھاگو اللہ کی طرف میں تمہیں اس سے کھلا ہو ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے علاوہ دوسرا خدا قرار نہ

دو میں تمہیں اس سے کھلا ہو ڈرانے والا ہوں“

بہت سے الفاظ بغیر کسی اضافت کے بولے جائیں تو سننے والے کو مذموم معلوم ہوں گے مگر کسی اضافت کے بعد ان میں حسن پیدا ہو جائے گا، اسی طرح بعض الفاظ بغیر اضافت حسن کے حامل ہے مگر کسی اضافت کے بعد ان میں برائی پیدا ہو جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مثال کفر اور ایمان ہے۔ کفر یا کفر کو نکر انسان کو نفرت پیدا ہوتی ہے لیکن قرآن نے کئی جگہ جس طرح اس لفظ کا استعمال کیا، مثلاً وَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ، جو طاقت باطل سے کفر کرے، اس کے بعد یہ لفظ انتہائی حسن کی حامل ہو گئی اس طرح ایمان یا مومن کا لفظ انتہائی حسن کی حامل معلوم ہوتا ہے لیکن جب اس کی اضافت باطل کی طرف ہو جائے تو وہ مذمت ہو جائے گی۔

### مومن اور کافر کے معنی

اس کے بعد صبر کے لفظ کو لیجیے، یہ نہایت مدوح چیز ہے لیکن قرآن نے اس لفظ کا جس طرح استعمال کیا ہے ”فَمَّا أَصْبَرْتُمْ عَلَى النَّارِ“ (البقرہ ۱۷۵) کتنے لوگ دوزخ کی آگ پر صبر کرنے والے ہیں، تو اس میں شدید مذمت ہو گئی۔ فرار یعنی بھاگنے کا لفظ ایسا ہے کہ بجائے خود یہ کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے؟ لیکن معصیت الہی سے فرار اور کفر و شرک سے فرار، باطل سے فرار اس کے بعد یہ لفظ حسن کا حامل ہو گیا۔ یہاں لفظ فرار کا استعمال اسی طرح ہوا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ کی طرف فرار کرو اب اس کے معنی ہو گئے برائیوں سے بچنا اور اچھائیوں کو اختیار کرنا، معصیت الہی سے گریز کرنا اور اطاعت الہی کی پابندی کرنا۔<sup>[۱]</sup> اب اس فرار کا کیا کہنا، یہ فرار ہے اللہ کی طرف اس کی ناراضگی کے ڈر سے۔ اس لیے رسول اللہؐ کی زبانی اس کا پیغام دیتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ میرا کام اس سے ڈرانا ہے۔ تاکہ تم اس کے گناہوں سے فرار کرو۔

[۱] فَرُّوا مِنْ عِقَابِهِ إِلَى الْإِيمَانِ التَّوْحِيدِ وَمِلَادِمَةَ الطَّاعَةِ (صافی)

حقیقت اللہ کی طرف فرار کی یہی ہے مگر ہر حقیقت کے لیے ایک عملی مظاہرہ ہوتا ہے اور مقام نسبت میں کعبہ اللہ کا گھر ہے اس لیے ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف بھی ملتی ہے اور کافی اور معانی الاخبار میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ اس سے مراد حج کو جانا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ وہی حج ہوگا جس کے ساتھ لوبا لکل اللہ سے لگی ہوئی ہے اور وہ انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہو سکے وہ حج نہیں جو اکثر ہمارے مشاہدے میں آیا کرتا ہے، وہ حج تو ایسا ہے جسے پھر اللہ کی طرف فرار کی ضرورت ہے ”ہست استغفار ما محتاج استغفارا“

**كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مُجْنُونٌ ﴿٥٦﴾**

**آتَوَا صَوَابِهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ﴿٥٧﴾**

”یونہی ان کے پہلے جو تھے، ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آیا مگر انہوں نے کہا ”جادوگر“ ہے یا ”دیوانہ“۔ کیا انہوں نے ایک دوسرے کو اس کی وصیت کر دی ہے بلکہ یہ خود ہی سرکشی میں مبتلا ہیں۔“

جادوگر ہے یا دیوانہ“ یہ ایک ہی وقت میں بطور اظہار شک کے دونوں باتیں نہیں کہی ہیں بلکہ جیسا کہ قصہ حضرت موسیٰ میں روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی مختلف اوقات کی باتوں کو سمو کر اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ جادوگر، کہنا اندرونی طور پر ایک غیر معمولی طاقت کے احساس کا نتیجہ ہے اور ”دیوانہ“ کہنا دوسروں کو ان کی باتوں پر توجہ کرنے سے روکنے کے لیے ہے ہر نبی کو ایک ہی طرح کے حالات سے سابقہ پڑا اور ایک ہی طرح کی باتیں منکروں سے سنیں، اس حقیقت کا ذرا جھلائے ہوئے انداز میں پہلے بطور رسول اظہار کیا گیا ہے ”ارے کیا ان لوگوں میں نسل در نسل اگلوں نے پچھلوں کو یہ وصیت کر دی“ کہ تم بھی ایسا کرنا اور ایسی ہی باتیں کہنا۔<sup>[۱]</sup> پھر قرآن نے جیسے اس کا جواب نفی میں دیا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ جو چیز ان باتوں کی باعث ہوتی ہے یعنی تعصب عناد، بدکیشی یا سرکشی، وہ ان سب میں مشترک ہے لہذا ان کا نتیجہ بھی سب میں یکساں نظر آتا ہے۔

**فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ ﴿٥٨﴾ وَذَكَرْ فَإِنَّ الدِّكْرَى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٩﴾**

”تو اب آپ ان سے منہ پھیر لیجیے، اب آپ مورد الزام نہیں ہے اور یاد دہانی کرتے رہیے کہ یاد دہانی اہل ایمان کے لیے فائدے کا باعث ہوگی۔“

**یاد دہانی کا اہل ایمان کے لیے فائدہ**

اس کا مطلب یہ کہ جو ایمان نہیں لائے ہیں، اب آپ کی طرف سے ان پر اتمام حجت ہوگئی اور ان کے سلسلے میں آپ کا فریضہ پورا ہو گیا..... آپ پر کوئی الزام کو تا ہی کا عائد نہیں ہوتا۔ ہاں ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھئے کہ جو اہل ایمان ہیں وہ تو اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اور ان کے ایمان میں جلا ہوتی رہے گی۔ اس میں اگر صرف پہلی ہی آیت پر بات ختم ہو جاتی تو اس سے یہ پہلو ضرور نکلتا تھا کہ بس اب رسول نے اس قوم سے کنارہ کشی اختیار فرما کر ان کے پاس سے کہیں دور چلے جائیں اور امم سابقہ میں ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب اس قوم پر عذاب نازل ہونے والا ہو، لہذا آپ کو اس حکم دینے سے کہ اب علیحدگی اختیار کیجیے یہ تصور پیدا ہوتا تھا کہ اب اس پر عذاب نازل ہو جائے گا مگر دوسری آیت

[۱] قتادة: اوصى اولهم بالتركيب (ابن جرير)

میں بتایا کہ نہیں رسول گواپنا کام جاری رکھنا چاہیے کہ جو پاک روحمیں ہیں وہ تو اس سے فائدہ اٹھاتی رہیں۔

دونوں آیتوں سے یکے بعد دیگرے جو دو (۲) تاثر پیدا ہوئے ہیں اس حقیقت کے اظہار کا ایک تمثیلی انداز تھا جو بطریق اہل سنت حضرت علی ابن ابی طالب کا نام لے کر آیا ہے کہ آپ مکان سے برآمد ہوئے اس طرح کہ سر پر عمامہ تھا اور پیراہن کو اپنے جسم مبارک پر لپیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ جب یہ آیت اتری کہ بس اب روگردانی کیجیے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے یہ یقین نہ ہوا ہو کہ اب عذاب آجائے گا کیوں کہ رسول کو حکم ہوا ہے کہ اب ان سے الگ ہو جائیں مگر جو نبی یہ آیت اتری کہ یاد دہانی کرتے رہیے..... تو بس ہمارے دل کو اطمینان ہو گیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اسے سیوطی نے تفسیر درمنثور میں کلمی کے حوالے سے درج کیا ہے اور اس طرح کی روایت ابن لاہویہ اور ابن مردودہ نے حضرت پیغمبر ﷺ سے نقل کی ہے۔ ہمارے علامہ طبری نے بھی اس کو مجاہد کے حوالے سے درج کیا ہے جس کا ماخذ غالباً جامع البیان طبری ہے جس میں پہلے تو قتادہ سے نقل سے کیا ہے کہ جب پہلی آیت اتری تو اصحاب پیغمبر ﷺ پر بہت شاق ہوا اور خیال ہوا کہ وحی کا سلسلہ اب قطع ہو رہا ہے اور عذاب آیا ہی چاہتا ہے اس کے بعد دوسری آیت نازل ہوئی۔ اور پھر مجاہد کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک خاص شان سے نکلے اور اس تاثر کا اظہار فرمایا۔ بہر حال اس دوسری آیت کے ملانے کے بعد پہلے جملے کی نوعیت ویسی تسلی دہانی کی ہو گئی کہ جو قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر طرح طرح سے ہے کہ آپ ان کی نافرمانیوں سے پریشان نہ ہوئے جیسے، ان کے نہ ماننے کی کوئی جواب دہی آپ سے نہیں ہو سکتی۔ اور نہ آپ کو کوئی ملامت ہو سکتی ہے [۱] آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ [۲]

## وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿۵۶﴾

”اور میں نے نہیں پیدا کیا جنات اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں“

### مقصد خلقت انسان اور جنات

یہاں جنات کا پہلے اور انسان کا نام بعد کو لینا شاید اس بنا پر ہو کہ جنات کی خلقت پہلے ہوئی جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ قَارِ السَّمُومِ.

جنات کو ہم نے پہلے گرم اور زہریلی ہوا سے پیدا کیا ہے (حجر آیت ۲۷)

اب یہ دیکھنا ہے کہ غرض خلقت جو عبادت بتائی گئی ہے اس سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ ایک عبادت تو وہ ہے جو بتقاضائے فطرت تمام کائنات پر حاوی ہے یعنی ہر چیز پر قدرتی طور پر اس نظام کے موافق چل رہی ہے جس پر خدا کو اس کا چلنا منظور ہے مگر وہ جبری اطاعت ہے۔ یہ عبادت تکوینی ہے جس میں اس شے کے ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس قسم کی عبادت اور سجدہ ریزی کا تمام اشیاء کے لیے قرآن مجید میں ذکر ہے۔

یہ اس محل پر مراد نہیں ہے ورنہ جن و انس کی خصوصیت نہ ہوتی، کہا جاتا ہے کہ تمام کائنات ہم نے عبادت کے لیے پیدا کی ہے

[۱] بل الاث و اللوم علیہم حیث لا یقبلون ما تدعونہم الیہ (تبیان)

[۲] فقد بلغت و نذرت (مجمع البیان)

اور اختیار اطاعت مگر بغیر مزاحم طاقتوں کے کرنے والے فرشتے ہیں۔ اس بندگی میں وہ رفعت نہیں ہے جو اس مخلوق کی اطاعت میں ہوگی جو مقابل کی طاقتوں کو کچل کر اللہ کی عبودیت کے راستے چلتا رہے، یہ وہ عبادت ہے جس کے لیے جن وانس کی تخلیق ہوئی جسے ”عبادت تشریحی“ کہنا درست ہے یعنی مقصود اس نوع کی تخلیق کا ہے کہ یہ اپنے ارادہ و اختیار سے عبودیت خدا کے تقاضوں کو پورا کرے اور چونکہ ارادہ و اختیار وابستہ ہے اس سے کہ اس شخص کو فعل و ترک دونوں پر قدرت ہو لہذا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں کچھ عبادات گزار نظر آتے ہیں اور زیادہ تر وہ ہے جو اس کی عبادت سے سرتابی کرنے والے ہیں۔ ان سرتابی کرنے والوں کا وجود ان افراد کی بلندی کا ثبوت ہے جو اپنی سعادت مندی سے اپنی زندگی خالق کے احکام کی تعمیل میں صرف کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ خالق اپنی غرض کے پورا کرنے میں ناکام رہا۔ اب جو اس غرض خلقت کو پورا کریں گے، وہ خالق کی طرف سے اس کی رحمت کے مورد ہوں گے جس کا نتیجہ آخرت میں درجوں کی بلندی ہے اس طرح اس آیت کا مضمون اس ارشاد الہی کے مطابق ہوگا کہ ”لَا يَزَالُ لَوْنٌ مُّخْتَلِفِينَ ﴿١١٨﴾ إِلَّا مَنْ رَزَقَهُ رَبُّكَ ۗ وَلِلذَّالِكَ خَلَقَهُمْ“ ان میں برابر اختلاف رہے گا سوان کے جن پر تمہارے پروردگار کی رحمت ہے اور اس نے تو انہیں اسی کے لیے پیدا کیا تھا (ہود ۱۱۸-۱۱۹)

یعنی اس رحمت کے استحقاق کے لیے مگر وہ خود اپنے سوا اختیار سے اس محروم رہتے ہیں۔

معصوم کی تشریح اسی کے مطابق ہے [۱] مگر مسلم اکثریت کا ذہن جبر و اختیار کے مسئلے میں چونکہ زیادہ تر جبر کی طرف مائل رہا ہے لہذا ان کے قدیم مفسر ابن جریر طبری نے اپنے راویوں کے جو تشریحات درج کے ہیں ان کا نتیجہ بعض کا یہ نکلتا ہے کہ عبادت غرض خلقت صرف ان کے لیے ہے جو اطاعت گزار ہیں اور جو بد نصیب نافرمان ہیں ان کی غرض خلقت ہی نافرمانی ہے اور بعض کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو نافرمانی کر رہے ہیں وہ بھی ایک طرح کی عبادت ہی کر رہے ہیں کہ فیصلہ تقدیر کو پورا کر رہے ہیں لیکن ان دونوں صورتوں میں جزا و سزا نظام عدل کے مطابق قرار نہیں پاتی جب کہ نافرمان بچارے بھی غرض خلقت کو پورا کر رہے ہیں یا ایک طرح کی عبادت انجام دے رہے ہیں تو پھر ان کو سزا کا ہے کی ہے؟

فرقہ امامیہ جس طرہ امتیاز عدلیہ ہوتا ہے، اس قسم کے تشریحات کو قبول کرنے سے قاصر ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں جو ہے کہ: **وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ**۔ ”ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے انسان اور جنات کو پیدا کیا ہے۔ (الاعراف ۱۷۹) وہاں لام جس کا ترجمہ ”لیے“ ہے، جو لام غرض نہیں ہے جو مقصد کا اظہار کرتا ہے بلکہ لام عاقبہ ہے جس سے وقوع میں آنے والے انجام کا مجازاً اظہار ہوا کرتا ہے یعنی نتیجہ تخلیق کے بعد جو وقوع میں آیا، وہ یہ تھا، نہ یہ کہ وہ پیدا اس لیے ہوئے تھے [۲]

**مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ**

**الْمَتِينِ ﴿٥٨﴾**

”میں ان سے کسی روزی کا طلب گار نہیں ہوں اور نہ میں اس کا خواہاں ہوں کہ وہ مجھے کھانا دیں، یقیناً اللہ وہی روزی دینے والا ہے، مضبوط طاقت والا“

[۱] - خلقهم ليفعلوا اما يسترحبون به رحمته فير حمهم (صافی)

[۲] - انه خلق الخلق كلهم لعبادته تصير عاقبة كثير منهم الى جهنم بسوء اختيارهم (تبیان)

پہلے پارے کے شروع میں ہمارا زقنا ہمہ ینفقون کے تحت میں آچکا ہے کہ رزق جس کا ترجمہ ”روزی“ ہوتا ہے وہ ہر شے ہے جس سے کسی زندہ شخص کی بقا وابستہ ہے کھانا اس کے تحت میں داخل ہے لہذا یہاں پہلے تو ہر قسم کی ضرورت سے اپنی بے نیازی کا اظہار کیا ہے اور پھر خصوصیت سے جس چیز کی ضرورت دنیا میں کسی ذی روح کو سب سے زیادہ ہوتی ہے یعنی غذا اس کی واضح طور پر نفی کی ہے۔ اس کا ربط پہلی آیت سے یوں ہوتا ہے کہ عام طور پر کوئی غلام اور کنیز وغیرہ بناتا ہے وہ اس لیے کہ ضروریات کے پورا کرنے میں اس کی مدد کریں مگر یہاں اس نے جو انسان وغیرہ کو پیدا کیا ہے، وہ خود مدد حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے کیوں کہ تو بے نیاز مطلق ہے..... اسے کوئی ان کی احتیاج نہیں ہے [۱] وہ عبادت جس کے لیے اس نے جن وانس کو پیدا کیا ہے اس کا فائدہ جو رحمت الہی ہے اسی مخلوق کو پہنچتا ہے، خالق کو نہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک بندے سے میں اس کا طلب گار نہیں ہوں کہ میرے دوسرے بندوں کو روزی دیں، نہ اس کا طلب گار ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ مگر یہ مفہوم آیت کے الفاظ سے ذہن میں نہیں آتا۔ بعد والی آیت میں اللہ کا نام لینا ایک قسم کی دلیل ہے کہ میں بھلا رزق کا طلب گار کہاں ہو سکتا ہوں، میں تو اللہ ہوں جس کی ذات مطلق بے نیاز ہے اور وہ خود فیض رسان خلاق ہے۔ ملائحتن فیض کو جیسے یہ الفاظ ذات الہی پر کھینچے نہیں محسوس ہوئے کہ میں ان سے کسی رزق کا طلب گار نہیں ہوں، اس لیے دبی زبان سے یہ تصور ظاہر کیا ہے کہ شاید اس اعلان کی ہدایت رسول گو ہوئی ہو [۲] مگر میرے خیال میں جب کہ سابق کی آیت کے ربط سے اس کا مناسب مفہوم موجود ہے تو اسے الگ قرار دینے اور وہ بھی ایک عدد ”قل“ کو درمیان میں محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جبکہ اس صورت میں مناسب یہ معلوم ہوتا کہ ”منہم“ ”ان سے“ کے بجائے ”تم سے“ کسی رزق کا طلب گار نہی ہوں۔

فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُنُوبًا مِّثْلَ ذُنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ

لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿۶۰﴾

”تو یقیناً ان لوگوں کا جو ظالم ہیں، وہی حصہ ہے جیسا ان کے ساتھ والوں کا تھا تو وہ لوگ مجھ سے جلدی نہ کریں، تو وائے ہو، ان لوگوں کے لئے کافر ہیں، اس دن سے جس کا ان سے وعدہ وعید ہوتا“ ہے۔  
ذنوب کے معنی تو بڑے ڈول کے ہوتے ہیں اور اس حصے کو بھی کہتے ہیں جس کا کسی کو استحقاق ہو تو لفظی معنی تو وہ ہوئے جو ترجمہ کیا گیا ہے۔  
مطلب یہ ہے کہ جو انجام ان کا ہوا وہی ان کا ہے۔ ساتھیوں سے مراد ان کے ہم کیش پہلے والے ہیں جو کفر اور بد اعمالی میں ان کی طرح تھے [۳]  
ایک دفعہ ظالم کہہ کے پھر کافر کہنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ظلم سب سے بڑا یہی ہے کہ وہ اللہ کے مقابلے میں کفر اختیار کیے ہوئے ہیں اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔

[۱]۔ انی لہم اخلقہم الماجۃ بی الیہم (علی ابن ابراہیم)

[۲]۔ یحتمل ان یقدر قل فیكون بمعنی قوله: قل لا اسئلكم علیہ اجرا (صافی)

[۳]۔ اصحابہم الذین ہلکوا مثل قوم نوح و عاد و ثمود (مجمع البیان)



# سُورَةُ الطُّورِ

”مکیہ ..... ۴۹..... آیات“

ادھر کے سوروں میں عموماً نام سورے کا پہلی ہی لفظ پر جو سورے کے شروع میں ہے مقرر ہو گیا ہے اور مضامین ان سوروں کے جو مکے میں نازل شدہ ہیں بنیادی طور پر مبداء و معاد سے متعلق ہیں اور بشارت سے زیادہ انداز پر توجہ ہے۔ پہلے عذابِ آخرت کا سخت سے سخت طریقہ پر اندیشہ پیدا کیا گیا ہے اور پھر اس کے مقابلے میں جو پرہیزگار ہیں ان کے خوش گوار انجام کا مسحور کن انداز میں تذکرہ ہے۔ درمیان میں نیک اعمال اہل ایمان کی اولاد کے لیے جو ایمان میں ان کے ساتھ شریک ہیں، خصوصی طور پر ان کے مراتب میں شرکت کا اعلان ہے جس پر تبصرہ اسی آیت کے ذیل میں ہوگا۔

آخر میں مشرکین کی مختلف طرح پریشان خیالیوں اور چومی گویوں کا جو وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے ایک ایک دو دو جملوں میں حوالہ دیتے ہوئے متعجبانہ انداز کے ساتھ سوالات کی صورت میں ان کے غلط ہونے کا اظہار ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَ الطُّورِ ۱ وَ کِتَابٍ مَّسْطُورٍ ۲ فِی رَقٍّ مَّنْشُورٍ ۳ وَ الْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ۴ وَ السَّقْفِ

الْمَرْفُوعِ ۵ وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُورِ ۶ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۷ مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ ۸

”قسم ہے طور کی اور ایک لکھی ہوئی کتاب کی چمک دار ورق میں اور قسم اس گھر کی جو آباد ہے اور اس چھت کی جو بلند ہے اور اس سمندر کی جو جوش زن ہے کہ تمہارے پروردگار کا عذاب ایک ایسی واقعیت ہے جس کا ٹالنے والا کوئی نہیں۔“

طور کے اصل معنی پہاڑ کے ہیں، اس لیے پہلے جو کئی جگہ آیا ہے کہ بنی اسرائیل کے اوپر پہاڑ کو بلند کیا۔ وہاں بظاہر خاص وہ کوہ طور نہیں ہے مگر عام طور پر لفظ طور سے ذہن اسی حضرت موسیٰؑ والے خاص پہاڑ کی طرف جاتا ہے جسے طور سینا اور قرآن میں ایک جگہ ”طور سینین“ کہا گیا ہے یہاں قسم میں الف لام عہد کے ساتھ جو فرد خاص کی طرف اشارہ ہے کے لیے ہوتا ہے۔ اشارہ اسی کی طرف ہو سکتا ہے۔ رق کے معنی لغت کے لحاظ سے وہ کھال ہے جس پر اس وقت لکھا جاتا تھا، جب کہ کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا تو کھال ہی کے باریک سے باریک ورق بنائے جاتے تھے جس کی بنا پر بعض تعویذوں کے ساتھ دعاؤں کی کتابوں میں ہوتا ہے کہ پوست آہو پر لکھا جائے اور اس کے معنی اصل ”چمک دمک“ بھی داخل ہے اسلئے بعض اہل لغت نے اس کے معنی میں کھال کا نام خصوصیت کے ساتھ نہیں لیا ہے۔ اب چونکہ طور کے ساتھ اس

کتاب کا ذکر ہے لہذا ذہن میں یہ آتا ہے کہ جس کتاب کی قسم کھائی گئی ہے۔ وہ تو ریت ہے جس پر دوسرے مقامات پر کتاب کا اطلاق قرآن میں ہوا بھی ہے اور وہ اُتری بھی تھی لیکن تحریر کی شکل میں قرآن کی طرح نہیں، جو غیر مکتوبی صورت میں اترتا تھا اور بعد کو قید کتابت میں آتا تھا۔

لیکن دوسرا قول اس جملے کی تشریح میں یہ بھی ہے کہ اس سے قرآن مراد ہے اور تیسرا یہ کہ اس سے لوح محفوظ مراد ہے۔ کلام معصوم کوئی جو فیصلہ کن ہو، موجود نہیں ہے مگر جو قرینہ لفظی کی بنا پر قابل ترجیح ہو سکتا ہے وہ پہلا ہی تصور ہے۔ ہاں ایک بات ذہن میں یہ آتی ہے کہ چونکہ مخاطب مشرکین مکہ ہیں جنہیں علم اور کتابت قلم سے مانوس بنانا بھی قرآن کی ایک مہم تھی جو سورہ اقرء سے ظاہر ہے تو مقام قسم میں بھی مطلق کتاب ان دل بھانے والے تعبیری خصوصیات کے ساتھ بھی مراد ہو سکتی ہے۔

بیت معمور کے بارے میں حدیثوں میں یہ ہے کہ وہ عالم بالا میں کئی ملائکہ کے لیے اسی طرح مرکز طواف ہے جس طرح کعبہ انسانوں کے لیے زمین پر ہے۔ اس میں روایتیں مختلف ہیں کہ وہ آسمان اول پر ہے یا چوتھے آسمان پر یا ساتویں آسمان پر۔ ان روایات کو ملاحظہ فیض نے تفسیر صافی میں درج کیا ہے۔ جامع البیان طبری میں بھی قدیم روایات درج ہیں وہ بس اسی محور پر گردش کرتے ہیں جن میں پیغمبر اکرم ﷺ اور حضرت علیؑ کے ارشادات بھی ہیں اور ان میں ہے کہ یہ کعبہ کی بالکل محاذات میں ہے اور اس کا نام ”ضراح“ ہے۔

”بلند کی ہوئی چھت“ کے تو بہت نمایاں معنی آسمان ہی کے ہیں اور دریا ظاہر میں کوئی مخصوص نہیں ہے، اس سے جس مراد ہو سکتی ہے اور سمندر میں نمایاں طور پر نظروں کو جوش کھانے کی کیفیت تو محسوس ہوتی ہی ہے۔ مگر چونکہ اسکی صفت یہاں مسجور آئی ہے اور یہ لفظ زیادہ تر تور کو ابندھن سے پُر کرنے کے معنی میں آتی ہے اور اس لیے قرآن مجید میں دوزخ میں ڈالے جانے کے لیے آیا ہے ”ثہر فی النار یسجرون“ جس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ پھر آگ میں وہ ابندھن کے طور پر ڈال دیے جائیں گے اور نبج البلاغہ بجز کالفظ آگ کے بھڑکانے کے معنی میں آیا ہے۔ امیر المومنینؑ اپنے خطبے میں فرماتے ہیں:-

”فتجبرنی الی النار سجرا جبارها لغضبه“

اور تو مجھے کھینچ کر ڈالے گا اس آگ کی طرف جسے جبار وقہار نے اپنے غضب کے لیے بھڑکایا ہے۔

اب یہاں یہ مسجور صفت سمندر کے لیے آئی ہے جو آگ سے نہیں، پانی سے بھرا ہوتا ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دریا سے مراد وہ و سمندر ہے جو مرکز زمین میں ہے جس کے لیے بتایا جاتا ہے کہ اس کے نیچے مشتعل ہونے والے گھلے ہوئے مواد ایسے ہیں کہ وہ گرمی سے جوش کھاتا ہے۔ جہاں تک ہم دیکھتے ہیں قسمیں کثرت کے ساتھ کئی سوروں میں ہے۔ مدنی سوروں میں نہیں ہے اس لیے کہ مدینہ میں تو زیادہ تر وہ جماعت مخاطب تھی جو آپ کی رسالت کو مان چکی تھی لہذا ان کے لیے آپ کا کہنا اور بتانا کافی تھا لیکن مکہ میں مخاطب مشرکین کی جماعت تھی جنہوں نے آپ کی رسالت کو نہیں مانا تھا لہذا صرف آپ کے کہنے سے خبروں کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے ان سے باتیں اتنی شدت کے ساتھ قسمیں کھا کھا کر کہی گئی ہیں جس پس پشت قبل کے چالیس برس کا ان کا یہ مشاہدہ اور ان کا یہ اعتراف بھی تھا کہ یہ شخص سچا ہے۔ اب یہ سچا جب ایک بات کو اتنی قسمیں کھا کھا کر سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہے تو اسی وقت اور پھر اس سے زیادہ فرصت کے لمحات میں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ یہ خبریں غلط نہ ہو سکتیں۔ پھر اتنی مسلسل قسمیں بتقا ضائے بلاغت ان کی توجہ مبذول کرنے کے لیے ہیں کہ ایک دم جو کہنا ہے وہ کہا جاتا تو رواداری میں نذر تغافل ہو جاتا اور جب اس فصاحت کے ساتھ جو نقطہ اعجاز پر ہے اتنی قسمیں ان کے سامنے آرہی ہیں تو وہ متوجہ ہو کر سنیں گے کہ

اس کے بعد کیا کہا جاتا ہے؟

اب یہاں ان قسموں کے ساتھ جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عذاب کی خبریں سن کر مذاق نہ اڑاؤ، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو وقوع میں لازمی طور پر آنے والی ہے اور اس کا ٹالنے والا کوئی نہیں ہے۔

**يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۙ وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۙ فَوَيْلٌ لِلْمُكَدِّبِينَ ۝۱۱**  
 ”جس دن آسمان پورے طور پر حرکت میں آجائے گا اور پہاڑی پوری طرح رواں رواں ہوں گے تو وائے ہو اس دن کو جھٹلانے والے پر جو بڑی ہی (غلط قسم کی) سرگرمی میں تفریح محسوس کرتے ہیں۔“

قیامت کے حشر و نشر سے پہلے جو موجودہ نظام کائنات کی ابتدی اور آخری فنکشن کا تذکرہ قرآن میں متعدد آیتوں میں ہوا ہے ان میں یکے بعد دیگرے رونما ہونے والے مختلف حالات جستہ جستہ بیان ہوئے ہیں، کہیں آسمان کے شق ہونے کا ذکر ہے، کہیں پہاڑوں کے سرمہ ہوجانے کا، کہیں روٹی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑنے پھرنے کا ذکر ہے۔ یہاں میرے خیال میں ابتدائی درجہ کا بیان ہے جب ابھی ان کی جسمانی کیفیت پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ صرف ان کی حرکت کی مقدار میں شدت اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی ہے ہاں پہاڑوں کے رواں دواں ہونے میں یہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ وہ حرکت نہیں ہے جو زمین کے ساتھ ساتھ ہے، جس کے لیے ایک جگہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے

وَتَسِرُ الْجِبَالُ تَحْسَبُهَا جَامِدًا وَهِيَ مَمْرٌ مَّوَّ السَّحَابِ. (نمل - ۸۸)

اور پہاڑوں کو تم دیکھتے ہو تو انہیں ایک جگہ منجمد سمجھتے ہو حالانکہ وہ اس طرح رواں ہیں جیسے بادل رواں ہوتے ہیں،

بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ زمین سے اکھڑ کر بذات خود رواں دواں ہوں گے۔ یہ ایک طرح کا انتشار ہے جس کی شدت کا اظہار دوسری جگہ ”كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ“ دھکی ہوئی روٹی، روٹی کی لفظوں میں کیا گیا ہے اور پھر اس سے زیادہ انتشار کی کیفیت کو ایک مقام پر ”هَبَاءٌ مَنْبِثًا“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی جب وہ بے حقیقت ذرات کی طرح ہوں گے جو کسی روشن دان وغیرہ سے فضا میں بکھرے نظر آتے ہیں [۱] دنیا اسی نظام کی تباہی کو اصل قیامت سمجھتی ہے، اس لیے قیامت کی پیش گوئیاں یوں ہوا کرتی ہیں کہ آفتاب کی گرمی کم ہو رہی ہے لہذا قیامت آنے والی ہے یا کچھ ستارے ایک دوسرے کے قریب ہو رہے ہیں، بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے قیامت آجائے گی۔ حالانکہ قیامت نام صرف اس تباہی و بربادی کا نہیں ہے بلکہ اس کے بعد جو تعمیر جدید ہوگی اس کا نام ہے۔

وہ تباہی و بربادی تو پیش خیمہ ہوگی، اس نئی تخلیق کا قیامت کا نام ہی قیامت قیام یعنی اٹھ کھڑے ہونے پر ہے جس کا تعلق حیات بعد الموت سے ہے جس کے لیے قرآن مجید نے کہا ہے:-

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (المطففين - ۶) ”جس دن سب لوگ پروردگار عالم کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔“

مگر چونکہ وہ تباہی و بربادی اس کی تمہید ہوگی اس لیے قرآن مجید نے بھی اکثر ان تباہیوں کا ذکر کر کے بعد والی منزل کو یاد دلایا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس کے بعد کہا ہے کہ وائے ہو اس دن کو جھٹلانے والوں کے لیے یعنی ان کی اصل شامت اعمال اس دن سامنے آئے گی جو حساب و کتاب کی منزل ہے اور اس کے بعد داخلہ دوزخ۔

[۱] تسير الجبال عن اماكنها من الارض ثمير اقتصير هباء منبثا (ابن جرير)

خوض کے اصل معنی تو دریا وغیرہ میں اترنے کے ہیں [۱۳] اسی کی ہم معنی لفظ غور ہے جو ہماری اردو میں اس کے ساتھ مثل تابع مہمل کے آتی ہے یعنی غور و خوض۔ اور عربی میں کسی کام یا گفتگو میں بہت انہماک کے ساتھ مصروف ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور قرآن میں اکثر مذموم باتوں میں سرگرمی کے ساتھ لگے رہنے کے معنی میں آئی ہے چنانچہ یہاں بھی کہا جا رہا ہے کہ جن باتوں میں کھیل اور تفریح سمجھ کر وہ انہماک کے ساتھ لگے ہوئے تھے وہ قیامت میں ان کی ہلاکت ابدی کا موجب یا باعث ہو رہی ہیں۔

يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ نَارٍ جَهَنَّمَ دَعَاً ۗ هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكذَّبُونَ ﴿۱۳﴾  
 اَفْسَحْرُ هَذَا اَمْ اَنْتُمْ لَا تَبْصِرُونَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاَصْبِرُوا اَوْ لَا تَصْبِرُوا ۗ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾

”جس دن وہ دھکیلے جائیں گے دوزخ والی آگ کی طرف شدت کے ساتھ۔ یہ وہ آگ ہے جسے تم جھٹلاتے تھے۔ کیا یہ جادو ہے یا تمہیں دکھلائی نہیں دیتا؟ اس میں جلتے رہو۔ اب تم ضبط کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے یکساں ہے، بس وہی تو تمہیں سزا مل رہی ہے جو تمہارے اعمال ہوا کرتے تھے،۔“

اہل لغت نے ’صلی‘ کے معنی ملازمت یعنی لگے رہنے کے لکھ دیے ہیں مگر موارد استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ اس لفظ کا استعمال آگ کے ساتھ ہوتا ہے تو لگے رہنے کی خصوصیت برقرار نہیں رہتی۔ اس لیے تاپنے کی بھی تعبیر اس لفظ سے کرتے ہیں بہر حال ہم نے اپنے ترجمے میں اس لغوی مفہوم کو بھی مد نظر رکھا ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِي جَنَّتٍ وَنَعِيْمٍ ﴿۱۷﴾ فَكَيْهَيْنِ بِمَا آتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۗ وَوَقَّهُمْ رَبُّهُمْ  
 عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾ كُلُّوا وَاشْرَبُوا هَنِيْئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾ مُتَّكِيْنَ عَلٰى  
 سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۗ وَزَوْجُهُمْ يُحْوَرُّوْنَ عَلَيْهِنَ ﴿۲۰﴾

”یقیناً پرہیزگار لوگ باغھائے بہشت میں ہیں اور آرام میں لطف اندوز ہوتے ہوئے اس سے جو انہیں ان کے پروردگار نے دیا ہے اور بچایا ہے انہیں ان کے پروردگار نے دوزخ کے عذاب سے کھاؤ اور پیو۔ مبارک تمہیں ان اعمال کی بدولت جو تم کرتے تھے گاؤ تکیے سے لگے ہوئے ان تختوں پر جو ترتیب کے ساتھ بچھے ہوئے ہوں گے اور ہم نے شادی کی ہوگی بڑی آنکھوں والی حوروں کے ساتھ۔“

’فا کھین کا ترجمہ لطف اندوز ہوتے ہوئے‘ ایک تشریح کی بنا پر ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ لفظ فاکھتہ سے ہے فاکہرہ وہ شخص ہے جس کے پاس فواکھات یعنی میوے بہت سے ہوں [۲] ہنیعاً کا لفظ عرب روزمرہ میں متداول ہے چنانچہ جب کوئی پانی پیتا ہے تو دوسرا

[۱] - الدخول في الماء بالقدم (تبیان)

[۲] - عندهم فاکھتہ کثیر ؕ وذا لک نظیر قول لعرب للرجل یكون عنده کثیر رجل تامر (ابن جریر)

کہتا ہے ہنیداً وعافیة۔ اس کے معنی میں دعائے خوش گواری مضمحل ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ چار مقام پر آئی ہے، چونکہ اس کی قائم مقام کوئی لفظ اردو محاورے کا جزو نہیں ہے، اس لیے اس کا ترجمہ دشوار ہے ”مبارک ہو“ کے ساتھ ترجمہ مجبوری کا نتیجہ ہے۔

**وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا**

**أَلْتَنَّهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ط كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾**

”اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ان کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ ہم نے ان کی اولاد کو ان سے ملا دیا اور ان کے اعمال میں کچھ بھی کمی نہیں کی۔ ہر آدمی اپنے اعمال کے ساتھ گروہوں میں ہے۔“

اس آیت میں ایک تصور یہ ہے کہ یہ آیت صاحبان ایمان کے بچوں کے بارے میں ہے جو نابالغ ہیں کہ یہ بچے مؤمنین کے حسن عمل کی وجہ سے ان کے درجے میں ان کے پاس پہنچا دیے جائیں گے مگر قرآن مجید کے یہ الفاظ کہ ان کی اولاد نے ان کی پیروی کی، یہ بتلاتے ہیں کہ وہ کمسن اور نابالغ بچے نہیں ہیں بلکہ بالغ اور عاقل اور ذمہ دار افراد ہیں جن کے ایمان کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے باپ کی پیروی کی یا نہیں۔ اس عقلی پہلو کا تحفظ کرتے ہوئے یوں تشریح کی گئی کہ وہ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے جو بالغ ہے، ایمان و عمل میں ان کے ساتھ دیا تو اب وہ بچے بھی جو نابالغ ہی میں دنیا سے اٹھ گئے ان سے ملا دئے جائیں گے [۱]

اس صورت میں لفظ ذریت میں یہ تفریق کہ پہلی ذریت اور ہے جو بالغ ہے اور دوسری ذریت وہ جو نابالغ ہے۔ یہ الفاظ آیت سے ذہن میں نہیں آتی۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ سلجھا ہوا جو مفہوم ہے۔ وہ یہ ہے کہ اولاد ایمان اور عمل صالح میں ان بزرگوں کے پیچھے تو رہیں مگر مراتب عمل کے لحاظ سے یہ بالکل اس نقطے پر نہیں ہے۔ اس میں کمزوری پائی جاتی ہے باپ کے حسن عمل کی وجہ سے ان کی کمزوری کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور انہیں اسی درجے پر پہنچا دیا جائے گا جو ان کے باپ کا ہے۔ طبری نے جامع البیان میں اگرچہ پہلے مفہوم کو بھی ایک طریقے سے ابن عباسؓ کی زبانی نقل کیا ہے مگر زیادہ طرق سے جناب ابن عباسؓ سے یہی دوسرا مفہوم وارد ہے اور خود طبری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے علماء نے جناب ابن عباس سے اس کو نقل کیا ہے [۲] اور اس کے مطابق حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ اہل بیت کی روایتیں بھی درج ہیں۔

مَا التنا کے لفظ کا مادہ الت ہے جس کے معنی کم کرنے کے ہیں۔ ایک جگہ قرآن مجید میں ہے: **وَإِنْ تَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا**۔ (حجرات - ۱۳) اگر تم اللہ اور رسول کی پیروی کرو گے تو وہ تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہ کرے گا۔

یہاں ما التنا ماضی منفی ہے۔ سابق جملے کے ساتھ اس کا ربط یہ ہے کہ ہم نے ان کے اعمال میں کچھ کمی نہیں کی ہوگی، یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اولاد ان کے بزرگوں کے ساتھ ملحق کیا جانا ہے ان بزرگوں کے حسن عمل کے حق بجانب صلے کا ایک جز ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو ان کے عمل کی جزا میں ایک طرح کی کمی ہو جاتی اور پھر اسی کے ساتھ مرتبط ہے کہ ہر انسان جو کچھ اس نے کیا ہے اس کے ساتھ گروہ ہے جس طرح جو شے رہن ہے محفوظ رہتی ہے جب تک کہ وہ رقم نہ ملے۔ اسی طرح ہر انسان کے اعمال خدا کے یہاں محفوظ رہتے ہیں کہ ان کا مناسب صلہ اسے مل جائے۔

[۱] - يقول الذين ادرك ذريتهم الايمان فعملوا بطاعتي الحقهم بايمانهم في الجنة اولادهم الصغار تلحقهم به (ابن جرير)

[۲] - عن ابن عباس ان التابعين الحقو بدرجة اباؤهم وان قصرت اعمالهم تكرمهم لا بائهم (تبيان)

ایک دوسری تشریح یہ ہوئی کہ اولاد کو جو ان کے ساتھ ملحق کیا جائے گا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ باپ کی جزا میں کچھ کمی کر کے اولاد کو ملحق کیا جائے گا۔ نہیں ان بزرگوں کی جو جزا تھی وہ پوری پوری ان کو ملے گی اور پھر مزید فضل و کرم یہ ہے کہ یہ اولاد ان کے ساتھ پہنچادی جائے گی۔

وَأَمَدَ دَنَّهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَحَمِيمٍ ۝۲۱ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا لَعْوَفُ فِيهَا

وَلَا تَأْتِيهِمْ ۝۲۲ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لَوْلُوهُمْ مَكْنُونٌ ۝۲۳

”اور ہم نے انہیں مدد پہنچائی پھلوں سے اور گوشت کے ساتھ جس طرح کی انہیں خواہش ہو، اس میں ایک دوسرے سے لے رہے ہوں گے ایسی شراب سے بھرے ہوئے شاعر جن میں نہ بیہودہ قسم کی کوئی بات ہے نہ گناہگار ٹھہرانے کی اور ان کے پاس چکر لگا رہے ہوں گے ایسے نوجوان خدمت گار جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی ہوں۔“

### نعمات بہشت کے اوصاف

چونکہ اس کے پہلے ان صاحبان ایمان کا ذکر ہے جن کے ساتھ ان کی اولاد ملحق کی گئی اس لیے اس ضمیر کو بھی انہی سے متعلق قرار دیا گیا ہے [۱] لیکن چونکہ عموماً ترتیب کا مطابق منزل ہونا یقینی نہیں ہے لہذا تناسب الفاظ سے ذہن میں یہ آتا ہے کہ قبل میں جو متقین کے لیے سلسلہ کلام تھا، جس کا آخری جملہ یہ تھا: ﴿زَوْجُهُمْ مُّخَوَّرٌ عَلَيْهِمْ﴾ اس پر یہ عطف ہو کہ شادی کی حوروں کے ساتھ اور انہیں مدد پہنچائی۔

مدد کے اصل معنی تو اضافے کے ہوتے ہیں، چونکہ جو مدد بھی پہنچائی جائے اس سے قوت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے کسی طرح کی بھی تقویت کو خواہ غذا سے ہو اور خواہ فوج و لشکر سے ہو مدد کہا جاتا ہے یہاں نعمات جنت کی عطا کو جو افزائش کے ساتھ ہے، اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اب اضافے کے لفظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض نے اس میں پے درپے کا مفہوم محسوس کیا ہے [۲] نزع کے معنی سلب کرنے اور اکھاڑنے کے ہیں، جب اسے باب تفاعل میں لے گئے تو تنازع کا لفظ ہوا جس سے اردو میں بھی ’نزع‘ کا لفظ ہے اور اکثر عوام ’تنازع‘، غلطی سے ’ز‘ پر زبر کے ساتھ کہہ دیتے ہیں جس میں باہمی کشاکش بطور مخالفت ہوتی ہے۔ اور اس لیے قرآن میں اس کا بطور مذمت ذکر ہوا ہے اور ممانعت کی گئی ہے کہ:

لَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا ۝۱ آپس میں نزاع نہ کرو ورنہ تم میں کمزوری پیدا ہوگی (انفال - ۳۶)

بہشت میں ناگواری کا گز نہیں اس لیے وہاں ساغر کی گردش کو جو ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کی طرف خوش دلی کے ساتھ منتقل ہوتا ہے، اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لغو کے ساتھ تاشیم کا لفظ ایک اور جگہ قرآن مجید سورہ واقعہ آیت نمبر ۲۵ میں بہشت کے وصف میں: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيهَا۔ چونکہ اثم کے معنی گناہ کے ہیں لہذا تاشیم کے معنی گناہ گار ٹھہراتے ہوئے جو ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ اب مطلب اس کا یہ ہوا کہ وہ شراب ایسی ہے کہ اُسے پی کر انسان گناہ گار ٹھہرایا نہیں جاسکتا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اسے پی کر رندوں میں کوئی جھگڑا کھڑا نہیں ہوتا جس میں ایک دوسرے کو گناہ گار ٹھہرائے۔ جتنے کھانے پینے کے اشیاء کے نام نعمات جنت کے ذیل میں قرآن میں لیے گئے ہیں، سب ذہن کو منتقل کرنے کے لئے اُن اشیاء کی طرف جو دنیا میں انسانی خواہشوں کا مرکز ہیں مگر یہاں اُن میں منافع کے ساتھ مفسد اور اچھائی کے ساتھ

[۱] - امددناھو لاء اللذین ورسولہم واتبعتم ذریعتہم بایمان (ابن جریر)

[۲] - پے درپے کنیم (شاہ ولی اللہ)

برائی کے پہلو بھی ہیں، نعمات جنت ان برائیوں سے خالی ہیں۔

جو چیز دنیا میں حرام ہے جیسے شراب، وہ اس برائی کی بنا پر ہے جو اس میں پائی جاتی ہے، جنت والی شراب چونکہ اس برائی سے پاک ہے لہذا نہ اس کا پینا گناہ ٹھہرایا جاسکتا ہے نہ اس کے سبب سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو گناہگار قرار دے۔ بہشت کی ہر شے چونکہ نقائص دنیوی سے پاک ہے لہذا حوریں ہیں تو پاک و پاکیزہ اور نوکر چاکر کے طور پر جو جو ان کام کر رہے ہیں انہیں یہاں اور دوسرے مقامات پر ان کے حسن و جمال کو نمایاں کرتے ہوئے موتیوں سے تشبیہ دی ہے اور وہ بھی وہ نہیں جو استعمال میں رہیں کہ میلے ہو جائیں بلکہ جو کسی غلاف یا ڈبیا میں محفوظ ہوں اور بعض نے صدف کے اندر ہونے کے ساتھ تشریح کی ہے [۱] کہ وہ بالکل ہی تروتازہ ہوں گے۔ اور سورہ دہر میں ان کے چاروں طرف پھرنے کے منظر کی بنا پر انہیں لؤلؤ منثوراً [۲] بکھرے ہوئے موتی، کہا گیا ہے اور سورہ واقعہ میں ان کے ہمیشہ بہار ہونے کے وصف کی بنا پر وَلَدَانٌ مُّخَلَّدُونَ، ہمیشہ کی زندگی رکھنے والے لڑکے، کہا گیا ہے۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلَ فِي أَهْلِنَا  
مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَدْنَا عَذَابَ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ  
نَدْعُوهُ ۗ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿٢٨﴾

”اور ان میں سے ایک نے دوسرے کی طرف رخ کیا، آپس میں سوال و جواب کرتے رہے، کہنے لگے کہ ہم پہلے ہی سے اپنے گھر بار میں ڈرتے رہتے تھے تو اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچایا، یقیناً ہم پہلے سے اسے پکارا کرتے تھے، یقیناً وہ اچھا ہی اچھا کرنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

مضمون گفتگو میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ حساب کتاب کے بعد کی منزل ہے، جب فیصلہ الہی نمایاں ہو گیا اور انہیں بہشت میں جگہ مل گئی تو آپس میں وہ یہ بات چیت کرنے لگے جو اس وقت بالکل باطل ہے مگر جناب ابن عباسؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ وہ اس وقت کا ذکر ہے جب وہ قبروں سے برآمد ہوں گے [۳] مگر ابھی جب پورا نتیجہ سامنے نہیں آیا تو اس خوف کو تو اب تک قائم رہنا چاہیے۔ اس لیے اس گفتگو کا اس وقت محل معلوم نہیں ہوتا۔ سموم کے معنی چونکہ گرم ہوا کے ہوتے ہیں اس لیے اردو محاورے میں دو وقتا عذاب السموم کا ترجمہ زہریلی کیا گیا ہے ”وہ دوزخ کی بھاپ بھی نہ لگی“ (موضح القرآن) مگر دوسرا تصور یہ ہے کہ سموم بھی دوزخ کا ایک نام ہے [۴] ہم نے ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے۔

فَذَكِّرْ فَمَا أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مُجْنُونٍ ﴿٢٩﴾

”تو یاد دہانی کرتے رہیے کہ آپ اپنے پروردگار کے فضل و کرم سے نہ کاہن ہیں اور نہ دیوانہ“

[۱] مصون فی الصدف لانہ فیہا احسن منہ فی غیرہا (جلالین)

[۲] عن ابن عباس: اذا بعثوا فی النفقۃ والثانیۃ (ابن جریر)

[۳] السموم من اسماء جہنم عن الحسن (مجمع البیان)

## پیغمبر خدا ﷺ کو تسلی

مشرکین حضرت کی ہدایت کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے کبھی کاہن کہہ دیتے تھے کہ وہ لوگ بھی ایک طرح کی عیب کی کچھ خبریں غلط یا صحیح سناتے تھے مفی اور مسیح عبارتوں میں اور کبھی دیوانہ کہہ کے ٹالتے تھے کہ ان کی باتیں توجہ کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے ان دونوں باتوں کی نفی کر کے کہا گیا ہے کہ آپ یاد ہانی کرتے رہیے، یعنی ان کی باتوں کی پرواہ نہ کیجیے۔

ہمارے نزدیک تو بس یہی پہلو نکلتا ہے، طبری نے اس کے علاوہ یہ مفہوم نکالا ہے کہ چونکہ یہ باتیں نہیں ہیں بلکہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں لہذا اطمینان رکھیے کہ خدا آپ کی مدد کرے گا [۱] کاہن، کسے کہتے ہیں؟ اس میں ذرا اختلاف ہے، بعض نے یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ گزشتہ خبریں سناتے تھے، اس لیے بعض واقعات بتاتے ہیں کہ نسب کی تحقیق کے لیے رجوع ہوتی تھی کہ یہ فلاں شخص کا بیٹا ہے یا نہیں؟ اور بعض نے گزشتہ اور آئندہ کی تفریق کے بغیر کہا ہے کہ وہ کسی موکل کی مدد سے جو اقبال جنات وغیرہ ہوتا تھا غیب کی خبریں سناتے تھے۔ جناب شیخ مرتضیٰ انصاری نے علامہ حلّی کے قواعد کے حوالے سے بطور اپنے مختار کے کاہن کی یہ تعریف لکھی ہے کہ وہ کسی جن کے ذریعے سے جسے اپنا مددگار بنا لیتا ہے، غیب کی خبریں حاصل کرتا ہے اور سناتا ہے۔ بعض آیات قرآنی سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کہانت کا تعلق جنات کے ساتھ ربط قائم کرنے سے تھا۔

## أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ تَتَّبِصُّ بِهِ رَيْبَ الْمُنُونِ ﴿٣٠﴾ قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَرِبِينَ ﴿٣١﴾

”کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے، یہی انتظار ہے اس کے لیے کہ وہ موت کے حادثہ کا شکار ہو جائے، کیسے کہ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں“

یعنی تم میرے لیے جس روز بد کے لیے منتظر ہو، وہ تمہاری امیدوں کے مطابق تمہیں دیکھنا نصیب نہیں ہوگا اور میں عذاب الہی سے تمہارے خاتمے کا منتظر ہوں جو عنقریب تمہارے سامنے آئے گا چنانچہ وہ مشرکین اس کے بعد جنگ بدر وغیرہ میں پیغمبر اسلام ﷺ سے مقابلہ کر کے ہلاک ہوئے۔

## أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُمْ بِهَذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ﴿٣٢﴾

”کیا (سچ مچ) ان کی عقول کا تقاضا ان سے یہ ہے یا وہ بے حد سرکش لوگ ہیں“۔

مطلب یہ ہے کہ درحقیقت وہ بھی اپنی عقل سے کام لیں تو یہ باتیں نہ کہیں مگر وہ تعصب میں اندھے ہو رہے ہیں، خود اپنے عقل و ضمیر کے تقاضوں کے خلاف باتیں کہتے ہیں، یہ سب سے بڑی ان کی حد سے گزری ہوئی سرکشی ہے۔ ایک معنی احلام کے ”خواب ہائے پریشان“ کے لئے گئے ہیں اس طرح ان کے غلط خیالات کو خواب ہائے پریشان سے تعبیر کیا گیا ہے [۲] اس صورت میں مطلب ہوگا کہ وہ جو باتیں کہتے ہیں، کیا اس کا سبب ان کے جھوٹے خواب ہیں۔ جو یہ باتیں کہتے ہیں یا بلاوجہ سرکشی سے کام لیتے ہیں؟

[۱] لَكِنَّكَ رَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَخْذُلُكَ لَكِنَّهُ يَنْصُرُكَ (ابن جریر)

[۲] گویا منظور خیالات است زیر خواب ہائے پریشان نذیبک نوع خیال اند (قاموس قرآن)



میرے نزدیک یہ معنی اس محل پر بعید ہیں۔

أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ ۗ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِنْ كَانُوا

صَادِقِينَ ﴿٣٣﴾

”یا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اسے گڑھ لیا ہے؟ بلکہ وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو پھر وہ ایسا ہی کلام لے آئیں، اگر وہ سچے ہیں“

## قرآن کا مثل لانے کی دعوت

اسے گڑھ لیا ہے، یعنی قرآن کو یہ ویسی ہی تھری یعنی دعوائے بے مثالی اور جواب لانے کی دعوت کے مطالبہ کی آیت ہے جیسی قرآن مجید میں پورے قرآن اور اس کے دس (۱۰) سوروں اور آخر میں ایک سورے کے جواب کا مطالبہ برابر ہوتا رہا اور دنیا اس کے جواب سے قاصر رہی۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ﴿٣٤﴾ أَمْ خَلَقُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ ۗ

بَلْ لَا يُؤْقِنُونَ ﴿٣٤﴾

”کیا وہ خود بخود پیدا ہوئے ہیں یا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ یا انہوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے“۔

من غیر شیء کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ بغیر کسی چیز کے مگر بظاہر مطلب اس کا یہ ہے کہ ”بغیر کسی مبداء کے“ اس لیے ہم نے ترجمہ کیا ”خود بخود“۔ بعض لوگوں نے اس کی تشریح میں کہا ہے ”بغیر کسی ماں باپ کے“ [۱] مگر نہ وہ ”ماں باپ“ منکر تھے نہ قرآن کی کوئی مہم ہے کہ وہ ماں باپ کے وجود کا اقرار کرائے، جس چیز کے وہ منکر ہو سکتے ہیں اور جو قرآن میں ایمان کی پہلی بنیاد ہے، وہ مبداء اول کا اقرار ہے کہ کوئی ان کا پیدا کرنے والا ہے لہذا ضمیر کو بیدار کرنے والے انداز میں یہاں جو سوال ہے وہ اسی سے متعلق ہے اسی سے دوسرے جز کا جوڑ ہے کہ ”وہ خود بخود پیدا ہوئے ہیں“ یعنی کوئی ان کا خالق ہے ہی نہیں یا وہ خود اپنے خالق ہیں؟ عقلی حیثیت سے دونوں ہی باطل ہیں۔

بعض نے من غیر شیء کے معنی قرار دیے ہیں ”بغیر کسی وجہ کے“ یعنی بے کار اور عبث اسے جناب شیخ طوسی نے نقل کیا ہے اور علامہ طبرسی کا مختار یہی معلوم ہوتا ہے [۲] مجھے اس مناسبت دوسرے جملوں سے اتنی محسوس نہیں ہوتی جتنی پہلے والے مفہوم کی۔ سب سے آخر جملہ بَلْ لَا يُؤْقِنُونَ کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں ان کے دل و دماغ کو تو کسی پیدا کرنے والے کے وجود کا یقین ہے مگر وہ بطور فعل ارادی کے یقین نہیں کرتے یعنی جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں جسے ”کفر جمود“ کہتے ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ غور فکر اور تحقیق و تفتیش نہیں کرتے تاکہ

[۱] ای من غیر اباء ولا امهات (ابن جریر)

[۲] لغیر شیء ای خلقوا باطلا بچاسیون والایو منون ولا ینہون (مجمع البیان)

انہیں یقین حاصل ہو تو چونکہ یقین کی کیفیت پیدا ہونے میں ان کی ارادی کوتاہی کا دخل ہے، اس لیے وہ مورد الزام اور مستحق سزا ہیں۔

### أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُضْطَرُونَ ﴿٣٤﴾

”یا ان کے پاس آپ کے پروردگار کے خزانے ہیں یا یہی پورے اقتدار کے مالک ہیں۔“

اللہ مرکز امید بھی ہے اور مرکز خوف بھی ہے۔ یہ کفار اللہ سے بالکل بے نیاز بنے ہوئے ہیں۔ نہ یہ اس سے کوئی آسرا وابستہ کرتے ہیں، نہ اس سے کوئی دھڑکا محسوس کرتے ہیں، اس لیے ان میں کوئی تحریک اس کی طرف رجوع کی پیدا نہیں ہوتی۔ تو بظاہر انہی دونوں محرکات کے مقابلے میں یہ دونوں جملے ہیں یعنی تمام اسباب اور آرام اور آسائش کے وسائل ان کے پاس ہیں لہذا وہ اللہ کے کسی بات میں محتاج نہیں۔ اس لیے وہ اسے اپنے لیے مرکز امید نہیں بناتے یا کیا وہ پورے اقتدار کے مالک ہیں۔ اس لیے اس کے غضب سے ان کو کوئی خوف معلوم نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ دونوں باتیں غلط ہے لہذا ان کی یہ بے نیازی اور بے خوفی دونوں خلاف عقل ہیں۔

### أَمْ لَهُمْ سُلْمٌ يَسْتَبِعُونَ فِيهِ ۖ فَلْيَأْتِ مُسْتَبِعُهُمْ بِسُلْطَنٍ مُّبِينٍ ﴿٣٥﴾

”کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس سے وہ (آسمانی رازوں کو) سن لیتے ہوں تو جو ان میں سے ایسا ہو، وہ کھلی ہوئی دلیل پیش کرے“

یعنی رسول تو جو دعوت دیتے ہیں، وہ آسمانی پیغام کی بنا پر اور اس کے ثبوت میں معجزات پیش کرتے ہیں۔ یہ جو انکا کرتے ہیں وہ کس بنا پر ہے؟ کیا ان میں بھی کوئی ایسا ہے جو وہاں کی باتیں جا کر سنتا ہو تو آخر ہمیں بھی بتاؤ اور اس کا ثبوت پیش کرو۔

### أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمْ الْبَنُونَ ﴿٣٦﴾

”کیا اس کے لیے مخصوص طور پر بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے مخصوص طور پر بیٹے ہیں۔“

یہ مشرکین کے اس مزعومہ کی رد ہے جس کی رد کئی طرح قرآن مجید میں آتی رہی ہے کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ پہلے آچکا ہے کہ یہ بات ہر طرح بے بنیاد ہے، اول تو انہیں کس نے بتایا کہ ملائکہ صنف اناث سے ہیں۔ پھر مطلق اولاد چاہے بیٹا ہو، اور چاہے بیٹی اللہ کی شان الوہیت کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ یہ خود اپنے لیے بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں..... تو یہ عجیب تصور ہے کہ ان کے لیے تو بیٹے پسندیدہ ہیں اور اللہ کے لیے بیٹیاں جو انہیں ناپسند ہیں۔

### أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَّغْرَمٍ مُثْقَلُونَ ﴿٣٧﴾

”یا آپ ان سے کوئی معاوضہ مانگتے ہیں تو وہ ایک بڑے مالی نقصان سے گراں بار ہیں“

یعنی انکی مخالفت اور ناگواری کا کیا سبب ہے؟ تو ایسا بھی نہیں ہے، آپ جو ان کی اصلاح و ہدایت میں جان کھپا رہے ہیں تو ان سے کسی معاوضہ کے طلب گار نہیں ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ رسول کو مشرکین کے مقابلے میں ہمیشہ یہی کہنے کی ہدایت ہوئی ہے اور آپ کا یہی قول رہا ہے کہ ہم تم سے کسی معاوضہ کے طلب گار نہیں ہیں۔ معاوضہ جو طلب کیا گیا ہے (قُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى..... شوریٰ - ۲۳) وہ ان سے جو آپ کی رسالت کو تسلیم کر کے باقرا خود مؤمنین میں داخل ہو گئے اور انہیں پھر دوسری جگہ بتایا گیا کہ وہ

معاوضہ جو میں نے تم سے مانگا ہے، اور اپنے فائدے کے لیے نہیں، تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے (مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ..... سب-۴) اور دوسری جگہ اس فائدے کی تشریح کر دی گئی کہ وہ تمہیں اللہ تک پہنچانے کا وسیلہ ہے (إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا... الفرقان - ۵۷)

### أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُمُونَ ﴿۳۱﴾

”یا خود ان کے پاس غیب کا علم ہے تو وہ اسے قلم بند کرتے ہیں؟“

کیا یہ بات ہے اس وجہ سے وہ آپ کی باتوں کو غور سے سنتے نہیں کہ انہیں ضرورت نہیں ہے؟

### أَمْ يَرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ﴿۳۲﴾ أَمْ لَهُمُ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۖ

### سُبْحٰنَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾

”یا یہ لوگ کوئی داؤ چلانا چاہتے ہیں، تو جو لوگ کافر ہیں وہ خود اپنے داؤ میں (پھنستے) ہیں۔“

”یا ان کے لیے (سچ مچ) اللہ کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ پاک ہے اللہ کی ذات اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔“

شروع سے آخر تک یہ جتنے سوالات ہیں، سب انکاری حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی ایسا بھی نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے..... یہ سب

باتیں غلط ہیں

### وَإِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿۳۴﴾

”اور اگر وہ آسمان کا ایک ٹکرا گرتے دیکھیں تو وہ کہیں گے یہ ابر ہے جو تہہ بہ تہہ کر دیا گیا ہے۔“

یعنی وہ اندیشہ ہائے عذاب سے بالکل مطمئن ہیں، یہاں تک کہ عذاب آتے ہوئے دیکھیں تو انہیں امیدوں کے سبز باغ ہی لہلہاتے نظر آئیں گے۔ جامع البیان طبری میں اس کا ربط اس آیت سے قائم کیا گیا ہے جو موجودہ ترتیب کے لحاظ سے بہت دور پر یعنی سترہویں سورے (یعنی بنی اسرائیل) میں ہے کہ مشرکین کہتے ہیں کہ اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ یہ نہ ہو جائے۔ یہ نہ ہو جائے اسی میں ہے۔

أَوْ تَسْقِطُ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمَتْ عَلَيْنَا كِسْفًا، یا جیسا کہ آپ کا خیال ہے آسمان کو ہم پر ٹکرے ٹکرے اور تَائِي بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا (اسراء-۹۲) کر کے گرا دیجیے۔ یا خدا اور فرشتوں کو گواہی میں لا کر کھڑا کیجیے۔ ایک قدیم مفسر ابن زید ہیں، انہوں نے ایک دوسری آیت یاد دلائی ہے کہ مشرکین نے کہا: فَاسْقِطْ عَلَيْنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصَّادِقِينَ (شعراء-۱۸۷) ہم پر آسمان کے کچھ ٹکرے گرا دیجیے، اگر آپ سچے ہیں۔ اس آیت میں خالق کا ارشاد ہے کہ یہ سب ہو بھی جائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے، آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی حقیقت کا انکار ہی کریں گے اور کہیں گے یہ تو ابر ہے جو تہہ بہ تہہ ہو کر گرا پڑا ہے۔

### فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ﴿۳۵﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ

### كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۳۶﴾

”تو چھوڑ دو انہیں، یہاں تک کہ سامنا ہوا نہیں، اس دن کا جس میں وہ بے حس و حرکت ہو کر گر جائیں گے، جس دن ان کی منصوبہ سازی انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گی اور نہ ان کو مدد ملے گی“  
 صعق اصل میں آسمانی دھماکے یا کڑا کے کو کہتے ہیں، گرتی ہوئی بجلی میں چونکہ یہ کڑک شدت کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے اسے بھی صاعقہ کہتے ہیں اور اس کڑک کے اثر سے غش آجائے جیسے حضرت موسیٰ کو آیا تھا تو وہاں بھی یہ لفظ صرف کی گئی ہے (فخر موسیٰ صاعقا) اور جو اس سے زیادہ درجہ کڑا کے کا ہو کہ ہلاکت ہو جائے، وہاں بھی جیسے وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ... (زمر - ۶۸)..... یہاں فیہ یصعقون میں بے حس و حرکت ہونے کا بظاہر یہی درجہ مراد ہے کہ نفخ صور سے سب بے جان ہو کر گر جائیں گے۔ وہی وہ دن ہوگا، جب ان کی منصوبہ سازی اور ترکیبیں کچھ نہ چل سکیں گی۔

### وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۷﴾

اور یقیناً ان کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ہے، اس کے پہلے بھی ایک بڑا عذاب ہے لیکن ان میں سے زیادہ جانتے نہیں۔“

قیامت کے پہلے ”کون عذاب ہے؟“ اس کے لیے ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ یہ رجعت کے دور سے متعلق ہے [۱] جو رجعت کے قائل نہیں ہیں ان کے لیے پہلی ہی نظر میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ اس سے عالم برزخ والا عذاب مراد ہے جسے ”عذاب قبر“ کہتے ہیں..... زیادہ تر قدیم تشریحات جن میں تین طرق سے جناب ابن عباسؓ کا قول نقل ہوا ہے اس کے موافق ہیں اور اسی کو طبری نے خود ترجیح دی ہے کہ عذاب کافی ہے، پہلے جو بالکل اس سے متصل ہے وہ یہی عذاب قبر ہے اور یوں اس کے علاوہ دو قول نقل کئے ہیں، ایک مجاہد کا ہے کہ اس سے بھوک مراد ہے اور دوسرا ابن زید کا ہے کہ اس سے دنیوی مصائب اموال اور اولاد کا تلف ہونا مراد ہے۔ یہ مصائب اگرچہ مومنین کو بھی پیش آتے ہیں مگر ان کے لیے وہ رحمت ہوتے ہیں کہ بسا اوقات اس سے ان کے کچھ گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے تو ان مصائب کا فائدہ ہوتا ہے اس دنیا سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں اور کبھی ان مصائب پر جو صبر وہ کرتے ہیں، وہ آخرت میں ان کے ارتقا کے درجات کا سبب ہوتا ہے۔ لیکن عذاب آخرت سے قریبی اتصال ہونے کی وجہ سے عذاب قبر ہی مرعہ معلوم ہوتا ہے۔

### وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ﴿۳۸﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ﴿۳۹﴾

”اور اپنے پروردگار کے فیصلے کے لئے ضبط و صبر سے کام لیجیے کہ آپ ہماری نگہبانی میں ہیں اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے جب کھڑے ہوں اور رات کے کچھ حصے میں اور ستاروں کے آسمان سے پٹھ پھرانے کے بعد۔“  
 ”فیصلے کے لیے ضبط و صبر سے کام لیجیے“ اس کی دوسری تعبیر انتظار ہے جس کے ساتھ راغب اصفہانی نے اس آیت کی تشریح کی ہے۔

[۱] - عذاب رجعتہ بالسیف (علی ابن ابرہیم)

حمد کے ساتھ کا جو حکم ہے اس کے لیے اہل سنت میں ایک قدیم قول عوف بن مالک کا ہے کہ جب بھی سو کر اٹھیں تو یہ وظیفہ سکھایا گیا ہے کہ کہیں: سبحانك اللهم وبحمدك -

حافظ ابن جریر طبری جو مفسر ہی نہیں بلکہ فقہ اہل سنت میں یہ درجہ رکھتے تھے کہ ابوحنیفہ، شافعی مالک اور احمد بن حنبل کی فقہوں سے آزاد ہو کر ایک مستقل فقہی مسلک رکھتے تھے، انہوں نے اس قول کو رد کیا ہے کہ اس وظیفہ کو رد کیا ہے اس وظیفہ کا پڑھنا نہ سو کر اٹھنے کے وقت وارد ہے اور نہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت اس وظیفہ کا حکم ہے اور خود اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ یہ قرآن نے اپنے انداز میں نماز پختگانہ کے اوقات بتائے ہیں اور کھڑے ہونے سے مراد دوپہر کے سونے کے بعد جسے قبولہ کہتے ہیں اٹھنا مراد ہے اور اس وقت جو تسبیح پڑھنے کا حکم ہے وہ نماز ظہر اور رات کے کچھ حصے میں یہ مغرب اور عشا ہیں اور ستاروں کے آسمان سے رخصت ہونے کے وقت، یہ نماز صبح ہے۔ اس میں ذرا سی کمی جو ہے کہ عصر کا نام نہیں آتا، وہ یوں ہی دور ہوگی کہ جیسے رات کے ایک حصے میں جو حکم ہے اس میں مغرب عشاء دونوں یعنی مغربین، انہوں نے بتائی ہے اسی طرح دوپہر کے سونے کے بعد اٹھ کر جو فقط ظہر کا نام ہے، اس کے ساتھ عصر کو بھی منضم کیا جائے جس کے معنی ہوئے ظہرین اور اس کے طرح یہ آیت بھی مثل دوسری آیت کے جن میں نماز کے اوقات کی طرف اشارہ ہے اور ہم ہر جگہ اس پہلو کو نمایاں کرتے رہے ہیں۔ پانچ نمازوں کے لیے وقت تین ہی بتا رہی ہے۔ ایک ظہرین، دوسرے مغربین اور تیسرے صبح جو فقہ ائمہ کے مطابق ہے پانچ وقت الگ الگ قرآن میں کہیں بیان نہیں کیے گئے ہیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب ان آیات کے مضمون کو فرائض پنجگانہ سے متعلق سمجھا جائے جو نفس الفاظ آیات کے لحاظ سے بعید نہیں ہے مگر ائمہ معصومین کے احادیث جنہیں طبری نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے۔ ان آیتوں کو نوافل اور بالخصوص نماز شب اور نافلہ صبح سے متعلق قرار دیتے ہیں جس کے بعد واجب نمازوں سے ان کا تعلق نہیں رہتا۔

# سُورَةُ النَّجْمِ

مکّیہ ..... ۶۲ ..... آیات

چونکہ اس سورے کا آغاز انجم (ستارے کی قسم) سے ہے، اس لیے یہی اس کا نام ہوا۔

سورۃ نجم کے خاص خاص مضامین:

۱..... پیغمبر خدا ﷺ کی عملی و قوی عصمت۔

۲..... تذکرہ بمعراج۔

۳..... دو کمان بلکہ اس سے کم۔

۴..... اس وحی کا اجمالی ذکر جس کی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔

۵..... جبرئیل کا سدرة المنتہی پر رہ جانا اور پھر واپسی میں ان سے ملاقات ہونا۔

۶..... مشرکین کے اس مزعومہ باطل کی رد کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔

۷..... عدم حجیت ظن

۸..... گناہان کبیرہ و صغیرہ میں تفریق۔

۹..... کوئی ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

۱۰..... نتائج کا انحصار سعی و کوشش پر

یہ سورہ عزائم، یعنی اس سوروں میں جن میں سجدہ واجب ہے موجودہ ترتیب قرآن کے لحاظ سے تیسرا سورہ ہے جس کی بالکل آخری آیت کی آخری لفظ پر پڑھنے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی ۲ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۳

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ یُّوحٰی ۴

”قسم ہے ستارے کی جب وہ جھکے، نہ تمہارا ساتھ (پیغمبر) گمراہ ہوا ہے اور نہ وہ بہکا، بھٹکا ہے اور وہ نفسانی خواہشوں سے بات نہیں کرتا، نہیں ہوتی وہ مگر وحی جو بھیجی جاتی ہے“

نجم کے معنی جو عام طور پر ذہن میں آتے ہیں ستارے کے ہیں اور الف لام اس پر ”عہد“ کا آنے سے جو فرد خاص کی طرف اشارہ کیے ہوئے ہوتا ہے اس سے خاص ستارہ مراد ہو سکتا ہے؟ اور عموماً کلام عرب میں النجم ستارہ ثریا کے لیے آتا ہے جو قریب صبح غروب ہوتا ہے اور اس طرح اس کا غروب طلوع صبح کی علامت ہوتا ہے، ہو سکتا ہے اس لحاظ سے اُس کی قسم کھائی گئی ہو۔

بعض نے اس کی تشریح قرآن کے ساتھ کی ہے مگر قرآن کے لیے یہ تو ہے کہ وہ نجوم یعنی رفتہ رفتہ اترا جو حقیقت واقعہ ہے لیکن اس کا نام النجم لغت کے لحاظ سے ذہن میں نہیں آتا نہ قرآن میں اس کا کسی جگہ یہ نام ملتا ہے، اس لیے طبری نے بھی پہلے ہی مفہوم کو ترجیح دی ہے [۱] جو سند متصل کے ساتھ ابن عباس سے منقول ہے۔

### پیغمبر خدا ﷺ کی عظمت عملی وقولی

”تمہارا ساتھ گمراہ نہیں ہوا ہے، اور نہ بہکا، بھٹکا ہے“ ان الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کی بات پیغمبر خدا ﷺ کے لیے کہی گئی تھی جس کی یہ رد کی جا رہی ہے،

ہمارے یہاں اس طرح کے مضمون آئے ہیں کہ حضرت پیغمبر ﷺ اپنے اہل بیت کے فضائل میں جو احادیث ارشاد فرماتے تھے تو ان کے لیے منافقین کہتے تھے کہ یہ اپنے قرابت داروں کی محبت میں (معاذ اللہ) گمراہ ہو گئے ہیں، اُس پر قرآن کے یہ آیات اترے ہیں ان روایات کو ملائسن فیض نے تفسیر صافی میں درج کیا ہے۔

”وہ خواہش نفس سے باتیں نہیں کرتے، وہ ہی کہتے ہیں جو ان پر وحی ہوتی ہے“

اس میں قرآن مجید کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ الفاظ قرآن آپ کے مطابق نطق یعنی ”بات کرنے“ سے متعلق ہیں جس میں آپ کے وہ ارشادات بھی داخل ہیں جو احادیث“ کہلاتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ قرآن وحی لفظی کے طور پر نازل ہوا ہے اور آپ کے احادیث وحی معنوی کے طور پر مرضی الہی کے مطابق ہیں اور اس طرح یہ آیت حضرت عیسیٰ کی عصمت قوی کا ثبوت ہے۔ چونکہ مکہ سورہ ہے اس لیے عام طور پر مخاطب مشرکین کو سمجھا گیا ہے لیکن اگر مخاطب مشرکین ہوتو بھی ہم تو اس کو کلام الہی ماننے ہیں لہذا یہ ارشاد کہ ”وہ گمراہ نہیں ہیں اور نہ بھٹکتے ہیں“ ہمارے نزدیک قیامت تک کے مسلمانوں کے سامنے آپ کی عصمت عملی کی خالق کی طرف سے سند ہے کہ آپ کسی قسم کی بھی عملی وقولی غلطی سے بری ہیں۔ اب کوئی مسلمان ہو کر بھی کسی وقت کسی حالت میں بھی رسول ﷺ کو یہ سمجھے کہ بہک کر یا بھٹک کر کوئی کام کر رہے ہیں تو وہ خالق کے اعلان کو جھٹلانے والا ہوگا۔ اسی طرح آپ کی کسی قول کو کسی نفسانی جذبے پر مبنی قرار دینا قرآنی اعلان سے انحراف ہوگا۔

ایک دوسرا رخ دونوں آیتوں میں باہمی ربط کا یہ ہے کہ حقیقت کے خلاف جو بات ہوتی ہے اس کے دو سبب ہوتے ہیں۔ یا نادانستہ نیز

[۱] الصواب من القول فی ذالک عندی ما قالہ مجاہد من انه عنی بالنجم فی هذا الموضع الثریا (ابن جریر)

فکر کے نشاۃ حقیقت سے اچٹنے اور رفتار قدم کے بہک کر ٹپنے کی وجہ سے یا کسی نفسانی جذبے سے مغلوب ہو کر دانستہ حقیقت کے خلاف راستے پر گفتار یا کردار سے چلنے کی وجہ سے پہلے جملے میں پہلی قسم کی کجروی کی نفی کی گئی ہے۔ اور دوسرے جملے سے دوسرے قسم کے غلطی کی نفی ہے کہ یہ نفسانی خواہش سے کلام نہیں کرتے۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اب آپ اپنی خداداد عقل اور بصیرت سے کام نہیں لیتے تھے جیسا کہ بعض لوگوں نے تو ہم کیا ہے بلکہ اس میں اس عقل بصیرت کے نتیجے کے لازمی طور پر صحیح ہونے کی توثیق اور آپ کی عصمت ذہنی کی بھی تصدیق ہے۔

**عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى ۝ ذُو مِرَّةٍ ۝ فَاسْتَوَى ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى ۝ ثُمَّ دَنَا**

**فَتَدَلَّى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى ۝ فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى ۝**

”اسے سکھایا پڑھا یا بڑی مضبوط طاقتوں والے صاحب قدرت نے، تو ٹھہرے وہ اور وہ اطراف آسمان کے بلند ترین نقطے پر، پھر زیادہ قریب ہوئے اور زیادہ قریب ہوئے تو وہ تھے دو کمان یا اس سے کمتر کے فاصلے پر یا اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کر دی جو اسے وحی کرنا تھی۔“

ان آیات میں سلسلہ کلام پہنچ گیا ہے معراج کے ذکر کے آغاز کی طرف ایک خود معراج عام انسان کے ذہن کی سطح سے بہت اونچی ہے اور پھر قرآن میں اس کا تذکرہ ہے تو وہ بھی ضمیروں کے ساتھ اس لیے ضمیروں کی تعین میں اور جو اسم مظہر ہے اس کے مصداق میں مفسرین سرگردان نظر آتے ہیں۔

”مضبوط طاقتوں والے صاحب قوت“ سے مراد عام طور پر جبرائیل امینؑ سمجھے گئے ہیں مگر ان کی طرف معلم رسول اکرم ہونے کی نسبت سے ذہن میں خلش پیدا ہوتی ہے۔ ہاں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ واسطہ فی التعليم ہونے کی بنا پر ان کی جانب تعلیم کی نسبت دی گئی ہے۔ اس کے بعد جو دنا فتدلیٰ ہے تو اس کا مطلب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جبرائیل اور حضرت اس نقطے تک پہنچنے جسے ”افق الاعلیٰ“ کہا گیا ہے اور پھر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی آگے بڑھے یہاں تک کہ مرکز جلال الہی سے اتنے متصل ہوئے جسے محسوسات کے دائرے میں لا کر سمجھانے کی خاطر دو کمان یا اس سے کم کہا گیا ہے اور یہ ”یا“ کا لفظ اظہار تردد اور شک کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ ”بلکہ“ کے معنی میں ہے تاکہ قرب رسول دو کمان میں محدود نہ ہو جائے۔ بلکہ اس سے کمتر اور ”کمتر“ کی کوئی حد نہیں بتائی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سننے والا فہم و خیال و تصور میں جتنا چاہئے آگے بڑھ جائے بس ممکن رہے اور واجب واجب۔ مخلوق مخلوق رہے اور خالق خالق۔ اب قریب ہونے کے لفظ سے جب اس مرکز جلال خداوندی کا تصور ہو گیا تو یہ ضمیر اس کی طرف ہے کہ ”اسنے اپنے بندے پر وحی کی جو اسے کرنا تھی“ اب اس وحی کا اجمالی تذکرہ قرآن میں ہے لیکن تفصیل نہیں ہے کہ وہ کیا وحی تھی؟ اس سے ظاہر ہے کہ تمام وحی قرآن میں منحصر نہیں ہے بلکہ بعض وحی ایسی ہے جو قرآن میں مندرج نہیں ہے لہذا ”اہل قرآن“ یعنی ”پرویزی جماعت“ کا یہ تصور کہ وحی قرآن میں منحصر ہے، از روئے قرآن درست نہیں ہے۔

**مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى ۝ أَفَتَسْبُرُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝**

”ان کے دل نے دھوکا نہیں کھایا اُس میں جسے انہوں نے دیکھا تو کیا تم ان سے بحث کرو گے اس میں جسے انہوں



نے خود دیکھا۔“

چونکہ عام قرائت جس کے مطابق قرآن میں اعراب لگے ہیں وہ ”كَذَّبَ (بغیر تشدید) ہے اس صورت میں مفہوم یہی ہوگا جو ہمارے ترجمے میں ہے اور بعض اہل قلم اس سے متفق ہیں [۱]

دوسرے بعض لوگوں نے غیر متداول ایک قرائت کی بنا پر جس میں ”كَذَّبَ (تشدید کے ساتھ) ہے، یہ معنی قرار دیے ہیں کہ دل نے جھٹلایا نہیں جسے انہوں نے دیکھا [۲] اب جو خدا کے دیدار کو درست سمجھتے ہیں، وہ اسے خود اللہ سبحانہ کے دیکھنے کے معنی میں قرار دے لیتے ہیں جسکے لیے انہیں اپنے راویوں کی روایتیں بھی مل جاتی ہیں لیکن ہم جو اس حقیقت پر ایمان لائے ہوئے ہیں کہ رویت صفات جسم سے ہے اور اللہ جسم سے ہے اور اللہ جسم جسمانیات سے بری ہے لہذا اُس کی رویت ممکن نہیں ہے یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ یہ دیدار خداوند عالم کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ آیات یعنی قدرت کی خاص نشانیوں سے متعلق ہے جو معراج میں آپ کی آنکھوں کے سامنے آئیں۔

کچھ روایات میں اس سے مراد لیا گیا ہے جبرئیل امینؑ کو دیکھنا مگر یوں جبرئیل کو دیکھنا تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ تو روئے زمین پر حضرت کے پاس آتے رہتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ وہ تو کسی دوسری مانوس شکل میں جیسے وحیہ بکلی وغیرہ کی صورت میں آتے تھے۔ معراج میں وہ اپنی اصل شکل میں نظر آئے جس میں ان کے چہرہ سو (۶۰۰) پر تھے۔ کچھ روایتیں اس سلسلے کی ہمارے بعض مفسرین نے درج کر دی ہیں جو صحیح و مستند نہیں ہیں۔

وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ ﴿١٤﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ﴿١٥﴾ إِذْ  
يَعْشَى السِّدْرَةَ مَا يَعْشَى ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ  
الْكُبْرَىٰ ﴿١٨﴾

”اور ضرور بالضرور انہوں نے انہیں دیکھا دوسری دفعہ کے اترنے میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کے پاس بہشت بریں ہے جب کہ سدرہ پر چھارہ ہاتھ وہ (نور) جو چھارہ ہاتھ، نہ نظر چوکی اور نہ آگے بڑھی۔ اس نے اپنے پروردگار کی نشانیوں میں سے بڑی سے بڑی دیکھیں۔“

اب یہ ضمیر جیسا کہ بعد میں ہم مزید تشریح کریں گے جبرئیل امینؑ کی طرف راجع ہے جن کا ذکر سب سے پہلے ہوا تھا، اس کا مطلب عموماً یہ لیا جاتا ہے کہ اصل شکل میں انہیں پہلے دیکھا تھا، اسی طرح پھر دوبارہ اُن کی اصلی شکل میں انہیں دیکھا اس خاص محل رفیع میں جسے ”سدرۃ المنتہیٰ“ کہا جاتا ہے اور وہیں بہشت بریں ہے اور یہاں ایک خاص نور تھا جو اس سدرے پر چھارہ ہاتھ۔

اور پھر زور دیا جاتا ہے کہ نگاہ ان کی چوکی نہیں کہ جو دیکھنے کی چیزیں ہیں، وہ نہ دیکھیں اور نہ وہ نگاہ حد سے آگے بڑھی کہ جتنا دیکھا تھا اس سے آگے بڑھ کر اس عین ذات کے دیکھنے کی کوشش ہو جو دیکھنے کی نہیں ہے اور خدا کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں تھیں جو اس سفر معراج

[۱]۔ قلب خطانہ کر ددر آنچه دید (قاموس قرآن)

[۲]۔ ما کذب فؤاد محمد، حمدا الذی رای ولا کنہ صدقہ (ابن جریر)

میں انہیں نظر آئیں۔

یہ وہ مطلب ہے جو خود الفاظ قرآن سے ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ اب اس کے بعد جامع البیان طبری کی طرف ہم رجوع کرتے ہیں تو اس میں کئی روایتیں جناب ام المؤمنین حضرت عائشہ سے ہیں جن میں انہوں نے شدت سے اس کی رد کی ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کو خدا کا دیدار ہوا اور انہوں نے اس پر استدلال کیا ہے قرآن کیا آیت سے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (زمر - ۱۰۳) نگاہیں اسے پانہیں سکتیں اور وہ تمام نگاہوں پر حاوی ہے، جس سے علمائے شیعہ نفی رویت پر استدلال کرتے ہیں اور جس کے بعد مسلمانوں کی اکثریت کو جو اپنے کتب صحاح کی بنا پر قیامت میں انتظار ہے، وہ بھی غلط ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ آیت قرآن نے عمومی طور پر نگاہوں سے اس کے پانے کی نفی کی ہے۔ اس میں دنیا اور آخرت کی قید نہیں ہے۔

اس منزل پر ہم مجبور ہیں کہ آیات کے ذیل میں علامہ سید محمد حسین طباطبائی سے اختلاف کریں جنہوں نے اپنی تفسیر ”المیزان“ میں فریقین کی کچھ حدیثوں کی بنا پر جنہیں ہم معتبر نہیں سمجھتے یہ راہ کی ضمیر خدا کی طرف راجع کر دی ہے اور کہہ دیا ہے کہ حضرت نے اللہ کو دفعہ دیکھا۔ ایک دفعہ جانے میں اور دوسری دفعہ آنے میں مگر موصوف نے نفی رویت پر اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ آپ نے اللہ کو دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ نہ کہ کاسہ سر کی آنکھوں سے مگر ہمارا تصور یہ ہے دل کی آنکھوں سے تو آپ اپنی زندگی کی ہر لمحہ حیات میں اُسے دیکھتے رہے جبکہ ان کے وحی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے جب کسی نے پوچھا: اهل رأیت ربك؟ کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ تو آپ نے خاص بلیغانہ انداز میں پہلے تو اس کو اس کے لیے حیران کن جواب دے دیا کہ: ”کیف اعبد من لہ ارۃ“ بھلا میں عبادت کیوں کروں گا اس کی جسے دیکھا نہیں، اور پھر اس کی حیرت کو دور کرنے کے لیے تشریح فرمائی کہ: لا تراہ العیون بالابصار ولکن تراہ لقلوب بحقائق الایمان“ اس سے آنکھیں ان نگاہوں سے نہیں دکھتیں مگر اسے دل ایمان کی حقیقتوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

حضرت علیؑ تو عمر بھر اسے اپنے دل کی گہرائیوں سے دیکھتے رہے ان سے جو بالاتر ذات ہے یعنی حضرت پیغمبر خدا ﷺ، انہوں نے بس اسے معراج میں جا کر دفعہ (۲) دل کی نگاہوں سے دیکھا؟ یہ تصور ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

بہر حال اسے جناب جبرئیل امین سے متعلق کرنے کے بعد ایک تصور یہ ہے کہ اس کا ربط ما کذب الفؤاد ما رأی سے ہے۔ ان کے دل نے دھوکا نہیں کھا یا اُس میں جسے انہوں نے دیکھا ”اُس سے مرد وہی حضرت جبرئیل امینؑ لیے جاتے ہیں جنہیں اس وقت چھ سوپروں کے ساتھ دیکھا تھا اور دوبارہ پھر یوں ہی دیکھا مگر ہم کہتے ہیں کہ اس کا ربط فاستوی وهو بالافق الاعلیٰ کے ساتھ کیوں نہ لیا جائے کہ جبرئیل امینؑ اور آپؐ وہاں ٹھہرے جو افق الاعلیٰ ہے یعنی اطراف آسمان کا بلند ترین نقطہ اور جبرئیلؑ وہیں رہ گئے اور آپ اس کے آگے پہنچے جو، قاب قوسین اودائی کا نقطہ تھا اور وہاں وحی ہوئی جو بغیر توسط جبرئیلؑ تھا جس کی خبر فرشتے کو بھی نہ ہوئی اور اب جب آپ واپس ہوئے تو دوسری مرتبہ جبرئیل امینؑ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا اور اب یہاں سے پھر جبرئیلؑ آپ کے ہمراہ ہوئے جس کے ذکر کو قرآن مجید نے ضروری نہیں سمجھا کہ یہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے اس کے معنی یہ ہے کہ وہ آخری آسمان پر جس کے آگے آسمان کوئی نہیں وہ جناب جبرئیلؑ کی آخری حد ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد کا نقطہ وہ ہے جو اصطلاح مذہب میں عرش کہلاتا ہے..... اس کا بلند ترین نقطہ وہ قاب قوسین والا تھا جہاں رسولؐ پہنچے اور چونکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ واپسی میں دوبارہ جناب جبرئیلؑ کو دیکھا تو درمیان کے اس جزء کو کہ دل نے دھوکا نہیں کھا یا اس میں کہ

جسے انہوں نے دیکھا ان آیتوں سے متعلق سمجھا جاسکتا ہے جو سدرۃ المنتہیٰ اور نزل قاب تو سین کے درمیان میں تھی جس کے لیے بعد میں ہے کہ اپنے پروردگار کی آیتوں میں سے جو بڑی سے بڑی تھیں، انہیں دیکھا۔ اس میں جناب جبرئیل کی کسی شکل خاص کا تذکرہ نہیں ہے۔

اس صورت میں یہ آیت اس حدیث کے مطابق ہوگی کہ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب پہنچ کر جناب جبرئیل رک گئے کہ اب آگے جانے کا میرے لیے امکان نہیں ہے اور جب وہ وہاں رکے رہے یہاں تک کہ حضرت واپس تشریف لائے اور دوبارہ انہیں وہاں دیکھا۔ [۱]

**أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنْوَةَ الثَّالِثَةَ الْآخِرَىٰ ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ الذَّكْرُ وَلَهُ**

**الْأُنثَىٰ ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ﴿٢٢﴾**

”کیا تم نے دیکھا ہے لات اور عزی اور آخر والے تیسرے منات کو، کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں، یہ تو اس صورت میں ایک غیر منصفانہ فیصلہ ہے۔“

لات اور عزی اور منات سب مشرکین کے اصنام ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے منات کو عزی کہا جاسکتا ہے کہ مرتبے کے لحاظ سے وہ خود ان کے نزدیک بھی لات اور عزی کا ہم رتبہ نہیں تھا [۲] ”کیا تم نے دیکھا ہے“ مطلب یہ ہے کہ اگر تم غور سے انہیں دیکھو تو وہ خود تمہاری سمجھ میں آجائے کہ یہ ”بے جان“ بے بس، بے شعور اور خود تمہارے بنائے ہوئے بت ہرگز الوہیت کے لائق اور عبادت مستحق نہیں ہیں۔

اس کے بعد جو لڑکے اور لڑکی کا ذکر ہے تو دوسرے مقامات پر تو یہ مشرکین کے اس مزعوے کے سلسلے میں آیا ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی لڑکیاں کہتے تھے مگر یہاں بتوں کا ذکر کے بعد آیا ہے اور یہاں سلسلہ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بتوں کو بھی اللہ کی لڑکیاں قرار دیتے تھے۔ اور پھر اُس کے بعد فرشتوں کا ذکر آئے گا۔ یہ اسی بنا پر ہو سکتا ہے کہ وہ ان بتوں کے متعلق خیال کرتے تھے کہ یہ کچھ فرشتوں کی شبیہیں ہیں اور چونکہ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اس لیے وہ انہیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے [۳] وہ چونکہ ان بتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اس لیے انہوں نے ان کے نام اللہ کے ناموں سے مشتق کر کے رکھے تھے۔ [۴]

ایک قدیم ماخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لات اور منات دونوں کو عزی کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ وہ ماخذ یہ ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل نے جب مسلمان ہوا تو یہ اشعار کہے:

عزلت اللات و لعزی جميعا

كذلك يفعل الجلد الصبور

بلا العزی ادين و لا ابنتیہا

[۱] فی العلل عنہ لما بلغ السدرۃ وقف جبرئیل دونہا وقال یا محمد ﷺ ہذا موفقی الذی وضعنی اللہ عزوجل فیہ ولن اقدر علی ان تقد  
مه ولكن امض انت امامک الى السماء فتقدم رسول اللہ الى سدرۃ وتخلف جبرئیل ﷺ (صافی)

[۲] صفة ذم للثالثۃ... جلالین۔ منات سوہمی بی قدر دا (شاہ ولی اللہ)

[۳] انکار لما قالت قریش ان الملائکۃ بنات اللہ ہذا الاصنام ہیا کلہا (صافی)

[۴] قالو من اللہ لات ومن العزیز العزی وان عمولا نہن بنات اللہ تعالیٰ عنہ وقول (ابن جریر)

## و لاضمى بنى عمرو زور

یعنی ”میں نے لات اور عزی دونوں کو ان کے منصب سے ہٹا دیا۔ ایسا ہی باہمت بہادر کو کرنا چاہیے۔ تو نہ اب عزے پر مجھے اعتقاد ہے اور نہ اسکی دونوں بیٹیوں پر اور نہ بنی عمرو کے دونوں بتوں کی اب میں زیارت کروں گا۔“ اب اسے اگر اس تصور کے ساتھ کہ وہ ان بتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے ملائیں تو یا تو یہ ماننا پڑھے گا کہ وہ عزی کو (معاذ اللہ) خدا کی شریک حیات مانتے ہوں اور لات و منات کر لڑکیاں اور اس بنا پر قرآن مجید نے اولاد ہونے کی نفی کے ساتھ بیوی کی بھی نفی کی ہے (ولہد یتخذ صاحبۃً ولا ولداً) اور یا یہ کہ عزی کو خدا کی لڑکی مانتے ہوں بلا واسطہ اور منات کو بلا واسطہ یعنی نواسی۔

پھر بھی اس شاعر کے قول کی بنیاد پر ان کا ملائکہ کے ساتھ کوئی رشتہ ثابت نہیں ہوتا جو قرآن کے سلسلہ کلام سے مستفاد ہوتا ہے۔ ہاں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ پہلے ان کے اس تصور کی رد ہے کہ یہ اصنام خدا کی بیٹیاں ہیں اور پھر بعد میں ان کے دوسرے تصور کی رد ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے زیادہ ذہن سے قریب وہی تصور ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے جس کا متعدد مقامات پر قرآن مجید میں ذکر ہے اور ان بتوں کو ان کی شبیہ ہونے کی بنا پر اللہ کی بیٹی سمجھتے تھے۔ جو طبری کے متعدد روایات سے مستفاد ہے۔

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۖ إِنَّ

يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ رَبِّهِمْ الْهُدٰى ۝۳۱

”یہ نہیں ہیں مگر کچھ نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں جن پر اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ وہ بیروی نہیں کرتے مگر وہم گمان کی اور جو ان کے دلوں کی خواہش ہوتی ہیں اور بلاشبہ ان کے پاس ان کے پروردگار کے پاس سے صحیح رہنمائی آچکی ہے۔“

## مشرکین کے اس مزعومہ باطل کی رد کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں

جیسا کہ پہلے ابن جریر کا بیان آچکا ہے کہ انہوں نے ان بتوں کے نام اسمائے الہیہ سے لے کر رکھے تھے اس تصور پر کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور پھر یہ مجبوراً رد کر دے کہ وہ خود انہیں خدا بھی کہتے تھے تو کہا جا رہا ہے کہ نام جو بتوں کے تم نے رکھے ہیں وہ بھی تمہارے طبع زاد ہیں اور انہیں خدا سمجھنا یا ان کا خدا سے رشتہ جوڑنا، یہ بھی تمہاری من مانی بات ہے [۱] ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جس کا ثبوت ہو۔ یہاں ظن ایسے خیال کو کہا گیا ہے جس کا کوئی منشاء ہی نہ ہو بلکہ ”دل بخواہ ہو“ یعنی اس کی بنیاد اپنے نفس کی خواہش پر ہو لہذا حقیقت میں اس کا تعلق ایسی چیزوں سے ہے ہی نہیں جن میں کوئی نتیجہ کسی حقیقت کے متعلق ایسی دلیل سے نکالا گیا ہو جو اس کے ثبوت پر اتنی طاقتور روشنی ڈالتی ہے جس میں کمزور دھندلا کا امکان خلاف کار ہوتا ہے۔ یہاں ظن کا لفظ جو ہے، وہ اس ظن سے مختلف ہے جس پر اصول فقہ میں حجیت ظن کے عنوان سے بحث کی جاتی رہی ہے۔

”بلاشبہ ان کے پاس ان کے پروردگار کے پاس سے صحیح رہنمائی آچکی ہے“ یعنی اس کی طرف سے رہنما ان بتوں کی نفی کرتے رہے اور بلا شرکت غیر اللہ ہی کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اور اب یہ آخری پیغمبر بھی مجزوں کے ساتھ جو اس کی حقانیت کی دلیل ہیں، انہیں بتا رہا ہے کہ

[۱] ای لیس تسمیتکم لهذا الاصنام بانہا الہة وانہا بنات اللہ الا اسماء لامعانی تحتاً (مجمع البیان)

یہ قابل عبادت نہیں ہیں [۱] اور ان کے سلسلے میں ان کے مزعمومات مثلاً وہ یہ کہ خدا کی بیٹیاں ہیں یا فرشتوں سے صورت میں مشابہ ہیں۔ یہ سب بے بنیاد ہیں تو اب انہیں اسے مان لینا چاہیے اور اب اپنے سابق دھڑے پر باقی رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

**أَمْرٌ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمْتَمِي ۚ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ۗ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا**

**تُغْنِي شَفَاعَتَهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ۚ**

”کیا انسان کے لیے وہ ضرور حاصل ہوگا جو وہ آرزو کرے تو اللہ کے قبضے میں ہے انجام بھی اور آغاز بھی اور کتنے ہی فرشتے ہیں آسمان میں کہ ان کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتی مگر بعد میں اس کے کہ اللہ جس کے لیے چاہے، اجازت دے اور وہ راضی ہو۔“

چونکہ بعد میں فرشتوں کی سفارش کے بذات خود کارگر نہ ہونے کا ذکر ہے، اس لیے آرزوؤں سے مراد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان بتوں کی پرستش اس امید سے کرتے تھے کہ وہ فرشتے جن کی صورت پر اپنے خیال میں انہوں نے یہ مورتیاں بنائی تھیں پیش خدا ہماری سفارش کریں گے [۲] تو کہا جا رہا ہے کہ خود وہ فرشتے بغیر اس کی رضا اور اجازت کے سفارش نہیں کرتے [۳] تو یہ بت کہاں سفارش کر سکتے ہیں [۴] مگر بعض لوگوں نے اس آیت کی تشریح اتنی دور لے جا کر کی ہے کہ اس کا کوئی تعلق قبل والی آیتوں سے نہیں رہ گیا ہے۔ انہوں نے یہ مطلب کہا ہے کہ کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آرزو تھی کہ انہیں نبوت و رسالت مل جائے اب اُس کے بعد الفاظ آیت کا تقاضا پھر یہ ہے کہ یہ مطلب نکالا جائے کہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ منصب آرزوؤں سے نہیں ملتا ہے بلکہ اللہ خود اپنی نگاہ غیب میں جسے اس کا مستحق پاتا ہے، اسے یہ منصب عطا کرتا ہے مگر ان بعض نے اب اسے چھوڑ کر اُس کا مطلب یہ نکالا ہے کہ تمہارے نزدیک انہیں یہ آرزو تھی تو سن لو کہ ان کی آرزو ہم نے انہیں عطا کر دی ہے [۵]

**إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيَسْمُؤْنَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْإِنثَىٰ ۗ وَمَا لَهُمْ**

**بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۗ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۗ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۗ**

”یقیناً جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کے نام لڑکیوں کے سے رکھتے ہیں، حالانکہ انہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ نہیں پیروی کرتے مگر بلاوجہ کے خیال کی اور یقیناً ایسا خیال حقیقت تک پہنچنے کی ضرورت کو بھی پورا نہیں کرتا۔“

نام رکھنے کے معنی یہی ہوں جیسا ہم نے ترجمہ کیا ہے تو گزشتہ آیات کے ربط سے مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے ان مورتیوں کے جو

[۱] - البيان بالوحي الذي اوحيناها الى محمد ﷺ ان عبادتها لا تنبغي وانه لا تصلح للعبادة الا الله الواحد القهار (ابن جرير)

[۲] - ماتمني من شفاعة الاصنامة (مجمع البيان)

[۳] - لا يشفعون الا باذن من الله وضاه (تبيان)

[۴] - فكيف يشفع الاصنام لعبادتهم (صافي)

[۵] - قال ابن زيد... وان كان محمد ﷺ تمنى هذا فذلك كله (ابن جرير)

لڑکیوں کے نام سے رکھے ہیں وہ فرشتوں کے تصور پر مبنی ہیں کہ انہیں یہ لڑکیاں سمجھتے ہیں اور پھر وہی بات ہے جو پہلے آچکی ہے کہ یہ ان کا تصور کسی علم پر مبنی نہیں ہے بلکہ بلاوجہ ہے اور اس کے بعد کا جملہ جو بلکہ ایک کلیہ کی صورت رکھتا ہے لہذا وہ اصول فقہ کی ایک بحث کا مرکز بن گیا کہ عدم حجیت ظن ہے اس سے استدلال ہو گیا اور جناب شیخ مرتضیٰ انصاری نے بھی رسائل میں تاسیس اصل کے محل پر اس آیت کو پیش کر دیا عام اصول کا تقاضا یہی ہے کہ ظن معتبر نہیں ہے لہذا اس سے ان لوگوں کی رد ہو جائے گی جو مطلق ظن کو احکام شرعیہ میں معتبر قرار دیتے ہیں ہاں اس عام اصول سے استثناء ان ظنون سے ہو جائے گا جنہیں خصوصیت کے ساتھ شرع نے قرار دیا ہے تو اب نتیجہ ان کا یعنی ان پر عمل کا صحیح ہونا ظنی نہیں بلکہ قطعی ہوگا لہذا وہ عمل بالظن میں داخل ہی نہیں ہوگا اور اب کلیہ یہ ہو گیا کہ علم پر عمل ہو یا ”علمی“، پر اور ”علمی“ سے مراد یہی ہے کہ ذاتاً تو وہ ظن ہے مگر شروع کے معتبر قرار دینے کی وجہ سے نتیجہ اس کا جو صحت عمل ہے، وہ علم پر مبنی ہوتا ہے، نہ کہ صرف ظن پر۔

مگر جیسا کہ گزشتہ ظن والی آیت میں ہم کہہ چکے ہیں کہ جس محل پر یہ فقرہ قرآن مجید میں آیا ہے، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ ظن ہے ہی نہیں جس میں کوئی دور بین ”واقع“ کو دکھا رہی ہو لیکن اس میں ذرا دھند کا سا ہو کہ کمزور احتمال مخالف پہلو کا بھی ہے بلکہ یہاں ظن ایسا ہے کہ اس میں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو واقعہ پر جھوٹ ڈال رہی ہو بلکہ بالکل آنکھ بند کر کے اپنے ایک مفروضہ کو واقعیت سمجھ لیا گیا ہے اور اب الظن پر جو الف لام ہے، وہ تقاضاے محل عہد کا ہوگا کہ ایسا ظن حقیقت سے ذرا بھی بہرہ یاب نہ کرے گا لہذا اس میں وہ ظنون داخل نہیں ہیں جو کسی ایک منشاء صحیح پر مبنی ہوں جو فطری طور پر حقیقت کے متعلق صحیح طور پر انسان کے ذہن کا رجحان پیدا کرتی ہے۔

فَاعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّى ۖ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٣٩﴾ ذَلِك

مَبْلُغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۗ وَهُوَ أَعْلَمُ

بِمَنْ اهْتَدَى ﴿٤٠﴾

”تو روگردانی کیجیے اس سے جو ہماری یاد سے روگردانی کر رہا ہے اور سو اس دنیوی زندگی کے کچھ اس کا مقصد نہیں ہے، یہ ان کے علم کی پہونچ کی آخری حد آپ کا پروردگار خوب واقف ہے اس سے جو اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور وہ خوب واقف ہے اس سے جو اس صحیح راستے کو پائے ہوئے ہے۔“

یہ دونوں آیتیں اس طرح کی ہیں جیسی متعدد مقامات پر قرآن میں آیتیں ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہدایات کے گویا بے اثر ہونے اور مشرکین کے قبول حق نہ کرنے سے بہت صدمہ ہوتا تھا تو طرح طرح کے انداز سے خالق نے آپ کو سمجھایا ہے کہ آپ رنج کیوں کرتے ہیں؟ وہ راہ راست پر نہیں آتے ہیں تو کم بخت خود ہی دوزخ میں جانے کا سامان کر رہے ہیں، آپ کیا کر سکتے ہیں؟ یہاں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ جاہل، ان کا مبلغ علم اپنی ان باطل کشیوں کے آگے سچی حقیقتوں تک نہیں جاتا اور پھر حق طلبی کا جذبہ بھی نہیں، بس دنیوی زندگی اچھی طرح بسر ہو جائے یہی ان کا انتہائے مقصد ہے تو آپ کیا کر سکتا ہیں؟ خود ہی دیکھ رہے ہیں کہ کون راہ راست سے ارادہ منحرف رہتا ہے، اور کون اسے قبول کرتا ہے ان دونوں کا حساب تو ہمارے ذمے ہے اور وہ انجام سب کے سامنے آئے گا

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاءُوْا بِمَا عَمَلُوْا

## وَيَجْزِي الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ﴿٣١﴾

”اور اللہ کے لیے وہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے تاکہ انہیں جو برے اعمال کریں وہ سزا ان اعمال کی دے اور جو اچھے کام کریں ان کو اچھائی کے ساتھ جزا عطا کریں“،  
آسمان اور زمین کے اندر کی ہر چیز اس کی ملک ہے، اسے جزا و سزا کے اعلان کی تمہید بظاہر اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ کوئی اس کے دائرہ اقتدار سے نکل نہیں سکتا کہ اُس کی طرف کی مکافات سے بچ جائے اور پھر اس کی وسعت قدرت میں کمی بھی نہیں کہ وہ انہیں جزا و سزا نہ دے سکے۔

الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ ۗ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ  
الْمَغْفِرَةِ ۗ هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ  
أُمَّهَاتِكُمْ ۗ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ ۗ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى ﴿٣٢﴾

”وہ جو پرہیز کرتے ہیں بڑے گناہوں اور سیاہ کاریوں سے، سوا اتفاقی معمولی غلطیوں کے یقیناً تمہارا پروردگار بخشش میں سمائی رکھنے والا ہے، وہ تمہیں خوب جانتا ہے کہ اس نے تمہیں خاک سے پیدا کیا اور جب تم ماؤں کے پیٹ میں بچوں کی شکل میں تھے تو اپنے نیکو کار ہونے کے دعوے نہ کرو، وہ خوب واقف ہے ان سے جو واقعی پرہیزگار ہو“۔

یہ اس مشرکین والے تذکرے سے جو پہلے تھا الگ ہے بلکہ گزشتہ آیت میں تھا کہ حسن عمل رکھنے والوں کو میں اچھی جزا عطا کروں گا تو ان حسن عمل رکھنے والوں کا بیان ہے، وہ کون ہوتے ہیں؟۔ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ، کی لفظیں قرآن مجید میں پہلے بھی آئی ہیں مگر وہاں اس کے ساتھ حرف الاستثناء (الا) نہیں ہے۔ ہاں ایک تیسری جگہ کبائر کے لفظ کے ساتھ اس کے مقابلے میں سیات کا لفظ آیا ہے: نساء آیت ۳۱ میں؛

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ . اور یہاں الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ کے ساتھ حرف استثناء (الا) کے ساتھ لَمَمٌ کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے کئی تشریحوں کو سمو کر، اتفاقی معمولی غلطیوں“ کے ساتھ کیا ہے۔ فقہ میں ایک اصطلاح گناہ کبیرہ اور صغیرہ کی موجود ہے مثلاً عدالت کی جو شروع میں نبض قرآن گوہیوں میں معتبر ہے اور فقہ جعفری کی رو سے امام جماعت اور طلاق کے وقت جن کی موجودگی ضروری ہے، ان گوہوں میں معتبر اس کی تعریف کی جاتی ہے کہ کبائر کا ارتکاب نہ ہو اور صغائر پر اصرار نہ ہو، اس تفریق کا ماخذ ان آیات کو قرار دے کر کبائر سے ذہن میں گناہان کبیرہ آتے ہیں، اس لیے ان کے مقابلے میں وہاں جو سیئات کا لفظ ہے اور یہاں جو الا کے ساتھ لَمَمٌ کا استثناء ہے، اس سے گناہان صغیرہ مراد ہوں گے۔

اس صورت میں استثناء متصل نہیں ہو سکتا جس میں الا کے ذریعے سے کسی ایسی چیز کو خارج کیا جاتا ہے جو بغیر اس لفظ کے قبل والے حکم کے عنوان میں داخل تھی، یہاں ایسا نہیں ہے اس لیے کہ پہلے جب گناہان کبیرہ کا ذکر تھا تو ان میں گناہان صغیرہ داخل ہی کہاں تھے جو استثناء کے ذریعے سے انہیں خارج کیا جائے اور چونکہ یہ اصول ہے گناہ صغیرہ بھی اصرار کی صورت میں کبیرہ ہو جاتا ہے لہذا ہماری قدیم تفسیر میں اس کے ساتھ

قید لگائی ہے نادانستہ کی [۱] استثنائے منقطع کا با محاورہ ترجمہ ہماری زبان میں ”ہاں“ کے لفظ کے ساتھ ہو سکتا ہے جس سے پہلی ہی بات میں ذرا وضاحت یا تاکید ہوتی ہے اب یہ معنی ہوں گے کہ وہ بڑے گناہوں اور شرمناک کاموں سے بالکل پرہیز کرتے ہیں ہاں صغیرہ گناہ اتفاقاً ہو جائے تو ہو جائے۔ اب اس سے یہ فقرہ وابستہ ہو جائے گا کہا، ان ربك واسع المغفرة ”تمہارے پروردگار کی بخشش میں بڑی وسعت ہے“، یعنی ایسے گناہ بخش دیے جاتے ہیں جو مطابق ہے سابق آیت کے اس جملے سے کہ اِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ ”اگر بڑے گناہوں سے پرہیز کرو تو ہم تمہاری معمولی غلطیوں کا کفارہ کرنے کا مطلب قرآن میں وہی بخش دینا ہوتا ہے جسے عربی میں مغفرت کہتے ہیں..... اللہ کے کچھ اور مفہوم بھی کہے گئے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر استثناء منقطع ہی قرار پاتا ہے۔

ایک یہ ہے کہ قبل اسلام جو ہو چکا ہو وہ چکا، اس کے باز پرس اب نہ ہوگی جیسے ”جمع بین الاختییین“ دو بہنوں کو ایک ساتھ زوجیت رکھنے کی ممانعت میں قرآن میں آیا تھا ”الامآقد سلف“، سوا اس کے جو پہلے ہو چکا اور اپنے باپوں کی بیویوں سے ازدواج کی ممانعت میں بھی ہے الامآقد سلف ان دونوں میں یہ معنی نہیں کہ جو کچھ ہو چکا اس کا باقی رکھنا اب درست ہے، تا کہ استثنائے متصل ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو پہلے ہو چکا اس کی باز پرس اب نہ ہوگی [۲] میری نظر میں یہ تشریح ظاہر لفظ سے بہت بعید ہے۔ تیسری تشریح یہ ہوئی ہے کہ کوئی گناہ عمل میں نہیں آیا مگر انسان اس کے قریب پہنچ گیا، خواہ صرف ارادے کے ساتھ یا اس کے ابتدائی اسباب عمل میں لے آیا لیکن اصل گناہ ہونے نہیں پایا۔

بعض نے اس کا تعلق الفواحش سیاہ کاریوں سے مراد لیا ہے جن کا نام زنا ہے، اس میں ایک آخری منزل ہے جو بالکل زنا کاری کی ہے، اس سے استثناء ہوا ہے، اس کے ابتدائی مراحل کا جنہیں ”مقدمات زنا“ کہا جاتا سکتا ہے جیسے آنکھ سے دیکھنا، ہاتھ سے چھونا، اس راستے پر چلنا یہ سب لہم میں داخل ہیں ان کی معافی کا اعلان ہوا ہے، جب کہ اصل عمل وقوع میں نہ آیا ہو طبری کی جامع البیان میں اس مضمون کی کئی روایتیں ہیں جن میں سے ایک میں تو بس ابن مسعود کا قول ہے اور دوسری روایت میں پیغمبر خدا ﷺ کی حدیث کے طور پر یہ مضمون وارد ہوا ہے اور اس کے موافق دوسرے افراد کے اقوال ہیں۔

جو ابن مسعود کے قول کے الفاظ ہیں، وہ ہمارے طرق سے ائمہ معصومین کی زبانی بھی وارد ہوئے ہیں مگر ان میں اللہ کی تشریح کے طور پر ان امور کا ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن ابن مسعود کی روایت میں اللہ کی تشریح کے طور پر یہ مضمون درج ہے [۳] چوتھی تشریح جس کے متعلق معصومین کے ارشادات ہیں کہ اتفاقی طور پر وقتاً فوقتاً جو گناہ ہوتے ہیں مگر انسان ان کا خوگر نہیں ہے وہ لہم کے لفظ کا مصداق ہیں۔ کافی باب اللہم میں ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں: الهنة بعد الهنة ای الذنب بعد الذنب یلم بہ العبد خوگر نہ ہونے کے معنی میں ایک حدیث میں ہے لیس من سلیقة [۴] لہم کے جو لغوی معنی ہیں: اس کے بھی یہ مطابق نہیں ہے راغب کے

[۱] هو ما یلم بہ العبد من ذنوب صغار بجهالته (علی ابن ابراہیم)

[۲] الذی المرابہ من الثم ولفوا حش فی لاجاہلیة قبل الاسلام فان الله قد عفاہم عنه فلا یؤخذہم بہ (ابن جریر)

[۳] ان ابن مسعود قال زنا العین النظر وزنا الشفتین التقبل وزنا الیدین البطش وزنا الرجلین المشی وصدق ذالک الفرج ویکذبہ فان تقدم بفرجه کازانیاً والافهو اللہم (ابن جریر)

[۴] فی الکافی عن الصادق اللہم یلم الرجل یلم الذنب ثم یستغفر الله... عند من الظلم العبد بعد الذنب لیس من سلیقتہ ای من طبیعتہ (صافی)



لفظ یہ ہیں کہ: فلان يفعل كذا لهما أي حيناً بعد حين۔ فلان شخص اسے لهما کرتا ہے وقتاً فوقتاً۔ اس صورت میں استثناء متصل قرار پاتا ہے اس لیے کہ اتفاقی اور وقتاً فوقتاً ہونا جس کے لیے معانی ثابت ہو رہی ہے، اس میں کبار اور صغائر کی تفریق نہیں ہے۔

اور بھی مفہوم کہے گئے ہیں مگر ہم جہاں تک سمجھتے ہیں پہلی تشریح زیادہ قوت رکھتی ہے اس لیے کہ کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق یہ کوئی علماء و فقہاء کی بتائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ معصوم رہنمایان دین کے اقوال سے یہ تفریق ثابت ہوئی ہے چنانچہ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالبؑ کے بھی ایک کلام میں جو نوح البلاغہ میں ہے گناہوں کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں: من کبیرا عد علیہ نیرا نہ و من صغیرا عد علیہ غفرانہ، کوئی بڑا ہے کہ اس پر اس نے اپنے یہاں کے آگ کا اعلان کیا ہے اور کوئی چھوٹا ہے کہ اس پر اپنی مغفرت کی امید دلائی ہے اس میں انداز کلام پتہ دیتا ہے کہ یہی آیتیں سامنے رکھ کر یہ بات کہی گئی ہے اور اس میں کبیرہ کا معیار وہی معلوم ہوتا ہے کہ جس پر خالق نے آتش دوزخ کا اعلان کیا ہے، وہ کبیرہ ہے۔ دوسری حدیثیں بھی اس پر دلالت کرتی ہیں چنانچہ کافی میں امام جعفرؑ کی حدیث ہے کہ:-

الکبائر التي اوجب الله عليها النار۔ کبارہ وہ ہیں جس کا نتیجہ اس نے آتش دوزخ قرار دیا ہے وسائل باب اجتناب الکبائر میں امام موسیٰ کاظمؑ کا ارشاد ہے جس سے ان آیات کی تفسیر سمجھنا چاہیے:- من اجتنب الکبائر وہی ما وعد الله عليه النار ان کان مؤمناً کفر الله عنه سیئاته۔ جو کبار سے پرہیز کریں اور وہ وہ ہیں جن پر اس نے آتش جہنم کا وعید کیا ہے۔ اگر وہ مؤمن ہے تو اللہ اسے اس کے سینات (معمولی برے کاموں) کا کفارہ کر دے گا۔

عقاب الاعمال میں امام محمد باقرؑ کی حدیث ہے راوی کا بیان ہے کہ:- سالت ابا جعفرؑ عن الکبائر فقال کل من اوعده الله عليه النار۔ میں نے حضرت علیؑ سے کبار کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: ہر وہ گناہ جس پر اللہ نے آتش دوزخ کا اعلان فرمایا ہے اس کی تائید اہل سنت کے ان روایات سے ہوتی ہے جن میں اللہ کے معنی میں کہا گیا ہے کہ مادون الحدین حد الدنيا وحد الآخرة۔ جو دونوں قسم کی سزاؤں سے کم تر رہے ہیں دنیا کی حد اور آخرت کی حد۔ ان شاگردِ مکرمہ نے اس کی توضیح کی ہے، کل ذنب لیس فیہ حد فی الدنيا ولا عذاب فی الآخرة فهو اللہ۔ وہ گناہ جسکے لیے نہ دنیا میں کوئی حد شرعی ہے اور نہ آخرت میں سزا کا اعلان ہوا ہو وہ اللہ سے قرآن کریم کی ان دو لفظوں میں کہ: کَبِيرٌ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشُ، جس میں فواحش کی تفسیر زنا کے ساتھ ہوئی ہے یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ کبار سے مراد وہ ہیں جس میں عذاب آخرت کا اعلان ہوا ہے اور فواحش وہ ہیں جس پر دنیا میں حد شرعی قرار دی گئی ہے۔

اس کی موافقت میں ہمارے یہاں کافی کی حدیث باب اللہم میں امام جعفر الصادقؑ سے ہے کہ: الفواحش الزنا والسرقة۔ فواحش زنا اور چوری ہیں۔ اب دونوں قسم کی سزائیں جس گناہ پر مرتب نہ کی گئی ہوں وہ گناہ صغیرہ بالمم ہے جس کے لیے یہ اعلان ہے کہ:- ان ربك واسع المغفرة۔ تمہارے پروردگار کی مغفرت میں وسعت ہے، اور یہ مغفرت کا اعلان اس پابندی یعنی کبار و فواحش سے پرہیز کے صلے کے طور پر ہے۔ لہذا وہ برناتے توجہ نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ اسی وقت تک ہے جبکہ اتفاقی طور پر ہو لیکن اگر اصرار ہو گیا تو پھر گناہ صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔ رہ گئی انسان کی بذات خود توبہ یا شفاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تو کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق نہیں ہے بلکہ شفاعت کے تعلق سے تو ایک حدیث پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کہ:- انی ادخرت شفاعتی اهل الکبائر من امتی۔ میں نے اپنی شفاعت کو اٹھا رکھا ہے اپنی امت کے ان افراد کے لیے جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوں۔

اور اس آیت قرآن میں بھی گناہان کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق نہیں ہے کہ: - **يَعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ بِمَجِيئَاتٍ ۗ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ** ..... (زمر - ۵۳) اے میرے بندو جنھوں نے گناہوں کے ساتھ اپنے اوپر ظلم اٹھایا اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے یقیناً وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اور کافی باب الاصرار علی الذنوب میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: **لا صغيرة مع الاصرار ولا كبيرة من الاستغفار**، اصرار کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا اور استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں رہتا۔

اور فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ اجتناب کبائر کی صورت میں صغائر پر مغفرت کا وعدہ قطعی ہے جس میں توبہ و استغفار کی قید نہیں اور کبائر میں در صورت توبہ و استغفار کے ساتھ مغفرت کا وعدہ ہے اور در صورت عدم توبہ شفاعت کے ساتھ اور کبھی بغیر شفاعت صرف تفضل الہی سے امکان مغفرت ہے جو یغفر کے ساتھ من یشاء کی قید سے ظاہر ہے جس سے مؤمن میں دونوں کیفیتوں کا امتزاج ہو جاتا ہے جو تقاضائے ایمان ہے۔ **الایمان نصف خوف و نصف رجاء**، ایمان کے دو برابر کے حصے ہیں ایک حصہ خوف اور ایک حصہ امید۔

یغفر کے اعلان سے رجاء اور لمن یشاء کی قید سے خوف اس خوف میں سب سے زیادہ دخل حقوق الناس کا ہے کہ ان میں بغیر ان صاحب حق کے معاف کئے ہوئے رحمت الہی بھی شاید قدم آگے نہ بڑھائے اور شفاعت کرنے والے بھی شفاعت میں توقف کریں۔ **نعوذ باللہ من سخط الرحمن و عذاب النیران**۔

اس کے بعد اس آیت میں بلا فاصلہ یہ تخلیق کا ذکر کر کے وہ خوب جانتا ہے جب اس نے (پہلے) تمہیں زمین سے پیدا کیا (یعنی تمہارے مورث اعلیٰ حضرت آدم کو) پھر ان کی نسل کو آگے بڑھایا ایسی صورت سے (جس کی آخری منزل جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ ہے) کہ تم ماں کی پیٹ میں بچے کی شکل میں تھے، یہاں یہ بات غور طلب ہو جاتی ہے کہ آخر اس کا کبائر سے پرہیز اور صغائر کے ارتکاب کی صورت مغفرت والے ذکر سے کیا تعلق ہے مگر یہاں جناب طبری نے بھی جن کی بالغ نظری کا مجھے اعتراف ہے باوجود اپنی تفسیر کے اتنے بسیط اور وسیع ہونے کی توجہ نہیں کی نہ انہیں بظاہر صحابہ و تابعین یعنی اور قدیم مفسرین کے اقوال اس سلسلے میں ملے جن کے اپنے دسترس بھر وہ نقل کرنے کے پابند ہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ گناہان کبیرہ سے پرہیز کی صورت میں صغائر پر جو مغفرت کا وعدہ ہے، اس سے متعلق ہے اور گویا ان لوگوں کو جو ایسے گناہگار ہوں ڈھارس دینا ہے اور ان کی طرف سے ایک عذر کا بیان ہے کہ آخر ہم ہی تو تمہارے خالق ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تم عام طور پر صرف نور سے پیدا نہیں ہوئے جس میں تقاضائے گناہ موجود ہی نہ ہو، تم تو ابتدا میں مٹی سے پیدا ہوئے ہو اور پھر نظام افزونی نسل میں نطفہ وغیرہ سے آگے بڑھ کر ماں کی پیٹ میں بچے کی شکل میں پہنچے ہو، تو اس کے بعد تو بہت بڑے کامل عقل والے ہیں وہ جنہیں خالق رہبری کے منصب کے لیے چنتا ہے وہ ہوتے ہیں جو صغائر سے بھی بری ہوں۔ تم میں ہر ایک تو ایسی کامل عقل کا مالک نہیں ہے تو ایسی غلطیاں تمہارے فطری جذبات کے ساتھ نادانی کا نتیجہ ہیں لہذا ان پر زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تو خالق نے اپنی طرف سے ان لوگوں کی دل جوئی کی۔ اب آدمیوں میں کچھ بخیاں خود بڑے پارسا اور پرہیزگار ایسے ہوتے ہیں جنہیں اپنی پابندی احکام شریعت کا بڑا زعم ہے کہ وہ دوسروں کی ذرا سی غلطیوں کو بہت اچھالتے ہیں اور انہیں بڑا ہولناک بنا کر پیش کرتے ہیں اور پھر اپنے کو مثال بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے اپنی برتری کا مظاہرہ ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو مخاطب کر کے متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اپنی پاکی

دامن کی حکایت کو اتنا دراز نہ کرو۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ کون کس حد تک واقعی پرہیزگار ہے۔ اس طرح ان کے یہاں ”رجاء“ کے ساتھ خوف کا پہلو پیدا کر دیا کہ کہیں تم ہی اللہ کے یہاں متقین کی فہرست سے خارج نہ ہو گئے ہو۔ بھلا اللہ جس طرح ہم نے تمام اجزا آیت کے باہمی ارتباط اور مطالب میں مسلسل ہونے کی تشریح کی ہے، وہ بڑی بسیط تفسیروں میں بھی ہمارے علم میں اتنی وضاحت کے ساتھ نہیں ہے۔

**أَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّى ۖ وَأَعْطَى قَلِيلًا ۖ وَأَكْدَى ۖ أَعِنْدَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ**

**فَهُوَ يَرَى ۖ**

”تو کیا دیکھا تم نے اسے جو پلٹ گیا اور ذرا سادیا اور پھر رک گیا، کیا اس کے پاس علم غیب ہے کہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے؟“

خود ان آیتوں کا مضمون بتا رہا ہے کہ ان کا تعلق کسی واقعہ سے ہے جو ان کے لیے شان نزول کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ طبری نے جامع البیان میں قدیم مفسرین کے حوالے سے درج کیا ہے کہ یہ شخص ولید بن مغیرہ تھا جس نے پہلے اسلام قبول کیا، جس پر اس کے دوست نے جو مشرکین میں سے تھا اسے برا بھلا کہا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ ولید نے کہا مجھے آخرت کے عذاب کا ڈر ہو، اس نے کہا کہ تم مجھے کچھ رقم دو اور میں تمہاری طرف سے آخرت کے عذاب کو اپنے اوپر لے لوں، یہ بے وقوف اس کے کہنے میں آ گیا اور اس سے ایک اقرار نامہ لکھوا کر اسے کچھ رقم دی اور اسلام سے منحرف ہو گیا۔ پھر اور تھوڑی رقم اس کو دی اور پھر جیسے اپنی حماقت کا احساس ہوا یا پیسے کی محبت دامن گیر ہوئی تو مزید رقم دینے سے منحرف ہو گیا۔ اسی شخص کا ان آیتوں میں ذکر ہے۔ کیا اس کے پاس علم غیب ہے؟ یعنی یہ احمق جس نے دوسرے کی بات کو مان لیا وہ اس کے عذاب کو اپنے اوپر لے لے فردائے قیامت کے کارخانے کا حال جانتا ہے؟ کہ وہاں ایک دوسرے کا بوجھ اٹھالے تو دوسرا عذاب سے بچ جائے گا [۱] بعض نے ولید کے تعین میں شک کا اظہار کیا ہے اس طرح کہ وہ کوئی دوسرا [۲] ہمارے بعض تفاسیر میں یہاں جناب عثمان اور ان کے برادر رضاعی کا نام آیا ہے۔ [۳]

**أَمْ لَمْ يُنَبِّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۖ وَإِنبُرْهِيمَ ۖ الَّذِي وَفَّى ۖ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ**

**أُخْرَىٰ ۖ وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۖ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۖ ثُمَّ**

**يُجْزَاهُ الْجِزَاءَ الْأَوْفَىٰ ۖ وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ ۖ**

”کیا اس تک خبر نہیں پہنچائی گئی اس کی جو موسیٰ کے اور وفاداری کرنے والے ابراہیم کے صحیفوں میں ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسروں کا بوجھ نہیں اٹھائیگا اور یہ کہ کسی آدمی کے لیے نتیجہ خیز نہیں ہے مگر وہی کوشش جو وہ

[۱] - اعندہ الذی ضمن له صاحبہ ان یتحمل عنہ عذاب اللہ فی الآخرة علم الغیب فہو یری حقیقتہ قولہ بما وعد (ابن جریر)

[۲] - هو الولید ابن المغیرہ (جلالین)

[۳] - فی المجمع نزلت الایات السبع یعنی ہذا وما بعدہا فی عثمان وکان یتصدقا وینفق فقال له اخوہ من الرضاۃ عبد اللہ ابن ابی سرح - اعطی ناقثک برحلہا وانا اتحمل عند ذنوبک کلہا (صافی)

کرے اور پھر اسی کے مطابق اس کا پورا پورا ابدلادیا جائے گا اور یہ کہ آخر میں پہنچنا اللہ ہی تک ہے۔“

## نتائج کا انحصار سعی و کوشش پر

یہاں سے تقریباً آخر سورہ تک نحوی قاعدہ کے لحاظ سے تو اسی شخص کو تنبیہ ہے جس کا ذکر تھا کہ کیا اسے یہ نہیں معلوم۔ یہ نہیں معلوم..... مگر یہ ایک مبلغ انداز قرآن مجید کا ہے جس سے ہم میں سے ہر ایک کو متنبہ کرتا ہے کہ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم ہے یہ نہیں معلوم ہے یعنی ہم تم سے کہتے ہیں یہ باتیں معلوم ہونی چاہیں، ان سب سے پہلا اصول یہی ہے کہ الاتزرو از ذرۃ و ذرۃ اخری ”کوئی دوسرے کو بوجھ نہیں اٹھا سکتا“۔

یعنی ہر ایک بد اعمالیوں کا خود ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا اس ذمے داری کو اپنے سر نہیں لے سکتا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ لیس للانسان الاما سعی“ ہر آدمی کے لیے نتیجہ وہ کوشش ہے۔ جو وہ انجام دے، یعنی اُس کے سامنے جو نتائج آئیں گے وہ اس کے سعی و عمل سے آئیں گے۔ یہ اصول قرآنی کے لحاظ سے اتنا ہمہ گیر ہے کہ ہر شعبہ عمل میں جو کسی نتیجہ کا طلب گار ہو اس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ وہ پوچھے کہ اس میں کیوں کر کامیابی ہو سکتی ہے تو اس کے سامنے یہ آیت پڑھ دی جائیں۔ کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى.

یہاں تک کہ اس کلیہ میں مقصد کے صحیح اور غلط ہونے کا سوال بھی نہیں ہے۔ یہ الگ سے سمجھنا چاہیے کہ مقصد کیا ہونا چاہیے۔ ہر مقصد کے حصول کا ذریعہ یہی ہے کہ اس راہ کو عملی طور پر اختیار کی جائے جو اس مقصد تک پہنچانے والی ہے۔ اب کوئی طالب مال ہو اور پوچھے کہ اموال کیوں کر حاصل ہوں تو اُس کے جواب میں یہی کہیے کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى. اُس طرح کوئی طالب علم ہو، کوئی طالب شہرت ہو، کوئی تجارت میں اپنی کامیابیوں کا طلب گار ہو اور اس طرح کوئی طالب نجات ہو تو ہر ایک کے سوال کا یہی جواب ہے اور جب اس جملے میں یہ وسعت ہے تو آخر میں جو بیجاہ جزاء الاوفیٰ ہے“ اسے پورا پورا صلہ ملے گا“ اُسے اجر آخرت سے مخصوص نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ جس کا جو ہدف نگاہ ہو، اُس کی سعی کا نتیجہ ہے جس کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ اُسے اس کوشش کا ثمرہ یا صلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور قرآن مجید کی کئی آیتیں اس کی مؤید ہیں جیسے:-

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۗ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ... (شوری ۲۰)

”جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس میں اس کے لیے صلہ دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے اس میں سے ملے گا اور اس کا آخرت میں حصہ نہ ہوگا“۔ یہ اس لیے کہ اس کا نصب العین صرف دنیا تھی۔ آخرت سے اسے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ ورنہ اگر آخرت کے ساتھ دنیا مطلوب ہو تو اس کی تو اسلام نے دعوت دی ہے اور اسے مثالی نقطہ نظر سے قرار دیا ہے کہ:-

اتَّعَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ ۲۰۱) ”ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی۔ اس کلیہ کے خلاف کہ لیس للانسان الاما سعی. ایک طرف تو جناب ابن عباسؓ کا قول طبری نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، دوسری آیت سے موجودہ ترتیب کے لحاظ سے اس سے قبل سورہ طور میں آئی ہے کہ:-

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ  
”جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ انکی پیروی کی تو ہم انکے ساتھ ان کی ذریت کو ملحق کر دیں گے“۔  
یعنی ان کے اعمال میں جو کمزوری ہے اسے نظر انداز کر کے بلند مرتبہ عطا کریں گے تو یہاں معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے ان کے اعمال

سے اولاد کو فائدہ پہنچ رہا ہے مگر ہم یہ ان اسلاف کے اعمال کے جز کا تمہ ہے کہ ان کی اولاد ان کے ساتھ ملحق ہو لہذا اسے بغیر سعی نہیں سمجھنا چاہیے۔ دوسری طرف منسوخی کا تصور اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ بعض عبادات میں نیابت شرع میں ثابت ہے..... جبکہ قرآن میں حکم کلیہ ہے تو اسے از قبیل مستثنیٰ سمجھا جاسکتا ہے جس سے اصل حکم منسوخ پھر بھی نہیں ہوتا، [۱] بعض نے اسے زبردستی اس کلیے کے مطابق بنانے کے لئے کہا ہے کہ جس نے قرابت یا دوستی کی بنا پر نیابت میت کی طرف سے عبادت کیے۔ اس کے دل میں محبت تو اس میت ہی نے اپنے برتاؤ سے پیدا کی ہے، لہذا وہ بھی اس کی ایک کوشش کا نتیجہ ہے [۲] مگر ہم نے اس کے لیے زبردستی کے لفظ کا استعمال اس بنا پر کیا کہ نماز اجارہ وغیرہ کو کیا کہا جائے گا جو شریعت میں ثابت ہے۔ پھر بغیر اجارہ اس نیابت کے ساتھ عبادت کرنے والے ایسے بلند ظرف بھی ہو سکتے ہیں کہ میت نے ان کے ساتھ کوئی حسن سلوک نہ کیا ہو بلکہ بدسلوکی کا برتاؤ رکھا ہو اور وہ پھر بھی اس کا رنجہ کو اسے فائدہ پہنچانے کے لیے انجام دیں تو کیا ان کی یہ عبادتیں قابل قبول نہ ہونگی لہذا زیادہ درست وہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان چیزوں کو از قبیل مستثنیات سمجھا جائے۔

یہ بھی ہم سمجھ سکتے ہیں کہ صدر اول میں اصطلاحات پورے طور پر منسوخ نہیں ہوئے تھے لہذا کبھی کبھی مطلق کی تفسیر اور عام کی تخصیص کی بھی نسخ سے تعبیر کی جاتی تھی اور لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى. اس ہمہ گیری بعد بھی جو ہم نے بتائی کہ وہ دنیا اور آخرت کے ہر شعبے پر حاوی ہے پھر بھی ایک عمومی اصول کی حیثیت رکھتا ہے جس میں عقلی و نقلی طور پر دونوں سے قیود اور مستثنیات کی بہت گنجائش ہے مثلاً دنیوی مقاصد میں چاہے وہ رزق ہو، چاہے وہ تحصیل علم ہو اور ایسا ہی جو مقصد ہو اس کے ساتھ خالق کی طرف کے غیر مشروط فیصلہ تقدیر سے ٹکراؤ نہ ہونے کی شرط لازمی ہے ورنہ ہر مقصد میں جو وسیع عالمی نظام کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے اگر ٹکرا جائے تو لاکھ سعی کرے، نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اسی طرح آخرت میں ایک طرف سے تو ہم کلیہ بنا سکتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ حسن عمل والی سعی رائیگاں جانا بر بنائے عدل ممکن نہیں ہے مگر سعی و عمل کے بغیر یا مقدار سعی سے زیادہ کسی صورت میں جزا کا حصول چونکہ تفضل ہے اس لیے اس کی اس آیت سے نفی ہو سکتی ہے۔ اس طرح حسن عمل کے ساتھ جزا کا نہ ملنا تو چونکہ خلاف عدل ہے اس لیے نہیں ہو سکتا مگر سوائے عمل والی سعی کے نتیجہ میں سزا کا ملنا ضروری نہیں ہے لہذا اس آیت کی وجہ سے شفاعت وغیرہ کا سد باب نہیں ہوگا۔

ان الی ربك المنتہی کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ”آخر میں پہنچنا تمہارے پروردگار کی طرف ہے“ اس طرح یہ المنتہی کا لفظ ویسا ہو گیا جیسے قرآن مجید میں مصیر کا لفظ ہے (والی اللہ المصیر) اس کے تحت میں یہ بھی تمام معاملات کی انتہا اس کے فیصلے پر ہے جیسا کہ ارشاد ہوا (والی اللہ ترجع الامور) ہمارے ائمہ معصومین نے اس کے ماتحت اس کا ایک تقاضا یہ بتایا ہے کہ جب بات خدا تک پہنچ جائے تو سر تسلیم خم کر دو پھر زیادہ قیل وقال نہ کرو اور ذات الہی اور اس کے اوصاف کی حقیقت سمجھنے میں فلسفہ آزمائی نہ کرو [۳]

[۱] من قال اللہ غیر منسوخ الحکم قال انہ علی منع النیابتنہ فی الطاعات الا ما قام الدلیل علیہ (مجمع البیان)

[۲] ما جاء فی الاخبار من ان الصدقہ والحج ینفعان المیت فذالك انما هو لمحبتہ زرعها المیت فی القلب النادی له النائب عنہ فهو من جملة سعیه (صافی)

[۳] فی الکافی التوحید عن الصادق علیہ السلام ان اللہ یقول: وان ربك المنتہی کلام الی اللہ فامسکو اوفی التوحید عن الباقر علیہ السلام قیل له ان للناس قد اکثر وافی الصفیة الی اللہ فما تقول قال مکروه اما تسمع اللہ عزوجل یقول وان اللہ الی ربك المنتہی تکلموا فیما دون ذالك (صافی)

وَأَنَّهُ هُوَ أَصْحَابُكَ وَأَبْنَىٰ ۖ وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتٌ وَأَحْيَا ۖ وَأَنَّهُ خَلَقَ الزُّوجَيْنِ الذَّكَرَ  
وَالْأُنثَىٰ ۖ مِنْ نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ۖ وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْأُخْرَىٰ ۖ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ  
وَأَقْنَىٰ ۖ وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشَّعْرَىٰ ۖ

”اور یہ کہ وہی ہے جس نے ہنسیا ہے اور رلا یا ہے اور یہ کہ وہی ہے جس نے مردہ کیا اور زندہ کیا اور یہ کہ وہی ہے جس نے مرد اور عورت کے جوڑے پیدا کیے ایک خاص نطفے سے جب وہ بہایا جاتا ہے اور یہ اس کے ذمے ہے دوسری دفعہ کا پیدا کرنا اور یہ کہ اُس نے غنی بنایا اور فقیر کیا ہے اور یہ وہی شعریٰ (ستارے) کا پروردگار ہے۔“

یہ اور..... یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں کہ صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ میں یہ بھی ہے اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ قیل کی مناسبت سے جو ان میں کی ایک کی تعلیم بیان کی گئی ہے کہ ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ ہر انسان کے لیے نتائج اس کے سعی اور عمل سے وابستہ ہیں تو اب اسی سلسلے میں ان صحیفوں کے اور مندرجات جنہیں دنیا بھولی ہوئی ہے یاد دلانے کے لیے لگے جس کے ذیل میں یہ نتیجہ پنہاں ہے کہ اسباب پر بھروسے کے ساتھ اس خالق اسباب کو نہ بھولو جس کے ہاتھ میں سلسلہ اسباب کی پہلی کڑی ہے۔

تم سمجھتے ہو حالات ہنسائے اور رلاتے ہیں، دنیا حالات سے آگے بڑھتی ہے تو دہر یا زمانے کو کہتی ہے کہ انقلابات دہر ہیں اور وہ کرتے ہیں اور مسبب الاسباب کو بھول جاتی ہے۔ آدمی زہر کو قاتل سمجھتا ہے اور انگبین کو باعث شفا سمجھتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اصل زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے۔ پیدائش کے لیے ماں باپ کا ہونا بھی ایک سبب ہے اس کا قرار دیا ہوا اور پھر اسی سے سمجھ لو کہ جس کے ہاتھ میں یہ زندگی اور موت ہے تو وہ دوسری زندگی دینے پر جزا و سزا کے لیے بھی قادر ہے جو بقضائے عدل اس کا ایک فریضہ ہے جو اس آیت میں علیہ کا لفظ علی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جس کے معنی ہیں اس پر ہے دوسری دفعہ زندہ کرتا ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ حسن تدبیر اور سوء تدبیر سے دولت اور عزت ہوتی ہے۔ ہاں ہیں یہ بھی اسباب اس لیے سعی کا حکم ہوا ہے مگر اس میں بھی نتیجہ اس کے ہاتھ میں ہے، دولت دینے والا اور غریب رکھنے والا وہی ہے اور کچھ لوگ اس کا سبب ستاروں کے قرار دے لیتے ہیں اور اس لیے مشرکین عرب کا ایک طبقہ ستارہ شعریٰ کی پرستش کرنے لگا تو سن لو کہ شعریٰ کا مالک بھی وہی ہے۔

اغنی کے ساتھ جو اقنی کی لفظ ہے، اس میں دو معنی اور ہیں، ایک یہ کہ ساز و سامان کا مالک بنایا، بعض نے ترجمہ اس کے موافق کیا ہے [1] دوسرے یہ کہ راضی و خوشنود کیا، جس کے موافق تفسیر اور ایک روایت میں جناب امیر کا ارشاد نقل ہوا ہے اور اس میں یہ تشریح ہے کہ اس نے دولت مند بنایا اور اپنی سعی و کوشش سے خوشنود کیا [2] ظاہر ہے کہ یہ ارشاد نقل شدہ اگر بطریق صحیح ہم تک پہنچ جائے تو سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے مگر یہ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ اور ان دونوں تشریحوں میں اقنی اور اغنی کا تقریباً ہم معنی یا اس کا تتمہ ہو جاتا ہے حالانکہ اس کے پہلے کے تمام جملوں میں تضاد کا پہلو نمایاں ہے، خندہ و گریہ، موت و زندگی، مرد و عورت۔ لہذا میرا ذہن اس معنی کو قبول کرتا ہے جسے طبری نے نقل

[1] - اقنی واعطى المتخذ فتية... جلالین) تو نگر کر دو سدر مایہ دار (ولی اللہ) دولت مند کیا اور خزانے والا کیا (رفیع الدین)

[2] - المیزان: از امیر المؤمنین صلوات اللہ علیہ..... اغنی کل انسان بعیشة ارضاہ بکسب یدہ (قاموس قرآن)

اقوال میں سب سے آخر میں درج کیا ہے کہ اغنی کے معنی ہیں دولت مند بنایا اور قنی کے معنی ہیں فقروفاقیہ میں مبتلا کیا جس کے موافق آیات خود قرآن مجید متعدد مقامات پر موجود ہیں [۱] لہذا میں نے اُسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

ستارہ شعری کا نام خصوصیت کے ساتھ لینے کی ایک وجہ بیان کی گئی ہے کہ قبیلہ قریش کے گزشتہ اسلاف میں سے ابو کبشہ تھا اور مشرکین رسول گلوبطرحن و تشنیع ابن ابی کبشہ کہتے تھے کہ انہوں نے بھی ایسا ہی نیاندھب ایجاد کیا ہے اس لیے یہاں معبود حقیقی کا رب الشعری کہہ کے تعارف کرایا ہے کہ میں شعری کی عبادت کا نہیں بلکہ اس کی عبادت کا داعی ہوں جو شعری کا بھی مالک ہے [۲]

وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ ۝۵۰ وَثَمُودًا فَمَا أَبْقَىٰ ۝۵۱ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَىٰ ۝۵۲ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ ۝۵۳ فَغَشَّهَا مَا غَشَّىٰ ۝۵۴ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارَىٰ ۝۵۵

”اور یہ کہ اُس نے پہلے والے قبیلہ عاد کو ہلاک کر دیا اور قبیلہ ثمود کو تو ان پر ترس نہیں کھایا اور نوح کی قوم کو اس کے پہلے کہ وہ اور بھی زیادہ ظالم اور سرکش تھے۔ اور قوم لوط کی بستیوں کو اوپر سے نیچے گرایا تو ان پر چھائی وہ آفت کہ چھائی تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں میں شک کرو گے؟“

چونکہ اس سے پہلے اس فقرے میں ہے کہ ”وہ شعری“ کا مالک ہے اور شعری مشرکین کے ایک گروہ کا معبود ہے، ذہن سننے والے مشرکین کی جماعت کی طرف مڑ جاتا ہی ہے، اس لیے اب سابق کی مشرک جماعتوں کا دنیا میں کیا کیا انجام ہوا، ان کا ان آیتوں میں مسلسل ذکر ہوا ہے۔ عاد کے لیے اولیٰ کی صفت آنے کی وجہ بتائی گئی ہے کہ اس قبیلہ عاد کے کچھ لوگ جا کر مکے کی سر زمین پر بس گئے تھے۔ وہ اس عذاب کے نازل ہونے کے موقع پر وہاں موجود نہ تھے۔ وہ بعد میں آپس میں لڑ لڑ کر تباہ ہوئے [۳]

قبیلہ ثمود کے لیے فَمَا أَبْقَىٰ کے لفظ کو ہم نے بقیا سے لیا ہے جس کے معنی ترس کے ہیں لیکن دوسرے لوگوں نے اس کو باقی رکھنے کے معنی میں لیا ہے کہ انہیں باقی نہیں رکھا۔ ہمارے نزدیک پہلا مفہوم زیادہ مناسب ہے۔ الْمُؤْتَفِكَةَ یعنی قوم لوط کی بستیوں کے لیے فَمَا هَوَىٰ کے لفظ کا ان کی نوعیت عذاب کے لحاظ سے اوپر سے نیچے گرانے کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اس کے معنی تباہ اور برباد کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں ”ان پر چھایا جو کہ چھایا“ اس سے دوسری نوعیت عذاب کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے یعنی پتھروں کی بارش۔

ان تمام قوموں کو ہلاکت کے بعد اللہ کی نعمتوں کو یاد دلایا ایک بڑا سخت تازیانہ ان قوموں اور افراد کے کردار پر ہے جس کی چوٹ انہیں محسوس کرنا چاہیے جو اس وقت دار دنیا میں موجود ہیں اور انہی کے کردار کے حامل ہیں کہ ایسوں کا وجود انسانیت کی پشت پر ایک بوجھ ہے جس کا

[۱] قال ابن زید: اغنی فاکثرو اوقنی اقل قرأ۔ یبسط الرزق لمن یشاء من عباده ویقدر له (ابن جریر)

[۲] کان المشرکین میمو الدین ابن ابی کبشہ الحانۃ ایہم فی الدین لما خالف ابو کبشہ غیرہ فی عبادۃ الشعری (مجمع البیان)

[۳] کان ہلاک عاد الاخرۃ ینبغی بعضہم علی بعض فتقاتلوا بالقتل... (ابن جریر)





ہو، جیسی ام سابقہ پر جن کا ذکر پہلے ہو، تباہی آئی۔ اس طرح کاشفہ کا ترجمہ ”ہٹانے والا“ درست ہوگا۔ یعنی وہ بری ساعت جو قریب ہے اس کا ہٹانے والا سو اللہ کے کوئی نہیں ہے۔

أَفَمِنْ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ﴿٥٩﴾ وَتَضْحَكُونَ ﴿٦٠﴾ وَلَا تَبْكُونَ ﴿٦١﴾ وَأَنْتُمْ سَمِدُونَ ﴿٦٢﴾  
فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ﴿٦٣﴾

”تو کیا اس تذکرے سے تم تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور تم غرور سے سراٹھائے چلتے ہو تو اب اللہ کے لیے سجدہ کرو اور عبادت گزار ہو۔“

حدیث جس کا ترجمہ ہم نے ”تذکرے“ کے ساتھ کیا ہے، اس سے مراد قبل میں جو کچھ بیان ہوا اس کی طرف اشارہ تو ہو سکتا ہے مگر چونکہ قرآن مجید میں متعدد آیات میں خود قرآن مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال ہوا ہے جیسے سورہ واقعہ آیت ۸۱، ۸۲ میں:  
أَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ ﴿٥٩﴾ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْتُمْ تُكذِّبُونَ ﴿٦٠﴾ تو کیا اس ”تذکرے“ سے تم لوگ منحرف ہو اور اپنی روزی بنائے ہو کہ اس کو جھٹلاتے ہو۔

اور سورہ ”مرسلات“ کے آخر میں:

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ آيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ”تو کس تذکرے پر اس کے بعد تم ایمان لاو گے؟“

اس لیے یہاں بھی ”اس تذکرے“ سے قرآن مراد لیا گیا ہے [۱] سادون کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، صحاح جوہری کے مطابق ہے کہ سمودارفع رأسه تكبرا۔ اور دوسرے مترجمین نے مختلف ترجمے کیے ہیں [۲]  
اس آیت کے آخر میں دو سجدہ عبادت کا حکم ہے، اُس کی تعمیل میں سجدہ یہاں پر شریعت اسلام میں فقہ جعفری کی رو سے واجب ہے [۳] جسے احترام فرمان الہی کی ایک رمزی علامت کے طور پر تعبیری حکم سمجھنا چاہیے۔

[۱] - أفمن هذا القرآن أيها الناس تعجبون (ابن جریر)

[۲] - بازی کنند ہستید (شاہ ولی اللہ) تم غفلت میں ہو (رفیع الدین)

[۳] - علی ما يذهب اليه اصحابنا (تبیان)

# سُورَةُ الْقَمَرِ

مکیہ ..... ۵۵ آیات

چونکہ پہلی ہی آیت میں چاند کے شق ہونے کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام سورہ قمر ہوا۔

**سورہ قمر کے خاص خاص مضامین:**

- ۱..... قیامت کا قریب آنا اور شق القمر ہونا۔
- ۲..... اتمام حجت ہو جانا اور اس کے بعد پیغمبروں کے فرض کا پورا ہو جانا۔
- ۳..... قیام قیامت کا ابتدائی ہولناک منظر۔
- ۴..... قوم نوح اور طوفان کی نوعیت۔
- ۵..... کشتی نوح کا ستاروں کے سہارے ہی نہیں بلکہ اللہ کی نگاہوں کے اشارے پر چلنا۔
- ۶..... قوم عاد پر عذاب اور اس کا ایسے دن آنا جو دائمی طور پر منحوس ہے۔
- ۷..... قوم ثمود اور ناقہ صالح اور قوم کو ہدایت کہ ایک دن چشمے کا پانی اس کے حصے کا ہوگا، کوئی اس دن چشمے پر نہ جائیں اور ایک دن ان لوگوں کا ہوگا۔ قوم کی نافرمانی اور ناقے کو پے کر ڈالنا اور پھر عذاب الہی کا آنا اور اس کا مختصر پس منظر۔
- ۸..... قوم لوط پر عذاب کا آنا اور اس کا مختصر پس منظر۔
- ۹..... قوم فرعون پر عذاب کا بہت مجمل تذکرہ
- ۱۰..... زمانہ رسول کے مشرکین کو سخت ترین الفاظ میں انتباہ۔
- ۱۱..... اس کی طرف اشارہ کہ ان کے افعال تو وہی ہیں جن کی وجہ سے قوموں پر عذاب نازل ہوتا رہا اور انکے پاس اس عذاب سے بچنے کے لیے کوئی روک نہیں ہے، مگر کچھ ہے جو ان کے عذاب کو آخرت پر اٹھا رکھا ہے جس کا سبب دوسری جگہ ہے کہ رحمۃ للعالمین کے قدم کی برکت ہے جو اس دنیا میں اس طرح کا عذاب نازل نہیں ہوتا۔
- ۱۲..... نامہ اعمال کو یاد دلانا کہ یہ نہ سمجھو کہ تمہاری کوئی بات نظر انداز کر دی جائے گی، وہ سب محفوظ ہے۔
- ۱۳..... آخر میں پرہیزگاروں کو مژدہ۔

**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ**

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاَنْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَبِرٌّ ② وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْا اَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقَرٌّ ③ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْاَنْبَاءِ مَا فِيْهِمْ مُّرْدَجَرٌ ④ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ الْغُدْرُ ⑤

”قیامت نزدیک آگئی اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور اگر وہ کوئی بھی معجزہ دیکھیں تو روگردانی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ ایک جادو ہے جو مستقل طور پر قائم ہے اور انہوں نے جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر بات میں یکسوئی ہونا ہے اور ان کے پاس خبریں ایسی آچکی ہیں جو ان کے باز لانے کے لیے کافی ہیں، پر اثر حکمت تو نہیں فائدہ دیتے انہیں ڈرانے والے۔“

### شق القمر ہونا

چونکہ پہلے جملے میں قیامت کا ذکر ہے اس لیے معجزات انبیاء کے منکرئی روشنی والے لوگ چاند کے شق ہونے کو ان علامات سے متعلق قرار دیتے ہیں جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گی۔ اس صورت میں شق القمر کے اظہار میں جو ماضی کا صیغہ ہے، اسے یقینی ہونے کی بنا پر مستقبل کی تعبیر سمجھا جائے گا۔ جو مجاز ہے مگر اس کی نظیریں قرآن میں بکثرت موجود ہے اس لیکن چونکہ معجزات پیغمبر اسلام ﷺ میں شق القمر کا معجزہ متواتر موجود ہے اس لیے مجاز قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، رہ گیا قیامت کا قریب ہونا، وہ تو بعثت رسولؐ ہی کو قرب قیامت کی علامت بتایا گیا ہے اور خود قیامت کے قریب ہونے کا اعلان ہے، یہاں تک کہ قیامت کا ایک نام ہی یوم الآزفہ ہو گیا جس کے معنی نزدیکی گھڑی کے ہیں، اور پھر اس کے بعد والی آیتوں میں معجزے کا ذکر ہے کہ کتنے ہی معجزے دکھائے جائیں، یہ نہیں مانیں گے اس لیے ظاہر قرآن سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ معجزہ شق القمر کا بیان ہے۔

بے شک یقینی طور پر جو ثابت ہے کہ وہ اجمالی طور پر شق ہونا ہے جو تمام روایات میں مشترک حیثیت رکھتا ہے لیکن تفصیل اس کی کہ یہ کس نوعیت سے ہے جو ایک ایک دو روایتوں میں مذکور ہے، اسے پورے طور پر ثابت نہیں سمجھا جاسکتا جب کہ اس تفصیلی کیفیت کے بارے میں اختلاف بھی ہے۔

رہ گیا سائنس سے اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرنا، تو ہمارے نزدیک کسی بھی معجزہ کی نوعیت کا سائنس سے سمجھنے کی کوشش کرنا دور از کار ہے۔

ہماری قدیم تفسیر میں اسے بطور مسلمات درج کیا ہے اور جناب شیخ طائفہ نے تبیان میں کثرت روایات کے اظہار کے بعد اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع بتایا ہے اور کہا ہے کہ اس میں میخیں نکالنا اس طرح کہ اگر ایسا ہوتا تو دوسرے ممالک میں بھی دیکھا جاتا بالکل بے کار کی باتیں ہیں۔ اس لیے کہ اس کا ظہور ایک مختصر وقت کے لیے شب کے کسی حصے میں ہوا تھا جس وقت بہت سے ملکوں کے لوگ سوتے ہوتے ہیں اور جاگتے بھی ہوں تو پہلے سے اس کا اعلان نہ ہوا تھا کہ لوگ زیر آسمان آ کر اس کے دیکھنے کے لیے آسمان پر مسلسل نظر رکھیں (تبیان) بہر حال جیسا کہ میں نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے شق القمر ویسا عمومی معجزہ رسولؐ کا نہیں ہے جسے بطور برہان رسالت تمام خلایق کے لیے پیش کیا گیا ہو بلکہ

انکا اصل معجزہ قرآن ہے جس پر برابرتحوی ہوئی ہے کہ کوئی اس کے مقابل کی چیز پیش کر دے۔

تاہم ہمارے یہاں کی تفاسیر میں اگرچہ تفسیر برہان میں ہمارے ائمہ علیہم السلام کی تین ہی حدیثیں نقل ہوئی ہیں مگر علامہ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے کہ سواعطا اور حسن اور بٹنی کے تمام مفسرین و محدثین کا اس پر اجماع ہے اور علامہ مجلسی نے بھی بحار میں تفصیل کے ساتھ اس سلسلہ کے روایات نقل کیے ہیں۔

اہل سنت کے مفسرین میں حافظ ابن جریر طبری بے جامع البیان میں اس سلسلہ میں جو روایتیں درج کی ہیں، ان میں صحابہ رسول میں انس بن مالک سے سات روایتیں ہیں۔ عبداللہ ابن مسعود سے آٹھ روایتیں ہیں۔ عبداللہ ابن عمر سے ایک۔ خذیفہ بن الیمان سے تین، جس میں سے آخری روایت میں نام نہیں لکھا ہے بلکہ ابوسنان نے بیان کیا ہے کہ؛ قدم رجل المدائن ایک صاحب مدائن آئے، وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے یہ کہا۔ ”کھڑے ہوئے“ کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انہوں نے خطبہ پڑھا اور خطبہ پڑھنا گورنر کے ایسے ذمہ دار شخص کا کام ہوتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ جناب خذیفہ گورنر بنا کر مدائن بھیجے گئے تھے اور سابق کی دو روایتیں جو صراحتہ خذیفہ کے نام پر مشتمل ہیں مضمون میں اس سے متحد ہیں، اس لیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب خذیفہ ہی تھے۔ جبیر ابن مطعم سے دو روایتیں اور ابن عباس سے پانچ روایتیں ہیں۔ ان میں ان صحابہ کا چشم دید بیان درج ہے مگر روایتی حیثیت سے ان میں سے بعض میں یہ کمزوری ہے کہ وہ عہد رسول میں کم سن تھے اور یہ واقعہ مکہ معظمہ کا ہے جس دیکھنے والے مہاجرین ہو سکتے ہیں جو مکہ کی زندگی کے شاہد بن سکتے ہوں اس لیے صحابہ کے بیان کا اس واقعہ کے تذکرے میں وہی وزن ہے جو تابعین کے اقوال اس سلسلے میں موجود ہیں جیسے مجاہد اور قتادہ اشحاک اور ابراہیم وغیرہ۔

بنیادی طور پر اعتقاد رسالت کا رکن نہ ہونے کے بعد بھی چونکہ معجزات رسول میں وہ ایک اہم حیثیت کا معجزہ ہے اور کسی بھی معجزہ کو عقل سے اس کی توجیہ نہ ہونے کی بنا پر رد کرنا درست نہیں ہے، اس لیے ایک مسلمان سے اس کا انکار درست نہیں ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ مَرِيئًا يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى شَيْءٍ تُكْرِهُ ۖ حُشَعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ  
مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ۖ مُهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ ۖ يَقُولُ  
الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝

”تو آپ ان سے منہ موڑ لیجیے کہ جب پکارنے والا پکارے گا ایک سخت ناگوار انجام کے لیے اس عالم میں کہ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی نکلیں گے قبروں سے جیسے چاروں طرف پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہوتی ہے، دہشت کے ساتھ نظریں جمائیں ہوئے پکارنے والے کی طرف اس وقت کافر کہہ رہے ہوں گے کہ یہ بڑا دشوار دن ہے۔“

مُهْطِعِينَ کے لفظ کے دو معنی اس محل پر چسپاں ہیں۔ ایک جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے اور اقرب الموارد کی تشریح اس کے مطابق ہے کہ ”دہشت زدہ صورت سے نگاہیں جمائے دیکھ رہے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ پکارنے والے آواز پر تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے۔“

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ آپ ان سے روگردانی کیجیے، اس حکم پر پہلی بات ختم ہوگئی یعنی ان پر اتمام حجت ہو چکا، اب آپ ان سے بحث

وتكرار نہ کیجیے۔ [۱] اس کے بعد حشر و نشر کا ذکر ہونے لگا۔ مطلب یہ ہوا کہ بس اب ان کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ۙ ﴿٩﴾ فَدَعَا  
رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۙ ﴿١٠﴾ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّهِيبٍ ۙ ﴿١١﴾ وَجَعَلْنَا  
الْأَرْضَ عَيْوُنًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدِيرٍ ۙ ﴿١٢﴾ وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ الْأَوَّاحِ  
وَالدُّسْرِ ۙ ﴿١٣﴾ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا ۙ جَزَاءً لِّمَن كَانَ كُفِرًا ۙ ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ  
مُدَّكِرٍ ۙ ﴿١٥﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرٍ ۙ ﴿١٦﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ  
مُدَّكِرٍ ۙ ﴿١٦﴾

”ان کے پہلے نوح کی قوم والوں نے جھٹلایا تو ہمارے بندے پر دروغ گو ہونے کا الزام لگایا اور کہا دیوانہ ہے اور انہیں سختی سے ڈرایا ڈپٹا گیا تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں ان کے مقابلے میں بے بس ہوں تو مدد فرما تو ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے برستے پانی کے ساتھ اور ہم نے زمین میں سے چشمے جاری کر دیئے تو وہ سب پانی (ادھر ادھر کا) مل گیا ایک تقدیری فیصلے کے مطابق اور ہم نے ان (اپنے بندے نوح) کو سوار کیا تختیوں اور میخوں والی (کشتی) پر جو ہماری نگاہوں کی اشاروں پر چلتی تھی صلے کے طور پر اس شخص کے لیے جس کی ناشکری کی گئی اور ہم نے اس کو اس ایک قدرت کی نشانی کے طور پر چھوڑ رکھا تو کیا ہے کوئی جو اس سے آڑے؟ تو دیکھا کیسا تھا میرا عذاب اور میری طرف ڈرانے والا اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے؟“

### قوم نوحؑ اور طوفان نوحؑ کی نوعیت

سابق والے تذکرے کے بعد یہ کہنا کہ ان سے پہلے نوحؑ کی قوم نے جھٹلایا، اس کی دلیل ہے کہ اس کے پہلے جو شق القمر اور قوم کے جھٹلانے کا جو ذکر تھا وہ رسول اللہ ﷺ کے دور کا ایک واقعہ تھا اور اسی کو اس وقت کے لوگوں نے جھٹلایا تو کہا جا رہا ہے کہ ان کے پہلے اس جرم تکذیب کا ارتکاب کیا اور اسی سلسلہ میں ان کا انجام اور پھر عادات و رسوم وغیرہ سب کا ذکر ہے کہ ان سب نے جھٹلایا تو ان کا کیا انجام ہوا ہے اسی طرح آخر تک پورا سورۃ شق القمر کو دیکھ کر اس کے نہ ماننے والوں کے ذکر سے مرتبط ہے اور بیچ بیچ میں ہر تذکرے کے بعد اس دور کے لوگوں کو انتباہ ہے اس سب کا قیامت کے تذکرے سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

اس کشتی کے ذکر کے بعد یہ جملہ کہ اسے ہم نے قدرت کی نشانی کے طور پر چھوڑ دیا، (بعد والوں کے لیے) یہ اس کے بعد واقعات یعنی

[۱] ہؤلاء ما قبلہ وبم تتم الکلام (جلالین)



وہ تیز و تند ایسی تھی کہ آدمیوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی تھی جیسے اکھڑے ہوئے کھجور کے درختوں کے تنے ہوں۔ ایک جگہ ہے ”تُدَّهْرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا (الاحقاف۔ ۲۵)“ ہر چیز کو وہ برباد کرتی تھی، اپنے پروردگار کے حکم سے، اس کے بعد یہ حکم الہی کا کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے مکانات باقی رہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے فَأَصْبَحُوا لَا يُرَى إِلَّا مَسَكِنُهُمْ۔ یہ حکم الہی اس لیے تھا کہ وہ مکانات بعد والوں کے لیے باعث عبرت ہوں۔

قوم عاد کے عذاب والے دن کا نخس کہا گیا اور اس کے ساتھ مستمر کی لفظ صرف کی گئی اس لفظ کو بعض لوگ طاقت ور کے معنی میں لیتے ہیں جیسے قرآن میں آچکا ذومرہ ”طاقت والا“ اسی مرہ کی لفظ سے یہ مستمر ہے۔ تب صرف یہ معنی نکلیں گے کہ وہ سخت منحوس دن تھا اور بعض اسے استمرار بعض دوام و بقا سے لیتے ہیں تب معنی یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے منحوس دن تھا اب اس نحوست کے لیے ایک تصور یہ ہے کہ وہ نحوست انہی کے لیے تھی..... ہمیشہ کے لیے۔ کیوں کہ یہ عذاب ان پر آیا اس کی بربادی قیامت سے متصل ہے۔

اور ایک یہ کہ ایام ہفتہ میں سے وہ دن قیامت تک کے لیے سب کے واسطے منحوس قرار پا گیا۔ اور اسے مطلق بدھ یا مہینے کے آخر کا بدھ بتایا گیا ہے تفسیر صافی میں کئی حدیثیں درج کی ہیں جن میں اسے چہار شنبہ کا دن قرار دیا ہے۔ علل الشرائع کی حدیث امام جعفر صادقؑ سے ہے کہ وہ عذاب آٹھ دن قائم رہا تھا جن میں پہلا دن چہار شنبہ تھا اور آخری دن بھی چہار شنبہ تھا۔ اس لیے میرا نظریہ یہ رہا ہے کہ ہفتے کے دنوں کی سعادت و نحوست تو کچھ ثابت ہوتی ہے لیکن مہینے کے دنوں میں سعد اور نخس اور میانہ کے جو نقشے چھپا کرتے ہیں ان کا کوئی معتبر ماخذ نہیں ہے۔

جو لوگ سعادت اور نحوست کے منکر ہیں، ان کی تائید کے لیے بھی کچھ احادیث موجود ہیں چنانچہ تحف العقول میں حسن بن مسعود کی روایت ہے کہ میں امام علیؑ کی خدمت میں گیا۔ راستے میں میری انگلی زخمی ہو گئی اور مرکب جس پر سوار تھا، اس نے بھی مجھے بہت پریشان کیا اور راہ میں بھیڑ بھاڑ لوگوں کی اتنی تھی کہ میرے کپڑے پھٹ گئے۔ اس حال میں پہنچا تو میں نے امام کے سامنے یہ جملہ کہا: کفانی اللہ شرک من یوم ما اشبک، اے کجنت دن تو کیسا منحوس تھا، خدا ہی نے تیرے شر سے میری جان بچائی۔

حضرت نے یہ جملہ سن کر فرمایا: یا حسن! ہذا وانت تغشانا تروہی بذنوبک من لا ذنب لہ؛ اے حسن! یہ عالم ہے جب کہ تم ہمارے پاس آیا کرتے ہو، تم اپنے گناہ کا الزام ایسے پر عائد کرتے ہو جو بے گناہ ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ امام کے اس جملے سے میری عقل واپس آئی اور اپنی غلطی کا احساس کیا۔ میں نے عرض کی کیا حضور! میرے لیے خدا سے مغفرت کی دعا کیجیے۔ حضرت نے فرمایا: یا حسن! ما ذنب الایام حتی صرتم تشاءمون بہا اذا جوزیتہم باعمالکم فیہا۔ اے حسن! دنوں کا کیا قصور ہے جو تم انہیں منحوس قرار دیتے ہو، جب کہ ان میں تمہارے اعمال کی سزا ملے۔

پھر فرمایا: لا تعد ولا تجعل لایام صنعافی حکم اللہ۔ اب ایسا نہ کرنا اور دنوں کی کارگزاری نہ سمجھنا اللہ کے فیصلے میں۔ اس کے علاوہ وسائل الشیعہ کتاب الحج میں ابواب آداب السفر کے آٹھویں باب میں یہ روایت ہے کہ اہل بغداد میں سے ایک شخص نے امام موسیٰ کاظمؑ کو لکھا اور مہینے کی آخری بدھ میں سفر کرے اس لیے کہ شگون ماننے والوں کی مخالفت کرنا چاہتا ہو تو وہ ہر آفت و بلا سے محفوظ رہے گا اور خداوند عالم اسے اس کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے گا۔ وہاں اہم واقعات کے انتساب سے مبارک اور منحوس ماننا جیسے ولادت معصومین کی تاریخوں کو مبارک سمجھنا یا وفات کی تاریخوں کو اور اسی میں ایام عزاء داخل ہیں برا سمجھنا، یہ دوسری چیز ہے اور اس کی تائید بھی وسائل کی

ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ پیر منحوس دن ہے اس لیے کہ اس میں ہمارے رسولؐ نے رحلت فرمائی اور وحی کا دروازہ بند ہوا۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ۚ ﴿٣١﴾ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّمَّنَّا وَاحِدًا نَتَّبِعُهُ ۗ إِنَّا إِذَا لَفِئَ ضَلَّلٍ  
وَسُعُرٍ ۚ ﴿٣٢﴾ أَلَيْسَ الَّذِي كُرِّ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌّ ۚ ﴿٣٣﴾ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَنِ  
الْكَذَّابُ الْأَشِرُّ ۚ ﴿٣٤﴾ إِنَّا مَرْسَلُوا النَّاقَةَ فِتْنَةً لَهُمْ فَأَرْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۚ ﴿٣٥﴾ وَنَبِّئْهُمْ  
أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ ۗ كُلُّ شَرِبٍ فَحْتَصَرٌّ ۚ ﴿٣٦﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ۚ ﴿٣٧﴾  
فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۚ ﴿٣٨﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ  
الْمُحْتَضِرِ ۚ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ ۚ ﴿٤٠﴾

”قبیلہ ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا تو انھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے میں سے ایک عدد آدمی کی پیروی کریں۔ اس صورت میں تو ہم بالکل گمراہ اور دیوانے ثابت ہوں گے۔ کیا ہم میں سے اسی پر وحی خداوندی اتری ہے بلکہ یہ ایک گھمنڈ یا بڑا جھوٹا ہے۔ انھیں بہت جلد کل ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون گھمنڈ یا جھوٹا ہے۔ ہم ایک خاص اونٹنی بھیجتے ہیں ان کے لیے ذریعہ آزمائش بنا کر تو انہیں دیکھتے رہو (کہ وہ کیا کرتے ہیں؟) اور ضبط و صبر سے کام لو اور انہیں بتادو کہ پانی ان کے درمیان تقسیم ہو گیا ہے۔ گھاٹ پر ہر باری میں اس کا حق دار حاضر ہوگا تو اب لوگوں نے اپنے آدمی کو لاکار تو اس نے پکڑ کر (اس اونٹنی کو) پے کر ڈالا تو کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا اور ہم نے ایک بار دھمکا یا تھا تو وہ ہو گئے بھرے ہو کھلیان میں خشک گھاس کی بھوسی کی طرح اور بلاشبہ ہم نے آسان قرار دیا ہے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا“۔ ”ڈرانے والوں کو جھٹلایا“۔ اس کی نظیر قبل میں کئی مقام پر آچکی ہے اور وہاں لکھا جا چکا ہے کہ یا تو سمجھا جائے کہ اس قبیلے میں جناب صالحؑ سے پہلے بھی کچھ انبیاء آئے تھے اور یہ آخری تھے جن کے مقابلے میں ان کے کفر و تکذیب کا پانی سر سے اونچا ہو گیا تو ان پر عذاب نازل ہو گیا اور یا یہ کہ چونکہ تمام پیغمبروں کا بنیادی پیغام ایک ہی ہے، اس لیے ایک کا جھٹلانا سب ہی کو جھٹلانا ہے۔

### قوم ثمود و ناقہ صالح اور عذاب الہی کا آنا

پھر یہاں چونکہ نذر کی لفظ ہے جو ایک قابل لحاظ تشریح کے مطابق مصدر کے طور پر استعمال ہو رہی ہے لہذا ہم اس جملے میں بھی اسے مصدر ہی لے سکتے ہیں کہ قبیلہ ثمود نے انذار یعنی رسولؐ کی تبلیغ کو جھٹلایا، اس کے بعد وہ ایک رسول یا بہت رسولوں کی بحث پیدا ہی نہیں



ہوں گی۔

”کیا ہم اپنے میں سے ایک آدمی کی پیروی کریں؟ اس کا مفہوم ہمارے نزدیک تو وہی ہے، جو دوسرے مقامات پر بہت نمایاں ہے کہ انہیں رسول کے بشر ہونے کی وجہ سے ماننا دشوار ہو رہا تھا وہ کہتے تھے کہ ہم میں سے ایک آدمی اور ہم اسے پیغمبر مان کر اس کی اطاعت کریں۔ یعنی اگر فرشتہ ہوتا یا کسی اور نوع کا مخلوق ہوتا تو ہم اسے ماننے کے لیے بلا عذر تیار ہو جاتے مگر دوسرے لوگوں کا ذہن ”ہم“ اور ”ایک“ کی طرف گیا ہے کہ ہم جماعت اور یہ ایک فرد یعنی ان کے نزدیک اصولاً فرد کو جماعت کا پیرو ہونا چاہیے۔ نہ کہ جماعت اپنی کثرت کے باوجود ایک فرد کی پیروی کرے۔ یہ ان کے نزدیک ناقابل قبول تھا۔ اس مفہوم کے ہوتے ہوئے یہ ان کے لیے سرمہ چشم ہے جو نظام دین میں جماعت کی پیروی کو ”اصول ثابتہ“ میں سے قرار دین میں جمہوریت کے قائل ہو گئے ہیں۔ انہیں محسوس ہونا چاہیے کہ یہ کافر اندھنیت ہے۔

سعر کے معنی مفسر طبری نے مشقت و زحمت کے لکھے ہیں لیکن یہاں اس سے زیادہ جنون کے معنی چسپاں ہیں جس کا شاہد قرآن مجید میں دوسرے مقام پر موجود ہے۔

اب جب ان کی سمجھ میں کوئی خصوصیت نہیں تھی کہ ہم ہی میں کا ایک آدمی خدا کی طرف سے پیغمبر ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دعویٰ ان کے نزدیک غلط ہے تو اس غلط دعویٰ کا محرک کیا ہے؟ وہ گھمنڈ ہے یعنی یہ غرور کہ دوسروں کو میری پیروی کرنا چاہیے، جیسا کہ دوسری جگہ جناب نوخ کے لیے ان کا مقولہ ہے کہ ان یتفضل علیکم وہ ہم پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ پیشوا ہو اور تم سب اس کے پیرو ہو، خالق نے جواب میں کہا کہ عنقریب کل معلوم ہوگا کہ کون گھمنڈ کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل گھمنڈ تو یہ ہے کہ جو شخص اپنے صفات کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ خالق نے اسے پیشوائی کے لیے منتخب کیا، تم لوگ اس کے سامنے سر جھکانے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہو جیسے شیطان نے سجدہ آدم سے بر بنائے تکبر انحراف کیا تھا تو ویسے ہی تکبر کرنے والا وہ ہے جو قابل تعظیم کی تعظیم نہ کرے اور جس کی پیروی اسے کرنا چاہیے، اس کی پیروی سے انحراف کرے۔

اوٹنی کے ذریعہ آزمائش ہونے کا پس منظر روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جناب صالح سے فرمائش کی کہ ہم اس وقت آپ پر ایمان لائیں گے جب اس پہاڑ کے اندر سے جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ایک اوٹنی نکل کر ہمارے سامنے آئے۔

چونکہ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ سنت الہیہ یہ رہی ہے کہ جب کسی خاص قسم کے معجزہ کی فرمائش ہوتی تھی اور وہ معجزہ آجاتا تھا اور لوگ نہیں مانتے تھے تو دنیاوی عذاب نازل ہو جاتا تھا۔ علم الہی تو تھا ہی کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو یہ انجام ہوگا اس لیے کہا گیا کہ اچھا بطور اتمام حجت یہ کر کے دیکھ لو اور پھر ضبط و صبر کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرو اور ہماری اطاعت کی آزمائش اسی نائقے کے ذریعے سے ہے۔ وہ یہ ہے کہ چشمے پر باری مقرر رہے گی، ایک دن وہ ناقہ جا کر پانی پیے گا، اس دن کسی آدمی کو وہاں سے پانی پینے کا حق نہ ہوگا۔ اور دوسرے دن وہ ناقہ پانی پینے نہیں جائے گا۔ یہ لوگ پانی لینے جائیں، پیغمبر نے اس کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے کچھ دن اس پر عمل کیا مگر پھر ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہو گئی اور انھوں نے طے کر لیا کہ ہم اس نائقے کو دنیا میں باقی رہنے نہیں دیں گے۔

کل شرب محتضر کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ہر ایک کو اپنی باری میں چشمے پر آنا ہوگا۔ یہ مفہوم دوسروں نے بھی سمجھا ہے مگر ایک دوسرا مفہوم اس کا یہ کہا گیا ہے کہ ہر دن پینے کی چیز ان کے لیے مہیا ہوگی یعنی ایک دن تو پانی پینے کی ان کی باری ہوگی اور دوسرے دن پانی پر جانا ان

کے لیے ممنوع ہے اس دن انہیں اونٹنی کو دودھ کرا اس سے دودھ حاصل کرنے کا حق ہوگا۔<sup>[۱]</sup>  
کھشیمہ المحتظر کے معنی میں بڑے ہی اختلافات ہیں لیکن واضح مفہوم وہی ہے جس کے مطابق اس مرکب اضافی کے دونوں  
جزوں کے لحاظ سے میں نے ترجمہ کیا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذْرِ ۝۳۳ اِنَّا ارسلنا عليهم حاصباً اِلَّا اَل لُّوطُ ۝ ط نَجَّيْنَاهُمْ  
بِسَعْرِ ۝۳۴ نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۝ كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ۝۳۵ وَلَقَدْ اَنْذَرْتَهُمْ بَطْشَتَنَا  
فَتَمَارَوْا بِالنُّذْرِ ۝۳۶ وَلَقَدْ رَاوْذُوهُ عَنِ ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا اَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا  
عَذَابِي وَنُذِرِ ۝۳۷ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳۸ فَذُوقُوا عَذَابِي  
وَنُذِرِ ۝۳۹ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلَّذِي كُرِهِيَ فَهَلْ مِنْ مُّدَّ كِرٍ ۝۴۰

’اور لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا بلاشبہ ہم نے ان پر ایک سخت پتھر اوڑھنے والی اندھی بھیجی سوالوٹ کے  
خاندان والوں کے کہ انہیں پچھلے ہی کونجات دے دی فضل و کرم سے اپنی کئے اسی طرح ہم صلہ دیتے ہیں  
انہیں جو شکر گزار ہوں اور انہوں نے ڈرا دیا تھا انہیں ہماری سخت گرفت سے تو وہ ڈرانے کے بارے میں شک  
وشبہ میں مبتلا رہے اور انہوں نے ان پر ڈول ڈالے ان کے مہمانوں کے بارے میں تو ہم نے ان کی آنکھوں کو ختم  
کر دیا تو چکھو میرے عذاب اور میرے ڈرانے کا مزہ اور صبح تڑکے آگیا ان پر عذاب جو ہمیشہ ہمیشہ  
کے لیے ہے تو چکھو میرے عذاب اور میرے ڈرانے کے مزے کو اور بے شک ہم نے آسان بنایا قرآن کو نصیحت  
کے لیے تو کیا کوئی ہے سبق لینے والا‘۔

### قوم لوط پر عذاب اور اس کا مختصر پیش منظر

’ڈرانے والوں کو جھٹلایا‘ اس پر ابھی ابھی تبصرہ آچکا ہے، یا یہ سمجھا جائے کہ ان میں جناب لوط کے پہلے بھی کچھ نبی آئے تھے یا یہ کہ  
بنیادی پیغام چونکہ سب انبیا کا ایک ہے لہذا ایک جھٹلانا سب کا جھٹلانا ہے..... یا نذر کو مصدر لیا جس کی نظریں اس سورے میں ہیں تو معنی یہ ہوں  
گے کہ ہمارے ڈرانے کو جھٹلایا..... ہاں یہاں ایک تشریح اور بھی ہے جس سے نذر کے معنی ہوں ڈرانے والے، مگر انبیا کا بکثرت تصور ضروری  
نہ ہو، وہ یہ کہ نذر کے معنی ہوں ڈرانے والے تذکرے، جو بنی کی زبان پر آتے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ان سبھوں کو جھٹلایا۔<sup>[۲]</sup>  
پہلے جھٹلانے کے نتیجے کا اظہار ہے، کچھ درمیانی واقعات کی تفصیل کی طرف اجمالی اشارہ ہے اس کا بھی صاف بیان دوسرے سوروں میں ہے۔

[۱] عن مجاهد يحضرون الماء اذا عابت واذا جدت حضر والدين (ابن جرير)

[۲] كذبت قوم لوط بايات الله التي انذرهم وذكروهم بها... ابن جرير اي الانذار وقيل هو جمع نذير يعنى الايات التي انذرهم بها  
موسى (مجمع البيان)

چونکہ حصباً سنگ ریزوں کو کہتے ہیں اور صاحب وہ آندھی ہے جس کے ساتھ سنگ ریزے ہوں اور ظاہر یہ ہے کہ اسی خارق عادت کی حد تک غیر معمولی شدت سے پتھروں کی بارش کا تصور وابستہ ہے لہذا یہاں جو بات کہی ہے اُس کی پرزور تعبیر ہے جو دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ اُن پر پتھروں کی بارش ہوئی۔

”ان کی آنکھوں کو ختم کر دیا“ اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ بصارت زائل ہوگئی چنانچہ تفسیر جامع الجامع میں ہے کہ اب وہ گھر سے باہر نکلنا چاہتے تو انہیں گھر کا دروازہ دکھائی نہیں دے رہا تھا حضرت لوطؑ نے انہیں پکڑ کر گھر سے باہر نکالا! ایک تصور یہ ہے کہ آنکھیں بالکل بے نشان ہو گئیں [۱] طمس کے معنی چونکہ مٹانے کے ہیں لہذا اس لفظ کا قرآنی مفہوم یہ ہو سکتا ہے۔

**وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ الْعُذْرُ ﴿٣١﴾ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخَذَ عَزِيزٌ**

**مُقْتَدِرٌ ﴿٣٢﴾**

”اور فرعون والوں کے سامنے بھی ڈرانے والی چیزیں آئیں تو انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں گرفت میں لے لیا اس طرح جیسے ایک زبردست اقتدار والا طاقتور اپنی گرفت میں لے“۔

اس اجمال میں جناب حضرت موسیٰؑ کے تمام معجزات سمٹے ہوئے ہیں اور پھر گرفت کی لفظ میں ان کے ڈوبنے کا پورا حال مضمر ہے جس کی تفصیل قرآن میں دوسرے مقامات پر ہے، یہاں فقط اسے ان اشاروں سے یاد دلا یا گیا ہے۔

**أَكْفَارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أَوْلِيَّكُمْ أَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿٣٣﴾ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ**

**مُنْتَصِرُونَ ﴿٣٤﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿٣٥﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ**

**أَذْهَىٰ وَأَمْرٌ ﴿٣٦﴾**

”تو کیا تمہارے کافران لوگوں سے بہتر ہیں یا تمہیں معافی کا پروانہ مل گیا ہے، کتابوں میں یا وہ کہتے ہیں کہ ہم بڑی کیدل جماعت ہیں جو فتح حاصل کر کے رہے گی، یہ جماعت بہت جلدی شکست کھائے گی اور یہ سب پیٹھ پھرائیں گے ہاں ان کی (اصل) سزا کا وقت مقرر ہے قیامت والی گھڑی کا اور وہ گھڑی سخت مصیبت اور بہت زیادہ تلخ منزل ہے“

**زمانہ رسول کے مشرکین کو سخت ترین الفاظ میں انتباہ**

”شروع کیا گیا کلام اکفار کہ قریش کی طرف رخ کر کے پھر جیسے متکلم نے ان کی طرف سے منہ موڑ لیا کہ یہ تو کسی سنجیدہ گفتگو کے لائق ہی نہیں ہیں لہذا دوسروں سے کہا جانے لگا۔ اس ذیل میں جن جن باتوں سے وہ تصور کر سکتے تھے کہ ہم اس انجام سے جو گزشتہ قوموں کا ہوا، دوچار نہیں ہوں گے، ان میں سے ایک ایک کو لے کر سوالیہ انداز میں اسے غلط قرار دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ تم

[۱] فسخناھا وسویناھا کسا والوجه (صافی)

اوصاف و کردار میں ان قوموں سے بہتر ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہیں کتب سماوی میں نجات کا پروانہ مل گیا ہو، پھر سب سے زیادہ ان کو جس چیز پر ناز تھا، اسے دوسری طرف رخ کر کے کہا گیا ہے کہ یہ ان کا زعم کہ ان جماعت کی کثرت اور یک جہتی انہیں بچالے گی، بھی غلط ہے یہ کثرت یک دلی عارضی ہے۔ ہوائے انقلاب کا ایک جھونکا ان کے تتر بتر ہونے کے لیے کافی ہے۔

یہ شکست اور یہ انتشار اسی دنیا میں جلد ہی بدر کے میدان میں سامنے آ گیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ روایت میں ہے کہ جب وہ لوگ بھاگ رہے تھے تو پیغمبر ﷺ ایک عجیب پر جوش خوشی کے ساتھ اسی آیت پڑھ رہے تھے سبھزم الجمع و یولون الدبر۔ بعد میں کہا گیا ہے کہ یہ علامتی طور پر ان کی سزا ہے، اصل ان کی سزا قیامت میں ملے گی جو بہت زیادہ سخت ہوگی۔

**إِنَّ الْمَجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعْرٍ ﴿٣٧﴾ يَوْمَ يُسْعَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ط**

**ذُقُوا مَسَّ سَقَرٍ ﴿٣٨﴾**

”یقیناً مجرم لوگ گمراہی اور دیوانگی میں ہیں، اس دن (معلوم ہوگا) جب آگ میں پھینکے جائیں گے اپنے منہ کے بھل چکھو دوزخ کا مزہ“۔

پہلے قوم شہود کے حال میں آچکا ہے کہ انہوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے ایسے آدمی کی پیروی کریں، یہ تو ہماری گمراہی اور دیوانگی ہوگی، اب یہاں بھی سحر کی لفظ گمراہی کے ساتھ ہی ہے بظاہر یہی معنی ہیں بعد میں جو آگ کا ذکر ہے، وہ اس کا نتیجہ ہے جو انجام میں ورنما ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سحر آگ سے جلنے ہی کے معنی میں ہو جس کا اطلاق حال میں باعتبار انجام مستقبل کر دیا گیا ہے [۱]

**إِنَّا كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿٣٩﴾ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلِمَةٍ بِالْبَصْرِ ﴿٤٠﴾**

”بے شک ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ایک پیمانہ خاص پر اور نہیں ہے ہماری بات مگر ایک دم مثل چشم زدن کے“۔

”پیمانہ خاص“ ابتدا انتہا اور مدت بقاء کے لحاظ سے [۲]

اس کا تعلق قضا و قدر کے مسئلہ کے ساتھ لیا گیا ہے اور اس کے لیے طبری نے صدر اول کے مفسرین کے کئی قول نقل کیے ہیں کہ وہ مجرم جن کا اس کے پہلے ذکر تھا، وہ ہیں جو تقدیر کے بارے میں جناب رسولؐ سے بحث کر رہے تھے۔

”ہماری بات نہیں ہے مگر مثل ایک چشم زدن کے“۔ یہ وہی باتیں ہیں جن کے لیے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ وہ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو بس حکم ”کن“ کے ساتھ وہ وقوع میں آجاتا ہے [۳] اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا لانا ہے [۴]

**وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مَّدْكِرٍ ﴿٤١﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ﴿٤٢﴾**

[۱]۔ فی سحر یعنی فی عذاب النار سحرهم ومعناہ انہم یصیرن الیہ (تبیان)

[۲]۔ لہ وقت واجل ومدة (علی ابن ابراہیم)

[۳]۔ القمی یعنی یقول کن فیکون (صافی)

[۴]۔ وما امرنا مجیع الساعة فی السرة الا کطراف البصر عن ابن عباس (مجمع البیان)

### وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَظَرٌّ ﴿٥٣﴾

”اور ہم نے سب ہی تمہارے ہم کیشوں کو ہلاک کر دیا تو کیا کوئی ہے سبق لینے والا، اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا نامہ ہائے عمل میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی ہے۔“  
یعنی نیکی چاہے چھوٹی ہو یا بڑی ہو، وہ بھی نامہ عمل میں درج ہوتی ہے اور برائی چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، وہ بھی اس میں درج ہوتی ہے۔

### إِنَّ الْمُنْتَفِقِينَ فِي جَنَّتٍ وَنَهْرٍ ﴿٥٤﴾ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٥٥﴾

”یقیناً پرہیزگار لوگ بہشتوں اور نہروں میں ہیں، سچائی کے محل میں اس بادشاہ حقیقی کے دربار میں جو بڑا صاحب قدرت ہے۔“

”سچائی کے محل میں“، یعنی جہاں سچوں کے سوا جھوٹوں کا گزر نہیں تو وہاں کسی زبان پر کوئی گفتگو نہیں جو حقیقت کے خلاف ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے لَا لَعْنُو فِيهَا وَلَا تَأْتِيْمٌ .، (طور - ۲۳) ”نہ وہاں کوئی بے کار گفتگو نہ گناہگار ٹھہرانے والی بات چیت“ اور ایک جگہ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَعْنًا وَلَا تَأْتِيْمًا“ (واقعہ - ۲۵) نہ وہاں کوئی لغو بات سننے میں آئیگی اور نہ گناہگار ٹھہرانے کی،<sup>[۱]</sup>  
زیادہ ذہن سے قریب یہی معنی ہیں، ورنہ اس کے علاوہ کئی قول اس کی تشریح میں اور ہیں، مثلاً یہ کہ اس کا مطلب ہے ایسا مقام جو واقعی بہت اونچے درجے کا ہے ہر حیثیت سے پسندیدہ یا یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دائمی طور پر برقرار رہنے والی جگہ ہے یا یہ کہ اللہ کا وعدہ اس محل کے داخلے سے سچائی ثابت ہوا ہے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] فی المجلس حق لا لغوفیه ولا تأثیم (تبیان)

[۲] قیل صفہ بالصدق لكونه رفیعاً مرضیاً وقیل لدوام النعیم وقیل لان اللہ صدق وعدہ اولیائہ فیہ (مجمع)

# سُورَةُ الرَّحْمٰنِ

مدنیہ..... ۷۸..... آیات

اس طرف کے بہت سے سوروں کی طرح اس سورے کا نام سورے کی پہلی ہی لفظ پر ہو گیا ہے۔ اس میں خدا کی نعمتوں اور قدرت کی نشانیوں میں سے ایک ایک کا ذکر کر کے انسان و جن کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ کس کس کو چھٹاؤ گے؟ اس ذیل میں جن مضامین کا تذکرہ ہوا ہے۔

## سورہ رحمن کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... تخلیق انسان و تعلیم بیان۔
- ۲..... نظام شمسی کا ارادۃ الہی کے ساتھ قیام۔
- ۳..... نباتات خالق کے لئے سر بسجود۔
- ۴..... خالق کی طرف سے توازن کا قیام۔
- ۵..... خلق خدا کے لیے نمونہ عمل۔
- ۶..... زمین اور اس کے نباتات سب انسان کے لیے خداوندی نعمتیں ہیں جنہیں یاد رکھنا چاہیے۔
- ۷..... انسان کی تخلیق خاک سے اور جنات کی آگ سے۔
- ۸..... دو مشرق اور دو مغرب۔
- ۹..... دو دریاؤں کی آمیزش اور ان سے موتی مونگے کی برآمد۔
- ۱۰..... سب چیزوں کو فنا اور وجہ الہی کو بقاء۔
- ۱۱..... قدرت الہی کے مقابلے میں انس و جن کی بے بسی۔
- ۱۲..... ہول قیامت۔
- ۱۳..... دوزخ کا منظر۔
- ۱۴..... نعمات جنت کا ذکر جس کا سلسلہ آخر سورہ تک ہے

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“۔

الرَّحْمٰنِ ۱ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۴

”سب کو فیض پہنچانے والا، اسی نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا، اسے بیان کرنا سکھلایا۔“

## تخلیق انسان و تعلیم کا بیان

تخلیق کے ساتھ بیان کے علم کا وابستہ کرنا پیچہ دیتا ہے کہ اس سے وہ جو ہر خاص مراد ہے جس سے انسان کا امتیاز دوسرے انواع حیوان سے ہے جس کی تعبیر علمائے منطق ”ناطق“ کے ساتھ کرتے ہیں۔

چونکہ اس سورے میں دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتوں کا ذکر ہے، وہ بھی جو مؤمن و کافر سب کے لیے عام ہیں اور وہ بھی جو مؤمنین کے لیے خاص ہیں، اس لیے آغاز سورہ کا لفظ ”رحمن“ کے ساتھ ہوا۔

چونکہ مشرکین الرحمن سے بہت خوف محسوس کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ یہ رحمن کون ہے؟ اور پھر قرآن کے لیے کہتے تھے پیغمبر خدا ﷺ کو اس کی تعلیم کوئی آدمی دیتا تو پہلے جملے میں ان دونوں کا جواب ہو سکتا تھا۔ رحمن کا تعارف بھی جو آخر سورہ تک اس کی نعمتوں کے شمار سے قائم ہے اور اس کا بھی کہ نہیں قرآن کی تعلیم دیتا ہے؟ جواب ہے کہ وہی خدائے رحمن جس کی یہ سب نعمتیں ہیں اس نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔<sup>[۱]</sup>

رحمن کی لفظ کے ساتھ قرآن کا تذکرہ یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ غائبہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ وجود خارجی میں مؤخر ہوتی ہے مگر وجود ذہنی میں مقدم ہوتی ہے تو خلقت انسانی کی بے شمار منزلیں طے کرنے کے بعد اگرچہ ظاہر میں رسول آیا جسے قرآن عطا ہو مگر خالق کا جو ہمہ گیر فیض کا مرکز ہے مقصود اول ایسی ہی ہستی کو پیدا کرنا تھا جو اس کے ہمہ گیر فیض کا جو ”رحمن“ کی لفظ سے ظاہر ہے مظہر اتم ہوتی ہوئی رحمت اللعالمین ہو جس پر یہ کتاب اترے جو ”هدی للناس“ ہے اور اس لیے وہ نوع انسان کا مقصد تخلیق ہے جس کا پہلے ذکر کے پھر انسان کی تخلیق ہے لہذا اس کو آخر عمر بشر تک اس کی رہنمائی کے لیے غیر منسوخ حیثیت سے باقی و دائم رہنا چاہیے۔

وہ بیان جو عام معنی میں مطلق نوع انسان کی خصوصیت ہے اور جو تخلیق کے ساتھ وابستہ ہے خصوصی طور پر کچھ افراد انسانی کے لیے وحی اور الہام سے جو اس کی تعلیم ہے وہ علمہ البیان کی مصداق اتم ہے اس بنا پر ایک تفسیر کے لحاظ سے تو الا انسان سے مراد یہ معصوم ہستیاں ہیں<sup>[۲]</sup> اور وہ ان افراد کے لیے سرمہ چشم ہے جو معصومین علیہم السلام کو انسان کہنے کے روادار نہیں ہیں۔

در صورتیکہ نوع سے متعلق لیا جائے اور بیان سے مراد وہ جو ہر امتیازی لیا جائے جس کی تعبیر منطق میں ناطق کی لفظ سے کی گئی ہے مگر اس ”ناطق“ کی تشریح کیا ہے حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ حیوان کی بولیاں بھی ان کا ایک طرح کا نطق ہیں جس سے اظہار مطالب ہوتا ہے جس طرح حضرت داؤد و سلیمان کے لیے ہے علمناہ منطق الطیر، ہمیں طائروں کی گفتگوؤں کا علم دیا گیا ہے، اور ہد طائر اور پھر چیوٹی سے حضرت سلیمان کی گفتگو کی صراحت ہے۔ پھر یہ نطق کیا ہے جو انسان سے مخصوص ہے۔

منطق کے مورث اعلیٰ ارسطو چونکہ اپنے فلسفی معقولات کی دنیا کے اسیر تھے لہذا انھوں نے ”ناطق“ کے معنی ”مدرک کلیات“ فارسی

[۱] لہا كانت هذه السورة مشتملة على تعداد النعم الذي يوهه ولاخرة صدرها بالرحمن (صافی)

[۲] عن ابی الحسن الرضا۔ ذالك امیر المؤمنین علیہ السلام علمہ بیان کل شیء یحتاج الناس الیه... علی ابن ابراہیم (وقیل محمد ﷺ)

میں ”دریابندہ معقولات کے قرار دئے مگر اہل دین کی زبان میں جو چیز ہے، وہ نظری طور پر امتیازی حق و باطل اور عملی حیثیت سے امتیاز حلال و حرام ہے۔ اس لیے دینی حلقے کے قدیم مفسرین کے تعبیرات اس محور پر گردش کرتے ہیں مثلاً قتادہ کی جو کئی روایتیں ہیں، ان میں ایک میں ہے ”علمہ اللہ الدنیا والآخرۃ تبین حلالہ وحرامہ“ اسے دنیا کی اور آخرت کی وضاحت کا علم دیا اور اپنے حلال و حرام کو بیان کیا۔

دوسری میں ہے کہ ”الدنیا والآخرۃ“ تیسری میں ہے ”تبین لہ الخیر والشر وما یأتی وما یدع“ اس کے لیے خیر و شر نمایاں ہوا اور جسے اختیار کرے اور جسے ترک کرے۔

مفسر طبری نے اس سب کی ہمہ گیر انداز میں اس طرح وضاحت کی ہے۔

ان اللہ علم الانسان ما بہ الحاجة الیہ من امر دینہ و دنیایہ من حلال و الحرام و المعاش و النطق و غیر ذلک ما بہ الحاجة الیہ لان اللہ جل ثناؤہ لم یخص بخبرہ ذلک انه علمہ من البیان بعضنا دون بعض بل عم فقال علمہ البیان..... (جامع البیان)

اللہ نے انسان کو تعلیم دی ان باتوں کی جن کی اسے ضرورت ہے اپنے دین و دنیا کے امور میں سے خواہ امتیاز حلال و حرام ہو بسر زندگی کے طریقے اور اظہار خیال اور جو کچھ اسے ضرورت ہو، اس لیے کہ خالق نے اس اعلان میں کہ اس نے بیان کی تعلیم دی کسی ایک چیز کو امتیازی طور پر مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ عام طور سے کہا ہے کہ اسے بیان کی تعلیم دی۔

ہاں عام طور پر یہ تعلیم عطاءے قوت کے طور پر ہوتی ہے جو باختلاف مدارج رونما ہوتی ہے اور کچھ امتیازی ہستیوں کے لیے یہ تعلیم عطاءے فعلیت کی صورت سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے دوسروں کی رہنمائی ہو۔

### الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُحْسَبَانِ ۝ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝

”سورج اور چاند ایک معین حساب کے ماتحت چل رہے ہیں اور بیلین اور درخت سجدہ ریز ہیں“

خالق کے مقرر کردہ حساب سے پورا نظام ثوابت و سیارات چل رہا ہے اور بیلین اور درخت اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اپنے منازل حیات کو طے کرتے ہیں یہی ان کا سجدہ ریز ہونا ہے۔

جب کہ یہ معلوم ہے کہ کلام عرب میں بیلوں کو نجم کہتے ہیں تو ان لوگوں کا تصور جو نجم کو آسمان کے ستارے کے معنی میں لیتے ہیں [۱] جبکہ درخت سے اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے، بلاوجہ ہے۔

### وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ

### بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝

”اور آسمان کو اس نے اونچا کیا اور توازن قائم رکھنے کا اصول مقرر کیا تاکہ تم توازن قائم رکھنے میں سرکشی نہ کرو اور تم انصاف سے ٹھیک طریقے پر تولو کرو اور تولنے میں دوسروں کا خسار نہ کرو“

[۱] عن مجاهد قال نجم السماء... ان قتادة يعني نجم السماء (ابن جریر)



## خالق کی طرف سے توازن کا قیام

”آسمان کو اونچا کیا“ کے معنی یہ تو نہیں سکتا کہ وہ پہلے نیچا تھا، پھر اسے اونچا کیا بلکہ یہی معنی ہو سکتا ہے کہ اس نے اسے اونچا پیدا کیا <sup>[۱]</sup> ”میزان“ کہتے ہیں ترازو کو مگر ترازو عدالت قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لیے یہاں حقیقت شناس مفسرین نے وضع المیزان کے معنی یہی کیے ہیں کہ اس نے عدالت کا معیار مقرر کیا ہے۔ <sup>[۲]</sup>

اور چونکہ عدالت کا معیار دین اور شریعت ہے اور آسمانوں کی بلند قرار دینے میں جس نظام کی طرف اشارہ ہے وہ نظام تکوینی ہے، اس لیے بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عدل سے نظام تشریحی مراد ہو جس میں عدالت کی اتنی اہمیت ہے کہ حدیث نبوی میں عدل پر آسمان وزمین کے نظام کا دار و مدار بتایا ہے۔ <sup>[۳]</sup> اور اسی پر اس ہدایت عام کی بنیاد ہے جسے تاکید کی طور پر کہا گیا ہے کہ لین دین میں ترازو کو ٹھیک رکھو، جس کی بنا پر جناب ابن عباسؓ ان آیتوں کو بازار میں پڑھ کر دوکانداروں کو تاکید کرتے تھے کہ ناپ تول میں نا انصافی ایسا جرم ہے کہ بعض امم سابقہ پر اسی کی وجہ سے عذاب نازل ہوا تھا۔

وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنْعَامِ ۗ فِيهَا فَاكِهَةٌ ۗ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ۗ وَالْحَبُّ

ذُو الْعَصْفِ ۗ وَالرَّيْحَانُ ۗ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝۱۳

”اور زمین کو اس نے بنایا تمام خلائق کے لیے جس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت، خاص طرح کے غلافوں والے اور دانے کھانے کے کام آنے والے جو پتوں کے اندر ہوتے ہیں اور خوشبودار پھول تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کس کو تم جھٹلاؤ گے؟“

## زمین اور اس کے نباتات خداوندی نعمتیں

اس پورے سورے کی ساخت اسی طرح ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مخاطب جماعت کو تازیا نے لگائے گئے ہیں کہ تم کس کس اللہ کی نعمت کو جھٹلاؤ گے اور نظم و نشر ہر ایک میں ادبی پیرایوں سے واقف افراد محسوس کرتے ہیں کہ یہ تکرار میدان مقصد میں ہر بار ایک مہمیز ہوتی ہے جس کی دھمک سے مخاطب دماغ میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔

آغاز سورے کا غذائے روحانی کے ذکر سے ہوا تھا جو علم ہے اور سب سے آخر میں اب اس غذا کا ذکر ہو رہا ہے جو رزق جسمانی ہے تو اب یہ جملہ اس سب سے متعلق ہے کہ تم دونوں کس کس نعمت کا اپنے پروردگار کی انکار کرو گے؟

”تم دونوں“ کون یہ ابھی کھل جائے گا جب انسان اور جنات کی خلقت کا ذکر ہوگا اور پھر بعد میں صراحتہً مخاطب بنایا جائے گا یا معشر الجن والانس“ اے جنات اور انسانو!“ یہی وہ ہیں جن پر مجاہدہ نفس کے ساتھ خود اختیاری عبادت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے

[۱] - خلقتہا مرفوعة (صافی)

[۲] - وضع العدل بین خلقه فی الارض (ابن جریر)

[۳] - بالعدل قامت السموات والارض (صافی)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. (الذاریات: ۵۶)“ میں نے جنات اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا ہے سوا اس مقصد سے کہ میری عبادت کریں۔

**خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ<sup>۱۳</sup> وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ<sup>۱۴</sup>**

**فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ<sup>۱۵</sup>**

”اس نے آدمی کو پیدا کیا کھنکھاتی ہوئی مٹی سے مثل ٹھیکرے کے اور جنات کو پیدا کیا آگ کے شعلے سے تو تم (دونوں) اللہ کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟“

پہلے انسان یعنی ابولبشر کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی اس کے تفصیلات یہاں بیان نہیں کیے گئے ہیں بلکہ جیسے نسل انسانی کی تخلیق کے بیان میں کبھی نطفہ کہہ دیا یا کبھی اس کے بعد کی کیفیت کے لحاظ سے علقہ کہہ دیا۔ کبھی مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) کہا ہے۔ یہ سب یکے بعد دیگرے کیفیتیں ہوئی ہیں، ویسے ابولبشر کی تخلیق کے منازل میں کبھی تو تراب کہا جاوے تاہم اس کی حالت تھی، کبھی حیا مسنون جو تر کی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں، کبھی طین کہا ہے جو گیلی مٹی کو کہتے ہیں اور اس کے بعد جب پتلا بن گیا اور وہ بالکل خشک ہو گیا کہ اس میں ہوا کے چلنے سے کھنکھانے کی آواز پیدا ہونے لگی تو اس وقت کے لحاظ سے صلصال کہا جاتا ہے اور اگرچہ یہ خشک ہونا اس کا ہوا سے ہوا ہے لیکن اب وہ سخت ایسا ہے جیسے ٹھیکرے ہوتے ہیں جو آگ میں پکائے جاتے ہیں۔

ان تمام منزلوں کو تفصیل سے حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے ایک اپنے خطبے میں جو پنج البلاغہ میں شروع ہی میں ہے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

**رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ<sup>۱۶</sup> فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ<sup>۱۷</sup>**

”پروردگار دو مشرقوں کا اور دو مغربوں کا تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کس کو تم جھٹلاؤ گے۔“

## دو مشرق اور دو مغرب

جب تک امریکا کا انکشاف نہیں ہوا تھا اس وقت تک کے معلومات کی حد تک دو مشرق اور دو مغرب کے معنی لیے جاتے تھے، گرمیوں کے موسم کا مشرق اور جاڑے کے موسم کا مشرق<sup>[۱]</sup> اور بعض کہتے تھے کہ سورج اور چاند دونوں کے مشرق اور مغرب مراد ہیں۔<sup>[۲]</sup> لیکن امریکا کے معرض انکشاف میں آنے کے بعد دو مشرق اور دو مغرب بہت نمایاں ہو گئے ہیں جس طرح رب المشارق والمغرب کا مفہوم بہت سے سورجوں کے انکشافات سے نمایاں ہو گیا ہے جسے میں ”تفسیر بالرأی“ میں داخل نہیں سمجھتا جس کی وضاحت میں مقدمہ تفسیر میں کی ہے۔

**مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيْنَ<sup>۱۸</sup> بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيْنَ<sup>۱۹</sup> فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا**

[۱] - مشرق السماء و مشرق الصيف (جلالین)

[۲] - قیل المراد بالمشرقین مشرق الشمس والقمر وبالغربین مغرب الشمس والقمر (مجمع البیان)

تُكَذِّبِينَ ﴿٢١﴾ بِخُرُوجِ مِنْهُمَا اللَّوْلُو وَالْمَرْجَانُ ﴿٢٢﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٢٣﴾

”اس دو دریاؤں کو جاری کیا اس طرح کہ وہ دونوں اکٹھا ہو گئے، ان کے درمیان ایک حد فاصلہ ہے وہ دونوں آگے نہیں بڑھتے، کس نعمت کو اللہ کی تم جھٹلاؤ گے نکلتے ہیں ان میں سے بڑے چھوٹے موتی تو اللہ کی نعمتوں میں سے کس کس کو تم جھٹلاؤ گے؟“

### دو دریاؤں کی آمیزش اور ان سے موتی اور مونگے برآمد

مرج عام معنی ایک چیز کی دوسرے کے ساتھ آمیزش کرنے کے ہیں جو تقریباً (مرج) کے معنی ہیں چنانچہ عام طور پر یہاں بھی یہی معنی کہے جاتے ہیں مگر قدیم مفسرین یہاں بتاتے ہیں کہ مرج کے معنی ہیں چھوڑ دینا اس لیے جانوروں کے لیے کہا جاتا ہے مرج فلان دابہ یعنی فلان شخص نے اپنے جانور کو چھوڑ دیا اور رہا کر دیا۔<sup>[1]</sup>

اور میں نے یہاں پر ترجمہ اسی مطابق کیا ہے، اس لیے اگر مرج کے معنی آمیزش کرنے کے لیے جائیں تو پھر یلتقیان کا کوئی خاص مفاد نہیں ہوگا دوسرے یہ ان کے درمیان برزخ یعنی حد فاصلہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ایک کے اجزا دوسرے میں نہیں ملتے تو پھر مرج کے اس معنی کی گنجائش کہاں ہے؟

اب یہ بحرین دو دریا ہیں کون؟ اس میں کچھ حضرات نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے کہ یہ ایک دریا ہے آسمان کا اور ایک زمین کا اور وہ ہر سال باہم ملاقات کرتے ہیں۔

کچھ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ دریائے فارس اور دریائے روم ہیں۔

اس سے بہتر یہ تھا کہ اس کے تعیین کرنے میں خود اس آیت قرآن سے مدد لی جاتی جس میں دو دریاؤں کا ذکر ہے۔

هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۚ وَجَعَلْ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَجُزْأً مِّنْهُ جُزْأً (فرقان - ۵۳) یہ میٹھا ہے اور یہ بالکل نمکین کھاری ہے اور خدا نے ان کے درمیان پردہ اور رکاوٹ کا سامان قرار دیا ہے۔

یہ منظر سفر دریا کرنے والوں کی آنکھوں کے سامنے آتا بھی ہے جہاں میٹھا دریا اور کھاری دریا یعنی سمندر دریا تک کا ندھے سے کا ندھا ملائے چلتے ہیں، ادھر رنگت اور، ادھر اور، ادھر سے کسی طرف میں پانی لیجیے تو انتہائی کھاری جس کا پینا غیر ممکن اور ادھر سے لیجیے تو میٹھا نہایت خوشگوار نہ یہ اس میں ملتا ہے اور نہ وہ اس میں ملتا ہے۔

اس پر تمام یہاں کے الفاظ منطبق بھی ہیں یا نہیں؟

یوں تو مرجان موتی کے علاوہ ایک اور چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا نام مونگا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ وہ نباتات میں داخل ہے اور وہ دریا میں سے نہیں نکلتی مگر طبری نے بہت سارے اقوال نقل کیے ہیں جو ظاہر ہے کہ یہ سب عربی کے اہل زبان ہیں کہ لؤلؤ مرجان دونوں موتی ہیں صرف بڑے چھوٹے کا فرق ہے۔ اس لیے ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔

[1] - اذا خلاها وتر کہا (ابن جریر)

اب ایک نظری دقت یہ ہے کہ موتی بس ایک دریا یعنی سمندر میں پیدا ہوتے ہیں، دو سے نہیں، اس کا حل یہ ہے کہ چونکہ دونوں دریاؤں کا ایک لفظ تشبیہ سے ذکر کیا گیا ہے اس لیے اگر جب کہ ان میں سے ایک سے موتی برآمد ہوتے ہیں، تب بھی مجموعی طور پر ان دونوں ہی سے پیدا ہوئے جن کی طرف ضمیر تشبیہ کی پھیری گئی ہے۔

یہ تو وہ تشریحیں ہوں جو لغت و عرف کی مدد سے عقل کے سہارے سے نکالی جاسکتی ہیں لیکن ایک تاویل معنی را سخنون فی العلمہ کی طرف نسبت رکھتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں کہ بحرین سے مراد حضرت علی وفاطمہ علیہما السلام ہیں اور برزخ یعنی درمیانی حد فاصلہ سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے جن کی تربیت دونوں کے شامل حال رہی ہے اور لؤلؤ مرجان حسن و حسین علیہما السلام ہیں جو دونوں سے برآمد ہوئے ہیں [۱] یہ روایت صحابہ و تابعین میں کے کئی بزرگوں سے وارد ہے۔ [۲]

### وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿۳۷﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۳۸﴾

”اور اسکے قبضے میں ہیں وہ کشتیاں جو سمندر میں چلتی ہیں بلند کیے ہوئے بادبانوں کے ساتھ مثل پہاڑوں کے تو اللہ کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کرو گے؟

اس کے قبضے میں ہیں اس لیے کہ ان کی رفتار ہواؤں سے وابستہ ہے جو اس کے حکم سے چلتی ہیں چونکہ سابق زمانوں میں زیادہ تجارتی مسافر سفر دریا سے وابستہ تھے اس لیے نعم الہیہ میں ان کشتیوں کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہے۔

بعض جدید اہل فکر و قلم نے جواری کو آب جاری سے لے کر اس کے معنی ندیوں کے لیے ہیں اور منشآت فی البحر کے معنی یہ لیے ہیں کہ وہ ندیوں سمندروں کے اندر وجود میں آتی ہیں اور کلاعلام کے معنی پہاڑوں کے نہیں، بلکہ سبزہ زاروں کے ہیں۔ اور سمندر کی سطح پر وہ ندیاں جو اس الگ رنگ کی ہیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے سطح زمین پر درمیان میں اہلہاتے ہوئے گھانس کے تختے ہوں اور اس کے لیے امریکا کے بحر اوقیانوس کا پتہ دیا ہے کہ اس کی سطح پر ایسی ندیاں جاری ہیں جو برطانوی جزائر تک بہہ کر جاتی ہیں لیکن ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ جہاں الفاظ کے معنی بدلنے کی ضرورت نہ ہو، صرف مصداق کی تلاش ہو جیسے رب المشرقین و رب المغربین، وہاں توخیر، لیکن جہاں الفاظ کے معنی کا سوال ہو، وہاں ایسا مفہوم قرار دینا جس سے چودہ سو برس کے بعد بھی عام لوگ واقف نہ ہوں مگر چند آدمی جو امریکا کے انکشاف کے بعد کے دریا کے جغرافیہ کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، بلاغت قرآنی کے خلاف ہے جس سے لکھنے والے کے وسعت معلومات کا پتا چل سکتا ہے مگر مراد الہی کی تشریح اسے نہیں سمجھا جاسکتا۔

### كُلُّ مَنْ عَلَيْهِ فَاَنٍ ﴿۳۷﴾ وَيَبْفِي وَجْهَ رَبِّكَ ذُ وَالْجَلَلِ وَالْإِكْرَامِ ﴿۳۸﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۳۸﴾

”ہر شخص جو اس (روئے زمین) پر ہے نیست نابود ہونے والا ہے اور باقی رہے گا تمہارے پروردگار کا چہرہ جو

[۱] - علی وفاطمہ قال لاینبغی احدہما علی صاحبہ یخرج منہما اللؤلؤ والمرجان قال الحسن والحسین رضی اللہ عنہما (علی ابن ابراہیم)

[۲] - روی عن سلمان فارسی وسعید بن جریر وسفیان الثوری (مجمع البیان)

بزرگی اور عزت والا ہے تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟

یوں تو نظام موت و حیات کا کلیاً نعمت الہی ہونا بالکل حقیقت ہے مگر یہاں چونکہ بعد میں وجہ الہی کے بقا کا بیان ہے، اس لیے بہت ممکن ہے کہ آخری جملے کا تعلق اسی سے ہو۔ اب اس حقیقت کی بنا پر خداوند عالم جسم و جسمانیات سے بری ہے اس کے لیے وہ چہرہ نہیں ہو سکتا جو اعضائے جسمانی میں سے ہے اس لیے وجہ الہی وہ کامل آثار صنعت الہی ہیں جو مکمل ترین ذرائع معرفت الہی ہیں جن کا وجود مرکز فیض خلّاق ہے۔<sup>[۱]</sup>

لہذا ان کی بقا اس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اسکی تائید میں ہمارے آئمہ کے بعض احادیث بھی ہیں۔ اس کے خلاف دو قول ہیں ایک اہل باطل کا یعنی مجسمہ جو خدا کی جسمیت کی قائل ہیں۔ اس لیے وہ اس کا چہرہ اس طرح مانتے ہیں جیسے ہر شخص کا چہرہ ہوتا ہے جنہی جماعت کا رجحان اس طرف رہا ہے جس کے پروردگار نمائندہ اپنے وقت میں شیخ ابن تمیمہ اور ان کے شاگرد ابن القیم الجوزی وغیرہ ہیں اور یہ بارہویں صدی ہجری کے بعد سے اب تک ابن عبدالوہاب اور ان کے نجدی علماء اور ہم خیال خاص وہابی عقیدے کے افراد جنہیں آل سعود کی پشت پناہی حاصل رہی اُس عقیدے کے علمدار رہے۔ ہمارے نزدیک یہ عقیدہ شان الہی کے خلاف ہے۔

دوسرا تصور جو ہمارے بعض علما کا ہے یہ ہے کہ وجہ کے معنی ذات الہی کے ہیں جیسے کہ بسم اللہ سے مقصود ہے اللہ سے مدد حاصل کرنا اور یہ بیچ میں اسم کی لفظ صرف عظمت الہی کے پیش نظر رکھتے ہوئے ایک لفظی واسطہ ہے، ویسے ”كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُۥٓ۔ اور كُلُّ مَنْ عَلَيَّهَا فَاَنۡ يَّوۡمَ ۙ وَيَبۡقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ“ دونوں آیتوں میں مطلب یہی ہے کہ ہر شے فنا ہونے والی ہے صرف ذات الہی ہے کہ جسے ہلاک و فنا نہیں ہے۔ اس میں شان الہی کے خلاف تو کوئی بات نہیں ہے مگر بعض شواہد اس پہلے مفہوم کو تقویت دیتے ہیں۔

يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِيۡ شَاۡنٍ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ اِلٰهٍ

رَبِّكُمْ اَتَكۡذِبُوۡنَ ﴿۵۰﴾

”آسمان اور زمین میں جتنے ہیں، سب اس سے سوال کرتے ہیں۔ ہر دن اس کی ایک خاص شان ہے، اللہ کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کرو گے؟“

یعنی کائنات کی کوئی ہستی اس کے فیض سے بے نیاز نہیں ہے۔ ہر ایک خواہ بزبان مقال یا بزبان حال اس کی بارگاہ میں دست سوال دراز کیے ہوئے ہے۔ یہ تو پہلے جز کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ دوسرا جز کہ ہر دن اس کی ایک خاص شان ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ تغیر ذات باری میں محال ہے۔ اس لیے ہر دن جس کا مطلب ہے ہر دقیقہ، ہر ثانیہ اور ہر لمحے اس سے مراد اس کے کرشمہ ہائے قدرت اور مظاہر عمل ہی کر سکتے ہیں۔<sup>[۲]</sup>

ہر دم اس کا سلسلہ فیض جاری ہے اور مختصر ترین جز وقت میں بھی اس کا سلسلہ فیض قطع ہوتا ہے ”ہستی“، نیستی میں مبدل ہو جائے۔ اس میں تقدیروں کی تبدیلیاں بھی داخل ہیں جنہیں قرآن مجید کے سورہ حجر میں ”محو واثبات“ سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس کا خاص موقع قرآن مجید نے شب و روز کو قرار دیا ہے۔

[۱] قال علی ابن حسینؑ وجہہ الذی یؤتی اللہ منہ (علی ابن ابراہیم)

[۲] یحییٰ ویمیت ویرزق ویرزق ویرزق ویرزق (علی ابن ابراہیم)

یہ خیال کہ تقدیرات سب ازل میں مقرر ہو گئے جن کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے۔ اب خالق کو کوئی فیصلہ کرنا نہیں ہے۔ نہ کوئی کام انجام دینا ہے جو انکارِ بداً کا حاصل ہے، خلاف قرآن ہے اور ہمارے نزدیک اسے وجودِ باری کا قتل لازم آتا ہے جو شانِ الہی کے خلاف ہے، قبولیت تو بہ استجابت دعا اور مغفرتِ ذنوب یہاں تک کہ قبولِ شفاعت جو تمام دینی حقائق مسلمہ ہیں اس سے وابستہ ہیں۔

### سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَا الثَّقَلَيْنِ ﴿٣٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٣٥﴾

”بہت جلدی اب ہم صرف تمہاری (خبر لینے کی) طرف متوجہ ہوں گے اے جنات و انسان تو آخر تم اپنے پروردگاری کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“

یعنی ابھی تو دور تکلیف ہے۔ مختتم طور پر ہر جزا و سزا کا دور نہیں ہے اور گزشتہ آیت کے تعلق سے ابھی نظمِ عالم کے بے شمار کام یہیں کرنا ہیں بہت جلد وہ وقت آئے گا اور سب کاموں کا دور ختم ہو جائے گا اور بس تمہاری جزا و سزا کا معاملہ ہمارے سامنے ہوگا۔

اب یہ ان مکلفین کے حسن عمل اور سوء عمل سے وابستہ ہے کہ کسی کے لیے یہ بشارت ہو اور کسی کے لیے انداز، مگر چونکہ وہ جن کا ضمیر مطمئن ہو اور وہ ایمان اور عمل دونوں اعتبار سے نجاتِ اخروی کے مستحق ہوں نسبتہ کم ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے اکثریت کے لحاظ سے اسے تہدید ہی کہہ سکتے ہیں جس کے ساتھ اس کے بعد والی آیت کا بھی تناسب ہے اور ایسی تہدید آیتوں میں یہ اختتامی جملہ جو ہر فقرے کے بعد دہرایا جاتا ہے تہدید ہی کا جز بن جاتا ہے کہ جتنا ہو سکے تم ہماری نعمتوں کو جھٹلائے جاؤ۔ اب وہ دن آرہا ہے جب تمہاری خبر لی جائے گی۔

### يَمْعَشَرُ الْمَجْنُّ وَالْإِنْسِ إِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَوَاتِ

### وَالْأَرْضِ فَاَنْفُذُوا ۗ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿٣٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٣٥﴾

”اے جنات و انسان کے گروہ! اگر ایسا کر سکو کہ اطرافِ آسمان و زمین کے اندر سے گزر جاؤ تو گزرو! تم نہیں گزرو گے مگر کسی بڑے اقتدار سے تو آخر اپنے پروردگاری کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“

اب تک تو بغیر اقتدار کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ یہ تعلق محال بالمحال کے طور پر ہے کہ یہ اقتدار تمہیں حاصل نہیں ہے لہذا اطرافِ زمین و آسمان سے نکلنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہے [۱] لیکن اب کے اہل نظر اس کے معنی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن نے کسی ایسے وقت کی خبر دی ہے جب انسان کو ایسے ذرائع مہیا ہو جائیں گے وہ اس زمین اور اس کے افلاک کے حدود سے باہر نکل جائے ایسے ذرائع ہی کا سلطان کی لفظ کے ساتھ استثنا کیا گیا ہے۔ [۲]

### يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شَوْاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۖ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرِينَ ﴿٣٥﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ

[۱] بقوۃ ولاقوۃ لکم علی ذالک (جلالین)

[۲] آیاساختن ”آپلو“ برائے رفتن، مہاہر سیدن بہ سلطان است؟ آیا آپلو بشر از اقطار زمین باز اقطار زمین و سموت ہفتگان آنخارج نشدن؟ (قاموس قرآن)

## رَبِّكُمْ أَتُكذِّبِينَ ﴿٣٦﴾

”تم دونوں کی طرف بھیجا جائے گا ایک شعلہ آگ کا اور دھواں تو تم اس کے مقابلے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے“

عام طور پر نحاس کا ترجمہ ”دھواں“ جیسے ہم نے کیا ہے ہوتا رہا ہے اور اسے قیامت کے پہلے والے علامت میں سے سمجھا جاتا رہا ہے مگر سابق الذکر اہل قلم جنہوں نے گزشتہ آیات کا جدید فضا کے حدود میں پرواز کر کے آگے جانے والے ذرائع پر محمول کیا تھا، انہوں نے اس آیت کو خاص نحاس ”تانے“ کے معنی میں لے کر اسے آخری حدود میں جو آسمانی ذرات کو بارش کے معنی میں لیا ہے اور کہا ہے کہ:

آینحاس کہ بمعنی مس، دود، و سرب مذاب آمدہ سنگہای آسمانی نیست کہ با سرعت ۴۸ ہزار کیلومیٹر در ساعت در فضا حرکت می کنند و مانند دانہ ہای شن و گاہی ہم بزرگ اند؟“

آپلود اراہی حفاظ و سلطان است کہ آن سنگہا داشتہ در بدنہ آن کار دیگر نیست“ (قاموس القرآن)

اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے ایسا سامان کر لیا ہے کہ وہ ان آتشین پتھروں کی بارش سے بچ جاتا ہے گر یہاں اس آیت میں الابل سلطان کا استثناء نہیں ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ تم اس کے مقابلے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

## فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكذِّبِينَ ﴿٣٨﴾

فَيَوْمَ مَبْدِلًا يُسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ ﴿٣٩﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكذِّبِينَ ﴿٤٠﴾

”تو جب آسمان پھٹ جائے گا تو وہ ایک گلاب کے پھول کی طرح ہوگا مثل سرخ چڑے کے تو اللہ کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کرو گے؟“ تو اس دن کسی آدمی اور جن سے اس کے گناہ کے متعلق پوچھا نہیں جائے گا، تو اللہ کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کرو گے؟“

گلاب کے پھول اور پھر سرخ چڑے کی تشبیہوں سے اس شدت تپش کا اظہار ہوتا ہے جو اس دن چھائی ہوئی ہوگی، عرب کے معیار فصاحت کے لحاظ سے تشبیہ میں کسی خاص پہلو سے بس شبہت کا لحاظ ہوتا تھا، اس کے علاوہ یہ دیکھنا نہیں ہوتا تھا کہ وہ شے جنس میں اس کے مماثل ہے یا نہیں یا مرتبے میں اس سے اونچی چیز ہے یا نیچی۔ یہ سب مقام تشبیہ میں خارج از بحث باتیں ہوتی تھیں۔ جیسے امرأ القیس نے اپنے ایسے معیاری قصیدے میں جو مؤلفات میں سب سے مقدم ہے، ہرن کی مکینوں کی تشبیہ کالی مرچوں سے دی ہے جو ہمارے اردو زبان کے ذوق کے بالکل خلاف ہے مگر کسی ایک زبان میں دوسرے اہل زبان کے ذوق کا لحاظ غلط ہے۔ اس کے لیے پوری صورت لانے کے لیے کبھی دو چیزوں سے تشبیہ دی جاتی تھی چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہے کہ آسمان کے شق ہونے کے بعد جو رنگت ہوگی، اسکے لیے ورد اور دہان کی دو لفظیں صرف کی گئی ہیں۔ پہلے ورد جس کے لغت کے لحاظ سے ایک معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمے میں لکھے ہیں اور پھول جسے ہم گلاب کہتے ہیں۔ دوسری تشریح جس کے لیے طبری نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ یہ ہے کہ ورد ایک خاص رنگت کا سواری کا مرکب گھوڑا یا خیر ہوتا ہے، شاید فارسی میں اشقر اسی قسم کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔ دوسرے کالدہان کے معنی ایک خاص طرح کے سرخی مائل زرد چڑے کے لیے گئے ہیں۔ یہ عرب

کے لحاظ سے اس رنگ کے ذہن میں لانے کا قوی ذریعہ ہے اور دوسری تشریح یہ ہے کہ وہ تیل کے معنی والے میں سے ہے چونکہ تیل انڈیلنے کے بعد جو اس کا پتھڑ ہوتا ہے، وہ اس کا رنگ ہوتا ہے اس میں ایک چمکیلا پن بھی ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup> ہم سمجھتے ہیں جب ورد کی لفظ میں رنگ کا اظہار ہو رہی گیا تو اب تشبیہ میں اس اضافے سے مزید اس چمکیلے پن کا اظہار مقصود ہوگا۔ اور دریافت حال کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ حساب و کتاب وغیرہ سب اتمام حجت کے لیے ہوگا، جس کا وقوع دوسرے آیات قرآنی سے ثابت ہے مثلاً؛

وَقِفُّهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُؤُونَ.

”اور انھیں ٹھہراؤ، ان سے ابھی سوال ہوگا،

فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

”تو قسم تمہارے پروردگار کی، ہم ان سب سے دریافت کریں گے اور اس کے متعلق جو یہ کرتے تھے۔

تَاللّٰهِ لَنَسْئَلَنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ.

”قسم خدا کی ضرورت تم سے سوال ہوگا اس کے متعلق جو تم سے سوال ہوگا اس کے متعلق جو تم کرتے تھے۔

یہ حساب کتاب والا سوال ہے جو خلائق منظر عام پر مجرموں کو متعارف بنانے اور ان کے جرائم ثابت کر کے ان کے سزاؤں کے احکام نافذ کرنے کے لیے ہے۔

یہ سوال و جواب جس کے لیے ”جواب دہی“ کی کوئی لفظ موزوں ہے، ان کے لیے سزائے اخروی کے ایک جز کی حیثیت رکھتی ہے۔

يُعْرِفُ الْمَجْرِمُونَ بِسَيِّئِهِمْ فَيُؤْخَذُ بِالتَّوَصِي وَالْاَقْدَامِ ﴿۳۱﴾ فَبِأَيِّ آيَةٍ

رَبِّكُمْ اَتَكْذِبْنَ ﴿۳۲﴾ هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكْذِبُ بِهَا الْمَجْرِمُونَ ﴿۳۳﴾ يَطُوفُونَ

بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ اِنَّ فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمْ اَتَكْذِبْنَ ﴿۳۴﴾

”گناہگار لوگ تو اپنے چہروں ہی سے پہچان لیے جائیں گے تو پیشانی کے پنے اور پاؤں پکڑے جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ بحوالہ (ترجمہ حافظ سید فرمان علی صاحب اعلی اللہ مقامہ) تو آخر اپنے پروردگار کی کس نعمت کو تم جھٹلاؤ گے، یہ دوزخ ہے جسے گناہگار لوگ جھٹلاتے تھے اب وہ اس کے اور گرم انتہائی کھولتے ہوئے پانی کے درمیان گردش کر رہے ہیں، تو آخر تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟“

”گردش کر رہے ہوں گے“ یعنی کبھی اس آگ میں ڈالے جائیں گے اور کبھی اس گرم پانی میں۔ مسلسل یہ عذاب ان پر جاری رہے گا۔<sup>[۲]</sup>

وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتٍ ﴿۳۵﴾ فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمْ اَتَكْذِبْنَ ﴿۳۶﴾ ذُوَاتَا اَفْنَانٍ ﴿۳۷﴾

[۱]۔ عنی بہ الدھن فی اشراق لونه لان ذالك هو المعروف فی كلام العرب (ابن ابراھیم)

[۲]۔ یعنی یطوفون مرۃ بین الحمیم ومرۃ بین الحمیم (جمع البیان)



فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٥٩﴾ فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيْنَ ﴿٥٨﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا  
تُكَذِّبِينَ ﴿٥٩﴾ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ﴿٥٨﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٥٩﴾  
مُتَّكِفِينَ عَلَىٰ فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ ۗ وَجَنَّاتٍ لَّجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿٥٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ  
رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٥٩﴾

”اس شخص کے لیے جو اپنے پروردگار کی عظمت و جلال سے ڈرتا رہے، دو (۲) دو (۲) باغ ہونگے تو اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟“، جن میں رنگ برنگ کی چیزیں ہیں، تو پروردگار کی کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“ ان میں دو دو چشمے رواں ہوں گے تو اپنے پروردگار کی کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟“ ان میں ہر پھل کے جوڑے ہوں گے تو اپنے پروردگار کی کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟“ گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے ایسے چھوٹوں پر جن کے استر ریشم کے ہوں گے اور ان دو باغوں کے بالکل تیار پھل ان سے بہت نزدیک ہوں گے، تو اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟“

### نعماتِ جنت کا ذکر

مقامِ رتبہ میں مقام کا ترجمہ عظمت و جلال کے ساتھ اس مجبوری سے ہے کہ جسمانی طور پر موقف یا منزل کی تعبیر اس کے لیے نہیں ہو سکتی، عظمت و جلال میں اسکی علامت بھی ہے جس سے بندے کو کوڈرتے رہنا چاہیے بعض لوگوں نے مقامِ ربہ کی تشریح اس طرح کی ہے کہ اس کی برگاہ میں اپنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہے جسے قرآن میں کہا ہے:

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (المطففين- ۶)

جس دن سب لوگ پروردگارِ عالم کے سامنے کھڑے ہونگے متعدد افراد نے اس کے مطابق تشریح اور ترجمہ کیا ہے۔<sup>[۱]</sup> ہماری نظر میں یہ تشریح الفاظ کے ظاہری مفہوم سے بعید ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا عملی تقاضا یہ ہے کہ وہ گناہوں سے پرہیز رکھے گا جیسا کہ جناب ابن عباسؓ نے کہا: وَعَدَ اللَّهُ جَلْ ثَنَاءَ الْهَؤْمِنِينَ الَّذِينَ خَافُوا مَقَامَ رَبِّهِمْ فَادُورِيضَةُ الْجَنَّةِ۔ اللہ کا وعدہ ہے جنت کا ان مؤمنین سے جنہوں نے خوفِ خدا رکھا تو اس کے فرائض ادا کیے۔

دوسری صورت میں ان کے الفاظ یہ ہیں: الخائف من ركب طاعة الله وترك معصية ”ڈرنے والا وہ ہوگا جو اطاعتِ الہی جلائے اور معصیتِ خداوندی کو ترک کر دے، اسی کے موافق فتاویٰ اور بعض دوسرے حضرات کے اقوال ہیں جنہیں طبری نے درج کیا ہے مگر چند روایتیں جناب ابودرداءؓ سے عجیب و غریب نقل ہوئی ہیں جن میں انہوں نے رسولؐ سے اس آیت کو سن کر پوچھا: ان زنى وان سرق، چاہے وہ بدکار ہو اور چور ہو۔

[۱]۔ ایستاددن بحضور پروردگار خویش (شاہ ولی اللہ) کھڑے ہونے سے آگے پروردگار اپنے کے... شاہ رفیع الدین) للحساب

آپ نے جواب میں وہی آیت پڑھی اور ان کے متعجبانہ طور پر دوبارہ اور تبارہ سوال کرنے پر بعد میں سخت سرزنش کے انداز میں فرمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ چاہے ابودرداء کو کتنا ہی ناگوار ہو [۱] ہماری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ الفاظ قرآن سے جناب ابوالدرداء کو اس تصور کی گنجائش کیوں محسوس ہوئی؟ کیا خوف الہی رکھتے ہوئے سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی ایسے شدید گناہوں کا ارتکاب کرے گا اور پھر رسولؐ اس کی تصدیق فرمائیں اور ابوالدرداء کے اظہار تعجب پر سخت سرزنش فرمائیں۔ ہمارا ذہن اس روایت کو قبول کرنے سے قاصر ہے۔

اب جب کہ باغ بھی دو چشمے بھی دو وہاں کے پھل بھی دو دو قسم کے، اس سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلام عرب میں دو کی لفظ کی تعداد یعنی کئی عدد ہونے کے اظہار کے لیے آتی ہے، اس میں دو نے کی خصوصیت مد نظر نہیں ہوتی، بعض نے دو کی خصوصیت کو محفوظ رکھتے ہوئے دو نے کی توجیہ اپنے ذہن کے مطابق کی ہے مثلاً یہ کہ ایک باغ قصر کے اندر اور ایک قصر کے باہر بیرونی احاطے میں یا یہ کہ ایک باغ خود اس کے رہنے کا ہے اور ایک اس کے متعلقین کا یا یہ کہ ایک سونے کا ہے اور ایک چاندی کا۔ ان سب کے لیے مستند کی تشکی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے جو مفقود ہے۔ باغوں کے وصف میں ذواتا افنان جو ہے تو افنان کے معنی شاخوں کے بھی ہوتے ہیں اور بعض نے یہی کہے ہیں مگر باغوں کے ساتھ اور وہ بھی جنت جس سے گھنے پن کا اظہار ہوتا ہے اس کے ساتھ شاخوں کا تصور ایک جز کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے زیادہ تر افراد نے افنان کو اقسام کے معنی میں لیا ہے یعنی رنگارنگ اور گونا گوں..... اس صورت میں من کل فاکھتہ زوجان کو اس کی مزید تشریح ماننا لازم ہے۔

**فِيهِنَّ قِصْرٌ الْظَّرْفِ ۚ لَمْ يَطْبِئْتُهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝۵۹ فَبِأَيِّ آلَاءِ**

**رَبِّكُمَا تُكذِّبِينَ ۝۶۰ كَاثِمَهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ۝۶۱ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكذِّبِينَ ۝۶۲**

”ان میں نظروں کو محدود رکھنے والیاں ہیں جنہیں ان سے پہلے کسی آدمی نے اور نہ کسی جن نے چھوا تک نہیں ہے۔ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کرو گے؟“

کہ یاقوت اور بڑے بڑے موتی ہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کرو گے؟“

حوریں آخرت میں صنف نازک کے کمال اوصاف کا نمونہ ہیں ان کے لیے خالق نے ہر جگہ ایسے اوصاف کہے ہیں جیسے یہاں قاصرات الطرف، نظروں کو محدود رکھنے والیاں، اور اس کے بعد مقصورات فی الخيام، اپنے خیموں میں محدود رہنے والیاں، یہ اوصاف اس طبقے کے لیے خالق کی نگاہ جو اخلاقی اقدار معیار شرافت ہیں ان کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ حجاب میں ہے بے پردگی میں نہیں ہے۔

**هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝۶۳ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكذِّبِينَ ۝۶۴**

”کیا اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا کچھ اور ہے؟ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟“

احسان کے معنی اردو میں جو ہیں، ان میں کسی کے ساتھ بلا استحقاق کسی حسن سلوک کا پہلو مضمحل ہے عربی میں احسان کے معنی بس حسن عمل ہی کے ہیں، اس میں وہ بار منت مضمحل نہیں ہے جو اردو کے لفظ احسان میں ہے۔ یہاں پہلا احسان ہے بندوں کی طرف سے اپنے خالق کی بارگاہ میں حسن اعتقاد اور حسن عمل کہ جسے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ایمان و عمل صالح اور کہیں ایمان و احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اور چوں کہ

[۱] زعم انفا ابی الدرداء (ابن جریر)

ایمان شرط حصول جزا ہے مگر جزا جو ہے، وہ از روئے قرآن حسن عمل ہی کی ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں لفظ احسان ہے اس سے بھی مراد ”حسن کردار“ ہے اور پھر اس کے مقابل میں جو احسان ہے وہ اس کے صلے کی صورت میں حسن سلوک ہے جو ثواب آخرت کی شکل میں سامنے آئے گا جس کے تذکرے کے درمیان میں یہ آیت آئی ہے! یہ حل کہہ کر سوال زیادہ تر ایسے محل پر آتا ہے جہاں اس کے مضمون کا فیصلہ خود عقل و ضمیر و وجدان سے ہوتا ہے یعنی اس کے خلاف ممکن نہ ہو، احسان کے بدلے احسان نہ ہونا ظلم ہے اور ایسا ہونا عدل الہی کے خلاف ہے اس لیے غیر ممکن الوقوع ہے۔ اس طرح یہ آیت بھی ثبوت عدل کے دلائل میں آسکتی ہے۔

وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتَيْنِ ﴿٥٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٥٣﴾ مُدْهَمَمَتَيْنِ ﴿٥٢﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٥١﴾ فِيهِمَا عَيْنِينَ نَضَّخَتِنِ ﴿٥٦﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٥٥﴾ فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ﴿٥٨﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٥٩﴾

”اور ان دو کے علاوہ دو باغ اور ہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے (جو سرسبزی کی شدت اور کثرت کی وجہ سے) سخت سیاہ نظر آئیں گے، تو تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟ ان میں دو چشمے ہوں گے جوش مارتے ہوئے تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟ ان میں پھل ہیں اور کھجور اور انار، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟“

گزشتہ سلسلہ آیات میں جو ایک بحث آئی تھی کہ دو سے مراد وہی ہیں یا کتنا یہ ہے کثرت تعداد سے اس سلسلہ آیات سے اس پہلے پہلو کو تقویت ملتی ہے، اس لیے کہ دو کے ساتھ تو اس کی مناسبت ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی دو ہیں لیکن ”کثرت“ کے ساتھ یہ کہ اور بھی بکثرت ہیں، کوئی خاص تناسب نہیں رکھتا۔

من دونہما کر ترجمہ جو ان کے علاوہ ہم نے کیا، اس دو باغوں اور ان میں کسی فرق کا پتہ نہیں چلتا نہ ان کے حق داروں میں مغائرت ثابت ہوتی ہے کہ وہ باغ کسی اور کے لیے ہیں اور یہ دو باغ کسی اور کے لیے ہیں۔ بلکہ جیسا کہ بعض کا خیال ہے ہر قصر میں اندر اور باہر دو دو باغ ثابت ہوتے ہیں اور ایک معنی لفظ دون کے نزدیک کے ہیں کہ ان دونوں باغوں کی نوعیت اور درجے میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف ایک معنی دونہما کے یہ کہے گئے ہیں کہ ان سے کم درجے کے دو باغ ہیں، اور جیسا کہ ابھی سورہ واقعہ میں آئے گا خود بہشت میں دو طبقے ہیں ایک اعلیٰ طبقہ جو السابقون السابقون کا ہے جو مقررین ہیں اور ایک طبقہ اصحاب الیمین کا اور ظاہر ہے کہ جب افراد کے مراتب میں فرق ہے تو ان کے باغوں میں بھی فرق ہونا چاہیے۔<sup>[1]</sup> مُدْهَمَمَتَيْنِ، کے معنی ہیں سیاہی مضمحل ہے تو اس کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ شدت کے ساتھ سرسبزی ہو تو اس میں سیاہی پیدا ہو جاتی ہے<sup>[2]</sup> ہو سکتا ہے اس میں درختوں کی کثرت اور سرسبز پتوں کی تہہ

[1] قال الحسن الاولیان السابقین والاخیرتان التابعین (تبیان)

[2] مسجودتان من شدت خضر تہما (ابن جریر)

درتہہ افراط کا دخل ہو۔<sup>[۱]</sup> فاکہتہ ونخل ورممان میں تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ”نخل ورممان“ کھجور اور انار، فاکہہ میں داخل نہیں ہیں لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ فواکہہ میں ہیں تو لیکن اہمیت کے لحاظ سے ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا کہ حافظہ اعلیٰ الصلوات والصلوۃ الوسطیٰ جس کا مطلب یہ ہے کہ پابندی کرو عموماً نمازوں کی اور خصوصیت کے ساتھ صلوة وسطیٰ کی جس کی تفسیر پہلے درج ہو چکی ہے۔

فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ﴿٤٠﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٤١﴾ حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي  
الْحَيَامِ ﴿٤٢﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٤٣﴾ لَمْ يَطْبُخُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿٤٤﴾  
فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٤٥﴾

”ان میں بڑی خوش کردار حسینائیں ہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟“ وہ حوریں جو خیموں کے اندر محدود رہتی ہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟“ جنہیں انسان اور جنات میں سے کسی نے انہیں چھوا تک نہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟“

حسان جس سے بآسانی ذہنی تصور خوب صورتی کا ہوتا ہے، اس کے قبل خیرات کی لفظ کہنا نظر اس لیے ہے کہ حسن صورت سے مقدم حسن سیرت ہے چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ام المؤمنین ام سلمہؓ کے دریافت کرنے پر یہی اس کی تشریح فرمائی<sup>[۲]</sup> جیسا کہ گزشتہ سلسلہ آیات میں بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے قبل میں حوروں کا وصف یہ تھا کہ وہ اپنی نگاہوں کو محدود رکھتی ہیں اور اب یہاں یہ کہ وہ خود خیموں کے اندر محدود رہتی ہیں، یہ سب عصر حاضر کے ارتقائی تصور کے خلاف ہے جس کے معیار کے لحاظ سے وہ اس صنف کی کسی فرد کی تعریف میں کہتے ہیں کہ وہ بہت ”ایڈوانس“ ہے یا سوشل ہے۔ حالانکہ اس کے پہلے کی آیت میں بھی اور یہاں بھی ”چھوا تک نہیں“ اس کا مطلب یہی ہے کہ ان سے تعلق اردو واجبی کسی کا اس کے پہلے قائم نہیں ہوا ہے جس طرح حضرت مریمؑ کی زبانی قرآن مجید میں ہے کہ ولہم بمسسنی بشر، مجھ کو کسی انسان نے چھوا نہیں..... اس کا بھی مطلب یہی ہے کہ کسی نے بحیثیت شوہر مجھ میں تصرف نہیں کیا ہے۔

مُتَّكِبِينَ عَلَى رَفْرِفٍ خُضِرٍ وَعَبَقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٤٦﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٤٧﴾  
تَلْبَرِكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَلِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٤٨﴾

”گاؤ سے لگے بیٹھے ہوئے سبز رنگ کے بچھونوں اور خوبصورت گدوں پر، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟“ قائم و دائم ہے نام تمہارے پروردگار کا جو عظمت و بزرگی والا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ تمہارا پروردگار قائم و دائم ہے مگر اس نام کا اضافہ ویسے ہی ہے جیسا کہ بسم اللہ میں جس کی ہم نے تفصیل کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں تشریح کی ہے۔

[۱] از بیوہی درختان سیاہی نماید (قاموس القرآن)

[۲] خیرات الاخلاق حسان الوجوه (ابن جریر)

# سُورَةُ الْوَاقِعَةِ

مکیہ..... ۹۶..... آیات

پہلی ہی آیت میں واقعہ کی لفظ ہے، اسی پر سورے کا نام ہوا۔

**سورۃ واقعہ کے خاص خاص مضامین:**

- ۱..... احوال و احوال قیامت۔
- ۲..... تین قسم کے لوگ، دو قسم والے اہل بہشت اور ایک قسم والے اہل دوزخ۔
- ۳..... اہل بہشت کا وجد آفریں۔
- ۴..... اہل دوزخ کا وحشت آفریں حال۔
- ۵..... انکار معاد سب سے بڑا جرم۔
- ۶..... ثبوت معاد کے لیے قدرت الہی کے حوالے اور اس کے مقابلے میں انسان کی عاجزی۔
- ۷..... نعمت الہی کی یاد دہانی سے شکرگزاری کی دعوت۔
- ۸..... قرآن کی توصیف۔
- ۹..... مس حروف قرآن کے لیے طہارت کی شرط۔
- ۱۰..... موت کے مقابلے میں انسان کی بے بسی۔
- ۱۱..... تینوں قسم کے لوگوں کے انجام کا خلاصہ۔

**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ**

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

**اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ لَيْسَ لَوْقَعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۖ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۗ**

”جب وہ وقوع میں آنے والی ساعت آگئی اور اس کے وقوع میں کسی جھوٹ کا شائبہ نہیں، وہ نیچا دکھانے والی

اور اونچا کرنے والی ہوگی“

یعنی کچھ جو دنیا میں اونچے تھے، اس دن پستی میں گرفتار ہوں گے اور کچھ جو دنیا میں نیچے سمجھے جاتے تھے آج ان کی برتری نمایاں ہوگی۔

إِذَا رَجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا<sup>١٣</sup> وَبَسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا<sup>١٤</sup> فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًّا<sup>١٥</sup>

”جب زمین پوری طرح تھرا جائے گی اور پہاڑ پوری طرح ریزہ ریزہ اس طرح ہوجائیں گے کہ وہ فضا میں اڑتے ہوئے بے حقیقت ذرے ہیں۔“

ہباء کا لفظ پہلے قرآن میں آچکا ہے جس کے ترجمے کے لیے درحقیقت اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے، اس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے کہ کسی روشن دان سے دھوپ آرہی ہو تو اس دھوپ میں فضا کے اندر کچھ اڑتے ہوئے ذرے نظر آئیں گے جنہیں ہاتھ سے پکڑنا چاہیں تو ہاتھ میں آتے کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔<sup>[1]</sup> ہباء کی صفت دوسری جگہ قرآن میں منثور آئی ہے یعنی بکھرے ہوئے اور یہاں اس کی صفت منبث آئی ہے یعنی پھیلے ہوئے، مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔

وَ كُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً<sup>١٦</sup> فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ<sup>١٧</sup> مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ<sup>١٨</sup> وَأَصْحَابُ

الْمَشْأَمَةِ<sup>١٩</sup> مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ<sup>٢٠</sup> وَالسَّبِقُونَ السَّبِقُونَ<sup>٢١</sup> أُولَئِكَ

الْمُقَرَّبُونَ<sup>٢٢</sup> فِي جَنَّاتٍ النَّعِيمِ<sup>٢٣</sup>

”تو تم تین قسم کے لوگ ہو گے اور دائیں طرف والے (کیا جانو) کیا ہے یہ دائیں طرف والے اور بائیں طرف والے (کیا جانو) بائیں طرف والے کیا ہیں؟ اور وہ جو سبقت کرنے والے پورے پورے سبقت کرنے والے ہیں، یہ لوگ خاص مقرب افراد ہیں نعمت کے خاص باغوں میں۔“

مشامۃ کی لفظ ہے تو شوم سے جس کے معنی نحوست کے ہیں مگر چونکہ بائیں سمت عرب میں منخوس سمجھا جاتا تھا اس لیے بائیں کو مشامۃ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی سورے میں تھوڑی دور پر اس کے بعد انہی لوگوں کی تعبیر اصحاب الشمال سے کی گئی ہے جس کے لفظی معنی ہی ہوئے ”بائیں طرف والے“۔

ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْأُولَىٰ<sup>٢٤</sup> وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ<sup>٢٥</sup> عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ<sup>٢٦</sup> مَّتَّكِينَ<sup>٢٧</sup>

عَلَيْهَا مَتَابِعُ الْمَقْبَلِينَ<sup>٢٨</sup> يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ<sup>٢٩</sup> بِأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقٍ<sup>٣٠</sup>

وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ<sup>٣١</sup> لَا يَصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُزْفُونَ<sup>٣٢</sup> وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا

يَتَخَيَّرُونَ<sup>٣٣</sup> وَلَحْمٍ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ<sup>٣٤</sup> وَحُورٌ عِينٌ<sup>٣٥</sup> كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ

الْمَكْنُونِ<sup>٣٦</sup> جَزَاءً لِّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ<sup>٣٧</sup>

”ایک بہت بڑی جماعت پہلوں میں سے اور بہت تھوڑے آخروں میں سے، ایک دوسرے سے بالکل

[1] - الهباء التي تدخل في الكرة من شعاع الشمس (علی ابن ابراہیم)

ملے ہوئے طلا کارگاؤ سے لگے ہوئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے، ان کے آگے گردش کر رہے ہوں گے ہمیشہ کی زندگی والے لڑکے جام، صراحی سبوساغر لیے ہوئے پاک صاف شراب جس میں درد سر ہوتا ہے اور نہ ہوش و خرد ہاتھ سے جاتا ہے اور پھل جو وہ پسند کریں اور پرندوں کا گوشت جو ان کی خواہش ہو اور بڑی آنکھوں والی خوب صورت حوریں صلے میں ان اعمال کے جوہ کرتے تھے۔

چونکہ ہر نبی پر ایمان میں سبقت کرنے والے سابق ہیں اور ظاہر ہے کہ اولین میں انبیاء کی کثرت ہے اور آخری امت میں تو ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو چاہے آپ کی امت کی مردم شماری قیامت تک کتنی ہی بڑھ جائے مگر سبقت کرنے والے تو اس وقت کے معدودے چند ہوں گے لہذا اولین کے لیے سابقین کی جماعت میں کثرت ہے اور آخرین میں سابق افراد معدودے چند ہیں [۱] اور ان میں بھی جو سب سے پہلا سبقت کرنے والا ہے وہ ایک ہی ہو سکتا ہے، زیادہ ہو ہی نہیں سکتے۔ [۲]

### لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيهَا إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ﴿٢٦﴾

”نہیں سنیں گے وہ اس میں کوئی بے کار اور گناہ گار بنانے کی بات مگر بس ایک گفتگو دعا اور اسلام۔“

اللہ کلمہ استثناء ہے اور استثناء کی دو قسمیں ہیں ایک استثنائے متصل جس میں الا کے بعد والی چیز جو مستثنیٰ کہلاتی ہے الا کے قبل والے عنوان کے تحت میں داخل ہوتی ہے اور اسے الا کے ذریعے اس حکم سے خارج کیا جاتا ہے، یہاں ایسا نہیں ہے اس لیے کہ دعا سلام نہ لغو ہے اور نہ تائیم یعنی گناہ گار بنانے کی بات۔ لہذا یہ استثناء کی دوسری قسم ہے جسے منقطع کہتے ہیں۔ اس سے پہلی ہی بات میں ذرا زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے یعنی دعا و سلام کے سوا کوئی بات نہ سنائی دے گی تو لغو اور تائیم والی بات کہاں گوش زد ہوگی۔

### وَاصْطَبُ الْيَبِينِ ﴿٢٧﴾ مَا اصْطَبُ الْيَبِينِ ﴿٢٨﴾ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ﴿٢٩﴾ وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ﴿٣٠﴾ وَوَظِلٍّ مَّمْدُودٍ ﴿٣١﴾ وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ ﴿٣٢﴾ وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ﴿٣٣﴾ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ﴿٣٤﴾ وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ ﴿٣٥﴾

”اور دائیں ہاتھ والے کیا کہنا دائیں ہاتھ والوں کا ایسے پیری کے درختوں میں جن میں کانٹے نہیں ہوں گے اور کیلے تہہ بہ تہہ اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور پانی بہتا ہوا اور پھل کثرت سے جو نہ ختم ہونے والے ہیں اور ان میں کوئی رکاوٹ ہے اور ایسے پچھونے جو اونچے اونچے ہیں۔“

اس سے پہلے ہی پارے کی اُس آیت میں کہ:

كُلَّمَا رَزَاقًا مِنْهُمْ رَزَقًا ۗ قَالُوا هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ ۗ وَأَنْتُمْ إِلَيْهِ مُتَشَابِهَةٌ (بقرہ ۲۵)

جب انہیں وہاں کوئی کھانے کی نعمت ملے گی وہ کہیں گے یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے ملی تھی حالانکہ وہ اب ملی ہے انہیں ملتی جلتی ہوئی۔

[۱] انا قال ذلك لان الذين سبقوا الى اجابة النبي قليل من كثير ممن سبق الى النبيين (تبيان)

[۲] السابق في امة محمد علي ابن ابي طالب (مجمع البيان)

لکھا جا چکا ہے کہ نعیم جنت کے ذیل میں جن پھلوں کے نام قرآن مجید میں لیے گئے ہیں، وہ نام اس لیے عربی زبان والے ان سے متعارف تھے لیکن نعمات جنت کو ان پھلوں میں محدود نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے ان پھلوں کے ذکر میں عربی کے جو نام ہیں ان کے متبادل ترجمے کی زیادہ اہمیت نہیں ہے، چنانچہ طرح کے ترجمے میں جو ہم نے کیلے کی لفظ لکھ دی ہے، یہ ایک تشریح کی بنا پر ہے کچھ لوگوں نے اس سے مختلف تشریحیں کی ہیں۔ [۱] فرش مرفوعہ کا ترجمہ 'ایسے پھونے اونچے اونچے ہیں' یہ وہ مفہوم ہے جو لفظوں سے بلا تکلف ذہن میں آتا ہے بعض لوگوں نے بعد والی آیتوں کے تناسب سے جو اس کے معنی لیے ہیں، وہ ابھی درج کیے جائیں گے۔

### اِنَّا اَنْشَاْنَهُنَّ اِنْشَاءً ۝۵۰ فَجَعَلْنَهُنَّ اَبْكَارًا ۝۵۱ عُرْبًا اَثَرًا ۝۵۲ لِاصْحَابِ الْيَمِينِ ۝۵۳

”یقیناً ہم نے انہیں پیدا کیا جیسا پیدا کرنا چاہیے تو انہیں کنوارا بنایا گر ویدہ بنانے والیاں، برابر کے سن و سال والی دائیں ہاتھ والوں کے لیے۔“

”انہیں پیدا کیا“ ھُنَّ؟ ضمیر جمع مؤنث کی ہے جسے حوروں کی طرف پھرنا چاہیے مگر حوروں کا ذکر یہاں پہلے تھا، بیچ میں دوسرا ذکر آ گیا جو پہلے سلسلے سے الگ ہے اس لیے ابھی جو فرش مرفوعہ کی لفظ تھی جس کا ترجمہ بچھونوں کے ساتھ کیا گیا تھا اسے کہا گیا ہے کہ اس سے ازدواج یعنی بیویاں مراد ہیں کیوں کہ جیسا کہ قبوی (لغت کے ماہر) نے مصباح المنیر میں لکھا ہے عرب میں فرش کی لفظ رشتہ زوجیت کے انظار کے لیے آتی ہے مگر جیسا کہ وہاں ہم نے اس فقرے کے ترجمے کے تحت میں لکھا ہے جس محل پر جملہ ہے وہاں اس سے ذہن میں وہی معنی آتے ہیں جن کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بستر کی لفظ سے فرش میں مضمحل ہونے والے کے ذہن میں، ہم بستروں“ کا تصور پیدا ہوتا ہے، اس خطور ذہنی کو مد نظر رکھتے ہوئے فرش کی لفظ کے بعد ان ازدواج کی توصیف شروع کر دی گئی۔

اب اگر ان ازدواج سے حوریں ہی مراد ہیں جیسا کہ عام طور پر آخرت والی ازدواج سے ذہن میں آتا ہے تو اِنْشَاءً ۝۵۰ سے یہ مطلب نکالنا بھی درست ہے کہ انہیں ایک دم عالم وجود میں لایا گیا ہے یعنی وہ بطور ولادت پیدا نہیں ہوتیں بلکہ حکم کن سے مکمل شکل میں ان کی تخلیق ہوئی ہے جسے فرشتے کی ان کی بھی تخلیق تدریجی طور پر نہیں ہوتی کہ وہ پہلے مبدا خلقت میں بچے ہوں اور پھر جوان ہوں لیکن طبری نے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں جن میں پیغمبر خدا ﷺ کی حدیثیں ہیں کہ یہاں مراد حوریں نہیں ہیں بلکہ یہ مؤمنین کی صاحب ایمان دنیا والی بیویاں ہیں جو دنیا میں چاہے جیسی ہوں، کتنی ہی بد صورت ہوں، کتنے ہی بچوں کی ماں ہوں، آخرت میں جو پیدا ہوگی تو ان کے یہ اوصاف ہوں گے۔ عرب کی لفظ ایک خاص قوم کے نسلی نژاد کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اخلاق و اوصاف کی جامعیت کے معنی میں ہے ا۔ (جمع عروب وہی المتجبة الى زوجها عشقاً له..... جلالین)

### ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۵۴ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝۵۵

”بہت سے پہلے والوں میں سے اور بہت سے ہیں آخر والوں میں سے“

[۱] قبیل لیس باطوزولکنہ شجر لہ ظل بار دور طب عن الحسن وقیل ہر شجر یكون بالیمین والحجاز من احسن الشجر منظر (مجمع



چونکہ پہلے ایمان میں سبقت کرنے والوں کا ذکر تھا تو ان میں اکثریت پہلے والوں کی تھی لہذا۔ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْأُولَىٰ. وَثَلَاثَةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ. تھا کہ ”کم افراد آخر والوں میں سے“ مگر اب سبقت کا سوال نہیں ہے۔ اس لائق ہونا ہے کہ انسان داہنی طرف والوں میں شمار ہو، تو اب اس میں پہلے اور بعد والوں میں اکثریت اور اقلیت کا فرق نہیں ہے، سابق امتوں میں بھی بہت سے ہیں اور اس امت میں بھی بہت سے۔

وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ ۖ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ ﴿٣١﴾ فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَظِلٍّ مِّن

يَحْمُومٍ ﴿٣٣﴾ لَا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ ﴿٣٤﴾

”اور بائیں ہاتھ والے (کیا جانو) کیا ہیں بائیں ہاتھ والے سخت تپش اور گرم پانی اور بہت تاریک دھویں کے سائے میں نہ سرد ہے اور نہ باعزت“۔

یہ دوزخ والوں کا حال ہے جنہیں پہلے اصحاب المشامتہ سے تعبیر کیا گیا تھا جس پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا أَقْبَلَٰ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿٣٥﴾ وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ ﴿٣٦﴾

وَكَانُوا يَقُولُونَ ۖ اٰیْذًا مِّتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ۗ اِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿٣٧﴾ اَوْ اٰبَاؤُنَا

الْاَوْلٰٓؤُنَ ﴿٣٨﴾

”یہ لوگ اس سے پہلے عیش و عشرت میں گرفتار تھے اور بہت بڑے گناہ پر ہٹ دھرمی سے کام لیتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور بس مٹی اور ہڈیوں کی شکل میں ہوں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور کیا ہمارے باپ دادا بھی؟“

بہت بڑے گناہ سے مراد ایک تفسیر کی بنا پر ”شُرک“ ہے [۱] جسے دوسری جگہ ظلم عظیم کہا گیا ہے اس طرح ان کے دوزخی ہونے کے اسباب میں معاد کے ساتھ توحید کا انکار آ گیا، جو دو باتیں ایمان باللہ والیوم الآخر کے تحت نجات کے لیے ضروری ہیں اور ایک تصور یہ ہے کہ ”حنث“ [۲] تاکیدی معاہدہ کو توڑتا ہے۔ یعنی اس کے دائرہ میں ان ذمہ داریوں کا پورا نہ کرنا بھی ہے جو ان پر عقل و فطرت اور شریعت کی رو سے عائد ہیں۔

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ ﴿٣٩﴾ لَمَجْمُوعُونَ ۗ اِلَىٰ مِيْقَاتٍ يَّوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٤٠﴾ ثُمَّ

اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ ﴿٤١﴾ لَا تَكُلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زُقُوْمٍ ﴿٤٢﴾ فَمَا لِيُوْنَ

مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٤٣﴾ فَشَرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿٤٤﴾ فَشَرِبُوْنَ شُرْبَ الْهَيْمِ ﴿٤٥﴾

[۱] الحنث العظيم ای الشُرک (جلالین)

[۲] نقص العهد الموكد بالحلف فهو التي ينقضون العقود التي يذمهم الوفاء بها (تبیان)

## هَذَا نُزِّلَهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ۝٥٦

”کہیے کہ بے شک اگلے اور پچھلے سب اکٹھا کیے جائیں گے مقرر دن کے موقع پر پھر تم اسے جھٹلانے والے گمراہ ہو، کھا کے زقوم (تلخ ترین پھل) کے درخت سے تو اس سے پیٹ بھر وگے، پھر اس پر گرم پانی تمہیں پینے کے لیے ملے گا تو اس طرح پیو گے جیسے انتہائی پیاسے اونٹ (بے تحاشا) پیتے ہیں۔ یہ ان کا سامانِ ضیافت ہوگا جزا و سزا کے دن“۔

قرآن مجید دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس معاد جسمانی کا تصور پیدا کر رہا ہے، جسے عام طور پر مسلمان مانتے ہیں۔ نہ صرف فلسفی قسم کی جزا و سزا جس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر یہ کہ وہ سب کا ایک موقع پر اکٹھا ہونا بتاتا ہے، نہ کہ پوری عمر زمانہ میں یکے بعد دیگرے تباہ و غیرہ کی صورت سے۔

مَنْ خَلَقَكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ ۝٥٧ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ ۝٥٨ ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ  
مَنْ خَلَقْتُمْ فَلَوْلَا تَبْتَغُونَ ۝٥٩ مَنْ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا تَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۝٦٠ عَلَىٰ أَنْ  
تُبَدَّلَ أَمْثَالِكُمْ وَتُنشَأَ لَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝٦١ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ  
فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ۝٦٢

ہم نے تمہیں پیدا کیا تو تم اب یقین کیوں نہیں مانتے اچھا تو کیا تم نے غور کیا ہے کہ جو مادہ تولید تم منتقل کرتے ہو، کیا تم اس تخلیق کو پیدا کرتے ہو یا یہ کہ ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت کا نظام قائم کیا ہے اور ہم بے بس نہیں ہو سکتے، اس میں کہ تمہاری تخلیق کی صورت کو بدل دیں اور تمہیں پیدا کریں اس عالم میں کہ جسے تم نہیں جانتے ہو اور پہلی دفعہ کی تخلیق تمہیں معلوم ہی ہے تو کیوں یاد نہیں رکھتے ہو؟ پہلی دفعہ کی تخلیق حضرت آدم کی جوٹی کے پتلے میں روح پھونکی ہوئی تھی تو اب ان اجزا کو جو منتشر طور پر موجود ہیں، اکٹھا کر کے ان میں روح پھونکنا اس کے لیے کیوں ممکن نہیں ہے؟ اس مفہوم کو چھوڑ کر کوئی ایسے معنی نکالنا جو کسی غلط عقیدے کا ثبوت بن سکیں جو قرآن کی دوسری آیتوں کے خلاف ہے، مطلب پروری ہے، قرآن فہمی نہیں ہے، پھر یہ کہ اس محشر میں بھی جس کے مسلمان قائل ہیں کسی حد تک صورتوں کی تبدیلی کا تصور تو موجود ہی ہے۔ [۱]

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ۝٦٣ ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝٦٤ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ  
حُطًا مَّا فِظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۝٦٥ إِنْ آتَاكُمْ مَوْنٌ ۝٦٦ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝٦٧

[۱] - مَا لَا تَعْلَمُونَ مِنَ الصُّورِ كَالْفُوتِ وَالْحَنَازِيرِ (جلالین)

”اچھا تو کیا تم نے غور کیا ہے کہ تم بوتے ہو تو کیا تم اس کھیتی کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ اگر تم چاہتے تو اسے خشک کر کے چورا بنا دیتے کہ تم حیرت میں پڑ جاتے کہ ہمیں بڑا مالی نقصان ہوا بلکہ ہم بالکل ہی بے نصیب رہے۔“

جب کہ اثبات معاد میں بچے کی پیدائش کے سلسلے میں یہ بات آگئی کہ یہ ظاہری اسباب جو تم فراہم کرتے ہو، وہ نتیجے کے پیدا کرنے والے نہیں ہیں اصل پیدا کرنے والے ہم ہیں تو اب اس سے مناسبت رکھنے والی دوسری کارگزاریوں کا پتہ دیا جا رہا ہے کہ تم اپنے خیال میں اس کے اسباب فراہم کرتے ہو لیکن اس پر نتیجہ مرتب ہونا اور نہ ہونا کس کی قدرت میں ہے؟ وہ صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہے، فَظَلَّمْتُمْ تَفَكَّهُونَ، کا ایک ترجمہ یہ ہے کہ تم بے کار آپس میں باتیں بناتے ہو، یہ دونوں ترجمے پہلے سے ہوتے آئیں ہیں۔ ہمیں پہلا تعجب کے معنی والا زیادہ چسپاں معلوم ہوتا ہے۔

**أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾ ءَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ**

**الْمُنزِلُونَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَافًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾**

”تو کیا تم نے غور کیا ہے اس پانی پر جو تم پیتے ہو، کیا تم اسے ابر سے نیچے اتارتے ہو یا ہم اتارنے والے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری کر دیں، تو تم شکر گزار کیوں نہیں ہوتے۔“

اس میں قدرت کے ساتھ اسکے نعمت و احسان کے پہلو کو بھی نمایاں کر کے شکرگزاری کی دعوت دی جا رہی ہے۔

**أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ﴿٧١﴾ ءَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ﴿٧٢﴾**

**نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذَكُّرًا وَرَمْتَنَا عَالِلًا لِّلْمُقْوِينَ ﴿٧٣﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٧٤﴾**

”تو کیا تم نے نظر کی ہے اس آگ پر جو تم روشن کرتے ہو تو کیا تم نے اسے درخت کو پیدا کیا تھا یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔ ہم نے اسے یاد دہانی اور فائدہ اٹھانے کا ذریعہ قرار دیا ہے ضرورت مندوں کے لیے تو تسبیح کرو اپنے بزرگ پروردگار کے نام کی۔“

چونکہ دور قدیم میں ایک خاص درخت کی لکڑی سے آگ حاصل کی جاتی تھی [۱] اس لیے کئی جگہ قرآن مجید میں آگ کے ساتھ درخت کا ذکر ہے۔ یاد دہانی کا ہے کی؟ سمجھ میں بھی آتا ہے کہ اس طرح پھر ذہن منتقل کیا گیا ہے آخرت کی اس آگ کی طرف جو مجرموں کے لیے مہیا ہے۔ [۲]

**فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْجِعِ النُّجُومِ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوَتَّعْلَمُونَ عَظِيمٌ ﴿٧٦﴾ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ**

**كَرِيمٌ ﴿٧٧﴾ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ﴿٧٨﴾ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ**

[۱] - یعنی الشجر التي منقذ منها النار (تبیان)

[۲] - عن قتادة نذکر النار الکبریٰ (ابن جریر)

## الْعَلَمِينَ ﴿٨٠﴾

”تو میں کھاتا نہیں قسم ستاروں کے مقامات کی حالاں کہ تم جانو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ یقیناً ایک بڑے مرتبہ والا قرآن ہے ایک نظروں سے پوشیدہ کتاب کے اندر اسے نہیں چھو سکتے مگر پاک افراد، یہ اتارا ہوا ہے، تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے“

## قرآن کے مس حروف کے لیے طہارت کی شرط

قرآن جس نظروں سے پوشیدہ کتاب کے اندر ہے وہ لوح محفوظ ہے، جو وہاں سے پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر توسط ملک اترتا رہا ہے۔ ”اسے پاک افراد کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا“ یہ ضمیر اگر ”کتاب مکنون“ کی طرح راجع ہو جیسا کہ جمہور مفسرین اہل سنت کا رجحان ہے تو وہ عالم بالا میں ہے اسے ہمارے لیے چھونے نہ چھونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور اب چھونے کے معنی علم و ادراک کے ہیں اور وہ مطہر مخلوق جس کا اس تک دسترس ہے فرشتے ہیں۔ اب اس میں ہمارے لیے کوئی عملی ہدایت نہیں ہو سکتی لیکن دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ ضمیر ”قرآن مجید“ کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں بھی ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ اس کا پورا علم سوائے مطہرین یعنی معصوم ہستیوں کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ کہ مس کے معنی جسمانی حیثیت سے چھونے ہی کے ہوں اس پر اس حکم فقہی کی بنیاد قائم ہوتی ہے کہ حروف قرآن کو بغیر طہارت یعنی وضو وغیرہ کے چھونا جائز نہیں ہے علمائے شیعہ کا مسلک یہی ہے [۱] یہ کہ ”قسم نہیں کھاتا“ یہ ایک انداز ہے قسم کھانے ہی کا جب کہ اس کے ساتھ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو جس کا تمہیں یقین ماننا چاہیے۔

## أَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ ﴿٨١﴾ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْتُمْ تُكذِّبُونَ ﴿٨٢﴾

”تو کیا اس بیان کو تم نظر انداز ہی کرتے رہو گے اور اپنی روزی یہی قرار دو گے کہ تم جھٹلاتے ہو۔“

”اپنی روزی یہی قرار دو گے؟“ یہ بظاہر بطور طنز ہے یعنی جیسے روزی انسان کے بقائے حیات کے لیے ضروری ہے، ویسے اس حیات بعد الموت کے تذکرے کو جھٹلانا تم ضروری سمجھتے ہو۔ اور ایک مطلب اس کا یہ سمجھا گیا ہے کہ اللہ جو تمہیں روزی عطا کرتا ہے اس کا تقاضا تم یہی سمجھتے ہو کہ تم اس کی باتوں کو جھٹلاتے رہو۔ [۲]

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ ﴿٨٣﴾ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ﴿٨٤﴾ وَمَنْ أَقْرَبُ إِلَيْهِ

مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُونَهَا إِنْ

كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٨٧﴾

”تو کیوں نہیں؟ جب وہ روح نکل کر گلے تک پہنچ جائے گی اس عالم میں کہ تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے

[۱] - عندنا ان الضمير يعود الى القرآن فلا يجوز لغير الطاهر مس كتابه القرآن (مجمع البيان)

[۲] - تجعلون شكر الله على رزقه اياكم التكميز (ابن جرير)

ہوا اور ہم تم سے زیادہ اس کے نزدیک ہوتے ہیں مگر تم دیکھتے نہیں ہو کیوں نہیں، اگر تمہیں جزا سزا ملنے والی نہیں ہے تو پلٹا دیتے تم اسے اگر تم سچے ہو۔“

مطلب یہ ہے کہ جب یہ موت اور حیات تمہارے قبضے میں نہیں کسی اور کے احاطہ قدرت میں ہے تو تمہیں اس قادر کی قدرت پر پابندی عائد کرنے کا کیا حق ہے؟ چاہے تو اسی وقت اس روح کو پلٹا دے اور چاہے تو ہزاروں لاکھوں سال کے بعد پلٹائے۔ یہ اس کی حکمت اور نظام کائنات کی مصلحت سے وابستہ ہے۔

فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٨٨﴾ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ ۖ وَجَنَّتْ نَعِيمٍ ﴿٨٩﴾ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ﴿٩٠﴾ فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ﴿٩١﴾ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمَكْدُوبِينَ الضَّالِّينَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ﴿٩٣﴾ وَتَصْلِيَةٌ جَهِيمٍ ﴿٩٤﴾ إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ﴿٩٥﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٩٦﴾

تو اب اگر وہ مقرب گروہ میں سے ہے تو راحت، آرام، روزی اور نعمت والا بہشت ہے اور اگر وہ داہنی طرف والوں میں سے ہے تو خیریت سمجھو، داہنی طرف والوں کی طرف سے لیکن اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہے تو پھر اس کا سامان ضیافت کھولتے ہوئے گرم پانی سے ہے اور دوزخ کی آگ کی تپش ہے، یقیناً یہ پوری پوری یقینی بات ہے تو تسبیح کرو اپنے بزرگ پروردگار کے نام کی۔“

### تینوں قسم کے لوگوں کے انجام کا خلاصہ

سورے کے شروع میں جو تین قسم کے لوگ بیان ہوئے تھے، آخر سورہ میں ان کا انجام ہے جن میں سے دو نجات یافتہ ہیں مگر ان میں مقربین کا درجہ اونچا ہے لہذا ان کی جزا میں الفاظ زیادہ صرف ہوئے ہیں وہاں السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ان کا سزا نامہ ذکر تھا اور مقربین کا وصف تھا یہاں اسی وصف کو سزا نامہ بیان قرار دیا گیا ہے۔ سَلَامٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ کا ایک ترجمہ وہ ہے جو درج ہوا کہ جس میں مخاطب غیر متعین طور پر ہر سننے والا ہے کہ اطمینان رکھو، سلامتی ان کے لیے بھی ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ النقات من الغیبہ الی الخطاب ہے یعنی کسی کے متعلق دوسروں سے کچھ کہتے کہتے ایک دم روئے خطاب خود اس کی طرف لوٹا دیا جائے۔ یہاں پہلے دوسروں سے خطاب تھا کہ اصحاب یمن کا حال یہ ہے۔ اب خود ان سے کہا جانے لگا کہ سنو اے اصحاب! یمن تمہارے لیے سلامتی ہے اس طرح من بیان یہ ہوگا کہ تمکو سلامتی ہے اے اصحاب یمن۔ بعض لوگوں نے سلام کے معنی سلامتی نہیں بلکہ ”سلام“ ہی کے لیے کہ لک کا مخاطب رسول کو قرار دیا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ”داہنی طرف والوں کی طرف سے (اے رسول) آپ پر سلام ہو یہ میرے نزدیک بعید ہے اور سیاق سابق کے ساتھ بالکل چسپاں نہیں ہے۔“

# سُورَةُ الْحَدِيدِ

مدنیہ..... ۱۹..... آیات

اس سورہ کے آخری حصے میں ایک جگہ لوہے کے اتارنے کا ذکر ہے، اسی پر اس سورے کا یہ نام ہو گیا۔

سورہ حدید کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... خدا کے اوصاف اول اور آخر اور ظاہر باطن جن کی تشریح اس آیت کی تفسیر میں ہوگی۔
- ۲..... خدا کے علم کی وسعت اور عمومیت۔
- ۳..... ایمان کے ساتھ بلا فاصلہ خیرات کا ذکر۔
- ۴..... فتح مکہ سے پہلے جان و مال کی قربانی کرنے والوں کا جو درجہ ہے، وہ بعد میں قربانی کرنے والوں کا نہیں ہے۔
- ۵..... روز قیامت اہل بہشت کے نور کا ان کے آگے آگے اور دہنے پہلو میں پھیلنا۔
- ۶..... منافقین کی بے بسی اور محتاجی۔
- ۷..... مسلمانوں کو انتباہ کہ وہ امتداد زمانہ سے گھبرا کر بددل نہ ہو جائیں۔
- ۸..... دنیوی زندگی کی بے حقیقی اور بے اعتباری اور اس کی مثال۔
- ۹..... حال کی ہر بات پہلے سے لوح قضا و قدر میں محفوظ ہوتی ہے۔
- ۱۰..... حالات کے انقلاب سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔
- ۱۱..... تمام انبیاء کے ساتھ کتاب اور میزان کا اترنا اور لوہے کا آسمان سے اترنا۔
- ۱۲..... عیسائیوں کی نیک دلی مگر ان کی ایجاد کردہ رہبانیت کی مذمت۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ ۱ لَهُ مُلْكُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ یُحِیْ وَیُمِیْتُ ۝ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ۲

”تسبیح کرتے رہے ہیں اللہ کی جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اور وہ زبردست ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا، اسی

کے لیے سلطنت آسمانوں اور زمین کی، وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔  
آسمان اور زمین اور کائنات کی ہر چیز کی تسبیح کا ذکر قرآن مجید میں پہلے بھی آچکا ہے،

**هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣٠﴾**

”وہ اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

اول اور آخر کے معنی کھلے ہوئے ہیں کہ جب کچھ نہ تھا تب وہ تھا اور جب کچھ نہ ہو، تب بھی وہ ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خود اس کی کوئی ابتدا نہیں اور نہ اس کی کوئی انتہا ہے جسے فلسفہ کی زبان میں کہتے ہیں ازلی اور ابدی اور دونوں کو ملا کر کہیں تو سردی۔  
ظاہر و باطن کی لفظوں کے بہت سے پہلو ہیں جن میں سب سے زیادہ واضح یہ ہے کہ ظاہر ہے آثار اور دلائل قدرت کی بنا پر اور باطن یعنی پوشیدہ باعتبار ذات ہے..... کہ دکھائی نہیں دیتا۔

وہ ظہور ایسا ہے جو کائنات کی ہر چیز سے نمایاں ہے اور یہ پوشیدہ ہونا ایسا ہے جس کے احاطہ عمومیت سے اس کے مخلوقات میں کوئی یہاں تک کہ انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مقررین بھی مستثنیٰ نہیں یعنی ان میں سے بھی کوئی نہیں جس کی آنکھوں کے سامنے وہ آیا ہو اور مذہب حق کی رو سے اس میں دور کی بھی کوئی قید نہیں، ازل سے وہ باطن ہی ہے اور ابد میں بھی وہ باطن ہی رہے گا۔ آنکھوں کے سامنے ظاہر کبھی نہیں ہوگا، چاہے وہ دنیا ہو یا آخرت، آج یا قیامت۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ظہور غلبہ مضمحل ہے اس لیے اس کے ساتھ علی کی لفظ آتی ہے کہ یہ اس پر ظاہر ہے اور باطن میں اندر کے معنی مضمحل ہیں تو ظاہر باعتبار قدرت ہے کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے اور باطن باعتبار علم ہے کہ وہ اندر گہرائیوں تک پہنچا ہوا ہے۔  
نہ اس کی قدرت کے احاطے سے کوئی باہر ہے اور نہ اس کے علم کے دائرے سے کوئی جز خارج ہے۔  
خداوند عالم کے اسمائے حسنیٰ کی تشریح میں عمل کلام کی کتابوں میں اور بھی پہلو درج ہیں۔

**هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ط**

**يَعْلَمُ مَا يَلْبِغُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ**

**فِيهَا ط وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ط وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣١﴾**

”وہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر متمکن ہوا عرش پر وہ ہے اسے جو زمین کے اندر جاتا ہے اور اسے کہ جو اس سے برآمد ہوتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا جاننے والا ہے۔“

چھ دن سے مراد دن نہیں سمجھنا نہیں چاہیے جو طلوع و غروب آفتاب سے وابستہ ہیں بلکہ چھ دور سمجھے جاسکتے ہیں جن میں تدریجی طور پر یہ تخلیق مکمل ہوئی اور عرش پر متمکن ہونا جسمانی طور پر نہیں ہے جب کہ وہ جسم و جسمانیات سے بری ہے بلکہ اپنے اقتدار کا مرکز اعلیٰ جسے مقام نسبت میں جائے تخت کہنا چاہیے اسے بنایا۔

جو آسمان سے اترتا ہے، یعنی روزی جس کا سب سے بڑا ذریعہ ابر باراں ہے، جو بلند ہوتا ہے وہ بندوں کے اعمال اور دعائیں۔ اسی ذیل میں فرشتوں کا نام بھی لیا گیا ہے۔ [۱]

مگر وہ دونوں فقروں میں داخل ہیں۔ وہ اترتے بھی ہیں اور چڑھتے بھی ہیں۔

**لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ  
وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۖ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝**

”اس کے لیے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور تمام معاملات کی اللہ ہی کی طرف رجوع ہے، وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور وہ سینوں کے اندر کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ دن کو رات میں اور رات کو دن میں داخل کرنے کا ذکر پہلے کئی جگہ آچکا ہے اور اسی کا حسی مشاہدہ موسموں کی تبدیلی میں ہوا کرتا ہے کہ ادھر کا ایک حصہ اُدھر چلا جاتا ہے اور ادھر کا ایک حصہ اُدھر آ جاتا ہے اور اس سے ذہن کو افراد اور اقوام کے حالات کے انقلاب کی طرف بھی مڑنا چاہیے جو سب اللہ کے ارادے کے ماتحت ہے۔

**أَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْفَقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلِفِينَ فِيهِ ۖ فَالَّذِينَ  
أَمِنُوا مِنْكُمْ وَأَنْفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ۝**

”ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبر پر اور خیرات کرو اس میں سے جس کا دوسری کے بعد اس نے تمہیں مالک بنا یا تو جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے خیرات کی ان کے لیے بڑا صلہ ہے۔“

جو چیز ہماری ملکیت ہے تو وہ دوسروں سے ہمارے پاس آئی۔ اگر خود مکسوبہ ہے تو پہلے وہ دوسرے کے پاس تھی، اسی سے تو ہمیں حاصل ہوئی اور اگر مورثی ہے تو پہلے آباؤ اجداد یا کسی دوسرے اس موروث کی تھی جس سے منتقل ہو کر ہمارے پاس آئی، بہر صورت ہمیشہ سے تمہاری ملکیت نہیں تھی، اس میں انتباہ اس پر بھی سمجھنا چاہیے کہ تمہارے ہاتھ میں بھی اُسے ہمیشہ نہیں رہنا ہے۔ تمہارے بعد یہ دوسروں کے پاس جائے گی [۲]

**وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ  
مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝**

”اور تمہیں کیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے ہو اللہ پر حالانکہ پیغمبر تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ تم ایمان لاؤ اپنے پروردگار پر اور اس نے تم سے عہد پیمان لیا تھا کہ تم واقعی مسلمان ہوئے تھے۔“

آیت کے آخری جز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اقرار ایمان کر چکے تھے، پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات ایسی ہے جس کو وہ

[۱] ما يعرج في السماء من الملكة وما يرفع اليها من اعمال الخلق (تبيان)

[۲] فيه سبحانه بهذا اعلیٰ ان ما في ايدينا يصير لغيرنا كما صار اليها من قبلنا (جمع البيان)



ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے کہا جا رہا ہے کہ جب تم مسلمان ہو چکے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ رسول اللہ تم سے عہد پیمان لے چکے ہیں کہ جو بات تم سے کہی جائے اسے مانو گے پھر اب تم کیوں نہیں مان رہے ہو۔

عام مفسرین نے اس غرض سے کہ خطاب جماعت کفار سے فرار پائے اس پیمان کو عہد الست والا عالم ذکر کا پیغام قرار دیا ہے اور ان کدتمہ مؤمنین کے معنی یہ لیتے ہیں کہ اگر تم کبھی بھی ایمان لانے والے ہو تو یہی بہترین موقع ہے ایمان لانے کا۔<sup>[۱]</sup>

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ط  
وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ٩ وَمَالِكُمْ أَلا تَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ  
مِيرَاتُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَّنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ  
وَقَتْلَ أَوْلِيٰكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدِ وَقْتَلُوا ط وَكُلًّا وَعَدَّ  
اللَّهُ الْحَسَنَى ط وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ١٥

”وہ وہ ہے جو اتارتا ہے اپنے بندہ خاص پر کھلی ہوئی آیتیں تاکہ تمہیں نکالے اندھیروں سے روشنی کی طرف اور بلاشبہ اللہ تمہارے ساتھ شفیق ہے بڑا مہربان۔ اور تمہیں کیا ہے تم خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں حالانکہ ترکہ آسمانوں اور زمین کا صرف اللہ کے لیے ہے، برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ جنہوں نے جرأت کی فتح سے پہلے اور جنگ کی ہو، یہ درجے میں زیادہ بڑے ہیں ان سے جنہوں نے اس کے بعد خیرات کی ہے اور جنگ کی ہے اور یوں تو ہر ایک کے لیے اللہ کا وعدہ بھلائی کا ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو، اس کا جاننے والا ہے۔“

”اندھیرا ہے یعنی گمراہی سے روشنی، صحیح منزل ہدایت اور حقیقی علم و معرفت کی طرف جس سے حق اور باطل میں امتیاز کلی ہو جاتا ہے۔ چونکہ پہلے مسلمانوں کی مقدرت کم تھی، اس لیے اس وقت جان و مال سے جو کام آئے ان کی قدر و قیمت پیش خدا والوں سے زیادہ ہے، یوں بعد والوں سے زیادہ ہے، یوں بعد میں بھی دیا تو اس کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا جیسا کہ بعد میں کہا گیا ہے کہ، ہر ایک سے اللہ کا وعدہ بھلائی کا ہے۔ فتح سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک فتح مکہ ہے مگر حافظ ابن جریر طبری نے اسے ترجیح دی ہے کہ اس سے صلح حدیبیہ مراد ہے، غالباً اس لیے کہ سورہ فتح میں سے ”فتح میں“ کہا گیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعْفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ ١١

”کون ہے جو اللہ کو اچھا قرضہ دے تو اسے بڑھادے گا اُس کے لیے بہت بڑا صلہ ہے۔“

کچھ لوگ اس آیت کی اور ایسے ہی کے پہلے قرآن مجید میں جو اس مضمون کی آیتیں آئی ہیں انہیں خاص طور پر قرض دینے کی فضیلت میں پیش کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں راہ خدا میں صرف کرنے کو بطور استعارہ قرض کہا گیا ہے کہ جیسے قرضہ آج دیں گے کل

[۱] ان کدتمہ تریدون ان تؤمنوا باللہ یوما من الایام فالان احدی الاوقات (ان جریر)

ملے گا، ویسے جو راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا عوض اللہ عطا کرے گا اور وعدہ کیا ہے کہ بہت بڑھا کر عطا کرے گا۔ ہاں بطور قرض بھی مومن کے کام آنا باعث ثواب ہے، لہذا وہ بھی اُس کے تحت میں داخل ہے، نہ یہ کہ قرض سے مراد قرض ہی دینا ہو۔  
مطلق انفاق کو قرض سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے ساتھ حسن کی قید بظاہر راہ خدا میں انفاق کے ان قیود کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں پہلے آچکے ہیں کہ دکھانے کے لیے نہ ہو جس کو ریا کہتے ہیں، نہ اس کا چرچا دوسروں تک پہنچانے کے لیے جسے سمعہ کہتے ہیں اور جسے دے اس پر احسان نہ جتائے اور اس کی دل آزاری نہ کرے جیسے قرآن میں من واذیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ  
بُشْرًا لَكُمْ الْيَوْمَ جَنَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ  
الْعَظِيمُ ﴿١٣﴾

”جس دن دیکھو گے بائیمان مردوں اور بائیمان عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑتا ہوگا تمہارے لیے آج مبارک ہوں یہ باغبانے بہشت جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے ان میں، یہی بڑی کامیابی ہے۔“  
چونکہ یہ اصحاب یمن ہیں جنہیں داہنی طرف سے بہشت میں جانا ہے لہذا انور سامنے اور داہنی طرف پھیل رہا ہوگا کہ اسی رخ پر وہ آگے بڑھتے جائیں۔ ﴿۱۳﴾

اب دور آخر کی جتنی بھی چیزیں ہیں، ان میں نام وہی ہیں جن سے ہم متعارف ہیں لیکن حقیقت ان کی الگ ہے لہذا اس نور کی بھی پوری حقیقت سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُوا نَارَ النَّبْتِيسِ مِنْ نُورِكُمْ ۗ  
قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا ۗ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ ۖ بَاطِنُهُ  
فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿١٤﴾ يُنَادُوا لَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۗ  
قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ  
حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ﴿١٥﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ  
الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ مَا أُولَئِكَ النَّارُ ۗ هِيَ مَوْلَاكُمْ ۗ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٥﴾

”جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے کچھ

بہرہ مند ہوں کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے واپس جاؤ اور کوئی نور ڈھونڈو، تو ان کے درمیان ایک دیوار اٹھ جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا، اس کے ادھر رحمت ہوگی اور ادھر جو باہر کا رخ ہے ادھر عذاب ہی عذاب ہے، اب وہ ان سے پکار کر کہیں گے کہ ارے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے کہ کیوں نہیں مگر تم نے اپنے کو گمراہی میں ڈالا اور نتائج کو دیکھنے لگے کہ آخر میں کیا ہوتا ہے اور شک و شبہ میں مبتلا رہے اور خیالات خام نے تمہیں دھوکے میں رکھا یہاں تک کہ اللہ کی طرف کا حکم آ گیا اور تمہیں اللہ کے بارے میں غافل رکھنے والے نے بتلائے قریب رکھا تو آج نہ تم سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان سے جو (کھلم کھلا) کافر تھے، تم سب کا ٹھکانا آتش دوزخ ہے وہ تمہارے لیے اولیٰ و انسب ہے اور یہ کیا برا انجام ہے۔“

### منافقوں کی بے بسی اور محتاجی

منافقین کے جواب میں جو مؤمنین کی زبان الفاظ بیان ہوئے، ان میں پہلی لفظ ہے ”فَتَنِمَا انفسکم“ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ”اپنے کو گمراہی میں ڈالا“ چونکہ اصل معنی فتن کے ہیں سونے کو آگ میں ڈالنا، تاکہ کھرے کھوٹے کی آزمائش ہو۔ اب اس میں دو جز ہیں ایک آگ میں ڈالنا دوسرے اس کا مقصد یعنی آزمائش۔ اس بنا پر اس لفظ کا استعمال دو طرح ہونے لگا کبھی آزمائش کے معنی میں جس کی مثالیں قرآن مجید میں دی ہیں۔ جیسے:-

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ (توبہ-۱۲۶)

”اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ہر سال ایک دفعہ یا دو دفعہ پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔“

أَحْسِبَ النَّاسَ أَنْ يُلَاقُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (عنکبوت-۲)

کیا وہ سمجھتے ہیں کہ چھوڑ دئے جائیں گے کہ وہ بس کہتے رہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہیں ہوگی۔ اسی سے فتنہ کی لفظ ہے جس کا اطلاق ذریعہ آزمائش ہونے کی بنا پر اموال اور اولاد پر بھی قرآن میں کیا گیا ہے۔ مگر ابھی میں ڈالنا جیسے سورہ بروج میں ہے۔

إِنَّ الدِّينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابٌ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ (بروج-۱۰)

جنہوں نے مؤمنین اور مومنات کو گمراہ کرنے کی کوشش کی، پھر توبہ نہ کی ان کے لیے دوزخ کی سزا ہے اور آگ میں جلنے کا عذاب ہے۔ یہاں ہمیں یہی معنی زیادہ موزون معلوم ہوتے ہیں۔

آخر میں آتش دوزخ کے لیے جو ہے: ہی مولم یعنی اولیٰ کے نہ صرف ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں ہیں [۱] اہل سنت کے یہاں بھی موجود ہیں [۲] اس نظیر کو یاد رکھنا چاہیے کہ روز غدیر رسول خدا کے ارشاد ہیں:

[۱]۔ مولا کہ قال ہی اولیٰ بکم (علی ابن ابراہیم)

[۲]۔ النار اولیٰ بکم (ابن جریر)

من کنت مولاه فهذا اعلى مولاه و ہاں یہ حضرات منکر ہو جاتے ہیں کہ ”مولیٰ“ کے معنی عربی میں ”اولیٰ“ نہیں ہیں مگر اس قرآنی نظیر کے بعد اس کا انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ قبل میں رسول خدا ﷺ کا سوال جو اس اعلان کے پہلے تھا یہی تھا کہ الست اولی بکم من انفسکم جب مجمع نے کہا ملی ”کیوں نہ ہو“ تب آپ نے وہ الفاظ کہے جن کے یہ معنی اس سوال کے بالکل مطابق ہیں!

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۖ  
وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ

قُلُوبُهُمْ ۗ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿١٣﴾

”کیا ابھی وقت نہیں آیا ان کے لیے جنہوں نے ایمان قبول کیا کہ ان کے دل متاثر ہوں اللہ کی یاد اور اس حق سے جو نازل ہوا اور وہ نہ ہوں ان کی طرح جنہیں ان کے پہلے کتاب ملی تھی تو مدت طولانی ہونے پر ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں زیادہ تر فاسق ہیں“۔

مسلمانوں کو انتباہ کہ وہ امتداد زمانہ سے گھبر کر بد دل نہ ہو جائیں

آیت کے شروع کے الفاظ سے نمایاں ہے کہ یہ کافروں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کا ہے جو اپنے کو مؤمنین مخلصین سمجھتے ہیں اور انہیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ کہیں ان میں سے اکثر صفت عدالت سے محروم ہو کر ”فاسقین“ میں داخل نہ ہو جائیں اور ”کیا ابھی وقت نہیں آیا“ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ جماعت اب تک اس منزل پر نہیں جو اس ”فسق“ سے اس کو بچا سکے۔ اس کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ بلا استثنا اس جماعت کو عادل سمجھنا صریح طور پر قرآن کے خلاف ہے یا نہیں؟

”خشوع“ دل و دماغ پر عظمت الہی کے اثر قائم ہونا ہے اور یہ اثر ایسا دیر پا ہونا چاہئے کہ امتداد زمانہ اس نقش کو نہ مٹا سکے۔ اب اسی میں یہ داخل ہے کہ خدا اور رسول کے کسی وعدے کے پورے ہونے میں مدت کا طولانی ہو جانا انہیں اصل حقیقت کے انکار پر آمادہ نہ کر دے جیسا کہ امام آخر کے ظہور کے انتظار کی مدت کا طولانی ہونا جس پر بہت سے گھبرا کر ان کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے بعض احادیث میں اس آیت کے مضمون سے اس انتباہ کی طرف رہ نمائی کی گئی ہے۔

إِعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ  
تَعْقِلُونَ ﴿١٤﴾

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے بے جان ہونے کے بعد ہم نے تمہارے لیے یہ نشانیاں واضح طور پر پیش کر دی ہیں، شاید تم عقل سے کام لو“۔  
متعدد جگہ اس مشاہدے سے دوبارہ کی زندگی پر استدلال کیا گیا ہے اس لئے نفس آیت کے مضمون سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اس پر متوجہ کرنا اثبات معاد کی خاطر ہے۔

مگر گزشتہ آیت کے ربط سے اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جیسے وہ زمین مردہ کو زندہ کرتا ہے ایسے ہی گمراہ کو ہدایت دیتا ہے اور کافر کو توفیق ایمان عطا کرتا ہے<sup>[۱]</sup> یا یہ کہ اسی طرح اللہ دلوں کو الطاف و توفیقات سے نرم کرتا ہے<sup>[۲]</sup> نتیجہ ان دونوں باتوں کا ایک ہی ہے۔

**إِنَّ الْمُصَدِّقِينَ وَالْمُصَدِّقَاتِ وَأَقْرَبُوا اللَّهَ قَرَضًا حَسَنًا يُضْعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ۝۱۸**

”یقیناً امور خیر میں صرف کرنے والے مرد اور امور خیر میں صرف کرنے والی عورتیں در آنحالانکہ انہوں نے اللہ کو قرضہ حسنہ دیا، ان کے لیے اس میں اضافہ کر دیا جائے گا اور ان کے لیے معزز معاوضہ ہوگا۔“  
یعنی وہاں کا اجر مزدور کی اجرت کی طرح کا نہیں جس میں اعزاز کی شان نہیں ہوتی بلکہ اعمال خیر کا معاوضہ عزت و اکرام کے ساتھ ہوتا ہے جیسے امتحان میں پاس ہونے والے کا انعام۔

**وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ط وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝۱۹**

”اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے پیغمبروں پر، یہی لوگ صدیق اور شہید ہیں اپنے پروردگار کے یہاں، ان کے لیے ان کا صلہ اور ان کا نور ہے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یہ لوگ دوزخ والے ہیں۔“  
ظاہر میں تو ”صدیقون اور شہداء دونوں معطوف علیہ اور معطوف ہیں جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر طبری نے صدر اول کے کئی قول نقل کیے ہیں کہ پہلا جملہ **أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ** پر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد شہداء سے دوسرا جملہ ہے مگر جب کہ اجرا اور نور کا ہونا ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اسی سورے میں آچکا ہے وہی اصحاب یمن اس میں شریک ہیں تو اس تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

**إِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُمْ زِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ط كَمَثَلِ غَيْثٍ آتَجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهْبِجُ فَتَرَاهُ مُمْصِرًا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ط وَفِي الْأَخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَمَتَاعٌ الْغُرُورِ ۝۲۰**

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دنیوی زندگی بس کھیل، تفریح میں محویت، بناؤ سنگار، آپس میں ایک دوسرے پر فخر،

[۱] - كذالك يحيى الكافر بالهدى الى الايمان بعد موته بالضللال (تبيان)

[۲] - قيل معنا عملوا ان الله بين القلوب بعد قسرتها بالطاف وتوفيقات (مجمع البيان)

ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مال اور اولاد میں زیادتی کی کوشش ہے (عارضی) جیسے وہ بارش جس کی پیداوار کے نباتات نے کافروں کو حیرت میں ڈال دیا، پھر وہ خشک ہونے لگے اور تم دیکھو اس حال میں وہ زرد ہوگئی، پھر وہ سوکھ کر چورا ہو جائیں اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور (کچھ کے لیے) بخشش ہے اللہ کی طرف سے اور ثواب ہے اور دنیوی زندگی نہیں ہے مگر سرمایہ فریب۔“

### دنیوی زندگی کی بے حقیقتی اور بے اعتباری کی مثال

قرآن مجید میں کھیل اور تماشا ہونے کی نفی بھی کی ہے، وہ نفی باعتبار تخلیق ہے، وہ بے مقصد نہیں تھی لیکن جہاں اس دنیا کو لہو لعل کہا گیا ہے، وہ کہیں باعتبار ناپائیدار اور بے اختیار ہونے کے ہے اور یہاں مقصد حیات کو فراموش کر کے عام انسانوں کی سرگرمیوں کے اعتبار سے ہے۔

دنیا کی جہاں جہاں مذمت بھی ہے، وہ دنیا داروں کی دنیا ہے، نہ کہ دینداروں کی دنیا جو آخرت کی مختتم کامیابی کی تمہید ہے، وہ دنیا درحقیقت جزو دین ہے جس کا نتیجہ وہ ہوتا ہے جو آیت میں بعد کو مغفرت من اللہ ورضوان اللہ کی طرف کی بخشش اور خشنودی“ کی لفظوں سے بیان ہوا ہے، اس نتیجہ کا سامان بھی اس دنیا کے اسی ساز و سامان سے ہوتا ہے جو دنیا داروں کے لیے نتیجہ عذاب شدید ہوتا ہے۔

سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۝

أَعَدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۗ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ

ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

”آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے پروردگار کی بخشش اس بہشت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کے برابر ہے، وہ تیار رکھا گیا ہے اس کے لیے جو اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائیں، یہ اللہ کا فضل کرم ہے جسے چاہتا ہے وہ اس پر مبذول فرماتا ہے، اور اللہ بہت فضل و کرم والا ہے۔“

اس آیت کا مضمون پہلے آچکا ہے اور وہاں اس پہلو پر روشنی دالی جا چکی ہے کہ اللہ کی مغفرت اور جنت براہ راست ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ اس کی طرف سبقت کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر وہ کردار اختیار کرو اللہ کی طرف کی بخشش اور اس بہشت کے مستحق بنو جس کا وصف یہ ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَنْ

نُنزِّلَهَا ۗ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا

آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ

## بِالْبُخْلِ ط وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٣٣﴾

”کوئی مصیبت نہیں آتی زمین اور نہ خود تمہارے نفس میں مگر یہ کہ وہ ایک نوشتے میں ہے قبل اس کے کہ ہم اس کی تخلیق کریں، یقیناً یہ اللہ کے لیے آسان ہے، یہ اس لیے ہے کہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور خوش نہ ہو اس پر جو تمہاری طرف آئے اور اللہ ہر اترانے والے، فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا جو کجی سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو کجی پر آمادہ کرتے ہیں، اور جو گردانی کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے تعریف کا حقدار۔“

## حال کی ہر بات پہلے سے لوح قضا و قدر میں محفوظ ہوتی ہے

دنیا میں مصیبتیں جو آتی ہیں جیسے زلزلے، قحط سالیاں، مختلف قسم کے وبائی امراض اور اس دور کی شاید خاص وبا ہے ملک کے سیاسی یا فرقہ وارانہ فسادات، خود تمہارے نفس میں جیسے بیماریاں یا عزیزوں اور دوستوں کے داغ، وہ بس ایک نوشتے میں ہیں جسے مذہبی زبان میں لوح محفوظ کہتے ہیں، قبل اس کے کہ ہم اس کی تخلیق کریں، کس کی تخلیق؟ جملے کی ساخت کے لحاظ سے قریب یہی ہے کہ ضمیر ”مصیبت“ کی طرف راجع ہو چنانچہ بعض نے ایسا ہی سمجھا ہے۔<sup>[۱]</sup> اور بعض نے اسے نفس کی طرف راجع کیا ہے<sup>[۲]</sup> مگر اس صورت میں پہلے جڑ سے یعنی دنیا میں جو مصیبتیں آتی ہیں اس کا نفل نہ رہے گا۔ اس کا مقصد یہ ہے، یعنی نوشتے میں پہلے سے درج ہونے کا مقصد؟ بعض نے ایسا ہی خیال کیا ہے۔<sup>[۳]</sup>

مگر ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے اس لیے کہ نوشتے میں درج ہونا تو اللہ کے احاطہ علمی کا ایک نتیجہ ہے وہ اس مقصد سے تھوڑی ہی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ تمہیں بتایا جا رہا ہے اس مقصد سے کہ اس دنیا کے عیش و آرام اور تکلیف کو کوئی اہمیت نہ دو، تقدیر الہی پر شاکر ہو، جو چیز ہاتھ سے جائے تو افسوس نہ کرو، یہ سمجھتے ہوئے کہ منظور خدا ایسا ہی تھا اور جو ملے اس پر اترادو نہیں کہ میں ایسا ہوں جسے اللہ نے اس طرح نوازا۔ یہ ”میں“ کا احساس شکر حق نہیں ہوگا بلکہ ایک قسم کا غرور ہوگا جو اللہ کو ناپسند ہے۔ حدیث میں ہے کہ: امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

الزهد كله في آية من كتاب الله لكي لا تأسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم... (مجمع البيان) زاہد ہونے کا پورا معیار کتاب الہی کی ایک آیت میں ہے کہ جو کچھ چلا جائے اس پر افسوس نہ کرو اور جو مل جائے اس پر خوش نہ ہو۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ

النَّاسَ بِالْقِسْطِ ۗ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ

اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۗ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٢٥﴾

[۱]۔ بیافرانیبیم آن مصیبت (شاہ ولی اللہ)

[۲]۔ من قبل ان یداء الانفس (ابن جریر)

[۳]۔ بین تعالیٰ لم فعل ذالک (تبیان)

”ہم نے اپنے پیغمبر کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور اتارا ان کے ساتھ قانون حیات اور توازن و اعتدال کا معیار تاکہ لوگ عدالت اور انصاف کو قائم رکھیں اور اتارا ہم نے لوہا جس میں طاقت جنگ کا مضبوط ذریعہ ہے اور بہت سے فائدے بھی ہیں اور اس لیے کہ اللہ جانے کہ اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب پر ایمان کی بنیاد پر کون لوگ مدد کرتے ہیں، یقیناً اللہ طاقتور ہے، غالب آنے والا۔“

### تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کتاب اور میزان کا اترا

بینات جس کا ترجمہ ہم نے کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ کیا ہے، اصطلاح قرآنی میں جیسا کہ ہم نے ”مقدمہ تفسیر“ شواہد کے ساتھ لکھا ہے ”معجزات“ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جو رسولوں کی حقانیت کی دلیل ہوتے تھے، اب اس کے ساتھ جو کہا گیا ہے کہ ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری تو یہ تحریری کتاب نہیں ہو سکتی کیوں کہ ایسی کتاب تو گنتی کے چند پیغمبروں کو ملی ہے اور یہاں عام طور پر رسولوں کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ ہم نے کتاب اتاری تو ہمارے نزدیک یہ کتاب کی لفظ ”کتاب“ کے اس مفہوم کی حامل ہے جو خالق کی طرف سے مقرر شدہ قانون کے لیے صرف ہوتی ہے جیسے کہ کہا گیا ہے کہ، کتب علیکم الصیام، ان الصلوة کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً۔ کتب علیکم فی القتلی۔ کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرن الوصیتہ..... اس لیے اس کا ترجمہ ہم نے قانون حیات کے ساتھ کیا۔

پھر اس کے ساتھ جو کہا گیا ہے ”میزان“ اتاری تو میزان کے لفظی معنی ترازو کے ہوتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ کوئی مادی ترازو آسمان سے نہیں اتری تو ”ترازو“ کیا ہوتی ہے؟ وزن یعنی تولنے کا ذریعہ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خریدار کو اس کے حق سے کم یا زیادہ نہ ملے، اس لیے یہاں میزان سے مقصود توازن قائم رکھنے کا سامان ہے جس سے کسی پر ظلم نہ ہو اور کسی کا حق نہ مارا جائے پھر ہر ایک کے ساتھ اس کی سیرت کا نمونہ بھی جو توازن کی مجسم مثال ہوتا تھا جس کی بنا پر وہ ہستیاں خود بھی ”میزان“ کی حیثیت رکھتی تھیں۔

پھر کہا گیا ہے کہ ہم نے لوہا نازل کیا، اس کا مفہوم قرار تو یہ دیا جا سکتا ہے کہ ہم نے لوہا خلق کیا لیکن جناب ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ عالم بالا سے تھوڑا اور پھاڑا وغیرہ بھی اترے تھے یہ زراعت وغیرہ کے سامان ہیں منافع للناس کے الفاظ کے تحت میں ہیں کہ پہلے بائس شدید یعنی جنگ کے سامان کی لفظ آئی ہے جس کا نمایاں ذریعہ قبل کے دور میں تلوار تھی اور اسی کا نام جناب آدمؑ کے ساتھ اترنے والے سامان میں نہیں ہے، اب اگر کوئی روایت سنائی دے کہ اس کے آخری رسولؐ پر کوئی تلوار آسمان سے اتری تو اسے مخالف قرآن نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ اس کی تصدیق کرنے والی ہوگی۔

آخری جملہ اس لیے ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی کی مدد کا محتاج ہے، یہ تو انسانوں کی فرض شناسی کا امتحان ہے کہ وہ اپنی قوت قاہرہ سے دشمنوں کے دفعیہ کے لیے کام نہیں لیتا، ورنہ اس کا ایک اشارہ قدرت تمام دنیا کی مخالف طاقتوں کو نیست نابود کرنے کے لیے کافی ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ



### مُهْتَدٍ ۚ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿٢٦﴾

”اور بے شک ہم ہی نے نوح اور ابراہیم کو پیغمبر بنا کر بھیجا، اور انہی کی اولاد میں نبوت اور کتاب مقرر کی تو ان میں کے بعض ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں کے بہترے بدکار ہیں۔“  
(آیت کا ترجمہ منجملہ دیگر آیات کے علامہ السید علی نقوی سے چھوٹ گیا تھا اس لیے حافظ سید فرمان علی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کے ترجمہ کلام سے نقل کیا گیا)۔۔۔۔ ناشر

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ  
الْإِنجِيلَ ۖ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ۗ وَرَهْبَانِيَّةً  
ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَا عَلَيْهَا إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ  
رِعَايَتِهَا ۗ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۗ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿٢٤﴾

”پھر ان کے پیچھے ان کے نقش قدم پر بھیجا ہم نے پیغمبروں کو اور عقب میں بھیجا حضرت عیسیٰ فرزند مریم کو اور انہیں ہم نے انجیل عطا کی اور جو ان کے پیرو ہیں، ان کے دلوں میں ہم نے ملنساری اور مہربانی رکھی اور رہبانیت جس کی انہوں نے طبع زاد طور پر ایجاد کی ہم نے اس کا قانون اور ان پر جاری نہیں کیا تھا مگر اللہ کی خوش نودی کی طلب رہنا چاہیے تھی تو انہوں نے اس کا پورا خیال نہیں رکھا تو عطا کیا ہم نے انہیں جو ایمان لائے ان میں سے ان کا صلہ اور ان میں کے زیادہ بد اعمال ہیں۔“

### عیسائیوں کی نیک دلی مگر ان کی ایجاد کردہ رہبانیت کی مذمت

رہبانیت کی اس شکل میں جو عیسائیوں کے یہاں ہے، اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے اگر یہ فقرہ نہ ہوتا کہ جسے انہوں نے ایجاد کیا تھا تو پتا چلتا کہ ملنساری اور مہربانی کی طرح یہ قانون بھی بالکل اللہ کی طرف سے نافذ کیا ہوا تھا مگر اس فقرے کے بعد غلط فہمی پیدا نہیں ہو سکتی، اب مطلب ہوا کہ نرمی اور مہربانی کی جو اچھی صفتیں ہیں یہ اللہ نے ان میں رکھی ہیں جیسا کہ چھٹے پارے کے آخر میں، بمقابلہ یہود مشرکین ان کی تعریف آچکی ہے لیکن رہبانیت انکی ایجاد کردہ ہے اللہ کا حکم یہ تھا کہ اللہ کی مرضی کے پیرو ہیں یعنی لذائذ اور منافع دنیا سے اس حد تک بہرہ اندوز ہوں اور دنیا کی چہل پہل اور اجتماعی زندگی میں بھی حصہ لیں مگر ہر شعبہ زندگی میں منہیات سے پرہیز کرتے رہیں لیکن حدود کا تحفظ نہیں کر سکتے اور اس طرح افراط تفریط سے کام لے رہبانیت کو اپنالیا، اب ان میں سے جنہوں نے ایمان اختیار کیا یعنی نظام اسلامی کو قبول کر کے رہبانیت کو غلط سمجھ لیا ہے، ان کو ان کے اعمال خیر کی جزا ملے گی مگر وہ کم ہیں، اکثریت ان کی غلط راستے پر ہے۔ دوسرے مفسرین یہ مطلب لیتے ہیں کہ رہبانیت کو ہم نے تو ان پر عائد نہیں کیا تھا مگر انہوں نے رضائے الہی کی خاطر سے اسے اختیار کیا تو ہم اس سے خوش ہیں اور ان میں جو حضرت عیسیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں اس رہبانیت کا بھی اجر ملے گا اس لیے کہ نیت اس کی حصول رضائے الہی تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ  
وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٨﴾

”اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ کہ وہ تمہیں دو حصے اپنی رحمت کے عطا کرے اور تمہارے لیے ایک روشنی قرار دے جس کے ساتھ تم پھر واد تمہیں بخشش سے نوازے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔“

جن لوگوں نے گزشتہ آیت کے آخر میں جو ایمان کا ذکر تھا اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لایا ہے تو یہ خطاب انہی عیسائیوں سے ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پر تم ایمان رکھتے تھے اب اللہ سے ڈرو اور اس ہمارے رسولؐ پر ایمان لاؤ تو تمہیں رحمت کے دو حصے ملیں گے ایک حضرت عیسیٰؑ پر ایمان کی وجہ سے اور ایک پیغمبر آخرؑ پر ایمان کے سبب سے اور تمہارے لیے بہتر ہوگا جس کے ساتھ تم راستا چلو گے یعنی تمہارا کردار دوسروں کے لیے نمونہ ہوگا اور تم دوسروں کی ہدایت کے لیے منارۃ نور ہو گے۔

ہمارے نزدیک اس کا لازم یہ ہے کہ جو ہمارے رسولؐ پر ایمان نہ لائیں، انہیں بھی رحمت الہی کا ایک حصہ ملے جب کہ وہ ایمان اب بھی قدر و قیمت کا حامل ہے حالانکہ مسلمہ اسلامی اور دوسرے محکمات قرآن کی صراحت یہ ہے کہ اصل اس رسولؐ پر ایمان لانا ہے بغیر اسکے دوسرے انبیاء کو ماننا نہ مصداق ایمان ہے اور نہ اعمال کا کوئی اجر ہے، لیکن جب کہ گزشتہ آیت میں ایمان سے مراد نظام اسلامی کو قبول کر کے رہبانیت کو غلط سمجھنا ہے تو یہ خطاب انہی سے ہے جو مسلمان ہو گئے ہیں اور ان سے کہنا کہ ایمان لاؤ ویسا ہے جیسے دوسری جگہ مسلمانوں سے خطاب کر کے کہا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ (نساء-۱۳۶)

اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

یعنی تم اقرار اسلام کر کے مؤمنین کی صف میں داخل ہوئے ہو تو اب سچے دل سے ایمان لے آؤ، بس وہی مطلب یہاں بھی ہوگا کہ مسلمان ہو گئے ہو تو اللہ سے ڈرو بھی یعنی تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسولؐ پر سچے دل سے ایمان لے آؤ..... اب کفیلین من رحمۃ دو حصے اس کی رحمت کے، یہ دنیا اور آخرت دونوں میں اجر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے:

وَأْتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا ۗ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ (عنکبوت-۲۴)

”ہم نے انہیں ان کا اجر دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں میں ہیں۔“

دوسری جگہ:

فَأَتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحَسَنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ (آل عمران-۱۳۸)

”انہیں اللہ نے دنیا کا ثواب عطا کیا اور آخرت کے ثواب کی بھلائی۔“

فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. (نساء-۱۳۳)

اللہ کے پاس ہے دنیا اور آخرت کا ثواب۔

لَعَلَّآ يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ وَأَنَّ الْفَضْلَ

بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

”تا کہ اہل کتاب یہ نہ جانیں کہ یہ لوگ (مسلمان) اللہ کے فضل و احسان کے حصول پر کچھ قدر نہیں رکھتے اور اس لیے کہ فضل و کرم اللہ کے ہاتھوں ہیں، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔“  
اس آیت میں عموماً مفسرین و مترجمین پہلے لاکوز اندمان کر ترجمہ و تفسیر کی منزل سے گزر رہے ہیں۔<sup>[۱]</sup> اب مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب میں سے جو مسلمان نہیں ہوئے انہیں معلوم ہو کہ وہ اللہ کے فضل و احسان پر کچھ قدرت نہیں رکھتے۔

حالاں کہ قبل میں جب کہ یہ بتایا گیا جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں اور اس رسول کو مان لیں تو انہیں دہرا حصہ رحمت الہی کا ملے گا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں بھی رحمت الہی پر قدرت حاصل ہے اس طرح کہ وہ اسلام اختیار کر لیں تو پھر بھی لاکوز اندمان کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب یہ ہوا کہ اہل کتاب یہ نہ جانیں کہ انہیں اللہ کے فضل پر کچھ قدرت حاصل نہیں ہے..... بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو کر اللہ کے فضل و کرم کے پورے پورے مستحق ہو سکتے ہیں۔

بہر حال ہم چونکہ قرآن مجید میں حروف زائدہ وجود کے جس مخالفین اسلام معترض ہیں منکر ہیں جیسا کہ مقدمہ تفسیر میں اس سلسلہ میں علامہ بلاغی کے افادات درج ہو چکے ہیں تو یہاں بھی ہم اسی مطلب کو درست سمجھتے ہیں جس میں لاکوز اندمان کی ضرورت نہیں ہے۔

اب ایک اختلاف دوسرا ہم میں اور دوسرے مفسرین میں یہ ہے کہ وہ لاکوز اندمان کران الفضل بید اللہ، فضل و کرم اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کا عطف الّا یقدرون پر لیتے ہیں اس طرح وہ یعلم کے تحت میں ہوگا کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ اللہ کے فضل و کرم پر کچھ قدرت نہیں رکھتے اور یہ معلوم ہو کہ فضل و کرم اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہم اس کا عطف پہلے لَعَلَّآ پر لیتے ہیں تا کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو اور اس لیے کہ فضل و کرم اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

[۱] یفعل بکم هذا کی یعلم اهل الكتاب (ابن جریر) ای عملکم بذالك لیعلم (جلالین) تابدا ننداھل کتاب (شاه ولی اللہ)  
(جانیناھل کتاب یہ (شاه رفیع الدین)

# سُورَةُ الْمَجَادَلَةِ

مدنیہ..... ۲۲..... آیات

مجادلہ کے معنی شدت کے ساتھ بحث اور تکرار کرنے کے ہیں، چونکہ پہلی آیت میں ایک خاتون کا ذکر ہے جسے اس کے شوہر نے اپنی ماں کے مثل کہہ دیا تھا اور اس لیے اس سے قطع تعلق کرنا اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا اور پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس فریاد لے کر آتی تھی اور اس سلسلے میں اپنی مجبور یوں کو پیش کرتے ہوئے بحث کر رہی تھی کہ میری مشکل کا کوئی حل ہونا چاہیے اور اس بحث کو خداوند عالم نے میجادلک کی لفظ سے بیان کیا ہے کہ وہ آپ سے مجادلہ کر رہی تھی۔

سورہ مجادلہ کے خاص خاص مضامین:

اس ذیل میں ظہار کے حکم شرعی کا بیان اور اس کے کفارے کا ذکر ہے اس علاوہ اس سورے میں حسب ذیل مضامین ہیں:-

- ۱..... خدا و رسول کی مخالفت کا انجام۔
- ۲..... خفیہ مشوروں کے وقت اللہ کا حاضر و ناظر ہونا۔
- ۳..... خفیہ سرگوشیوں کی مذمت۔
- ۴..... نیک باتوں میں باہمی مشوروں کی اجازت۔
- ۵..... آداب مجلس کی تعلیم۔
- ۶..... اہل علم کی تعظیم تکریم کا حکم۔
- ۷..... آیہ محجوبی، جس پر عمل صرف حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے کیا۔
- ۸..... اس وقت کے مسلمانوں کو تنبیہ تازیانے لگانے کے ساتھ اس حکم کی منسوخی۔
- ۹..... منافقین کی مذمت۔
- ۱۰..... خدا و رسول کی مخالفت کرنے والے باپ بیٹے، عزیز و اقارب بھی ہوں تو ان کی محبت کا تقاضا ایمان کے خلاف ہونا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ

## تَحَاوَرَكُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝۱

”سنی ہے اللہ نے بحث اس کی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارے میں شدت کے ساتھ بحث کر رہی ہے اور اللہ سے شکوہ کر رہی ہے۔ اور اللہ آپ دونوں کی باہمی گفتگو سن رہا ہے، یقیناً اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔“

### ظہار کے حکم شرعی کا بیان اور اس کے کفارے کا ذکر

احکام شرعیہ تدریجی طور پر نازل ہوئے ہیں اسلام میں واضح شریعت و قانون خداوند عالم ہے۔ پیغمبر خدا ﷺ بھی مبلغ شریعت ہیں، واضح نہیں ہیں۔ جب تک کہ کوئی قانون اسلامی شریعت میں خالق کی طرف سے نافذ نہ کیا جائے اس وقت تک عمل یا تو ان احکام پر ہوگا جو سابق انبیاء سے چلے آ رہے ہیں، اس سے پیغمبر خدا ﷺ تعرض نہیں فرمائیں گے، چنانچہ اب تک یہ قانون تھا کہ کوئی مرد بیوی کو کہدے کہ انت علی کظہراہی یعنی تم مجھ پر مثل میری ماں کی پشت کی ہو چونکہ پشت کو عربی میں ظہر کہتے ہیں۔ اس لیے مرد کے اس عمل کو ظہار کہا جاتا ہے تو پھر یہ عورت اس شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی، چونکہ خود یہ کوئی روزمرہ کی ضرورت کی بات نہیں تھی، اس لیے کوئی دوسرا حکم الہی بذریعہ وحی رسول کے پاس آیا نہیں تھا اور نہ بعثت کے بعد سے اب تک اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا تا کہ لوگ رسول کے پاس آ کر اس کے بارے میں دریافت کریں۔

اور مدینہ میں یہ صورت پیش آئی کہ جماعت انصار میں سے ایک صحابی اوس بن صامت نے جن کے متعلق ایک روایت میں تصریح یہ ہے کہ وہ جلیل القدر صحابی عبادہ بن صامت کے بھائی تھے اپنی بیوی سے کسی طرح یہ جملہ کہہ دیا کہ انت علی کظہراہی اور اب اس کے بعد خود بھی پریشان تھے کیوں کہ اس کا قانونی نتیجہ معلوم تھا، اس لیے ”خود کردہ راعلا بے نیست“ کے مقولے کے پیش نظر یہ ہمت نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر اس اپنی غلطی کا اظہار کریں اور اس کا حل دریافت کریں بیوی نے کہا کہ میں رسول کے پاس جاتی ہوں اور اس مشکل کو حل کرانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اب اس خاتون کے نام میں ذرا سا اختلاف ہے کہ خولہ ہے یا خویلہ ہے اور باپ کے نام میں زیادہ نمایاں اختلاف ہے کہ بنت ثعلبہ ہیں یا بنت خویلد یا بنت صامت یا بنت دراج۔ بہر حال اس کی اصل قضیہ میں کوئی اہمیت نہیں۔

وہ رسول کے پاس آئیں اور صورت واقعہ بیان کی کہ میری شادی کو کافی زمانہ ہو گیا ہے۔ اتنی مدت کا میرا ان کے ساتھ ہے میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور اولاد بھی ہمارے یہاں ہو چکی ہے۔ اب انہوں نے یہ حماقت کر دی، بتائیے اب کیا ہوگا؟ حضرت نے جواب دیا ابھی تک جو عام قانون تھا اس کے مطابق اب تو تم ان پر حرام ہو گئیں، میں کیا کروں؟ بعض روایت میں ہے کہ حضرت نے فرمایا ”میرے پاس ابھی اس بارے میں کوئی حکم آیا نہیں ہے۔ رسول کی طرف سے مایوس کن جواب سن کر وہ اللہ سے فریاد کرتی ہے اور پھر پیغمبر سے اپنی وہی پریشانی اور مجبوری کہ اتنے دن کا ساتھ ہے اور بچے ہیں۔ میں کیا کروں؟ ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنے حال زار کے بیان میں گریہ بھی کر رہی تھی۔ پھر حضرت جیسے اپنی بے بسی کا اظہار فرماتے ہیں اور پھر وہ خدا کو پکارتی ہے۔ یہ صورت واقعہ ہے جسے خالق کریم نے سورے کی اس پہلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔ طبری نے اس کے تفصیلات دو قدیم کے راویوں کی زبانی بیان کیے ہیں چونکہ رسول کا اپنی بے بسی کے اظہار کے ساتھ یہ جواب اور اس کی مضطربانہ طور پر خالق سے فریاد کہ اس میں کی کوئی بات ہمارے نزدیک شان رسول کے خلاف نہیں ہے لہذا اب ان روایات کے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

روایت بتاتی ہے کہ تیسری دفعہ حضرت جیسے بالکل خاموش ہو گئے اور حضرت کے چہرے پر ایک خاص قسم کا تغیر محسوس ہوا اور یہ اس کی علامت تھی کہ وحی نازل ہونے والی ہے اور اس وقت یہ آیتیں اتریں ہم نے اس کی بحث اور خدا سے فریاد سب سنی۔ مطلب یہ تھا کہ اب ہم اس کا حل بتاتے ہیں جس سے اس کی پریشانی دور ہو۔ روایت بتاتی ہے کہ آپ کی خاموشی کو دیکھ کر وہ بھی اب جیسے خاموشی سے نتیجہ کی منتظر ہو گئیں کہ یہ آیتیں اتریں، حضرت نے سراٹھایا اور فرمایا اپنے شوہر کو جا کر میرے پاس بھیج دو۔<sup>[۱]</sup>

اب راوی کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ آپ کے اس جواب سے کتنی اس کے نہال امید میں تازگی پیدا ہوئی اور کیسی مضطربانہ ومشتاقانہ تیزی کے ساتھ وہ اپنے گھر گئی اور اپنے شوہر کو بلا کر اپنے ساتھ لائی۔

وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ  
 أَنْ يَتَمَآسَا ۗ ذَلِكُمْ تُوَعَّظُونَ بِهِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝۳۰ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ  
 فَصِيَامَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَآسَا ۗ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ  
 سِتِّينَ مِسْكِينًا ۗ ذَلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ  
 وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۳۱

”وہ جو تم میں سے اپنی عورتوں سے اظہار کرتے ہیں، وہ ان کی ماں تو نہیں ہیں، مائیں تو ان کی بس وہی تھیں جنہوں نے اپنے پیٹ سے انہیں پیدا کیا تھا۔ اور لوگ ایک بری بات زبان سے کہتے ہیں اور جھوٹ اور بلاشبہ اللہ بخشنے والا، بڑا مہربان ہے اور جو لوگ اپنی عورتوں سے اظہار کریں، پھر جو کچھ کہا ہے اس سے (پریشان ہو کر) رجوع کرنا چاہیں تو آپس میں تعلقات ازدواجی قائم کرنے سے پہلے ایک بندہ آزاد کریں، یہ تمہیں سبق دیا جاتا ہے اور اللہ جو کچھ تم کو اس سے واقف ہے۔ اب جس کے پاس نہ ہو تو پے در پے دو مہینے روزے رکھنا ہوں گے قبل اس کے ازدواجی تعلقات کے۔ اب جو اس پر قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ ساٹھ غریبوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ اور اس کے پیغمبر پر تمہارا ایمان پایہ ثبوت تک پہنچے اور یہ اللہ کی طرف کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

ان آیات سے ظہار کے متعلق حسب ذیل باتیں سمجھ میں آتی ہیں:-

(۱) جس طرح معنیٰ بنانے یعنی بیٹا کہہ دینے سے کوئی واقعی بیٹا نہیں ہو جاتا، ویسے ہی ماں کہہ دینے سے واقعی وہ عورت ماں نہیں بن جاتی، نسبی جو رشتے ہیں، وہ قدرتی اسباب سے وابستہ ہیں اور وہ تمہارے کہنے یا سمجھ لینے سے وابستہ نہیں ہیں۔

شریعت اسلام میں بس رضاعت ایک ایسی چیز ہے جو بعض احکام میں نسبی رشتوں کے ساتھ مشترک ہو جاتی ہے۔ باقی کہہ دینے یا سمجھ

[۱] ادعی لی زوجک (ابن جریر)

لینے سے کوئی رشتہ قائم نہیں ہوتا۔

(۲) یہ کام یعنی بیوی کو ماں کہنا ظہار کا جو مطلب ہے اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ اور بہت برا عمل ہے۔ اس لیے اس کو منکر اور زور کہہ دیا یعنی خلاف واقعہ ہونے کے علاوہ بہت بڑی برائی اس میں یہ ہے کہ ایک طرح یہ ماں کی توہین ہے، چونکہ ماں کا احترام پیش خدا بہت اہمیت رکھتا ہے لہذا غلطی پر ماں کی لفظ کا صرف بھی اسے ناپسند ہے۔

(۳) اب اس کے بعد کیا ہو؟ کیا بس اس قول کو لغو، مہمل اور بے اعتبار سمجھ لیا جائے اور کچھ نہیں اب یہ شوہر ہے اور وہ اس کی زوجہ؟ ..... جی نہیں، یہ جو ماں کی بے حرمتی کی اور رشتہ ازدواج کی ناقدری بھی ..... اس کی کچھ تو سزا ہونی چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ اب ابھی تو وہ اس کے لیے حرام ہے لیکن شرعی رمانہ جسے کفار کہتے ہیں، ادا کر دے تو وہ اس کے لیے حلال ہو جائے گی۔ اب وہ کفارہ کیا ہے؟۔

(۴) اس کے بیان سے پہلے یہ جملہ کہ ثم یتعدون لما قالوا جس کا ترجمہ ہم نے یہ کیا ہے کہ جو کچھ کہا ہے اس سے (پریشان ہو کر) وہ رجوع کرنا چاہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ظہار کے بعد انہیں یکسوئی کے ساتھ صبر و سکون کے لمحات میں یہ غور کر لینا ہے وہ اس کے تقاضا پر قائم رہنا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ تعلقات کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر رجوع کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ترکیب یہ ہے۔

(۵) کفارہ ادا کریں، وہ ترتیبی طور پر تین چیزیں ہیں، پہلے یہ کہ کسی کو جو قید غلامی میں ہے آزاد کرے یہ ظاہر ہے کہ ایسے صاحبان حیثیت کا کام ہے جو خود غلام یا کنیز کے مالک ہوں یا اتنا پیسہ رکھتے ہوں کہ خرید کر آزاد کر سکیں اور اب عرصہ دراز سے غالب معمرہ ارض میں غلامی کے سدباب کی وجہ سے یہ چیز خارج از بحث ہو گئی لہذا کہا گیا کہ جس کے پاس یہ امکان نہیں ہے تو پھر دو مہینے کے پے در پے روزے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک مہینے کے روزے تو تمام و کمال ایک ساتھ ہوں، کوئی دن ناغہ نہ ہو اور اُس سے ملا ہو دوسرے مہینے کے روزہ رکھ لے۔ اب دوسرے مہینے کے باقی روزے کچھ تفریق کے ساتھ رکھ سکتا ہے۔ بہر صورت ان تمام روزوں کے رکھنے کے لیے جسمانی صحت و طاقت کی ضرورت ہے لہذا اس کے ساتھ کہا گیا کہ اگر یہ نہ کر سکے تو پھر؟ آخری چیز یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

طبری کی درج کردہ روایت میں ہے کہ جب اوس بن صامت رسولؐ کی خدمت میں آئے تو حضرتؐ نے یہ آیات پڑھ کر سنائے اور دریافت فرمایا کہ کیا تم طلاق دینا چاہتے ہو؟ انہوں نے انکار کیا تو حضرتؐ نے فرمایا تو پھر کفارہ دو اور وہ یہ ہے کہ بندہ راہ خدا میں آزاد کرو۔ انہوں نے کہا یہ میں کہاں کر سکتا ہوں تو حضرتؐ نے فرمایا تو پھر پے در پے دو مہینے کے روزہ رکھو۔ انہوں نے کہا ضعیفی سے میرا عالم یہ ہے کہ دن میں تین وقت کچھ نہ کچھ کھاؤں تو میری بصارت میں فرق محسوس ہوتا ہے۔ فرمایا پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ انہوں نے کہا اس کے لیے جتنا پیسہ درکار ہے وہ بھی میرے پاس نہیں ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا، خیر اس میں تمہاری مدد کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ آپ نے انہیں کچھ غلہ عنایت کیا جس سے انہوں نے کفارہ ادا کیا اور اس طرح اس خاتون کی دادی ہو گئی اور یہ ظہار کا قصہ رفع دفع ہو گیا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُبِتُوا كَمَا كُبِتَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ  
 أَنْزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٥﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا

**فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا ۗ أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝٤**  
 ”یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبر کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ویسے ہی ذلیل و رسوا ہوں گے جیسے وہ لوگ ذلیل و رسوا ہوئے جو ان کے پہلے تھے اور ہم نے کھلی ہوئی نشانیاں اتاری ہیں، اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے جس دن ان سب کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا تو انہیں بتائے گا جو انہوں نے کیا تھا۔ اللہ تو اس پر حاوی ہے اور وہ اسے بھول گئے ہیں اور اللہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے“  
 ”وہ انہیں بتائے گا“، یعنی ان کے کرتوت ان کے سامنے لا کر انہیں سزا دے گا۔

**أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا آدْنَىٰ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ آيْنَ مَا كَانُوا ۗ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝٥**

”کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ جانتا ہے اسے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ کوئی تین آدمی آپس میں خفیہ باتیں نہیں کرتے مگر یہ کہ وہ انکا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہے جہاں بھی وہ ہوں گے، پھر انہیں بتائے گا جو کچھ انہوں نے کیا ہے قیامت کے دن، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

ناداں بچے جیسے کسی بات کو جب تک دہرا دہرا کر ان کے سامنے پیش نہ کی جائے نہیں سمجھتے ویسے ہی خالق کریم کے سامنے تمام افراد انسانی ہیں لہذا اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کی حقیقت کو وہ اس طرح سمجھتا ہے جیسے بچوں کو کوئی بات سمجھائی جاتی ہے مگر افسوس ہے کہ صاحب عقل انسان اس کے بعد بھی نہیں سمجھتا۔ ورنہ یہ حقیقت اگر اس کے پیش نظر رہے تو وہ کوئی کام ایسا کیوں کرے جو اس مالک حقیقی کے قانون کے خلاف ہو۔

**أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَىٰ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَجَّوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْعُرُوقِ ۚ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ ۚ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحْيِكَ بِهِ اللَّهُ ۗ وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ۗ حَسْبُ لَهُمْ جَهَنَّمُ ۗ**  
**يَصَلُّونَهَا ۗ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝٦**

”کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں خفیہ سرگوشی سے ممانعت کی گئی، پھر بھی جس سے انہیں منع کیا تھا، وہ دوبارہ



وہی حرکت کرتے ہیں اور آپس میں خفیہ میٹینگلیں، گناہ اور ظلم و تعدی اور پیغمبر کی نافرمانی کے ساتھ کرتے ہیں اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے آپ کو سلام نہیں کیا اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ جو ہم کہتے ہیں، اس پر اللہ ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں کرتا۔ ان کے لیے دوزخ کافی ہے جس کی تپش انہیں اٹھانا ہوگی تو وہ کتنا برا انجام ہے۔“

یہ کھلے ہوئے کفار و مشرکین نہیں ہو سکتے ورنہ انہیں پیغمبر منع کیوں کریں گے خفیہ سرگوشی سے اور ان سے پیغمبر کی اطاعت کا مطالبہ ہی کیوں ہو، اور ان سے یہ امید ہی کیوں کی جائے گی کہ وہ رسول کو مناسب طور پر ادب و قاعدے کے ساتھ سلام کریں، تو وہی ہو سکتے ہیں جو اسلامی جماعت میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے پیغمبر کے پیغمبر ہونے کا اقرار کر کے آپ کی اطاعت کا جو اپنے کندھوں پر رکھ چکے ہیں۔ مگر خفیہ میٹینگلیں کرتے ہیں، اسلام پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی ضرر رسانی کے لیے اور ان کی ان خفیہ کاروائیوں کی اطلاع رسول کو ہوتی ہے تو آپ انہیں بلا کر متنبہ فرماتے ہیں کہ مجھے تمہاری خفیہ سرگوشیوں کی اطلاع ہے۔ دیکھو ایسا نہ کرو مگر وہ اس کے بعد بھی اپنے رویے میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے اور اس پر طرہ یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر بدتمیزی سے مثلاً حضرت مگانام لے لے کر مخاطب ہوتے ہیں حالانکہ ان کی عظمت کا پاس و لحاظ وہ ہے کہ خداوند عالم نے اس عظمت و جلال ذات کے ساتھ ان سے نام لیکر مخاطب نہیں کیا اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہمارا طرز عمل ہوگا اور چونکہ واقعی تو وہ خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر ایمان رکھتے نہیں، اس لیے دل میں اپنے کہتے ہیں کہ اگر واقعی خدا کوئی چیز ہے تو ہمارا طرز عمل تو ایسا ہے کہ اسے ہم پر عذاب نازل کر دینا چاہیے تو اللہ آخر ہم پر عذاب کیوں نازل نہیں کرتا اور اللہ اپنی ستار العیوبی کو قائم رکھتے ہوئے ان کے نام کے بغیر اپنی علام الغیوبی کے ثبوت میں نہ صرف ان کی خفیہ سرگوشیوں بلکہ ان کے ذہنی تصورات کا بھی پردہ قرآن میں فاش کر دیتا ہے مگر جیسے کہہ دیتا ہے کہ ان کے افعال تو ایسے ہی ہیں کہ مستحق عذاب ہیں مگر حکمت ربانی کا تقاضا اس امت میں یہ ہے کہ ان پر دنیا کا عذاب نازل نہیں ہوگا۔ ان کے معاملے کو آخرت پر اٹھا رکھا جائے گا اور وہاں کا عذاب دوزخ کا ہے، وہ ان کے لیے کافی ہے۔

ہم ان آیات کے الفاظ سے بالکل یہی سمجھتے ہیں جو لکھا گیا مگر مفسرین، جہور ان آیات کو لے جا کر جماعت یہود پر منطبق کرتے ہیں۔ آپ کو سلام کرتے ہیں اس طرح جس طرح اللہ نے سلام نہیں کیا ہے، اس کے لیے یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ السام علیک کے بجائے السام علیک کہتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ پر ہلاکت ہو [۱] مگر اتنی بڑی سنگین گستاخی کو خداوند عالم بس ان الفاظ میں ظاہر کرے کہ اللہ نے آپ کو اس طرح سلام نہیں کیا۔“ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

بس ایک جناب ابن عباسؓ ہیں جنہوں نے اس آیت میں منافقوں کا نام لیا ہے مگر انہوں نے بھی سلام کی وہی کیفیت بتائی ہے کہ وہ السام علیک کہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ام المؤمنین عائشہ نے اسے محسوس کیا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یہ کجبت سلام کے بجائے سام کہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا میں محسوس کرتا ہوں اور اس لیے جواب میں صرف علیکم کہتا ہوں جس سے وہ بددعا انہی کی طرف پلٹ جاتی ہے۔ زہری کی روایت میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ اہل پڑیں اور جو نبی انھوں نے اس طرح سلام کیا، وہ چیخ اٹھیں علیکم السامۃ واللعنۃ، ارے ہلاکت اور پھر لعنت تم ہی کو ہوگی، مگر پیغمبر اکرمؐ نے منع فرمایا اور صبر تحمل کی ہدایت فرمائی۔

[۱] عن مجاہد: قال الیہود کانوا یقولون السام علیک (ابن جریر)

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَاتِنَا جَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ

الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَى ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩﴾

”اے ایمان لانے والو! جب آپس میں خفیہ باتیں کرو تو گناہ اور ظلم و تعدی اور رسولؐ کی نافرمانی کی باتیں نہ کیا کرو اور نیکی اور پرہیزگاری کی باتیں کیا کرو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف دوبارہ زندگی کے بعد تم سب کو یکجا ہی طور پر جانا ہے“

اگر وہ جماعت یہودی کی بات ہوتی تو مسلمانوں کو مخاطب کر کے اس حکم کی کیا ضرورت تھی اور پھر ایک طرح کی تحدید کے ساتھ اور حشرِ شرکی یا دہانی کے ساتھ؟ چونکہ منافقین وہ ہیں جو مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں اس لیے یا یہاں الذین آمنوا کہہ کر ضابطہ قانونی کے ماتحت یہ پوری جماعت مراد ہوتی ہے جس میں منافقین بھی داخل ہیں، اس لیے ان کے انتہا کے لیے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ ہدایت کی گئی ہے جس میں بعد والے جملے سے یہ اصول بتا دیا گیا کہ ہر خفیہ قسم کی گفتگو ممنوع نہیں ہے بلکہ گریک مقاصد سے مصلحتاً خفیہ میننگ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے بلکہ وہ پسندیدہ پروردگار ہوگی۔

إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزَنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ

شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾

”وہ خفیہ گفتگو شیطان کی تحریک سے ہوتی ہے تاکہ انہیں جو مومن ہیں باعث رنج ہو حالانکہ وہ انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی سوا اس کے کہ منظور خدا ہو اور اللہ کا بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو“

جب کہ گزشتہ آیت میں ایک قسم کی خفیہ گفتگو کی ممانعت کی گئی اور اس کے بالمقابل دوسری طرح کی خفیہ گفتگو کا بصیغہ امر حکم دیا گیا جو اس بناء پر کہ ممانعت کے مقابلے میں ہے حکم نہیں، بلکہ اجازت کے مفہوم میں ہوگا تو اب شیطانی تحریک کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے وہ پہلی ہی قسم کی سرگوشی ہوگی جس کی ممانعت کی گئی تھی۔ اس طرح یہ الف لام النجوى میں عہد کا ہوگا جس کی بنا پر ہم نے ترجمہ کیا ”وہ خفیہ گفتگو یعنی سرگوشی جو منافقین کرتے ہیں لہذا اب جو الذین آمنوا ہے، اس سے مراد وہ ہوں گے جو واقعی مومن ہیں اور اس طرح آخر میں جو کہا گیا ہے کہ مؤمنین کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے، اس سے مراد بھی یہی ہے مومن ہیں چنانچہ یہاں مفسر طبری بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ

لَكُمْ ۗ وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَاَنْشُرُوا وَيَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۖ وَالَّذِينَ

أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١١﴾

[۱] - اولی الاقوال فی ذالک بالصواب قول من قال عنی بہ مناجاة المنافقین (ابن جریر)

”اے ایمان لانے والو! جب تم سے کہا جائے کہ جمہوں میں ادھر ادھر ہٹ کر جگہ دو تو جگہ دے دیا کرو، اللہ تمہارے لیے کشائش پیدا کریگا اور جب تم سے کہا جائے کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ اللہ بلندی نمایاں کرے بدرجہا ان کی جو تم میں ایمان رکھتے ہیں اور جنہیں علم کا جو ہر عطا ہوا ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔“

بغیر تفاسیر کے مطالعے کے خود آیت کے الفاظ سے جو سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض وقت رسول خدا ﷺ کے خطبوں میں یا کسی مجلس مشاورت میں لوگ پہلو سے پہلو ملائے ہوئے بیٹھے ہیں اور ایک شخص ایسا آیا جو تقدم ایمان کے اعتبار سے اور علمی بلندی کے لحاظ سے قابل تعظیم و تکریم ہے مگر لوگ اسے جگہ نہیں دیتے کہ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا، اس بد تمیزی پر قرآن نے تنبیہ کی ہے۔ ایک تو قابل احترام شخص کو دیکھ کر لوگوں کو خود ہی اس شعور سے کام لینا چاہیے تھا کہ اس کے احترام میں کھڑے ہو جائیں اور اسے آگے بڑھ کر شایان شان جگہ پر بیٹھنے کا موقع دیں اور پھر اس پر مزید یہ کہ رسول خدا ﷺ مجمع سے فرمائیں کہ دیکھو، وہ آرہے ہیں، اٹھ کھڑے ہو اور انہیں آگے بڑھنے کے لیے جگہ دو مگر مجمع اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہو تو یہ کتنی بد تمیزی کی بات ہوگی، اس لیے آخر کے جملے میں ایک تہدید کی انداز ہے کہ ”اللہ جو تم کرتے ہو، اس سے خوب واقف ہے،“ یہ تو ہم نے وہ لکھا ہے جو خود الفاظ آیت سے سمجھ میں آتا ہے۔ اب تفسیر سامنے رکھتے ہیں اور اس پر نظر ڈالتے ہیں تو پہلے مجالس کی تشریح میں اختلاف ہو گیا کچھ لوگوں نے مجالس کی تشریح میں اختلاف ہو گیا، کچھ لوگوں نے مجالس کے معنی وہی پیغمبر خدا ﷺ کی بزم کے قرار دئے، اور کچھ نے اُسے مجالس جہاد قرار دیا مگر یہ دوسری تشریح ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئی اس لیے کہ جہاد کے میدان ہوتے ہیں یا صفوف لشکر ہوتے ہیں، مجالس نہیں ہوا کرتے۔

پھر اس کے بعد جو ہے کہ جب کہا جائے کھڑے ہو جاؤ، اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ جب کچھ کارہائے ضروری کے لیے اور نماز کے لیے کہا جائے تو اٹھ کھڑے ہو کرو۔ اگر فقط یہی جملہ ہوتا تو بات اپنی جگہ صحیح تھی مگر یہ توفیق میں ہے، یہ جو مفہوم قرار دیا گیا ہے، مجھے اس کا ربط نہ تو قبل کے جملے سے محسوس ہوتا ہے اور نہ بعد کے جملے سے، اور میں تو وہی مفہوم سمجھ رہا ہوں جو خود الفاظ آیت سے سمجھ میں آیا تھا جو پہلے لکھا جا چکا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِ مُوَابِقِينَ يَدَيَّ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ ط  
ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَظْهَرُ ط فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٣﴾ ءَأَشْفَقْتُمْ  
أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ ط فَإِذَا لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ  
فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ط وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا  
تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

”اے ایمان لانے والو! جب پیغمبر کے پاس آ کے بصیغہ راز کچھ بات کرو تو اپنی اس بات چیت سے پہلے کچھ خیرات دے دیا کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور زیادہ پاکیزگی کا ذریعہ تو اگر تمہارا پاس نہ ہو تو بلاشبہ اللہ

بخشنے والا، مہربان ہے۔ (ارے) کیا تم ڈر گئے اس سے کہ اپنی صیغہ راز والی باتوں کے پہلے خیرات دو، اب جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی تو بس نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو، اور اللہ واقف ہے اس سے جو تم کرتے ہو۔“

یہ مشہور و معروف آیہ ”نجوی“ ہے جس کے لیے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مخصوص مناقب میں سے ایک یہ ہے کہ اس آیت پر سوا آپ کے کسی نے عمل نہیں کیا۔

واقعہ یہ تھا کہ اکثر صحابہ رسول حضرت سے اپنے تقرب کے انظار کے لیے بلا وجہ جب موقع ملتا رسول کی خدمت میں آ کر چپکے چپکے باتیں کرتے تھے جس میں اس کا مظاہرہ تھا کہ ہم بڑے حضرت کے راز دار ہیں، یہ باتیں اکثر کسی افادیت کی حامل نہیں ہوتی تھیں، اس سے بلا وجہ رسول کا قیمتی وقت برد ہوتا تھا۔ حضرت بر بنائے اخلاق کریمہ اسے برداشت کرتے تھے اور ان کی دل شکنی نہ فرماتے تھے۔ خداوند عالم نے ذرا ان کی تنبیہ کے لیے اور ان پر اور دوسروں پر بھی نمایاں کرنے کے لیے کہ وہ حقیقتہً کتنے پانی میں ہیں، ذرا سا ان کا امتحان لے لیا کہ جب رسول کے پاس آ کے تمہیں اس طرح مخفی طور پر باتیں کرنا ہوں تو پہلے راہ خدا میں کسی غریب کو کچھ دے دو۔ اس میں کوئی کم زیادہ کی قید نہیں تھی مگر اب سناٹا ہو گیا اور جو لوگ روز آ کر آتے تھے اب ان میں سے کوئی نہیں آیا، حترام حکم الہی کے قائم رکھنے کے لیے صرف حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے، جنہوں نے اس دوران میں کئی مرتبہ صدقہ دیا اور آ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھے، جب خالق کی طرف سے جو امتحان کا مقصد تھا، وہ پورا ہو گیا تو دوسری آیت اتری جس کا مطلب یہ کہ اچھا بس اتنے ہی میں تمہارے خلوص و تقرب کا بھرم کھل گیا تم اتنے سے میں اڑ گئے، اب یہ حکم ہر طرف، اب جو عام فرائض ہیں، بس وہی ادا کرو اور خدا اور رسول کی طرف سے جو عام فرائض ہیں، بس وہی ادا کرو، یقیناً اس کے بعد زرا بھی جنہیں غیرت تھی ان کے آنے میں رسول کی خدمت میں ذرا کمی ہو گئی اور رسول کے پاس آنے والوں کے خلوص کی حقیقت بھی نمایاں ہو گئی۔

محمد ابن جریر طبری نے مجاہد کی زبانی تو بس اتنا لکھا ہے کہ فلم ینباجہ الاعلیٰ ابن ابی طالب قدم دینارا تتصدقہ بہ “تو اس کے بعد آپ سے اس طرح آ کر بات نہیں کی سوا علی ابن ابی طالب کے جنہوں نے ایک دینار لگ کیا اور اسے خیرات میں دیدیا۔

دوسری روایت میں خود علی ابن ابی طالب کا فرمان درج ہیں: ان فی کتاب اللہ عزوجل الایۃ ما عمل بہا احد قبلی ولا یعمل بہا احابعدی۔ کتاب الہی میں ایک آیت ایسی ہے کہ نہ اس پر کسی نے میرے پہلے عمل کیا اور نہ بعد میں اس پر عمل کرنے والا ہوگا۔ تیسری روایت میں بھی وہی پہلا مضمون ہے، چوتھی روایت میں حضرت علی کا بیان ہے کہ میرے پاس ایک دینار تھا میں نے اسے بھنوا لیا تو میرے پاس دس درہم ہو گئے۔ اب میں نے یہ کیا کہ حضرت کے پاس جب بھی آتا تھا، ایک درہم کسی کو دیتا تھا۔ اس کے بعد یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ دوسرے تفاسیر اہل سنت جیسے کشاف اور تفسیر خازن اور تفسیر ابن کثیر، اور درمنثور وغیرہ میں بھی حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی یہ خصوصیت درج ہے۔ اب طبری کی ایک روایت میں تو یہ ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب نے چار مرتبہ صدقہ دیا جس کے بعد وہ حکم منسوخ ہوا۔ زنجشیری نے کشاف میں لکھا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ حکم کتنے وقت تک رہا۔ ایک قول یہ ہے کہ دس دن تک یہ حکم رہا اور ایک یہ ہے کہ پورے ایک دن بھی نہ رہا، صرف چند گھنٹوں تک رہا اس کے بعد دوسری آیت نازل ہو گئی۔

درايۂ ان میں پہلی بات قابل ترجیح ہے، اس لیے کہ اس حکم کا جو مقصد تھا وہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا تھا، جب تک کافی مدت اس کا عمل کرنے کی دعویٰ اور ان خلوص و تقرب کو دی نہ جائے پھر اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت علیؓ کی زبانی آچکی ہے کہ آپ کے پاس ایک دینار سے دس درہم ہوئے۔ اس سے ذہن میں آتا ہے کہ حکم دس دن رہا اور آپ نے روز ایک مرتبہ حضرت سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک درہم دیئے۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ عبد اللہ بن عمر کی روایت ہے کہ علی ابن ابی طالبؓ کے لیے تین فضیلتیں ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک میرے لیے ہوتی تو میرے لیے سرخ بال والی اونٹ سے زیادہ محبوب ہوتی۔ ایک حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کے ساتھ شادی، اور دوسرے خیر میں علم کا عطا ہونا، اور تیسرے آیت نبوی پر عمل میں منفر دہونا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ مَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۗ  
 وَيَجْلِفُونَ عَلَى الْكُذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۗ ﴿١٤﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۗ إِنَّهُمْ  
 سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۗ ﴿١٥﴾ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ  
 عَذَابٌ مُهِينٌ ۗ ﴿١٦﴾ لَنْ تُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۗ  
 أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۗ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۗ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ  
 لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۗ ﴿١٨﴾  
 اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۗ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۗ  
 أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخٰسِرُونَ ۗ ﴿١٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادِّثُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ  
 أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۗ ﴿٢٠﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے اتحاد عمل کیا ہے اس جماعت سے جس پر اللہ کا غضب ہے، نہ وہ ان میں ہیں اور نہ تم میں سے اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں، ان کے لیے اللہ نے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے، بہت برا ہے وہ جو وہ کرتے رہے ہیں، انہوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا لیا تو اللہ کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں تو ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ انہیں ان کے مال اور اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ فائدہ نہ پہنچائیں گے، یہ لوگ دوزخ والے ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جس دن اللہ انہیں دوبارہ اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے یوں ہی قسمیں کھائیں گے جیسے تم لوگوں کے سامنے کھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کسی صحیح پالیسی پر ہیں، آگاہ ہونا چاہیے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان نے غلبہ پایا لیا ہے تو انہیں اللہ کی یاد کو بھلا دیا ہے۔ یہ لوگ شیطان کے پارٹی والے ہیں آگاہ ہو کہ شیطان کی پارٹی گھانا اٹھانے والی ہے، یقیناً جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی

مخالفت کرتے ہیں، یہ لوگ انتہائی ذلیل لوگوں میں سے ہیں“  
قرآن مجید میں یہود کا جیسے مخصوص وصف جو مثل لقب ہو گیا ہے کہ وہ ”مغضوب علیہم“ یعنی مورد غضب پروردگار ہیں، منافقین  
جا کر ان کے ساتھ مشوروں میں شریک ہوتے تھے اور انہیں اپنی ہمدردی اور یک جہتی کا یقین دلاتے تھے اور جب مسلمان ان سے پوچھتے تو وہ  
قسمیں کھا کھا کر انکار کرتے تھے یہ آیتیں انہیں کے اس کردار کی مذمت میں ہیں۔

**كَتَبَ اللَّهُ لَأَعْلَبَنَ آتَاوَرُسُلِي ط إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٣١﴾**

”اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بالضرور میں اور میرے پیغمبر غالب آئیں گے یقیناً اللہ طاقتور ہے، غالب آنے  
والا“۔

لکھ دیا ہے، اس کا قطعی فیصلہ ہے مگر یہ کسی ایک پیغمبر کے ظرف زندگی سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ پورا نظام جو اللہ کا قائم کیا ہوا اور اس  
کے پیغمبروں کا پہنچایا ہوا ہے اس کے آخر میں عالمگیر غلبہ کا ذکر ہے جس کا دوسرے مقامات پر ”لیظہرہ علی الدین کلہ“ کی لفظوں میں اعلان  
ہے۔ وہ مکمل طور پر دنیا کے سامنے نہیں آیا ہے۔ اس کے لیے ایک خاص رہنما کا انتظار ہے جو دنیا کے سامنے آخر عمر دنیا میں آئے گا۔

**لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ  
كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ط أُولَئِكَ كَتَبَ فِي  
قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ ط وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ  
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ط رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ط أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ط  
الْآنَ حِزْبُ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٣٢﴾**

”کسی جماعت کو جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو، نہیں پاؤ گے کہ وہ محبت رکھیں ان سے جو اللہ اور اس  
کے پیغمبروں کے مخالف ہیں، چاہے وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے یا اور بھائی ہوں یا ان کے قبیلے والے ہوں۔ یہ وہ  
ہوں گے کہ جن کے دلوں میں اس نے ایمان کو نقش کر دیا ہے اور ان کی تقویت کی ہے اپنی طرف کی روح سے اور  
انہیں داخل کرے گا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان  
سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں۔ یہ اللہ کی جماعت والے ہوں گے یقیناً اللہ کی جماعت والے غالب  
آنے والے ہیں۔“

منافقین کے مقابلے میں یہ ایمان والوں کی شان ہے۔ ان کے ذکر میں کہا گیا تھا کہ یہ شیطان کی پارٹی والے ہیں۔ اب ان  
کے مقابلے میں اس گروہ کو کہا جا رہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف والے ہیں۔ ان دونوں میں نتیجے کے لحاظ سے غلبہ ایمان والوں کا ہونا ہے۔

# سُورَةُ الْحَشْرِ

مدنیہ ..... ۲۴ ..... آیات

وہ حشر عمومی اولین اور آخرین کا ہے جو قیامت میں ہوگا، یہاں یہود کے ایک قبیلہ کو اجتماعی طور پر سزا دی گئی ہے اور اس کو سورہ کی دوسری آیت میں حشر سے تعبیر کیا گیا اس پر سورہ کا یہ نام ہوا۔

اس ذیل میں ان اموال کے متعلق احکام کا بیان ہوا ہے جنہیں فقہ میں بھی قرآن مجید کی استعمال کردہ لفظ کے لحاظ سے فی کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مہاجرین اور انصار کی توصیف ہے اور اس کے بعد منافقین اور ان کی ترکیبوں کا بیان ہے جو سورہ بقرہ کے شروع والے حصے سے لے کر یہاں تک قرآن مجید کی ایک بڑی مہم معلوم ہوتی ہے۔ اس سب کے بعد قرآن کی قوت تاثیر کا پُر زور الفاظ میں اظہار ہے۔ آخر کی کئی آیتوں میں اوصاف الہی کا مسلسل تذکرہ ہے جس پر یہ سورہ ختم ہوا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۱ هُوَ الَّذِیْ  
اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ مَا ظَنَنْتُمْ  
اَنْ يَّخْرَجُوْا وَظَنُّوْا اَنْهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتَتْهُمْ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ  
لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۚ وَقَذَفَ فِي قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُجْرِبُوْنَ بَیْوَتَهُمْ بِاَیْدِيهِمْ وَاَیْدِی  
الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصٰرِ ۝۲

”تسبیح خواں ہے اللہ کے لیے جو چیز بھی ہے آسمان میں اور جو چیز بھی ہے زمین میں ہے اور وہ غالب آنے والا، صحیح کام کرنے والے ہے۔ وہ وہ ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان کو جنہوں نے کفر اختیار کیا، نکالا ان کے گھروں سے پہلے حشر میں، تم لوگوں کو تو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ نکلیں گے اور ان کا گمان یہ تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے محفوظ رکھیں گے تو اللہ ان کی طرف آیا ایسی راہ سے جس کا انہیں خیال نہیں تھا اور ان کے دلوں میں اس نے رعب ڈال دیا کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کر رہے تھے ایمان والوں کے ہاتھوں سے، تو اے نگاہ والو عبرت حاصل کرو“۔

جماعت یہود کے جواہم قبیلے مدینہ میں آباد تھے، بڑے صاحب اقتدار، صاحب ثروت اور دفاعی اسلحہ سے مسلح تھے اور انہوں نے بڑے بڑے قلعے بنا رکھے تھے، جنہیں وہ ناقابل تسخیر سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک بہت مضبوط قلعہ قبیلہ بنی نصیر کا تھا۔ انہوں نے جب غدار کی اور رسولؐ نے محاصرہ کیا تو جیسے اس آیت میں ہے، اللہ نے ان پر رعب ایسا طاری کیا کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے ان شرائط پر کہ وہ مدینہ سے باہر نکل جائیں گے اور جتنا مال دولت اونٹوں پر بار ہو سکے، وہ سب ساتھ لے جائیں گے، باقی ان کے مکانات اور جو سامان نہ جاسکے، ان سب پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگا۔ چنانچہ اس شرط کے مطابق ان کی جلاوطنی شام کے مل کی طرف ہوئی اور کچھ لوگ خیبر کی طرف چلے گئے۔ حشر کے معنی اکٹھا کرنے کے ہیں۔ اس اجتماعی جلاوطنی کو پہلے ”حشر“ کی لفظ سے تعبیر کرنے سے ذہن اس برے حشر کی طرف مڑتا ہے جو قیامت میں ہوگا اور جہاں اولین اور آخرین سب اکٹھا ہوں گے اور ہر ایک کو پوری سزا اس کے زندگی بھر کے جرائم کی ملے گی۔

اپنے گھروں کو کیوں مسمار کر رہے تھے؟ اس کے لیے ایک خیال یہ ہے کہ چونکہ منقولہ اموال کے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوئی تھی اس لیے گھر و کا دروازہ جو انہیں قیمتی معلوم ہوتا تھا یا کوئی خاص لکڑی کہیں پر قیمتی تھی تو وہ اس کو نکال کر اپنے ساتھ منقولہ اموال میں شامل کرتے تھے دوسرے یہ کہ قلعے کے کچھ حصے کو مسلمان توڑتے تھے وہ اپنے کسی گھر کو گرانے کر اسے درست کرتے تھے، یہ دونوں وجہیں طبری نے لکھی ہیں جن میں پہلی بات زیادہ ترین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے یہاں اندر گھروں کو تباہ کرتے تھے تاکہ مسلمان آسانی کے ساتھ ان میں قیام نہ کر سکیں اور مسلمان باہر کی عمارتوں کو گرا کر قلعہ کے اندر جانے کے لیے راستا بناتے تھے۔

وَلَوْلَا اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ  
عَذَابُ النَّارِ ﴿٤٠﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۗ وَمَنْ يُشَاقِ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ  
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٤١﴾

’اور اگر اللہ جلاوطنی کا فیصلہ ان کے لیے نہ کرتا تو انہیں یہیں اس دنیا میں انہیں سزا دیتا اور ان کے لیے آخرت میں تو عذاب ہے ہی۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے پیغمبر سے مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرے گا تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔‘

ظاہر ہے کہ جلاوطنی کی صورت میں جو سزا ہوتی وہ اور زیادہ سخت ہوتی یعنی مردوں کا قتل ہونا اور عورتوں اور بچوں کا اسیر ہونا جو جنگ میں ہوا کرتا تھا۔<sup>[۱]</sup>

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّبْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمْوهَا قَائِمَةً عَلٰى اَصْوِلِهَا فَاِذِنِ اللّٰهُ وَلِيْخِزْيِ  
الْفٰسِقِيْنَ ﴿٤٢﴾

[۱] لعذبہم فی الدنیا بالقتل والسبی (ابن جریر)



”طرح طرح کے کھجور کے درختوں میں سے جو تم نے قطع کیا یا جنہیں ان کی جڑوں پر چھوڑ دیا وہ اللہ کی اجازت سے ہے اور وہ اس لیے کہ وہ ان بد اعمالوں کی رسوائی نمایاں کرے۔“

پہلے جو ذکر تھا ان کے مکانات کا، اب یہ ان کی باغات کا ذکر ہے جن میں بہت کھجور کے درخت تھے، ان میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو گیا، کچھ لوگ جوش انتقام میں ان کے درختوں کو بھی کاٹنے لگے، اور کچھ لوگوں نے ہوش سے کام لیتے ہوئے کہا کاٹنے سے کیا فائدہ؟ اب یہ مسلمانوں کے قبضے میں آئیں گے تو ان سے وہ فائدہ اٹھائیں گے۔ خداوند عالم نے اس آیت میں دونوں کی بات رکھی کہ جنہوں نے کچھ درخت کاٹ دیے وہ بھی ٹھیک تھا، اس سے ان کے مالکوں کی رسوائی کا ایک مظاہرہ ہوا۔ اور جو انہیں باقی رکھنا چاہتے ہیں، وہ بھی ٹھیک ہے کہ مسلمان ان سے منتفع ہوں گے۔<sup>[1]</sup>

وَمَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ  
وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ ط وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦﴾ مَا آفَاءَ  
اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِللَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ  
وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ﴿٧﴾ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ط وَمَا  
آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ ؕ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ؕ وَاتَّقُوا اللَّهَ ط إِنَّ اللَّهَ  
شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٨﴾

”اور جو (مال) اللہ نے اپنے رسول کی طرف سے (نکال کر) پہنچایا تو تم لوگوں نے اس پر کوئی اونٹ گھوڑے تو دوڑائے نہیں ہیں مگر اللہ کی قدرت ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو قابو دیتا ہے جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے، تو اللہ نے اپنے پیغمبر کو پہنچایا ان بستیوں کے باشندوں سے تو وہ بس اللہ کا ہے اور پیغمبر کا ہے اور صاحبان قرابت اور یتیموں اور مسکینوں اور پردیسی کا ہے تاکہ وہ ایسی دولت نہ ہو جو دست بدست گردش کرتی رہے ان لوگوں میں جو تم میں سے صاحب دولت ہیں اور جو رسول عطا کریں اسے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز آؤ اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ سخت سزا والا ہے۔“

فئی کا معنی پلٹنے کے ہیں یہاں آفَاء کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں راجع کیا یعنی پلٹا یا چونکہ ان اموال کے ذکر میں قرآن مجید نے لفظ آفَاء صرف کی ہے، اس لیے اسلامی فقہ میں ان اموال کا نام ہی اموال فئی ہو گیا۔

اب چونکہ جو پہلے مالک تھے، ان کا یہاں نام نہیں ہے بلکہ پہلے منہم ضمیر کے ساتھ ہے کہ ”ان لوگوں سے“ اور پھر من اہل القرای ”ان بستیوں والوں سے“ تو چونکہ اس سورے کا آغاز بنی نضیر کے ذکر سے ہوا ہے لہذا بعض قدیم مفسرین نے اسے بنی نضیر ہی کے متروکہ اموال

[1] نزل القرآن بتصدیق من نہی عن قطعة وتعلیل من قطعة من الاثم (ابن جریر)

سے متعلق قرار دیا، بعض نے یہود کے دوسرے قبیلے بنی قریظہ کے اموال سے متعلق قرار دیا ہے جن کی سرکوبی کی مہم اس کے بعد انجام پائی تھی۔ بہر حال بنی، نضیر یا بنی قریظہ چونکہ مدینہ کے اندر ہی تھے اور بس مسلمانوں نے پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ جا کر ان کا محاصرہ کر لیا، جہاد کے لیے نہ کوئی سفر ہوا اور نہ کوئی جنگ ہوئی۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور دھر سے ان کے خلاف تادیبی فیصلہ جو ہونا تھا وہ ہوا تو ایسے اموال کا حکم یہ ہے کہ وہ خاص رسول خدا ﷺ کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان میں بطور مال غنیمت مسلمانوں کا حق نہیں ہے۔ رسول خود ان اموال کو جس طرح چاہیں تقسیم فرمائیں اور جتنا جس کو چاہیں دے کسی کو چون چرا کا حق نہیں ہے۔ بغیر تفاسیر پر نظر کے جب ان دونوں آیتوں پر ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ سمجھ آتا ہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ نازل شدہ ہیں اور دوسری آیت میں پہلی کا مکملہ ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلْجَبْرِيِّلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيَّنَّ يَدٰىهِ وَهُدًى وَبُشْرٰى  
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (بقرہ-۵-۹۷)

جو جبرئیل کا دشمن ہو تو انہوں نے تو اسے اللہ کے حکم سے اتارا ہے آپ کے دل پر (تا آخر مضمون آیت)

اس میں جو بات شروع کی گئی تھی وہ جیسے ختم نہیں ہوئی۔ دوسری آیت میں اسے مکمل کیا گیا کہ:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَرُسُلِهِ وَجَبْرِيْلَ وَمِيْكَوْلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ (بقرہ-۵-۹۸)

جو دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور پیغمبروں اور جبرئیل اور میکائیل کا تو یقیناً اللہ دشمن ہے کافروں کا۔

ایسے ہی یہاں کلام شروع ہوا ہے کہ:- وما افال الله على رسوله منهم ”جو اللہ نے مال دلوا یا اپنے پیغمبر کو ان سے“ اس کا تمہ ابھی نہیں آیا کہ وہ مال کیا ہوگا؟ اور تبصرہ ہونے لگا ان مسلمانوں کے مطالبہ پر جو چاہتے ہیں کہ وہ بطور مال غنیمت تقسیم ہو تو کہا جا رہا ہے کہ اس میں تم نے کوئی مختلف سواروں پر سوار ہو کے سفر تو کیا نہیں، نہ جنگ کی ہے جو اس میں تم سب کا حق ہو۔ وہ تو اللہ نے اپنی قدرت سے اپنے رسول کو دلوا یا ہے۔ اب اس بات کو پورا کرنے کے لیے یہ دوسری آیت ہے کہ جو اللہ نے ان بستیوں کے رہنے والوں سے اپنے رسول کو دلوا یا ہے وہ اللہ کا ہے اور اس کا رسول کا ہے اور صاحبان قرابت کا (تا آخر مضمون آیت) یہ وہ ہے جو دونوں آیتوں سے پہلی نظر میں سمجھ میں آتا ہے۔ مگر طبری نے جس طرح تشریح کی ہے، کہ اس میں پہلی آیت الگ کر دی ہے کہ وہ اموال بنی نضیر یا بنی قریظہ کے بارے میں ہے اور دوسری آیت کو الگ کر دیا ہے کہ یہ کچھ دیہات کے مشرکین تھے، ان کے اموال کے بارے میں ہے اور عمر کا قول ہے کہ وہ جزیہ اور دیہات کے باشندوں کے خراج کے بارے میں ہے۔ یزید بن رومان کا قول ہے کہ یہ وہ ہے جن پر سواروں اور پیادوں کے ساتھ فوج کشی ہوئی ہو اور جنگ کر کے ان پر فتح حاصل کی گئی ہو، اور کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ابتدائے اسلام میں مال غنیمت کا حکم تھا، پھر وہ منسوخ ہو گیا، سورہ انفال کی آیت سے کہ:-

وَاعْلَمُوْا اَنْتُمْ عَدُوٌّ لِّمَنْ شِئْتُمْ فَاَنْ يَّلٰهُمُّسَسْءَ وِلِلرَّسُوْلِ وِلِلذِي الْقُرْبٰى (انفال-۳۱)

اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو تم مال غنیمت حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور صاحبان قرابت کا۔

بہر حال ہماری نظر میں اسی کو ترجیح ہے کہ یہ آیتیں ایک ساتھ کی ہیں اور ایک دوسرے کے تمد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ جملہ کہ:- ما اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا محل کے اعتبار سے تو یہ مال ہی سے متعلق ہے کہ رسول جس

کو جتنا دیں، اسے بس وہ لے لے، پھر زیادہ کا طلب گار نہ ہو اور جس کو نہ دیں وہ خاموش رہے، اس پر اعتراض نہ کرے مگر چونکہ عطا فقط عطاء مال نہیں ہے بلکہ احکام بھی اس کے تحت میں داخل ہیں اس لیے علماء اس جملے کو بطور استدلال مطلق اطاعت رسول کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ ما آتا کم میں رسول کے ثبوت احکام میں کہ رسول جس بات کی ہدایت فرمائیں اسے عمل میں لاؤ اور نہاکم میں حضرت کی ممانعتیں ہیں کہ جن کاموں سے روک دیں انہیں عمل میں نہ لاؤ۔ آخر میں بہت سخت تہدید الفاظ ہیں جن سے ظاہر ہے کہ مخالفت رسول کی بہت سخت سزا ہے۔

**لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ**

**فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿٨﴾**

”ان غریبوں کے لیے جو ہجرت کر کے آئیں ہیں، جو اپنے گھر و بار اور مال و دولت سے نکلنے پر مجبور ہوئے طلب گار ہوتے ہوئے اللہ کا فضل و کرم اور خوشنودی کے اور اس کے پیغمبر کی مدد کرتے ہوئے، یہ سچے لوگ ہیں۔“

بغیر حرف عطف یہ لام جو استحقاق یا ملکیت کا اظہار کرتا ہے بظاہر سابق میں ”اللہ وَرَسُولَهُ“ الخ تھا اسی کا بیان ہے کہ ان کے جو قرار دیا گیا ہے، وہ درحقیقت ان مہاجرین کے لیے ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں۔ عام طور پر مفسرین نے اسے اموال بنی نضیر سے متعلق قرار دیا ہے کہ وہ مہاجرین کے لیے رکھے گئے تھے۔

**وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ**

**وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ**

**بِهِمْ خِصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٩﴾**

”اور وہ جو پہلے سے اس دیار میں قیام کیے ہوئے تھے اور ان کے (آنے سے) پہلے ایمان لائے تھے، وہ محبت رکھتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کی طرف آتے ہیں اور وہ اپنی بستیوں کے اندر رشک و حسد محسوس نہیں کرتے اس سے جو انہیں دیا گیا ہے اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں چاہے وہ ضرورت مند ہوں اور جو اپنی نفسانی تنگدستی سے بچا رہے تو یہی لوگ دین و دنیا کے بہترین حاصل کرنے والے ہیں۔“

انصار کی تعریف ہے جنہوں نے مہاجرین کو اس مال کے عطا کرنے پر کوئی ناگواری محسوس نہیں کی تھی بلکہ سمجھے کہ یہ چونکہ یہاں بے سر و سامانی کے ساتھ آئے ہیں، اس لیے ان کی امداد ضروری ہے اور رسول نے جو انہیں ان اموال کے ساتھ مخصوص کیا، وہ بالکل درست ہے۔

**وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ**

**سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ**

**رَحِيمٌ ﴿١٠﴾**

”اور جو ان کے بعد آئے کہتے ہیں کہ پروردگارا! اپنی مغفرت میں شامل حال فرما، ہمارے لیے اور ہمارے ان بھائیوں کے جنہوں نے ایمان میں ہم پر سبقت کی اور ہمارے دل میں کینہ و عداوت نہ آنے دے ان سے جو ایمان لائے ہیں۔ اے ہمارے مالک! یقیناً تو بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔“

چونکہ انصار کو یہ کہا گیا تھا کہ وہ ان مہاجرین کے آنے سے پہلے ایمان لائے تھے اس لیے ایک تصویر یہ ہے کہ ان کے بعد جو آئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان لانے کے بعد جو باہر سے آئے تو یہ وہی مہاجرین کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور ان دونوں آیتوں میں ان کی باہمی خیر سگالی کا ذکر ہے۔ کہ انصار ان سے جلتے نہیں بلکہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اور وہ مہاجرین ان کو یوں دعائیں دیتے ہیں اور ہو سکتا ہے مراد بعد کے اسلام لانے والے ہوں جو اپنے سے تقدم رکھنے والے صاحبان ایمان کی فضیلت کے قائل ہیں اور انہیں یوں دعائیں دیتے ہیں [۱] لیکن اس سے شخصیتوں میں امتیاز اور کسی منصب دینی کی اہلیت اور عدم اہلیت پر بحث کا سدباب نہیں ہوتا، نہ فاسقین یا ظالمین میں سے ثابت ہونے کے بعد جو اس کا تقاضا ہے، اس کی نفی لازم آتی ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ  
لَإِنِ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نَطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا ۖ وَإِنْ قُوتِلْتُمْ  
لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَإِنِ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ ۗ  
وَلَإِنِ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُوهُمْ ۗ وَلَإِنِ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلِّنَنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ  
لَا يَنْصُرُونَ ۝ ۱۳

”کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو منافق ہیں کہ وہ اپنے بھائی نبدوں سے جو منکر اسلام ہیں اہل کتاب میں کہتے ہیں کہ اگر تم جلا وطنی کیے گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ شہر سے نکل جائیں گے اور تمہارے بارے میں کسی دوسرے کا کہنا نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نکلیں گے نہیں اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر مدد کریں بھی تو پیٹھ پھرائیں گے اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔“

شروع سورہ سے جو آیتیں تھیں، ان سے ظاہر تھا کہ وہ ہم سر ہونے کے بعد کی آیتیں ہیں اور ان کے مضمون سے ظاہر ہے کہ وہ بنی نضیر سے متعلق ہیں۔ حالانکہ بعض نے وہاں بھی قریظہ کا نام لیا تھا مگر وہ درست نہیں ہے اور اب ان آیتوں کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ کسی آئندہ پیش ہونے والی مہم سے متعلق ہیں جو اہل کتاب یہودیوں کے سلسلہ میں ہیں۔ اسی لیے یہ سمجھنا درست ہے کہ اب یہ آیتیں بنی قریظہ سے متعلق ہیں کہ منافقین ان سے غلط دعوے کر کے انہیں رسول کے مقابلے میں قدم جمائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ کہ وقت آئے گا تو وہ ان کا ساتھ

[۱] - عنی بالذین جاءوا من بعدہم والذین آمنوا من بعد الذین ثبتوا الدار (ابن جریر)

بالکل نہیں دیں گے مگر تجب ہے کہ قدیم مفسرین ان آیات کو بھی بنی نصیر سے متعلق قرار دیتے ہیں۔<sup>[۱]</sup> جو نظم سورہ کی بنا پر ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

لَا أَنْتُمْ أَشَدُّ رَهَبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِّنَ اللَّهِ ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۝۱۳

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرَى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ ط بِأَسْهُمٍ بَيْنَهُمْ

شَدِيدٌ ط تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقَلُوبُهُمْ شَتَّى ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ۝۱۴

”یقیناً تم لوگوں کا خوف ان کے دلوں میں اللہ سے زیادہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔ یہ سب مل کر کبھی تم سے جنگ نہیں کریں گے مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہوں یا دیواروں کے پیچھے سے، ان کا اختلاف خود آپس میں بہت سخت ہے تم انہیں سب اکٹھا دیکھتے ہو، حالانکہ دل ان کے الگ الگ ہیں، یہ اس وجہ سے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔“

مناقضین کا ذکر اس سے پہلے ختم ہو گیا اور تمہ اس کا بعد کو بھی آئے گا۔ اب یہ خود اس یہود جماعت کا ذکر ہے جیسا کہ ہم نے بتایا۔ پہلے کے مفسرین بنی نصیر بتا رہے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ بنی قریظہ ہیں جن کی مہم بعد کو سر کی گئی۔ خدا سے ڈرتے رہتے تو ایمان لے آتے مگر خدا سے تو ڈرتے نہیں، تم سے ڈرتے ہیں اس لیے تم سے بچاؤ کے لیے قلعوں کی پناہ لیتے ہیں۔

كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۵

”جیسے وہ جو ان کے پہلے تھے، ابھی ماضی قریب میں انہوں نے اپنے کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

جو اختلاف ہمارے اور ان مفسرین کے درمیان تھا، وہ برابر چل رہا ہے۔ ہماری بنا پر مطلب صاف ہے۔ یہ جن کا ذکر ہے بنی قریظہ ہیں تو وہ پہلے جن کا انجام سامنے آچکا وہ بنی نصیر ہیں جن کا ذکر اسی سورے کے شروع میں ہو چکا ہے۔ یہ لوگ چونکہ ان آیتوں کو بنی نصیر سے متعلق قرار دے رہے ہیں تو آپ سے ”قبل والے“ کوئی کہتا ہے اسی سے بنی قینقاع مراد ہیں، وہ یہودیوں کا قبیلہ جو سب سے پہلے جلاوطن کیا گیا تھا۔ اور کوئی کہتا ہے ان پہلے والوں سے مراد مشرکین مکہ ہیں جن سے بدر میں جنگ ہوئی تھی اور انہیں جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔<sup>[۲]</sup>

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ ۖ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ إِنِّي

أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝۱۶ فَكَانَ عَاقِبَتُهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا ط

وَذَلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝۱۷

[۱]۔ بعثوا الی بنی نصیر حین نزل بہم رسول اللہ للحرب ان اثبتوا و تمنعوا (ابن جریر)

[۲]۔ اختلف اهل التأویل فی الدین عنوا بالذین من قبلہم فقال بعضهم علی بذالك بنو قینقاع وقال آخرون عنی بذالك

مشرکوا قریش ببدر (ابن جریر)

”جیسے شیطان۔ اس نے آدمی سے کہا کافر ہو جا اور جب وہ کافر ہو گیا تو کہا میں تجھ سے بے تعلق ہوں میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے تو ان دونوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ آگ میں ہیں ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ سزا ہے ظالم لوگوں کی“۔

یہ شیطان سے تشبیہ منافقین کی ہے کہ وہ انہیں مخالفت پر قائم رہنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔ مگر وقت آنے پر ان کے ساتھ چھوڑ دیں گے جیسے شیطان آدمی کو ورغلاتا ہے، پھر جب اس پر مصیبت پڑتی ہے تو اس کے کام نہیں آیا کرتا“۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿١٩﴾

”اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور کسی بھی تنفس کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے کل کے لیے کیا سامان پہلے سے کر لیا ہے اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ باخبر ہے اس سے جو تم کرتے ہو، اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اللہ کو بھول گئے تو اس نے انہیں خود ان کو بھلا دیا اور یہ ہیں بد اعمال لوگ“۔

دینی اصلاح اور قرآن کی زبانی میں قیامت کے لیے ”کل“ کی لفظ کا استعمال ہوا ہے جس بنا پر ہمارے محاورے میں ”فردائے قیامت“ کہا جاتا ہے۔ انسان پہلے ارادی طور پر خدا کو بھولتا ہے پھر رفتہ رفتہ گناہوں کا خوگر ہو کر بری باتوں کی برائی کا احساس بھی سلب ہو جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ارادی کوتاہیوں کا ایک تہری نتیجہ ہوتا ہے، کبھی دلوں پر مہر لگ جانا کبھی کانوں اور آنکھوں پر پردے پڑھ جانا اور یہاں اسے خود اپنے کو بھول جانے سے تعبیر کیا ہے ”خود اپنے کو بھول جانا“ یعنی بالکل غافل ہو جانا اور اپنے حقیقی مفاد کا ذہن میں نہ رہنا، یہ درحقیقت معاصی میں دیر پائی کی ایک تہری خاصیت ہے جسے قرآن نے اللہ کی طرف کی ایک سزا کے طور پر بیان کیا ہے۔

لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۗ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفٰرِحُونَ ﴿٢٠﴾

”دوزخ والے اور بہشت والے یکساں نہیں ہیں۔ بہشت والے ہی نتیجہ میں کامیاب ہیں“۔

دنیا والی کامیابی تو عارضی چیز ہے۔ وہ حقانیت کی ضامن نہیں ہے آخرت کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔ وہ اہل بہشت کے لیے ہے۔

لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١﴾

”اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے اثر پذیر ٹکڑے ہو جانے والا اللہ کی عظمت کے احساس سے اور یہ مثالیں ہیں جنہیں ہم پیش کرتے ہیں لوگوں کے لیے شاید کہ وہ غور فکر سے کام لیں“۔

یہ ایک بلیغ انداز ہے ان انسانوں کی بدذوقی یا سخت دلی کے اظہار کا جو قرآن سے اثر پذیر نہیں ہوتے اور انہیں اس سے عظمت الہی

کا تصور نہیں ہوتا جب کہ یہ کلام آرہا ہے کہ اگر بالفرض پہاڑ پراتا راجاتا تو وہ ٹکرے ہو جاتے یعنی یہ کلام متقاضی اس کا ہے کہ ہر ایک اس سے متاثر ہو اور آخر میں کہہ دیا گیا ہے کہ یہ حقیقت کے سمجھانے کے لیے ایک مثال ہے جو پیش کی جا رہی ہے۔ نہ وہ پہاڑ پراتا راجائے گا اور نہ پہاڑ اس سے ٹکرے ہوگا۔ بعض اہل نظر نے اس آیت کو پہاڑوں کے شعور و ادراک کی دلیل کہا ہے جو میرے نزدیک مشکل ہے۔

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۖ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴿٣٢﴾  
 هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّبُ  
 الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۗ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ  
 الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى ۗ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ  
 وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٣٤﴾

’وہ وہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ ان دیکھی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ وہ سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے، وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، سلطنت کا حقیقی مالک، تمام نقائص سے بری، بے عیب، بے ضرر ذات، امن عطا کرنے والا، محافظ و نگہبان، غالب آنے والا، سرکشوں کو زیر کرنے والا، بزرگی کا مرکز، پاک ہے اللہ کی ذات اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں، وہ ٹھیک اندازے کے مطابق پیدا کرنے والا، نیستی سے نکال کر ہستی میں لانے والا، صورت گری کرنے والا، اس کے لیے اچھے سے اچھے نام ہیں، اس کی تسبیح کرتی ہے ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ غالب آنے والا ہے، صحیح کام کرنے والا‘۔

ان دونوں آیتوں میں متعدد اسمائے حسنیٰ خداوند عالم کے مذکور ہیں جن میں سے قدوس پہلی مرتبہ یہاں آیا جس کے معنی ہیں ’بہت پاک‘ اور مطلب وہی جو ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ وہ تمام نقائص سے بری ہے۔ سلام کی لفظ سلامتی کے مفہوم کی حامل ہیں وہ سراسر سلامتی ہے تو نہ اس میں کوئی عیب و نقص ہو سکتا ہے جو ذات کا کمال ہونے کی بنا پر توحید میں داخل ہے اور نہ اس سے دوسرے کو بلا وجہ ضرر پہنچ سکتا ہے جو عدل کے تحت کمال افعال سے تعلق ہے۔ مؤمن امن سے ہے جس کے معنی ہوئے امن عطا کرنے والا۔

خالق اور باری کا عام مفہوم یکساں محسوس ہوتا ہے چنانچہ ہندوستان میں گزشتہ صدی کی مشہور ابتدائی کتاب ’خالق باری‘ کے اس پہلے جملے کا مطلب یہی تھا کہ ان دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں مگر لغوی مفہوم کے اعتبار سے خالق کے معنی میں مضمر ہے صحیح پیمانہ مقرر کرنا اور باری کے معنی ہیں نیستی سے ہستی کے دائرے میں لانا اور مصور میں لباس صورت پہنانا، اس طرح یہ اسماء خالق، باری، مصور۔ ان میں باعتبار زمانہ کوئی ترتیب نہیں مگر تصوری طور پر پہلا منصوبہ تخلیق، دوسرا اصل تخلیق اور تیسرا نتیجہ تخلیق کا مظہر ہے۔

# سُورَةُ الْمُنْتَحِنَةِ

مدنیہ..... ۱۳..... آیات

اثنا عشر سورہ میں ایک آیت کے اندر فامتنحوہن کی لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان عورتوں کا امتحان لیا کرو، اسی پر اس سورے کا نام ”منتحنہ“ ہو گیا۔

اس سورے میں پہلے کافروں کے ساتھ ساز باز میں شریک ہونے کی ممانعت ہے اور سمجھا یا جا رہا ہے کہ یہ لوگ تمہارے کبھی کبھی نہیں ہو سکتے اور جب موقع ملے گا تمہیں ہر طرح قول و عمل سے نقصان ہی پہنچائیں گے، ان کا تو بس نصب العین یہ ہے کہ تم بھی راہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تمہاری اپنی اولاد یا رشتہ داریوں کا لحاظ ہو تو یاد رکھو یہ رشتہ داریاں تمہارے کام نہیں آئیں گی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروں کا ذکر ہے کہ دیکھو انہوں نے کس طرح دینی تصورات پر رشتہ داریوں کے تقاضوں کو قربان کر دیا، پھر دفع دخل کے طور پر حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے صفائی پیش کی گئی ہے کہ انہوں نے جس شخص کے لیے استغفار کیا تھا، وہ صرف وعدے کو پورا کرنے کے لیے تھا۔ ورنہ انہیں کوئی میلان قلبی اس کی طرف نہ تھا۔ اس کے بعد عام اصول بتایا جا رہا ہے کہ مطلق طور پر غیر مسلم افراد سے میل ملاپ سے تمہیں روکا نہیں جا رہا ہے، ان کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو حسن سلوک کرو اور معاملات میں ان کے ساتھ انصاف کرو، انصاف بہر حال اللہ کے لیے پسندیدہ چیز ہے تمہیں جو روکا جا رہا ہے، وہ ان لوگوں کی پارٹی میں شرکت سے جو تم سے برسر جنگ ہیں کہ تم ان سے تعاون نہ کرو اور جو ان کے ساتھ تعاون کریں گے وہ ظلم کی تقویت کا باعث ہوگا اور خود ظالموں میں محسوب ہوگا۔

آخر میں وہ عورتیں جو کافر شوہروں کو چھوڑ کر ادھر آئیں اور کہیں کہ ہم مسلمان ہو رہے ہیں ان کے لیے ہدایت ہوئی ہے کہ یہ دیکھ لو کہ یہ شوہروں سے بگڑ کے صرف ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے آئی ہیں یا واقعی اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر رہی ہیں، اگر دوسری صورت ہو تو انہیں ہرگز واپس نہ کرو، اس لیے کہ کفر اور اسلام کے اختلاف سے رشتہ قطع ہو جاتا ہے۔ نہ وہ ان کے شوہر رہ سکتے ہیں اور نہ یہ ان کی بیویاں ہو سکتی ہیں اور اب تم ان سے شادی کر سکتے ہو، اس ذیل میں کافر عورتوں سے شادی کرنے کی ممانعت کا عام حکم دیا گیا ہے۔

آخر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پاس جو عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ مسلمان ہو جائیں ان کے لیے بتایا گیا ہے کہ کن شرائط پر ان سے بیعت حاصل کی جائے اور سورۃ کو ختم کرتے ہوئے یہودیوں سے تعاون کی ممانعت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہار اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ  
وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ ۖ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ  
رَبِّكُمْ ۗ إِنَّ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي ۖ تُسِرُّونَ  
إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ ۗ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ ۗ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ  
فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ①

”اے ایمان لانے والو! میرے اور اپنے دشمن کو اپنے حوالی موالی کی حیثیت نہ دو، تم ان کے ساتھ محبت کے پیگ بڑھاتے ہو، حالانکہ انہوں نے کفر اختیار کیا اس کے ساتھ جو تمہارے پاس حق آیا اور ان کا عالم یہ ہے کہ وہ گھروں سے نکلنے پر مجبور کرتے ہیں پیغمبر کو اور تمہیں اس جرم میں کہ تم ایمان لاتے ہو اللہ پر جو تمہارا پروردگار ہے اگر تم نکلے تھے میری راہ میں جدوجہد کے لیے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، تم خفیہ طور پر ان سے محبت کے پیگ بڑھاتے ہو اور میں خوب جانتا ہوں اسے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم میں ایسا کرے گا اس نے سیدھے راستے کو گم کر دیا۔“

”اگر تم نکلے تھے میری راہ میں جدوجہد کے لیے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے،“ یہ قبل کے حکم سے متعلق ہے کہ جب تمہارا گھر سے بے گھر ہونا میری راہ میں تھا تو اب تم ان مشرکین سے ربط کیوں قائم کرتے ہو جو تمہارے گھر سے بے گھر ہونے کا باعث ہوئے۔<sup>[۱]</sup> الفاظ قرآن کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ مدینے کے رہنے والے منافقین سے مخاطب نہیں ہے بلکہ یہ طبقہ مہاجرین کے کچھ افراد ہیں جو مشرکین کے ساتھ خفیہ طور پر تعلقات محبت بڑھانا چاہتے ہیں۔ یہ انہیں فہمائش کی جا رہی ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ اس کا تعلق حاطب بن بلتعہ کے ساتھ ہے انہوں نے مشرکین مکہ کے نام خط لکھ کر حضرت کے نقل و حرکت کی جسے آپ مخفی رکھنا چاہتے تھے مخبری کرنے کی کوشش کی اب قرہی قیاس تو یہ ہے کہ یہ مخبری اس وقت ہوئی جب آپ فتح مکہ کے لیے تشریف لے جا رہے تھے مگر بعض روایات میں یہ صراحت ہے کہ یہ اس سفر مکہ میں ہوا ہے جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ہوئی۔ خالق نے اپنے رسول کو اس مخبری کی اطلاع دی اور حضرت نے جناب امیر کو اور بعض روایات کے مطابق آپ کے ساتھ کچھ دوسرے افراد کو بھیج کر اس خط کو برآمد کر لیا۔

إِنْ يَشْفِقُواكُمْ يَكُونُوا أَعْدَاءً ۖ وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ ۖ وَالسِّنَنُ  
بِالسُّوءِ ۖ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ۗ لَنْ نَنْفَعَكُمْ أَرْحَامَكُمْ ۖ وَلَا أَوْلَادَكُمْ ۗ يَوْمَ  
الْقِيَامَةِ ۗ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ③

[۱] من المؤخر الذي معناه التقديم ووجه الكلام - لا تتخذوا اعدوي وعدوكم اولياء ان كنتم خرجتم (ابن جرير)

”اگر وہ تمہیں پاجائیں تو تمہارا دشمن ہی ثابت ہوں گے، اپنے ہاتھوں اور اپنی زبان کو تمہاری طرف دراز کریں گے برائی کے ساتھ اور ان کی خواہش یہ ہوگی کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ نہ تمہیں تمہاری قرابت دار اور نہ تمہاری اولاد کام دے گی قیامت کے دن وہ تم سے ان کو دور کر دے گا اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا دیکھنے والا ہے۔“

چونکہ حاطب بن بلتعہ سے جب رسول ﷺ نے بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ تو انہوں نے کہا حضور! خدا گواہ ہے کہ میں ایمان کے رستے سے ذرہ بھر منحرف نہیں ہوا ہوں اور نہ آپ کی اور آپ کے دین کی حقانیت میں مجھے ذرا بھی شک شبہ ہوا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اور حضرات مہاجرین جو ہیں وہ صاحب قوم قبیلہ ہیں، ان پر وقت پڑے تو ان کے عزیز واقارب ان کی حمایت کریں گے، میرے کوئی قبیلے کے لوگ نہیں ہیں، اور مکہ معظمہ میں میرا مال اور میری اولاد ہے۔ میں نے خیال کیا کہ مشرکین پر ایک احسان کر دوں کہ بوقت ضرورت میرے کام آئے اور اس کی وجہ سے میرے اموال و اولاد محفوظ رہیں۔ بس یہ بات ہے جس کی وجہ سے میں نے یہ اقدام کیا۔

ان دونوں آیتوں میں اسی کا جواب ہے کہ ایک تو مشرکین سے کسی خیر سگالی اور خوشگوار اقدام کے بعد بھی کبھی بھی یہ امید نہ کرنا چاہیے کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت کریں گے، ان کی تو بس تمنا یہ ہے کہ تم دین اسلام سے منحرف ہو کر کافروں میں شامل ہو جاؤ اور پھر یہ رشتے بس اس دنیا تک ہیں۔ آخرت میں یہ قوم و قبیلہ، اولاد سب تم سے الگ ہوں گے وہاں یہ تمہارے کام نہ آئیں گے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا الْقَوْمِ هُمْ  
إِثَابُكُمْ وَإِنَّا نَكْفُرُ بِاللَّهِ وَكَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ  
الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدَاهُ الْإِقْوَالُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ  
لَا سْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ  
أَبْنَيْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٥٠﴾

”تم لوگوں کے لیے بہت اچھی مثال عمل ہیں ابراہیم اور ان کے ساتھ والوں میں جب انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ یقیناً ہم بے تعلق ہیں تم سے اور اس سے جس کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو، ہم تم سے منکر ہیں اور ہماری تمہاری دشمنی منافرت ہمیشہ کے لیے نمایاں ہوگئی ہے جب تک کہ تم ایمان لاؤ ایک اللہ پر، ہاں بس ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے دعائے مغفرت کروں گا مگر اللہ یہاں میں تمہارے لیے کچھ قدرت نہیں رکھتا، اے ہمارے پروردگار! تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے اور تجھ ہی سے ہماری لوگی ہے اور تیری ہی طرف بازگشت ہے۔“

یہ آیت صاف نمایاں کرتی ہے کہ اسلام میں قومیت بنیاد محبت والفت نہیں ہے بلکہ ایمان بنیاد الفت ہے۔

جناب ابراہیم کے ساتھ جو کہا گیا اور ان کے ساتھ والوں، تو ظاہر میں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو مومنین ان کے پیرو کی حیثیت سے ان

کے ساتھ تھے مگر واقعات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کے ساتھ اس سرزمین پر ساتھیوں کی کوئی جماعت نہ تھی اس لیے مفسرین اس کی تشریح میں کہتے ہیں کہ ”ان کے ساتھ والوں“ سے مراد دوسرے انبیاء ہیں کیوں کہ مسلک میں ان سے متحد تھے گریہ بعید ہے۔ ہمارے نزدیک جب کہ دوسری جگہ یہ موجود ہے کہ فامن لہ لوط لوط نے ان کی بات مانی، تو بمقتضائے نمائندگی کی تعبیر لفظ جمع سے کر دی گئی ہو جو کچھ بعید نہیں ہے۔

اس آیت میں مؤمنین کی زبانی کفرناکم میں جو اعلان کفر ہے، وہ منجملہ کچھ دوسرے آیات کے تبصرہ ان کے محل پر کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ ایمان اور کفر دونوں باعتبار معنی لغوی اضافی چیزیں ہیں اصل اس میں حسن اور قبح متعلق کے لحاظ سے پیدا ہوتا ہے کہ کس پر ایمان ہے اور کس کے ساتھ کفر ہے؟

حضرت ابراہیمؑ کے استغفار اور اس کے پس منظر پر اس کے پہلے جہاں ذکر آیا ہے، روشنی ڈالی جا چکی ہے چنانچہ حافظ محمد بن جریر طبری نے یہاں ابراہیمؑ کے اس حسنہ میں ان لفظوں سے کہ انہوں نے باطل پرستوں سے کہا: ”بَوَّءُوا مِنْكُمْ“، ہم تم سے بری یعنی بے تعلق ہیں اور اس کے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے استغفار کے ذکر میں جو ایک جگہ قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ

(توبہ - ۱۱۴) ”جب ان پر ثابت ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے برأت کر لی،“ تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے تبرا کا سبق حاصل کرنے کی دعوت دی ہے اور کہا ہے:-

فَكَذَلِكَ أَنْتُمْ إِيَّاهُمْ مَنُونَ بِاللَّهِ فَتَبَرُّوْا مِنْ أَعْدَاءِ اللَّهِ

(جامع البیان) تو اسی طرح تم اے اللہ پر ایمان لانے والو تبرا کرو دشمنان خدا سے۔

أَلَا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا بِيَه

سوا ابراہیمؑ کے قول کے اپنے باپ سے، اسے استثنائے متصل قرار دے کر یہ مطلب نکالا گیا ہے کہ سب باتوں میں ابراہیمؑ کی پیروی کرو مگر ان کا یہ قول جو تھا کہ میں استغفار کروں گا تمہارے لیے۔ اس میں پیروی نہ کرو کیوں کہ یہ ان کی ایک شخصی بات تھی۔<sup>[۱]</sup>

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَاعْفُ رَنَا رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ

الْحَكِيمُ ⑤

”اے ہمارے پروردگار! ہمیں تختہ مشق نہ بنانا ان لوگوں کا جو کافر ہیں اور ہمیں بخش دے اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو غالب آنے والا ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

”فتنہ“ کے معنی ذریعہ آزمائش کے ہیں۔ اسی کو ہم اپنی زبان میں ”تختہ مشق“ کہہ سکتے ہیں جو میں نے ترجمہ کیا ہے۔

دوسرا مطلب ذریعہ آزمائش نہ بنانے کا یہ کہا گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ ہم پر غالب آجائیں تو اسے دوسروں کے گمراہ کرنے کا ذریعہ

[۱] (فلا تأسو بذا لك منه ..... ابن جریر)

بنائیں کہ دیکھو اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو ہمیں ان پر غلبہ کیوں حاصل ہوتا۔<sup>[۱]</sup>

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَمَن  
يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ⑥

”تمہارے لیے ان میں اچھا نمونہ عمل ہے اس شخص کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت سے امید وابستہ کیے ہو اور جو روگردانی کرے تو یقیناً اللہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا حقدار۔“

فیہم کی ضمیر بظاہر حضرت ابرہیمؑ اور ان کے ساتھیوں ہی کی طرف راجع ہے جن کا ذکر اس کے پہلے بلافاصلہ تھا اور مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ کی طرف کے اجر و ثواب اور آخرت کی نجات کا تصور رکھتے ہو تو اسی کردار کو اختیار کرو جس کا ابھی بیان ہوا۔

عَسَى اللَّهُ أَن يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُم مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ⑦ وَاللَّهُ قَدِيرٌ ⑧  
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ⑨

”بہت ممکن ہے کہ اللہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے ان میں سے محبت پیدا کر دے اور اللہ بڑا قادر ہے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان“

مطلب یہ ہے کہ ابھی جو ان کا رویہ معاندانہ ہے ان سے تعلقات محبت پیدا کرنا درست نہیں ہیں لیکن بالکل مایوسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں انقلاب ہو جائیں اور وہ پیغامِ حق کو قبول کر لیں، پھر تم میں اور ان میں باہمی محبت کا رشتہ قائم ہو جائے گا، اور غفور رحیم کے الفاظِ مشرکین کے لیے اس طرح ہیں کہ جب وہ ایمان اختیار کر لیں گے تو ان کے گزشتہ افعال پر جو بحالت کفر انہوں نے کیے ہیں، اب باز پرس نہ ہوگی۔

لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ  
دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ⑩ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ⑪  
إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ  
وَوَظَّهُرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوهُمْ ⑫ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ  
الظَّالِمُونَ ⑬

”تمہیں اللہ ان لوگوں سے نہیں روکتا جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکلنے پر مجبور نہیں کیا کہ تم ان کے ساتھ نیکی کرو اور ان کے ساتھ انصاف کرو۔ یقیناً اللہ انصاف

[۱] بان لستلخهم علينا نبروا انهم على الحق واناعلى الباطل (ابن جریر)

کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ بس تمہیں ان سے روکتا ہے جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کے ساتھ پیٹھ ملائی کہ ان کے ساتھ تعاون کرو اور جوان کے ساتھ تعاون کریگا تو یہ لوگ خود ظالم ہیں۔“

سلسلہ کلام سے ظاہر ہے کہ یہ آیت غیر مسلمین ہی میں دو قسم کے لوگوں میں تفریق کر رہی ہے، ایک وہ جو مسلمان تو نہیں ہیں مگر اسلام سے برسر پیکار بھی نہیں۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ ان کے ساتھ میل ملاپ سے اللہ کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ ان سے حسن سلوک کرو۔ کوئی وقت ان پر پڑے مصیبت کا تو ان کی مدد کرو، اور ان کا کوئی مقدمہ تمہاری عدالت میں پیش ہو تو جو انصاف کا تقاضا ہو، اس کے مطابق فیصلہ کرو، اور اس میں تعیم ہے کہ چاہے ان کے مقابلے میں جو فریق ہو وہ اپنے مذہب و ملت کا ہو جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے آیات سے بھی ظاہر ہے۔

یہ مطلب بالکل صاف ہے مگر ہر دور میں ایسے اشخاص ہوئے ہیں جنہیں ”رواداری“ پسند نہیں ہے ان کے حلق سے یہ چیز نہیں اترتی کہ بھلا غیر مسلم اور ان کے ساتھ نیکی کی جائے انصاف سے کام لیا جائے لہذا کچھ لوگوں نے ان مسلمانوں سے متعلق قرار دیا ہے جو مکہ میں رہ گئے ہیں اور ہجرت نہیں کی ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ الفاظ کہ انہوں نے تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا ہے، بالکل ان پر چسپاں نہیں ہیں جو دین اسلام کو قبول کیے ہوئے ہیں صرف کسی مجبوری سے مکہ چھوڑا نہیں ہے، کچھ لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ ہے تو یہ غیر مسلمین ہی بارے میں تو کہہ دیا کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے احکام جہاد آنے کے بعد، مگر یہ سورہ سورہ ممتحنہ جیسا کہ ظاہر ہے، اگر فتح مکہ کے وقت کا نہیں ہے اسکے پہلے کا بھی ہے تو بھی حدیبیہ والے سفر کے موقع کا ہے جو لڑائی میں ہے اور ظاہر ہے کہ احکام جہاد اس کے بہت پہلے سے نازل ہو چکے تھے لہذا یہ منسوخ ہونے کا تصور بھی بالکل غلط ہے۔ اس لیے ان اقوال کے نقل کرنے کے بعد حافظ طبری نے حقیقت پسندی سے کام لے کر اپنا فیصلہ جو لکھا ہے، وہ وہی ہے جسے ہم شروع میں درج کر چکے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

اولی الاقوال فی ذلك قول من قال عنی بذالك الاينها کم الله عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین من جمیع اصناف الملل والادیان ان تبروهم وتصلوهم وتقسطوا الیهم ، ان الله عزوجل عم بقوله الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیار کم جمیع من کان ذالك صفتہ فلم یخصص به بعضا دون بعض ولا معنی لقول من قال ذالك منسوخ لان برأ المؤمن من اهل الحرب ممن بینہ وبينہ قرابة نسب او ممن لا قرابة بینہ وبينہ ولا نسب غیر محرر ولا منتهی عنہ اذال ، یکن فی ذالك دلالة له ولاهل الحرب عورة لاهل الاسلام او تقویة لهم بکرا ع او صلاح (جامع البیان - ج ۲۸ - ص ۶۶)

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ترجیح وہی قول ہے کہ مقصود اس سے یہ ہے کہ اللہ کی تمہیں ممانعت نہیں ہے ان لوگوں سے جنہوں نے تم سے جنگ نہیں کی دین کے بارے میں تمام اقوام و مذاہب کے افراد میں سے کہ تم ان سے نیکی کرو اور ان کے ساتھ صلہ رحم کرو اور ان سے انصاف کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے عمومیت رکھی ہے اپنے اس ارشاد میں کہ جنہوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں گھروں سے تمہارے نہیں نکالا جن میں یہ وصف ہو اس میں کسی ایک کی خصوصیت نہیں ہے اور کوئی معنی نہیں اس قول کے کہ وہ منسوخ ہے، اس لیے کہ نیکی کرنا کفار کے ساتھ جن سے کوئی نبی قرابت ہے یا نہیں بھی ہے حرام نہیں ہے نہ اس کی ممانعت ہوئی ہے جب کہ اس میں ان لوگوں کو جن سے جنگ

ہو رہی ہے اہل اسلام کے کسی راز کی اطلاع نہ دی جائے یا انہیں جنگ کے کسی سامان کے ساتھ مدد نہ دی جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۗ اللَّهُ أَعْلَمُ  
بِأَيْمَانِهِنَّ ۗ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۚ لَا هُنَّ حِلٌّ  
لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۚ وَاتَّوهُهُنَّ مِمَّا أَنْفَقُوا ۗ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ  
تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ ۗ وَلَا تُمْسِكُوا بِعَصَمِ الْكُوفِرِ  
وَأَسْأَلُوا مِمَّا أَنْفَقْتُمْ وَلَيْسَ لَكُمْ أَنْفَقُوا ۗ ذَلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ ۗ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۗ

وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾

”اے ایمان لانے والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا امتحان لے لو، اللہ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کا حال۔ اب تمہیں اگر معلوم ہو کہ وہ واقعی بایمان ہیں تو انہیں کافروں کی طرف واپس نہ کرو، نہ وہ عورتیں ان مردوں کے لئے جائز ہیں اور نہ وہ مردان عورتوں کے لیے جائز ہیں اور انہیں ”جو انہوں نے خرچ کیا ہے اور تمہارے لیے کوئی حرج نہیں کہ تم ان سے نکاح کرو، جب تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو اور کافر عورتوں سے ازدواجی رشتہ قائم نہ کرو اور طلب کرو جو تم نے خرچ کی ہو اور وہ اب طلب کریں جو انہوں نے خرچ کیا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ نافذ کرتا ہے تمہارے درمیان اور اللہ جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا“۔

یہ امتحان کیا تھا؟ یہ کہ قسمیں دے دے کر ان سے پوچھا جاتا تھا کہ وہ شوہروں سے ناراضگی یا ایک سرزمین سے نفرت اور دوسری سرزمین کے شوق یا مال دنیا کی طمع میں مکہ کو چھوڑ کر مدینہ نہیں آئی بلکہ صرف اللہ اور اس کے پیغمبر کی محبت میں یعنی سچے معنی میں دین کو اختیار کر کے آئی ہیں۔ اب جب معلوم ہو کہ وہ واقعی مسلمان ہو گئی ہیں تو واپس نہیں کی جائیں گی مگر چونکہ اس وقت ان مشرکین سے جنگ کی صورت نہیں بلکہ حدیبیہ میں معاہدہ ہو چکا ہے اس لیے ان کے شوہروں نے جو انہیں مہر وغیرہ دیا ہو ان شوہروں کو واپس کر دیا جائے۔

وَلَا تُمْسِكُوا بِعَصَمِ الْكُوفِرِ ﴿الممتحنة: ۱۰﴾ ”کافرہ عورتوں سے ازدواجی رشتہ قائم نہ رکھو“ اس ذیل میں مفسر طبری نے کئی صحابہ کا نام لیا ہے کہ اب تک ان کے حوالہ عقد میں مشرک عورتیں تھیں اس حکم کے نازل ہونے کے بعد انہوں نے ان سے قطع تعلق کیا۔

اب یہاں چونکہ مشرکات نہیں کہا گیا ہے بلکہ کافر کہا گیا ہے جس کے معنی ہوئے کافرات، اس لیے علماء اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ بھی نکاح کو اس آیت کی بنا پر ممنوع قرار دیتے ہیں وہ چاہے اس معنی میں مشرکات نہ ہوں جو اہل کتاب کے مقابلے میں ہے مگر ”مسلمات“ کے مقابلے میں کافرات تو وہ بھی ہیں۔

ہاں بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ان کے متعلق ہے جن کے نکاح میں پہلے سے مشرک عورتیں تھیں ابتدائی عقد کا اس میں ذکر نہیں ہے کہ ان سے نکاح نہ کرو مگر بظاہر مقصد کے لحاظ سے یہ کوشش لا حاصل ہے اس لیے کہ جب قبل کے تعلقات قائم رکھنے کا اسلام روادار نہیں ہے تو اس

سے ظاہر ہے کہ ان سے تعلق ازدواجی ناجائز ہے لہذا ان سے شادی کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اب جس طرح ادھر سے بعض عورتیں ادھر آ جاتی تھیں، ویسے مسلمانوں کی کچھ عورتیں ادھر چلی جاتی تھیں تو کہا گیا ہے کہ جیسے پہلی صورت میں ان کو حق ہے کہ جو کچھ انہوں نے ان عورتوں پر خرچ کیا ہے وہ تم سے طلب کریں، ویسے ہی اس صورت میں تمہیں حق ہے کہ جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے، وہ ان سے طلب کرو۔

**وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَرْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعاقِبْتُمْ فَاتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ**

**أَرْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَا أَنْفَقُوا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿۱۱﴾**

”اور اگر وہ تمہاری عورتوں میں کچھ تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس گئی ہوں اور پھر تم سزا دو تو جن کی عورتیں چلی گئی ہیں، انہیں دو جتنا انہوں نے خرچ کیا ہو اور ڈرو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو“۔

اب دوسری صورت میں جب کہ مسلمانوں کے پاس کچھ عورتیں بھاگ کر کافروں کے پاس چلی جائیں اور کافروں نے خدا کے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا تو اب دوسرے مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اب کافروں کا کچھ مال تمہیں مل جائے اور تم ان کے کیے کی سزا کے طور پر اسے قبضے میں رکھو تو ان کے شوہروں کو جن کی عورتیں ادھر چلی گئی ہیں جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہے، اس مال میں سے دیدو۔ یہ تمہارے ایمان کا تقاضا ہے۔

**يَأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ**

**شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ**

**بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيَنَّ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ**

**اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲﴾**

”اے پیغمبر! جب آپ کے پاس ایمان لانے والی عورتیں بیعت کرنے لیے آئیں، ان شرائط پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی اور چوری نہیں کریں گی اور زنا کاری نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کی جان نہیں لیں گی اور کوئی بہتان نہیں باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پیروں کے بیچ میں اور آپ کے احکام کی جو نیکی کے ساتھ ہوں گے نافرمانی نہیں کریں گی تو ان سے بیعت لے لیجیے اور ان کے لیے اللہ سے دعائے مغفرت کیجیے۔

یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔

شرائط بیعت کا یہ جز کہ کوئی بہتان نہیں باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پیروں کے بیچ میں، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی بچے کو غلط طور پر اپنے شوہروں کے سر نہیں منڈھیں گی<sup>[۱]</sup> اس موقع پر ہندہ بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان کی بیعت کا دلچسپ واقعہ علاوہ کتب تاریخ کے تفسیر طبری میں بھی موجود ہے کہ جب مکہ کی عورتیں بیعت کے لیے رسول کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو پہلے تو یہ ہندہ چھپی ہوئی خاموش بیٹھی رہی کہ کہیں یہ معلوم

[۱]۔ لا یلحقن بأزواجهن غیرا ولا دھم (ابن جریر)

ہو کر کہ میں بھی اس جماعت میں ہوں رسول میرے قتل کا حکم نہ دیدیں مگر جب اسے یہ طمینان ہو گیا آج پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سابق کردار کا کوئی انتقام لینے کے درپے نہیں ہیں اور رسول نے بیعت کے یہ شرائط بتانا شروع کیے تو اس جملے پر کہ ”زنا کاری نہ کریں“ وہ بول اٹھی کہ کیا کوئی شریف عورت بھلا زنا کاری بھی کرتی ہے؟ رسول نے بڑے معنی خیز انداز میں اس فقرے کو جیسے دہرایا۔ فرمایا ہاں بے شک شریف عورت کوئی زنا نہیں کرے گی۔ اس کے بعد ایسا جملہ اس کی زبان پر بے ساختہ آیا جو اس نمائش اسلام کے بعد اس کی نمازی کرتا ہے کہ جنگ بدر کے کینے دلوں سے نہیں نکل سکتے، جب یہ شرط پیش ہوئی کہ ”اولاد کی جان نہ لیں“ تو وہ پھر بول اٹھی کہ ہم کیا جان لیں گے آپ ہی نے جنگ بدر میں ان کی جانیں لے لیں (جامع الاخبار۔ ج ۲۸۔ ص ۷۸) مگر رسول اکرم کے بے پایاں حلم و تحمل نے اسے برداشت کر لیا اور اس کی بات کا جواب خاموشی کی صورت میں دیا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے شرافت نسوانی کے تحفظ کے لیے مرد و عورت دونوں کے درمیان جو خلیج حائل کی ہے، اس کا لحاظ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت ایسے اہم آئینی معاملے میں بھی قائم رکھا کہ بیعت کا عام طریقہ یہ تھا کہ بیعت کرنے والا ہاتھ بڑاتا تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس سے اقرار لیتے تھے جیسا کہ قرآن مجید کی آیت سے ظاہر ہے کہ ید اللہ فوق ید یہی مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہاتھ جو ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے یہ اللہ کا ہاتھ ہے مگر خواتین کے لیے مسلماً یہ طریقہ نہیں رکھا گیا تاکہ رسول کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس نہ ہو۔ اب خواتین کی بیعت کا کیا یہ طریقہ تھا؟ اس کے لیے طبری کے روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بس ان سے زبانی اقرار بیعت کرایا جاتا تھا چنانچہ ایک روایت میں جو ام المؤمنین عائشہ سے ہے صراحت ہے کہ:

فكان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم اذا اقررن بذلك من قولهن قال لهن انطلقن فقد بايعتكن والاوله مامست يدر رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يدا مرثة قط غير ان يبایعهن بالكلام (جامع الاخبار۔ ج۔ ۲۸۔ ص ۶۸)

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ جب اس کا اقرار کر لیتی تھیں کہ اپنے قول سے تو ان سے فرماتے تھے کہ جاؤ میں نے تم سے بیعت لے لی اور بخدا رسول خدا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا بس آپ زبانی ان سے بیعت لیتے تھے۔ دوسری روایت ایک خاتون ایک خاتون امیمہ کی زبانی ہے جو انہوں نے بعد میں بیان کی ہے کہ میں نے حضرت سے کہا اپنا ہاتھ بڑھائیے، حضرت نے فرمایا:-

انی اصافح النساء ولكن ساخذ عليكن

یعنی میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا بس تم سے عہد و پیمانہ لے لیتا ہوں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَدْبُوا مِنَ الْآخِرَةِ

كَمَا يَدْبِسُ الْكُفَّارُ مِنَ أَصْحَابِ الْقُبُورِ ﴿١٣﴾

”اے ایمان والو! تعاون نہ کرو اُس جماعت سے جن پر اللہ غضب ناک ہے جو آخرت سے یوں ناامید ہیں

جیسے کافر لوگ قبروں میں گڑے ہوئے، مردوں سے“۔

ادھر کے سورے جن کی ساخت ایک خاص طرح کی ہے جیسے ”سورۃ رحمان، سورۃ واقعہ، وغیرہ ان کا خود انداز بتاتا ہے کہ وہ بوقت



واحد مجموعی طور پر نازل ہوئے ہیں مگر اس سورے کے مضامین اور پھر اس کی شان نزول جو معلوم ہوتی ہے، اس کے لحاظ سے اتنا زمانے کا فرق محسوس ہوتا ہے کہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ پورا سورہ ایک ساتھ نازل نہیں ہوا ہے بلکہ مختلف موقعوں پر نازل شدہ آیات کو جوڑ کر اس کی تشکیل ہوئی ہے چنانچہ شروع سے لیجئے تو آدھے سے زیادہ سورے کی آیات سفر حدیبیہ کے قبل سے متعلق ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رواجی کی خفیہ مخبری ہوئی اور اس پر تنبیہی طور پر دو آیات نازل ہوئے اس کے بعد مومنین کو خطاب کر کے جو کہا گیا تھا کہ عورتیں ادھر کی ادھر آئیں تو ان کا امتحان لو جس پر سورے کا نام ”ممتحنہ“ ہو گیا وہ حدیبیہ کے معاہدے کے بعد دوران معاہدہ کا ذکر ہے اور پھر رسول سے جو کہا گیا ہے کہ مسلمان عورتیں جو بیعت کرنے آئیں تو ان شرائط پر بیعت لیجئے جس کا بیان اس کے قبل ہوا وہ فتح مکہ کے بعد کی آیت ہے کیوں کہ یہی وہ موقع ہے جب کہ تمام لوگ جو اب تک مشرک تھے خواہ مرد ہوں یا عورتیں آ کر مسلمان ہوئے تھے اور ان سے بیعت لی گئی تھی اور اب یہ آخری آیت جس میں کہا جا رہا ہے ان کے ساتھ تعاون نہ کرو جن پر اللہ کا غضب ہے اور جیسا کہ پہلے آچکا ہے قرآن کی اصطلاح ہے یہ کہ غضب الہی جن پر ہے ان سے مراد یہودی جماعت ہوا کرتی ہے اور اس لیے مفسرین یہاں بھی غضب اللہ علیہم سے مراد اسی جماعت کو قرار دیتے ہیں اب ظاہر ہے کہ مکہ میں ب یہودی نہیں تھے، نہ حدیبیہ کے موقع پر، نہ فتح مکہ کے موقع پر تھے مدینہ میں اور وہ اس سے بہت پہلے لہذا یہ آیت اُس مضمون سے متعلق ہے جو اس کے پہلے سورہ حشر میں بیان ہوا تھا کہ منافقین ان یہودیوں کے ساتھ ساز باز کرتے ہیں۔ اور انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں جن آیات کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ یہ آیت اسی دور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ مفسر طبری نے اپنی تفسیر کے بسط و وسعت کے باوجود اس پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالی بس آخر کے جملے کا کیا مطلب ہے؟ اس میں دو قول نقل کر دیے ہیں:-

پہلا مطلب جو کہا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جیسے کہ کفار جو دار دنیا میں ہیں، وہ اپنے مردوں سے ناامید ہیں کہ وہ ان کی طرف واپس نہیں آسکتے ویسے ہی یہ لوگ جان بوجھ کر انکار حق کی بنا پر اپنی نجات سے ناامید ہیں اس صورت میں من اصحاب القبور فعل یئسوا سے متعلق ہے۔ اس کو اپنے محاکمہ میں انہوں نے رد کر دیا کہ مرنے والوں کی دوبارہ ملاقات سے مایوسی کافروں سے مخصوص تھوڑی ہے۔ مومنین کو بھی یہ امید نہیں ہے کہ مردے پھر آ کر ان سے ملیں گے تو قرآن کو ہی کیوں کہتا کہ وہ اصحاب القبور سے مایوس ہیں۔

دوسرے معنی جسے انہوں نے ترجیح دی ہے یہ ہیں کہ من اصحاب القبور۔ الکفار کی صفت ہے یعنی وہ کافر جو قبروں میں پہنچ گئے، اب رحمت خدا سے مایوس ہیں کیوں کہ اصلاح عمل کا وقت گزر چکا ویسے ہی یہ یہودی لوگ اپنے باطل پر ہونے کے احساس کی بنا پر نجات اخروی سے مایوس ہیں۔ میں پہلے مفہوم کو قابل قبول سمجھتا ہوں، اس طرح کہ کفار سے مراد منکرین قیامت ہیں جو حیات بعد الموت کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ ان کے مقابلہ میں مومنین اصحاب قبور سے مایوس نہیں ہے کہ سمجھتے ہیں کہ وہ مرنے والے ہمیشہ کے لیے مرے ہیں بلکہ پھر زندہ ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس زندگی میں ہم پھر اس کے ساتھ ایک ہی جگہ پر ہوں لیکن اس زندگی کے منکروں کے لیے ان لوگوں سے جو دنیا سے اٹھ گئے کبھی بھی ملاقات کی امید نہیں ہو سکتی کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی بس یہی ختم ہو گئی۔ اب آئندہ کوئی دور نہیں ہے جو ان سے ملاقات ہو سکے۔

# سُورَةُ الصَّفِّ

مدنیہ ..... ۱۴ ..... آیات

تقریباً شروع ہی کے حصہ میں ایک آیت میں صفا کی لفظ ہے اسی پر سورے کا نام ہو گیا۔

## سورہ صف کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... ایسے دعوے زبانی نہ کرو جن کی تصدیق عمل سے نہ ہو۔
- ۲..... راہ خدا میں اس طرح صف جما کر جہاد کی تعریف جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوتی ہے
- ۳..... حضرت موسیٰ کی اپنی قوم کو فہمائش۔
- ۴..... جناب عیسیٰ کی اپنی قوم کو آنے والے رسول کی بشارت یہ کہہ کر کہ اس کا نام احمد ہوگا۔
- ۵..... دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا وعدہ جو پہلے بھی آپکا ہے۔
- ۶..... تجارت کے نام سے ایمان اور جہاد کی دعوت۔
- ۷..... دین الہی کے مددگار ہونے کی دعوت اور حواریین حضرت عیسیٰ کی مثال۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

## سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ①

جو چیز بھی آسمان میں ہے اور زمین میں ہے، اس نے اللہ کی تسبیح کی اور وہ غالب آنے والا ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

ادھر کے زیادہ تر سوروں کی ابتداء، اس طرح کی تسبیح سے ہے اس لیے ان سوروں کو ”مستبحات“ کہتے ہیں، تسبیح کرنے والے کے لحاظ سے تو ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم ہوتی ہے مگر وہ حقیقت جو ذات باری کے لحاظ سے ہے کہ وہ تمام نقائص سے بری ہے۔ اس میں ماضی اور مضارع کے درمیان بس لفظی مفہوم کا فرق ہے نتیجہ کے لحاظ سے نہ وہ ماضی اور حال سے مختلف ہے اور نہ یہ مضارع جو حال اور مستقبل لفظی مفہوم کا فرق ہے نتیجہ کے لحاظ سے نہ وہ ماضی اور حال سے مختلف ہے اور نہ یہ مضارع جو حال اور مستقبل کو شامل ہے ماضی سے الگ چیز ہے، چونکہ خالق خود قیود زمانہ میں اسیر نہیں ہے لہذا اس کے جتنے کمالات ذات ہیں، ان میں جو فعل بھی صرف ہو، اس زمانہ بس لفظ کے لحاظ سے ہوتا ہے حقیقت کے لحاظ سے نہیں اس لیے اس کی ذات کے لیے قرآن میں إِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿فاطر: ۱﴾ کے بھی وہی معنی ہیں جو وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی

كُلِّ شَيْءٍ قَائِمًا. (الأحزاب: ۲۴) کے ہیں حقیقت کے لحاظ سے اس کے اور اس کے مطلب میں کوئی فرق نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا

مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿۳﴾

”اے ایمان لانے والو! کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو، یہ بہت بڑی ناراضگی کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ تم کہو جو کرتے نہیں ہو۔“

یہ تو کلام کا انداز بھی بتانا ہے اور تمام اقوال جو آیت کی تشریح میں ہیں، وہ بھی متفق ہیں کہ وہ باتیں جو کرتے نہیں اور کہتے ہیں ان سے مراد کارہائے خیر ہیں۔ اب اختلاف اس میں ہے کہ یہ مستقبل کے متعلق ہے کہ بڑھ چڑھ کر دعویٰ کیے کہ ہم یوں ساتھ دیں گے، ہم حکم دیا جائے اس کی پوری تعمیل کریں گے چنانچہ طبری کی روایات میں ہے کہ رسول سے پوچھا کہ ہمیں بتائے کہ اللہ کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟ اور جب راہ خدا میں جہاد کو کہا تو بہت سوں نے کوتاہی سے کام لیا۔ اس ذیل میں ایک روایت میں جنگ احد کا حوالہ بھی آیا ہے کہ وہاں مسلمانوں نے کس طرح میدان سے کنارہ کشی اختیار کی اس پر تنبیہ کی جارہی ہے اور کچھ ماضی سے متعلق قرار دیتے ہیں کہ آدمی دعویٰ کرے کہ میں نے یوں کیا یوں کیا اور حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ منافقین کو بھی کہا گیا کہ وہ مسلمانوں کو ساتھ دینے کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر وقت ہمیشہ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ طبری نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے مگر ہمارے نزدیک الفاظ آیت میں یہ سب ہی باتیں داخل ہیں اور سب اللہ کی ناراضگی کا باعث ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرصُوصٌ ﴿۴﴾

”یقیناً اللہ دوست رکھتا ہے انہیں جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پراجمائے جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔“

چونکہ ان سوروں میں آیتوں کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی ترتیب شان نزول کے مطابق ہے اس لیے قبل کی آیتوں سے ارتباط بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں آیتوں کی تشریح میں بعض روایات ایسے تھے کہ صحابہ نے پوچھا تھا کہ اللہ کو سب سے زیادہ کون سی بات پسند ہے؟ تو کہا جاتا ہے کہ اس کے جواب میں یہ آیت اتری ہے لیکن اس صورت میں ماننا پڑیگا کہ اس کے قبل کی دو آیتیں جو سرزنش کی ہیں کہ کیوں ایسی باتیں کہتے ہو جن پر عمل کرتے نہیں ہو، وہ اس آیت کے بعد کی ہیں۔

ہم تو اس طرح کے سوروں میں ہر آیت سے وجدانی طور پر جو مطلب مستفاد ہوتا ہے اسی کو مستند سمجھتے ہیں اور ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ان الفاظ میں درحقیقت ثبات قدم کی تعریف ہے لہذا بعض لوگوں کا یہ خیال کہ قرآن میں پیادوں کی جنگ کی تعریف ہوئی ہے، سواروں کی نہیں کیوں کہ سواروں کے لیے جنگ میں پراجمائے کا تصور نہیں ہو سکتا۔<sup>[۱]</sup> حقیقت سے دور ہے۔ ہاں ثبات قدم کے علاوہ تمام مجاہدین کے یکدل اور یک جہت، ہم آہنگ ہونے کا پہلو بھی اس میں محسوس کیا جائے تو بعید نہیں ہے۔

[۱] لان الفرسان لا یصطفون واما تصطف الرجال (ابن جریر)

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ لِمَ تُوذُّوَنِي وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ

إِلَيْكُمْ ۖ فَلَمَّا رَأَوْا آيَاتِ اللَّهِ قُلُوْا بِهِمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم والو! کیوں مجھے ایذا پہنچاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں تمہاری طرف توجب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو (اور زیادہ) کج کر دیا اور اللہ منزل مقصد تک نہیں پہنچایا کرتا بے اعمال لوگوں کو“۔

### حضرت موسیٰ کی اپنی قوم کو فہمائش

یہاں قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں جن کے لیے جناب موسیٰ نجات دہندہ کی حیثیت رکھتے تھے اور انہی کی ہدایت اور تعلیم آپ کا نصب العین تھی مگر یہ انہیں طرح طرح سے اپنی کج روی کے ساتھ اذیت پہنچاتے جس سے ان کو دکھ ہوتا تھا۔ انہی سے ان الفاظ میں خطاب ہے۔ اب یہاں بعد میں جو دلوں کو کج کرنے کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے، اس کے پہلے بطور فعل اختیاری کے خود ان کی طرف کج ہونے کی نسبت دی گئی ہے تو اب بعد میں جو کج کرنے کی نسبت ہے وہ بطور سزاسلب توفیقات کے معنی میں ہے اور یہی توفیق وہ ہدایت ہے جس کی فاسق گروہ سے نفی کی گئی ہے جس کی تشریح طبری نے بھی حقیقت پسندی کے ساتھ ان الفاظ میں کی ہے:۔ واللہ لا یوفیٰ لاصابة الحق القوم الذین اختار الکفر علی الایمان (جامع البیان) اللہ حق تک پہنچنے کی توفیق انہیں نہیں دیتا جنہوں نے کفر کو ایمان پر ترجیح دی۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ بِنَتِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيِّ مِنَ التَّوْرَةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ

أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

”اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں تمہاری طرف تصدیق کرتا ہوا تو ریت کی جو میرے پہلے تھی اور خوش خبری دیتا ہوا ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا توجب وہ آئے معجزے لے کر تو ان لوگوں نے کہا یہ کھلا ہوا جادو ہے“۔

اس میں جناب عیسیٰ علیہ السلام نے ہمارے پیغمبر کی بشارت دی ہے احمد کی لفظ کے ساتھ جو ہمارے رسول کا نام ہے اور ”جب وہ معجزے لے کر آئے“ اس سے قریب چونکہ حضرت ہی کا نام ہے لہذا یہی مطلب ہے کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم معجزے لے کر آئے، تو کافروں نے کہا کھلا ہوا جادو ہے جو درحقیقت غیر معمولی یعنی خارق عادت ہونے کا اپنے کفریہ طریقے پر اقرار ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَى إِلَى الْإِسْلَامِ ۖ وَاللَّهُ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ ۝ یریدون لیطفؤا نور اللہ بأفواہہم واللہ متئم

نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٨﴾ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۗ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٩﴾

”اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے کہ جو اللہ پر غلط تہمت لگائے درنحالیکہ اسے دعوت دی جا رہی ہو اسلام کی طرف اور اللہ منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا ظالم لوگوں کو، وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھادیں اپنے منہ سے اور اللہ اپنے نور کو کمال منزل تک پہنچانے والا ہے، چاہے کافر لوگ ناپسند کریں، وہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو بھیجا رہنمائی اور حقیقت والے دین کے ساتھ کہ اسے ہر دین پر غالب کرے چاہے مشرک لوگوں کو ناپسند ہو۔“

اسلام کی طرف دعوت دی جانے کی صورت میں وہ اللہ پر غلط تہمت کیا لگاتے ہیں؟ مفسر طبری نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ وہ پیغمبر کو ساحر وغیرہ کہتے ہیں، اس کا اللہ پر افترا ہونا اس سمجھ آتا ہے کہ کس طرح کسی چیز کا اللہ کی طرف منسوب کرنا افترا ہے اسی طرح اس کی طرف کی کسی صحیح بات کو غلط کہنا بھی افترا ہے۔ اس طرح ساحرہ وغیرہ کچھ نہ کہیں، صرف انکار رسالت کریں تو وہ بھی اللہ پر افترا ہے۔

اس کے بعد کی دونوں آیتوں کا مضمون پہلے آچکا ہے جس کے ذیل میں تمام ادیان پر دین اسلام کے غالب کرنے کا اعلان ہے جس کے پورے ہونے کا، اہل ایمان کو یقین ہے اور اس دن کے آنے کا انتظار ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنَجِّيكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ﴿١٠﴾

تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۗ

ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١﴾ يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۗ ذَلِكَ الْفَوْزُ

الْعَظِيمُ ﴿١٢﴾ وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۗ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِيرٌ

الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾

”اے ایمان لانے والو! کیا میں تمہیں پتہ بتاؤں اس تجارت کا جو تمہیں نجات دے دردناک عذاب سے (وہ یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ گے اللہ اور اس کے پیغمبر پر اور جہاد کرو گے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو، تو اللہ بخش دے گا تمہارے گناہوں کو اور تمہیں داخل کرے گا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں اور پاک و پاکیزہ مکانات میں ہمیشہ والی زندگی کے باغوں میں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور دوسری بات (اس کے علاوہ) ہے جس کی تمہیں خواہش ہے اللہ کی طرف کی مدد اور قریبی فتح کامیابی اور کامرانی اور خوش خبری دے دیتیجیے ایمان والوں کو۔“

اسلام میں تجارت کے پسندیدہ خالق ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ آخرت کے بلند مقاصد کی تحریک تجارت کی لفظ کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ جو مخاطب بنایا گیا ایمان لانے والوں کو اور پھر تجارت کی تشریح میں جس کی طرف دعوت دی گئی، کہا گیا ”ایمان لاؤ گے“ اس کی نظیر پہلے قرآن مجید میں آپکی ہے اور ہر جگہ اس کی توجیہ یہ ہے کہ وہ ایمان جو سرنامہ خطاب میں آتا ہے اقرار ایمان زبان جس سے ہے اور پھر جس کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ، وہ ایمان واقعی ہے جو دل سے ہوتا ہے اس کے عملی تقاضوں کے ساتھ اور یہاں اس کا ایک اہم تقاضا بیان ہوا ہے راہ خدا میں جہاد۔ آخر میں جو ہے: **وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا**، اس کا عطف بعض لوگوں نے قبل والی تجارت کی لفظ پر لیا ہے ب معنی یہ ہوں گے کہ تمہیں ایک تجارت کا پتہ بتادوں اور ایک ایسی بات کا جس کی تمہیں خواہش ہے مگر یہ مفہوم درست نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ تجارت جسے کہا گیا ہے وہ تو ان لوگوں کا ارادی عمل ہے جس کی طرف رہ نمائی خالق کی طرف سے ہوئی ہے اور یہ نصرت و مدد ان کا عمل نہیں ہے۔ یہ خالق کی طرف کی بات ہے جس کی رہ نمائی ان لوگوں کو توڑی ہونا ہے ہم نے جو ترجمہ کیا ہے مفسر طبری بھی اس کے موافق ہیں۔<sup>[1]</sup>

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِحَوَارِيِّينَ  
مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ فَأَمْنَتْ ظَآئِفَةٌ مِّنْ  
بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرْتُ ظَآئِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ  
فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ﴿١٣﴾**

”اے ایمان لانے والو! اللہ کے مددگار بنو جیسا کہ عیسیٰ فرزند مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ میں میرے مددگار ہیں؟ حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا جو ایمان لائے ان کی ہم نے مدد کی ان کی دشمن کے مقابلے میں آئے تو وہ غالب آئے۔“

### دین الہی کے مددگار ہونے کی دعوت اور حواریین حضرت عیسیٰ کی مثال

شروع میں مطالبہ انصار اللہ ہونے کا ہے بعد میں حواریوں کے جواب میں انصار اللہ کی لفظ ہے مگر بیچ میں جناب عیسیٰ کے جو الفاظ ہیں، ان میں انصار الی اللہ ہے اس کا مفہوم قبل اور بعد سے مختلف تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے جو ترجمہ کیا ہے اس کے لحاظ سے قبل اور بعد میں ”جو اللہ کے مدد کی لفظیں ہیں، یہ درمیان کی تعبیر ان کی تشریح ہے یعنی آدمی براہ راست اللہ کی مدد کیا کریں گے؟! اللہ کی مدد کرنے کے معنی یہی ہیں کہ وہ انسان جو اس کی راہ میں یعنی اس کے مقصد میں گامزن ہیں ان کی مدد کی جائے۔ طبری نے اس کی جن الفاظ میں تشریح کی ہے ان کا مفہوم گنجلک ہے اور قبل اور بعد سے غیر مرتبط بھی، وہ لکھتے ہیں:۔ یعنی من انصار الی منکم الی نصرۃ اللہ لی..... (جامع البیان) مطلب یہ ہے کہ کون ہیں تم میں سے جو میرے مددگار ہوں اس منزل تک کہ اللہ کی مدد میرے شامل حال ہو۔

[1] ہی فی موضع رفع ای ولکم اخری فی العاجل مع ثواب الاخرة (ابن جریر)

# سُورَةُ الْجُمُعَةِ

## مدنیہ.....۱۱.....آیات

یہ سورہ بھی ”مسجات“ سے ہے اور چونکہ اسمیں روز جمعہ خصوصی طور پر خاص نماز کا حکم ہے اس لیے اس کا نام یہ ہوا۔ اس میں تسبیح الہی کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ کے ذمے خالق کی طرف سے جو کام ہیں، وہ بیان ہوئے ہیں جن کا اس کے قبل پہلے اور دوسرے اور چوتھے پارے میں بھی بیان ہوا تھا مگر یہاں ان کی بیان میں ایک خاص خصوصیت ہے جس کا بیان اس آیت کے ذیل میں بھی آئے گا۔

### سورہ جمعہ کے خاص خاص مضامین:

۱..... مزید خصوصیت یہ ہے کہ ان کاموں کے تذکرے کے بعد اس کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ آپ کی رسالت زمانہ مستقبل کے آنے والوں پر بھی حاوی ہے۔

۲..... اہل کتاب کو جو کتاب ملی تھی، ان کے ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کا ذکر ہے جس کے ضمن میں اس امت کو جنہیں یہ کتاب عطا ہوئی ہے، انتباہ ہے کہ تم ایسے نہ ہونا کہ اس کتاب کے ذمہ داریوں کو پورا نہ کرو۔

۳..... یہودیوں سے خطاب کر کے ان کے اس زعم کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے کہ وہ من حیث الجماعت خدا سے اپنا خاص رشتہ سمجھتے ہیں اور پھر اس کی تصدیق کا معیار تمنائے موت کو قرار دیا ہے جو اس کے پہلے سورہ بقرہ میں بھی ایک طرح آچکا ہے۔

۴..... آخر میں جمعہ کا حکم جس کے خصوصیات پر اس آیت کے تحت میں روشنی پڑے گی۔

۵..... صحابہ کے اس کردار پر سرزنش کہ وہ رسول کو چھوڑ کر تجارتی باجے کی آواز سن کر چلے جاتے ہیں۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكُ الْقَدُّوْسُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ①  
هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمَمِیْنَ رَسُوْلًا مِنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ  
وَّیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ② وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ③ وَاٰخِرِیْنَ

مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ط وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۳ ذَلِكُمْ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ

يَشَاءُ ط وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝۴

”تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، جو سلطنت کا مالک ہے، نقائص سے بری غالب آنے والا صحیح کام کرنے والا ہے، وہ ہے جس نے امین کی قوم میں ایک پیغمبر انہی میں جو ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس کے پہلے کھلی گمراہی میں تھے، اور کچھ دوسرے لوگ ان میں کے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں، اور وہ غالب آنے والا صحیح کام کرنے والا ہے۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے جسے وہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔“

پہلی آیت میں تسبیح کے ساتھ اللہ کے جتنے اوصاف اسمائے حسنیٰ کی صورت میں ہیں، وہ پہلے آتے رہے ہیں جن کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد جو آیہ بعثت ہے، اس کا مضمون اسکے پہلے قرآن مجید میں تین جگہ آیا ہے۔

پہلے پارہ اول آلہ میں دعائے حضرت ابراہیم کے ذیل میں:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط إِنَّكَ أَنْتَ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (قرہ ۵-۱۲۹)

كُنَّا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمُ

مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (بقرہ ۵-۱۵۱)

تیسرے پارہ چہارم میں (بن تنالوا) میں:-

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ

الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (آل عمران ۱۶۳)

اب یہ چوتھی جگہ وہ مضمون آیا ہے مگر یہاں اس کے محل وقوع میں خاص خصوصیت ہے۔ سورہ اوصاف الہی سے شروع ہوا۔ کائنات سب مصروف تسبیح ہے اللہ کے لیے، کون ہے، جو ملک یعنی سلطنت کا حقیقی مالک ہے۔ قدوس یعنی تمام عیوب و نقائص سے بری عزیز ہے اور حکیم ہے۔ اب انہی اوصاف الہی میں کہاں جا رہا ہے کہ وہ وہ ہے جس نے امین میں ایسا رسول بھیجا، یعنی رسول کا تعارف یہ کہہ کر نہیں کرایا جاتا کہ وہ وہ ہے جسے اللہ نے بھیجا بلکہ اللہ کا تعارف کرایا جاتا ہے یہ کہہ کر کہ اللہ وہ ہے جس نے ایسا رسول بھیجا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ رسول اس شان کا ہے جسے دیکھ کر عظمت الہی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان کاموں کی فہرست پیش کی گئی ہے جو خالق کی طرف سے آپ کے ذمے ہیں جن کا ذکر اوصاف امتیازی کے طور پر پہلے

تین جگہ آچکا ہے۔



”اگرچہ وہ اس کے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ یہ فقرہ پہلے کی تیسری آیت میں بھی تھا جس میں قبل اسلام دور جاہلیت کی پوری تاریخ مضمون ہے کہ دنیا کی کیا حالت تھی اور پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت سے ان میں کیا انقلاب ہوا۔

آخر کا فقرہ جو اس جگہ خصوصیت کے ساتھ ہے: وَالْآخِرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ اس سے ہمارے پیغمبر کی رسالت کے عموم زمانی کا استفادہ ہوتا ہے کہ آپ کی رسالت اسی نسل میں محدود نہیں ہے بلکہ بعد میں جتنے آئیں، وہ سب آپ کے دائرہ رسالت میں ہیں۔

### پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی رسالت

اب چونکہ واقعہ یہ ہے کہ بعد کے آنے والے قوم عرب میں محدود نہیں ہیں بلکہ اور بھی قومیں ہیں، اس لیے مفسرین نے اس کی تشریح میں قوم و نژاد کی ہمہ گیری پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کے لیے مفسر طبری نے کئی روایات تو ایسے درج کیے ہیں جن میں صراحت ہے کہ اس سے عجم مراد ہیں اور چونکہ اصطلاحاً جتنے غیر عرب ہیں، سب ہی عجم ہیں، اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمام اقوام عالم کے لیے آپ کی رسالت ہے اور دوسرا قول صاف صاف یہ ہے کہ:-

عنى بذلك جميع من دخل فى الاسلام من بعدى النبى ﷺ كائنا من كان الى يوم القيامة (جامع البيان)  
اس سے مراد تمام وہ ہیں جو رسول خدا ﷺ کے بعد سے اسلام داخل ہوئے چاہے جو بھی ہوں قیامت تک۔  
یہ اگرچہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس کے لیے قرآن مجید میں بہت بلند آہنگ کے ساتھ اعلان ہے کہ: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ (سبا- ۲۸) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام انسانوں کے لیے کافی و وافی رہبر مگر زیر تحریر آیت میں آخرین کے ساتھ جو منہم کی لفظ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ انہی امین میں سے اور لوگ، اس کے بعد اس آیت سے مذکورہ ہمہ گیری کا استفادہ مشکل ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ط  
بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ  
الظَّالِمِينَ ۝

”مثال ان کی جن پر توریت (کی ذمہ داری) کا بار ڈالا گیا، پھر وہ اسے اٹھانے سے گریز کر کے گدھے کے لیے جو بہت سی کتابیں اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہو کتنی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی کتاب کو اور اللہ منزل مقصد تک نہیں پہنچاتا ظالم لوگوں کو“

”بار ڈالا گیا“ یعنی توریت ان کی ہدایت کے لیے اتاری گئی، اب ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس پر عمل کریں مگر انہوں نے اس ذمہ داری کو پورا نہیں کیا یعنی اس پر عمل نہیں کیا، پھر یہ کہ اس کے بعد جن اللہ کے پیغمبروں پر ایمان لانا چاہیے تھا، ان پر ایمان نہیں لائے، جب کہ یہ پیغمبر اس توریت کی تصدیق کرنے والے تھے اسے رد کرنے والے نہ تھے تو جب کہ انہوں نے اس توریت پر جس کے وہ حامل بنائے گئے تھے عمل نہیں کیا تو ان کی مثال اس گدھے کی سی ہوگئی جس پر کتابوں بوجھالدا ہوا ہو مگر اس سے فائدہ کچھ بھی نہیں اٹھاتا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ  
فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ⑥ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيَهُمْ ⑦  
وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ④ قُلْ إِنْ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلْقِيكُمْ  
ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنذِرُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ⑧

”اے یہودی مذہب رکھنے والو! اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے خاص لگاؤ رکھتے ہو تو موت کی آرزو مند ہو اگر تم سچے ہو اور وہ اس کے کبھی آرزو مند نہیں ہونگے ان اعمال کی وجہ سے جو پہلے وہ کرتے رہے اور وہ اس کے کبھی آرزو مند نہیں ہوں گے ان اعمال کی وجہ سے جو پہلے وہ کرتے رہے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے کہیے کہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، وہ بہر حال تم تک پہنچے گی، پھر تم پلٹا جاؤ گے اس کی طرف جو ان دیکھی اور دیکھی سب باتوں کا جاننے والا ہے، تو وہ تمہیں بتائے گا ان اعمال کو جو تم کرتے تھے۔“

شروع کا خطاب مسلمان جماعت یہود سے ہے لیکن خطاب ”یہود“ کی لفظ کے ساتھ نہیں کیا گیا ہے بلکہ قرآن نے یہودی جماعت کے لیے پہلے بھی کئی جگہ، الذین ہادوا کی لفظ استعمال کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی کے نام کو جو ایک ”نژاد“ کا پتا دیتا ہے ایک مذہبی جماعت کے شایان شان لفظ کے ساتھ جو اللہ سے لوگانے کا اظہار کرتی ہے۔ [۱]

تبدیل کر کے صرف حروف کی ساخت کی مشابہت سے ذہن کو ان کی جماعتی نام ”یہود“ کی طرف منتقل کیا ہے۔ غالباً اصل بنیاد اس لفظ کے استعمال کی یہی تھی جس کے بعد اس نے ایک وضع شاذی کی حیثیت اختیار کر لی اور معنی ہی اس لفظ کے ہو گئے کہ یہودی مذہب اختیار کیا [۲] چونکہ جماعت یہود کا دعویٰ تھا جو پہلے قرآن مجید میں بیان ہو چکا ہے کہ:۔ (ماندہ-۱۸) نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ: ہم اللہ کے بیٹے اور اس سے خاص محبت کا رشتہ رکھنے والے ہیں۔ اس لیے ان سے کہا گیا ہے کہ اگر ایسا ہے تو موت سے ڈرتے کیوں ہو؟ اس کا آرزو مند ہو کیوں کہ لقمے محبوب سے بڑھ کر خوش آئند بات اور کیا ہو سکتی ہے اور وہاں تمہیں بخیاں خود کوئی کھٹکا بھی نہیں ہے۔ اس دنیا کے جھگڑوں بکھیڑوں اور مصائب و آلام سے چھوٹ کر بہشت عنبر سرشت کی نعمتیں ہیں تو پھر اس کا ڈر کیسا؟

اور اس کے بعد کہا گیا کہ یہ تو مشرکین یعنی آخرت کا تصور نہ رکھنے والے بت پرستوں سے بھی زیادہ دنیاوی زندگی پر جان دیتے ہیں اور ہر ایک کی آرزو ہے کہ وہ ایک ہزار برس اس دنیا میں رہے۔ اب اگر مسلمانوں میں بھی یہی بات ہو جائے تو وہ تمام سرزنشیں جو جماعت یہود کو کی گئی ہیں۔ ان مسلمانوں کے بھی حسب حال ہوں گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ

[۱] قال موسیٰ انادینا الیک (ابن جریر)

[۲] ہو د داخل شدن بدین یہودیت است گویند ہادو یہود یعنی بدین یہودیت داخل شد (قاموس قرآن)

وَذَرُوا الْبَيْعَ ۗ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٩﴾ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ  
فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ  
تُفْلِحُونَ ﴿١٠﴾

”اے ایمان لانے والو! جب پکارا جائے جمعہ کے دن والی نماز کے لیے تو دوڑ پڑو ذکر خدا کی طرف اور خرید و فروخت چھوڑ دو، وہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو، تو جب نماز ختم ہو جائے تو ادھر ادھر جاؤ اور اللہ کے فضل و کرم سے طلب معاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، شاید کہ تم دین اور دنیا کی بہتری حاصل کرو“۔

### جمعہ کی نماز کا حکم

اس میں پہلے نماز جمعہ کا حکم قرآن نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ جب جمعہ کی نماز کے لیے پکارا جائے یعنی نماز جمعہ قائم ہو تو ذکر الہی یعنی نماز کے لیے دوڑ پڑو مگر اس حیثیت سے اس حکم میں اجمال ہے کہ اس نماز کے قیام کے شرائط کیا ہیں؟ یعنی کن صورتوں میں اس نماز کا قائم کرنا لازم ہے اور اس کے لزوم کی کیا نوعیت ہے؟ اس کی تفصیل قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے۔ احادیث میں ہے اور ان سے نتائج کے برآمد کرنے میں علماء کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔

اہل سنت چونکہ رسولؐ کے بعد کسی امام معصوم کے قائل نہیں ہیں لہذا ان کے یہاں بعد پیغمبر خدا ہر آدمی جس طرح عام نماز کا امام ہو سکتا ہے، اسی طرح جمعہ کی نماز ہر امام کے پیچھے ہر مسجد میں ہو سکتی ہے مگر شیعہ بعد رسولؐ چونکہ اصل جانشین رسولؐ کا انہی اماموں کو جانتے ہیں جو اللہ کی طرف سے مقرر تھے لہذا بہت سے انہم منصب رسولؐ کے ان نزدیک ان آئمہ کے لیے جس نوعیت کے ساتھ ثابت ہیں اس طرح دوسرے لوگوں کے لیے ثابت نہیں ہیں، اس ثابت نہیں ہیں لہذا اکثر علمائے شیعہ کے نزدیک احادیث معصومینؑ کی بنا پر قرآن مجید کے یہ احکام جو نماز جمعہ کے لیے ہیں اس شکل میں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھانے کی صورت میں تھے وہ اس وقت ہیں جب ان کے وہ جانشین یعنی ایسے معصومین علیہم السلام ایسا موقع پاتے کہ نماز جمعہ کی امامت فرمائیں۔ باقی غیبت امام میں مختلف اقوال ہیں جن کے لیے ان رسائل عملیہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو مجتہدین کی طرف سے ان کے مقلدین کے لیے شائع ہوتے ہیں۔

اب یہ کہ جب نماز جمعہ کی اذان ہو جائے تو دوڑ پڑو، اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت پر حاضری میں تاخیر نہ ہونے پائے۔ لہذا گھر اگر مسجد کے قریب ہے ایسا کہ بغیر دوڑے پہنچ جائے گا یا پہلے سے مسجد میں موجود ہے اور اس کے سامنے اذان ہوئی تو بلا وجہ خاص اس حکم کی تعمیل کے لیے دوڑنا مقصود نہیں ہے، بس مطلب یہ ہے کہ وقت پر نماز میں حاضر ہو تو در صورت شرائط و وجوب یہ حکم و جوبی ہے وَذَرُوا الْبَيْعَ یعنی خرید و فروخت چھوڑو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب خرید و فروخت حرام ہیں اور یہ تحریم بھی انہی شرائط کے ساتھ ہیں جن میں نماز میں شرکت واجب ہے۔ مگر اس کے بعد تیسرا حکم کہ جب نماز ختم ہو جائے تو ادھر ادھر منتشر ہو جاؤ، یہ صورتہ حکم ہے لیکن مراد اس سے اجازت ہے۔

چونکہ یہ عام اصول ہے کہ ممانعت کے بعد جو صیغہ امر آئے وہ صرف پابندی کے ختم ہونے کا اظہار کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ نہ کہ اس سے کوئی پابندی عائد کرنا منظور ہو۔ اس لیے یہ حکم صرف جواز کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور چونکہ ممانعت خرید و فروخت سے ہوئی تھی لہذا اب اس

کے مقابلے میں یہ ہے کہ خدا کے فضل و کرم کے امیدوار ہونے کے لیے یعنی طلب معاش کے لیے جاؤ۔ اب یہ جانے کی اجازت بھی طلب معاش ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس جائز کام کے لیے جانا چاہتے ہو جاؤ۔ اب کوئی ممانعت نہیں ہے،

**وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۗ قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ  
مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۗ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّزُقِينَ ۝۱۱**

”اور جب وہ دیکھتے ہیں کوئی تجارت یا باجا جاگا تو منتشر ہو جاتے ہیں اس کی طرف اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہیے کہ جو اللہ کے یہاں ہے، وہ اس باجے گا جے، اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق پہنچانے والا ہے۔“  
واقعہ یہ تھا کہ جیسا کہ طبری نے بھی اس کے متعلق متعدد روایات نقل کیے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نماز جمعہ کا خطبہ شروع فرما چکے تھے کہ باجے کی آواز آئی اور یہ علامت تھی اس کی کہ تجارتی قافلہ شام سے مال تجارت لے کر آیا ہے، بس اس کی آواز سننا تھی کہ صحابہ اٹھ اٹھ کر جانے لگے، یہاں تک کہ پیغمبر خدا کے سامنے صرف بارہ (۱۲) آدمی رہ گئے۔ کئی حدیثوں میں ہے کہ حضرت نے فرمایا اگر یہ اتنے آدمی نہ رہ جاتے تو فوراً عذاب الہی کے طور پر آگ کے شعلے بھڑکنے لگتے۔ [۱]

[۱] لا التہب علیکم الوادی بأراً (ابن جریر)

# سُورَةُ الْمُنَافِقُونَ

مدنیہ.....۱۱.....آیات

کھلے ہوئے کافر اسلام کے لیے اتنے ضرر رساں اور خطرناک نہیں تھے، جتنے وہ جو ظاہر میں مسلمان ہو گئے تھے لیکن دل سے کافر تھے۔ ان کا نام اصطلاح قرآن میں ”منافقون“ ہوتا ہے اور ان کا ذکر قرآن میں اس نام کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے اوصاف کے ساتھ سورہ بقرہ کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا اور جابجا ان کا ذکر کہیں صرف اوصاف کے ساتھ کہیں لفظ ”منافقون“ یا ”المنافقین“ کے ساتھ بار بار ہوتا رہا اور اب یہ پورا سورہ ان کے نام پر اتنا ردیا گیا جس میں ان کے اوصاف اور علامات بھی ہیں اور ان کی باتوں کا جواب بھی“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ

لَرَسُولُهُ ۗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكٰذِبُونَ ﴿۱﴾

”جب منافقین لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ آپ ضرور اس کے پیغمبر ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔“

ایک علمی بحث صدق و کذب کی تعریف میں ہے کہ بعض نے خبر دینے والے کے اعتقاد کے موافق ہونے کا اعتبار بھی صدق میں کیا ہے یعنی اگر بات اپنی جگہ حقیقت کے مطابق ہے لیکن وہ کہنے والے کے اعتقاد کے خلاف ہے تو وہ جھوٹ میں داخل ہیں اور اس کے ثبوت میں اس آیت کو پیش کیا ہے مگر یہ آیت اس کی دلیل نہیں ہے اس لیے کہ اصل ان کا جملہ جس کی خبر انہوں نے دی یہ نہیں تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں بلکہ اصل جملہ یہ تھا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور گواہی کے معنی اعتقاد کے باب میں ہوتے ہیں اس بات پر اپنے ایمان کا اظہار مگر وہ لوگ جب یہ کہہ رہے تھے تو حقیقت میں انہیں ایمان اس کا نہیں تھا لہذا یہ اظہار کہ ہم گواہی دیتے ہیں خلاف واقعہ تھا اس بنا پر خالق نے انہیں جھوٹا کہا ہے کہ وہ بات واقعہ کے خلاف ہے نہ یہ کہ چونکہ ان کے اعتقاد کے خلاف تھی۔ اس لیے انہیں جھوٹا کہا اور بیچ کا جملہ ہمارے نزدیک خالق کی طرف سے اسی اظہار کے لیے ہے کہ جس بات کی گواہی وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم دے رہے ہیں، وہ بات تو بالکل صحیح ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ آپ اُس کے رسول ہیں مگر یہ جو اپنے لئے کہتے ہیں کہ ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، یہ اظہار غلط ہے اس لئے اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ منافقین جھوٹے ہیں۔

بعض لوگوں نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ بیچ کا جملہ بھی انہی کا ہے، مگر ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ان کے کلام

کیا جز نہیں ہے۔

ایک تصویر یہ ہے کہ کذب کی دو قسمیں ہیں: کذب خبری اور کذب مخبری۔ جب بات جو کہی گئی ہے حقیقت کے مطابق نہ ہو تو وہ خبر کا جھوٹا ہونا ہے اور اگر کہنے والے کے نقطہ نظر سے وہ بات درست نہ ہو چاہے وہ خبر سچی ہو، مگر یہ خبر دینے والا جھوٹا ہے۔ اب بیچ کا جملہ جو کلام الہی میں ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسولؐ ہیں، یہ خبر کی سچائی کا اظہار ہے اور آخر میں جو یہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، وہ خبر دینے والوں کو غلط گو ہونے کا اظہار ہے۔

چونکہ بعد میں عبداللہ بن ابی اور اس کی خاص جماعت کے آدمیوں کی گفتگو ہے لہذا اس پورے سورے کو انہی کے بارے میں سمجھا گیا ہے مگر مورد نزول وہی افراد ہوں، تب بھی جو اوصاف منافقین کے بیان کیے گئے ہیں، عام طور پر ایسے دورنگ افراد میں پائے جاتے ہیں جن میں شخص یا اشخاص خاص کی خصوصیت نہیں ہے۔

إِتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲﴾

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۳﴾

”انہوں نے اپنی قسموں کو سپر بنایا ہے تو اللہ کے راستے سے روگردان ہو گئے ہیں، یقیناً بہت برا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ مسلمان ہوئے، پھر بھی کافر ہی رہے تو ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔“

وہ قسمیں کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہتے ہیں اس طرح اپنی حفاظت کا سامان کرتے ہیں ان خطرات سے جو ان کے دلوں کے بھید کھلنے کی صورت میں انہیں درپیش ہو سکتے ہیں اور انہیں بخیاں خود ان قسموں کے ذریعے سے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب انہیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تو وہ انہیں راستے سے جو ان کے لیے باعث نجات ہو سکتا ہے دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جس کا انجام بہر حال ہلاکت ابدی ہے لہذا کہا گیا کہ بہت برا یہ کردار ہے جو وہ خود اختیار کیے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ زبان سے اقرار ایمان کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوئے اور اندر سے کافر ہی رہے۔ جس کی وجہ سے ان پر اثر ہدایت ربانی کا جو رسولؐ کے ذریعے سے پہنچتی ہے نہیں ہوتا۔ اس تاثر کے ختم ہونے کو مہر سے تعبیر کیا ہے اور ہر جگہ کی طرح یہاں بھی اس مہر لگنے کو ان کے سوا اختیار کا نتیجہ قرار دیا ہے، نہ کہ اس کا سبب جس سے جبر کا تصور پیدا ہو۔

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۗ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعُ لِقَوْلِهِمْ ۗ كَأَنَّهِمْ

حُشْبٌ مِّنْ سِنْدَةٍ ۗ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۗ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۗ

فَاتْلُهُمْ اللَّهُ ۗ إِنِّي يُوَفِّكُونَ ﴿۴﴾

”اور جب انہیں دیکھے گا تو ان کی جسمانی شکلیں صورتیں آپ کو بہت خوشنما معلوم ہوگی اور اگر بات کریں گے تو ان کی گفتگو سننے کے قابل محسوس ہوگی (مگر اندر سے وہ ایسے ہیں) جیسے اڑانے لگاتی ہوئی لکڑیاں ہوتی ہیں۔ جو زور سے آواز سنائی دے، ہر دفعہ سمجھیں گے اُن کے خلاف ہے۔ یہ ہیں خاص دشمن۔ ان سے ڈرتے رہیے۔ اللہ

انہیں غارت کرے، کہاں یہ بھٹکے پھرتے ہیں۔“

یہ لوگ صورتِ شکل سے بہت دیدہ زیب اور شاندار نظر آتے ہیں اور باتیں بھی شیریں کلامی سے کرتے ہیں، گفتگو ایسی دل آویز ہوتی ہے کہ ان کی باتوں میں آدمی کا دل لگتا ہے مگر اندر سے ان میں ایمانی زندگی کا نام و نشان نہیں ہے جیسے وہ لکڑی جو اڑانے لگا کر کھڑی کی جائے کہ حیاتِ نباتی بھی اس کی رخصت ہو چکی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ان میں نفسیاتی کمزوری پائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے چور کی داڑھی میں تنکا جو زور زور کی آواز آئے، کیا مطلب؟ یعنی کوئی آیت ایسی جس کے الفاظ سخت ہوں اور تہدید کی انداز رکھتی ہو، بس ان کا دل دھرنے لگتا ہے کہ کہیں ہمارے ہی خلاف کسی سخت کارروائی کرنے کا حکم نہ ہو، چونکہ ان کا ضمیر اپنے کو اس لائق جانتا ہے کہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد رسولؐ کو صاف الفاظ میں ہوشیار کیا گیا ہے کہ کھلے ہوئے کافر ایسے خطرناک دشمن نہیں ہے جتنے یہ منافق قسم کے لوگ۔ اب ختم آیت میں ان پر نفرین ہے جیسے انہیں غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے جو اس قسم کی نفرینوں کو شائستگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّارُءٌ وَسَهُمٌ ۖ وَرَأَيْتَهُمْ  
يَصُدُّونَ ۖ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۖ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ

تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۖ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمہارے لیے پیغمبر خدا دعائے مغفرت کر دیں تو وہ اپنے سر گھماتے ہیں برابر ہے ان کے لیے آپ طلب مغفرت کیجیے ان کے لیے یا طلب مغفرت نہ کیجیے، اللہ ہرگز نہیں بخشنے گا۔ یقیناً اللہ منزل تک نہیں پہنچاتا انہیں جو ایسے بد کردار ہوں۔“

جب ان کے کسی قول عملی جرم کا کچھ مسلمانوں یا کسی مسلمان پر انکشاف ہو جاتا ہے تو یہ ان سے کہتے ہیں کہ ارے، اب بھی غنیمت ہے۔ رسولؐ کے پاس جا کر اپنے لیے بارگاہِ الہی میں استغفار کرا لو۔ یہ سن کر وہ طنزیہ طور پر سروں کو حرکت دیتے ہیں اور اسے جیسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

اللہ جو ان کے دلوں کے رازوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے کہ آپ اپنے منہ صبی فریضہ کی بنا پر کہ آپ کو ظاہر پر نگاہ رکھنا چاہیے ایک مسلمان کے دعائے مغفرت کی خواہش پر دعائے مغفرت کر بھی دیجیے تو اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشنے گا۔

ایک جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر ستر دفعہ بھی آپ استغفار کیجیے تو اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتّٰی يَنْفَضُوا ۗ وَ لِلّٰهِ  
خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنْفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝  
رَجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لِيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذْلَّ ۗ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ

## وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٨﴾

”وہی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ روپیہ پیسہ نہ دو ان لوگوں کو جو رسول خدا کے پاس ہیں تاکہ یہ لوگ منتشر ہو جائیں حالانکہ اللہ کے لیے خزانے ہیں آسمانوں اور زمین کے مگر منافق لوگ سمجھتے نہیں کہتے ہیں کہ ہم لوگ مدینے واپس ہوئے تو جو ہم میں غلبہ و عزت والا ہے، وہ ذلت و عاجزی والے کو نکال باہر کرے گا حالانکہ عزت اللہ اور اس کے پیغمبر کے لیے ہے اور ایمان والوں کے لیے مگر منافق لوگ جانتے نہیں۔“

یہ اس سورے کی مرکزی آیتیں ہیں جو ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ایک غزوے سے واپسی میں ایک کنویں پر پانی بھرنے میں ایک انصاری اور ایک مہاجر کے درمیان جھگڑا ہو گیا جن میں انصاری کو چوٹ آگئی۔

عبداللہ بن ابی جو مدینہ کے منافقین کا سرغنہ تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں آنے سے پہلے مدینہ کی بادشاہت کا خواب دیکھ رہا تھا بلکہ تاج تک اس کے لیے بن گیا تھا۔ رسول کے مدینہ میں آنے کے بعد اس نے ہوا کے رخ کو دیکھ کر اسلام قبول تو کر لیا مگر دل سے اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن رہا۔ اسے اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے انصار کو مخاطب کر کے بڑی مفسدانہ تقریر کر ڈالی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ”تم نے ان پر دیسیوں کو اپنے سر پر مسلط کیا، یہ تمہارے کیے کی سزا ہے۔ اب بھی تم اپنا ہاتھ روک لو، اور ان کی مالی مدد نہ کرو تو یہ فاتے مرنے لگیں اور ادھر ادھر منتشر ہو جائیں اور پھر کہا کہ بس اب کی مدینے پہنچیں، تو پھر دیکھنا جو عزت والا ہے (یعنی وہ خود) وہ اس کو جو ذلت والا ہے (یعنی معاذ اللہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم) شہر سے نکال دے گا۔ یہ الفاظ زید بن ارقم نے سنے جو اس وقت کم عمر تھے یعنی تازہ تازہ بلوغ کی سرحد تک پہنچے تھے، تو ان کی حمیت ایمانی کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئے تو انہوں نے اسی وقت اس کے خلاف برہمی کا اظہار کیا اور پھر آ کر اپنے ایک بزرگ کے ذریعہ سے ان الفاظ کی اطلاع رسول تک پہنچائی۔ حضرت نے بلا واسطہ بواسطہ عبداللہ بن ابی سے ان باتوں کے متعلق دریافت کیا تو وہ قسمیں کھانے لگا کہ یہ سب بالکل غلط ہے۔ حضرت نے بظاہر انتظار جوی میں خاموشی اختیار فرمائی۔ لوگوں نے ایسا محسوس کیا ہوگا کہ آپ نے اس کے انکار کو تسلیم کر لیا اور زید کی بات کو غلط سمجھا اس پر عبداللہ کے ہوا خواہ اور مؤند کچھ دوسرے سادہ لوح مسلمان بھی زید کو سخت سست کہنے لگے کہ تم نے ایسی غلطی کیوں کہی؟ اس بیچارے کو اس سے بڑا سخت صدمہ ہوا، یہاں تک کہ گھر سے نکلنا موقوف کر دیا۔ اس پر یہ سورہ نازل ہو اور مذکورہ آیتوں میں ان باتوں کو جو عبداللہ بن ابی کی زبانی زید نے آ کر کہی تھی، انہی لفظوں میں دہرایا گیا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو بلا کر وہ آیتیں سنائیں اور فرمایا اب تو خوش ہو؟ تمہاری پہنچائی ہوئی خبر کی خداوند عالم نے من و عن تصدیق کی ہے۔

گزشتہ آیت میں جو طلب استغفار کا ذکر تھا اسے بھی عبداللہ بن ابی سے متعلق قرار دیا گیا ہے کہ کسی نے اس سے کہا کہ جا کر رسول اللہ سے دعائے مغفرت کر لو، اس پر اس نے سر کو انکاری طور پر گھمایا اور کہا تم لوگوں نے کہا کہ اسلام لے آؤ۔ میں لے آیا، پھر کہا زکوٰۃ دیا کرو میں زکوٰۃ بھی دینے لگا۔ اب کیا میں جا کر ان کے قدموں میں سجدے میں گر جاؤں؟

عبداللہ بن ابی کی سابق مفسدانہ تقریر میں جو دو جملے تھے، ان دونوں کو نقل کرتے ہوئے ہر جملے کے بعد اس کو جواب دیا ہے۔ پہلا جملہ کہ انھیں تم نہ دو تو یہ فاتوں مرنے لگیں، اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی انسان ذاتاً مال و دولت پر اختیار نہیں رکھتا۔ ذرائع رزق اللہ کے ہاتھ



میں ہے، لہذا کسی کو یہ گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہاتھ روک لیں تو لازماً یہ فاقوں مرنے لگے گا۔ اور دوسری بات کو جو صاحب عزت ہے وہ دوسرے کو جس کے حصے میں ذلت ہے نکال باہر کریگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عزت اور ذلت دنیا کی نگاہ والی کوئی چیز نہیں ہے کافر و منافق کتنا ہی دولت مند ہو، کتنا ہی بخیال خود صاحب اثر ہو، اصل عزت کا مالک نہیں ہے، حقیقی عزت مخصوص ہے اللہ سے اور اس کے پیغمبر سے اور ایمان والوں سے، تو جو ایمان سے محروم ہیں، وہ عزت سے بھی محروم ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۗ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٩﴾ وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِمَّنْ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَّ أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ فَأَصَدِّقْ وَأَكُنْ مِنَ الصَّٰلِحِينَ ﴿١٥﴾ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

”اے ایمان دارو تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کرے اور جو ایسا کرے گا تو وہی لوگ گھائے میں رہیں گے (بحوالہ ترجمہ علامہ سید فرمان علی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ) اور خیرات کرو اس سے جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے تو وہ کہے کہ اے میرے پروردگار! کیوں نہ تو نے مجھے مہلت دی اور تھوڑی سی مدت تک کہ میں خیرات کرتا اور نیکو کاروں میں سے ہوتا۔ اور ہرگز اللہ مہلت نہیں دے گا کسی کو جب اس کی عمر پوری ہو جائے اور اللہ جانتا ہے اسے جو وہ کرتے ہیں۔“

اب یہ جیسے ان کی باتوں سے قطع نظر کر کے سچے مسلمانوں سے خطاب ہے ﴿١٦﴾ کہ ان کو جو یہ کہتے ہیں، وہ کہنے دو، تم سنو کہ جتنی مدت حیات ہے اسے غنیمت سمجھو اور جتنا اللہ نے دیا ہے اس میں سے راہ خدا میں صرف کرو، ورنہ جب وقت گزر جائیگا تو افسوس ہوگا کہ ارے عمر جلد ہی ختم ہوگئی اور پھر اس افسوس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

﴿١٦﴾ - انفقوا ایہا المؤمنون باللہ ورسولہ (ابن جریر)

# سُورَةُ التَّغَابُنِ

مدنیہ..... ۱۸..... آیات

قیامت کے لیے اس سورے میں یوم التغابن کی لفظ صرف کی گئی ہے۔ اسی لفظ پر اس سورے کو نام ہوا۔

**سورۃ تغابن کے خاص خاص مضامین:**

- ۱..... منزل تخلیق میں سب کی یکسانی، پھر مومن اور کافر کا فرق۔
- ۲..... تمام کائنات کا صحیح طور پر با مقصد پیدا ہونا اور اُس کی طرف سے جسمانی صورتوں کا مختلف ہونا۔
- ۳..... علم الہی کا حاوی ہونا۔
- ۴..... پہلے والوں کے انجام کی یاد دہانی۔
- ۵..... اللہ اور رسول اور اس نور پر جو ان کے ساتھ ہے، ایمان لانے کی دعوت۔
- ۶..... قیامت کے دن سب اکٹھا ہوں گے دنیا والی اپنی زندگی کے لحاظ سے کوئی فائدہ اٹھائے گا اور کوئی نقصان۔ اسی کو تغابن کی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔
- ۷..... بعض بیویاں اور اولاد انسان کے دشمن ہوتے ہیں۔ اس معنی سے کہ غلط راستے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ ان سے ڈرتے رہنا چاہیے۔
- ۸..... اموال اور اولاد کا فتنہ یعنی ذریعہ آزمائش ہونا۔
- ۹..... اللہ کو قرض حسن دینے کی دعوت جو پہلے کئی جگہ آچکی ہے۔

**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ**

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

**يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ لَهٗ الْمُلْكُ وَلَهٗ الْحَمْدُ ۗ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ**

**شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱**

”تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اسی کے لیے پورا پورا اقتدار سلطنت ہے اور اسی کے لیے ہر تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے“

ابتدائی تمہیدی جملہ تو وہی ہے جو ادھر کے تقریباً ہر سورے میں ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مدعیان سلطنت کے مقابلے میں اس کو واحد اقتدار سلطنت کا مالک ثابت کیا گیا ہے مگر جو ایسے اقتدار کا مالک ہوگا وہ اندھا دھند کام کریگا۔ اسے اس سے بحث نہیں ہوگی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ کام اچھا ہے یا برا لیکن خدا جو کرتا ہے، اچھا ہی ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

اس لیے یہ کہہ کر کہ اسی کے لیے تعریف ہے، اس کے کاموں کا حسن ثابت کیا گیا ہے۔ یہ وہی اصول عدالت ہے جسے امامیہ توحید کے ساتھ ماننا ضروری سمجھتے ہیں جو منکر عدل ہیں، وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسے عمل کا پابند بنانا اس کی شان کے خلاف ہے اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ پابندی وہ شان کے خلاف ہے جو کسی بلا دست طاقت کی طرف سے ہو لیکن قدرت کاملہ کے باوجود اپنے اختیار سے کمال حکمت کی بنا پر کوئی غلط کام نہ کرنا عین کمال ذات ہے چنانچہ اس آیت میں بھی لہ الحمد کہہ کے اس پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے کہ یہ اس کی قدرت کے نقص کا نتیجہ نہیں ہے قدرت تو اس کی ہر چیز پر ہے لیکن وہ کمال قدرت کے باوجود کرتا وہی ہے جو اس کی حکمت و عدالت کے شایان شان ہے۔

**هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲﴾**  
 ”وہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ اب تم میں سے کوئی کافر ہے اور تم میں سے کوئی مومن ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو، اس کا دیکھنے والا ہے۔“

### منزل تخلیق میں سب کی یکسانی

تخلیق کے ذکر کے بعد یہ جو کہا گیا کہ تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن۔ اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ اسی بات کو کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے، کوئی نہیں مانتا اور کوئی مانتا ہے تو یہ کفر اور ایمان اسی بات سے متعلق ہے جس کا ذکر ہوا۔<sup>[۲]</sup> دوسرا مفہوم یہ ہے کہ خالق نے تو سب کو پیدا کیا، منزل تخلیق میں سب یکساں تھے۔ اس کے بعد اپنے سوء اختیار اور حسن اختیار سے یہ تفرقہ ہو گیا کہ کوئی مومن ہے اور کوئی کافر جیسے سورہ دہر میں ارشاد ہوا:-

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (دھر-۲۰۳)  
 ہم نے انسان کو پیدا کیا ملے جلے ہوئے نطفے سے محل آزمائش میں لانے کے لیے تو اسے کان آنکھ کی طاقتیں دیں ہم نے اسے ایک خاص راستے کی طرف ہدایت کی، اب شکر گزار ہے یا ناشکر۔

تخلیق یکساں، مقصد تخلیق ابتلا و امتحان یکساں، سمیع و بصیر قرار دیا یعنی صلاحیتیں قبول ہدایت کی سب میں رکھیں پھر ہدایت بھی سب کو ایک ہی راستے کی ہوئی، اب اس کے بعد جہاں سے اپنے اختیار کی منزل آئی، کوئی شکر گزار یعنی مومن ہے اور کوئی ناشکر کافر۔ اور اب اختیار کا قدم درمیان میں آنے کے بعد جزا و سزا کی تفریق ہے جس پر آخری جملے سے متنبہ کیا گیا ہے۔

**خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۗ وَالْيَهُ**

[۱] لان جمیع رحمت فی الخلد من الخلق لا یعرفون الخیر لامنه (مجمع البیان)

[۲] فمنکم کافر بخالقه موو منکم مومن (ابن جریر)

الْمَصِيرُ ۝ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

”اس نے آسمانوں اور زمین کو حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تمہاری صورت گری کی تو بہت اچھی صورتیں بنائیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو ہے وہ اسے جانتا ہے اور جانتا ہے اسے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور اللہ سینوں کے اندر کی چیزوں کا جاننے والا ہے“

”حقانیت کے ساتھ“ یعنی نہ تو بے فائدہ اور نہ غلط طور پر اے (بالعدل والانصاف..... ابن جریر) یہ دونوں باتیں مقتضائے حکمت کے خلاف ہیں جیسے ایک جگہ منفی طور پر کہا گیا ہے:-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (ص-۲۴)

ہم نے آسمان اور زمین کو باطل طور پر پیدا نہیں کیا۔ جس کی ”وہاں باطل کہہ کرنی کی گئی ہے، اسی کے مقابل جو پہلو ہے اس کا یہاں بالحق کہہ کر اثبات کیا گیا ہے۔

خالق عالم کا تصور پیدا کر کے انجام کو یاد دلایا گیا ہے کہ اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور پھر اس کے علم کی وسعت کو دکھا کر ہر ایک کو اس کے پوشیدہ اعمال کے محاسبے کا اندیشہ پیدا کیا گیا ہے۔

الْمَ يَأْتِكُمْ نَبُوءُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

أَلِيمٌ ۝ ذَلِكِ بَأْنَهُ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ

يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوْا وَاسْتَغْنَى اللَّهُ ۝ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝

”کیا تمہیں خبر نہیں پہنچی ان لوگوں کی جنہوں نے کفر اختیار کیا اس سے پہلے تو انہوں نے چکھا اپنے معاملے کا خمیازہ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کے پیغمبران کے پاس آتے تھے کھلی ہوئی دلیلیں لے کر تو انہوں نے کہا کیا کچھ آدمی ایسے ہیں جو ہماری ہدایت کریں تو انہوں نے کفر اختیار کیا اور روگردانی کی اور اللہ کو کوئی ضرورت نہ تھی اور اللہ بے نیاز ہے، قابل تعریف“۔

ہمیشہ کفار و مشرکین انبیاء و مرسلین کے خلاف بات پیش کرتے رہے کہ یہ تو انسان ہیں، خدا بھلا کسی انسان کو اپنی طرف سے رہنما کیوں مقرر کرنے لگا؟! وہی بات ان سے پہلے والوں کی زبانی یہاں یاد دلائی گئی ہے کہ کیا کچھ بشر ایسے ہو سکتے ہیں جو ہماری ہدایت کریں؟

بعض جگہ تو اس کے جواب اطمینان بخش پیرائے میں دیا گیا ہے کہ واقعی شبہہ ذہن میں ہے تو دور ہو جائے لیکن یہاں اس کا جواب ایسا دیا گیا ہے کہ جیسے یہ کہنا صرف ایک بہانہ ہے کفر اختیار کریں لہذا یہاں یوں کہا جا رہا ہے کہ ان کا ہی کرتے رہیں گے۔ اچھا تو پھر یہ شوق سے کفر اختیار کریں۔ اللہ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ بے نیاز ہے۔ اسے تو صحیح طریقہ کار ہے، وہی اختیار کرنا ہے۔

زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا ۗ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ

بِمَا عَمِلْتُمْ ۗ وَذَلِكَ عَلَىٰ اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٤﴾

”وہ جو کافر ہیں، ان کا خیال ہے کہ ہرگز دوبارہ زندہ نہیں ہونگے، کہیے کہ کیوں نہیں قسم میرے پروردگار کی، تم لوگ دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے، پھر تمہیں بتایا جائے گا جو تم نے کیا ہوگا، اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔“  
قبل سے تمہیداسی کی تھی جو بعد موت کے منکر ہیں، انہیں اس کا احساس پیدا کیا جائے یہاں چونکہ ان کی کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی ہے تاکہ اس کا جواب دیا جائے۔ نہ کوئی ان کا اعتراض ہے جسے رد کیا جائے بلکہ ان کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا جس کی بنیاد علمی پر ہے لہذا اس کے مقابلے میں جیسے خبر دینے والے کی سچائی کے پس منظر میں جس کا انہیں اس کے پہلے اقرار رہا ہے پورے طور پر حتم و جزم کی صورت میں قسم اور لام دونوں تاکید کے ساتھ اطلاع دینے پر کہ ایسا ضرور ہوگا اکتفاء کی گئی۔ آخر میں ذرا ذہن کو قدرت الہی کی طرف موڑا ہے کہ یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

فَأْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٥﴾

”تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبر پر اور اس نور پر جو ہم نے اتارا ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو باخبر ہے۔“  
”اس نور“ سے مراد عام طور پر قرآن لیا گیا ہے [۱] مگر ایسا یقینی طور پر متعین نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد تمام و کمال وہ دین و شریعت ہو جو آپ کے ذریعہ سے منجانب اللہ آئی ہو۔ خواہ وہ بصورت قرآن ظاہر ہو یا دوسری طرح آپ کے اقوال و اعمال سے۔ ہاں ایک پہلو یہ ہے کہ چونکہ سیاق کلام یقیناً یہ ہے کہ اس صیغہ امر (آمنو) کا روئے خطاب مشرکین ہی کی طرف ہے جو خدا و رسول سب ہی کے منکر تھے، ان کے مقابلہ میں جس چیز کو بطور تہدی پیش کیا گیا ہے اور جسے بطور معجزہ رسول سامنے لایا گیا ہے، وہ قرآن ہے لہذا ان کو دعوت رسول کی رسالت کے ساتھ ساتھ قرآن ہی پر ایمان کی دعوت دیے جانے کا محل تھا کہ جب رسول پر ایمان لے آئیں گے اور قرآن کو منجانب اللہ مان لیں گے تو دوسری چیزیں سامنے آئیں گے جو آپ کی زبان مبارک یا سیرت مبارک سے ان کے سامنے پیش ہوں گی۔ لہذا یہ سمجھنا درست معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نور سے مراد قرآن مجید ہی ہے جس پر ایمان کی انہیں دعوت دی جا رہی ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكِ يَوْمِ التَّغَابُنِ ۗ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ

صَالِحًا يُكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيَدْخُلْهُ جَنَّتِ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا

أَبَدًا ۗ ذَلِكِ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ وَبئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٧﴾

”جس دن تمہیں اکٹھا کیا جائے گا اس دن کے لیے جو اکٹھا کرنے ہی کے لیے ہے، وہ دن ہوگا ایک دوسرے

[۱]۔ ہذا هو القرآن (ابن جریر)

کے مقابلے میں نقصان اٹھانے کا اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرائے، وہ اس کی معمولی غلطیوں کو نظر انداز کرے گا اور اسے داخل کرے گا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہ رہی ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہ آتش دوزخ والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بہت برا انجام ہے۔“

”غبن“ تجارت میں یہ ہوتا ہے کہ ایک معاملہ میں بہت زیادہ فائدہ اٹھالے گا تو یہ غبن کہلاتا ہے اور دوسرے نے اسی معاملہ میں نقصان اٹھایا تو مغبون کہلاتا ہے۔ اسی غبن کو جب باب تفاعل میں لے جائے تو باہم ایک دوسرے کے مقابلے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہاں کارگاہ عمل میں اگرچہ ایسا نہیں ہے کہ نیک اعمال لوگوں کا مقصد دوسروں کو نقصان پہنچانا ہو مگر چونکہ نتیجہ ہوا یہی کہ اہل بہشت کامیاب ہوئے اور اہل دوزخ خود اپنے سوء اختیار سے نتیجہ ناکامیاب ہوئے لہذا قیامت کے دن کو اس آیت میں ”یومہ التغابن“ یعنی ایک دوسرے کو معاملت میں نقصان پہنچانے کے دن سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض لوگوں نے فائدہ اٹھانے کے پہلو کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا خاص اہل دوزخ ہی سے متعلق کیا ہے۔ اس طرح کہ وہ سرغنہ لوگ جنہوں نے دوسروں کو گمراہ کیا ان کے غبن یعنی نقصان کے درپے ہوئے کہ انہیں غلط راستے پر ڈال کر مستحق دوزخ بنایا اور انہوں نے کثرت کے ساتھ ان کی پیروی کر کے ان کے استحقاق سزا میں اضافہ کیا کہ ان کے گناہوں کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوئی۔ مگر خود الفاظ آیت میں چونکہ اس کے بعد بلا فاصلہ اہل بہشت کا ذکر ہے اور ان کے انجام بخیر ہونے کا ہے۔ اور بعد میں اہل دوزخ کا ذکر ہے اور ان کے برے انجام کا لہذا یہ دوسرا مفہوم اس محل پر بعید معلوم ہوتا ہے پھر جب کہ کلام عرب میں اس لفظ یعنی باب تفاعل کے استعمال میں دو طرفہ کا پہلو نظر انداز بھی کر جاتا ہے جس کی مثال تبارک و تعالیٰ کے الفاظ ہیں اور قدیم اہل تفسیر کی تشریح یہی ہے کہ اہل جنت کو نتیجہ فائدہ حاصل ہوا اور اس لیے غابن یعنی غبن پہنچانے والے ہیں اور اہل ناکو نقصان پہنچا اس لیے وہ مغبون یعنی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

**مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ**

**شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۱﴾**

”کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کی اجازت سے اور اللہ پر جو ایمان رکھتا ہو، وہ اس کے دل کو صحیح راستہ دکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

اجازت کے یہ معنی ہیں کہ اللہ اپنی قوت قاہرہ کو صرف کر کے رکاوٹ پیدا کر دے تو سبب جو باعث مصیبت ہے تاثیر نہیں کر سکتا اب یہ رکاوٹ پیدا نہ کرنا جسے اجازت سے تعبیر کیا ہے کبھی بطور امتحان ہوتا ہے، کبھی بطور سزا ہوتا ہے اور کبھی کچھ اہم مفادات کے لیے۔ بہر حال مقتضائے ایمان یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ اللہ کی طرف سے جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ درست ہے یہی وہ صبر ہے جسے کہا گیا کہ ایمان رکھنے والوں کے دل کو اللہ صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ مگر یہ فیصلہ کہ اللہ کی طرف سے اس مصیبت کو آنا تھا پورے طور پر اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسانی قدرت و اختیار میں بظاہر اسباب جتنے عملی ذرائع ہیں، وہ اختیار کیے جا کے ہوں۔ اس آخر میں صبر کے حکم کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ شروع ہی میں انسان ہاتھ پیر رکھے بیٹھارے کہ جو منظور قدرت ہے وہ ہوگا۔ جد جہد سے کیا فائدہ جب کہ بعض قدرت

کے فیصلے خود انسان کے قوت عمل کے صرف کرنے سے مشروط ہوتے ہیں اور انسان کے قوت عملی کوتاہی اللہ ہی کے احکام کی خلاف ورزی ہے جو کہ سعی و عمل سے متعلق ہیں اور اسی ظلم و عدوان کے رفع کرنے کے لیے جہاد نظام شریعت کا مستقل عنوان ہے۔ یہ آیت بعد والے حکم کی تمہید ہو تو مطلب یہ ہے کہ مصیبتوں کے اندیشے کو قبول ایمان اور اطاعت خدا و رسول میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

**وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ**

**الْمُبِينِ ۝۱۳ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝۱۳**

”اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو پیغمبر کی۔ اب اگر تم نے روگردانی کی تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو بس صاف صاف تبلیغ کر دینا ہے۔ اللہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور اللہ ہی پر بس ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے“

قرآن مجید میں بکثرت اعلان کیا گیا ہے کہ رسول کا کام حجت الہی تمام ہونے کی حد تک واضح اور صاف الفاظ میں تبلیغ کرنا ہے۔ اب اگر لوگ ایمان اختیار نہیں کرتے تو اس سے رسول پر کوئی الزام نہیں آسکتا۔ مورد الزام وہ ہوں گے جو باوجود صاف طور پر حقیقتوں کے واضح ہونے کے پھر بھی انہیں نہیں مانتے اور رسول کی تبلیغ سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

آخر کا جملہ اس لحاظ سے کہ اس راہ میں جو مشکلات درپیش ہوں جن مصائب کا سامنا ہو، ان کے مقابلے میں اپنی امکانی جدوجہد کے ساتھ اہل ایمان کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اگر اس کی مصلحت ہوگی تو وہ ان مصائب کو دفع فرمائے گا۔

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن مِّنْ أَرْوَاحِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ**

**وَإِن تَعَفَّوْا وَتَصَفَّحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۱۴**

”اے ایمان لانے والو! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں ایسے ہیں جو تمہارے دشمن ہیں تو ان سے ڈرتے رہو اور اگر معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو یقیناً اللہ بخشنے والا بڑا مہربان“۔

**اہل و عیال جو صحیح راستے پر جانے سے روکیں درحقیقت دشمن ہیں**

اس کی شان نزول جیسا کہ ابن جریر طبری نے کئی روایتوں سے اسے درج کیا ہے، کہ کچھ اشخاص جو مکہ میں تھے کہ رسول خدا کی خدمت میں جائیں اور ان کے بیوی اور بچے مانع ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ وہاں جاؤ گے تو طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ انہی سے ہوشیار کیا جا رہا ہے کہ اہل و عیال جو صحیح راستے پر جانے سے روکتے ہیں اور درحقیقت دوست نہیں ہیں، دشمن ہیں۔ ان سے ہوشیار رہنا چاہیے یعنی ان کے کہنے میں نہیں آنا چاہیے۔ بعد میں ان لوگوں نے چاہا کہ انہیں اس کی سزا دیں تو آخر کا جز آیا کہ نہیں خدا سے پسند نہیں کرتا کہ تم انہیں سزا دو۔ انہیں معاف کرو اور درگزر کرو تو خداے ہمارے گناہوں کو بخشنے گا اور تم سے درگزر کریگا کہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس طرح پرکار خیر میں بیوی اور بچے سدراہ ہوں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں یعنی وہ بجائے دوست ہونے کے دشمن جان ہوتے ہیں۔ ہاں مناسب حد تک احکام شریعہ میں خود خالق نے بیویوں اور بچوں کا خیال کیا ہے جیسے کہ حج کی شرائط استطاعت میں یہ رکھ دیا کہ اتنی مدت تک کے لیے اہل و عیال کے

آزوتے کا سامان کرنا ضروری ہے بغیر اس کے حج واجب نہیں ہوگا لیکن اس کے علاوہ صرف ان کی محبت کا خیال کہ انہیں چھوڑ کر کیوں جائیں؟ یہ کوئی عذر شرعی نہیں ہے اور یہی منزل ہے کہ جہاں دیکھنا ہے کہ آدمی اہل عیال سے محبت زیادہ رکھتا ہے یا خداوندی احکام کی اطاعت کو مقدم سمجھتا ہے۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا  
اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ ط وَمَنْ يُوقِ شُحَّ  
نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٦﴾

”تمہارے مال اور تمہاری اولاد ذریعہ آزمائش ہیں اور اللہ کے یہاں بڑا اجر و ثواب ہے تو اللہ سے ڈرو جہاں تک تم سے ہو سکے اور سنو اور اطاعت کرو اور خیرات کرو تمہارے لیے بہتر ہے اور جو اپنے نفس بخل سے بچا رہے تو یہی لوگ دنیا اور آخرت میں بہتری حاصل کرنے والے ہیں۔“

### اموال اور اولاد، ذریعہ آزمائش

ہماری اردو زبان میں ”فتنہ اور بلا“ دونوں لفظوں میں شدید مذمت مضمحلہ مگر عربی زبان میں دونوں کے مفہوم میں صرف امتحان و آزمائش ہے۔ اب انسان اس آزمائش میں پورا اترتا تو یہی سبب سعادت ہو سکتے ہیں اور اگر پورا نہ اترتا تو یہ چیزیں انجام میں باعث ہلاکت ہو سکتی ہیں اور وہ اجر عظیم جو اللہ کے یہاں ہے، وہ انہی چیزوں کے صحیح مصرف میں صرف کرنے سے وابستہ ہے اور یہ صحیح مصرف میں صرف کرنا وہی اللہ سے ڈرنا یعنی تقویٰ ہے جسے بعد میں کہا گیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ چونکہ ایک جگہ قرآن میں ہے:

اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ (آل عمران - ۱۰۲) اللہ سے ڈرو جتنا ڈرنے کا حق ہے۔

اس سے انسانوں کو پریشانی پیدا ہو سکتی تھی کہ بھلا ہم ”پورا حق“ اس سے ڈرنے کا کہاں ادا کر سکتے ہیں تو اس آیت کے ذریعے سے اس پہلی آیت کو منسوخ کر دیا مگر اس کی تعبیر منسوخ کرنے سے بظاہر درست نہیں ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت سے اسکی تشریح ہو گئی کیوں کہ پہلے ہی جو حکم ہوا تھا وہ قدرت و طاقت کے باہر تھوڑی تھا۔ اس میں بھی یہ شرط مضمحلہ تھی کہ جہاں تک ہو سکے۔

إِنْ تَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ط وَاللَّهُ شَكُورٌ  
حَلِيمٌ ﴿١٧﴾ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٨﴾

”اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو تو وہ تمہارے لیے اسے بہت بڑھا دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا اور اللہ بڑا قادر دان حلم و تحمل سے کام لینے والا ہے۔ وہ ان دیکھی چیزوں کا جاننے والا ہے غالب آنے والا، صحیح کام کرنے والا ہے۔“

اللہ کو قرض دینے کا ذکر قرآن مجید میں کئی دفعہ آچکا ہے اور ہر جگہ یہ تشریح کی گئی ہے کہ اس سے کسی کو قرض دینا ہی مراد نہیں ہے بلکہ کسی بھی کار خیر میں رضائے الہی کے لیے صرف کرنا اللہ کو قرض دینا ہے جس کے نتیجے میں اس نے اپنی طرف سے بڑھا کر دینے کا وعدہ کیا ہے جس میں ایک جگہ سات سو گنے کا اعلان تک ہے اور پھر کہہ دیا ہے کہ جس کے لیے چاہتا ہے اور زیادہ عطا کر کرتا ہے۔



# سُورَةُ الطَّلَاقِ

مدنیہ ..... ۱۲ ..... آیات

اس سورے میں شروع سے احکام طلاق کا بیان ہے، اس لیے اس کا یہ نام ہوا، اب کچھ امور اس ذیل میں اور کچھ اس کے ساتھ ساتھ بطور عام نصح و مواعظ اور تشیروانذار کے بیان ہوئے ہیں۔

## سورۃ طلاق کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... طلاق اس حساب سے دیا جائے کہ اس سے ایام عدہ کا حساب ہو سکے۔
- ۲..... زمانہ عدہ میں ان عورتوں کو شوہروں کے گھر میں رہنے کا حق سوا استثنائی صورتوں کے۔
- ۳..... دو عادلوں کی گواہی کی ضرورت۔
- ۴..... طلاق میں تقویٰ کی ترغیب۔
- ۵..... اللہ پر توکل کی ہدایت۔
- ۶..... یا نسہ وغیرہ کا عدہ۔
- ۷..... حاملہ کا عدہ۔
- ۸..... بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ طلب کرے تو وہ معاوضہ ادا کرنا چاہیے۔ یا پھر کسی اور سے پلوانا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ ۗ  
وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ ۗ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ  
بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۗ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ  
نَفْسَهُ ۗ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا ۝۱

”اے پیغمبر! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو زمانہ عدہ کے لحاظ سے اور پورے عدے کے دنوں کا حساب رکھو اور

اللہ سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے، انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں سو اس کے کہ کھلے ہوئے شرمناک جرم کا ارتکاب کریں اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جس نے اللہ کی مقرر حدوں سے ایک قدم آگے بڑھایا، اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، تم نہیں جانتے، شاید اللہ اس کے بعد کوئی تازہ بات پیدا کرے۔“

ابتدا میں پکار کے کہا گیا ہے رسولؐ سے مگر جو احکام دیے ان میں جمع مذکر حاضر کے صیغے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ احکام کا تعلق تمام افراد امت سے ہے۔ خاص پیغمبر خدا سے تعلق نہیں ہے۔ ہاں قدیم مفسر قتادہ کی روایت میں جسے طبری نے درج کیا ہے کہ خود حضرتؐ نے حفصہ کو طلاق دیا تھا، اس سلسلہ میں یہ سورہ نازل ہوا ہے لیکن مورد نزول کوئی ایک ہونے سے احکام میں خصوصیت پیدا نہیں ہوتی جب تک صراحتہ خصوصیت ثابت نہ ہو۔ احکام میں عمومیت ہی ہوتی ہے۔

”جب طلاق دو“ یعنی طلاق دینا چاہتے ہو [۱] جیسے حکم وضو میں کہا گیا ہے:-

اذا قمتہ الى الصلوٰۃ :- جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو، اس کے یہ معنی نہیں کہ جب نماز کے لیے مصلے پر کھڑے ہو جاؤ، تب جا کر وضو کرو بلکہ معنی یہی ہیں جب نماز کے لیے کھڑا ہونا چاہتے ہو یعنی نماز ادا کرنا چاہتے ہو تو وضو ضرور کرو اور یہ احکام ان عورتوں سے متعلق ہیں جن سے خاص جنسی تعلق قائم ہو چکا ہو اس لیے کہ اگر طلاق قبل دخول ہو تو اس میں جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ تصریح موجود ہے، عدہ ہے ہی نہیں۔

”طلاق در زمانہ عدہ کے لحاظ سے“ یعنی عورت کے ماہواری ایام کے دنوں میں جو نجاست ہوتی ہے، اس دوران میں طلاق نہ ہونا چاہیے۔ اس حالت سے بری ہونے کی حالت میں جسے ”طہر“ کہتے ہیں طلاق ہونا چاہیے اور وہ طہر ایسا ہو جس میں شوہر نے جماعت نہ کی ہو، تاکہ اسی کے لحاظ سے اس کے عدے کا شمار ہو سکے۔ ”اور عدہ کا پورا حساب محفوظ رکھو“ وہ عدے کی مقدار جو دوسری جگہ قرآن مجید نے بتائی ہے، ان عورتوں کے لیے جنہیں ایام ہوتے ہوں۔ ثلاثۃ قروء یعنی اس کے بعد تین دفعہ ایام سے پاکیزگی کے دنوں کا پورے طور پر حساب محفوظ رکھو۔

جب یہ زمانہ پورا ہو جائے تو عدہ ختم ہو جائے گا۔ اب اگر مرد نے ان دنوں میں رجوع نہیں کی ہے یعنی اپنے قول یا عمل سے اس کا ثبوت نہیں دیا کہ اس نے دوبارہ تعلقات ازدواج قائم کر لیے ہیں، تو اب وہ اس شوہر کی زوجیت کے حلقے سے بالکل نکل جائے گی اور اسے عقد ثانی کرنے کا حق ہوگا۔

اللہ سے ڈرنے جو حکم بلافاصلہ متصل ہے اس ممانعت سے کہ انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے کا حکم اس ممانعت پر زور دینے کے لیے ہے اور اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے گھروں کی نسبت ان کی طرف دی گئی ہے کہ ابھی تک تو جو شوہر کا گھر تھا، وہ ان بیویوں کا تھا کہ یہ میں رہنے کی حق دار تھیں تو اب بھی جب کہ عدے میں ہونے کی وجہ سے ابھی بالکل رشتہ قطع نہیں ہوا ہے، سمجھو کہ وہ اپنے گھروں میں ہیں تو انہیں وہاں سے نکالنا نہیں چاہیے۔

”سو اس کے کہ کھلے ہوئے شرمناک گناہ کی مرتکب ہوں“۔ اس کے لیے روایات میں تین چیزیں آئی ہیں۔ زنا کاری اور فحش کلامی

[۱]۔ المعنی اذار دتم طلاق النساء (مجمع البیان)

اور گھر والوں کو اذیت پہنچانا۔

بعد میں جو ہے کہ ”تمہیں نہیں خبر اللہ اس کے بعد کوئی صورت پیدا کرے“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف راغب ہو جائیں اور اس لیے ان کے باہمی تعلقات مستقل طور پر خوشگوار ہو جائیں یہ اصل عدہ کے اندر رجوع کے حق کا مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس زمانہ میں اگلے گھر کے اندر رہنے کے حکم کی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا  
ذَوِي عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۗ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ يُؤْمِنُ  
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۖ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ  
لَا يَحْتَسِبُ ۗ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۗ قَدْ جَعَلَ  
اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝۳

”توجہ وہ اپنی مقررہ (عدہ والی) مدت تک پہنچ رہی ہوں تو اب یا تو انہیں رکھو اچھے طریقہ پر یا جدا ہی کر دو انہیں اچھے طریقہ پر اور گواہ بناؤ دو عادلوں کو اپنے میں سے اور گواہی کو صحیح طریقے پر انجام دو خدا کے لیے۔ اس سے نصیحت حاصل ہوتی ہے اسے جو ایمان رکھتا ہو اللہ اور آخرت کے دن پر اور جو اللہ سے ڈرتے تو وہ اس کے لیے نکاسی کا راستہ پیدا کرتا ہے اور اسے روزی دیتا ہے اس طرح جو اس کے سان گمان میں بھی نہیں ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے، یقیناً اللہ اپنے کام کا پورا کرنے والا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تعداد مقرر کی ہے۔“

### طلاق کے موقع پر دو عادلوں کی بحیثیت گواہ موجودگی ضروری

بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ کے ایک معنی تو یہ ہونے کہ وہ اپنی مقررہ مدت پہنچ جائیں لیکن اگر وہ مدت پوری ختم ہو جائے تو اس کے بعد رجوع کا حق ہی نہیں رہتا، اس لیے ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ وہ اس مدت تک پہنچ رہی ہیں یعنی اس مدت کا اختتام قریب ہے تو ادھر یا ادھر فیصلہ کر لے کہ اب اسے زوجیت برقرار رکھنا ہے تو رجوع کر لے مگر پھر اچھے عنوان سے جدائی اختیار کر لے اور جدائی کا مطلب یہ ہے کہ جو دن یا جو ساعتیں عدہ گزرنے کے باقی ہیں ان میں رجوع نہ کرے اور مدت گزر جانے دیں تو پھر قطعی طور پر جدائی ہو جائے گی ”اور دو (۲) عادلوں کو گواہ بناؤ“ یعنی طلاق کے موقع پر دو عادلوں کی بحیثیت گواہ موجودگی ضروری ہے اور ان گواہوں کو ہدایت ہے کہ جب گواہی طلب کی جائے تو وہ صحیح طور پر گواہی دیں۔ اس طرح یہ اشہدوا، گواہ بناؤ، کا حکم شروع میں جو، فَطَلَّقُوهُنَّ ”انہیں طلاق دو“ کی لفظ تھی، اس پر عطف کی بحیثیت رکھتا ہے۔

بعد میں جو تقویٰ اور حصول رزق اور توکل وغیرہ کا ذکر ہے، وہ ہمارے خیال میں اس بنا پر کہ اگر ہر ایک تقویٰ کا پابند ہو، دوسرے کے حق کی

ادیگی میں کمی نہ کرے اور اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرے تو ایسی صورتیں پیدا ہی نہ ہوں جو طلاق کی باعث ہوتی ہیں اور اللہ پر توکل ہو تو مالی پریشانی اس کی باعث نہ ہو کہ ایک دوسرے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

وَالَّذِي يَدِينُ مِنَ الْمَحِيضِ مَنْ نَسِيَ كُمْ إِنْ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ ۖ  
وَالَّذِي لَمْ يَحِضْ ۖ وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۗ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ  
يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ۝ ذٰلِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنْزَلَهُ إِلَيْكُمْ ۗ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ  
عَنْهُ سُبُلًا وَيُغْنِهِ لَعَلَّ أَجْرًا ۝

”جو تمہاری عورتوں میں سے ایسی ہوں کہ ماہواری خون کے آنے سے ناامید ہوگئی ہوں اگر تمہیں شک ہو تو ان کا عدہ تین مہینے ہے اور ان کا بھی جن کے ماہواری خون نہیں آیا ہے۔

### یا نسہ وغیرہ اور حاملہ کا عدہ

اور حمل والیاں ان کے لیے مدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے اور جو اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لیے اس کے معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم اس نے تمہاری طرف اپنے علم سے اتارا ہے اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کی غلطیوں کی تلافی کرتا ہے اور اس کے اجر و ثواب کو بڑا کرتا ہے۔“

یہاں تین قسم کی عورتوں کا بیان ہے ان کا عدہ کیا ہوگا؟ پہلے سن رسیدہ عورتیں، یہاں یہ فقرہ کہ ”اگر تمہیں شک ہو“ نہ ہوتا تو صاف سمجھ میں آتا کہ یہ سن یا اس جس کا ہو گیا ہو اور وہ عام عورتوں کے لیے پچاس برس اور قریشیہ کے لیے جن کی فرد کھلی خواتین سادات ہیں ”شرعاً ساٹھ (۶۰) برس مقرر ہیں۔ ان کا یہ عدہ ہے مگر اس فقرے کی وجہ سے پتہ چلتا ہے کہ جو یقینی طور پر یا نسہ ہوں ان کا یہ حکم نہیں ہے بلکہ یہ ان کا ہے جو اس عمر تک پہنچی ہیں مگر ماہواری کا ہونا بند ہو گیا ہے تو شک ہے کہ یہ کبر سن کی وجہ سے پاک ہوگئی ہیں یا کسی عارضہ کی وجہ سے انہیں حیض آنا موقوف ہو گیا ہے ان کا عدہ تین (تین) مہینے ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر معلوم ہو کہ ان کی عمر اس مقررہ حد سے باہر ہوگئی ہے اور اس میں شک نہیں ہے تو ان کا کیا حکم ہے؟ وہ یہاں مسکوت عنہ ہے۔ اکثر علمائے شیعہ اس کے قائل ہیں کہ ان کے لیے عدہ ہے ہی نہیں دوسرے وہ کسن خواتین جو بلوغ شرعی کی عمر تک پہنچی چکی ہیں مگر اس کے بعد بھی ایام جاری نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے لیے بھی اگر دخول کے بعد طلاق دیا جائے تو یہی عدہ ہے یعنی تین مہینے لیکن اگر وہ نابالغ ہیں یعنی حیض والی عمر ہوئی ہی نہیں ہے جس کی شرعاً مدت ۹ برس ہے تو وہاں بھی زیادہ تر ہمارے علماء اس کے قائل ہیں کہ ان کے لیے عدہ نہیں ہے۔

تیسرے حاملہ :- اگر حالت حیض میں طلاق دیا جائے تو عدہ اس وقت تک ہے جب تک وضع حمل ہوخواہ وہ وضع حمل جلدی ہو جائے یا کافی مدت کے بعد وضع حمل ہو۔

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارَّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا

عَلَيْهِنَّ ۖ وَإِنْ كُنَّ أُولَاتٍ حَمَلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ  
 أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَآمُرُوا بِبَيْنِكُمْ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَإِنْ  
 تَعَاَسَرْتُمْ فَسَتَرْضِعْ لَهُ أُخْرَىٰ ۖ لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَنْ قَدِرَ  
 عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ حِمًّا اتَّهَ اللَّهُ ۖ لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۖ  
 سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۚ

”انہیں مکان میں رکھو جیسے تم خود رہتے ہو اپنی مقدرت کے مطابق اور انہیں نقصان نہ پہنچاؤ، تاکہ ان پر تنگی کرو اور اگر حاملہ ہوں تو انہیں نان و نفقہ دو جب تک کہ ان کا وضع حمل ہو اور اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو انہیں جو ان کا معاوضہ ہو وہ دو اور بھلائی کے ساتھ آپس میں طے کر لو اور اگر تم نے ایک دوسرے کو مشکل میں ڈالنا چاہا تو کوئی دوسری اسے دودھ پلائے گی اور جو مالدار ہو، وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر روزی میں تنگی ہو، وہ پھر جتنا اللہ نے اسے دیا ہے اس میں خرچ کرے اللہ کسی پر اس کے مقدور سے زیادہ پابندی نہیں کرتا، جلد ہی اللہ دشواری کے بعد آسانی پیدا کرے گا۔“

اس کے قبل جو تھا کہ انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو، اس سے تو سمجھ میں یہی آتا تھا کہ جس مکان میں وہ تھیں اس میں ان کے قیام کو برقرار رکھنا چاہیے مگر اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ بالکل اسی مکان میں رکھنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں یہ نہ ہونا چاہیے کہ خود تو عالی شان محل میں رہتا ہے اور انہیں ایک چھوٹے سے کھنڈر میں ٹھہرا دیا۔ نہیں بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق جگہ خود رہتا ہے، ویسی ہی جگہ ان کے قیام کا انتظام کرنا چاہیے۔

یہ اسی وقت ہے جب ”مِنْ حَيْثُ سَكَدْتُمْ“ کے یہ معنی لیے جائیں کہ جیسے تم خود رہتے ہو لیکن ایک دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ جہاں تم خود رہتے ہو تو یہ پہلے ہی حکم کی دوسرے انداز میں وضاحت ہوگی۔

## احکام رضاعت

رضاعت کے بارے میں ان بیویوں کے لیے جو حبالہ زوجیت میں برقرار ہیں دوسرے پارے میں کہا جا چکا ہے کہ انہیں اجرت کے مطالبہ کا حق ہے۔ چہ جائیکہ یہ جسے طلاق ہو گیا ہے اور اسے اب بچہ کے باپ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے؟! وہ بغیر اجرت دودھ پلانے پر کیوں کر مجبور کی جاسکتی ہے؟ وَاْمُرُوا بِبَيْنِكُمْ بِمَعْرُوفٍ ”بھلائی کے ساتھ آپس میں طے کر لو یعنی ایک جہتی کے ساتھ بچے کے مفاد کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے بغیر آپس کے جذبہ عناد سے کام لیے ہوئے اس معاملہ کو طے کر لینا چاہیے۔  
 بعد میں جو حسب حیثیت خرچ کا حکم ہے، وہ بھی انہی سے متعلق ہے جو بچوں کو دودھ پلائیں۔<sup>[۱]</sup>

[۱] اوسمجانہ اهل التوسعہ ان یوسعوا علی نساءہم المرضعات اولادہن علی قدر وسعتہم (مجمع البیان)

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا ۝  
 وَعَدَّ بِهَا عَذَابًا نُكْرًا ۝۸ فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ۝۹  
 ”اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے سرکشی کی اپنے پروردگار کے حکم اور اس کے پیغمبروں سے توہم نے ان کا سختی کے ساتھ حساب لیا اور انہیں عجیب غیر معمولی سزا تو انہوں نے چکھا اپنے کام کا خمیازہ اور ان کے معاملے کا انجام گھاٹا تھا۔“

اس تذکرے ماضی کا جو بار بار قرآن مجید میں کہا گیا ہے مفاد یہ ہے کہ بعد والے اس سے عبرت حاصل کریں اور خداوند عالم کے مقابلہ میں سرکشی کرنے سے پرہیز کریں،

اب ”بستی“ تو ایک قطعہ ارض کو کہتے ہیں جو آباد ہو مگر جبکہ سورہ یوسف آیہ ۷۲ میں ہے ”وَسَلَّ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا“ اس بستی سے پوچھ لیجئے جہاں ہم تھے“ اور ظاہر ہے کہ دیواروں سے پوچھا نہیں جائے گا، مطلب یہ ہے کہ بستی والوں سے پوچھ لیجئے۔ ویسے ہی یہاں یہ کہ بستی نے سرکشی سے کام لیا اور یہ انجام ہوا تو بستی سرکشی کیا کرے گی، یعنی اس بستی والوں نے سرکشی سے کام لیا۔

اس آیت کے اس سورے میں آنے کی بنا پر ابن جریر طبری نے خود بھی اور دوسرے لوگوں کی زبانی بھی یہ تشریح کی ہے کہ اس بستی نے طلاق کے سلسلے میں احکام الہی سے سرتابی کی تھی، اس لیے اس بستی پر عذاب نازل ہوا مگر ہمارے نزدیک ان تمام سوروں میں کچھ جز کم یا زیادہ اس بنیادی موضوع سے متعلق ہوتا ہے جس پر سورے کا نام ہے لیکن اس کے علاوہ بہت باتیں بطور کلیہ بمناسبت بیان ہو جاتی ہیں جن کا خصوصی تعلق اس موضوع سے نہیں ہوتا۔ بظاہر یہ تذکرہ بھی ایسا ہی ہے جس میں احکام الہی سے سرکشی کے عام انجام پر توجہ دلائی گئی ہے جسے احکام طلاق ہی سے متعلق ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ آمَنُوا ۝ قَدْ  
 أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰ رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَ  
 الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۝ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ  
 وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝ قَدْ  
 أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ۝۱۱

”اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے تو اللہ سے ڈرو اے عقل والوں جو ایمان لائے ہو! اللہ نے تمہاری طرف یاد دہانی اتاری ہے، ایک ایسا پیغمبر جو تمہارے سامنے اللہ کی کھلی ہوئی آیتوں کو پیش کرتا ہے تاکہ انہیں جو ایمان لائیں اللہ پر اور نیک اعمال کریں نکالے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرتا رہے، وہ اسے داخل کریگا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ

رہیں گے۔ اللہ نے بہت اچھی رکھی ہے اس کے لیے روزی“۔

اس سلسلہ کے پہلے جز کو گزشتہ سے مرتبط کر کے دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ تو ان کے لیے دنیا کا عذاب تھا جو ان پر نازل ہوا اور اب آخرت کا عذاب ہے جو ان کے لیے تیار ہے [۱] اس کے بعد صاحبان عقل کو پکار کر ان کا وصف قرار دینا کہ ”جو ایمان لائے ہو“ اس میں یہ پہلو مضمر ہے کہ اصل صاحبان عقل وہی ہیں جو ایمان اختیار کریں۔

یہ کہ ”تمہاری طرف یاد بانی اتاری ہے، ایک ایسا پیغمبر“ اس میں اتارنے کی لفظ سے سمجھا گیا ہے کہ ذکر جس کا ترجمہ ہم نے ”یاد بانی“ کیا اس سے مراد قرآن ہے مگر اتارنے کی لفظ کا کثرت استعمال کی وجہ سے قرآن کے ساتھ متعلق ہونا، اتنا واضح نہیں ہے جتنا رسول کی لفظ کا پیغمبر سے متعلق ہونا جب کہ اس کے ساتھ آپ کا وصف خاص آیات الہی کی تلاوت کرنا بھی مذکور ہے اس لیے یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ آپ کا یاد بانی والا کام اتنا نمایاں تھا کہ آپ کو جسم ذکر کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور چونکہ شروع میں ذکر کی لفظ سے تعبیر کیا اس لیے ارسلنا یا بعثنا کے بجائے عموماً اس معنی کے لیے ”بھیجا ہم نے“ استعمال ہوتا ہے، یہاں انزلنا یعنی اتارا ہم نے کہا گیا۔ تاریکی“ کو قرآن میں جمع کی لفظ ”ظلمات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان سب کے مقابلے میں راہ ہدایت ایک ہوتی ہے اس لیے اس کو لفظ واحد ”نور“ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ ”اللہ نے اسے روزی بہت اچھی عطا کی ہے“ اس میں ایمان اور عمل صالح کو بھی روزی سمجھا جاسکتا ہے اس لیے کہ توفیق خیر اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور پھر اس کے صلے میں باغ بہشت اور وہاں کی نعمتیں، اس سے بہتر روزی اور کیا ہو سکتی ہے!؟

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۖ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ

لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ ﴿۱۷﴾

”وہ اللہ جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی انہی کی ایسی کہ ان کے درمیان حکم چلتا ہے تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ علم کے لحاظ سے ہر چیز پر حاوی ہے“۔

”انہی کی ایسی“ سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ تعداد میں جیسے آسمان سات ہیں ویسی ہی زمین بھی سات ہیں اور اس بھی زیادہ جو پہلو ذہن میں آتا ہے، وہ یہی کہ یہ سات طبقے تہہ در تہہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں اور بعض نے اسے ہفت اقلیم کے تصور کے مطابق خیال کیا ہے، چونکہ قرآن مجید کا کام سائنسی معلومات کا فراہم کرنا نہ تھا بلکہ جو عام انسانوں کے ذہن میں مخلوقات ہیں، انہی کو یاد لاکر ذہن کو ان کے خالق کی طرف موڑنا تھا۔ اس لیے بعد میں امریکا کے انکشافات سے اس ہفت اقلیم میں اضافہ ہو جانے سے اُس آیت کے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

”ان کے درمیان حکم چلتا ہے“ یعنی ارادہ الہی جسے ”حکم تکوینی“ کہتے ہیں مختلف قسم کا کائنات کی تخلیق یا ان میں تغیر و تبدل کے متعلق ان آسمان اور زمین کے طبقات میں جاری رہتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی تشریح ”حکم تشریحی“ کے ساتھ کی ہے یعنی وہ احکام شریعت جن کی تعمیل کی ذمہ داری انسان کے ارادہ و اختیار کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے لیکن بعد میں قدرت الہی کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ اسی قسم کے احکام کے لیے موزون ہے جو ارادہ الہی کا فرمان ہونے کے ساتھ وابستہ ہیں۔

[۱] ہذا یدل علی ان المراد بالعذاب الاول عذاب الدنيا (مجمع البیان)

# سُورَةُ التَّحْرِيمِ

مدینہ ..... ۱۲ ..... آیات

چونکہ اس سورے کا آغاز واقعہ ”تحريم“ سے ہوا ہے، اس لیے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

## سورۃ تحريم کے خاص خاص مضامين:

- ۱..... رسول خدا ﷺ کی دو بیویوں کو شدید تنبیہ اور ضمناً ان کے انتہائی خطرناک ہونے کا بیان۔
- ۲..... اہل ایمان کی ذمہ داری کہ وہ اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی (جہاں تک ممکن ہو) عذاب الہی سے بچائیں اس طرح کہ وہ معاصی الہیہ سے دور رہیں۔
- ۳..... پر خلوص توبہ کی ہدایت۔
- ۴..... پیغمبر خدا ﷺ اور اہل ایمان کے نور کا ذکر جو عرصہ قیامت میں پھیل رہا ہوگا جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔
- ۵..... کفار اور منافقین دونوں کے مقابلے میں جہاد کا حکم، اس کا بھی ذکر پہلے آچکا ہے۔
- ۶..... اچھے شوہروں کی بڑی بیویوں کی مثال میں زوجہ نوحؑ اور زوجہ لوطؑ کو پیش کرنا جو موضوع سورہ کے لحاظ سے ازواج رسولؐ کے غرور شرف پر بڑا تازیانہ ہے۔
- ۷..... برے شوہر کی اچھی زوجہ فرعون کی مثال۔
- ۸..... ایک ایسی خاتون جس کا انتساب کسی شوہر کی طرف نہیں یعنی جناب مریمؑ جو ذاتی طور پر ایک بلند مرتبہ خاتون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ضمناً ان کی پاک دامن کی تصدیق اور یہود کے گستاخانہ تصور کی رد قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر اور سورہ مریم میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِي مَرْضَاتِ أَزْوَاجِكَ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ ۗ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۗ



## وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿٥﴾

”اے نبی! کیوں آپ حرام کیے لیتے ہیں اسے جو آپ کے لیے اللہ نے حلال قرار دیا ہے، آپ اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔ اللہ نے مقرر کر دیا ہے تم لوگوں کے لیے اپنی قسموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ اور اللہ تمہارا مالک و مختار ہے اور بڑا جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا۔“

اتنا بس قرآن مجید سے مجھلا پتہ چلتا ہے کہ بعض ازواج کی سخت ناراضگی سے پریشان یاد کسی سازش سے مجبور ہو کر رسول خدا ﷺ نے کسی جائز کام کو ترک کرنے کا حتمی طور پر اقرار فرمایا تھا۔ خالق نے ان بیویوں کے موقف کو غلط قرار دیا اور رسولؐ کو ہدایت فرمائی کہ آپ اپنی پابندی ترک فرمائیں۔ اب وہ معاملہ کیا تھا اور یہ بیویاں کون تھیں؟ اس بارے میں دو (۲) روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جناب ماریہ قبطیہ کے ساتھ حضرت کا جنسی اختلاط تھا جس پر جناب حفصہ بنت عمر بہت برہم ہوئیں اور حضرتؐ کو مجبوراً قسم کھانا پڑی کہ میں اب ماریہ سے مطلب نہیں رکھوں گا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ بعض ازواج کے پاس کسی کا بطور تحفہ لایا ہوا شہد تھا اور حضرتؐ کو شہد بہت مرغوب تھا اس لیے ان بیوی کے پاس ذرا دیر تک تشریف فرما ہوتے تھے کہ وہاں آپ شہد کا شربت نوش فرماتے تھے۔ یہ بات دوسری بیویوں کو ناگوار ہوئی اور جناب عائشہ نے کچھ دوسری بیویوں کو اپنے ساتھ متفق کر کے یہ منصوبہ بنایا کہ جس کے پاس بھی رسول تشریف لے گئے اس نے کہا کہ آپ کے منہ سے معافیہ کی بو آتی ہے۔ یہ ایک پھول ہوتا ہے جس میں بسا ہند ہوتی ہے، تو جب شہد کی مکھی ان پھولوں سے شہد حاصل کرتی ہے تو اس شہد میں وہ بسا ہند آ جاتی ہے، چونکہ حضرتؐ کو گوارا نہ تھا کہ آپ کے جسم اطہر سے سوا خوشبو کے کوئی دوسرا اس قسم کا شائبہ بھی محسوس ہو، لہذا آپ نے قسم کھائی کہ اب اس شہد کا استعمال نہیں کروں گا۔

علمائے اہل سنت اس دوسری روایت کو مرجح قرار دیتے ہیں اور علامہ طبرسیؒ نے بھی پہلے اسی کو درج کیا ہے، پھر بطور نقل قول پہلی روایت کو فقہی حیثیت سے عموماً یہ الفاظ کہ یہ مجھ پر حرام ہے، بے اثر ہوتے ہیں اور یہاں بعد میں یہ حکم الہی کہ قسم کا کفارہ دیدیجیے بتاتا ہے کہ حرام کہنے کے ساتھ حضرتؐ نے قسم کھائی تھی۔ [۱] جیسا کہ جناب ماریہ سے متعلق واقعہ کی بعض روایتوں میں اس کی صراحت بھی ہے کہ حضرت نے حرام کہنے کے ساتھ واللہ کی لفظ بھی کہی تھی۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ حرام کہنا خود ایک قسم کی قسم ہے اور اسی پر اللہ نے قسم کے کفارہ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے خصوصیت کے ساتھ جب یہ الفاظ زوجہ سے متعلق ہوں تو بعض علمائے اہل سنت انہیں تین طلاقوں کا مرادف قرار دیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ نیت دیکھی جائے گی۔ اگر ظہار کی نیت ہو تو ظہار سمجھا جائے گا اور اگر طلاق کی نیت ہو تو طلاق سمجھا جائے گا۔ ہمارے نزدیک طلاق وغیرہ ہر ایک کے لیے خاص الفاظ کے صیغے مقرر ہیں۔ بغیر ان صیغوں کے صرف نیت اور کچھ دوسرے الفاظ سے یہ چیزیں وقوع میں نہیں آتیں اور قسم بھی اسی وقت ہے جب اس کے ساتھ لفظاً قسم شرعی کھائی جائے ورنہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ [۲]

[۱] فی هذا دلالة على انه قد خلف ولم يقصد على قوله هي على حرام لان هذا القول ليس بيدين (مجمع البيان)

[۲] قال اصحابنا الله لا يلزم شيء وجوهه كحرمه (مجمع البيان)

وَإِذْ أَسْرَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا ۖ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ  
عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَذَا ۖ  
قَالَ نَبَّأَنِ الْعَلِيمِ الْحَبِيبِ ﴿٣﴾

”اور جب پیغمبر نے اپنی بیویوں سے ایک خفیہ بات کہی تو جب اس نے (کسی دوسرے کو) وہ بتلا دی اور اللہ نے ان کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے ایک حصہ اس کا (اس بیوی) سے بتایا اور کچھ حصے سے درگزر کیا، جب آپ نے اس (بیوی) کو اس کی خبر دی تو اس نے کہا کہ آپ کو یہ کس نے بتایا اس علم والے (اللہ) نے جو بڑا باخبر ہے۔“

قرآن مجید کے انداز بیان سے تو یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ تذکرہ گزشتہ واقعہ سے کوئی تعلق رکھتا ہے لیکن جب بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ وہی جناب ماریہ کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی بات ہے جو حضرت نے جناب حفصہ سے بصریہ راز کہی تھی اور انہوں نے اپنے سے ایک جہتی رکھنے والے خاص فرد جناب عائشہ پر اس راز کا افشا کر دیا، خالق نے اپنے رسولؐ کو غیبی طریقے پر اس کی خبر کر دی اور آپ نے حفصہ کو بتایا کہ مجھے تمہاری اس افشاء راز کی اطلاع ہو گئی ہے مگر اب یہاں قرآن کے یہ الفاظ کہ کچھ بتایا اور کچھ سے درگزر کیا تو اس واقعے میں تو ایسی کوئی دو باتیں نظر نہیں آئیں جن میں سے ایک کہی گئی ہو اور ایک سے درگزر کیا ہو معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات کچھ اور تھی۔ بہر حال اس صورت حال میں صحیح رویہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب خدا اور رسول ﷺ کو اسے راز رکھنا منظور تھا اور اس کے افشاء پر ہی تنبیہ کی گئی ہے تو ہم بھی اس کے درپے نہ ہوں کہ اس راز کی بات کو معلوم کریں۔

بہر حال قرآن مجید صاف کہہ رہا ہے کہ اللہ نے حضرت کو اس سے مطلع کیا مگر قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں اس کی اطلاع دی گئی ہو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کا ہر پیغام جو بذریعہ وحی رسولؐ تک پہنچتا تھا قرآن مجید میں درج نہیں ہے۔ پھر جب زوجہ مکرمہ نے پوچھا کہ آپ کو کس نے بتایا؟ اور آپ نے جواب دیا کہ اللہ نے، تو انہوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ قرآن کی آیت سنائے جس میں خدا نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بات از روئے اسلام ان خواتین کو بھی معلوم تھی کہ وحی الہی جو رسولؐ پر اترتی ہے وہ قرآن میں منحصر نہیں ہے۔

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ  
وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ ﴿٤﴾

”اگر تم دونوں توبہ کر لو اللہ کی طرف (تو اچھا ہے) اس لیے کہ تم دونوں کے دل کج ہو گئے ہیں اور اگر تم دونوں ایک کر و ان کے خلاف تو یقیناً اللہ ان کا مددگار ہے اور جبرئیل اور مؤمنین کی وہ فر د جو بالکل نیک ہے اور سب فرشتے اس کے بعد پشت پناہ ہیں۔“

خطاب باتفاق مفسرین انہی دونوں بیویوں سے یعنی عائشہ اور حفصہ سے ہے چونکہ ان کے طرز عمل سے رسولؐ کو سخت ایذا پہنچتی تھی، اس لیے خالق نے ان سے ایسے سخت عتاب کے ساتھ خطاب فرمایا ہے۔ اور جو اہتمام ہے ان کے مقابلہ میں ان کے انتہائی خطرناک ہونے کا

ثبوت ہے۔

دو آدمیوں کے دل ظاہر ہے دوہی ہوں گے، مگر ان کے لیے جمع کی لفظ قلوب صرف کی گئی گونا گوں خواہشوں اور تمناؤں کے لحاظ سے جو ان کے دلوں میں کرڈھیں لیتی ہیں اور یا یہ کہ یہ ایک طرح کا محاورہ ہے کہ ایسے محل پر دو (۲) کے لیے بھی جمع ہی کی لفظ استعمال ہوتا ہے۔  
مولانا کی لفظ کے ساتھ صرف اللہ کا نام ہوتا تو مالک و سرپرست کا مفہوم زیادہ نمایاں ہوتا مگر جب کہ اس کے ساتھ جبرئیل اور صالح المؤمنین کا ذکر ہے تو اس کے معنی مددگار ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔

بعد میں عام ملائکہ کے ذکر سے الگ پہلے جبرئیل کا نام لینا ان کی خصوصیت امتیازی کا اظہار ہے جو انہیں رسول کے ساتھ حاصل ہے اور اسی طرح مؤمنین میں سے کسی فرد کو خصوصیت کے ساتھ صالح کہنا اس کے امتیاز خاص کا بلندی کردار کے لحاظ سے بھی اور رسول کے مددگار خاص ہونے کے لحاظ سے بھی ترجمان ہے جس کی تشریح میں ہمارے یہاں کی حدیث میں جس کے موافق اہل سنت کے یہاں کی روایت بھی موجود ہے حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہما کا نام آیا ہے۔ اور اس کی تائید میں رسول کے ساتھ آپ کی جان سپاری اور آپ کی زندگی کے پورے کارنامے ہیں مگر عام طور پر مفسرین اہل سنت اسے عمومی حیثیت سے مؤمنین کے معنی میں لیتے ہیں۔

عَسَى رَبُّهُ إِنْ طَلَّقَكُنَّ أَنْ يُبَدِّلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِنْكُنَّ مُسَلِّمَاتٍ مُّؤْمِنَاتٍ

قَانِتَاتٍ تَبِيَّتْ غِيْبَاتٍ سَبِيْحَاتٍ تَبِيَّتْ وَأَبْكَارًا ۝۵

”بہت ممکن ہے کہ اگر وہ تم بیویوں کو طلاق دیدیں تو اللہ انہیں تمہارے بدلے ایسی بیویاں عطا کرے جو (سچے معنی میں) مسلمان، باایمان، اطاعت میں سرگرم تو بہ و انا بت کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ دار، پہلے بیاہی ہوئی اور کنواریاں“۔

عسی یوں تو افعال مقاربتہ میں سے ہے جس کے معنی ہوئے ”نزدیک ہے“، مگر یہ نزدیکی ضروری نہیں کہ زمانہ کے لحاظ سے ہو جس کے معنی یہ ہوں کہ عنقریب ایسا ہوگا بلکہ اس لفظ کا استعمال ذہن سے اس بات کو قریب لانے کے لیے ہوتا ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ”بہت ممکن ہے“۔

اب ان بیویوں کے لیے جن کے بعد میں حاصل ہونے کا رسول کے لیے امکان قریب ظاہر کیا گیا ہے موجودہ افراد سے بہتر قرار دے کر جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان سے یہ نتیجہ تو ضرور نکلتا ہے کہ جن خاص بیویوں کو مخاطب کر کے تشبیہی طور پر یہ اعلان ہوا ہے ان میں یہ تمام اوصاف اس درجے پر یکجا نہیں ہیں جو ازواج رسول میں ہونا چاہیں۔

آخر کے دو (۲) وصف ”دہا جو اور کنواری“ ایسے ہیں جن میں سے کوئی ایک صفت لازماً ہر عورت میں پائی جائے گی تو اس کے ذکر کا مقصد کسی ایسی فرد کے سرغور کو جو کانا ہو سکتا ہے جس کا بہت بڑا سرمایہ فخر رسول کی زوجیت میں آنے کے وقت کنواری ہونا ہے اور ان دونوں وصفوں میں کسی کو معیار فضیلت نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ وہ اوصاف بدرجہ اتم موجود نہ ہوں جو پہلے بیان ہوئے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

## عَلَيْهَا مَلِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا

### يُؤْمَرُونَ ﴿٦﴾

”اے ایمان لانے والو! بچاؤ اپنے آپ کو اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کے ایندھن انسان ہیں اور پتھر، جس پر مقرر ہیں بڑے سخت گیر، تشدد قسم کے فرشتے جو اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اس میں جو اس نے انہیں حکم دیا اور وہی کرتے اس میں جو اس نے حکم دیا اور وہی کرتے ہیں جس پر وہ مامور ہوتے ہیں۔“

### اپنے اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کے معنی

بچانا اپنے کو آگ سے ان اعمال سے پرہیز کے ساتھ جو اس آگ کا موجب ہیں، یہ پرہیز اپنی نسبت انسان کا فعل ارادی ہے جو اس اختیار سے وابستہ ہے لیکن دوسروں کے لیے جو اس کے گھر والے ہیں، بس جدوجہد، وعظ و نصیحت اور زبرد تو بیخ ہی کی حد تک اپنے اختیار میں ہے ورنہ جیسا کہ خود اس سورے کے آخر میں ہے، حضرت نوح اور لوط کی بیویوں کو اور جیسا کہ پہلے آچکا ہے، حضرت نوح اپنے بیٹے کو عذاب سے نہ بچا سکے تو کوئی دوسرا قدرت کہاں رکھتا ہے کہ وہ بہر صورت اپنے گھر والوں کو عذاب سے بچائے؟

”اس آگ کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر“ یہ الفاظ پہلے پارے میں تھانیت قرآن کے منکروں کے عذاب کے سلسلے میں آچکے ہیں اور وہاں ہم نے ان کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ کافر اور ان کے معبود جو پتھروں کے بت تھے، وہ سب آتش جہنم میں جھونکے جائیں گے جس طرح لکڑی وغیرہ جو ایندھن ہے اور وہ آگ میں ڈالا جاتا ہے۔

اب یہاں مسلمانوں کو خطاب کر کے اس آگ سے بچنے اور گھر والوں کو بچانے کا حکم دیا جا رہا ہے تو یہاں وہ پتھر والے بت کہاں ہیں جو مشرکین کے معبود تھے تو اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ الفاظ اس دوزخ کے تعارف کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں انسان اور وہ پتھر ہوں گے۔ اب چاہے ان دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ وہ پتھر نہ ہوں۔

ایک دوسری تشریح جو دونوں جگہ ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ پتھروں سے مراد گندھگ کے پتھر جو خود مشتعل زیادہ ہوں گے ﴿٦﴾ آج کل کے بعض لوگ پتھر کا کونکہ کہہ دیتے ہیں کہ ان کی آگ تیز اور دیر پا ہوتی ہے مگر وہاں کی آگ تو غضب الہی کے تقاضا سے مشتعل ہے جس کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی تیزی اور دیر پا کو ذہن میں لانے کے لیے اس کا ذکر کیا گیا ہو۔

ایک طبقہ علماء کا چشم اعمال کا قائل ہے اور آخرت کی جزا و سزا کو انہی اعمال کی بدلی ہوئی صورت قرار دیتا ہے، ان کی بنا پر یہ گندھگ کے پتھر یا پتھر کا کونکہ اس آگ کی تیزی کا اظہار ہے اور در صورتیکہ بت مراد ہوں تو بت اگرچہ صاحب کردار نہیں ہوتے لیکن چونکہ جو عمل بھی ان سے متعلق ہو یعنی پرستش، وہ آگ کے شعلوں کی شکل میں سامنے آیا لہذا کہا گیا کہ وہ پتھر بھی اس آگ کو ایندھن کی طرح بھڑکانے والے ہیں۔

آگ پر مقرر فرشتوں کا ”سخت گیر“ اور ”تشدد ہونا“ ان کے عمل کے لحاظ سے ہے جس کی تشریح کے بعد کوئی گئی ہے کہ جس بات پر وہ مامور ہیں، اسے عمل میں لاتے ہیں اور اس کے لیے جیسے اشخاص کی ضرورت ہے، ویسے ہی وہ پیدا کیے گئے ہیں ورنہ فرشتے جذبات کے حامل نہیں ہوتے

کہ طبیعت کے تقاضے سے ایسے کام انجام دیں، وہ تو بس احکام الہی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۗ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤﴾**

”اے کافر لوگو! اب آج عذر خواہی نہ کرو تمہیں تو سزا مل رہی ہے بس وہی جو تمہارے اعمال رہے تھے۔“

چونکہ قبل کی آیت میں اہل ایمان کو تنبیہ و تخویف کرتے ہوئے دوزخ کا ذکر آگیا تھا تو اس کے ساتھ اصل اہل دوزخ کا ذکر ہو رہا ہے جو کافر لوگ ہیں کہ اب وہ قیامت میں دوزخ کا سامنا ہونے کے بعد معذرت کر رہے ہوں گے کہ خداوند! معاف کر دے۔ اب ہم کفر نہیں کریں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اب توبہ و انابت کا وقت گزر چکا ہے۔ اب توبہ جو تم نے دار تکلیف میں کیا تھا، اس کی سزا ہے جو تمہیں بھگتنا ہے۔ ہم تو اس کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ جو تم کرتے تھے اس کی یہ سزا ہے اس کے اظہار کے لیے قرآن مجید میں جزا و سزا کے ذکر کے ساتھ اکثر شبّ کا حرف آیا ہے کہ بماکانو ایکسبون (یا) بماکانو یعلمون جس سے بدلے کا مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے اور سبب کے معنی بھی نکلتے ہیں کہ یہ اس سبب سے ہے جو وہ کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک جہاں ”ب“ احکام رضاعت نہیں ہے، اس کا بھی مطلب یہی ہے۔ مگر انہی اعمال کے مجسم شکل میں آنے کے جو قائل ہیں، وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ یہ وہی تمہارے اعمال ہیں جو اس شکل میں تمہارے سامنے ہیں۔ اب عذر خواہی سے کیا ہوتا ہے؟

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتُّوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ۗ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنْكُمْ**

**سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۗ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ**

**وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۗ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا**

**أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۗ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥﴾**

”اے ایمان لانے والو! توبہ کرو اللہ کی بارگاہ میں خالص توبہ، بہت ممکن ہے کہ اللہ تمہاری برائیوں پر پردہ ڈال دے اور تمہیں داخل کرے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، جس دن اللہ پیغمبر کی اور ان ایمان لانے والوں کی جو ان کے ساتھ ہیں ذلت نہیں ہونے دے گا، ان کا نور دوڑتا ہوگا ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب، وہ کہیں گے پروردگار! ہمارے نور کو ہمارے لیے مکمل فرما اور ہمیں بخش دے، یقیناً تو ہر چیز رقا در ہے۔“

### خالص توبہ

”خالص توبہ“ یعنی جو صحیح احساس جرم کے ساتھ ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ گزشتہ پر نادام ہو اور آئندہ اس کے ترک پر مستقل طور پر عازم ہو، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن فرائض کے ادا کرنے سے اب تک غفلت رہی ہے، ان کو ادا کریں جن کا حق ان تک نہیں پہنچایا ہے ان کا حق ان تک پہنچایا جائے اور جس کے ساتھ کوئی قولی یا عملی زیادتی کی ہے اس سے معافی مانگے۔ غرض جس طرح جس خرابی کا تدارک ہو سکتا ہو اس

کا تدارک کریں اور یہ سب رضائے الہی کی خاطر ہونہ کہ صرف کسی دنیوی مضرت کے احساس سے۔ اس کے بعد کہنا تو یہ ہے کہ اللہ رسول اور صاحبان ایمان کی عزت و عظمت کو نمایاں کریگا لیکن مخالفین رسول اور اسلام کا مزعومہ یہ تھا کہ یہ لوگ بعد میں معاذ اللہ ذلیل ہوں گے تو انداز بیان نفی کا اختیار کیا گیا کہ خدا اپنے رسول اور ان کے ساتھ والے اہل ایمان کی ذلت نہیں ہونے دے گا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی عزت دنیا کی آنکھوں کے سامنے آئے گی اور اُس عزت کا بیان بعد کو ہے کہ جب وہ بہشت کی طرف بڑھ رہے ہوں گے تو ان کے سامنے اور داہنی جانب جدھر سے وہ جا رہے ہوں گے ان کا نور پھیل رہا ہوگا۔ اس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے جب کہ مضمون یہاں سے قریب ہی سورہ حدید میں آیا ہے۔

اب چونکہ یہ سب معلوم نہیں ہیں، ان میں حسن عمل کے مراتب میں فرق ہے اس لیے بعض کو محسوس ہوگا کہ ان کا نور ذرہ مدہم ہے تو وہ خدا سے دعا کریں گے کہ پروردگارا ہمیں بخش دے یعنی ہماری اس کمی کو نظر انداز فرما جو تیرے لئے کوئی دشواری نہیں اور ہمیں پورا نور عطا فرمایا کہ جو ہمارے نور میں ہے باقی نہ رہے۔ بعض قدیم مفسرین کی تشریح یہ ہے کہ شروع میں منافقین اور مؤمنین سب ہی کے سامنے نور ہوگا۔ پھر منافق جماعت کا نور بجھ جائے گا اور وہ ٹھوکرین کھانے لگیں گے تو مؤمنین یہ دعا کریں گے کہ جس کا مطلب اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ ہمارے نور کو بجھنے نہ دے۔ آخر تک اسے قائم رکھ۔ ہو سکتا ہے کہ شروع کا یہ نور اور پھر اس کا بجھ جانا ان کے ابتدائی اقرار اسلام اور پھر دل سے کافر رہنے کا محسوس طور پر اظہار ہو جو جزا و سزا کے بمناسبت عمل ہونے کا تقاضا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ ط

وَبئْسَ الْمَصِيرُ ⑨

”اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور ان کے مقابلے میں سختی سے کام لیجیے اور ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے اور وہ بہت برا انجام ہے۔“

کفار اور منافقین کے مقابلے میں سختی کی ضرورت

یہ آیت بالکل انہی الفاظ میں دسویں پارے کے اندر سورہ برأت میں آچکی کہ یہاں حکم ”قتال“ کی لفظ کے ساتھ نہیں ہے تاکہ لازمی طور پر اس کے معنی خونریز مقابلے کے ہوں بلکہ حکم جہاد کا ہے جس کے معنی جدوجہد کے ساتھ مقابلے کے ہیں لیکن ایک قسم اس کی قتال بھی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے کھلے ہوئے کافروں کے مقابلے میں تو دو قسم کے جہاد کیے۔ میدان جنگ میں تلوار والا جہاد بھی اور انہیں حق سے قریب لانے کے لیے دوسری نوعیتوں سے جہاد بھی لیکن منافقین کے مقابلے میں تلوار نہیں اٹھائی گئی۔ پھر بھی سیرت رسول کے اس جز کی تکمیل، وقت آنے پر ان کے حقیقی نائب نے کی جس کے ہر اقدام کو آپ نے اپنا اقدام قرار دیا تھا ان لفظوں میں کہ یا علیٰ حربک حربی، اے علی تمہاری جنگ میری جنگ ہے، تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ تمہیں تین (۳) گروہوں سے جنگ کرنا ہوگی۔ ناکثین۔ اور قاسطین اور مارقین جن کے مطابق حضرت علیؑ کو تین لڑائیاں درپیش ہوئیں:- جمل، صفین، اور نہروان۔

صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتٌ نُّوحٌ وَامْرَأَتٌ لُّوطٍ ط كَانَتَا تَحْتِ

عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحِينَ فَخَاتِمُهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ

ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ﴿١٥﴾

”کافر کے لحاظ سے اللہ نے مثال پیش کی ہے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی جو ہمارے بندوں میں سے دو (۲) نیک بندوں کی زوجیت میں تھیں تو انہوں نے ان سے غداری کی تو ان دونوں نے ان دونوں کو خدا کے عذاب سے کچھ نہیں بچایا اور کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ دونوں آگ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ۔“

یوں تو جیسا کہ درمیان کی آیتوں میں ہم نے کہا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ یہ درمیان کے اجزا سورے کے اصل موضوع اور اس کے ابتدائی حصہ سے مرتبط ہوں مگر اس آیت کا مضمون جو تقریباً انجام سورہ ہے آغاز سورہ کے مضمون سے اتنا مرتبط ہے کہ یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ان میں انہی دونوں بیویوں کے کردار پر تشبیہ ہو کہ انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غداری کی کہ ان کے راز کا افشا کیا اور اس طرح انہیں اذیت پہنچائی اور پھر انہیں نتیجہ سے باخبر کیا جا رہا ہو کہ رسول خدا سے رشتہ زوجیت کا انہیں عذاب الہی سے بچا نہیں سکتا۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتٍ فِرْعَوْنَ مَرَادُ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ

بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿١٦﴾

وَمَرْيَمَ ابْنَتِ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ

بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتِبَ عَلَيْهَا إِتْقَانُهَا وَكَانَتْ مِنَ الْغَابِيَاتِ ﴿١٧﴾

”اور اہل ایمان کے لحاظ سے اللہ نے مثال پیش کی ہے زوجہ فرعون کی جب کہ اس نے کہا اے میرے پروردگار! میرے لیے ایک گھر بنا بہشت میں اور مجھے نجات دے فرعون اور اس کی گزاری سے اور مجھے نجات دے ظالم لوگوں سے اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال جس نے اپنی شرمگاہ کو (مرد کے تعلق سے) بچائے رکھا تو ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح کا ایک جز پھونک دیا اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ پورے طور پر عبادت کرنے والوں میں تھی۔“

جب کہ موضوع سورہ کی مطابقت کے لحاظ سے ایک مثال پیش کر دی گئی تو اب اس کی مناسبت مزید دو (۲) مثالیں پیش کی جا رہی گزشتہ اور سب ملا کر تین قسم کی ہوں گی: ایک مثال: بری عورتیں اور اچھے شوہر۔ یہ مثال پہلے آچکی۔ دوسرے اچھی عورت کا برا شوہر: اس کی مثال زوجہ فرعون ہے جس کا نام قرآن میں نہیں ہے۔ مگر روایات کی بنا پر ان کا نام آسیہ مشہور و معروف ہے۔ ایک تیسری قسم جو یہاں بیان ہو رہی ہیں، وہ ایک مقدس اور پاک باز خاتون ہے جو کسی بھی مرد کے حلقہ زوجیت میں نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اسے بلندی حاصل ہو مگر اپنے طبقہ کی وہ ایک بلند مرتبہ فرد ہے۔ وہ جناب مریم ہیں۔ ان سب مثالوں کا مشترک نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے نتیجہ خیز اس کا ذاتی کردار ہے دوسرے فریق کی طرف نسبت سے اس میں بلندی یا پستی پیدا نہیں ہوتی۔

# سُورَةُ الْمَلِكِ

مکیہ ..... ۳۰ ..... آیات

اس میں پہلی ہی آیت میں چونکہ الملک کی لفظ ہے لہذا اسی پر اس کا نام ہوا۔

## سورہ ملک کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... اللہ کی سلطنت کا اعلان جو ہمہ گیر بھی ہے اور لازوال بھی۔
- ۲..... تخلیق موت و حیات کا مقصد آزمائش اعمال۔
- ۳..... کائنات کا نظم و ترتیب اور اس کی استحکام کے لحاظ سے یکسانی۔
- ۴..... آسمان کی ستاروں سے آرائش، چراغان اور شیاطین کے لیے سنگ باران۔
- ۵..... دوزخ کی کیفیت اور اس کا جوش و خروش۔
- ۶..... اہل دوزخ کا اقرار جرائم۔
- ۷..... اللہ کے لیے آہستہ اور با آواز گفتگو کی یکسانی۔
- ۸..... زمین کے فوائد اور پھر ہر وقت کے خطرات۔
- ۹..... اللہ سے انسان کسی وقت بے نیاز نہیں۔
- ۱۰..... جھٹلانے والوں کے انجام پر مختصر توجہ دہانی۔
- ۱۱..... صحیح طور پر سالکان حق کی قدر و قیمت۔
- ۱۲..... اللہ کی نعمتوں کا بالا جمال تذکرہ۔
- ۱۳..... قیامت کے وقت کا صحیح علم بس اللہ کو۔
- ۱۴..... عذاب الہی سے ہر وقت ڈرتے رہنے کی ضرورت۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِيَدِهِ الْمَلِكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ



وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۙ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٥﴾ الَّذِيْ خَلَقَ  
 سَبْعَ سَمَاوٰتٍ طِبَاقًا ۙ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۗ فَاَرْجِعِ الْبَصَرَ ؕ  
 هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ﴿٦﴾ ثُمَّ اَرْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ  
 حَاْسِبًا ۗ وَهُوَ حَسِيْبٌ ﴿٧﴾

”با برکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اعمال کے لحاظ سے بہتر ہے اور وہ زبردست ہے بخشنے والا جس نے سات آسمان بنائے تہہ پر تہہ تم اس بڑے فیض پہنچانے والے کی تخلیق میں کوئی بے نظمی نہیں پاؤ گے تو موڑو نگاہ کو کہ کیا تمہیں کوئی گڑبڑ دکھائی دیتی ہے، پھر دوبارہ نگاہ موڑو تو نگاہ تمہاری طرف نا کام واپس آئے گی اس عالم میں کہ وہ تھکی ہوئی ہے۔

### موت و حیات ذریعہ آزمائش

تبارک کی لفظ اصل میں برک سے ہے جس کے معنی عربی لغت میں ہیں طائر کا پانی پر ٹھہرا رہنا اور پھر برکت کا مفہوم ہو مال دولت کا نشوونما کے ساتھ قائم و برقرار رہنا اس طرح خالق کے لیے اس لفظ سے اس کا لازوال طور پر بقاء و دوام بھی نکلتا ہے جو اس کے واجب الوجود ہونے کا تقاضا ہے اور اس کا مرکز خیرات ہونا بھی کہ وہ خالق رب کائنات ہے۔ عظمت یعنی بزرگی اور علو برتری، اس ذات کے مقام حقیقت میں شان ہے۔ نہ کہ اس لفظ کا مفہوم مگر قدیم مفسرین اس لفظ کی تشریح کے طور پر انہی پہلوؤں کو اتنا نمایاں کرتے ہیں کہ جیسے وہ اس لفظ کے اصل معنی ہیں اور ان کی بنا پر تبارک کا ترجمہ کبھی یہ ہوتا ہے کہ ”بلند و برتر ہے وہ“ اور کبھی یہ کہ ”عظیم و بزرگ ہے وہ“..... علامہ طبریؒ باوجودیکہ اللغۃ کے عنوان کے ماتحت اس کی اصل وہی بتاتے ہیں جو ہم نے پہلے درج کیا ہے مگر المعنی کے زیر عنوان فرماتے ہیں۔ اخیر سبحانہ عن عظمتہ و علو شأنہ و کمال قدرتہ “خداوند عالم نے اس میں اپنی بزرگ شان کی بلندی اور کامل قدرت کی اطلاع دی ہے“

”جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے“ اس کی نظیریں کئی جگہ پہلے آچکی ہیں اور وہاں بتایا جا چکا ہے کہ ”ہاتھ“ کا مطلب یہ جسمانی ہاتھ نہیں ہوتا۔ خدا جسم اور جسمانیات سے بری ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حصہ سلطنت کسی کے لیے اس کے قدرت و اختیار سے وابستہ ہے اور خود اس کے قدرت اور اختیار کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سلاطین اس کے سامنے بے بس ہیں۔

”موت اور زندگی کو پیدا کیا“ یعنی یہ نظام مقرر کیا۔ اس کے لیے یہ فلسفی بحث دوز کار ہے کہ موت وجودی چیز ہے یا عدی اگر عدی ہے تو اس سے خلق کا تعلق کس طرح ہے اس لیے کہ وہ وجودی ہو یا عدی، بہر حال سلسلہ زندگی کا قطع ہونا جس کا نام موت ہے، اسی کی طرف سے ہوتا ہے لہذا یہ کہنا درست ہے کہ اس نے موت کو پیدا کیا۔ ”تاکہ تمہاری آزمائش کرے“ یہ آزمائش جو اس زندگی کا مقصد ہے یہ اپنے علم کے لیے نہیں ہے بلکہ موقع دینا ہے اس کے ظہور کا کہ کس میں اچھائی کی صلاحیتیں مضمحل ہیں اور کس میں برائی کے جراثیم موجود ہیں جس سے انسان

کے اختیار کا جو ہر نمودار ہو جو اس کی صفت امتیازی ہے۔ ”وہ زبردست ہے“ یعنی طاقت کا مالک ہے لہذا مجرم اس کے قابو سے باہر نہیں ہو سکتا مگر اس کے ساتھ وہ غفور ہے بخشنے والا کہ توبہ کرنے والے کی توبہ کو قبول کرتا ہے اور کبھی بر بنائے تفضل گناہگار کے گناہ سے درگزر کرتا ہے۔ انہی دو باتوں سے مؤمن میں خوف اور رجا کے دونوں پلے برابر سے موجود رہتے ہیں۔ بے نظمی نہیں پاؤ گے، یعنی تمام چیزیں ربط و نظام کے ساتھ ہیں اور ان میں مکمل تناسب پایا جاتا ہے۔ دوبارہ یعنی جتنی دفعہ چاہو، جائزہ لو اور تلاش کرو۔ تمہیں کوئی شکاف یعنی خلل اور خرابی نظر نہیں آئے گی۔ چاہے دیکھو کہ نظریں تھک جائیں اور یہی اس کا قرینہ ہے کہ مرتین جس کا ترجمہ ہم نے دوبارہ اور تبارہ سے کیا ہے کیوں کہ ایک دفعہ تو اس کے پہلے نظر موڑنے کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس سے مراد بھی بس دو ہی دفعہ نہیں ہے کیوں کہ دو تین دفعہ میں تو دیکھنے سے کوئی تھکن پیدا نہیں ہوتی۔ [۱]

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ وَجَعَلْنَا جُودًا لِلشَّيْطَانِ وَأَعْتَدْنَا

لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ⑤

”ہم نے نزدیک والے آسمان کو خاص چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور انہیں شیطانوں کے لیے تیر باراں کا ذریعہ بنایا اور ان کے لیے ہم نے دوزخ کا عذاب تیار رکھا ہے“

خاص چراغوں سے مراد بلاشبہ ستارے ہیں۔ اب یہ تیر باراں کا ذریعہ کس طرح ہیں؟ پہلے بھی علما کی نظر اس پر گئی ہے کہ وہ ستارے اپنی منزل سے ہٹ کر شیطین کے پیچھے نہیں جاتے بلکہ ان کا کوئی جز ہے جو ان کے بھگانے کے لیے تیر کی صورت سے حرکت میں آتا ہے اور یہ شہابے ہیں جنہیں ہم ٹوٹے والے تارا کہتے ہیں۔ یہ نکل کر انہیں آسمان پر جانے سے روکتا ہے۔ آج کل جدید تحقیقات کے پرستار کہتے ہیں کہ ان ستاروں کا جز نہیں موجود ہے بلکہ سابق میں کوئی ستارہ منقر ہوا، اس کے اجزا ہیں جو بے حد شہابیوں کی صورت سے فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں اور کبھی زمین کے حدود میں آجاتے ہیں۔ ان کی بارش شیطانوں کے آسمان پر جانے سے سدراہ ہے۔ بہر حال ظاہر قرآن میں ہر جگہ یہی ہے کہ یہ ستارے یا ان کے اجزا شیطانوں کو عالم بالا پر جانے اور وہاں کے رازوں کے معلوم کرنے سے مانع ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ اس وقت کے لوگوں کو اس حقیقت کے ذہن نشین کرانے کے لئے ہو کہ یہ تصور کہ کاہن لوگ شیطان کے ذریعہ سے فضا و نور اور عالم بالا کے دیگر رازوں کو معلوم کر کے ہمیں صحیح معلومات بہم پہنچاتے ہیں، غلط ہے۔ آخر کا جملہ اس لیے ہے کہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بس بہ تیر باراں ہی ان شیطانوں کے جرائم کی سزا ہے بلکہ یہ تو ان کی شرارت کے دفعیہ کا ایک سامان ہے اور اصل سزا ان کی وہی دوزخ ہے جو ہر کافر کے عذاب کے لیے مہیا اور تیار ہے چاہے وہ جنات کی قوم میں کے کافر ہوں جن میں شیطین داخل ہیں اور خواہ وہ انسانوں میں ہوں جیسا کہ بعد کی آیت سے ظاہر ہے۔

وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ⑥ إِذَا أُلْقُوا فِيهَا

سَمِعُوا هَاهُنَا هَيْفًا وَهِيَ تَفُورٌ ⑦ تَكَادُ تَمَيِّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ

سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ⑧ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ ۗ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا

[۱] لایرید حقیقۃ الشنیہ لقلولہ وھو حسیر ولا بصیر حسیرا امرتین (مجمع البیان)

مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ۝۹ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ

مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝۱۰ فَأَعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ ۗ فَسُحِقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝۱۱

”اور ان کے لیے جنہوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر اختیار کیا، دوزخ کا عذاب ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کا ہولناک شور سنیں گے اور وہ جوش میں ہوگا جیسے کہ غیظ و غضب کی شدت سے وہ پھٹا جاتا ہو جب اس میں کسی دستے کو ڈالا جائے گا تو وہاں کے پھریدار پوچھیں گے کیا تمہاری جانب کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں، ہدایت کرنے والا ضرور آیا مگر ہم نے جھٹلایا، اور کہا کہ اللہ نے کچھ اتارا ہی نہیں ہے۔ تم لوگ نہیں ہو مگر بڑی گمراہی میں۔ اور انہوں نے کہا اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ تو لعنت ہو ان دوزخ والوں پر۔“

عمومیت کے ساتھ کافروں کے انجام میں دوزخ کا اعلان کرتے ہوئے وہاں کی ہیبت ناک کیفیت کے ایک جز کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ نزدیک پہنچتے ہی انہیں اس کا شور سنائی دے گا۔ یوں ایک شور تو ان اہل جہنم کی فریادوں کا اور کرب و اذیت سے نکلی ہوئی صداؤں کا بھی ہے جو پہلے وہاں پہنچ چکے ہیں مگر بعد والے الفاظ اس کا قرینہ ہے کہ یہ شور خود دوزخ کے جوش و خروش کے ساتھ شعلہ وری کا ہے جو اس وقت غضب الہی کا مظہر ہونے کی وجہ سے دل ہلا دینے والی مہیب آوازیں نکال رہا ہے۔ یا وہ فطری آوازیں اس کے جوش کے ساتھ شعلہ وری کی ایسی ہے جیسی دیگ کے کھولنے اور جوش مارنے کے وقت سنائی دیتی ہے جو ایک ادنیٰ مثال ہے اس لیے کہ یہاں کی بڑی سے بڑی دیگ بھی اس دوزخ کے مقابلے میں پہنچ ہے جس میں ابتدائے خلقت سے لے کر آخر عمر دنیا تک مجرم معذب ہو رہے ہوں گے۔ اور یہ ہولناک آواز بھی ان کے عذاب میں اضافہ کا ایک ذریعہ ہوگی۔ [۱]

مخالفین یا پھرہ داروں کا سوال حقیقت واقعہ معلوم کرنے کے لیے اس کا در یافت کرنا نہیں ہے بلکہ اتمام حجت کے لیے خود ان کی زبان سے اقرار کرانے کے لیے ہے کہ ہمارے پاس ہدایت کرنے والے آئے مگر ہم نے ان کی بات نہیں مانی۔ اس لیے ہم اس سزا کے واقعی مستحق ہیں جو ہمیں دی جا رہی ہے اور یہ مقصد سوال کا حاصل ہوا ان کے جواب سے جو بعد میں درج ہے۔ ان کا کہنا کہ ”اگر ہم سنتے یا سمجھتے“ یہ سننے سمجھنے کی طاقتوں کے اپنے میں وجود کا انکار نہیں ہے ورنہ شاید وہ معذور قرار پاتے بلکہ یہ ہے کہ ان طاقتوں کے ہوتے ہوئے ہم نے ان سے کام نہیں لیا اور اسی لیے ان کا یہ کہنا کوئی معذرت نہیں بلکہ اعتراف قرار پایا جس کا قرآن نے ان لفظوں میں کہ فَأَعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ اظہار کیا ہے۔ [۲]

إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝۱۲

”بلاشبہ جو لوگ ان دیکھے پروردگار سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر و ثواب“

[۱] - فيعظم بسماع ذلك عذابهم لما يرد على قلوبهم من هوله (مجمع البيان)

[۲] - قال قد سمعوا وعقلوا ولكنهم لم يطيعوا ولم يقبلوا والدليل على انهم قد سمعوا انهم قد سمعوا وعقلوا ولم يقبلوا قوله

أَعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ (علي ابن ابراهيم)

ظاہر بھی مفہوم ہے جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ بالغیب کی لفظ اس ذات کے وصف کو ظاہر کرتی ہے جس سے ڈرنا ہے یعنی وہ پروردگار جو پردہ غیب میں ہے، جسے انہوں نے دیکھا نہیں مگر غیب پر ایمان کے ماتحت اسے مانا ہے اور یہ جانا ہے کہ وہ ان کے افعال اور اعمال کا نگران ہے، اسی کے احتساب، ناراضگی اور آخر میں عذاب کا خوف ہے جس سے وہ اچھے افعال کے پابند اور برے افعال سے محترز ہیں، نتیجہ انہی کے لیے آخرت کے بڑے مراتب ہیں یہی مفہوم قرآن مجید کی دوسری آیتوں کے مطابق ہے؛ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بالغیب کی لفظ کو ڈرنے والوں سے متعلق قرار دیا ہے کہ وہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ پردہ غیب میں تنہائی میں بھی اللہ سے ڈرتے ہیں کہ اس کی اطاعت کے پابند اور اس کے گناہوں سے دور رہتے ہیں مگر یہ خلاف ظاہر ہے اور مقام حقیقت میں وہ پہلے مفہوم کا لازمی نتیجہ ہے کیوں کہ جو دنیوی نقصان کے اندیشہ سے افعال خیر ہوں گے وہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہی ہوں گے۔ تنہائی میں نہ ہوں گے لیکن جب ان دیکھے پروردگار کا خوف محرک اعمال ہوگا تو اس میں سر اوعلانیاً یعنی خفیہ اور علانیہ کا فرق نہیں ہوگا۔

### وَأَيُّرُوا قَوْلَكُمْ أَوْ اجْهَرُوا بِهِ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٣﴾

”اور تم چپکے چپکے اپنی بات چیت کرو یا اسے آواز کے ساتھ کرو۔ وہ تو سینوں کے اندر کی باتوں کا بھی جاننے والا ہے۔“  
انسان بالکل چپکے چپکے یا بہت دہمی آواز کے ساتھ اکثر اس لیے گفتگو کرتا ہے کہ دوسروں کو اس کا علم نہ ہو لیکن کسی دوسرے کو چاہے علم نہ ہو، اس خدا کو بہر حال علم ہے جو ظاہر و باطن پر حاوی ہے۔ آہستہ کا کیا ذکر، اگر بالکل زبان پر نہ آئے دل کے اندر ہی رہے، تب بھی وہ اس سے واقف ہے لہذا اگر یہ گفتگو اس کی مرضی کے خلاف اور اس کے احکام کے برعکس ہے تو یہ سات پردوں میں چھپ کر گفتگو کرتے تب بھی اس کے احتساب کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔

### أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۗ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٤﴾

”کیا جس نے پیدا کیا ہے، وہ واقف نہ ہوگا؟ حالانکہ وہ باریک بین، باخبر ہے“  
یعنی تمہارا کتم عدم سے عالم وجود میں لانے والا اگر بے شعور اور بجائے خود کوئی بے خبر ہوتا جیسے مادہ یا طبیعت، تو تم مطمئن رہتے کہ جو چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہیں یا وہ کوئی ناقص علم والا ہوتا جو ظاہری مخبروں کا محتاج ہو تو تم آہستہ سے باتیں کر کے اس کی گرفت سے آزاد رہ سکتے تھے لیکن جبکہ تمہارا خالق جو ہر باریک سے باریک بات کا دیکھنے والا ہے تو تم آہستہ سے باتیں کر کے اس پر پوشیدہ کیوں کر رہ سکتے ہو؟۔

### هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ ذُلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ ۗ

### وَالْيَهُ النَّشُورُ ﴿١٥﴾

”وہ وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے قابل استعمال بنا دیا ہے کہ چلو اس کے کاندھوں پر اور کھاؤ اس (اللہ کی) (دی ہوئی) روزی سے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔“

## زمین کی صفت

زمین کی جو صفت بتائی گئی ہے ”قابل استعمال“ اس کے حدود ہر دور زمانہ میں باعتبار ادراک بشر اور ذرائع استعمال کے مختلف رہے ہیں اور ان میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس سے اللہ کی اس مخلوق کے متعدد فیوض و برکات کا احساس اور زیادہ ہونا چاہیے، تاہم اس وقت کے انسانوں کے محدود ذرائع کی حد تک انہیں اس کی طرف دلائی جا رہی ہے، اور قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر نگاہ کو ادھر موڑا گیا ہے اور اس کے دوسرے فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہاں ان تمام فوائد کو اور جن کا آئندہ انکشاف ہوتا رہے ذلولاً کی لفظ میں جس کا ترجمہ ہم نے ”قابل استعمال“ کیا سیٹ کر صراحتاً صرف اس فائدے پر توجہ دلائی گئی کہ ”چلو اس کے کاندھوں پر“۔ چونکہ کاندھوں کی لفظ بلندی کا پتہ دیتی ہے، اس لئے بعض لوگوں نے اُسی کو پہاڑوں کے معنی میں لیا ہے۔ مگر اس کی ضرورت نہیں ہے، انسان زیادہ تر جہاں چلے پھرے گا وہ زمین کی اندرونی تہوں کے مقابلے میں اوپر ہی کا حصہ ہوگا لہذا اسے پشت یا کندھ زمین کا کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کی روزی سے کھاؤ۔ یعنی اللہ نے زمین میں جو نباتات روئیدہ کیے ہیں۔ ان سے غذا حاصل کرو مگر یہ نہ بھولو کہ یہ نعمت کس کی دی ہوئی ہے اور یہ کہ اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ لہذا اپنے فرائض کا ادا کرنا ضروری سمجھو۔

ءَاْمِنْتُمْ مِّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ اَلْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ

مِّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۗ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرٌ ﴿١٧﴾

”کیا تمہیں ڈر نہیں اس سے جو آسمان میں ہیں کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے تو وہ ایک دم بچکولے کھانے لگے یا تمہیں ڈر نہیں اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسائے والی ہوا بھیج دے تو بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری طرف کا ڈرانا کیسا ہوتا ہے۔“

یعنی یوں تو زمین تمہارے لیے گوارہ مسکون بھی ہے اور روزی کا ذریعہ بھی مگر تمہیں اس کے ساتھ اسی سے جس نے یہ تمہارے لیے پیدا کی ہے، اس کے غضب کے تقاضوں سے ڈرتے رہنا چاہیے جس کی بہت صورتیں ہیں جن میں سے بعض کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ خالق کے لیے یہ کہنا کہ آسمان میں ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وہاں (معاذ اللہ) جسمانی طور پر بود و باش رکھتا ہے کیوں کہ وہ لامکان ہے، جسم و جسمانیات سے بری ہے بلکہ چونکہ مقام نسبت میں عالم بالا کا سب سے بلند طبقہ اُس کا عرش یعنی ”پایہ تخت“ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے انسانوں کو اس کا تعارف یونہی کرایا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر ہے اور اسی لیے اس کی طرف سے آنے کو نازل ہونا، اترنا کہتے ہیں اور دعاء یا اعمال خیر جو قابل قبول ہوں ان کے لیے عالم بالا کی طرف جانے کا تصور ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرٌ ﴿١٨﴾

”اور ان کے پہلے جو تھے، انہوں نے جھٹلایا تو میری طرف کی سزا کیسی تھی۔“

اب جیسے روئے خطاب ان کی طرف موڑا گیا اور دوسروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا جانے لگا کہ جن عذابوں سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے، یہ کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ امم سابقہ پر اس کے عذاب آتے رہے ہیں۔ اس کے لیے ان امتوں کے حالات پڑھ لیے جائیں و قرآن

مجید میں بکثرت مقامات پر درج ہیں۔

**أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَفَّتْ وَيَقْبِضْنَ ۗ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ ۗ إِنَّهُ**

**بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ۝۱۹**

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا پرندوں کو اپنے اوپر پر پھیلاتے ہوئے اور سمیٹ بھی لیتے ہیں، انہیں نہیں سنبھالے رہتا (کوئی) (سوا (خدائے) رحمان کے، وہی ہر چیز کی نگرانی کرنے والا ہے۔“

یوں تو طائرؤں کی ہوا میں پرواز، انسانوں اور بہائم وغیرہ کا زمین پر چلنا، مچھلیوں کا دریا میں تیرنا، سب کے طبعی اسباب ہیں لیکن تمام اسباب کا سلسلہ آخر میں تو خدا ہی تک پہنچتا ہے۔ اس نے طائر میں قوت پرواز دی اور ان کے جسم کو اس طرح کا بنایا کہ وہ ہوا میں بلند ہو سکے اور فضا میں اڑ سکے۔ اور یہ چیزیں تو براہ راست اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں جو چیزیں انسان نے سانس کی مدد سے پیدا کی ہیں اور ان میں برابر ترقی ہوتی جا رہی ہے وہ کب ان قوانین سے آزاد ہیں جو اس کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ ماننا ماننا انسان کا کام ہے۔ قرآن کا مقصد نگاہوں کو موڑنا ہے، تاکہ وہ اس پر غور کریں جو حقیقت ہے اسے سمجھیں اور سمجھنے کے بعد اس خدائے واحد کی مائیں جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

**أَمَّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُونِ الرَّحْمَنِ ۗ إِنَّ الْكُفْرَ وَنَّالِ فِي**

**عُرُورٍ ۝۲۰ أَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَرِزُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۗ بَلْ لَّجَّوْا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ۝۲۱**

”آخر کون تمہارا لائشکر ہے جو اللہ کو چھوڑ کر تمہاری مدد کرے۔ یہ کافر لوگ نہیں ہیں مگر دھوکے میں۔ آخر کون ہے یہ جو تمہیں روزی عطا کرے۔ اگر وہ اپنی روزی کو روک لے، بلکہ وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ سرکشی اور حق سے وحشت پر جمے ہوئے ہیں۔“

مشرکین کو زعم باطل تھا کہ ان پر کوئی وقت پڑے تو ان کے اصنام ان کی مدد کریں گے دوسرے لوگوں کو بھی جتھے، اپنے پارٹی یا قوم قبیلے کا غرا ہوتا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں سوال کے پیرایہ میں انہی لوگوں کے اس پندار باطل کو توڑا گیا ہے۔ اگر خدا کی طرف کا عذاب آئے تو یہ لائشکر تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اگر وہ اپنی طرف سے روزی کا دروازہ بند کر دے تو کوئی روزی دینے والا نہیں۔ دونوں آیتوں میں پہلے جیسے ان کی طرف منہ کر کے سوال ہے۔ اور پھر ادھر سے منہ موڑ کر دوسروں سے مخاطب ہو کر ان کے خیال کی رد کی ہے۔

**أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝۲۲**

”تو کیا جو اوندھے منہ چل رہا ہو زیادہ صحیح راستہ پائے گا یا وہ جو سیدھا راہ راست پر جا رہا ہو؟“

پہلی مثال کافروں کی ہے کہ وہ اندھا دھند آباؤ اجداد کی تقلید میں منہ اوندھائے چل رہے ہیں نہ راستے کے نشیب و فراز پر ان کی نظر ہے، نہ نشان منزل پر نگاہ ہے تو وہ کیا منزل مقصد تک پہنچیں گے۔ اس کے برخلاف مؤمنین دلائل حق کو دیکھ کر معلوم کر چکے ہیں کہ صحیح راستہ کون ہے تو یہی وہ ہیں جو سیدھے منزل مقصد پہنچ سکتے ہیں۔

قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا

تَشْكُرُونَ ﴿٢٣﴾ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾

”کیسے وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے سننے اور دیکھنے کی طاقتیں اور دل و ماغ قرار دیے مگر بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو، کیسے وہی ہے جس نے تمہیں ادھر ادھر پھیلا یا ہے اور اسی کی طرف تمہیں سمیٹ کر لے جایا جائے گا“

سابق میں ان سے خطاب کر کے کچھ تازیا نے تشبیہ کے لگائے تھے مگر یہ کہنے کے بعد کہ وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ سرکشی اور قبول حق سے گریز پر جھمکے ہوئے ہیں۔ اب جیسے طور پر ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور اب رسول سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان سے بات کیجیے اور انہیں میری ربوبیت کے دلائل یاد دلائیے اور ان کے کردار کی خامیوں پر توجہ دلائیے۔ انسان کی خلقت کو لفظ انشا سے تعبیر کیا ہے کہ یہ ان تغیرات کے ماوراء ایک چیز ہے جو مادے میں ہوتے رہتے ہیں اور جن سے جسم انسانی کی ساخت ہوتی ہے۔ اصل انسان وہ مجسمہ خاک نہیں ہے بلکہ وہ ہے جسے سورہ مؤمنون میں نطفہ علقہ کی منزلیں طے ہو کر کہہ دیا ہے کہ ”پھر کچھ اور کر دیا“ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ۔ ”کچھ اور کا مطلب یہی ہے کہ وہ نوعیت میں ان جسمانی تغیرات سے الگ ایک خداوندی تصرف تھا“۔ سننے اور دیکھنے کی طاقتیں یعنی حواس ظاہری اور افعیادہ جس کا ترجمہ ہم نے ”دل و ماغ“ کے ساتھ کیا یعنی حواس باطنی اور تفکر و عقل کی طاقت جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ سب اس لیے کہ انسان خود حقیقتوں کو سمجھ کر صحیح راستہ اختیار کرے۔ نہ یہ کہ تقلید کو رانہ کے ساتھ جو جس نے کہہ دیا اسی کو مان لے اور اس پر جم جائے۔ یہی ان نعمتوں کی ناشکری ہے جس کا پہلی آیت کے آخر میں اظہار کیا گیا ہے، پھر مکافات عمل سے انہیں ہوشیار کیا جا رہا ہے کہ تمہیں تمام دنیا میں اس نے پھیلا دیا ہے مگر جب جزا و سزا کا ہنگام آئے گا تو تم سب سمٹ کر موقف حساب میں آ جاؤ گے اور تمہیں تمہارے برے اعمال کی سزا دی جائے گی۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٥﴾ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ

وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢٦﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ

هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَدْعُونَ ﴿٢٧﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو (بتاؤ) کہ یہ وعدہ وعید پورا کب ہوگا؟ کیسے کہ اس کا علم تو بس اللہ کو ہے اور میں صرف صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں تو جب وہ اسے نزدیک دیکھیں گے تو کافروں کے چہروں کا برا عالم ہوگا اور کہا جائیگا یہی وہ جس کا تم تقاضا کرتے تھے۔“

ان کا یہ مطالبہ قطعاً سنجیدگی کے ساتھ نہ تھا کہ وہ واقعی قیامت کے وقت کو پوچھنا چاہتے ہوں بلکہ یہ انکار کا ایک بیہوشیہ تمسخر و استہزاء کا انداز تھا۔ اگر بالفرض وقت بتایا بھی جاتا تو وہ انکار پر قائم رہتے اور کہتے ہمیں کیا معلوم کہ جو آپ کہہ رہے ہیں، وہ درست ہے اور اس لیے ظاہر قرآن یہ ہے کہ یہ علم حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطا نہیں ہوا اس لیے کہ آپ کے فرائض میں اس کا دخل نہ تھا۔ آپ کا کام خلق خدا کو مکافات عمل کے ضروری ہونے پر متنبہ کرنا تھا جسے ثبوت خدا کے عقل بھی بتاتی ہے اور اس کی نوعیت بتانا تھی جو قیامت اور اس کے احوال و احوال کے بیان

کے ساتھ مؤثر ترین انداز میں پیش کی گئی۔ اس کی تصدیق کے لیے وہ دلائل تھے جو آپ کی رسالت کی حقیقت کو بتا رہے تھے جن پر غور کرنا اور ان کے تقاضا کے مطابق ایمان اختیار کرنا سننے والوں کا کام تھا اور جس سے ہٹ دھرمی کے طور پر انحراف کر کے وہ ان عذابوں کے مستحق ہو رہے تھے جو کفار مشرکین کے لیے یہ بتا رہے تھے اور اسی آخر میں کہا گیا ہے کہ جب وہ دن آجائے گا تو تمہارا برا عالم ہوگا۔

**قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكْنِي اللَّهُ وَمَنْ مَعِيَ أَوْ رَحِمَنَا ۖ فَمَنْ يُجِيرُ الْكَافِرِينَ مِنْ**

**عَذَابِ أَلِيمٍ ﴿٣٨﴾**

”کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ختم بھی کر دے یا اپنی رحمت ہمارے شامل حال رکھے تو (بہر صورت) کافروں کو دردناک عذاب سے کون پناہ میں رکھے گا؟“

کافر لوگ آپس میں کہتے تھے کہ کسی طرح یہ اور ان کے مٹھی بھر ساتھی ختم ہو جائیں جنہوں نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے تو ہم آرام کی نیند سوئیں تو کہا جا رہا ہے کہ جب میرے ذریعے سے صدائے حق تم تک پہنچ چکی اتمام حجت ہو گیا تو اب اگر جائیں تو تم اس عذاب سے بچ تو نہیں سکتے جو کافروں کے مقرر ہے۔ ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ ہم مؤمن ہوتے ہیں امید و بیم کے درمیان رہتے ہیں جو تقاضائے ایمان ہے تو کافر لوگوں کے لیے تو امید کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں، وہ عذاب سے کیوں بچ سکتے ہیں [۱] مگر پہلا مفہوم ذہن نشین زیادہ ہے۔

**قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ أَمَّنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۖ فَسْتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٣٩﴾**

”کہئے کہ وہ خدائے رحمن ہے جس پر ہم ایمان لائے ہیں اور اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اب تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔“

چونکہ مشرکین لفظ رحمن سے وحشت کرتے تھے، اس لئے اس سورے میں بار بار اس کا نام رحمن ہی لیا گیا ہے اور کہا ہے کہ وہ یعنی جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں رحمان ہے۔

تمہیں جلد ہی معلوم ہوگا، اس میں اب و لہجہ جیسے ملائم اختیار کر لیا ہے یعنی ابھی تم غور نہیں کر رہے ہو۔ اگر ذرا سوچو سمجھو اور غور کرو تو پتہ چل جائے گا کہ سیدھا راستہ کون سا ہے۔! کون اس راستے پر چل رہا ہے اور کون کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔

**قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَّعِينٍ ﴿٤٠﴾**

”کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے اگر تمہارا پانی تہہ نشین ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے لیے تھریں پانی کے سوتے پھر جاری کر دے؟“

یعنی یہ پانی جس پر تمہاری زندگی موقوف ہے، اسی رحمن کی فیض سے وابستہ ہے۔ کنوؤں میں یہ سوتے پانی کے اسی کے حکم سے جاری ہوتے ہیں۔ اگر یہ بند ہو جائیں تو جب تک وہ نہ چاہے کوئی دوسرا ان کے جاری کرنے پر قدرت نبی رکھتا۔

[۱] - نحن مع ایماننا باین الخوفۃ فمن یجیرکم مع کفرکم من العذاب (مجمع البیان)



# سُورَةُ الْقَلَمِ

مکیہ ..... ۵۲ ..... آیات

یہ سورہ ادھر کے دوسرے سوروں کے تناسب سے ایسا بڑا نہیں ہے مگر چونکہ آیتیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں لہذا تعداد ان کی بہ نسبت سابق کے سوروں کے کافی زیادہ ہے اور پہلی ہی آیت میں قلم کا ذکر ہے اور اس سے قبل ن کی لفظ ہے لہذا اس کا نام یہ دونوں ہوئے، سورہ قلم بھی اسے کہتے ہیں اور سورہ نون بھی۔

## سورہ قلم کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... قسم کھا کر قلم اور اس کی افادیت کا ثبوت۔
- ۲..... حضرت پیغمبر خدا ﷺ کو (معاذ اللہ) دیوانہ کہنے والوں کی رد۔
- ۳..... حضرت کی اخلاقی رفعت کا بتا کید بیان۔
- ۴..... اصول سے ہٹ کر کسی سبھوتے کی ممانعت۔
- ۵..... ایک سرکش کا فرک کردار۔
- ۶..... ایک باغ کے مالکوں کا غلط طرز عمل اور اس کا انجام۔
- ۷..... اطاعت گزار اور نافرمان کے انجام میں فرق کا ضروری ہونا۔
- ۸..... قیامت کے سخت ہنگام کی یاد آوری۔
- ۹..... کافروں پر نعمتوں کی بارش بر بنائے مہربانی نہیں بلکہ تمہیدی عذاب ہے۔
- ۱۰..... مشرکین کو آپ سے مخالفت بلا وجہ ہے۔
- ۱۱..... آنحضرتؐ کو صبر و ثبات کی تلقین۔
- ۱۲..... حضرت یونسؑ کے ترک اولیٰ کا اظہار۔۔۔۔۔ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ﴿۱﴾ مَا أَنْتَ بِبِعَمَةٍ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ﴿۲﴾ وَإِنَّ لَكَ

## لَا جْرَ اٰخِرٍ مِّنْهُمْ ۗ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلِقْتَ عَظِيْمًا ﴿۴﴾

”نون“ قسم ہے قلم کی اور اس کی جسے لوگ لکھتے ہیں، آپ اپنے پروردگار کے فضل و کرم سے دیوانے نہیں ہیں، یقیناً آپ کے لیے بڑا اجر ہے جس کا احسان آپ پر جتایا نہیں جائے گا اور بلاشبہ آپ عظیم اخلاق کے درجے پر فائز ہیں۔“

پہلی لفظ یعنی نَ مقطعات قرآنیہ میں سے ہے جن کے معانی عموماً قدرتی راز کی حیثیت رکھتے ہیں اور چون کہ وہ مقطعات میں سے ہے اس لیے وہ بطور ایک لفظ کے قرآن میں لکھی گئی ہے بلکہ بطور ایک حرف کے جیسے مقطعات کے لکھنے کا عام اصول ہے کہ الف لام میم کو آلفہ اور حائیم کو حیم اور حاء، میم، عین، س، قاف کو حَمَعَسَق لکھتے ہیں۔ یہ لکھنے کا طریقہ اسی بنا پر ہے کہ انہیں رمز کے طور پر انفرادی حیثیت حاصل ہے اور اس کا علم اس نے انہی کو دیا تھا جو اس کے راز دار تھے،

اس کے بعد قلم کی قسم کھائی گئی ہے، اس سے مراد مطلق قلم ہو تو پھر مایسٹرون ”جسے لکھتے ہیں“ اسے بھی مطلق ہونا چاہیے جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا کہ ”لوگ لکھتے ہیں“۔ چونکہ عرب میں عموماً لوگ اس فن سے بے بہرہ تھے لہذا قرآن نے قسم کے ن پیرائے میں اس کی رفعت اور اہمیت ان کے ذہن نشین کرائی۔ اب اگر کوئی قلم کا غلط استعمال کرے اور اس سے گمراہی خلق کا سامان فراہم کرے یا فساد پھیلانے کا کام لے تو اس سے اصل چیز کی افادیت متاثر نہیں ہوگی جیسے اللہ کی نعمتوں کا غلط استعمال جو ان کی اہمیت اور افادیت کو مجروح نہیں کرتا۔

بعض لوگوں کی نظر شاید اس پہلو کی طرف گئی ہے تو انہوں نے مایسٹرون سے مراد وہ فرشتے لے لیے ہیں جو اللہ کی طرف کی وحی کو اور خلق کے اعمال کو لکھتے ہیں لیکن اس صورت میں قلم سے مراد بھی وہی فرشتے ہونا چاہئیں، قلم دنیا والے کا ہو اور لکھنے والے فرشتے ہوں جیسا کہ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان معلوم ہوتا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

مجاہد نے جو جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ایک قدیم مفسر ہیں قلم کی تشریح اس قلم کے ساتھ کی ہے جس سے قرآن لکھا جاتا ہے اس صورت میں مایسٹرون سے مراد قرآن ہوگا۔ اب اس کا ربط پہلے والے مضمون سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ خالق پہلے قرآن کی طرف نظروں کو موڑ کر اور اس کے بعد میں آپ کی اخلاقی عظمت کو پیش کر کے بیچ والی حقیقت پر زور دے رہا ہے کہ اگر یہ لوگ ان دونوں چیزوں پر غور کریں۔ اس کتاب کو دیکھیں جسے آپ پیش کر رہے ہیں اور خود آپ کو دیکھیں کہ آپ کتنے بلند اخلاق کے حامل ہیں تو انہیں اپنے اس الزام کا غلط ہونا سمجھ میں آجائے کہ معاذ اللہ آپ میں کسی قسم کی دیوانگی ہے۔ اسے خود آپ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے اور مقصود دوسرے لوگوں کی آنکھوں کا کھولنا ہے جو اس قسم کا غلط تصور رکھتے ہیں۔

”آپ کے لیے بڑا اجر ہے“۔ سیاق کی مناسبت سے اس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً ان لوگوں کی اس بات سے کہ وہ ”دیوانہ“ کہہ کر آپ کی ہدایت و تعلیم کو ناقابل قبول قرار دیتے ہیں اور آپ کے لیے ایسی غلط لفظ کا استعمال کرتے ہیں آپ کو بڑی اذیت اور تکلیف ہوتی ہے جسے آپ برداشت کرتے ہیں۔ اس پر آپ کے لیے اللہ کے یہاں بڑا اجر ہے۔ حقیقت میں ربوبیت اور عبودیت کے رشتے کی بنا پر وہ تفضل ہے لیکن خود اس نے جب اجر کہہ کے مقرر کیا ہے تو یہ اس کا ضامن ہے کہ اس پر احسان جتایا نہ جائیگا جو غیر ممنون کی ایک تفسیر ہے اور جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

دوسری قسم تفسیر یہ ہے کہ ممنون کے معنی مقطوع کے ہیں یعنی وہ اجر ثواب دائمی ہوگا کبھی ختم نہ ہوگا۔ خلق کی لفظ ہماری زبان میں تو محدود ہے۔ ہم اسے بس میل جول میں خاطر تواضع کے معنی میں لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہماری نزدیک اس میں سچائی کا بھی دخل نہیں ہے۔ اگر ہمارا کسی سے کوئی کام ہے اور وہ سچائی کے ساتھ اپنی مجبوری کا اظہار کر دے تو وہ ہمارے نزدیک بد اخلاق ہے لیکن اگر وہ جھوٹا وعدہ کر لے چاہے وہ اسی وقت سمجھتا ہو کہ اس پر عمل نہیں کرے گا تو وہ خوش اخلاق ہے پہلا اس لیے بد اخلاق قرار دیا گیا کہ اس نے ہمیں دھوکے میں نہیں رکھا۔ صاف صاف اپنے موقف کا اظہار کر دیا اور دوسرا اس لئے خوش اخلاق ہو گیا کہ اس نے میں تاریکی میں رکھا اور بتلائے فریب رکھ کر پریشان کیا۔ ایسی صورت میں ہم خالق کی اس سن کی قدر و قیمت کیا سمجھ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں خلق کی لفظ محدود نہیں ہے وہ ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہے۔ چاہے انفرادی زندگی ہو، چاہے منزلی زندگی ہو اور چاہے بیرونی اجتماعی زندگی ہو، رسول کو خالق نے ”خلق عظیم“ کی سند دے کر ہر شعبہ حیات میں آپ کی سیرت کی بلندی پر مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے۔

**فَسْتَبْصِرْ وَيُبْصِرُونَ ۝۵ بِأَيْسِكُمُ الْيَفْتُونَ ۝۶ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ**

**سَبِيلِهِ ۝ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝۷**

”تو بہت جلدی آپ بھی دیکھ لیجیے گا اور انہیں بھی دکھائی دے جائے گا کہ تم میں سے کس میں دیوانگی ہے۔ یقیناً آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے اسے جو اس کی راہ میں سے ہٹا ہوا ہے اور وہ زیادہ جانتا ہے انہیں جو سیدھے راستے پر ہیں۔“

رسول کو مخاطب ہو کر یہ کہنا کہ آپ بھی دیکھ لیجیے گا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معاذ اللہ آپ کو بھی اپنے متعلق شبہ تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ نتائج سامنے آجائیں گے اور سب ہی دیکھ لیں گے یہ دیکھنا آپ کے لیے باعث تسلی ہوگا یعنی ان کی باتوں سے جو رنج پہنچ رہا ہے وہ دور ہو جائے گا اور ان کے لیے باعث حسرت و ندامت ہوگا جس کا عذاب آنے کے بعد کوئی حاصل نہ ہوگا۔

**فَلَا تُطِيعُ الْمَكْدِبِينَ ۝۸ وَذُؤَالُو تَدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ۝۹ وَلَا تُطِيعُ كُلَّ حَلَّافٍ**

**مَهِينٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ مَشَاءٍ بِنَمِيمٍ ۝۱۱ مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝۱۲ عَتَلٌ بَعْدَ ذَلِكَ**

**زَنِيمٍ ۝۱۳ أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝۱۴ إِذَاتُ تَلَى عَلَيْهِ أَيْتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ**

**الْأُولَئِينَ ۝۱۵ سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرُطُومِ ۝۱۶**

”تو آپ جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مانے، وہ چاہتے ہیں کہ آپ رورعایت سے کام لیں تو وہ بھی رورعایت کریں اور کہنا نہ مانے ہر بڑے قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کا جو نکتہ چینی کرنے والا اور چغلیاں کھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا، خیر خیرات کو روکنے والا، تم گناہگار سرکش اور پھر اس کے بعد بداصل ہے، اس برتے پر کہ وہ مال اور اولاد والا ہے، جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پیش ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ

پرانے لوگوں کی داستائیں ہیں بہت جلد ہم اس کی سونڈ پر داغ لگا دیں گے۔“

قرآن مجید کے انداز بیان سے ظاہر ہے کہ یہ عام اوصاف نہیں ہیں بلکہ کسی شخص خاص کو ذکر میں صرف جو اپنے ان اوصاف کے ساتھ قوم میں مشہور معروف تھا، جو لفظیں اس شخص کے بارے میں صرف کی گئی ہیں، ان میں سے متعدد الفاظ کے لغت اور محاورے کے لحاظ سے کئی کئی معنی بتائے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ ان میں سے ایک ہی کے لحاظ سے ہو سکتا ہے۔

خصوصیت کے ساتھ عقل جس کا ترجمہ ہم نے ”موذی“ کی لفظ سے کیا ہے۔ اس کے معنی یہ بھی کہے گئے ہیں کہ وہ مختلف صورتوں سے لوگوں کو قید و بند میں مبتلا کرانا اور سزائیں دلواتا ہے اور اور یہ بھی کہ خود بہت کھاتا ہے اور دوسروں کو کھانا پسند نہیں کرتا اور یہ بھی بلاوجہ لڑتا جھگڑتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اصل میں یہ اس کلام کو کہتے ہیں جو بہت سخت ناگوار اور تکلیف دہ ہو۔  
زینم کے ایک معنی لیے گئے ہیں کہ وہ شریہ شخص کہ جب شریہ کی لفظ کئی جائے تو سب کا ذہن اسی کی طرف منحرف ہو جائے اور زیادہ تر وہ جس کے اصل باپ کا پتہ نہ ہو اور وہ غلط طور پر کسی خاندان میں داخل سمجھا جانے لگا ہو۔

”اس کا کہنا نہ مانئے“ اس سے ظاہر ہے کہ عام جھٹلانے والوں کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ اس شخص نے رسول کے سامنے کوئی شرط پیش کی تھی کہ اگر آپ ایسا کیجیے تو ہم آپ کی مخالفت چھوڑ دیں گے اور وہ شرط ظاہر ہے یہی ہو سکتی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کے خلاف تبلیغ چھوڑ دیں لیکن اگر آپ ایسا کرتے تو آپ کا مشن ہی پھر کیا رہ جاتا، اسی لیے اس کے مقابلہ میں ایسے سخت الفاظ صرف کیے گئے جن کا وہ مستحق تھا۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ سَنَسِمْهُ عَلَى الْخُرْطُوْرِ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ”ہم اس کی سونڈ پر داغ لگا دیں گے“ یوں تو سونڈ اصل میں ہاتھی کی ہوتی ہے۔ مگر ناک چونکہ عزت اور شرافت کا رمز سمجھی جاتی ہے اور وہ اپنے کو بڑا اور شاندار سمجھتا تھا، لہذا بطور طنز اس کی ناک کو سونڈ کہا گیا ہے اور یوں تو ناک پر داغ لگا دیں گے۔ اس کا مطلب عزت اور شرافت کا ختم کرنا اور ذلیل و رسوا کرنا ہو سکتا ہے اور اس کا آخرت سے بھی تعلق ہو سکتا ہے۔

مگر بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ جنگ بدر میں اس کی ناک پر تلوار پڑی اور اس طرح قرآنی خبر کی سچائی ثابت ہوتی ہے، یہ شخص کون ہے؟ اس کے لیے ولید بن مغیرہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اور اسود بن یغوث کا اور انس بن شریق کا۔ اس کا اصل مضمون اور اس کے مقصد میں کوئی دخل نہیں ہے۔

إِنَّا بَلَوْنَهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ﴿١٦﴾ وَلَا

يَسْتَثْنُونَ ﴿١٧﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿١٩﴾ فَأَصْبَحَتْ

كَالضَّرِيْمِ ﴿٢٠﴾ فَتَنَادُوا مُصْبِحِينَ ﴿٢١﴾ أَنْ اغْدُوا عَلَي حَرِثِكُمْ إِنَّ كُنْتُمْ

طَرِ مِيْنِ ﴿٢٢﴾

”ہم نے ان (مشرکین مکہ) کو ویسے ہی آزمائش میں ڈالا ہے جیسے ایک خاص باغ والوں کو، جب انہوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح ہوتے ہوتے اس کے پھل توڑ لیں گے اور وہ اس میں کوئی قید بھی نہیں لگا رہے تھے تو رات رات اس

پر آگئی ایک آفت تمہارے پروردگار کی، جب کہ وہ سورہے تھے تو وہ ہو گیا مثل اس کھیتی کے جو کاٹی جا چکی ہو تو انہوں نے صبح ہوتے ایک دوسرے کو آواز دی کہ چلو کھیتی کی طرف اگر تمہیں کاٹنا ہے۔“  
کہا جاتا ہے کہ یہ یمن کے ایک باغ کا قصہ ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:-

كانت شيخ كان يمسك منها قدر كفايته و كفاية اهله و يتصدق بالباقي فلما مات قال بنوه نحن احق بهالكثرة عيالنا ولا يسمعنا ان نفعل كما فعل ابونا وعز مواعلي حرمان المساكين فصارت عاقبتهم الى ما قص الله تعالى في كتابه... (مجمع البيان)

یہ واقعہ ایک بوڑھے آدمی کا تھا جو اس میں سے اپنے اور اپنے اہل عیال کے لیے کافی ہونے کی مقدار بھر محفوظ رکھتا تھا اور باقی کو خیرات میں دے دیتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے بیٹوں نے کہا کہ ہمارے اہل عیال زیادہ ہیں اس لیے ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں اور ہم وہ نہیں کر سکتے جو ہمارے والد کرتے تھے اور انہوں نے مضبوط ارادہ کیا کہ وہ غریبوں کو محروم رکھیں گے تو ان کا انجام وہ ہوا جو خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہاں بیان کیا ہے۔

لا یستثنون جس کا ترجمہ ہم نے کیا ”وہ کوئی قید نہیں لگا رہے تھے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنے منصوبے کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ وہ اپنے اس ارادہ کے قطعی اظہار کے ساتھ انشاء اللہ بھی نہیں کہہ رہے تھے کہ اگر خدا نے چاہا تو وہ پورے باغ کے پھلوں کو توڑ کر اپنے گھر لائیں گے۔

آخر کے جملے میں ”کھیتی“ کی لفظ کے لیے کہا گیا ہے کہ اس باغ میں درختوں کے بیج بیج میں کھیت بھی ہوں۔ اس لیے انہوں نے حرث یعنی کھیتی کی لفظ استعمال کیا ہے۔

فَانْطَلِقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ ﴿٢٣﴾ اَنْ لَا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مَسْكِينٌ ﴿٢٤﴾  
وَعَدُوا عَلَى حَرْدٍ قَدِ رَيْنَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوا اِنَّا لَضَالُّونَ ﴿٢٦﴾ بَلْ نَحْنُ  
مُحْرَمُونَ ﴿٢٧﴾

”تو وہ روانہ ہوئے اس حال میں چپکے چپکے آپس میں کہہ رہے تھے کہ دیکھو خبردار آج تیرے پاس اس باغ میں کوئی غریب فقیر آنے نہ پائے اور اس کنجوسی پر بالکل تل کر اس اطمینان کے ساتھ کہ وہ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں جلدی وہ وہاں پہنچے تو جب اسے (اس حال میں) دیکھا تو کہا یقیناً ہم بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ گئے بلکہ ہم ہی ناکام و نامراد ہیں۔“  
یعنی جب انہوں نے خلاف توقع باغ کا یہ عالم دیکھا تو پہلے سمجھے کہ کوئی دوسرا باغ ہے ہم راستہ بھول کر ادھر آگئے ہیں پھر غور سے دیکھا تو کہنے لگے ارے یہ تو ہمارا ہی باغ ہے اور بد نصیبی ہمارے شامل حال ہو گئی ہے کہ ہمارے باغ کا یہ عالم ہو گیا ہے۔

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تَسْبِحُونَ ﴿٢٨﴾ قَالُوا سُبْحٰنَ رَبِّنَا اِنَّا كُنَّا

ظَلِيلِينَ ﴿٢٨﴾ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَلَوْمُونَ ﴿٢٩﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا  
طَٰغِيْنَ ﴿٣٠﴾ عَسَى رَبُّنَا أَنْ يُبَدِّلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَى رَبِّنَا رَاغِبُونَ ﴿٣١﴾ كَذٰلِكَ  
الْعَذَابُ ۗ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَكْبَرُ ۗ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٣٢﴾

”جو ان میں سے سب سے بہتر تھا کہنے لگا کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ کیوں تم اللہ کو یاد نہیں کرتے ہو انہوں نے کہا پاک ہے ہمارا رب یقیناً ہم ظالم ہیں تو ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے لعنت ملامت کرنے لگے، کہنے لگے وائے ہو ہم پر بے شک ہم سرکش تھے ممکن ہے اب ہمارا پروردگار ہمیں اس کے بدلے اس سے بہتر عطا کر دے یقیناً ہم اپنے پروردگار سے لو لگائے ہوئے ہیں۔ اس طرح ہوتا ہے عذاب خدا۔ اور بلاشبہ آخرت کا عذاب بہت زیادہ بڑا ہے اگر وہ جانیں۔“

کہا گیا ہے کہ یہ ان بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا جس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ تمہارا رویہ غلط ہے۔ نہ وہ منصوبہ تمہارا درست ہے کہ غریبوں کو بالکل محروم کر دو۔ نہ تمہارا اپنے ارادے کی کامیابی پر اتنا اعتماد کہ تم اس کے ساتھ انشاء اللہ بھی نہیں کہتے۔ اب جب انجام سامنے آیا تو ایک دوسرے کو الزام دینے لگا کہ تم ہی نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ ورنہ ہم ایسا نہ کرتے اور یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتِ النَّعِيمِ ﴿٣٣﴾ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ  
كَالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٤﴾ مَا لَكُمْ ۖ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٥﴾

”یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں نعمت کے گھنے ہوئے باغ ہیں کیا ہم اطاعت گزاروں کو مثل گناہگاروں کے کر دیں گے، تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے حکم لگاتے ہو۔“

کافر لوگ کہتے تھے کہ ہم دنیا میں مزے کر رہے ہیں تو آخرت میں بھی ہم مزے میں رہیں گے اور یہ مسلمان اور پیغمبر کے گروہ میں لوگ یہاں تختیوں اور مصیبتوں میں ہیں تو دیکھنا یہ وہاں بھی تکلیف ہی اٹھائیں گے۔ اس کے جواب میں کہا جا رہا کہ یہ فیصلہ تمہارا بالکل خلاف عقل ہے وہ عالم تو جزو سزا کا ہوگا۔ اس میں یہ ممکن ہی نہیں کہ اطاعت گزار اور نافرمان یکساں ہو۔ چہ جائیکہ نافرمانوں کا انجام بہتر ہو یا فرمان بردار برے حال میں رہیں۔

أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ﴿٣٦﴾ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ﴿٣٧﴾ أَمْ لَكُمْ آيْمَانٌ  
عَلَيْنَا بِالْعَهْدِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ﴿٣٨﴾ سَلِّمُوا إِلَيْهِمْ بِذٰلِكَ  
رَعِيْمٌ ﴿٣٩﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ ۖ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ ۖ إِنَّ كَانُوا صٰدِقِينَ ﴿٤٠﴾

”کیا تمہاری کوئی خاص (آسانی) کتاب ہے جس میں یہ تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے وہی ہے جو تم پسند کرتے ہو یا

کیا تم نے ہم سے کچھ قسمیں لے لی ہیں جو قیامت تک کے لیے ہیں کہ تمہارے لئے وہی ہے جو تم حکم لگاتے ہو۔ ان سے پوچھو کہ ان میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ یا ان کے کچھ آدمی (ہمارے) شریک کار ہیں تو وہ اپنے شریکوں کو پیش کریں، اگر وہ سچے ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ عقل کا فیصلہ تو ان کے خلاف ہے جسے سابق جملوں میں ظاہر کیا گیا اور خلاف عقل ہونے کا اظہار یہ کہہ کر کیا گیا ہے۔ کیسے فیصلے کرتے ہو۔ اب بطور استفہام انکاری پوچھا جا رہا ہے کہ پھر تمہارے پاس اس کا ماخذ کیا ہے؟ کہاں سے یہ حکم لگاتے ہو؟ کیا تورات اور انجیل وغیرہ کے علاوہ جنہیں ہم جانتے ہیں، اس طرح کی کوئی خاص کتاب تمہاری ہے جس میں اُٹی گروہ کے لوگ تھے۔ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ تھی تو وہ کس کتاب میں لکھا ہوا دکھا سکتے تھے جو وہ کہہ رہے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ براہِ راست تمہارا کوئی آدمی اللہ سے ملا ہے اور اس نے اس سے قسمیہ طور پر قیامت تک کے لیے یہ عہد و پیمانہ لے لیا ہو تو آخر وہ تمہارا نمائندہ جو اللہ سے ملا ہو کون ہے؟ اس کی صورت ہمیں دکھاؤ۔ یا نہ عقل کی بنا پر تمہارا یہ فیصلہ ہے، نہ کسی کتاب آسمانی میں تم نے یہ لکھا ہوا پایا ہے۔ نہ تم میں سے کسی نے منہ در منہ اللہ سے یہ عہد لیا ہے۔ تو اچھا ایک صورت یہ ہے کہ خود تم میں اس کے کچھ شریک کار ہیں جو خود ایسے فیصلے کرتے ہیں اور خاندان کے فیصلوں کا پابند ہے؟ توہ شریک کا اس کے کون ہیں؟ انہیں ہمارے سامنے لاؤ۔ یہ ایسے جھوٹے تھے کہ ڈھٹائی کے باوجود ادعا بھی وہ ان کے پیش کرنے سے قاصر تھے۔

**يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٢٣﴾ خَاشِعَةً**

**أَبْصَارُهُمْ تَرَاهُمْ ذَلَّةً ۖ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَلِيمُونَ ﴿٢٤﴾**

”جس دن بڑی سختی کا ہنگام ہوگا اور کہا جائے گا سجدہ کرنے کو تو وہ سجدہ نہیں کریں گے ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ذلت ان پر چھائی رہی ہوگی حالانکہ انہیں سجدے کی دعوت دی جاتی تھی اس وقت جب صحیح سالم تھے۔“

اس آیت میں لفظ ساق متشابہات میں سے ہے جس کے لیے روایتی دنیا میں آگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی پر سے پردہ ہٹائے گا اور کہا جائے گا کہ سجدہ کر لیکن خداوند عالم کے جسم اور جسمانیات سے بری ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں ان الفاظ سے کہ یکشف عن الساق جس کا لفظی ترجمہ یہی ہوا کہ پنڈلی کو کھولا جائے گا، یہ مفہوم نہیں سمجھا جاسکتا کہ خدا تعالیٰ خود اپنی پنڈلی کھول کر اہل محشر کو سجدے کی دعوت دے گا بلکہ کلام عرب میں یہ محاورہ ہے کہ سختی اور پریشانی کے موقع کا تصور پیدا کرنے کے لیے کشف ساق کی لفظ استعمال کرتے ہیں کیوں کہ پریشانی کے وقت گھبراہٹ میں راستہ طے کرتے ہیں، دامن اٹھا کے اس طرح پنڈلیاں نمایاں ہو جائیں قرآن مجید میں اس موقع کی سختی کے اظہار میں بطور کنایہ ان لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال یوں تو قیامت پوری ہی شدت و ہول کا مرقع ہے مگر یہ خاص موقع کوئی ایسا ہوگا جب یہ معاملہ پیش آئے گا۔ حکم الہی ہوگا کہ سجدہ کرو، مومنین جو صدق دل سے دنیا میں سجدہ ریز رہے تھے بلا توقف سجدے میں پیشانی رکھ دیں گے مگر منافقین جو دنیا میں سجدہ کرتے ہی نہ تھے یا کرتے بھی تھے تو بجز واکراہ نمائشی طور پر وہ اس وقت چاہیں گے کہ اظہارِ عبودیت کے طور پر سجدہ کریں مگر ان کی پشت مثل تختے کے سخت ہو جائے گی وہ سجدہ نہیں کر سکیں گے۔

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَدِّبْ بِهَذَا الْحَدِيثِ ط سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾

وَأْمَلِي لَهُمْ ط إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿٣٤﴾

”تو وہ چھوڑ دو مجھے اور انہیں جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں۔ ہم انہیں رفتہ رفتہ تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کی انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ اور میں انہیں دھکیل دوں گا، یقیناً میری چال مضبوط ہوتی ہے۔“  
یعنی کافروں کو اور رسولؐ کے پیغام حق کے جھٹلانے والوں کو جو نعمتوں کی بظاہر بارش ہو رہی ہے اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے یہ عذاب الہی کی ایک صورت ہے کہ یہ اس کی نافرمانی کرتا ہے اور پھر وہ اسے ایک نعمت دے دیتا ہے۔ اس طرح اس کی خدا فراموشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور آخر میں ایک دم وہ عذاب آجاتا ہے جاوہ اپنے کفر اور معصیت کی وجہ سے مستحق تھا۔ اس کو قرآن مجید نے استدراج اور املاء کی لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسی کو اپنے چال کہا ہے کہ وہ بے پناہ ہوتی ہے۔

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ﴿٣٥﴾ أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ

يَكْتُبُونَ ﴿٣٦﴾

”تو کیا آپ ان سے کسی اجرت کے طلب گار ہیں کہ یہ مالی نقصان کے تصور سے زیر باری محسوس کر رہے ہیں یا ان کے پاس غیب کی خبریں ہیں جنہیں یہ لکھا کرتے ہیں۔“

یہ اب پھر گزشتہ انکاری سوالوں کے سلسلے کی دو کڑیاں آگئی ہیں کہ آخر وہ آپ کے پیغام حق سے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ کیا سمجھتے ہیں کہ اگر وہ آپ کو سچا رسول مان لیں گے تو ان سے آپ سے اپنے ہدایت پر کوئی ایسا مالی معاوضہ طلب کریں گے جس سے ان کی جیبوں پر بہت بڑا بوجھ پڑیگا اور وہ اس بار کو برداشت نہیں کر سکیں گے، تو یہ غلط ہے آپ ان سے کسی مالی معاوضہ کے طلب گار نہیں ہیں آپ تو انہی کی بہبودی کے لیے خالصاً لوجہ اللہ یہ سب مصائب برداشت کر رہے ہیں تو وہ پھر آپ کی مخالفت کیوں کر رہے ہی۔ اچھا تو کیا انہیں غیب پر کوئی دسترس حاصل ہو گیا ہے اور انہیں ذاتی طور پر علم ہو گیا ہے کہ اللہ نے آپ کو رسول نہیں بنایا ہے اور آپ کا دعویٰ سچا نہیں ہے؟ تو یقیناً ایسا بھی نہیں ہے۔ ہر پھر کر نتیجہ یہ ہے کہ ان کی مخالفت بے بنیاد ہے اور وہ بلا وجہ آپ کے پیغام کی مخالفت میں اتنی شدت کے ساتھ گرم ہیں۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَى وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٣٧﴾ لَوْلَا

أَنْ تَدْرَكَهُ نِعْمَةٌ مِّنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿٣٨﴾ فَاجْتَبِهْ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ

مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٣٩﴾

”تو اپنے پروردگار کے فیصلے کے مطابق ضبط و صبر سے کام لیجیے اور مچھلی والے (یونسؑ نبی) کی طرح نہ ہو جائیے جب کہ انہوں نے پکارا اس عالم میں کہ وہ غم و رنج میں گرفتار تھے اگر خبر نہ لیتی ان کی ان کے پروردگار کی طرف سے مہربانی تو وہ پھینکے جاتے بے آب و گیاہ کھلے ہوئے میدان میں اس حالت میں کہ وہ مذمت میں گرفتار ہوتے (مگر) اب ان



کے پروردگار نے انہیں منتخب افراد میں شامل رکھنے کے ساتھ نیکو کار بندوں میں داخل رہنے دیا۔  
یعنی اللہ نے جس طرح ان کے عذاب کا فیصلہ کیا ہے، اس کا وقت آنے تک ضبط و تحمل کے دامن کو تھامے رہیے اور اس طرح جلد بازی سے کام نہ لیجیے جیسا یونسؑ پیغمبر نے کیا تھا، اس واقعہ کی بہت سی کڑیاں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پہلے آتی رہی ہیں۔ قوم کی مخالفت سے گھبرا کر انہوں نے بے تابی کے ساتھ بددعا کر دی۔ خالق نے بتلایا کہ فلان دن ان کی طرف عذاب بھیجا جائے گا چنانچہ اس دن سے پہلے آثار عذاب رونما ہو ہی ہوئے..... اس پر ان لوگوں نے بڑے خاص طریقہ پر صدق دل سے توبہ کر لی۔

### حضرت یونسؑ کے ترکِ اولیٰ کا اظہار

حضرت یونسؑ بجائے اس کے کہ اتنے بندگانِ خدا کے ہدایت یافتہ ہونے سے خوش و مسرور ہوتے اپنی بات جانے کی شرمندگی اور غصہ سے انہوں نے طے کر لیا کہ ان کی طرف واپس نہیں جاؤں گا۔ وہ دریا کے کنارے آئے اور پھر ایسا ہوا کہ کشتی کے دوسرے لوگوں نے دریا میں پھینک دیا اور حکمِ الہی سے انہیں فوراً ایک مچھلی نے نگل لیا۔ اب مچھلی کی پیٹ میں جا کر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اب قرآن مجید میں اس واقعے کی یہ کڑی ہے کہ انہوں نے پکارا..... کس طرح پکارا؟ اس کا ذکر سورہ انبیاء میں ہے کہ انہوں نے کہا:

لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۸۷﴾

کوئی خدا نہیں سوا تیرے، یقیناً میں قصور وار ہوں“ (انبیاء۔ ۸۷)

اس پر ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اسی کو قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر پروردگار کی طرف سے مہربانی انکے شامل حال نہ ہوتی تو وہ پھینکے جاتے بے آب و گیاہ کھلے ہوئے میدان میں اس حالت میں کہ وہ مذمت میں گرفتار ہوتے۔ اب یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورہ صافات آیت ۱۴۳، ۱۴۴ میں ہے کہ:-

فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَّكِبَتْ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ

اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں نہ ہوتے تو اس کے شکم میں قیامت تک رہتے۔

نظا ہر اس محل پر جو کہا جا رہا ہے، یہ اس کے خلاف ہے۔ اس کا جواب بعض اہل نظر نے یہ دیا ہے کہ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی تمام زندگی میں جو اس مچھلی کے پیٹ میں جانے سے پہلے تھی اگر وہ تسبیح الہی کرنے والوں میں نہ ہوتے تب تو قیامت تک اس مچھلی کے شکم میں رہتے اور یہاں جو کہا جا رہا ہے وہ اس وقت کی تسبیح ہے جو بطور توبہ ہے یہ کہ اگر اللہ کی قبول توبہ کے ساتھ رحمت شامل حال نہ ہوتی تو وہ چٹیل بیابان میں پھینکے جاتے حالتِ ندامت میں..... یعنی وہ پوری زندگی کی تسبیح تو قیامت تک اس کے پیٹ میں رہنے سے مانع تھی اور اس توبہ نے چٹیل بیابان میں پھینکے جانے کے ساتھ مذموم صورت میں ہونے سے انہیں بچایا۔

وَإِنَّ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُرْ لِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ

إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿۵۱﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿۵۲﴾

”اور یقیناً جو کافر ہیں وہ اس وقت جب سنتے ہیں اس قرآن کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی (تیز) نظروں کے

زور سے) تزلزل کر دیں گے اور وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ دیوانہ ہے، حالاں کہ وہ نہیں ہے مگر نصیحت تمام جہانوں کے لیے۔“

یعنی نگاہیں ان کی ایسی تند و تیز آپ پر پڑتی ہیں کہ کوئی اور ہو تو ان نگاہوں کی شدت سے خوفزدہ ہو کر اپنے موقف کو چھوڑ دے جیسا کہ کہا گیا ہے:-

”گھور گھور کر دیکھتے کہ ڈر کر چھوڑ دے“ (موضح القرآن) بعض نے کہا ہے کہ نظریں ایسی ہیں جیسے وہ ان نگاہوں سے آپ کو بیہوش کر دیں گے جس کے لیے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کسی قدیم مفسر زجاج کے الفاظ نقل کئے ہیں کہ:-

هذا مستعمل في الكلام يقولون نظر الی فلان نظر ايكاديم ونظر ايكاديا كلني (مجمع البيان)  
اس نے میری طرف ایسی نگاہ سے دیکھا کہ قریب تھا مجھے زمین پر گرا دے اور ایسی نگاہ سے کہ قریب تھا مجھے کھا جائے۔

بعض علماء و مفسرین نے اس ذیل میں نظر بد اور اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے یقیناً نظر بد جسے اردو میں نظر لگانا بھی کہتے ہیں اس کی تاثیر ناقابل انکار ہے جس کے لیے احادیث بھی ہیں اور مشاہدہ میں آئے ہوئے واقعات بھی مگر مخالفت اور شدت عداوت کے ساتھ اس قسم کی نگاہ کا مجھے کوئی ربط محسوس نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی نگاہ مزاج مخالفت کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔

## سُورَةُ الْحَاقَّةِ

مکیہ ..... ۵۲ ..... آیت

الحاقۃ کے لفظ ہی سے سورہ شروع ہوا ہے اور وہی اس کا نام ہو گیا ہے۔

سورہ حاقۃ کے خاص خاص مضامین:

۱..... قیامت کے ناموں میں سے دو الحاقۃ اور القارعہ۔

۲..... قیامت کا آنا یقینی۔

۳..... قیامت کے جھٹلانے والے کا مختصر طور پر انجام۔

۴..... قیامت کا ہولناک موقع۔

۵..... حاملان عرش۔

۶..... نامہ اعمال۔

۷..... فرد فرار و جرم۔

۸..... رسول اگر رسالت کا غلط دعویٰ کرتے تو انہیں سخت سزا دی جاتی۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

### الْحَاقَّةُ ۱ مَا الْحَاقَّةُ ۲ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ ۳

”وہ ہو کے رہنے والی بات، کیا ہے وہ ہو کے رہنے والی بات۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ ہو کے رہنے والی بات کیا ہے؟“

یعنی وہ ہو کے رہنے والی بات جس کا نام قیامت ہے علم و تصور سے بہت بالاتر چیز ہے۔ اس اظہار اہمیت کے ساتھ سننے والوں کو بعد والے مضامین کے متوجہ سننے کی تحریک ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالقَارِعَةِ ۴ فَأَمَّا ثَمُودُ فَأهْلِكُو بِالطَّاغِيَةِ ۵ وَأَمَّا عَادُ  
فَأهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَنِيَةَ أَيَّامٍ ۷  
حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى ۸ كَأَنَّهُمْ أُعْجَازُ نخْلِ خَاوِيَةٍ ۹ فَهَلْ تَرَى  
لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ ۱۰

”قبیلہ ثمود اور عاد نے اس تباہ کن ساعت (قیامت) کو جھٹلایا تو ثمود جو تھے وہ بڑی زبردست آفت سے ہلاک کیے گئے اور عاد کے لوگ ہلاک کیے گئے ایک بہت تیز و تند سرد آندھی سے، جسے اس نے ان پر قائم رکھا گیا لگا تار سات رات اور آٹھ دن، تو تم (ہوتے) تو دیکھتے ان لوگوں کو زمین پر گرا ہوا اس طرح جیسے کھجور کے درخت کے اندر سے کھوکھلے تنے ہوں تو کیا تمہیں ان میں سے باقی رہنے والا کوئی بھی نظر آئے گا؟“

قبیلہ ثمود کی ہلاک کرنے والی آفت کو قرآن نے دوسرے مقامات پر مختلف حالات کے لحاظ سے کہیں صیغہ یعنی سخت مہیب اور ہولناک آواز بتایا ہے اور کہیں صاعقہ یعنی گرنے والی بجلی اور کہیں رجفہ یعنی سخت زلزلہ کہا گیا ہے۔ اسی کو یہاں الطَّاغِيَةِ کہا گیا جس کا ترجمہ ہم کیا زبردست آفت، بظاہر یہ زبردست آفت کوئی ان تینوں باتوں سے الگ چوتھی بات نہیں ہے بلکہ انہی باتوں کی مجمل تعبیر ہے۔ آخر میں جو سوال ہے وہ صرف ایک انداز ہے اس امر کے اظہار کا کہ ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس وقت والے اس وقت کہاں تھے جو یہ دیکھتے کہ کوئی باقی رہا یا نہیں۔

وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ وَالْمُؤْتَفِكُتْ بِالْحَاطِئَةِ ۱۱ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ

فَاخَذَهُمْ أَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۱ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۰ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲

”فرعون اور اس کے پہلے والوں اور (قوم لوط کی) تہہ وبالا ہوجانے والی بستیوں (کے لوگوں نے) یہی غلطی کی اور اس طرح اپنے پروردگار کے پیغمبر کی نافرمانی کی تو اس (خدا) نے انہیں حد سے زیادہ سخت گرفت میں لے لیا، جب پانی کا زور ہوا تو ہم نے تم لوگوں کو کشتی پر سوار کیا، تاکہ اسے تمہارے لیے یادگار واقعہ بنا سکیں اور اسے محفوظ رکھیں محفوظ رکھنے والے کان“۔

فرعون اور ان قوموں کے عذاب کا تو بالکل مبہم طریقہ پر ذکر ہے اور پھر قوم نوح کے عذاب کا جو طوفان کے ساتھ تھا نوعیت کے تعین کے ساتھ تذکرہ ہے کہ وہ پانی کے ساتھ تھا اور پھر کشتی نجات کو یاد دلا یا گیا ہے۔ تفصیلات اس کے بھی قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر ہیں۔ اصل میں بیان عذابوں کا براہ راست ذکر مقصود نہیں ہے بلکہ اسی قیامت کی اہمیت دکھانا ہے کہ اسی کے انکار سے یہ قومیں عذاب میں مبتلا ہوئیں اور تباہ و برباد ہوئیں۔ اب تم اس جرم کے مرتکب نہ ہو۔ یہ لوگ جو اس وقت ہیں اس دور میں نہ تھے جب وہ کشتی بنائی گئی تھی مگر چونکہ یہ انہی کی نسل سے ہیں جو اس کشتی پر سوار ہوئے تھے، اس لیے ان سے کہا گیا ہے کہ تم کو ہم نے اس کشتی پر سوار کر کے ساحل زندگی تک پہنچایا اور نہ آج تمہارا وجود نہ ہوتا۔

فَاِذَا نْفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ وَحَمَلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝۱۴ فَيَوْمَ مِيدٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱۵ وَاَنْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَ مِيدٍ وَاٰهِيَةٌ ۝۱۶ وَالْمَلِكُ عَلٰى اَرْجَائِبِهَا ۝۱۷ وَيَجْمَلُ عَرْشُ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَ مِيدٍ ثَمْنِيَّةٌ ۝۱۸ يَوْمَ مِيدٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝۱۹

”تو جب ایک دفعہ صور پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی ضرب میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا تو اس وقت وہ ہوجانے والی بات ہوجائے گی اور آسمان شق ہوجائے گا، اس کا نظام اس وقت بالکل سست ہوجائے گا اور فرشتے اس کے اطراف میں ہوں گے اور تمہارے پروردگار کے عرش کو اس دن کے اوپر آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے، اس دن تم سب کی پیشی ہوگی اس طرح کہ تمہاری کوئی بات چھپی نہ رہے گی۔“  
یہ ایک دفعہ والا ”صور“ اسے کوئی کہتا ہے کہ پہلا صور اور کوئی کہتا ہے کہ آخری.....: ”ایک ہی ضرب میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔“  
یہ ایک تصور کی بنا پر ترجمہ ہے..... دوسری تشریح یہ ہے کہ پہاڑ منتشر ہو کر ہوا ہوجائیں گے اور پوری زمین ایک ہوگی یعنی اس میں نشیب و فراز نظر نہیں آئے گا جیسے دوسری جگہ کہا گیا ہے:-

فَيَنْذِرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا... لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَا اَمْتًا . (طہ- ۱۰۵، ۱۰۴)

چیل بیابان جس میں کہیں اور بلندی دکھائی نہ دے گی۔ عرش کو آٹھ اٹھائے ہوں گے، بالکل لفظی ترجمہ تو صرف یہی ہے۔ زیادہ جو معنی

ذہن میں آتے ہیں وہ بھی کہ آٹھ فرشتے جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا اور کہا گیا ہے کہ یوں تو حاملان عرش چار ہیں مگر اس دن کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اٹھانے میں چار فرشتے اور شریک ہوں گے۔ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کی زبانی ایک قول یہ ہے کہ آٹھ صفیں ملائکہ کی اٹھائے ہوئے ہوں گے جن کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے اسے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مجمع البیان میں نقل کیا ہے..... بہر حال وہ آٹھ عدد فرشتے ہوں یا آٹھ صفیں ہوں اور بے شمار فرشتے ہوں..... جو بات ماننا گزیر ہے وہ یہ کہ اس سے صرف عرش الہی کی عظمت اور اہمیت کو دکھانا مقصود ہے..... جس سے جلال الہی کا اثر ذہن پر پڑے..... لیکن یہ بات ماننا صحیح نہیں ہے کہ خود خداوند عالم اس عرش پر ہوگا اس لیے کہ وہ جسم و جسمانیات سے بری ہے..... وہ نہ آج اس عرش پر بیٹھا ہے جسے چار اٹھائے ہوئے ہیں اور نہ اس دن جب کہ آٹھ یا بے شمار اٹھائے ہوں گے۔

**فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ فَيَقُولُ هَذَا مَا أَدْرَأُ ۗ كِتَابِيهِ ۗ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي**

**مُلِقٍ حِسَابِيهِ ۗ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۖ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۖ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ۗ**

**كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۗ**

”تو جیسے اس کا نامہ عمل دائیں ہاتھ میں دیا جاگا، وہ کہے گا: ”آؤ پڑھو میرا نامہ عمل میں خوب جانتا ہے رہا کہ مجھے حساب دینا ہے تو یہ شخص اپنی پسند کے عیش و آرام کی زندگی میں ہوگا، بلند منزل بہشت میں جس کے بالکل تیار پھل لٹکے ہوئے ان کے نزدیک ہوں گے خوشگوار کی ساتھ کھاؤ پچوان نیک کاموں کی بدولت جو تم گزرتے ہوئے دنوں میں کرتے رہے۔“

چونکہ نامہ اعمال کا اپنے ہاتھ میں دیا جانا خود اس کی علامت ہے کہ وہ نیکو کار ہے اور اسے برزخ کی زندگی ہی میں جو موت سے لے کر قیامت تک کا دور ہے برابر رحمت الہی کے آثار اپنی نسبت نظر آتے رہے تھے، اس لیے بغیر خود پڑھتے ہوئے وہ خوشی خوشی دوسروں کی طرف اس نامہ اعمال کو بڑھا جائیگا کہ پڑھو میرا نامہ عمل میں نے ہمیشہ دنیا میں یاد رکھا کہ مجھے ایک دن اپنے پروردگار کو حساب دینا ہے، تو آج دیکھو میرا حساب کیسا صاف ہے۔ اب فوراً قدرت کی طرف سے اسے بہشت عنبر سرشت میں بھیج دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ یہ نعمات بہشت تمہارے لیے موجود ہیں، اس پاک صاف زندگی کے لحاظ سے جو اپنے سابق دور حیات میں تم بسر کرتے رہے۔

**وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ ۖ فَيَقُولُ يَلَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيهِ ۗ وَلَمْ أَدْرِ**

**مَا حِسَابِيهِ ۗ يَلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۗ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيهِ ۗ هَلَكَ عَنِّي**

**سُلْطَانِيهِ ۗ خَذُوهُ فَغُلُّوهُ ۗ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ۗ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا**

**سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ۗ**

”اور جسے اس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: ”کاش میرا نامہ اعمال مجھے نہ دیا جاتا اور مجھے خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کتاب کیا ہے؟ کاش پہلے مجھے موت آئی تھی وہی بس فیصلہ کن ہوتی (ہائے) میرے مال

نے مجھے کوئی فائدہ نہ دیا، میرا اثر اور اقتدار بھی سب برباد ہو گیا، پکڑو اسے اور ہاتھوں کو گردن سے ملا کر جکڑ دو، پھر دوزخ کی آگ میں ہمیشہ کے لیے ڈال دو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے، اسے باندھ دو۔“

لَعَلَّكُمْ أَذْرٍ مَّا جَسَدِيَّةٌ“ کا ایک مطلب یہ ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا کہ یہ اس آرزو کا جو ہے کہ کاش میرا نامہ عمل مجھے نہ دیا جاتا، اسی پر عطف ہے یعنی کاش مجھے خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کتاب کیا ہے؟ اس لیے کہ اس میں سوا بد اعمالیوں کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں نے دنیا میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میرا حساب کتاب ہوگا، مقابل میں ان کے تو دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال لینے والے نے کہا تھا کہ میں پہلے ہی یقین رکھتا تھا کہ میرا حساب ہوگا۔ هَلَّاكَ عَمِّيْ مُسْلَطِيَّةٌ کا بھی یہ ایک ترجمہ ہے کہ میرا اثر و اقتدار سب برباد ہو گیا۔ دوسری تشریح کے مطابق کہ سلطان کے معنی دلیل و حجت کے ہوں ترجمہ یہ ہوگا کہ میری بحث و حجت سب ختم ہوگئی یعنی دنیا میں خوب اپنی صفائی پیش کیا کرتا تھا۔ اب آج اپنی صفائی کے لیے میرے پاس کوئی دلیل و حجت نہیں جسے میں پیش کر سکوں۔

إِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يُحِضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِيْنَ ﴿٣٤﴾ فَلَيْسَ

لَهُ الْيَوْمَ هَهُنًا حَمِيْمٌ ﴿٣٥﴾ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غَسْلِيْنٍ ﴿٣٦﴾ لَا يَأْكُلُهٗ اِلَّا الْخَاطِطُوْنَ ﴿٣٧﴾

”یہ اللہ پر جو بزرگ و برتر ہے ایمان نہ رکھتا تھا اور کسی غریب کو کھانا دینے کی تحریک نہیں کرتا تھا تو آج اس کا کوئی مددگار نہیں ہے اور نہ زخموں سے بہتے ہوئے مواد کے سوا اس کی کوئی غذا ہے جسے نہیں کھانا پڑتا سوا خواہ کاروں کے کسی کو۔“

یہ ان احکام کے ساتھ کہ ”پکڑو جکڑو اور زنجیر پہناؤ اور آگ میں جھونکو“ اب خالق کی طرف سے ان سزاؤں کی بنیاد کا بیان ہے جسے سمیٹ کر دو جملوں میں ادا کیا گیا ہے۔ ”اللہ پر ایمان نہ رکھتا تھا“ اس اجمال میں ایمان کے جتنے تقاضے ہیں، ان کے پورے نہ کرنے کی تفصیل درج ہے۔ اس طرح حقوق اللہ کا ادا نہ کرنا ہے۔ اور پھر طعام مسکین“ والے جملے میں حقوق الناس کا ادا نہ کرنا ہے۔

”کسی غریب کو کھانا دینے کی تحریک نہیں کرتا تھا“ اس میں آسان کی نفی کے ساتھ بدرجہ اولیٰ ”مشکل“ کی نفی مقصود ہے یعنی زبان کا بلانا تو خود عمل کی بہ نسبت آسان ہوتا ہے۔ وہ خود بھلا کسی غریب کو کھانا کیا دیتا کسی دوسرے سے تحریک کرنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ اس آئینہ میں جو قرآن نے پیش کیا ہے ہر آدمی جو ایسا ہوا اپنا چہرہ پیش دیکھ سکتا ہے۔

فَلَا اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَمَا لَا تَبْصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿٤٠﴾ وَمَا

هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۙ قَلِيْلًا مَّا تُوْمِنُوْنَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۙ قَلِيْلًا مَّا تَذْكُرُوْنَ ﴿٤٢﴾

تَنْزِيْلٍ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٣﴾

”تو نہیں میں قسم کھاتا ہوں اس کی جو تمہیں دکھائی دیتا ہے اور جو تمہیں دکھائی نہیں دیتا، یقیناً ایک معزز پیغام رساں کا قول ہے، کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، تم لوگ بہت کم ایمان لاتے ہو، نہ وہ کسی کاہن کی گفتگو ہے۔ بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو، وہ اتارا ہوا ہے تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے۔“

متعدد جگہ قرآن میں اقسام سے پہلے لایا ہے، ان مقامات پر ایک تصور تو یہ ہے کہ لازماً ہوتا ہے یعنی لاقسم کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ”میں قسم کھاتا ہوں“ لاکے کچھ معنی نہیں ہوتے۔ اس پر مخالفین اسلام معترض ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کے قرآن میں معاذ اللہ بے معنی حروف ہیں۔ اس اعزاز سے گھبرا کر ہی نہیں بلکہ پہلے بھی بعض اہل نظر قرآن میں حروف زائدہ کے منکر ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں علامہ بلاغی کے افادات ہم نے مقدمہ تفسیر میں درج کیے ہیں۔ رسول یعنی معزز پیغام رساں سے مراد یہاں بقرینہ مقام حضرت پیغمبر اسلام ﷺ ہی مراد ہیں، بے شک بعض جگہ اس کا اطلاق حضرت جبرئیلؑ ائین پر ہوا ہے کہ وہ رسول اللہ کے پاس اللہ کا پیغام لاتے ہیں مگر یہاں وہ مراد نہیں ہیں کیوں کہ شاعر اور کاہن وغیرہ وہ لوگ جبرئیل کو نہیں کہتے تھے حضرت ہی کو کہتے تھے، یوں حقیقت میں جبرئیل کی طرف اور کہیں حضرت کی طرف کلام کی نسبت ویسی ہی ہے جیسے قرآن مجید میں توئی یعنی قبض روح کی نسبت کہیں ملائکہ کی طرف دی گئی ہے

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْتَهُمُ الْهَلِكَةَ: (انساء-۹۷): اور کہیں ملک الموت کی طرف قُلْ يَتَوَفَّيْكُمْ مَلَائِكَةُ الْمَوْتِ الَّذِينَ يُكَلِّمُكُمْ (سجدہ-۱۱) لیکن حقیقت میں وہ فعل اللہ کا ہے، جبکہ ارشاد ہوا، اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا (زمر-۴۲) اسی طرح نبی کریم ﷺ کی طرف قول کی نسبت اس لیے ہے کہ لوگوں تک وہ آپ کے ذریعہ سے پہنچتا تھا اور جبرئیل کا قول تھا اس لیے کہ حضرت تک وہ ان کے ذریعہ سے پہنچتا تھا لیکن اصل میں وہ اللہ کا قول ہے۔ اسے آخر کے جملے سے ظاہر کیا گیا ہے وہ اتارا ہوا ہے تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے، لہذا حقیقت میں وہ کلام الہی ہے۔ نہ وہ کلام جبرئیلؑ ہے اور نہ کلام رسول خدا ﷺ۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٣٧﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٣٨﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ  
الْوَتِينَ ﴿٣٩﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٠﴾ وَإِنَّهُ لَتَذَكَّرَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٤١﴾  
وَأَنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُكَذِّبِينَ ﴿٤٢﴾ وَإِنَّهُ لَكُنُوسَةٌ عَلَى الْكُفْرِينَ ﴿٤٣﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ  
الْيَقِينِ ﴿٤٤﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٤٥﴾

”اور اگر وہ ہم پر کوئی قول خود بنا کر منڈھتا ہے تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑتے، پھر اس کی رگ حیات کو کاٹ دیتے تو تم میں سے کوئی اس کے آگے سد راہ نہیں ہو سکتا تھا اور بلاشبہ یہ نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لیے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے بہت سے جھٹلانے والے ہیں اور یقیناً یہ غم و غصہ کا باعث ہے کافروں کیلئے اور بلاشبہ وہ بالکل یقینی حقیقت ہے تو آپ (ان کی پروا نہ کیجیے) اپنے پروردگار بزرگ کی تسبیح کرتے رہیے۔“

سابق جو کہا گیا تھا کہ یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے، اسی پر زور دینے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ بھلا کیا مجال کہ یہ رسول اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر اس قول کو ہماری طرف منسوب کرے اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس کو تمہارے سامنے سخت سزا دیں جس سے کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔ یہ خاص حضرت کی حقانیت کو بتا کید ظاہر کرنے کے لیے ایک انداز بیان ہے، اس میں کسی عام اصول کا اعلان نہیں ہے کہ جو غلط دعویٰ نبوت کا کرے ہم اس کے ساتھ یہ سلوک کریں گے جب کہ اس غلط دعویٰ کے دعوے کے غلط ہونے کے لیے پہلے سے ثبوت موجود ہو جیسے مسلم الثبوت سابق رسول کا اعلان کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ ایسے دعویٰ کی حقانیت کے لیے اس اعلان قرآن سے استدلال درست نہیں ہے۔

# سُورَةُ الْمَعَارِجِ

مکیہ ..... ۴۴ ..... آیات

بالکل آغاز میں ہی نہیں مگر شروع ہی کے حصے میں المعارج کی لفظ ہے، اس پر سورے کا نام ہوا۔

سورۃ معارج کے خاص خاص مضامین:

- ۱..... پچاس ہزار برس کا ایک دن،
- ۲..... قیامت کا ہولناک منظر۔
- ۳..... نفسی نفسی کا عالم۔
- ۴..... انسان کی طبعی کمزوریاں۔
- ۵..... مستثنیات۔
- ۶..... سچے نمازیوں کے اوصاف۔
- ۷..... خدا کے دائرہ کار سے کوئی نکل نہیں سکتا۔ وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنانے والا بڑا مہربان ہے۔“

سَأَلْ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ۱ لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ۲ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۳

”ایک طلب کرنے والے نے طلب کیا اس عذاب کو جو ہونے ہی والا ہے کافروں کے لیے، اسے کوئی ٹالنے والا نہیں ہے، اللہ کی طرف سے جو بلندی کے زینوں کا مالک ہے“

سوال کے ایک معنی تو پوچھنے کے بھی ہوتے ہیں اور اس لیے ایک تفسیر اس آیت کی یہ ہوئی ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا ہے اس عذاب کے متعلق جو آنے والا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دریافت کیا ہے؟ دوسرے مقامات پر جو کفار کی گفتگو میں ہیں، ان کی بنا پر تو پوچھنے کا تعلق اس کے وقت سے ہونا چاہیے کہ آخر وہ کب آئے گا جیسے وہ قیامت کے لیے کہتے تھے مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. (سورہ یٰس۔ مملک۔ سبأ۔ نمل) یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو، مگر یہاں اس کے بعد بلافاصلہ للکافرین کی لفظ ہے لہذا کہا



جاتا ہے کہ وہ یہ دریافت کرتے تھے کہ یہ عذاب آخر کن پر ہوگا؟ اس کا جواب دیا گیا لاکافرین ”وہ عذاب کافروں کے لیے ہے“..... میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں کہ یہ اس کا جواب ہے اس کے پہلے بعذاب واقع کی لفظ پر کسی وقف کی علامت ہونا چاہیے، نہ کہ لا جو عدم وقف کا رمز ہے لہذا اگر یہ سوال پوچھنے کے معنی میں ہے تو اس کا تعلق وقت ہی سے ہونا چاہیے کہ وہ کب ہوگا؟ اور پھر اس کا جواب بعد میں یہ ہوگا کہ وہ قیامت کے دن ہوگا جو ایسا ہولناک ہے۔

اس تفسیر کے برخلاف دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ سوال پوچھنے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ طلب کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ ایک کافر نے کہا کہ:-

اللَّهُمَّ إِنَّ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حَجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوْ ائْتِنَا بِعَذَابٍ آلِيمٍ (الانفال)

-(۳۲)

”پروردگار اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا (خداوند!) اور کوئی دردناک عذاب لے آ۔“ چونکہ زیادہ تر مفسرین اسی تفسیر کے حق میں ہیں لہذا ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے اور وہ ہمارے یہاں کی ایک روایت کے موافق بھی ہے جسے علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع البیان میں اپنی سند خاص سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی درج کیا ہے کہ روز غدیر ولایت امیر المؤمنین علیہ السلام کے اعلان کے بعد نعمان بن حارث فہری حضرت رسول اکرمؐ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ یہ اعلان کیا؟ اللہ کی طرف سے کیا۔ اپنی طرف سے نہیں تب اسی نے وہ کہا جس کا ذکر سورۃ انفال میں ہے اور اسی کا تذکرہ یہ سورہ معارج میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ اہل سنت کی تفسیر درمنثور میں بھی اس طرح کی روایت ہے۔

**تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ۝**

”فرشتے اور روح اس کی بارگاہ میں بلندی کی منزلیں طے کر کے حاضر ہوں گے ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہے۔“

**پچاس ہزار برس کا ایک سال**

یہ دن کون ہے؟ اس میں ایک تصور یہ ہے کہ اس سے روز قیامت مراد ہے جس کے بعد میں تعارف ہے اور اس کے کیفیات کا بیان ہے کہ وہ دن ایسا دن ہوگا اور پچاس سال کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس مدت کو دنیا کے دنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ پچاس سال کی ہوگی نہ یہ کہ وہاں سورج اور چاند کی گردش سے ماہ و سال کی تشکیل ہوتی ہے اور بلندیوں طے کر کے ملائکہ اور روح کے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب تمام عمر کائنات کے باہمی رشتے قطع ہو چکے ہیں اور سب کی رجوع اسی کی طرف ہو چکی ہے..... تمام فرشتوں کی بارگاہ میں حاضری کے لیے دو آیتیں اور ہیں۔

وَتَسْمَى الْمَلَائِكَةُ حَاقِقِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ

”اور دیکھو گے فرشتوں کو گھیر لگائے ہوئے عرش کے ارد گرد،“

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا

جس دن روح اور ملائکہ ایک صف میں کھڑے ہوں گے۔

اس کی تائید کہ اس سے قیامت مراد ہیں اس حدیث سے ہوتی ہے جو امالی شیخ میں ایسی سند کے ساتھ جو امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچتی ہے وارد ہوئی ہے کہ قیامت میں پچاس موقف ہیں جن میں سے ہر ایک موقف دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہے اور پھر حضرت نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ فی یوم کان مقداره الف سنۃ۔ یہ حدیث روضہ الکافی میں بھی حفص بن غیاث کی روایت کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ اسی دور عالم سے متعلق ہے۔ اب چونکہ ایک جگہ قرآن مجید میں ہے:-

وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (حج-۴)

یقیناً تمہارے پروردگار کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے۔

اور اسی طرح سورہ سجدہ آیت پانچ میں بھی ہے کہ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے، اور یہاں پچاس ہزار برس کہے گئے ہیں تو کہا گیا ہے کہ یہ ہزار اور پچاس ہزار سب بطور مثال ہے، ورنہ کائناتی منصوبے لاکھوں اور کڑوروں اور اربوں سال کے بھی ہوتے ہیں۔

اس لیے قیامت کے آنے میں جلدی کا مطالبہ کرنا غلط ہے اور اس میں دیر کو اس کے سرے سے بے بنیاد ہونے کی دلیل قرار دینا محض جہالت ہے۔

روح سے مراد اور بظاہر تو جبرئیل امین ہی ہیں جن کے لیے سورہ شعراء آیت - ۱۹۳ - ۱۹۴ میں ارشاد ہوا ہے:-

نَزَّلَ بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينُ (الشعراء- ۱۹۳)

اسے روح امین نے آپ کے دل پر اتارا ہے، اور سورہ بقرہ میں جبرئیل کا نام لے کر کہا گیا ہے کہ نزلہ علی قلبک، انہوں نے آپ کے دل پر اسے اتارا ہے، اور ملائکہ کے عمومی میں داخل ہونے کے باوجود نام لے کر انہیں الگ ذکر کرنا ان کی اہمیت اور خصوصی امتیاز و رفعت کے اظہار کے لیے ہے۔

علامہ سید محمد حسین طباطبائی کے خیال میں ظاہر یہ ہے کہ روح سے مراد وہ روح ہے جسے سورہ بنی اسرائیل آیت - ۸۵ میں کہا گیا ہے کہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ہے کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے، اور یہ روح ملائکہ سے الگ ہے اور سورہ نحل آیت ۲ میں ہے:-  
يُنزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِمْ فَرِشَاتٍ رُوحِ كَوَاسِ كَالْعِلْمِ مِنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَرِشَاتٍ هِيَ، یہ چیز پھرتشہ ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝ إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝ وَنَرَاهُ قَرِيبًا ۝

”تو آپ اچھے طریقہ پر صبر برداشت سے کام لیجیے، وہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے نزدیک جانتے ہیں“

چونکہ کافروں کی اس قسم کی باتوں سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تکلیف ہوتی تھی لہذا کہا گیا ہے اور وہ درحقیقت بطور سرکشی و عناد اذیت

پہنچانے کے لیے کہتے ہی تھے، اس لیے حضرت کو اس پر صبر و برداشت سے کام لینے کے لیے کہا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ چونکہ حقیقت میں اسے بعید از امکان سمجھتے ہیں اور اس کے وقوع پر یقین ہی نہیں رکھتے اس لیے مدت بھی انہیں دراز محسوس ہوتی ہے اور ہم یعنی خدا اور رسول اور مومنین سب اس کے وقوع کو یقین جانتے ہیں اس لیے ہمارے لئے طول مدت بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ عذاب ہو یا وہ دن کوئی بھی ہمارے نزدیک دور نہیں ہے۔ بلکہ قریب ہی ہے جیسے کل ہونے والی بات بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ وقوع میں آئی ہوئی بات۔

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ۙ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيماً ۙ يُبْصِرُونَ ۙ وَنَهُمُ ط يَوْمَ الْمُجْرِمِ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۙ وَصَاحِبَتَهُ وَأَخِيهِ ۙ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤَيِّدُهَا ۙ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيهِ ۙ كَلَّا ۙ إِنَّهَا لَظَى ۙ نَزَّاعَةً لِلشَّوَى ۙ تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّى ۙ وَجَمَعَ فَأَوْعَى ۙ

”جس دن آسمان مثل پگھلی ہوئی چاندی کے ہوگا اور پہاڑ مثل دھنکے رنگ برنگ اون کے ہوں گے اور کوئی دوست دوسرے دوست کو نہ پوچھے گا، حالانکہ وہ انہیں دکھائے جا رہے ہوں گے۔ گناہگار شخص آرزو مند ہوگا کہ کاش اس دن کے عذاب کے عوض میں وہ دے دیتا اپنے بیٹوں کو اور اپنی رفیقہ حیات کو اور اپنے بھائی کو اور اپنے بہت قریبی خاندان کو جو اس کے لیے جائے پناہ تھا اور روئے زمین پر جتنے ہیں سب کو پھر یہ اسے چھٹکارا دیتا ہرگز نہیں یہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کا شعلہ ہے جو جوڑ بند کو الگ کر دے گا وہ اپنی طرف بلائے گا سے جس نے روگردانی کی اور پیٹ پھرائی اور دولت اکٹھا کی اور اسے محفوظ جگہوں میں رکھا۔“

مصل کے معنی پگھلا ہوا تانبا بھی کہے گئے ہیں، پگھلا ہوا سونا چاندی اور بعض نے کہا ہے پگھلی ہوئی مختلف دھاتیں لیکن زیادہ تر اس کے معنی پگھلی ہوئی چاندی ہی کے کہے گئے ہیں۔ اب یہ تشبیہ کس بات میں ہے؟ یہ مبہم ہے۔

قرآن مجید میں احوال قیامت میں آسمان اور پہاڑ ہر ایک کے مختلف مقامات پر مختلف کیفیات وارد ہوئے ہیں، یہ مختلف اوقات میں یکے بعد دیگرے جو صورتیں رونما ہوں گی وہ ہیں۔ جن میں سے کبھی کسی صورت کو بیان کر دیا گیا ہے اور کبھی کسی صورت کو۔ ان میں ترتیب قائم کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ”دھنکے ہوئے رنگ برنگے اون“ کی طرح ہوں گے، چونکہ خود پہاڑوں کے مختلف رنگ ہیں۔ یہاں ”دھنکے ہوئے“ کی صفت لفظ عھن کے اندر مضمحل ہے اور دوسری جگہ عھن کی لفظ کے معنی سے اس صفت کو نکال کر الگ سے اس کا وصف قرار دیا گیا ہے کالعھن المنفوش اور پھر ایک جگہ تو ہے کہ وہ مثل ہباء منثورا ہو جائیں گے یعنی وہ بے حقیقت طرح کے ذرے جو روشن دان وغیرہ سے جب دھوپ آرہی ہو نظر آتے ہیں۔ کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ انہیں دکھائے جا رہے ہوں گے یعنی یہ نہیں ہے کہ وہ غائبانہ نہیں بھول گئے ہیں، ان کا خیال نہیں آتا۔ بلکہ وہ ان کے سامنے ہیں اور فرشتے انہیں توجہ دلا رہے ہیں کہ دیکھو تمہارا جگری دوست ہے مگر نفسی نفسی کا عالم وہ

ہوگا کہ کوئی ایک دوسرے کو نہ پوچھتا ہوگا کہ تم پر کیا گزری رہی ہے۔

تو جیسا ہر جگہ قرآن مجید میں اہل دوزخ کے اوصاف میں حقوق الناس کی عدم ادائیگی کو اہمیت دی گئی ہے، وہ یہاں بھی ہے کہ وہ آگ انہیں اپنی طرف بلا رہی ہوگی جو پیسے بچا بچا کر رکھیں اور خیر و خیرات میں بخل سے کام لیں اور پھر بعد کی آیتوں میں بھی جو ابھی آئیں گی منفی اور مثبت دونوں طریقوں سے زور دیا ہے

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝١٩ إِذَامَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝٢٠ وَإِذَامَسَّهُ الْخَيْرُ مَمُوعًا ۝٢١ إِلَّا الْبَصِلِينَ ۝٢٢ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝٢٣ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝٢٤ لِللسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝٢٥ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝٢٦ وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ ۝٢٧ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ۝٢٨ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝٢٩ إِلَّا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝٣٠ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ۝٣١ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِنَتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رِعُونَ ۝٣٢ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ ۝٣٣ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝٣٤ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّةٍ مُّكْرَمُونَ ۝٣٥

”یقیناً انسان چھوٹے دل والا پیدا ہوا ہے جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو بے قرار ہو جاتا ہے اور جب کچھ دولت ہاتھ آتی ہے تو بخل سے کام لیتا ہے سو ان نماز گزاروں کے جو ہمیشہ نماز کے پابند رہتے ہیں اور جن کے مال میں ایک مقرر حق ہے سوال کرنے والے اور نہ سوال کرنے والے محتاج کے لیے اور جو جزا و سزا کے دن کو سچ مانتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے طرف کی سزا سے ڈرتے رہتے ہیں، یقیناً ان کے پروردگار کی سزا ایسی ہے جس سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں سو اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں ہیں کہ اس میں ان پر کوئی الزام نہیں ہے تو جو اس سے آگے بڑھے تو یہ لوگ ستم گار ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا لحاظ رکھنے والے ہیں اور وہ جو اپنی گواہیوں پر برقرار رہتے ہیں اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ بہشتوں میں عزت کے ساتھ جاگزیں ہیں۔“

”چھوٹے دل کا ہونے“ کی تشریح وہی ہے جو خود قرآن میں اس کے بعد کے جملوں میں ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو بے قرار ہو جاتا ہے، اس پر صبر نہیں کرتا اور جب کچھ بھی دولت ہاتھ آتی ہے تو بخل سے کام لیتا ہے اور چھوٹے دل کا پیدا کیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب

نہیں کہ وہ اس طرح کی پیدائشی چیزیں ہیں کہ ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس سے استثنا کیوں ہوتا اس استثنا کے معنی ہی ہیں کہ انسان اپنی نفسانی خواہش کا مقابلہ کر کے ان طبعی میلانات کو مغلوب کر سکتا ہے۔

ان میں جو ان بڑے اوصاف سے مستثنیٰ ہیں اول اور آخر نماز کا ذکر اس کی اہمیت کا ثبوت ہے پہلی جگہ باعتبار زمانہ اس کی مداومت کا ذکر اس کی اہمیت کا ثبوت ہے پہلی جگہ باعتبار زمانہ اس کی مداومت کا ذکر ہے کہ وہ ناغہ نہیں کرتے اور آخر میں باعتبار کیفیت اس کی ادائیگی کا ذکر ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں یعنی اس کے شرائط و ارکان کو صحیح طریقے پر انجام دیتے اور اسے ایسے رجوع قلب سے ادا کرتے ہیں کہ جو اس کے مقاصد ہیں وہ بخوبی پایہ تکمیل تک پہنچیں۔

”ان کے اموال میں ایک مقرر حق ہے“ چونکہ مقرر کی لفظ سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ قانون الہی یعنی شریعت کے لحاظ سے وہ حق مقرر ہے اور یہ زکوٰۃ میں ہوتا ہے کہ اس نصاب معین ہے اور اس کے لحاظ سے مقدار مقرر ہے کہ وہ ادا کرنا لازم ہے، اس لیے بعض لوگوں نے اسے اس سورے یا ان آیات کے مدنی ہونے کی دلیل قرار دیا ہے چونکہ فریضہ زکوٰۃ مدینہ میں عائد ہوا ہے مگر مقرر کی لفظ سے یہ سمجھنا ضروری نہیں ہے کہ وہ خالق کی طرف سے مقرر ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے خود طے کر رکھا ہے کہ اپنے اموال میں سے اتنا وہ ضرورت مند کی امانت میں صرف کریں گے، بعد میں فریضہ زکوٰۃ کی صورت سے اس کی شرح مقرر ہوگی مگر اس کے بعد بھی اہل خیر کے لیے یہ دروازہ کھلا رہا ہے کہ وہ خود اس سے زیادہ امداد محتاجان میں صرف کریں۔

”اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے“ اس میں زنا کاری سے بچنا بھی ہے اور عریانی سے بھی، اپنی امانتوں کا لحاظ رکھتے ہیں، ان میں وہ امانتیں بھی ہیں جو لوگ اس کے سپرد کرتے ہیں خواہ مال ہو یا کوئی منصب جو اسے تفویض کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے مشورہ لے رہا ہے تو اس کے لیے بھی وارد ہے کہ المتشاور مؤتمن جس سے مشورہ لیا جا رہا ہے وہ ابھی امانت ہے جو اسکے سپرد کی گئی ہے، اس کا لحاظ یہ ہے کہ صحیح مشورہ دیا جائے اور وہ امانتیں بھی جو خدا کی طرف سے اس کے حوالے کی گئی ہیں۔ اس میں اللہ کی سب نعمتیں داخل ہیں کہ یہ انہیں صحیح مصرف میں صرف کرتا ہے یا انہیں اولاد ایک امانت ہے کہ یہ ان کی صحیح تربیت کریں۔ اعضاء و جوارح بھی امانت ہیں کہ یہ انہیں انہی مقاصد میں صرف کرے جن سے عطا کرنے والا راضی ہے اور جو اس کا مقصد عطا ہے۔

عہد کا لحاظ رکھتے ہیں، اس میں ایک وہ عہد پیمان ہے جو یہ خود دوسرے لوگوں سے کرتا ہے اور ایک عہد وہ بھی ہے جو بندہ خدا ہونے کے لحاظ سے اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ اس نے اللہ سے کیا ہے کہ یہ اس کے احکام پر عمل کرے گا۔

”جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں“ یعنی جن باتوں کے وہ شاہد یعنی ہیں ان پر جب گواہی طلب کی جائے تو وہ بے کم کاست سچ سچ گواہی دیں، کسی قسم کی حق پوشی سے کام نہ لیں اور جن باتوں کی وہ دینی حیثیت سے گواہی دیتے ہیں ان پر اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں مثلاً توحید و رسالت اس کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی گواہیوں پر قائم رہنے میں داخل ہے۔

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ﴿٣٦﴾ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ﴿٣٧﴾  
 أَيَطْبَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ﴿٣٨﴾ كَلَّا ط إِنَّآ خَلَقْنَاهُمْ

## ﴿مَّا يَعْلَمُونَ﴾ ۳۸

”تو کیا ہو گیا ہے لوگوں کو جو کافر ہیں کہ وہ آپ کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں دائیں اور بائیں سے غول پر غول؟ کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمتوں والے بہشت میں داخل کر دیا جائیگا؟ ہرگز نہیں بلاشبہ ہم نے انہیں پیدا کیا ہے اس سے جو وہ جانتے ہیں۔“

یوں تو یہ کہ دوڑے چلے آتے ہیں اس طرح۔ یہ منافقین کے حسب حال ہے جو اپنے نمائشی اسلام کے لیے اس طرح دوڑتے ہوئے رسولؐ کی طرف آتے ہیں جیسے بہشت کے سب سے حقدار وہی ہیں، اس لیے بعض حضرات نے اسے منافقین پر منطبق بتاتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سورہ مدینہ کا نازل شدہ ہے کیوں کہ منافقین کا گروہ مدینہ میں ہی پیدا ہوا تھا اور قرآن کا الذین کفروا ”وہ جو کافر ہیں“ کہنا اس کے منافی نہیں ہے کیوں کہ حقیقت میں تو منافق بھی دل سے کافر ہیں چنانچہ علامہ طبریؒ نے بھی کل امرء منہم ”ان میں سے ہر شخص“ کے تحت میں لکھ دیا ہے مگر ایک تو سورہ بالاتفاق مکی ہے اور پھر منافقین کے لیے تو دوسری جگہ ہے کہ وہ نماز تک میں بڑی سستی کے ساتھ آتے ہیں تو وہ ذوق شوق سے آپ کی طرف دوڑتے ہوئے کیوں آئیں گے؟

لہذا تمہارے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ کافروں اور مشرکوں کا ذکر ہے کہ وہ رسولؐ کی دعوت تبلیغ کے وقت ادھر ادھر سے دوڑتے ہوئے آئے تھے رکاوٹیں پیدا کرنے کے لیے آپ کو طرح طرح سے پریشان کرنے کے لیے۔

آخر جملے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اپنے کردار کے باوجود ان کا داعیہ یہ ہے کہ آخرت اگر کوئی چیز ہے تو وہاں بھی یہی آرام سے رہیں گے جیسا کہ اس کے پہلے سورہ قلم میں آچکا ہے مگر جنت تو ایمان اور عمل صالح سے وابستہ ہے اور اسی سے انسان میں وہ پاکیزگی آتی ہے کہ جنت میں جانے کا مستحق ہے۔ اور پھر یہ اپنے کردار کے لحاظ سے اس نجاست پر قائم ہیں جو ان کے مبدأ خلقت والے نجس مادے کا تقاضا ہے تو وہ اس طاہرین و مطہرین والی جنت میں کیوں کر جاسکتے ہیں۔

فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِنَّا لَقَدِرُونَ ﴿۳۸﴾ عَلَىٰ أَنْ تُبَدِّلَ  
خَيْرًا مِنْهُمْ ۖ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿۳۹﴾ فَذَرَهُمْ يَحْضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلْقُوا  
يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ يُخْرِجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَانَتْهُمْ إِلَىٰ  
نُصْبٍ يُوْفُضُونَ ﴿۴۱﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي  
كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۴۲﴾

”تو نہیں قسم کھاتا ہوں مشرکوں اور مغربوں کے پروردگار کی کہ ہم اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ ان کے بدلے ان سے بہتر پیدا کر دیں اور ہمیں بے بس بنایا نہیں جاسکتا تو چھوڑے انہیں کہ یونہی اپنی سرگرمیوں اور کھیل کود میں مصروف رہیں یہاں تک کہ ان کا سامنا ہو ان کے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ وعید کیا جا رہا ہے جس دن یہ

نکلیں گے قبروں سے تیزی کے ساتھ جیسے وہ بتوں کے معبودوں کے طرف دوڑتے ہیں، ان کی نگاہیں جھکی ہوئی، ذلت اور عاجزی ان پر چھائی ہوئی ہوگی، وہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ وعید کیا جا رہا ہے۔“

قرآن مجید میں کہیں مشرق اور مغرب (واحد کے صیغے کے ساتھ) ہے تو وہ بظاہر ہے کہ اسی کرۂ ارض کے ایک حصے کے مشرق اور مغرب ہیں کہ جدھر سے آفتاب طلوع ہوتا ہے وہ مشرق ہے اور جدھر سے آفتاب غروب ہوتا ہے وہ مغرب ہے اور کہیں مشرقین اور مغربین (تنبیہ کی صورت میں) یہ لفظ ہے جس کے معنی ہیں دو مشرق اور دو مغرب، اسے سابق زمانے میں یوں سمجھا جاتا تھا کہ یہ گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے ہے کہ ان میں نمایاں طور پر موسم کے لحاظ سے محل طلوع اور محل غروب میں فرق ہو جاتا ہے اور اب یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کرۂ ارض کے دونوں طرف کے حصوں کے لحاظ سے ہے کہ جب ادھر طلوع ہوتا ہے تو ادھر غروب ہوتا ہے اور جب ادھر طلوع ہوتا ہے تو ادھر غروب ہوتا ہے اور یہاں مشارق اور مغارب (جمع کی صورت سے) جس کے معنی ہوئے بہت سے مشرق اور بہت سے مغرب۔ اسے یوں بھی سمجھا گیا ہے کہ ہر دن کا مشرق اور مغرب الگ الگ ہوتا ہے۔ اور سورجوں کی کثرت کے لحاظ سے بھی وہ علم جدید کے مکتشفات میں سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے دین نے پہلے ہی اس کا انکشاف کیا تھا جس پر مقدمہ تفسیر میں روشنی ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ جتنے سورج ہیں اتنے ان کے مشرق ہیں اتنے ہی ان کے مغرب ہیں۔

اب وہ بات ہے جو اس قسم کے ساتھ کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ قادر ہے کہ وہ ان سے بہتر پیدا کر دے یعنی عذاب نازل کر کے اس پوری جماعت کا خاتمہ کر دے اور ان کے عوض میں دوسرے خلق فرمادے جو اوصاف کے لحاظ سے ان سے بہتر ہوں۔

ان کے دوڑنے کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے، وہ طنز یہ طور پر ہے کہ اس دنیا میں تو بڑے ذوق و شوق اور بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے بتوں کی طرف جاتے ہیں۔ اب اُس دن وہ قبروں سے نکل کر اور محشر کے حکم سے اُس کے قرار دیئے ہوئے مرکز حساب کی طرف اُسی تیزی سے جا رہے ہیں جیسے کہ وہ اپنے بتوں کی طرف جاتے ہیں۔

نصب کی ایک تشریح ان نصب شدہ پتھروں یا ستونوں کے ساتھ کی گئی ہے جس کی طرف گھوڑا دوڑ کے میدان میں گھوڑے دوڑائے جا رہے ہوں کہ ایک چاہتا ہے دوسرے کے آگے اس کو پھاند جائے ویسی تیزی کے ساتھ وہ اس وقت جا رہے ہوں گے۔

# سُورَةُ نُوحٍ

مکیہ ..... ۲۸ ..... آیات

اس سورہ میں چونکہ شروع سے لیکر آخر تک حضرت نوحؑ ہی کا حال ہے، اس لیے اس سورے کا نام یہ ہوا۔

**سورہ نوح کے خاص خاص مضامین:**

اس میں خالق کی طرف سے حضرت نوحؑ کا ہونا، ان کا پیغام۔ اس پیغام پر قوم کا رویہ خود حضرت نوحؑ کی بارگاہ الہی میں مناجات کی شکل میں اور پھر ان کے لیے دعائے عذاب نتیجہ میں عذاب کا آنا اور اس کا مختصر بیان اور پھر آخر میں حضرت نوحؑ کی بارگاہ الہی میں دعا، بس انہی امور کا بیان ہے۔

**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ**

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔“

**اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰی قَوْمِهٖ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱**

”ہم نے بھیجا نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف کہ تم متنبہ کرو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ ان پر درناک عذاب آئے۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے آنے سے پہلے ہی اس قوم کا کفر و شرک اور بد اعمالیاں انہیں عمومی طور پر عذاب الہی کا مستحق بنا چکی تھیں۔ حضرت نوحؑ انہیں اس سے خبردار کرنے کے لیے آئے تھے۔ اتمام حجت کے طور پر اور پھر اس لیے کہ ان میں سے کچھ ایمان لے آئے اور اپنی بد اعمالیوں کو چھوڑ کر صحیح راستے پر آجائیں تو وہ اس عذاب سے محفوظ رہیں چنانچہ کچھ لوگ ایمان لائے ہی تھے، ورنہ وہ کون تھے جو ان کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے اور جن سے پھر نسل آگے بڑھی اور پھر وقتاً فوقتاً ان میں انبیاء آئے۔

**اِنْ اَعْبُدُو اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيعُوْنَ ۝۲ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰى**

**اَجَلٍ مُّسَمًّى ۝۳ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ مَلَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴**

”انہوں نے کہا اے میری قوم والو! میں تمہیں صاف طور پر متنبہ کرنے والا (پیغمبر) ہوں کہ عبادت کرو اللہ کی



اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو تو وہ کچھ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے، اور تمہیں ایک مقررہ مدت تک زندگی گزرنے کے لیے چھوڑ دے، یقیناً اللہ کی طرف کا مقررہ وقت جب آجاتا ہے تو وہ ٹالا نہیں جاسکتا اگر تم جانو۔  
 ”اللہ کی عبادت کرو، یعنی صرف اسے اپنا معبود مانو اور غیر اللہ کی جو عبادت کرتے ہو، اسے ترک کرو، شرک نہ کرو، اس کی عظمت کے تقاضے کو محسوس کرو، اور اس کے عذاب کا خوف کرو اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا نمائندہ جو احکام تم تک پہنچائے، ان کی تعمیل کرو۔  
 ”تمہارے کچھ گناہوں کو معاف کر دے، یعنی ایمان لانے سے پہلے اب تک کے کفر کی حالت میں اور ان میں بھی حقوق اللہ قابل معافی ہیں لیکن حقوق الناس معاف نہیں ہوتے۔“ [۱] ”ایک مقررہ مدت تک زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دے“ اور پھر یہ کہ ”اللہ کی طرف کا مقررہ وقت جب آجاتا ہے تو ٹالا نہیں جاسکتا“ اس سے یہ ظاہر ہے کہ ان کے لیے دو مدتیں مقرر ہیں۔ ایک مدت اس صورت میں ہے جب وہ ایمان لے آئیں اور اطاعت رسول کریں۔ اس صورت میں وہ اس عمر تک پہنچیں گے جس کے بعد ہر ایک کو موت آتی ہے اور ایک مدت اس صورت میں ہے کہ جب وہ اپنے کفر و انکار پر قائم ہیں تو اس وقت عذاب کا آنا ان کے لیے مقرر ہے اور وہ عذاب کا وقت جب آجائے تو وہ ٹل نہیں سکتا۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ وہ جسے کہا ہے ٹل نہیں سکتا، اس سے مراد وہ وقت ہے جو ایمان لانے کی صورت میں ان کی موت کا مقرر ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

فی هذا دلالة على ثبوت الاجلین لانه شرط في الوعد بالاجل المسبب عبادۃ الله ولتقوی فلما لم یقم ذلك منهم اقتطعوا بعذاب الاستیصال قبل الاجل الاقصی بالاجل لادنی ثم قال ان اجل الله یعنی الاقصی اذا جاء لایؤخر (مجمع البیان

اس سے پتہ چلتا ہے دو مدتوں کا اس لیے کہ اس نے مقرر مدت تک پہنچنے میں شرط رکھی عبادت اور تقویٰ کی توجہ ایسا انہوں نے نہیں کیا تو وہ ختم کر دئے گئے عذاب استیصال کے ساتھ اس دور والی مدت سے پہلے قریب والی مدت کے ساتھ پھر کہا کہ اللہ کی طرف کا وقت وہ دور والا جب آجاتا ہے تو پھر دیر نہیں ہوتی۔ ہمارے خیال میں پہلی صورت زیادہ الفاظ آیت کے مطابق ہے یعنی یہاں جسے کہا ہے وہ ٹل نہیں سکتا، وہ وہی در صورت عدم ایمان عذاب آنے کی گھڑی ہے جو خالق نے مقرر کر دی ہے۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ۝ وَإِنِّي  
 كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَعْشَوْا ثِيَابَهُمْ  
 وَأَصْرَوْا وَاسْتَكْبَرُوا وَاسْتَكْبَرُوا ۝ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جَهَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ  
 لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝  
 يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَيُبْدِنَ وَيَجْعَلَ لَكُمْ جُنُودًا

[۱] - تبعیضیذلا خراج حقوق العباد (جلالین)

## وَيَجْعَلُ لَكُمْ آيَاتِهِ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝

”انہوں نے کہا اے میرے معبود میرے مالک! میں نے اپنی قوم کو دعوت دی رات دن تو انہیں میری دعوت نے اور بھاگنے میں اضافہ ہی کیا اور میں جب بھی انہیں دعوت دیتا ہوں کہ (وہ اس قابل ہوں کہ) تو ان کو بخش دے تو وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیتے اور اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیتے ہیں اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اور پوری طرح تکبر اختیار کرتے ہیں۔ پھر (یہ کہ) میں بہت صاف طور پر دعوت دی اور پھر (ہر طرح دعوت دی) اعلانیہ بھی بالکل خفیہ طریقے پر بھی تو میں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے معافی مانگو، بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ بھیجتا ہے بادل کو تم پر برستا ہوا اور تمہیں مدد پہنچاتا ہے مال کے ساتھ اور قرار دیتا ہے تمہارے لیے باغ اور قرار دیتا ہے تمہارے لیے نہریں، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے، حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح کی شکلوں سے گزار کر بنایا۔“

عمر بھر کی تبلیغ کے مراحل کو طے کرنے کے بعد اپنی انتہائی جانفشانی کے ساتھ فرض منصبی کی ادائیگی اور قوم کے رویہ کی روئداد بارگاہ الہی میں پیش کرتے ہیں، اب جس طرح انہوں نے ان سے امید قطع ہو جانے کا احساس کیا ہے اور اس سے ان پر عذاب نازل ہونے کی درخواست کی ہے اس کو بیان کیا جا رہا ہے اس ذیل میں ان کے طریقہ تبلیغ کا بیان بھی ہے۔ ”بھاگنے میں اضافہ ہی کیا“، یعنی حق کے راستے سے گزیراں تو وہ پہلے ہی سے تھے۔ اب میری دعوت و تبلیغ مسلسل کے ساتھ جب ان کا انحراف قائم رہا تو یہ گزیراں ہونے میں اضافہ ہے۔ انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیتے ہیں اور اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیتے ہیں، یہ انتہائی نفرت کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی آواز ہم نہ سنیں گے اور ان کی صورت ہمیں نظر نہ آسکے، اور اس خطرے سے بھی کہ کہیں ان کی باتیں ہمارے دلوں پر کچھ اثر نہ کر جائیں جیسا کہ مشرکین مکہ پیغمبر خدا ﷺ کی تبلیغ کے وقت ایسی ہی صورتیں اختیار کرتے تھے۔ ”پوری طرح تکبر اختیار کرتے ہیں“، یعنی اس پیغام کو قبول کرنے میں ذلت محسوس کرتے ہیں کہ اس کے معنی اس کا قرار ہے کہ ہمارے باپ دادا اور ہم اب تک غلط راستے پر تھے۔ پھر پہلے قرآن مجید میں آچکا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ بہت ادنیٰ درجے کے لوگوں نے آپ پر ایمان اختیار کیا ہے تو ایمان لانے کو اس لیے بھی وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے کہ ہم ادنیٰ درجے کے لوگوں میں کیوں شامل ہوں۔ یہ سوا تکبر کے اور کیا تھا؟ دعوت ایمان کے ساتھ دنیوی نعمتوں کا وعدہ۔ وہ بھی ایک نفسیاتی طریقہ ان کو حق کی طرف مائل کرنے کا تھا کہ یہ اتنے بلند نظر نہیں ہیں کہ حق کو صرف حق ہونے کی بنا پر اختیار کریں۔ نہ آخرت پر ایمان لاسکتے ہیں کہ وہ دنیوی مفادات کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دے سکیں تو انہیں خدا کے حکم سے دنیوی مفادات حاصل ہونے کی بھی خوشخبری بھی دی جا رہی ہے کہ اگر تم ایمان اختیار کرو گے تو اللہ تمہیں دنیوی نعمتوں سے بھی بہرہ مند کرے گا صاف طور پر دعوت دی یعنی دعوت عام، مجموعوں میں بھی دی ہے اور خصوصی طور پر بلا کر اعلانیہ بھی گفتگو کی اور آہستہ آہستہ بھی سمجھا یا یعنی کوئی طریقہ بھی افہام و تفہیم کا چھوڑا نہیں۔

یہ جملہ کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا. (نوح: ۱۳) اس کے لفظی معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ تم اللہ کی عظمت کے امیدوار کیوں نہیں ہوتے مگر چونکہ امیدوار ہونے کا جو مطلب عام طور پر ذہن میں آتا ہے وہ وقار و عظمت کے ساتھ محاورے میں چسپاں نہیں ہوتا اس لیے اس کے لازم معنی کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا کہ تم اللہ کی عظمت کے قائل ہوتے، جلالین نے یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ تم اس پر ایمان لا کر اس کے امیدوار



وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۚ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۗ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ۝۲۳

”نوح نے (بارگاہ الہی میں) عرض کیا کہ اے میرے مالک ان لوگوں نے میرا کہنا نہ مانا اور ایسے آدمی کی پیروی کی جنہیں مال اور اولاد کے ملنے نے اور زیادہ خسارے میں مبتلا کیا اور انہوں نے (میرے خلاف) بڑا منصوبہ چلا رکھا ہے اور (عوام سے) کہا ہے کہ ہرگز نہ چھوڑنا اپنے خداؤں کو اور (خصوصیت کے ساتھ) نہ چھوڑنا واد کو اور نہ سواع کو اور یغوث اور یعوق اور نسر کو اور اس طرح سوں کو گمراہ کر دیا اب تو بھی ان کی گمراہی میں اور اضافہ کرتا رہ۔“

### حضرت نوح کی بارگاہ الہی میں مناجات

چونکہ حضرت نوح کی عمر تبلیغ بھص قرآن بڑی طولانی ہوئی لہذا انہیں کہا جاسکتا کہ ان کی متعدد مناجاتوں میں جو قرآن مجید میں جا بجا ہیں اور پھر عذاب الہی کے آنے میں اس کا ذکر بھی آئے گا بیچ میں کتنا فاصلہ ہے بہر حال اب یہ ان کی مناجات ہے کہ انہوں نے بارگاہ الہی میں کہا ہے کہ یہ کس طرح میرا کہنا نہیں مانتے اور ایسے آدمیوں کی پیروی کی..... یہ کون لوگ ہیں؟ رؤسا اور صاحبان مال و اولاد جو اپنی دولت اور خاندان کی وسعت سے عوام کو اپنا تابع فرمائے ہوئے تھے اور انہوں نے تمام قوم کو جناب نوح کی طرف سے برگشتہ کر رکھا تھا اور ان کی تبلیغ کے مقابلے میں وہ اپنی تقریروں سے زہر افشانی کرتے تھے اور اپنے نمائندے انہوں نے ہر طرف بھیج رکھے تھے کہ لوگ جناب نوح کی ہدایت کو قبول نہ کریں جیسے حضرت نوح نے یوں کہا ہے کہ انہوں نے میرے خلاف بڑا منصوبہ چلا رکھا ہے..... بت جن کے نام لیے گئے ہیں وہ بن جن سے عرب بھی متاثر تھے اور یہاں بھی مختلف قبیلے ان بتوں کی پرستش کر رہے تھے..... باقی ان یہاں خاص بت بھی ہو سکتے ہیں جن سے عرب واقف نہ تھے لہذا انہیں ان بتوں کے نام لینے سے پہلے اَلْهَيْتُكُمْ ”اپنے خداؤں“ کے اجمال میں سمود یا گیا ہے۔

مِمَّا خَطِيئَتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا ۗ فَلَمْ يَجِدْ وَالْهَمُّ مِّنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ۝۲۴

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝۲۵ إِنَّكَ إِن تَذَرْنِي

يُضِلُّوْا عَبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا إِلَّا فَاَجْرًا كُفْرًا ۝۲۶ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ

بَيْتِي مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝۲۷

”چنانچہ وہ اپنے جرائم کی وجہ سے غرق کردئے گئے جن کے بعد میں آگ میں ڈال دیئے گئے تو انہوں نے نہیں پائے اپنے لیے اللہ کو چھوڑ کر کوئی مددگار لوگ اور نوح نے کہا اے میرے مالک زمین پر ان کافروں میں سے کوئی باشندہ نہ چھوڑ مگر تو انہیں چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور اس کے یہاں سوائے بد اعمال اور کافروں کے اولاد میں کوئی پیدا نہیں ہوگا اے میرے مالک! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور جو میرے گھر میں ایمان رکھتے ہوئے داخل ہو اور تمام با ایمان مردوں اور با ایمان عورتوں کو اور ظالموں کے لیے سوائے ہلاکت کے کسی بات میں اضافہ نہ کر۔“

”غرق کردئے گئے جس کے بعد آگ میں ڈال دئے گئے“ اس میں ایک خیال تو یہ ہے کہ یہ فرعون اور اس کے لشکر کی ایک خصوصیت قرآن مجید میں بیان کی ہے اور ایک اس قوم نوح کی کہ وہ غرق ہونے کے ساتھ ہی عذاب جہنم میں ڈال دیئے گئے یعنی آخرت کا انتظار نہیں ہوا اور دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ جہنم کے علاوہ جس میں داخلہ آخر میں ہوگا عالم برزخ کا عذاب ہے جس کا قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے۔

## سُورَةُ الْجِنِّ

مکیہ ..... ۲۸ ..... آیات

چونکہ اس سورے میں جنات میں سے ایک گروہ کا جو قرآن مجید کے آیات کو سن کر ایمان لایا، کافی حد تک مفصل تذکرہ ہے، اس لیے اس کا نام ”سورہ الجن“ ہوا۔

### سورہ جن کے خاص خاص مضامین:

جنات کا وجود قرآن مجید کے متعدد نصوص اور متواتر احادیث کی بنا پر ایک مسلم دینی حقیقت ہے جس کے منکر صرف وہی ہو سکتے ہیں جو ہر ان دیکھی حقیقت کا انکار کریں جیسے ملائکہ اور سب سے بڑھ کر خالق جو بالکل ان دیکھی ذات ہے۔ قرآن مجید کے آیات کو سن کر جنات کے ایمان لانے کا چونکہ ایک تذکرہ سورہ اتحاف میں ہے اس لیے بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ یہاں جو جنات کا ذکر ہے وہ وہی جن ہیں جو اس واقعہ میں قرآن کے آیات کو سن کر ایمان لائے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

مگر خود قرآن مجید میں دونوں واقعوں میں ان ایمان لانے والے جنات کی جو گفتگو اپنی قوم سے مذکور ہے اس کے مضامین سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے اور روایات میں دونوں جگہ کے آیات کی جو شان نزول درج ہے اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ ایک گروہ تھا جس کا ذکر سورہ جن میں ہے اور وہ کوئی دوسرا گروہ تھا جس کا ذکر سورہ اتحاف میں ہے۔ وہ سورہ اتحاف والے جنات وہ تھے جو حضرت موسیٰؑ وغیرہ پر ایمان لائے ہوئے تھے اور یہ جنات تھے جو اب تک مشرک اور بت پرست تھے اور کسی بنی یار رسول پر ایمان لائے ہوئے نہیں تھے۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

قُلْ اَوْحٰی اِلَیَّ اِنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱ یَّهْدِیْ  
اِلَی الرُّشْدِ فَاَمْتَابِهٖ ۝۲ وَلَنْ نُشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۝۳ وَاِنَّهُ تَعَلٰی جَدًّا رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ

[۱] ہم الذین ذکر وفی قوله تعالیٰ واذا صرنا الیک نفوا من الجن (جلالین)

## صَاحِبَةٌ وَلَا وِلْدَانٌ ﴿٣﴾

”کہیے کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنات میں کچھ اشخاص نے توجہ کے ساتھ سنا تو کہا کہ ہم نے عجیب طرح کا کلام سنا ہے جو راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور اب ہم اپنے پروردگار کا کوئی شریک قرار نہیں دیں گے اور ہمارے پروردگار کی عظمت بہت بالا و برتر ہے، نہ اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد۔“

ان الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ قرآن مجید کے کسی حصے کا تلاوت فرما رہے تھے اس وقت یہ جنات آپ کے پاس رکے اور انہوں نے غور سے قرآن کے ان اجزا کو سنا اور ایمان لے آئے، پھر جو اپنے تاثرات تھے وہ جا کر اپنی قوم سے بیان کیے اور خالق کریم نے بذریعہ وحی ان تفصیلات سے اپنے رسول کو آگاہ کیا..... اس وقت وہ اشخاص آپ کے سامنے آئے۔ نہ حضرت سے انہوں نے کوئی گفتگو کی، خاموشی کے ساتھ آئے اور رکے رہے پھر خاموشی کے ساتھ اپنی قوم کی طرف واپس گئے۔ اب وہ اجزاء قرآن کے کون سے تھے جن کی حضرت تلاوت فرما رہے تھے کہ ان سے انہوں نے اتنے نتائج اخذ کیے کہ تمام اصول اسلامی ان کے ذہن میں راسخ ہو گئے؟ ہو سکتا ہے کہ کچھ باتیں انہوں نے اس کلام سے سنیں اور پھر توفیق الہی نے ان کی بصیرت والی آنکھوں کو جو کھولا تو اپنے ضمیر کی رہ نمائی سے اور حقیقتیں ان کے دماغ میں راسخ ہوتی چلی گئیں جو ایک مومن کی شان ہے۔ شان نزول والی روایتوں میں تو یہ ہے کہ آپ نماز صبح پڑھ رہے تھے ظاہر ہے کہ ایک نماز میں کتنا قرآن سنا جا سکتا ہے مگر اس سے انہوں نے قرآن مجید کی اس غیر معمولی فصاحت و بلاغت اور بے مثال انداز بیان کا بھی احساس کیا جو حدِ اعجاز پر ہے اس لیے انہوں نے عجا کی لفظ صرف کی اور اس سے وہ ان تمام معارفِ حقہ تک پہنچے جو ایمان کے لیے ضروری ہیں جو ان کی تقریر سے ظاہر ہے۔

وَأَنَّهُ كَانَ يَفْقُولُ سَفِيهًا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا ﴿٤﴾ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّنْ نَقُولَ الْإِنْسِ  
وَالْحِجْنَ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ﴿٥﴾ وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْحِجْرِ  
فَرَادَوْهُمْ رَهَقًا ﴿٦﴾ وَأَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ أَن لَّنْ يَبْعَثَ اللَّهُ أَحَدًا ﴿٧﴾  
وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَا حَمِيمًا مَّيْمَنًا ﴿٨﴾ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ  
مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ﴿٩﴾ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شَهَابًا رَّصَدًا ﴿١٠﴾

”اور یہ کہ ہم میں کا بے وقوف اللہ کی نسبت غلط بکواس کیا کرتا تھا اور یہ کہ ہمارا خیال تھا کہ انسان اور جنات اللہ کی نسبت پر گز غلط باتیں نہیں کریں گے اور یہ کہ انسانوں میں کے کچھ لوگ جنات میں کے افراد کو ذریعہ پناہ بناتے تھے تو انہوں نے ان کی سرکشی میں اور اضافہ کر دیا اور ان آدمیوں کا بھی تمہاری طرح یہ خیال تھا کہ اللہ کسی کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجے گا اور یہ کہ ہم نے آسمان کو چھونا چاہا تو اسے پایا کہ وہ بھر دیا گیا پہرہ دینے والوں اور ٹوٹنے والے ستاروں سے اور یہ کہ ہم جا کر بیٹھا کرتے خاص مقامات پر سننے کے لیے، تو جواب سننے کی کوشش کرے گا وہ

اپنے لیے ایک ٹوٹنے والے ستارے کو سدراہ پائے گا۔“

”بے وقوف“ سے بظاہر وہ خاص شیطان مراد ہے جو ابلیس کہلاتا ہے [۱] اور عام جنات جو گمراہی کی باتیں کرتے تھے وہ مراد ہو سکتے ہیں اور چونکہ عام طور پر انسان جنات سے ڈرتے رہے ہیں، اور جنات کے تصرفات کے بہت قائل رہے لہذا تعویذوں اور عملیات کے ذریعہ سے جنات کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بھی سمجھنے لگے، یہ جن کہہ رہے ہیں کہ اس کی وجہ سے ان جنات کو اپنی طاقت وغیرہ پر اور زیادہ گھمنڈ ہو گیا اور وہ اپنے کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگے تو ان کی سرکشی اور خدا فراموشی میں اضافہ ہو گیا لہذا بیعت اللہ احدا، کا بظاہر مطلب یہ ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا کہ ہمیں تصور یہی تھا کہ اب اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا مگر اس وقت یہ غلط فہمی دور ہو گئی جب ہم نے جا کر یہ کلام سنا۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے اس دور میں بھی ایک رسول بھیجا ہے جو ایسا عجیب کلام اس کی طرف پیش کر رہا ہے لیکن چونکہ بعثت کے معنی جزا و سزا کے لیے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کے بھی ہوتے ہیں اس لیے بعض نے وہ مطلب سمجھا ہے۔ [۲] مگر بعد والے تذکرے کی مناسبت سے پہلے مطلب کو ترجیح حاصل ہے ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس رسول کے آنے کی وجہ سے ہی ہوا ہے کہ آسمان پر اتنے انتظامات ہوئے ہیں کہ ہم وہاں کی باتوں کو نہ سن سکیں۔

وَأَنَّا لَنذَرِيكَ أَشْرًا أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝ وَأَنَّا  
مِنَّا الصُّلِحُونَ وَمِمَّا دُونَ ذَلِكَ ط كُنَّا طَارِقِينَ قَدَرًا ۝ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّنْ نُّعْجِزَ  
اللَّهِ فِي الْأَرْضِ وَلَن نُّعْجِزَهُ هَرَبًا ۝ وَأَنَّا لَبَسْنَا مَعَنَ الْهُدَىٰ أَمْتَابَهُ ط فَمَنْ يُؤْمِنُ  
بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا ۝ وَأَنَّا مِمَّا الْقَاسِمُونَ وَمِمَّا الْقَاسِطُونَ ط فَمَنْ  
أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ وَأَمَّا الْقَاسِمُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝

”اور یہ کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زمین کے رہنے والوں پر کوئی عذاب نازل کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا انہیں ان کے پروردگار نے صحیح راستہ دکھانے کو کوئی انتظام کیا ہے اور یہ کہ ہمیں یقین ہو کہ ہم اللہ کو روئے زمین پر کہیں بے بس نہیں بنا سکتے اور نہ بھاگ کر بے بس بنا سکتے ہیں اور ہم نے جب صحیح رہ نمائی کی آواز سنی تو اس پر ایمان لے آئے تو جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے گا اسے کسی نا انصافی اور اپنے حق میں کسی زیادتی کا ڈرنہ ہوگا اور یہ کہ ہم میں سے کچھ فرماں پذیر ہیں اور ہم میں سے کچھ راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں تو جو فرماں برداری کریگا تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحیح راستہ اختیار کیا اور جو اس راہ سے ہٹے ہوئے ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہونے والے ہیں۔“

ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر جانے سے جو غیر معمولی رکاوٹیں ہم نے محسوس کیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ کس وجہ

[۱] - ارادو بسفیہم ابلیس (مجمع البيان)

[۲] - لن یبعث احدا بعد موتہ (جلالین)

سے ہیں۔ کیا اہل زمین پر ان کے رب کی طرف سے کوئی عذاب آنے والا ہے یا ان کی ہدایت کا کوئی خاص انتظام ہوا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں یہ معلوم تھا کہ آسمان پر شیاطین کے جانے سے یہ رکاوٹیں دوصورتوں میں ہوتی ہیں۔ ایک جب عذاب اس کی طرف کا آنے والا ہو اور ایک جب کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہو [۱] اور اسی تلاش میں وہ نکلے تھے کہ اس کا سبب معلوم کریں تو انہوں نے رسول خدا ﷺ سے وہ کلام حق سنا، جس پر وہ ایمان لے آئے۔

وَأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقَيْنَهُمْ مَاءً غَدَقًا ۝ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝ وَأَنَّ الْمَسْجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ۝ وَأَنَّهُ لَبِاقَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝

”اور یہ کہ اگر لوگ راہ راست پر برقرار رہتے تو ہم انہیں سیراب کرتے اچھی بارش سے تاکہ اس کے بارے میں ہم ان کی آزمائش کریں اور جو اپنے پروردگار کی یاد سے روگردانی کرے، اسے عذاب میں داخل کرے گا جو بڑھتا ہی جائے گا اور یہ کہ سجدہ کے مقامات اللہ سے مخصوص ہیں لہذا اللہ کے ساتھ کسی کو خدا نہ کہو اور یہ کہ جب بھی اللہ کا بندہ اس کا نام لیتا ہوا کھڑا ہوا قریب ہوا کہ لوگ اس پر ٹوٹ پریں۔“

جنات کا تذکرہ اور جو انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا اس کے قبل ختم ہوا۔ بلاشبہ اب جو مضمون ہیں وہ شروع والے اس جملے کے تحت میں ہے کہ اوحی الی ”مجھ پر وحی بھیجی گئی ہے“ کیا؟ اِنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرًا مِّنَ الْحَجِّ کہ جنات کے ایک گروہ نے غور سے سنا تا آخر مضمون اور دوسرے یہ کہ اگر یہ لوگ یعنی یہ انسان بھی جنہیں آپ ہدایت کر رہے ہیں اگر راہ راست پر برقرار رہتے تو ہم انہیں سیراب کرتے [۲] کہا جاتا ہے کہ اس کے پہلے کئی سال تک قطر بارش اور پانی برساتا تھا اس لیے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو ان پر روزی کے دروازے کھول دئے جائیں گے اور پانی برسے گا اس لیے کہ پانی ہی پر تمام ضروریات حیات کا انحصار ہے لیکن اس بار ان رحمت کے نازل ہونے کے بعد بھی یہ دیکھنا ہے کہ وہ خدا فراموشی میں مبتلا تو نہیں ہو جاتے، اسلئے یہ کہا گیا ہے کہ تاکہ اس کے بارے میں ہم ان کی آزمائش کریں، اپنے پروردگار کی یاد سے روگردانی کرے اس طرح بھی کہ اس کے رسول کے احکام کو نہ مانے اور اس طرح بھی کہ اس کی دی ہوئی روزی کو غلط طور پر صرف کرے تو پھر اس کے لئے روز افزوں عذاب کی وعید ہے۔

”مساجد“ مسجد کی جمع ہو سکتی ہے جو اسم ظرف ہے تو مسجد کے معنی ہوں گے عبادت گاہوں کے، مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کہیں کسی غیر کی عبادت نہ ہو۔ اور مسجد کی جمع بھی ہو سکتی ہے یعنی وہ اعضا جن سے سجدہ کیا جاتا ہے، انہیں صرف نہ ہونا چاہیے سوا اللہ کے کسی غیر کی عبادت میں..... ٹوٹے پڑتے کے عنوان چونکہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ شوق ذوق سے ٹوٹے پڑنا کچھ لوگوں نے یہ مطلب لیا ہے کہ جب رسول قرآن

[۱]۔ ان مثل هذا لا يكون الا لاحد الامرین (مجمع البيان)

[۲]۔ هو معطوف عليه على الاستماع (جلالین) نیز بگو محمد ﷺ کہ وحی فرستادہ شدہ است بسوی من کہ بنی آدم (شاه ولی اللہ) اور وحی کیا گیا ہے طرف میرے اگر یہ لوگ (رفیع الدین)



مجید پڑھ رہے تھے تو جنات ایک دوسرے شوق ذوق کے مارے ٹوٹ پڑ رہے تھے۔<sup>[۱]</sup>

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ بطور عتاب ہے کہ آخر یہ کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حق کی دعوت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو یہ لوگ ایذا رسانی کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا ہوگا۔

قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا ۝ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ۝ قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ ۚ وَلَنْ أجدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝  
إِلَّا بَلْعَاةً مِنَ اللَّهِ وَرِسَالَةً ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا ۝

”کہیے کہ میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور اس کا کوئی شریک قرار نہیں دیتا، کہیے کہ میں تمہارے لیے نہ نقصان پہنچانے پر قابو رکھتا ہوں اور نہ راہ راست کا پابند بنانے پر اور کہیے کہ مجھے اللہ کے عتاب سے کوئی دوسرا نہیں بچا سکتا اور میں اسے چھوڑ کر کوئی جائے پناہ نہیں پاسکتا سوا اس کے کہ میں اللہ کی طرف سے تبلیغ کروں اور اس کے پیغاموں کو پہنچاؤں اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی نافرمانی کریگا، اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“

مطلب یہ ہے کہ تمہیں مجھ پر آخر اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟ میں بس ایک پیغامبر ہوں جس کا کام پیغام کو پہنچانا ہے، تمہارا کوئی نفع نقصان میرے قبضے میں نہیں ہے تمہارا نفع نقصان کیا میں تو خود اپنے نفع نقصان پر قدرت نہیں رکھتا، میرے ذمے جو فرض ہے، وہ میں ادا نہ کروں تو خود مجھے اس کی طرف سے اس کی سزا ملے جس سے میں بچ نہیں سکتا اور جو میری بات نہ مانیں اور میرے پیغام کو قبول نہ کرے اس کا انجام دوزخ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ أَضَعُفٌ نَّاصِرًا ۚ وَأَقَلُّ عَدَدًا ۝ قُلْ  
إِنْ أَدْرِيٓ أَقْرَبُٓ مَا تُوْعَدُونَ أَمْ لِيَجْعَلَ لِرَبِّيٓ أَمَدًا ۝ عَلِمَ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ  
عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَيَمْنُنُ  
خَلْفَهُ رَصَدًا ۝ لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَتِي رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ  
وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝

”یہاں تک کہ جب دیکھ لیں گے اسے جس کی انہیں اطلاع دی جا رہی ہے تو انہیں پتہ چلے گا کہ کس کے

[۱] ای کا دا الحن یر کب بعضهم بعضا یر دعومون علیہ حرصا منهم علی استماع القرآن عن ابن عباس وضحاك (مجمع البیان)

مددگار کمزور ہیں اور ساتھیوں کی تعداد کم ہے، کہیے کہ مجھے خبر نہیں کہ نزدیک ہے وہ جس کی میں اطلاع دے رہا ہوں یا میرا پروردگار کوئی طولانی مدت قرار دے گا، وہ غیب کا جاننے والا ہے تو وہ اپنے غیب پر کسی کو حاوی نہیں کرتا سوا اس پیغمبر کے جسے اس نے منتخب کیا ہے تو وہ اس کے سامنے سے اور اس کے پس پشت سے پہریدار بھیج دیتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کو پہنچایا ہے اور وہ گھیرے ہوئے ہے انہیں چاروں طرف سے اور وہ ہر چیز کی گنتی پر حاوی ہے۔

مشرکین کو غرہ تھا کہ رسولؐ کے پاس آنے گئے چند اشخاص گرد و پیش میں ہیں جو ان کی مدد کے لیے تیار ہو سکتے ہیں لیکن وہ کمزور و ناتواں ہیں، مدد کریں گے بھی تو کیا کر سکتے ہیں اور ہم ہر طرح طاقت ور ہیں ہماری تعداد بھی زیادہ ہیں تو کہا جا رہا ہے کہ ابھی وہ یہ کہہ لیں مگر آئے گا ایسا وقت جس سے ہم برابر خبردار و ہوشیار کر رہے ہیں کہ اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور ساتھیوں کی تعداد کم ہے! ہاں اگر یہ پوچھیں کہ وہ وقت کب آئے گا تو رسولؐ کو اس کی اطلاع نہیں دی گئی ہے کہ اس میں اب کتنے دن باقی ہیں، اور وہ بہت جلد ہی آئے گا یادیر میں آئے گا؟ اس کا تعلق علم غیب سے ہے اور وہ ذاتاً صرف خدا کو ہے وہ رسولؐ کو بتقاضائے حکمت جتنا مناسب سمجھتا ہے اتنا علم عطا کرتا ہے اس کے پاس جو جی بھیجتا ہے اس میں اہتمام کرتا ہے کہ درمیان میں شیاطین کوئی کارگزاری نہ کر سکے یا اس میں کوئی جز چوری چھپے اڑا کر کاہنوں کو نہ بتادیں اور راز الہی کو افشاں نہ کر دیں اور پھر اس طرح اللہ جانے یعنی بحیثیت واقعہ یہ بات یقینی ہو جائے کہ ان تک جو پہنچا ہے اور جو وہ پہنچا رہے ہیں وہ بالکل وہی ہے جو خالق نے ان تک پہنچانے کے لیے فرشتوں کے سپرد کیا تھا اور انہوں نے اسے خلق خدا تک پہنچایا ہے یوں اللہ کو اپنے علم کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے وہ تو ہر چیز پر حاوی ہے اور کائنات کے ذروں کی تعداد جانتا ہے تو اپنی وحی اور اس کی ادائیگی کو بھلا وہ نہ جانے گا؟۔

# سُورَةُ الْمُرْمِلِ

مکیہ ..... ۲۰ ..... آیات

”مزل“ کے معنی چادر میں لپٹے ہوئے کے ہیں، چونکہ اس کا آغاز رسولؐ سے مزل کی لفظ کے ساتھ کیا گیا ہے اس لیے اس سورے کا یہ

نام ہوا۔

## سورۃ مزل کے خاص خاص مضامین:

۱..... اس میں حضرت پیغمبر ﷺ کو سپرد کرنے والی ذمہ داری کی اہمیت اور دشواری کو دکھاتے ہوئے آپ کو راتوں کی بیداری کے ساتھ عبادت میں کافی وقت گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

۲..... مخالفین کی ایذا رسانیوں پر صبر و تحمل کی تلقین اور نتیجہ کو اللہ پر چھوڑنے کا حکم جس کے ساتھ مخالفین کو عذاب کی تہدید ہے۔

۳..... قرآن مجید کے ہولناک مناظر کا اجمالی تذکرہ

۴..... رسول خدا ﷺ کے مثل موسیٰؑ مبعوث فرمانے کا اعلان اور مخالفین کو فرعون کے عذاب کی یاد دہانی۔

۵..... آخر میں سابق میں جو تہجد کے اوقات کی پابندی عائد کی گئی تھی اس میں تخفیف کا اعلان اور نماز شب کی پابندی میں تخفیف جس کے متعلق مفسرین کا خیال ہے کہ وہ گزشتہ حصے سے تقریباً دس برس گزرنے کے بعد ترا ہے اور اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سورے میں پہلا رکوع مکی ہے اور بعد والا دوسرا مدنی ہے اس کے مضامین سے ظاہر ہے۔ اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو سورے کی پیشانی پر مکی لکھے جانے سے اس کے مضامین کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مکی زندگی سے متعلق ہے بلکہ وہ مدینہ کے نازل شدہ ہو سکتے ہیں۔ پھر اس سورہ کے متعلق ترتیب کے لحاظ سے بھی یقینی طور پر رائے قائم نہیں کی جاسکتی کہ وہ مکہ ہی کا نازل شدہ سورہ ہے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

يَا أَيُّهَا الْمُرْمِلُ ۙ قِمِ الْيَلَّ إِلَّا قَلِيلًا ۙ نِصْفَهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۙ أَوْ زِدْ

عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۙ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۙ

”اے کپڑوں میں لپٹ کر لیٹنے والے! رات نماز میں گزارے مگر کچھ تھوڑا حصہ، آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کر دیجیے یا اس پر اضافہ کر دیجیے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پوری طرح واضح کر کے پڑھا کیجیے، عنقریب ہم آپ

پرايسے پيغام پہنچانے کا بوجھ ڈالنے والے ہیں جو بہت گراں ہے۔

اس سورے کا ابتدائی حصہ اس وقت نازل ہوا جب آغاز رسالت کا دور تھا، حضرت رات کے ابتدائی حصے ہی میں آرام فرمانے کے لیے لیٹے تھے کہ خالق کریم کی طرف سے یہ آیات نازل ہوئے جن میں حضرت کو شب کو بیدار رہ کر نمازوں میں گزارنے کا حکم آیا ہے۔

یہ ہمارے رسول کی خصوصیت ہے جو قرآن مجید کے مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ جس نبی یا رسول سے مخاطب ہوا ہے ہمیشہ نام لے کر مخاطب ہوا مثلاً یا آدم اسکن انت وزوجک الجنة، یا نوح اهبط بسلاہ منا وبرکات علیک، یا ابرہیمہ قد صدقت الرویا وغیرہ وغیرہ لیکن رسول خدا ﷺ سے کبھی نام لیکر خطاب نہیں ہوا بلکہ بعد میں تو زیادہ تر جو آپ کا منصب تھا اس کو سرنامہ خطاب قرار دیا یعنی یا ایہا النبی اور یا ایہا الرسول لیکن شروع میں بتقاضائے محبوبیت بے تکلفی کے ساتھ جس وقت جیسا انداز ہوا اس سے سرنامہ خطاب قرار دے دیا جیسے سورہ مدثر میں جو اس کے بعد میں ہے مگر پتہ چلتا ہے کہ وہ نازل اس سے پہلے ہوا تھا یا ایہا المدثر کہہ کر مخاطب اور اس سورے میں یا ایہا المزمّل۔<sup>[۱]</sup> مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے حبیب اب اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے کا وقت نہیں ہے، اب تو خلق خدا کو جگانے کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی جا رہی ہے لہذا اب تو آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ آپ کو نمازوں میں گزارنا ہے تاکہ افراد امت کے لیے مثال ہو اور وہ بھی رات کو زیادہ حصہ عبادت خدا اور یاد الہی میں گزاریں۔

اس کے ساتھ تلاوت قرآن مجید کے آداب کی تعلیم بھی ہے کہ اسے جلدی جلدی نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ الفاظ و حروف کو نمایاں کر کے رک رک کر پڑھنا چاہیے۔ امام جعفر الصادقؑ کا ارشاد ہے: اذ امرت بأیة فیہا ذکر النار فتعوذ باللہ من النار، جب ایسی آیت سے گزر جس میں بہشت کا ذکر ہے تو اللہ سے بہشت کا سوال کرو اور جب ایسی آیت سے گزر جس میں جہنم کا ذکر ہے تو اللہ سے طلب کار پناہ ہو اس آگ سے۔ پیغام کو بوجھل اور گراں کہنا ان کی لحاظ سے بھی ہے جن تک وہ پہنچا ہے کہ وہ ان کے اب تک کے عادات و قصورات اور آباؤ اجداد سے چلے آتے ہوئے طریقوں کے خلاف ہے، اس لئے انہیں اس کا قبول کرنا بڑا دشوار ہے، اسی لحاظ سے زیادہ گراں رسول کے لئے بھی ہے کہ آپ کو اس کے پہنچانے میں دشواریوں کا سامنا ہوگا اور شداہد کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ روایات بتاتے ہیں رسول خدا ﷺ کے لئے اس کے بوجھ کا جسمانی طور پر بھی ظہور ہوتا تھا سخت جاڑے میں بھی وحی نازل ہوتی تھی حضرت کی پیشانی پسینے سے تر ہو جاتی تھی۔ اور اگر نائق کی پشت پر آپ ہیں اور اس وقت وحی نازل ہوئی تو ناقہ اپنا پسینہ زمین پر ٹکادیتا تھا سیدھا کھڑا نہیں رہتا تھا۔ یہ روایتیں زیادہ ام المؤمنین عائشہ سے مروی ہیں۔

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلاً ۖ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۗ<sup>⑥</sup>  
وَأذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً ۗ<sup>⑧</sup> رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۙ<sup>⑨</sup> وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۙ<sup>⑩</sup>  
وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۙ<sup>⑪</sup>

[۱]۔ انما خوطب بهذا في بدو الوحي ولم يكن قد بلغ شأناً ثم خوطب بعد ذلك بالنبی والرسول (مجمع البيان)

”یقیناً رات کو بیدار رہنا ریاضتِ نفس میں بہت پر تاثیر ہے اور کلام کو زیادہ مضبوط بنانے کا سبب ہے بلاشبہ آپ کے لئے دن میں بہت مشغولیت ہے، اپنے پروردگار کے نام ورد رکھیے اور اُس کی طرف پوری طرح لو لگائیے۔ مشرق و مغرب کا پروردگار کوئی سوا اُس خدا کے نہیں ہے تو بس اُس پر بھروسہ کیجئے اور مناسب عنوان پر ان میں قطع نظر کیجئے اور چھوڑ دیجئے مجھے اور ان جھٹلانے والے اہل دولت کو اور انہیں تھوڑے دن مہلت دیجئے۔“

یعنی دن کو بہت قسم کی مصروفیت رہتی ہے۔ اُس میں عبادت اتنی یکسوئی کے ساتھ نہیں ہو سکتی نہ اس طرح تلاوت قرآن ہو سکتی ہے جیسی رات کو لہذا رات کا وقت عبادت، تلاوت اور ذکر الہی کے لئے موزوں و مناسب ہے۔ پھر یہ کہ اس میں چونکہ طبیعت کی خواہش آرام کا زیادہ مقابلہ کرنا ہوتا ہے لہذا اس کا اجر و ثواب بھی زیادہ ہے اور اُس سے خود نفس میں شدائد کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی پیدا ہوتی ہے اور چونکہ یہ عبادت و تلاوت زیادہ یکسوئی کے ساتھ ہے لہذا قرآن کے مفادات پر غور کا بھی اس میں زیادہ امکان ہے اور پوری قوت کے ساتھ پھر تبلیغ و دعوت کا کام انجام دیا جاسکتا ہے، مخالفتوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ آپ کا حامی وہ ہے جو مشرق اور مغرب کا پروردگار ہے، آپ بس اس پر بھروسہ کیجئے ”مناسب عنوان پر قطع نظر“ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دعوت و تبلیغ کرنا انہیں چھوڑ دیجئے بلکہ یہ اُن کی بدزبانیوں اور ایذا رسانیوں پر جھنجھلانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے میں نیٹوں گا، ان کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ ہاں جلد بازی نہیں ہونا چاہیے۔..... تھوڑے دن کی انہیں مہلت دیجئے۔ وہ وقت جب آجائے گا تو اُن سے سمجھ لیا جائے گا۔

إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ۝۱۲ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ ۝۱۳ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۝۱۴ يَوْمَ تَرْجُفُ

الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۝۱۵

”بلاشبہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور دوزخ کی آگ اور گلے میں پھسنے والی خوراک اور دردناک عذاب، اُس دن جب کانپ رہی ہوگی زمین اور پہاڑ، اور پہاڑ بکھرنے والے ریگ کے تودے ہو جائیں گے۔“

یوں تو دنیا ہی میں عذاب آسکتا ہے لیکن اگر اُن کی پوری دنیا کی عمر مہلت میں ختم کر دی جائے تب بھی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ عذاب سے بچ گئے کیوں کہ خلق کے یہاں آخر میں عذاب کا سامان موجود ہے۔ اس کے لئے ابھی قیامت کے ہنگام کی ابتدائی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ زمین اور پہاڑ تھڑا رہے ہوں گے۔ پہاڑوں کی یہ کیفیت کہ اُن کی سختی و مضبوطی ختم ہوگئی..... اور وہ ایسے ہو گئے جیسے ریگ کے بکھرے ہوئے تودے۔ یہ پہلا اثر ہے ابتدائی جو پہاڑوں کے لئے قرآن نے بتایا ہے اور اس کے لئے ایک منزل وہ ہے جسے کہا ہے کالعھن ”جیسے دھنکے ہوئے اون کے ٹکڑے ادھر ادھر منتشر“ اور پھر اُس کے بعد ایک درجہ ہے جب وہ ہباء منشور ہیں یعنی اُن ذروں کی طرح جو روشندان وغیرہ سے دھوپ آنے کی حالت میں نظر آتے ہیں اور پھر آخر میں تو وہ غائب ہی ہو جائیں گے..... زمین چٹیل میدان کی طرح ہو جائے گی، جس میں کوئی اونچ نیچ سے فرق دکھائی نہ دے گا (قَاعًا صَفْصَفًا ۝۱۵ لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا..... طہ۔ ۱۰۶، ۱۰۷)

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝۱۶

فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِئْسَ لِلْكَافِرِينَ ۝۱۷

يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝۱۷ السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ ۝ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝۱۸ إِنَّ  
هَذِهِ تَذَكِيرَةٌ ۝ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝۱۹

”ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر جیسے فرعون کی طرف ایک پیغمبر بھیجا تھا تو فرعون نے اُس پیغمبر کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اُسے بڑی سختی کے ساتھ عذاب میں گرفتار کیا تو تم کیوں کرنچ جاؤ گے اگر تم نے کفر اختیار کیا اُس دن کے عذاب سے بچوں کو بوڑھے بنا دے جس سے آسمان پھٹ جائے گا۔ یہ اُس کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ یقیناً اس میں ایک بہت بڑی نصیحت ہے تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کرے۔“

اس میں مجمل طور پر حضرت موسیٰ کی بعثت کا حوالہ دیا گیا ہے اور حقیقت ہے کہ ہمارے رسول متعدّد دو جہ سے ”مثل موسیٰ“ کی حیثیت رکھتے تھے جس کے لئے بائبل میں بھی خود حضرت موسیٰ سے مخاطب میں کہ ”میں تمہارا ایسا بنی بھیجوں گا“ مگر یہاں تو اُن کی بعثت کا حوالہ مشرکین کو اُس انجام کی طرف متوجّہ کرنے کے لئے دیا گیا ہے جو فرعون کا ہوا اُن کی مخالفت کر کے وہ غرق دریا کر دیا گیا۔ اب رسول خدا ﷺ کے مخالفین کو متوجّہ کر کے کہا جا رہا ہے کہ موسیٰ کی مخالفت کر کے تو دنیا ہی میں عذاب آگیا تو تم پر بھی دنیا ہی میں عذاب آسکتا ہے اگر دنیا میں عذاب نہ بھی آئے تو قیامت کے عذاب سے کیوں کرنچ سکتے ہو اور پھر ہول قیامت کا ایسے عنوان سے بیان ہوا ہے جو کسی حد تک اُس کی شدّت اُن کے ذہن میں لاسکے۔ اور ”گواہ“ اس حیثیت سے کہا گیا ہے کہ رسول جتّ خدا ہوتا ہے جس کے آنے کے بعد کافروں کے پاس اپنے کفر اور نافرمانوں کے پاس اپنی نافرمانی کے قابل معافی ہونے کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ جاتا اور ان کا مستحقّ عذاب ہونا پورے طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ  
الَّذِينَ مَعَكَ ۝ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ عَلِمَ أَنْ لَّنْ نُحْصِيَ فَتَابَ عَلَيْكُمْ  
فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۝ عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَّرْضَىٰ ۝ وَآخَرُونَ  
يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ ۝ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ  
اللَّهِ ۝ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۝ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاقْرَءُوا اللَّهَ  
قَرْضًا حَسَنًا ۝ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا  
وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۝ وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ ۝ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۲۰

”بلاشبہ آپ کا پروردگار جانتا ہے کہ آپ تقریباً دو تہائی، آدھی اور (نہیں تو) ایک تہائی رات نمازیں پڑھا کرتے ہیں اور اُن میں سے بھی ایک گروہ جو آپ کے ساتھ ہیں اور اللہ خوب پیمانہ جانتا ہے رات اور دن (کی ہر بات) کا۔ اُسے معلوم ہے کہ تم لوگ اُس پر حاوی نہیں ہو سکتے لہذا اب خاص مہربانی اُس کی تمہارے شامل حال ہوئی ہے تو پڑھو جتنا آسانی کے ساتھ ممکن

ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ سفر میں ہوتے ہیں، اللہ کی طرف کی روزی طلب کرتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں لہذا جو آسانی سے (جس حال میں) ممکن ہو پڑھ لیا کرو اور پابندی کرو (واجب) نماز کی اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو نیک قرضہ دو اور جو کچھ اچھائی کا ذخیرہ اپنے لئے بھیج دو گے، اُسے پاؤ گے اللہ کے یہاں جو تمہارے لئے سب سے بہتر چیز ہوگی اور جس کا ثواب بہت بڑا ہوگا اور اللہ سے بخشش کے طلبگار ہو، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، مہربان۔“

ایک روایت تو ایسی جو بتاتی ہے کہ پہلا عمل تو بس ایک سال رہا اور پھر سورے کا یہ آخری حصہ نازل ہو گیا اور دوسری روایت یہ ہے کہ وہ طریقہ عبادت کا دس ۱۰ برس جاری رہا اور چونکہ گھڑی اور گھڑیال اُس وقت عام دنیا اور خصوصاً عرب ملک میں نہیں پائے جاتے تھے اس لئے کبھی اس خیال سے کہ تعمیل حکم میں کوتاہی نہ ہونے پائے کبھی کبھی پوری رات قیام و نماز میں گزر جاتی تھی [۱] لہذا اس حکم میں تخفیف کر دی گئی اور کہا گیا اب اُتنا زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جتنا آسانی سے پڑھا جائے اتنا پڑھ لیا کرو۔

چونکہ وجہ تخفیف میں جہاد کا بھی ذکر ہے اور وہ بھی قتال کی لفظ کے ساتھ (يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ) جس کے معنی تلوار وغیرہ سے مقابلے کے ہیں یعنی مرنے مارنے کی بات ہے اور اُس کا حکم مکہ کی سرزمین پر یعنی ہجرت سے پہلے نہ تھا۔ اور زکوٰۃ کا بھی اُن اصطلاحی معنی میں جس میں نصاب ہوتا ہے اور مقدار مقرر رہے اور مستحقین معین ہیں مکہ میں حکم نہ آیا تھا ان کی وجہ سے زیادہ ترجیح اسی قول کو حاصل ہے کہ یہ پہلے حکم سے تقریباً دس ۱۰ برس بعد مدینہ میں نازل ہوا ہے۔ ”پڑھو جتنا آسانی کے ساتھ ممکن ہے“ اس سے جیسا کہ زیادہ تر مفسرین کا قول ہے نماز شب مراد ہے جس کی رکعتیں مقرر ہیں لہذا ان کا شمار آسان ہے۔ اُس میں بھی ”پڑھو“ کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ ممکن ہو اتنی قرآن مجید کی زیادہ مقدار پڑھے۔ اب اگر اتنا ہی حکم رہتا تو ہم سمجھتے کہ کم از کم نماز شب واجب ہے لیکن چونکہ بعد میں پھر اعذار بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ جتنا آسانی سے ممکن ہے پڑھو، ہاں نماز کی پابندی کرو اور اب نماز سے مراد واجب نمازیں ہیں تو معلوم ہوا کہ نماز شب کی بھی بس افضلیت ہے، وجوب نہیں ہے۔ اصل واجب بس پنجگانہ نمازیں ہیں۔ انہیں پوری پابندی کے ساتھ بہر صورت ادا کرنا لازم ہے۔ اب جو لوگ بدآ پر معترض ہیں کہ اُن سے معاذ اللہ خداوند عالم کا پہلے جاہل ہونا اور پھر پشیمان ہونا لازم آتا ہے اُن کو اس آیت کے انداز بیان پر غور کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم ہونا ازل سے اور چیز ہے اور علم کے تقاضے کا معرض ظہور میں آنا باعتبار مصالح دوسری چیز ہے، جو بعد میں تبدیل کی جا رہی ہے اس کا علم بھی پہلے سے تھا اور جس بنا پر تبدیلی ہو رہی ہے وہ بھی علم تھا۔ مگر مصلحت کا تقاضا پہلے وہ تھا خواہ بنظر امتحان ہو..... خواہ باوجود مشقت تعمیل کرنے والوں کے صبر و ثبات کا اندازہ دنیا کو کرانے کے لئے ہو اور پھر بعد میں مصلحت تخفیف کی متقاضی ہوگئی۔ اور یوں کہنا چاہیے کہ حکم جہاد پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے مگر نوعیت جہاد میں فرق ہو گیا پہلے وہ اُس طرح تھا جس میں چمکتی ہوئی تلوار نظر نہیں آتی اور اب اس طرح ہو گیا جس میں تلوار بھی نظر آرہی ہے..... مگر اس جہاد کے ساتھ بھی وہ جہاد فرض نمازوں کی بلاناغہ ادائیگی..... اور نافلہ شب کی بطور افضلیت پابندی اور زکوٰۃ کی شرائط وجوب کے ہوتے ہوئے بطور فرض پابندی اور کارہائے خیر میں جتنا زیادہ ممکن ہو، اُتنا صرف کرنے کی بطور تاکید پابندی اس کے بعد بھی قائم ہے۔

[۱] - كان الرجل يقوم ولا يلدی منی ینتصف الیل و منی یکون الغلثان و كان الرجل بقوم حتی یصبح محافاة ان لا یحفظه (علی بن

# سُورَةُ الْمَدَّيْنِ

مکیہ ..... ۵۶ ..... آیات

چونکہ اس سورہ کا آغاز پیغمبر خدا ﷺ سے لفظ المدثر کے ساتھ مخاطب ہوا ہے اس لئے اس کا یہی نام ہو گیا۔

## سورہ مدثر کے خاص خاص مضامین:

یہ سورہ ترتیب میں اگرچہ المزمحل کے بعد درج ہے مگر اس سے بہت پہلے ابتدائے زمانہ بعثت میں اتر ہے۔ بعض نے تو کہا ہے کہ یہ سب سے پہلا سورہ ہے جو پیغمبر خدا ﷺ پر نازل ہوا، مگر اس سورے کے بعض مضامین سے جو ابھی آئیں گے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پہلے قرآن کا کافی حصہ نازل ہو چکا تھا جسے سن کر مخالفین نے اس کلام کی نوعیت پر غور کرنا شروع کر دیا تھا اور طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے اور رسولؐ کو کبھی کاہن کہتے تھے اور کبھی شاعر، کبھی (معاذ اللہ) مجنوں اور اس کی تاثیر بھی کچھ ان کو محسوس ہونے لگی تھی کہ وہ آپ کو ساحر کہہ رہے تھے۔ اور اس لئے بعض مفسرین اس کے قائل ہیں اور وہ بعید نہیں ہے کہ بالکل شروع میں تو سورہ ”اقراء“ کی پانچ آیتیں اتریں جن سے بعثت رسولؐ کی ابتدا ہوئی پھر کافی عرصے تک سلسلہ وحی کا بندر ہا اور اُس کے بعد اس سورے کی ابتدائی سات آیتیں اتریں جو ابھی سامنے آئیں گی اور اس کے بعد جلدی جلدی وحی کے اجزاء اترنے لگے اور اکثر وہ چھوٹے سورے اترنے لگے جو تیسویں پارے میں درج ہیں۔ اس دوران میں متفرق آیت کی صورت میں وہ آیتیں بھی آئیں جن سے سورہ اقراء کی تکمیل ہوئی اور یہ آیات بھی آئے جن سے سورہ مدثر ایک مکمل سورہ ہو گیا۔

اس سورہ میں پہلے تو رسول خدا ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ بس اب کھڑے ہو جائیں اور خلق خدا کو عذاب الہی سے ڈرائیں، پھر قرآن کی عظمت اور علو شان کا بیان ہے، پھر جس شخص نے خاص طور پر یہ رائے ظاہر کی تھی یہ سحر ہے، اُس کو سختی کے ساتھ عذاب الہی سے خبردار کیا گیا ہے اور پھر دوزخ کا ذکر اور ان فرشتوں کی تعداد ہے جو دوزخ پر مقدر ہیں۔ پھر مختصر طور پر اہل بہشت کا ذکر ہے اور ان کے حسن انجام کا اور قرآن سے وحشت کرنے والوں اور بھاگنے والوں کا ذکر ہے اور یہ کہ ہدایت وہ پائیں گے جن کے شامل حال توفیق ربانی ہوگی جو اہلیت کے ساتھ وابستہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

يٰۤاَيُّهَا الْمَدَّثِرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ وَالرُّجْزَ



## فَاهُجْرٌ ۝ وَلَا تَمُنُّنَ تَسْتَكْثِرُونَ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝

”اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے، اٹھیے اور متنبہ کیجئے اور اپنے پروردگار کی بڑائی کا اعلان کیجئے اور اپنے کپڑے کو پاک رکھئے اور نجاست سے بچتے رہیے اور احسان نہ کیجیے زیادہ حاصل کرنے کے لئے اور اپنے پروردگار کے لئے صبر و برداشت سے کام لیجئے۔“

کہا جاتا ہے کہ جبریل امینؑ کو دیکھ کر حضرت پیغمبر خداؐ خوف زدہ ہو گئے تھے اور گھر پر آ کر فرمایا مجھے اڑھاؤ اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے اُس وقت یہ سورہ اتر اور یا ایہا المدثر کہہ کے خطاب کیا گیا..... یعنی آپ اُس سے نہ ڈریے کہ جو آپ نے دیکھا ہے وہ شیطان کا کوئی وسوسہ ہوا اٹھیے اور خلق خدا کو عذاب الہی سے متنبہ کیجئے آپ تو اللہ کے رسول ہیں۔ علامہ طبرسی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:-

فی هذا ما فيه لان الله تعالى لا يوحى الى رسوله الا بالبراهين العيرة والايات البيينة الدالة على ان ما يوحى اليه ائما هو من الله تعالى فلا يحتاج الى شيء سواها ولا يفزع ولا يفرت (مجمع البيان)

اس روایت میں جو کمزوری ہے وہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جو وحی اپنے رسول کی طرف بھیجتا ہے وہ کھلے ہوئے دلائل اور نمایاں نشانیوں کے ساتھ ہوتی ہے جو پتہ دیتی ہیں کہ جو اُس پر وحی ہو رہی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے جس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے اور وہ گھبراتا نہیں اور نہ ڈرتا ہے۔ بہر حال اس جزء کو رد کرنے کے بعد بھی کہ حضرت گو معاذ اللہ شیطان کے وسوسہ کا ڈر ہوا، بحیثیت واقعہ اس کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے کہ جب یہ سورہ نازل ہوا ہے تو حضرت چادر اوڑھ کر لیٹ چکے تھے۔ چنانچہ علامہ طبرسی نے اس کے بعد ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ

انه كان قد تدثر بشملة صغيرة لمنامه فقال قم يا ايها النائم من نومك فانذر قومك -

آپ نے ایک چھوٹی سی چادر اوڑھی تھی تاکہ سوئیں، تو ارشاد ہوا کہ اے سو نوا لے اپنی نیند چھوڑ کر اٹھیے اور اپنی قوم کو متنبہ کیجئے۔

بہر حال جیسا کہ سورہ منزل کے ابتدائی حصے میں لکھا جا چکا ہے ان دونوں خطابوں میں کہ یا ایہا المدثر اور یا ایہا المزمّل ایک محبانہ تکلفی ہے۔ مطلب یہی ہے کہ اب سونے اور لیٹنے کا زمانہ نہیں ہے اب تو آپ کو خلق خدا کو بیدار کرنا ہے..... لہذا بس اب اٹھیے اور اپنی قوم کو متنبہ کیجئے کہ اُن کا شرک اور اُن کی بد اعمالیاں اُنہیں عذاب خدا کا مستحق بنا رہی ہیں۔

یہاں اٹھنے کا حکم دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بس اب کھڑے ہو جائیے اور جا کر لوگوں کے گھروں پر اسی پردہ شب میں انہیں جگانا شروع کر دیجیے بلکہ یہی ہے کہ اب اپنے دور حیات میں مستقل طور پر آپ کو یہ کام انجام دینا ہے جس میں آپ کو آرام کا موقع کم حاصل ہوگا اور سرگرمی و عرق ریزی کے ساتھ جدوجہد اور شہدائے کرام کا مقابلہ زیادہ کرنا پڑے گا جسے ان آیات کے آخر میں کہا ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف کے فرض کو ادا کرنے کے لئے آپ کو صبر و برداشت سے کام لینا ہوگا۔

## اللہ اکبر کے معنی

”اپنے پروردگار کی بڑائی کا اعلان کیجئے“..... یعنی یہاں کے لوگ جو دوسرے خداؤں کے سامنے سر جھکا رہے ہیں انہیں بتا دیجئے کہ ان میں سے کوئی عظمت کا مالک نہیں ہے، بزرگی صرف اُس ذات کے لئے ہے جو سب کا پروردگار ہے۔ اور اس حقیقت کے اظہار



## إِلَّا سِحْرٌ يُؤْتِرُهُ ﴿٢٧﴾ إِنَّ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٨﴾

”تو جب صور پھونکا جائے گا تو یہ جس دن ہوگا بڑا دشوار دن ہوگا، کافروں پر وہ کوئی معمولی نہ ہوگا، چھوڑ دو مجھے اور اسے جسے میں نے تہا پیدا کیا، اور اس کے لئے بڑا پھیلا ہوا مال وزر میں قرار دیا اور بیٹے کہ جو ہر وقت موجود رہتے ہیں اور ہر طرح کی آسانیوں کا سامان اُس کے لئے فراہم کیا، پھر بھی وہ لالچ رکھتا ہے کہ میں اُسے اور زیادہ دوں ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں سے جان بوجھ کر دشمنی کرنے والا ہے میں تو اب جلد اُسے سخت عذاب کی راہ پر لے جاؤں گا، اُس نے سوچا کہ اندازہ کر کے کیا بات کہے تو اُس کی جان لی جائے، کیا اُس نے اندازہ لگایا پھر (سنو) اُس کی جان لی جائے کہ اُس نے کیسا اندازہ لگایا پھر اس نے غور سے دیکھا، پھر اُس نے منہ سیڑ اور نفرت کی صورت بنائی پھر (سچائی کی طرف سے) پیٹھ پھیری اور غور سے کام لیا تو کہنے لگا یہ بس (لوگوں سے) سنا سنا یا جادو ہے۔ یہ نہیں ہے مگر آدمیوں کا کلام۔“

### ایک شخص خاص کا تذکرہ

انداز کلام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک شخص خاص کا ذکر ہے۔ گزشتہ آیتوں کی شان نزول میں جو روایتیں ہیں وہ نہ ہوتیں تو ہم سمجھ سکتے تھے کہ اسی شخص کے طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر رسول اُس طرح منہ لپیٹ کر لیٹے تھے جو یہ سورہ نازل ہوا۔ مگر جیسا کہ کہا گیا وہ سات آیتیں ہیں جو پہلے نازل ہوئیں اور اس کے بعد جب اس شخص سے اس واقعہ کا ظہور ہوا تو یہ آیتیں اتریں۔ علامہ طبرسی نے اس سلسلے میں جو دو روایتیں نقل کی ہیں اُن میں سے ایک میں تو یہ ہے کہ جب قریش دارالندہ وہ میں جہاں کسی بھی اہم موقع پر مجلس شوریٰ کی ضرورت ہوتی تھی جمع ہوتے تھے (جمع تھے کہ اُس نے از خود کھڑے ہو کر مجمع سے کہا کہ تم صاحبان عقل ہو اور تمہاری بات کا عرب میں وزن معلوم ہوتا ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) جو کلام سناتے ہیں اُس سے عرب متاثر ہوتے ہیں اور تم لوگ مختلف باتیں اس کلام کے متعلق کہتے ہو تو یکسوئی کے ساتھ ایک بات طے کر لو یہی کیا کرو گے۔ اب بتاؤ تم لوگ کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے تو اُس نے یہ سن کر منہ سیڑ اور کہا کہ ہم نے بے شمار شعر سنے ہیں یہ شعر والے انداز کا کلام ہے ہی نہیں۔ انہوں نے کہا اچھا کاہن ہے۔ اُس نے کہا تم برابر اُس سے باتیں کرتے رہے ہو، کبھی اس نے کاہنوں کی سی گفتگو کی؟ انہوں نے کہا دیوانہ کہیں گے، اُس نے کہا یہ بھی تم اُس کی گفتگو سے محسوس کرو گے کہ وہ دیوانوں کی سی باتیں نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا اچھا تو ساحر کہیں، اُس نے کہا ساحر کس طرح سے ہے۔ کہا اس لئے کہ وہ دوستوں میں آپس کے تفرقہ ڈالتا ہے، اور جو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے اور یہ کام جادو گروں کا ہوتا ہے۔ اُس نے کہا اچھا یہ ٹھیک ہے، بس یہی کہو کہ وہ جادو گر ہے۔ اب جو ملتا تھا، رسول ﷺ کو جادو گر کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت نے قرآن مجید کے ایک سورے کی تلاوت شروع کی تھی مسجد میں کہ یہ شخص آ گیا اور کھڑے ہو کر سننے لگا۔ حضرت گو جب محسوس ہوا کہ وہ غور سے سن رہا ہے تو آپ نے جو آیت پڑ چکے تھے اسے دوبارہ پڑھا اور پھر اگلے حصے کی تلاوت کی تو ولید اپنے قوم قبیلہ میں گیا اور کہا بخدا میں نے محمد سے ایک ایسا کلام سنا جو انسانوں کا یا جنوں کا کلام نہیں ہے، اس میں شریں ہے اور بڑی دل فریبی ہے۔ اس

کے اوپر کا حصہ میوہ دار ہے اور نیچے سے بھی وہ سرسبز شاداب ہے اور یہ غالب آ کر رہے گا، کوئی اسے مغلوب نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر گھر چلا گیا۔ قریش میں چرچا ہونے لگا کہ لو ولید تو گرویدہ ہو گیا (یعنی مسلمان ہو گیا) ان جتنے قریش کے لوگ سب گرویدہ ہو جائیں گے، کیونکہ ولید کو قریش میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ابو جہل نے کہا اسے ٹھیک کرنا میرے ذمہ ہے، چنانچہ وہ گیا اور بڑی رنجیدہ صورت سے اس کے پاس بیٹھا، اس نے کہا کیوں بیٹے! رنجیدہ کیوں ہو؟ کہا آپ ایسے بزرگ آدمی کو قریش کے لوگ بڑی لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے محمدؐ کے کلام کی تعریف کی ہے۔ یہ سن کر ابو جہل کے ساتھ اٹھا اور اپنی قوم کے مجمع میں آیا اور اس سے گفتگو کی کہ تم شاعر کس طرح کہتے ہو، اور کاہن کس طرح کہتے ہو، تو قریش نے کہا اچھا تو آپ کیا کہتے ہو اس نے کہا جا دو گرہے کہ خاندانوں میں تفرقہ ڈالتا ہے، میاں بیوی سے اور باپ کو اولاد سے اور ایک عزیز کو دوسرے عزیزوں سے چھڑا دیتا ہے تو وہ بس ساحر ہے۔ اسی کا قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے۔

یہ دونوں روایتیں انہوں نے الگ الگ درج کی ہیں لیکن سیرت ابن ہشام میں جو واقعہ درج ہے، اس میں ان دونوں روایتوں کے خاص اجزا بھی ترتیب کے ساتھ سموائے ہوئے ہیں اور اس اجتماع کا پس منظر بھی ہے کہ رسول خدا ﷺ کی تبلیغ کا چرچا ہونے لگا تھا اور اب ان کے متعلق چرمی گویاں ہر طرف ہو رہی تھیں کہ حج کا زمانہ قریب آ گیا اور اب قریش کو فکر ہوئی کہ اس موقع پر تمام قبائل عرب کے لوگ آئیں گے لہذا ہم لوگوں کو اس کا سدباب کرنا چاہیے کہ ان کی تبلیغ سے وہ متاثر نہ ہوں۔ اس کے لیے دارالندوہ میں وہ اجتماع ہوا تھا اور اس پر ولید نے وہ تقریر کی جو پہلے بیان ہو چکی۔ آخر تم لوگ اس کلام کو کیا کہو گے؟ اور ایک ایک بات کو جو وہ لوگ کہتے تھے، اس نے رد کیا۔ اور اسی ذیل میں اس نے رسولؐ سے سنے ہوئے کلام کی تعریف میں وہ الفاظ کہے جو مجمع البیان کی دوسری روایت میں ہیں ابو جہل نے کہا کہ آپ سے لوگ ایسی بات سنیں گے تو پھر کون ہے جو ان کے کلام سے متاثر نہ ہوگا اور پوری قوم خود آپ سے ناراض ہو جائے گی لہذا آپ ہی کچھ نہ کچھ تو بات بتائیے کہ کیا کیا جائے اور اس پر سوچ سناج کر اس نے وہ کہا جو قرآن مجید میں ذکر ہے۔

سَأُصَلِّيهِ سَقَرَ ﴿٣٦﴾ وَمَا أَذْرُكَ مَا سَقَرُ ﴿٣٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٣٨﴾ لَوْ أَحَاطَ لِلْبَشَرِ ﴿٣٩﴾  
عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٤٠﴾ وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۖ وَمَا جَعَلْنَا  
عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا ۗ لَيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ  
الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۗ وَلَيَقُولُ  
الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَغَلًا ۗ كَذَلِكَ يُضِلُّ  
اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۗ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۗ وَمَا هِيَ  
إِلَّا ذِكْرٌ لِلْبَشَرِ ﴿٤١﴾

”بہت جلد میں اسے دوزخ کا مزہ چکھاؤں گا اور تم کیا جانو کہ دوزخ کیا چیز ہے! وہ رحم نہیں کرتا اور نہیں چھوڑتا، وہ کھالوں کو جلا کر سیاہ کر دینے والا، اس پر انیس (۱۹) کارکن مقرر ہیں اور ہم نے آتش جہنم کے ان کارکنوں کو نہیں

بنایا ہے مگر فرشتہ اور ان کی تعداد کو نہیں قرار دیا ہے مگر آزمائش کا ذریعہ کافروں کے لیے تاکہ جنہیں پہلے کتاب عطا ہو چکی ہے انہیں یقین آجائے جو ایمان لائے ہیں، ان کے ایمان میں اضافہ ہوا جنہیں کتاب عطا ہو چکی ہے اور جو با ایمان ہیں، وہ کسی شک و شبہ میں گرفتار نہ ہوں اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور کافر لوگ نہ کہیں کہ اللہ کا اس بیان سے کیا مطلب ہے؟ اس طرح اللہ گمراہی میں ڈال دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا سو خود اس کے اور یہ نہیں ہے مگر نصیحت انسانوں کے لیے۔

چونکہ اُس شخص کو کفار قریش بڑی اہمیت دیتے تھے اور اُس نے جانتے بوجھتے ہوئے اور ایک دفعہ حق کا اعتراف کرتے ہوئے پھر یہ معاندانہ رویہ اختیار کیا تھا صرف اپنی وجاہت دنیوی کو قائم رکھنے کے لئے، اس لئے قرآن مجید نے یہاں بڑی سختی کے ساتھ اُس کے عذاب کا تذکرہ کیا ہے۔ دوزخ کی یہ صفت جو بیان کی گئی کہ لا تبقی ولا تذر اُس کا ترجمہ جو ہم نے کیا کہ وہ ”رحم نہیں کرتا اور نہیں چھوڑتا“ یہ ایک تشریح کی بنا پر ہے۔<sup>[۱]</sup>

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ”وہ نہیں باقی رکھتا اور نہیں چھوڑتا“ اب باقی نہیں رکھتا کا مطلب چونکہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ختم کر دیتا ہے، اس لئے دوسرا جملہ کہ نہیں چھوڑتا۔ اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ایک دفعہ ختم ہونے کے بعد بھی نہیں چھوڑتا بلکہ دوبارہ اُن کی رفق حیات کو تازہ احساس دے کر انہیں مزید تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں تاکہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے: کَلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ”جب اُن کی کھالیں گل جاتی ہیں تو نئی کھالیں انہیں دی جاتی ہیں تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہے۔“ (نساء۔ ۵۶)

لِوَاحَةِ اللَّبْشَرِ کے بھی دو ۲ معنی ہیں ایک یہ کہ ”وہ کھالوں کو جھلس کر سیاہ کر دینے والا ہے“<sup>[۲]</sup> اس کی شدت کا درجہ وہ ہے کہ کھالیں بالکل گل جائیں اور ضرورت ہو کہ دوسری کھالیں تازہ پیدا ہوں اور دوسرے یہ کہ وہ تمام آدمیوں کو جو وہاں داخل ہوں گے جلادے گا<sup>[۳]</sup> اور آدمیوں کے نام اس لئے لیے گئے کہ یہاں بات ایک آدمی ہی کی تھی ورنہ جنات بھی جو داخل ہوں گے، انجام اُن کا بھی یہی ہے، اب یہ مضمون آیات سے بالکل ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی دفعہ وحی کی جو قسط نازل ہوئی اور سنائی گئی وہ اتنے پر ختم ہو گئی۔

اب مشرکین جن کے سامنے اُس کی تلاوت ہوئی وہ مذاق اڑانے لگے، ابو جہل نے قریش سے کہا رے تم سب غارت ہو جاؤ۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں بس ۱۹ کارکن مقرر ہیں تو تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ دس (۱۰)، دس (۱۰) آدمی اُن میں سے ایک سے ایک سے بھڑ جائیں اور اس طرح سب کا خاتمہ کر دیں۔ اس پر ابوالسدا ججی جسے اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا کہنے لگا کہ اُن میں سے سترہ ۱۷ کے لئے تو میں اکیلا کافی ہوں۔ دو ۲ کو تم لوگ ختم کر دینا..... بس یہود و نصاریٰ میں کہ وہ افراد جس میں گزشتہ انبیاء کے تعلیمات کے کچھ مٹے ہوئے نقوش موجود تھے کہنے لگے یہ سب مذاق بے کار ہے۔ وہ (۱۹) کی تعداد میں سہی مگر وہ کوئی اُن آدمیوں میں جو تھوڑے ہوں گے یہ سب مل

[۱] ای لا تبقی علیہم بل تبلیغ مچھو دھم فی انواع العذاب (مجمع البیان)

[۲] محرقہ تظاہر الجلد (جلالین) مغیڑة للجلود و قیل لانهة للجلود حتی ندعها اشد مراداً فی اللیل (مجمع البیان)

[۳] سوزند است آدمیانرا (شاه ولی اللہ)

کرا نہیں دبا لیں..... خدا جنہیں مقرر کرے گا وہ ایسے کمزور کچھ تھوڑی ہوں گے آدمی کہ آدمی انہیں دبا لیں..... اس پر کچھ ڈھل لیں قسم کے مسلمان بھی جو شک و شبہہ یا نفاق کے فرق میں گرفتار تھے، ایسے ہی ڈھیلے ڈھالے کافروں کے ساتھ مل کر کہنے لگے کہ بہر حال یہ تعداد بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ انیس ۱۹ ہوں گے کہ اُس کا مذاق اڑایا جائے۔

اس پر یہ بعد کی آیت اتری..... جس میں پہلے اسی بات کو صاف طور پر کہا گیا کہ وہ انیس ۱۹ سہی مگر وہ تمہاری طرح آدمی تھوڑی ہیں کہ تم انہیں دبا لو..... بحیثیت واقعہ یہ ہے کہ وہ انیس ۱۹ ہوں گے لیکن خدا چاہتا تو اس پورے کام کو ایک فرشتے سے لے سکتا تھا۔ اور اُس ایک کو تم سب مل کر مغلوب و مقہور نہیں کر سکتے۔ وہ تو فرشتے ہیں اور جو کام اُن سے لینا ہے اُس کے تناسب سے اللہ انہیں طاقت عطا کرتا ہے، تمہاری جسمانی طاقتیں اُن کا مقابلہ تھوڑی کر سکتی ہیں..... اور جو کچھ اس کہنے کا رد عمل ہو رہا ہے، اس کے سامنے لانے کے لئے تو اللہ نے اس تعداد کا اظہار کیا ہے کہ یہ کھل کر سامنے آجائے کہ اہل کتاب پر کیا اثر ہوتا ہے اور مومن پر کیا اثر ہوتا ہے اور کافروں اور منافقوں میں سے کس کس پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے..... گمراہ اور ہدایت یافتہ میں بحیثیت واقعہ امتیاز کا ظاہر ہونا بھی اللہ کا ایک مستقل مقصد ہوتا ہے۔

یوں وہ چاہتا نہیں کہ کوئی گمراہ ہو لیکن جس میں گمراہی کے جزا ایم چھپے ہوئے ہیں، اُن کو ابھرنے کا موقع دینا بھی اُس کا ایک خاص طریقہ کار ہے جس سے عذاب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

كَلَّا وَالْقَمَرَ ۚ وَاللَّيْلِ إِذَا أَدْبَرَ ۚ وَالصُّبْحِ إِذْ أَسْفَرَ ۚ إِنَّهَا إِحْدَى الْكُبَرَىٰ ۚ

نَذِيرًا لِلْبَشَرِ ۚ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَّقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۚ

”ہرگز نہیں قسم ہے چاند کی اور رات کی جب وہ پیٹھ پھرائے اور صبح کی جب وہ روشن ہو، بلاشبہ وہ ایک بہت بڑی چیز ہے، وہ متنبہ کرنے والی ہے انسانوں کو اُن کے لئے جو چاہے تم میں سے کہ آگے بڑھے یا پیچھے رہے۔“

چونکہ وہ دوزخ کا ذکر تھا اور یہ سب مذاق اُسی کے سلسلے میں اڑایا جا رہا تھا، اس لئے ہرگز نہیں کا تعلق بھی اُسی کے ساتھ ہے اور پھر یہ ضمیر کہ یہ بڑی چیز ہے، اُسی کی طرف راجع ہے [۱] جب کہ ڈرایا جا چکا تو اب یہ کہنا کہ جو چاہے قدم آگے بڑھائے یا پیچھے رہے، اس کے معنی اجازت کے نہیں ہو سکتے کہ ہم تمہیں اختیار دیتے ہیں خواہ تم آگے بڑھو یا پیچھے رہو بلکہ یہ اُس اختیار کا ذکر ہے جو ایمان و کفر اور طاعت و معصیت میں ہر ایک کو ہے اور جس کے سبب سے جزا و سزا کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۚ إِلَّا أَعْرَضَ الْيَسِيْرَ ۚ فِي جَنَّتِ ۚ

يَتَسَاءَلُوْنَ ۚ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۚ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۚ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ

الْمُصَلِّيْنَ ۚ وَلَمْ نَكُ نَطْعُمْ الْمَسْكِيْنَ ۚ وَكُنَّا نَحْوُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ ۚ

وَ كُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۚ حَتَّىٰ آتَيْنَا الْيَقِيْنَ ۚ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ

[۱] یعنی ان سقر الی ہی التار لحدی العظیم (مجمع البیان)

## الشَّفَعِينَ ۝۳۸

”ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ گڑھوں ہے سوادائیں طرف والوں کے، کہ وہ بہشتوں میں ہوں گے، سوال و جواب کرتے ہوں گے گناہگاروں سے کہ تمہیں کیا بات دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے ہم نمازیوں میں داخل نہ تھے اور غریب محتاج کو کھانا نہیں دیتے تھے اور ہم بے ہودہ باتیں کرنے والوں میں شامل ہو کر بے ہودہ چرچے کرنے لگتے تھے، اور ہم روز جزاء کو جھوٹ کہتے رہے یہاں تک کہ یہ یقینی منزل ہمارے سامنے آگئی، یہ لوگ ایسے ہیں کہ انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہیں پہنچائے گی۔“

”ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ گڑھوں ہے“ یعنی اُس کے حسن انجام اور بد انجامی کا تعلق اُس کے کردار سے ہے جس میں اصل چیز تو ایمان لانا ہے کہ اسی پر پورے تمام افعال کے نتیجہ خیز ہونے کا انحصار ہے اور ”ہم نمازیوں میں داخل نہ تھے“ یعنی ہم نے ایمان قبول نہیں کیا تا کہ نماز پڑھتے، اور وہ قابل قبول ہوتی۔ بغیر ایمان ایک تو نماز پڑھتے ہی کیوں اور پڑھتے بھی تو وہ قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی، علماء نے اس سے علم کلام کی اُس بحث میں استدلال کیا ہے کہ کفار فرعون دین کے احکام کے ساتھ مکلف ہیں یا نہیں۔ اُن کا مقبول نظریہ یہ ہے کہ یہ احکام سب کے لئے ہیں مگر شرط صحت ایمان ہے۔ کافر کو اس کی بھی سزا ہوگی کہ وہ ایمان کیوں نہیں لایا اور اس کی بھی کہ اُس نے نماز وغیرہ جو فرائض تھے وہ کیوں ادا نہیں کیے..... یہ کہ وہ ایمان نہیں لایا تھا، اُسے ان احکام کی خلاف ورزی کی پاداش سے بچا نہیں سکتے جس طرح کوئی وضو یا غسل کرے ہی نہ تو وہ رتک نماز کی سزا سے بچ نہیں سکتا حالانکہ بغیر اس شرط کے نماز پڑھتا تو قبول نہ ہوتی مگر یہ شرط جب اُس کے اختیار میں تھی اور اُس نے اُسے ترک نماز کی سزا کا مستوجب ہے، اُسی طرح کافران احکام پر عمل پیرا نہ ہونے کی سزا کا بھی مستوجب ہے۔ [۱]

حقوق اللہ کے ساتھ حقوق الناس کو کہیں نظر انداز نہیں کیا جاتا..... چنانچہ جیسے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر یقیناً الصلوٰۃ کے ساتھ یؤتوں الزکوٰۃ ہے ویسے ہی یہاں بد انجامی کے اسباب میں نمازیوں میں نہ ہونے کے ساتھ بھوکے کو کھانا نہ دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ”یقینی زندگی سے مراد موت بھی ہو سکتی ہے“ یعنی مرتے دم تک ہم اُسی روش پر قائم رہے اور یہ ”جزاؤ سزا“ کی ساعت بھی مراد ہو سکتی ہے جسے وہ جھٹلاتے رہے تھے۔ انہیں شفاعت فائدہ نہ پہنچائے گی۔ کیونکہ یہ سب کافر تھے اور شفاعت کفار کی جماعت کے لئے نہیں ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝۳۹ كَانَتْهُمْ حُمْرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝۴۰ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝۴۱ بَلْ يَرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُؤْتِي صُحُفًا مِّنْشَرَّةٍ ۝۴۲ كَلَّا ۝۴۳ بَلْ لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۝۴۴ كَلَّا إِنَّهُ تَذَكَّرَةٌ ۝۴۵ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۝۴۶ وَمَا يَنْدُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۝۴۷ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝۴۸

[۱]۔ فیہ دلالت علی ان الکفار مخاطبون بالعبادات الشرعیة لانه حکایة عن الکفار بدلالة قوله و کثان کذب بیوم الدین (مجمع

”تو انہیں کیا ہے کہ وہ نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں جیسے وہ وحشی گدھے ہیں جو کسی شیر سے بھاگے ہوں بلکہ ہر ایک اُن میں سے چاہتا ہے کہ (براہ راست خود) اُسے کھلی ہوئی کتابیں دی جائیں۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ہرگز نہیں یہ ایک نصیحت ہے تو جو چاہے وہ اُسے یاد رکھے اور وہ یاد نہیں رکھیں گے جب تک کہ اللہ کو منظور نہ ہو۔ وہ ڈرے جانے کا حقدار ہے اور وہ بخشش والا ہے۔“

یعنی نصیحت تو انہیں اُن کی خیر خواہی کے لئے کی جا رہی ہے مگر یہ اُسے توجہ سے سننے اور فائدہ اٹھانے کے بجائے اُس سے اس طرح بھاگ رہے ہیں، چونکہ جنگلی گدھے ذرا بھی خطرہ محسوس کر کے بے تحاشہ بھاگتے ہیں ایسے منظر کی تشبیہ اُن سے دی جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا براہ راست اُن کے پاس خطوط بھیجے یا کتابیں اُن تک پہنچائے۔ اس میں ایک پہلو تکبر کا بھی مضمحل ہے کہ ہم ایک شخص کے کہنے پر جو ہم ہی میں سے ہے سر جھکا دیں، یہ ہماری شان کے خلاف ہے..... بعد میں قرآن مجید نے کہہ دیا ہے کہ ”یہ چاہنا بھی“ اُن کا ایک بہانہ ہے ایمان نہ لانے کا۔ حقیقت میں وہ اس آخرت کو مانتے ہی نہیں، اور اُس کا اندیشہ اپنے دل سے محسوس نہیں کرتے۔ ورنہ ایسی باتیں اُن کے لئے رسولؐ کی رسالت کو ماننے سے سد راہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ بعد میں جو کلا ہرگز نہیں کہا گیا، اللہ کا کام نہیں ہے..... اتمام حجت ہو چکی جسے پھر کہا جا رہا ہے کہ جو نصیحت کرنا تھی کر دی گئی۔ اب نہیں مانتے تو یہ جانیں ان کا کام۔ یہ چاہیں تو اس نصیحت کو یاد رکھیں مگر ان کا مستقل کر سارا ایسا رہا ہے کہ اب وہ چاہیں ہی نہیں۔ اللہ کی توفیق بھی اُن کے شامل حال ہونے والی نہیں ہے..... وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے یہ لوگ ڈرتے رہیں کہ کب وہ ان پر عذاب نازل کر دے..... ہاں جو نیک راستے پر ہو اور ایمان اختیار کرے اُس سے جو غلطیاں بھی ہو جائیں اُن سے درگزر کرتا ہے، وہ بخشنے والا بھی ہے مگر ایسے باطل پر ایمان رکھنے والوں کو نہیں۔



# سُورَةُ الْقِيَامَةِ

مکیہ ..... ۴۰ ..... آیات

چونکہ قیامت کی قسم ہی سے سورہ شروع ہوا ہے، اس لئے سورے کا یہ نام ہوا اور یہی تقریباً اس سورے کا موضوع ہے۔ صرف درمیان میں پیغمبر خدا ﷺ کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کو اس کی فکر نہ ہونا چاہیے کہ آپ وحی کے کچھ اجزاء کو بھول جائیں گے۔ ہمارے ذمے ہے کہ ہم اسے محفوظ رکھیں اور ہمیں بھروسہ ہے آپ کے حافظہ پر کہ آپ محفوظ رکھیں گے تو آپ کو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ آپ فراموش کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر آخر تک منکرین آخرت کے شبہات اور اعتراضات کا جواب ہے اور محاسبہ اعمال کے ضروری ہونے کو ثابت کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ انسان کے تمام افعال و اعمال اُس کے یہاں محفوظ ہیں اور انہیں ایک ایک کر کے اُس کے سامنے لے آیا جائے گا اور اُس کے مطابق مکافات ہوگی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

لَا اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَامَةِ ۱ وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللّٰوَامَةِ ۲ اَیْحَسِبُ الْاِنْسَانُ  
اَلَنْ یَّجْمَعَ عِظَامَهُ ۳ بَلٰی قَدِ رِیِّنَ عَلٰی اَنْ نُّسَوِّیَ بَعَانَهُ ۴ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ  
لِیَفْجَرَ اَمَامَهُ ۵ یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ ۶

”نہیں قسم میں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نہیں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی، کیا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکیں گے، کیوں نہیں ہم قادر ہیں کہ اُس کی ایک پور کو بالکل ٹھیک ٹھیک (پھر) بنا دیں، بلکہ انسان چاہتا ہے کہ آئندہ کی زندگی میں خوب فسق و فجور کرے، وہ پوچھتا ہے قیامت کا دن کب ہوگا؟“

یعنی یوں تو قیامت ایک ایسی حقیقت ہے جس کی قسم کھائی جاسکتی ہے مگر تم اُس دن کو مانتے نہیں لہذا اس کی قسم کھانا بے کار ہے۔ پھر انسان کا وہ ضمیر جو خود اُسے بری باتوں پر ٹوکتا ہے وہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے قسم کھانے کے قابل مگر تم نے اس ضمیر کو مردہ بنا رکھا ہے۔ اس لئے میں اُس کی بھی قسم نہیں کھاتا، بہر حال کسی بھی آدمی کا یہ کہنا کہ اُس کی ہڈیاں جب بوسیدہ ہو گئیں اور ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو گئیں تو وہ کیوں کر دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے؟ غلط ہے اس لئے کہ وہ ہماری قدرت کو نظر انداز کر رہا ہے..... اسی کو دو ۲ فقروں میں بیان کیا گیا ہے کہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم ہرگز اُس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے؟ کیوں نہیں..... ہم تو وہ ہیں اور ہماری قدرت ایسی ہے کہ ہم اُس کے بڑے بڑے اجزائے جسم کا کیا ذکر، اُس کی انگلیوں کی ان پوروں کو جن سے وہ بڑے چھوٹے ہر طرح کے کاموں کو انجام دیتا ہے بالکل اسی

طرح دوبارہ انہی منتشر اجزاء کو اکٹھا کر کے پیدا کر دیں گے حقیقت یہ ہے کہ اُس کے انکار کی کوئی بنیاد نہیں ہے بلکہ وہ جانتا ہے کہ قیامت کو مان لینے اور جزا و سزا کے قائل ہو جانے سے اُس کی آزادی ختم ہو جائے گی اور وہ طرح طرح کی اخلاقی و دینی پابندیوں میں مقید ہو جائے گا تو وہ صرف اپنی مطلق العنانی کو برقرار رکھنے کے لئے بطور انکار کہتا ہے کہ آخر قیامت کا دن کب ہوگا؟

**فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۚ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ يَقُولُ**

**الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ الْمَفْتَرُ ۚ كَلَّا لَوْ رَأَىٰ رُبُّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۙ ۝۱۳**

”تو جب نگاہ چندھیا جائے گی اور چاند کو گہن لگے گا اور سورج اور چاند اکٹھا ہو جائیں گے تو آدمی کہے گا کہ کہاں ہے بھاگنے کی جگہ؟ ہرگز نہیں، کوئی پناہ نہیں ہے، آج کے دن صرف تیرے پروردگار کی طرف پہنچ کر ٹھہرنا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں تمہیں وقت معلوم کرنا ہی نہیں ہے۔ نہ خالق کو اُس کا وقت بتانا ہے مگر ہاں پھر سن لو کہ وہ کیسا ہولناک موقع ہوگا۔ ”نگاہ چندھیا جائے گی“ یعنی وہ دہشت ناک منظر ایسا ہوگا اور ایسا ایک دم اچانک طور پر آجائے گا کہ کوئی دیکھ بھی رہا ہو تو حیرت اور دہشت سے اُس کی نظر کچھ کام نہ کرے۔ آنکھیں اس کی کھلی کی کھلی رہ جائیں اور دکھائی نہ دے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

چاند کو گہن لگے گا یعنی اس کی روشنی ختم ہو جائے گی اور سورج اور چاند اکٹھا ہو جائیں گے یعنی نظام عالم الٹ جائے گا اور دونوں مغرب کی طرف سے طالع ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد یہ ہو کہ آفتاب اور ماہتاب دونوں بے نور ہوں گے تو تاریک ہونے میں دونوں کی حیثیت ایک ہو جائے گی [۱] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نظام شمسی میں ابتری ہونے سے چاند ایک دم اپنے مستقر سے ہٹ کر سورج میں داخل ہو جائے۔ اصل یہ ہے کہ صحیح کیفیت ان باتوں کی بھی سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بہر صورت خدا کو ماننے کے بعد جزا و سزا کی ضرورت عقل انسانی بغیر کدو کاوش کے سمجھ سکتی ہے اور جو شخص قدرت الہی کے کرشموں کو جو کائنات میں نمایاں ہیں سامنے رکھے اُس کے لئے انکار قیامت کی کوئی وجہ معقول نہیں ہے اور اُس کے انکار کی بنیاد صرف یہ ہے کہ یہ سب سننے سے اُس کے افعال و اعمال پر پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں جیسا کہ گزشتہ آیات میں پردہ کشائی کی گئی ہے۔

**يُنَبِّئُ الْإِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ مَّا قَدَّمَ وَآخَرَ ۙ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۙ ۝۱۴**

**وَلَوْ أَلْفَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۙ ۝۱۵**

”اُس دن انسان کو بتایا جائے گا جو کچھ اُس نے آگے رکھا اور پیچھے رکھا بلکہ انسان خود اپنے حال کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنے ہی بہانے کرے۔“

”جو کچھ آگے رکھا اور پیچھے رکھا“ اس کا یہ مطلب بھی لیا گیا ہے جو جناب ابن عباسؓ کا قول بیان ہوا ہے کہ آگے رکھا کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو اعمال انجام دیئے اور پیچھے رکھا کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اعمال کے نتائج جو اس کے بعد بھی باقی رہے اور یہ مطلب بھی لیا گیا ہے کہ کن بد اعمالیاں اُس نے کیں اور کن فرائض کو پس پشت ڈال دیا اور انجام نہیں دیا اور یہ بھی کہ اپنے اموال میں سے کیا اُس نے بطور ذخیرہ آخرت بھیج دیا اور کتنا وارثوں کے واسطے اپنے بعد چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہ کارہائے خیر میں سے کتنے نہیں کئے اور یہ بھی کہ خود اپنی زندگی میں کون سی باتیں پہلے

[۱] ای جمع بینہما فی ذہاب ضرءہما بالخنسوف فیتکامل ظلہما الارض علی اہلہا حتی یراہما کل احد بغیر نور و ضیاء (مجمع البیان)

انجام دیں اور کونسی بعد انجام دیں..... یہ سب اُس دن نامہ اعمال اور حساب و کتاب کے ذیل میں اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور یوں تو وہ خود ہی اپنے ضمیر کے فیصلے کی بنا پر اپنے متعلق خود جانتا ہے۔ وہ دوسروں کو قائل کرنے کے لئے کتنے ہی دلائل اپنی صفائی میں پیش کرے اور طرح طرح کے بہانے بنائے۔

**لَا تُحْرِكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۗ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۗ فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۗ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتَهُ ۗ**

”اپنی زبان کو اُس کے ساتھ جنبش نہ دیجئے تاکہ جلدی آپ اُسے حفظ کر لیں، بلاشبہ ہمارے ذمے ہے اس کا محفوظ رکھنا اور اُس کا پڑھوانا تو جب ہم اُسے پڑھوائیں تو آپ اسی کے مطابق پڑھتے رہیں، پھر ہمارے ہی ذمے ہے اُس کا واضح کرنا۔“

خود ان آیات کے مضمون پر نظر ڈالتے ہوئے عموماً یہی سمجھا گیا ہے کہ خالق نے اپنی ذمہ داری بتائی ہے، وہ خود رسول کی ذات سے متعلق ہے مگر جناب شاہ ولی اللہ نے ترجمہ میں اسی پہلو کو پیش نظر رکھنے کے باوجود تفسیری حواشی میں ایک پہلو اپنے منظور نظر صحابہ رسول کی مدح کا پیدا کیا ہے اور ضمناً قرآن مجید کے حافظوں اور مفسرین کی تعریف کا بھی، اور لکھا ہے:-

ظاہر نزدیک بندہ آنست کہ معنی آیت چندی باشد ہر آئینہ وعدہ لازم است بر جامع کردن قرآن در مصاحف و حفظ قرأت آن عصر بعد عصر و ایضاً و تفسیر معانی آن خدا تعالیٰ بردست شیخین رضی اللہ عنہما جمع آن کرد و در ہر زمانی قاریاں را توفیق داد کہ حافظ شدند و تجوید بخوانند و در ہر زمانی مفسراں را توفیق داد کہ در تفسیر آن سعی نمایند (فتح الرحمن)

میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ وعدہ ہمارا یہ ہے کہ ہمارے ذمے قرآن کا جمع کردہ محفوظ کی صورت میں اور حفاظت اور پڑھوانا اُس کے یکے بعد دیگرے ہر زمانے میں اور اُس کے معانی و مطالب کا واضح کرنا اور اُس کی تفسیر چنانچہ خدائے تعالیٰ نے جناب شیخین کے ہاتھ سے اسے جمع کرایا اور ہر زمانہ میں اور ہر جگہ قاریوں کو توفیق دی کہ حافظ ہوں اور قرأت کے ساتھ اُسے پڑھیں اور ہر زمانے میں مفسرین کو توفیق دی کہ اُس کی تفسیر میں کوشش کریں۔

ہماری قدیم تفسیر قتی میں آل رسول کی اُن خدمتوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو مسلم طور پر انہوں نے حفظ و تشریح قرآن کے ذیل میں انجام دی ہیں [۱] اس سب کے برخلاف ایک پرانے مفسر کوئی بلخی صاحب ہیں انہوں نے یہ رُخ اختیار کیا ہے کہ ان آیات میں روز قیامت ہی نامہائے اعمال کے پڑھنے میں بندہ جو جلد بازی کرے گا اُسے تنبیہ کی گئی ہے۔ اسے علامہ طبری نے اس طرح نقل کیا ہے:-

قال البلخی الذی اختار انہ لم یرد القرآن و ائمارا دقرأت العباد لکتبہم یوم القیامۃ یدل علی ذلک ما قبلہ و ما بعدہ و لیس فیہ شئی یدل علی انہ القرآن و لاشئی من احکام الدنیا و فی ذلک تقریر للعبد و توبیخ لہ

[۱] - علی آل محمد جمع القرآن و قرأتہ (علی بن ابراہیم)

حين لا تنفعه العجلة يقول لا تحرك لسانك بما تقرأ. من صحيفتك التي فيها أعمالك يعني اقرأ كتابك ولا تعجل وتثبت لتتعلم الحجة عليك فانانجمعهالك فاذا جمعناك فاتبع ما جمع عليك بالانقياد والاستسلام للتبعة فيه فانه لا يمكنك انكاره ثم ان علينا بيان انه لو انكرت (مجمع البيان)

بلٹی نے کہا ہے کہ یہاں قرآن مراد ہی نہیں ہے بلکہ بندوں کا قیامت کے دن اپنے نامہ ہائے عمل کو پڑھنا مراد ہے اس کی دلیل اس کے پہلے اور بعد کی آیتیں ہیں اور کوئی ایسی چیز ان میں نہیں ہے جو اس کا پتہ دے کہ اس سے قرآن یا کوئی دنیا کے شرعی احکام مراد ہوں اور اس میں بندے کی سرزنش ہے اس پر کہ وہ اُس نامہ عمل کو جلدی جلدی کیوں پڑھ رہا ہے، اور اُس سے کہا جاتا ہے کہ اس نامہ عمل کے پڑھنے میں تو اپنی زبان جنبش نے دے اور غور سے اسے پڑھ جلد بازی سے کام نہ لے، سمجھ کہ تجھ پر کیا کیا الزامات ہیں۔ ہم وہ سب تیرے لئے جمع کئے دیتے ہیں تو جو کچھ تیرے لئے یکجا فراہم کر دیا گیا ہے اس کو سر جھکا کے سکون کے ساتھ پڑھ اور اس کی جو سزا ہے اسے برداشت کر کہ تیرے لئے اُس سے انکار ممکن نہ ہوگا اور اگر انکار کرے تو ہمارے ذمے ہے اس کا بیان کرنا اور وضاحت سے پیش کرنا۔ مگر یہ مطلب کچھ دل کو لگتا ہوا نہیں ہے اور اس میں کچھ زبردستی کی بناوٹ محسوس ہوتی ہے، قبل اور بعد کی آیتوں میں بھی ابتدائی احوال و احوال قیامت کا ذکر ہے، نامہ عمل کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نامہ عمل مراد لینے کے بعد بھی اس کا کوئی جوڑ قبل اور بعد کی آیتوں سے نہیں لگتا۔ خود ان فقرات کے مضمون سے صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اثنائے کلام میں جملہ معترضہ کے طور پر خود حضرت پیغمبر خدا ﷺ سے مخاطب ہے جیسا کہ عام طور پر مفسرین نے سمجھا ہے۔ اس کے بعد سلسلہ کلام قبل والے بیان کے ربط سے شروع ہوا ہے جو ابھی آئے گا۔ الفاظ قرآن کو رسولؐ تک پہنچانے اور محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کے ساتھ یہ کہنا کہ پھر ہمارے ذمے اس کی وضاحت کرنا بھی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اصل الفاظ قرآن کے ساتھ اُن الفاظ کی وضاحت بھی جہاں ضرورت ہوتی تھی بذریعہ وحی کی جاتی تھی جو اس قرآن مجید کا جزء نہیں ہے مگر اس کی تنزیل بھی بصورت وحی ہوئی ہے، جس کے علم کا ذریعہ دوسروں کے لئے بیان رسولؐ ہے جو داخل سنت ہے اس لئے ماخذ دین کی حیثیت سے کتاب کے ساتھ سنت کا اعتبار بہر صورت ناگزیر ہے۔

**كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ﴿٦٠﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿٦١﴾ وَجُودًا يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ﴿٦٢﴾ إِلَىٰ**

**رَبِّهَا نَاصِرَةٌ ﴿٦٣﴾ وَوَجُودًا يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٦٤﴾ تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٦٥﴾**

”ہرگز نہیں، حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ اس وقتی دنیا کو دوست رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کرتے ہو، اُس دن کچھ چہرے سرسبز و شاداب ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف نگران اور کچھ چہرے اُس دن بسورتے ہوئے ہوں گے یقین کئے ہوئے کہ اُن کے ساتھ پیٹھ کو توڑ دینے والی سختی ہوگی۔“

**دیدار خدا بصیرت سے نہ کہ بصارت سے**

مطلب یہ ہے کہ انکار آخرت حقیقت میں کسی عقلی فیصلے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ایک سبب تو اس کا وہ تھا جو پہلے بیان ہوا کہ آخرت کے تصور سے اُس افعال و اعمال پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں لہذا وہ حیلے حوالے کر کے اپنی مطلق العنانی کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جواب بیان ہو رہا ہے کہ اس کے وقت کے مفادات اُسے آنکھ سے نقد نظر آرہے ہیں اور آخرت کے لئے آئندہ کا تصور ہے وہ ان لذائذ و منافع

کو جو بظاہر اس وقت حاصل شدہ نظر آرہے ہیں ترجیح دیتا ہے ان نعمتوں پر جنہیں وہ سنتا ہے کہ آخرت میں ملیں گے لہذا وہ ان پر ٹوٹتا ہے اور اس کا انکار کرتا ہے۔ جب آخرت آئے گی تو اس وقت دو قسمیں نظر آتی ہوں گی ایک چہرے اُن کے جو بشارتوں کے مستحق تھے اور اب ان بشارتوں کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ چہرے ہشاش و بشاش پر رونق ہوں گے۔ اب انہیں جو کہا گیا ہے اپنے پروردگار کی طرف نگران تو مسلمانوں میں سے وہ فریق جو دیدار کا قائل ہے اپنے یہاں کے احادیث کی بنا پر اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ وہ انہی آنکھوں سے اللہ سبحانہ کو دیکھ رہے ہوں گے اور ہم جو رویت خالق کو ان آنکھوں میں سمجھتے ہیں، جس کے لئے خود قرآن میں ہے لا تدرا کہ الا بصار ”نگاہیں اُسے پانہیں سکتیں کیوں کہ رویت اجسام سے متعلق ہوتی ہے جس میں شکل و صورت اور رنگت ہو اور وہ کسی سمت اور کسی جگہ میں محدود ہے اور خالق جسم و جسمانیات سے بری ہے، نہ وہ کسی مکان میں ہے نہ شکل و صورت اور رنگت رکھتا ہے اس لئے اس کا آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس کا یہ مطلب قرار دینا ضروری ہے کہ انہیں اپنے خالق کی رحمت کے جلوے ہر طرف نظر آرہے ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ ناظر کے معنی منتظر کے ہیں۔ اس پر ایک اعتراض یہ ہوا ہے کہ انتظار شاق و ناگوار چیز ہے اور اہل بہشت کی زندگی کسی تکلیف و ناگوارگی سے مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انتظار وہ شاق و ناگوار ہوتا ہے جس کے حصول کا یقین نہ ہو لیکن جس کا حصول یقینی ہو اس کا انتظار بھی لذیذ ہوتا ہے۔ دوسرا اعتراض لفظی قواعد کے لحاظ سے کیا گیا ہے کہ انتظار کے ساتھ الی نہیں آتا اور یہاں کہا گیا ہے الی رہا ناظر ”اپنے پروردگار کی طرف نگران“ اس کے لئے علامہ طبرسی نے شعراء عرب کے اشعار نظیر میں پیش کئے ہیں کہ وہ نظر جو انتظار کے معنی میں ہو، اُس کے ساتھ بھی الی آتا ہے۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ کاسہ سروالی آنکھوں سے نہیں، بلکہ دل کی آنکھوں سے انہیں ہر طرف خدا دکھائی دے رہا ہوگا جو یقین کامل کے معنی میں ہے مگر اس صورت میں یہ عام اہل بہشت ہوں گے جو وہیں اللہ کو دیکھیں گے اور جو کامل یقین والے ہیں وہ اس دنیا میں اُس کا جلوہ ہر طرف دیکھتے ہیں جیسا کہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب سے کسی نے پوچھا اہل رایت ربک ”کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟“ حضرت نے فرمایا۔ و کیف اعبدا بآلہم اذہ ”پھر میں عبادت کیوں کرتا ہوں اُس پروردگار کی جسے دیکھا نہیں ہے۔“ جب وہ ذرا اس جواب پر غور کرنے لگا تو آپ نے فرمایا لا تراہ العیون بالابصار و لکن تراہ القلوب بحقائق الایمان ”اسے آنکھیں ان نگاہوں سے نہیں دیکھتیں بلکہ اسے دل ایمانی بصیرتوں سے دیکھتے ہیں۔“ اہل سنت کا وہ سمجھدار طبقہ جو اپنے یہاں کے احادیث صحیحہ کی بنا پر خالق کے دیدار کا انہی آنکھوں سے انکار نہیں کر سکتا، وہ بھی کہتا ہے کہ دیکھنے کی حقیقت کچھ اور ہوگی جس کا ہم یہاں ادراک نہیں کر سکتے۔ اس ”خارج ادراک“ چیز کو ہم اگر بصارت کے بجائے بصیرت کہیں اور رویت کے بجائے ایمان و یقین کہیں تو پھر نزاع لفظی رہ جائے گی جو کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتی۔

كَلَّا اِذَا بَلَغَتِ النَّزَّاقِي ۙ وَقِيلَ مَنْ رَاقِي ۙ وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقِي ۙ وَالتَّفَّتِي ۙ

السَّاقِي ۙ بِالسَّاقِي ۙ اِلَى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقِي ۙ

”ہرگز نہیں جب جان کھینچ کر حلق تک پہنچ جائے گی اور کہا جائے گا اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا اور پورا گمان ہو جائے گا اب جدا ہونا ہے اور پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ جائے گی تو تمہارے پروردگار ہی کی طرف کھینچ کر جانا ہوگا۔“

اب پھر اُن کے انکار آخرت کی رد ہے کہ تم اس وقت یہ سمجھ لو کہ مر کے چھٹکارا مل جائے گا مگر جب عالم احتضار ہوگا اور اس زندگی سے مایوسی

ہو چکے گی اُسی وقت پتہ چل جائے گا کہ بات ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ اُس کے بعد پروردگار کا سامنا کرنا ہے اور وہاں گزشتہ اعمال کی پاداش ملنا ہے۔

**فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى ۝۳۱ ۝ وَلَكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۝۳۲ ۝ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ آهْلِهِ يَتَمَطَّى ۝۳۳**

**أُولَىٰ فَأُولَىٰ ۝۳۴ ۝ ثُمَّ أُولَىٰ لَكَ فَأُولَىٰ ۝۳۵ ۝ أَيْحَسِبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدىٰ ۝۳۶**

”تو نہ اُس نے تصدیق کی اور نہ اُس نے نماز پڑھی بلکہ اُس نے جھٹلایا اور منہ موڑ لیا، پھر اٹھلٹا ہوا اپنے گھروں کی طرف چلا گیا (ہاں) یہ تیرے ہی لئے زیادہ سزاوار ہے اور تیرے ہی لائق ہے، پھر (سن لے کہ) یہ تیرے ہی لائق اور تیرے ہی لئے سزاوار ہے۔ کیا آدمی سمجھتا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟“

انداز کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی خاص آدمی کا ذکر ہے۔ روایتیں بتاتی ہیں کہ وہ ابو جہل تھا کہ اُس نے گزشتہ آیتیں سنیں اور کچھ اثر نہ لیا بلکہ متکبرانہ انداز سے سن کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُسی سے کہا جا رہا ہے کہ یہ رویہ اختیار کرنا تیرے ہی اوپر رکھ پ بھی سکتا ہے اور تیرے ہی لائق اور تیرے ہی لئے موزوں بھی ہے یعنی کوئی صاحب عقل و فہم ہوتا تو وہ ضرور غور کرتا اور جو کچھ کہا جا رہا تھا اُس سے اثر پذیر ہوتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اولیٰ لک عرب کے محاورے میں ”وائے“ اور ”تف“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اُس کے کچھ شواہد بھی پیش کیے ہیں اور بار بار کہنا گویا مسلسل تازیانے لگانا ہے۔ بعض نے کہا ہے وائے ہو تجھ پر اس زندگی میں اور وائے ہو موت کے ہنگام میں اور پھر وائے ہو عالم برزخ میں یعنی موت اور قیامت کے بیچ والے دور میں اور وائے ہو قیامت میں اور سزا کی منزل میں۔

بعض روایات میں ہے کہ رسول خدا ﷺ نے اُس رویہ کو دیکھ کر یہ الفاظ اُس سے فرمائے تھے جس پر اُس نے کہا کہ یہ تم کا ہے کاہے سے مجھے ڈرار ہے ہو۔ بخدا میں قریش میں سب سے زیادہ بااثر آدمی ہوں آخر میں ایک کلیہ کے طور پر استہمام کے پیرا یہ میں انکار ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ وہ یونہی مطلق العنان چھوڑ دیا جائے گا۔ زندگی بھر جو چاہے کرے اور پھر اُس کی کچھ جزاؤں سزا نہ ہو، یہ غلط ہے۔ بہر حال زندگی میں اُسے کچھ فرائض انجام دینا ہیں جو اُس کے لئے مقرر رہیں اور پھر انہی کے لحاظ سے اُسے پاداش ملنا ہے۔

**أَلَمْ يَكْ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝۳۷ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَىٰ ۝۳۸ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ**

**الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝۳۹ ۝ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۝۴۰**

”کیا وہ شروع میں ایک منی کا ذرا سا پانی نطفہ کا نہ تھا جو (عورت کے پیٹ میں) ڈالا جاتا ہے، پھر وہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں تھا تو اُس (خدا) نے اُس کے اعضاء جو ارح بنائے پھر اس سے دو قسمیں مرد اور عورت کی پیدا کیں، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو پھر زندہ کرے؟“

یہاں وہ بالکل شروع والی منزل کو چھوڑ کر بات شروع کی ہے یعنی وہ آدم والی خلقت جو مٹی سے تھی، اُس کا ذکر نہیں کیا گیا اور جہاں سے تو والد و تناسل کا سلسلہ شروع ہوا اُسی کو بیان کیا گیا اور پھر اُسی سے نتیجہ نکالا گیا کہ جو ان تمام تغیرات کے پیدا کرنے پر اور تخلیق میں ان تمام منازل کو طے کرانے پر قادر تھا، وہی دوبارہ اس آدمی کو جزاؤں سزا کے لئے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اس کا انکار کرنا کسی آدمی کے لئے بے معنی ہے۔ اصل مضمون یہی تھا جس سے سورہ شروع ہوئی تھی، اُسی پر اب اُسے ختم کیا جا رہا ہے۔

# سُورَةُ الدَّهْرِ

”دہر“ اور سورۃ الانسان دونوں اس سورے کے نام ہیں جو اس کی پہلی ہی آیت کے دو الفاظ سے ماخوذ ہیں اور عرف عام میں یہ سورہ ”ہل آتی“ کہلاتا ہے جو اس کے ابتدائی الفاظ ہیں۔ چونکہ اس سورہ کے مکی اور مدنی یا مجموعہ مکی و مدنی ہونے میں بہت اختلاف ہے، اس لئے ہم نے پیشانی پر اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

بہر حال اس میں تھوڑی سی تمہید کے بعد آل رسول کے روزوں اور خیرات کا واقعہ درج ہے جو بہر حال مدینہ منورہ میں پیغمبر خدا ﷺ کی زندگی کے آخری حصے کا واقعہ ہے اس لئے اُس حصے کو مدنی ماننا ناگزیر ہے۔ آخر کے آیات کے مضمون پیغمبر خدا ﷺ کی بعثت کے ابتدائی دور سے متعلق ہیں لہذا اسے مکی سمجھا جاسکتا ہے اور اس کی نظیریں سوروں میں بہت ہیں کہ مکی سوروں میں مدنی آیتیں اور مدنی سوروں میں مکی آیتیں درج ہیں۔ اس سورہ میں شروع میں انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ عالم امکان کے ایک دور میں کچھ بھی نہ تھا، پھر اس کی تخلیق (۲) مقصد تخلیق (۳) کفران نعمت کرنے والوں کا انجام مختصر الفاظ میں۔ (۴) نیکو کاروں کے لئے آخرت کی نعمتوں کا تذکرہ ذرا تفصیلی طور پر (۵) اُس واقعہ کا ذکر جس کی بنا پر یہ سورہ نازل ہوا ہے (۶) نعمات کا مفصل ذکر اُس کے کردار کی جزا کے طور پر (۷) پیغمبر خدا ﷺ کو مشرکین کے کردار پر صبر و ثبات کی تلقین (۸) نمازوں کے اوقات کا مختصر بیان (۹) انسانی ارادہ اللہ کے ارادہ کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں۔ یہ اپنے ارادے میں کامیاب اسی وقت ہو سکتا ہے جب اللہ کے ارادے سے ٹکراؤ نہ ہو۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

هَلْ آتَىٰ عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝۱ اِنَّا خَلَقْنَا  
الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۝۲ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝۳ اِنَّا هَدَيْنٰهُ  
السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا ۝۴ اَوْ اِمَّا كَفُوْرًا ۝۵

”کیا انسان پر عالم امکان کے دور میں ایک وقت ایسا نہ تھا جب کہ وہ کوئی ذکر میں آنے والی چیز نہ تھا۔ ہم نے اس انسان کو طے جلے ہوئے نطفے سے پیدا کیا تاکہ اُس کو محلّ آزمائش میں لائیں تو اُسے دیکھنے والا اور سننے والا بنایا۔ ہم نے اُسے ایک خاص راستے کی ہدایت کی اب یا تو وہ شکر گزار ثابت ہوتا ہے یا ناشکر“۔

استفہام یعنی سوالیہ جملہ کبھی اقرار لینے کے لیے ہوتا ہے کبھی انکار کے لیے اس کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ لفظوں کے معنی بدلے جائیں جیسے بعض نے کہا ہے کہ هل یہاں قد کے معنی میں ہے۔ لفظیں بدلنے کی اس ضرورت نہیں ہے کہ زبان میں یہ انداز سوال

کا مقصد اقرار یا انکار کا حامل ہوا کرتا ہے تو اس کا مطلب چاہے اقرار ہو، چاہے انکار، بہر صورت لفظیں استغناء ہی کی ہوتی ہے اور یہاں مطلب یہی ہے کہ انسان کو توجہ دلائی جائے کہ وہ غور کرے کیا ایسا ایک دور نہیں تھا کہ انسان کے نام سے جس کا ذکر اب ہوتا ہے یہ وجود ہی نہیں رکھتا تھا کہ اس کا ذکر کیا جاسکے۔ حدیثوں میں ہمارے یہاں ایک عیاشی کی روایت ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے جس میں الفاظ قرآنی میں مذکور کی قید کو واضح کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:- کان شیعاً ولم یکن مذکوراً؛ وہ کوئی چیز تو تھا مگر اس کا ذکر نہیں تھا۔ دوسری روایت میں سعید حدادی امام محمد باقر علیہ السلام سے ہے یہ الفاظ ہیں کہ:- کان مذکوراً فی العلم ولم یکن مذکوراً فی الخلق: علم الہی میں تو اس کا ذکر تھا مگر زبان خلق پر اس کا ذکر نہ تھا۔

تیسری روایت حمران بن اعین کی امام جعفر الصادق علیہ السلام سے ہے کہ:- کان مقدوراً ولم یکن مکوناً: وہ دائرہ قدرت میں تھا مگر احاطہ وجود میں نہ تھا۔ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان المعلوم معلوم وان لم یکن مذکوراً وان بالمعلوم یسمی شیعیاً ”نا بود جو ہو وہ بھی علم میں ہوتا ہے اگرچہ ذکر اس کا نہ ہو اور جو معدوم ہو وہ بھی شے کا مصداق ہوتا ہے۔ اس صورت میں فلسفیوں کا یہ قول غلط ہو جاتا ہے کہ الشیء تساو الوجود شے ہونا موجود ہونے کے مرادف ہے۔“

بہر صورت انسان سے یہ اقرار لینے کا کہ وہ ایک دور میں قابل ذکر چیز نہ تھا اسے متوجہ کرنا ہے وہ ذاتا ایسی چیز نہ تھا جس کا ذکر ہو سکے۔ یہ خالق کا احسان و کرم ہے کہ اس نے اسے قابل ذکر بنایا اور اب اسے یہ سوچنا چاہیے کہ اس منعم حقیقی کے اس احسان کے نتیجہ میں اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ ”ملے جلے ہوئے نطفہ سے“ یعنی اس میں ایک جز باپ کی طرف سے آتا ہے ایک ماں کی طرف سے آتا ہے اور دونوں سے مل کر اس انسان کی تشکیل ہوتی ہے۔ ”محل آزمائش میں لانے کے لیے“ یہ آزمائش اپنے علم کے لیے نہیں ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ کس میں کیا صلاحیتیں مضمر ہیں اور کس میں کیا جراثیم ہیں، بلکہ یہ آزمائش ان آثار کے علم ظہور میں آنے کے لیے موقع کا فراہم کرنا ہے جو اس دور حیات میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کو متوجہ رہنے کی ضرورت ہے کہ وہ آزمائش میں کیسے اترتا ہے اور اس میں کمی محسوس ہو تو اس کے پورا کرنے کی کوشش لازم ہے۔ اسی آزمائش کے لیے اُسے ”گوش شنوا“ اور ”چشم بینا“ عطا کی۔ یہ ”گوش چشم“ وہ نہیں ہیں حیوانات کی بھی عطا ہوئے ہیں بلکہ یہ کان اور آنکھیں وہ ہیں جو حق و باطل اور صحیح و غلط میں امتیاز کر سکتی ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کون کون باطل کو قبول کرتا ہے اور کون باطل کو قبول کرتا ہے اگر وہ حق و صحیح کو اختیار کرتا ہے تو وہ ”شاکر نعمت“ ہے اور اگر باطل و غلط کو اختیار کرتا ہے تو وہ کافر نعمت ہے جہاں تک خالق کا عمل تھا وہ سب کے ساتھ یکساں تھا۔ جہاں سے انسان کے اختیار کی کارگزاری شروع ہوئی دو قسمیں ہو گئیں، ایک شاکر اور ایک کفور۔ اب یہ تفرقہ قائم رہا جو آخر تک رہا کہ فریق فی الجنة و فریق فی السعیر“ ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں“

### إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلْسِلًا وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا ﴿۴۱﴾

”ہم نے تیار رکھی ہے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ“

اگرچہ عموماً بشارت کا درجہ انداز پر مقدم ہے اور پہلے ذکر میں ”شاکر“ پہلے تھا اور ”کفور“ بعد کو مگر چونکہ کافروں کی پاداش کا ذکر موضوع کے لحاظ سے یہاں ضمنی حیثیت رکھتا ہے جسے چند لفظوں میں ختم کر دینا ہے اس لیے اسے مقدم کر دیا گیا اور نیکو کاروں کے جس انجام کو جسے دور تک بیان کرنا ہے اور اسی ذیل میں اس واقعہ کا ذکر کرنا ہے جس کے لیے ان تمام نعمتوں کا بیان ہوا ہے، اس لیے اسے بعد میں شروع کیا گیا ہے۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۗ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ



يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ٦ يُؤْفُونَ بِاللَّيْلِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ٧  
 وَيُطْعَمُونَ السَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ٨ إِمَّا نُنْطَعِبُكُمْ لِيُوَجِّهَ اللَّهُ  
 لَا تَرْيَدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ٩ إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ١٠  
 ”یقیناً نیک لوگ ایسے (بہشت کی شراب کے) جام پئیں گے جن میں کانور کی شرکت ہوگی وہ چشمہ جس سے اللہ  
 بندے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے شاخیں نکال نکال کر سیراب ہوں گے یہ وہ ہیں جو نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن کا اندیشہ  
 محسوس کرتے رہے ہیں جس کی مصیبت پھیلی ہوئی ہوگی اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت کے ساتھ ساتھ غریب  
 محتاج اور یتیم اور جنگ کے قیدی کو، ہم تمہیں صرف اللہ کے رضا کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے جزا چاہتے ہیں اور نہ  
 شکریہ۔ ہم ڈرتے ہیں اپنے پروردگار کی طرف سے اس دن کے عذاب کے ڈر سے جو بہت ترش روا اور سخت ہوگا۔“

### اس واقعہ کا ذکر جس کی بنا پر یہ سورہ نازل ہو ہے

قرآن مجید میں ایک فرد کی بھی مدح ہوتی ہے تو اکثر جمع کے صیغے استعمال ہوتے ہیں اور یہاں تو جن ہستیوں کے کردار کے لیے  
 سنبھولیت کے طور پر سورہ اتر اتر اتر خود متعدد افراد تھے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ پیغمبر خدا ﷺ کے دونوں نواسے حسنؓ اور حسینؓ بیمار ہوئے حضرت  
 فاطمہ زہراؓ اور حضرت علی ابن ابی طالبؓ دونوں بزرگواروں نے نذر کر لی کہ خداوند عالم بچوں کو صحت فرمائے گا تو وہ تین تین  
 روزے رکھیں گے، گھر کی خادمہ جناب فضلہ نے بھی نذر کر لی جب بچوں کو صحت حاصل ہوئی تو حالانکہ خود شاہزادوں نے اپنی صحت کے لیے نذر نہ کی  
 ہو مگر وفائے نذر میں بزرگوں کے ساتھ یہ بھی شرکت کے لیے آمادہ ہو گئے۔ حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے تین دن کی  
 وفائے نذر کے لیے جو اس گھر کی غذا معمولاً تھی یعنی جو فراہم کیے اور سیدہ عالمہؓ اللہ علیہا نے اس کے تین حصے کیے۔ ایک حصے سے پہلے دن کی  
 غذا تیار کی گئی۔ جب وقت افطار کا آیا تو دروازے پر سے آواز آئی میں ایک مسکین مدینہ سے بھوکا ہوں، مجھے کھانا چاہیے، روزہ داروں میں ہر ایک  
 نے اپنا کھانا اس سائل کو دے دیا اور پانی سے افطار کر کے عبادت خدا میں مصروف ہو گئے اور دوسرے دن کے روزے کی نیت کر لی، دوسرے دن  
 کھانا تیار ہوا اور افطار کے وقت سامنے آیا..... مگر آج یتیم کی آواز آئی..... اور وہ کھانا تیار ہوا حوالے کر دیا گیا..... اور تیسرے دن  
 افطار کے وقت ایک اسیر جنگ کی آواز آئی..... آج کھانا اس قیدی کو دے دیا گیا..... یہی وہ کردار تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا اور اس  
 کی بنا پر یہ سورہ یا کم از کم یہ سلسلہ آیات کا جس میں سے یہ آیتیں ہیں نازل ہوئیں۔ یہ جو ہے کہ ”ہم تم کو صرف اللہ کی رضا کے لیے دیتے ہیں، نہ تم  
 سے جزا چاہتے ہیں، نہ شکریہ“ یہ زبانی الفاظ ان ہستیوں کے نہیں ہو سکتے، اس کے کہ یہ مسکین، یتیم اور اسیر یہاں واحد نہیں آئے تھے جو ان سے یہ  
 الفاظ کہے جاتے بلکہ ہر دن کھانا دینے میں جو ان کے دل کی آواز تھی اسے خالق نے اپنے الفاظ میں جز قرآن بنا دیا

فَوْقَهُمْ اللَّهُ شَرُّ ذَلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّهْمُ نَصْرَةً وَسُرُورًا ١١ وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا  
 جَنَّةً وَحَرِيرًا ١٢ مُتَّكِنِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرْبَابِ ١٣ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا

زَمَّهَرِيرًا ۱۳ وَذَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا وَذُلَّتْ قُطُوفُهَا تَدْلِيلًا ۱۴ وَيُطَافُ  
عَلَيْهِمْ بِأَنِيَّةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرًا ۱۵ قَوَارِيرًا مِّنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا  
تَقْدِيرًا ۱۶ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۱۷ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى  
سَلْسَبِيلًا ۱۸ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا  
مَّنْثُورًا ۱۹ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمًّا رَأَيْتَ نَعِيمًا وَ مَلَكًا كَبِيرًا ۲۰ عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ  
سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ وَحُلُّوْا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقَمَهُمْ رِبَاهِمُ  
شَرَابًا بَاطَهُرًا ۲۱ إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُورًا ۲۲

”تو بچایا اللہ نے اس دن کی سختی سے اور انہیں ملایا تروتازگی اور مسرت سے اور انہیں صلہ دیا اس کا جو انہوں نے صبر کیا بہشت اور ریشم کے کپڑوں کے ساتھ جن میں وہ بیٹھیں تکیوں سے لگے ہوئے اونچی مسندوں پر، نہ دیکھیں گے وہاں سورج کی گرمی اور نہ سردی کی ٹھنڈی، اور ان پر جھکی ہوگی وہاں کی چھاؤں اور وہاں کے پھلوں کا حاصل ہوگا ان کے لیے آسان رکھا جائے گا اور ان پر گردش کرائی جاتی ہوگی چاندی کے برتنوں کی اور ان ساغروں کی جو شیشے کے ہوں گے جنہیں صحیح اندازے کے ساتھ ان کے سامنے لیا جائے گا اور انہیں پلائے جائیں گے وہ جام جن میں آمیزش ہوگی سوٹھ کی، اس چشمے سے جو وہاں ہے جس کا نام سلسبیل ہے اور ان کے سامنے گردش کر رہے ہوں گے وہ خدمت کرنے والے لڑکے جو ہمیشہ ایک ہی حال پر رہیں گے، جب تم انہیں دیکھو گے سمجھو گے بکھرے ہوئے موتی اور جب دیکھو گے تو اس موقع پر دیکھو گے منظر ایک بڑے عیش و آرام اور بڑے اقتدار کا ان پر ہوں گے سبز باریک ریشم کے اور اطلس و دیبا کے اور انہیں پہنائے جائیں گے کنگن چاندی کے اور ان کا پروردگار انہیں پلائے گا پاک و پاکیزہ شراب، یقیناً یہ تمہارا کچھ صلہ ہے اور تمہاری کوشش قدر دانی کے قابل ہے۔“

### نعمات بہشت کا مفصل ذکر، کردار کی جزا کے طور پر

تروتازگی کا تعلق چہرے سے ہے اور مسرت کا دل سے اور دونوں میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے، اور یہ سب رضائے الہی کے احساس سے ہے، یہ سب جزائیں ان کے صبر کی بیان ہوئیں ہیں اور یوں تو صبر ان کی پوری زندگی پر حاوی ہے مگر اس واقعہ خاص میں پہلے تو روزے ہیں جنہیں قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ (اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ) لفظ صبر سے تعبیر کیا ہے اور پھر راہ خدا میں اطعام کے سلسلہ میں جو انہوں نے تین دن مسلسل بے غذائی برداشت کی، اُس نے اُس صبر کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا گرمی اور سردی کی تکلیف اعتدال کی حد سے گزرنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، ہوئے جنت نقطہ اعتدال پر ہے اس لئے نہ وہاں سردی تکلیف دہ ہے نہ گرمی۔

شاخیں درختوں کی اُن کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی، یہی چھاؤں کا جھکا ہونا ہے اور اسی سے پھلوں کے باسانی حاصل ہونے کا تعلق ہے۔ چاندی کے ساتھ کہا گیا ہے شیشے کے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہیں تو وہ چاندی کے مگر اتنے صاف و شفاف اور نازک کہ شیشے کے معلوم ہوتے ہوں گے، پہلے چشمے کے وصف میں کہا گیا تھا کہ کافر ملا ہوگا اور اس چشمے کے وصف میں یہ سوٹھ کا پانی ملا ہوا ہوگا ان کا ذکر اس لئے ہے کہ عرب لوگ ان خوشبوؤں کو پسند کرتے تھے۔ ورنہ نہ اس کافر کو بالکل دنیاوی کافر کی طرح کا سمجھنا چاہیے۔ نہ اس سوٹھ کو بلکہ یہ اُس کے انتہائی خوشگوار ہونے کا اظہار ہے..... اب ہم اگر خوشگوار کا تصور کسی اور خوشبو سے وابستہ محسوس کرتے ہیں تو ہم اس خوشگوار کو اس سے تعبیر کر سکتے ہیں اسی طرح لباس میں جن کپڑوں کے نام لئے گئے ہیں، اگر اس دنیا میں اُس سے زیادہ بیش قیمت کوئی چیز آگئی جس کا لباس اس سے اعلیٰ سمجھا جائے تو اس خاص قسم کے کپڑے کی خصوصیات نہ سمجھنا چاہیے بلکہ جو بلند سے بلند تصور لباس کا ہمارے ذہن میں آسکے وہ سمجھنے کا ہمیں حق ہے اس لئے کہ نعیم جنت کا معیار یقیناً اس دنیا سے بالاتر ہے۔ شراب کے ساتھ طہور کا لفظ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جن جن خرابیوں کی وجہ سے دنیا والی شراب کو حرام کیا گیا ہے بہشت کی شراب ان تمام خرابیوں سے مبرا ہوگی، اس میں خوشگوار ہی خوشگوار ہے۔ یہ نفائض نہیں ہیں جو دنیا کی شراب میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ان سب باتوں سے پاک صاف ہے۔ چونکہ اُن کی نیت اپنے کردار میں بے غرض تھی جس کے ساتھ دو چیزوں کی نفی کی گئی تھی (لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا) ”نہ تم سے ہم جزا چاہتے ہیں، نہ شکریہ“ تو خالق نے ان تمام جزاؤں کے تذکرے کے بعد اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ وہی دو (۲) چیزیں اپنی طرف نسبت دے کر کہہ دیں کہ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا ﴿الانسان: ۲۲﴾ ”یہ تو تمہارے عمل خیر کی کچھ جزا ہے اور تمہاری کوشش ”مشکور“ ہے۔ اگرچہ فاعل کی طرف انتساب سے ”شکر“ کے مفہوم میں فرق ہو جاتا ہے۔ بندے کا شکر ادا کرنا اور ہے اور خدا کی طرف یہ نسبت دی جائے تو اس کا ترجمہ وہی ہو سکتا ہے جو ہم نے کیا کہ تمہاری کوشش ہمارے نزدیک قابل قدر ہے۔ ہم نے جزا کی تینوں کو تقلیل کا قرار دے کر ترجمہ میں ”کچھ“ کے لفظ کا اضافہ کر دیا یعنی عمل کی گرانی کے مقابلہ میں تمام نعیم جنت سمٹ کر بھی اگر عمل کا پلہ گراں رہے تو اس کمی کو دور کرنے کے لئے یہ ”مشکور“ کہنے کی سند ہی اُس بلند نظر صاحبان کردار کے نقطہ نگاہ سے کافی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطِعْ مِنْهُمْ  
اِثْمًا وَّ كُفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ  
وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾

”ہم ہی نے آپ پر یہ قرآن تدریجی طور پر وقتاً فوقتاً نازل کیا ہے تو اپنے پروردگار حکم کی خاطر صبر کیجئے اور ان میں سے کسی بد اعمال یا منکر ایمان کی بات نہ مانیے اور اپنے پروردگار کو یاد کیجئے صبح و شام اور رات کے ایک حصہ میں سجدہ کیجئے اور اُس کی تسبیح کیجئے رات کے طویل حصے میں“۔

اس کے شروع کے تین فقروں میں نماز ہائے فریضہ کے اوقات کا بیان ہے اور جہاں جہاں قرآن مجید میں اوقات نماز کی طرف اشارہ ہے ان سے پانچ نمازوں کے لئے بیان تین اوقات کا کیا جاتا ہے چنانچہ وہاں بھی صبح کی نماز کا وقت بس الگ بیان ہوا ہے اور پھر اسیل کے لفظ

سے بعد زوال سے لے کر مغرب تک وقت دو نمازوں کا بیان کیا گیا ہے جو ظہر و عصر ہیں اور رات کو سجدہ کرنے کا حکم میں مغرب اور عشاء دونوں نمازیں ہیں۔ پھر طویل حصہ شب میں جو تسبیح کو کہا گیا ہے اُس سے بظاہر نماز شب مراد ہے بہر حال پانچ وقت کی نمازوں کے لئے تین اوقات کا اعلان کرنا فقہ جعفری ہی کے حکم پر منطبق ہے کہ زوال سے لے کر مغرب تک ظہرین کا وقت ہے جس میں صرف بلحاظ ترتیب شروع کا ایک جزء ظہر کا وقت مختص اور آخر کا ایک جزء عصر کا وقت مختص ہے۔ باقی وقت دونوں نمازوں میں مشترک ہے اور مغربین میں غروب کے بعد سے بنظر ترتیب شروع کا جزء مغرب سے اور آخر کا ایک جزء عشاء سے مخصوص ہے باقی پورا مغربین یعنی مغرب اور عشاء کا مشترک وقت ہے۔

إِنَّ هَؤُلَاءِ يُجِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿٢٤﴾ نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ  
وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَلَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿٢٥﴾ إِنَّ هَذِهِ تَذَكُّرَةٌ ۖ  
فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿٢٦﴾ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ  
عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٢٧﴾ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٢٨﴾

”یہ لوگ اس وقتی دور زندگی کو دوست رکھتے ہیں اور جو بھاری دن آگے آنے والا ہے، اسے چھوڑے ہوئے ہیں ہم نے انہیں پیدا کیا ہے اور ان کے اعضاء و جوارح کا مضبوط نظام بنایا ہے اور جب ہم چاہیں تو ان کی صورتوں کو پورے طور پر بدل دیں یقیناً اس میں ایک بڑی نصیحت ہے تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کرے اور تمہارا چاہنا کچھ نہیں جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے صحیح صحیح کام کرنے والا، جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور جو ظالم ہیں ان کے لئے اُس نے دردناک عذاب تیار رکھا ہے۔“

یہ پہلے بھی آچکا ہے کہ یہ مفادات دنیا کی محبت ہے جس کی وجہ سے یہ پیام حق کو قبول نہیں کرتے اور آخرت کو یاد کر کے اُس کے تقاضے پورا نہیں کرتے، ان کو اپنی موجودہ طاقت و قوت اور جماعت کی کثرت وغیرہ پر ناز ہے، حالانکہ کہ ہم جب چاہیں ان تمام چیزوں کو بدل دیں..... یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ ان سب کو فنا کر دیں اور ان کی جگہ ایک دوسری قوم کو پیدا کر دیں جیسا کہ بعض جگہ قرآن مجید میں ہے اور یہ بھی کہ بطور عذاب ان کی صورتوں کو بدل دیں جیسا کہ بعض امم سابقہ پر عذاب ہوئے اور آخرت میں مختلف شکلوں میں محسوس کریں جس کا احادیث میں بھی ذکر ہے اور قرآن مجید میں بھی، دوسری جگہ ارشاد موجود ہے۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ حق اور باطل، نیک اور بد کے راستوں میں کسی ایک کو اختیار کرنا انسان کا کام ہے لیکن وہ جس راہ کو اختیار کرے، اُس پر چلنے میں بالکل آزاد بھی نہیں ہے، اسباب شرائط اور مواقع کے سلسلوں کی کڑیاں اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اپنے اچھے اور بُرے مقاصد میں اُس حد تک کامیاب ہوتا ہے جس حد تک اللہ کی مشیت سد راہ نہ ہو، جہاں سے اس کی مشیت کا فرما ہو جاتی ہے یہ اپنے تمام منصوبوں میں ناکامیاب ہو جاتا ہے اور ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہو..... جہاں تک کہ اس کے سوء اختیار کا تعلق ہے، یہ غلط راستہ اختیار کر کے اصول عقائد میں کہ کافر ہو یا اعمال میں کہ فاسق ہو یہ دونوں باختلاف مراتب ظالمین میں داخل ہیں اور ظالمین کا انجام اُس کی طرف کا عذاب الیم ہے۔

# سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ

مکیہ ..... ۵۰ ..... آیات

چونکہ شروع ہی میں المرسلات کا لفظ ہے اس لئے یہ نام ہوا۔

اس سورے میں بھی منکرین آخرت کی رد ہے اور قیامت کے ہولناک مناظر کا ذکر ہے اور خالق کی قدرت کی کچھ نشانیوں کا بیان ہے اور منکرین کو مستقبل کے ہولناک دن سے ڈرایا گیا ہوا اور پرہیزگاروں کے حسن انجام اور جھٹلانے والوں کے بُرے انجام پر سورے کو ختم کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ۝۱۱۱ فَالْعَصْفِ عَصْفًا ۝۱۱۲ وَالنَّشْرِ نَشْرًا ۝۱۱۳ فَالْفَرْقَتِ

فَرَقًا ۝۱۱۴ فَالْمُلْقَاتِ ذِكْرًا ۝۱۱۵ عُدْرًا أَوْ نُذْرًا ۝۱۱۶ اِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ ۝۱۱۷

”قسم ہے اُن کی جو مسلسل بھیجی جاتی ہے، پھر وہ روزہ دار جھکڑ کے ساتھ چلتی ہے، اور چاروں طرف شدت کے ساتھ پھیلا دیتی ہیں، پھر پوری طرح جدا جدا کر دیتی ہیں، پھر خدا کی یاد پیدا کرتی ہیں، حجت تمام کرنے یا ڈرانے کے طور پر جو تم سے وعدہ وعید کیا جا رہا ہے یہ ضرور ہو کر رہنے والا ہے۔“

یہاں مسلسل قسمیں صفات کے ساتھ کھائی گئی ہیں اور موصوف کا پتہ نہیں کہ کون بھیجی جانے والیاں، کون رفتار سے چلنے والیاں، کون پھیلانے والیاں اور کون جدا کرانے والیاں اور کون خدا کی یاد پیدا کرنے والیاں..... اس لئے مفسرین میں سے بعض نے ان کی تشریح میں فرشتوں کا نام لیا ہے اور کچھ نے انبیاء کو لیا ہے، کچھ نے خداوندی آیات یعنی قدرت کی نشانیوں یا قرآن کی آیتوں کو لیا ہے۔

انبیاء پر تو جمع مؤنث سالم کی لفظیں جس کے ترجمے میں ہر جگہ ’والیاں‘ کہنا پڑا ہے کسی طرح منطبق نہیں ہوتی..... فرشتوں کے لئے بھی وہ تو مشرکین کا تصور تھا کہ وہ لڑکیاں ہیں لیکن قرآن نے اُس کی رد کی ہے اور سخت ناگواری کا ظہار کیا ہے تو خود قرآن اُن کے لئے جمع مؤنث کے لفظ کیوں استعمال کرتا۔ بعض میں تفریق ہے کہ شروع کے فقرات میں ہوائیں مراد ہیں اور بعد میں فرشتے مراد ہو گئے ہیں یہ بھی ایک سلسلہ کے الفاظ ہونے کی وجہ سے کچھ سمجھ میں آنے والی بات معلوم نہیں ہوتی..... زیادہ ترجیح اسی کو ہوتی ہے کہ یہ ہواؤں ہی کی قسم ہے..... وہی مختلف طرح کے پے در پے بھیجی جاتی ہیں اور وہی تیز جھکڑ کے ساتھ چلتی ہیں۔ ان ہی میں کی بعض ہیں جو بادلوں کو چاروں طرف پھیلاتی ہے اور انہیں میں بعض ہیں جو برابر کو جدا جدا کر دیتی ہیں اور انہیں ذریعہ سے اگر باران رحمت ہے تو حجت الہی تمام ہوتی ہے اور انہیں کے

ذریعہ سے ایسی تباہی ہوتی ہے خواہ خود اس سے یا اس تباہ کن بارش سے جو اس کے سبب سے ہوئی ڈرانے کا کام ہوتا ہے اور خوف و دہشت طاری ہو جاتی ہے، بہر صورت قسمیں اسی پر ہیں کہ آخرت کی بار بار جو اطلاع دی جاتی ہے، وہ واقع میں آ کر رہے گی۔

**فَإِذَا التُّجُومُ طُمَسَتْ ۙ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۙ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِتَتْ ۙ لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ ۙ لِيَوْمِ الْفُصْلِ ۙ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْفُصْلِ ۙ وَيَلَّيْومَ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۙ**

”تو جب ستارے بے نشان ہو جائیں گے اور جب آسمان کشادہ کر دیا جائے گا اور جب پہاڑ سرسہ کر دیئے جائیں گے اور جب پیغمبر حاضر کیے جائیں گے (آخر) کس دن کے لئے یہ اتنی مہلت دی گئی تھی فیصلے کے دن کے لئے اور تم کیا جانو فیصلے کا دن کیا ہے۔ وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے۔“

ستارے بے نشان ہو جائیں گے یعنی اُن کی روشنی ختم ہو جائے گی، لہذا وہ تاریک ہوں گے اور آسمان کشادہ کر دیا جائے گا یعنی وہ شق ہو جائے گا جیسا کہ بعد میں آئے گا (إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ) اور اُس میں درمیان درمیان خلا ہو جائے گا جیسا کہ ابھی آئے گا (وَكَانَتْ أَبْوَابًا) اُس میں دروازے ہو جائیں گے، پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر ہوا میں منتشر ہو جائیں گے، اور پیغمبر حاضر کیے جائیں گے، اپنی کارگزاری اور قوم کے رویہ کی روندادسنانے کے لئے جسے قرآن کی بعض آیتوں میں ”شہادت“ یعنی گواہی کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ اب جو منکرین بار بار کہتے تھے آخر یہ سب پھر ہو کیوں نہیں جاتا، دیر کا ہے کی ہے۔..... اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تمہارے تقاضوں سے تھوڑی ہوگا۔ اس کے لئے تو ایک دن مقرر ہے جو فیصلے کا دن ہوگا..... اُس دن جھٹلانے والوں کی مکمل تباہی اور بربادی ہوگی۔

یہ آخر کا جملہ ”حاصل سورہ“ ہونے کے طور پر اسی طرح بار بار دہرایا گیا ہے جیسے سورہ رحمن میں فبما نرى الاء ربكنا تكذبان کے لفظ میں پے در پے دہرائی گئی ہیں اور سورہ قمر وغیرہ میں بھی ایسے جملے ہیں جو ہر تذکرے کے بعد برابر دہرائے گئے ہیں جو بتلاتے ہیں کہ یہ سورہ اس خاص طرز میں ایک دفعہ میں اتارا گیا ہے۔

**أَلَمْ نُهَبِكِ الْأُولِينَ ۙ ثُمَّ نُنَبِّئُهُمُ الْآخِرِينَ ۙ كَذَلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ۙ وَيَلَّيْومَ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۙ**

”کیا ہم نے پہلے والوں کو ہلاک نہیں کیا، پھر انہی کے پیچھے بھیجیں گے بعد والوں کو، ایسا ہی کرتے ہیں ہم مجرموں کے ساتھ۔ وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے۔“

پہلے والوں سے مراد وہی عا دوشمود وغیرہ زمانہ سابق والی قومیں ہیں جو عذاب الہی سے تباہ و برباد کر دی گئیں کہا جا رہا ہے کہ انہیں اور اُن کے انجام کو یاد کرو، وہی انجام ہونا ہے بعد والوں کا جو آیات الہیہ کو جھٹلانے لگیں۔ یوں مختتم انجام کے لئے وہی دن مقرر ہے جس کا یوم الفصل کے نام سے اعلان ہو چکا ہے۔

أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ﴿٢٠﴾ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ﴿٢١﴾ إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿٢٢﴾

فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقَدِيرُونَ ﴿٢٣﴾ وَيْلٌ لِّيَوْمٍ ذُلِّ الْمَكَدِّ ﴿٢٤﴾

”کیا ہم نے تم نے ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا، اور اُسے قابل اطمینان پر سکون جگہ رکھا ایک مقرر مدت تک تو ثابت ہوئی اس سے ہماری قدرت، تو کیسی اچھی قدرت رکھنے والے ہم ہیں۔ وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے“۔

یعنی ابتدائے خلقت کو دیکھو تو انتہائے خلقت اور دوبارہ پلٹائے جانے کا انکار نہ کرو، اس کے بعد بھی جو انکار کریں وہ فیصلے کے دن تباہی اور بربادی کے سوا اور کاہے کے مستحق ہیں۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ أَحْيَاءَ وَأَمْوَاتًا ﴿٢٦﴾ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيًّا ﴿٢٧﴾

وَأَسْقَيْنَكُم مَّاءً فُرَاتًا ﴿٢٨﴾ وَيْلٌ لِّيَوْمٍ ذُلِّ الْمَكَدِّ ﴿٢٩﴾

”کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی چیز نہیں بنایا زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی اور اس میں اُونچے اُونچے پہاڑ بنائے اور تمہیں خوشگوار پانی سے سیراب کیا، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے“۔

پھر یہ خالق کی قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں جن کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ زمین ہے جو طرح طرح کے انسانی ضروریات کو پورا کرنے والے خزانے لئے اُن کے بود و باش کے لئے ہے اور اسی زمین کے اندران کے دفن ہونے کے لئے بھی گنجائش ہے اور پھر اُونچے پہاڑ ہیں جن سے ان کے بہت سے ضروریات پورے ہوتے ہیں اور اسی زمین میں وہ پانی بھی فراہم کیا گیا ہے جس پر ان کی زندگی کا انحصار ہے، جو ان کے پینے کے کام آتا ہے جس نے یہ سب کچھ کیا ہے اُس کی قدرت سے یہ کیوں بعید سمجھے کہ وہ پھر ان مُردوں کو دوبارہ زندہ کر کے جزاؤ سزا کی منزل میں لائے۔ اتنی نشانوں کو قدرت کی دیکھنے کے بعد بھی جھٹلائیں تو پھر اُس دن وائے بحال اُن کے۔

إِنظِلُّوْا إِلَىٰ مَا كُنْتُمْ بِهِ تُكَدِّبُونَ ﴿٣٠﴾ إِنظِلُّوْا إِلَىٰ ظُلِّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ﴿٣١﴾

لَا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣٢﴾ إِنَّمَا تَرْمِي بِشَرِّرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٣﴾ كَأَنَّهُ جِهْلِيَّةٌ

صُفْرَةٌ ﴿٣٤﴾ وَيْلٌ لِّيَوْمٍ ذُلِّ الْمَكَدِّ ﴿٣٥﴾

”جاؤ“ اب اُسی کی طرف جسے تم جھٹلاتے تھے، جاؤ اُس چھاؤں کی طرف جو تین شاخوں والی ہے جو نہ آرام دینے والا ہے اور نہ آگ کے شعلوں سے بچانے والا، وہ آگ پھٹکتی ہوگی اونچی عمارتوں کی ایسی چنگاریوں کو جو اچھلتی ہوئی یوں نکل رہی ہے جیسے زرد رنگ کی اونٹنیاں، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے“۔

یہ چھاؤں کسی عمارت کی نہیں ہے بلکہ وہ دھواں ہے نیچے سے اجتماعی طور پر نکلتا ہے اور اونچا ہو کر اُس میں کئی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ تم ان چیزوں کو جھٹلاتے تھے اب انہی کا سامنا ہے۔ انہی کی طرف تم کو اپنے پیروں سے جانا ہے۔ اسی تباہی اور بربادی

سے تمہیں ڈرایا جاتا تھا اور اب وہی آج تمہارے سامنے ہے۔

هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُونَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ﴿٣٦﴾ وَيَلَّيْ يَوْمَئِذٍ  
لِّلْمُكذِّبِينَ ﴿٣٧﴾

”یہ وہ دن ہے جب وہ بات نہیں کہہ سکیں گے اور موقع دیا جائے گا کہ وہ عذرخواہی کر سکیں وائے ہو اس دن جھٹلانے والوں کے لئے“۔

شروع میں حیلے حوالے کیے اور اپنی صفائی میں جو سمجھ میں آیا وہ کہا لیکن اب وہ منزل آگئی جب سب جنتیں قطع ہو گئیں اور ان کے خلاف ہر بات کا ثبوت پیش ہو چکا، یہاں تک کہ ان کے اعضاء و جوارح کی گواہیاں بھی ہو گئیں تو اب سوا دم بخود رہنے کے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اب نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے، نہ وہ کوئی عذر پیش کر سکتے ہیں۔

هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۖ جَمَعْنَاكُمْ وَالْأُولَئِينَ ﴿٣٨﴾ فإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُوا ﴿٣٩﴾  
وَيَلَّيْ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكذِّبِينَ ﴿٤٠﴾

”یہ فیصلے کا دن ہے ہم نے تمہیں اور پہلے کے تمام لوگوں کو اکٹھا کیا ہے، تو اگر تمہارے پاس کوئی ترکیب ہو تو میرے مقابلے میں وہ کرو، وائے ہو اس دن جھٹلانے والوں کے لئے“۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر مشکل سے مقابلہ کے لئے تم ترکیبیں سوچا کرتے تھے اور کبھی اس میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے لیکن اب اس وقت میرے عذاب کی گرفت سے نکلنے کے لئے تمہارے پاس کیا ترکیب ہے؟ اگر کوئی ترکیب ہو تو اسے اختیار کرو۔ اب آج سوا تباہی اور بربادی کے اور صورت ہی کیا ہے؟

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ ﴿٤١﴾ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٤٢﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا  
هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ إنا كذبتك نجزي المحسنين ﴿٤٤﴾ وَيَلَّيْ يَوْمَئِذٍ  
لِّلْمُكذِّبِينَ ﴿٤٥﴾

”پرہیزگار لوگ سایوں میں ہیں اور چشموں میں اور طرح طرح کے پھلوں کے اندر جسے ان کا جی چاہے، شوق سے کھاؤ اور پیو صلے میں ان اعمال کے جو تم کرتے تھے ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں حسن عمل رکھنے والوں کو، وائے ہو اس دن جھٹلانے والوں کے لئے“۔

مجرموں کی بد انجامی کا مسلسل تذکرہ کرنے کے بعد ان کی حسرت و ناکامی کو مکمل کرنے کے لئے بیان ہو رہا ہے، ان کے مقابل کی جماعت کے حال کا جس نے آخرت کو سچ سمجھا اور اس کی تصدیق کا برابر اپنے اعمال سے بھی ثبوت دیا جس میں شروع میں ان کا ذکر بطور غائب ہے اور پھر ان سے مخاطب کر کے نعيم جنت سے بہرہ مند ہونے کی بشارت دی گئی ہے اور آخر میں پھر تاز یا نہ لگایا گیا ہے، جھٹلانے والوں کو۔



كُلُّوْا وَتَمْتَعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ هُمْ مُجْرِمُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَيَلْ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَدِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾

”کھاؤ اور تھوڑے دن فائدہ اٹھا لو (بہر حال) تم مجرم لوگ ہو، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے،“

وہ دن جب آجائے گا تو اس موقع کے تذکرے کرنے کے بعد اب دار دنیا میں ابھی جن کے لئے وہ وقت نہیں آیا ہے، اُن تمام کافروں اور بد اعمال لوگوں کو مخاطب کر کے اعلان کیا جا رہا ہے کہ اس دار دنیا میں عارضی طور پر جب تک موقع دیا جا رہا ہے اتنے دن آرام اٹھا لو اور اللہ کی نعمتوں سے جو اُس نے خلق فرمائی ہیں اٹھا لو مگر یاد رکھو کہ تم مجرم لوگ ہو، انجام تمہارا وہی ہونا ہے جس کا بار بار جھٹلانے والوں کے لئے اعلان ہو رہا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَرْكَعُوْا اَلَا يَرْكَعُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَيَلْ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَدِّبِيْنَ ﴿٣٩﴾ فَبِأَيِّ

حَدِيْثٍ بَعَدَهَا يَوْمُ مَنُوْنَ ﴿٤٠﴾

”اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے تو کون بیان ہے اس کے بعد جسے سن کر وہ ایمان لائیں۔“

رکوع سے مراد وہ احکام خدا و رسول کے سامنے جھکنا ہے، اگر وہ آخرت کو نہ جھٹلاتے ہوتے تو اُن کے عملی تقاضوں کو پورا کرتے اور احکام خدا و رسول کے سامنے جھکتے، مگر وہ تو آخرت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے لہذا وہ ان احکام کے سامنے جھکتے بھی نہیں، لہذا اُس کا نتیجہ وہی ”وائے“ ہے جس کا مطلب ہے تباہی و بربادی۔ آخر میں کہا گیا ہے کہ قرآن اتنے واضح طور پر ان حقیقتوں کو پیش کر رہا ہے، اب اس کے بعد بھی یہ لوگ اس کو قبول نہیں کرتے تو وہ کون سا کلام ہو سکتا ہے جو ان کے سامنے آئے اور یہ اس کے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں۔

# سُورَةُ النَّبَاِ

مکیہ ..... ۴۰ ..... آیات

پہلی ہی آیت میں النبأ العظیمہ ایک خاص بڑی خبر کا ذکر ہے، اس لئے اس کا یہ نام ہوا۔  
 نبأ یعنی خاص خبر سے مراد وہی قیامت کی خبر ہے جس کا منوانا اس کی زندگی کے سوروں کی بڑی مہم ہے اور اُس کے منکروں سے بحث، اُن کی شبہات کا دفعیہ ہی ان سوروں کا خاص موضوع ہے۔ اس ذیل میں وہی خداوند عالم کی قدرت کے کرشمے اور اس کے مخلوقات صنائع کی طرف توجہ دہانی جس سے ایک ساتھ مبدأ اور معاد دونوں پر روشنی پڑتی ہے یعنی مستحق عبادت وہ خدا ہے جس نے یہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔ نہ کہ تمہارے اصنام جو ان میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے..... درمیان میں رسول کی سچائی اور قرآن کی حقانیت پر توجہ دلائی گئی ہے اور آخر میں روز قیامت منکروں کی بے بسی اور عاجزی پر سورے کو ختم کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۱ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۲ الَّذِي هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُونَ ۳ كَلَّا

سَيَعْلَمُونَ ۴ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۵

”یہ لوگ کاہے کے بارے میں باہم سوال و جواب کر رہے ہیں؟ اس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق وہ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہوگا، پھر (سنو) ہرگز نہیں عنقریب انہیں معلوم ہوگا۔“

## خاص بڑی خبر کا ذکر

یوں تو لفظ نبی ہی اکثر کے نزدیک جو اس لفظ کو آخر کے ہمزے کے ساتھ پڑھتے ہیں، نبأ سے مشتق ہے جس کے معنی خبر کے ہیں اور رسول کا پیغام تمام تر اخبار غیبیہ ہی سے تعلق رکھتا ہے جس میں خدا، ملائکہ اور تمام کارگاہ قیامت سب غیب ہی کی خبریں ہیں جو انہیں سنائی جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت سب سے بڑی موضوع بحث چیز اُن کے لئے وہی آخری چیز یعنی موت کے بعد دوسری زندگی اور قیامت اپنے اُن تفصیلات کے ساتھ جنہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بتاتے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جا رہا ہے کہ آخر یہ کون سی ایسی بات ہے جس میں اس قدر ”چہ گویاں“ ہو رہی ہیں..... انکار کی تو تمہارے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے بلکہ اُس کے وقوع کے شواہد جو بڑے ذہن نشین ہیں تمہارے سامنے پیش

ہوتے ہیں مگر تم نہیں مانتے..... تو نتیجہ کا انتظار کرو..... ایک وقت میں تم سب اُسے آنکھوں سے دیکھ لو اور پھر اُس کے منکروں کا اسی دنیا میں کیا انجام ہوتا ہے، اس کے دیکھنے کے لئے بھی تیار رہو۔ ممکن ہے اور پھر عنقریب معلوم ہوگا۔ ان دونوں کی طرف اشارہ ہے۔

الْمُ نَجَعِلِ الْاَرْضَ مِهْدًا ۝۱۱ وَ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۱۲ وَ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝۱۳  
وَ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۱۴ وَ جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۵ وَ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۶  
وَ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۷ وَ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَ نَهَارًا ۝۱۸ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ  
الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَمَّاجًا ۝۱۹ لِيُنْخَرِجَ بِهِ حَبًّا وَ نَبَاتًا ۝۲۰ وَ جَنَّاتٍ الْفَاوَّاحِ ۝۲۱

”کیا ہم نے زمین کو گوارہ راحت نہیں بنایا اور پہاڑوں کو منخوں کی صورت قائم نہیں کیا، اور تمہیں دو صنفوں (مرد اور عورت) کے جوڑوں کی شکل میں پیدا نہیں کیا اور تمہاری نیند کو یکسوئی کا ذریعہ بنایا اور رات کو پوشاک اور دن کی تحصیل روزی کا ذریعہ بنایا اور تم پر سات مضبوط آسمان بنائے اور ایک بہت تپش اور روشنی سے بھرا ہوا چراغ پیدا کیا اور اپنے اندر سے نچوڑ نچوڑ کر موسلا دھار پانی برسانے والے ابر بنائے تاکہ اُن سے اناج کے دانے اور سبزیاں اور گھنے ہوئے باغ لگائیں۔“

جس نے یہ سب کارخانہ تمہارے ضروریات کے بالکل مطابق خلق کیا ہے، وہی کسی وقت اس نظام کو بدل دے اور اس پوری دنیا کو فنا کر دے تو تمہیں اس میں تعجب کیوں ہے؟

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝۲۲ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ اَفْوَاجًا ۝۲۳  
وَ فَتَحَتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝۲۴ وَ سِيَّرَتِ الْجِبَالَ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝۲۵ اِنَّ جَهَنَّمَ  
كَانَتْ مِرْصَادًا ۝۲۶ لِلظَّالِمِيْنَ مَاۡبِآءًا ۝۲۷ لِبِئْسَ لِيۡثِيۡنَ فِيۡهَا اَحْقَابًا ۝۲۸ لَا يَذُوۡقُوۡنَ  
فِيۡهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝۲۹ اِلَّا حَمِيۡمًا وَّعَسَاۗءًا ۝۳۰ جَزَاءً وَّ فَاۡقًا ۝۳۱ اِنَّهُمْ كَانُوۡا اِلَّا يَزۡجُوۡنَ  
حِسَابًا ۝۳۲ وَ كَذَّبُوۡا بِآيٰتِنَا كِذَّابًا ۝۳۳ وَ كُلَّ شَيْۡءٍ اَحۡصٰىنَا كِتٰبًا ۝۳۴ فَذُوۡقُوۡا فَلَٰنَ  
تَزِيۡدُكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝۳۵

”یقیناً فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے، جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم لوگ آؤ گے فوج در فوج اور آسمان کھل جائے گا تو ہو جائے گا وہ بہت سے دروازوں کی صورت سے اور پہاڑ حرکت میں آجائیں گے تو وہ مثل پانی کی طرح چمکتی ہوئی بالو کے ہو جائیں گے، یقیناً دوزخ اُن کی گھات میں ہے جو ان سرکشوں کا آخری انجام ہے جس میں وہ

مدتوں رہیں گے، اس میں نہ وہ چکھیں گے کسی ٹھنڈک کا مزہ اور نہ پینے کی کوئی چیز سوا گرم پانی اور زخموں کے مواد کے۔ یہ اُن کے کئے کا حسب حال بدلہ ہے، یہ لوگ حسابِ آخرت کے سامنے آنے کا کوئی تصور نہ رکھتے تھے اور انہوں نے ہماری آیتوں کو پوری طرح جھٹلایا اور ہر چیز کو ہم نے ایک نوشتے میں گھیر دیا ہے تو چکھو اس کا مزہ کہ ہم تمہارے لئے تمہارے عذاب کو بڑھاتے ہی رہیں گے۔

جب گزشتہ آیات میں نظم کائنات اور انسانی ضروریات حیات کو پورا کرنے کے لئے تمام کارخانہ قدرت کے انتظامات پر توجہ دلا کر اللہ کی قدرت و حکمت پر روشنی ڈال دی گئی تو اب پھر اصل موضوع سورہ یعنی قیامت کے ذکر کو شروع کر دیا گیا کہ وہ فیصلے کا دن ہے، وہ جب آجائے گا تو تمہاری التجاؤں سے پھر نکل سکے گا۔ اب چونکہ صور بھی از روئے قرآن ایک سے زیادہ ہیں اور یہاں مطابق صور کہا گیا ہے کہ جب پھونکا جائے گا تو یہ ہوگا اور یہ ہوگا لیکن اس میں ترتیب ذکر کے مطابق ترتیب واقعہ ضروری نہیں ہے اس لئے لازم نہیں ہے کہ جس بات کو پہلے کہا گیا ہے، وہ پہلے ہو اور جسے بعد میں کہا گیا ہے وہ بعد میں ہو۔ بہر حال یہ سب باتیں صور پھونکے جانے کے بعد ہونا ہیں۔ قبروں سے نکل نکل کر موقف حساب میں آنا بظاہر بعد کی منزل ہے اور عام تباہی و بربادی جس میں پہاڑوں کی یہ حالت ہوگی اور آسمان کی یہ کیفیت ہو جائے گی۔ یہ شاید اس کے پہلے وقوع میں آنے والے حالات ہیں، قرآن اور حدیث سے تو پہلے بھی آسمان میں راستوں اور دروازوں کا ہونا سمجھ میں آتا ہے یہ اور بات ہے کہ اُن کی پوری نوعیت ہم نہ سمجھ سکیں۔ اب یہاں جو ”دروازے“ کہے گئے ہیں۔ تو جو دوسرے مقامات پر مجمل طور سے شگافتہ ہونے کا آسمان کے ذکر ہے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ایک جگہ سے شگافتہ نہیں بلکہ بکثرت دراڑیں ہوں گی اور شگافتہ ہوں گے۔ جنہیں دروازوں کی شکل میں سمجھنا چاہیے۔

اب جب کہ آسمان کو یقینی طور پر مان لیا گیا کہ کوئی ٹھوس جسم نہیں بلکہ فضا اور خلا ہے تو اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ آسمانی بلائیں ٹوٹ پڑیں گی کہ کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی اور ہر طرح کی آفتوں کے دروازے کھل جائیں گے اور پہاڑ اپنی جگہ سے اڑاڑ کر منتشر ہو جائیں گے۔ اُن کی جگہ سپاٹ زمین ہو جائیگی۔ جیسے وہ بالو جو پانی کی طرح چمکتی ہے اور قریب جا کر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ہے ویسے ہی پہاڑ بے حقیقت بن جائیں گے اور اُن کی جگہ زمین ہی زمین ہو جائیگی، دوزخ گھات میں ہے یعنی بس صور پھونکے جانے کا انتظار ہے اور اس کے بعد اُن دوزخیوں کو دوزخ میں جانا ہے جن کا گویا دوزخ کو انتظار ہے اور وہ آخری سر نوشت جو اُن لوگوں کی جسے ”مآب“ کے لفظ سے ظاہر کیا گیا کہ آخری اور مختتم ٹھکانا ان کا وہی ہوگا۔ ”مذتوں“ رہیں گے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مدتیں کبھی ختم ہو جائیں گی بلکہ انہیں اگر تقسیم کیا جائے طولانی حصوں پر تو ہر حصہ کے بعد ایک دوسرا حصہ شروع ہو جائے گا اور یونہی یہ سلسلہ قائم و برقرار رہے گا ہوں وہ جنہیں عبوری مدت کے لئے سزا دی گئی ہو، اُن کے لئے دوزخ کے قیام کی اتنی مدت گزارنے کے بعد پھر وہاں سے منتقل کر دیا جائے گا۔ نہ وہ چکھیں گے کوئی ٹھنڈک کا مزہ یعنی سایہ میں جو ذرا سکون محسوس ہوتا ہے وہ بھی انہیں نصیب نہ ہوگا اور پینے کے لئے کوئی چیز سوا گرم پانی اور زخموں کے مواد یا دھوون کے سوا انہیں نہ ملے گا۔ ان کے دو ۲ جرم ہیں ایک یہ کہ خود اپنی جگہ بھی انہوں نے بھی یہ نہیں سمجھا کہ ایک دن ایسا درپیش ہو سکتا ہے جب ان اعمال کا محاسبہ ہو اور اس طرح آخرت نام کی کسی چیز کا تصور ہی نہیں کیا اور دوسرے یہ کہ انہوں نے انبیاء کی خبروں کی جن میں انہیں اس سب کی اطلاع دی گئی تھی، سن کر بھی نہیں مانا اور انہیں جھوٹا کہتے رہے۔ پھر یہ سمجھتے رہے کہ اس وقت کی سب باتیں ہماری آئی گئی ہو جائیں گی اور کبھی ان کی جواب دہی نہیں ہوگی، حالانکہ ہماری طرف سے کوئی نامہ اعمال میں ان کے برابر وہ درج ہوتی رہیں اور کوئی بات چھوٹی نہیں جو اس میں درج نہ ہو، اب چکھو اسے تمہارے عذاب میں برابر اضافہ ہی ہوتا ہے گا، یعنی اب لاکھ تو بہ تلاً کرو، منت و سماجت کرو، اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ عذاب کی شدت اور گونا گونی میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝۱۱۱ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ۝۱۱۲ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۝۱۱۳ وَكَأْسًا دِهَاقًا ۝۱۱۴

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِدَابًا ﴿٣٦﴾ جَزَاءٌ مِّن رَّبِّكَ عَطَاءٌ حِسَابًا ﴿٣٧﴾ رَبِّ

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَنُ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٨﴾

”بلاشبہ پرہیز گاروں کے لئے کامیابی ہے باغ اور انگور کی بیلیں اور نوخیز ہم عمر حوریں اور لبریز جام، وہاں وہ نہیں سنیں گے مہمل قسم کی گفتگو اور جھٹلانا، یہ صلہ ہے تمہارے مالک کی طرف کا بطور عطیہ ان کے حسب حال، وہ جو آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا مالک ہے جس کی ہیبت سے بات کرنے تک کی انہیں قدرت نہیں ہے۔“

پہلے قسم کے لوگوں کے تقابل کے لحاظ سے جن کا حال یہ تھا کہ انہیں حساب و کتاب کا کوئی تصور نہ تھا اور جنہوں نے آیات الہی اور انبیاء کے تملیغات کو جھٹلایا تھا۔ اب یہ پرہیز گار لوگ وہ ہیں جنہوں نے اس دن کا تصور رکھا اور اپنے اقوال و اعمال سے اس کا ثبوت دیا، یہ مختصر طور پر ان کے حسن انجام اور عطیائے پروردگار جو ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی جزا کے طور پر ان کے درجہ ایمان و عمل کے تناسب سے عطا ہوئی ہے بیان ہے..... وہاں نہ لغو یعنی مہمل باتیں انہیں سنائی دیں گی اور جھٹلانا۔ یہاں اصل قرآن میں کذاب کا لفظ ہے..... اسے بعض نے کذب کے ہم معنی کہا ہے لیکن دوسرے لوگوں نے اس کے معنی تکذیب کے کہے ہیں۔ ہم نے ترجمہ اُس کے مطابق کیا ہے۔ یعنی وہاں یہ نہیں ہوگا کہ ایک دوسرے کی بات کو رد کرے اور جھوٹا سمجھے۔ [۱] اس میں ایک اشارہ اس طرف ہو سکتا ہے کہ دنیا میں انہوں نے یہ اذیت بھی بہت اٹھائی ہے کہ ان کی باتوں کو جھوٹا کہا جاتا تھا..... اب آج اس طرح کی اذیت سے انہیں دوچار ہونا نہیں ہے، آج کوئی ان کی بات کو جھوٹا کہنے والا نہیں ہے۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ﴿٣٩﴾ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ

وَقَالَ صَوَابًا ﴿٤٠﴾ ذَلِكَ الْيَوْمَ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ مَا بَاءًا ﴿٤١﴾ إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ

عَذَابًا قَرِيبًا ﴿٤٢﴾ يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكٰفِرُ يَلَيْتَنِي

كُنْتُ تُرَابًا ﴿٤٣﴾

”جس دن فرشتے اور روح صف باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے، وہ بات نہیں کریں گے مگر وہ جسے خدائے رحمن کی اجازت ہو اور ٹھیک بات کہے، وہ دن بالکل حقیقت ہے، تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف پلٹنے کا سامان کر رکھے، ہم نے تمہیں ڈرا دیا اُس قریبی عتاب سے، جس دن آدمی دیکھے گا کہ اُس کے ہاتھوں سے کیا کیا ہوا اور کافر کہے گا کہ کاش میں خاک ہوتا۔“

روح سے مراد جبرئیل امین ہیں یا کوئی بڑا ہم فرشتہ جس کا ذکر دوسرے فرشتوں سے الگ بنظر خصوصیت کیا گیا ہے، اس پر سورہ معارج کی تفسیر میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہاں پہلے الملائکہ کا لفظ ہے اور پھر روح کا..... اور یہاں الرُّوح پہلے ہے اور ملائکہ بعد کو ہے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے کوئی خاص فرق نہیں۔

[۱] ای لا تکذیب بعضهم لبعض..... وقیل کذباعن ابی علی الفارسی (مجمع البیان)

# سُورَةُ النَّازِعَاتِ

مکیہ ..... ۴۶ ..... آیات

سورے کا پہلا ہی لفظ النَّازِعَاتِ ہے، اس لئے سورے کا یہ نام ہوا۔

اس سورے میں بھی قسمیں کھانے کے بعد وہی قیامت کے آنے اور اُس کی تباہی و بربادی کا ذکر ہے۔ درمیان میں حضرت موسیٰ کا ذکر ہے اور فرعون نے جو اُن کو جھٹلایا اور انہیں مقابلہ کرا کے شکست دینے کی کوشش کی، اس کا کیا انجام ہوا، اس کے تذکرے کے ساتھ اس وقت کے رسول خدا کے مقابلہ میں مخالف طاقتوں کے انجام کی طرف اشارہ ہے، اور پھر اللہ کے صنایع و بدائع کا تذکرہ کر کے اُس کی قدرت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں قیامت کا وقت پوچھنے والوں کو یہ انتباہ ہے کہ اس منزل کو دور نہ سمجھنا چاہیے۔ تم تو اُسے اتنا نزدیک سمجھو جتنا آج کے بعد کل کا دن۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَالزُّعْفَرَانُ ۱ وَاللشَّيْطَانُ نَسْفًا ۲ وَالسَّبْحِ ۳ فَالسَّبْحِ ۴

سَبْقًا ۵ فَالْمَدْبِرَاتِ ۶ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۷ تَتَّبِعَهَا الرَّادِفَةُ ۸

”قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو جسوں کے اندر سرایت کر کے روجوں کو کھینچتے ہیں اور ان جانوں کو آسانی کے ساتھ نکل لے جاتی ہیں اور جو احکام الہی کی تعمیل میں تمام اطراف میں یوں رواں دواں ہیں جیسے وہ تیر رہے ہیں اور جو تیزی کے ساتھ سبقت کرنے والے ہیں اور تمام انتظامات کائنات کے کاموں کا بندوبست کرنے والے ہیں جس دن ایک بڑا زلزلہ آجائے گا اور اُس دن کے بعد ہنگامہ خیز مصیبت رونما ہوگی۔“

اگرچہ ہر لفظ میں بہت بہت سے اقوال ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ ذہن نشین مفہوم یہی ہے۔ جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے، بے شک والمرسلات میں اس قول کو کہ اس سے فرشتے مراد ہیں، ہم نے اس بنا پر رد کیا تھا کہ یہاں جمع مؤنث سالم کی ضمیریں صرف کی گئی ہیں اور فرشتوں کے لئے مشرکین کا تصور یہ تھا کہ وہ عورت ہیں لہذا قرآن مجید کے ان الفاظ کو اُن پر محمول نہیں کیا جاسکتا مگر اب یہاں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہی لئے جائیں اور چونکہ محاورے میں اُن کے لئے اسی طرح کے الفاظ اہل عرب میں مستعمل ہوتے تھے اس لئے ان کے واسطے یہی الفاظ صرف کردئے گئے ہیں جب کہ صراحتاً دوسری جگہ ان مشرکین کے قول کی رکاکت ظاہر کر دی گئی ہے کہ انہیں عورت سمجھنا اور انہیں خدا کی بیٹیاں کہنا غلط ہے وہر اجفۃ زلزلہ اور ادفۃ بعد والی مصیبت یوں دونوں سے مراد شاید پہلے اور دوسرے صورتوں اور اُن سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی مراد ہے۔

قُلُوبٍ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝۸ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝۹ يَقُولُونَ ءَاِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي  
الْحَافِرَةِ ۝۱۰ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا مَّخْجَرَةً ۝۱۱ قَالُوا اتِّلِكِ اِذَا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝۱۲ فَاِنَّمَا هِيَ  
رَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴

”کچھ دل اس دن لرز رہے ہوں گے نگاہیں ان کی جھکی ہوئی ہوں گی، وہ کہیں گے کہ کیا ہم پہلی ہی صورت  
میں دوبارہ لائے جائیں گے، انہوں نے پھر کہا کہ یہ واپسی تو بڑے خسارے کی بات ہوگئی، حالاں کہ بس ایک  
پرزور ڈانٹ پڑے جس کے بعد کھلے ہوئے قیمت کے میدان میں وہ کھڑے ہوں گے۔“  
وہ صورت کی آواز ہے جسے یہاں ”ڈانٹ“ کہا گیا ہے یا یہ پراثر حکم الہی کی تعبیر ہے۔

هَلْ اَتَيْتَكَ حَدِيثُ مُوسٰى ۝۱۵ اِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶ اِذْ هَبَّ اِلَى  
فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰى ۝۱۷ فَقُلْ هَلْ لَكَ اِلٰى اَنْ تَزْكٰى ۝۱۸ وَاَهْدِيْكَ اِلَى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝۱۹  
فَاَرٰهُ اٰيٰةَ الْكُبْرٰى ۝۲۰ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝۲۱ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝۲۲ فَخَشَرَ فَنَادٰى ۝۲۳  
فَقَالَ اِنَّا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝۲۴ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاٰوَلٰى ۝۲۵ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ  
لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۲۶

”کیا تمہیں موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اُن کے پروردگار نے انہیں مقدس طوبیٰ کی وادی میں  
پکارا جاؤ فرعون کی طرف کہ یقیناً اس نے سرکشی کی ہے اور اس سے کہو کہ کیا تجھے منظور ہے کہ پاکیزگی کا راستہ اختیار  
کرے اور میں تجھے تیرے پروردگار کی راہ بتاؤں تو تو اس کا ڈرا اپنے دل میں پیدا کرے تو انہوں نے  
(جا کر) اسے بہت بڑی نشانی دکھائی تو اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی، پھر پلٹا اور ان کی مخالفت میں سرگرمی  
دکھانے لگا اس طرح کہ اس نے مجمع کیا اور بلند آواز میں کہا کہ میں بہت بڑا تمہارا پروردگار ہوں، تو اللہ  
نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب گرفت میں لے لیا، یقیناً اس میں عبرت کا سرمایہ ہے اس کے لیے جو ڈرے۔“

اس میں مختصر طور پر جناب موسیٰ اور فرعون کی رواندسنائی گئی ہے۔ تفصیلات قرآن مجید کے دوسرے سوروں میں مذکور ہیں۔ فرعون کی  
سرکشی میں اُس کے تمام مظالم جو بنی اسرائیل پر تھے وہ مضمحل ہیں اور دعوائے خدائی تو یہاں بڑی صراحت اور شدت کے ساتھ مذکور ہے نشانیاں  
یعنی معجزات حضرت موسیٰ کو جو عطا ہوئے ان کی تعداد ایک جگہ قرآن مجید میں نو (9) بتائی گئی ہے۔ یعنی سب سے بڑی نشانی سے مراد ان کے عصا کا  
اڑدھابن جانا ہے اور ساحروں نے اپنی رسیوں اور لٹھیوں سے جو سانپ بنائے تھے اس عصا کا اڑدھابن کرنگل جانا اور حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں  
آنے کے بعد پھر اس کا مثل سابق عصا بن جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معجزہ ہونے میں کسی قدیم یا جدید منکر کی دھاندلی سوا عناد اور سرکشی کے اور کچھ

نہیں ہو سکتی اور اس پر طرہ جو اپنی شکست کو مٹانے کے لیے انار بکھرا الا علی کے کھوکھلے نعرے کا بلند کرنا ہے۔ دنیا کا عذاب ہے غرق کی صورت میں سب کے سامنے آگیا اور آخرت کے عذاب کا تصور وہی کریگا جو اس عذاب سے عبرت حاصل کرے۔

ء اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اِمَّ السَّمَاءِ ط بِنْدَهَا ٢٤ رَفَعَ سَمَكَهَا فَسَوَّبَهَا ٢٥ وَاَعْطَشَ  
لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ صُحْبَهَا ٢٦ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ٣٠ اَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا  
وَمَرَّ عَلَيْهَا ٣١ وَالْجِبَالَ اَرْسَهَا ٣٢ مَتَاعًا لَكُمْ ٣٣ وَلَا نَعَامِكُمْ ٣٤

”کیا تم لوگوں کا پیدا کرنا زیادہ سخت مشکل کام ہے یا آسمان جس کو اس نے بنایا، اس کی چھت کو اونچا کیا اور اس میں توازن قائم کیا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اُس کے دن کو نمودار کیا، اور اُس کے بعد زمین کا بچھونا اس نے بچھایا۔ اُس میں اُس کا پانی برآمد کیا اور چرنے کے قابل نباتات نکالے اور پہاڑوں کو جمادیا تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زندگی کے طور پر۔“

جب تک کہ کارگاہ عالم بالا کے کیفیات کا انکشاف نہیں ہوا تھا، الفاظ قرآن کے یہی معنی سمجھے جاتے تھے کہ ایک مجسم عمارت ہے جو بغیر ستونوں کے قائم ہے جس کی یہ چھت نیلی نیلی نظر آتی ہے لیکن جب دور بینوں اور خلائی سفروں سے کچھ ادھر کے کیفیات کا علم ہوا تو پتہ چلا کہ اس طرح کی کوئی عمارت نہیں ہے تو اب الفاظ قرآنی کی تشریح یہ سمجھ میں آنے لگی کہ عالم بالا میں جتنے ستارے، سیارے شمسی نظام اور بے شمار کہکشاں ہیں ان تمام کو سماء یعنی آسمان کی لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اسی کو کہا گیا ہے کہ اس پورے نظام کا قائم کرنا زیادہ مشکل کام تھا یا تمہیں دوبارہ پیدا کرنا تو جو خدا اس پر قادر تھا، وہ کیا تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے؟ رات اور دن کی نسبت آسمان کی طرف اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ اس کے سورج غروب سے یہ دونوں تبدیلیاں ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ زمین کو آسمانی نظام کی تکمیل کے بعد کہنا ”ترتیب واقعہ کے اظہار کے لیے نہیں ہے بلکہ ”ترتیب ذکر“ کے طور پر ہے کہ وہ سن چکے، اب یہ سنے۔ اگرچہ بحیثیت واقعہ دنوں باتیں ایک ساتھ یا یہ اس کے پہلے ہوئی ہو۔ چرنے کی لفظ کا استعمال عموماً جانوروں کے لیے ہوتا ہے لیکن کبھی حقیقی طور پر نہ سہی مجازی حیثیت سے انسان کے لیے بھی نباتات سے غذا حاصل کرنے کے لیے ہو سکتا ہے جب کہ اس کی صورت شروع زمانے میں یہی تھی کہ جنگلوں اور باغوں میں گردش کر کے وہاں کے نباتات سے پیٹ پالے۔ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس کے صنعتوں کی یاد آوری سے جس طرح اس کی قدرت کا دکھلانا ہے، اسی طرح حکمت کا بھی کہ اس نے جو چیز پیدا کی ہے ہیں جب وہ سب بامقصد ہیں تو یہ انسان بے مقصد کیوں کر ہو سکتا ہے لہذا ایک دن یہ محاسبہ بھی ہونا چاہیے کہ اس نے اس مقصد کو پورا کیا یا نہیں پہلا امر یعنی قدرت پر نظر سے امکان معاد ثابت ہوتا ہے اور دوسرے امر سے ضرورت معاد۔

فَاِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَى ٣٥ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعَى ٣٦ وَبُرِّزَتِ  
الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّزِي ٣٧ فَاَمَّا مَنْ طَغَى ٣٨ وَاَثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ٣٩ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ  
الْبَاوِي ٤٠ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ٤١ فَاِنَّ الْجَنَّةَ



## هِيَ التَّائِيَاتِ ٣١

”تو جب وہ عظیم آفت آئے گی جس دن آدمی یاد کرے گا کہ اس کی سرگرمی کیا رہی اور دوزخ سامنے آجائے گا دیکھنے والے کو تو جو شخص سرکشی کرتا رہا اور اس نے دنیوی زندگی کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا مستقبل ٹھکانا ہے اور جس نے اپنے پروردگار کے یہاں کی حضوری کا ڈر رکھا تھا اور اپنے کو نفسانی خواہشوں سے روکے رکھا تو بہشت اس کا مستقبل ٹھکانا ہے“؟

اب آدمی اپنے سابق میں کیے ہوئے ہر طرز عمل کو یاد کرے گا اور دوزخ جسے کانوں سے سنتا رہا تھا، اب ایک مشاہدہ میں آنے والی حقیقت بن کر سامنے ہوگا تو جس نے اپنے پروردگار سے سرکشی کی اور آخرت کے مقابلہ میں ہمیشہ دنیا کے مفادات کے پیچھے لگا رہا اس کے مستقبل قیام کی جگہ اب دوزخ ہے اور جس نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑے ہونے کا اندیشہ سامنے رکھا تھا..... ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اپنے پروردگار کی شان عظمت و جلال اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا خیال دل میں رکھا تھا اور اپنی خواہشوں کے مقابلہ میں اس کے احکام کی پابندی کو ہمیشہ مقدم سمجھا تھا، اس کے لیے بہشت مستقل محل اقامت ہوگا۔ یہی دو (۲) طرز حیات ہیں جن کا محاسبہ ہونا ہے اور انہیں کے مطابق جزا و سزا ملنا ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۗ فِيمَا أَنْتَ مِنْ ذِكْرِهَا ۗ إِلَىٰ رَبِّكَ  
مُنْتَهَاهَا ۗ إِنَّهَا آتٌ مِّنْ دُونِ عَيْنِكَ لَآتِيَنَّ السَّاعَةَ ۗ كَأَنَّهُمْ يَبْرُونَهَا ۗ  
يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا ۗ

”آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کب برپا ہوگی؟ آپ کے متعلقہ کاموں میں اس کا بتانا کہاں ہے، اس کی انتہا تو بس اللہ پر ہے، آپ تو بس جو اس کا تصور رکھے اسے اس سے ڈرانے والے ہیں، یہ لوگ جب اسے دیکھیں گے تو ایسا محسوس ہوگا جیسے نہیں رہے تھے مگر ایک شام یا اس کے بعد کی صبح کا ایک پہرہ۔“

یہ پوچھنا سنجیدگی کے ساتھ واقعی اپنے علم کے لیے تو کبھی بھی نہیں تھا۔ اکثر بطور طنز یا استہزاء ہی تھا، بہر حال اگر سنجیدگی کے ساتھ بھی ہوتا تو قرآن کے رو سے اس کا جواب پیغمبر کی طرف سے ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اس کا علم بس اللہ کو ہے۔ یہاں اس کے ساتھ یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ آپ کے فرائض منصبی میں یہ ہے کہ آپ اس کے تاریخ اور وقت سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہیں۔ یہ لوگ واقعی اس کا تصور ہی نہیں رکھتے، آپ کا کام ڈرانا ہے اس کے حالات و کیفیات کو بیان کر کے جس سے خبردار تو آپ سب کو کریں گے مگر اس سے متاثر وہی ہوں گے جو اس کا تصور رکھتے ہوں اس کا تصور وہی ”مقام رب“ کا خوف ہے جسے گزشتہ آیت میں معیار نجات بتایا تھا۔ ڈرانے کو اس جماعت سے مخصوص بتانا اسی لحاظ سے ہے کہ فائدہ اس سے یہی جماعت اٹھائے گی، دوسرے لوگ تو اس ڈرانے کو بھی ہنسی مذاق میں اڑائیں گے۔

# سُورَةُ عَبَسَ

مکیہ ..... ۴۲ ..... آیات

اس سورے کا یہ نام تو سورے کی پہلی ہی لفظ کی بنا پر ہے اور بعض نے اس کا ایک دوسرا نام السفرۃ بتایا ہے۔<sup>[۱]</sup> جو بعد کی ایک لفظ کی بناء پر ہے جو تھوڑی دور پر ان آیتوں میں ہے کہ بایدی سفرۃ کو راہ ہرۃ سفیروں کے ہاتھ سے جو بزرگ مرتبہ ایک کردار ہے۔ سورے کی ابتدا ایک واقعہ سے ہے جس کا زیادہ تر مفسرین کے بیان کے مطابق جو ظاہری الفاظ قرآن کے موافق بھی معلوم ہوتا ہے خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن ایک روایت کے مطابق ایک دوسرے شخص سے ہے جو رسول کی خدمت میں اس وقت تھا اور اس نے یہ رویہ اختیار کیا تھا۔ غرض پہلی چند آیتوں کے آغاز عمل کے نامناسب ہونے پر زور دیا گیا ہے پھر منکرین اور متکبرین کو ان کے آغاز خلقت کو یاد دلاتے ہوئے سرزنش ہے کہ اسے پیش نظر رکھیں، تو وہ تکبر سے کام نہ لیں، پھر وہی پہلے اللہ کی کچھ نعمتوں کا ذکر ہے جو انسانوں کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اس کے بعد آخرت کے ہولناک دن اور پھر دو جماعتوں کی تقسیم ہے ایک جو ہشاش و بشاش ہوں گے اور ایک جن کے چہروں پر دھوئیں اڑ رہے ہوں گے۔ وہ مؤمن اور یہ کافر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۱ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی ۲ وَمَا يُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یَرٰکُمۡی ۳ اَوْ یَدَّکُرُّ  
فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی ۴ اَمَّا مَنِ اسْتَعْنٰی ۵ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدِّی ۶ وَمَا عَلَیْکَ  
الْاٰیٰتِی ۷ وَاَمَّا مَنْ جَاءَکَ یَسْعٰی ۸ وَهُوَ یَخْشٰی ۹ فَاَنْتَ عَنْہُ تَلْہٰی ۱۰

”اس نے ترش روی کی اور منہ پھیر لیا کہ اس کے پاس اندھا آگیا اور آپ کو کیا خبر، شاید وہ پاک صاف ہو جائے یا نصیحت سے اثر لے اور یہ نصیحت اسے فائدہ پہنچائے جو بے نیاز ہیں، آپ ان کے درپے ہوتے ہیں حالانکہ آپ کا کیا نقصان اگر وہ اصلاح کا اثر نہیں لیتے اور جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ انجام سے ڈرتا ہے تو آپ اس سے بے توجہی اختیار کرتے ہیں۔“

یہ ہے وہ سلسلہ آیات کا جس کا ظاہری مفہوم بھی اسی کے مطابق ہے اور عام مفسرین بھی لکھتے ہیں کہ وہ ابن ام مکتوم کے بارے میں

[۱]۔ سورۃ عبس تسبی سورۃ السفرۃ (مجمع البیان)

نازل ہوئیں کہ وہ حضرتؑ کے پاس آئے ایسے وقت جب آپ کے پاس عتبہ بن ربیعہ، ابو جہل ابن ہشام اور امیہ بن ابی خلف اور عباس ابن عبدالمطلب بیٹھے تھے اور آپ انہیں اسلام لانے کی ترغیب دے رہے تھے جسے آپ مفاد اسلامی کے لیے بہت اہم تصور فرما رہے تھے گفتگو جاری تھی۔ یہ ابن اُم مکتوم جو آئے تو بے چارے ناپینا تھے، انہوں نے یہ محسوس نہ کیا کہ یہاں کوئی اہم گفتگو ہو رہی ہے یا سلسلہ کلام جاری ہے۔ انہوں نے چیخ چیخ کر حضرتؑ کو مخاطب کر کے کچھ پوچھنا شروع کر دیا۔ حضرتؑ کو بار بار اپنی بات قطع ہونے سے اذیت ہوئی اور آثار برہمی آپ کے چہرہ مبارک پر نمودار ہوئے۔ اس کی بنا پر یہ آیات نازل ہوئے۔

علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے امام جعفر الصادق علیہ السلام سے ایک روایت درج کی ہے کہ وہ آیتیں بنی امیہ کے ایک شخص کے بارے میں اتری ہیں جو اس وقت وہاں موجود تھا اور جب ابن مکتوم آئے تو ان کے میلے کپڑوں کی وجہ سے اس نے اپنے کپڑے سمیٹے اور اظہار ناگواری کیا، اس پر یہ آیتیں اتریں۔

میں نے ایک مرتبہ ایک صاحب کو جنھوں نے ان آیات کے متعلق دریافت کیا اس کے بعد فوراً جو ہے **كَلَّا اِنَّهَا تَذٰكِرَةٌ** ہرگز نہیں ہے، یہ تو ایک نصیحت ہے، اس کلا کی لفظ سے مطمئن کیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حاشا، آپ بھلا ایسا تھوڑی کریں گے۔ یہ تو عام طور پر ایک نصیحت ہے کہ اسے یاد رکھنا چاہیے۔

دوسرے لوگ جو اسے حضرتؑ سے متعلق قرار دیتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ حضرتؑ کا عمل معاذ اللہ بر بنائے تکبر نہ تھا کہ آپ غریبوں کو ذلیل نظر سے دیکھتے ہوں اور مال دار کی عزت فرماتے ہوں بلکہ مفاد اسلامی کی خاطر تھا لہذا وہ کوئی گناہ تو نہیں تھا جو خلاف عصمت ہو لیکن خداوند عالم نے اسے ”ترک اولیٰ“ کی طرح قابل ترک قرار دیا اور اس سے بہتر طرز عمل کی ہدایت فرمائی۔

**كَلَّا اِنَّهَا تَذٰكِرَةٌ ۙ فَمَنْ شَاءَ ذَكَّرْهُ ۗ فِيْ صُحُفٍ مُّكْرَمَةٍ ۙ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ**

**بِاٰیٰتِنَاۤیِ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۙ**

”ہرگز نہیں، یہ ایک نصیحت ہے تو جو چاہے اسے یاد رکھے، وہ ایسے صحفوں میں ہے جو بڑے عزت دار ہیں بلند درجے کے پاک و پاکیزہ ہیں، ان خداوندی لکھنے والوں کے ہاتھ سے جو عزت دار نیک کردار ہیں“۔

کلام کے ایک معنی وہی ہیں جو ابھی سابق میں درج ہوئے کہ ہرگز نہیں ہے، آپ کا یہ شیوہ نہیں ہے، یہ تو ایک عام نصیحت ہے ہر داعی حق کے لیے، جو چاہے اسے یاد رکھے، دوسرے معنی عام مفسرین کے خیال کے مطابق ہیں، یہ ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو دعوت حق کے سلسلے میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کون طالب حق ہے اور حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ نہ یہ کہ کون بڑا آدمی ہے اور کس کے حق کو قبول کرنے سے حق کو فائدہ زیادہ پہنچے گا، جب کہ وہ خود اختیار حق ست بے نیازی کا ثبوت دے رہا ہے تو خود آپ کو بھی ان سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ یہ قرآن کی تعلیم ہے، بعد میں جو اوصاف ہیں وہ تو فرشتوں کے ہیں۔ لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو قرآن مکتوبی شکل میں نہیں پہنچا لہذا اس لکھے کو لوح محفوظ سے متعلق قرار دیا گیا ہے یہ عالم بالا میں جہاں بھی وہ فرشتے اسے لکھنے پر مامور ہوں اور پھر اسی کے مطابق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسے نازل کیا جاتا ہو۔

یہ اس صورت میں ہے جب سفرۃ کے معنی لکھنے والوں کے لیے جائیں لیکن اگر وہ سفیروں کے معنی میں لیے جائیں [۱] تو وہ بلا تکلف اسی تنزیل سے متعلق ہے جو رسالت مآب ﷺ پر ہوئی بس اس صورت میں اتنا ہے کہ یہاں ایک مخصوص ملک کی جو جبرئیل امین ہیں بطور ابہام جمع سے تعبیر کی گئی ہے جیسے بعض جگہ قرآن مجید میں ایک شخص کی بات کے بیان کرنے میں جمع کے صیغے صرف کیے گئے ہیں یا صحف سے مراد یہاں قرآن مجید کے ساتھ اور انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے بھی مراد لئے گئے ہیں۔ [۲]

قَتَلَ الْإِنْسَانَ مَا أَكْفَرَهُ ﴿١٤﴾ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ﴿١٨﴾ مِنْ نُطْفَةٍ ط خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ﴿١٩﴾  
ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ﴿٢١﴾ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشُرَهُ ﴿٢٢﴾ كَلَّا  
لَبِئْسَ الْقِضْمُ مَا أَمَرَهُ ﴿٢٣﴾

”لعنت ہو اس انسان پر کتنا یہ ناشکر ہے، کس چیز سے اُس (اللہ) نے اسے پیدا کیا ہے؟ نطفے سے، اس کو پیدا کیا اور اس کی تقدیر مقرر کی پھر ایک خاص راستے کی طرف اس کے چلنے میں آسانی پیدا کی پھر اسے موت دی پھر اسے قبر میں پہنچایا پھر جب چاہے اسے باہر لے آئے گا، اس سب کے بعد بھی اس نے پورا نہ کیا اسے جو اس نے حکم دیا تھا“۔

تقدیر کے دائرہ میں تو شکل و صورت، قدر و قامت، صحت و مرض اور عمر وغیرہ کی طرح اس کا کردار بھی ہے مگر کردار سے تعلق تقدیر بحد جبر نہیں ہے ورنہ شروع اور آخر میں یہ سرزنش نہ ہوتی کہ لعنت ہو اس پر کتنا یہ ناشکر ہے اور پھر یہ کہ اس نے اسے جو حکم دیا تھا وہ پورا نہیں کیا۔ اگر مجبور محض ہوتا تو یہ ملامت کیسی۔ ”ایک خاص راستے کی طرف چلنے میں سے آسانی پیدا کی جائیں“ یہ دین اور شریعت کا راستہ بھی ہے جس میں انبیاء مرسلین کے بھیجنے کے ساتھ آسانی پیدا کی اور بس زندگی کا سامان بھی داخل ہے جسے عموماً رزق کہتے ہیں۔ ملامت اسی پر ہے کہ جو ایسا صاحب اقتدار مالک، خالق اور مربی ہے، اس کے مقابلے میں اسے سرکشی تو نہیں کرنا چاہیے اور اس کے احکام سے سرتابی کا راستہ اختیار نہ کرنا چاہیے

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ﴿٣٣﴾ أَكَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ﴿٣٥﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ  
شَقًّا ﴿٣٦﴾ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ﴿٣٧﴾ وَعَيْنًا وَقَضْبًا ﴿٣٨﴾ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ﴿٣٩﴾ وَحَدَائِقَ  
غُلْبًا ﴿٤٠﴾ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ﴿٤١﴾ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ﴿٤٢﴾

”پھر انسان نگاہ کرے اپنی غذا کی طرف کہ ہم نے جیسا چاہیے پانی برسایا، پھر زمین میں شگاف پیدا کیا، پھر اس میں اگائے اناج کے دانوں اور انگور اور سبزیاں اور زیتون اور کھجور اور بڑے گھنے باغ اور پھل اور چار اسامان زندگی تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے“۔

[۱] قبیل یعنی اسفرۃ لہ بالوحی بین اللہ تعالیٰ و ہا بین رسالہ من السفارۃ (مجمع البیان)

[۲] قبیل کتب الانبیاء المنزلة علیہم کقولہ ان هذا الغی الصحف الاولی (مجمع البیان)

انہی چیزوں کی طرف قبل کے سوروں میں توجہ دلائی گئی تھی اور انہی چیزوں کی طرف اب اس سورے میں توجہ دلائی گئی کہ جس ”خدا نے تمہارے لیے یہ سب زندگی کا سامان فراہم کیا ہے، تم اس کی نعمتوں کو کیوں یاد نہیں رکھتے اور کیوں اس سے سرکشی کرتے ہو۔“ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ مکہ میں نازل شدہ سورتوں میں وہی انداز ہے جیسا ابتدائی طالب علموں کے شعبوں میں مختلف طرح بار بار کچھ باتوں کو دہرایا جاتا ہے تاکہ انہیں یاد ہوں اور ان کے ذہن میں رہ سکیں، پھر جب وہ انہیں یاد ہو جائیں گی اور ذہن نشین ہو جائیں گی تو آئندہ آگے کے سبق دیے جائیں گے۔ اللہ کی نعمتوں کا ذکر اس کی اطاعت کی تحریک کے لیے بھی ہے اور اپنے محاسبہ نفس کے لیے بھی اور آخرت کا خوف پیدا کرنے کے لیے بھی اور اس کی قدرت کو دکھا کر جو اس کے مخلوقات سے ظاہر ہے انسان کے دوبارہ زندہ کیے جانے پر استدلال کے لیے بھی جسے مشرکین ناممکن سمجھ رہے تھے یا اسے بعید خیال کرتے تھے۔

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاحَّةُ ۙ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۗ وَأُمُّهُ وَأَبِيهِ ۗ وَصَاحِبَتِهِ  
وَبَنِيهِ ۗ لِكُلِّ أَمْرٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۗ وَجُودَةٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۗ  
صَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۗ وَوُجُودَةٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۗ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۗ أُولَٰئِكَ  
هُمُ الْكٰفِرَةُ الْفَجْرَةُ ۗ

”توجہ وہ کانوں کر پھاڑنے والی آواز بلند ہوگی تو وہ ایسا دن ہوگا کہ آدمی بھاگ رہا ہوگا اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے، ہر ایک کا ان میں سے یہ عالم ہوگا کہ اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا، کچھ چہرے اس دن خوش خوش ہوں گے اور کچھ چہروں پر گردوغبار چھایا ہوگا جن پر سیاہی دوڑ رہی ہوگی۔“

بھاگنا اس معنی میں بھی کہ کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا اور اس معنی میں بھی کہ کہیں یہ سب میرے خلاف مستغیث نہ ہوں کہ میں نے ان پر مظالم کیے ہیں یا یہ کہیں میرے خلاف غلط اعمال کے گواہ نہ ہوں۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے کئی وجوہ بیان کیے ہیں اس طرح کہ:-

ای لایلتفت الی واحد من هؤلاء لعظم ما هو فیہ وشغل نفسه وان کان فی الدنیا یعنی بشانہم وقیل یفرّ منہم حذر لمن مطالبہم ایاہ بما بینہ و بینہم من التبعات والمظالم ولعلمہ بانہم لاینفعونہ ولا یغنون عنہ شیئاً ویجوز ان یکون مؤمناً واقرباً و من اهل النار فی عادیہم ولا یلتفت الیہم او یفرّ منہم لئلایری ما نزل بہم من الہون ..... (مجمع البیان) یعنی ان میں سے کسی ایک طرف بھی وہ توجہ نہیں ہوگا، اس صورت حال کی شدت کی وجہ سے جس میں وہ خود گرفتار ہے اور خود اپنی فکر کی وجہ سے حالانکہ دنیا میں اُسے اُن کی فکر ہوئی تھی اور کہا گیا ہے کہ اُن سے بھاگے گا اس خوف سے کہ یہ اس سے مطالبہ کریں گے ان کے حقوق کا جو ان کے آپس میں تھے اور مظالم کا اور پھر اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے اور ہو سکتا ہے کہ یہ مؤمن ہو اور اس کے وہ عزیز اہل دوزخ سے ہوں تو خود اسے ان سے نفرت ہوگی اور ان کی طرف توجہ نہ کرے گا یا ان سے نفرت ہو اور ان سے بھاگے تاکہ اسے آنکھوں سے دکھائی نہ دے وہ ذلت جو ان کی ہو رہی ہے۔

# سُورَةُ التَّكْوِيْرِ

مکیہ..... ۲۹..... آیات

پہلی ہی آیت میں کورت کی لفظ ہے، اس کا مصدر تکویر ہے جس کے معنی لپٹنے کے ہیں۔ یہ اس سورے کا نام ہوا۔ اس میں بھی شروع میں وہی قیامت کے سخت ہولناک حالات کا ذکر ہے اور اس سب کے بعد انسان کو یہ سوچنے کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس دن کے لیے کیا ذخیرہ چھوڑ رہا ہے۔

پھر رسول خدا ﷺ کی حقانیت اور قرآن مجید کی سچائی اور از جانب الہی ہونے کا پرزور الفاظ میں اظہار ہے اور لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اسے قبول نہ کر کے ادھر ادھر بھٹک رہے ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچنے والا بڑا مہربان ہے“

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَاِذَا النُّجُوْمُ اُنْكَدَرَتْ ۝۲ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳  
وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُوْشِرَتْ ۝۵ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶  
وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوْجَتْ ۝۷

”جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب تارے تہہ و بالا ہو جائیں گے اور جب پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیئے جائیں گے اور جب حاملہ اونٹنیوں کی فکر ختم ہو جائے گی اور جب صحرائی جانور اکٹھا ہو جائیں گے اور جب سمندر شعلہ آور ہو جائیں گے اور جب جانیں ملا دی جائیں گی۔“

سورج کے لپٹنے جانے سے مقصود یہ ہے کہ اس کی کرنیں جو ہر طرف پھیلی ہوئی روشنی پھیلاتی ہیں سب سمیٹ کر اس کے حرم میں محدود ہو جائیں گے تو چاروں طرف تاریکی چھا جائے گی۔ اُنْكَدَرَتْ کی لفظ جو ستاروں کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ اس کی ایک تشریح یہ ہوئی ہے۔ کہ جب پرندہ فضا سے ٹوٹ کر زمین کی طرف تیزی سے آئے تو کہتے ہیں تَكَدَّرَ الطَّائِرُ۔ اسی طرح ستارے اپنے اپنے محل سے ٹوٹ کر جدا ہو جائیں گے جب کہ قرآن مجید میں ابھی اس کے بعد کے سورے میں آئے گا وَاِذَا الْكُوَاكِبُ اُنْتَثَرَتْ۔ ”جب ستارے بکھر جائیں گے“ یعنی ان کا نظم ضبط ختم ہو جائے گا جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا تہہ و بالا ہو جائیں گے۔

دوسری تشریح یہ ہے کہ پانی ٹیلا ہوتا تو اسے کہتے ہیں کہ پانی مکدّر ہے تو مطلب یہ ہے کہ ستاروں کی روشنی مدہم ہو جائے گی اور وہ بے

نور ہو جائیں گے۔

”پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیئے جائیں گے“ تو پھر کیا ہوں گے؟ دوسرے مقامات پر ہے کہ ”وہ دھکے ہوئے اون کے گالوں کی طرح چاروں طرف فضا میں اڑ رہے ہوں گے اور کہیں یہ ہے کہ ”ریزوں کی طرح روشن دانوں میں بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہاتھ میں پکڑائی نہیں دیتے ایسے بے حقیقت ہو جائیں گے۔“

عربوں کا سب سے قیمتی سرمایہ اونٹ تھے لہذا وہ اونٹنی جس کے پیٹ میں بچہ ہو، اس کا بہت خیال ہوتا تھا اس وقت عام اضطراب اور بدحواسی کا عالم یہ ہوگا کہ ان اونٹیوں کو چھوڑ دیا جائے گا، ان کا پرسان حال کوئی نہ ہوگا۔

جنگلی جانور سب اکٹھا ہو جائیں گے۔ یہ عالم دہشت میں عام طور پر ان جانوروں کی فطرت ہے بلکہ یہ سب جو ایک دوسرے کے دشمن بھی ہیں سب اکٹھا ہو جاتے ہیں۔

”سمندر شعلہ آور ہو جائیں گے“ یعنی بجائے پانی کے ان میں آگ بھڑکنے لگے گی۔“

”جانیں ملادی جائیں گی“ یہ شاید اس عام تباہی کے بعد اب دوبارہ زندہ کیے جانے کا ذکر ہے کہ وہ جدائی جو موت کے بعد روح اور جسد میں ہوتی تھی اب دور ہو جائے گی اور دوبارہ ان میں اتصال ہو جائے گا بعض نے کہا ہے کہ ہر ایک کے اپنے ہم جنس کے ساتھ محسوس ہونے کا ذکر ہے۔ نیک نیکوں کے ساتھ اور بد بدوں کے ساتھ [۱] اور بعض نے کہا ہے کہ اب یہ اس کے بعد کے مرحلے کا ذکر ہے کہ بہشت میں مؤمنین کو حوروں کے قبیل سے بیویاں ملیں گی اور اہل دوزخ کو ان کے لائق ساتھ والیاں جنات اور شیاطین میں سے۔

### وَإِذَا الْمَوْءِدَةُ سُبِّلَتْ ۙ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۙ ۙ

”اور جب زندہ زمین میں دفن کی جانے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ میں اس کی جان لی گئی؟“

عرب میں جو غلط رسم رائج ہو گئی تھی کہ وہ لڑکیوں کو پیدائش کے فوراً بعد ہی یا کچھ دنوں بعد زمین میں گڑھا کھود کر اس میں گرا دیتے تھے اور اسے مٹی سے پاٹ دیتے تھے کہ وہ ہلاک ہو جاتی تھی تو اب قیامت میں الفاظ قرآنی کے معنی تو یہی ہیں کہ خود اس سے پوچھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنا استغاثہ پیش کرے تاکہ اس کے قاتل کا سراغ ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قاتل کے مقصود اس لڑکی کے بارے میں تو عربی کے لحاظ سے سُبِّلَتْ کے معنی ہوں گے سننل عنہا اس کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اس کی نظیر قرآن مجید میں یہ ہے کہ ارشاد ہوا ہے:۔ (بنی اسرائیل - ۳۴)

ان العهد کان مسئولا۔ ”عہد سے سوال کیا جائے گا؟ یعنی عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ اسے پورا کیا یا نہیں؟“

اسلام نے اس اس عمل کو گناہ عظیم ہی نہیں قرار دیا بلکہ لڑکی کی پرورش و پرداخت کے ثواب بہت بیان کیے گئے جو احادیث میں درج ہیں، یہاں تک کہ اپنے حبیب خاص کے لیے حکمت الہی نے بیٹیوں کو زندہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا مگر فاطمہ سلام اللہ علیہا ایسی بیٹی کرامت فرما کر آپ کی نسل مطہرہ کو اسی بیٹی سے دنیا میں قائم رکھا۔

[۱] ای قرن کل واحد منہما الی شکل فصتم الیہ (مجمع البیان)

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِرَتْ ۝

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُرْلِفَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۝

”اور جب نامہ ہائے اعمال کھولے جائیں گے اور جب آسمان کا پردہ چاک کیا جائے گا اور جب دوزخ بھڑکایا جائے گا اور جب بہشت نزدیک لے آیا جائے گا تو ہر نفس کو پتہ چلے گا کیا اُس نے لاکر پیش کیا ہے۔“

اب وہ منزل آگئی جب صحیفہ اعمال ہر ایک کے ہاتھ میں دیدیا گیا اور اس نے دیکھ لیا کہ اس کی کارگزاری دنیا میں کیا رہی تھی اور ”جب آسمان کا پردہ چاک کیا جائے گا“ یا تو اس کے وہی معنی میں جن کے لحاظ سے کبھی کہا گیا ہے کہ آسمان شگافتہ ہو جائے گا اور کبھی یہ کہ اس میں دروازے ہو جائیں گے یعنی درمیان کی رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی۔ اور ہر قسم کی بلائیں ٹوٹ پریں گی تو یہ پہلے ہی مرحلے کا ایک جز ہے جو تعبیر کے لحاظ سے ترتیب واقعہ اب بیان ہو گیا اور یا یہ مراد ہے کہ یہ نظام پورا بدل جائے گا جسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ شامیانہ فلک کا کھل جائے گا اور اب دوسرا آسمان ہوگا اور دوسری طرح کی زمین جب ایک جگہ قرآن مجید میں ہے: **يَوْمَ تَبْدُلُ الْأَرْضَ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتِ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ** (سورۃ ابراہیم - ۴۸) جس دن یہ زمین بدل جائے گی دوسری زمین کے ساتھ اور تمام آسمان، اور اس وقت دوزخ کے شعلے بھی سامنے نظر آرہے ہوں گے اور بہشت بھی سامنے دکھائی دے رہا ہوگا۔ دوسری جگہ ہے: **وَأُرْلِفَتْ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ وَبُرَزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَوِينَ**، ”بہشت پر ہیزگاروں کے نزدیک کر دیا جائے گا اور دوزخ بے نقاب ہوگا مگر اہوں کے لیے“ (شعراء - ۹۱، ۹۰)

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسَسَ ۝ وَالصُّبْحِ

إِذَا تَنَفَّسَ ۝ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝

مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ۝

”تو نہیں میں قسم کھاتا ہوں ان تاروں کی جو چھپتے ہیں اور چلتے اور پھر چمک کر چھپتے ہیں اور رات کی جب کہ وہ تاریک ہوئی ہو، اور صبح کی جب کہ اس کا سفیدہ نمودار ہوا ہو کہ یہ ایک معزز پیغام پہنچانے والے کی بات ہے جو طاقت والا عرش کے مالک کی بارگاہ میں عزت رکھنے والا جس کے احکام کی تعمیل ہوتی ہے اور پھر وہ امانت دار ہے اور تمہارا سابقہ جس (پیغمبر) کے ساتھ ہے یہ دیوانہ نہیں ہے اور اس نے اسے کھلی ہوئی روشن فضا میں دیکھا ہے۔“

لاکوزاندہ نہ مانتے ہوئے ہر جگہ اس نفی کا تعلق مشرکین کے اُس مزعومہ کے ساتھ ہوتا ہے جس کے مقابلے میں اُن کی بات کو رد کرتے ہوئے اصل حقیقت پر قسم کھائی گئی ہے۔ یہاں چونکہ بعد کو یہ ہے کہ یہ قرآن ایک معزز فرشتے کے ذریعے سے جس کے اوصاف بعد میں بیان کیے گئے پیغمبر خدا ﷺ کو پہنچتا ہے اور یہ پیغمبر معاذ اللہ دیوانہ نہیں ہے..... اور پھر بعد میں آئے گا کہ وہ کسی شیطان کے ذریعے سے نہیں پہنچتا ہے تو اس نفی کا تعلق انہی دو جملوں کے ساتھ ہوتا ہے، ایک حضرت گو معاذ اللہ مجنون سمجھنا اور اس قرآن کو شیطانی کارگزاری کا نتیجہ سمجھنا..... اس کے مقابلے میں قسموں کے ساتھ جو بات کہی گئی وہ اصل حقیقت ہے کہ اسے یہ فرشتہ خدا کی طرف سے رسول خدا ﷺ تک پہنچاتا ہے۔ اسے اس پیغام



پہنچانے والے کا قول کہنا اس اعتبار سے ہے کہ وہ رسول خدا ﷺ تک اس کے ذریعے سے پہنچتا ہے اور اس لیے اس فرشتے کو یہاں رسول کی لفظ سے یاد کیا ہے کہ وہ جو پہنچاتا ہے وہ درحقیقت اللہ کا پیغام ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ اس کی نسبت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف اس اعتبار سے دی گئی ہے کہ وہ عامہ خلاق تک آپ کے ذریعے سے پہنچتا ہے ورنہ حقیقت میں نہ وہ آپ کا کلام ہے، نہ جبرئیل امین کا بلکہ وہ خالق متعال کا کلام ہے جو ان کے ذریعے سے پیغمبر خدا ﷺ تک پہنچتا ہے اور آپ کے ذریعے سے دوسروں تک۔

جبرئیل امین کے لیے جو مطاع کی لفظ استعمال کی گئی ہے کہ ان کا احکام کی تعمیل ہوتی ہے اس سے جیسا کہ بعض اہل نظر نے استفادہ کیا ہے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جیسے جناب عزرائیل ملک الموت کا ایک عملہ ہے جو اکثر ان کے حکم سے قبض ارواح کے لیے چلا جاتا ہے، اسی طرح جناب جبرئیل امین کے لیے ان کے دائرہ عمل میں ایک عملہ ہے جو اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پاس بشارت فرزند کے لیے کئی فرشتے آئے تھے جو ان کے مہمان ہوئے تھے اور پھر وہ قوم لوط کی طرف عذاب نازل کرنے کے لیے گئے تھے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٣٧﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٣٨﴾ فَاَيْنَ تَذٰهَبُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٠﴾ لِيُنْشَاَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٤١﴾ وَمَا تَشَاؤُنْ وَاِلَّا اَنْ يَّشَاَءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٢﴾

”اور یہ غیبی باتوں (کے پہنچانے) میں کجوس نہیں ہیں اور وہ کسی مردود شیطان کا قول نہیں ہے تو تم لوگ کدھر جا رہے ہو یہ نہیں ہے مگر ایک نصیحت تمام دنیا جہاں کے لیے اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہیے اور تم ایسا نہیں چاہو گے، جب تک اللہ نہ چاہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔“

یعنی صرف اس لیے کہ تم لوگ مذاق اڑاؤ گے یا ان باتوں کے پہنچانے سے ناگواری محسوس کر کے انہیں طرح طرح کی اذیتیں دو گے وہ ان غیبی حقیقتوں کے پہنچانے میں کمی نہیں کریں گے اور تمہارا یہ سمجھنا کہ معاذ اللہ کوئی شیطان انہیں یہ باتیں سکھاتا ہے جو یہ دنیا تک پہنچاتے ہیں بالکل غلط ہے۔ بھلا شیطان ایسے بلند اخلاقی تعلیمات پہنچانے کا درپے کیوں کر ہو سکتا ہے اس کا کام تو گمراہ کرنا ہے ہدایت کی باتیں اس کی وسوسہ انگیزی کا نتیجہ کہاں ہو سکتی ہے بہر حال ان کا کام نصیحت کرنا ہے۔ اور وہ نصیحت سب کو کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جنہیں فائدہ اٹھانے کی خواہش ہوگی اور یہ خواہش بھی ان کی اسی وقت ہوگی جب توفیق الہی شامل حال ہو جو صلاحیت دیکھ کر شامل حال ہوتی ہے۔

# سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ

مکیہ..... ۱۹..... آیات

پہلی ہی آیت میں انفطرت کی لفظ کا مصدر انفطار ہے وہی اس کا نام ہوا۔

اس سورے کا انداز بالکل سورہ تکویر کا سا ہے۔ شروع میں کچھ احوال قیامت، اعمال گزشتہ کا ہر ایک کے سامنے آجانا، نعمت وجود اور ابتدائی خلقت کو یاد دلانا کہ اس کے کرم و احسان کے مقابلہ میں تمہارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اور جب کہ تمہارا رویہ اس کے خلاف ہے تو اس کے محاسبے اور مواخذہ کا کوئی وقت ہونا چاہیے۔ اس دن نیکو کاروں کا عالم اور ہوگا اور بدکاروں کا انجام دوسرا ہوگا۔ کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا بس اللہ کا اختیار و اقتدار کا فرما ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِذَا السَّمَاءُ اِنْفَطَرَتْ ۙ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ اُنْتَثَرَتْ ۙ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ

وَاِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۙ عَلِمْتَ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاٰخَرَتْ ۙ

”جب آسمان شگافتہ ہو جائے گا اور جب ستارے منتشر ہو جائیں گے اور جب سمندروں کی تہیں پھاڑ دی جائیں گی اور جب قبریں کھول دی جائیں گی تو ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے کس چیز کو آگے رکھا اور کسے پس پشت ڈال دیا۔“

آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا جس کا اس کے قبل کے سورے میں ذکر ہے (وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ) اور یہاں شگافتہ ہے (اِذَا السَّمَاءُ اِنْفَطَرَتْ) اب اس سب کا مفہوم یہی سمجھ میں آتا ہے کہ درمیان کے اجسام اور اجرام ادھر ادھر بکھر جائیں گے اور نظام درہم برہم ہو جائے گا جو اس کے بعد ستاروں کے منتشر ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

زمین کی اندرونی تہوں میں جو سمندروں کی نیچے کی تہ کے بعد ہے بہت گرم لاوا ہے، قیامت کی تباہی میں سمندر کی اندرونی تہیں شق ہو جائیں گی اور سمندر سب اس لاوے تک پہنچ جائے گا اور جیسا کہ سورۃ التکویر میں تھا خود سمندروں میں آگ بھڑکنے لگے گی۔ اس سب کے بعد قبریں کھلیں گی، اور مردے دوبارہ زندہ ہو کر حشر و نشر کے لیے اٹھیں گے، تب اعمال کا حساب و کتاب ہوگا جو آگے کے فقرے میں بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۖ الَّذِي خَلَقَكَ فَسُوِّكَ فَعَدَلَكَ ۚ فِي  
 آيِ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۙ كَلَّابِلٌ تُكَدِّبُونَ بِالذِّينِ ۙ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ  
 لِحَفِظِينَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۙ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۙ

”اے آدمی! کاہے نے تجھے دھوکے میں مبتلا کر دیا اپنے اس لطف و کرم والے پروردگار کے بارے میں جس نے  
 تجھے خلق کیا تو تجھے سرتاپا درست بنایا، تیرے اعضا میں تناسب پیدا کیا اور جس طرح چاہا تیرے اجزا کو ملا کر تیری  
 صورت بنائی۔ ہرگز نہیں بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) تم جزاؤں کو جھوٹ سمجھتے ہو حالانکہ تم پر محفوظ رکھنے والے  
 مقرر ہیں عزت دار کاتب جو سب کچھ تم کرتے ہو، اسے جانتے ہیں۔“

یعنی بلاوجہ تو اس دھوکے میں پڑ گیا کہ جو کچھ اس کا فضل و انعام ہے، وہ سب تیرا حق ہے جو تجھے مل رہا ہے اور اس سے کوئی ذمہ داری تجھ  
 پر عائد نہیں ہوتی، اس لیے تو نے اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی نافرمانی اور اس کے احکام سے سرتابی شروع کر دی اور اسی راستے  
 پر آخر تک قائم رہا اس دھوکے کی کوئی وجہ نہ تھی مگر اصل یہ ہے کہ تم نے جزاؤں والے دن کو مانا ہی نہیں۔ اسے غلط سمجھتے رہے، حالانکہ اسی خالق نے  
 جس نے سب نعمتیں عطا کیں، اپنی طرف سے معزز لکھنے والے تو تم پر مقرر کر دیے تھے جو تمہارے ہر کام کو لکھتے رہے تھے اور اسی کے مطابق اب  
 جزاؤں ادا دی جائے گی۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۙ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۙ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۙ  
 وَمَاهُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۙ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ۙ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ  
 الدِّينِ ۙ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۙ وَالْأَمْرُ يَوْمَ لِلَّهِ ۙ

”یقیناً نیکوکار لوگ عیش و آرام میں ہوں گے اور یقیناً فاسق و فاجر دوزخ میں ہوں گے، وہ اس کی تپش کا سایہ  
 کریں گے جزاؤں والے دن میں اور تم کیا جانو جزاؤں والے دن کیا چیز ہے۔ پھر (سنو کہ) جزاؤں والے دن کیا چیز  
 ہے؟ جس دن کوئی دوسرے کے کسی طرح کام نہ آسکے گا اور اختیار اس دن سب اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔“

شفاعت کرنے والے جو مؤمنین کی شفاعت کریں گے، وہ بھی اللہ کی اجازت سے اور اس کی مرضی کے ماتحت، خود اپنے  
 اختیار سے وہاں کوئی فائدہ کسی کو نہیں پہنچا سکتا۔

# سُورَةُ الْمَطْفِيِّينَ

مکیہ ..... ۳۶ ..... آیات

چونکہ پہلی ہی آیت ویل للمطففین ہے، اس لیے یہ نام ہوا۔

ناپ تول میں دھاندلی کر کے کمی زیادتی کرنے والوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے، اس ذیل میں پھر وہی روز جزا کا نقشہ ہے اور حساب آخرت پر توجہ دہانی ہے، پھر وہی اچھے اعمال اور برے اعمال کے صحیفوں کا ذکر ہے اور برے لوگوں کے انجام سے ان مؤمنین کا جنہیں آج مذاق میں اڑا کر توہین کی جا رہی ہے اس دن خوش ہونا ہے کہ اب آج وہ تمہے لگا رہے ہوں گے اور ان کی سزا سے خوش ہو رہے ہوں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔“

وَيْلٌ لِّلْمَطْفِيِّينَ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا كُنَالُوْا عَلٰی النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲ وَاِذَا كَالُوْهُمْ

اَوْ وَّرٰوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳ اَلَا يٰظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنْهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵

يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶

”لعت ہے دنڈی مارنے والوں پر جو لوگوں سے ناپ تولیں تو پورا پورا وصول کریں، اور جب خود ناپ یا تول کریں تو انہیں گھانا پہنچائیں، کیا انہیں یہ گمان نہیں کہ یہ زندہ کر کے لائے جائیں گے ایک بڑے دن میں جس دن سب کھڑے ہوں گے جہانوں کے پروردگار کے سامنے۔“

تطفیف یعنی ناپ تول میں دھوکا دے کر نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا کاروباری حلقے میں بہت رائج رہا ہے حالانکہ وہ جرم عظیم ہے جس پر ائم سابقہ میں بھی عذاب نازل ہوا ہے۔ یہ عرب میں بھی رائج تھا، اس جرم عظیم پر متنبہ کر کے لیے آخرت کو یاد دلا یا جا رہا ہے کہ وقتی نفع ہے جو اس ترکیب سے فروخت کرنے میں ہو جائے گا مگر اس کے نتیجے میں جو سزا ہے، اسے یاد رکھنا ضروری ہے۔ اگر اسے یاد رکھے تو اس جرم کا ارتکاب نہ کرے۔

كَلَّا اِنَّ كِتٰبَ الْفُجٰرِ لَفِيْ سَجِيْنٍ ۝۷ وَمَا اَدْرٰكَ مَا سَجِيْنٌ ۝۸ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝۹

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يُكَدِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۱۱ وَمَا يُكَدِّبُ بِهٖ

## الْاَكْلُ مُعْتَدٍ اَيْتِيْمٍ ﴿١٤﴾ اِذَا تَلَمَّ عَلَيْهِ اَيْتِنَا قَالَ اَسَا طِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٥﴾

”ہرگز نہیں بد اعمال لوگوں کے اعمال کی تحریر دائمی قید خانے کے رجسٹر میں ہے اور تم کیا جانو قید خانے کا رجسٹر کیا چیز ہے۔ وہ لکھی ہوئی کتاب ہے، لعنت ہے اس دن کو جھٹلانے والوں پر، جو جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں اور نہیں جھٹلاتا اسے مگر ہر ایک وہ ظلم وہ تعدی کرنے والا گناہگار ہے کہ جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پہلے زمانہ والوں کی کہانیاں ہیں۔“

سجین کی لفظ سے عام طور پر عرب ناواقف تھے۔ صرف ایک عربی شاعر نے اس لفظ کو شدید کے معنی میں استعمال کیا ہے علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول لکھا ہے کہ وہ سخن سے مشتق ہے جس کے معنی قید خانہ کے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ چونکہ سجین تشدید کے ساتھ مبالغہ کا اظہار کرتا ہے جیسے تشریب ’’بہت پینے والا‘‘ اور ’’سکیریت نشہ میں رہنے والا‘‘ اس لیے اس لفظ کے معنی میں یہاں دائمی قید کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ چونکہ عام طور پر لغوی معنی اس کے غیر واضح تھے، اس لیے اہل کتاب وغیرہ کے علماء نے اس کے معنی میں طرح طرح کی باتیں کیں۔ کعب الاخبار کی زبانی یہ ہے کہ کافر و فاجر کی روح کہ آسمان کی طرف لے جائیں گے تو آسمان اُس کے قبول کرنے انکار کر دے گا اور زمین کی طرف لے جائیں گے تو زمین بھی انکار کر دے گی۔ تب سات طبقے زمین کے طے کر کے اُس کے حصے میں جو ابلیس اور دوسرے شیطانوں کا مرکز ہے پہنچا کر رکھ دیا گیا ہے، بعض نے کہا ہے سخن دوزخ کا ایک کنواں ہے۔ جس کا منہ کھلا ہوا ہے، یہاں سب سے زیادہ واضح مفہوم وہی ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ اُن کے لئے ہے جو جزا و سزا والے دن کو جھوٹ کہتے تھے۔ بعد میں بتایا گیا کہ اُسے جھوٹا وہی کہتے ہیں جو ظلم و ستم کے مرتکب ہیں تو وہ اپنی ظالمانہ روش پر برقرار رہنے کے لئے اُس کا انکار کرتے ہیں اور اس لئے ان آیات کو جن میں اُس کی اطلاع دی گئی ہے، پرانے لوگوں کی بیان کی ہوئی کہانی قرار دیتے ہیں۔

## كَلَّابِلٌ سَنَّانٌ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٤﴾ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمِيْنَ لَمَّحْجُوْبُوْنَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُو الْجَحِيْمِ ﴿١٦﴾ ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٧﴾

”ہرگز نہیں، بلکہ زنگ آلود کر دیا ہے اُن کے دلوں کو اُن اعمال نے جو یہ کرتے رہے، ہرگز نہیں یہ لوگ اپنے پروردگار سے پردے میں رہیں گے، ہرگز نہیں یہ لوگ یقیناً دوزخ میں ڈالے جائیں گے پھر کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جسے تم جھٹلاتے تھے۔“

ہرگز نہیں یعنی روز قیامت کو افسانہ کہنا غلط ہے، پھر جیسے پہلے کہا گیا تھا کہ جھٹلاتے وہ ہیں جو ظلم و تعدی اور گناہ کے مرتکب ہیں، اسی کو اس انداز میں کہا جا رہا ہے کہ گناہوں نے جو وہ کر چکے ہیں، اُن کے دلوں پر زنگ کے غلاف چڑھا دیے ہیں یعنی اُن کے دل و دماغ اب شعور حق سے بالکل محروم ہو گئے ہیں جو گناہوں کے خوگر ہونے کا نتیجہ ہے، اس لئے حقیقتیں جو بیان ہوئی ہیں وہ اُنہیں اُلٹ کہتے ہی نہیں بلکہ بے شعوری سے سمجھتے بھی ایسا ہی ہیں۔

”یہ لوگ اپنے پروردگار سے پردے میں رہیں گے“ اس میں جو لوگ دیدار کے قائل ہیں، وہ تو بلا تکلف یہ معنی کہہ دیتے ہیں کہ وہ دیدار الہی سے جو اہل ایمان کو ہوگا محروم رہیں گے مگر رویت الہی کے غیر ممکن ہونے کے پیش نظر اس کے معنی یہ ہیں کہ جن رحمت الہی کے جلووں سے اہل ایمان محفوظ و متمتع ہو رہے ہوں گے، اُن سے یہ محروم رہیں گے جس کے لئے جناب امیر ؑ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ:- **محر ومون عن ثوابه وكرامته** ”اُس کی طرف کے ثواب اور اعزاز سے محروم رہیں گے“ دوسرے لوگوں کے اقوال بھی اس کے موافق ہیں۔<sup>[۱]</sup>

**كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عَلَيَيْنِ ﴿١٨﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا عَلِيُّونَ ﴿١٩﴾ كِتَابٌ**

**مَرْقُومٌ ﴿٢٠﴾ يَشْهَدُهُ الْمَقَرَّبُونَ ﴿٢١﴾**

”ہرگز نہیں یقیناً نیکوکاروں کے اعمال کی تحریر بلند افراد کے رجسٹر میں ہے اور تم کیا جانو کہ بلند افراد کا رجسٹر کیا چیز ہے؟ وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس پر مقرب فرشتوں کی گواہیاں ہیں۔“

قرآن کے انداز بیان سے ظاہر ہے کہ علیین سچین کے مقابل کی چیز ہے بلکہ وہ دائمی قیدیوں کا رجسٹر تھا تو یہ رجسٹر وہ ہے جو ہمیشہ کی نعمتوں سے سرفراز ہونے والے ہیں۔ اُن کے نیک اعمال وہ ہیں جن کے مقرب فرشتے گواہ ہیں، یہ کاتبان اعمال بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے دنیا میں اُن کے اعمال حسنہ کو لکھا تھا اور دوسرے فرشتے بھی ہو سکتے ہیں جو اب اُس نامہ عمل پر مطلع ہو رہے ہیں۔

**إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ**

**النَّعِيمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتْمُهُ مَسْكٌ ط وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ**

**الْمُتَنَافِسُونَ ﴿٢٦﴾ وَمِمَّا جَاءَهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾**

”یقیناً نیکوکار لوگ نعمت و آرام میں ہیں، بلند مسندوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے اُن کے چہروں پر راحت و آرام کی شادابی ہوگی، انہیں مہر لگی ہوئی عمدہ شراب پلائی جا رہی ہوگی جس پر مشک کی مہر ہے اور یہ وہ ہے جس کی طرف ہماہمی کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے ہماہمی کرنے والوں کو اور اُس میں ملا ہوا ہوگا آب تسنیم یہ وہ ہمیشہ ہے جس سے مقرب لوگ سیراب ہوں گے۔“

مشک کی مہر کے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ وہ شراب جن بوتلوں میں بند ہے، اُن پر مشک کی مہر لگی ہوئی ہے کہ ہاتھ میں لیتے ہی اُس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ شراب جس پر مہر لگی ہوئی ہے وہ جب پی جائے گی تو بجائے بدبو کے جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہے، مشک کی خوشبو محسوس ہوگی۔ اس کے پہلے سورہ دہر میں ایک ایسے چشمے کا ذکر تھا جس میں کافور کی آمیزش ہوگی، وہاں اُس کا نام نہیں تھا اور پھر ایک چشمے کا ذکر تھا جس کا نام سلسبیل۔ اب اس چشمے کا ذکر جس کا نام تسنیم ہے جس کی آمیزش اس شراب میں ہوگی۔

[۱] - محجوبون يوم القيامة عن رحمة ربهم واحسانه وكرامتهن الحسن وقتاده وقيل ممنوعون مزة رحمة مدفون عن ثوابه غير مقبولين ولا مرضيين عن ابي مسلم (مجمع البيان)

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿٢٩﴾ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ﴿٣٠﴾ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ﴿٣٢﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ﴿٣٣﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ لَا يَنْظُرُونَ ﴿٣٥﴾ هَلْ تُؤْتِبُ الْكُفَّارَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

” بلاشبہ جو مجرم لوگ ہوں، وہ ان پر جو ایمان لائے ہیں ہنستے تھے اور جب ان کی طرف سے گزرتے تھے تو آنکھوں سے اُن کی طرف اشارہ کرتے تھے اور جب اپنے گھر والوں کی طرف واپس ہوتے تھے تو تفریح سے لطف اٹھاتے ہوئے واپس ہوتے تھے، اور جب انہیں دیکھتے تھے تو کہتے تھے یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں، حالانکہ وہ ان کے نگران کے طور پر نہیں بھیجے گئے ہیں، لو اب آج وہ مومن ہیں، جو کافروں پر ہنس رہے ہیں، اونچی مسندوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ کیا کافروں کو کوئی ثواب ملا اُس کا جو وہ کرتے تھے۔“

” لطف اٹھاتے ہوئے واپس ہوتے تھے“ یعنی اس طعن و تشنیع اور آنکھوں کے اشاروں سے جو اُن کا مذاق اڑایا تھا اُس سے وہ ایسے لذت اندوز ہوتے تھے کہ اپنے گھروں کو واپس ہونے تک اُنہیں اُس سے مزہ آتا رہتا تھا۔ آخر کے جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ کرتے تھے، اُسے کارِ ثواب سمجھ کر کرتے تھے تو اب آج مومن دیکھ رہے ہیں کہ انہیں اُن کے طرزِ عمل پر بجائے ثواب کے کس طرح عذاب مل رہا ہے۔

## سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ

مکیہ ..... ۲۵ ..... آیات

سورۃ انفطار کی طرح چونکہ پہلی آیت میں آسمان کے پھٹنے کا ذکر ہے، اس لئے یہ نام ہوا، چونکہ انشقاق اور انفطار دونوں تقریباً ہم معنی لفظیں ہیں جن کے معنی شگافتہ ہونے کے ہیں۔

ان سوروں کا عموماً جو انداز ہے، اس سورے کا بھی وہی ہے۔ قیامت کی کیفیت، خدا کی قدرت اور مالکیت سے اس کا ثبوت کہ یہ تمام چیزیں اس کے اقتدار کے احاطہ میں ہیں لہذا وہ جو چاہے کرے۔ آسمان اور زمین دونوں اُس کے تابع فرمان ہیں۔

پھر دو قسم کے لوگوں کا ذکر، ایک جن کے نامہ عمل اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، دوسرے وہ جو بد اعمال ہیں، یہاں اُن کے لئے بائیں ہاتھ کے بجائے پس پشت کہا گیا ہے۔ اس کی تشریح اس آیت کے ذیل میں بعد کو ہوگی۔ یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے۔ اس لئے کہ وہ آج

کے دن کو بھولے رہے اور ممکن تصور نہ کیا کہ ہمیں خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ انقلابات زمانہ کی رفتار دکھلا کر دنیوی زندگی سے پلٹ کر آخرت کی منزل تک پہنچنے کو ذہن نشین کیا گیا ہے اور پھر آخر میں کفار کے دردناک عذاب کی خبر کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے حسن انجام کی خوش خبری دی گئی ہے۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِذَا السَّمَاءُ اَنْشَقَّتْ ۙ وَاذِنْتَ لِرِیْبِهَا وَحَقَّتْ ۙ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ وَاَلْقَتْ

مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ وَاذِنْتَ لِرِیْبِهَا وَحَقَّتْ ۙ

”وہ وقت جب آسمان شگافتہ ہو جائے گا اور وہ اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اسے یہ کرنا ہی چاہیے اور جب زمین کو کھینچ کر بڑھا دیا جائے گا اور جو کچھ اُس کے اندر ہے وہ اُسے باہر ڈال دے گی اور خالی ہو جائے گی اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اُسے کرنا ہی چاہیے۔“

اذنت لریبہا وحقّت کا فقرہ جو دو بار ہے، یہ از قبیل تکرار اس لئے نہیں ہے کہ وہ پہلا جملہ آسمان کے لئے تھا اور یہ جملہ زمین کے لئے ہے اور یہ ایک طرح ان چیزوں میں ان تبدیلیوں کے پیدا ہونے کو ضروری بتانا ہے کہ وہ تو جو اُن کا خالق ہے وہ جب اُن میں یہ تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ سرتابی کہاں کر سکتی ہیں۔<sup>[۱]</sup>

جو کچھ اندر ہے، اُسے زمین باہر لے آئے گی یعنی مردے جو اُس کے اندر دفن تھے وہ سب اب زندہ ہو کر اوپر آجائیں گے۔ ”زمین کو کھینچ کر بڑھا دیا جائے گا“ یعنی سمندر سب ختم ہو جائیں گے اور پہاڑ ہوا میں منتشر ہو جائیں گے زمین سپاٹ میدان کی شکل میں ہو جائے گی تو لازماً پہلے کی بہ نسبت اُس کی وسعت میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔

### يَا أَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلَى رَبِّكَ كَدًا فَمُلْقِيْهِ ۙ

”اے انسان! تو زبردستی کھینچا چلا جا رہا ہے اپنے پروردگار کی طرف لازماً اس کے یہاں حاضر ہونے والا ہے۔“

جب یہ ہوگا اور جب یہ ہوگا، تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ علم نحو کی اصطلاح میں ان شرطوں کی جزا اور منطق کی زبان میں اس مقدم کا تالی کیا ہے؟ وہ گزشتہ آیات کے بعد الفاظ قرآن میں موجود نہیں ہے اس کا اب اس کے بعد کے جملے سے پتہ چلتا ہے، یعنی اُس دن تو اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا..... اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ یکے بعد دیگرے جو حالات تیرے پیدا ہوتے ہیں پیدائش کے بعد بچپن کا دور اور بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا..... یہ تمام تغیرات درحقیقت ایک سرگرم رفتار ہے جس سے تو مجبوری اُس کی بارگاہ میں حاضر ہونے والا ہے جس کا تصور نہیں رکھتا اور سمجھتا ہے کہ یہی بس دنیا ہے اور اس کے آگے کچھ نہیں۔

[۱] - حق لها ان تاذن بالانقباض لمرورها الذي خلقها وتطبع له (مجمع البيان)



فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۗ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ  
 أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۙ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۖ فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۙ  
 وَيَصْلِي سَعِيرًا ۚ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۗ إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ ۗ بَلَىٰ ۗ إِنَّ  
 رَبَّهُ كَانَ بِهَبَصِيرًا ۙ

”تو جس کا نامہ عمل اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو بہت جلد آسانی کے ساتھ اُس کا حساب ہو جائے گا اور وہ اپنے والوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا اور جس کا نامہ عمل اُس کے پس پشت سے دیا جائے گا تو وہ پکارے گا ہائے تباہی اور وہ آتش جہنم میں داخل کر دیا جائے گا یہ اپنے والوں میں پہلے بڑا خوش تھا سمجھتا تھا کہ وہ کبھی پلٹے گا نہیں، کیوں نہیں، یقیناً اُس کا رب اُسے خوب دیکھ رہا تھا۔“

آسانی سے حساب ہو جائے گا یعنی بس اُس نامہ عمل کی سرسری جانچ کر لی جائے گی، اُس میں قابل گرفت چیزیں ہوں گی ہی نہیں تاکہ اُن کے متعلق پوچھ گچھ کی ضرورت ہو، اور اُسے جواب دہی کرنا پڑے لیکن جس کا نامہ عمل اُس کے پس پشت سے دیا جائے گا..... اب یا تو چونکہ اسے یقین ہے کہ اُسے نامہ عمل بائیں ہاتھ میں ملے گا اس لئے کہ اُس کے اعمال اسی قابل ہیں تو وہ اپنا ہاتھ بڑھائے گا ہی نہیں بلکہ اپنا ہاتھ پیٹھے کے پیچھے کر لے گا لیکن اس کی وجہ سے بچ نہیں جائے گا بلکہ پس پشت ہی اس کے ہاتھ میں وہ نامہ اعمال دیا جائے گا اور یہ کہ اُس کا حشر ہی اس طرح ہوگا کہ وہ پشت کی طرف مڑا ہوا ہوگا اور بعض کا خیال ہے کہ اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے اور اس طرح بائیں ہاتھ پشت کی طرف ہوگا مگر یہ ہاتھوں کا بندھنا یا طوق و سلاسل کا پہننا تو حساب کے بعد کی باتیں ہیں..... بظاہر پہلی ہی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے اعمال سے مایوسی کی بنا پر اپنا ہاتھ بڑھائے گا ہی نہیں بلکہ پیچھے کی طرف چھپالے گا اب نامہ اعمال کو دیکھتے ہی وہ چلا اٹھے گا کہ ہائے تباہی و بربادی..... کہا جا رہا ہے کہ اب یہ ہائے واویلا کا ہے کی ہے۔ وہ تو دنیا میں بڑا خوش تھا اور سمجھتا تھا کہ کبھی بارگاہ رب میں حاضری ہوگی ہی نہیں، اور پروردگار اُس کے ایک ایک لمحہ سے واقف تھا تو ناممکن تھا کہ اُسے اُن اعمال کی پاداش نہ ملے۔

اپنے والوں کے یہاں سے مراد وہ آخرت میں جو اُسے اللہ کی طرف سے شریک حیات بننے کے لئے اور خدمات کے واسطے حور و غلمان ملے ہیں وہ بھی ہو سکتے اور وہ عزیز و اقارب بھی جو اُس کی طرح نجات کے مستحق ہوں..... باقی تمام اہل ایمان جو اہل جنت ہیں وہ بھی ہو سکتے ہیں۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۗ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۗ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۗ لَتَرْكَبُنَّ  
 طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۗ فَمَأَلَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۙ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ  
 لَا يَسْجُدُونَ ۗ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكذِّبُونَ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ۗ

فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٣﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ

مَمْنُونٍ ﴿٢٤﴾

”تو قسم ہے شفق کی اور رات کی جب وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ تھوڑا ہوجاتا ہے کہ تم یونہی ایک ایک منزل طے کرو گے تو انہیں کہا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ سربسجود نہیں ہوتے بلکہ جو کافر ہیں وہ جھٹلاتے ہیں حالاں کہ جو کچھ وہ بھر کے محفوظ کر رہے ہیں اللہ اُسے خوب جانتا ہے تو انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری دیدیجئے مگر جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے، اُن کے واسطے اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔“

یعنی ان کا خیال کہ وہ کبھی ملیں گے نہیں بالکل غلط ہے، ایسا نہیں ہے؟ جن چیزوں کی قسم کھائی جا رہی ہے ان تغیرات جس طرح مشاہدہ میں ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے آرہے ہیں۔ اسی طرح یہ اپنی تمام منزلیں زندگی کی طے کر کے بہر حال اُس آخری نقطہ کی طرف رہ سپار ہیں جو آخرت کہلاتی ہے تو یہ اُسے مانتے کیوں نہیں اور قرآن جو ان حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، اُس کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔ یہاں چونکہ سجدہ نہ کرنے کی مذمت ہے اس لئے آیت میں لایسجدون کے لفظ سے سجدہ کا حکم ہے لیکن فقہ امامیہ کے رو سے وہ واجب نہیں ہے..... واجب سجدے چار ہیں جن میں یہ جگہ داخل نہیں ہے۔

## سُورَةُ الْبُرُوجِ

مکیہ ..... ۲۲ ..... آیات

پہلی ہی آیت میں چونکہ ذات البروج کا لفظ ہے، اس لئے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

اس سورے کے شروع میں اہل حق کی سابق زمانہ کی ایک جماعت کا ذکر ہے جنہیں حق پرستی کے جرم میں آگ سے بھرے ہوئے گڑھے میں زندہ ڈال کر جلادیا گیا۔ اُن گرانے والوں کا جو انجام ہوا، وہی ان لوگوں کا ہوگا جو اسلام لانے کے جرم میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچا رہے ہیں۔ اس ذیل میں اہل ایمان کو صبر و ثبات کی تلقین ہے کہ جیسے اس جماعت نے آگ کے گڑھے میں گر کر جان جانے کو گوارا کر لیا مگر حق کے راستے سے منحرف نہیں ہوئے، ویسے ہی تم سب سختیاں اٹھا لو مگر حق کے جادے سے منحرف نہ ہو۔ نتیجہ میں وہ تمہیں ہمیشہ والی زندگی میں اجر عطا کرے گا اور انہیں جو تمہاری جان لے رہے ہیں ابدی ہلاکت میں مبتلا کر کے عتاب ابدی کا مستوجب گردانے گا اور نہ ختم ہونے والی سزا دے گا..... انہیں عا دوشمود وغیرہ کو یاد کرنا چاہیے جو کبھی طاقتور قومیں تھیں لیکن جب اُس کی طرف کا اشارہ ہو گیا تو وہ سب تباہ و برباد ہو گئے۔ آخری جملوں میں قرآن کی حقانیت پر زور دیا گیا ہے کہ اس کی ہر بات لوح محفوظ کے مطابق ہے جو کسی کے

جھٹلانے سے مٹ نہیں سکتی۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

### وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۲ وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ ۳

”قسم ہے قلعوں والے آسمان کی اور وعدہ کیے ہوئے دن کی اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی“

یہ قسمیں اُس واقعہ سے متعلق ہیں جو ابھی بیان ہوگا۔ اصل آیت میں جو بُرُوج کا لفظ ہے، اُسے قدیم زمانہ میں اُس وقت کی ہیئت کے لحاظ سے اُن بارہ ۱۲ برجوں کے معنی میں لیا جاتا تھا جس میں سیاروں کی گردش ہوتی تھی اب اُن سے مراد عالم بالا کے بڑے بڑے اجسام و اجرام ثوابت و سیارات سمجھے جاتے ہیں جس کی تائید میں بھی قدیم مفسرین کے اقوال موجود ہیں۔ یوم موعود سے بالکل ظاہر ہے کہ قیامت کا دن مراد ہے اور پھر سے ذہن کو اُس جزاؤ سزا کی طرف منتقل کیا گیا ہے جو مظلوم و ظالم کو ملنے والی ہے اور شاہد سے مراد آخرت کی دیکھنے والی تمام نگاہیں بھی ہو سکتی ہیں، دنیا والے مظالم کو دیکھنے والے نوع انسانی کے افراد بھی اور پہلی صورت میں مشہود آخرت کے مناظر ہوتے ہیں اور دوسری صورت میں موجودہ مظالم کا مشاہدہ کرنے والے۔ اس کے علاوہ شاہد و مشہود کے لفظ میں اتنے قول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متشابہات میں داخل ہے جن کا متعین مفہوم سمجھنا مشکل ہے مگر اُن میں سے اکثر اس سلسلہ بیان سے بالکل غیر مرتبط ہیں اس لئے ان الفاظ کا اُن پر محمول کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ بعض ان میں سے معصومین علیہ السلام سے بھی مروی ہیں مگر یہ احادیث عموماً مسلمات کے قبیل سے ہوتے ہیں لہذا جب تک وہ بالکل الفاظ قرآنی پر منطبق نہ ہوں، اُن پر اعتماد کرنا مشکل ہے۔ بہر حال ایک اُن میں سے یہ ہے کہ شاہد روز جمعہ ہے اور مشہود روز عرفہ ہے یعنی ۹ ذی الحجہ ہے۔ یہ ابن عباسؓ اور قتادہ کا قول ہے اور اس کی روایت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کی طرف نسبت دے کر بھی ہوئی ہے اور بعض نے اس خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بھی نقل کیا ہے اور روز جمعہ کو شاہد اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ تمام لوگوں کے اعمال کی جو اُس میں عمل خیر کریں گواہی دے گا اور روز عرفہ کو مشہود کہا گیا ہے اس لئے کہ اس میں تمام اطراف کے لوگ حج کے سلسلہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ شاہد روز عید ہے، ۱۰ ذی الحجہ اور مشہود عرفہ کا دن ہے۔ تیسری روایت میں ایک شخص کا بیان ہے کہ میں مسجد میں آیا۔ دیکھا ایک صاحب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث بیان کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے شاہد و مشہود کے معنی پوچھے، انہوں نے کہا شاہد روز جمعہ ہے اور مشہود روز عرفہ آگے بڑھا تو دیکھا دوسرے صاحب احادیث بیان کر رہے ہیں۔ میں نے اُن سے یہ سوال کیا تو انہوں نے شاہد روز جمعہ ہے اور مشہود روز عرفہ بانی ہے۔ اور آگے بڑھا تو دیکھا ایک صاحب زادے احادیث بیان کر رہے ہیں جن کا چہرہ کندن کا ایسا چمکدار ہے میں نے ان سے وہی سوال کیا تو انہوں نے کہا شاہد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مشہود روز قیامت ہے حضرت کے لئے خود خالق کریم کا ارشاد ہے کہ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۱ (احزاب - ۴۵) اور قیامت کے لئے قرآن میں ہے: ذٰلِكَ يَوْمٌ فَجْمُوعٌ لِّلّٰهِ النَّاسِ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ (ہود - ۱۰۳) یہ وہ دن ہوگا جس کے لئے تمام انسان جمع ہوں گے اور یہ روز مشہود ہوگا سب اُس کا مشاہدہ کریں گے۔

راوی کا بیان ہے کہ میں ان شخصیتوں کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے اور دوسرے عبداللہ بن عمرؓ تھے اور تیسرے حضرت امام حسن بن علیؓ تھے۔ ایسے ہی اور روایات و اقوال ہیں۔ ان میں سے یہ امام حسنؓ کی روایت سیاق آیت قرآن سے

اس لئے زیادہ مطابق ہے کہ یہاں بھی ایوم الموعود کے بعد جو مشہود آیا ہے اُس سے قیامت کا مراد ہونا بالکل درست معلوم ہوتا ہے اور اُس کا مشاہدہ کرنے والے جتنے ہوں گے ان کی فردا مکمل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی ہے لہذا امام حسنؑ نے دوسری قرآنی آیت کی شہادت پیش کرتے ہوئے جو آپ کو شاہد بتایا وہ بھی بالکل صحیح ہے۔ آسمان کی عظمت کی قسم کھا کر اُس کے خالق کے عظمت و اقتدار کا کائنات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ ظالم لوگ اُس کی گرفت سے کہاں نکل سکتے ہیں اور روز قیامت کی قسم کھا کر اُس کی طرف کی سزا کا ظالموں کو تصور پیدا کیا گیا ہے کہ تم اُس کی سزا سے نکل کر کہاں جاسکتے ہو۔

قَتِيلَ أَصْحَابِ الْأُخْدُودِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوُقُودِ ۝ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۝ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۝ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۝ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

”جان سے مارے جائیں وہ گڑھا کھودنے والے اُس بھڑکتی ہوئی آگ کا جس میں بہت ایندھن تھا، جب وہ اُس کے ارد گرد بیٹھے تھے اور جو کچھ ایمان والوں کے ساتھ وہ کر رہے تھے، اُس کا تماشا دیکھ رہے تھے اور انہیں اُن سے عداوت کی کوئی وجہ نہیں تھی سوا اس کے کہ وہ ایمان لائے تھے اللہ پر جو عزت و غلبہ والا اور ہر تعریف کا حق دار ہے جس کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔“

یہ ایک قدیم واقعہ کا حوالہ ہے جو اسلامی روایات میں بھی مختلف صورتوں سے آیا ہے اور مغربی محققین نے قدیم کتبوں اور تحریروں سے بھی اُس کے کچھ تفصیلات محفوظ کیے ہیں کہ سرزمین یمن کے عیسائیت اختیار کرنے کے جرم میں یہودیوں نے یہ ظلم کیا تھا، کہا جاتا ہے کہ نجران میں اب تک وہ جگہ لوگوں کو معلوم ہے جہاں یہ گڑھا تھا جسے قرآن میں الاخدود کہا گیا ہے۔

یہاں المؤمنین جنہیں کہا گیا ہے، وہ عیسائی ہی تھے جن کے لئے اُس وقت دین حق یہی تھا اور اس کے مقابلہ میں وہ تشریح دکنے والے یہودی کافر کی حیثیت رکھتے تھے۔

اُس پر قرآن نے جیسے مرثیہ پڑھا ہے، اس طرح دین کے معاملے میں تغدد کی مذمت کی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ  
وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي  
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۝ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝

”یقیناً جنہوں نے باایمان مردوں اور باایمان عورتوں پر مظالم کیے، پھر توبہ نہیں کی، ان کے لیے دوزخ کی سزا ہے اور اُن کے لیے آگ میں جلنے کا عذاب ہے، یقیناً جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، اُن کے لئے

بہشت میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔“

وہ گزشتہ واقعات کا بیان تھا جو ہو چکا، لیکن چونکہ اس کا بیان کوئی تاریخی واقعہ کے بیان کے طور پر صرف وسعت معلومات کے لئے نہیں تھا بلکہ اُس سے موجودہ دور کے ظالموں کو جو اہل ایمان پر مظالم ڈھا رہے ہیں تنبیہ مقصود ہے لہذا اب بطور کلیہ بر بنائے ایمان مؤمنین اور مؤمنات پر مظالم کی سزا کا اعلان ہے اور چونکہ یہ ظلم ڈھانے والے کافر ہوں گے لہذا اب یہ کہا گیا کہ اس کے بعد اگر وہ توبہ نہ کریں، اب اس توبہ کا مطلب دین حق کا اختیار کر لینا ہے جس کے لئے اصول یہ ہے کہ الاسلام سبج ما قبلہ اسلام قبول کر لینا پہلے والی باتوں کا نظر انداز کر دیتا ہے، یہاں ان مظالم کا ذکر نہیں ہے جو اسلام کا اذعا کرنے والے اہل حق کے ساتھ کریں، آخر میں اس پر اشارہ کیا گیا ہے کہ اس دنیا کی کامیابی اور یہ سمجھ لینا کہ ہم نے اپنی مخالف جماعت کے اپنے راستے سے ہٹا دیا کوئی کامیابی نہیں ہے، اصل کامیابی وہی آخرت کی ہے جو اہل بہشت سے مخصوص ہے۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝۱۳ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ۝۱۴ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ۝۱۵  
ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝۱۶ فَعَالٌ لِّمَآئِرٍ يُدۡ۝۱۷ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۝۱۸ فِرْعَوْنَ  
وَتَمُودَ ۝۱۹ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۝۲۰ وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۝۲۱  
هُوَ قَرَأَنُ الْحَجِيدِ ۝۲۲ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۝۲۳

”یقیناً تمہارے پروردگار کی گرفت بہت سخت ہے، وہی پہلے بھی پیدا کرتا ہے اور دوبارہ بھی پیدا کرتا ہے اور وہ بڑا جتنے والا ہے، بڑی محبت والا، عرش کا مالک، بزرگ مرتبہ، جو کچھ چاہے، پورے طور پر کر ڈالنے والا، کیا تمہیں پہنچا ہے تذکرہ اُن فوجوں کا فرعون اور قبیلہ شمود کے لشکر گروہ جو کافر ہیں جھٹلانے میں پڑے ہوئے ہیں حالانکہ اُن کے پس پشت سے اُن کے گھیرا ڈالے ہوئے ہے بلکہ یہ بزرگ مرتبہ قرآن ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے۔“

فرعون اور شمود کے ساتھ فوجیں کہہ کر صرف اُن کی مادی طاقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اپنے زعم میں انہیں حاصل تھیں اور بس انہیں یاد دلا کر جنہیں خبریں اُن کے انجام کی پہنچ چکی ہوں، اُن کے لئے لمحہ فکریہ پیدا کر دیا کہ جو اس وقت اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتے ہیں اُن کے غرور و طاقتوری کو شکست ہو اور جنہیں پورے واقعات اُن کے نہ معلوم ہوں انہیں ذوق جستجو پیدا ہو اور وہ معلوم کر کے اُس سے عبرت حاصل کریں۔

چونکہ جنود یعنی افواج کہہ کر اُن کے طاقت و اقتدار کے زعم کا اظہار کیا گیا تھا، اس لئے اس کے مقابلہ میں خالق کے احاطہ و اقتدار کی وسعت کو بیان کیا گیا ہے کہ جو کچھ وہ کرنا چاہے، اُسے وہ ناکام نہیں بنا سکتے، ذرہ بھر اُس کے احاطہ و اقتدار سے وہ نکل سکتے نہیں اور یہ قرآن اُس کی طرف کی لوح محفوظ میں ثبت ہے لہذا اس کی مندرجہ کسی بات اور اُس کی دی ہوئی کسی خبر کو وہ کتنا ہی جھٹلائیں مگر جو کچھ وہ اعلان کر رہا ہے، وہ سب ہو کر رہے گا، اس کا کوئی جز ٹل نہیں سکتا۔

# سُورَةُ الطَّارِقِ

مکیہ..... ۷..... آیات

چونکہ پہلی ہی آیت میں ’الطارق‘ کی قسم ہے یعنی رات کو نمودار ہونے والے تارے، اس لئے یہ نام ہوا۔ مکہ میں نازل ہونے والے دوسرے تمام سوروں کی طرح اس میں بھی نگاہ آسمان اور اس کے ستاروں کی طرف موڑی گئی ہے تاکہ پتہ چلے کہ جو اس تمام نظام کی نگہبانی کر رہا ہے وہ انسان کو نظر انداز نہیں کر سکتا، پھر انسان کو اُس کی ابتدائے خلقت کی یاد دلائی گئی ہے کہ اُسے غرور کبھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خود کچھ ہے اور پھر اُسی سے دوبارہ پیدا ہونے پر اُس کی قدرت کا اظہار کیا گیا ہے جو اس دور کے سوروں کی امتیازی مہم ہے اور بتایا ہے کہ اُس قیامت میں اس کے چھپے ہوئے اعمال سب نمایاں ہوں گے اور وہاں کوئی اس کا مددگار نہیں ہوگا پھر قرآن کی سچائی پر زور دیا گیا ہے۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں مشرکین کہ سرگرمیوں کا اظہار کرتے ہوئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لاکھ تدبیریں کریں، خدا کی تدبیر کے مقابلے میں ان کی کوئی تدبیر نہیں سکتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النُّجُومُ الثَّاقِبُ ۝ إِنَّ كُلَّ

نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيَّهَا حَافِظٌ ۝

”قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی اور تم کیا جانو کہ رات کو نمودار ہونیوالا کیا ہے؟ وہ چمکتا ہوا تارا ہوتا ہے، کوئی تنفس نہیں مگر یہ کہ اُس پر کوئی نگہبان ہے“۔

اگرچہ الطارق کے لفظ اور انداز بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص رات کو نمودار ہونے والی روشن چیز ہے جس کی قسم کھائی جا رہی ہے اس لیے بعض قدیم مفسرین نے کہا ہے کہ وہ زحل ہے سب سے سب سے اونچا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ثریا مراد ہے کہ عرب اُسے النجم کہتے تھے اور بعض نے چاند کہا ہے مگر زیادہ قوت اسی کو ہے کہ اس سے یہاں بطور جنس آسمان کے تارے مراد ہیں جو رات کو نظر آتے ہیں اور ان کی قسم کھائی گئی ہے کہ خالق اس پورے عالم بالا کے نظام کا نگہبان ہے تو کسی انسان کو اپنے کو مطلق العنان نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اُس کی طرف سے اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ

وَالْتَّرَابِ ۞ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَابِ ۝ فَمَالَهُ مِنْ قُوَّةٍ

وَلَا تَأْخِذْ ۝

”تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کاہے سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ پیدا کیا گیا ہے ایک اچھل کر نکلنے والے پانی سے جو ریڑھ اور سینے کی ہڈیوں کے بیچ میں سے نکلتا ہے، وہ اس کے پلٹا کے لانے پر بھی قادر ہے اُس دن جب تمام چھپی ہوئی باتوں کا بھی جائزہ لیا جائے گا تو اس آدمی کے پاس نہ خود کوئی طاقت ہوگی، یہ اس کا کوئی مددگار ہوگا۔“

جسم کے اسی حصے سے جو پشت اور سینے کے درمیان ہے، مادہ تولید برآمد ہوتا ہے، اس کا بنیادی ربط دماغ سے ضرور ہے لیکن براہ راست یہ دماغ سے خارج نہیں ہوتا اس لئے محاورے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ اولاد اُس باپ کے صلب سے ہے اور صلب کے معنی پشت کے ہیں، جس خدانے ایسے پیچیدہ جسم کے نظام کو پہلی دفعہ میں پیدا کیا، وہی دوبارہ بعد میں موت اُسے پلٹا بھی سکتا ہے، اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اُس دن تمام چھپی ہوئی باتیں سامنے آجائیں گی اور اُن کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ پوشیدہ اعمال بھی ہیں اور دل کی نیتیں بھی ہیں جو دنیا میں لوگوں کو معلوم ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ آخرت میں وہ سب دکھی لی جائیں گی اور اُن کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝

وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝ فَمَهْلِكِ الْكَافِرِينَ

أَمْهَلُهُمْ رُويًا ۝

”قسم ہے آسمان کی جو بارش والا ہے اور زمین کی جو (نباتات کے ذریعہ سے) شگافتہ ہونے والی ہے کہ یہ فیصلہ کن بات ہے اور وہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ (کافر لوگ) اپنی چالیں چل رہے ہیں اور میں اپنی چال چل رہا ہوں تو چھوڑ دو ان کافروں کو تھوڑا سا (پھر دیکھا جائے گا)۔“

چونکہ روزی کا انحصار آسمان کی بارش اور زمین کی پیداوار پر ہے جس کے لئے پہلے بھی آچکا ہے شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا۔ (عبس - ۲۸ تا ۲۶) ہم نے زمین کو شگافتہ کیا اور اس میں اناج اور انگور اگائیں گے اس لئے آسمان اور زمین کی قسم میں اُسے ذات الرجوع کہا گیا اور رجوع کے معنی محاورہ عرب میں بارش کے ہوتے ہیں اور زمین کی صفت شگافتہ ہونے والی بتائی کہ اُس کی سطح کو پھاڑ کر نباتات برآمد ہوتے ہیں۔

یہ اپنی دوبارہ زندگی کا ملنا اور جزا و سزا کا ہونا فیصلہ کن بات ہے جو ٹل نہیں سکتی، پھر کافروں کی سرگرمیوں، ریشہ دوانیوں اور ترکیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے جو وہ رسول خدا ﷺ کے خلاف کر رہے ہیں، رسول ﷺ کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تھوڑے دن انہیں جو کر رہا ہیں کرنے دیجئے پھر ہم بھی انہیں موقع دے رہے ہیں جسے یہ اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں، وہ ہماری ان کے ساتھ چال ہے کہ پھر ان کو ایک دم تباہ و برباد کر دیا جائے اور پھر آخرت کے عذاب میں رکھا جائے جو ان کا آخری انجام ہے۔

# سُورَةُ الْأَعْلَى

## مکیہ ..... ۱۹ ..... آیات

پہلی آیت میں رب الاعلیٰ کی تسبیح کا حکم ہوا ہے اس لئے الاعلیٰ اس کا نام ہوا۔ شروع میں رب کے وصف کے ساتھ اُس کی تسبیح کا حکم دیتے ہوئے نظام تخلیق کو یاد دلا کر اس کی طرف کی ہدایت کا ذکر ہوا ہے جس کے ساتھ جزا و سزا کا ہونا ضروری ہے اور بہار و خزاں کے مشاہدات پر توجہ دلائی گئی ہے اس طرح ان چند جملوں میں مبدأ اور معاد دونوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلا گیا ہے کہ جو آپ پر وحی آرہی ہے اُس کے لئے یہ اندیشہ نہ کیجئے کہ آپ اسے کہیں بھول نہ جائیں اس کے ہم ضامن ہیں کہ آپ کو ایسا پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں نہیں۔ اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مشرکین کے رویہ اور آپ کی دعوت کے قبول نہ کرنے سے صدمہ ہوتا تھا، اس کے لئے کہا گیا ہے کہ آپ کا کام ہدایت کرنا ہے یعنی صحیح باتوں کو پہنچا دینا۔ اب لوگ مانتے ہیں یا نہیں اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے، جس میں صلاحیت ہوگی اور نفس میں اُس کے طہارت ہوگی وہ خود مان لے گا اور نتیجہ میں ہمیشہ کی کامیابی و کامرانی سے دوچار ہوگا یہ لوگ دنیاوی زندگی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں حالاں کہ آخرت مقدم ہے اور وہی مستقل اور پائیدار ہے۔ یہ آج ہی نہیں بلکہ پہلے کتب سماوی میں بھی کہا جا تا رہا ہے۔

## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝۱ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۝۲ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۝۳ وَالَّذِي

أَخْرَجَ الْمَرْعَى ۝۴ فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَى ۝۵

”تسبیح کیجئے اپنے پروردگار کے بلند و برتر نام کی جس نے پیدا کیا تو بالکل ٹھیک تو ازن قائم کیا، اور جس نے تقدیر مقرر کی اور صحیح راستے کی طرف ہدایت کی اور جس نے نباتات برآمد کئے، پھر انہیں خشک کر کے سیاہ بنا دیا۔“

تسبیح کے معنی نقائص سے بری سمجھنے اور اس کا اظہار کرنے کے ہیں اور جتنے نقائص ہیں وہ سب اُس کی بلندی ذات کے خلاف ہیں اس لئے تسبیح کے حکم کے ساتھ رب کے اعلیٰ ہونے کی صفت کا ذکر کیا۔

اس کی ذات سے ہر قسم کے نقائص کا دور سمجھنا تو حید ہے اور اُس کے افعال سے ہر قسم کے ظلم و نقص کو دور سمجھنا عدل ہے جو ہماری جماعت امامیہ کا امتیازی نشان ہے۔ کائنات میں ہر صورت سے توازن کا ہونا اس پیدا کرنے والے کے علم و حکمت کی دلیل ہے۔ ہر شے کی اُس نے تقدیر مقرر کی، کب پیدا ہوگی کتنے دن رہے گی، کیا خاصیتیں اُس سے ظہور میں آئیں گی اور کب وہ ختم ہو جائے گی اور اُس کی ہدایت کی یعنی اُسے



درجہ بدرجہ اُس آخری نقطہ تک پہنچایا جو اُس کا انجام ہے، یہ ہدایت ہر چیز میں بالکل جبری طور پر ہے لیکن انسان کو ایک منزل میں آکر اُس نے ایک حد تک اختیار کا مالک بنایا تو اُس کے لئے صحیح اور غلط راستوں میں امتیاز کے لئے اندرونی طور پر عقل کو قرار دیا اور جن باتوں کے لئے عقل کام نہیں کرتی اُن میں ہدایت تشریحی کا نظام قائم کیا جو انبیاء و مرسلین کے ذریعہ سے ہوتا ہے، نباتات کا لہلہانا اور پھر خشک ہو کر سیاہ ہو جانا اُس کا ثبوت ہے کہ یہ نوع انسانی بھی اس طرح باقی نہیں رہے گی بلکہ اس کے لئے بھی ایک اختتام کی منزل ہے جو موت ہے انسان کو اُس سے یاد رکھنا چاہیے۔

**سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى ۙ ۱۰ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى ۙ ۱۱**  
**وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَى ۙ ۱۲**

”ہم آپ کو پڑھادیں گے آپ بھولیں گے نہیں سوا اُس کے جو اللہ کو منظور ہو۔ اللہ جانتا ہے ظاہر کی بات کو بھی اور اُسے بھی جو چھپا ہوا ہو اور ہم آپ کو آسان شریعت کے پہنچانے میں آسانی پیدا کریں گے۔“

یوں تو خالق کا انہیں کتاب کی تبلیغ پر مامور کرنا جو غیر مکتوبی شکل میں نازل ہوا جس کے اکثر طولانی سورے بھی ایک ساتھ اترے ہیں ان کے حافظہ پر اُس کے اعتماد کی دلیل تھا تاہم اس دنیا کے اطمینان لئے جو اسباب ظاہری پر اعتماد رکھتی ہے آپ اسے محفوظ کرنے کی کوشش بھی فرماتے تھے کہ آپ اُس کے نازل ہوتے وقت خود اُسے بار بار پڑھتے جاتے تھے اور کبھی بلند آواز سے پڑھتے تھے تو قرآن میں دو تین جگہ صراحتاً اس کی ضمانت دی ہے کہ آپ اُسے بھولیں گے نہیں لہذا جو خدا پر ایمان رکھتا ہے، اُسے آپ کے حافظہ پر ایمان لازم ہے اور جس بات کو آپ نہ پہنچائیں، اُسے آپ کے حافظہ کا نقص نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا کو اُس کا پہنچانا منظور ہی نہیں تھا جس شریعت سہلہ کی تبلیغ پر آپ مامور ہوئے ہیں، اُس کے پہنچانے میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا مگر خدا ان دشواریوں کو دور کرے گا اور آپ کو اس کی تبلیغ کے لئے آسانیاں بہم پہنچائے گا۔

**فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَى ۙ ۹ سَيَذَكِّرْكَ مَنْ يُخَشَى ۙ ۱۰ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۙ ۱۱**  
**الَّذِي يَصِلَى النَّارَ الْكُبْرَى ۙ ۱۲ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۙ ۱۳**

”تو آپ یاد دہانی کرتے رہیے اگر اس یاد دہانی سے فائدہ پہنچے، فائدہ اٹھائے گا جو اندیشہ آخرت رکھے اور اُس سے بچنا چاہے گا وہ بد بخت جسے اس بڑی آگ میں جانا ہے، پھر نہ اُس میں وہ مرے گا اور نہ جئے ہی گا۔“

ظاہر ہے کہ عمومی تبلیغ تو سب کے لئے ہے، ورنہ یہ پتہ ہی کہاں چلے گا کون فائدہ اٹھاتا ہے اور کون نہیں لیکن خصوصی کوشش تبلیغ کی اُن لوگوں کے پیچھے پڑ کر بے کار ہے جنہیں مبداء و معاد سے کوئی سروکار نہیں ہے اور فکر انجام سے بالکل بے نیاز ہیں۔ اس لئے وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اس میں موت بھی ایسی نہ آئے گی کہ وہ اس عذاب سے چھٹکارا دیدے اور زندگی بھی ایسی نہ ہوگی جس میں کیفِ زندگی ہو۔

**قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۙ ۱۴ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۙ ۱۵ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۙ ۱۶**  
**وَالْآخِرَةَ خَيْرٌ ۙ ۱۷ وَأَبْقَى ۙ ۱۸ إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى ۙ ۱۹ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ**  
**وَمُوسَى ۙ ۲۰**

”دین اور دنیا کی بہتری حاصل کی اُس نے کہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے پروردگار کے نام کو یاد کیا اس طرح کہ نماز پڑھی مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور پائدار ہے یقیناً یہ پہلے کی کتابوں میں بھی بیان آتا رہا ہے ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔“

پاکیزگی اختیار کرنے کا مطلب ہے کفر و شرک کی آلائش سے دامن کو بچا کر ایمان کی طہارت کو اختیار کرنا اور بڑے کردار کو چھوڑ کر اچھے کردار سے آراستہ ہونا اور دنیا کی بہتری جو فلاح کے معنی میں مضر ہے وہ مال و دولت یا عیش و آرام نہیں ہے کہ یہ کافروں کو بھی حاصل ہوتا ہے بلکہ اکثر مومن سے زیادہ ملتا ہے بلکہ وہ سکون ضمیر بھی ہے جو راہ راست پر ہونے سے وابستہ ہے۔

## سُورَةُ الْغَاشِيَةِ

مکہ.....۲۶..... آیات

پہلی آیت میں جو الغاشیة کا لفظ ہے، اُس پر یہ نام ہوا۔  
صحرائی عربوں کے لئے جو سب سے زیادہ قریبی مشاہدات تھے ریگستان کے سفر میں سواری کے لئے اونٹ۔ اوپر نظر اٹھائی تو آسمان، ادھر ادھر دیکھا تو پہاڑ، نیچے نگاہ کی تو زمین، انہی مشاہدات کے ذریعہ سے مبداء و معاد دونوں پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہی چیزوں کی طرف نظر کو متوجہ کر کے مبداء و معاد خدا کی حکمت اور آخرت کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شروع ہی میں سب پر چھا جانے والی آفت یعنی قیامت میں ماننے اور نہ ماننے والے دو گروہوں کے انجام میں فرق، اور سورہ کے بالکل آخر میں حساب کے لفظ سے سے انہیں ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے کے لئے اپنے ضمیر سے فیصلہ کرنے کی دعوت ہے اور درمیان میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ آپ کا کام بس سمجھنا ہے، زبردستی منوانا آپ کا کام نہیں ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

هَلْ أَتٰكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وَجُوهُ يَوْمٍ خَاشِعَةٍ ۝۲ عَامِلَةٌ تَأْتِبَةٌ ۝۳  
تَصَلِي نَارًا حَامِيَةً ۝۴ تُسْقَى مِنْ عَيْنٍ اِنِيَّةٍ ۝۵ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ  
ضَرِيحٍ ۝۶ لَا يُسِينُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ۝۷ وَجُوهُ يَوْمٍ تَأْتِمَةٌ ۝۸ لِسَعْيِهَا  
رَاضِيَةٌ ۝۹ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۱۰ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَآغِيَةً ۝۱۱ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝۱۲

فِيهَا سُرٌّ مَّرْفُوعَةٌ ﴿١٣﴾ وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ﴿١٤﴾ وَمَنَارِقٌ مَّصْفُوفَةٌ ﴿١٥﴾ وَزَرَائِبُ

مَبْشُورَةٌ ﴿١٦﴾

”کیا تمہیں پہنچی ہے خبر اُس چھا جانے والی آفت کی۔ اُس دن کچھ چہرے تزلزل کا منظر پیش کرنے والے ہوں گے، بہت کام کیے ہوئے، بڑی محنت و مشقت اٹھائے ہوئے، وہ گرمی اٹھا رہے ہوں گے آگ کی، پینے کو پنی رہے ہوں گے بہت شدید گرم چشمے سے، اُن کے لئے کوئی غذا نہ ہوگی سوا خاردار گھاس ”ضریح“ کے جو نہ موٹا پاپا پیدا کر دیتی ہے اور نہ بھوک کی تکلیف کو دور کرتی ہے، کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنی کدو کاوش سے مطمئن، بہشت برین میں، جہاں کوئی لالیعنی بات سننے میں نہ آئے گی، اُس میں ایک چشمہ رواں ہوگا، اُس میں اونچے اونچے تخت ہوں گے اور جام و ساغر رکھے ہوں گے اور گاؤ تکیہ ترتیب کے ساتھ لگے ہوئے اور طرح طرح کے عمدہ پھونے بچھے ہوئے۔“

پہلے پڑ مردہ چہروں کے ساتھ عاملۃ ناصبہ بہت کام کئے ہوئے، بڑی محنت و مشقت اٹھائے ہوئے، یہ لفظیں چہرے کی اُس کیفیت کے اظہار کے لئے ہیں جسے ہم ”تھکے ہارے ہوئے“ کے لفظوں سے بھی ادا کر سکتے ہیں اور یا یہ طنز ہے اُن لوگوں کی اُن سرگرمیوں پر جو وہ دنیا میں بخیاں خود اپنی کامیابیوں کے لئے کرتے رہے تھے کہ وہ سب اکارت گئیں اور انہیں کوئی ثمرہ حاصل نہ ہوا۔ خصوصاً منافقین جنہوں نے اپنی پوری پوری عمریں بخیاں خود عبادت میں بھی گزار دیں اور بڑے بڑے کارہائے خیر بھی انجام دیئے مگر چونکہ وہ سب بغیر ایمان صحیح کے تھے اس لئے وہ سب بے کار ہو گئے۔

أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَإِلَى

الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَا أَنْتَ

مَذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيَعَذِّبُهُ اللَّهُ

الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿٢٦﴾

”تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ یہ کیوں کر پیدا کئے گئے ہیں اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیوں کر بلند ہوا اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیوں کر قائم کئے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیوں کر بچھائی گئی، تو بس آپ یاد دہانی کئے جائیے، آپ کا کام تو بس یاد دہانی کرتے رہنا ہے، آپ انہیں زبردستی منوانے کے ذمہ دار نہیں ہیں، بے شک جو شخص روگردانی کرے گا اور کفر اختیار کرے گا تو اللہ اُسے سب سے بڑی سزا دے گا یقیناً اُن کا پلٹنا ہماری ہی طرف ہے پھر ہمارے ہی ذمے ان کا حساب کتاب ہے۔“

یعنی یہ اُن دیکھی حقیقتوں کا انکار کرتے ہیں جو باتیں ان کے ماحول کے لحاظ سے ہر وقت ان کے سامنے ہیں، اونٹوں کو دیکھ لیں جن

پر ریگستانی راستے طے کرتے ہیں کہ ان کی خلقت ان کے سفروں کے لیے کتنی موزوں و مناسب رکھی گئی ہے جن کی کلیں آدمیوں کو دیکھنے میں کیسی ہی ٹیڑھی معلوم ہوں گی مگر اپنے مصرف کے لحاظ سے وہ بالکل صحیح و درست اور ضروری ہیں، آسمان کے پورے نظام کو کیوں نہیں دیکھتے جو ان کے بالائے سر ہیں پہاڑ جو ہر طرف نظر آتے ہیں کس طرح اپنی جگہوں پر جمائے گئے ہیں اور زمین کس طرح بچھائی گئی ہے، جس خالق کی قدرت سے یہ سب باتیں ہو گئیں، اسی کی قدرت سے جب قیامت کی بات بیان کی جائے، بہشت اور دوزخ کے تذکرے کئے جائیں تو وہ کیوں مذاق اڑاتے ہیں اور جھٹلاتے ہیں۔ جب ان کے اس رویہ کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے تو وہ سزا کے حقدار نہیں ہیں تو اور کیا ہیں تو اُس سے وہ بچ نہیں سکتے اس لئے کہ انہیں پلٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے اور ان سے حساب لینا ہمارے ذمے ہے جس کے نتیجے میں یہ سزائے سخت کے مستوجب ہیں۔

## سُورَةُ الْفَجْرِ

مکیہ ..... ۳۰ ..... آیات

چونکہ فجر یعنی صبح کی قسم سے سورے کو شروع کیا گیا ہے اس لئے یہ نام ہوا۔

اس میں قسموں کے ذریعے روز و شب کے انقلابات اور ان کی نوعیتوں پر توجہ دلاتے ہوئے خالق کی قدرت دکھلاتے ہوئے گزشتہ اعمال کے انجام پر توجہ دلائی گئی ہے اور انسانوں کو ان کے غلط رویہ پر متنبہ کرتے ہوئے آخرت کی کامیابی اور ناکامیابی کے دونوں رخ پیش کئے گئے ہیں اور آخر میں نہ ماننے والوں کے تاثرات کیا ہوں گے؟ اسی پر سورہ کو ختم کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَالْفَجْرِ ۱) وَ لَيْلٍ عَشْرِ ۲) وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۳) وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ۴) هَلْ فِي ذٰلِكَ

قَسَمٌ لِّذِي حَجْرِ ۵)

”قسم ہے صبح کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہو رہی ہو کیا اس میں کوئی

قسم صاحب عقل کے لئے (توجہ کے قابل) ہے۔“

زیادہ تر مفسرین کا رجحان اور قدیم روایات تو یہی ہیں کہ صبح جس کی قسم کھائی ہے، کوئی خاص صبح ہے اور دس راتیں بھی کوئی خاص ہیں جفت اور طاق میں بھی کوئی خصوصیت ہے اور وہ رات بھی کوئی خاص ہے لیکن یہ روایتیں اتنی مختلف ہیں کہ وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ فجر کئے ذیل میں کہا جاتا ہے کہ وہ ذی الحج کی پہلی تاریخ کی صبح ہے اور اسی سے جو عشرہ شروع ہوتا ہے جس کی انتہا عید قربان پر ہوتی ہے یہ دس راتیں ہیں اور کسی نے کہا کہ دس راتیں تو یہی ہیں لیکن فجر ان دونوں کی آخری صبح یعنی عید قربان کی صبح ہے، کسی نے کہا دس راتیں ماہ رمضان

کی آخری راتیں ہیں، شفع اور وتر میں کہا جاتا ہے کہ نمازیں ہیں جن میں کوئی جفت ہے اور کوئی طاق، کسی نے کہا شفع آدم اور حوا ہیں اور وتر تنہا آدم ہیں، کسی نے کہا جفت مخلوق کے صفات ہیں جن میں ہر ایک دوسرے مقابل ہے مثلاً علم و جہل، عزت و ذلت، وجود و عدم اور قدرت و عاجزی وغیرہ اور وتر اللہ کی صفت ہے کہ اس کے مثل و مانند کوئی نہیں کسی نے کہا کہ شفع صفا اور مرہ ہیں اور وتر خانہ کعبہ ہے..... اور انہی کے ساتھ یہ روایت ہمارے یہاں آگئی ہے کہ شفع علی و فاطمہ اور وتر حضرت پیغمبر خدا ﷺ ہیں، دس راتوں میں یہ ہے کہ یہ عشرہ محرم کی دس راتیں ہیں..... لیل میں یہ بھی روایت ہے کہ وہ سب معراج ہے جب رسول خدا ﷺ آسمان پر گئے، اور سب اختلافات سے بچنے کے لئے مفر کی صورت یہ اختیار کی گئی ہے کہ فجر بھی کوئی سی صبح ہے جب پو پھوٹی ہے اور دس راتیں بھی مبینہ کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں اور حقیقت انہی تاریخوں کی تبدیلی مراد ہے کہ ایک سے دو اور دو سے تین ہو جاتی ہیں۔ یہی سلسلہ آخر ماہ تک جاری رہتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے علم کو اللہ ہی کے حوالے رکھنا چاہیے کسی بات کو بھی حتم و جزم کے ساتھ کہنے کی جرأت نہیں کرنا چاہیے۔

قسمیں کھا کر کیا بات کہنا منظور ہے، وہ بھی ظاہر الفاظ کے اندر مذکور نہیں..... بہر حال بعد کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ گفتگو وہی جزا و سزا کی ہے اور اُسے جھٹلانے والوں کو جو سزائیں مل چکی ہیں ان کا ذکر ہے اور موجودہ منکرین کے طبقے کو براہ راست اور بعد والوں کو اُن کے ذیل میں تنبیہ ہے کہ ان کا انجام بھی یہی ہونے والا ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿١﴾ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿٢﴾ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلَهَا فِي  
الْبِلَادِ ﴿٣﴾ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿٤﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿٥﴾ الَّذِينَ  
طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿٦﴾ فَاكْتَرُوا فِيهَا الْفُسَادَ ﴿٧﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ  
عَذَابٍ ﴿٨﴾ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْبِرِّ صَادٍ ﴿٩﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اُنچے ستونوں والے عدارم کے ساتھ کیا کیا جن کی ایسی کوئی قوم ان ملکوں میں پیدا نہیں ہوئی تھی اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراش کر عمارتیں بنائی تھیں اور میخوں والے فرعون کے ساتھ جنہوں نے ملکوں میں سرکشی کی تھی اور بہت بڑا فساد پھیلا یا تھا تو اللہ نے اُن پر عذاب کے تازیانے برسائے یقیناً تمہارا پروردگار گھات میں لگا ہوا ہے۔“

ہمارے قدیم مفسرین نے ارم کو جیسے اُس قبیلہ عاد کے علاوہ قرار دے کر جس کا تذکرہ بہت جگہ قرآن مجید میں ہے اس ذیل میں جنت شداد کا قصہ لکھ دیا ہے لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عادرم سے مراد وہی قدیم قبیلہ عاد ہے جس کی طرف جناب ہودؑ مبعوث ہوئے تھے اور جو عذاب الہی سے تباہ و برباد کر دیا گیا ان کو ستونوں والے اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور بلند ستونوں پر عمارتیں قائم کرنے کا طریقہ انہوں نے شروع کیا تھا جس طرح قبیلہ ثمود کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے پہاڑوں کے اندر پتھروں کو تراش کر عمارتیں بنانے کا طریقہ شروع کیا تھا۔

فرعون کو میخوں والا کیوں کہا گیا ہے؟ اس میں پھر کئی توجیہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مجاز ہے کہ اُس کا لشکر اتنا مضبوط اور طاقتور تھا کہ ان

میٹوں پر اُس کی سلطنت مستحکم و پابدار تھی دوسرے یہ کہ اُس کے لشکر کی کثرت اتنی تھی کہ ہر طرف اس فوج کے جانے پر میٹیں ہی میٹیں نظر آتی تھیں جہاں اُن کے شامیانے نصب ہوتے تھے۔ یہ بھی وہ دولت مندی کے سبب سے لشکر کے گھوڑے سونے کی میٹوں سے باندھا کرتا تھا۔ یہ بھی اپنے مخالفوں کو میٹیں ٹھونک کر سزا دیتا تھا، یہ بھی کہ اہرام مصر مراد ہیں جو اُن کی عظمت اور شان و شوکت کی نشانی کے طور پر بعد میں مدتوں سے قائم ہیں، مگر یہ اہرام تو فرعون مصر کی یاد ہیں جو تمام اُس سلسلہ کے سلاطین مصر سے متعلق ہیں، یہاں یہ صفت جیسے خاص اُس فرعون کی معلوم ہوتی ہے جو حضرت موسیٰ کا ہم عصر تھا اور جس پر عذاب آیا تھا۔ ان سب کے عذاب کا یہاں اجمالی طور پر تذکرہ کر دیا گیا ہے جس کے تفصیلات قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر درج ہیں۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ ۖ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝  
وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۖ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝  
لَا تَكْرُمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَخْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْيَسِيرِينَ ۝ وَتَأْكُلُونَ  
الْثَّرَاتِ أَكْلًا لَّبًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

”مگر انسان، جب اُس کا پروردگار اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری عزت افزائی کی اور جب اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے تو اُس پر اُس کی روزی میں تنگی کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلت دیدی، ہرگز نہیں، بلکہ تم ہو کہ یتیم سے عزت کا برتاؤ نہیں کرتے اور غریب کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو آمادہ ہیں کرتے اور میراث کا مال اکٹھا کر کے کھاتے ہو اور مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو۔“

یعنی یہ انسان عزت و ذلت کا پیمانہ اس دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھتا ہے، دنیوی عزت اور دولت عیش و آرام مل گیا تو سمجھا کہ بس خدا کی نظر میں میری عزت ہے اور تنگ دستی میں مبتلا ہو گیا تو سمجھا کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا حالانکہ معیار عزت و ذلت انسان کا کردار ہے۔ یہ اپنے کردار کو کبھی نہیں دیکھتا کہ وہ کیا ہے؟۔

اس کا کردار یہ ہے کہ یتیم کی دلجوئی کے بجائے اسے ذلیل نظر سے دیکھتا ہے اور غریب کو کھانا کھلانے کے بجائے دوسروں کو آمادہ بھی نہیں کرتے کہ اس کے پیٹ بھرنے کا سامان کریں اور دوسروں کے حقوق پر قبضہ کر کے اپنی دولت بڑھانے کی فکر رہتی ہے۔

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۖ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۖ وَجِئْتَ  
يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۖ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ ۖ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي  
قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۖ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۖ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۖ  
”ہرگز نہیں، جب زمین پوری طرح کوٹ پیٹ کر سیاٹ بنا دی جائے گی اور تمہارا پروردگار آجائے گا اور فرشتے

صف در صف اور دوزخ کو اس دن لے آیا جائے گا اس وقت انسان کو سبق ملے گا کہ اب اس سبق لینے سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ کہے گا، کاش میں نے آج کے دن کے لیے کچھ کر رکھا ہوتا تو اس دن اللہ کا سزا دینے والا، کوئی نہیں اور اس کا ایسا گرفت میں لینے والا کوئی نہیں۔“

اللہ کی طرف آنے کی نسبت اس معنی میں ہے کہ آج وہ برسر محاسبہ آئے گا۔ اب اس نے اس انسان کو موقع دیا، اب موقع دینے والی مہلت گزر گئی اور آخری فیصلے کا ہنگام آ گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ﴿٤٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٤٨﴾ فَادْخُلِي فِي

عِبَادِي ﴿٤٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٥٠﴾

”اے پورا اطمینان رکھنے والے نفس! تو پلٹ آ اپنے پروردگار کی طرف اس طرح کہ تو اس سے خوش رہے اور وہ تجھ سے خوش ہو تو شامل ہو جا میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔“

وہ نفس جو دنیا میں شکوک و شبہات کی آماجگاہ رہا اور کردار اس کا مایوس کن ثابت ہوا وہ اپنا انجام دیکھ رہا ہے اور اب وہ نفس ہے جو ایمان و عمل صالح کے لحاظ سے سکون و اطمینان کا مرکز ہے، اس سے ان محبت بھرے الفاظ میں مخاطب ہے اور گویا اس کے حسن انجام پر اسے مبارکباد دی جا رہی ہے جو اسے موت سے لے کر اب تک وقتاً فوقتاً ملتی رہی تھی اور اب آخری انجام کے ظہور کے موقع پر اسے پھر مل رہی ہے، خواہ فرشتوں کی زبانی ہو اور خواہ قدرت کی طرف کے القاء کی صورت سے ہو۔

## سُورَةُ الْبَلَدِ

مکیہ ..... ۲۰ ..... آیات

شروع میں بلدی یعنی اس شہر کی قسم ہے، اس لیے یہ نام ہوا۔

اس میں قسم کے ذریعہ سے شہر مکہ کی اہمیت اور اس میں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مقدس کی ضرورت کو پیش کیا گیا ہے جسے سننے والوں کی نگاہ کو اس شہر کے حالات اور ان میں حضرت کے ذریعے سے کیا انقلاب لاتا ہے، اس کی طرف موڑا گیا ہے، پھر سننے والے کو پھر نوع انسانی کے آغاز، اس کی آفرینش کی ابتداء اور انتہا پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے وہی دونوں مہمیں جو مبداء و معاد کے ذہن نشین کرنے کی ہیں پایہ تکمیل تک پہنچتی ہیں: اس ذیل میں انسانی اعضا جو ارح کی افادیت اور ان کے منافع اور مقاصد کو ذہن میں لایا گیا ہے تاکہ وہ نہ انہیں عبث سمجھے نہ غلط مقاصد میں صرف کرے اور پھر آخر میں عملی زندگی میں جس کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے یعنی حقوق الناس پر سورے کو ختم کیا گیا ہے جس میں سب سے آخری جہنم کا انجام ہے جس سے نکلنا ممکن نہیں۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔“

لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَوَالِدٍ وَّمَا وَاَلَدٌ ۙ لَقَدْ

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۙ

”نہیں میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی در آنحالانکہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں اور باپ کی اور جو اس کے اولاد ہو، کہ ہم نے انسان کو محنت و مشقت کے لیے پیدا کیا ہے۔“

شہر ایک وقت وہ بے آب و گیاہ تھا اور اب وہ مرکزِ خلاق بنا ہوا ہے، جس کی خصوصیت خاص یہ ہے کہ اس پورے بدامنی کے ماحول میں یہ ایک محل امن سمجھا جاتا ہے۔ آپ اسی میں مقیم ہیں، اب اس شہر والوں کو اس شہر کے شایان اپنے کردار پر بھی غور کرنا چاہیے کہ تمہیں کیسا آدمی ہونا چاہیے اور پھر یہ سلسلہ نسل انسانی جو آدم ﷺ سے لے کر چلا اور پھیل گیا، اس سلسلہ کو جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اپنے کردار پر غور کرنا چاہیے کہ وہ اپنی شرافت انسانی کے تقاضوں کو کس طرح محفوظ رکھ سکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ تن آسانی اور بے کار وقت گزاری کے لیے پیدا ہوا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ سعی و عمل کے لیے پیدا ہوا ہے۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۙ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَا لَالْبَدَا ۙ اَيَحْسَبُ اَنْ

لَّمْ يَرَهُ اَحَدٌ ۙ

”کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے کسی کا بس نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ میں نے بہت دولت خرچ کر دی ہے، کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اسے دیکھا ہی نہیں۔“

یعنی انہیں اپنی قدرت اور طاقت پر گھمنڈ بھی ہے اور اپنی فضول خرچیوں پر غور بھی، چنانچہ عرب میں شراب خوری فیاضی سمجھی جاتی، حالانکہ انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ ایک بالادست طاقت ان کے اوپر ہے جس کی قدرت کے دائرہ سے وہ باہر نہیں جاسکتے، وہ ان کے حالات کو بدلنے پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے ان کی پوری دولت کو ختم کر دے اور اس کے احاطہ علم سے بھی وہ باہر نہیں نکل سکتے، وہ ان کے پورے حالات کا نگران ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَّلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۙ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۙ فَلَا اقْتَحَمَ

الْعَقْبَةَ ۙ وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْعَقْبَةُ ۙ فَكُ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعَمُ فِيْ يَوْمٍ ذِي

مَسْغَبَةٍ ۙ اَوْ مَسْكِيْنَا ذَا مَثْرَبَةٍ ۙ

”کیا ہم نے اسے دو (۲) آنکھیں نہیں دیں اور زبان اور ہونٹ اور ہم نے دونوں امتیازی راستے آپ



کو دکھا دیئے تو وہ کٹھن گھاٹی نہ اتر اور تم کیا جانو کٹھن گھاٹی کیا ہوتی ہے؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا بھوک والوں میں کسی قریب والے یتیم یا خاک پر بیٹھے ہوئے غریب کو کھانا کھلانا۔“

مطلب یہ ہے کہ یہ آنکھیں ملی ہیں حقیقتوں پر نظر ڈالنے کے لیے اور زبان اور دہن ملا تھا صحیح باتوں کو کہنے کے لیے مگر اس نے حقیقتوں کے دیکھنے سے نگاہیں چرائیں اور حق کے اقرار سے زبان کو خاموش رکھا اس طرح جو انسانی اعضاء سے عطا ہوئے تھے، دونوں امتیازی راستے دکھادئے یعنی ایک بلندی کی طرف لے جانے والا جو سخت اور کٹھن ہے اور دوسرا آسان یعنی مطلق العنانی کا جو پستی کی طرف لے جانے والا مگر یہ اس سخت قرض شناسی کے راستے پر نہ چلا جو بلندی کی طرف لے جاتا۔ وہ سخت کٹھن راستہ یہ تھا کہ اپنے اوپر جبر کرنا، اور دوسروں کے دکھ درد میں کام آنا، کسی غلام یا کنیز کی قید غلامی سے گلو خلاصی کرنا، کسی یتیم یا مسکین کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلانا۔ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے لگا رہا اس لیے پستی اس کی بڑھتی گئی۔ حالانکہ بلندی اسے اسی پہلے راستے میں ملتی جس راستے پر چلنے سے یہ اس گروہ میں شامل ہوتا ہے جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَّاصُوا بِالصَّبْرِ وَتَوَّاصُوا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٦﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَاهُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ﴿١٧﴾ عَلَيْهِمُ نَارٌ مُّؤَصَّدَةٌ ﴿١٨﴾

”پھر یہ ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی دعوت دی اور ایک دوسرے کو رحم و کرم کی ہدایت کی، یہ لوگ داہنی طرف والے ہیں اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بائیں طرف والے ہیں۔ ان پر آگ کا حلقہ جو چاروں طرف سے بند ہے۔“

”پھر“ کا یہ مطلب نہیں کہ وہ باتیں پہلے ہونا چاہیں جو قبل میں بیان ہوئیں ہیں اور یہ باتیں ثانوی حیثیت سے ہیں جن کا درجہ بعد کو ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ باتیں جو پہلے ہیں وہ قابل قبول نہ ہوں گی جب تک کہ ایمان نہ ہو اور ایمان کو ثبوت اس کے اس کردار سے ہوگا جو قبل میں بھی مذکور تھا اور بعد میں بھی ہوگا اور جو ایمان سے منحرف اور ان احکام الہی کے منکر ہیں وہ دوسرے گروہ میں شامل ہیں جو بائیں ہاتھ والوں کا ہے، انہیں نجومست والا گروہ بھی کہہ سکتے ہیں جو شوم کی لفظ سے ماخوذ مشئمہ کے معنی ہوتے ہیں، ان کے چاروں طرف آگ کا ایسا احاطہ ہے جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتے۔

# سُورَةُ الشَّمْسِ

مکیہ..... ۱۵..... آیات

پہلی قسم شمس یعنی سورج کی ہے، اس لئے یہ نام ہوا۔

اس میں بھی قسموں کے بعد تعبیر بدل کر خالق کی طرف سے دونوں راستوں کا بتا دینا کہ کون اچھا کردار ادا کر رہے اور کون برا اور پھر اسی کے لحاظ سے انجام کا فرق بیان کیا گیا ہے۔

اس میں اچھے اور برے راستوں کے امتیاز کے لئے بتایا ہے کہ یہ امتیاز اس کے ضمیر میں خالق کی طرف سے رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ علاوہ انبیاء کے ذریعے سے شرعی احکام کے ذریعے سے تفصیلات بتانے کے اچھے اور برے، دو راستے الگ ہیں جن کا امتیاز خود انسان کا شعور کر سکتا ہے یہ حسن فتح عقلی کی دلیل ہے جس کا ایک طبقہ منکر ہے۔

پھر قبیلہ شموذ کی سرکشی اور اپنے رسول کو اذیت پہنچانے اور حکم الہی سے مخالفت کرنے کا انجام تھوڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس کی مزید تفصیل دوسرے سوروں میں ہے، اس سے رسول خدا ﷺ کو ایذا دینے والے اس دور کے مشرکین کو متنبہ کرنا ہے کہ ان کا انجام بھی یہی ہوگا جسے صراحت کے ساتھ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ خود اس نظریہ کے پیش کرنے سے اسے سمجھ سکتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“۔

وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّهَا ۝۳ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝۴ وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَدَهَا ۝۵ وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَّهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝۷ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝۸ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۝۱۰

”قسم سورج اور اس کی پھیلتی ہوئی شعاعوں کی اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے سامنے آتا ہے اور دن کی جب کہ وہ اس (سورج) کو نمایاں کرتا ہے اور رات کی جب کہ وہ اسے ڈھانپ لیتی ہے اور آسمان کی اور اس کی جس نے اس کی عمارت قائم کی اور زمین کی اور جس نے اس کا بچھونا بچھایا اور انسانی نفس کی اور جس نے اس میں توازن پیدا کیا تو اس نے اس میں اس کے برے کردار اور اچھے کردار کا القا کر دیا، ہر طرح کی بہتری حاصل کی اس نے

جس نے اسے پاک صاف بنایا اور ناکام ہو اوہ جس نے اسے پامال کر دیا۔“

جوشعائیں چڑھتی ہیں تو یہی دھوپ کہلاتی ہیں جن میں روشنی بھی ہوتی ہے اور گرمی بھی اور صبحی کا وقت یعنی چاشت وہی ہوتا ہے جب یہ دونوں صفتیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور انہی دونوں صفتوں سے انسانوں کے کاروبار کا نظام بھی قائم ہے اور پھلوں اور زراعتوں کے پختہ اور رسیدہ ہونے میں اس کی روزی کا انحصار بھی، اس لیے آفتاب کے ساتھ صبحی کی قسم قرار دیا ہے اس کے بعد کے قریبی ایک سورہ میں بغیر آفتاب کا ذکر کیے ہوئے مستقل طور پر بھی مورد قسم قرار دیا ہے، یہاں سورج ہی کو مرکز بنا کر نظام لیل و نهار میں جتنے تغیرات ہیں سب ہی کو قسموں کے ذریعے سے یکے بعد دیگرے پیش کیا گیا ہے جن تغیرات کے ضروری ہونے پر دوسرے سوروں میں بھی قرآن کے اندر جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ان مخلوقات کو مرکز قسم بنانے کے بعد ذہن کو ان کے خالق کی طرف موڑا ہے کہ اس پورے نظام کو قائم کس نے کیا، تو کہا قسم آسمان کی اور جس نے اس کی عمارت قائم کی۔ مابناہا اور پھر بعد کے جملوں میں بھی اگرچہ مآ کی لفظ جس کے معنی عموماً وہ چیز کے ہوتے ہیں مگر اس کی نظیریں خود قرآن میں متعدد ہیں کہ ماکومن کے معنی میں لایا گیا ہے جس کے معنی وہ شخص کے ہوتے ہیں اس لیے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ماکومصدر یہ لے کر یہ ترجمہ کیا جائے کہ قسم آسمان اور اس کے بنائے جانے کی کہ اس کے بچھائے جانے کی اور نفس انسانی اور اس کے درست کیے جانے کی کیوں کہ اس کے بعد والا جملہ پھر نہیں بنے گا کہ اس نفس انسانی میں اس کے اچھے اور برے راستوں کا امتیاز اس نے ڈالا اور مائے مصدر یہ کے فعل پر عطف کے ساتھ فعل کا لانا بظاہر عربی میں درست نہیں ہے کہ اس جملے کے معنی بھی یوں کہے جائیں کہ نفس انسانی کے درست ہونے کی قسم اور اس میں اچھائی اور برائی کا احساس پیدا ہونے کی قسم اس لیے قبل کے جملوں میں قدیم مترجمین نے بھی اس تفسیر کو قبول نہیں کیا ہے جو ماکومصدر یہ قرار دینے کے ساتھ وابستہ ہے بلکہ ماکووہ ”شخص“ کے ہم معنی لفظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے [۱] اور صدر اول کے قدیم مفسرین کے اقوال بھی اس کے موافق موجود ہیں۔ [۲]

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوِيهَا ۖ إِذْ انبَعَثَ أَشْقَاهَا ۗ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۗ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ۗ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا ۗ وَلَا يَجْنِفُ عُقْبَاهَا ۗ

”قبیلہ ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے جھٹلایا، جب اس میں کاسب سے زیادہ بد بخت آدمی اٹھا، تو ان لوگوں سے اللہ کے پیغمبر نے تو یہ کہا تھا کہ اللہ کی اونٹنی کا خیال رکھنا اور اس کے پانی پینے کا مگر ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو اسے پے کر ڈالا جس پر ان کے پروردگار نے ان پر آفت ڈال دی کہ اس بستی کو زمین کے برابر کر دیا اور خدا کو اس کے انجام کو کوئی اندیشہ نہیں ہے۔“

یعنی وہ کسی قوم پر عذاب نازل کرے تو اس پر کوئی بالادست طاقت نہیں ہے جس کا اسے اندیشہ ہو کہ وہ کہیں اس قوم کی حمایت میں مجھے کوئی نقصان پہنچائے یا اس کا مجھ سے محاسبہ کرے۔

[۱]۔ بذاتی کہ ساخت اور ..... شاہ ولی اللہ (اس ذات کی کہ پیدا کیا اس کو) رفیع الدین

[۲]۔ ای ومن بناہا عن مجاہد والکلبی وقیل والذی بناہا عن عطاء (مجمع البیان)

# سُورَةُ اللَّيْلِ

مکیہ ..... ۲۱ ..... آیات

پہلی ہی قسم لیل یعنی رات کی ہے، اس لیے یہ نام ہوا، کائنات میں شب و روز کی دورنگی اور مخلوقات میں مرد اور عورت، نر اور مادہ کی دورنگی، اس کو قسم کے ذریعہ سے پیش کر کے انسانی کارگزاری کی دورنگی اور پھر اس کے نتیجے کی دورنگی، پورا سورہ انہی دو جزؤں پر مشتمل ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۙ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۙ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۚ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۚ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيسِرُّهُ لِيُسرِي ۙ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۙ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيسِرُّهُ لِيُعسرِي ۙ وَمَا يَغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۙ

”قسم رات کی جب وہ چھا جائے اور دن کی جب کہ وہ جلوہ گرہو اور اس کی جس نے ذکور و اناث (دونوں صنفوں) کو پیدا کیا یقیناً تم لوگوں کی کوشش الگ الگ ہے تو جو شخص (خدا کی راہ میں) دے دلاؤ اور پرہیزگاری سے کام لے اور اچھی بات کا یقین مانے تو ہم اسے آسان منزل تک پہنچنے کی آسانی دیتے ہیں اور جو بخل سے کام لے اور بے نیازی اختیار کرے اور اچھی بات کو جھٹلائے تو ہم اس کے لیے مشکل منزل تک پہنچنے کا سامان کرتے ہیں اور اس کی دولت اسے کچھ فائدہ نہیں دیتی بس وہ منہ کے بھل گرا ہوا ہے۔“

جس طرح ہم نے فہرست مضامین میں بتایا مطلب یہ ہے کہ رات اور دن الگ الگ ہیں اور ان دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں اس طرح نر اور مادہ دو صنفیں الگ الگ ہیں اور ان کے مقاصد الگ الگ ہیں اس طرح تم لوگوں کی کوششیں بھی الگ ہیں۔ ان کی قسمیں جدا جدا ہیں اور ان کے نتائج بھی مختلف ہیں۔ ایک طرف یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو راہ خدا میں صرف کرے اور اس سے حقوق اللہ اور حقوق الناس ادا کرے اور خدا کی ناراضگی کی باتوں سے پرہیز کرے جو اچھی باتوں کی انہیں تعلیم دی گئی ہے، انہیں سچ سمجھے اور ان پر عمل پیرا ہوں تو اس کے لیے خدا کی طرف سے نیک راہ پر چلنے میں آسانیاں فراہم ہوتی جائیں گی اس راستے پر قائم رہنے جسے پہلے ایک سو رے میں کہا گیا تھا کہ وہ سخت گھاٹی ہے جس پر چڑھنے کی

وہ ہمت نہیں کرتا اور اب اسے کہا جا رہا ہے کہ وہ آسان منزل ہوگی، یعنی وہ سختی اس وقت تک محسوس ہو رہی تھی جب تک ہمت نہیں کی تھی اور جب ہمت باندھ لی تو اب توفیقات الہی شامل حال ہوں گے اور سب باتیں آسان محسوس ہوں گی جن کا نتیجہ بھی پھر حسن انجام کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آئے گا، دوسری طرف وہ جو نکل سے کام لے کر حقوق اللہ اور حقوق الناس ادا نہیں کرے گا اور اچھائی کی تعلیمات سے منکر اور ان سے عملاً منحرف رہے گا تو اسے قدم قدم پر دشواریاں ہی محسوس ہوں گی راہ حق پر آنا اور اس پر قائم رہنا اسے دشوار سے دور تر ہی ہوتا جائے گا اور نتیجہ میں اس کے لیے تباہی و بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے جس سے اس کا مال دولت اسے کچھ فائدہ پہنچا نہیں سکتا۔

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۖ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۗ فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ۚ  
لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۖ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۖ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۖ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۖ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۖ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ  
الْأَعْلَىٰ ۖ وَلَسَوْفَ يَرَىٰ ۖ

”یقیناً ہمارے ذمے راستہ دکھانا ہے اور بلاشبہ ہماری ہیں آخرت اور دنیا تو میں نے تمہیں ڈرایا اس آگ سے جو بھڑکتی ہوگی، اس میں نہیں جلے گا مگر وہ بدترین بد بخت جو جھٹلائے اور روگرانی کرے اور اس سے بچا رہے گا وہ انتہائی پرہیزگار جو اپنا مال اپنی پاکیزگی کے لیے دیتا رہے اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو، سو اپنے برتر پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے اور بلاشبہ وہ اس سے خوش ہوگا۔“

چونکہ وہ خالق ہی نہیں بلکہ رب ہے، تربیت کا لازمی جز بقا اور ارتقا کا اہتمام کرنا ہے اس بنا پر ہدایت کرنا اس کے ذمے ہے لہذا اس نے پہلے عقل و ضمیر انسان کی رہ نمائی اور پھر انبیاء و مرسلین کے ذریعے سے ہدایت کا سامان کیا۔ یہ حقیقت قرآن مجید میں بہت مقامات پر مذکور ہے اور اسی کو یہاں اس مختصر جملے میں ادا کیا گیا ہے کہ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ’ہمارے ذمے راستہ دکھانا ہے‘

”ہمارے ہیں آخرت اور دنیا“ دونوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ اور دونوں کے فائدے اور نقصانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں لہذا تم ہر لمحہ ہمارے محتاج ہو اور پھر یہ کہیں تم ہمارے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے کہیں بھاگ کر بچ نہیں سکتے۔

اشقی اور اتقی اگرچہ دونوں فعل التفضیل کے صیغے ہیں یعنی سب سے زیادہ شقی اور سب سے زیادہ متقی لیکن یہاں بظاہر اس کی یہ دوسروں پر زیادتی کا لحاظ نہیں ہے بلکہ یہاں اشقی کے معنی بس شقی یعنی بد بخت کے ہیں جس کی تشریح بعد کو ہے کہ وہ جھٹلاتا ہے اور صحیح تعلیمات سے منہ پھیرتا ہے اور اتقی کے معنی بس تقی یعنی پرہیزگار کے ہیں جسکے کردار کی تشریح بعد کو ہے کہ وہ رضائے الہی کی خاطر اپنا مال خرچ کرتا ہے۔

وہ اس کی سزا ہے اور یہ اس کی جزا ہے جس کی پوری تفصیل اس اجمال میں مضمربہ ہے کہ وہ خوش ہو جائے گا کہ اسے اس عمل کا اجر ملا۔

# سُورَةُ الضُّحَى

مکیہ ..... ۱۱ ..... آیات

پہلی ہی قسم ضحیٰ کی ہے جو دھوپ چڑھنے کے وقت کو کہتے ہیں، اس لیے یہ نام ہوا۔

روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور سورے کا مضمون بھی بتانا ہے کہ ابتدائے بعثت میں کچھ آیتوں اور سوروں کے نازل ہونے کے بعد تھوڑی مدت تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا، اس سے حضرت پیغمبر خدا ﷺ کو عظمت الہی کے احساس اور بتقاضائے عبودیت یہ تشویش اور تردد ہوا کہ خالق کی نظر میری طرف توجہ میری طرف سے ہٹ گئی ہے، اس لیے پیغمبر خدا ﷺ کی اطمینان دہانی کے لیے اب آغاز وحی اس سورے کے ساتھ ہوا اور آپ کو اطمینان دلا یا گیا۔ اور پھر آپ کو خبر دی گئی کہ آپ کے سامنے بڑی مشکلیں اس دعوت اسلامی کے سلسلے میں پیش آئیں گی لیکن وہ عارضی ہوں گی اور نتیجہ بہر حال آپ کے موافق رہے گا جس کو دیکھ کر آپ کو خوشی ہوگی اور مزید اطمینان کے لیے اپنے سابق کے انعامات جو رسول پر رہے ہیں، انہیں یاد دلا یا گیا ہے کہ اس کے بعد آپ کو یہ خیال پیدا ہی نہ ہونا چاہیے کہ آپ کا پروردگار آپ سے ناراض ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔“

وَالضُّحَىٰ ۱ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ ۚ وَمَا قَلَىٰ ۳ ۚ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ

مِنَ الْأُولَىٰ ۴ ۚ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۵ ۚ

”قسم ہے دھوپ چڑھنے کے وقت کی اور رات کی جب کہ اس کا ستاٹا چھا جائے، آپ کو آپ کے پروردگار نے نہ چھوڑا ہے اور نہ وہ ناراض ہوا ہے اور بلاشبہ انجام آپ کے آغاز سے بہتر ہے اور بہت جلد آپ کو پروردگار آپ کو عطا کرے گا ایسا کہ آپ خوش ہو جائیں۔“

اصل مقصود دن کی قسم کھانا ہے مگر جیسے رات کی قسم میں اس کے ستاٹا چھانے کے وقت کا تذکرہ ہوا ہے، اس لیے کہ اسی وقت رات کی کیفیت پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے، اسی طرح دن کی طرف اس کے آثار کے نمایاں ہونے کے موقع کا نام لیا ہے اور وہ اسی وقت ہوتے ہیں جب دھوپ چڑھتی ہے۔

رات کے ساتھ ستاٹے کی کیفیت کا تصور اس پس منظر کے ساتھ بھی بہت تناسب رکھتا ہے جو وحی کے تسلسل میں درمیانی وقفہ کی وجہ سے پریشانی کا ہے کہ جیسے وہ ستاٹا وقتی ہے جس کے بعد پھر دن آتا ہے اور اس کی چہل پہل ہو جاتی ہے، ویسے ہی یہ وقفہ وقتی ہے جس کے بعد لگا تار وحی کا سلسلہ قائم ہو جائے گا۔

”نجام آغاز سے بہتر ہے“ یہ فقرہ اس عالم کا مشاہدہ سے بھی متعلق ہو سکتا ہے جیسا کہ پہلے لکھا گیا کہ یہ مشکلات وقتی ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے آرہی ہیں اور عنقریب اس دارِ دنیا میں آپ کی کوشش کے خوش گوار نتائج سامنے آتے جائیں گے اور پھر آخرت سے مراد اس دنیا کے بعد کی منزل بھی ہے کہ اس دنیا میں آپ کے سامنے جتنے بھی مصائب اور اذیت رساں حالات پیش آئیں، دنیا کے بعد جو آخرت کا دور ہے وہ آپ کے لیے بہتر سے بہتر ہے اور آپ کو اللہ اتنا عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔

چنانچہ تفسیر اہل بیت میں ہے کہ اس سے شفاعت کا درجہ اور بخشش امت مراد ہے [۱] اس کے لیے جناب محمد حنفیہ کی زبانی بھی آیا ہے کہ انھوں نے کہا:-

يا اهل العراق تزعمون ان ارجى آية في كتاب الله عز وجل يا عبادي الذين اسرفوا على انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله وانا اهل البيت عليه السلام نقول ارجى آية في كتاب الله ولسوف يعطيك ربك فترضى وهي الشفاعة يعطيها في اهل لا اله الا الله حتى يقول رب رضيت -

”اے عراق والو! تم لوگ خیال کرتے ہو کہ سب سے زیادہ امید افزا آیت قرآن میں یہ ہے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپرستم ڈھایا اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور ہم خاندان رسالت والے کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ امید افزا آیت کتاب خدا میں یہ ہے کہ عنقریب اللہ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے اور یہ بخیر شفاعت ہے جسے کلمہ گویوں میں اتنا قبول کیا جائے گا کہ آپ کہیں گے پروردگار میں خوش ہو گیا“۔

اور امام جعفر الصادق عليه السلام نے فرمایا:-

ان رضا جدى ان لا يبقى في النار موحد“

یرے جد بزرگوار کی خوشی اس میں ہے کہ دوزخ میں کوئی کلمہ تو حید کا قائل باقی نہ رہے۔

بہر حال اس شفاعت میں حدود و قیود ہیں جنہیں خود شفاعت کرنے والے رسول اور ان کے جانشینوں نے بتایا ہے جس میں سب سے زیادہ قید یہ ہے کلمہ لا اله الا اللہ صرف زبانی نہ ہو بلکہ صدق دل سے اس کا اقرار ہو جس کا اثر افعال اور اعمال پر پڑنا لازمی ہے اور پھر یہ کہ ان کی رضائیت الہی کے ساتھ مشروط ہے جو قرآن کے دوسرے آیات سے ثابت ہے اور وہ ان کا تقاضا عبودیت ہے۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَى ۖ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى ۗ وَوَجَدَكَ عَابِلًا فَأَغْنَى ۗ

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۙ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۙ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۗ

”کیا ایسا نہیں کہ اس نے آپ کو یتیم پایا تو پناہ کی جگہ دی اور آپ کو کھویا ہوا پایا تو رہنمائی کی اور آپ کو تہی دست پایا تو مالدار بنایا تو کوئی یتیم ہو تو اس پر سختی نہ کیجیے اور جو سائل ہو اسے جھڑکیے نہیں اور اپنے پروردگار کی نعمت کو ظاہر کرتے رہیے“۔

[۱] سیؤتیک ربک فی الآخرة من الشفاعة والمحوض وسائر انواع الکرامة فیک وفي امتک ماتر ضعی بہ (مجمع البیان)

ان فقرات میں خالق نے اپنے فضل و کرم کا جو ابتدائے عمر سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل حال رہا ہے تذکرہ فرمایا ہے ”یتیم پایا تو پناہ کی جگہ دی“ زیادہ تر معتبر روایت یہی ہے کہ حضرتؐ اس وارد دنیا میں پیدا ہی ہوئے بحالت یتیمی یعنی آپ شکم مادر میں تھے، جب آپ کے والد بزرگوار جناب عبداللہؑ کی وفات ہوگئی جس کے بعد صرف ان کی والدہ تھیں جو پرورش کرتی رہیں مگر آپ چھ برس ہی کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا تو آپ کے دادا جناب عبدالمطلبؑ پورے ذمہ دار آپ کی تربیت کے ہوئے اور انہوں نے اس طرح آپ کی پرورش کی جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ صرف ایک دادا کے طور پر پال نہیں رہے ہیں بلکہ وہ ان کی اس شان سے واقف ہیں جو مستقبل میں سامنے آنے والی ہے چنانچہ ان کا یہ قول تاریخ میں درج ہے کہ ان لہ شانا کبیرا۔ ”اس بچے کی بڑی شان ہے۔“

ظاہر ہے کہ جو دادا اپنے پوتے کی مستقبل میں سامنے آنے والی شان سے واقف تھا، وہ غیر ممکن تھا کہ اپنے بیٹوں کی موجودہ شان و حالت سے واقف نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے خدا کے اس دیے علم ہی کی بنا پر اپنی اولاد میں سے جناب ابوطالبؑ کو منتخب کیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا کہ اب تم ان کی تربیت کے ذمہ دار ہو۔

اب یہی تربیت تھی جس میں آپ پورے طور پر پروان چڑھے یہاں تک کہ بعثت کے بعد بھی وہ دس برس تک آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے مشن یعنی اسلام کے بھی جائے پناہ رہے اس لیے وہ مفسرین جنہیں ابوطالب سے پر خاش ہے وہ آپ کو پسند نہیں کرتے۔ اس محل پر جناب ابوطالبؑ کے تذکرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے، چنانچہ بعض نے والدہ اور دادا کی تربیت کے بعد اور بعض نے بغیر ان کے تذکرے کے صرف اسی آخری کفیل کا ذکر ہے۔<sup>[۱]</sup>

اسی طرح تیسرے فقرے میں کہ ”آپ کو تہی دست پایا تو مالدار بنا یا، قدیم تفسیر میں زیادہ تر جناب خدیجہ سلمہ اللہ علیہا کا تذکرہ ضروری ہوا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:

حضرت خدیجہ سلمہ اللہ علیہا اپنی قوم میں اشرف تھیں اور مالدار، ان سے نکاح ہوا، (موضع القرآن)

بے شک ان دونوں کے درمیان کے فقرے کی تشریح ذرا نزاکت رکھتی ہے جس کا وہ مفسرین احساس نہیں کر سکتے جو قبل بعثت رسولؐ کے مرتبہ کی رفعت اور آپ کی شان عصمت کے قائل نہیں ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس محل پر ضال کے معنی کھوئے ہوئے کے ہیں اور جو شے کھوئی ہوئی ہے اس کا پتہ جب تک مل نہ جائے دوسرے کو نہیں ہوتا ہے، چنانچہ عرب کا محاورہ ہے: ضلت الناقة ”اونٹنی کھو گئی“ اس کا مطلب یہ ہے کہ مالک کو پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے علاوہ کہتے ہیں ضل اللبن فی الماء ”دودھ پانی کے اندر کھو گیا یعنی دیکھنے والے کو پتہ نہیں چلتا۔ امرء القیس نے اپنے مشہور معلقہ میں کہا ہے۔“

تفضل العتاص فی ثنی ومرسل یعنی بال حسینہ کے سر کے اتنے گھنے ہیں کہ دو (۲) لٹوں کی گندھی ہوئی زلفوں اور یونہی کھلے ہوئے بالوں کے اندر جوڑے گم ہو جاتے ہیں، بعض نسخ میں ہے۔ تفضل المرداری فی مثنی ومرسل ”یعنی گندھی زلفوں اور کھلے ہوئے بالوں میں کنگھیاں گم ہو جاتی ہیں۔“

[۱]۔ اذی بان صمک الی عمک ابی طالب (جلالین)



# سُورَةُ الْمَنَشْرِحِ

## مکیہ..... ۸..... آیات

اس سورے کا تو علیحدہ سے مفرد نام ہی کوئی نہ ہوا بلکہ پہلے ہی مرکب فقرے کو اس کا نام قرار دے دیا گیا۔ اس سورے کا مضمون گزشتہ سورے کے ساتھ اتنا قریبی تعلق رکھتا ہے کہ ہمارے اکثر علماء تو ان کو ایک سورہ سمجھتے ہیں اور ان کا فتویٰ یہ ہے کہ نماز میں سورہ حمد کے ساتھ جو پورا ایک سورہ پڑھنا لازم ہے تو ان میں سے ایک پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ دونوں سورہ میں درمیان میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہے ہوئے پڑھے جائیں۔<sup>[۱]</sup> پھر بھی باوجود اتحاد مضمون کے چونکہ لفظی ساخت دونوں سوروں کی ذرا الگ الگ ہے اس طرح کہ ان میں اتصال و اتحاد مشکل محسوس ہوتا ہے اس لیے احتیاط یہ ہے کہ نماز فریضہ میں ان کی تلاوت کو اختیار نہ کیا جائے کیوں کہ اگر ایک پڑھا جائے تو تعجیز یعنی سورے کے نامکمل ہونے کا احتمال ہے جسے اکثر علماء دوست نہیں سمجھتے اور دونوں پڑھے جائیں تو تھوڑا سا احتمال قرآن یعنی حمد کے بعد دوسروں کے ایک ساتھ پڑھنے کا ہے۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے۔“

الْمَنَشْرِحُ لَكَ صَدْرَكَ ۱ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۲ الذِّبْنِ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۳

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۴ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۶ فَاِذَا

فَرَعْتَ فَاَنْصَبْ ۷ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ ۸

”کیا ہم نے آپ کے سینے کو کشادہ نہیں کیا اور اتارا نہیں آپ پر سے اس بوجھ کو جو آپ کی پیٹھ کو توڑے دیتا تھا اور اونچا کیا آپ کے ذکر کو تو یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہونا ہے، یقیناً دشواری کے ساتھ ساتھ آسانی ہوتی ہے لہذا جب ان کاموں سے فراغت کیجیے تو عبادت و ریاضت میں لگ جایا کیجیے اور اپنے پروردگار ہی سے لو لگائے۔“

”سینہ کشادہ کرنے“ کا مطلب ہے اس پریشانی کو دور کرنا کہ ہم کس طرح آگے بڑھے اور وہ عزم بہت اور حوصلہ عطا ہونا کہ اتنے عظیم کام کے لیے آپ بغیر کسی پس و پیش کے کھڑے ہو جائیں جس میں پورے ماحول اور معاشرت سے ٹکرانا تھا۔ اس شواہد خود قرآن مجید میں موجود

[۱]۔ روی اصحابنا ان الضحی الم نشرح سورة واحدا لتعلق احدهما بالآخری ولم یفضلو بینہما بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وقرأتہا فی

الرکعة الواحدة فی لفریضہ (مجمع البیان)

ہیں۔ اس لیے اسے اہل سنت کی اس روایت پر کہ رسول خدا ﷺ کے سیدہ کو بچپن میں چاک کیا گیا اور اس میں سے دل نکال کر دھویا گیا، اور اس کا لے نقطہ کو (معاذ اللہ) جو اس میں تھا دور کیا گیا جو اصل روایت ہی ہمارے نزدیک غلط ہے منطبق کرنا بہر حال غلط ہے۔

دوسرا فقرہ ”اور آپ پر سے اس بوجھ کو اتار دیا جو آپ کی پیڑھ کو توڑے دیتا تھا“ اس میں بوجھ سے مراد معاذ اللہ ان گناہوں کی فکر کو لینا جو ان لوگوں کے زعم کے مطابق رسول ﷺ سے قبل بعثت ہو چکے تھے یہ بھی غلط ہے کہ بوجھ کے معنی گناہ کے نہیں ہیں بلکہ بوجھ سے مراد وہ فکر ہے جو آپ کو اپنی قوم کی جہالت اور غلط کاریوں کے مشاہد سے تھی۔ اب جب کہ ان کی اصلاح کا کام آپ نے اس راہ میں قدم اٹھا دیا۔

اور ”آپ کے ذکر کو بلند کیا“۔ یہ بلند کرنا قیامت تک کے لیے وعدہ ہے کہ آپ کا ذکر اونچا رہے گا اور روایتیں بتاتی ہیں اور مشاہد بھی ہے کہ اس کا سب سے بڑا مصداق ہے اذان میں شہادت توحید کے ساتھ شہادت رسالت کا اعلان جو دنیا کے ہر ملک میں جہاں مسلمان بستے ہیں میناروں پر بلند آواز سے ہوتا ہے۔

اتنی اطمینان دہانیوں کے ساتھ بطور تاکید دہراتے ہوئے یہ کہا جا رہا ہے کہ اب جو مشکلات اس وقت درپیش ہیں انہیں عارضی سمجھنا چاہیے۔ ان کے سامنے آسانی پیدا ہونا یقینی ہے۔ آپ ان کی فکر نہ کیجیے اور اپنے کاموں میں لگے رہیے اور تبلیغی مہموں، نیز اپنے ضروریات حیات کے پورے کرنے سے حیات کے پورے کرنے سے جتنا وقت بچے ان میں پوری تندہی کے ساتھ عبادت الہی میں مصروف ہو جائے اور ان لوگوں کے رویہ سے متاثر ہونے کے بجائے اپنے پروردگار سے لو لگائیے کہ یہی سب سے بڑا مشکلات کے آسان ہونے کا ذریعہ ہے۔

## سُورَةُ التِّينِ

مکیہ..... ۷..... آیات

چونکہ پہلی ہی قسم تین یعنی انجیر کی کھائی گئی ہے، اس لیے یہ نام ہوا۔

اس میں قسموں کے بعد انسان کے اصل خلقت میں اچھی صلاحیتوں کے حامل ہونے اور پھر اپنے کردار کے لحاظ سے انتہائی پستی میں گرفتار ہونے اور بلندی کی منزل تک جا کے بہترین جزا کے حق دار ہونے کا تذکرہ کیا ہے جس سے وہی جزا و سزا کی ضرورت پر روشنی ڈالنا مقصود ہے جو ان ابتدائی دور کے سوروں کا خاص موضوع ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝۱ وَطُورِ سِیْنِیْنَ ۝۲ وَهَذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۝۳ لَقَدْ

خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ  
 آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدَ الدِّينِ ۝  
 أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ ۝

”قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا اور امن و امان والے شہر (مکہ) کی کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر پلٹا دیا یا اس کو پست سے پست ترین مخلوقات کے درجے پر سوا ان کے جو ایمان لائیں اور اچھے اعمال رکھیں کہ ان کے لیے نہ ختم ہونے والا معاوضہ ہے تو آپ کو اس کے بعد جزا و سزا کے بارے میں کون جھٹلا سکتا ہے۔ کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟“

انجیر اور زیتون یوں تو دو پھل ہیں مگر چونکہ بعد کو دو مقامات کی قسم ہے اس لیے بظاہر تین اور زیتون سے مراد وہ علاقے ہیں جہاں یہ پھل کثرت سے پائے جاتے تھے اور وہ شام اور فلسطینوں کے علاقے ہیں کہ یہاں انبیاء و مرسلین کثرت سے ہوئے۔

ان قسموں کے بعد جو بات کہی جا رہی ہے، وہ یہ ہے ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے جسمانی طور بھی اس میں وہ توازن اور تناسب ہے جو نوعی طور پر کسی دوسرے ذی روح میں نہیں ہے اور پھر ذہنی ترقی کے امکانات بھی ہیں، وہ کسی دوسرے کو عطا نہیں ہوئے اور اسی مناسبت سے اس کے قبل انبیاء و مرسلین کے خاص مرکزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں کہ یہی طبقہ عملی طور پر اس کمال انسانی کا نمائندہ ہے مگر بعد میں اس نے اپنے سوا اختیار سے اپنے کو اس کردار کی منزل پر پہنچا دیا۔

جس کی وجہ سے ہم نے اسے مخلوقات کے سب سے نیچے درجے تک پہنچا دیا کیوں کہ اس نے کردار بھی وہ اختیار کیا جو حیوانات میں سے بھی کسی کا نہیں ہے، جس کا مشاہدہ ہر شخص کو ان جنگلوں اور نیز فسادات میں بڑا جانور ثابت ہوتا ہے، اس سے مستثنیٰ بس وہ ہیں جو سچے طور پر ایمان کے جوہر سے آرتے اور عمل صالح کے پابند ہوں، یہ اس شرف انسانی کے درجے پر باقی رہتے ہیں جو ان کی رفعت کا تقاضا تھا اور جس کا اعلیٰ نمونہ انبیاء مرسلین تھے اور اس طبقے کو اللہ کی طرف سے وہ جزا ملتی ہے جو ختم ہونے والی نہیں اور غیر ممنون کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ جزا انہیں بطور ایک ایسے احسان کے جو بلا استحقاق ہو عطا نہیں کی جائے گی۔

بلکہ ان کے حق طور پر انہیں دی جائے گی اور جب کہ نوع انسانی میں یہ دو قسم کے نمونے عالم مشاہدہ میں موجود ہیں تو جزا و سزا کا انکار کس بنیاد پر ہو سکتا ہے اور اس خبر دیتے والے کو جھوٹا کیوں کر کہا جاسکتا ہے، جب کہ ہر حاکم کے لیے انصاف ضروری سمجھا جاتا ہے جو تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم ہے وہ بھلا انصاف نہ کرے؟ یہ کیسے غضب کی بات ہے اور اس انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ جب دو (۲) قسم کے نمونے کردار کے پائے جاتے ہیں تو ان کے نتیجے میں ایسا ہی فرق ہو جس میں ایک کا نام جزا ہو اور ایک کا نام سزا ہو۔

# سُورَةُ الْعَلَقِ

مکیہ ..... ۱۹ ..... آیات

سورے کی دوسری آیت خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ میں سے لفظ علق پر اس کا نام ہو۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے بعثت کے بعد سورہ اقرآن نازل ہوا ہے مگر حقیقت امر یہ ہے کہ یہ پورا سورہ پہلے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اُس کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں جو اس وقت نازل ہوئیں باقی آیتیں بعد کو اتریں۔

روایت بتاتی ہے کہ حضرتؑ کے بعثت کے کچھ عرصہ پہلے کئی کئی دن جا کر غار حرا میں عبادت الہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اسی میں ایک دن فرشتہ اتر ا اور اس نے یہ پیغام پہنچایا اس طرح اسی سے آغاز بعثت ہوا اس میں شروع میں قرأت کا حکم اور پھر ایک طرح کتابت کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد رسولؐ کی نماز میں مزاحمت کرنے والے کی مذمت اور اسے زبرد توخی اور تہدید ہے اور رسولؐ کو ہدایت ہے کہ ان لوگوں کی ممانعت میں نہ آئے اور آپ اپنے طریق کار پر جو نماز کا ہے برقرار رہیے اور ان کی مزاحمت کی پرواہ نہ کیجیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔“

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ

الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵

”پڑھیے اپنے پروردگار کے نام کے سہارے سے جس نے پیدا کیا خون کے جمے ہوئے ایک ٹکڑے سے انسان کو پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا پروردگار وہ بہت بڑا فضل و کرم والا ہے جس نے تعلیم کا سامان کیا قلم کے ساتھ۔ انسان کو وہ تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتا تھا“ چونکہ تنزیل اول کے روایات میں ایک روایت موجود ہے کہ:-

اول سورہ نزلت علی رسول اللہ فاتحہ الكتاب..... (مجمع البیان)

پہلا سورہ جو پیغمبر خدا ﷺ پر نازل ہوا وہ سورہ حمد ہے۔

اور پڑھنے کے حکم سے ظاہر ہے کہ پیغمبر خدا کو کچھ پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے، پھر اس کے ساتھ سورہ حمد کا نماز میں لازمی طور پر پڑھا جانا اور اس سورے کے اسلوب کا اس طرح ہونا کہ جیسے بندہ اپنے خالق کی بارگاہ میں کچھ عرض معروض کر رہا ہے جسکی بنا پر میں نے اسی تفسیر کے پہلے

پارے میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سورہ وہ ہے جس سے اقرأ کا حکم متعلق ہے تو جس طرح قل هو اللہ احد میں قل کی لفظ وہ ہے جو کلام خالق میں هو اللہ احد کے جملے کو جو بندے کی طرف سے خالق کے لیے غائبانہ لب و لہجہ کا حامل ہے کلام خالق میں منسلک بناتی ہے اسی طرح اقرأ ہے جو پورے الحمد کو جو بندے کی زبانی خالق کی بارگاہ میں عرض معروض کے لیے اترتا ہے، کلام الہی کا جز بناتا ہے۔

علق وہ حالت ہے جو نطفہ ہونے بعد منزل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد مضغہ ہونے کی کیفیت ہے۔ قرآن مجید نے ابتدائی خلقت میں کہیں اس پہلی منزل سے ابتدا کی ہے کبھی ماء مہین ایک حقیر پانی کہہ کر اور کہیں نطفہ ہی کی لفظ کہہ کر اور مضغہ کا نام لیا ہے۔ یہاں اس درمیانی حالت یعنی علقہ کا نام لیا ہے کہ یہ تینوں ہی حالتیں انسان پر روح کے داخل ہونے سے پہلے پیدا ہوتی ہیں۔

رب کے تعارف میں پہلے صرف خلقت کا ذکر کیا گیا اور متعلق کو اطلاق کے پردے میں چھپا دیا گیا کہ وہ سب ہی کا خالق ہے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ انسانی تخلیق کا تذکرہ کیا کہ اسی سے سورے کے مضمون کا تعلق ہے اور اسے متوجہ کیا گیا کہ اس ابتدا کیوں کرتھی اور اس سے ترقی کر کے وہ انسانیت کی منزل تک آیا لہذا اسے اب اپنے اس جوہر کے تحفظ کے لئے اس کے شایان شان کردار اختیار کرنا چاہیے۔

خلقت کے بعد سب سے بڑی اللہ کی نعمت علم کو قرار دیا گیا ہے اور اس کے تحفظ اور ارتقا کا جو سب سے بڑا ذریعہ یعنی قلم ہے، اس کی افادیت کو انسان کے ذہن نشین کیا۔

اگر خدا کا رسول عام انسانوں کی طرح ماحول کا ساختہ و پرداختہ ہوتا تو ہمارے رسولؐ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور اتنی عمر گزاری تھی، اس کے لحاظ سے وحی اول میں سیف کا ذکر ہوتا مگر تلوار کا ذکر نہ ہونا قلم کا ذکر ہونا اس کی دلیل ہے کہ یہ پیغمبر امن ہے اور دنیا میں امن و امان کا حامی ہے نہ کہ خونریزی کا..... اب اگر خونریزی کی صورتیں پیدا ہوں تو وہ دوسروں کے ہاتھوں ہوں گی۔ اس پر جارحیت کا الزام عائد کرنا غلط ہوگا۔

آخر کا جملہ بتاتا ہے کہ علم بھی انسان کو جو حاصل ہوتا ہے، وہ اصل میں اللہ ہی کا عطیہ ہے لہذا جتنی اُس کی مرضی ہوتی ہے، اتنا ہی وہ علم سے نوازتا ہے اور جب تک وہ چاہے اُس وقت تک باقی رکھے اور جب وہ چاہے اُسے سلب کر لے۔ لہذا کسی کو علمی پندار بھی پیدا ہونا غلطی ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے عطیہ غیر ہے۔ اپنا کچھ نہیں ہے۔

**كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَّاظٍ ﴿١﴾ أَنْ رَأَاهُ اسْتَغْنَى ﴿٢﴾ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَى ﴿٣﴾**

”ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے کہ وہ اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے، حالاں کہ یقیناً تمہارے پروردگار ہی کی طرف پلٹتا ہے۔“

انسان کو اس مرکز فیض و کرم کو یاد رکھنا چاہیے مگر ہرگز نہیں، وہ اسے یاد نہیں رکھتا بلکہ بھول جاتا ہے اور اپنے کو جس چیز پر اسے ناز ہے، خواہ علم پر ہو یا دولت پر اسے وہ اپنی ملکیت سمجھ کر اس سے اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے، اس لیے اس کے مقابلے میں سرکشی سے کام لیتا ہے جب کہ اب بھی پورا سلسلہ اسباب کا اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر پھر کر ہر نعمت اسی کی طرف راجع ہے اور خود اس آدمی کو بھی پلٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ یہ تمہید ہے اس سرکشانہ طرز عمل کے بیان کی جو ابھی سامنے آئے گا۔ انسان بجائے اس کی کہ وہ اللہ کو یاد کرے اس کے یاد کرنے والے کی یاد سے روکتا بھی ہے۔

أَرَعَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ۙ عَبْدًا إِذَا صَلَّى ۙ أَرَعَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَى ۙ أَوْ أَمَرَ

بِالتَّقْوَى ۙ أَرَعَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۙ أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَى ۙ

”کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے، کیا تم نے دیکھا اگر وہ صحیح راستے پر ہے یا پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے، کیا تم نے غور کیا اگر یہ شخص جھٹلاتا ہو اور روگردانی کرتا ہو، کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟“

قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے، بعض مفسرین اُس کا مخاطب رسول ﷺ ہی کو قرار دیتے ہیں مگر ہم اسے درست نہیں سمجھتے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب غیر معین سے خطاب ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسے دیکھنا چاہیے چنانچہ یہاں شروع سے جو کئی دفعہ ”کیا تم نے دیکھا، کیا تم نے دیکھا“ ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ دیکھنے کی بات ہے۔ اب جو ذرا انصاف پسند اور صاحب شعور ہو وہ دیکھے۔ مذکورہ جملوں میں دو ۲ کردار پیش کیے جا رہے ہیں۔ ایک اُس بندے کا جو خاموشی کے ساتھ اپنے پروردگار کی نماز پڑھ رہا ہے، وہ کسی کا کیا بگاڑ رہا ہے جو اسے روکا جائے ”کیا تم نے دیکھا“ یعنی جو ٹھنڈے دل سے دیکھنے سے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ یہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسے روکا جائے۔ دوسرا کردار اُس شخص کا جو بلا وجہ اُسے روک رہا ہے۔ اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر یہ بلا وجہ اس سچے کے پیغام کو جھٹلاتا اور اس سے روگردانی کرتا ہے تو کیا اس کا یہ طرز عمل درست ہے۔

کیا یہ روکنے والا نہیں جانتا کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس میں جزا و سزا کا اعلان مقرر ہے کہ وہ اس بندے کو جو مظلوم ہے نوازے گا اور اُسے جزا دے گا اور اس ظالم کو بلا وجہ اُسے کارنیک سے روک رہا ہے، سزا دے گا۔ روکنے والا شخص ابو جہل تھا جو رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کے پاس نماز پڑھنے سے مانع ہوتا تھا۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَه ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۙ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۙ فَلْيَدْعُ

نَادِيَهُ ۙ سَعَدُ الرِّبَانِيَّة ۙ كَلَّا ۙ لَا تَطِعُهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۙ

”ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آتا تو ہم پیشانی کے بال پکڑ کر اُسے کھینچیں گے، ایسی پیشانی جو دروغ گو اور خطا کار کی پیشانی ہے تو وہ بلائے اپنے مجمع کو، ہم صدا دیں گے اپنے ہر کاروں کو، ہرگز نہیں، اُس کا کہنا نہ مانے اور سر بسجود ہو جائے اور (اپنے پروردگار کا قرب) حاصل کیجئے۔“

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جب ابو جہل نماز میں مانع ہوا تو رسول ﷺ نے اُسے عذاب خدا سے ڈرایا مگر اُس نے اپنے حمایتیوں کی کثرت کا اعلان کیا کہ تم میرا کیا بنا سکتے ہو میرے اتنے مددگار ہیں، اتنی بڑی جماعت میرا ساتھ دینے والی ہے، اس پر جبار و قہار پروردگار نے اُس کے چیلنج کا جواب دیا ہے کہ اچھا وہ اپنے حمایتیوں کو بلا لے، ہم اپنے عذاب والے عمل کو بلا لیں گے، پھر دیکھیں اُسے ہمارے عذاب سے کون بچاتا ہے۔ پھر رسول ﷺ کو اطمینان دلایا گیا کہ آپ کے کہنے میں نہ آئیے، اطمینان کے ساتھ اس طرح نماز پڑھتے رہتے اور اللہ سے تقرب حاصل کرنے کا جو آپ کا طریقہ ہے اُسے جاری رکھیے۔

فقہ جعفری کے لحاظ سے موجودہ ترتیب قرآن کے لحاظ سے یہ چوتھی جگہ ہے جہاں سجدہ واجب ہے۔ پہلے اکیسویں پارے میں سورۃ الحمد سجدہ میں، پھر چوبیسویں پارے میں سورۃ فصلت میں جو لحم سجدہ ہے، پھر ستائیسویں پارے میں سورۃ نجم میں اور پھر آخر میں یہ سورۃ اقرأ کے لفظ اقرب پر..... باقی سجدے جو متعدّد مقامات پر ہیں وہ ہمارے نزدیک مستحب ہیں، واجب نہیں ہیں۔

## سُورَةُ الْقَدْرِ

مکیہ..... ۵..... آیات

پہلی ہی آیت میں لفظ القدر جس پر اس سورے کا نام ہوا۔ اس کے کئی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے لیکن زیادہ تر علماء اسے کئی ہی قرار دیتے ہیں، اس میں قرآن مجید کے شب قدر میں نازل ہونے اور اس رات کی قدر و قیمت کی اہمیت کہ اس میں سال کے اندر ہونے والے بہت سے واقعات کے تقدیر الہی سے فیصلے ہوتے ہیں اور وہ ایک ہزار مہینوں سے افضل و برتر رات ہے جس میں ملائکہ روح احکام الہی لے کر نازل ہوتے ہیں، اور وہ صبح صادق تک مرکز خیر و سلامتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَ مَا اَدْرٰکَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝۳ حٰخِیْرٌ  
مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۴ تَنْزِیْلُ الْمَلٰٓئِکَةِ وَالرُّوْحِ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۝۵ مِنْ کُلِّ اَمْرِ ۝۶  
سَلٰمٌ ۝۷ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۸

”ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا چیز ہے، شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے فرمان کے موافق ہر حکم کو لے کر اترتے ہیں، وہ سلامتی ہی سلامتی ہے صبح صادق تک۔“

”اُسے“ یہ چیز بلاشبہ قرآن مجید کی طرف راجع ہے جیسے دوسری جگہ لیلۃ مبارکہ کہا ہے۔ بابرکت رات اور دوسرے پارے میں جس کی تفسیر پہلے ہو چکی ہے زمانہ تنزیل ماہ رمضان کو بتایا ہے کہ اس مہینے میں قرآن نازل ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شب قدر ماہ رمضان میں کی کوئی رات ہے، بس اس حد تک تعلق قرآن سے ہوتا ہے لیکن اس کے آگے کہ وہ رات کونسی ہے؟ یہ قرآن مجید سے پتہ نہیں چلتا، اس کی روایات و احادیث مختلف ہیں جو فریقین کے یہاں موجود ہیں۔ اہل سنت کے روایات اس بارے میں اتنی کثرت کے ساتھ اختلاف کے حامل ہیں کہ ان کی بنا پر چالیس ۴۰

قول ہو گئے ہیں، جن میں ترجیح اُن کے یہاں اکثر علماء کے نزدیک ۲۷ رمضان کو ہے۔ شیعہ روایات کی بنا پر زیادہ ترجیح تین راتوں کو ہے۔ اُنیس، اکیس، اور تیس لیکن ان روایات میں بھی زیادہ ترجیح اسی آخری قول کو ہے جو تیس ۲۳ ماہ رمضان کے متعلق ہے، قرآن کے نازل کرنے کا شب قدر میں کیا مطلب ہے؟ اس پر مقدمہ تفسیر میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ مسائل آپس میں دست گریاں رہتے ہیں لہذا اس کا تعلق کلام نفس اور خلق قرآن وغیرہ کی بحث سے بھی ہو جاتا ہے اور پھر تاریخی طور پر اس صورت میں جب اس کے معنی یہ لیے جائیں کہ ابتداء نزول قرآن کی اس رات میں ہوئی تو اُس کا اثر واقعہ بعثت پر پڑتا ہے کہ اس میں شیعہ و سنی اختلاف ہے۔ اہل سنت اسی شب قدر کو آغاز بعثت بتاتے ہیں اور شیعہ روایات میں ۲۷ رجب عید بعثت مانی جاتی ہے کہ بعثت رسول ﷺ ظاہری طور پر اس رات کو ہوئی ہے یعنی کہ پہلی مرتبہ فرشتہ وحی لے کر اسی رات کو آیا۔

قدر کے معنی یوں تو قدر و منزلت کے بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ بڑی عظیم القدر رات ہے مگر چونکہ پہلے اُس لیلہ مبارکہ کے لئے آچکا ہے کہ **فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ**۔ (الدخان: ۴) ”اس میں ہر بات کا جو حکیمانہ فیصلہ کیا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ تقدیرات کے ایک وسیع احاطہ کے محفوظ رہتے ہوئے جو ازل سے طے ہے اس رات کو کچھ اہم فیصلے ہوتے ہیں۔ اس طرح اُس سے اُس بداء کے مسئلہ کا تعلق ہو جاتا ہے جو بہت ہی اہم علم کلام کا مسئلہ بن گیا ہے مثلاً کچھ عروں میں اضافہ اور کچھ عروں میں کمی اس طرح اور تقدیر کے بہت سے اور فیصلے ہوتے ہیں۔ جو بغیر بداء کو مانے ہوئے سمجھ میں نہیں آسکتے یعنی اگر کسی نے یہ سمجھ لیا کہ ازل میں جو کچھ طے ہو گیا تھا اب خدا اس کا پابند ہے تو یہ غلط ہے تو پھر آخر یہ کون امور ہیں جنہیں کہا گیا ہے کہ شب قدر میں طے پاتی ہیں اور یہی احکام تشریحیہ نہیں، احکام تکوینیہ ہوتے ہیں جن کے احکام لے کر فرشتے اور روح اس شب میں اترتے ہیں اور یہ فجر یعنی صبح صادق تک ہر آفت و بلا سے سلامتی کا ذریعہ ہے بشرطیکہ خود انسان ان احکام پر عمل کرے جو تشریحی طور پر اس کی ذمہ داری سے وابستہ ہیں۔

## سُورَةُ الْبَيِّنَاتِ

مکیہ ..... ۸ ..... آیات

اس سورے کے بھی کئی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔

نام اس کے ”کھلے ہوئے ثبوت“ کے معنی میں پہلی آیت کا جزء ہے۔ وہ اس کے بعد کے مضامین دونوں ایسے ہیں جو مکہ اور مدینہ دونوں جگہ کے لئے مشترک حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے اُن سے بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس میں رسول ﷺ کی بعثت اور کھلے ہوئے دلائل کے ساتھ جو اکثر قرآن میں لفظ بیئۃ کے ساتھ معجزات کے معنی میں ہوتے ہیں، اُن کی حقانیت کا اعلان ہے اور آخر میں مومن اور غیر مومن دونوں کے آخری انجام پر سورے کو ختم کیا گیا ہے، یہی انسانوں میں بہتر سے بہتر اور بد سے بدترین حد کا حل ہے جس کے درمیانی درجے بھی اسی اعتبار سے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“



لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ

الْبَيِّنَاتُ ۝ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيهَا كُتِبَ الْقِيَمَةُ ۝

”اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ اس سے چھٹکارا نہیں پاسکتے تھے جب تک کہ ان کی طرف ایک روشن رہنمائی آنے جائے، وہ اللہ کا پیغمبر جو اللہ کی طرف کے پاک و پاکیزہ صحیفے پڑھ کر سنائے جس میں بالکل درست تحریریں موجود ہوں۔“

کفر میں تو وہ سب شریک ہیں مگر مشرک کا لقب جب اہل کتاب کے ساتھ الگ سے بولا جائے تو اس سے وہ بت پرست مراد ہوتے ہیں جن کے پاس نام کی بھی کوئی آسمانی کتاب موجود نہ تھی جسے وہ پڑھتے ہوں، یوں وصف کے لحاظ سے اہل کتاب بھی شرک میں مبتلا ہو گئے تھے مگر لفظ مشرکین بحیثیت لقب اُن کے لئے استعمال نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے احکام شرک جو کفر و شرک کی بنا پر ہیں وہ اُن کے لئے بھی ثابت ہیں۔ پھر بھی نام کے لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔ اس لئے احکام فقہیہ میں یہ اجتہادی چیز جزء بن گئی کہ کس حد تک احکام کا تعلق شرک کے ساتھ بحیثیت لقب کا ہے اور کس حد بحیثیت وصف۔

یہاں اہل کتاب کے لئے جو کافر کے لفظ کا اطلاق ہے، وہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ اُن سچائیوں میں سے اکثر سے بھی منحرف ہو گئے تھے جو خود اُن کتابوں میں بھی صحیح صورت پر موجود تھیں، نیز یہ کہ اُن کتابوں میں بھی تحریف کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔ اُن کا ان گراہیوں سے چھڑانا ضروری تھا جو ممکن نہیں تھا اُس وقت تک جب تک اللہ کی طرف کی صحیح رہنمائی ایک سچے رسول کے ذریعہ سے پھر اُن کے سامنے نہ آئے، اُس کے لئے خالق نے اپنے اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا جو انہیں اُن کی غلطیوں پر متنبہ کرے۔

کسی نہ کسی قسم کے کفر میں مبتلا وہ سب ہی تھے خواہ اہل کتاب ہوں، خواہ مشرکین اس لئے من اہل الکتاب والمشرکین میں جو من کا لفظ ہے، یہ تعین کے لئے نہیں ہے کہ بعض اُن میں سے کفر میں مبتلا ہے اور کچھ نہ تھے بلکہ یہ بیان کے لئے ہے کہ وہ جو کافر ہیں، دو قسم کے لوگ ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ ۝ وَمَا أَمْرًا

إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ هُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۝ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا

الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ ۝

”اور اُن میں سے کہ نہیں کتاب ملی تھی تفرقہ نہیں پڑا مگر اس کے بعد کہ اُن پاس کھلا ہوا بیان حقیقت کا آچکا تھا اور انہیں پہلے بھی حکم یہی ہوا تھا کہ وہ بس اللہ کی عبادت کریں اور سب غلط راستوں سے ہٹ کر دین کو اُس کے لئے خالص رکھیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی بالکل صحیح و درست دین ہے۔“

یعنی ہر نبی کا آنا اور ہر کتاب کا نازل کیا جانا اسی لئے رہا ہے کہ خالق کی طرف سے اتمام حجت ہو جائے تاکہ اس کے بعد جو تفرقہ اُن میں پیدا ہو اُس کی ذمہ داری خود اُن پر ہو، خالق کی طرف کی ہدایت میں کوئی کمی نہ رہنے پائے، اب اس کے بعد بھی جو نہ مانیں، اُن کے کفر کا خدا ذمہ

دار نہیں ہے کیوں کہ خدا کو جبری طور سے ہدایت کرنا نہیں ہے بلکہ ہدایت کر کے انہیں اختیار کے صرف کاموقع فراہم کرتا ہے اور اسی پر سزا و جزا کی بنیاد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ط  
 أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ٦  
 ”یقیناً اہل کتاب اور مشرکین جو کفر میں مبتلا ہیں دوزخ کی آگ میں ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں۔“

”دوزخ کی آگ میں ہیں“ اس کا مطلب عمومی طور پر دوسری آیات قرآن کی روشنی میں یہی ہے کہ یہ ان کا کفر انہیں عذاب دوزخ کا مستحق بنائے ہوئے ہیں جس میں داخل ہونے کے بعد پھر وہاں سے نہیں نکلیں گے ہمیشہ ہمیشہ جلتے رہیں گے اور جو لوگ تجسیم اعمال کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہی کفر ان کا آگ کے شعلوں کی شکل اختیار کر لے گا جس میں وہ ہمیشہ جلتے رہیں گے اور اس آیت کی روشنی میں استثنائی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسی دنیا میں ایسا عذاب آجائے جس کا سلسلہ قیامت تک جاری ہے کبھی ختم نہ ہو، یہ وہ ہیں جو اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے ایسے کردار کی منزل پر پہنچ گئے کہ وہ بدتر خلائق ہو گئے۔ اس لئے کہ دوسروں کے نقائص طبعی حیثیت رکھتے ہوئے انہیں اس سزا کا حق دار نہیں بناتے اور یہ عقل و شعور اور امتیاز حق و باطل کے لئے عقل رکھتے ہوئے پھر بھی اس پستی کردار میں مبتلا رہے کہ وہ جمادات، نباتات اور حیوانات سے بدتر ہو گئے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۖ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ٧ جَزَاءُ لَهُمْ  
 عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ عَدْنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ط رَضِيَ اللَّهُ  
 عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ط ذَلِكَ لِمَنْ حَشِيَ رَبَّهُ ٨

”بے شک جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے، یہ بہترین مخلوقات ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے یہاں وہ بہشت ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ سب اس کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتا رہے۔“  
 خدا سے ڈرتا ہے یعنی ہمیشہ اس کا لحاظ رکھے کہ کوئی بات اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو، اُس کے اس کردار سے اللہ مطمئن رہے اور یہ اُس کی طرف کے اس صلے سے جو اُس نے انہیں دیا ہے، صدق دل سے مطمئن ہیں۔

# سُورَةُ الزَّلْزَالِ

مکیہ..... ۸..... آیات

اس میں پہلا ہی لفظ جو اذلززلت کی ہے اُس پر سورے کا نام ہو گیا اور مدنی ہونے کا اختلاف اس سورے میں بھی ہے، بر بنائے روایات قوت اسے سمجھی گئی کہ یہ مدنی سورہ ہے اس لئے پیشانی پر یہی لکھا جاتا ہے لیکن مضمون اس کا مکلی ہونے سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے قیامت کی ہولناک کیفیت، اور زمین کے اندر کی چیزوں کا اوپر آجانا یعنی مُردوں کا دوبارہ زندہ ہو کر باہر آجانا اور پھر ذرا بھی عمل خیر کیا ہو، تو اُس کے نتیجے کا اور جو غلط عمل کیا ہو، اُن کے نتیجے کا سامنے آجانا جس پر سورہ ختم کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝۲ وَقَالَ الْاِنْسَانُ

مَا لَهَا ۝۳ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا ۝۵

”جب زمین پورے طور پر ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے تمام بوجھوں کو نکال کر باہر کر دے گی اور آدمی کہے گا کہ یہ اسے کیا ہو گیا ہے، اس دن وہ اپنے اوپر کی تمام خبروں کو بیان کرے گی اس لئے کہ تمہارے پروردگار کا اُسے ایسا حکم ہوگا۔“

قیامت والے زلزلے کے بعض کیفیات قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئے ہیں جن سے مجموعہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک زلزلہ قیامت کے آنے سے پہلے بطور تمہید ہوگا اور ایک زلزلہ خود قیامت میں ہوگا۔ اس لئے یہاں جو زلزلہ ہے اُسے اکثر یہی سمجھا گیا ہے کہ یہ دوسرے زلزلے کا بیان ہے جس کے لئے پہلے سورہ انشقاق میں آچکا ہے کہ القت ما فیہا وتخلت جو کچھ اُس کے اندر تھا سب کو باہر کر دیا اور وہ خالی ہو گیا۔ یہاں کہا جا رہا ہے کہ اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر ڈال دیا۔ اس سے ایسا بھی سمجھا گیا ہے کہ مردے جو دفن ہو چکے تھے وہ سب باہر آگئے اور جو کچھ سونا، چاندی، جواہرات وغیرہ زمین کے اندر تھا وہ سب باہر آ گیا جس سے ان انسانوں کو حیرت بھی ہوئی اور اپنی ناکامی کا مزید احساس جزء عذاب کے طور پر کہ یہی وہ دولت تھی جس پر میں جان دیتا تھا ارج وہ سب میرے سامنے ہے اور نہ میں اُس سے کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہوں، نہ وہ میرے کسی کام آسکتی ہے۔ اور اس لئے اس حیرت و پریشانی کی صورت اُنہی کے لئے سمجھنا چاہیے جو اس کے منکر تھے۔ اب وہ سب جس کا وہ انکار کرتے تھے، اُن کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اہل ایمان جو سورہ فجر میں نفس مطمئنہ کا حامل بتایا جا چکا ہے انہیں حیرت وغیرہ کی کیفیت یوں طاری نہ ہونا چاہیے کہ جسے وہ ازاول صدق دل سے مانتے تھے، وہ سب اُن کی آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے، نہ اس دولت کو پہلے اُنہوں نے قابل لحاظ سمجھا

۔ نہ اب اُن کے لئے کوئی قدر و قیمت رکھتی ہے اور اب اُنہیں اُس کی ضرورت بھی بالکل نہیں کیونکہ خدا کی مستقل نعمت اور کرامت بطور جزاء اُن کے سامنے ہے جس کا ابھی ابھی ذکر آئے گا۔ اسی طرح وہ زمین جو سب کے لئے گزارہ بسر اور فائدوں کا مرکز تھی، اب کافروں کے خلاف بطور گواہ اُن کے کردار کو بیان کر رہی ہے اور مومنین کے حسن عمل کے لئے بطور گواہ اُن کے عمل خیر کے اُن کے کارناموں کو پیش کر رہی ہوگی اور یہ اس لئے کہ وہ سب بے زبان چیزیں جو پہلے خاموش تھیں بحکم خدا آج بول رہی ہیں جیسے خود ان کی زبان جو پہلے کافروں کے ارادے کی پابندی تھی، آج ان کی گرفت سے بالکل نکل چکی ہے۔ یہاں بیچ بیچ میں اب بھی کچھ ان کی حسرتوں اور تمنائوں وغیرہ کی شکل میں ان کی ترجمان بنا دی جائے گی۔ یہ بھی حقیقت میں خدا ہی کی طرف سے اُن کے عذاب کا ایک جزء ہوگا جیسا کہ زمین کے لئے آخر میں کہا گیا ہے کہ بائ ربک ادجی لہا اس لئے کہ تمہارے پروردگار نے اُسے ایسا حکم دیا ہوگا۔ یہ حکم وہی کُن کی طرح کا حکم ہے کہ ”ہوجا“ اور وہی ہو رہا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۗ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

حَبِيرًا يَبْرَهُ ۗ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَبْرَهُ ۗ ۝۸

”اس دن لوگ جدا جدا اپنی منزل تک پہنچیں گے تاکہ اعمال اپنی آنکھوں سے اُنہیں دکھائے جائیں تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی اُسے بھی دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر بُرائی کی ہوگی اُسے بھی دیکھ لے گا۔“

بظاہر قبروں سے تو ایک ساتھ برآمد ہوں گے لیکن سوال و جواب اور حساب و کتاب وغیرہ سب کے بعد آخری منزل الگ الگ ہے۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کام کی خواہ اچھا ہو یا برا، ایک وزن ہے، کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو حقیر سمجھ کے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور کسی چھوٹی سے چھوٹی بُرائی کو عمل میں نہیں لانا چاہیے کیونکہ وہی چھوٹی نیکیاں بڑی نیکی کی شکل اختیار کرتی ہیں اور وہی چھوٹی بُرائیاں مل کر بہت بڑی بُرائی بنتی ہے۔ تو وہ نیک کام چھوٹا حقیر ہے۔ اور نہ یہ بُرا کام چھوٹا سے چھوٹا بے اثر ہے اُس کا نتیجہ بھی آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ ہاں اہل ایمان کے لئے توبہ و مغفرت کا دروازہ اس سے بند نہیں ہوتا لیکن کفار و منافقین کو اُن کے اصولی اور فروعی دونوں ہی قسم کے افعال و اعمال کی سزا مل کر رہے گی جس سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

## سُورَةُ الْعَدِيَّتِ

مکیہ ..... ۱۱ ..... آیات

ہمارے یہاں کی ایک روایت سے جس کی تفصیل قرأت ابراہیم کوفی میں ہے۔ اس میں مدنی ہونے کا پتہ چلتا ہے لیکن عام طور پر مفسرین اُسے مکیہ قرار دیتے ہیں۔ اور عادیات کے معنی دوڑنے والے لگھوڑے کے ہیں۔ تو یہ میدان جنگ میں جو عام طور سے عربوں کی زندگی کا جزء تھی قسم کے ذریعہ سے اُن کی ضروریات حیات کے لحاظ سے جو اُن کے ماحول کا ضروری جزء تھا مثل آسمان اور زمین کے جن کی قسمیں کھائی گئیں

ہیں قسم کے ذریعہ سے ذہن کو متوجہ کیا گیا ہے اور اُس لحاظ سے اس کا یہ نام ہوا۔ جس کے ساتھ اُن کا اس طرز عمل کے نتیجہ کی بے وقعتی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں آخرت کی فکر کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور منعم حقیقی کو شروع سے لے کر آخر تک اُسے یاد دلا گیا ہے وہ ان نعمتوں کی وقعت سمجھتا ہے اور پھر اس منعم کا تصور نہیں کرتا جس نے یہ نعت عطا کی ہے۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَالْعَدِيَّتِ صَبْحًا ۱۱ فَاَلْمُورِيَّتِ قَدْحًا ۱۲ فَاَلْمُعِيْرِيَّتِ صُبْحًا ۱۳ فَاَثْرُنَ بِهٖ  
نَقَعًا ۱۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۱۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۱۶ وَاِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ  
لَشٰهِيْدٌ ۱۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۱۸

”قسم پھنکارے مارتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں کی جو (اپنی ٹاپوں کی زد سے) پتھروں سے آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں تو اُس سے غبار اُڑاتے ہیں اور کسی جماعت کے درمیان پہنچ جاتے ہیں، یقیناً انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح گرفتار ہے۔“

اگر سورہ مدنی مانا جائے تو مجاہدین کے گھوڑے ہیں جن کی قسم کھانی جا رہی ہے مگر جیسا کہ عام طور پر مفسرین کا فیصلہ ہے جب کہ وہ مکہ کی سورہ ہے اور جہاد بالسیف کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تو یہ وہی عام طور سے عرب کے گھوڑے مراد ہوں جو اُن کی زندگی کے ہر شعبے میں ان کے مددگار تھے اور اُن سے وہ آس پاس کے قبیلوں پر چھاپے مارتے تھے انہی گھوڑوں کی یہ قسم ہے کہ اُن کے گویا بسر معاش کا ایک لازمی جزء تھا۔ جس سے ان کا برابر ساتھ تھا جیسے عام زندگی کے سفروں میں اونٹ ہوتے تھے، ویسے جنگ کے میدان کا گھوڑے کے ساتھ تعلق تھا۔ لہذا اُن کے ذہن کو اس کی طرف موڑنے کے لئے اُن کے اس جزو زندگی کو سامنے لا کر انہیں بتایا ہے کہ یہ سب کچھ تم اُس مال و دولت کی طلب میں کرتے ہو جس کا ذریعہ تمہارے نزدیک یہی ہے لیکن اس کے ساتھ جو سب سے بڑی بات تمہارے سوچنے کی ہے اُس پر غور نہیں کرتے کہ آخر تمہیں وہ طاقت کہاں سے ملتی ہے جس سے تم اپنے فریق مقابل پر حملہ آور ہوتے ہو تو اُس کے نتیجہ میں جو دولت حاصل ہوتی ہے، اُس کے لئے یہ سوچنا چاہیے کہ اُس کا دینے والا کون ہے اور اُس پر مغرور و سرکش نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں ناشکرے ہونے کے اظہار سے اس حقیقت پر بھی انتباہ ہے کہ یہ طریقہ صرف طاقت کا اس منعم کی نعت کی ناقدری ہے جس سے کمزوروں کو پامال کی جائے اور امن و امان کو غارت کیا جائے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۱۹ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۲۰ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهٖمْ

یَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۲۱

”تو وہ کیوں نہیں جانتا کہ جب قبروں میں جو کچھ دفن ہے، وہ نکال لیا جائے گا اور سینہ میں جو کچھ چھپا ہوا ہے، یقیناً ان کا پروردگار اُن کے حالات سے باخبر ہے۔“

یعنی وہ مردے بھی جو دفن ہو چکے ہیں، سب باہر آجائیں گے اور دلوں کے اندر جو پوشیدہ ہیں وہ بھی سب ظاہر ہو جائیں گے، اس وقت اُن کے سب اعمال کا جائزہ لیا جائے گا، اور یوں تو خدا پہلے ہی سے اُن سے واقف ہے، وہ خود ان کی اپنے خلاف گواہیاں اور یہ سب آنکھوں کے سامنے لے آیا جائے گا۔ جزا و سزا کی حقانیت کا ہر پہلو سے ثبوت ہے جو مکمل طور پر قیامت میں سب کے سامنے آجائے گا، ورنہ اللہ کا ذاتی علم اُن کے افعال و اعمال سے متعلق بجائے خود اُس کی طرف کی سزا ہے۔

## سُورَةُ الْقَارِعَةِ

مکیہ ..... ۱۱ ..... آیات

قارِعہ قیامت کو کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں عظیم حادثہ، یہی اس سورہ کا نام ہے اور پورا سورہ اس کی کیفیت کا حامل ہے، اس کی ابتدا کا بھی ذکر ہے اور اُس کی انتہا کا بھی جو حسن انجام اور بد انجامی کی صورت میں اہل ایمان اور کافروں کے سامنے آنے والی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

الْقَارِعَةُ ۱ مَا الْقَارِعَةُ ۲ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ۳ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ  
كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۴ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۵ فَأَمَّا مَنْ  
ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۶ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۷ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۸ فَأُمُّهُ  
هَارِيَةٌ ۹ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَةٌ ۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۱۱

”وہ بڑا حادثہ اور کیا ہے وہ بڑا حادثہ اور تم کیا جانو کہ وہ بڑا حادثہ کیا ہے؟ جس دن سب لوگ مثل منتشر پروانوں کے ہوں گے اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کے ایسے ہونگے تو جس کے (نیک اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے وہ اپنے پسندیدہ عیش و آرام میں رہے گا اور جس کے (اعمال کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو گہرا گڑھا اُن کا مرکز رہے گا اور تم کیا جانو وہ کیا ہے۔ وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی۔“

قارِعہ اصل میں دھماکے والی چیز کو کہتے ہیں جس سے دل ہل جائیں، کوئی بڑی آفت و بلا چونکہ ایسی ہی دھمک والی چیز ہوتی ہے، اس لئے اُسے قارِعہ کہتے ہیں اور سب سے بڑی دل ہلا دینے والی مصیبت قیامت کی ہے اس لئے قرآن میں قیامت کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔ یوں اس سے کم درجہ کی کوئی آفت اس دنیا کی ہو تو اُس سے بھی بعض جگہ قرآن میں قارِعہ کہا گیا ہے مگر قیامت عظیم ترین حادثہ ہے تو وہ سب سے بڑے ”قارِعہ“

کی حیثیت رکھتی ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔

”انسان مثل منتشر پروانوں کے پھیلے ہوئے ہوں گے“ چونکہ اس کے ساتھ پہاڑوں کا اُون کی طرح ادھر ادھر پراگندہ ہونے کا ذکر ہے، تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی قیامت کے قبل کا تذکرہ ہے جب کہ ابھی سب لوگوں کی موت نہیں آئی ہے تو جن کے سامنے یہ آفت برپا ہے وہ گھبرائے ہوئے ادھر ادھر پراگندہ پھر رہے ہیں۔ اب اُس کے برے اعمال خیر کے پلڑے کے بھاری ہونے سے حسن انجام اور پلڑوں کے ہلکے ہونے سے جو بد انجامی کا تذکرہ ہے وہ قیامت آنے کے نتیجہ کا اظہار ہے کہ اب جزا و سزا کی منزل سامنے آگئی ہے۔

یہاں ایک فریق کا انجام جو ”ہمیشہ رَاضِيَةٌ“ کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے اس میں باعتبار مراتب بہت درجے ہیں اور مقابل فریق کے لئے جس بد انجامی کا ذکر ہے اُس میں بھی بہت طبعے ہیں جو الگ ہیں۔ ان کے درمیانی منزلوں کا اظہار یہاں نہیں کیا گیا ہے۔

## سُورَةُ التَّكْوِيْنِ

مکیہ ..... ۸ ..... آیات

پہلی ہی آیت میں ”التکائر“ کا لفظ ہے جس پر اس سورے کا نام ہوا۔

اس میں انسان کی ہوس جو مال و اولاد وغیرہ کی کثرت میں اندھا دھند استعمال سے وابستہ ہے اُس کی مذمت اور اُس کے نتیجہ میں جو تباہی اور بربادی انسان کے سامنے آتا ہے اُسی پر اُس کی بیداری کا سامان فراہم کرنا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اَلْهُكْمُ التَّكْوِيْنِ ۱ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۲ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۳ ۝ ثُمَّ كَلَّا

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۴ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۵ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۶ ۝ ثُمَّ

لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۷ ۝ ثُمَّ لَتَسْأَلَنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۸ ۝

”تم لوگوں کو مدہوش بنا رکھا ہے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی فکر نے یہاں تک کہ اسی فکر میں تم قبروں تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا پھر (سمجھ لو کہ) عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں، اگر تم یقینی طور پر انجام سے واقف ہوتے (تو ایسا نہ کرتے) ضرور ضرور تمہیں دوزخ کا

سامنا ہوگا، پھر تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلب ہوگا۔“

تکاثر میں کثرت حاصل کرنے کی فکر میں اندھا دھند سرگرمی بھی ہے اور پھر اُس پر سرمایہ فخر بنا کر ایک دوسرے کے مقابلہ میں پیش کرنا بھی ہے۔ جس کے لئے ایک روایت ہے کہ عرب دو قبیلوں میں آپس میں جو بحث مبحثا ہوئی تو اپنے کارناموں کو اپنی کثرت مال و اولاد اور قبیلہ کو پیش کرتے کرتے وہ قبرستان بھی چلے گئے اور وہاں قبروں کا شمار کر کے بھی پیش کرنے لگے۔ مگر قرآن اس سب کے انجام پر توجہ دلاتے ہوئے لازمی فرائض سے غفلت کی وجہ سے اُس دوزخ کو یاد دلا رہا ہے جس کا انہیں سامنا کرنا ہے اور وہاں ان نعمتوں کے شمار کے ساتھ اُن کے استعمال کے متعلق جواب طلب ہوگا کہ تم بس زیادتی حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہے اور اُن کے استعمال میں جو فرائض عائد تھے اُس کا خیال نہ کیا، اُس کے نتیجے میں اب یہ جہنم کی سزا بھی بھگتنا ہے۔

## سُورَةُ الْعَصْرِ

مکیہ ..... ۳ ..... آیات

عصر کی قسم سے آغاز ہے، اس لئے یہی نام ہے۔

اس میں انسان کی فلاح و نجات کا معیار اور اُس کے مقابل کے بڑے خسارے کا اظہار ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَالْعَصْرِ ۱ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۲ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

وَتَوَّاصَوْا بِالْحَقِّ ۳ وَتَوَّاصَوْا بِالصَّبْرِ ۴

”قسم زمانے کی یقیناً انسان خسارے میں ہے سوا اُن کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کرتے رہیں اور ایک

دوسرے کو حق کی ہدایت اور صبر و تحمل کی تلقین کرتے رہیں۔“

اگر قسم اظہار شرف کے لئے ہو تو یہ الف لام عہد کا ہوگا جس سے اشارہ خاص کی طرف ہوتا ہے یعنی اس دور زمانہ کی قسم اور یہ وہ زمانہ خاص ہے جو اُس کے حیثیت سے تعلق خاص رکھتا ہے تو اُس شہر کی قسم کھائی جو اُس کا ظرف مکان تھا، ویسے ہی اُس طرف زمان کی جو اُس سے مفتر و مشرف ہے اور اگر قسم بعد والے مطلب کے لئے ثبوت کے طور پر ہے تو مطلب یہ ہے کہ خود زمانہ اُس نقص کے اظہار کے لئے کافی ہے جو اب بیان ہو رہا ہے۔ یہ نقص ممکن الوجود یعنی مخلوق ہونے والی ذاتی کمی نہیں ہے جو واجب الوجود یعنی ذات الہی کے علاوہ ہر شے کو حاوی ہے مگر یہ تجارت کی اصطلاح ہے کہ جب کاروبار کے سلسلہ میں جتنا تھا، اُس سے اضافہ ہو جائے تو اُسے ربح کہتے ہیں جیسے قرآن میں ہے فارححت تجارتہم اور جب



کئی ہو جائے اور جو پونجی تھی وہ نابود یا کالعدم ہو جائے تو اُسے اُردو میں گھانا، فارسی میں زیاں اور عربی میں خسر کہتے ہیں جس سے اُردو میں لفظ خسارے کی ہوئی۔ اور عربی میں بھی خسر کے علاوہ خسار کا لفظ مستعمل ہے اور اسی لئے اس خسارے کے امتیازی طور پر انسان کے لئے بتایا گیا ہے کیوں کہ انسان کے علاوہ کوئی دوسری مخلوق اتنی پکدار نہیں ہے جس میں ترقی اور تنزل کے اتنے امکانات ہوں جتنے انسان میں ہیں کہ وہ بد سے بدتر بھی بن سکتا ہو اور بہتر سے بہتر بھی اپنے اس جوہر اختیار کے صحیح و غلط استعمال سے جس کا وہ حامل ہے اس لئے اُسے کہا گیا ہے کہ وہ خسارے میں ہے۔ اگر کلام الہی اتنے پر ختم ہو جاتا تو یہ مطلب نکلتا کہ سب ہی خسارے میں ہیں مگر جب کلام آگے بڑھایا اور اللہ کے ذریعہ سے استثناء ہو گیا تو اب یہ تھا کہ اگر یہ اوصاف موجود ہوں، جن کا بعد میں ذکر ہے، تو وہ نفع میں ہے اور خسارے سے بری ہے لیکن اگر یہ اوصاف موجود نہ ہوں تو وہ اس خسارے میں ہے جس کا عام طور پر اُس کے لئے اظہار کیا گیا ہے۔ یہ چار ۴ وصف حسب ذیل ہیں۔

پہلے ایمان جس کے معنی اُن حقیقتوں کو تسلیم کرنا جنہیں دین پیش کرتا ہے اور جن سے انسان دنیا و آخرت کی کامیابی مضمحل ہے اور دوسرے عمل صالح یعنی اُن حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے عملی تقاضوں کو پورا کرنا ہے اور چونکہ خدا کی ہر نعمت، اُسے ایک میں محدود ہو کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُس کا فیض دوسروں تک پہنچانا چاہیے، اس لئے ایمان جب متعدی غیر کی طرف ہوتا تو اُس کا اظہار تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کی لفظوں سے ہوا اور عمل صالح دوسروں تک متعدی ہونے کے لئے تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کی لفظیں ہیں کیونکہ صبر کے معنی خاموشی کے ساتھ حربوں کی برداشت کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس میں فرائض کی پوری دنیا سمٹی ہوئی ہے یعنی اُس جادے پر ثابت قدم رہنا جس پر اُسے چلنا چاہیے، چاہے کتنی ہی ناگواریاں سامنے آئیں۔ اس لئے علماء نے کہا ہے کہ صبر کی دو قسمیں ہیں۔

ایک صبر عن المحبوب یعنی گوارا طبع اور پسندیدہ چیز کے چھوٹنے پر صبر اور دوسرے صبر علی المکر و العین ناپسند بات کے اختیار پر صبر۔ پہلے میں تمام حرام باتوں کا ترک داخل ہے اور دوسرے میں تمام واجبات کا مثبت طور پر عمل میں لانا یہی دونوں شعبے مل کر عمل صالح ہوتے ہیں اور انہی کی دوسروں کو دعوت دینے کا نام تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کا مصداق ہے۔

## سُورَةُ الْهُمَزَةِ

مکیہ ..... ۹ ..... آیات

پہلی ہی آیت کی ایک لفظ پر اس کا نام ہوا۔ اور یہ دوسروں پر چشمک زنی اور اُن کے عیوب کو بیان کر کے اُن کی توہین و تذلیل اور پھر اپنے مال و دولت پر فخر و غرور وغیرہ ایسی برائیوں پر جو عرب میں بہت زیادہ رائج تھیں متنبہ کر کے اُس کے نتیجے کی یاد دہانی کے لئے اُتری ہے اس لئے اُس کو نام میں بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور وہی اس سورے کا موضوع بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝  
 كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللَّهِ الْمَوْقَدَةُ ۝ الَّتِي  
 تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِدَةِ ۝ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَسَّدَةٌ ۝ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

”وائے گن گن کر رکھا، کیا وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے مال نے اُسے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی دے دی۔ ہرگز نہیں، وہ چورا چورا کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ وہ چورا چورا کر دینے والی جگہ کیا ہے؟ اللہ کی خاص بھڑکتی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچے گی، وہ اُن پر چاروں طرف سے ڈھاک کر بند کر دی جائے گی، لمبے لمبے ستونوں کے احاطے میں۔“

دوسروں کی توہین و تذلیل کی بہت صورتیں ہوتی ہیں۔ منہ پر بھی طعن کرنا، اشاروں، کنایوں سے اور ہاتھوں اور بھوڑوں اور آنکھوں کے اشاروں سے اُن کی توہین و تذلیل کرنا اور پیٹھ پیچھے بھی اُن کی برائیوں کو اچھالنا۔ یہ سب ہی ان دونوں لفظوں میں (ہمزۃ لمزۃ) مضمربیں، اسی کی ایک شکل پھبتیاں کسنا ہوتی ہیں جو اکثر شہرت عام حاصل کر کے اُس شخص کی مستقل توہین و تذلیل کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ یہ سب باتیں اُس وقت بھی رائج تھیں اور اب بھی کم و بیش ہر معاشرہ میں پائی جاتی ہیں اور مال دنیا کی ہوس اور اُس کی طرح طرح سے حفاظت کی فکر اور برابر اعداد و شمار کا محفوظ رکھنا کہ اس میں اضافہ ہوتا رہے جیسے کہ وہ اس دنیا میں ہمیشہ رہے گا اور یہ مال بھی اُس کے پاس ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہے گا حالانکہ چونکہ یہ سب واجب الادا فرائض کی فکر سے غافل رہتے ہوئے اور اُن کو نظر انداز کرتے ہوئے ہے تو نتیجہ میں ایسی بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں اُسے جلنا ہے جسے اُس کی ہولناکی کو دکھانے ہی کے لئے اُس کی خاص نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے جس آگ کا اور اُس کا تمہیں مشاہدہ ہوا کرتا ہے وہ تو آدمیوں کی بھڑکائی ہوئی آگ ہوتی ہے۔ اور وہ آگ خاص اللہ کی بھڑکائی ہوئی ہے جسے امیر المؤمنین نے ایک محل پر ایسا فرمایا ہے کہ ستر جرہا الجبار لغضیہ ”اُسے جبار و قہار خدا نے اپنے خاص غضب نازل کرنے ہی کے لئے بھڑکایا ہے تو اُس کی شدت قوت کا اندازہ اس دنیا کی آگ سے کہاں کیا جاسکتا ہے۔ وہ چاروں طرف سے اُنہیں ایسا گھیرے میں لئے ہوگی کہ ہر طرف سے بند ہوگی، کہیں باہر کی طرف نکلنے کے لئے دروازہ کیسا وزن بھی نہ ہوگا۔“

اب یہ لمبے ستون خواہ اُس احاطے کے سمجھے جائیں جو انہیں گھیرے ہوئے ہے اور خواہ جیسا کہ بعض نے سمجھا ہے اُس آگ کے لمبے لمبے شعلے ہوں جو انہیں چاروں طرف سے گیرے ہوئے ہیں؟

یہ آگ دلوں تک پہنچتی ہے۔ اپنی حرارت اور طپش کے ساتھ بھی اور اس ضمیر کی کرب و اذیت کے ساتھ بھی جو اپنے جرائم کے احساس کی وجہ سے انہیں مستقل طور پر ہے جسے ایک جگہ کہا گیا ہے: إِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكُفْرِيِّينَ. (الحاقة: ۵۰) ”وہ کافروں کے لئے مستقل حسرت و ناکامی کے احساس کا ہنگام ہوگا۔“

# سُورَةُ الْفِيلِ

مکیہ ..... ۵ ..... آیات

چونکہ اس میں خانہ کعبہ پر جو ہاتھیوں کے ساتھ حملہ ہوا تھا، اُس سے جو خانہ کعبہ کی خدا نے حفاظت کی اُس کا اظہار ہے اور وہی اس سورے کا موضوع ہے اور اُس پر اس کا نام ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ۙ۱ اَلَمْ یَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِی تَضْلِیْلِ ۙ۲  
وَاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۙ۳ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلِ ۙ۴ فَجَعَلَهُمْ  
كَعَفْفٍ مَّا كُوْلٍ ۙ۵

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اُس نے اُن کی ترکیب کو بے کار نہیں کر دیا اور اُن پر غول پر غول کے بھیج دیئے جو اُن پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، تو انہیں ایسا کر دیا جیسے مویشیوں کا کھایا ہوا بھوسا ہو“۔

باوجود یہ کہ کعبہ میں ۳۶۰ بت تھے مگر اُس موقع پر کسی نے اُن بتوں سے فریاد نہیں کی، جناب عبدالمطلبؓ کی سرکردگی میں جتنی دعائیں مانگی گئیں، سب اللہ سے مانگی گئیں اور پھر انجام سامنے آیا اور وہ سخت حملہ جو ابرہہ کی سرکردگی میں کعبہ کے ڈھانے کے لئے ہوا تھا اس قدرتی انتظام سے ناکام ہوا اور وہ پوری جماعت تباہ و برباد ہوئی تو اس پر جو اشعار کہے گئے ان میں بھی اس کا رنامہ کو اللہ ہی کی قدرت کا کرشمہ قرار دیا گیا تو اس لئے اس واقعہ کو یاد دلا کر انہیں یہ سمجھا یا ہے کہ پھر ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو، اُس خدا کی عبادت کیوں نہیں کرتے جسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں جسے ابھی سورہ قریش میں نمایاں کر دیا جائے گا جو اس سورہ فیل کے مضمون سے اتنا قریبی تعلق رکھتا ہے اس لئے بعض صحابہ کے مرتب کردہ قرآن میں جس کے موافق ہمارے یہاں کے بعض روایات بھی ہیں کہ وہ دونوں ایک ہی سورہ کے جزء مانے گئے ہیں۔

چونکہ یہ ہاتھیوں والا واقعہ مکہ کے لئے بہت قریبی تاریخ کا ایک بڑا جزء تھا، اس لئے کہ یہ وہی سال تھا جس میں حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور اُس سے عرب کی جنتری گو یا مرتب ہوئی کہ اس سال کا نام عام الفیل ہوا اور اسی سے واقعات کو نسبت دی جانے لگی لہذا ”کیا تم نے نہیں دیکھا“ کے الفاظ اس وقت کے بہت سے لوگوں کے لئے چشم دید واقعہ کی یاد دہانی کی حیثیت رکھتے تھے اور خواہ لفظی حیثیت سے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہوں لیکن اُن میں سے ہر ایک ان کا اصلی مخاطب ہو سکتا تھا۔ اس لئے دوسری اُمتوں پر عذاب کے واقعات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوئے ہیں لیکن اس واقعہ کا یہ مختصر تذکرہ صرف یہاں ہے اور کسی مقام پر نہیں ہے اور یہاں بھی اُس کے تفصیلات بیان نہیں ہوئے ہیں کہ وہ اں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھے۔

یمن پر پہلے یہودیوں کا اقتدار تھا تو انہوں نے وہاں کے عیسائیوں کے ساتھ تشدد کیا اور بہت ظلم و ستم کے ساتھ اُن کو ختم کیا۔ اُن سے انتقام لینے کے لئے حبش اور روم کے باہمی تعاون سے جہاں عیسائی برسر اقتدار تھے ملک حبش سے فوج گئی تھی۔ اُس نے اُن یہودیوں کی قوت کا خاتمہ کر کے اپنا تسلط قائم کیا۔

اُس وقت سے یمن عیسائیوں کا مرکز اور انہی میں ابرہہ جو اُس فوج کے ایک معمولی خدمت گار کے طور پر آیا تھا رفتہ رفتہ یمن میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت اختیار کر گیا جیسے کہ وہ وہاں کا خود مختار بادشاہ ہے۔ حالانکہ برائے نام تو ویسے بادشاہ حبش کا نام کہتا تھا مگر عملاً اب وہی حکمران ہو گیا تھا۔ اُس نے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عالی شان کلیسا بنوایا اور اُس کلیسا کو تمام عرب کا مرکز بنانے کے لئے اُس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ مکہ کے اس عظیم معبد کو جہاں عرب حج کو جاتے ہیں ڈھادے اور اُس کے لئے ۶۰ ہزار فوج کے ساتھ غملہ کر دیا اس میں بارہا تھی اور ایک روایت کے مطابق ۹ ہاتھی تھے، اس لئے انہیں اصحاب الفیل کہا گیا ہے۔

راستے میں کچھ عرب قبیلوں نے مقابلہ کی کوشش کی اور وہ شکست کھا گئے اور بعض نے کسی حد تک تعاون کر کے اپنی جان بچائی۔ جناب عبدالمطلب نے اپنے ایمان اور اللہ پر اعتماد کے زور پر اُس سے جا کر بتایا کہ یہ اللہ کا گھر ہے۔ وہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے لہذا وہ اپنے اس اقدام سے باز رہے لیکن اُس نے نہ مانا، جناب عبدالمطلب اتمام حجت کر کے واپس آ گئے۔

دوسرے دن ابرہہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر پہلے تو اُس کا خاص ہاتھی جو محمود تھا اور سب سے آگے اُسے رکھا گیا تھا ایک دم بیٹھ گیا اور پیچھے مڑ کر تو وہ دوڑنے لگتا مگر جب آگے کی طرف منہ کر کے اُسے چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ بیٹھ جاتا تھا۔ اور پھر ایک کچھ عجیب پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ چوچوں اور پنچوں میں سخت قسم کے مٹی کے پتھر لئے ہوئے آ گئے۔

جنہوں نے ان سنگریزوں کی بارش کر دی جس سے جسم گلنے اور سڑنے لگتا۔ اس فوج کے بہت سے وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے میں جا بجا مر مر کر گرتے رہے اور خود ابرہہ بھی اسی طرح بھاگتے ہوئے ہلاک ہوا۔ یہ پتھر کچھ لوگوں نے اہل مکہ میں سے پائے اور انہیں محفوظ کر لیا مسلمان راویوں میں سے بعض کا بیان تھا کہ انہوں نے وہ پتھر دیکھے تھے۔

# سُورَةُ قُرَيْشٍ

مکیہ ..... ۴ ..... آیات

چونکہ پہلی آیت ہی میں قبیلہ قریش کا نام ہے اور سورہ انہی سے متعلق ہے لہذا سورے کا یہی نام ہوا اور یہی اُس کا موضوع ہے۔ چونکہ پیغمبر خدا ﷺ قبیلہ قریش میں پیدا ہوئے تھے اور اُس کے بڑے بڑے لوگوں نے آپ کی سب سے زیادہ مخالفت کی اس لئے دعوتِ اسلامی میں انہیں خاص طور پر اُس حقیقت پر توجہ دلا نا ضروری تھی جسے رسول خدا ﷺ پیش کر رہے تھے اور چونکہ عرب کی تجارت ان کے ہاتھ میں تھی اور انہوں نے اس سلسلہ میں دوسرے ممالک سے تعلقات قائم کئے تھے اور ہاتھیوں والے حملے کا مقصد بہت بڑا اس تجارت کو ختم کرنا تھا اس لئے اس سورہ فیل کے ساتھ جیسا کہ پہلے بیان ہوا اتنا گہرا ہے کہ اس لئے ایک تصویر یہ بھی ہے اور بعض ہمارے روایات کے بھی موافق جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ ان دوسروں کو حقیقت میں ایک ہی سورے کے دو جزء مانتے ہوئے متحد قرار دیا گیا ہے لیکن خلیفہ ثالث جناب عثمان نے جو قرآن لکھوا کر اطراف میں مشتہر کرائے، اُن میں اُن کے درمیان بسم اللہ درج تھی اور دو ۲ سوروں کی طرح لکھے ہوئے تھے اس لئے عموماً وہ دو ہی سوروں کے شمار میں آئے اور تمام دنیا میں اسی صورت سے مشہور معروف ہیں۔ اگر ہاتھیوں والا حملہ ناکام نہ ہوتا جو بالکل خدا کی قدرتِ قاہرہ کے ظہور سے ہوا تو یہ اُن کے سفر ختم ہو جاتے جو تجارتی ہوا کرتے تھے اور اس طرح وہ بھوکوں مر جاتے۔ اس قدر ترقی کاروائی سے اُن کی معاشی زندگی اور اس کا تحفظ ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

لَا يَلْفِ قُرَيْشٍ ۱) الْفِهْمَ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۲) فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا

الْبَيْتِ ۳) الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۴) وَأَمَّهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۵)

”چونکہ افراد قریش عادی ہیں، وہ عادی ہیں جاڑے اور گرمی والے سفروں کے تو انہیں لازم ہے کہ وہ عبادت کریں اس گھر کے پروردگار کی جس نے انہیں بھوک کے بجائے پیٹ بھرنے کا سامان دیا اور انہیں بھی خوف و دہشت کے بجائے امن و عافیت عطا کی“۔

یہ دونوں باتیں اس حملہ کے ناکام بنانے سے حاصل ہوئیں جس کی وجہ سے وہ ان سفروں کا جو جاڑوں میں تجارت کے لئے گرم ملک کی طرف اور گرمی میں سرد ملک یعنی شام وغیرہ کی طرف ہوتے تھے۔ نہ یہ راستے ان کے سفروں کے لئے بند ہوئے اور نہ اُن پر حملے کی کسی کو ہمت ہوئی اور یہ سب اُن کے علم میں اللہ کی طرف سے ہوا جو اس گھر کا مالک ہے اس لئے انہیں اُن بتوں کی نہیں بلکہ اسی ذاتِ واحد کی عبادت کرنا چاہیے۔

# سُورَةُ الْمَاعُونِ

## مکیہ..... ۷..... آیات

اس سورے میں ماعون کا لفظ بالکل آخر میں ہے جس پر اس کا نام ہوا تحریری طور پر رواج اس سورے میں بھی پیشانی پر مکی لکھنے کا ہے لیکن اُس کا مضمون زیادہ قوت سے پیدا کرتا ہے کہ وہ مدنی ہے کیوں کر دکھاوے کی نماز پڑھنے والوں کو جو کساتے ہوئے آکر جماعت میں نماز پڑھنے پر شریک ہوئے ہیں سرزنش ہے اور ایسے نمازی مکہ میں نہ تھے وہاں کے حالات میں کسی کو نماز پڑھنا ہی مشکل تھا، چہ جائیکہ وہ نماز کا قائل نہ ہو اور پڑھنا نہ چاہتا ہو اور پھر بھی دکھاوے کے لئے آکر نماز پڑھے۔ یہ قسم منافقین کی مدینہ ہی میں پیدا ہوئی تھی جب کہ اسلام کو قوت حاصل ہو گئی تھی، اس لئے وہی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْإِيْمَانِ ۚ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيْمَ ۖ وَلَا يَحْضُ عَلٰی  
طَعَامِ الْمَسْكِيْنِ ۗ فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّيْنَ ۗ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۗ  
الَّذِيْنَ هُمْ يُرْآءُوْنَ ۗ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۗ

”کیا تم نے دیکھا اُس کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہ ہے جو یتیم کو دکھا دیتا ہے اور کسی غریب کو کھانا دینے پر (لوگوں) کو آمادہ نہیں کرتا تو وائے ہے اُن نمازیوں کے لئے اپنی نماز سے بے اعتنائی برتتے ہیں، دکھاوے سے کام لیتے ہیں اور اپنے کو کسی بھی امداد سے روکتے ہیں“۔

”کیا تم نے دیکھا“، یعنی تم جو توجہ سے آنکھیں کھول کر دیکھو تو ایسے لوگ نظر آئیں گے اور اُن کا کردار خود بتائے گا کہ وہ آخرت کے قائل نہیں ہیں اور وہاں کی جزا و سزا کو نہیں مانتے۔ اُن کا ایک شعبہ زندگی کے لحاظ سے یہ عمل ہے کہ یتیم مدد چاہتا ہے تو وہ دھکے دے کر نکالتے ہیں، اور خود کھانا درکنار، دوسرے کو بھی آمادہ نہیں کرتے کہ وہ غریب کو کھانا کھلائے۔

اور دوسرے شعبہ حیات یعنی حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی اُن کا یہ عالم ہے کہ نماز سے غفلت برتتے ہیں اور پڑھتے ہیں تو اس طرح کہ اُن کے طرز عمل سے یہ نمایاں ہے کہ وہ اُسے کوئی فریضہ نہیں سمجھتے۔

بلکہ ایک بار ہے جو سر سے اتارنا چاہتے ہیں بلکہ یہ بھی لوگوں کی نظروں کے سامنے کہ وہ اُنہیں تارک الصلوٰۃ نہ سمجھیں، اپنے محل پر تو

اُسے ٹال ہی جاتے ہیں اور پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔

معاون کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ساتھ مدد ہے جسے عام طور پر پڑوسی لوگ ایک دوسرے سے مانگ لینا عیب نہیں سمجھتے، کسی وقت نمک نہ ہو اور پاس والے مکان سے نمک مانگ لیا یا چولہا جلانے کے لئے اور آگ سلگانے کے لئے کسی وقت دیا سلائی نہ ہوئی جس کے لئے پہلے چھماق ہوا کرتا تھا اور اُسے پاس والے مکان سے وقتی طور پر مانگ لیا۔ ان کی تنگ دلی کا یہ عالم ہے کہ ایسی چیزوں کے ساتھ مدد کرنے میں بھی باوجود امکان وہ گریز کرتے ہیں۔

غور کیا جائے تو اس میں دو ۲ گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ ہیں جو کھلم کھلا دین یعنی جزا و سزا کے منکر ہیں، لہذا ان کے کردار میں نماز کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہ دوسرے وہ ہیں جو بظاہر مسلمان ہو چکے ہیں لیکن دل سے قائل نہیں۔ اُن کے یہاں نماز کی ادائیگی کے ساتھ یہ بے اعتنائی پائی جاتی ہے اور حقوق الناس کی ادائیگی میں بھی یہ عالم ہے۔

## سُورَةُ الْكَوْثِرِ

مکیہ ..... ۳ ..... آیات

کوثر کے جو بھی معنی ہوں جس میں اختلاف ہے جس پر ابھی روشنی ڈالی جائے گی، بہر حال پہلی آیت میں اس کے رسول ﷺ کو عطا ہونے کا اعلان ہے، اس لئے یہ نام ہو اس کا۔

اور اس سورے میں جو مضمون درج ہے وہ یہی ہے کچھ لوگوں نے پیغمبر خدا ﷺ کی نسبت گستاخانہ طور پر ابتر کی لفظ کہہ دی، اُس کے مقابل میں خالق کی طرف سے رسول ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ آج جو آپ کے کام ہیں وہ کرتے رہیے۔ ابتر یہی ہوں گے۔ جو آپ کو کہہ رہے ہیں اور آپ کو تو اللہ نے کوثر عطا کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۝۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَاَنْحَرْ ۝۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

”ہم نے تو آپ کو کثرت نسل عطا کی ہے، تو آپ اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھتے رہیے اور قربانی کرتے رہیے،

یقیناً آپ کا دشمن ہی بے اولاد ہوگا۔“

کوثر کے لئے چونکہ روایات میں ہے کہ یہ جنت کی ایک بڑی نہر ہے جو معراج میں رسول ﷺ کو دکھائی بھی گئی تھی اور مسلمانوں میں بھی کوثر کا چرچا بہت ہے اور کوثر سے سیرابی کا شوق ہے اس لئے پہلی آیت میں جو کوثر کی عطا کا اعلان ہوا ہے، اُس کی تفسیر کے لئے اسی کے

مطابق یہ روایت آگئی اور یہ آگئی اور یہ شہرت ہوگئی کہ یہ اسی نہر کے عطا ہونے کا اعلان ہے۔

لیکن حقیقت میں یہ کوثر کی عطا کا اعلان مقابل میں دشمنوں کی زبان سے نکلی ہوئی لفظ ابتر سے ہے جس کو خداوند عالم نے خود اُن کے لئے دہرا دیا ہے اس لئے اس کوثر کے معنی اُسی ابتر کی مناسبت سے اور اُس کے تقابل کے ساتھ لینا چاہیے جس کا اس لفظ سے جوڑ ہو جو حضرتؐ کے لئے اُنہوں نے استعمال کی تھی۔ جہاں تک ہم غور کرتے ہیں کوثر جو نہر ہے، اُس کا کوئی جوڑ اُس ابتر سے نہیں ہوتا جو وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کہتے تھے۔

ابتر کی لفظ ابتر سے ہے جس کے معنی قطع ہونے یعنی کٹنے کے ہیں۔ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ابتر کہتے تھے اُس کے لئے کئی روایات میں ہے کہ جب آپ کے فرزند جو بطن جناب خدیجہ سے تھے، پے در پے وفات پاتے رہے تو اُن لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ ابتر ہیں ان کا مشن بہت جلد ختم ہو جائے گا یعنی اُن کے نزدیک بھی انسان کے کارنامہ کی بقاء اُس کی اولاد سے وابستہ تھی۔ اس سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت ہوئی۔ تو اُس کے مقابل میں اعلان ہوا کہ یہ آپ کو ابتر کہتے ہیں۔

ارے ہم بتاتے ہیں کہ ابتر یہی ہوں گے۔ اُن کی اولاد سب ختم ہو جائے گی اور آپ کو تو اللہ نے کثرت نسل و اولاد عطا کی ہے۔ یہ خالق کی بات نسل جانب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے پوری ہوئی۔ جو ایک طرف قرآن مجید کے اعلان کا زندہ معجزہ ہے جس کا مشاہدہ اقطاع و اطراف عالم میں کیا جاسکتا ہے۔

اور دوسری طرف اولاد جناب فاطمہ کے بنائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا ثبوت ہے جو مسلمانوں میں بد نصیبی سے ایک بحث طلب مسئلہ بن گیا اس لئے اُس کے بالمقابل یہ تشریح آگئی کہ ابتر کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ اپنی قوم سے کٹ کر الگ ہو گئے ہیں اور بے یار و مددگار ہیں، بہت جلدی ختم ہو جائیں گے۔

اُس کے جواب میں کہا گیا کہ نہیں آپ کو تو کثرت اصحاب و تابعین ہم نے عطا کی ہے اور آپ کی جماعت بہت زیادہ ہے۔ یہ خود بے یار و مددگار ہوں گے، اور ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

بہر حال جیسا کہ پہلے بیان ہوا ابتر کے کسی مفہوم کا جوڑ اُس نہر کوثر سے نہیں ہے۔ جو خداوند عالم نے آپ کو عطا کی ہے۔ یہاں اُسے مراد لینا درست نہیں ہے۔



# سُورَةُ الْكَافِرُونَ

مکیہ ..... ۶ ..... آیات

اس سورے کی پہلی ہی آیت میں الکافرون لاکر مخالفین سے مخاطب ہے، اس لئے اس سورے کا نام یہ ہوا۔ اس سورے میں مخالفین سے اپنے کسی اصول سے دستبردار ہو کر کسی سمجھوتے سے انکار ہے، چونکہ آپ کے سامنے ان کی طرف سے یہ تجویز پیش ہو رہی تھیں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی پرستش کیجئے، اسی کو دوسری لفظوں میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک سال آپ ہمارے دین کو اختیار کریں اور ایک سال ہم آپ کے دین کو قبول کر لیں اور اُسے برتنے رہیں تو ان کے خیالات خام کی نفی اور ایسی غلط پیش کشوں کے مسترد کرنے کے لئے یہ سورہ اتر ہے کہ ایسی غلط قسم کی رواداری جو اپنے اصول کو ترک کر کے رواداری نہیں بلکہ دین سے انحراف ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝۱ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝۲ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُونَ ۝۳  
وَلَا آتَا عَابِدًا مَّا عَبَدْتُمْ ۝۴ وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَّا أَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ  
دِينِ ۝۶

”کہیے اے کافر لوگو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم نے عبادت کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین“۔

چونکہ اس وقت ان لوگوں کے جنہوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ کچھ زمانے تک آپ ہمارے معبودوں کی پرستش کیجئے اور کچھ زمانے تک ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے۔ مخاطب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے لہذا خالق نے جو کہنے کا حکم دیا ہے اس کے مخاطب بھی رسول ہی ہیں لیکن اصول بہر حال اصول ہے اور اس لیے یہ کہنے پر مامور ہر مسلمان ہے جس کے سامنے ایسی پیش کش ہو۔

صیغہ مضارع عربی میں حال اور استقبال میں مشترک ہوتا ہے اور اسم فاعل اسی سے بنتا ہے اس لیے اس میں بھی دونوں زمانوں کا اشتراک ہے۔ یہاں ان میں سے ہر ایک کو دھرایا گیا ہے، پہلی جگہ اس سے حال مراد ہے۔ اور دوسری جگہ استقبال یعنی نہ اس وقت ایسا ممکن ہے کہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں اور نہ آئندہ کبھی ایسا ہونے کی امید رکھو۔ اس طرح ان کی توقع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا ہے کہ اب

ان کے لیے اپنی اس بات پر اصرار کا دروازہ بند ہو جائے۔ نہ وہ کسی بھی تبدیلی کے ساتھ آئندہ اس طرح کی کوئی متبادل تجویز پیش کریں۔ یہ غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ مشرکین بتوں کے ساتھ ساتھ اللہ کی بھی عبادت کر لیتے تھے اور یہ کیوں کہا گیا کہ تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کو قبول کرتا ہوں، اس لیے کہ چاہے نام کو اللہ کی عبادت کو قبول کرتے ہوں مگر اسلام جس طرح خالص عبادت اللہ کی چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ مانا جائے۔ وہ اس کے قائل نہیں ہیں لہذا دوسروں میں شامل کر کے اللہ کی عبادت نام کو وہ کرتے بھی تو یہ عبادت نہیں جسے اسلام اللہ کی عبادت قرار دیتا ہے۔

اب یہ امکانی روداداری ہے جو صرف کی گئی کہ نقطہ دین کو دونوں طرف یکساں طور پر استعمال کر دیا گیا ہے کہ ”تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور ہمارے لیے ہمارا دین“۔

حالانکہ حقیقت کے لحاظ سے وہ مشرکین ہی کا عمل ہے جو بے دینی کا مصداق ہے۔ دین نہیں ہے۔

## سُورَةُ النَّصْرِ

مدنیہ ..... ۳ ..... آیات

اس میں اسلام کی مکمل فتح و ظفر کا اعلان پیغمبر اسلام کے مشن کی کامیابی کو بصورت مشاہدہ سامنے کے بیان کے ساتھ آپ کو حمد و شکر الہی ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے اس کا یہ نام ہے اور یہی مضمون اس سورے کا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحِ ۙ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۙ وَاسْتَغْفِرْهُ ۗ ۙ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۙ

”جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح و ظفر ہو جائے اور آپ دیکھیے کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دن میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش کی دعا مانگیے، بے شک وہ بڑا نظر رحمت متوجہ کرنے والا ہے“۔

یہ کسی خاص معرکہ میں فتح نہیں ہے بلکہ عمر کے پورے کارنامہ کی مکمل فتح ہے جس سے رسول کا مقابلہ میں کسی معرکہ آرائی کی کسی کو ہمت نہ رہے اس لیے مفسرین کا بیان ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا آخری سورہ ہے۔

فوج در فوج دین الہی میں داخل ہوتے تھے یعنی اس کے پہلے انفرادی طور پر دو، دو یا ایک، ایک آدمی آکر مسلمان ہوتے تھے اور اب

دستے پر دستہ اجتماعی طور پر آتا ہے اور وہ اسلام قبول کرتا ہے اس طرح کہ بظاہر پورے ملک میں اب کوئی ایسا نہیں رہا جس نے دین اسلام قبول نہ کیا ہو اور اللہ کی توحید اور جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کو نہ مان لیا ہو۔ یہ صورت واقعہ فتح مکہ کے بعد کی مدت میں حجۃ الوداع تک رونما ہوئی اور اس اپنی کارگزاری کے نتیجے کو رسول نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا مگر وہ دنیا فتح ہوتی جس کے بعد کسی جشن مسرت منانے کا حکم ہوتا اور اپنی فتح کے نقارے بجانے کی تقریب منعقد کرائی جاتی، یہ دین کی فتح ہے اس لیے تقاضاے عبودیت یہی ہے اور اسی کا حکم دیا جا رہا ہے کہ اس پر اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی یاد میں مزید سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہو جانا چاہیے کہ خداوند اتیری ہی ذات ہے جس کی بدولت یہ فتح کا منظر سامنے آیا ہے۔ تو اس خدمت کو قبول فرما اور اس میں مجھ سے جو کوتاہی ہوئی ہو اس کو نظر انداز فرما یقیناً تیری بخشش اور عطا درکار ہے۔

## سُورَةُ اللَّهَبِ

مکیہ ..... ۵ ..... آیات

چونکہ پہلی ہی آیت میں ابولہب کا نام ہے لہذا اُس کے ایک جزو ابولہب پر اس سورے کا نام ہو گیا اور اُس میں ابولہب کی ایک گستاخی کا جو اُس نے شان رسالت میں کی تھی، خالق کی طرف سے جواب ہے۔ یہی اس سورے کا مضمون ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے“

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۚ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۚ سَيَصْلَىٰ نَارًا

ذَاتَ لَهَبٍ ۚ وَآمَرَ أَتَهُ ۥ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۚ

”ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور وہ ہلاک ہوا، اس کا مال جو اس نے کمایا وہ اس کے بالکل کام نہ آیا، بہت جلد وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا اور اس کی عورت بھی جو کٹڑیاں لاد کے لانے والی تھی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی“

ابولہب پیغمبر ﷺ کا قریب ترین ہمسایہ تھا یعنی صرف ایک دیوار بیچ میں تھی اور اُس کی رفیقہ حیات ابوسفیان کی بہن ام جمیل تھی، یہ دونوں حضرت کے لئے بڑے ایدارساں تھے ہر وقت بحیثیت پڑوسی کے جو انتہائی سخت ایذائیں پہنچاتے تھے، وہ تو پہنچاتے ہی تھی، باہر جب حضرت نکلتے اور لوگوں کو دعوت اسلام دینے جاتے تھے تو یہ ابولہب پیچھے لگ جاتا تھا اور آپ پیغام حق پہنچاتے تو یہ چیختا جاتا کہ یہ شخص جھوٹا ہے، دین سے منحرف ہو گیا ہے اور تم لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اور اس کی بات کبھی نہ ماننا، اجنبی لوگ دریافت کرتے، یہ کون ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا چچا ہے تو ان پر اُس کی بات کا بہت اثر پڑتا اور پیغمبر خدا ﷺ کی تبلیغ کے مقصد کو سخت نقصان پہنچتا۔ وہ اُس کی شریک حیات ام جمیل جو تھی

خاردار جھاڑیاں حضرت کے دروازے پر پھیل جاتی جس حضرت زحی ہوں اور آپ کو اذیت پہنچے۔ یہ تھا کہ ابولہب کا اُس کی کنیت کے ساتھ جو نام سے زیادہ مشہور تھی، صراحتاً اس سورے میں نام لیا گیا اور پورا سورہ اسی پر معنون ہوا اور اُس نے دو ایک مرتبہ جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں متباً کی لفظ کہی تھی، ایک دفعہ جب کوہ صفا پر حضرت اعلانیہ اپنے پیغام کو سب تک پہنچانے کے لئے تشریف لے گئے تو اور لوگ تو خاموش رہے یا ہنستے ہوئے چلے گئے مگر اُس نے کہا: لک الہذا جمعنا ہلاکت ہو تیرے لئے۔ کیا اس لئے تو نے ہم سب کو اکٹھا کیا؟ اس لفظ کو دو ۲۰ طرح سے اس کی طرف واپس کر دیا گیا۔ تبت ید اور پھر تبت جو بد دعا بھی ہو سکتی ہے مگر زیادہ قوت اس کو ہے کہ وہ مستقبل کی اطلاع ہے جسے یقینی ہونے کی بنا پر ماضی کے صیغے سے ادا کیا گیا ہے کہ سمجھ لو کہ ایسا ہو ہی گیا کہ اُس کے ہاتھ ٹوٹ گئے یعنی وہ بالکل عاجز اور بے بس ہو گیا اور ہلاک ہوا چنانچہ چند ہی سال کے بعد جنگ بدر میں قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے اسلام کے مقابلہ میں آ کر قتل ہو جانے سے اُسے ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ ایک ہفتہ سے زیادہ پھر زندہ نہیں رہ سکا اور وہ بھی ایسے سخت موذی اور متعذبی مرض میں مبتلا ہو کر کہ خود اُس کے گھر والوں نے اُس سے دوری اختیار کر لی اور مرنے کے بعد اُس کے دفن کرنے سے بھی پرہیز کیا۔ یہاں تک کہ کئی دن تک بے گور رہنے سے جب اُس کی لاش سڑنے لگی اور بدبو پھیلی تو کچھ مزدوروں کو جو حبشی تھے بلا کر ایک گڑھا بصورت قبر کھود کر بانسوں سے اُس کی لاش کو ڈھکیل کر وہاں تک پہنچایا اور اس طرح سپرد خاک ہوا۔

اُس کی بیوی کو جو اُم جمیل تھی لکڑیوں کو بوجھ لاد کر لانے والی اس کے اُس کردار کے لحاظ سے بھی کہا گیا جو وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کے لئے اختیار کئے ہوئے تھی اور پھر اس لفظ کو عرب میں لگائی بجھائی کرنے والوں کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ وہ فتنہ کی آگ کو بھڑکا کر گویا اُس کے لئے ایندھن فراہم کرتا ہے۔ گردن کے لئے جید کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں لمبی گردن، یہ واقعہ تھا اور اُس کے گلے میں ایک قیمتی موتیوں کا ہار ہوتا تھا تو اُس کے بالمقابل اُس کی سزا کے اعلان میں مونجھ کی رسی کا نام لیا گیا ہے جو ظاہر میں مونجھ کی ہوگی مگر حقیقت میں وہ دوزخ کی آگ کا ایک جزء ہوگی جو اُس شکل سے اُس کے گلے کا ہار بنی رہے گی اور اُسے مستقل دائمی ایذا پہنچاتی رہے گی۔

## سُورَةُ الْاِخْلَاصِ

مکیہ ..... ۴ ..... آیات

لفظ اخلاص اس سورے کے اندر نہیں ہے جس پر اس سورے کا نام ہو بلکہ مضمون اس سورے کا جو ہے اُس کے خلاصہ کو اس سورے کا نام قرار دیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۙ اللّٰهُ الصَّمَدُ ۙ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُولَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا

اَحَدٌ ۙ

”کیسے کہ وہ اللہ ہے یکتا، اللہ وہ مالک ہے جس سے سب لوگ لاتے ہیں نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اُس کا برابر دار نہیں ہے۔“

رسول خدا ﷺ کے پاس آ کر وقتاً فوقتاً اس طرح کا سوال پیش ہوتا تھا کہ اپنے اللہ کی اصل و نسل بتائیے، وہ کس چیز سے بنا ہے، سونے، چاندی، پیتل یا کاہے سے اور اُس کا خاندان کیا ہے؟ اس کے لئے یہ سورہ نازل کیا گیا ہے کہ جب اس قسم کا سوال پیش ہو تو رسول ﷺ یہ سورہ پڑھ کر سنائیں۔

چونکہ مشرکین لفظ رحمن سے تو اجنبی تھے مگر اللہ کے لفظ سے ان اصنام کے علاوہ جو ان کے معبود تھے ایک ذات کا تصور کرتے تھے۔ تو اس لفظ کے کہنے ہی میں یہ مضمر ہے کہ وہ تمہارے بتوں کی طرح کا کوئی بت ہوتا تو میں بتاتا کہ وہ کاہے سے بنا ہے، کس چیز سے تراشا گیا ہے۔ وہ تو اللہ ہے جسے تم خود ان بتوں کے علاوہ ایک الگ ذات مانتے ہو، تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ وہ کاہے سے بنا ہے اور اُس کے وجود کا اصل مادہ کیا ہے؟

احد وہ ہے جو ہر حیثیت سے ایک ہے یعنی اُن کاموں میں جو اُس کے ہیں کوئی اُس کا شریک نہیں ہے، وہ تنہا ہے اور ذات میں اُس کی کثرت کا شائبہ نہیں کہ وہ کچھ اجزاء سے مل کر بنا ہو۔ یا اُس کا تجزیہ ہو سکے اور نہ وہ کسی دوسرے کا ہم جنس ہے کہ ذہنی حیثیت سے وہ کسی بات میں دوسروں کے شریک ہو، اور پھر کسی جزء کے لحاظ سے اُسے دوسروں سے امتیاز حاصل ہو۔

وہ یکتا اور بے ہمتا ہے، سب اُس سے لو لگاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سب اُس کے محتاج ہیں اور وہ سب سے بے نیاز ہے۔ سب سے بے نیاز ہونے میں پھر اجزا کی نفی اور مادہ وجودات سے بری ہونے کا مفہوم نکل آتا ہے جو اُن کے سوالات کا جواب ہے۔

”اُس کی کوئی اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔“ اس سے خاندان کے تصور کی نفی ہوگئی اور اس سوال کا جواب کہ اُس کا نسب کیا ہے؟ اگرچہ کھل کر مشرکین نے بھی اللہ کے لئے کوئی باپ تجویز نہیں کیا مگر منطقی طور پر جب اولاد کا تصور اُس کی ذات سے وابستہ کر لیا جائے تو ذہن میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ وہ خود کس کی اولاد ہے۔ اس لئے یہ سوال ہوا، یہ بھی کہ آخر یہ کائنات کا اقتدار کس سے اُس کے ورثہ میں آیا ہے، وہ کس کا وارث ہے اور اُس کا کون وارث ہے۔

لہذا صاف الفاظ میں نفی میں دونوں جزء ایک ساتھ کہہ دیئے کہ نہ کوئی اُس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اُس کا کوئی ہمسر ہے یعنی تربیت کائنات اور اُس کے پہلے تخلیق کی منزل میں بھی کوئی دوسرا نہیں جو اُس کے ساتھ شریک ہو یا اُس کے ذات و صفات میں اُس کے مماثل ہو۔ اس طرح آغاز سورہ میں جو بات کہی گئی تھی، اُس کو دوسرے عنوان سے آخر سورہ میں بھی دہرا دیا گیا لیکن اوروں کی طرح اُس کے لئے اصل نسل اور کسی مادہ و صورت کا تلاش کرنا غلط ہے۔

# سُورَةُ الْفَلَقِ

مکیہ ..... ۵ ..... آیات

یہ اور اُس کے بعد والا سورہ موجودہ ترتیب میں قرآن کا آخری سورہ ہے دونوں معوذتان بھی کہلاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے مضمون کے لحاظ سے بندہ ان کے ذریعہ سے اپنے کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہے۔ اور پہلے سورہ میں چونکہ پہلی آیت میں برت الفلق ہے، اس لئے وہ اس نام سے موسوم ہے۔

اہل سنت کے روایات میں ہے کہ جس طرح حضرت پُرطرح طرح کے حملے ہو رہے تھے، اُسی طرح ایک مرتبہ حضرت پُرجادو کیا گیا اور اُس کی وجہ سے آپ شدت کے ساتھ علیل ہو گئے۔ اُس کے دفعیہ کے لئے خالق نے یہ سورہ نازل فرما کر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی اور بارشادر بانی ان سوروں کے پڑھنے سے حضرت کو مرض سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ ظاہر ہے اگر معصومین کی طرف سے ان روایات کے خلاف ہمیں کوئی رہنمائی ملی ہوتی تو ہم قوت کے ساتھ انہیں رد کر سکتے تھے لیکن موجودہ حالت میں ایسا ممکن نہیں ہے، بہر صورت یہ یقینی ہے کہ سحر کا اثر حضرت پُر ایسا کبھی نہیں ہو سکتا جس سے فرائض رسالت کو صدمہ پہنچے۔ یوں سحر میں ایسی خاصیتوں کا ہونا جیسے دواؤں میں خاصیتیں ہیں ناقابل انکار ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ

شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵

”کہیے کہ میں پناہ لیتا ہوں صبح کے مالک کی طرف اُس چیز کے شر سے جس کو اُس نے پیدا کیا ہے اور رات کے اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جاتا ہے اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد رکھنے والے کے حسد سے جب وہ حسد کرے۔“

چونکہ اکثر آفتیں اور بلائیں تاریکی شب میں آتی تھیں اور ان سے بعد میں پناہ مانگی گئی ہے، اس کی بنا پر جس کی پناہ طلب کی جا رہی ہے، اُس کا پہلا وصف قرار دیا گیا ہے کہ وہ سفیدہ سحری کا مالک ہے اس لئے ان بلاؤں اور مصیبتوں سے بچانے والا وہی ہے اور پھر چونکہ اُس واقعہ میں کہ جس سلسلہ میں یہ سورا اترتا ہے، جادو جو برآمد ہوا تھا، وہ یہی تھا کہ گنڈے کی صورت میں گریں لگی ہوئی تھیں اور خالق کی طرف سے جبریل نے بھی یہی پیغام پہنچایا تھا کہ اس سورے کے ذریعہ سے اس کا دفعیہ کیجئے جس کے لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ کو ہدایت کی اور آپ نے ہر گہ پر اس سورے یا اگر اسی کے ساتھ دوسرا سورہ بھی اترتا ہوتا اُس کی بھی ایک ایک آیت دم کی اور ہر ترتیب کے ساتھ ایک گہر کھلی، اس لئے

پناہ مانگی گئی اُن کے شر سے جو پھونک کر گرہیں لگاتی ہیں، چونکہ زیادہ تر اس قسم کے جادو کی ماہر عورتیں ہی ہوتی تھیں اس لئے جمع مؤنث کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں اور پھر اُس کے ساتھ حسد کرنے والوں کے حسد سے پناہ مانگی ہے، اس لئے کہ وہ ہر طرح سے نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔

## سُورَةُ النَّاسِ

مکیہ ..... ۶ ..... آیات

چونکہ پہلی ہی آیت میں، بلکہ آخر تک ہر آیت کا اختتام الناس کے لفظ پر ہوا ہے لہذا سورے کا یہ نام ہوا، یہ باعتبار مضمون تقریباً تتمہ ہے پہلے سورے کا۔ اس لئے اکثر دونوں کو ملا کر ایک نام یعنی معوذتان سے یاد کیا گیا ہے کہ دونوں میں یکساں طور پر ضرر رسان چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کی گئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے“

قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۝۴

الْحَقَّاسِ ۝۵ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۶ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶

”کہیے میں پناہ لیتا ہوں تمام آدمیوں کے پروردگار سے جو تمام آدمیوں پر سلطنت کا مالک ہے جو سب آدمیوں کا خدا ہے، شر سے وسوسے پیدا کرنے والے سے جو بار بار پلٹ پلٹ کر آتا ہے جو لوگوں کے دل سے وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جنوں میں سے ہو، یا آدمیوں میں سے“

ان تمام چیزوں کے شر سے پناہ مانگنے کے بعد جنوں کا ذکر پہلے ہوا اب اس قسم کے نقصان پہنچانے والوں کے شر سے پناہ مانگی جا رہی ہے کہ یہ ہدایت کے راستے میں بڑی رکاوٹ ڈالنے والے ایک مصیبت ہیں۔ ایسے آدمی بھی جو گمراہ ہیں اور گمراہ کرنے والے ہیں اور شیاطین بھی جن کا کام ہی گمراہ کرنا ہے۔ ان سب کی وسوسہ انگیزیوں سے بندہ اپنے کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہے۔

تمام شدہ

علی نقی النقیوی ۱۵ ماہ صیام ۱۴۰۷ھ